حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ 120 خطبات کا مجموعہ

خطبات حکیم الاسلام

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان

حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

خطباتِ حکیم الاسلامؒ

جلد — ۵

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحبؒ
فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحبؒ
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحبؒ
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشرز ۔ کراچی ۔ پاکستان

شانِ بعثت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

أَمَّـــا بَعْـــدُ!فَقَدْقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَۃً، وَلَمْ أُبْعَثْ لَعَّانًا ①. وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا . ②وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْأَخْلَاقِ .أَوْکَمَا قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ③

حرفِ آغاز......بزرگانِ محترم!اس وقت میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین حدیثیں آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہیں،ان تینوں احادیث میں تین بنیادی مقاصد ارشادفرمائے گئے ہیں۔پہلی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شان بیان فرمائی گئی ہے۔کہ آپ کس رنگ کے ساتھ مبعوث کیے گئے۔کون سی شان لے کرآپ دنیا میں تشریف لائے۔تو ایک بعثت کی شان اوراس کی صفت کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔دوسری دو روایتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض وغایت بیان فرمائی گئی ہے کہ آپ کو کیوں مبعوث کیا گیااوروہ کیامقاصد تھے،جن کو لےکرآپ دنیامیں تشریف لائے۔اس تقریر کاموضوع دواجزاء پر مشتمل ہے۔پہلا جز شان بعثت کہ آپ کارنگ کیاہے؟ دوسرا جزیہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے کیامقاصد متعین تھے؟وہ جبھی صحیح طور پر سامنے آسکیں گے جب ان کی اصل اور بنیاد پر روشنی ڈالی جائے،اس واسطے ابتدا میں بطور تمہید کے میں چند کلمات گزارش کروں گااس کے بعداحادیث کی تفسیران کا موضوع اوران کامعنی انشاءاللہ واضح ہو جائیں گے۔

کلماتِ تمہید......حق تعالیٰ شانہ،سارے کمالات کا سرچشمہ ہیں۔ساری برکات اورساری نعمتیں انہی کی ذات میں ہیں۔انہوں نے دنیامیں تمام نعمتوں کو بھیجا۔حق تعالیٰ کی صفات دوقسم کی ہیں:ایک جلالی صفات ہیں اورایک جمالی۔جلالی صفات جیسے شانِ قہر،شانِ غضب،شانِ انتقام یہ تمام جلالی صفات کہلاتی ہیں اور جمالی صفات جیسے

① الصحیح لمسلم،کتاب البر والصلۃ والآداب، باب النهی عن لعن الدواب وغیرها، ج:۴ ص:۲۰۰۶ رقم:۲۵۹۹. ② السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم ج:۱ ص:۲۶۵.

③ السنن الکبریٰ للبیهقی، کتاب الآداب، باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیها، ج:۱۰ ص:۱۹۱.

رزاقی، انعام واکرام اور تربیت، یہ تمام جمالی شانیں کہلاتی ہیں، غرض صفات خداوندی دو نوع میں منقسم ہیں۔ایک جلالی شانیں اور ایک جمالی شانیں ہیں۔

جمالی شانوں کا سرچشمہ رحمت ہے اور جلالی شانوں کا سرچشمہ غضب ہے تو ساری صفات مل کر دو نوع میں آجاتی ہیں، ایک رحمت کے نیچے ایک غضب کے نیچے۔حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: ”میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے“۔

حدیث میں ہے کہ عرش عظیم کے اوپر اللہ نے ایک لوح رکھی ہوئی ہے، جس کی بڑائی زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے، اس پر ”اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ“ ① میری رحمت میرے غضب کے اوپر غالب ہے میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے، جب رحمت اور غضب کا مقابلہ ہوتا ہے تو رحمت آگے آگے چلتی ہے اور غضب پیچھے رہ جاتا ہے، تو عرش عظیم کے اوپر یہ بطور دستاویز کے لکھ کر رکھ دیا ہے۔

تختِ شاہی......عرش عظیم وہ تخت شاہی ہے۔احکام خداوندی عرش سے جاری ہوتے ہیں جس کو فرمایا گیا: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ ② ”کہ تمام امور کی تدبیر عرش سے ہوتی ہے، اس لئے عرش تخت شاہی ہے اور ساری کائنات اس کے نیچے“۔

اس کائنات کو دیکھا جائے یہ زمینیں، آسمان، جنتیں ان سب سے اوپر جا کر عرش کا سلسلہ ہے تو مخلوقات عرش تک جا کے ختم ہو جاتی ہیں۔عرش کے اوپر کسی مخلوق کا وجود نہیں ہے، بجز اس تختی کے جو اوپر رکھی گئی ہے، جس پر لکھ دیا گیا ہے کہ:

دستاویزِ رحمت..... ”اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ“ صرف اس مخلوق کے سوا اوپر تجلیات ربانی ہیں اور صفات الٰہیہ کا وہ مرکز ہے تو عرش عظیم گویا پایہ تخت خداوندی ہے جس سے دنیا میں تدبیر امر ہوتی ہے اور احکام چلتے ہیں۔ اس عرش پر رحمت کو غالب کر دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام احکام میں رحمت کا غلبہ ہے اور اللہ نے اپنے بندوں سے جو تعلق قائم فرمایا ہے وہ شان رحمت سے قائم کیا ہے، اگر کہیں شان غضب سے تعلق قائم کرتے تو مخلوق کا وجود باقی نہ رہتا مخلوق پامال ہو جاتی، غضب اور قہر کے سامنے کیا چیز ٹھہر سکتی تھی تو بندوں سے جو رشتہ قائم فرمایا، وہ صفت رحمت سے قائم فرمایا صفت غضب سے نہیں۔

غضب تو تنبیہ کرنے اور سزا دینے کے لئے ایک وقتی چیز ہے، لیکن دوامی چیز جو تمام باتوں پر چھائی ہوئی ہے وہ رحمت کی شان ہے۔اسی واسطے فرمایا گیا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی.﴾

”رحمٰن عرش کے اوپر چھا گیا“۔اور عرش ساری کائنات پر چھایا ہوا ہے اور عرش کے اوپر رحمٰن چھایا ہوا ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ساری کائنات پر رحمٰن شان رحمت سے چھایا ہوا ہے۔یعنی ساری کائنات کے اوپر رحمت غالب

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب و کان عرشه علی الماء وهو رب العرش العظیم: ج:٦ ص: ٢٧٠٠ رقم: ٦٩٨٦. ② پارہ: ١١، سورة یونس، الآیة: ٣.

ہے، یہ نہیں فرمایا کہ:

''اَلْجَبَّارُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی یا'' '' اَلْقَھَّارُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی.''

اس کا مطلب یہ ہوتا کہ کائنات پر غضب چھایا ہوا ہے، اگر غضب چھایا ہوا ہوتا تو کائنات کا وجود ہی باقی نہ رہتا بلکہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی رحمٰن عرش کے اوپر چھایا ہوا ہے، یعنی صف رحمت عرش کے اوپر چھا گئی اور عرش ساری کائنات کے اوپر چھایا ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ عرش پوری کائنات پر اس طرح سے ہے جس طرح ایک قبہ ہوتا ہے جس طرح خوان بنا کر اس کو آپ خوان پوش سے ڈھانپ دیں اور وہ سارے خوان پر چھا جائے۔ اس طرح سے پوری کائنات پر مثل قبہ کے چھایا ہوا ہے اور اس پر رحمت چھا گئی ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ رحمت ساری کائنات پر چھا گئی ہے، تو رحمٰن عرش پر چھا گیا اور عرش کے اوپر دستاویز لکھ کر رکھ دی کہ میری رحمت میرے غضب کے اوپر غالب ہے۔

محل عرش...... پھر عرش کو کس چیز پر قائم کیا؟ حدیث میں بھی موجود ہے اور قرآن کریم میں بھی فرمایا گیا ہے:

﴿وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾ ① ''عرش کو پانی کے اوپر قائم کیا ہے''۔

حدیث میں ہے کہ وہ ایک عظیم سمندر ہے، جس کی ایک ایک موج زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے اس سمندر پر عرش قائم ہے، اگر رحمت کو مجسم بنایا جائے تو پانی کی شکل اختیار کرے گی۔ جس طرح غضب کو اگر جسم دیا جائے تو وہ آگ کی صورت بن جائے گا۔

جب کوئی شخص مہربان ہوتا ہے اور رحم وکرم کرتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ: فلاں شخص پانی پانی ہوگیا، یعنی اس پر شان رحمت غالب آ گئی۔ اور محبت غالب آ گئی اور اگر کوئی غضب ناک ہوتا ہے اور غصہ میں ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں آدمی آگ بگولہ ہوگیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غضب کو آگ سے مناسبت ہے اور رحمت کو پانی سے نسبت ہے تو عرش کو اللہ تعالیٰ نے پانی کے اوپر قائم فرمایا۔ اگر آگ پر قائم فرماتے تو معلوم ہوتا کہ غضب زمین ہے اس کے اوپر عرش کو قائم کیا۔ پانی کے اوپر قائم کیا اور پانی شان رحمت کی صورت مثالی ہے تو گویا عرش کے نیچے بھی رحمت ہے اور اوپر بھی رحمت ہے، عرش پانی پر قائم ہے اور پانی شان رحمت کی صورت ہے۔ تو عرش رحمت کے اوپر قائم ہوا۔ عرش پر رحمٰن چھا گیا یعنی صفت رحمت چھائی ہوئی ہے، عرش کے اوپر تختی لکھ کر رکھ دی کہ میری رحمت غضب پر غالب ہے تو دستاویز بھی رحمت کی ہے گویا عرش کے اوپر بھی رحمت نیچے بھی رحمت۔

قیامت میں غلبہ رحمت...... حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: حق تعالیٰ نے اپنی شان رحمت سے سو رحمتیں عالموں کے لئے پیدا فرمائیں، جن میں ایک رحمت اس دنیا میں اتاری ہے۔ اس رحمت کا اثر ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں پر رحم کھاتے ہیں جانور اپنے بچوں پر رحم کرتے ہیں، دوست دوست پر رحم کرتا ہے۔

---

① پارہ: ۱۲، سورة الهود، الآية: ۷.

عزیز عزیزوں پر رحم وکرم کرتے ہیں۔ یہ صرف ایک رحمت کا اثر ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اپنی مخلوق پر رحم وکرم فرماتا ہے۔ رزق دے رہا ہے، بارشیں آ رہی ہیں، نعمتیں مل رہی ہیں۔ یہ سب ایک رحمت کا اثر ہے، ننانویں رحمتیں جو ہیں ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ: وہ اپنے عرش کے نیچے چھپا کر رکھی ہوئی ہیں۔ قیامت کے دن ایمان والوں پر وہ رحمتیں کی جائیں گی تو اندازہ کیا جائے کہ قیامت کے دن کتنی رحمتیں ہوں گی جب ایک ہی رحمت کا اثر یہ ہے جو پوری دنیا میں نمایاں ہے تو ان ننانوے رحمتوں کے آثار کیا ہوں گے جو قیامت کے دن ایمان والوں پر کی جائیں گی، حیلوں پر مغفرت کی جائے گی، ذرا ذرا سے بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نجات دی جائے گی، گناہ گاروں پر شفقتیں کی جائیں گی، وہ ننانویں رحمتیں وہاں کام آئیں گی تو حاصل یہ نکلا کہ عرش کے اوپر بھی رحمت، نیچے بھی رحمت، پانی رحمت کی صورت مثالی اور ننانویں رحمتیں عرش کے نیچے چھپائی ہوئی ہیں۔ تو عرش گویا رحمت سے ڈھانپا ہوا ہے۔ اوپر سے نیچے تک رحمت ہی رحمت چھائی ہوئی ہے۔ اور "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" اور اللہ شانِ رحمت سے عرش کے اوپر چھا گیا ہے تو ساری کائنات پر رحمت غالب ہے۔

شانِ رحمت کا اثر...... اور اس شانِ رحمت کا اثر شانِ ہدایت ہے، اللہ کی رحمت متوجہ ہوئی تو بندوں کی ہدایت کا سامان کیا۔ بندوں کے لئے راہنمائی فرمائی کہ خیر کی طرف چلیں اور شر سے بچیں، بھلائی کی طرف آئیں اور برائی سے اپنے آپ کو بچائیں۔

یہ اسی شانِ رحمت کا اثر ہے، اگر بندوں کے اوپر رحمت وشفقت نہ ہو تو بھلائی کی طرف راہنمائی کیوں کریں؟ اگر کسی سے دشمنی کا تعلق ہو تو دشمن کو کون اچھا راستہ دکھلاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ اور جاکے جہنم میں جھک جائے جلدی سے ہلاک ہو۔ جب دشمن ہی ٹھہرا، دوست کو راہنمائی کی جاتی ہے کہ کسی برائی میں مبتلا نہ ہو۔ ماں باپ اپنے بچے کے دوست ہوتے ہیں اس کی راہنمائی کرتے ہیں کہ بیٹا یہ کام کرو اور یہ مت کرو۔ یہ تمہارے لئے بھلائی کی بات ہے اور یہ برائی کی بات ہے۔ یہ رحمت وشفقت ہی کا اثر ہوتا ہے استاد اگر اپنے شاگردوں کو پڑھاتا ہے تو اسی شانِ شفقت کا اثر ہوتا ہے اگر استاد کو طالب علموں سے دشمنی ہو جائے وہ طالب علموں پر کیوں محنت کرے گا؟ نہ کتاب پڑھائے گا، نہ راہنمائی کرے گا، نہ مسائل بتائے گا تو شفقت اور رحمت کا اثر ہوتا ہے، جو راہنمائی کی جاتی ہے۔ سب سے بڑا رحمت کا ظہور ہدایت ہے کہ سیدھی اور بھلائی کی راہ بتلا دی جائے۔

سب سے بڑی دعاء...... اسی شانِ ہدایت کے تحت حق تعالیٰ شانہ، نے انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا۔ وہ اللہ کی ہدایت ہیں جو اسباب کے ذیل میں نمایاں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا ہدایت کرنا، یہ اللہ کا ہدایت کرنا ہے۔ یہ اس کی رحمت کا ظہور ہے۔ تو ہدایت سب سے بڑی چیز ہے۔

سورہ فاتحہ جس کو قرآن عظیم فرمایا گیا ہے اور نماز کی ہر رکعت میں اس کو پڑھا جاتا ہے اس سورہ کا نام "سُوْرَۃُ

الْمَسْئَلَةِ'' بھی ہے، یعنی سوال کرنے کی سورت۔ اس میں سوال کیا گیا ہے؟ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ ①
''ہدایت دے دیجئے، سیدھے راستہ کی''۔ یہ ہے سب سے بڑی دعاء جو سورۂ فاتحہ میں منگوائی گئی ہے۔

سورۂ فاتحہ کی ابتدا میں حق تعالیٰ شانہ، کی صفات کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ رب العٰلمین ہے۔'' رَحْمٰنٌ وَ رَحِيْمٌ ہے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' ہے، معبود ہے جس کی عبادت کی جاتی ہے۔ آگے بندگی کی شان فرمائی گئی ہے کہ بندہ کا کام یہ ہے کہ معبود کے آگے جھکے، بھیک مانگے، سوال کی دعا یہ بتلائی گئی کہ: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ گویا بندے مکلف اور مامور کئے گئے ہیں کہ پانچوں نمازوں میں یہ دعا کریں۔ جب فاتحہ پڑھیں گے یہ دعا آئے گی۔ فرائض کے بعد سنتیں پڑھے تو پھر فاتحہ کے ذریعہ یہ دعا مانگے۔ نفلیں پڑھے یا تہجد پڑھے یہ دعا مانگے غرض جتنی نمازیں فرض، واجب، سنت اور نفل، یہ دعا سب میں لازم ہوگی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑی اہم دعا ہے، ہدایت کا مانگنا کوئی بہت اہم چیز ہے۔

بظاہر ایک سوال ہوتا ہے کہ فاتحہ جس کو ''سورۃ المسئلۃ'' کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی ذرا اونچی دعا منگوائی جاتی کہ یا اللہ! ہمیں جنت عطا کر دیجئے، یا اللہ ہم سے راضی ہو جائیے، اپنی رضا عطا کر دیجئے، ہمیں اپنے عرش کے سائے میں جگہ دید یجئے، یہ تو معمولی سی دعا ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو ساری دعاؤں کی جڑ بنیاد یہی دعاء ہے اس واسطے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیدھا راستہ دکھلا دیجئے تو جب سیدھا راستہ مل گیا تو آدمی اس پر چل پڑا، رضا خود بخود حاصل ہوگئی۔ بے راہ رو کو رضا حاصل نہیں ہوتی سیدھے راستہ پر پڑ گئے تو جنت خود بخود حاصل ہوگئی، بے راہ چلتے تو جنت نہ ملتی سیدھے راستہ پر پڑ گئے تو جنت خود بخود حاصل ہوگئی، بے راہ چلتے تو جنت نہ ملتی سیدھے راستہ پر چل پڑے تو عرش کے سائے میں بھی جگہ خود بخود مل گئی۔ اگر آدمی بدراہ ہوگا۔ عرش کا سایہ نہیں ملے گا، تو جتنی بڑی سے بڑی دعا ہو سکتی تھی، اور جتنا بڑے سے بڑا مقصد ہو سکتا تھا وہ سب اس دعا سے حل ہوتا ہے اصل میں ہدایت ہے، ہدایت ہوگئی تو رضا بھی ملی جنت بھی ملی عرش کا سایہ بھی ملا اور انبیاء علیہم السلام کی مرافقت بھی ملی۔ ساری نعمتیں دستیاب ہوگئیں۔ اور اگر خدانخواستہ ہدایت نہ ملے تو نہ جنت نہ عرش اگر آدمی ضلالت اور گمراہی پر ہو تو کہیں سے کوئی نعمت دستیاب نہیں ہو سکتی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ سب سے بڑی نعمت ہدایت ہے۔ اس لئے سورہ فاتحہ میں دعا منگوائی گئی کہ ہدایت کی دعا مانگو کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھلا دیجئے دل کی کلیں درست ہوگئیں، دل کا راستہ درست ہو گیا، تو دنیا و آخرت کی ہر نعمت مل گئی۔

ثمرۂ دعاء...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''اِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ.''

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جو صنوبری شکل کا ہے، اگر وہ درست ہے تو سارا انسان درست

① سورۃ الفاتحۃ.

ہے اگر وہ غلط ہے تو سارا انسان غلط ہے اور وہ گوشت کا لوتھڑا ''دل'' ہے اگر دل درست ہے تو سارا انسان درست ہے اور اگر دل خراب تو سارا انسان خراب ہے۔ اور دل کب درست ہوتا ہے جب دل کی کلیں درست ہوں، دل کا راستہ درست ہو دل میں ہدایت موجود ہو، دل میں ضلالت اور گمراہی موجود نہ ہو، تب دل درست ہوتا ہے، تو سارے انسان کی درستگی قلب کی ہدایت پر موقوف نکلی۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کوئی بہت بڑی عظیم نعمت ہے اس لئے یہاں دعا منگوائی گئی کہ: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ ''ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت دے دیجئے''۔

اور وہ صراطِ مستقیم کونسا ہے؟ ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ''جن پر آپ نے انعام کیا، ان کا راستہ''۔ اور وہ کون ہیں، جن پر انعام کیا گیا؟ وہ انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صلحاء ہیں تو ان کا راستہ مطلوب ہے۔ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّينَ﴾ ''جن پر آپ کا غضب وقہر نازل ہوا ان کا اور گمراہوں کا راستہ ہمیں نہیں چاہئے''۔ ان کا راستہ چاہئے جن پر آپ کا انعام ہوا، وہ آپ کی رحمت کے نیچے ہیں۔

تو سب سے بڑی دعا جو فاتحہ میں منگوائی گئی وہ ہدایت کی دعا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت اتنی بڑی نعمت ہے کہ ساری نعمتیں اس کے تابع ہیں اور ضلالت سب سے بڑی گمراہی ہے کہ ساری مصیبتیں اس کے تابع ہیں، اس لئے فاتحہ جو قرآن کریم کا خلاصہ ہے اس میں ہدایت کی دعاء رکھی گئی جو فاتحہ کا خلاصہ ہے، تو سارے قرآن کا خلاصہ ہدایت نکل آتی ہے۔

نعمتِ عظمٰی...... اسی واسطے سورہ بقرہ سے جب قرآن کریم کا آغاز کیا گیا اور کہا گیا کہ: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَيْبَ فِيْهِ﴾ ① ''وہ کتاب ہے جس میں کوئی کھٹکا نہیں''۔

اس کی شان یہ فرمائی گئی کہ: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ ''یہ کتاب متقین کے لئے ہدایت ہے''۔ یہ تو سب سے بڑی نعمت کتاب اللہ ہے، کتاب اللہ کی سب سے بڑی نعمت جو بنیاد ہے وہ ہدایت ہے۔ تو فاتحہ میں ہدایت مانگی گئی ہے۔ جو حق تعالیٰ شانہ، کی رحمت عرش پر چھائی ہوئی ہے۔

اور رحمت کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ بندوں کی ہدایت کا سامان کر دیا۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام وہ ہدایت لے کر آئے۔ انبیاء علیہم السلام کا بھیجا جانا خود مستقل ایک انعام نکلا۔ اس سے بڑھ کر عالم میں کوئی نعمت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر انبیاء علیہم السلام دنیا میں نہ آئیں، آدمی کو آدمی بننا میسر نہیں ہوسکتا، انسان کو انسان انبیاء علیہم السلام نے بنایا ہے۔ ورنہ انسان تو گھوڑوں اور ڈنگروں کا ایک مجموعہ ہے، جو آپس میں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ایک دوسرے کے درپے آزار ہوتا ہے۔ جانور، جانور کے ساتھ وہ بدسلوکی نہیں کرتا، جو انسان انسان کے ساتھ کرتا ہے، تو انسان اگر انسانیت پر نہ آئے تو سب سے بڑا درندہ یہ ہے، سب سے خونخوار غضبناک بھی یہ ہے اس کو جو جانور کی حد سے نکال کر انسانیت میں داخل کیا ہے وہ انبیاء علیہم السلام ہی نے تو کیا ہے انہی کی

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱.

تعلیمات کا تو اثر ہے کہ آدمی آدمی بنتا ہے، جب ان کی تعلیمات کسی جگہ ختم ہو جاتی ہیں، وہیں انسان گھوڑوں اور ڈنگروں میں شامل ہو جاتے ہیں، جہاں تعلیمات آئیں وہیں آدمیت آجاتی ہے، تو آدمی کی آدمیت ہدایت پر موقوف ہے، اور ہدایت انبیاء علیہم السلام کے آنے پر موقوف ہے۔ تو نبیوں کا آنا ایک عظیم نعمت نکلی اور کل انبیاء علیہم السلام میں سے بھی سب سے بڑی نعمت جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث ہونا ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں، افضل الانبیاء ہیں اور افضل البشر ہیں۔

نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم...... حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں کا فیض بھی درحقیقت نبوّت محمدی سے چلا، حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ: ''اَنَانَبِیُّ الْاَنْبِیَآءِ'' ''میں نبیوں کا نبی ہوں''۔

اور انبیاء امتوں کے نبی ہیں۔ اسی واسطے انبیاء علیہم السلام پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، انبیاء کرام سے عہد لیا گیا: ﴿وَاِذْ اَخَذَاللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَامَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ ①

''یاد کرو اس وقت جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب وہ رسول عظیم الشان آئے جن کو بھیجنا ہے اور تمہیں میں نبوت اور کتاب دے دوں اور پھر وہ رسول آئیں گے تو تم اس کے اوپر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو، اگر تم میں سے کوئی اس کا زمانہ پائے تو خود مدد کرے، ورنہ اپنی اقوام کو ہدایت کرو کہ وہ خاتم النبیین کی مدد کریں''۔

اس نبی کی کیا شان ہوگی؟ ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَامَعَكُمْ﴾ وہ رسول عظیم، جو کچھ تمہیں علم دیا گیا ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہوگا۔

جامع الہدایات...... تصدیق، اس کی دلیل ہوتی ہے کہ جس چیز کی وہ تصدیق کرتا ہے وہ اس کے اندر موجود ہے، جس علم کی تصدیق کوئی کرے گا تو پہلے اس کا علم ہونا چاہئے۔ جاہل تصدیق نہیں کر سکتا، عالم تصدیق کرے گا، تو سارے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ جو علم سارے انبیاء کو دیا گیا تھا، وہ علم اس نبی عظیم میں موجود ہوگا تو آپ تمام علوم انبیاء کے جامع ہوں گے۔ اس لئے آپ سارے انبیاء کی تصدیق کریں گے، جو کچھ جسے ملا ہے میں کہتا ہوں کہ وہ حق ہے وہی سچ ہے۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے جس کے پاس حق موجود ہو۔ وہ علم اس کے پاس موجود ہو تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین اور جامع العلوم بنائے گئے تو اگر انبیاء کا دنیا میں آنا رحمت ہے تو خاتم النبیین کا آنا سب سے زیادہ رحمت ہے۔ جو جامع ترین نعمت لے کر آئے۔ اگر اور انبیاء علیہم السلام مختلف رنگوں کی ہدایت لے کر آئیں تو آپ ساری ہدایتوں کا مجموعہ بن کر آئے۔ تو خاتم النبیین کا مطلب یہ ہے کہ آپ جامع الہدایات ہیں۔ جامع العلوم اور جامع الکمالات ہیں تو ایک ایک کمال کا آنا اگر نعمت اور رحمت ہے تو سارے کمالات کے مجموعے کا آنا سب سے بڑی نعمت ہے۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا نعمت ہوگی

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۱.

اور سب سے بڑی نعمت آپ کی بعثت ہوگی۔

افضل الشئون......اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو شان ہوگی، وہ ساری شانوں سے افضل ہوگی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم ہیں تو خاتم الشئون بھی ہونگے، ساری شانیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوں گی، تو جامع ترین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ہونی چاہئے۔

تمام انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کے کمالات کا مظہر بن کر آئے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جامع الکمالات ہیں اس لئے حق تعالیٰ شانہٗ کے کمالات کا مظہر اتم ہیں تو حق تعالیٰ شانہٗ کی شانیں جس قوت اور کمال کے ساتھ آپ میں آئی ہیں، دوسروں میں نہیں آئیں۔

شانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں غلبہ رحمت......ابھی آپ نے سنا کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی شان یہ ہے کہ ان کی تمام صفات دو نوع میں ہیں۔ صفات جمال اور صفات جلال، صفات جمال کا منشاء رحمت ہے اور صفات جلال کا منشا غضب ہے۔ اور رحمت اللہ کے غضب پر غالب ہے۔ تو جو اللہ کا سب سے بڑا مظہر اتم ہے اس میں بھی رحمت ہی غالب ہونی چاہیئے اس لئے آپ کی شان فرمائی گئی کہ: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ① جیسے اللہ کے ہاں شان رحمت غالب ہے تو خاتم النبیین میں بھی ساری شانیں ہیں، مگر سب پر جو شان غالب ہے تو وہ رحمت کی شان ہے آپ کو رحمت مجسم بنا کر بھیجا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ''اَنَا رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ''. ②

میں ایک رحمت ہوں جو بطور ہدیہ کے مخلوق کو دی گئی ہوں، یعنی میں اللہ کا ایک ہدیہ ہوں جو مخلوق کو عطا کیا گیا، ایک تحفہ ہے جو اللہ نے بنی آدم کے لئے بھیجا ہے اور وہ میں ہوا اور میں کون ہوں؟ ''رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ'' ایک رحمت مجسم ہوں جس کو بطور ہدیہ کے عطا کیا گیا، تو اللہ نے اپنی مخلوق کے لئے عظیم ہدیہ بھیجا۔ وہ ہدیہ رحمت ہے۔

تو جیسے حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں کہ: میری شانوں میں رحمت کی شان غالب ہے یہی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ہے کہ آپ پر شان رحمت کا غلبہ ہے، شان غضب غالب نہیں ہے، جب آپ حق تعالیٰ شانہٗ کے نمائندے اور مظہر ہیں۔ تو شان غضب بھی موجود ہے۔ اس غضب کا اثر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں حدود بھی ہیں۔ قصاص بھی ہیں۔ کفارات بھی ہیں۔ تعزیرات اور سزائیں بھی ہیں، جہاد بھی ہے۔ جو شان غضب کا مظہر ہیں، مگر ان سب کے اندر بھی اگر غلبہ ہے تو شان رحمت کا غلبہ ہے۔ غضب بھی چلتا ہے تو وہ بھی رحمت ہی سے چلتا ہے۔

اگر باپ بچے کو مارتا بھی ہے۔ اس کا منشاء دشمنی نہیں ہوتی۔ محبت منشا ہوتی ہے۔ محبت ہی سے مارتا ہے تاکہ اس کو ہدایت ہو۔ حق تعالیٰ شانہٗ بھی اگر کسی فرد یا قوم پر غضب فرماتے ہیں تو اس کا منشا رحمت ہوتا ہے۔ تو نبی کریم

---

① پارہ: ۱۷، سورة الانبياء، الآية: ۱۰۷. ② سنن الدارمي، باب كيف كان اول شأن النبي ﷺ ج: ۱ ص: ۱۷. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحيحة ۴۹۰۔

صلی اللہ علیہ وسلم بھی اگر کسی پر غضب یا غصہ فرمائیں اس کا منشا بھی رحمت ہی ہے، ہدایت اور تنبیہ اس کا منشا ہوتی ہے۔ تو غضب کا منشا بھی فی الحقیقت رحمت ہے تو رحمت غالب آ گئی۔ کہیں بلا واسطہ رحمت کا ظہور ہے۔ کہیں غضب کے واسطہ سے رحمت کا ظہور ہے غضب میں بھی سو رحمتیں چھپی ہوئی ہیں۔ دشمن اگر غصہ کرے تو یہ غصہ ہے اور باپ اگر غصہ کرے تو اس کے اندر رحمت چھپی ہوئی ہے۔ دشمنی چھپی ہوئی نہیں۔ تو اللہ اپنی کائنات پر اور مخلوق پر ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے۔ تو اس کے غصہ میں بھی ہزاروں رحمتیں چھپی ہوئی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پر ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصہ بھی فرمائیں گے تو اس کا منشاء رحمت اور محبت ہی ہوگا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم شانِ رحمت اور رحمت مجسم بن کر آئے ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں شانِ رحمت...... اسی لئے آپ کی شریعت میں رحمت کا غلبہ ہے۔ ایک ایک حکم کے اندر رحمت کا غلبہ ہے، ہر ہر حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ شفقت ٹپکی پڑتی ہے۔ بندوں کو ہدایت دے رہے ہیں۔ اس میں بھی شانِ رحمت کا غلبہ ہے۔

اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ جیسے رحمت مجسم ہیں تو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی تربیت شانِ رحمت سے ہی فرمائی۔ اس لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان یہ فرمائی گئی کہ: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ①

رحمت اور کرم ان کے اندر مخفی ہے، رحمت و کرم کے ان کے اندر رچا ہوا ہے اگر کفار پر شدت ہے تو ان کی ذوات پر نہیں ان کے کفر پر ہے۔ رحمت وہاں بھی چھپی ہوئی ہے کہ کسی طرح وہ بھی ایمان قبول کر لیں کسی طرح یہ ہدایت پر آ جائیں۔

رحیم اُمت...... صحابہ میں سے بھی اَجل صحابہ، اکمل صحابہ رضی اللہ عنہم اور افضل صحابہ رضی اللہ عنہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا کہ: انبیاء کے بعد اگر کوئی شخصیت ساری کائنات پر افضل ہے تو وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان فرمائی گئی: ''اَرْحَمُ اُمَّتِيْ بِاُمَّتِيْ اَبُوْبَكْرٍ'' ②

''صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر رحمت کا غلبہ ہے''۔

حدیث میں واقعات آتے ہیں کہ: صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب اپنے مکان سے مسجد نبوی کی طرف چلتے تھے گویا دربارِ خلافت میں پہنچتے تھے تو رحمت کا غلبہ اس درجہ پر تھا اور اس درجہ مخلوق اس رحمت سے آپ کی طرف متوجہ ہوتی تھی کہ چھوٹے چھوٹے سینکڑوں بچے آپ کے پیچھے ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یَا اَبَتَا! اے باپ! اور کوئی کہتا

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹.

② السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل مزید بن ثابت... ج: ۱۲ ص: ۲۶۲. صحیح ابن حبان، کتاب اخبارہ ﷺ عن مناقب الصحابۃ، باب ذکر البیان بأن معاذ بن جبل کان من اعلم الصحابۃ بالحلال والحرام، ج: ۱۶ ص: ۷۴ رقم: ۷۱۳۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلۃ الصحیحۃ ۱۲۲۴۔

کہ اے چچا! اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں کہ کسی بچے کو کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں، کسی کو گود میں لئے ہوئے ہیں، کسی کے سر پر ہاتھ ہے، بیسیوں بچے پیچھے پیچھے ہیں اور امیر المومنین دربارِ خلافت میں جارہے ہیں۔ یہ رحمت کا غلبہ تھا۔ ''اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکْرٍ''

سب سے رحیم القلب اور سب سے زیادہ شفیق صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو فرمایا گیا تو اللہ کے یہاں شانِ رحمت غالب ہے تو سب سے زیادہ بڑے نائب اور اللہ کے وزیرِ اعظم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ان کو رحمت مجسم فرمایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتوں میں جو سب سے زیادہ با کمال ہیں اس کو ارحم کہا گیا کہ سب سے زیادہ رحیم ہیں۔ تو رحمت اوپر سے لے کر نیچے تک چھائی ہوئی ہے اور رحمت کا ایک سلسلہ چلا جو پہلے انبیاء میں آیا۔ اکمل ترین حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں آیا۔ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم میں آیا کہ ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' اکمل ترین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں آیا غرض رحمت غالب ہے اور رحمت کا سرچشمہ وہ فی الحقیقت ہدایت ہے۔ تو سارے صحابہ رضی اللہ عنہم ہادی ہیں۔

طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ'' ① ''میرے تمام صحابی (رضی اللہ عنہم اجمعین) ستاروں کی مانند ہیں، جس کی روشنی میں راستہ طے کرو گے ہدایت پا جاؤ گے''۔ ہر ایک ہادی اور مہدی ہے گویا صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی وہ شان ہے کہ قرآن نے من حیث الطبقہ کسی کو مقدس کہا ہے تو وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے اوروں میں افراد کی تعریف کی گئی ہے، لیکن طبقے کے طبقے کو مقدس کہنا یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے۔ ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ②

سابقین اولین مہاجرین ہوں یا انصار ہوں اور جو بعد میں ان کے ساتھ ملتے گئے ان سب کے مجموعے کو کہا کہ اللہ ان سب سے راضی وہ اللہ سے راضی تو اللہ طبقہ سے راضی۔ افراد کا نام نہیں لیا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے راضی یا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے راضی۔ ﴿مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ﴾

مہاجرین اولین ہوں، انصار اولین ہوں یا بعد میں ان کے ساتھ لاحق ہونے والے ہوں، سب کو کہا گیا اللہ ان سب سے راضی اور وہ اللہ سے راضی جس طبقے میں طبقے کی حیثیت سے کھوٹ ہو۔ اللہ کبھی ان سے راضی نہیں ہو سکتا۔ رضا کا اعلان دلیل ہے کہ طبقے میں کھوٹ نہیں۔ طبقہ بہت مقدس ہے۔

① علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ البیهقی واسنده الدیلمی عن ابن عباسؓ بلفظ: اصحابی بمنزلة النجوم فی السماء بأیهم اقتدیتم اهتدیتم. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۳۲. اس حدیث کے بارے میں نہایت عادلانہ کلام حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تصنیف ''التلخیص الحبیر'' میں کیا ہے دیکھئے: التلخیص الحبیر، باب ادب القضاء ج: ۵ ص: ۴۹۸.

② پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۰.

دوامی رضا کا اعلان...... پھر رضا کا بھی اعلان کوئی ہنگامی اور وقتی نہیں۔ یہ رضامندی کا اعلان قرآن میں کیا گیا اور قرآن قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ اس کا حاصل یہ کہ کوئی دقیقہ بیچ میں ایسا نہیں گزرے گا کہ اللہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ناراض ہو۔ جو رضا ابتدا میں ہے وہی وسط میں ہے، وہی انتہا میں ہے۔ قیامت تک وہ رضا باقی رہے گی اور قیامت کے بعد بھی رہے گی۔ قیامت کے بعد قرآن اسی طرح موجود ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ جنت میں حافظ سے کہا جائے گا کہ: رَتِّلْ وَارْتَقِ ① قرآن پڑھتا جا۔ اور جہاں تک تیری طاقت میں ہے ترقی کرتا جا۔ تو وہاں بھی تلاوت ترقیات کا ذریعہ بنے گی۔ قرآن قیامت تک ختم نہیں ہوگا اس کے بعد بھی قرآن ہی کا دورِ حکومت ہے، جنت میں بھی قرآن ذریعہ ترقی بنتا جائے گا اور جب تک قرآن ہے: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ کا نعرہ موجود ہے تو مطلب یہ نکلا کہ اب جب صحابہ رضی اللہ عنہم (نزول قرآن کریم کے وقت) موجود ہیں۔ اب بھی ہم ان سے راضی، ان کی وفات کے بعد بھی ان سے راضی، قیامت میں بھی ہم ان سے راضی، اس کے بعد جنت میں بھی ان سے راضی یعنی ابدالاباد تک ان سے راضی ہیں۔ تو جس طبقے کے بارے میں رضا کا اعلان کیا جائے کہ علی الاطلاق ہم ان سے راضی ہیں اور وہ علی الاطلاق ہم سے راضی تو وہ طبقہ یقیناً بحیثیت طبقے کے مقدس ہے، یہ نہیں ہے کہ ایک دو فرد مقدس ہیں۔ باقی میں معاذ اللہ، معاذ اللہ کچھ کھوٹ ہے، بلکہ پورا طبقہ مقدس ہے۔

کتب سابقہ میں شانِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر...... پھر یہ کتب کہ سابقہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان بیان کی گئی، تورات میں بیان کی گئی۔ حدیث میں ہے کہ: صحابہ رضی اللہ عنہم کی شانیں اور صفات دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خواہش کی اور کہا کہ اے پروردگار! یہ امت مجھے عطا کر دیجئے فرمایا گیا کہ: یہ امتِ محمد ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ: پھر اس امت ہی میں مجھے داخل کر دیجئے۔

تو گویا ایسی شان بیان کی گئی کہ انبیاء نے تمنائیں کیں کہ اس امت کے ذیل میں ہمیں شمار کر لیا جائے۔ تو اس امت میں سب سے زیادہ مقدس طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ کتب سابقہ میں بھی اس طبقہ کے مقدس ہونے کی شہادت دی گئی اور قرآن میں شہادت دی گئی تو ازل سے ان کا تقدس چلا اور ابد تک چلتا رہا تو اول سے لے کر اخیر تک یہ طبقہ مقدس ہے اور طبقات کے تو افراد کو نام لے کر مقدس کہا گیا ہے یا بلا نام کے۔ اور اس پورے طبقے کی تقدیس کر دی گئی۔

اصنافِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... پھر اس طبقے کے نام لے لے کر قرآن کریم نے الگ تقدیس کی: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ ② ''اللہ ان مومنوں سے راضی

① السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فیمن قرأ حرفا من القرآن ماله من الاجر: ج:۵. ص:۱۷۷ رقم:۲۹۱۴ . ② پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۱۸ .

ہوگیا جن سے آپ نے شجرۃ الرضوان کی بیعت لی ہے۔حدیبیہ میں بیٹھ کر بیعت لی،ان سے اللہ راضی''۔

وہ ڈیڑھ ہزار کے قریب صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔تو ایک صنف بتلائی گئی اس پر پھر رضا کا اعلان کیا گیا۔تو مجموعہ سے رضا کا اعلان اور اسکی اصناف سے رضا کا اعلان۔اصحاب بدر سے رضا کا اعلان،اصحاب احد سے رضا مندی کا اعلان پھر پورے رضا کے نیچے آجاتے ہیں۔پورے صحابہ کی تقدیس وتقدس کا قرآن کریم اعلان کررہا ہے اور شہادت دے رہا ہے، یہ اللہ کی شہادت ہے اصل اور مضبوط ترین شہادت ہے تو طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہ کو بحیثیت طبقہ مقدس قرار دے دیا گیا۔

مقامات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس......پھران کے اعمال کی تقدیس الگ کی گئی،ان کے اخلاق کی تقدیس الگ کی گئی، پھران کے مقامات کو مقدس الگ بتلایا گیا۔

ایک موقع پر فرمایا گیا:﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ﴾ ① ''جو لوگ اللہ کے رسول کے ساتھ ہیں،ان کی شان یہ ہے کہ کفر کے بارے میں شدید ہیں اور ایمان اور مومن کے بارے میں رحیم اور رقیق القلب ہیں''۔یہ ان کے مقامات کو سراہا گیا کہ ان کے قلبی مقامات میں سے دو مقام یہ ہیں کہ ایمان کے روبرو اٹل اور مظبوط اور کفر کے بارے میں بہت شدید ہیں۔کفر کا چھوٹے سے چھوٹا جز یہ بھی آجائے۔اس کے سامنے جھک نہیں سکتے کفر کی ہر چیز کو رد کریں گے،کفر کی چیز سے رضا مندی کا اعلان نہیں کرسکتے،تو یہ ان کے قلبی مقامات کو سراہا گیا آگے فرمایا گیا:

اعمال صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس......﴿تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا﴾ پہلے قلبی مقامات تھے،اب بتلاتے ہیں کہ عمل کیا ہے؟ جب دیکھو رکوع اور سجود میں ہیں۔اللہ کی رضا اور اس کے فضل کو ڈھونڈرہے ہیں۔جب دیکھو عبادت اور طاعت میں ہیں:﴿سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾② جب کوئی ظرف بھر جاتا ہے تو بھر کر چھلکنے لگتا ہے۔بھر کر وہ شی اس کے اوپر آجاتی ہے۔تو اس درجہ صحابہ کے قلوب میں ایمان بھر چکا ہے کہ چھلک کر ان کی پیشانیوں پر نمایاں ہوگیا۔سجدے کے آثار ان کی پیشانیوں پر ہیں۔ان کو دیکھ کر ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ ان کی پیشانی ہر وقت اللہ کے سامنے جھکی رہتی ہے۔ہر وقت یہ حق تعالیٰ کے سامنے ناک رگڑتے ہیں۔یہ تو عمل بتلا دیا گیا۔﴿ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ﴾ ③ ان کی شانیں تو راۃ وانجیل میں بیان کردی گئی ہیں تو پہلے سے انبیاء انہیں سراہتے ہوئے آرہے ہیں۔انبیاء علیہم السلام نے ان کو الگ سراہا۔خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو الگ سراہا۔حق تعالیٰ نے قرآن میں الگ سراہا اور دوامی رضا کا اعلان کردیا کہ یہ طبقہ یقیناً کھوٹ سے بری ہے،نیتوں کی خرابی سے بری ہے۔

خطاءِ فکری......کوئی اجتہادی خطا اور غلطی ہوجائے وہ ہوسکتی ہے خطاء اجتہادی تو انبیا سے بھی ممکن ہے وہ فکری خطا

---

① پارہ: ۲۶،سورۃ الفتح،الآیۃ: ۲۹۔ ② پارہ: ۲۶،سورۃ الفتح،الآیۃ: ۲۹۔ ③ پارہ: ۲۶،سورۃ الفتح،الآیۃ: ۲۹۔

ہوتی ہے اس کو معصیت نہیں کہتے فرق اتنا ہے کہ نبی اگر خطاء اجتہادی کرتے ہیں تو حق تعالیٰ انہیں فوراً صواب تک پہنچا دیتے ہیں۔ غیر نبی اگر خطا اجتہادی کرے وہ اس کے اوپر باقی رہ سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ صواب پر آئے۔ مگر اس کی خطا پر بھی اسے اجر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ فکر کی خطا ہوتی ہے۔ نیت اور ارادے کی خطا نہیں ہوتی۔ صورت عمل کی خطا ہوتی ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی نیتیں پاک اور مقدس ہیں۔ اسی طرح سے صحابہ کرام کے بارے میں بھی فرمایا گیا کہ عمل بھی پاک اور قلبی مقامات بھی پاک، کوئی ان میں کھوٹ نہیں ہے نیتیں بھی مقدس ہیں، ارادے بھی مقدس ہیں، فکری طور پر یا اجتہادی خطا واقع ہو یہ بڑے سے بڑے کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ یہ کوئی معصیت نہیں، کوئی برائی نہیں۔

اس سے تو زیادہ سے زیادہ مخلوقیت ثابت ہوتی ہے۔ علم الٰہی ہے جو ہر قسم کی خطا سے بری ہے لیکن مخلوق کے علم میں خطا کا آجانا ممکن ہے۔ تو مخلوق ہونا تو کوئی برائی کی بات نہیں ہے، انبیاء بھی مخلوق ہیں، ملائکہ بھی مخلوق ہیں۔ اولیاء بھی مخلوق ہیں، تو مخلوق ہونا عیب نہیں ہے۔ تو اتنا تو ہے کہ وہ بے شک مخلوق ہیں، لیکن مخلوق ہونے کے بعد ان کا ظاہر و باطن ان کا قلب و قالب مقدس ہے۔

تقدیسِ قلب..... ممکن تھا کوئی یوں کہتا کہ دلوں کے اندر خرابی ہوگی یہ تو ظاہری اعمال ہیں۔ تو قرآن کریم نے اس کا بھی رد کر دیا، فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ﴾ ① ''اللہ نے پہلے ہی ان کے قلوب کا امتحان کر لیا تھا۔ تقویٰ کے معیار پر انکے قلوب کو جانچ لیا تھا۔ یہ پختہ نکلے۔'' ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ﴾. ''یہ سب کے سب بزرگ اور مقدس ہیں۔ رشد و ہدایت لئے ہوئے ہیں۔'' ﴿فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً﴾ ''یہ اللہ کی طرف سے اس کا فضل ہے اور اس کی بڑی نعمت ہے''۔

تو قلب کو الگ سراہا گیا۔ قالب کو الگ سراہا گیا۔ قلبی مقامات، قالب کے افعال کو الگ سراہا گیا اور طبقے کو الگ۔

شرفِ صحابیّت..... اس وجہ سے اہل السنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ ''اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ'' سارے صحابہ متقی پاکباز اور مقدس ہیں۔ امت میں کوئی بڑے سے بڑا قطب، شیخ، ولی اور کامل گزرے مگر صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جو رفعت مقام ہے۔ وہ بڑے سے بڑے قطب اور غوث کو نصیب نہیں۔ اس واسطے کہ صحابی وہ ہے جس نے اپنی آنکھ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کیا ہے۔ اپنے کانوں سے بلاواسطہ کلام مقدس کو سنا ہے یہ شرف غیر صحابی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ تو بلاواسطہ آفتاب نبوت کا نور جس طبقے نے لیا ہے۔ جو تیزی اس میں ہوگی بالواسطہ نور میں وہ تیزی نہیں ہو سکتی۔ وسائط کے سبب سے کچھ نہ کچھ پھیکا پن ضرور آئے گا، سب سے پہلے ایمان کا اثر اور نقش جو پڑا ہے۔ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلب پر پڑا ہے بلاواسطہ کسب فیض کیا، اور فیض صحبت حاصل کیا۔ تو نگاہیں بھی مقدس تھیں ان کے کان اور ساعتیں اور زبانیں بھی مقدس ہو گئیں اور ان کی ترقی قلوب ہو گئی۔

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳۔

ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ انہوں نے اپنی ہر قوت کا مصرف یہ سمجھا کہ ان کے ذریعہ اللہ کے رسول کے ساتھ رضامندی کا اظہار کرتے جائیں یہی ان کا دین یہی ان کا ایمان ہے۔

عشق صحابہ رضی اللہ عنہم...... حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوئی تو ایک صحابی ہیں، وہ عوام صحابہ رضی اللہ عنہ میں سے ہیں، یعنی خواص میں سے نہیں ہیں کہ فقہاء وعلماء صحابہ میں سے ہوں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ تو اس دور میں عوام میں تھے مگر صحابی ہیں تو کھیت میں ہل چلا رہے تھے، تو کسی خبر دینے والے نے خبر دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، ایک دم ہل روک کر ششدر اور حیران رہ گئے! کہا: وفات ہوگئی؟ کہا کہ: ہاں! وفات ہوگئی۔ بس ہل چھوڑ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور کہا کہ: "اے اللہ! یہ آنکھیں اس لئے تھیں کہ تیرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کریں یہ کان اس لئے تھے کہ تیرے مقدس رسول کی آواز سنیں اور جب رسول دنیا میں نہیں تو میری بینائی بھی ختم کردے اور میری سماعت بھی ختم کردے اب میں نہ کسی کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں، نہ کسی کی آواز سننا چاہتا ہوں"۔

مستجاب الدعوات تھے۔ اسی وقت دعا قبول ہوگئی اور اسی وقت نابینا ہوگئے اور اسی وقت بہرے ہوگئے کہ کوئی لفظ سن نہیں سکتے تھے، یہ گویا انتہائی محبت تھی کہ انہوں نے اپنی آنکھوں کا مصرف دیدار نبوی سمجھا ہوا تھا۔ کانوں کا مصرف یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنیں، اور کوئی مصرف نہ تھا۔

یہ انتہائی کمال ولایت اور قرب مع اللہ اور نسبت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ تمام اعضاء وقویٰ بدن کی آخری۔ غایت اللہ اور اس کا رسول رہ جائے، کان ہوں تو ان کا مصرف یہ ہے کہ اللہ ورسول کی باتیں سنیں، آنکھ ہو تو اس کا مصرف یہ ہو کہ اللہ کے رسول کا دیدار کرے، ہاتھ اس لئے ہوں کہ اس سے اللہ اور رسول کے آثار کو چھوئیں، قرآن پر ہاتھ رکھیں حدیث پر ہاتھ رکھیں دینی کتابیں اور دینی مکانات پر ہاتھ رکھیں۔ بیت اللہ کے پردوں پر ہاتھ رکھیں گویا ہاتھ کا مصرف یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کو چھوئیں جو اللہ ورسول کے نام لگی ہوئی ہیں۔

وہ کسی عارف نے کہا ہے کہ:

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است	افتم بپائے خود کہ بکوئے تو رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دستِ خویش را	او دامنت گرفتہ بسوئے ام کشیدہ است

عارف کہتا ہے کہ: مجھے اپنی آنکھ پر ناز ہے، مگر اس لئے ناز نہیں کہ میری آنکھ ہے، اس لئے ناز ہے کہ وہ تیرا جمال دیکھنے والی ہے، نہ اس لئے کہ وہ میری آنکھ ہے اس لئے کہ وہ تیری دیدار کنندہ ہے، اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے قدموں پر سر رکھدوں۔ اپنے قدموں کی تعظیم کروں نہ اس لئے کہ میرے قدم ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ قدم مجھے تیرے کوچے کی طرف کھینچ کر لے گئے ہیں۔ تیری مسجد اور بیت اللہ کی طرف دینی احکامات کی طرف، دینی چیزوں کی طرف، یہ قدم مجھے کھینچ کر لے گئے ہیں۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے قدموں میں اپنا سر ڈالدوں۔ مجھے

قدموں سے محبت ہوگئی ہے، یہ تجھ تک پہنچنے کا واسطہ بن گئے ہیں۔

اور میرا جی چاہتا ہے کہ ہر دم اپنے ہاتھوں کو چومے جاؤں، نہ اس لئے کہ میرے ہاتھ ہیں، بلکہ اس لئے کہ تیرا دامن پکڑ کر تجھے میری طرف لے آتے ہیں اور قرب کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ تو کمال ولایت یہ ہے کہ آدمی اپنی ہر قوت کو ہر عضو کو ہر ملکے کو حق تعالیٰ تک پہنچنے کا اور اللہ کے رسول تک پہنچنے کا واسطہ بنائے۔ صحابہ میں عوام صحابہ کو یہ مرتبہ نصیب تھا۔ صحابہ کے بعد پچاسوں برس کی محنت اور ریاضت کے بعد کہیں یہ مسئلہ آدمی کے سامنے حل ہوتا ہے کہ میرے جسم اور میری روح کی غرض و غایت اللہ اور اس کا رسول ہے۔ بیسیوں برس کی محنت ترک لذات اور مجاہدوں کے بعد کہیں اس مقام تک پہنچتا ہے، مگر صحابہ کی یہ بات ہے کہ عوام صحابہ پہلے ہی قدم پر اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں کہ دنیا تو دنیا اگر ہماری ذات کا بھی مصرف ہے تو اللہ و رسول ہے۔ اس کے سوا کوئی چیز نہیں، غرض اس طبقے کی تقدیس فرمائی گئی۔ اور اس طبقہ کو مقدس ترین طبقہ کہا گیا۔

معیارِ ایمان و عمل...... اسی واسطے اہلسنت والجماعت کا یہ مذہب ہو گیا کہ: ''اَلصَّحَابَةُ کُلُّهُمْ عُدُوْلٌ.'' ''سارے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین متقن، عادل اور پاکباز ہیں۔''

اور ہماری ہر تنقید سے بالاتر ہیں۔ ہماری ہر حالت سے اونچے ہیں۔ ہمارا فرض ہوگا کہ ان کو سامنے رکھ کر اپنے ایمانوں کو پرکھیں۔ اگر ان کے ایمان کے مطابق ہو جائے تو ہمارا ایمان درست ہے۔ ورنہ غلط ہے ہم ان کے اعمال کو کسوٹی کے طور پر سامنے رکھیں اگر ہمارا عمل ان کے عمل پر منطبق ہو گیا تو سیدھا۔ ورنہ ہمارے عمل میں کھوٹ ہے وہ ہمارے عمل کے حق و باطل کو پرکھنے اور پہچاننے کے معیار اور کسوٹی ہیں۔ اسی طرح ہمارے ایمانوں کو پہچاننے کا معیار ہیں۔ اس لئے کہ سب سے پہلے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے راوی ہیں اگر ان میں معاذ اللہ کوئی خرابی ہے تو پھر ہمارے دین کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر بنیاد میں خرابی پڑے تو ہم پھر صحیح ایمان نہیں لا سکتے۔ ہمارا ایمان تو انہی کے قدموں کے صدقے ہے اگر وہ صحیح ایمان لائے ہیں تو ہمارے پاس صحیح ہے اگر انہوں نے کوئی معاذ اللہ غلطی کی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ بعد والوں کے ایمان درست ہوں۔ تو درحقیقت وہ ہمارے ایمان کے پہچاننے کے لئے ایک کسوٹی ہیں۔ ہمارے علم اور عمل کے صحیح اور درست ہونے کے لئے۔ اس لئے کہ علم کی روایت بھی انہوں نے اللہ کے رسول سے کی ہے اور عمل کی روایت بھی انہوں نے ہی کی ہے۔

اسوۂ علم و عمل...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے یہ فرمایا گیا کہ: آپ اللہ کی طرف سے علم لے کر آئے ہیں۔ سچا اور قطعی علم لا کے امت کے سامنے پیش کیا۔ اسی طرح عمل کے نمونے بھی اللہ کی طرف سے آپ ہی لے کر آئے ہیں۔ ان نمونوں کو دیکھ کر امت نے عمل کا نمونہ سیکھا، اگر علم محض دے دیا جاتا اور عمل کا نمونہ سامنے نہ آتا تو جس شخص کا جیسا جی چاہتا عمل کا نمونہ اختیار کر لیتا۔ نماز کا حکم دے دیا جاتا، مگر نماز کا ڈھنگ عمل کر کے نہ بتلایا جاتا تو میں اپنی ڈھنگ کی نماز پڑھتا۔ آپ اپنی روش کی نماز پڑھتے۔ ایک نماز کی لاکھوں نمازیں بن جاتیں، لیکن اللہ کے

رسول نے جہاں علم دیا، جہاں نماز کا آرڈر دیا وہاں نماز کا نمونہ بھی دیا۔ اسی واسطے آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ: "صَلُّوْا" اے لوگو! نماز پڑھا کرو، یہ فرمایا کہ: "صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ" ① "نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو"۔

یعنی نماز کے صحیح ہونے کا نمونہ میں ہوں اسی ڈھنگ کی پڑھو۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ: "تَوَضَّأُوْا" اے لوگو وضو کرلیا کرو، جس طرح تمہارا جی چاہے۔ وضو کا آرڈر بھی دیا اور وضو کر کے بھی دکھلایا کہ یوں کرو۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو تمام اعضاء کو ایک ایک دفعہ دھویا، فرمایا:

هٰذَا وُضُوْءٌ لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ الصَّلٰوةَ اِلَّا بِهٖ. ② "یہ وہ وضو ہے جس کے بغیر نماز ہی نہیں قبول ہوگی"۔

یعنی اگر ایک دفعہ بھی اعضاء وضو نہ دھوئے جائیں تو وضو نہیں ہوتا تو پھر نماز کیسے ہوتی۔ یہ تو وہ وضو ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوگی۔

اس کے بعد دوبارہ وضو کیا اور ہر عضو کو دو مرتبہ دھویا۔ ہاتھ بھی دو مرتبہ دھوئے، کلی بھی دو مرتبہ کی، ناک میں پانی دو مرتبہ اور منہ بھی دو مرتبہ دھویا فرمایا کہ: یہ وہ وضو ہے جو نورٌ علٰی نور ہے۔ ایک نور ایک دفعہ دھونے میں دوسرا نور دوسری دفعہ کے دھونے میں۔

پھر تیسری دفعہ وضو کیا اور اس میں تمام اعضاء وضو کو تین مرتبہ دھویا اور فرمایا کہ: هٰذَا وُضُوْئِیْ وَوُضُوْءُ الْاَنْبِیَآءِ مِنْ قَبْلِیْ. "یہ میرا وضو ہے اور میرے سے پہلے سارے پیغمبروں کا یہی وضو ہے"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آرڈر نہیں دیا کہ وضو کرو، یعنی جیسے تم علم میں مختار نہیں ہو کہ جب چاہو تم اپنی طرف سے گھڑ لو، عمل کے نمونے میں بھی آزاد نہیں کہ جیسا چاہو نمونہ بنالو اس میں بھی اللہ کے رسول کی پابندی کرنی پڑے گی۔

اسوۂ نبی کی احتیاج...... حدیث میں واقعہ آتا ہے، حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ کا، جو صحابی ہیں، رمضان شریف کے بارے میں آیت نازل ہوئی: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ ③

فرمایا گیا کہ: "کھاؤ اور پیو جب تک کھل کر نمایاں نہ ہو جائے، سیاہ ڈورا سفید ڈورے سے یعنی متمیز نہ ہو جائے اور الگ پہچان نہ ہو جائے، اس وقت تک کھانے پینے کی اجازت ہے۔" مطلب یہ ہے کہ رات جب جانے لگے، سپیدی کا تاگہ جب نمودار ہو جائے اور صبح صادق ہوگئی اب کھانا پینا بند کر دو، روزے کی نیت کرلو۔ رات میں کھانے کی اجازت ہے اور جہاں پو پھٹی اب کھانا پینا ممنوع ہوگیا۔ تو "خیط ابیض" یعنی سفید ڈورا صبح صادق کی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة ج: ٣ ص: ٧ رقم: ٥٩٥.

② السنن الکبری للبیهقی، کتاب الطهاره، باب فضل التکرار فی الوضوء، ج: ١، ص: ٨٠، رقم ٣٨٤. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحیحة باب ٢٦، ج: ١ ص: ٢٦٠. ③ پارہ: ٢، سورة البقرة، الآیة: ١٨٧.

لکیر کو کہا گیا ہے اور سیاہ ڈورارات کی لکیر کو کہا گیا۔

حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے ایک دوڑا تو سفید رکھا اور ایک ڈورا سیاہ رنگوایا اور تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور کھانا پینا جاری ہے، تکیہ اٹھا کر دونوں کو دیکھ لیتے ہیں کہ جب یہ ڈورے الگ پہچانے جائیں گے، تب کھانا پینا بند کروں گا، تو صبح صادق کب کی ہوگئی، چاندنا بھی ہوگیا مگر اتنا چاندنا نہیں ہوا تھا کہ ڈورے الگ نمایاں ہو جائیں، تو صبح صادق گزر رہے ہوئے بیس منٹ گزر گئے اور یہ اپنا کھا پی رہے ہیں کہ جب تک ڈورے الگ الگ نمایاں نہیں ہوں گے، کھانے پینے کی اجازت سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ اطلاع ہوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم کیا کرتے ہو؟ روزے کی نیت کب کرتے ہو؟

انہوں نے عرض کیا : یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ: کھاؤ پیو جب تک سفید ڈور کی سیاہ ڈورے سے الگ پہچان نہ ہو جائے۔ یارسول اللہ! میں نے دو ڈورے تکئے کے نیچے رکھ رکھے ہیں، ایک کالا ڈورا ایک سفید ڈورا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِیْضٌ'' ''تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے'' کہ کالا ڈورا اور سفید ڈورا دونوں تیرے تکئے کے نیچے آگئے، یعنی رات اور دن دونوں تیرے تکئے کے نیچے آگئے، تیرے تکئے کی بڑائی کا کیا ٹھکانہ ہے؟

بندۂ خدا! کالے ڈورے سے مراد، رات کی سیاہی ہے اور سفید سے مراد صبح صادق کی لکیر ہے، تو تیرا تکیہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے نیچے صبح صادق بھی آگئی اور رات بھی آگئی۔ تب واضح ہوا کہ کالے ڈورے سے مراد خداوندی رات ہے اور سفید ڈورے سے مراد خداوندی صبح صادق ہے تو لغت کے لحاظ سے وہ یہ مطلب سمجھے اور لغت کے لحاظ سے وہ مطلب صحیح تھا، مگر مراد اللہ کی یہ نہیں تھی۔

اب اگر اللہ کا رسول اس مراد کو بیان نہ فرمائے۔ تو عمر بھر وہ اسی غلطی میں مبتلا رہتے، ایک روزہ بھی ان کا صحیح نہ ہوتا، اس لئے واضح ہوا کہ قرآن و حدیث میں ایک لغوی معنی ہوتے ہیں اور ایک ارادی معنی جن کا اللہ و رسول نے ارادہ کیا ہے۔ ایک اس کا ترجمہ ہے اور ایک اس کا مطلب ہے یعنی جیسے تم علم میں مختار نہیں کہ جو چاہو اپنی طرف سے گھڑ لو۔ عمل کے نمونے میں بھی آزاد نہیں ہو کہ جیسا چاہو نمونہ بنالو۔ اس میں اللہ کے رسول کی پابندی کرنی پڑے گی۔

علم و عمل کی مطابقت...... اسی واسطے قرآن کریم میں جہاں یہ فرمایا گیا کہ: یہ قرآن ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ہے، ہر چیز کے لئے یہ تبیان ہے، تبیان دعویٰ مع الدلیل کو کہتے ہیں، یعنی اس میں احکام بھی ہیں اور احکام کے دلائل بھی ہیں، یعنی مدلل دعوؤں اور مدلل مسائل کا مجموعہ ہے۔

اس طرح سے فرمایا کہ: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ① تو قرآن نے جتنے علم کے نمونے

① پارہ ۲۱، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۲۱.

پیش کئے۔اللہ کے رسول نے اتنے ہی عمل کے نمونے پیش کئے۔قرآن میں جو چیز قال کی صورت میں ہے اللہ کے رسول میں وہی چیز حال کی صورت میں ہے۔وہاں قول ہے یہاں عمل ہے تو قول اور عمل دونوں مطابق ہیں آپ جو کچھ عمل کرتے ہیں،قرآن وہی کچھ کہتا ہے،جو کچھ قرآن کہتا ہے وہی آپ عمل کرتے ہیں۔تو علم وعمل کی مطابقت ہے۔

اتباعِ محض ...... یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں اختلافات بہت کم ہیں ، اس لئے کہ جہاں کسی آیت کے مضمون میں انہیں اشکال ہوا وہ اللہ کے رسول کے عمل کو دیکھ لیتے تھے اشکال حل ہو جاتا تھا۔معلوم ہو جاتا تھا کہ اس علم کا مصداق یہ ہے کہ اس عمل کی ہیئت عمل یہ ہے جو اللہ کے رسول نے کر کے دکھلائی۔تو جتنی چیزیں قرآن میں علم کی صورت میں ہیں وہ سب چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عمل کی صورت میں ہیں۔تو آپ نے جہاں یہ فرمایا کہ:''یہ کرو اور یہ نہ کرو'' وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلا دیا کہ جو کرنے کی چیز ہے اس کی ہیئت یہ ہے اور جو بچنے کی صورت ہے تو بچنے کی یہ ہیئت ہے،تو وضو کر کے دکھلایا۔نماز کو کر کے دکھلایا جہاد کو کر کے دکھلایا۔روزے کو کر کے دکھلایا۔شادیاں کر کے دکھلائیں کہ یہ نمونہ ہے۔اور غمی کو کر کے دکھلایا کہ یہ نمونہ ہے، دوستوں سے یہ معاملہ ہے، دشمنوں سے یہ ہے، صلح کا یہ طریقہ ہے، جنگ کا یہ طریقہ ہے۔اصول بتلا دیئے اور ان اصولوں کے مطابق اپنے عمل کا نمونہ پیش کر دیا۔

تو خلوت ہو یا جلوت،انفراد ہو یا اجتماع،جماعتی زندگی ہو یا فردی،سب کے عمل کے نمونے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلا دیئے۔اس واسطے امت کے لئے اتباع ہی اتباع ہو گیا تجویز باقی نہیں رہی تجویز تو تب کریں جب کوئی نمونہ نہ دکھلایا گیا ہو۔سارے نمونے موجود ہیں آگے اتباع رہ جاتا ہے۔گھڑنا یا بنانا یا ساخت کرنا نہ علم کے درجے میں باقی۔علم پورے کا پورا لا کر پیش کر دیا۔شریعت جامع ہے۔اس شریعت پر پورا پورا عمل کر کے دکھلایا تو اتباع باقی رہ جاتا ہے، تجویز امت کا کوئی درجہ باقی نہ رہا۔

تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے سب سے پہلے اتباع کیا،سب سے زیادہ متبع سنت وہی ہیں۔سب سے زیادہ متبع شریعت وہی ہیں۔انہوں نے ہر نمونے کو اللہ کے رسول سے روایت کیا۔تو قرآن کریم کی عملی روایت بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے چلی اور اس کی روایت بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے چلی۔عمل بھی کر کے دکھلاتے رہے۔صحابہ رضی اللہ عنہم پھر تابعین اس کے بعد تبع تابعین۔

فرائضِ رسالت......قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چار وظیفے ہیں:﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ [1] اللہ نے رسول بھیجا۔اس کی کیا شان ہے؟ اللہ کے رسول نے چار کام کئے، پہلے تلاوت آیات کی یعنی بلاکم وکاست، وحی کے الفاظ جو اللہ نے آپ کے قلب مبارک پر نازل کئے پڑھ کر سنا دیئے۔اس کے بعد تعلیم دی۔تعلیم تلاوت

[1] پارہ:۲۸،سورۃ الجمعۃ،الآیۃ:۲.

سے الگ ہے، تلاوت کا تعلق لفظوں سے ہوتا ہے۔ تعلیم کا تعلق معانی سے ہوتا ہے، یعنی پہلے لفظ سنائے، پھر معانی سمجھائے کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے۔ اس کے بعد پھر تعلیم حکمت کی اور حکمت سے مراد یہاں اسوہ حسنہ ہے، یعنی کر کے دکھلایا۔ اس لئے کہ حکمت کی دو قسمیں ہیں ایک حکمت نظری اور ایک حکمت عملی۔ حکمت نظری تو تعلیم میں آ گئی کہ نظر وفکر کی چیز تھی علمی صورت میں آپ نے بتلا دی، اب عملی صورت رہ جاتی تھی۔ اس کو حکمت سے تعبیر کیا کہ عمل کا نمونہ پیش کر دیا تو علم بھی سکھلایا اور عمل کا نمونہ بھی دکھلایا۔

تزکیہ قلوب...... اس کے بعد چوتھی چیز بتلائی "وَيُزَكِّيْهِمْ" دلوں کے مانجھنا اور ان کو صاف کرنا یہ بھی آپ کا ایک وظیفہ ہے، امت کا تزکیہ فرمانا اور ان نفوس میں استقامت پیدا کرنا، زیغ کجی اور ٹیڑھ نکال دیں، فہم کی ایسی سلامتی پیدا کریں کہ جب اللہ کی آیات پڑھی جائیں تو آدمی ٹھیک وہ مطلب سمجھے جو اللہ کی مراد ہے۔ دل صحیح راستہ پر پڑ جائے۔

اس واسطے کہ اگر دل میں ٹیڑھ رہ جاتی ہے تو صحیح سے صحیح کلام کا مطلب بھی ٹیڑھا سمجھتا ہے۔ سمجھ کا دار و مدار دل پر ہے اور دل کا راستہ غلط ہو تو ہر مکتوب غلط ہو جائے گا۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص کے دل میں خدانخواستہ یہودیت بھری ہوئی ہے وہ قرآن کو پڑھے گا تو ساری آیتوں میں سے یہودیت نکالنا شروع کر دے گا، اسے یوں معلوم ہوگا کہ سارا قرآن یہودیت سکھلانے کے لئے آیا ہے۔ نصرانی ذہنیت ہے تو ہر آیت میں سے اسے نصرانیت نکلتی ہوئی معلوم ہوگی۔ اگر قادیانی ذہنیت ہے تو ہر آیت میں سے اسے قادیانیت نکلتی ہوئی معلوم ہوگی۔ کوئی اور نظریہ مکتب فکر لے لیجئے۔ جو مکتب فکر بنا ہوا ہوگا ویسا ہی آدمی ہر آیت ہر روایت سے مطلب سمجھے گا تو سمجھنے کا دار و مدار دل پر ہے۔ اگر دل میں صحیح سلامتی پیدا کی جائے تو آدمی ٹھیک مطلب سمجھے گا اور اگر دل ٹیڑھا ہے تو ہر چیز ٹیڑھی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط تعلیم ہی نہیں دی۔ فقط مطالب ہی نہیں بتلائے بلکہ دلوں کا رستہ بھی سیدھا کیا تاکہ سیدھا مطلب سیدھے دل میں اتر جائے گھر کر جائے۔ اگر دلوں میں ٹیڑھ رہ گئی تو یقیناً مطلب بھی ٹیڑھا بن جائے گا۔

عمل کی نگرانی...... تو آپ نے تزکیہ بھی کیا اور عمل کی نگرانی بھی کی۔ ایک طرف مسائل سکھلائے اور ایک طرف عمل دیکھتے تھے کہ آیا صحابہ کا عمل اس کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو نگرانی فرماتے تھے۔

(۱) حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نگرانی کرتے ہوئے گھومے تو آپ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مکان سے گزرے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تلاوت میں مشغول تھے اور اتنی آہستہ تلاوت کر رہے تھے کہ کان لگا کے سنا جائے تو سننے میں آتی تھی ورنہ سننے میں نہیں آتی تھی۔ آپ آگے پہنچے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مکان سے گزرے وہ اتنے زور زور سے قرآن پڑھ رہے تھے کہ سارا محلہ گونج رہا تھا۔

صبح کو جب یہ حضرات دربار نبوی میں جمع ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تم اتنا آہستہ

---

(۱) السنن لابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب فی رفع الصوت بالقراۃ فی صلوۃ اللیل، ج:۲ ص:۳۷ رقم ۱۳۲۹۔
حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح ابی داؤد ج: ۳ ص: ۳۲۹ رقم: ۱۳۲۹۔

کیوں پڑھتے تھے کہ کوئی دوسرا نہ سن سکے' کان لگائے تو مشکل سے سننے میں آئے عرض کیا، یارسول اللہ میں اسے سنا رہا تھا جو نہ بہرہ ہے نہ مجھ سے غائب ہے، یعنی اللہ رب العزت، تو مجھے زور زور سے پڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو میرے دل کی کھٹک سے بھی واقف ہے: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ''مجھے ضرورت نہیں تھی کہ میں زور زور سے آواز اٹھاؤں''۔ ''لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَآئِبًا۔'' تم جو پکار رہے ہو نہ بہرے کو پکار رہے ہو نہ غائب کو پکار رہے ہو وہ تو ہر وقت حاضر وناظر ہے اور شنوا وبینا اور سمیع وبصیر ہے۔ اس واسطے میں آہستہ پڑھتا تھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم اتنا زور زور سے کیوں پڑھ رہے تھے؟ عرض کیا: ''اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاُطْرِدُ الشَّيْطَانَ''

زور زور سے پڑھ کر سوتے ہوؤں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا، کہ اس کوچے میں نہ آنے پائے قرآن کی آواز سن کر دور سے بھاگ جائے۔ تو دونوں کے پاس ایک حجت تھی اور دونوں کے قلب کا ایک مقام تھا۔ اپنے مقام کے مطابق ہر ایک کا عمل سچا اور حق تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تم ذرا آواز کو پستی سے بلند کردو اور، اے عمر! تم ذرا رفعت سے پستی کی طرف آؤ، تاکہ اعتدال قائم ہو جائے۔ دونوں نقطہ اعتدال پر آجاؤ، ظاہر بات ہے کہ یہ نگرانی تھی، یہ قلب کی راہیں درست کرنا تھا۔

غرض مجاہدہ...... یہ کوئی جائز وناجائز کا مسئلہ نہیں تھا، آہستہ پڑھنا بھی جائز ہے اور پکار کر پڑھنا بھی جائز ہے، یہاں جائز وناجائز کی بحث نہیں تھی۔ یہاں قلب کو راہ اعتدال پر لانے کی بحث تھی۔ یہ چیز قلبی مقامات سے متعلق ہے، مسائل سے نہیں بلکہ مقامات باطن سے متعلق تھی تو جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم سکھلایا۔ مسائل بتلائے وہاں دلوں کو مانجھا بھی اور صاف بھی کیا۔ مجاہدے اور ریاضتیں کرا کر اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت بھری، تاکہ دنیا کی محبتیں قلب سے نکل جائیں تو کہیں جہاد، کہیں مجاہدہ اور کہیں راتوں کے تہجد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قدر راتوں کو تہجد میں راسخ القدم بن کے اتنا کھڑے رہتے تھے کہ پیروں پر ورم آجاتا تھا، یہ محنتیں اور مجاہدے کس لئے تھے؟ تاکہ نفس کی مرغوبات ختم ہو کر روح کی مرغوبات سامنے آجائیں، قلب کے اندر محبت الٰہی جاگزیں ہو جائے اور راسخ ہو جائے، اب دنیا کا کام بھی کریں تو اللہ کے لئے کریں، نفس کے لئے نہ کریں، تو نفس کی راہوں کو بند کر کے قلب اور روح کی راہیں ان کے سامنے کھول دیں کوئی عمل بند نہیں کیا۔

فرق عمل...... اعمال جو ایک عامی آدمی کرتا ہے، وہی ایک ولی بھی کرتا ہے، فرق ہوتا ہے قلب کے راستے میں اس کا کرنا لوجہ اللہ ہوتا ہے، اور اس کا لوجہ النفس ہوتا ہے، عمل دونوں کا برابر ہے۔ کھاتا یہ بھی ہے اور ایک ولی بھی کھاتا ہے، بازار میں یہ بھی جاتا ہے اور ایک ولی کامل بھی بازار جاتا ہے، صورت عمل میں تو فرق نہیں مگر نیت عمل اور غرض وغایت عمل میں فرق ہے تو باطن کا فرق ہوتا ہے آپ نے قلوب کو صاف کر کے باطن کو مانجھ دیا کہ جو کچھ کریں لوجہ النفس نہ رہے، لوجہ اللہ ہو جائے۔ دوستی ہو یا دشمنی، محبت ہو یا عداوت خالص اللہ کے لئے ہو جائے۔

اخلاص عمل...... حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ سیر کی کتب میں مشہور ہے کہ آپ نے غزوہ بدر میں ابوجہل کو پچھاڑ

دیا اور ارادہ کیا کہ خنجر لے کر اسے ذبح کر دیں۔ اس نے غصہ میں آ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھوک دیا، بس خنجر چھوڑ کر کھڑے ہو گئے قتل سے باز آ گئے کہ اب نہیں قتل کروں گا۔

ابو جہل نے کہا: اے علی! میں تو تم کو دانشمند سمجھتا تھا۔ میں تمہارا بھی دشمن، تمہارے رسول کا بھی دشمن اور تمہارے دین کا بھی دشمن۔ ایک منٹ کے لئے میں نہیں چاہتا کہ تمہارا دین اس دنیا میں باقی رہے تم یا تمہارے رسول باقی رہیں اتنے بڑے دشمن پر قابو پا کر اسے چھوڑ دینا یہ کونسی دانشمندی ہے؟ تم نے کیوں نہیں مجھے قتل کیا۔

فرمایا کہ: میں تجھے اللہ کے لئے قتل کرنے بیٹھا تھا۔ میری کوئی ذاتی لڑائی تجھ سے نہیں، کوئی ذاتی بغض نہیں۔ اللہ کی وجہ سے عداوت تھی اور یہ ساری لڑائی بھڑائی اللہ کی وجہ سے تھی۔ جب تو نے میرے منہ پر تھوکا تو میرے نفس میں غصہ پیدا ہو گیا، اب اگر میں قتل کرتا تو نفسانی جذبات سے قتل کرتا تو میری عبادت شرک میں بدل جاتی۔ میری توحید، توحید باقی نہ رہتی۔ اس واسطے میں قتل سے باز آ گیا۔ اس لئے کہ یہ قتل و غارت نفسانی جذبے سے نہیں رحمانی جذبے سے ہے۔ جب نفس میں غضب پیدا ہو گیا۔ تو اب قتل کرنا نفس کی راہنمائی سے ہوتا خدا کی راہنمائی سے نہ ہوتا۔ لوجہ اللہ نہ ہوتا، لوجہ النفس ہوتا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کا جو کچھ عمل تھا وہ اللہ کے لئے تھا، نفس کے لئے نہ تھا۔

حقیقتِ ولایت...... یہ دولت حضرات صحابہ کرام کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تزکیہ سے نصیب ہوئی۔ آپ نے ریاضتیں اور مجاہدے کرا کر دلوں کو مانجھا اور دلوں کی راہ درست کی نیتیں بھی صاف۔ منزلیں بھی صاف، غرض و غایت بھی درست، ہر عمل کھانا پینا، سونا جاگنا اللہ کے لئے ہو گیا۔ ان کی جوتیوں کی برکت ہے کہ اولیاء کرام میں بھی یہ چیزیں آئیں۔ ولایت کہتے ہی اس کو ہیں کہ قلب کا راستہ درست ہو جائے۔ ولایت کے یہ معنی نہیں کہ آدمی کھانا چھوڑ دے، لباس چھوڑ دے، گھر بار ڈھا دے، گھر میں رہنا سہنا ترک کر دے، ولی کے معنی یہ ہیں کہ گھر میں رہے مگر حظِ نفس کے لئے نہیں۔ خدا کی رضا کے لئے، کھانا کھائے مگر نفس کی لذت کے لئے نہیں، رضائے خداوندی کے لئے۔ ایک ولی اور عامی میں یہی فرق ہوتا ہے تو عمل ولی اور عامی کا ایک ہوتا ہے، مگر قلب کا فرق ہے۔ نیتیں الگ الگ ہوتی ہیں، قلب کے مقامات کا فرق ہوتا ہے، تو اولیاء میں یہی چیز ہوتی ہے کہ وہ ہر بات لوجہ اللہ کرتے ہیں۔

حضرت سہل بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ...... سہل بن عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ یہ اولیائے کاملین میں سے ہیں اور بڑے اونچے رتبے کے اولیاء میں ہیں، حتیٰ کہ اس درجہ کے لوگوں میں ہیں کہ خود سہل بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ: وہ جو حق تعالیٰ نے عالمِ ازل میں عہد لیا تھا ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟'' آدم علیہ السلام کی کمر سے ان کی ساری اولاد نیک و بد نکالی گئی اور سب کو سامنے کر کے حق تعالیٰ نے عہد لیا۔ ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟﴾ ''کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟'' سب نے وہاں عہد کیا کہ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ ہمارے پروردگار ہیں۔ یہ سہل بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس درجے کے لوگوں میں ہیں فرماتے ہیں کہ: ''مجھے آج تک وہ عہد یاد ہے۔ اور وہ مقام بھی یاد ہے جہاں یہ عہد لیا گیا تھا''۔

اس درجہ ان کی روح صاف ہے اور جلا لئے ہوئے ہے کہ عالم ازل کا نقشہ پیدائش کے بعد بھی ان کے ذہن میں تھا۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ مجاہدین کی ایک جماعت جارہی تھی۔ تو ان کا ارادہ ہوا کہ میں بھی جہاد میں شریک ہوں کہ مفت میں ایک اتنی بڑی عبادت ملتی ہے تو ان کے نفس میں تقاضا پیدا ہوا کہ میں جہاد میں شریک ہو جاؤں، لیکن جب نفس میں تقاضا پیدا ہوا تو بیٹھ گئے اور کہا کہ یہ نفس کیوں چاہتا ہے کہ جہاد میں شریک ہوں۔ نفس کو تو جہاد سے بچنا چاہئے تھا نفس چاہے کہ میں عبادت کروں تو نفس تو اس درجے کی چیز نہیں وہ تو عبادت سے روکنے والی چیز ہے۔ ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ ①

نفس تو برائی کا امر کرتا ہے، نہ یہ کہ امر کرے کہ تم نماز پڑھو اور جہاد کرو اور اللہ کی راہ میں جان دے دو۔ نفس کو تو بچنا چاہئے۔ تو نفس میں کیوں یہ تقاضا ہے؟ کوئی مکر پوشیدہ ہے اور نفس کے اندر کوئی کھوٹ ہے غرض بیٹھ گئے اور بیٹھ کر سوچنا شروع کیا کہ آخر نفس کے لئے جہاد کے اندر کیا لذت کا سامان ہے کہ یہ نفس کہہ رہا ہے کہ جہاد میں چلو۔

تو ذہن میں یہ بات آئی کے مجھے چالیس برس روزے رکھتے ہوئے گزر گئے ہیں اور ایک دن بھی چالیس برس میں افطار نہیں کیا اور جہاد میں روزہ رکھ کر شریک ہونا مکروہ ہے، اگر رمضان بھی ہے تو بھی مستحب یہ ہے کہ افطار کرے تا کہ قوت سے جہاد کر سکے۔ بھوکا آدمی جہاد نہیں کر سکے گا۔ تو نفس کی مکاری یہ چھپی ہوئی تھی کہ چالیس برس سے مجھے بھوکا مار رکھا ہے۔ جہاد میں جاؤ گے تو دن میں کھانے کو روٹی تو مل جائے گی۔ یہ مکر پوشیدہ تھا۔ اب کھڑے ہوئے اور کہا اے نفس! میں جہاد میں جاؤں گا اور روزہ رکھ کر جاؤں گا۔ آج (افطار کرنے کے) مستحب کو انجام نہیں دوں گا چاہے مکروہ ہو مگر تجھے ستانا ہے اور تیرا مقابلہ کرنا ہے لہٰذا جہاد بھی کروں گا تو روزہ رکھ کر کروں گا۔ تجھے کھانے کو وہاں نہیں ملے گا۔ اس پر بھی نفس نے کہا تم چلو جاؤ جہاد میں، میں تیار ہوں۔

پھر بیٹھ گئے کہ یا اللہ! یہ نفس میں جہاد کا کیوں تقاضا ہے؟ یہ تقاضا قلب اور روح میں ہونا چاہئے یہ نفس کیوں تقاضا کر رہا ہے اسے تو جہاد سے بچنا چاہئے پھر بیٹھ گئے، غور اور مراقبہ کیا کہ آخر کونسا مکر نفس کے اندر پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے یہ کہہ رہا ہے کہ: جہاد کرو۔

تو سوچتے سوچتے ذہن میں یہ بات آئی کہ چالیس برس سے میں خلوت میں ہوں، آدمی کے نفس کا تقاضا لوگوں سے ملنا جلنا، اُنس و موانست حاصل کرنا ہوتا ہے۔ انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے۔ یہ جانوروں کی طرح بھٹوں میں وحشت زدہ ہو کر الگ الگ نہیں رہتا۔ بستیاں بنا کر رہتا ہے۔ میل جول سے رہتا ہے تا کہ اُنس و موانست پیدا ہو۔ یہ تو اُنس کا بندہ ہے۔ اور اسی واسطے انسان کو انسان کہتے ہیں کہ انسان کا مادہ اُنس ہے جس میں اُنس نہ ہو وہ انسان ہی نہیں۔ تو انسان کا جبلی تقاضا انسیت و موانست ہے کسی عرب کے شاعر نے کہا ہے کہ:

وَمَا سُمِّيَ الْاِنْسَانُ اِلَّا لِاُنْسِهٖ وَمَا الْقَلْبُ اِلَّا اَنَّهٗ يَتَقَلَّبُ

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۳.

انسان کوانسان کہا ہی اسی لئے گیا ہے کہ اس میں انسیت اور موانست کا مادہ موجود ہے۔ جیسے قلب کوقلب اس لئے کہتے ہیں کہ قلب کے معنی لوٹنے پوٹنے کے ہیں۔ قلب میں چوں کہ ہر وقت کا لوٹ پوٹ ہوتا رہتا ہے کبھی یہ جذبہ، کبھی یہ خیال، کبھی یہ ارادہ، اس لئے قلب کوقلب کہتے ہیں۔ تو انسان انسان بنا ہی اس لئے کہ اس میں انس ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ چار آدمیوں کے ساتھ مل کر رہے۔ تنہائی میں اسے وحشت اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ تو چالیس برس سے سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ خلوت میں رہتے تھے۔ نفس چاہتا تھا کہ لوگوں سے مل جل کر رہیں، مگر بچتے تھے۔ تو نفس میں تقاضا جہاد کا ہوا کہ جب جہاد کریں گے تو چار آدمیوں سے ملاقات تو ہوگی۔ یہ جو تنہائی میں مجھے گھوٹ رکھا ہے۔ جہاد میں جا کے یہ تنہائی کی وحشت کچھ تو کم ہوگی۔ ایک خیمہ میں جب جمع ہونگے نو دس آدمی ہوں گے اور تو کچھ بات چیت کرنے کا موقع ملے گا، کسی میدان میں جمع ہوں گے تو ایک دوسرے کے ساتھ موانست حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آئے گا۔ تو یہ جو تنہائی کی وحشت کے ساتھ چالیس برس سے مجھے مار رکھا ہے۔ یہ مار تو ختم ہو جائے گی۔ اس لئے جہاد کا تقاضا پیدا ہوا۔

یہ گویا مکر تھا جو چھپا ہوا تھا۔ تو سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ پھر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ: ''اے نفس! اگر میں جہاد کو بھی جاؤں گا تو کسی شخص کی طرف نہ دیکھوں گا، نہ انس حاصل کروں گا، نہ کسی سے گفتگو کروں گا۔ تجھے خلوت ہی میں رکھوں گا اور تجھے اسی طرح مارنا ہے''۔

نفس نے کہا کہ: یہ بھی منظور ہے اگر تم جہاد کے لئے چلو، اب پھر بیٹھ گئے کہ یا اللہ کون سی ایسی مکاری چھپی ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ نفس جہاد کا تقاضا کر رہا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ: اے اللہ! اس نفس میں ایسا باریک مکر ہے، جو مجھ پر منکشف نہیں ہوتا تو مجھ پر کھولے گا تو واضح ہوگا کہ کیا خباثت ہے اور کیا مکاری ہے جو چھپی ہوئی ہے کہ نفس چاہتا ہے کہ میں شریعت کے اعمال سرانجام دوں۔

ادھر سے الہام ہوا اور اب اصلیت کھلی اور وہ یہ کہ چالیس برس ریاضت اور مجاہدے میں گزر گئے تھے گویا نفس کو مار رکھا تھا ''مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا'' مرنے سے پہلے اسے مار دیا تھا۔ اس کی خواہشات کو کچل دیا تھا۔ اس کی مرضیات کو فنا کر دیا تھا تا کہ مرضی حق حاصل ہو۔ نفس پر یہ چیزیں شاق تھیں، تو نفس میں جہاد کا تقاضا اس لئے تھا کہ میدان میں جائے ایک دفعہ گولی لگے گی تو روز روز کی جھک جھک کا تو خاتمہ ہو جائے گا، بس ایک دفعہ ختم ہو جائیں گے۔ یہ جو روز کی موت ہے، یہ تو ختم ہوگی۔ جو ہونا ہوگا ایک دفعہ ہو جائے گا، ایک دفعہ تلوار پڑے گی، ختم ہو جائیں گے۔ یہ مکر پوشیدہ تھا۔

سہل ابن اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے توبہ کی اور کہا کہ یا اللہ میری نیت درست کر دے، جب نیت درست ہوئی تو جا کر مجاہدین میں شریک ہوئے اور جہاد کے لئے گئے۔

عمل بلا اثر کیہ...... یہ کیا چیز تھی؟ یہ وہی تھا کہ نفس مانجھ کر اس درجہ صیقل بنا لیا تھا اور حقیقی معنوں میں رضاء خداوندی

کا ادراک اور احسان جب تک نفس میں صفائی نہ ہو نہیں ہوسکتا، بعض دفعہ ایک عادت بصورت عبادت ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں عبادت کر رہا ہوں اور وہ نفس کی پرستش ہوتی ہے ایک صاحب باطن بتاتا ہے کہ اس کے اندر کھوٹ ملا ہوا ہے۔ یہ عبادت صحیح نہیں بنی۔ اس سے رضائے حق تعالیٰ حاصل نہیں ہوگی۔ تو اس کا ادراک ہو جانا اور اس کی سمجھ پیدا ہو جانا کہ نفس کی کیا خواہش ہے اور حق تعالیٰ کی کیا مرضی ہے کس جانب کو مجھے جانا چاہئے اور کس جانب کو ترک کرنا چاہئے؟

تو نفس کی باریک باریک خواہشیں اور مکاریاں ہوتی ہیں یہ اس وقت تک منکشف نہیں ہوسکتیں۔ جب تک نفس کے اندر صفائی نہ پیدا ہو۔ جب تک جلاء نہ پیدا ہوا اور نورانیت نہ پیدا ہوا اور یہ نورانیت بغیر مجاہدے اور بغیر ریاضت کے نہیں آسکتی۔ اس واسطے مجاہدے اور ریاضتیں کراتے ہیں تاکہ نفس میں استقامت پیدا ہو سیدھا پن پیدا ہو سلامتی قلب پیدا ہو تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو مجاہدے کرائے گئے ریاضتیں کرائی گئیں۔ اس کے ذریعہ سے ان کے نفوس سے جو شرک کے نزغے تھے۔ وہ نکل گئے۔ وہ جو کج راہی تھی وہ نکل گئی۔ وہ جو غیر اللہ کی محبت میں سرشار تھے۔ وہ محبت ختم ہوئی۔

کمالِ استقامت...... اب انکی محبت تھی تو اللہ کے لئے، عداوت تھی تو اللہ کے لئے، دینا تھا تو اللہ کے لئے، لینا تھا تو اللہ کے لئے۔ کمال ایمان کمال استقامت سے پیدا ہوتا ہے جس کی حدیث میں ایک موقع پر فرمایا گیا: "مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ" "جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے کی، عداوت باندھی تو اللہ کے لئے، کسی کو دیا تو اللہ کیلئے کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے، اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا"۔

تو دنیا میں آدمی جو کچھ بھی عمل کرتا ہے یا بچتا ہے تو اس کا منشاء یا محبت ہوتی ہے یا عداوت۔ جس کام کو آپ کرتے ہیں اگر رغبت ہوگی جب ہی تو آپ کریں گے، اگر نفرت ہوگی تو کیسے کریں گے تو کسی چیز کی رغبت ہونا اس کے کرنے کی دلیل ہے، کرنا اس سے محبت اور مرغوب ہونے کی دلیل ہے جس چیز سے عداوت ہوگی، اس سے آپ بھاگتے ہیں۔

تو کسی چیز کو نہ کرنا اس سے نفرت کی دلیل ہے تو فرمایا گیا کہ: جس نے رغبت کی تو لوجہ اللہ کی۔ نفرت کی تو یوجہ اللہ کی۔ رغبت اور نفرت کا تعلق نفسانی جذبات سے باقی نہ رہے۔ دیا کسی کو تو اللہ کے لئے، نہ دیا تو اللہ کے لئے، جب ہر حرکت اور سکون لوجہ اللہ بن جائے۔ تب کہا جائے گا کہ: نفس کامل ہوگیا۔ اس کا ایمان کامل ہوگیا۔

تفویضِ مطلق...... اس کے معنی اسلام کے ہیں یہی حقیقی اسلام ہے کہ جو کچھ ہو اللہ کے لئے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا گیا تھا: ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ﴾ "اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ"۔

مسلم بننے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ اب تک آپ غیر مسلم تھے، اب اسلام قبول کریں، آپ تو پیغمبر ہیں، مسلم ہونے کے کیا معنی؟ یعنی گردن جھکا دو۔ جو کچھ کرو، ہمارے لئے کرو۔ اپنے نفس کے لئے کچھ مت کرو۔

مسلم بننے کے یہ معنی تھے یعنی تفویض کرنا، اپنے نفس کو سونپ دینا، اللہ کے حوالے کر دینا کہ جس طرح اس کی شریعت الٹ پلٹ کرے، اس طرح الٹ پلٹ ہو جاؤ تمہاری اپنی کوئی مرضی یا تدبیر باقی نہ رہے، تم ایسے بن جاؤ ''کَالْمَيِّتِ فِيْ يَدِ الْغَسَّالِ'' جیسے مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جدھر کو کروٹ دے دے، مردہ یہ نہیں کہتا کہ: مجھے ادھر کو کیوں پلٹ دیا، جدھر کو بٹھا دے، لٹا دے، کروٹ دے دے، میت نہلانے والے کے اختیار میں ہے۔ اس طرح سے آدمی اپنے ارادہ و اختیار سے شریعت کے ہاتھ میں ہو۔ غیر ارادی طور پر تو اب بھی انسان اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اسی کی مرضی سے اس کی حرکت اور سکون ہے، لیکن ارادے سے اپنے آپ کو سونپ دے کہ جدھر کو آپ چاہیں گے ادھر ہی کو میرا ارادہ متوجہ ہو جائے گا۔ یہ اسلام ہے۔ اس کو کہا گیا کہ۔ ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ﴾ ① ''اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ''۔ یعنی اپنے کو ہمارے حوالے کر دو جس طرح ہم الٹیں پلٹیں تم تیار رہو۔ ﴿قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② ''اے اللہ! میں مسلم بن گیا''۔

یعنی میں نے اپنے کو حوالے کر دیا۔ جس طرح سے آپ کا جی چاہے مجھ میں تصرف کریں۔ میری محبت ہوگی تو آپ کے لئے ہوگی۔ عداوت ہوگی تو آپ کی خاطر ہوگی نفس کی خاطر کچھ نہیں ہوگا۔

فرمایا کہ: جب تم مسلم بن گئے اور مان لیا تو دوسری جگہ فرمایا گیا کہ: اب اس اسلام کا اعلان کرو۔ وہ اسلام کیا ہے؟ ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ ③ ''اے ابراہیم! اعلان کر دو کہ میری نماز اور میرا حج میرا مرنا اور میرا جینا سب اللہ کے لئے ہے، میرے اپنے لئے کچھ نہیں''۔

جس کا کوئی شریک نہیں ہے تو میرے ان اعمال میں کوئی شریک نہیں، ایک ہی کی رضا کے لئے کر رہا ہے، چند کی رضا کے لئے نہیں، اور اسی کا مجھے امر کیا گیا ہے اور میں آج کے دور میں اول مسلم ہوں۔

تو اسلام کے معنی یہ نکل آئے کہ نماز بھی ہے تو اللہ کے لئے ہے، حج ہے تو اللہ کے لئے، مرنا ہے تو اللہ کے لئے، جینا ہے تو اللہ کے لئے، یعنی تفویض محض، اپنے آپ کو حوالے کر دینا ہے۔ اسلام کے یہی معنی ہیں کہ آدمی اپنے کو حوالے کر دے کہ نہ اس کی اپنی مرضی باقی رہے نہ اس کی اپنی رضا باقی رہے، رضا ہو تو اللہ کی ہو، ارادہ ہو تو اللہ کا ہو۔

فنائے کلی ...... کسی غلام سے کسی نے پوچھا: تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا کہ: جو آقا کھلا دے۔ کہا: تو کیا پہنے گا؟ اس نے کہا: جو آقا پہنا دے۔ کہا: تو کام کیا کرے گا؟ کہا: آقا جو کام لے لے۔ اس نے کہا کہ: آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا: اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو میں غلام ہی کیوں بنتا!

پھر میں آقا ہی نہ بن جاتا۔ میرے غلام ہونے کے یہ معنی ہیں کہ میری مرضی بھی غلام میری رائے بھی غلام،

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱.

③ پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۲-۱۶۳.

میری خواہش بھی غلام،

اگر خواہش ہے تو آقا کی مرضی ہے تو آقا ہی کے لئے، ارادہ ہے تو آقا کا ہے۔ تو ایک انسان جب غلام بن کر اپنے کو دوسرے کے اس درجے حوالے کر دیتا ہے، حالانکہ دوسرا انسان اس کا خالق نہیں اس کا مالک نہیں، پھر بھی ذرا سے احسان کی بدولت حوالے ہوگیا۔ تو جو محسن حقیقی جو اللہ رب العزت ہیں، جس کا دعویٰ کیا ہے کہ میں اس کا غلام اور بندہ ہوں۔ اس کا بندہ بھی بنے اور تجویز بھی اپنی پیش کرے۔ اس کا بندہ بھی بنے اور اس کے سامنے پھر رائے بھی رکھے۔ یہ بندگی نہیں، دعویٰ بندگی ہے اور وہ غلط ہے۔ بندگی یہ ہے کہ کَالْمَیِّتِ فِیْ یَدِالْغَسَّالِ مرضی حق کے تابع ہونا ہے۔

مرضی حق ...... آج دنیا میں لوگ اللہ کو اپنے تابع کرنا چاہتے ہیں۔ خود اس کے تابع ہونا نہیں چاہتے۔ مرضی سوچ لیتے ہیں کہ ایسا ہو، استفتاء بھی کریں گے تو اس نیت سے کہ ہماری مرضی کے مطابق فتویٰ ہو اگر رائے بھی پوچھیں گے تو اس نیت سے کہ جو ہم چاہیں گے وہ تو اپنی جگہ قائم رہے اور دعاء بھی ہو تو اسی کے تابع ہو فتویٰ بھی ہو تو اسی کے تابع ہو۔ یہ تو اللہ کو تابع بنانا ہے۔ تو دعویٰ تو اپنے تابع ہونے کا ہے اور آدمی متبوع بن گیا اور چاہتا ہے کہ خدا اس کے تابع ہو تو یہ چلنے والی بات نہیں۔ تفویض کے بھی خلاف ہے اور اسلام کے بھی خلاف ہے مسلم ہونے کے تو یہ معنی ہیں کہ میں تابع ہوں مرضی حق کے میری مرضی کوئی چیز نہیں۔ فنائے مرضی ہی کا نام اسلام ہے فنائے خواہش ہی کا نام اسلام ہے اگر ہم میں ہماری مرضی زندہ ہے تو مسلم کب ہیں؟ اور اگر خواہش زندہ ہے تو حقیقی معنی میں مسلم کب ہیں؟ اس لئے فرمایا گیا کہ: اسلام یہ ہے کہ اپنے کو سونپ دو اور حوالے کر دو، یہ زندگی اگر صحیح معنی میں دیکھی گئی تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دیکھی گئی، اگر ان کی آنکھ اس چیز کو دیکھ رہی ہے اور اللہ و رسول اس کو کوئی اور چیز کہلوانا چاہیں تو آنکھ کو بے تکلف جھٹلانے پر تیار تھے مگر مرضی حق کو جھٹلانے کو تیار نہ تھے۔

① حدیث میں ہے کہ حجتہ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: "اَیُّ یَوْمٍ ھٰذَا؟" "یہ کون سا دن ہے؟"۔

سب جانتے تھے کہ ۹ رذی الحج ہے۔ عرفہ کا دن ہے۔ حج میں جمع ہیں۔ تو سیدھا جواب یہ تھا کہ یوم عرفہ ہے، جواب کیا دیتے ہیں: "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "اَیُّ بَلَدٍ ھٰذَا؟" "مکہ مکرمہ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ کون سا شہر ہے؟"۔

سب جانتے تھے کہ مکہ ہے، جواب یہ ہوتا کہ "مکہ" ہے مگر جواب کیا دیتے ہیں: "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" "اللہ و رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ کون سا شہر ہے"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَیُّ شَھْرٍ ھٰذَا؟" "یہ کون سا مہینہ ہے؟"۔ سب جانتے تھے کہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے جواب دے دیتے کہ ذی الحجہ ہے، مگر جواب میں یہ عرض کیا:

① الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منی، ج: ٦ ص: ٢٢٨.

"اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" "اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سا مہینہ ہے"۔

تابعین میں سے ایک شاگرد نے ان صحابی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: یہ جواب آپ نے کیوں دیا۔ آپ کو قطعی علم تھا کہ یہ مکہ ہے۔ ذی الحجہ کا مہینہ ہے، نویں تاریخ ہے، تو نام لے کر بتاتے کہ فلاں شہر ہے، فلاں مہینہ ہے، فلاں تاریخ ہے، یہ کہنا کہ "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں، آپ نے یہ کیوں کہا؟

حقیقتِ اسلام..... اس صحابی رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفویض اسے کہتے ہیں۔ وہ صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ہم نے اس لئے کہا کہ:

اگر اس دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما دیتے کہ: یہ مکہ نہیں، مدینہ ہے۔ تو ہم کہتے کہ ہماری آنکھوں نے غلط دیکھا، بلاشبہ یہ مدینہ ہے، اللہ کا رسول غلط گو نہیں ہو سکتا اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما دیتے کہ یہ ذی الحجہ نہیں، محرم کا مہینہ ہے، ہم سب کہہ دیتے کہ ہم سب ایمان لائے، بلاشبہ محرم کا مہینہ ہے، ہمارا علم غلط تھا کہ ہم اسے ذی الحجہ سمجھ رہے تھے۔

اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیتے کہ یہ نویں تاریخ نہیں بلکہ ذی الحج کی بارہویں تاریخ ہے، ہم کہتے کہ بلاشبہ یہ بارھویں تاریخ ہے، ہم سے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے کہ یہ نویں تاریخ ہے۔

تو **تفویض مطلق** اسے کہتے ہیں کہ پیغمبر کی خبر کے مقابلے میں آنکھوں کو جھٹلانے کے لئے تیار ہو جائے، کانوں کو جھٹلانے کے لئے تیار ہو جائے کہ میرا کان غلطی کر سکتا ہے، میری آنکھ غلطی کر سکتی ہے، مگر خدا کا رسول تبلیغ حق میں غلطی نہیں کر سکتا۔ اس کو تفویض مطلق کہتے ہیں۔ اور فی الحقیقت یہ اسلام ہے۔

آج ہم اللہ و رسول کو اپنی خواہشات کا تابع بنانا چاہتے ہیں کہ اپنی مرضی پہلے متعین کر لی اور مسئلے کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کے مطابق کرنا چاہا۔ گویا خدا اور رسول کو اپنے تابع بنا رہے ہیں حالانکہ تابع بننے کا صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ درجہ حاصل کیا ہے کہ آنکھوں تک کو جھٹلانے کے لئے تیار ہیں۔ ہم تو خدا اور رسول کو اپنے خیال کا تابع بناتے ہیں، وہ مشاہدے کا بھی تابع نہیں بناتے۔ مشاہدے کو بھی اللہ و رسول کے تابع کرتے تھے کہ آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے اگر اللہ کے رسول اس کے خلاف فرما دیں گے، حق وہ ہوگا، آنکھ حق پر نہیں ہوگی۔ آنکھوں کی تکذیب کے لئے تیار ہیں۔

اللہ کے نام کے مقابلہ میں مشاہدہ کی تکذیب..... اور یہ تو یہ ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا بھی یہ طریقہ ہے کہ وہ اللہ کے نام کی وجہ سے اپنے مشاہدے کی تکذیب کر دیتے ہیں۔ سیر کی روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک چور کو دیکھا کہ وہ چوری کر رہا ہے اور دن میں دیکھا کہ وہ چوری کر رہا ہے، اور چیز اٹھا رہا ہے۔ آنکھوں سے دیکھ لیا، اس کو بلا کر پکڑ کر فرمایا: "ظالم! یہ دن دھاڑے چوری کرتا ہے تجھے شرم نہیں آتی"۔ اس نے کہا: "وَاللّٰہِ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ مَاسَرَقْتُ" "قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے میں نے چوری نہیں کی"۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: "صَدَّقْتُ رَبِّیْ وَکَذَّبْتُ عَیْنِیْ." "میں اپنے پروردگار کے نام کی تصدیق

کرتا ہوں اور اپنی آنکھوں کو جھٹلاتا ہوں۔'' بے شک تو نے چوری نہیں کی، جب تو نے اللہ کے نام پر حلف دیا تو اللہ کا نام سچا ہے۔ میں اس کی تکذیب نہیں کرسکتا۔ یہ اتباع کامل کا درجہ ہوتا ہے کہ جب اللہ کا نام بھی آجائے۔ حالانکہ چور اس نامِ پاک کو غلط استعمال کررہا ہے، مگر جرات نہیں کرتے کہ تکذیب کریں کہ خدا کا نام آگیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ خادم کو گوشت خریدنے کے لئے بھیجتے جب وہ لے کر آتا تو گوشت کی بوٹیاں گن لیتے تھے۔ مثلاً ایک پیسے میں چھ بوٹیاں آنی چاہئے تھیں تو یہ چھ لایا ہے یا پانچ لایا ہے۔ خادم کہتا کہ مجھ پر کیا اعتماد نہیں؟ فرمایا: اعتماد ہے، اپنے قلب کی تسکین اور تیرے ساتھ حسن ظن باقی رکھنے کے لئے میں یہ کام کرتا ہوں کہ گن لیتا ہوں۔ کسی نے کہا کہ: یہ خادم دھوکہ کرتا ہے اور یہ کم لے آتا ہے اور پیسے آپ سے زیادہ لے جاتا ہے، فرمایا کہ: وہ خادم اللہ کا نام لے کر کہتا ہے کہ میں پورا پورا لے کر آیا ہوں۔ اس نے کہا: وہ غلط نام لیتا ہے اور غلط حلف اٹھاتا ہے اور کم لے آتا ہے اور آپ کو دھوکہ دیتا ہے۔

فرمایا: ''مَنْ خَدَعَنَا فِي اللهِ اَنْ خُدِعْنَالَهٗ.'' ''جو اللہ کا نام لے کر دھوکہ دے گا، ہم ضرور اس کے دھوکہ میں آئیں گے اللہ کے نام کو ہم نہیں جھٹلا سکتے''۔

عِلم، محبت اور اخلاق کا وظیفہ...... اس کا تعلق عظمت سے ہے۔ جب اللہ کے نام کی اس درجہ عظمت پیدا ہو جائے کہ اس کے سامنے آنکھ بھی بے کار، کان بھی بے کار، باتیں بھی بے کار، اللہ ہی اللہ سامنے ہے، وہ حقیق معنی میں قلب کی تفویض کا اور اسلام کا مقام ہے، یہ مقام حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور تزکیہ سے دیا گیا تھا علم کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسائل بتلائے اور تزکیہ کے ذریعے سے قلوب کا راستہ سیدھا کیا۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میری بعثت کی غرض وغایت کیا ہے؟ ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، تاکہ علم کے ذریعے سے امت کو صحیح راستہ دکھلا دوں''۔ اور ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ'' ''میں بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاق کو مکمل کر کے پیش کروں''

ان کو اخلاق کریمانہ کا مکمل نمونہ بنادوں اخلاق عمل کی قوت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ علم سے تو میں راستہ دکھلاتا ہوں اور اخلاق درست کر کے اس راستہ پر چلنے کی قوت پیدا کرتا ہوں۔ علم آدمی کو اس وقت تک نہیں چلا سکتا جب تک اخلاق درست نہ ہوں۔ اخلاقی قوت سے ہی آدمی چلے گا۔ علم کا کام فقط راستہ دکھلانا ہے۔

اگر ایک عالم بہت اعلیٰ علم حاصل کرے، مگر عمل کی طرف متوجہ نہیں تو راستہ اس نے دیکھ لیا، مگر محض علم اسے راستے پر نہیں چلا سکتا۔ جب تک اس کے اندر چلنے کی اخلاقی قوت نہ ہو۔

اخلاق میں صبر ہے، شکر ہے، شجاعت ہے، رضا ہے تسلیم ہے یہ عملی چیزیں ہیں۔ علم راستہ بتلادے گا کہ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ اور بچنے کا یہ طریقہ ہے، لیکن اس طریقہ پر آدمی چل پڑے، چلا دینا علم کا کام نہیں ہے۔ یہ کام اندرونی

قوت کا ہے جو اخلاقی قوت ہے۔ اگر قلب میں محبت ہے آدمی شجاعت اختیار کرے گا۔ محبوب کی کے خاطر لڑے گا اور محبوب کے دشمنوں کو فنا کر دینا چاہے گا۔ معلوم ہوا کہ محبت اخلاق کو چلاتی ہے، علم نہیں چلاتا۔ اگر انسان کے اندر صبر ہے تو ظاہر بات ہے کہ جو مرغوب خدا کی خاطر اختیار کرے گا، اس پر جم جائے گا، گویا طاعت پر جمے گا اور صبر کرے گا۔ اس کے خلاف سے ہٹ جائے گا، یہ صبر محبت ہی کرائے گی، اگر حق تعالیٰ شانہ سے محبت نہ ہو تو عبادت پر آدمی صبر کیسے کرے؟ آپ نماز پر صبر کئے بیٹھے ہیں۔ سردی ہے، لحاف چھوڑ کر سردی کے زمانے میں نماز کے لئے آتے ہیں تو عبادت پر اتنا جمنا یہ محبت ہی سے تو ہے محض علم سے نہیں۔ علم نے تو راستہ دکھایا تھا کہ بھئی! اگر تم نے نماز پڑھ لی تو ثواب ملے گا، لیکن پڑھنا اور پڑھنے کے لئے اٹھنا۔ اور اپنے عیش و آرام کو چھوڑنا، یہ محبت کراتی ہے، علم نہیں کراتا ہے تو محبت اخلاق کو حرکت میں لاتی ہے، اخلاق عمل کو حرکت میں لاتے ہیں۔ تب جاکے آدمی عمل کرتا ہے۔

غرض ہر چیز کا ایک وظیفہ ہے۔ علم کا کام راہ دکھلانا ہے۔ محبت کا کام حرکت میں لانا ہے۔ اخلاق کا کام عمل کرا دینا ہے۔ ہر چیز اپنے اپنے دائرے میں عمل کرے گی۔ سارے کام آپ علم کے اوپر ڈال دیں کہ وہی راستہ دکھلائے، وہ چلائے، وہی گردن پکڑ کر آپ کو مسجد میں لے جائے تو ایک چیز سارے کام انجام نہیں دے سکتی۔ الگ الگ قوتیں ہیں۔ غرض تعلیم کے ذریعے سے علم پہنچتا ہے۔ تزکئے کے ذریعے سے اخلاق درست ہوتے ہیں اور محبت پیدا کرائی جاتی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو وظیفے نکلے۔ ایک تعلیم اور ایک تربیت۔ تعلیم سے آپ مسائل پہنچاتے تھے۔ یہ جائز یہ ناجائز، یہ حلال یہ حرام۔ تزکیے کے ذریعے سے عمل کی قوتیں قلب میں فراہم کرتے تھے کہ اس حلال کے اوپر آدمی چل پڑے اور حرام سے بچنے لگے۔ جائز کے اوپر چل پڑے اور ناجائز سے بچنے لگے۔ یہ چیز تزکیہ اور احوال قلب سے متعلق تھی۔

قلب کی حالت اگر درست نہ ہو، فتنے میں پڑا ہوا ہو اور شکوک و شبہات میں پڑا ہوا ہو تو شکی آدمی کبھی عمل نہیں کرسکتا۔ تذبذب اور تردد ہوگا تو کبھی عمل ظہور پذیر نہیں ہوگا۔ قوت یقین پہلے آئے، پھر آدمی چلے گا، اور اخلاق ابھاریں گے تو آدمی عمل کرے گا۔ اس واسطے دو وظیفے فرمائے گئے، گویا بعثت کی دو غرض و غایت نکلیں۔ ایک فرمایا: **"اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا"** "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ اور ایک فرمایا: **"بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ"** "میں بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاق کا مکمل نمونہ تمہارے سامنے رکھ دوں"۔

تاکہ تمہارے اخلاق صحیح ہو جائیں اخلاق کے بغیر عمل نہیں ہوگا، اور تعلیم کے بغیر علم نہیں آئے گا، جس سے جائز و ناجائز کا پتہ چلے۔

تعلیم بلا تربیت کا نقصان..... تو مجلس مبارک میں ایک طرف مسائل کی تعلیم ہوتی تھی جائز و ناجائز اور حلال و حرام بتلایا جاتا تھا اور رات کو نگرانی فرماتے تھے کہ عمل کیسا ہے، مجاہدے کراتے تھے تاکہ نفوس کا تزکیہ ہو جائے، اس کا تعلق جائز و ناجائز سے نہیں قلب کے احوال باطن سے ہوتا ہے۔ احوال باطن وہی درست کرسکتا ہے، جو

باطن کے ان مقامات سے گذرا ہوا ہو، جو اس راہ میں چلا ہوا نہیں ہے، وہ کس طرح سے اعمال باطن کو درست کرے گا، اسے خود اپنے اندر کا پتہ نہیں دوسرے کے اندرون کا کیا پتہ چلے گا

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

اس واسطے جیسے ظاہری مسائل پوچھنے کی ضرورت ہے، باطنی احوال کے درست کرنے کے لئے بھی لوگ اہل باطن کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ وسوسوں کو دور کر کے قلب کی راہ کو درست کرلیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے مسائل کی تعلیم دی حلال و حرام، جائز و ناجائز کے دائرے کو بتلایا فرائض بتلائے، واجبات اور ان کی مقداریں بتلائیں، ان کے ادا کرنے میں جو خطرات اور وسوسوں کی رکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں، ان کے رفع کرنے کی ذمہ داری بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے لی اور قلب کو درست کرنے کا طریقہ بھی آپ نے اختیار فرمایا۔ اس کا نام تعلیم ہے اور اس کا نام تربیت ہے، تربیت سے آدمی صحیح بنتا ہے، اگر تعلیم ہی تعلیم ہو اور علم ہی علم، تو کورے علم سے راستہ تو نظر آئے گا، مگر چلنے کی طاقت پیدا نہیں ہوگی۔

جیسے غالب نے کہا کہ۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ہم   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

آج کے دور میں بد عملی جہالت کی وجہ سے نہیں ہے۔ علم کے باوجود بد عملی ہے، علم کے راستے اتنے پھیل چکے ہیں کہ قدم قدم پر آدمی کو علم ہوتا ہے اور ہے کاغذ ہے، پیپر ہے، رسائل اور اخبارات ہیں، رات دن علم سامنے آرہا ہے، مگر رات دن بد عملی بڑھتی جاتی ہے، یہ بد عملی جہالت کے سبب سے نہیں ہے، بلکہ عدم تزکیہ کے سبب سے ہے کہ جب نفوس مانجھے ہی نہیں گئے اور قلب کے مقامات ہی درست نہیں ہوئے، دل کی کلیں ہی درست نہیں ہیں، تو جتنا بڑا علم ہوگا، اتنی ہی بڑی بد عملی بھی ہوگی، اس لئے جہاں ظاہری علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے، وہاں باطنی تربیت کی بھی ضرورت ہے اس کے بغیر آدمی چلتا نہیں ہے۔

اہمیتِ تزکیہ...... اگر یہ چیز ضروری نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں تزکیہ نہ رکھا جاتا۔ اور تربیت نہ رکھی جاتی۔ تو سب سے زیادہ ضرورت تربیت کی پڑتی ہے۔ اور تربیت کے ساتھ تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے اور ان دونوں چیزوں کا تعلق کسی منجھی ہوئی شخصیت کے ساتھ ہوتا ہے۔

تزکیہ میں شخصیت کی احتیاج...... آدمی یہ چاہے کہ میری تربیت کاغذ سے ہو جائے تو کاغذ اور کتاب تربیت نہیں کر سکتے، کاغذ میں تو کالے کالے نقوش ہوتے ہیں، ان نقوش کی مرادات کیا ہیں؟ یہ تو معلم سمجھا سکتا ہے اور مزکی بتلا سکتا ہے کاغذ نہیں بتلائے گا۔ چناں چہ کلام میں جو کیفیات ہوتی ہیں تو کاغذ میں حروف کا نقش آتا ہے، کیفیت تو نہیں آتی، بہت سی کیفیتیں ہیں جو طرز ادا سے تعلق رکھتی ہیں، کلام کے بہت سے ایسے معانی ہوتے ہیں جو طرز ادا، ہیئت کذائی اور لب و لہجے سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اگر وہ ہیئت اور انداز نہ ہو کلام کا مطلب متعین نہیں ہوگا اور میں اس کی

مثال دیا کرتا ہوں کہ اردو کا ایک جملہ اس کے کئی معنی آتے ہیں اور سب کا تعلق لب و لہجے سے ہے وہ جملہ ''کیا بات ہے'' اس کے معنی استفہام و استفسار، تفخیم شان، تحقیر شان، اور تعجب کے آتے ہیں، سب کا تعلق لب و لہجے سے ہے اگر لب و لہجہ سامنے نہ ہو تو معنی متعین نہیں ہو سکتے، اگر یہ جملہ کاغذ پر لکھ کر کسی دوست کے پاس آپ بھجوا دیں تو کاغذ میں تو کالے کالے نقوش لکھے ہوتے ہیں، لب و لہجہ لکھا ہوا نہیں ہے، وہ اس سے جو سمجھے گا، وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی، بلکہ جو کیفیت اس پر غالب ہوگی وہ وہی معنی سمجھے گا، وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی وہ اس کی اپنی مراد ہوگی۔ وہ دنیا کو یہ کہہ کر دھوکہ دے گا کہ لکھنے والے کی یہ مراد تھی حالانکہ یہ غلط ہے، کلام اس کا تھا مراد اس کی اپنی تھی۔

ٹھیک اسی طرح سے قرآن و حدیث میں بہت سے مضامین کا تعلق لب و لہجے سے ہے، اور بہت سے مضامین کا تعلق شان نزول سے ہے، ان سب سے کٹ کر اگر محض قرآن و حدیث کے لکھے ہوئے الفاظ سامنے آجائیں، اور اس کا آپ مطلب لیں تو وہ مطلب آپ کا ہوگا اگرچہ لفظ خدا کے ہوں گے، اب آپ دنیا کو یہ کہیں کہ خدا نے یہ فرمایا۔ یہ دھوکہ دہی ہوگی، وہ تو آپ فرما رہے ہیں۔ اور دنیا کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اس لئے کہ خدا کا مطلب تو جب کھلتا جب خدا کی طرف سے کوئی بیان کرنے والا آکر اپنے لب لہجے، اپنے طرز ادا، اپنے ماحول اور اپنی کیفیت سے بیان کرتا۔ آپ کے سامنے ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں، حتیٰ کہ شانِ نزول بھی آپ کے سامنے نہیں، کالے نقش لکھے ہوئے آپ کے سامنے ہیں تو ماحول، کیفیت اور ہیئت کذائی آپ کی اپنی ہے، اور قرآن اور حدیث پر آپ نے تھوپ دی ہے۔ تو حقیقت میں وہ قرآن اور حدیث کا مطلب نہیں، وہ آپ کا مطلب ہے، لفظ آپ نے اللہ کے لئے اور مطلب اپنی طرف سے گھڑ لیا۔

اسی کو مٹانے کے لئے تعلیم و تزکیہ کو رکھا گیا ہے، کہ ایک شخصیت آکر تعلیم دے اور سمجھائے کہ یہ مراد ربانی ہے، اس واسطے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا گیا۔ تاکہ وہ کلام بھی سنائیں اور کلام سنا کر اس کا مطلب بھی بیان کریں کہ یہ اس کا مطلب اور مصداق ہے۔

مقاصدِ بعثت...... بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے آئے ہیں کہ علم سے دنیا کو آراستہ کریں اور اس علم سے راہ حق نظر آئے، اور تزکیہ سے آراستہ کریں جس سے لوگوں میں اس راستے پر چلنے کی قوت پیدا ہو، اور عمل کا نمونہ سکھلائیں، تاکہ عمل من گھڑت نہ ہو۔ اس میں بھی لوگ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی سنت کے متبع ہوں۔ یہی چیزیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض و غایت ہیں اسی کے مجموعے کا نام تعلیم و تربیت ہے۔ اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ ایک حدیث میں ایک غرض ظاہر کی گئی فرمایا: '' اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا '' ''میں دنیا معلم بن کر بھیجا گیا ہوں''۔

وہ علم سکھلاؤں جس کے ذریعے سے لوگوں کو حق کا راستہ ملے، لوگ خدا تک پہنچیں۔ ان کے اخلاق اور کردار و کریکٹر درست ہوں۔ دوسری غرض یہ فرمائی: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ''

میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاق کریمانہ کا اعلیٰ ترین نمونہ تمہارے سامنے رکھوں، اور عمل کر کے دکھلا

دوں، اوراخلاق کریمانہ کی ہیئت کذائی تم کو دکھلا دوں، اس کا نام تربیت ہے، اس کا نام تعلیم ہے، خلاصہ یہ نکلا کہ انبیاء علیہم السلام کی دنیا میں آنے کی غرض وغایت تعلیم وتربیت ہے ہرقوم اور ہرملک میں نبی بھیجے گئے تا کہ دنیا کی قومیں علم سے محروم نہ رہ جائیں اوراخلاق سے محروم نہ رہ جائیں۔

اندازِ تعلیم وتربیت......اور یہ تعلیم وتربیت کس شان بعثت سے کی؟ تو بعثت کی شان یہ ہے کہ اس میں رحمت کا غلبہ ہے، شریعت کے ایک ایک حکم سے رحمت ٹپکتی ہے، ایک ایک حکم میں شان رحمت رچی ہوئی نظر آتی ہے، غضب اور قہر رچا ہوانہیں ہے، محبت کی آمیزش ہے عداوت کی آمیزش نہیں ہے، شفقت رچی ہوئی ہے، بیگانگی اور بے تعلقی رچی ہوئی نہیں ہے، انس موانست رچی ہوئی ہے وحشت رچی ہوئی نہیں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی، تربیت کی، اور ساتھ ساتھ وحشت سے بچایا، نفرتوں سے بچایا، انس وموانست کو پھیلایا، محبت ویگانگت پھیلائی۔

اندازِ حکومت.....حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہما کو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا۔ ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو قاضی القضاۃ، یعنی چیف جسٹس بنا کر بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں صحابیوں کو اونٹ پر سوار کیا اور خود پیدل ساتھ ہو لیے۔

ان کو رکاوٹ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدل چلیں۔ اور ہم سواری پر بیٹھیں مگرامر ارشاد تھا کہ نہیں تم بیٹھو، تو یہ اونٹ پر سوار ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدل ساتھ ہیں، میل بھر تک ساتھ تشریف لائے گئے اور مختلف نصیحتیں فرمائیں۔

فرمایا: جب تم یمن میں پہنچو گے تو تمہیں عیسائیوں کی رعایا ملے گی، وہاں کے سب باشندے عیسائی ہیں، تم وہاں جاکے کیا کام کروگے۔ تو نصیحت فرمائی کہ: بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَيَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَتَطَاوِعَا وَلَاتَخْتَلِفَا.

عیسائیوں کی ریاست میں جاکر لوگوں کو بشارتیں سنانا، نفرتیں نہ دلانا آسانیاں بہم پہنچانا، لوگوں کو تنگیوں میں مبتلا نہ کرنا۔ مطاوعت، وحدت اور اتحاد پیدا کرنا، اختلاف کی راہیں مت ڈالنا کہ لوگ بکھر جائیں، تم ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کرنا، متفرق بنانے کی کوششیں مت کرنا۔

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

تم کو دنیا کے جوڑنے کے لئے بھیجا گیا ہے، دنیا کو توڑنے کے لئے تم کو نہیں بھیجا گیا، متفرقوں کو جمع کرنے کا کام تمہارا ہے، جمع شدہ کو متفرق کردینا یہ تمہارا کام نہیں ہے، اور جمع کرنے کا معیار تمہاری ذات نہیں ہوگی، اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہوگا۔ اسی پر لوگ جمع ہوسکیں گے، تمہاری عقل پر جمع نہیں ہوں گے، تمہارے مزاج پر جمع نہیں ہوں گے، ہر شخص عقل رکھتا ہے ضروری نہیں ہے کہ دوسرے کی عقل کا تبع ہو، تم کہو گے میرا مزاج یہ ہے، دوسرا کہے گا میرا مزاج یہ ہے۔ لیکن جب آپ یہ کہیں گے کہ یہ اللہ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے سب گردن جھکا دیں گے وہ معیار ہے غرض تم لوگوں بشارتیں سنانا، نفرتیں مت دلانا۔ انہیں باغنا

متفرق کرنا اور گروہ سازی مت کرنا۔ سب کو ایک گروہ بنانے کی کوشش کرنا۔ کوئی از خود گروہ بنے یہ اس کا اپنا فعل ہے۔ تمہاری طرف سے اذن اور اعلان وحدۃ واتحاد کا ہونا چاہئے۔ تو شانِ رحمت ہے کہ لوگوں کو ملاؤ اور بانٹو مت، متفرق مت کرو ان کے سامنے ایسی چیزیں کہو کہ اگر ان کے قلوب بکھرے ہوئے بھی ہوں تو جڑ جائیں اور جمع ہو جائیں۔ ایسے کلمات ان کے سامنے مت کہو کہ ان میں گروہ بندی پیدا ہو جائے وہ بٹ جائیں، اور متفرق ہو کر ان میں نفرتیں پیدا ہونے لگیں، کسی ایک مرکز پر انہیں لانے کی کوشش کرو۔ تو یہ ہی شانِ رحمت ہے۔ غرض تعلیم دینا بھی شانِ رحمت ہے تربیت کرنا بھی شانِ رحمت ہے۔

رحمتِ مجسم ...... لیکن اگر اس ضابطے کو فرض قرار دیا جائے تو اس تعلیم وتربیت کو جس شان سے ادا کیا گیا وہ شان تو رحمت ہی کی ہے۔ اور وہ شان انس وموانست اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً وَّلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا'' ''میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں لوگوں کو دور کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا''۔

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا ہے جب غزوۂ احد کے اندر ستر صحابہ رضی اللہ عنہم کی لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر پتھر لگا۔ اور خون کی چادر منہ پر آگری۔ دندان مبارک شہید ہو گئے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان کے لئے بددعا کیجئے کہ ان ناہنجاروں نے اللہ کے رسول کو زخم پہنچایا۔ سر مبارک پر زخم لگا۔ محبوب صحابہ رضی اللہ عنہم جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں، شہید ہو گئے، بددعا فرمائیے۔! اس پر فرماتے ہیں: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً وَلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا'' ''میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پھٹکار دینے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا''۔ اور فرماتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ اغفر لقَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ'' ① ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت کر! یہ جاہل ہیں، جانتے نہیں ہیں''۔

اس موقع پر بھی رحمت ہی کا ظہور ہوا، یہ وہ اخلاق عظیم تھا کہ دوسرے گالیاں دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حق میں دعائیں کر رہے ہیں، دوسرے تلوار اٹھا کر زخم لگائیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان فیض ترجمان سے ان کے اوپر پھول برسائیں یہی ہے وہ شانِ رحمت کہ دوستوں کے ساتھ رحم کرنا تو ہے ہی، لیکن دشمنوں کے ساتھ جو رحم وکرم کرے اور دشمنوں کو جو نوازنے کی کوشش کرے، کہا جائے گا کہ وہی ''رحمتِ مجسم'' ہے۔ غرض ہر موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کے ساتھ وہ کیا جو آج دوستوں کے ساتھ بھی کیا جانا مشکل ہے۔

بہر حال بعثت کی شان رحمت کی ہے، اور بعثت کی غرض وغایت تعلیم اور تربیت کی ہے۔ یہی تین حدیثیں ابتداء میں پڑھی تھیں کہ ایک میں شانِ بعثت بتلائی گئی۔ دو احادیث میں بعثت کی غرض وغایت بتلائی گئی۔

''اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً'' میں شانِ بعثت ہے، کہ میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور ''بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' اور

---

① المعجم الكبير للطبراني، سهل بن سعد الساعدي، ج:۵، ص: ۳۸۹. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، باب مقتل حمزة ج:۳ ص:۱۵.

"بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ" میں غرض وغایت، یعنی تعلیم وتربیت ہے۔ یہ تین روایتیں میں نے پڑھی تھیں بقدرِ ضرورت ان کی تشریح کی ہے، ان سب کا مقصد اور گویا لب لباب اور حاصل یہ نکلتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصدِ اصلی تعلیم وتربیت ہے۔

نیابتِ نبوی......اور نبی کے بعد قوم نبی کے قائم مقام بنتی ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد یہ پوری امت نبی کے قائم مقام اور نبی کی نائب ہے، اس کا بھی اصلی فریضہ یہ ہے کہ یہ تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ ویسے دنیا میں بہت سے علوم ہیں، اور ہر علم مفید ہی ہے، لیکن حقیقی علم وہ ہے جو آدمی کو آدمی بنائے جو انسان میں اخلاق کے جوہر پیدا کرے، بہت سی تعلیمات ہیں جو سامان بناتی ہیں جیسے آپ سائنس پڑھیں گے تو بہترین قسم کے سامان بنائیں گے، فلسفہ پڑھیں گے تو دماغی ریاضت ہو جائے گی۔

ہندسہ اور انجینئرنگ پڑھیں گے تو بہترین قسم کے مکانات بنائیں گے، یہ سب چیزیں آپ کی ضروریات کی ہیں، اور اچھے اچھے سامان آپ کے لئے مہیا کریں گی، لیکن اچھے انسان بنانا ان علوم کا موضوع نہیں، اچھے سامان بنانا موضوع ہے، اگر آپ اچھا انسان بننا چاہتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے نیچے آنا پڑے گا، نبیوں کی دنیا میں آنے سے غرض اچھا سامان بنانا نہیں، چھری، کانٹے بنانا نہیں ہے، یہ تو ضرورت کی چیزیں ہیں۔ جس طرح آپ چاہیں یہ خود بنالیں۔ ان کے آنے کی غرض یہ ہے کہ آپ کو انسان بنا دیا جائے۔ انسان کے ہاتھ میں اگر چھری ہوگی تو دوست کے گلے پر نہیں چلے گی۔ دشمن کے گلے پر چلے گی، انسان کے ہاتھ میں اگر برتن ہوگا تو صحیح استعمال کرے گا، جانور کے آگے ہوگا تو اسے پھینک مارے گا، اس لئے آدمی اگر آدمی بن گیا تو سامان بھی کارآمد ہو گئے، اور اگر آدمیوں میں آدمیت نہ رہی تو یہ سامان وبالِ جان بن جائیں گے اگر دنیا میں کروڑوں روپے کا سامان بھرا ہوا ہے اور آدمی جانوروں کی مانند ہوں، جن میں نہ خدا کی پہچان، اور نہ رسول کی پہچان نہ حق وباطل کی پہچان، نہ انس و موانست، ایسے میں سامان اور زیادہ وبالِ جان ہیں۔

اور اگر ایک بھی سامان نہ ہو اور چٹنی روٹی پر گزر ہو، مگر آدمیوں میں انسانیت کا جوہر ہو، انس ہو، محبت ہو ہمدردیِ خلائق ہو وہ دنیا جنت ہے تو انبیاء علیہم السلام دنیا کو جنت بنانے آئے ہیں، جہنم بنانے نہیں آئے جہنم والوں کیا خلاق فرمائے گئے ہیں۔ ﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا﴾ ①

جب کوئی پارٹی جہنم میں داخل ہوگی، دوسری پارٹی اس پر لعنت کرے گی کہ تم پر لعنت ہو تمہاری وجہ سے ہم مبتلا ہوئے، وہ کہے گی تم پر لعنت ہو تمہارے بہکانے کی وجہ سے ہم مبتلا ہوئے۔ تو جہنم کا عذاب ایک طرف، یہ لعن طعن خود ایک مستقل عذاب ہے۔

اور جنت والوں کے اخلاق بیان کئے گئے ہیں۔ ﴿اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ﴾ ②

---

① پارہ: ۸، سورة الاعراف، الآية: ۳۸۔ ② پارہ: ۱۴، سورة الحجر، الآية: ۴۷۔

بڑی بڑی مسندوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے اور دل ایسے ہوں گے، جیسے حقیقی بھائیوں کے ہوتے ہیں، ہر ایک کے دل میں محبت کھپی ہوئی اور رچی ہوئی ہے، تو انبیاء علیہم السلام محبتیں پیدا کرنے آئے ہیں عداوتیں پیدا کرنے نہیں آئے۔ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی	نے برائے فصل کردن آمدی

اور یہ چیز بغیر رحمت اور شفقت کے نہیں ہوتی۔ تو امت کو بھی اسی طرح شفیق بننا چاہئے اپنوں میں بھی باہم اور اغیار کے حق میں بھی کہ انہیں ہدایت کریں اور انہیں سیدھا راستہ دکھلائیں، ایسی راہیں پیدا کریں کہ لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ ایک طرح محبت واتحاد سے چلیں، اس میں قوم کی بھی قوت ہے، ملک کی بھی قوت ہے، جتنی پاکیزگی آپ کے نفوس میں بڑھے گی، جتنے پاکیزہ اعمال بڑھیں گے، آپ اپنی قوم کے لئے بھی مفید ثابت ہوں گے۔ ملک کے لیے بھی مفید ثابت ہونگے، اگر بدعنوانیاں رہیں تو قوم کے لئے بھی اور حکومت کیلئے بھی وبالِ جان بن جائیں گے۔ تو آدمی وہ ہے جو صحیح طور پر معاشرہ کے لئے آدمی ثابت ہو اور بہترین انسان ثابت ہو۔

احساسِ ذمہ داری...... بلاشبہ بہت سی چیزوں میں حکومت روک تھام کرتی ہے۔ چوروں کو پکڑتی ہے، ڈکیتوں کو پکڑتی ہے، قانون بناتی ہے، لیکن ساری ذمہ داری حکومت پر نہیں کچھ آپ پر بھی عائد ہوتی ہے، آپ کو بھی تو اپنے اخلاق درست کرنے ہوں گے۔ جہاں کوئی سپاہ اور سی۔ آئی۔ ڈی نہ ہو، اگر آپ تنہائی میں ہوں اور اخلاق درست نہ ہوں، وہاں پھر آپ خیانت کریں گے، ایسا آدمی ہو کہ جب تنہائی میں ہو جب بھی نیک نفس ہو، مجمع میں ہو جب بھی نیک نفس ہو۔ یہ جب ہو سکتا ہے کہ جب اس کا نفس درست ہو جائے، ورنہ اگر انسان بدنفس ہے تو ڈر کے مارے مجمع میں خیانت نہیں کرے گا، مگر جب تنہائی میں جائے گا، خیانت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہوگی وہ آدمی آدمی نہیں بلکہ آدمی کی صورت ہوگی۔ تو آدمی صورتِ انسان کا نام نہیں حقیقتِ انسان کا نام ہے ؎

گر بصورتِ آدمی انسان بدے	احمد و بوجہل ہم یکساں بدے

اگر صورت سے آدمی آدمی بنا کرتا تو صورتِ انسان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل دونوں کی صورت انسان کی تھی، مگر زمین وآسمان سے بھی زیادہ فرق ہے، وہ فرق حقیقت کے لحاظ سے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت دیکھی جائے تو عرش کے اوپر پہنچی ہوئی ہے، اور ابوجہل کی حقیقت دیکھی جائے تو تحت الثریٰ میں پہنچی ہوئی ہے، صورتیں دونوں کی انسانوں کی ہیں یکساں ہیں۔ غرض صورت سے آدمی نہیں بنتا، حقیقت سے بنتا ہے اور یہ حقیقت انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے بنتی ہے۔ اس کے بغیر جوہر پیدا نہیں ہوتا، اس لئے جہاں آپ اور علوم کی طرف توجہ کریں بنیادی طور پر اس عمل کی طرف توجہ کرنا سب سے ضروری ہے، جس سے ہمارا جوہر درست ہو۔ اس واسطے یہ تین حدیثیں میں نے تلاوت کیں کہ تعلیم وتربیت تو اصل غرض ہے اور اس میں شفقت اور رحمت کی شان ملی ہوئی ہونی چاہئے۔ تب جا کے وہ تعلیم وتربیت صحیح معنی میں مفید ثابت ہوگی، حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم

تعلیم کے ذریعے سے علم حاصل کریں۔ تربیت کے ذریعے سے اخلاق درست کریں اور حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے اتباع کی توفیق عطاء فرمائیں۔ اور ہمیں اپنی مرضیات پر چلائیں۔ آمین۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَابَعْدَاِذْھَدَیْتَنَاوَھَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ. اَللّٰھُمَّ اَعِذْنَامِنَ الْفِتَنِ مَاظَھَرَمِنْھَا وَمَابَطَنَ. اَللّٰھُمَّ مَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَاوَاَبْصَارِنَاوَقُوَّتِنَآ اَحْیَیْتَنَاوَاجْعَلْ ثَارَنَاعَلٰی مَنْ ظَلَمَنَاوَلَاتَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَافِیْ دِیْنِنَاوَلَاتَجْعَلِ الدُّنْیَآ اَکْبَرَھَمِّنَاوَلَامَبْلَغَ عِلْمِنَاوَلَاغَایَۃَرَغْبَتِنَآ اَللّٰھُمَّ لَاتُسَلِّطْ عَلَیْنَامَنْ لَّایَرْحَمُنَااَللّٰھُمَّ زِدْنَاوَلَا تَنْقُصْنَاوَاَکْرِمْنَاوَلَاتُھِنَّاوَ اَعْطِنَاوَلَاتَحْرِمْنَاوَاٰثِرْنَاوَلَاتُؤْثِرْعَلَیْنَاوَاَرْضِنَاعَنْکَ وَارْضَ عَنَّا،اَللّٰھُمَّ وَتَوَفَّنَامُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَابِالصّٰلِحِیْنَ غَیْرَخَزَایَا وَلَامَفْتُوْنِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖٓ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَااَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ(حررہ ۸ جمادی الاولیٰ ۹۰۵)

عناصر سیرت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ .﴿قَدْجَآءَ كُمْ مِّنَ اللهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَهْدِيْ بِهِ اللهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. صَدَقَ اللهُ الْعَظِيْمُ.

تمہید...... بزرگان محترم! یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی اس آیت کریمہ میں جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند بنیادی صفات اور چند بنیادی مقاصد وافعال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسی آیت کی مجھے مختصر طریق پر کچھ شرح آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنی ہے، مگر آیت کی تشریح سے قبل بطور تمہید ومقدمہ کے چند باتیں سمجھ لیجئے تا کہ اس کے بعد آیت کے مقاصد سمجھنے آسان ہو جائیں اور وہ یہ کہ جب انسان کسی بھی متعین منزل کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لئے چار باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان چار کے بغیر منزل مقصود تک آدمی نہیں پہنچ سکتا۔

1 ......سب سے پہلی چیز روشنی راہ ہے۔ راستہ میں روشنی اور چاندنا ہو جس میں آدمی راستہ قطع کرے اور روشنی بھی ایسی کہ نہ اتنی تیز ہو کہ نگاہوں کو خیرہ اور چکا چوند کر دے کہ راستہ چلنا ہی مشکل ہو جائے، نہ اتنی دھیمی ہو کہ راستے کا نشیب و فراز ہی نظر نہ آئے، بلکہ معتدل روشنی ہو جس میں آدمی بے تکلف چل سکے، غرض سب سے پہلی چیز راستہ کی روشنی ہے۔

2 ......اس کے بعد خود راستہ ہے کہ جو سیدھا ہو اس میں ٹیڑھ اور کجی نہ ہو، جس میں آدمی بے تکلف چل سکے، اگر راستہ میں اونچ نیچ ہے اور گڑھے ہوں تو روشنی بھی ہوگی تو گر جانے کا اندیشہ ہوگا۔ اس لئے روشنی ہونے کے باوجود ضرورت ہوتی ہے کہ راستہ سیدھا ہو اونچ نیچ اور نشیب وفراز سے بری ہو۔

3 ......اس کے ساتھ ساتھ ایک تیسری چیز کی اور ضرورت پڑتی ہے کہ راستہ بھی سیدھا ہو اور ساتھ میں راہنما بھی

ہوا گر راہ دکھلانے والا کوئی نہ ہو تو محض روشنی اور راستہ کام نہیں دے سکتا۔ تو راہنما کی بھی ضرورت ہے کہ وہ ہاتھ پکڑ کر پہنچا دے۔ پھر چوتھی چیز ''راہ رو'' ہے کہ روشنی، راستہ اور راہنما بھی موجود ہے لیکن چلنے والا موجود نہیں تو منزل مقصود تک کون پہنچے؟ اس لئے ضرورت پیش آتی ہے کہ خود راہ رو بھی ہو۔ غرض یہ چار باتیں ہیں کہ ان کے بغیر منزل مقصود تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اگر روشنی نہیں ہوگی اندھیرے میں چلنا دشوار ہوگا، روشنی ہو، مگر راستہ نہ ہو تو آدمی چلے کس چیز پر؟ راستہ بھی ہو مگر راہنما اور راہ دکھلانے والا کوئی نہ ہو تو پھر آدمی چلے کیسے؟ اور یہ تینوں چیزیں موجود ہوں، مگر چلنے والا کوئی نہ ہو تو منزل تک کون پہنچے؟

حصولِ منزل کی شرائط...... دنیا میں بھی آپ جب کبھی کسی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں تو چند باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے، حق تعالیٰ نے آپ کے لئے روشنی کا بندوبست کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا﴾ ① ''برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بروج بنائے اور سراج منیر یعنی سورج اور قمر منیر رکھا''

دن میں آپ سورج کی روشنی میں راستہ طے کرتے ہیں اور رات کو چاند کی روشنی میں راہیں قطع کرتے ہیں۔ اللہ نے آسمان پر دو بڑے روشن سیارے رکھ دیئے۔ اور فرمایا: ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ﴾ اور لاکھوں کروڑوں ستارے متعین کئے جس سے سمتیں متعین ہوتی ہیں اور آپ آسانی سے راہ قطع کر سکتے ہیں لیکن محض سورج کام نہ دیتا اگر زمین پر سڑکیں بنی ہوئی نہ ہوتیں۔ راہ ہی نہ ہو سورج تو نکلتا ہے لیکن پہاڑ ہیں نہ اس میں راستہ ہے۔ بڑے بڑے غار ہیں، کھڈ ہیں تو آدمی چلے گا تو اس کی جان کا خطرہ ہے۔ منزل مقصود پر کیسے پہنچے گا؟ دوسری چیز یہ ہے کہ راہ ہو اور مستقیم ہو جیسا کہ ایک موقع پر فرمایا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا﴾ ②

اللہ، وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ذلیل کر دیا پست بنا دیا کہ تم اس کے راستوں پر چلو۔ اس میں راہیں بنائیں کہ جس پر چل کر آدمی منزل مقصود پر پہنچے۔ راستہ ہو مگر راہنما نہ ہو، راستہ قطع کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لئے راہنما کی بھی ضرورت ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔ جس کی حق تعالیٰ حکایت فرماتے ہیں: ﴿وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْیَنَ قَالَ عَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ﴾ ③

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب مدین کا ارادہ فرمایا تو کہا کہ: قریب ہے۔ اللہ مجھے راستہ دکھلائے گا۔ راہنمائی خدا کی ہوگی مجھے راستہ نظر آئے گا تو راستہ کے لئے راہنما کی ضرورت ہے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''اُطْلُبُوا الرَّفِیْقَ قَبْلَ الطَّرِیْقِ'' راستہ چلنے سے پہلے رفیق سفر متعین کرلو، جو تمہاری رہنمائی کرے۔

ظاہر بات ہے کہ راہ رو کی تو ضرورت ہی ہے۔ راستہ چلنے والا ہوگا تو ان تینوں چیزوں کا متلاشی ہوگا اور اگر

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۱۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۵۔ ③ پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۲۲۔

راہ رو ہی نہ ہوتو پھر کون چلے؟ غرض اصولاً کسی منزل تک پہنچنے کے لئے ان چار باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔

سفرِ روحانیت کی شرائط..... جب مادی راستوں میں ان چار چیزوں کی ضرورت ہے تو اللہ تک پہنچانے والا راستہ جو نہایت عظیم اور طویل ہے اس کے لئے ان چیزوں کی کیا ضرورت نہیں ہوگی؟ آپ معمولی سفر کریں تو یہ چار چیزیں ضروری ہوں اتنا طویل و عظیم سفر کہ بندہ اپنے خدا تک پہنچے، اتنا لمبا راستہ کہ اللہ کی ذات وراء الوری اور بندہ ظلمت در ظلمت:

چہ نسبت خاک را عالم پاک

بندہ خدا تک جائے بلا راستہ، بلا روشنی اور بلا کسی راہنما کے پہنچ جائے اور بغیر اس جذبے کے پہنچ جائے جو اس کے دل میں راہ چلنے کے لئے ہونا چاہئے۔ لامحالہ ضرورت پڑے گی، بلکہ مادی راستوں سے زیادہ ضرورت پڑے گی۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تک پہنچنے کے لئے یہ دنیوی سڑکیں تو نہیں ہوں گی۔ حق تعالیٰ شانہ جو نور مطلق ہیں، مادیات سے بھی بالا، روحانیت سے بھی بالا، اس کی لطافت کے سامنے روحانیت بھی کثیف ہیں تو اس کی ذات بابرکات اور لطیف و خبیر ذات تک پہنچنے کے لئے راستے بھی معنوی ہونے چاہئیں اور نور بھی معنوی ہونا چاہئے۔ (اس راہ کو قطع کرنے کے لئے) سورج کی روشنی کام نہیں دے سکتی سورج کی روشنی ہمیں ہندوستان سے پاکستان، ایران و عرب پہنچادے گی مگر اس سے عرش عظیم تک نہیں پہنچ سکتے۔ جنتوں تک نہیں پہنچ سکتے عالم برزخ تک نہیں پہنچ سکتے، تو جیسا عالم ویسی روشنی۔ اس لئے اللہ تک پہنچے کے لئے مادی راستہ کافی نہیں بلکہ روحانی و معنوی راستہ کی ضرورت ہے۔ اور ویسی ہی معنوی روشنی کی ضرورت ہے کہ وہ لطافت لئے ہوئے ہو۔ اس میں کثافت کا نشان بھی نہ ہو اور مادیت سے بالاتر ہو تو ظاہر بات ہے کہ اللہ تک آ پہنچنے کے لئے ایسا راستہ درکار ہے اور ایسی ہی رہنما درکار ہے اور راہ رو بھی ایسا ہی ہونا چاہئے، اس کے لئے فقط یہ پیر کافی نہیں کہ آدمی خدا تک چلا جائے وہ تو کوئی معنوی قوت ہونی چاہئے۔ تو مادی منزل کے لئے مادی راستے، مادی طریقے، مادی راہنما، اور عالم غیب تک پہنچنے اور اللہ سے رابطہ قائم کرنے کے لئے روحانی راستے روحانی، راہنما اور روحانی رہ گزر کی ضرورت پیش آئے گی۔

نورِ معنوی کی ضرورت..... تو حق تعالیٰ تک پہنچانے والی روشنی کون سی ہے؟ جس میں ہمیں صحیح طور پر نظر آ جائے کہ راستہ کیسا ہے؟ نشیب و فراز کیسے ہیں؟ اس کے لئے حق تعالیٰ نے ایک روشنی کا مینار بلکہ روشنی کا آفتاب روشن کیا، لیکن وہ مادی آفتاب ہیں بلکہ آفتاب نبوت ہے، جس کی روشنی میں آپ اللہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ ''وہ ذات ہے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی''۔ جبکہ دنیا میں اتنی اندھیریاں چھا چکی تھیں کہ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔

اس ظلمت میں حق و باطل میں امتیاز کرنا محال تھا۔ ساری علامتیں روشنیوں کی بجھ چکی تھیں۔ راستہ کے میل اور فرلانگ ختم ہو چکے تھے کہ جن سے راستہ کا پتہ چلے ظلمت ہی ظلمت پھیل چکی تھی کیفیت یہ تھی کہ بندے خدا اور مخلوق کا فرق مٹا چکے تھے۔ مخلوق کی ضعیف و ناقص اور عیب دار صفات خدا میں تسلیم کر لی تھیں اور خدا کی پاک صفات بندوں

میں مان لی تھیں۔ بندوں کو خدائی کے درجہ تک پہنچا دیا تھا اور خدا کو بندوں کے درجہ تک لے آئے تھے۔

یہود و نصاریٰ کے عقائد کی ظلمت...... ایک جماعت کہتی تھی کہ: اللہ میں وہ ساری صفات موجود ہیں، جو بندوں کی بشری صفات ہیں۔ آپ توراۃ کو پڑھیں گے جو آج چھپی ہوئی ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی اللہ میاں سے کشتی ہوگئی اور بہت سے داؤ پیچ کے بعد اسرائیل بالآخر غالب آگئے خدا کو پچھاڑ دیا۔ (نعوذ باللہ)

لکھا ہے کہ: طوفان نوح جب آیا ہے تو فرشتوں نے جا کر اطلاع کی کہ وہ آپ کا کنبہ ڈوب رہا ہے۔ مخلوق ختم ہو رہی ہے جب اور کچھ نہ بن پڑا تو خدا نے رونا شروع کر دیا اور اتنا روئے کہ آنکھیں دکھنے آگئیں۔ فرشتے عیادت کے لئے پہنچے کہ اب مزاج کیسا ہے؟ اور آنکھوں کی سرخی کچھ کم ہوگئی یا نہیں؟ تو بندوں کی ساری ناقص اور عیب دار صفات خدا میں تسلیم کی ہوئی تھیں۔ جب کہ ایک قوم نے خدائی صفات بندوں میں مان لی تھیں۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا۔ (نعوذ باللہ)

نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کے لئے علم غیب تسلیم کرتے تھے۔ خدا کے لئے بیوی تجویز کی تو خصوصیات الوہیت وہ بندوں میں مان لی تھیں اور بندوں کی عیب دار صفات خدا کے اندر مان لی تھیں ایک قوم نے مخلوق کو خدا کا ظرف بنا دیا تھا کہ اس کے اندر حلول کرے اور طاریت کا عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ جسموں میں خدا سمایا ہوا ہے تو مخلوق ظرف بنی اور خالق اس کا مظروف بنا اور ایک قوم نے خالق کو ظرف بنا کر مخلوق کو اس کے اندر سمایا ہوا کہا کہ مخلوق کی مثال ایسی ہے جیسا کہ گولر کے پیٹ میں بھندے ہوتے ہیں تو خدا کے پیٹ میں مخلوق مظروف ہے تو ایک نے مخلوق کو ظرف مانا اور خدا کو سمایا ہوا مانا یہ تو تجلی میں گت بنائی اور ایک نے خالق کو ظرف مانا اور مخلوق کو اس میں سمایا ہوا مانا یہ وحدۃ الوجود کی گت بگڑی۔ بہر حال دونوں قسم کے عقیدے پائے جاتے تھے۔ اور خالق و مخلوق کا فرق مٹ چکا تھا۔

تردیدِ عیسائیت...... عیسائیوں نے کہا تھا کہ: حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ ① یہود نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا کہ عزیز ہی صرف خدا کے بیٹے نہیں بلکہ ہم سب خدا کی اولاد ہیں۔ ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ② ہم تو خدا کے بھائی بھتیجے ہیں، تو ایک نہیں لاکھوں بیٹے مانے۔

مجھے اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ دار العلوم دیو بند کا بالکل ابتدائی دور تھا اور صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جو ایک عالم باعمل ہی نہیں بلکہ عارف باللہ صاحب کشف و کرامت بزرگ بھی تھے۔ ان کے زمانے کا ایک طالب علم اتفاق سے ڈیرہ زون پہنچا۔ یہ متوسط درجہ کا تھی، یعنی دستار بندی نہیں ہوئی تھی، فاضل نہیں تھا، فارغ التحصیل نہ تھا، وہ کہیں ڈیرہ زون پہنچ گیا۔ وہاں ایک چوراہے پر کھڑا ہوا پادری تقریر کر رہا

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبہ، الآیۃ: ۳۰۔ ② پارہ: ۶، سورۃ المائدہ، الآیۃ: ۱۸۔

تھا اور یہ ثابت کر رہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ طالب علم اس سے الجھ پڑا کہا کہ: آپ غلط کہتے ہیں اور بحث شروع کر دی مگر پادری بڑا ہوشیار تھا اور یہ بیچارہ مبتدی طالب علم۔ اس کے مقابلہ میں بحث میں چل نہ سکا کئی جگہ اس نے طالب علم کو عاجز کر دیا۔ جس کا لوگوں پر برا اثر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ: یہ کون جانے گا کہ یہ طالب علم ہے فاضل نہیں ہے، لوگ تو یوں کہیں گے ایک عالم آیا تھا اور پادری سے ہار کر چلا گیا۔ وہیں قریب ایک بھٹیارے کی دکان تھی۔ وہ فوراً دکان سے کود کر نیچے اترا اور اس نے طالب علم کو دھکا دے کر کہا کہ: ''مولوی صاحب! آپ کا کام اس جاہل سے بحث کرنا نہیں، جاہل سے جاہل نمٹ سکتا ہے، عالم کا کام نہیں ہے کہ جاہل سے نمٹے اس پادری سے بحث کرنا ہمارا کام ہے، آپ پیچھے ہٹئے۔'' اسے بھی غنیمت معلوم ہوا کہ وہ عاجز آ گیا تھا۔

بھٹیارا آگے بڑھا اور کہا کہ پادری صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ: ''عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں'' کہا اچھا آپ اس دعویٰ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہا کہ: مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اللہ میاں کی عمر کتنی ہوگی؟ کہا بے وقوف! بے ادبی کی بات کہتا ہے وہ تو ازلی ہیں۔ ابدی ہیں۔ انہیں عمر سے کیا تعلق؟ تو اس نے کہا: یہ مطلب ہے کہ بہت لمبی عمر ہے جس کی کہیں حد نہیں۔ کہا: ہاں! یوں سمجھ لیجئے۔

بھٹیارے نے کہا کہ اتنی عمر میں ان کی کتنی اولاد ہوئی؟۔ پادری نے کہا کہ صرف ایک بیٹا۔

بھٹیارے نے کہا کہ: ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ'' کہ میں بھٹیارہ باون برس کی عمر میں بارہ بچے جنوا چکا ہوں اور اللہ میاں کی اربوں کھربوں برس کی عمر اور کل ایک بیٹا۔ اس پر تالیاں جو پٹیں اور شور پڑ گیا کہ پادری ہار گئے، ہار گئے۔ لوگوں نے دھکے دے کر اس کو وہاں سے نکال دیا اور مسلمانوں کی فتح کا اعلان ہو گیا۔

یہ واقعہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پاس پہنچا، فرمایا کہ: بھٹیارے نے بڑا عالمانہ جواب دیا، مگر وہ بے چارہ اصطلاحات سے واقف نہیں تھا اس لئے اس نے اپنی بات ایک عامیانہ زبان میں کہی مگر مقصد اس کا یہ تھا کہ اگر باپ بننا اللہ میاں کے لئے صفت کمال ہے اور اولاد ہونا اس کے لئے کوئی کمال کی بات ہے تو اس کی ہر صفت لامحدود ہونی چاہئے۔ اولاد بھی لامحدود ہونی چاہئے تھی جس کے عدد کی کوئی انتہا نہ ہوتی اور اگر اولاد ہونا خدا کے لئے عیب کی صفت ہے تو ایک بیٹا ہونا بھی عیب ہے وہ ایک سے بھی بری ہونا چاہئے۔ بھٹیارہ کا یہ مطلب تھا مگر وہ بے چارہ اصطلاحی الفاظ سے واقف نہیں تھا، اس لئے اپنے عامیانہ الفاظ میں کہا کہ: عمر کتنی ہوگی۔ اور ان کروڑوں برسوں میں لے دے کے کل ایک بیٹا۔ حالانکہ میرے تو اب تک بارہ بچے ہو چکے ہیں۔ بہر حال عیسائیوں نے ایک ہی بیٹے کا دعویٰ کیا تھا۔

ردِ یہودیت...... یہود نے آگے بڑھ کر کہا: ﴿نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ''ہم سب اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔'' یہ گویا بھٹیارے کے مذہب پر چلے اس نے جو بحث میں کہا تھا کہ بہت سی اولاد ہونی چاہئے تھی تو یہود نے سمجھا کہ واقعی اللہ میاں کا کل ایک، بیٹا۔ ہزار دو ہزار، کروڑ دو کروڑ، تو ہونے چاہئیں۔ تو انہوں نے کہا

کہ: ہم سب خدا کے بیٹے ہیں۔ اور جو قومیں باقی رہ گئیں وہ بھی کچھ احباب میں ہیں کچھ بھتیجوں میں آجائیں گے غرض اللہ میاں سے رشتہ داری قائم کرلی تو قرب خداوندی کی یہ گت بنائی کہ قرب بمعنی قرابت و راشتہ داری لے لیا اور کہا کہ: اللہ میاں کے قریب ہم بھی ہیں، یعنی اس کی اولاد ہیں، ہمارا نسب اس سے ملتا ہے۔

مشرکین کی تردید...... مشرکین مکہ نے بھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ اللہ میاں کی اولاد ہوتی ہے مگر انہوں نے کہا تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں جس کا قرآن کریم نے جواب دیا کہ: ﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى o تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴾ ①

تم تو بیٹوں پر راضی، بیٹی ہو جائے تو ناک منہ چڑھاؤ اور اللہ میاں کے لئے بیٹیاں؟ کیا تم نے بھونڈی تقسیم کی ہے؟ جس کو اپنے لئے پسند نہیں کرتے۔ وہ ظالموں نے خدا کے سر تھوپ دیا۔ اگر اولاد ماننی ہی تھی تو کم از کم یہود کی طرح بیٹے تو مانتے۔ بہر حال مخلوق اللہ کی قدر نہیں جانتی تھی۔ خالق اور مخلوق کا فرق بھلا چکی تھی۔ اپنی عیب دار صفات خالق میں مان لی تھیں کہ ہم باپ ہیں تو وہ بھی باپ ہے۔ ہماری اولاد ہے تو اس کی بھی اولاد ہے۔ ہم کسی ظرف میں رہتے ہیں تو خدا بھی کسی ظرف میں رہتا ہے۔ ہم محدود ہیں تو معاذ اللہ وہ بھی محدود ہے گویا اس درجہ کو جہالت کی ظلمت پہنچ چکی تھی کہ علم کا نشان باقی نہیں رہا تھا۔

مسخ عقل...... اسی طرح اللہ کی صفات کے بارے میں اور اس کی توحید کے بارے میں مخلوق علم کو گم کر چکی تھی۔ توحید جیسی عقلی چیز جسے انسان عقلاً سمجھ سکتا ہے اسے سمجھنے کا شعور باقی نہیں رہا تھا۔ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کامل کا دعویٰ کیا تو مشرکین مکہ نے حیرت سے کہا کہ: ﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ ②

کیا کروڑوں دیوتاؤں اور خداؤں کو ایک ہی خدا، پیغمبر نے بنا دیا؟ کیا ایک خدا سارے آسمانوں اور زمینوں کا انتظام کرلے گا؟ ﴿ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ﴾

یہ تو عجیب بات ہے جو پیغمبر کہہ رہے ہیں، یعنی عجیب تو یہ تھا کہ شرک مانا جائے، مگر شرک رگ و پے میں اتنا سرایت کر چکا تھا کہ توحید عجیب معلوم ہونے لگی۔

توحیدِ اجمالی...... توحید کا اجمال واقعی عقلی ہے۔ اگر انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام بھی دنیا میں تشریف نہ لائیں۔ تو انسان کی فطرت اجمالاً مالک کے ایک ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کلام لکھتے ہیں کہ: اگر کسی قوم یا فرد کو انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی دعوت نہ پہنچے پہاڑوں کی چوٹیوں میں گزر کر رہا ہو۔ کوئی ڈرانے والا پیغام حق لے کر اس تک نہ پہنچا اور اسی پر اس کی موت آ گئی تو قیامت کے دن توحید کا سوال اس سے بھی ہوگا۔ اگر اجمالی وہ اتنا کہہ دے کہ ''میں اتنا جانتا تھا کہ ہاں ہے کوئی پیدا کرنے والا اور وہ ایک ہے تفاصیل تو انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام بتاتے ہیں۔ تفاصیل مخبر صادق کی خبر اور وحی کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتیں لیکن اتنا اجمال کہ کوئی پیدا کرنے والا ضروری

① پارہ ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۲۱۔ ② پارہ ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۵۔

ہے اور وہ چند نہیں ہو سکتے دس بیس نہیں ہو سکتے یہ ایک فطری امر ہے، اور توحید عقلی ہے لیکن معقولات بھی اس دور میں ختم ہو چکی تھیں اس درجہ جہالت کی ظلمت چھا چکی تھی کہ توحید پیش کی تو کہا: ﴿ إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ یہ پیغمبر نے کیا عجیب وغریب بات کہہ دی کہ ایک خدا سارے عالم کا انتظام کرلے گا۔

جہالت کی ظلمت ...... اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاد کو پیش کیا کہ دنیا ایک دن فنا ہو جائے گی۔ یوم آخرت آنے والا ہے۔ قیامت آنے والی ہے، تم سب کو وہاں جواب دہی کرنی پڑے گی۔ تو حیرت سے کہا کہ: ﴿مَنْ يُحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ﴾ ① ''جب ہماری ہڈیاں گل سڑ کر بوسیدہ ہو جائیں گی۔ پھر کون ہے جو انہیں زندہ کرے اور اٹھائے؟'' ان کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ کوئی قادر مطلق موجود ہے تو جہالت کی ظلمت اس قدر قلوب پر چھا چکی تھی کہ توحید جیسی معقول چیز کو وہ عجیب بات سمجھے۔

بشریت انبیاء علیہم السلام ...... پیغمبر کی شان اور پیغمبر کی ذات کو بھی عجیب سمجھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں انہوں نے کہا تھا: ﴿قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ ②

یہ کیسا رسول آیا ہے کہ کھانا یہ کھاتا ہے، پانی یہ پیتا ہے، بازاروں میں یہ جاتا ہے۔ گویا رسول کا تصور ان کے نزدیک یہ تھا کہ بشریت سے بالاتر ہو۔ تو رسول کی ذات کے لئے بشریت کا انکار لازم سمجھتے تھے کہ رسول بشری نہیں ہو سکتا۔ بشری عوارض اس پر طاری نہیں ہو سکتے۔

حالانکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر تمام بشری عوارض طاری کئے جاتے ہیں تاکہ لوگ ان پر خدائی کا شبہ نہ کر سکیں اس لئے کہ ایک طرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ پر معجزات ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے کہ اشارہ فرمائیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ اشارہ فرمائیں تو بت آ کر وضو کے لئے پانی پیش کریں۔ درختوں کو اشارہ فرمائیں تو دوڑ کر آئیں اور سر مبارک کے اوپر سایہ کرلیں۔ پانی میں ہاتھ ڈال دیں تو انگلیوں سے چشمے بہہ پڑیں۔ جس سے پندرہ سو آدمی سیراب ہو جائیں۔ تو ایک طرف تو یہ افعال اور عجائبات قدرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر نمایاں ہوں۔ ایک طرف یہ کیفیت کہ بخار چڑھتا ہے تو شدید، اور فرمایا کہ جتنا تمہیں عام طور سے بخار آتا ہے۔ مجھے اس سے دوگنا آتا ہے۔ غزوہ احد میں سر مبارک پر پتھر لگ پڑا تو خون بہہ پڑا۔ ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔ لاشیں تڑپ رہی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ طائف پہنچے تو طائف کے شہدوں نے آپ کے پیچھے کتے لگا دیئے۔ پتھر مارے۔ پائے مبارک زخمی ہو گئے۔ سجدہ میں تھے کہ مشرکین مکہ نے عین حرم کے اندر اونٹ کا اوجھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر ڈال دیا۔ جس سے اٹھنا دشوار ہو گیا۔ کانٹے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستوں میں بچھائے گئے۔ سحر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کرایا گیا اور سحر کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو گیا۔ تو ایک طرف قدرت کے یہ کارنامے کہ اشارہ کریں تو چاند دو

① پارہ: ۲۳، سورۃ یٰسٓ، الآیۃ: ۷۸۔ ② پارہ: ۱۸، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۔

ٹکڑے ہو جائے۔ ایک طرف یہ کیفیت کہ اوجھ گر جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ نہیں سکتے۔ ایک طرف یہ کیفیت کہ انگلیوں سے چشمے جاری ہو جائیں اور ایک طرف یہ کیفیت کہ بیت نبوت میں دو دو مہینے دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا کہ کھانے پینے کو کچھ مل جائے۔ یہ متضاد چیزیں کیوں رکھی گئیں اگر فقط معجزات دیئے جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر خدائی کا شبہ ہوسکتا تھا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے تمام بشری عوارض طاری کئے، تا کہ انبیاء علیہم السلام کی بشریت کی کوئی نفی نہ کرے۔

عظمت انبیاء علیہم السلام......اور پھر فرما دیا گیا کہ: اپنی زبان سے اعلان کر دو۔ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ﴾ ①

کہہ دوائے پیغمبر کہ میں بشر ہوں اور بشر بھی فقط نہیں کہا بلکہ "مِثْلُكُمْ" فرمایا کہ تم جیسا بشر ہوں، یعنی جو تمہارا طریق پیدائش ہے۔ وہی میرا طریق پیدائش ہے۔ جو تمہارا طریق وفات ہے وہی میرا طریق وفات ہوگا جیسے تم پر عوارض بشریت آتے ہیں میرے اوپر بھی آتے ہیں۔ تو میں بشر ہوں اور تم جیسا بشر ہوں۔ ہاں! اللہ نے یہ بزرگی دے دی کہ مجھ پر وحی فرمائی۔ مجھ پر اپنا کلام نازل فرمایا یہ میری خصوصیت ہے جو تم میں سے کسی کو نہیں دی گئی۔

تو یہ بزرگی خدا کی دی ہوئی ہے۔ لیکن دی کس کو؟ بشر ہی کو دی ہے، لیکن اس بزرگی کے آنے کے بعد بشریت کا چولہ نہیں اتر گیا۔ میں بھی اپنی وحی کا اسی طرح متبع ہوں جیسا کہ تمہیں اتباع کی دعوت دے رہا ہوں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ﴾ ② میں کوئی انوکھا رسول نہیں آیا۔ میں وحی کی اتباع کرتا ہوں۔ جس طرح وحی خداوندی کے تم پابند ہو میں بھی پابند ہوں۔ جس طرح تم قانون حق کے پابند ہو۔ میں بھی پابند ہوں۔ یہ تمام چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لئے پیش کرائی گئیں تا کہ واضح ہو جائے کہ آپ بشر ہیں۔

نفیٔ بشریت کا نقصان......اور حقیقت یہ ہے کہ بشریت کی نفی کرنا یہ بدقسمتی کی بات ہے۔ ہماری نوع میں اللہ نے وہ ذات بابرکات پیدا کی کہ تمام مخلوقات میں بڑھ چڑھ کر ہے یہ تو ہماری نوع کو خدا کا شرف ہے کہ ایسا شرف بخشا اور ہم اپنی نوع کی توہین کریں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے نکال دیں کہ آپ بالاتر ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی اور محرومی کی بات ہوگی۔ ہم تو دلائل کی رو سے کہیں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے بشریت کی عظمت واضح ہو۔

بہرحال جہاں معجزات دیئے گئے وہاں عوارض بشریت بھی دیئے گئے تا کہ کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدائی کا شبہ نہ ہو سکے۔

اظہارِ عبدیت کا امر......اسی لئے ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور فرمایا مامور ہو کر: ﴿قُلْ اِنِّيْ

---

① پارہ: ۱۶، سورة الكهف، الآية: ۱۱۰.

② پارہ: ۲۶، سورة الاحقاف، الآية: ۹.

﴿لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللہِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا﴾ ① ’’آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلان کر دیجئے کہ اگر اللہ میری پکڑ کرے تو کوئی مجھے چھڑانے والا نہیں اسی کا فضل و کرم مجھے چھڑا سکتا ہے‘‘۔

اور اس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری چیز یہ ارشاد فرمائی کہ: ’’لَنْ یُّنْجِیَ اَحَدَکُمْ عَمَلُہٗ‘‘ تم میں سے کسی کا عمل کسی کو نجات نہیں دلا سکتا بجز اللہ کے فضل کے تو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ’’وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللہِ؟‘‘ کیا آپ کو بھی آپ کا عمل نجات نہیں دلا سکتا، فرمایا: ’’لَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللہُ بِرَحْمَتِہٖ‘‘ کہ مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ جب تک اللہ ہی کا فضل میری دستگیری نہ فرمائے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یہ عبدیت کے کلمات اس لئے ادا کرائے جاتے ہیں تا کہ کسی کو ان کی الوہیت کا شبہ نہ ہو جائے۔ ان کی خدائی کا شبہ کسی کو نہ گزر جائے اس لئے یہ تمام چیزیں پیش آتی ہیں۔ ②

دورِ بعثت کا اجمالی حال..... غرض مشرکین میں نبوت کا تصور یہ تھا کہ وہ بشریت سے بالاتر کوئی چیز ہے کہ نبی نہ کھائے نہ پیئے تو کہتے تھے۔ ﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ﴾ ③

بہر حال خدا کے بارے میں بھی رسول کے بارے میں بھی اس قدر ظلمت عالم پھیل چکی تھی۔ مکہ کے اندر بھی مکہ کے اردگرد بھی اور چہار طرف قلوب میں ظلمت اور اندھیری چھا گئی تھی۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: ’’اِنَّ اللہَ نَظَرَ اِلٰی قُلُوْبِ بَنِیْ اٰدَمَ فَمَقَتَ عَرَبَھُمْ وَعَجَمَھُمْ‘‘ ④ اللہ نے انسانوں کے دلوں کی طرف نگاہ کی تو غضبناک نگاہ سے دیکھا۔ کوئی شمہ خیر کا باقی نہیں رہ گیا تھا ’’اِلَّا غُبَّرَ اَھْلُ الْکِتٰبِ‘‘ اہل کتاب میں سے چند گنے چنے افراد جو حق کے اوپر قائم تھے، وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بیٹھ کر اپنے دین کو بچا رہے تھے۔ مخلوق سے الگ تھے۔ حق کے لئے عام مجامع کے اندر، عام اجتماعات اور عام بستیوں میں گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی تو حق پر جمنے کے لئے لوگ پہاڑوں کی کھوہ میں جاتے تھے تا کہ دین کو سلامت رکھ سکیں۔ تو عقائد، اعمال، اخلاق اور رسوم کی ظلمت پھیل چکی تھی۔ ہر طرف اندھیریاں چھا گئی تھیں۔ ان اندھیریوں میں ایک تیز روشنی کی ضرورت تھی کہ ان تمام ظلمات کے پردے چاک ہوں۔ اور روشنی سامنے آئے جس سے عقائد، اعمال اور احوال درست ہوں۔ تو اس شدید ترین اندھیری کو دفع کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔

شانِ تشریف آوری..... آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس شان سے دنیا میں تشریف لائے کہ آپ کے دائیں ہاتھ میں سورج تھا اور آپ کے بائیں ہاتھ میں چاند تھا۔ اکٹھی دو روشنیاں لے کر آپ تشریف لائے۔ غالباً آپ کو یہ شبہ ہو گا کہ ہم نے یہ کسی تاریخ میں نہیں پڑھا۔ کسی حدیث میں نہیں پڑھا کہ آپ کے ہاتھ میں چاند اور سورج ہوں۔ یہ

---

① پارہ: ۲۹ سورۃ الجن، الآیۃ: ۲۲. ② الصحیح لمسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب لن یدخل احد الجنۃ بعملہ بل برحمۃ اللہ تعالیٰ ج: ۴ ص: ۲۱۶۹. ③ پارہ: ۱۸، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷. ④ الصحیح لمسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا، باب الصفات التی یعرف بھا فی الدنیا اھل الجنۃ واھل النار، ج: ۴ ص: ۲۱۹۷ رقم: ۲۸۶۵.

ایک نئی سی بات ہے۔ تو میں عرض کرتا ہوں کہ آپ صبر وسکون سے کام لیں۔ بلا شبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند تھا۔ سورج سے کیا مطلب ہے؟ یعنی دائیں ہاتھ میں اللہ کی چمکتی ہوئی کتاب تھی۔ اور بائیں ہاتھ میں قلب نبوت تھا۔ جس میں اخلاق کی روشنی بھری ہوئی تھی۔ کتاب اللہ کے اندر الوہیت کا جلال بھرا ہوا تھا۔ اگر فقط کتاب اللہ سامنے آئی اور پیغمبر نہ آتے تو الوہیت کا جلال مخلوق کو بھسم کر دیتا، مجال نہ تھی کہ کوئی اس کو سمجھ سکے اس کی روشنی کو قلب نبوت میں اتارا گیا تو نبوت کی عبدیت کے ساتھ جب الوہیت کا نور اس پر فائز ہوا تو ٹھنڈک پیدا ہوئی جس کو انسان سہہ سکیں۔ تو سورج اللہ کی کتاب تھی اور چاند جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک تھا جو کمالات اخلاق کا مرکز تھا۔ اس طرح سے آپ دنیا میں تشریف لائے، یعنی جلال بھی تھا اور جمال بھی۔ خدا کی کتاب کے اندر جلال تھا اور قلب مبارک کے اندر شان جمالی تھی۔

جامعیت شریعت...... اس لئے شریعت مقدسہ میں دونوں شانیں موجود ہیں۔ رحمۃ للعالمین کی شریعت ہے جس میں عفو ودرگذر اور معافیاں بھی ہیں اور ساتھ ساتھ حدود وقصاص اور جہاد بھی ہے چور چوری کرے تو ہاتھ کاٹ دو، زانی زنا کرے تو سنگسار کر دو جہاں شریعت کے اندر رحمۃ للعالمینی ہے۔ وہاں جلالی شانیں اور تعزیرات و عقوبات بھی موجود ہیں۔ اسی لئے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بُعِثْتُ مَرْحَمَةً وَّمَلْحَمَةً'' ''میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں اور جنگ مجسم بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں۔ مطیعوں کے لئے رحمت ہوں اور مجرموں کے لئے غضب مجسم ہوں''۔ اسی طرح فرماتے ہیں: ''اَنَا الضَّحُوْکُ الْقَتَّالُ'' میں بہت زیادہ ہنس مکھ بھی ہوں۔ اور بہت زیادہ قتال کرنے والا بھی ہوں۔ یعنی رحمت کی شان بھی ہے۔ اللہ کی رحمت میرے اندر سرایت کئے ہوئے ہیں اور غضب کی شان بھی ہے کہ خدا کے غضب سے اس کے منکروں کے مقابلہ میں غضب مجسم بنتا ہوں۔ غرض دونوں شانیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرمائیں۔ بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں روشنیاں لے کر آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات فی الحقیقت ایک نور ہے، کیسا نور تھی؟

حق و باطل میں امتیاز کا نور...... جیسی ظلمت آپ کے سامنے ابھی آئی ویسا ہی نور تھا۔ جہالت، اخلاق وعقائد کی ظلمت بنی آدم میں تھی جبلت کی شہوتیں، جبلت کی ظلمتیں یہ ایسی ظلمات ہیں۔ جن سے حق و باطل میں امتیاز نہیں ہوتا تو ان ظلمتوں کے لئے ویسے ہی نور کی ضرورت تھی کہ یہ ظلمتیں رفع ہوں۔ چاندنے میں حق و باطل نظر آئے۔ حق و باطل اس سورج کی روشنی میں نظر نہیں آتا۔ وہ پیغمبر کی روشنی میں نظر آتا ہے۔ جو علم اور کمالات اخلاق کی روشنی ہے۔ حقیقت میں نبوت نورانی ہے۔

غرض جس طرح کی ظلمتیں میں نے عرض کیں یہ ظلمتیں وہ نہیں ہیں جو سورج کے ڈوبنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ حسی اور مادی ظلمت ہے اور جہالت وبداخلاقی کی ظلمت یہ معنوی ظلمت ہے جو قلب میں پیدا ہوتی ہے جیسے حدیث

میں فرمایا گیا کہ ''اَلظُّلْمُ ظُلُمٰتٌ'' ① (ظلم یہ ظلمت وتاریکی ہے۔ عدل روشنی ہے تو عدل کی روشنی سورج کی طرح سے نہیں ہے۔ علم کی روشنی سورج کی روشنی کی طرح نہیں ہے، مگر سورج کی روشنی اس روشنی کے سامنے ماند ہے۔

سورج فقط مکان کو روشن کرتا ہے اور علم کی روشنی قلوب اور ارواح کو روشن کرتی ہے سورج سے فقط زمین اور مکان روشن ہوتا ہے، اور علم سے زمان، مکان اور اعیان سب روشن ہو جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نور خداوندی ہیں۔ مگر مادی نور نہیں ہیں معنوی نور ہیں۔ یعنی علم الٰہی کا پرتو جو آپ کے اوپر پڑا ہے وہ عالم میں کسی کے اوپر نہیں ڈالا گیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ: ''اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ'' ② اس روایت کو بعض نے ضعیف اور بعض نے موضوع کہا ہے لیکن اس کا مضمون صحیح ہے، کیوں کہ قرآن کریم نے دعوی کیا کہ: ﴿قَدْجَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ﴾ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور پہنچا۔ اور نور سے مراد ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو ''اول ماخلق اللہ نوری'' کو دیکھا جائے تو اگر چہ حدیث موضوع بھی ہو مگر مضمون کے لحاظ سے صحیح ہے، کیوں کہ قرآن کے ساتھ موید ہے۔ بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں۔ مگر معنویت کا نور ہیں۔ روحانیت کا نور ہیں۔ اخلاق کا نور ہیں۔ کمالات خداوندی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ظہور کرتے تھے۔ جلوہ کرتے تھے اس کی روشنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر تھی، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مظہر اتم تھے۔ اللہ کے کمالات کے جس طرح سے یہ بجلی کی روشنی آپ کے سامنے ہے۔ فیوز جو ہے اس کے اندر ایک بہت معمولی سا تار ہے، لیکن جب اس کا کنکشن پاور ہاؤس سے ہو جاتا ہے تو وہ اتنا روشن ہو جاتا ہے کہ میدانوں کو چمکا دیتا ہے۔ تو اصل میں روشنی پاور ہاؤس سے آتی ہے۔ خود اس کے تار کے اندر روشنی نہیں ہے لیکن منور ہو کر تار کی ہستی نظر نہیں آتی۔ روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔ ایسے میں اگر تار کہہ دے: ''اَنَا النُّوْرُ'' میں تو خود نور ہوں۔ تو وہ کہہ سکتا ہے لیکن حقیقت میں نور اور ہے اس کی ذات اور ہے اس کی ذات پر، نور نے جلوہ کیا ہے۔ وہ نور کا مظہر بن گیا۔ اسی واسطے نور بھی کہہ جا سکتا ہے اور جب ذات کی طرف نگاہ جائے گی تو کہا جائے گا کہ میں تو تار ہوں۔ روشنی دوسرے کی ہے جو میرے اندر آرہی ہے۔ انبیاء علیہم السلام وہ صلاحیتیں لے کر آتے ہیں کہ علوم خداوندی ان کے اندر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اخلاق ربانی ان کے اندر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ تو یہ نور معنوی نور ہے جیسا کہ وہ ظلمت معنوی ظلمت تھی۔ معنوی ظلمت کے رفع کرنے کے لئے معنوی نور کی ضرورت تھی۔ آفتاب کا نور اسے زائل نہیں کر سکتا تھا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات نور بن کر آئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو دیکھ کر مخلوق نے یہ سمجھ لیا کہ حق یہ ہے، باطل یہ ہے، نیکی اسے کہتے ہیں، بدی اس کہتے ہیں۔ آپ کے اعمال، اخلاق اور پاکیزہ کردار کو دیکھ کر دنیا کے سامنے معیار آ گیا اور سمجھا کہ نیکی کس چیز کا نام

---

① الصحیح للبخاری، کتاب المظالم والغصب، باب الظلم ظلمات یوم القیامة، ج: ۲ ص: ۸۶۴ رقم: ۲۳۱۵.

② قال العلامة اللکھنوی: وقد اشتھر بین القصاص حدیث "اول ماخلق اللہ نوری" وھو حدیث لم یثبت بھذا لمعنی وان ورد غیرہ موافق له فی المعنیٰ دیکھئے: الآثار المرفوعة ج: ۱ ص: ۴۳.

ہے۔خلق حسن کس چیز کا نام ہے۔کمال کس چیز کا نام ہے۔عیب کس چیز کا نام ہے۔

گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ تک پہنچنے کے راستہ کے لئے روشنی تھے۔اس کے بغیر راستہ نظر نہیں آ سکتا تھا۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشعل نور بن کر تشریف لائے اور راہ خداوندی لوگوں کے سامنے کھل گئی۔

راہنمائے حق......راہنما کیا چیز ہے؟ حقیقت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تو مشعل نور ہے جس سے راہ کھلی، لیکن راہ کے لئے راہنما کی بھی ضرورت ہے تو راہنما آپ کی سنتیں۔آپ کے افعال اور کردار ہیں۔اسوہ حسنہ جس کو سیرت کہا جاتا ہے۔وہ اسوہ حسنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور احوال کا مجموعہ ہے۔فی الحقیقت وہ راہنما ہے تو یہ ایک نور راہ آیا جس سے راستہ روشن ہوا اور ایک راہنما آیا۔وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے جو راہنمائی کرتی ہے کہ اس طرح سے چلو۔

اسوۂ عمل......آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر جو اعمال کا نمونہ پیش کیا فقط آپ نے قانون نہیں پیش کر دیا۔قانون کے ساتھ اپنا اسوہ بھی پیش کیا۔آپ نے فقط یہ نہیں فرمایا کہ "صَلُّوْا" نماز پڑھو بلکہ یہ فرمایا کہ: "صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ أُصَلِّیْ" نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔اسی نمونے کی نماز پڑھو۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ عمل بن کر دنیا کے اندر آئے۔آپ کی سیرت عمل کے لئے راہنما تھی جس کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہوگی وہ نماز صحیح پڑھے گا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سامنے نہیں ہوگی۔نماز صحیح نہیں پڑھ سکتا۔تو یہ نہیں فرمایا کہ "صَلُّوْا" بلکہ فرمایا: "صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ أُصَلِّیْ" اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا۔فقط آرڈر نہیں دیا بلکہ وضو کر کے دکھلایا ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا۔تو تمام اعضا کو ایک ایک دفعہ دھویا۔اور فرمایا: "هٰذَا وُضُوْءٌ لَا یَقْبَلُ اللهُ صَلٰوةً إِلَّا بِهٖ" یہ وضو ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتے۔اگر ایک دفعہ بھی اعضا کو نہ دھویا جائے تو وضو ہی نہ ہوگا۔اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ وضو فرمایا اور اعضاء کو دو دو مرتبہ دھویا اور فرمایا کہ یہ وضو ہے جو "نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ" ہے۔اور اس کے بعد تیسری مرتبہ وضو کیا۔تو تین تین دفعہ اعضاء وضو کو دھویا، اور فرمایا کہ: "هٰذَا وُضُوْئِیْ وَوُضُوْءُ الْأَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِیْ" یہ میرا وضو ہے اور میرے سے پہلے جتنے انبیاء تھے وہ یہی وضو کرتے تھے۔

ضرورتِ مربی......تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط یہ نہیں فرمایا کہ: "تَوَضَّؤُوْا" لوگو وضو کرو بلکہ کر کے دکھلایا کہ اس طرح سے کرو کیوں کہ عمل کی بہت سی خصوصیات ہوتی ہیں جو بلا عامل کی ہیئت کے سمجھ میں نہیں آ سکتیں، الفاظ سے آدمی عمل کی ہیئت نہیں بنا سکتا۔جب تک کہ عمل کی ہیئت سامنے نہ ہو۔دین ہی میں نہیں بلکہ ہر صنعت میں ہر حرفت میں یہی طریقہ ہے کہ محض اصول اور کتاب کافی نہیں ہوتے جب تک کر کے دکھلانے والا کوئی مربی اور استاد سامنے نہ ہو۔خیاطی کا فن ہے۔آپ پانچ سو صفحے کی کتاب پڑھ جائیں۔جس میں یہ اصول ہوں کہ کپڑے سینے کے یہ یہ طریقے ہیں لیکن جب تک درزی کو سوئی چلاتے ہوئے نہیں دیکھیں گے آپ کو سوئی چلانی

آئے گی نہیں کیوں کہ عمل کی ایسی باریکیاں ہوتی ہیں جو کاغذ پر نہیں آسکتیں کر کے دکھلانے والا جب تک اس ہیئت سے کر کے نہ دکھلائے۔

اسی واسطے حضرات محدثین نے جہاں جہاں احادیث کی روایت کی ہے وہاں خود بھی عمل کر کے دکھلایا ہے اور اپنے عمل کو روایت کے مطابق کیا ہے۔ میں نے مشکوۃ شریف اپنے والد بزرگوار رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی مشکوۃ شریف میں جب یہ باب آیا کہ نماز کس طرح پڑھنی چاہئے، تو رکوع کی بحث آئی تو رکوع کی روایت کو پڑھ کر اور اسے سمجھا کر خود والد مرحوم نے جماعت کے اندر رکوع کر کے دکھایا کہ یوں کرنا چاہیے، جب سجدے کی روایت آئی تو اسے پڑھا کر سجدہ کر کے دکھلایا کہ یوں کرنا چاہئے، تو ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ ہم تو رات دن رکوع و سجدہ کرتے ہیں۔ اس میں درس کے دوران جماعت میں کر کے دکھلانے کی کیا ضرورت تھی؟

فرمایا کہ: یہ میں نے اس لئے دکھلایا کہ جب میں نے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تھی تو انہوں نے بھی مجھے یونہی کر کے دکھلایا تھا اور فرمایا کہ: جب میں نے شاہ عبدالغنی محدث دہلوی سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی اس موقع پر یونہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جب میں نے شاہ اسحاق صاحب سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی مجھے یوں ہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ اسحاق صاحب نے فرمایا کہ: جب میں نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے حدیث پڑھی تو انہوں نے حدیث سمجھا کر یوں ہی رکوع اور سجدہ کر کے دکھلایا تھا اور کہا کہ: مجھے شاہ ولی اللہ نے یونہی کر کے دکھایا تھا اور شاہ ولی اللہ نے کہا کہ: مجھے شیخ ابو طاہر مدنی نے یونہی کر کے دکھلایا تھا اور آخر تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچادی۔

تسلسل ہیئت عمل...... تو محدثین جہاں الفاظ کی روایت کرتے ہیں وہاں ہیئت عمل کو بھی کر کے دکھاتے ہیں، یعنی الفاظ فقط اصول کا نام نہیں، بلکہ تاریخ بھی اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ کوئی قانون قانون نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ اس کی تاریخ نہ ہو۔ تو روایات حدیث کے ساتھ امت کا تعامل بھی موجود ہے۔ اس میں اس عمل کے بارے میں راہنمائی ہوتی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عمل کیا صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس عمل کی نقل کی تابعین نے اس عمل کی نقل کی روایت بھی پیش کی۔

اسی واسطے بعض روایات جو مسلسل بالاولیات کے نام سے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی روایت کو ظاہر فرمایا اور ایک حکم دیا اور اسی مجلس میں اس کو کر کے دکھلایا تو محدثین روایت کے ساتھ ساتھ سند اور اس کو کر کے دکھاتے چلے آتے ہیں۔

مثلاً حدیث "مُسَلْسَل بِالْمَآءِ وَالتَّمَر" یہ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی فضیلت بیان کی اور بیان کر کے خود کھائی اور اپنا اولش (کھجور کا بقیہ) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیا اور کٹورے میں پانی پیا اور بچا ہوا پانی عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو پلایا۔ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے

اپنے شاگرد کو کھجور کی فضیلت کی یہ حدیث سنائی تو فضیلت بیان کر کے اسی طرح کھجور کھائی اور بقیہ نصف اپنے شاگرد کو کھلائی اس طرح پانی پیا اور بچا ہوا اپنے شاگرد کو پلایا۔ اسی طرح تابعین نے تبع تابعین کو، تبع تابعین نے اتباع تبع تابعین کو کہا یہاں تک کہ سند ہم تک پہنچ گئی۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث سہارنپوری اکابر علماء میں سے گزرے ہیں۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور جو مشہور ہے۔ اس کے حضرت صدر مدرس تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ کے خلفاء میں سے تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ حضرت مولانا کے ساتھ سفر میں ساتھ ہوا۔ حضرت میرٹھ جا رہے تھے راستے میں مجھ سے فرمایا کہ: اس وقت میری حدیث کی سند پوری جماعت میں سب سے زیادہ عالی اور بلند ہے میں ایک واسطے سے حضرت شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد ہوں۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ تجھے سند کی اجازت دوں اس کے لئے تو خود سہارنپور آ کر اجازت لے، میں نے عرض کیا کہ: حضرت میں ضرور حاضر ہوں گا۔ لڑکپن کی بات تھی اور ابالی پن کی وجہ سے بھول بھال گیا۔ ایک برس گزر گیا پھر اتفاق سے سفر میں ساتھ ہوا۔ پھر یہی ارشاد فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ اب میں حاضر ہوں گا پھر برس چھ مہینے کے قریب گزر گئے، چھ مہینے کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لئے جا رہے ہیں۔ اب میں نے سوچا کہ اگر یہ سند نہ لی تو میں محروم ہو جاؤں گا۔ اس لئے میں نے سہارنپور کا سفر کیا حضرت بہت خوش ہوئے۔ مولانا محمد زکریا صاحب جو آج مظاہر العلوم کے شیخ الحدیث ہیں سے فرمایا کہ حدیث کی جتنی کتابیں مظاہر العلوم کے کتب خانے میں ہیں وہ سب لے آؤ۔ تو ساری صحاح ستہ معاجم، مسانید اور سنن سب کتابیں آ گئیں اور اجازت دی تو حضرت نے بہت سی کتابوں کا اول مجھ سے پڑھوایا اور بعض کتابوں کو خود پڑھا اس کے بعد فرمایا کہ مسلسل بالاولیات بھی لے کر آؤ تو الیانع الجنی لائی گئی جس میں وہ روایتیں جمع ہیں۔ جو اولیات کے ساتھ مسلسل ہیں جن میں عمل کے ساتھ ہیئت عمل کی ضرورت ہے تو کھجور بھی منگوایا اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بیان کی کہ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی فضیلت بیان کر کے خود کھائی اور انہیں کھلائی پانی پیا اور بچا ہوا پانی پلایا۔ تو خود کھجور کھا کر مجھے کھلائی، خود پانی پیا اور بچا ہوا مجھے پلایا۔ اس عمل کی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک ملا دی غرض محدثین جہاں حدیث کی روایت کرتے ہیں وہاں اس کے تعامل کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ اس کی صفات اور کیفیات کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ حدیث کے درس میں جب "رَنَّةُ النِّيَاحَةِ" ① کی حدیث آئی یہ زمانہ اہلیت میں رسم تھی کہ جب کوئی بڑا آدمی مر جاتا تھا تو وہ وصیت کر کے مرتا تھا کہ مجھ پر چھ مہینے تک رونا۔ تاکہ یہ سمجھا جائے کوئی بڑا آدمی مرا ہے۔ کوئی ایک برس کی کوئی دو برس تک رونے کی وصیت کرتا تھا۔

اب ظاہر بات ہے کہ برس دن رونے کے لئے کس کی آنکھ میں اتنے آنسو رکھے ہوئے ہیں۔ کہ ایک برس تک

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الجنائز، باب التشديد في النياحة، ج: ٢ ص: ٦٤٤ رقم: ٩٣٤.

رویا جائے۔اس لئے رونے والیاں کرایہ پر رکھی جاتی تھیں جو چھ مہینے برس دن تک روتی تھیں اور طریقہ ان کا یہ ہوتا تھا کہ جہاں کوئی تعزیت کرنے والا آیا۔اورانہوں نے دیکھا کہ کوئی آرہا ہے تو دوڑ کر آئیں اور حلقہ بنا کر بیٹھ گئیں۔اور جب وہ قریب پہنچا تو انہوں نے راں راں کرنا شروع کر دیا۔"وَا کَـذَا وَا جَمَلَا ا" ہائے تو ایسا تھا۔تو ویسا تھا۔جب تعزیت کرنے والا چلا گیا تو انہوں نے بھی رونا موقوف کر دیا پھر کوئی آیا پھر شروع کر دیا تو شہرت ہوتی تھی کہ بڑا آدمی مرا ہے کہ رونا ہی نہیں تھمتا تو کرایہ پر رونے والیاں رکھی جاتی تھیں اور وہ بیان کر کے روتی تھیں۔ماتم کرتی تھیں۔

تو جب یہ حدیث آئی تو میرے والد صاحب نے اس راں راں کی نقل اتاری ہم لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس کی کیا ضرورت تھی تو والد محترم نے فرمایا کہ: مولانا گنگوہی نے بھی یوں ہی نقل اتاری تھی اور انہوں نے فرمایا تھا کہ شاہ عبدالغنی نے بھی یوں ہی نقل اتاری تھی۔آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچا دی، بہر حال عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تو مشعل نور تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھ کر عرش تک پہنچنے کا راستہ نظر آجاتا تھا کہ یہ حق ہے اور فلاں راستہ باطل ہے نور اور ظلمت میں امتیاز ہو جاتا تھا اور راہنما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں تھیں۔آپ کا طریق عمل تھا جس سے آدمی حق کا راستہ پاتا تھا حج اس طرح کرتے ہیں، روزہ اس طرح، نماز اس طرح، جہاد اس طرح کرتے ہیں۔انفاق فی سبیل اللہ، معاشرت، معیشت، صلح و امن کا یہ طریقہ ہے سب چیزیں آپ نے عملی طور پر کر کے دکھلائیں۔

عملی قرآن.....تو کتاب اللہ میں جو چیزیں علمی شکل میں موجود تھیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں وہ چیزیں علمی شکل میں موجود تھیں، اس لئے اللہ کا علمی قرآن وہ ہے جو اوراق اور کاغذوں میں موجود ہیں اور عملی قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔جو قرآن میں لکھا ہوا تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا ہوا موجود تھا۔اسی واسطے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور سیرت کیا تھی تو فرمایا۔"کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ" اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت دیکھنی ہے تو اول سے آخر تک قرآن پڑھتے جاؤ۔یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تھی یعنی جو اس میں لکھا ہوا ہے وہی آپ کے اندر عملی شان سے موجود ہے جو چیزیں اس میں اقوال کی شکل میں موجود ہیں۔وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں احوال کی شکل میں موجود ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں راہنما ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نہ آتی تو راہنمائی ناممکن تھی۔

طریقۂ تعلیم خداوندی......اس سے اندازہ ہوا کہ عمل کے لئے اور دین کی راہ قطع کرنے کے لئے محض کتاب اللہ کافی نہیں جب تک کہ شخصیت ساتھ نہ ہو۔محض لٹریچر کافی نہیں ہے جب تک کہ کوئی شخصیت راہنمائی نہ کرے۔یہی وجہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ خیر و برکت تک تعلیم کا یہی طریقہ اللہ نے رکھا کہ کتاب بھی بھیجی اور کتاب کے ساتھ معلم کتاب بھی بھیجے۔آدم علیہ السلام کو صحیفے دیئے گئے تو خود ان کو بھی ساتھ بھیجا گیا، ادریس علیہ السلام کو پچاس صحیفے دیئے گئے تو حضرت ادریس علیہ السلام بھی ساتھ بھیجے گئے۔

اگر صحف ابراہیم بھیجے گئے تو ابراہیم علیہ السلام بھی ساتھ بھیجے گئے۔ تورات آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ساتھ آئے اگر انجیل آئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ساتھ آئے۔ زبور آئی تو حضرت داؤد علیہ السلام بھی ساتھ بھیجے گئے اور قرآن آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات آئی۔

اس لئے اگر پیغمبر نہ آئیں تو محض کتاب کے الفاظ سے آدمی مرادِ ربانی کو نہیں سمجھ سکتا۔ اگر سمجھ جاتا تو پیغمبروں کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کتاب اللہ کو بیت اللہ کی چھت پر رکھ دیا جاتا اور اعلان کر دیتے کہ اے لوگو! تم مریضانِ نفوس ہو اور یہ ”شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ“ ہے۔ جاؤ! اسے لے جاؤ اور اپنا اپنا علاج خود کر لو اگر اٹھا کر لوگ لے جاتے تو مرادات ربانی ان کی سمجھ میں نہ آتیں جب تک پیغمبر تعلیم نہ دیتے۔

انبیاء علیہم السلام کی احتیاج...... اس واسطے کہ کلام کی مراد سمجھنے کے لئے کبھی لب و لہجے کی بھی ضرورت پڑتی ہے، کاغذ پر جو کلام لکھا جاتا ہے۔ تو اس میں کلام کی کیفیات کاغذ پر نہیں آتیں وہ لب و لہجے اور ہیئت سے سمجھ میں آتی ہیں۔ ماحول سے سمجھ میں آتی ہیں محض کاغذ اور کاغذ کے کالے حروف سے سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ہماری اردو زبان کا ایک جملہ ہے ”کیا بات ہے“ عام طور سے بولا جاتا ہے۔ اس کے کئی معنی آتے ہیں اور سارے معنوں کا تعلق لب ولہجہ سے ہے۔ اگر میں یوں کہوں کہ بھئی! کیا بات ہے؟ آپ یوں سمجھیں گے کہ میں سوال کر رہا ہوں، پوچھ رہا ہوں کہ کیا بات ہے، کیا واقعہ گذرا ہے؟ اور اگر میں یوں کہوں: کیا بات ہے، اب آپ کیا سمجھے؟ اب آپ یہ سمجھے کہ میں نے بڑائی بیان کی کہ فلاں چیز کی کیا بات ہے وہ تو بہت بڑی چیز ہے اور اگر میں یوں کہوں کہ ”کیا بات ہے“ اب آپ کیا سمجھے؟ اب آپ یہ سمجھے کہ میں نے ایک چیز کی تحقیر کی ہے کہ نہایت ذلیل چیز ہے کیا بات ہے اور اگر میں یوں کہوں کہ کیا بات ہے۔ اب آپ سمجھیں گے کہ میں نے تعجب کا اظہار کیا تو ایک ہی جملہ ہے اس کے معنی وسوال، تعجب تفخیم شان اور تحقیر شان کے آتے ہیں۔ لیکن ہر معنی کا تعلق لب و لہجے سے ہے۔ کاغذ اور کالے نقوش سے نہیں اب اگر آپ کسی کے سامنے کاغذ پر لکھ کر بھیج دیں کہ ”کیا بات ہے“ وہ مطلب سمجھے گا جو اس کے ذہن میں کیفیت ہے۔ وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی اس کی اپنی طبعی گھڑی ہوئی مراد ہوگی اور متکلم کے سر تھوپ دے گا۔

حالانکہ مراد اپنی ہوگی۔ تو ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم کا ایک لب ولہجہ ہے اگر قرآن کے ساتھ بیان کرنے والے مربی نہ آتے، لب ولہجہ، ماحول اور ہیئت کذائی سے نہ سمجھاتے تو قرآن کریم سے اللہ کی مرادیں سمجھنا آپ کے لئے ممکن نہ ہوتا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لب و لہجے، طریق عمل اور ہیئت کذائی سے سمجھایا۔ حدیث میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا واقعہ فرمایا گیا۔ جب قرآن کریم کی یہ آیت اتری ﴿ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ رمضان کی راتوں میں کھاؤ اور پیو جب تک فجر طلوع نہ کرے، اس کو اس طرح تعبیر کیا کہ اس وقت تک کھاؤ، پیو۔ جب تک فجر کا سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے ممتاز نہ ہو جائے تو سفید ڈورے سے مراد صبح صادق ہے جو پوپھٹتی ہے اور ایک لمبی لے کر آسمان پر کھنچ جاتی ہے اور سیاہ

ڈورے سے رات کی تاریکی مراد ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے ایک ڈورا تو کالا لیا اور ایک سفید اور دونوں تکئے کے نیچے رکھ لئے کھاتے پیتے رہے تکیہ اٹھایا دیکھا کہ اتنا اندھیرا ہے کہ سیاہ ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہیں ہوتا۔ پھر کھاتے پیتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح صادق بھی ہوگئی پندرہ بیس منٹ اوپر گزر گئے کیوں کہ صبح صادق کے بعد کچھ دیر اندھیرا رہتا ہے، مگر چوں کہ کالا ڈورا سفید ڈورے سے الگ اور نمایاں نظر نہیں آیا اس لئے کھاتے پیتے رہے۔ جب اتنا چاندنا ہو جاتا کہ دونوں ڈورے الگ الگ نظر آنے لگتے تب روزے کی نیت کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کی اطلاع دی گئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ فرمایا تم کیا عمل کرتے ہو؟ انہوں نے کہا حضرت! قرآن شریف میں یہ آیت نازل ہوگئی ہے:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ①

تو میں نے کالا اور سفید ڈورا اپنے تکئے کے نیچے رکھ لیا ہے تا کہ دیکھتا رہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِیْضٌ" تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ کالا سفید دونوں ڈورے اس کے نیچے آگئے۔ بندہ خدا کالے ڈورے سے مراد رات کی تاریکی اور سفید ڈورے سے مراد صبح صادق کی سفیدی ہے، تو نے روئی کے دھاگے سمجھ لئے۔ تو لغت کے لحاظ سے صحیح سمجھے، مگر اللہ کی مراد نہیں تھی، مراد سمجھانے والے پیغمبر تھے۔ اگر مراد پیغمبر نہ سمجھائیں تو کالا ڈورا اور سفید ڈورے سے وہ روزہ رکھنا شروع کرتے روزہ رکھتے رہتے کوئی ملامت اس پر نہ ہوتی۔ مگر وہ مرادِ خداوندی نہ ہو سکتی، غرض بعض دفعہ لغت ہوتی ہے مرادِ خداوندی دوسری ہوتی ہے۔ عرفی معنی مراد ہوتے ہیں۔

تعینِ مراد میں عرف کا دخل ...... ہمارے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ "سونے پر سہاگہ" تو لغتہً تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سونا رکھ کر سہاگہ اس کے اوپر چھڑک دو، لیکن مراد یہ نہیں مراد عرفِ عام میں یہ ہے کہ جب کسی چیز میں خیر کا مبالغہ بیان کیا کرتے ہیں۔ اس وقت کہتے ہیں کہ سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ یعنی سونا تو اپنی ذات سے عمدہ ہی تھا اور سہاگہ لگنے کے بعد کندن بن گیا، یعنی اس کی خوبی بڑھ گئی۔ عرفِ عام اور اہلِ زبان میں رہ کر یہ محاورے سمجھ میں آتے ہیں پھر ان کی لطافت محسوس ہوتی ہے۔ کوئی محض ڈکشنریاں دیکھے اور اہلِ عرف سے قطع نظر کر دے تو وہ یہ سمجھے گا کہ سونا رکھ کر سہاگہ پیس کر اس پر چھڑک دے تو اہلِ عرف اس کی بات پر ہنسیں گے کہ یہ عرف کو جانتا ہی نہیں۔ ہمارے ہاں ہمارے اساتذہ میں آپ کے ضلع ہزارہ کے حضرت مولانا غلام رسول خان صاحب تھے، اردو پوری طرح نہیں بول سکتے تھے۔ جیسے سرحد کے لوگ بول سکتے ہیں۔ ویسی ہی بولتے تھے اور دعوی مولانا کو یہ تھا کہ میں سب سے زیادہ اردو جانتا ہوں۔ تو ایک موقع پر دار العلوم کے تمام اساتذہ جمع تھے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان کے بھائی مولانا محمد حسن صاحب وغیرہ تو مولانا محمد حسن صاحب نے کہا کہ: میاں مولوی غلام رسول! چالیس برس سے تم دار العلوم دیوبند میں مدرسی کر رہے ہو اور تمہیں اردو بولنی نہیں آئی۔ مولانا کو غصہ آگیا کہنے لگے:

① پارہ: ۲، سورة البقرة، الآية: ۱۸۷.

’’میں اردو نہیں جانتا؟‘‘۔ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اردو جانتا ہوں مگر اس زبان کو لغو سمجھتا ہوں اس لئے بولتا نہیں ہوں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ: آپ ہندوستانیوں سے زیادہ سمجھتے ہیں؟ کہا کہ ہاں! انہوں نے کہا کہ بتاؤ اس کے کیا معنی ہیں۔ ’’کریلا اور نیم چڑھا؟‘‘ اب مولانا چپ بیٹھے کہ اس کا کیا مطلب کہ ’’کریلا اور نیم چڑھا‘‘۔

کہنے لگے کہ: اس عطف (لفظ اور) نے کام خراب کر رکھا ہے ورنہ معنی ظاہر تھے حکیم صاحب نے کہا کہ چلو تم عطف نکال دو۔ ’’کریلا نیم چڑھا‘‘ اس کا مطلب بتلا دو کہنے لگے اب معنی ظاہر ہے کہ کریلا آدھا کچا آدھا پکا۔ سارا مجمع ہنس پڑا۔ اب ظاہر بات ہے کہ مولانا نے لغت کی مدد سے یہ معنی بیان کئے اہل عرف میں کبھی رہے نہیں تھے کہ اس محاروے کی حقیقت کو سمجھتے۔ ’’کریلا‘‘ لیا اردو کا ’’نیم‘‘ فارسی کا لیا چڑھا لیا ہندی کا اور تینوں چیزوں کو ملا کر ایک معنی بنا دیئے تو اس معنی پر اہل عرف کو ہنسنا ہی تھا یہ معنی مراد تھوڑا ہی ہیں۔

ایسے ہی ہمارے ہاں ضلع سہارن پور میں ایک کلکٹر تھا یہ آج سے چالیس برس کی بات ہے، انہیں بھی یہی دعویٰ تھا کہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں ان کے ہاں پیش کار ہمارے دیوبند کے منشی حبیب حسن تھے بڑے عمدہ شاعر تھے، بڑی شستہ ان کی زبان تھی تو بعض اوقات وہ کلکٹر دعویٰ کیا کرتا کہ ویل! پیش کار۔ ہم تم سے زیادہ بہتر اردو جانتا ہے۔

یہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں کہ یہ کمبخت اردو کیا جانے، اس کی مادری زبان نہیں۔ اہل عرف میں یہ نہیں رہا۔ اسے خواہ مخواہ یہ دعویٰ ہو گیا۔ اب یہ ملازمت کے ڈر کے مارے بول نہیں سکتے تھے کہ کہیں برخاست نہ کردے کہیں روٹی نہ جائے۔

ایک دن کوئی بات آپڑی تو اس کلکٹر نے میز پر جوش کے ساتھ مکہ مار کر کہا کہ ویل پیش کار! تم جاہل ہو اردو سے۔ ہم اردو جانتے ہیں۔ پیش کار کو بھی غصہ آگیا، انہوں نے کہا کہ: میری نوکری رہے یا نہ رہے مگر مجھے اس کے دماغ سے یہ خناس نکالنا ہے۔ اس نے میز پر ایک مکا مارا تھا انہوں نے دو کے مارے اور کہا۔

ویل صاحب بہادر! تم جاہل مطلق ہو تم نہیں جانتا اردو کسے کہتے ہیں ہم جانتے ہیں۔

صاحب کے غصہ کا پارہ چڑھ گیا آسمان پر۔ کہنے لگا تم نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔ کہنے لگے تمہیں کیا خبر اردو کی؟

انہوں نے کہا ویل صاحب بہادر! اچھا میں تمہارا امتحان لیتا ہوں۔ بتلاؤ اس کے کیا معنی ہیں؟ کہ ’’صاحب بہادر سے جب میں نے یہ پوچھا تو بغلیں جھانکتے رہ گئے‘‘ صاحب نے کہا ادھر کو جھانک لیا، ادھر کو جھانک لیا۔ یہ بغلیں جھانکنا ہو گیا۔

وہ ہنس پڑے کہ یہ معنی ہیں؟ تو کہنے لگا اور کیا معنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ: آپ تو ہندوستانیوں سے زیادہ اردو جانتے ہیں۔ آپ بتائیں میں کیوں بتاؤں؟ اب وہ صاحب بہادر بیٹھ کر سوچ رہے ہیں کہ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ بغل ادھر کو جھانک لی بغل ادھر کو جھانک لی۔ بغلیں جھانکنے کا لفظ صادق آ گیا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو

کہنے لگا کہ ویل پیش کار! آپ ہمیں تین دن کا مہلت دیں ہم آپ کو ڈکشنری دیکھ کر بتائے گا۔ انہوں نے کہا کہ حضور تین دن کے بجائے آپ کو ایک ہفتہ کی مہلت ہے اور ساری ڈکشنری دیکھ کر بتائیے گا۔ تو صاحب بہادر نے ڈکشنریاں کھنگالنا شروع کیں۔ لغت کی ہر چھوٹی بڑی کتاب دیکھ ماری۔ ان میں کہیں بھی یہ کیفیت اور ہیئت موجود نہ تھی۔ یہ محاورہ تھا۔ جب صاحب بہادر عاجز ہوگیا تین چار دن کے بعد کہا کہ: ویل پیش کار صاحب ہمیں کسی ڈکشنری میں یہ چیز نہیں ملی بغلیں جھانکنا تو لکھا ہے مگر اور کچھ نہیں نکلتا۔

انہوں نے کہا: حضور قیامت تک اور کچھ نکلے گا بھی نہیں۔ پھر اس نے کہا اچھا آپ بتلائیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نہیں بتلاتا آپ ہندوستانیوں سے زیادہ اردو جانتے ہیں۔ کہا آپ بتلا دیں، انہوں نے کہا تو بہ کریں آئندہ میں یہ نہیں کہوں گا میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں۔ یہ صاحب بہادر پر بڑا شاق گذار، مگر جہالت کا اقرار کر چکے تھے تو مجبوراً انہیں کہنا پڑا کہ اچھا اب ہم نہیں کہیں گے۔ تب انہوں نے بتلایا کہ بغلیں جھانکنا لغتہ اس کے معنی یہ ہیں ہے کہ بغل میں ادھر کو جھانک لیا ادھر کو جھانک لیا مگر عرف میں اسکے معنی یہ ہیں کہ بغلیں جھانکنا یہ تحیر کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ جب آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ بغلیں جھانکتا رہ گیا۔ اس سے کوئی بات بن نہیں پڑی۔ کوئی جواب نہیں بن پڑا تو یہ حیرت سے کنایہ ہے۔

ہر زبان میں یہ چیز ہوتی ہے کہ ایک لغوی معنی ہوتے ہیں، ایک اصطلاحی اور ایک عرفی معنی ہوتے ہیں۔ فارسی کا محارہ ہے کہ ''فلاں شخص آب در کرد۔ فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے۔

تو ٹوکری میں پانی ڈالنے کا لغوی مطلب تو یہ ہے کہ آدمی ٹوکری نیچے رکھ کر اوپر سے گھڑا انڈیل دے۔ مگر مراد یہ ہے کہ جب کوئی شخص بے نتیجہ اور فعل عبث کرتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے نتیجہ کچھ نہیں۔ ہزاروں گھڑے ڈال دے گا، پانی بہہ جائے گا۔ غرض جب کوئی آدمی عبث کام کر رہا ہو جو بے نتیجہ ہو تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے۔ تو جو لوگ فارسی دانوں کے عرف میں نہ رہے ہوں۔ اہل عرف کی صحبت نہ اٹھائے ہوئے ہوں۔ وہ لغت کی مدد سے ایسے ہی معنی بیان کریں گے کہ اہل عرف ان کے معنی اور حماقت و جہالت پر ہنس پڑیں گے یہی شان قرآن وحدیث کی بھی ہے کہ ان کا بھی ایک عرف ہے قرآن فقط لغت پر نہیں اترا، اس کی کچھ اصطلاحیں ہیں۔ کچھ محاورات ہیں۔ ادا کا کچھ لب و لہجہ ہے وہ اس لب و لہجے اس ماحول اور طرز ادا ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ تبھی اس کی مرادیں متعین ہوسکتی ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص قرآن دانوں کے عرف کو ہی نہیں جانتا ہو قرآن والوں کے عرف میں نہ رہا ہو وہ کبھی بھی مراد ربانی کو نہیں سمجھ سکتا وہ لغت کی مدد سے مراد خداوندی کو حل کرنے کی کوشش کرے گا۔ تو قرآن کریم کا لغت کی مدد سے حل کرنا کافی نہیں ہے۔ یہ کافی نہیں کہ آپ نے (عربی ادب کی کتاب) مقامات حریری یا اردو ادب کی کتابیں پڑھ لیں۔

مرادِ قرآنی کی تعیین میں سنت کا مقام...... نیز یہ تو قابلیت کی بات ہے، اور یہ تو تعجب بالائے تعجب ہے کہ

اردو کے ترجمے دیکھ کر آپ مفسر بن گئے، اس سے قرآن حل نہیں ہوتا جب تک مرادات ربانی پوری طرح سمجھ میں نہ آئیں، اور وہ جب سمجھ میں آئیں گی جب پیغمبر کے اقوال وافعال اس کے ساتھ ملائے جائیں جن سے قرآن کریم کی تفسیر اور تطبیق ہوتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خوارج کے مقابلہ کرنے کے لئے بھیجا کہ ان سے بحث ومناظرہ کرو اور ان کو حق سمجھاؤ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ تیار ہوئے۔ تو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا دیکھو خوارج کے سامنے مجمع میں قرآن سے کوئی دلیل نہ پیش کرنا بلکہ سنت سے دلیل پیش کرنا۔ انہوں نے عرض کیا حضرت! قرآن حکیم کا علم تو میرا موضوع ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قرآن فہمی کی دعا دی ہے تو میں عالم قرآن ہوں۔ تو جو میرا مضمون اور موضوع ہے۔ اسی سے آپ روک رہے ہیں کہ میں اس سے استدلال نہ کروں اس کی کیا مصلحت ہے۔ فرمایا کہ: قرآن کریم کی آیتیں ذی وجوہ ہیں۔ اصولی جملے ہیں۔ کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ تم اگر عوام کے سامنے ایک آیت پڑھ کر اس کا مطلب بیان کرو گے۔ مخالف اس آیت کے عموم سے فائدہ اٹھا کر اسی کے دوسرے معنی بیان کردے گا، عوام یوں کہیں گے کہ یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ حق وباطل واضح نہیں ہوگا لیکن جب سنت رسول کی دلیل پکڑو گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور عمل مشخص ہے اس میں دوسری چیز کی گنجائش نہیں ہوگی، تو قرآن کریم کے معنی متعین ہو جائیں گے۔ دورنگی نہیں رہے گی دو معنی لینے کی گنجائش نہیں رہے گی اور حق واضح ہو جائے گا عوام سمجھیں گے کہ یہ حق ہے۔

اس لئے جب تک قرآن کے ساتھ سنت کو نہ ملایا جائے قرآن کی مراد مشخص نہیں ہو سکتی معنی متعین نہیں ہو سکتے۔ اس کے بغیر اگر مراد متعین کریں گے تو وہ آپ کی اپنی مراد ہوگی جو آپ قرآن کے سر تھوپ دیں گے تو یہ تلبیس ہوگی یا نفاق ہوگا کہ لفظ قرآن کے لئے معنی اپنا ڈال دیئے۔ حالانکہ دنیا میں کسی کے کلام کا بھی مطلب بیان کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ جب تک وہ صاحب کلام خود نہ کہے کہ یہ میرا مطلب ہے۔ تو ظاہر بات ہے کہ مراد ربانی کی تعین اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک حق تعالیٰ شانہٗ اپنی طرف سے کسی کو نہ بھیجیں کہ جا کر میری مراد بتلادو۔

اسی واسطے قرآن کریم کی دو شانیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ جب آپ پر قرآنی آیات کی وحی ہوتی تھی تو ابتداء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ اس کو رٹنا شروع کر دیتے تھے کہ کہیں بھول نہ جاؤں اور۔ میرے ذہن میں آیت جم جائے۔ حق تعالیٰ شانہ نے حکم فرمایا: ﴿لَاتُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ① ''اے پیغمبر! اپنی زبان کو حرکت مت دیں۔ جلدی مت کریں''۔ اس خیال سے کہیں میں بھول نہ جاؤں۔ یہ لفظ میرے سینے میں جمع ہو جائیں۔ اس لئے فرمایا: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ② ''ہمارے ذمہ ہے اس کا تمہارے سینہ میں جمع کر دینا اور تمہاری زبان سے اس کا پڑھوا دینا تو حق تعالیٰ نے ذمہ لیا''۔ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ③ ''جب ہم (بواسطہ فرشتہ) کلام کرنے لگیں۔ تو اس کا اتباع کرو سنتے رہو''۔ یہ پہلا حکم تھا جو قرآن کے

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے فرمایا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ جمع کردینے اور پڑھوا دینے کا تعلق الفاظ سے ہوتا ہے۔ معنی نہ جمع کئے جاتے ہیں نہ پڑھوائے جاتے ہیں۔ اب آگے معنی کی بات رہ جاتی ہے تو معنی کی صورت یہ نہیں تھی۔ یہ آپ نے کسی روایت میں کسی جگہ نہیں دیکھا ہوگا کہ قرآن کریم کی جب آیت اترتی ہو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر سوچتے ہوں کہ اس کے ایک معنی یہ ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ ایک یہ۔ یہ معنی ذرا زمانے کے زیادہ مناسب ہیں۔ لاؤ یہ اختیار کرلو۔ اس لئے کہ اگر خدانخواستہ یہ ہوتا تو یہ اپنی اختراع ہوتی متکلم کی مراد نہ ہوتی تو حق تعالیٰ شانہ نے جیسے لفظوں میں پابند کیا، آگے معانی میں بھی پابند کیا۔ فرماتے ہیں: ﴿ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴾ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول کر بیان کردینا کہ مطلب کیا ہے مراد کیا ہے"۔

تو بیان کا تعلق لفظوں سے نہیں ہوتا۔ معانی سے ہوتا ہے، اس کا حاصل یہ نکلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے الفاظ کے بارے میں بھی امین تھے۔ اپنی طرف سے الفاظ اختراع نہیں فرماتے تھے۔ اور معانی کے بارے میں بھی امین تھے۔ جو آپ کے قلب مبارک میں اللہ نے ڈالا وہی معنی آپ نے سمجھا اپنی عقل سے یا سوچ بچار سے معنی متعین نہیں کئے تو نبی کو وحی میں آزاد نہیں کہا گیا کہ جو چاہو تم معنی متعین کردو اس معنی کے پابند ہیں جو نازل کیے جائیں، جسے تم لفظوں میں پابند ہو جب اللہ کا رسول امین ہے اور آزاد نہیں کہا گیا ہے۔ کہ الفاظ و معانی میں ایک شوشہ گھٹا بڑھا سکے تو میں اور آپ کیسے آزاد ہو جائیں گے؟ کہ جو ہمارا جی چاہے ہم سمجھ لیں ہم انہی معنی کے پابند ہیں جو اللہ کے رسول نے سمجھے اور آپ کو سمجھائے گئے۔ قرآن خود دعویٰ کرتا ہے کہ تم انہیں معنی کے اندر مقید ہو۔ اب وہ معنی اور بیان رسول کہاں ہے؟ اسی بیان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیث کہتے ہیں، اور اسی کو سنت کہتے ہیں۔ کسی چیز کا بیان قول سے کیا کسی چیز کا عمل سے کیا، اور کسی چیز کا تقریر سے کیا کہ عمل دوسرے کا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا یہ بیان تقریری کہلاتا ہے، ایک بیان قولی ہے اور ایک بیان فعلی ہے، ان تینوں بیانوں کے مجموعے کا نام سنت ہے۔

تفکر فی القرآن...... اسی واسطے ایک جگہ فرمایا گیا: ﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (1) "اے پیغمبر! ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف نازل کیا تا کہ تم کھول کھول کر اس کو بیان کردو۔ اور شاید کہ لوگ اس میں تفکر کریں"۔

تو تفکر کا درجہ بیان کے بعد رکھا کہ بیان دے دو تا کہ مراد واضح ہو۔ اس مراد کے اندر رہ کر لوگ غور و فکر کریں تا کہ حقائق و معارف اور علوم لوگوں پر کھل جائیں۔ اس واسطے کہ علوم و معارف اللہ کی مراد میں چھپے ہوئے ہیں، ہماری اختراع میں علوم اور معارف نہیں ہیں تو پہلے بیان اور مراد سامنے آئے تو اس میں غور کریں گے تو حقائق علمی کھلیں گے۔ اور اگر اللہ کی مراد ہی سامنے نہ ہو تو پھر ہم کس چیز میں غور کریں گے؟ پھر جو غور ہوگا وہ محض ہمارا ذاتی

(1) پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴.

تخیل ہوگا، اس تخیل کو ہم قرآن کریم کے سر تھوپ دیں گے۔ حالانکہ قرآن اس سے بری ہوگا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ''مُبَیِّن'' بن کر تشریف لائے کیوں کہ قرآن کریم کی مرادات بغیر مبین کے سمجھ میں نہیں آتیں۔

جمع حدیث کی تکوینی تدبیر...... اسی واسطے حضرات محدثین نے حدیث کی جمع و تنقیح اور تشریح کی طرف پوری پوری توجہات منعطف کیں اور حق تعالیٰ شانہ نے انہیں محیر العقول حافظے دیئے۔ ان کے حافظوں میں کئی کئی لاکھ حدیثیں جمع ہوتی تھیں۔ عظیم الشان مجالس میں بیٹھ کر حدیث کا املا کیا جاتا تھا اور ایک ایک محدث اٹھتا تھا۔ اس کے سینے میں دو دو تین تین لاکھ احادیث مع متن اور سند کے جمع ہیں حق تعالیٰ کو یہ چیزیں حافظوں میں محفوظ کرانی تھیں تو محیر العقول حافظے دے دیئے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ حجاز کا سفر کر رہے تھے۔ جہاز میں بیٹھے تھے اس زمانے میں بادبانی جہاز ہوتے تھے۔ ہوا موافق ہوئی چل پڑے۔ مخالف ہوئی لنگر ڈال دیا تو چھ چھ مہینے میں جا کر جدّہ کے ساحل پر اترتے تھے برس اور دو برس حج کرنے میں لگتے تھے تو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ جہاز پر سوار ہوئے۔ ترمذی اور بہت سے تلامذہ بھی ساتھ سوار ہوگئے۔ جہاز میں مدت کافی لگتی تھی۔ اس لئے یہ ارادہ کیا کہ شیخ سے عرض کریں کہ آپ احادیث کا املا کرائیں ہمارا یہ وقت احادیث کے سننے اور لکھنے میں کٹے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد نے اس کو مان لیا اور کہا کہ کل سے ایک وقت مقرر کر لو تا کہ میں حدیثیں املا کراؤں۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس نہ کاغذ تھا نہ قلم دوات۔ اب انہوں نے سوچا کہ اگر میں مجلس میں بلا کاغذ اور قلم دوات کے گیا تو مجھے اٹھا دیا جائے گا، یہ باب حدیث اور باب املا کے خلاف ہے۔ اس لئے سب سے پیچھے بیٹھ گئے اور اپنا ایک گھٹنا کھڑا کر کے اپنا ہاتھ سامنے رکھتے اور دوسرے ہاتھ کو حرکت دیتے رہتے تا کہ شیخ یوں سمجھیں کہ لکھ رہے ہیں اور مجلس سے نہ اٹھائے جائیں۔ تیس چالیس روز اسی طرح گزر گئے اور ہر دن میں دس دس، بیس بیس حدیثیں روایت ہوتی تھیں۔ ایک روز شیخ نے گردن اٹھائی دیکھا کہ نہ کاغذ نہ قلم۔ فرمایا یہ کیا حرکت ہے؟ کاغذ ہے؟ عرض کیا نہیں ہے۔ فرمایا قلم ہے؟ عرض کیا نہیں۔ پھر یہ کیا حرکت ہے؟ عرض کیا میں اس لئے ایسا کرتا تھا کہ آپ یہ سمجھیں گے کہ اس کے پاس کاغذ قلم نہیں ہے۔ اس لئے مجلس سے اٹھا دیں گے تو میں اپنے کو بصورت کاتب نمایاں کرتا تھا کہ میں بھی لکھ رہا ہوں۔

شیخ کو غصہ آیا فرمایا تم نے میری محنت اکارت کر دی۔ تم درس میں مت بیٹھو۔ انہوں نے عرض کیا حضرت! محنت اکارت نہیں ہوئی۔ مجھے الحمد للہ وہ ساری روایتیں حفظ یاد ہیں۔ اب ان کو ترتیب وار پڑھنا شروع کیا کہ پہلی تاریخ میں آپ نے یہ حدیثیں مع اس سند کے بیان کیں۔ دوسری تاریخ میں یہ بیان کیں۔ اور یہ ان کی سند ہے۔ تیسرے دن آپ نے یہ حدیثیں بیان کیں اور ان کی سند یہ ہے اتنے روز یں جتنی روایتیں املا کرائی تھیں، وہ ساری امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے سنا دیں۔ تو شیخ نے ان کے حافظے پر اعتماد فرمایا اور اجازت دے دی کے تم

میرے درس میں بیٹھ سکتے ہو۔ تو یہ محیر العقول حافظہ نہیں تھا تو اور کیا تھا؟

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے نے جو خود بھی محدث تھے بغداد کا سفر کیا تو بغداد کی جامع مسجد میں جب معلوم ہوا کہ امام ابوداؤد کے بیٹے آئے ہیں اور وہ خود بھی محدث ہیں، سارے عوام جھک پڑے۔ لاکھوں آدمی جمع ہوگئے کہ کچھ حدیثیں تبرکاً سنی جائیں۔

بعض علماء نے عرض کیا کہ آپ الحمد اللہ یہاں تشریف لائے ہیں۔ اللہ نے آپ کو محدث بنایا ہے۔ کچھ حدیثیں آپ سنا دیں اور املا کرا دیں۔ فرمایا کہ: ''میں بیاض ساتھ نہیں لایا جس میں حدیثیں لکھی ہوئی ہیں''۔

اس کو بہت حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ ایک محدث یوں کہے کہ میں اپنی یادداشت ساتھ نہیں لایا۔ وہ محدث کیا ہوا جس کا حافظہ اتنا کمزور ہو۔

تو بعض نے کچھ لعن کا لفظ کہا جو ابن ابی داؤد کے کان میں پڑ گیا، اس میں غیرت جو آئی تو فوراً منبر پر بیٹھ گئے اور ابوداؤد کی حدیثیں سنانا شروع کیں تو ایک دو تین دن میں پوری ابوداؤد مع سند اور اور متن کے اپنی یادداشت سے سنادی ایک دو مقام کے سوا کہیں فروگزاشت نہیں ہوئی۔ پھر لوگوں نے مان لیا کہ واقعی یہ محدث ہیں۔ بہرحال حق تعالیٰ کو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام جمع کرنا تھا تو محیر العقول حافظے پیدا کر دیئے۔

دور جدید میں روایت حدیث کا طریق...... جب ساری حدیثیں سینوں سے نکل کر سفینوں میں جمع ہو گئیں۔ اسی نسبت سے حافظے کم ہونا شروع ہوگئے اس لئے کہ حاجت باقی نہیں رہی آج ہم اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر نوٹ بک جیب میں نہ رکھیں تو صبح کی بات شام کو نہیں یاد رہ سکتی۔ کاغذ دیکھ دیکھ کر اپنے افعال کو انجام دیتے ہیں۔

میرا جو یہاں آ کر حشر ہوا۔ وہ یہ کہ جلسوں کی کچھ تاریخیں متعین ہوئیں۔ یہاں دعوت چائے کی۔ یہاں کھانے کی۔ یہاں تقریر یہاں مذاکرہ۔ وہ پندرہ دن کا پروگرام لکھا گیا۔ اب وہ نامہ اعمال میری جیب میں پڑا ہوا ہے اور بحمد اللہ ہے دائیں جانب۔ بائیں جانب نہیں ہے۔ روز صبح کی نماز پڑھ کر میں دیکھتا ہوں کہ آج کہاں تقریر ہے۔ آج کہاں جانا ہے۔ تو حافظوں کی یہ حالت ہے کہ پندرہ دن تو پندرہ دن صبح کی بات شام کو یاد نہیں رہتی۔ آج اگر کوئی یوں کہنے لگے میں امام بخاری ہوں، امام مسلم ہوں یا امام ابوداؤد ہوں۔ تو یہ مضحکہ خیز بات ہوگی۔ جن لوگوں کے حافظوں میں اللہ کو حدیث کو جمع کرانا تھا انہیں ایسے حافظے دے دیئے۔ جب کتابوں میں روایت آگئی اب محدث کے معنی فقط یہ ہیں کہ روایت کا حوالہ دے دے کہ یہ روایت بخاری میں ہے، یہ مسلم میں ہے، یہ ترمذی میں ہیں۔ اول سے لے کر اخیر تک پوری سند پڑھنا اور رجال کی تنقیح کی حاجت باقی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ کام سب محدثین کر چکے ہیں۔ پکی پکائی ہمارے سامنے آگئی ہے۔ یہ نہایت ناقدری ہوگی کہ ہم دعویٰ کریں کہ ہم بھی بخاری ہوگئے۔ صبح کی بات تو شام کو یاد نہیں رہتی اور بخاری بننے کا دعویٰ ہے۔

یہ قدرتی چیز ہے کہ جب کسی قوت سے کام لینے کی ضرورت باقی نہ رہے اسی نسبت سے وہ قوت گھٹنی شروع

ہو جاتی ہے تو حافظہ گھٹتے گھٹتے اس نوبت پہ آ گیا۔

اجتہادی قوت کا فقدان..... اور میں کہتا ہوں کہ: یہی صورت درایت اور تفقہ کے اندر بھی ہے، اجتہاد جس کو کہتے ہیں۔ جب قرآن اور حدیث کتابوں کے اندر جمع ہو گیا اور حافظوں سے نکل کر سفینوں میں آ گیا۔ تو مسائل نکالنے کی طاقت جس کو اجتہادی قوت کہتے ہیں، اللہ نے آئمہ کے اندر اعجازی طور پر پیدا کی کہ ایک رات میں ایک آیت سے ایک ایک سو مسئلے نکالے ہیں اور فقہ کو مرتب کر دیا۔ وہ استنباطی واجتہادی مسائل جب سینوں سے نکل کر سفینوں میں جمع ہو گئے، اور کتابوں میں آ گئے۔ تو اسی نسبت سے اجتہاد گھٹنا شروع ہوا۔ گھٹتے گھٹتے اس حد تک پہنچ گیا کہ ایک شخص عالم بنتا ہے مگر بعض دفعہ الٹا سمجھ جاتا ہے، کہتے کچھ ہیں، سمجھتا کچھ ہے تو فہم بھی ہمارے خراب اور ختم ہو گئے الٹی بات سمجھتے ہیں۔ ایک روایت یہاں سے نقل ہوئی ہے چلتے چلتے چند زبانوں کے بعد وہاں پہنچ کر کچھ کا کچھ بن جاتا ہے اور پروپیگنڈہ بن جاتا ہے۔ اصلیت کا پتہ نہیں ہوتا۔ تو اسی نسبت سے اجتہادی قوت بھی ختم ہوگئی۔ اس لئے آج اگر کوئی ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یا شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہونے کا دعوی کرے تو یہ مضحکہ خیز دعوی ہو گا۔ اس لئے کہ اس قوت کے باقی رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ کام اپنا پورا کر گئی۔ تو حافظے بھی ختم ہو گئے۔ اجتہادی قوتیں بھی اس نسبت سے ختم ہو گئیں۔ اس لئے جس طرح روایت میں ہمارا بڑا درجہ یہ ہے کہ ہم کتاب کا حوالہ دے دیں۔ استنباطی مسائل میں بڑا فقیہ وہ ہے جو کتاب کا حوالہ دے دے کہ یہ فلاں کتاب میں ہے۔

بہر حال جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے مبین بنا کر بھیجا۔ تا کہ آپ اللہ کی آیتوں کو بیان کریں کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے اس کی مراد یہ ہے جیسا کہ عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ کو آپ نے سمجھا دیا۔ ورنہ عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ تو روئی کے ڈورے لے کر بیٹھ گئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کی مراد کا بیان کیا کہ روئی کا دھاگہ مراد نہیں ہے، بلکہ صبح کی سفیدی اور رات کی تاریکی مراد ہے۔ تو اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کر کے آیت کی مراد کو کھول دیا۔ اگر پیغمبر کی ذات نہ آتی۔ فقط قرآن کریم سامنے آتا تو یہ مرادات نہ کھل سکتیں ہم اپنے ذہن سے سمجھتے جو بھی ہمارے ذہن میں آتا۔

تزکیہ قلب..... پھر اگر ذہین تربیت یافتہ نہ ہو۔ مزکی نہ ہو۔ صاف نہ ہو۔ اخلاقی قوتیں اس میں نہ ہوں۔ ایسے میں اگر وہ غور کرے تو اوندھا ہی سمجھے گا اور اپنے مذاق کے مطابق سمجھے گا۔ اس لئے جہاں اس کی ضرورت تھی کہ شخصیت آ کر مرادیں سمجھائے وہاں اسکی بھی ضرورت تھی کہ مخلوق کا ذہن بھی بنائے۔ ذہنیت بھی درست کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں مراد کو بیان کیا۔ وہاں لوگوں کے نفوس کا تزکیہ بھی کیا۔ ان کا ذہن بھی بنایا۔

اگر کوئی شخص مشرکانہ ذہنیت لے کر قرآن کو دیکھے تو یوں معلوم ہو گا کہ ہر آیت سے شرک ہی نکل رہا ہے، اگر نصرانی ذہنیت سے سوچے تو یوں معلوم ہو گا کہ ہر آیت میں عیسائیت بھری پڑی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم تو ایک مردِ سخی کی مانند ہے۔ دوست اس سے کمالے دشمن کمالے۔ وہ تو ذی وجوہ اصولی اور کلی جملے ہیں۔ ہیر پھیر کر آدمی اپنا

مطلب نکال سکتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی یہودیانہ ذہنیت سے دیکھے تو یوں معلوم ہوگا کہ قرآن میں یہودیت بھری پڑی ہے، لیکن اگر کوئی موحدانہ ذہنیت لے رجائے گا تو آیت آیت سے توحید نکلے گی اس لئے جہاں مراد سمجھانے کی ضرورت تھی وہاں ذہن کو بنانے کی بھی ضرورت تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفوس کا تزکیہ بھی کیا۔ ریاضت اور مجاہدات بھی اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو کرائے، "تَوَجُّهُ اِلَى اللهِ" کی مشق بھی کرائی" اِنَابَتْ اِلَى اللهِ رُجُوْعٌ اِلَى اللهِ" اور تعلق مع اللہ کے مجاہدے بھی کرائے، تا کہ اللہ سے رابطہ صحیح ہو۔ ذہن میں استقامت پیدا ہو جائے۔ ذہن سے زیغ اور کجی نکل جائے، جب ذہن میں استقامت آئے گی تو جو آیت پڑھی جائے یا معنی بیان کیے جائیں گے وہ آدمی صحیح سمجھے گا، غلط سمجھنے کی صورت باقی نہیں رہے گی تو ذہن میں استقامت پیدا کرنا یہ ایک مستقل موضوع اور مقصد نبی کے آنے کا ہے۔

اسی واسطے قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چار فریضے بیان کئے گئے ہیں: ﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ① اللہ کی ذات وہ ہے جس نے امیوں میں رسول بھیجا۔ کیسا رسول؟ خود بھی امی ہے لکھنے پڑھنے کی خبر نہیں مگر علوم وہ بیان کئے جن سے لوگوں کو عاجز کر دیا۔

یتیمے کہ نا کردہ قرآن درست | کتب خانہ چند ملت شست

بہر حال رسول بھیجا اس کا کیا کام ہے۔ اس کے کیا فرائض ہیں؟ لوگوں کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے، یعنی اللہ نے جو الفاظ اتارے ہیں۔ وہ امانت اور دیانت کے ساتھ پورے الفاظ پہنچا دیتے ہیں۔ نیز تعلیم بھی دیتا ہے، تعلیم بیان مطالب کو کہتے ہیں یعنی ان کے معانی بھی سمجھاتے ہیں یہ نہیں کہ فقط الفاظ لوگوں کے سامنے رکھ دے اور یوں کہہ دیں کہ جو تمہارا جی چاہے اس کے معنی سمجھ لیں۔ اس لئے کہ تعلیم کہتے ہی اسے ہیں کہ الفاظ کے اندرونی حقائق اور معانی کو سامنے رکھا جائے۔ تو کتاب کی تعلیم معانی و مطالب کے ساتھ دیتے ہیں۔ اور آگے فرمایا: حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، حکمت کی دو قسمیں ہیں، حکمت نظری اور حکمت عملی، حکمت نظری تو علمی چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ تعلیم میں آگئی۔ اس لئے متعین ہو گیا کہ حکمت سے مراد حکمت عملی ہے، یعنی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ معانی بھی سمجھاتے ہیں۔ پھر کر کے دکھلاتے بھی ہیں تا کہ نمونہ عمل بھی سامنے آجائے۔ جس کے معنی اسوہ حسنہ کے ہیں تو عمل کی ہیئت بھی سامنے پیش کر دیتے ہیں تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے آیت کے معنی متعین ہو جائیں۔

آدمی میں یہ سب چیزیں ہوں مگر اس کے ساتھ ایک چوتھی چیز کی ضرورت تھی ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ ہے ان کے دلوں کو مانجھتے تھے ان میں سے زیغ اور کجی بھی نکالتے تھے، کسی کی یہودیانہ ذہنیت تھی تو یہود سے مسلم بنا، کسی کی نصرانی ذہنیت تھی تو نصرانیت سے مسلم بنا، کسی کی مشرکانہ ذہنیت تھی تو شرک سے اسلام کی طرف آیا۔ غرض وہ پچھلے

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔

اثرات زائل کر کے قلب کو پاک کر دیا۔اس کے لئے ریاضت اور مجاہدے کی ضرورت پڑتی ہے،تو آپ جہاں حلال وحرام کا بیان کرتے تھے وہاں پاک صاف قلوب کی دیکھ بھال بھی فرماتے تھے۔

عمل کی نگرانی......راتوں کو اٹھ کر اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی نگرانی فرماتے تھے کہ عمل کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر کر رہے ہیں تو کیسا عمل کر رہے ہیں۔

ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مکان سے گزرے تو دیکھا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں،مگر اتنی آہستہ کہ کان لگا کر سنو تو آواز آتی ہے،ورنہ آواز نہیں آتی۔آگے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکان کی طرف بڑھے تو اس زور سے پر قرآن پڑھ رہے تھے کہ محلہ گونج رہا تھا۔صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں دونوں حضرات جمع ہوئے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! تم اتنا آہستہ کیوں پڑھ رہے تھے کہ کان لگا کے سنا جائے۔تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اس کو سنا رہا تھا جو نہ بہرہ ہے نہ مجھ سے غائب ہے،یعنی اللہ کو سنا رہا تھا۔

تو مجھے زیادہ چلانے کی ضرورت کیا تھی۔پھر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم اتنے زور زور سے کیوں پڑھ رہے تھے؟ تو عرض کیا کہ:''اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاُطْرِدُ الشَّیْطٰنَ'' سوتوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا،اس لئے زور زور سے پڑھ رہا تھا۔ان کی شان ہی ''اَشَدُّهُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰهِ عُمَرُ'' ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تم ذرا آواز کو اونچا کر دو۔اور اے فاروق! تم ذرا آواز کو نیچا کر دو تا کہ اعتدال پیدا ہو جائے۔

یہ کوئی حلال وحرام یا جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا،یہ عمل کی نگرانی تھی،طرز عمل سکھلانا تھا۔تا کہ استقامت اور اعتدال پیدا ہو جائے۔

قلوب کا علاج......حدیث میں ہے کہ:بعض لوگوں نے آکر عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں وسوسے بہت آتے ہیں،فرمایا: کیا وسوسے آتے ہیں؟ عرض کیا: سوالات کا ایک سلسلہ ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کس نے بنائی؟ دل سے جواب نکلتا ہے اللہ نے بنائی۔آسمان کس نے بنایا؟ دل سے جواب نکلتا ہے کہ اللہ نے۔چاند سورج کو کس نے بنایا؟ جواب ملتا ہے کہ اللہ نے ان سوالوں کے بعد ذہن میں ایک کلیہ جمع ہوتا ہے کہ ہر بنی ہوئی چیز کے لئے کسی بنانے والے کی ضرورت ہے۔ہر موجود کے لئے کسی موجد کی ضرورت ہے تو سوال ہمارے دل میں آتا ہے کہ اللہ میاں بھی تو موجود ہیں تو ان کے بنانے والا اور پیدا کرنے والا کون ہے؟

جب یہ سوال آ گیا تو ہمارا ایمان کہاں باقی رہا؟ جب اللہ کی نسبت یہ خیال آئے کہ اس کا بنانے والا کون ہے؟ تو ایمان کہاں باقی رہا؟ اور جب ایمان نہ رہا تو عمل میں تو ایمان سے طاقت آتی ہے تو ترقی عمل رک گئی،عمل معطل ہو گیا۔وسوسہ کا اثر یہی پڑتا ہے کہ آدمی عمل سے معطل ہو جاتا ہے گویا عملی زندگی اور عملی ترقی رک گئی۔سبحان اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وسوسہ کو دفع فرمایا اور کس حکیمانہ طریق سے اس وسوسہ اور شبہ کو زائل فرمایا۔

فرمایا: یہ جو تمہیں شبہات ہوتے ہیں سوالات دل میں پیدا ہوتے ہیں تم انہیں برا سمجھتے ہو یا اچھا؟ عرض کیا یا رسول اللہ اتنا برا جانتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا گوارا ہے لیکن یہ وسوسہ گوارا نہیں ہے۔ فرمایا: ''ذَاکَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ'' فرمایا: یہی تو ایمان کی علامت ہے۔ یہ ایمان ہی تو ہے جو اس وسوے کو برا جتلا رہا ہے۔ اگر اندر ایمان نہ ہوتو آدمی وسوسے کو برا نہ سمجھے اور ڈرے کیوں؟ یہ ایمان ہی ڈر پیدا کر رہا ہے۔

جیسے آنکھ کھل جاتی ہے، بیدار ہو گئے سمجھ یوں رہے تھے کہ ایمان باقی نہیں رہا واضح ہوا کہ ایمان تو موجود ہے وہ جو عمل کی ترقی رک گئی تھی۔ وہ پھر جاری ہو گئی۔

اب یہ کوئی جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا نہ حلال وحرام کا مسئلہ تھا، یہ قلب کی تربیت کا مسئلہ تھا دل کی کلیں درست کرنی تھیں۔ دل کا رخ صحیح کرنا تھا کہ ادھر کو چلو ادھر کو نہ چلو۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جا رہے تھے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پوچھا اے حنظلہ کیا حال ہے؟ عرض کیا کہ ''نَافَقَ حَنْظَلَۃُ'' حنظلہ تو منافق ہو چکا ہے۔ اس میں ایمان باقی نہیں ہے، فرمایا: وَمَا ذَاکَ؟ یہ کیا بات کہی؟ فرمایا بات یہ ہے کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر رہتے ہیں تو جنت و دوزخ گویا آنکھوں کے سامنے رہتی ہے اور جب گھر آتے ہیں اور بال بچوں میں لگتے ہیں تو وہ چیز باقی نہیں رہتی۔ معلوم ہوا کہ ہم میں منہ دیکھے کا ایمان ہے، حقیقی ایمان نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جاتے ہیں ایمان آجاتا ہے گھر آتے ہیں ایمان نکل جاتا ہے، یہی معنی نفاق کے ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ بات تو میرے اندر بھی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہوتا ہوں تو عرش و کرسی کا گویا مشاہدہ کرتا ہوں اور گھر میں یہ کیفیت نہیں ہوتی، یہ تو میرا بھی حال ہے اور جب یہ حال تیرا بھی اور میرا بھی ہے تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی دل کا روگ ہے۔ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں اس کا علاج کرائیں تو دونوں کے دونوں حاضر ہوئے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سارا واقعہ سنایا کہ حنظلہ ملے۔ میں نے ان سے حال پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ مجھ میں تو نفاق آ گیا۔ پھر میں نے کہا کہ یہ حال تو میرا بھی ہے۔ یا رسول اللہ ہم میں تو نفاق ہے ایمان کہاں ہے ہمارے اندر؟ یہ تو منہ دیکھے کا ایمان ہے۔ فرمایا: ''یَا حَنْظَلَۃُ اِسَاعَۃً وَسَاعَۃً!'' فرمایا: اے حنظلہ! گھبرانے کی بات نہیں سَاعَۃً وَسَاعَۃً! یہی ہوتا ہے کہ کبھی حضور کی کیفیت، کبھی غیب کی کیفیت، کبھی غیوبت کبھی حضور۔

اور اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال سے سمجھایا۔ فرمایا: دیکھو سمندر ہے، سمندر میں بعض دفعہ تو مد و جزر رہتا ہے۔ طوفانوں کا زمانہ ہوتا ہے موجیں اٹھتی ہیں، جیسے مئی جون اور جولائی کے مہینے ہیں، پھر اکتوبر، نومبر، دسمبر میں آ کر سمندر ساکن بن جاتا ہے۔ جب موجیں اٹھتی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سمندر دوگنا تگنا ہو گیا، بلکہ چوگنا ہو گیا گویا اس کا پانی بہت بڑھ گیا۔ اور جب ساکن ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پانی گھٹ گیا، تو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ موجوں میں پانی بڑھتا ہے نہ سکون میں گھٹتا ہے، جب پانی میں جوش ہوتا ہے تو تموج کی وجہ سے نظریوں آتا ہے کہ پانی چوگنا بن گیا۔ سکون کے وقت وہ بات نہیں رہتی۔ فرمایا۔

''اسی طرح سے جب تم میری مجلس میں آتے ہو تو ایمان کے سمندر میں جوش پیدا ہوتا ہے وہ چوگنا نظر آتا ہے، جب گھروں میں جاتے ہو تو سکون پیدا ہوتا ہے ایمان کے اندر کمی نہیں آتی۔ رہتا اتنے کا اتنا ہی ہے، جیسے سمندر میں سکون کے وقت کمی نہیں، جوش کے وقت زیادتی نہیں''۔

جو وسوسہ گزر رہا تھا وہ قلب سے نکل گیا اور جو عمل کی ترقی رک گئی تھی وہ پھر جاری ہوگئی۔ یہ قلوب کا علاج کرنا ہے۔ یہ حلال وحرام کا بیان نہیں۔ یہ تربیت وتزکیہ نفوس ہے دلوں کا رخ درست کرنا ہے، تو تعلیم مدارس کا کام ہے، تربیت شیخ کا کام ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے سب سے بڑے استاد بھی ہیں اور سب سے بڑے شیخ بھی ہیں ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعمال کی تصحیح فرماتے ہیں اور ایک طرف دلوں کو مانجھتے ہیں اور دلوں میں نورانیت پیدا فرماتے ہیں۔

قلبی نورانیت کے آثار...... اس نورانیت اور قلب کے رخ صحیح ہونے کا اثر یہ ہے کہ جب دل کی راہ صحیح پڑ گئی، جو آیت سامنے آئے گی اللہ کی صحیح مراد سمجھے گا کجی باقی نہیں رہے گی، صحیح مطلب سمجھے گا اور جس کے قلب کی تربیت صحیح نہ ہوا سے آیتوں میں شبہ ہوگا، روایتوں میں شبہ ہوگا، اس لئے کہ دل میں کجی ہے، وہ کجی حدیث یا قرآن کی نہیں وہ اس کے قلب کی ہے اسے وہ حدیث وقرآن میں نظر آتی ہے، حالانکہ حدیث وقرآن اس سے بری ہے اس نے اپنے قلب کو کسی سے صحیح کرایا نہیں۔

بلا تربیتِ قلب قرآن فہمی...... ایک ناتربیت یافتہ نفس جس میں حرص وہوا، کبر وحسد اور انانیت ہے ان اخلاق کے ساتھ جب قرآن میں غور کرے گا تو اوندھے سیدھے مطلب لے گا، اس لئے کہ قلب اور راستہ صحیح نہیں وہ نفس کی طرف متوجہ ہے خدا کی طرف متوجہ ہی نہیں۔

اسی واسطے اس حدیث میں فرمایا گیا ہے جس میں فتنہ انکار حدیث کی خبر دی گئی ہے۔

''یُوْشِکُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰی اَرِیْکَتِهٖ یَقُوْلُ'' عنقریب ایک وقت آئے گا کہ ایک پیٹ بھرا ہوا آدمی تکیہ لگائے ہوئے مسند پر بیٹھا ہوا ہوگا اور کہے گا۔ ''حَسْبُنَا کِتٰبُ اللّٰهِ'' کتاب اللہ کافی ہے۔ ہم حدیث کو نہیں مانتے۔ جو اس میں حلال ہے اس کو حلال سمجھیں گے جو اس میں حرام ہے اس کو حرام سمجھیں گے۔ تو جہاں فتنہ انکار حدیث کی خبر دی ہے وہاں یہ خبر بھی دی کہ اس فتنہ کا منشاء کیا ہوگا؟ تو فرمایا۔

''رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰی اَرِیْکَتِهٖ''۔ پیٹ بھرا ہوا آدمی۔ پیٹ بھر کر کھانے والا وہی ہوتا ہے جس کے نفس کے اندر حرص وآرزو زیادہ ہوتی ہے۔ صاحب تقویٰ اور متقی کی کام یہ ہے کہ بقدر ضرورت کائے۔ لیکن اناپ شناپ کھائے اور ناک تک پیٹ بھر جائے یہ حریص ہونے اور ہوسناکی کی علامت ہوتی ہے، اور حریص وہ ہوتا ہے جو

بندہ نفس ہوتا ہے جب بندہ خدا بنتا ہے تو کجی باقی نہیں رہتی اور بندہ نفس ہے تو نفس کی طرف رخ رہے گا۔ تو منہ نفس کی طرف کئے ہوئے ہیں۔ اور خدا کی آیتوں میں غور کر رہا ہے تو برعکس مطلب سمجھے گا۔ صحیح مطلب اس کو نہیں سمجھ میں آئے گا۔ اس لئے دو لفظ فرمائے "شَبْعَانُ" اور "عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ" شبعان سے حریص ہونے کی طرف اشارہ ہے اور "عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ" اس سے کبر اور نخوت کی طرف اشارہ ہے۔ تو وہ لوگ جن کو اپنے علم پر گھمنڈ ہے کہ ہم جانتے ہیں اور باقی سب جاہل ہیں تو پہلا تزغہ تو یہ ہے کہ ان میں کبر و نخوت ہے اور حریصانہ شان ہے۔ اس شان کو لے کر قرآن کو سمجھیں گے تو اپنی شان کے مطابق ہی وہ مطلب بھی سمجھیں گے اور خیال یہ کر لیں گے کہ یہ اللہ کا مطلب اور مراد ہے۔ اس لئے اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا کہ لفظوں کی بھی تلاوت کرے، معنی بھی سمجھائیں عمل بھی کر کے دکھلائیں نفوس کو مانجھیں اور تزکیہ بھی کریں۔

اللہ کے رسول کے دنیا سے اٹھنے کے بعد یہ چاروں چیزیں موجود رہنی چاہئیں تب تو دین کامل موجود ہے اور اگر ان میں سے ایک بھی گھٹ جائے تو کہا جائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناقص دین چھوڑ گئے ہیں کامل اسلام باقی نہیں ہے۔

خدمتِ کلامُ اللہ...... **الحمد للہ**! آج تلاوت آیات بھی موجود ہے، لاکھوں حفاظ امت کے اندر موجود ہیں، جن کو قرآن کے الفاظ از بریاد ہیں۔ دنیا میں کسی قوم نے اپنی مذہبی کتاب کی وہ خدمت نہیں کی جو مسلمانوں نے کی ہے ایک چھ برس کا بچہ کھڑا ہوتا ہے، اور الحمد سے لے کر والناس تک فر فر پڑھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ رمضان شریف میں آپ دیکھیں مساجد میں ایک رونق ہوتی ہے جگہ جگہ تراویح ہوتی ہیں۔ امام پڑھ رہا ہے اگر اس نے کہیں غلطی کی تو مقتدی پیچھے لگ جاتے ہیں جب تک اس کو لقمہ دے کر صحیح نہ کرا دیں اس کو آگے نہیں چلنے دیتے تو سننے والے بھی حفاظ ہوتے ہیں، پڑھنے والے بھی تو اتر طبقہ کے ساتھ قرآن کی روایت موجود ہیں، تو الفاظ کے محافظ در حقیقت حفاظ ہیں۔

قرآن کے معانی کی حفاظت کرنے والے علماء ربانی ہیں۔ عمل کر کے دکھلانے والے حضرات صوفیائے محققین ہیں جو کمال تقوی و دیانت سے عمل کی ہیئتیں بتلاتے ہیں، اور عمل کر کے دکھلاتے ہیں اور دلوں کو مانجھنے والے وہ حضرات ہیں جو خانقاہوں میں بیٹھ کر قلوب کی تربیت کرتے ہیں تو تلاوت، تعلیم، تزکیہ اور اسوہ کے تمام افعال جاری ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی چیز باقی نہ رہے تو کہا جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کے چار ستونوں میں سے ایک گر گیا۔ تو اسلام کی عمارت کیسے باقی رہتی؟

آج بحمد اللہ چاروں طبقے موجود ہیں اور یہ چاروں حق تعالیٰ شانہٗ کے خلفاء ہیں۔ اللہ کے ایک علمی خلیفہ ہیں جو اس کے الفاظ کو محفوظ کئے ہوئے ہیں ایک علمی خلیفہ وہ ہیں جو اس کے معانی کو محفوظ کئے ہوئے ہیں، ایک عملی خلفاء ہیں کہ آیتوں میں جو کیفیات چھپی ہوئی ہیں اور قلب پر پڑتی ہیں۔ ان کیفیات کو ریاضات اور مجاہدات سے محفوظ کئے ہوئے ہیں، یہ مٹنے والی چیز نہیں۔ انکار کرنے والے انکار کریں، پہلے بھی منکر پیدا ہوئے ہیں۔

خدمتِ حدیث...... فرق اتنا ہے کہ پہلے منکر اقرار کی صورت سے انکار کرتے تھے یعنی وضاعین حدیث کا زمانہ، یعنی حدیثیں گھڑ گھڑ کر صحیح احادیث سے ملاتے تھے تاکہ صحیح احادیث کا اعتماد اٹھ جائے۔ لوگ احادیث کو نا قابل اعتبار سمجھیں۔ تو انہیں اتنی جرأت نہیں تھی کہ حدیث کا انکار کریں، اقرار کر کے پھر سازش کر کے حدیثیں گھڑ کر رلا ملا دیتے تھے، لیکن اللہ جزائے خیر دے حضرات محدثین کو کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیا، مستقل کتابیں لکھ دیں کہ یہ حدیثیں صحیح ہیں یہ حدیثیں موضوع ہیں، احادیث کی اقسام بیان کیں، حجیت کے مراتب بیان کئے۔

ہر حدیث ایک ہی درجے کی نہیں ہوتی۔ اگر حدیث متواتر ہے اس کی سند کا ثبوت ایسا ہے۔ جیسے قرآن کا اس حدیث سے جو چیز ثابت ہوگی وہ قطعی ہوگی، اور موجب یقین ہوگی۔ اگر حدیث اس سے کم درجہ کی ہو تو اسے خبر واحد کہتے ہیں۔ وہ موجب ظن ہوگی۔ موجب یقین نہیں ہوگی۔ اگر حدیث ظنی ہے اور اس میں کچھ اور کمزوری پیدا ہوگئی وہ معضل ہوگی۔ تائید کے درجے میں استعمال کی جاسکے گی، کسی حکم کی بنا نہیں بنائی جاسکے گی۔ غرض حدیث کی اقسام بیان کیں کہ متن کے لحاظ سے اتنی اقسام ہیں اور سند کے لحاظ سے اتنی اقسام ہیں، رجال سند کے لحاظ سے اتنی اقسام ہیں، اگر اول سے یعنی صحابی رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوئی راوی حذف ہو جائے تو اسے مرسل کہیں گے۔ شروع میں اگر راوی نہ رہے تو اسے معضل کہیں گے بیچ میں راوی نہ رہے تو اسے مشکل کہیں گے، معضل و مرسل اور مشکل کے احکام بیان کئے جو حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو۔ سارے راوی اس کے ثقہ ہوں، وہ مرفوع متصل کہلائے گی۔ اور جس میں انقطاع پیدا ہو جائے اس کا یہ حکم ہے تو اس کو مستقل فن بنایا، دنیا میں روایت کا فن موجود نہیں تھا، مسلمانوں نے یہ فن بنایا اور حدیث کے فن کے لحاظ سے اس کو بنایا، حدیث کی تاریخ اور رجال حدیث کی تاریخ مرتب کر دی۔

روایت کرنے والے آدمی چار لاکھ کے قریب ہیں۔ تو چار لاکھ آدمیوں کی سوانح عمریاں جمع کر دیں، تاکہ واضح ہو جائے کہ کس کیریکٹر کے آدمی تھے، کس کردار کے آدمی تھے۔

روایت حدیث میں احتیاط...... پھر روایت میں یہ احتیاط کہ اگر عمر بھر میں ایک دفعہ جھوٹ ثابت ہو جائے تو اس کی عمر بھر کی روایتیں کالعدم کر دیتے تھے، کہ یہ روایتیں قابل اعتبار نہیں ہیں اور جھوٹ بولنا تو بجائے خود رہا۔ اگر صورت کذب اور واہمہ کذب بھی پیدا ہو جائے تب بھی اس کی روایت چھوڑ دیتے تھے۔

ایک محدث ہیں ان کا واقعہ تراجم میں موجود ہے کہ انہیں معلوم ہوا کہ اس حدیث کی سند عالی شام میں موجود ایک محدث کے پاس ہے، تو ایک حدیث کی سند لینے کے لئے مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) سے تین سو میل کا سفر شام کے لئے کیا۔ اس زمانے کے سفر پیدل چلنا، اونٹوں پر چلنا وغیرہ مہینوں میں جا کر پہنچتے تھے۔ صرف ایک حدیث سننے کے لئے تین سو میل سفر کی صعوبت اختیار کی، جا کر ان کا پتہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ محدث فلاں محلے میں رہتے ہیں۔ ان کے مکان پر گئے آواز دی وہ باہر آئے۔ سلام و مصافحہ کیا۔ انہوں نے نہایت اخلاق

سے ٹھہرایا۔ ان کی مجلس ہوئی تو ان کا ایک بچہ اس مجلس میں آ گیا۔ بچے میں ضد ہوتی ہے وہ کسی چیز پر ضد کرنے لگا۔ اس کو ہزار بہلایا پھسلایا مگر وہ ضدی بچہ تھا مانتا نہیں تھا۔ تو ان محدث نے ہاتھ بند کر کے کہا کہ آؤ تمہیں چیز دیں۔ وہ بچہ آیا تو ہاتھ میں تو کچھ تھا نہیں، اسے بہلانا مقصود تھا، اسے لے کر باہر کر دیا۔

یہ جو حدیث سننے گئے تھے یہ لاحول پڑھ کر اٹھ کر چلے آئے اور کہا کہ جو معصوم بچے کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہے کہ ہاتھ میں کچھ نہیں تھا اور کہا کہ: آؤ تمہیں چیز دیں۔ اسے اللہ پر جھوٹ بولتے ہوئے کیا دیر لگتی ہے، وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بول دے تو کیا اس کی زبان تھام لی جائے گی تو یہ بالکل مباح تھا۔ لیکن سارا اپنا سفر اکارت کر کے واپس آ گئے کہ یہ اس قابل نہیں ہے کہ اس سے حدیث سنی جائے، بچے کو بہلانے کے لئے جھوٹ بول دے۔ ہاتھ میں چیز نہ ہو اور کہہ دے کہ آؤ چیز دیں، حالانکہ واقعہ کے لحاظ سے یہ جھوٹ نہیں تھا بہلانے کے لئے توریہ کی سی صورت ہوتی ہے، ایسے آدمی کو کاذب نہیں کہا جا سکتا مگر حدیث کی سند میں صورتِ کذب اور وہمِ کذب کو بھی کذب سمجھا ہے، اس احتیاط سے روایتیں لی ہیں تب آج دین منقح صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگر خدا نخواستہ شیون منکر پیدا ہو جاتے تو قرآن سمجھانے والا آج کوئی باقی نہ رہتا۔ بس پھر یہی ہوتا کہ اردو کے ترجمے دیکھ دیکھ کر لوگ الگ الگ ہانکتے اور کہتے کہ یہ خدا کی مراد ہے اور وہ علم نہ ہوتا اور اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیتے۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو چار فریضے دے کر بھیجا گیا تھا۔ وہ چاروں فریضے آج بھی موجود ہیں۔ اور چاروں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء موجود ہیں۔ الفاظ کی روایت کرنے والے۔ معانی اور احکام کی روایت کرنے والے، تزکیہ قلوب کے سلسلے میں نیابت کا فرض انجام دینے والے بھی اور عمل کا نمونہ دکھلانے والے بھی۔

آدابِ تعلیم ...... مگر ہاں! ان کی تلاش کی ضرورت پڑتی ہے، اس لئے کہ ایسے لوگ لوگوں کے گھروں پر نہیں جایا کرتے کہ ہم سے سیکھ لو۔ لوگوں کو ان کے گھروں پر جانا پڑتا ہے۔ "اَلْعِلْمُ يُؤْتٰى وَلَا يَأْتِىْ" علم خود نہیں آتا۔ اسے حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس جایا جاتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ہارون الرشید نے کہا کہ میرے دو بیٹے ہیں۔ آپ انہیں "موطا" پڑھا دیں۔ (یہ حدیث کی کتاب ہے) آپ نے وعدہ فرمایا کہ پڑھا دوں گا۔ ہارون الرشید نے کہا کہ کس وقت تشریف لایا کریں گے؟ فرمایا تشریف لانے کا کیا مطلب؟

"اَلْعِلْمُ يُؤْتٰى وَلَا يَأْتِىْ" علم خود لوگوں کے دروازوں کے اوپر آیا کرتا ہے؟ ان کو خود آنا پڑے گا، تو ہارون الرشید پر ذرا بھاری گزرا، مگر اس نے کہا کہ بہتر ہے حاضر ہوں گے، مگر ایک شرط ہے کہ عام طالب علموں میں نہ بٹھائیں۔ ان کو ذرا امتیازی جگہ بٹھلائیں۔

فرمایا: طالب علمی کی لائن میں سب برابر ہیں، اگر آپ کو جاہل رکھنا ہے تو میں امتیازی برتاؤ کروں؟ عالم بنانا ہے تو یہ برتاؤ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ علم تمہارے گھر سے نکلا ہے تم بنی عباس ہو۔ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کے اقارب ہو۔ اگر تم ہی اس کو ذلیل کرو گے تو اسے عزت دینے کے لئے کون آئے گا؟

پھر شہزادے اسی طرح جاتے تھے، اسی طرح مؤدب بیٹھتے تھے اور استاد کی جھڑکیاں بھی سنتے تھے، اس طرح حدیث حاصل کی۔ پھر ہارون الرشید کا بھی یہ عالم ہوا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ مامون سے کہا کہ پانی ڈالو میں پیر دھوتا ہوں۔ تو مامون الرشید شاہزادہ پانی ڈال رہا تھا، امام مالک اپنے پیر کو اپنے ہاتھ سے صاف کر رہے تھے، اچانک ہارون الرشید پہنچ گئے تو دیکھ کر امام مالک سے شکایت کی۔ یہ شکایت نہیں کہ کیوں پیر دھلوائے؟ کیوں پانی ڈلوایا۔ فرمایا مجھے اس کی شکایت ہے کہ آپ اپنے پیر کو اپنے ہاتھ سے مل رہے ہیں، مامون کے ایک ہاتھ میں لوٹا ہوتا، ایک ہاتھ سے آپ کے پیر مل کر دھوتا۔ مامون کا یہ فرض تھا۔ نہ یہ کہ وہ فقط پانی ڈالے پھر اس درجے پر ہارون الرشید آ گیا۔

کمالِ طلب......تو حقیقت یہ ہے کہ: "**اَلْعِلْمُ عِزٌّ لَاذُلَّ فِیْهِ وَلٰكِنْ یُحْصَلُ بِذُلٍّ لَاعِزَّفِیْهِ**" یہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ علم ایک ایسی عزت ہے جس میں ذلت کا نشان نہیں، مگر ایسی ذلت سے حاصل ہوتا ہے جس میں عزت کا نشان نہیں، غلامی محض کرنی پڑتی ہے، اساتذہ کے آگے جھکنا پڑتا ہے اڑی کڑی جھیلنی پڑتی ہے۔ تب جا کر چار حرف آتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ یہ اتنا بڑا علم آپ کو کیسے حاصل ہوا تو فرمایا:" **بِلِسَانٍ سَئُوْلٍ وَّقَلْبٍ عَقُوْلٍ**"①

سوال کرنے والی زبان اور عقل مند قلب کے ذریعہ حاصل ہوا، میں نے سوال کرنے میں کبھی عار نہیں کیا۔ اگر مسئلہ معلوم نہیں ہوا اپنے چھوٹے سے سوال کر لیا، چناں چہ ایک دفعہ ایک مسئلہ ذہن میں اٹکا، تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جو کاتب وحی ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے استاد ہیں۔ ضرورت پڑی کہ ان سے تحقیق کی جائے، تو بارہ بجے دوپہر کو یہ سوال ذہن میں آیا تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی دہلیز پر بیٹھ گئے، جہاں جلتا ہوا پتھر ہے، دھوپ پڑ رہی ہے یہ خیال کیا کہ جب ظہر کی نماز کے لئے نکلیں گے تو سوال کروں گا اگر مسجد میں پہنچ گئے تو درس شروع ہو جائے گا، سوال کا موقع نہیں رہے گا تو ساری دوپہر دھوپ میں دہلیز پر بیٹھ کر گزاری۔ جب اچانک زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نکلے فرمایا۔

اے ابن عم رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ آپ کہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟ عرض کیا: حضرت ایک مسئلہ اٹک رہا تھا، اس کی تحقیق کرنی ہے۔ فرمایا پھر آ جاتے۔

عرض کیا: سوال تو دل میں اب ہی کھٹکا تھا، پھر آنے کا کون سا وقت ہے؟ جب سوال ذہن میں آیا تو جبھی حاضر ہو گیا۔

اس سے شدت طلب معلوم ہوئی۔ اور شدت طلب کے ساتھ ساتھ کسر نفس بھی واضح ہوا کہ علم کے حاصل

① فیض القدیر، ج: ۲ ص: ۵۶۹.

کرنے میں نہ کسی وقار کا سوال نہ کسی خودداری کا سوال غلاموں اور خادموں کی طرح جا کر دہلیز کے اوپر بیٹھ گئے اس طرح سے علم حاصل ہوتا ہے۔

عظمتِ استاذ...... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، (جن کا نام نامی ابھی آپ نے سنا) کو خنزیر کے بارے میں تحقیق کرنی تھی فقہی مسئلہ میں کسی موقع پر خنزیر کا ذکر آیا تو لوگوں نے کہا کہ: یہ تو بھنگیوں سے معلوم ہوسکتا ہے، وہی خنزیر پالتے ہیں، انہیں کو زیادہ معلوم ہوگا۔

تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں جو بھنگی آتا تھا، ایک دن اس سے پوچھا کہ بھئی! خنزیر کے بارے میں اس بات میں تمہاری کیا تحقیق ہے؟ کیا علم ہے؟ اس نے اصلیت بتلائی کہ یہ صورت ہوتی ہے۔ اس دن کے بعد سے جب وہ بھنگی آتا تو اس کی تعظیم۔ میں کھڑے ہو جاتے اور فرماتے۔ ''اس کے ذریعہ مجھے ایک علم حاصل ہوا ہے''۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: '' اَنَاعَبْدُمَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفًااِنْ شَآءَ بَاعَ وَاِنْ شَآءَ عَتَقَ''

میں اس کا زرخرید غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف سکھا دیا۔ چاہے مجھے بیچ دے، چاہے آزاد کر دے۔ تو علم تو اس کے ساتھ آتا ہے کہ اتنا نفس پست کر لیا جائے اتنی ذلت وتواضع اختیار کی جائے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے سارا علم سمٹ کر خود بخود ہمارے سینے میں آجائے یہ عادت اللہ کے خلاف ہے۔

اہلِ علم کا استغناء...... ایسے لوگ جو علم میں گہری نظر رکھتے ہیں، علمی تحقیقات پر ان کی عمریں بسر ہوئی ہیں، وہ لوگوں کے گھروں کے دروازوں کو جھانکتے نہیں پھرتے، لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ ان کے پاس آئیں۔ جو آتے ہیں وہ کامیاب ہوتے ہیں جو نہیں آتے بے علم رہ جاتے ہیں، مگر امت خالی نہیں ہے اگر امت خالی ہو جائے تو اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب لازم آتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ یَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَتَاْوِیْلَ الْجَاهِلِیْنَ''

فرمایا کہ: ہر سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے، اس علم کو اٹھاتے رہیں گے اور اس علم کے ذریعے سے غلو کرنے والوں کی تحریفوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے، مبطلوں کی دروغ بافیوں کے پردے چاک کرتے رہیں گے اور جاہلوں کی رکیک تاویلات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور علم نکھر کر سامنے آتا رہے گا، حق وباطل میں امتیاز ہوتا رہے گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں لاوارث چھوڑ کر نہیں گئے، آپ ہمارے ہاتھ میں علم وعمل ذوق اور استقامت ذہن کی پوری قوت دے کر گئے ہیں، سارے راستے ہمارے لئے کھول کر گئے ہیں۔

گمراہی سے حفاظت کی ضمانت...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ: ''تَرَکْتُ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا'' دو وزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم نے ان کو مضبوط پکڑ لیا اور ان کو لپٹ گئے تو کبھی قیامت تک گمراہ نہیں ہوگے۔ ''کِتَابُ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ'' اللہ کی کتاب اور میری سنت۔ میرا طریقہ اور میرا عمل۔ ان کو وزنی کہا ہے؟

اس لئے کہ جب طوفان اٹھتے ہیں ۔ تنکے کا سہارا پکڑ لینے سے جان نہیں بچتی ۔کوئی لکڑی تیر رہی ہے ۔ بڑی سے بڑی ہے وہ خود بہہ رہی ہے ۔آپ نے اسے پکڑلیا ، بہنے ہی کی طرف جائیں گے ۔ جان بچنی ضروری نہیں ۔ لیکن اگر کوئی چٹان پڑی ہو ۔ جو ہلائے نہ ہلے اگر اسے پکڑلیں گے تو طوفان آپ کا کچھ نہیں کرسکتا ۔ تو کتاب وسنت ایک مضبوط چٹان کی طرح ہیں ۔ دنیا میں کتنے ہی جہالتوں اور دروغ بافیوں کے طوفان آئیں لیکن اس چٹان سے جو تمسک کررہا ہے وہ کبھی نہیں بہک سکتا ، کبھی گمراہ نہیں ہوسکتا اس لئے کہ کتاب اللہ اپنی جگہ اٹل ہے اس کے معانی بھی اٹل ہیں ، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے معانی اپنی جگہ اٹل ہیں جو اس سے تمسک کرے گا وہ ہر دروغ بافی کا پردہ چاک کرسکتا ہے ہر مبطل کے انتحال اور ہر جاہل کی رکیک تاویلوں کو رد کرسکتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خبر دے گئے ہیں کہ قیامت تک امت میں خلف صالح پیدا ہوتے رہیں گے ۔

تجدید دین ...... جہاں یہ خبر دی کہ فرقے پیدا ہوں گے ۔ گمراہ پیدا ہوں گے وہاں یہ بھی خبر دی کہ حقانی لوگ بھی برابر جاری رہیں گے ۔ اس امت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا ۔ "لَاتَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَایَضُرُّھُمْ مَّنْ خَاذَلَھُمْ وَلَامَنْ خَالَفَھُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُاللّٰہِ" ① فرمایا! میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی جو منصور من اللہ ہوگی ۔ اللہ کی طرف سے اس کی تائید ہوگی ، خلاف کرنے والے اسے ضرر نہیں پہنچا سکتے رسوا کرنے والے اسے رسوا نہیں کرسکیں گے ۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے ۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا." ② اس امت میں ہر سو برس کے بعد مجدد دین آتے رہیں گے جو دین کو نکھارتے رہیں گے ۔ دودھ اور پانی الگ کر کے نکھار کر علم اور مسائل نکالتے رہیں گے ۔ صدی کے اخیر میں جو لوگ قلت علم اور کثرت جہل سے کچھ کا کچھ سمجھ جائیں گے ، من گھڑت رسوم اور عمل پیدا کردیں گے تو اللہ نے وعدہ کردیا کہ ہر صدی کے آخر میں مجدد دین آکر دین کو نکھار دیں گے ، پھر صدی کے اخیر میں علمی اور عملی فتنے پیدا ہوں گے پھر مجدد آجائیں گے ، خواہ جماعتوں کی صورت میں آئیں یا افراد کی صورت میں آئیں ، غرض امت گمراہ ہونے والی نہیں ہے ۔ چناں چہ فرمایا گیا: "لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ" ③ میری امت پوری کی پوری کبھی گمراہی پر قیامت تک جمع نہیں ہوگی ۔ اہل حق ہمیشہ باقی رہیں گے ۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " کَیْفَ تُھْلَکُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُھَا وَالْمَسِیْحُ اٰخِرُھَا وَالْمَھْدِیُّ وَسَطُھَا" حدیث منکر ہے ۔ السلسلۃ الضعیفۃ ۵/۳۷۱ اول الکتاب ④ "وہ امت کیسے گمراہ ہوسکتی ہے

---

① سنن ابن ماجه، باب اتباع سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، ج: ١، ص: ١٢، رقم: ١٠.

② السنن لابى داؤد، كتاب الملام، باب مايذكر فى قرن المائة. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابى داؤد ج: ٩ ص: ٢٩١. ③ المستدرک للحاکم ج: ١ ص: ٢٠١ رقم: ٣٩٥. حدیث صحیح ہے ۔دیکھئے: صحيح وضعيف الجامع الصغير ج: ٧ ص: ١٧٦. ④ الفتن لنعيم بن حماد، بقاء عيسى ابن مريم عليه السلام بعد نزوله، ج: ٢ ص: ٥٧٨ رقم: ١٦١٤. حدیث صحیح ہے ۔دیکھئے: صحيح وضعيف ابن ماجه ج: ١ ص: ٨٢ رقم: ٨٢.

جس کے ابتدائی سرے پر میں ہوں۔ انتہائی سرے پر مسیح ابن مریم ہوں اور بیچ میں حضرت مہدی ہوں'' تو امت کا اول و آخر کے لحاظ سے بھی بتلایا کہ وہ حق پر قائم رہے گی امت کے درمیانی قرون کا بھی بتلایا کہ ہر قرن میں مجدد آئیں گے، امت کے ہر قرن کے ہر ہر سال کے بارے میں بتلایا کہ: ''یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ'' تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری ہوگا اور خلف صالح پیدا ہوتے رہیں گے، یہ امت کوئی لاوارثی امت نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس کا حلیہ بگاڑ دے، اگر بگاڑنے والے پیدا ہوں گے تو اس بگاڑ کو دکھلانے والے بھی پیدا ہو جائیں گے۔ تاویل کرنے والے ہوں گے تو اس رکیک تاویل کو باطل کرنے والے بھی پیدا ہوں گے۔ بہر حال یہ دین ہر دہر اور قرن میں نکھرا ہوا رہے گا۔

فرقہ ناجیہ...... فرق اتنا ہے کہ کبھی اہل حق کی قلت ہوگی، کبھی کثرت ہوگی۔ لفظ ''طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ'' کا بولا ہے، یعنی ایک چھوٹی جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی، چاہے عددی قلت ہو مگر بہر حال موجود رہے گی۔ اسی طرح جہاں یہ خبر دی کہ امت میں تہتر فرقے پیدا ہوں گے اور بہتر ناری ہوں گے وہاں یہ بھی خبر دی کہ ایک فرقہ ناجی ہوگا۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: '' وَمَنْ هُمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ!(صلی اللہ علیہ وسلم) '' وہ فرقہ ناجیہ کون ہے؟ فرمایا: ''مَا أَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَأَصْحَابِیْ'' جس پر میں اور میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) آج کے دن ہیں اس پر چلنے والا فرقہ حق ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین معیارِ حق ہیں...... اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ: ''مَا أَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَأَصْحَابِیْ'' جس پر میں اور میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو اپنے ساتھ شریک کیا۔

اس سے واضح ہوا کہ جو میرا دین ہے وہی بعینہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا دین ہے۔ جو میرا عقیدہ ہے وہی بعینہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا عقیدہ ہے جو میرا عمل ہے وہی بعینہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل ہے۔ فرق اتنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ان اعمال کے ساتھ وہ اعمال بھی ہیں کہ امت ان کی نقل نہیں اتار سکتی جو خصوصیات نبوت میں داخل ہیں۔ صحابہ کے اندر عملوں کے مختلف نمونے ہیں، تاجر ہے تو تجارتی عمل دیانت کے ساتھ اس کے اندر موجود ہے، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم زارع اور کاشت کار ہیں تو زراعت کے مسائل دیانت کے ساتھ ان کے اندر موجود ہیں۔ فوجی ہیں تو فوج کے مسائل دیانت کے ساتھ موجود ہے۔ سول میں ملازم ہیں تو اس کے مسائل دیانت کے ساتھ ان میں موجود ہیں۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم مختلف رنگوں کے ہیں۔ مگر ہر رنگ میں دیانت بھری ہوئی ہے، سرخ اور سبز رنگ ہے، مگر اندر ان کے دین کی روح کام کر رہی ہے۔

امت میں چوں کہ طبقات مختلف ہیں، طبائع مختلف ہیں۔ مزاج مختلف ہیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں اللہ نے اتنے ہی مزاج کے لوگ پیدا کر دیئے تاکہ جس مزاج کا آدمی ہو جیسا مزاج چاہئے ویسے ہی مزاج کا آدمی صحابہ رضی

اللہ عنہم میں مل جائے اس لئے فرمایا کہ ''میں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم'' تو سارے صحابہ رضی اللہ عنہ کا ایک دین ہے، اس لئے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کا متبع بن گیا وہ میرا متبع ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو معیار بتلایا کہ ان کے عمل اور ایمان پر اپنے عمل اور ایمان کو پرکھ لو، یعنی تم صحابہ رضی اللہ عنہم کے افعال پر نقد و تبصرہ نہیں کر سکتے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم تمہارے افعال پر نقد و تبصرہ کریں گے کیوں کہ وہ تمہارے کھرے اور کھوٹے پہچاننے کے لئے کسوٹی ہیں۔ تو کسوٹی بتلاتی ہے کہ سونا کھرا ہے یا کھوٹا، سونے کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ بتلائے کہ یہ کسوٹی کھری ہے یا کھوٹی، تو کسوٹی ناقد ہے منقود نہیں ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم ناقد ہیں ہم منقود ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ منقود ہمیشہ مغلوب ہوتا ہے۔ ناقد غالب ہوتا ہے۔ اگر ہم صحابہ رضی اللہ عنہم پر نقد و تبصرہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان پر غالب اور افضل ہیں۔ ان کے اعمال کا کھرا اور کھوٹا بتا سکتے ہیں۔ حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہمارے حق میں کسوٹی ہیں۔ وہ بتلائیں گے کہ تمہارا اتنا عمل کھوٹا ہے کیوں کہ وہ ہمارے مطابق نہیں ہے اور اتنا کھرا ہے کہ جو ہمارے مطابق ہے۔ گویا صحابہ رضی اللہ عنہم کو معیار بتلایا گیا۔

اہل حق کی پہچان...... اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت و محبت اور اطاعت دل میں موجود ہے۔ تو سمجھ لو کہ وہ فرقہ حق پر ہے اور اگر عظمت و محبت اور اطاعت موجود نہیں ہے تو باطل پر ہے یہ ایک کھلا معیار ہے۔ اس لئے جو فرقے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں گالم گلوچ کرتے ہیں وہ کبھی حقانی نہیں کہے جا سکتے۔ انہوں نے پہلی بنیاد ہی ختم کر دی جو ان کے حق میں اس کے قائل ہیں کہ ان کی فلاں بات کھری ہے اور فلاں کھوٹی ہے وہ کبھی بھی دین کو پوری طرح نہیں پا سکتے۔ دین کو وہی پائیں گے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوری عظمت کے قائل ہیں۔ چناں چہ اہل سنت و الجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ: "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ." سارے صحابہ رضی اللہ عنہم عدول، متقن اور پارسا ہیں۔

جیسے انبیاء علیہم السلام اپنے اقوال و افعال میں معصوم ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اپنی نیات اور باطن میں محفوظ ہیں، عملی لغزش اگر ان سے ہو جائے تو ہو جائے، مگر ان کے قلوب کا رخ اتنا پاک اور صحیح ہے کہ اللہ نے ان کے قلوب کو پہلے ہی جانچ لیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّأَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ ①

صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ اللہ نے ان کے قلوب کا پہلے ہی امتحان کر لیا ہے۔ انہیں اپنے رسول کی صحبت کے لئے منتخب کیا ہے، تو امتحان کر لیا اور یہ امتحان میں پاس ہو گئے، اس لئے ان کے لئے مغفرت بھی ہے اور اجر عظیم بھی ہے تو جس پر حق تعالیٰ اطمینان نہ فرمائیں اسے کیسے اجر دیں؟

اسی طرح اور مقام پر ارشاد ہے: "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی۔ جن کے دلوں میں کھوٹ ہو۔ اللہ ان سے کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ رضا بھی ایسی کہ اس کا اعلان کر دیا گیا اور اعلان قرآن

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳۔

حکیم میں کیا گیا تا کہ قیامت تک یہ اعلان جاری رہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں آ سکتا کہ ان کا کھوٹ ثابت ہو۔ قیامت تک ان کی رضا کا پتہ دے دیا۔ غرض قلوب اور باطن کا پتہ یہ کہہ کر دیا کہ ہم نے ان کے قلوب کو جانچ لیا ہے اور اعمال کا پتہ دوسری جگہ دیا۔ فرمایا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ ①

تم انہیں دیکھو گے کہ رکوع اور سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ کے فضل اور رضا کو تلاش کر رہے ہیں۔ ہر حال میں اللہ کی طرف انابت اور رجوع ہے ان کے سجدوں کا اثر ان کی پیشانیوں پر آ گیا ہے تو ایک طرف عمل کو سراہا اور ایک طرف دل کو سراہا۔ ایک طرف ان کا مقام بتلایا تو من حیث الطبقہ جس طبقے کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے۔ وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے، بعد میں افراداً آتے رہیں گے، لیکن من حیث الطبقہ پورے طبقے کو سراہا گیا۔ اس کی تقدیس کر دی گئی ہو۔ سوائے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دوسرا طبقہ نہیں ہے۔ اس لئے فرمادیا گیا: ''اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ'' میرے سارے صحابہ رضی اللہ عنہم ستاروں کی مانند ہیں، جس کی روشنی میں چل پڑو گے۔ ہدایت پا جاؤ گے، راستہ تمہیں مل جائے گا، کسی کا استثناء نہیں کیا۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم امین ہوئے۔

وارثت نبوی کا استحقاق...... اور گویا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی روحانی اولاد ہیں پھر ان کی روحانی اولاد تابعین ہیں جنہیں وہ وراثت ملی پھر ان کی روحانی اولاد تبع تابعین ہیں۔ جنہیں وہ وراثت ملی ثم وثم چلتے چلتے وہ فرقہ حقہ وہ اہل حق آج بھی ان کے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کے وارث بنے تو ہماری علمی وراثت جب ہی قائم رہ سکتی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔ اگر بیچ میں ایک کڑی بھی کٹ گئی وراثت سے محروم ہو جائیں گے اس لئے کہ وراثت اسے ملتی ہے جس کا نسب محفوظ ہو اور نسب ہی محفوظ نہ ہو تو وراثت کا حق دار کہاں ہے؟ جس نے طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم یا تابعین یا تبع تابعین سے تعلق نہ رکھا تو سوال یہ ہے کہ وہ دین اس تک پہنچا کیسے؟ وہ جو سلسلہ زنجیر کا آ رہا ہے تھا اس کی کڑی ٹوٹ گئی تو دین کیسے پہنچا؟ وحی آنے سے رہی کیوں کہ نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ عقلی اختراعات کا نام دین نہیں ہے، نقل کا نام دین ہے، اور منقول ہونے کے لئے سلسلہ کی ضرورت ہے، اور سلسلہ میں سے ایک کڑی نکل گئی پھر دین کیسے پہنچا؟ تو لامحالہ الفاظ ومعانی، ذوق اور استقامت قلب نیز تزکیہ نفس میں سلسلہ ماننا پڑے گا، ساری چیزیں ہم تک منقول ہو کر پہنچیں گی تب تک دین کا کمال ہم میں پیدا ہو گا، سلسلہ کٹ گیا یا سلسلہ کے ذریعہ جو چار چیزیں ہم تک پہنچ رہی تھیں، ان میں سے ایک کڑی کٹ گئی۔ دین ناقص رہ جائے گا۔ تو وعدہ یہ کیا گیا ہے کہ دین کامل ہو کر باقی رہے گا اور سلسلہ ختم ہونے کے بعد سرے سے دین نہیں رہتا اور دین کے اجزاء میں سے کوئی چیز کٹ جائے تو کامل دین نہیں رہتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب لازم آئے گی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس سے بری ہے کہ کوئی اس کی تکذیب کرے۔

---

① پارہ: ۲۶، سورة الفتح، الآية: ۲۹.

آفتابِ راہ اور راہ نما...... بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آفتابِ نبوت بن کر تشریف لائے، دنیا میں عقائد و اعمال اور رسوم کی جو ظلمات پھیل گئی تھیں، آفتاب نبوت نے آ کر ان سب کے پردے چاک کر دیئے، دیگر انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام ستاروں کی مانند ہیں۔ ستارے سارے کے سارے نمودار ہو جائیں، مگر رات زائل نہیں ہوتی اگرچہ روشنی پھیل جائے۔ آفتاب کی آمد کا جب قصہ شروع ہوا پو پھٹی تو ابھی آفتاب نکلا نہیں مگر رات غائب ہونا شروع ہو جاتی ہے تو تمام انبیاء علیہم السلام آئے انہوں نے دلوں میں دماغوں میں روشنی پھیلائی۔ لیکن رات ہی رات رہی مگر آفتاب نبوت طلوع ہوتے رات ختم ہوگئی اور دن نکل آیا اور ہر چیز جتنی دن میں واضح نظر آتی ہے، رات میں نظر نہیں آتی تو توحید کے دقائق رسالت کے دقائق بلاشبہ سارے انبیاء علیہم السلام نے سمجھائے۔ لیکن رات کے وقت روشنی میں آدمی اجمالی طور پر سمجھتا ہے۔ دن کی روشنی میں ایک ایک مخفی چیز نمایاں ہو جاتی ہے تو توحید و رسالت کے جتنے دقائق اس دین میں کھلے۔ پچھلے ادیان میں وہ حقائق نہیں ملتے جتنے علوم و معارف توحید و رسالت کے اس دین نے واضح کئے دنیا کے کسی دین میں نہیں کھلے پچھلے انبیاء علیہم السلام نے نکتے کھولے مگر جتنی روشنی تھی اتنا اجمال سامنے آگیا، جب تیز روشنی پڑی تو چھپی چیزیں بھی کھل گئیں اور نمایاں ہوگئیں۔

غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات آفتاب نبوت اور مشعل نور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھنا یہ اس کی دلیل ہے کہ حق واضح ہوگیا جو آپ سے اوجھل ہے وہ ناحق ہے اور جو آپ میں روشن ہے وہ حق ہے، تو راستہ قطع کرنیکی لئے روشنی کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے روشنی بھیج دی۔ راہنما کی ضرورت تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں ہماری راہنما ہیں کہ نماز و جہاد ایسے کرو۔ گھریلو زندگی ایسے بسر کرو تو ایک ایک سنت ہمارے عمل ے لئے راہنمائی کرتی ہے تو جہاں راستہ کے لئے نور کی ضرورت تھی وہاں رہنما کی بھی ضرورت تھی۔

صراطِ مستقیم......اور صراط مستقیم اللہ کی روشن کتاب ہے۔ جس نے ایک لائن بچھا دی ہے۔ جس پر آدمی دوڑتا ہوا اللہ تک پہنچ جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: "اَلْقُرْاٰنُ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ" ① یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو اس نے آسمان سے زمین تک لٹکا دی ہے۔ تمہارا کام کیا ہے؟ ﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا ﴾ ② اللہ کی رسی کو تم مضبوط پکڑ لو۔ جب یہ رسی کھینچی جائے گی تو اس کے ساتھ لپٹنے والے کھنچ کر اوپر پہنچ جائیں گے۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن پہلے آسمان سے لے کر ساتویں زمین تک یہ سارا علاقہ جہنم کا ہوگا۔ جس میں آگ بھی تپے گی اور سارے سانپ بچھو وغیرہ ہوں گے۔

اور آسمان اول کے اوپر جنتیں ہوں گی۔ ویسے جنت ساتویں آسمان کے اوپر ہے لیکن قیامت کے دن اسے آسمان اوّل پر لا کر رکھیں گے اور آسمان بیچ میں ہوگا، پانچ سو برس کی مسافت اس کا پل ہوگا جو کہ اعراف ہوگا۔ جس

① تفسیر الطبری، واعتصمو ابحبل اللہ ج: ۴ ص: ۳۱ حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحیحة ج: ۵ ص: ۳۳.

② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳.

میں کچھ آثار جنت کے ہوں گے اور کچھ آثار جہنم کے ہوں گے تو یہ سارا جہنم کا علاقہ ہے، جس میں ہم اور آپ پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ نے رسی لٹکائی کہ جسے جہنم سے نکل بھاگنا ہو۔ اس رسی کو پکڑ لے، میں اسے کھینچنے والا ہوں جو اسے پکڑ لے وہ بھی آ جائے گا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ کفار نے جو اللہ کی رسی کو نہیں پکڑا تو انہیں جہنم میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں وہ ہیں ہی جہنم میں۔ تو اللہ کی رسی ٹوٹ نہیں سکتی البتہ چھوٹ سکتی ہے تو غور کرتے رہنا چاہئے بیدار رہنا چاہئے کہ کہیں یہ رسی چھوٹ نہ جائے۔ اللہ کے باطن سے نکل کر اس کا کلام (رسّی) آیا۔ جو اسے تھامے گا۔ باطن حق سے اس کا تعلق قائم ہوگا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ'' ''قرآن پاک سے برکت حاصل کرو۔ کیوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے''۔ حق تعالیٰ کا تبرک براہ راست دنیا میں جو موجود ہے وہ صرف اس امت کے ہاتھ میں موجود ہے کہ اس نے کلام کیا اور وہ کلام بعینہ ہمارے ہاتھ میں موجود ہے۔

ویسے تو زمین، آسمان، سورج وغیرہ سب کچھ اس کا تبرک ہے جن سے ہم فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر یہ سب کچھ مخلوق ہیں اور قرآن کو پیدا نہیں کیا یہ تو کلام ہے اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ جو اس کی صفت ہے، تو صفت کو موصوف پیدا نہیں کیا کرتا۔ صفت موصوف سے صادر ہوتی ہے۔ میں یوں نہیں کہوں گا کہ میں اپنے کلام کو پیدا کر رہا ہوں۔ یوں کہوں گا کہ بول رہا ہوں، یعنی کلام مجھ سے صادر ہو رہا ہے۔ سرزد ہو رہا ہے کہ جو چیز میرے اندر بھری ہوئی ہے وہ باہر نکل رہی ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ میں کلام کو پیدا کر رہا ہوں۔ تو جو چیز اللہ سے صادر ہو رہی ہو۔ وہ اللہ سے منقطع نہیں ہو سکتی۔ اس کا سرا اوپر اللہ میاں سے لگا ہوا ہے نیچے کا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اگر تھامو گے تو اللہ کی ذات تک رسائی ہوگی۔ اسی واسطے کثرت تلاوت سے جو ترقی ہوتی ہے اس سے ذات باری تعالیٰ سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری عبادات سے آدمی صفات خداوندی تک پہنچتا ہے، بہرحال یہ مسئلہ بہت طویل ہے اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کریم اللہ کی ایک رسی ہے جسے اس جہنم سے نکل بھاگنا ہے، وہ اس رسی کو مضبوطی سے تھام لے۔ غرض کتاب اللہ صراطِ مستقیم ہے۔ جس پر چل کر آدمی اللہ تک پہنچتا ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مشعل نور، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں راہنما اور سیدھا راستہ کتابِ مبین اور چلنے والے ہم اور آپ ہیں۔ اگر چلنے کا جذبہ ہے، تو راستہ روشنی مینارے، میل اور فرلانگ کے نشانات موجود ہیں، اور منزل بھی سامنے ہے اور اگر چلنے کا ارادہ نہ ہو تو اس کے حق میں روشنی اور راستہ سب کچھ بیکار ہے۔ سنتیں اور واجبات بھی بے کار:

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

قرآن وحدیث کی طرف سے کوئی کمی اور کوتاہی نہیں ہے کمی اور کوتاہی چلنے والوں کی طرف سے ہے۔ یہ چلنا نہیں چاہتے ورنہ ادھر سے فیضانِ خداوندی موجود ہے۔

حصولِ مقصد کی شرائط...... بہرحال میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ہر مقصد تک پہنچنے کے لئے چار باتوں کی ضرورت ہے، ایک روشنی، راہ ایک راستہ، ایک راہنما ہو جو مبصر اور دانا ہو۔ راستے کے نشیب وفراز سے واقف ہو تو روشنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ اور صراطِ مستقیم کتاب اللہ ہے جس میں کہیں ٹیڑھ کا نشان نہیں ہے۔ ﴿ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ﴾ ① یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی کھٹکا، زیغ اور ٹیڑھ پن نہیں ہے، سیدھا سیدھا راستہ ہے۔

یہ فرمایا: ﴿لَا رَیْبَ فِیْہِ﴾ یہ نہیں فرمایا "لَا رَیْبَ فِیْھِمْ" کہ لوگوں کے اندر ریب (اور شک) نہیں جتنی کھٹک ہے وہ ہمارے ہی سینوں میں ہے، کتاب میں کوئی کھٹک نہیں مگر یہ کھٹک بھی کتاب ہی کی طرف رجوع کرنے سے زائل ہوگی۔ خود بخود زائل نہیں ہوگی۔ آپ اس انتظار میں رہیں کہ پہلے کھٹک زائل ہو جائے پھر کتاب اللہ کو پکڑوں؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کے بدن پر ناپاکی لگی ہوئی ہو اور دریا ہو سامنے اور یہ کہے کہ پہلے پاک ہو جاؤں۔ دریا کہے گا۔ بے وقوف! میرے اندر آکے دیکھ، پاک بھی میں ہی کروں گا، اس لئے اگر کسی کے دل میں زیغ اور کجی موجود ہے اور وہ اس کا علاج چاہتا ہے تو اس میل کو دھونے کے لئے کتاب وسنت ہی ذریعہ ہے۔

لٹریچر کی کثرت کا نقصان...... زیغ تربیت اور تزکیہ نفس سے ہٹے گا، اس کے لئے شخصیت کی ضرورت پڑے گی، شخصیتوں کی طرف رجوع کئے بغیر محض کاغذی لٹریچر اور کالے نقوش سے کام نہیں چلے گا۔ آج ہم لٹریچر کتنا ہی اکٹھا کرلیں ہزاروں کتابیں شائع کردیں لیکن جب تک نفس کی تربیت نہ ہو تو جو کتاب جس کے آگے جائے گی جب ذہن بنا ہوا نہیں تو الٹے ذہن سے الٹی بات سمجھے گا۔ سیدھے ذہن سے دیکھے گا۔ سیدھی بات سمجھ میں آئے گی اور ذہن عموماً نا تربیت یافتہ ہیں۔ اس لئے میں تو سمجھتا ہوں کہ لٹریچر کی کثرت عموماً مسلمانوں کو مضر پڑ رہی ہے۔ وہ فقط کاغذ کے بندے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اہل حق کی طرف رجوع نہیں کرتے، بس کتابچہ دیکھ لیں گے۔ تو کتابچوں سے دین تھوڑا ہی آتا ہے، دین تو صحبت اہل اللہ اور صحبتِ صلحاء سے آتا ہے۔

مرکزِ علم شخصیّت ہے اور کتاب علامت...... اسی واسطے جب کسی عالم کے علم کو جانچتے ہیں۔ اس سے یہ پوچھا کرتے ہیں؟ کہ تمہارا استاذ کون ہے؟ اور اس کا استاذ کون ہے؟ سلسلہ کیا ہے؟ یعنی سند پوچھی جاتی ہے۔ اگر دیکھتے ہیں کہ سند بڑے بڑے علماء کی ہے تو سمجھتے ہیں کہ مستند عالم ہے۔ یوں کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ نے کون سی کتاب پر پڑھا تھا۔ اگر تو مطبع مجتبائی کی چھپی ہوئی تھی۔ تب تو آپ بڑے عالم ہیں، اگر کسی اور مطبع کی تھی تو آپ گھٹیا درجہ کے عالم ہیں، کیوں کہ وہ کتابیں غلط چھاپتا تھا اس کا کاغذ اچھا نہیں ہوتا تھا تو عالم کا علم کاغذ اور کتاب سے نہیں پہچانا جاتا۔ روشنائی کی عمدگی سے نہیں پہچانا جاتا۔ اس سے پہچانا جائے گا کہ اس کا معلم کیسا تھا۔ اس میں دین تھا یا نہیں۔

ابن سیرین رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "اِنَّ ھٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ" یہ علم

① پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۱۔

تمہارا دین ہے۔ تو جس سے دین سیکھو، پہلے اسے بھی دیکھ لو کہ اس میں بھی دین ہے یا نہیں، اس لئے کہ دین سینوں سے آتا ہے، سفینوں سے نہیں آتا۔

کتاب تو درحقیقت نقوش اور علامات ہیں۔ ان نقوش اور علامات کے حقائق سینوں کے اندر موجود ہیں۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا: ﴿ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ ۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾ ① یہ آیات بینات اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

انہوں نے اس ریاضت و مجاہدہ اور امانت و دیانت سے سینوں میں لیا ہے۔ کتابوں کی سند نہیں ہوتی کہ اس سے پہلے کون سی کتاب چھپی تھی، اور اس سے پہلے کون سی۔ یہ دیکھیں گے کہ اسے کس نے پڑھایا اور اسے کس نے پڑھایا۔ تو محدثین سندوں میں شخصیتوں کو پیش کرتے ہیں۔ کتابوں کو پیش نہیں کرتے، اس لئے مرکز علم شخصیت ہوتی ہے، کتاب نہیں، کتاب علامت ہوتی ہے جس سے وہ علم موجود رہے اور غلطی کے وقت کتاب کی طرف رجوع کریں۔

آدابِ طریق...... اس لئے محض کتابوں اور پمفلٹوں سے اگر ہم دین حاصل کریں۔ کبھی دین حاصل نہیں ہوگا۔ دس رائیں پیدا ہوں گی۔ یہی وجہ ہے جو کتاب دیکھتا ہے اس کی اپنی ایک رائے ہوتی ہے۔ یہ جو ہو رہا ہے کہ ہر آدمی کہتا ہے کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے اب اسے کون سمجھائے کہ آیت کا مطلب سمجھنے کے لئے کچھ اصول موضوعہ بھی ہیں اور کچھ مقدمات بھی ہیں۔ وہ تو نے حاصل نہیں کئے۔ چاہتا یہ ہے کہ سارے مطالب میں سمجھ لوں۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے اقلیدس کی شکل حل کرنے کے لئے ایک دیہات کا گنوار یہ کہے کہ مجھے اقلیدس کی اڑتالیسویں شکل سمجھا دو۔ آپ اسے پوچھیں گے کہ اصول موضوعہ تجھے یاد ہیں؟ وہ کہے گا کہ وہ تو میں نے نہیں پڑھے۔ علوم متعلقہ تجھے یاد ہیں؟ کہ یہ بھی نہیں پڑھے۔ تو استاد کہے گا میں سمجھاؤں کس طرح؟ جب مبادی تیرے ذہن میں نہیں تو مقاصد کس طرح ذہن میں ڈالوں، غرض علم کے لئے بہت سے مبادی اور مقدمات کی ضرورت ہے اور وہ کتاب وسنت میں ہیں۔ وہ مقدمات ذہن میں ندارد، اور نتیجہ سمجھنے کے لئے آجائے اور بحث کرنے کے لئے تیار، اب کس طرح سے ان کو سمجھایا جائے تو لٹریچر کی زیادتی سے یہ نقصان پہنچ رہا ہے کہ دس ہزار آدمی ہیں تو مسئلہ کے اندر دس ہزار رائیں ہیں، پھر ہر ایک اپنی رائے پر جمود کئے ہوئے ہے کہ اسے ہی مانو یہی امر حق ہے، یا پھر مجھے سمجھا دیں۔ اور جو چیز سمجھ میں نہ آئے۔ چاہے اسی کے نقصان فہم کی وجہ سے سمجھ میں نہ آئے وہ سمجھتا ہے کہ مسئلہ ہی غلط ہے جو میں سمجھتا ہوں، وہ صحیح ہے۔ اس لئے علامات قیامت میں فرمایا گیا ہے کہ: "اِعْجَابُ كُلِّ ذِىْ رَأْىٍ بِرَأْيِهٖ" ② ہر شخص کو اپنی رائے پر اتنا اصرار اور جمود ہوگا کہ وہ اسے وحی خداوندی سمجھے گا کہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اپنی رائے کے اوپر ایک گھمنڈ اور اتراہٹ ہوگی۔ لیکن جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں سامنے آئیں گی اور

---

① پارہ: ۲۱، سورة العنكبوت، الآية: ۴۹.

② السنن للترمذي، كتاب تفسير القرآن، باب ومن سورة المائدة ج: ۱۰ ص: ۳۲۱.

کتاب مبین کی اغراض ومقاصد اور مرادات واضح ہوں گی۔ پھر خود بخود اپنا کھوٹ اپنے اوپر کھل جائے گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں انسان سب سے پہلے اپنا کھوٹ دیکھتا ہے۔ اس کھوٹ کو زائل کر کے محبت اور اتباع کتاب سے اپنے اندر نورانیت پیدا کرتا ہے اور اطاعت کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں درکار ہیں، تو سنن نبوی ہمارے عمل کے لئے راہنمائی کرتی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات روشنی پہنچاتی ہے، اور سیدھا راستہ کتابِ مبین ہے، اب ضرورت ہے چلنے کی تو چلنے والے ہم اور آپ ہیں۔ اگر ہم ہی نہ چلیں تو کتاب وسنّت کا کوئی قصور نہیں۔ گھر بیٹھے ہی ایک رائے قائم کرلیں تو کتاب وسنت پر وہ رائے عائد نہیں ہوسکتی اسی واسطے دین کے اندر مطیع و متادب بن کر چلنے کی ضرورت ہے۔

وسائلِ علم کا ادب ...... دین کی بنیاد ادب کے اوپر ہے۔

بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

جب ادب نہیں تو دین کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ دین کی بنیاد تا ادب پر ہے اللہ کا ادب۔ اللہ کے رسول کا ادب، کتاب اللہ کا ادب، بیت اللہ کا ادب، اہل علم کا ادب، اور وسائل علم کا ادب جب تک نہ ہو دین نہیں آسکتا۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو واقعی آیت من آیات اللہ تھے اور اس زمانے میں قدیم محدثین کا ایک نمونہ اللہ نے علم درایت وتفقہ اور عمل کے لحاظ سے پیدا کر دیا تھا نے خود ایک دفعہ فرمایا: بات تو بڑی چھوٹی سی ہے مگر جب آدمی کرے تو اس پر استقامت بڑی مشکل ہے۔ فرمایا: ''پانچ برس کی عمر سے جب سے میں نے ہوش سنبھالا اور آج میری عمر ساٹھ برس کی ہے کسی دینی کتاب کو میں نے بے وضو ہاتھ نہیں لگایا''۔ یعنی قرآن کے بارے میں نہیں۔ حدیث کی کتاب ہو، فقہ کی ہو، اصول فقہ کی ہو، جس پر دینی فن کا اطلاق آجائے فرمایا: اسے میں بے وضو ہاتھ نہیں لگاتا، اتنا ادب تھا تو حضرت شاہ صاحب بن گئے، بے ادب کا مقام تھوڑا ہی ہے کہ وہ شاہ صاحب بن جائے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ (1) ''اے ایمان والو! نبی کی مجلس میں نبی کی آواز سے اپنی آواز کو بلند مت کرو۔ کیوں کہ یہ بے ادبی ہے''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی آواز سے اپنی آواز کو غالب بنانا چاہتے ہیں تو یہ گستاخی ہے ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ اعمال کی بقا ادب کے ساتھ ہے اگر بے ادبی ہوگی تو عمل حبط وضبط ہو جائیں گے اتنا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ خلقی طور پر جہری الصوت (بہت بلند آواز) تھے جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسجد نبوی میں آہستہ بولنے لگے تھے کہ لوگ ان کی باتوں کو کان لگا کر سنتے تھے، کہتے تھے کہ میری آواز بلند نہ ہو کہ میرے عمل اللہ کے ہاں حبط کر لئے جائیں۔ غرض یہ کہ ادب سکھلایا گیا۔ اسی طرح فرمایا

(1) پارہ: ۲٦، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۲.

گیا: ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ ① رسول کو اس طرح مت پکارو۔ جس طرح آپس میں بے تکلف ایک دوسرے کو پکار دیتے ہو، بلکہ ادب وعظمت اور احترام کے ساتھ پکارو۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے یا محمد کہہ کر پکارا۔ تو تنبیہ فرمائی گئی: یَارَسُوْلَ اللهِ! یَانَبِیَ اللهِ! کہہ کر پکارو۔ نام لے کر مت پکارو۔

رعایتِ مقام..... خود حق تعالیٰ شانہ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو نام لے لے کر پکارا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے القاب سے پکارا۔

﴿يَآدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ﴾ ② ﴿يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ﴾ ③ ﴿يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ﴾ ④ ﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ﴾ ⑤ ﴿يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ ⑥ ﴿يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ﴾ ⑦

غرض ہر نبی کا نام لے پکارا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطاب فرمایا تو کہیں "یَامُحَمَّدُ" نہیں فرمایا بلکہ کہیں ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ﴾ ⑧ کہیں فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ ⑨ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ﴾ ⑩

منصب کے لقب لئے جاتے ہیں۔ تاکہ حرمت واحترام واضح کر دیا جائے۔ اور نمونہ بتلا دیا جائے کہ نبی کا نام لے کر کوئی نہ پکارو۔ خطاب خداوندی سے پکارو۔ رسول و نبی آپ کا خطاب ہے۔

حبیب اللہ آپ کا خطاب ہے۔ تو جب حق تعالیٰ شانہ جن کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کئے ہوئے ہیں وہ احترام فرمائیں گویا اپنی بنائی ہوئی چیز ان کے نزدیک اتنی اعلیٰ ہے کہ خود بھی احترام فرما رہے ہیں تو ہماری اور آپ کی کیا مجال ہے کہ ہم بے حرمتی سے پیش آئیں۔ اگر بے حرمتی سے پیش آئیں گے تو عقائد وعمل اور دین بھی حبط۔

غرض اللہ کے رسول کا ادب بتلایا گیا۔ کتاب اللہ کا ادب بتلایا گیا ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ ⑪

"کتاب اللہ کو چھوئیں۔ صرف وہ لوگ جو طہارت حاصل کر چکے ہوں" وضو اور غسل جنابت کئے ہوئے ہوں۔ جو پاک ہوں وہ ہاتھ لگائیں، تو کتاب اللہ، رسول اللہ، بیت اللہ اور مساجد کا ادب بتلایا۔

لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ مساجد میں جمع ہو گئے ادھر ادھر کی بات چیت شروع کر دی تو اس کے بارے

---

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۳.
② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۳.
③ پارہ: ۱۲، سورۃ الھود، الآیۃ: ۴۸.
④ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۷.
⑤ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۱۲.
⑥ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۵۵.
⑦ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۴.
⑧ پارہ: ۲۹، سورۃ المدثر، الآیۃ: ۱، ۲.
⑨ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۶۷.
⑩ پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۹.
⑪ پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۷۹.

میں فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَآ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ﴾ ① اس سے زیادہ بدقسمت و بدبخت کون ہے جو مساجد میں ذکر اللہ کرنے والوں روکے اور مساجد کو ڈھائے۔ ایک مسجد کی صورت ہے جو اینٹ پتھر ہے۔ ان کے ڈھانے کا یہ مطلب ہے کہ عمارت گرادے اور ایک مسجد کی حقیقت ہے جو ذکر اللہ ہے اگر کوئی ذکر اللہ پر پابندی عائد کردے اور مخل بن جائے تو اس نے مسجد کی حقیقت کو ڈھادیا۔ دنیا کی باتوں سے ایسے مخل بن جائے کہ دوسرا نفلیں نہ پڑھ سکے زور زور سے دنیا بھر کی خرافات کررہے ہیں۔ دوسرے کی تلاوت میں خلل پڑرہا ہے۔ یہ حقیقت مسجد کو ڈھادینا اور گرادینا ہے ان لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں تھا بلکہ ان لوگوں پر واجب تھا کہ مسجد میں خوف و دہشت زدہ اور ڈرتے ہوئے داخل ہوئے کہ یہ دربارِ خداوندی ہے نہ یہ کہ بے ادبی گستاخی لاپرواہی اور لاابالی پن سے داخل ہوتے۔

اسی طرح اولیاء اللہ کا ادب بتلایا گیا کہ اللہ کے جتنے اولیاء ہیں۔ انکی عظمت وحرمت کو ملحوظ رکھا جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا: مَنْ صَلّٰى خَلْفَ عَالِمٍ تَقِيٍّ فَكَاَنَّمَا صَلّٰى خَلْفَ نَبِيٍّ ② جس نے کسی متقی عالم کے پیچھے نماز پڑھی اس نے گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی تو ربانیوں کی توقیر اور ادب بتلایا گیا۔ بہر حال علم کا ادب وسائل و اشخاصِ علم کا ادب بتلایا گیا ادب کے بغیر دین حاصل نہیں ہوتا جس قوم کے اندر جسارت اور بے ادبی ہوگی۔ وہ دین سے محروم رہے گی۔

فسادِ کبیر...... صاحبِ ہدایہ نے ایک قطعہ لکھا ہے۔

فَسَادٌ كَبِيْرٌ عَالِمٌ مُتَهَتِّكٌ ‏ وَاَكْبَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَنَسِّكٌ

هُمَا فِتْنَةٌ فِی الْعَالَمِيْنَ كَبِيْرَةٌ ‏ لِمَنْ بِهِمَا فِیْ دِيْنِهٖ يَتَمَسَّكُ

وہ عالم فسادِ کبیر ہے جو بے ادب اور گستاخ ہو وہ دنیا کو بے ادبی کے راستہ پر ڈال دے گا تو عالم میں مفسدہ پھیلا رہا ہے اور اس سے بڑا مفسد جہالت کے ساتھ من گھڑت طریقوں پر عبادت کرے۔ اور جس راستہ پر چاہا بے سند چل پڑا۔ بے سند رسوم اختیار کیں۔ بدعات میں مبتلا ہوگیا۔ یہ جاہل بھی بے ادب عالم سے زیادہ فسادِ کبیر ہے جو جہالت سے عبادت کرے۔ مسئلہ اور فتویٰ نہ پوچھے۔ ایسا عالم اور جاہل یہ دونوں عالم کے اندر فتنے ہیں اور اس شخص کے لئے بھی فتنہ ہیں جو ان سے اپنے دین کا تمسک کرے اور انہیں اپنا راہنما بنائے۔ وہ بھی فتنہ میں گرفتار ہوجائے گا۔

عالم کا جوہر...... عالم کا جوہر یہ ہے کہ اس میں ادب ہو۔ ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ③ خوفِ خدا اور خشیۃ اللہ عالم ہی کے اندر ہوتا ہے جتنا جس میں علم ہے۔ اتنی ہی اس میں خشیت ہے۔ جتنا علم

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۱۴۔ ② علامہ زیلعیؒ نے اس روایت کو غریب قرار دیا ہے البتہ وہ فرماتے ہیں: معجم طبرانی میں اس کے مثل روایت موجود ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ان سرکم ان تقبل صلاتکم فلیؤمکم علمائکم فانھم وفدکم فیما بینکم وبین ربکم دیکھئے: نصب الرایۃ، باب الامامۃ، ج: ۲ ص: ۴۸۰۔ ③ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸۔

سے کورا ہے۔ اتنا ہی اس میں بے خوفی ہے اور نڈر ہے تو بنیادی چیز ادب ہے۔ دین اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک ادب نہ کیا جائے۔ اس لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہم بارگاہ رسالت کے اندر ادب اختیار کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیں تو درود شریف پڑھیں۔ نام مبارک آئے تو کہیں: ''صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ''۔ ایک تو رسمی درود ہے کہ ہم نے ایک طریقہ باندھ لیا کہ بیٹھ کر پڑھو، درود شریف۔ یہ تو ایک رواجی چیز ہے اور ایک یہ ہے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آئے تو درود پڑھے بغیر نہ رہے صلی اللہ علیہ وسلم ضرور کہے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اس سے زیادہ بخیل کوئی نہیں جس کے سامنے میرا نام لیا جائے اور وہ درود نہ پڑھے۔

اس لئے سب سے بڑی چیز ادب ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں درود شریف ادب کا مظہر ہے۔ اور اس سے بڑھ کر چیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واتباع ہے۔ اطاعت نام کو نہ کرے اور ادب کا مدعی بنے تو وہ ''عشق سعدی تا بزانو'' ہے عشق حقیقی نہیں۔ اس لئے کہ جب ادب اور عظمت ہوئی ہے تو اطاعت اس کے لئے لازم ہوتی ہے۔

بہر حال ان وسائل کا ادب اور تادّب لازمی ہے ورنہ اس کے بغیر عمل نہیں ہو سکے گا۔ یعنی راستہ پر آپ نہیں چل سکیں گے۔ یعنی راہ روکی جو قید تھی تو اس کے لئے یہ تین چیزیں ہیں کہ روشنی راہ، راہ اور ساتھ میں راہنما۔ تو راہ رو بھی ہونا چاہئے۔ تو اس میں شرط یہ ہے کہ متادب بن کر چلے اللہ کے راستہ میں سینہ ابھار کر نہ چلے۔ گردن جھکا کر چلے گا تو سر بلند کیا جائے گا اور سینہ ابھار کر چلے گا تو پٹخ دیا جائے گا: ''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ'' جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرے گا۔ اللہ اسے سر بلند رکھیں گے۔

عبادت کا مفہوم...... اور اگر اکڑ کر چلے گا تو اس کے لئے دوسری چیز فرمائی گئی ہے: ''اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ وَالْعَظَمَةُ إِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ فِيْهِمَا قَصَمْتُهُ'' ① کبریائی اور تکبر میری چادر ہے۔ عظمت اور بزرگی میری لنگی ہے۔ جو اس میں کھینچا تانی کرے گا، اس کی گردن توڑ دوں گا۔ میں اس کو نیچا دکھا دوں گا۔ تواضع کرے گا تو اونچا ہوگا۔ اینٹھے گا تو نیچا ہوگا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں ۔۔۔ پستی سے سر بلند ہو اور سرکشی سے پست

ابھر کے چلتا ہے تو گرا دیتے ہیں۔ گر کر چلتا ہے تو اٹھا دیتے ہیں تو اس راہ کے اندر گردن جھکا کر چلنا پڑتا ہے۔ وہ اور راہ ہوگی جس میں آپ اکڑ کر چلیں۔ ہاں اگر وہ خود ہی ہمیں کہیں کہ اکڑ کر چلو پھر ہم سو دفعہ اکڑ کر چلیں گے۔ انہوں نے حکم دیا: ﴿لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ ② خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چلو۔ اور فرماتے ہیں: ﴿اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا﴾ ③ اے اکڑ کر چلنے والے! تو جو اینٹھ

① سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر: ۴/۵۹، رقم: ۴۰۹۰۔

② پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۳۷. ③ پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۳۸.

اینٹھ کر چل رہا ہے تو جو سینہ ابھار کر گردن اکڑا اکڑ کر چل رہا ہے تو تو زمین کو پھاڑ نہیں ڈالے گا۔ آسمان کو نہیں پہنچ سکے گا۔ اتنی ہی جگہ میں رہے گا جتنی میں ہے پھر کیوں اس مصیبت میں مبتلا ہے۔ اکڑ کر کہیں اوپر پہنچ جاتا تو ٹھیک تھا۔ اکبر (لسان العصر) نے خوب کہا ہے۔

تعجب نخوتِ اہلِ زمیں پر مجھ کو آتا ہے ۔۔۔ یہ کیوں اس پر اکڑتے ہیں کہ جس میں مر کر گڑنا ہے

جس چیز کے پیٹ میں سرنگوں ہو کر اور سر کے بل جانا ہے اس پر سر کو ابھارنا دانائی اور دانشمندی کے خلاف ہے اس لئے حکم دیا کہ اکڑ کر نہ چلو۔ لیکن اگر ہمیں حکم دیں کے اکڑ کر چلو جیسا کہ جس طواف کے بعد سعی ہوتی ہے تو اس کے ابتدائی تین پھیروں میں حکم ہوتا ہے کہ اکڑ کر چلو، ہم سو دفعہ اکڑ کر چلیں گے۔

گر طمع خواہد زمن سلطان دین ۔۔۔ خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

اگر بادشاہ یوں کہے کہ لالچی بنو تو ہم لالچی بن کر دکھائیں گے پھر ہمیں قناعت کی ضرورت نہیں اگر اللہ میاں یوں کہیں کہ تم لالچی بنو تو سو دفعہ لالچی بنیں گے پھر قناعت کے سر پر خاک ڈالیں گے۔ ﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ ①

جنت کے بارے میں حریص بننا چاہئے کہ ایک دوسرے پر حریص بن کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ خوب لالچ کا مظاہرہ کریں۔ قناعت اگر کرنی ہے تو دنیا کے مال میں کرو۔ ہوسنا کی چھوڑ دو، لیکن آخرت کی نعمتوں کے بارے میں ہوسناک بنو۔ کسی حد پر نہ ٹھہرو۔

جنت کی نعمتوں میں علم اور معرفت بھی ہے اس لئے فرمایا کہ: مَنْهُوْمَانِ لَايَشْبَعَانِ: طَالِبُ الْعِلْمِ وَطَالِبُ الدُّنْيَا ② ''دو بھوکوں کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ طالب علم اور طالب دنیا کا''۔ ''اَمَّا طَالِبُ الْعِلْمِ فَيَزْدَادُ رِضَى الرَّحْمٰنِ وَاَمَّا طَالِبُ الدُّنْيَا فَيَتَمَادٰى فِي الطُّغْيَانِ'' ''طالب علم جتنا پڑھے گا رضاء خداوندی بڑھتی رہے گی اور دنیا کی طلب میں جتنا بڑھے گا۔ سرکشی اور تمرّد بڑھتا رہے گا تو جہاں قناعت کرنی ہے وہاں قناعت کرے۔ جہاں لالچی بننا ہے وہاں لالچی بنے۔ اور دونوں حکم خداوندی کے تابع ہیں''۔

حاصل یہ نکلا کہ بندہ وہ ہے جو فرمان خداوندی کے تابع ہو۔ بندگی اور عبدیت کے یہی معنی ہیں کہ جس وقت جو حکم دیں اسے انجام دے۔ اگر وہ یوں حکم دیں کہ نماز پڑھو تو نماز پڑھنا عبادت بن جائے گا اور اگر یوں کہیں کہ ہرگز مت پڑھو۔ تو نماز کا چھوڑ دینا عبادت بن جائے گا پانچوں وقتوں میں حکم دیا کہ نماز پڑھو۔ تو نماز پڑھنا عبادت

① پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۲۶.

② سنن الدارمی، باب فی فضل العلم والعالم: ۱/۱۰۸ رقم ۳۳۲. علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کا پہلا حصہ سنداً ضعیف ہے۔ البتہ دوسرا حصہ ''اما طالب العلم'' امام بیہقیؒ نے ''المدخل'' میں حضرت ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت کیا ہے دیکھئے: الدررۃ المنتشرۃ فی الاحادیث المشتھرہ، حرف الواؤ، ج۱۰ ص: ۲۰ کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۸۸.

اور تین وقتوں میں حکم دیا کہ ہرگز مت پڑھو۔طلوع ،غروب، اوراستواء آفتاب کے وقت۔اس وقت نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا۔کوئی ثواب نہیں ملے گا۔اس سے معلوم ہوا کہ نہ نماز پڑھنا عبادت ہے نہ نماز چھوڑنا عبادت ہے۔کہنا ماننا عبادت ہے جو کہہ دیں وہ کرو۔

حکم دیا کہ روزے رکھو۔بہت اچھا۔بس یہ عبادت ہے۔عید کے دن حکم دیا کہ خبردار اگر روزہ رکھا تو گناہ گار ہوگا۔افطار واجب ہے اس سے معلوم ہوا کہ نہ روزہ رکھنا عبادت نہ اس کا چھوڑنا عبادت، کہنے کا ماننا عبادت ہے۔

خودکشی حرام کردی۔خون مت بہاؤ اسی طرح دوسرے کا بھی خون نہ بہاؤ۔فرمایا:﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ﴾ ① ”جس نے مسلمان کو عمداً قتل کیا۔اس کی جزاء جہنم ہے“۔

گویا قتل کرنا عظیم الشان معصیت ہے اور جہاں وہ فرمائیں کہ خوب قتل کرو۔وہاں وہ عبادت ہے۔چناں چہ جہاد میں جائے تو سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ آدمی خون بہادے تو معلوم ہوا کہ نہ خون کا بہانا معصیت نہ چھوڑنا معصیت کہنا نہ ماننا معصیت ہے اور ماننا اطاعت ہے۔ہر چیز میں یہی اصول کارفرما ہے۔

فطرت اور شریعت......اسلام معتدل مذہب ہے جسے اسپرنگ پالیسی کہتے ہیں وہ ہے اسلام میں، کہ دونوں پہلوؤں کی رعایت ہے کہیں ادھر کا حکم دیتے کہیں ادھر کا حکم دیتے ہیں۔علی الاطلاق کسی چیز کو معصیت نہیں قرار دیا۔ایسے ہی ”جھوٹ بولنا“ بلاشبہ معصیت ہے۔گناہ کبیرہ ہے بلا توبہ کے معاف نہیں ہوتا لیکن انسان میں مبالغہ آمیزی کا ایک طبعی جذبہ ہے کہ جھوٹ بات بھی کہہ جاتا ہے۔زور کلام میں بعض دفعہ غلط چیزیں بھی کہہ جاتا ہے۔اس جذبے کو بھی شریعت نے پامال نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ محفوظ رکھو اگر کہیں نوبت آئے اور ہم اجازت دیں تو ضرور جھوٹ بول لینا۔

چناں چہ فرمایا ② اگر دو بھائیوں میں لڑائی ہو رہی ہو۔تلواریں کھنچ چکی ہوں۔ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو۔تم جھوٹ بول کر صلح کرا سکتے ہو تو کرادو۔تمہیں جھوٹ بولنے میں وہ اجر ملے گا جو نماز پڑھنے میں ملتا ہے۔آپ نے ایک بھائی سے جا کر یہ کہا۔”کہ بھائی تم کس سے لڑ رہے ہو وہ تو رات تمہاری بڑی تعریفیں کر رہے تھے اور رو رہے تھے کہ میرا بھائی مجھ سے جدا ہو گیا“۔

اس نے نے کہا اچھا! میرے بھائی کے دل میں اتنی گنجائش ہے میں تو سمجھ رہا تھا کہ بڑا دشمن ہے۔کہا آپ نے بالکل غلط سمجھا۔دوسرے سے بھی جا کر یہ کہہ دیا کہ تم کس سے دشمنی کر رہے ہو وہ تو رات بھر تمہارا ذکر کرتے رہے اور جدائی کا افسوس کرتے رہے۔

اس کی دشمنی بھی ڈھیلی ہوگئی۔اس کی بھی ہوگئی دونوں نے صبح مصافحہ کیا۔حالانکہ آپ نے جھوٹ بولا تھا۔اس جھوٹ پر آپ کو وہ اجر ملے گا جو آپ کو اطاعت وعبادت پر ملتا۔اگر سچ بول دیں اور اس سے فتنہ پھیلے تو وہ سچ

① پارہ:۵،سورۃ النساء،الآیۃ:۹۳. ② مسند احمد،حدیث ام کلثوم بنت عقبۃ ج:٦ ص:۴۰۳،رقم:۲۳۱۳.

حرام ہے۔اسی لئے غیبت حرام ہے۔غیبت سچ بولنے ہی کو کہتے ہیں۔اس لئے کہ غیبت کی تعریف یہی ہے کہ کسی کی واقعی برائی کو اس کی پشت پیچھے بیان کرے۔اگر جھوٹی بات کہی تو وہ افتراء ہے تو یہ سچ بولنا حرام ہے۔کیوں کہ فتنے کا ذریعہ ہے اور وہ جھوٹ بولنا ضروری ہو جاتا ہے اس لئے کہ رفع فتنہ کا ذریعہ ہے۔اسی طرح دھوکہ دینا، مکرو فریب بہت بڑی چیز ہے۔''لَیْسَ مِنَّامَنْ غَشَّنَا''① ''وہ ہم میں سے ہے ہی نہیں جو دھوکہ بازی کرے''۔

لیکن فرماتے ہیں:''اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ''② ''جہاد میں دھوکہ دینا بھی جائز ہے''۔وہاں جا کے یہ عبادت بن گئی تو دھوکہ دہی کے جذبے کو شریعت نے پامال نہیں کیا۔مگر اپنے کنٹرول میں رکھا ہے۔جہاں ہم کہیں استعمال کرو۔جہاں روکیں رک جاؤ۔اس لئے کہ تم ہمارے بندے ہو۔اپنے نفس کے بندے نہیں ہو کہ جو تمہارا نفس چاہے وہ کرو۔نہیں جو ہم چاہیں وہ کرو نفس کو پیچھے پھینکو۔

تو جھوٹ مکر و فریب یہ یقیناً معصیت ہیں اور انسان کے ضمیر کے اندر یہ معصیتیں رکھی گئی ہیں۔جھوٹ بولنے کا انسان کے قلب میں ایک کونہ ہے اور مکر و فریب کا بھی ایک کونہ ہے۔غیض و غضب اور حسد کا بھی ایک کونہ انسان کے دل میں ہے تو شریعت اس لئے نہیں آئی کہ پیدائشی مادوں کو زائل کردے یا ختم کردے بلکہ اس لئے آئی ہے کہ مصرف بتادے اور ٹھکانے لگادے۔

غصہ کا جذبہ ہے۔اس کو شریعت نے پامال نہیں کیا اگر غصہ نہ ہو تو آپ جہاد کیسے کریں گے؟ اگر جوش اور جذبہ نہ ہو تو باطل کے مقابلہ میں آپ کیسے آئیں گے؟ اگر سارے ہی ٹھنڈے ہو جائیں تو ملک کی حفاظت کون کرے گا۔فوجی طاقت بھی تو ہونی چاہئے اور کبھی کبھی اس کا مظاہرہ بھی تو چاہئے تا کہ فتنوں کا استیصال ہو۔اس لئے غصہ بھی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے۔اس کو پامال نہیں کیا۔یہ کہا کہ جہاں ہم کہیں وہاں استعمال کرو۔جہاں ہم نہ کہیں وہاں ٹھنڈے بن جاؤ۔جہاں بے مصرف استعمال کرو گے۔گناہ گار بنو گے۔جہاں مصرف صحیح میں استعمال کرو گے، نیکو کار بن جاؤ گے۔غرض کوئی جذبہ جسے ہم برے سے برا سمجھیں اسے شریعت نے ختم نہیں کیا۔ہاں ٹھکانے لگایا ہے۔یہی معنی ہیں دینِ فطرت کے کہ کسی قوت کو زائل نہیں کیا بلکہ ہر قوت کے مصارف بتلا دیئے۔تو اپنی قوت کا استعمال کرنا یہ فطرت ہے، مصارف کا بیان کرنا شریعت کا کام ہے۔اس لئے فطرت کو پامال نہیں کیا۔

دینِ فطرت کی عجیب تعبیر......اگر انسان ان قوتوں کو کھودے تو انسان ہی باقی نہیں رہے گا۔پھر شریعت پر عمل کون کرے گا۔ان چیزوں کے مجموعے ہی کا نام انسان ہے۔ہاتھ اور پیر کے مجموعے کا نام انسان ہے۔اگر ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دیں تو شرعی اعمال کون انجام دے گا؟ اگر پیر کو کاٹ کر پھینک دیں تو بیت اللہ اور مسجد میں کون جائے گا۔ان اعضاء کو صحیح رکھ کر ہی دین پر صحیح عمل ہو سکتا ہے۔

---

① الصحیح لمسلم ، کتاب الایمان،باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم،من غشنا فلیس منا، ج ۱ ص: ۹۹، رقم: ۱۰۱. ② الصحیح للبخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب الحرب خدعة، ج: ۱۰ ص: ۲۲۹.

بعض مذاہب میں یہ ہے کہ قوتوں اوراعضاء کو زائل کر دو یہ دین ہے کسی جوگی نے ہاتھ اٹھایا اور برس دن اٹھائے رکھا۔حتیٰ کہ وہ خشک ہوگیا۔تو اس قوت کو زائل کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دین دار بن گئے۔تو تعذیب جسمانی کا نام دین نہیں ہے۔تہذیب روحانی کا نام دین ہے یہ جب ہوگی جب جسم کو استعمال میں لگاؤ۔عمل کرو۔تو ہاتھ کاٹ دینا یا مٹا دینا یہ دین نہیں ہے۔ہاتھ کو شریعت کے مطابق صحیح مصرف میں استعمال کرنا یہ دین ہے۔فرمایا گیا: "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ" ① "مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں"۔

تو یہ دین ہے کہ ہاتھ کو مار پٹائی کے لئے استعمال کرو۔مگر مومن کے مقابلہ میں استعمال نہ کرو۔سچے کے مقابلہ میں استعمال نہ کرو۔جھوٹے کے مقابلے میں مجرم کے مقابلے میں استعمال کرو۔تو اگر ہاتھ کی قوت زائل کردی تو مجرم کے اوپر ہاتھ اٹھانے والا کون ہوگا؟ دین دار بن کر سارے لُنجے بن جائیں گے۔غرض شریعت اسلام دین فطرت ہے اور دین فطرت کے معنی یہ ہیں کہ کسی بھی قوت کو پامال نہ کیا جائے۔ہر قوت کا صحیح مصرف بتلایا جائے۔تو غصہ، جھوٹ، دھوکہ اور جذبہ اطاعت اور تواضع کا بھی مصرف بتلایا۔سب چیزوں کے مصارف کو متعین کرنا یہ شریعت کا کام ہے اور ان ساری قوتوں کے حقوق ادا کرنے کا نام اسلام ہے کسی ایک قوت کو آپ کھودیں اس کا حق ادا نہ کریں۔اسی حد تک آپ کا اسلام ناقص ہوگیا۔دین ناقص ہوگیا۔

ان ساری چیزوں کے مجموعے کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً کر کے دکھلا دیا۔ہاتھ یوں اٹھاتے ہیں، چلتے یوں ہیں۔غصہ یوں کرتے ہیں۔مہربانی یوں کرتے ہیں۔محبت کا یہ طریقہ، عداوت کا یہ طریقہ ہے۔ان ساری سنتوں کو راہنما بنا کے اپنی اندرونی قوتوں کو استعمال کیجئے۔نمونہ نبی کا سامنے ہو۔جذبہ آپ کے اندر ہو تو آپ کا دین کامل ومکمل ہو جائے گا بہرحال راہ رو کے اندر رہروی کی طاقت ہونی چاہئے۔اگر اس میں طاقت موجود ہے تو راستہ بھی موجود ہے۔راستے کی علامتیں بھی موجود ہیں۔روشنی بھی موجود ہے۔راہنما بھی موجود ہے۔فرق اتنا ہے کہ خلل جتنا ہے وہ راہ رو کے اندر ہے۔

راہ دکھلائیں کسے راہ رومنزل ہی نہیں

جود وعطا......حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: روزانہ آسمان دنیا پر حق تعالیٰ کی تجلیات اترتی ہیں، اور ہاتھ پھیلاتے ہیں۔جیسا ہاتھ ان کی شان کے مناسب ہے۔اور فرماتے ہیں کہ:

اَنَا الْمَلِكُ مَنْ ذَاالَّذِیْ يَدْعُوْنِیْ　　اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَاالَّذِیْ يَسْتَغْفِرُنِیْ

اَنَا الرَّازِقُ مَنْ ذَاالَّذِیْ يَسْتَرْزِقُنِیْ

میں بادشاہ ہوں کوئی ہے مانگنے والا؟ میں مغفرت کرنے والا ہوں کوئی ہے بخشش طلب کرنے والا؟ میں

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده: ۱/۱۳ رقم: ۱۰.

رزق دینے والا ہوں کوئی ہے رزق طلب کرنے والا؟ ①

یعنی بندے کو تکلیف نہیں دی کہ تو اُڑ کر آسمان پر آ۔ اپنی تجلیات سے عرش سے آسمان دنیا پر نزول فرمایا۔ جو آپ کا آسمان ہے تو بجائے آپ کو تکلیف دیتے کہ اوپر چڑھو۔ خود بادشاہوں کا بادشاہ نیچے آتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے۔

اور ہاتھ پھیلانا سائل کا کام ہے۔ مگر یہاں دینے والا ہاتھ پھیلا رہا ہے کہ مانگو کون مانگتا ہے، صبح صادق تک یوں ہی آوازیں لگتی رہتی ہیں جن کو اللہ نے توفیق دی ہے اٹھتے ہیں تہجد پڑھتے ہیں گڑگڑاتے ہیں۔ مانگتے ہیں۔ ان کو منہ مانگی مرادیں ملتی ہیں جو محروم القسمت ہیں وہ پڑے رہتے ہیں۔

رعایت و سہولت...... پھر آسانی کتنی کردی۔ تہجد کو ہی دیکھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بارہ رکعات بھی ثابت ہیں آٹھ بھی اور چار رکعات بھی ثابت ہیں حتیٰ کہ دو بھی ثابت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو بھی پڑھ لیں تو بھی آپ تہجد گزار ہیں، بلکہ ایک حدیث میں تو یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر اخیر شب میں اٹھنا ذرا بھاری ہو تو عشاء کی سنتوں کے وتروں سے پہلے دو یا چار رکعات تہجد کی نیت سے پڑھ لیں وہ بھی تہجد ہی شمار ہوگا۔ یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اخیر شب میں تہجد پڑھی۔ بلکہ حدیث میں تو یہ بھی فرمایا گیا کہ قیامت کے دن ایک شخص حاضر ہوگا۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ اس کے نامہ اعمال میں لکھ دو کہ عمر بھر تہجد پڑھا۔ ملائکہ عرض کریں گے۔ یا اللہ اس نے تو ایک دن بھی نہیں پڑھا۔ کیسے لکھ دیں؟

حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب یہ سونے کے لئے لیٹتا تھا تو نیت کرتا تھا کہ آج ضرور اٹھوں گا۔ مگر آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ تو آنکھ نہ کھلنا یہ اس کے قبضے کی چیز نہیں تھی۔ وہ ہماری طرف سے تھا یہ تو نیت کر لیتا تھا اور "نِيَّةُ الْمَرْءِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهٖ" آدمی کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے، جب عمر بھر روزانہ نیت کرتا تھا تو لکھ دو کہ روزانہ تہجد پڑھتا تھا۔ پوری عمر کا اجر و ثواب (باوجود سوئے رہنے کے اس کو) مل جائے گا۔ تو میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی نہ پڑھے تو کم از کم سوتے ہوئے نیت ہی کر لیا کرے کہ اللہ میاں آج ضرور اٹھوں گا۔ یہ دوسری چیز ہے کہ اگر آنکھ کھل جائے تو تہجد پڑھ لو۔ اگر آنکھ نہ کھلے گی تو نیت کے لحاظ سے تہجد گزار بن جاؤ گے، تو اس سے زیادہ آسانی اور کیا چاہتے ہو۔ نیت کرنے میں ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ نہ پیسہ نہ دھیلہ مفت کا ایک ثواب۔ اتنی بھی کوئی کوشش نہ کرے۔ تو اس محروم القسمتی کا کسی کے پاس کیا علاج ہے۔ بلکہ آدمی ہر خیر کی نیت کرے۔

انوار السنن...... اچھا خیر کی نیت بھی نہ کرو یہ جو روزانہ فرائض کے علاوہ اعمال انجام دیتے ہو۔ مثلاً بازار جا رہے ہو۔ سودا خرید رہو۔ کپڑا لا رہے ہو۔ دنیا بھر کے کام کرتے ہو اگر ان کاموں میں یہ نیت کرلو کہ حق تعالیٰ کے انعامات ہیں اور ہمیں حکم ہے کہ انعام کا استعمال کرو تو میں تعمیل حکم الٰہی کے واسطہ یہ چیزیں خرید رہا ہوں۔ تو وہی اجر ملنا شروع ہو جائے گا جو عبادت کے اوپر ملتا تو ذرا سی نیت کے پھیر سے آدمی چاہے تو عادت کو عبادت بنا لے اور ذرا

① مسند احمد، حدیث ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ، ج: ۲، ص: ۲۵۸، رقم: ۷۵۰۰۔

سی غفلت اور بےفکری سے عبادت کو چاہے تو عادت بنالے کہ بے اجر ہو کر رہ جائے۔

تو جب اللہ نے عادتوں پر بھی اجر رکھا ہے اور اس میں نیت کافی ہو جاتی ہے تو وہ آدمی بڑا محروم ہے کہ نیت ہی نہ کر پائے۔ جس پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ کوئی محنت نہیں بس ذرا سی فکر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب آدمی ایسا بھی کیا ہو کہ شتر بے مہار بن جائے کہ اسے نیت کرتے بھی تعجب ہو کہ میں خود بھی آزاد اور میری فکر بھی آزاد۔ تو پھر آزادی کے ساتھ جنگل میں چلے جانا چاہئے۔ شہر میں کیوں رہے۔ کسی بھی چیز کا پابند کیوں رہے؟

تو سنن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اتنی آسان ہیں کہ ان میں اگر آدمی ذرا فکر کرے تو محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ اور اجر و ثواب کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ لیکن ۔

اگر تو ہی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

خود اگر ارادہ نہ کرو تو اس کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔ لقمان حکیم کے پاس بھی اس کی دوا نہیں یہ ایسا لاعلاج مرض ہے۔ تو میرے بزرگو!

سب سے پہلے ادب اور عظمت پیدا کرو۔ دین کی اہل دین کی اور وسائل دین کی۔ اس کے بعد اپنی نیت صحیح کرو۔ نیت کی صحت کے ساتھ جذبہ رکھو کہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا اتباع کریں گے جو نور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں ہے وہ نور اور برکت تمہارے بنائے ہوئے نمونوں میں نہیں ہوسکتا۔ ہاں میں کہتا ہوں کہ مشائخ طریقت ہی بنائیں وہ ان کے حال کی بات ہوگی۔ لیکن نقالی جب کریں تو رسم پیغمبر کی کریں گے۔ اس لئے کہ رسم پیغمبر سے بہتر کوئی رسم نہیں ہوسکتی۔ جو طرز کلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اس میں جو نور ہے وہ کسی کے طرز کلام میں نہیں ہوسکتا۔ تو انوار و برکات اہل اللہ کے کلام میں بھی ہوتے ہیں۔ ان کے عمل میں بھی لیکن ع

از تو دہ کلاں بردار

جب اٹھانا ہی ہے تو بڑے ڈھیر میں سے اٹھاؤ۔ جس سے اونچے پہنچو تو اصل چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع ہے۔

آثارِ محبت...... تو محبت کا جذبہ رکھو اور محبت کے ساتھ اطاعت کا جذبہ رکھو۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''مَنْ أَحْياسنتي فَقَدْاحبني وَمَنْ احبني كَانَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ'' (1) ''جس نے میرے ساتھ محبت کی وہ میری اطاعت ضرور کرے گا اور جو میری اطاعت کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا''۔

معلوم ہوا کہ محبت کا ثمرہ لازمی اطاعت ہے اگر اطاعت اور اتباع سنت نہیں ہے تو دعویٰ محبت باطل ہے نیز عاشق دعویٰ نہیں کیا کرتا۔ عاشق تو عمل کرتا ہے جو کہتا پھرے کہ میں فلاں کا عاشق ہوں لوگ کہیں گے جھوٹا ہے مکار ہے عاشق کہیں دعویٰ کرتے پھرتے ہیں۔ عشق کی اولین منزل ترک دعویٰ ہے کہ دعویٰ نہ رہے فنائیت محضہ ہو جائے

(1) سنن الترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع ج: ۵ ص: ۴۶، رقم: ۲۶۷۸.

اور جو مدعی بنا ہوا ہے تو مدعی اپنی بقا کا قائل ہے اس میں فنائیت کہاں؟

غرض عاشق کے لئے دعوی کہاں؟ سب سے پہلی چیز عاشق کے لئے ترک دعوی ہے، اس لئے اگر کوئی عاشق رسول ہے تو اس کی علامت یہ ہے۔

کہ دعوی نہ ہو کہ میں عاشق رسول ہوں۔ بلکہ نادم ہو کہ جتنا عشق کرنا چاہئے تھا نہیں کرسکا۔ اور اس عشق کو اطاعت سے پہچانا جائے گا۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ: ''مَنْ اَحَبَّنِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ'' ''جو میرے ساتھ محبت کرے گا وہ میری اطاعت بھی کرے گا''۔

تو محبت کی علامت اور اس کے ظہور کا طریقہ یہ فی الحقیقت اطاعت ہے، جیسا کہ ایمان کی علامت عمل صالح ہے تو ایمان نام محبت ہی کا تو ہے۔

''لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ'' ① ''کوئی شخص تم میں سے اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کو میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی محبت نہ اپنے نفس سے ہو اپنے اہل وعیال اور ماں باپ سے ہو''۔

اور اس کا پتہ چلتا ہے جب مقابلہ پڑتا ہے کہ ایک طرف اللہ ہے اور ایک طرف اولاد ہے کس کو اختیار کروں؟ جو محبّ اور مومن ہوگا وہ یقیناً اللہ کو ترجیح دے گا۔ اولاد کو ترک کردے گا۔

حدیث میں واقعہ آتا ہے کہ جب غزوۂ بدر ہوا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ایک صاحبزادے ایمان نہیں لائے تھے وہ کفار کی صف میں تھے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ادھر تھے۔ جب غزوہ بدر ختم ہوگیا اور وہ صاحبزادے ایمان لے آئے تو ایک دن انہوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ اے باپ! اس جنگ (بدر) میں کئی مرتبہ اس کی نوبت آئی کہ آپ ٹھیک میری زد کے اوپر آگئے اور میں چاہتا تیر پھینکتا یا تلوار لگاتا تو یقیناً آپ کو ختم کردیتا۔ مگر دل میں خیال آیا کہ میرا باپ ہے میں بیٹا ہو کر باپ پر حملہ کروں۔؟ یہ اس نے کہا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس غزوہ میں تو میری زد میں نہیں آیا۔ اگر آجاتا تو خدا کی قسم سب سے پہلے تیرے گلے پر تلوار چلاتا۔ اس لئے کہ تو میرا بیٹا نہیں تھا۔ جب تو دشمن رسول اللہ بن گیا تو میں دشمنان رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ کررہا تھا۔ آل اور اولاد کا وہاں کیا کام؟

تو محبت خداوندی کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ دوسری چیزوں سے پڑ جائے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایمان اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بیٹے کو ختم کردینا چاہتے تھے تو محبت دو باتوں سے پہچانی جاتی ہے ایک یہ کہ دعوی ترک کردے۔ دوسرے محبوب کا اتباع کرے۔ اتباع بھی نہ ہو اور مدعی بھی ہو۔ وہ جھوٹا دعوی ہے۔ حقیقی دعوی نہیں ہے۔ اس لئے دعوی بھی ترک کیجئے نیت بھی اپنی صحیح کیجئے۔

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبة رسول الله ﷺ اکثر من الاهل، ج: ۱، ص: ۶۳.

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کیجئے۔

اسوۂ حسنہ...... اگر جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور نمونہ جامع ہے جیسا کہ آپ خود دعوی کرتے ہیں کہ اللہ نے جامع رسول ہمارے پاس بھیجا۔ زندگی کا کوئی گوشہ خالی نہیں جس کا نمونہ عمل نہ دکھلایا ہو تو آپ کو ہر گوشہ زندگی میں دیکھنا چاہئے کہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فعل کس طرح انجام دیا۔ اگر غمی ہو جائے تو آپ دیکھیں کہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ غمی کس طرح انجام دی۔ آج تیجے دسویں اور چالیسیوں کیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر شادی ہو تو میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح شادی کی۔ آیا اسی طرح سے برداریوں کے اندر نوید پھیری تھی۔ اسی طرح بڑھ چڑھ کر مفاخرت کی دعوتیں کی گئیں تھیں تو خوشی ہو یا غمی ہر چیز کے اندر مومن اور مسلم کی پہلی نگاہ اس پر جانی چاہئے کہ میرے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح کر کے دکھلایا تو کوئی وجہ نہیں کہ نماز میں تو آپ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں اور شادی بیاہ میں نہ کریں۔ موت اور غمی میں نہ کریں۔ یہ چیزیں آپ کے اختیار میں تھوڑا ہی دی گئیں۔ یہ چیزیں تو اہم چیزیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ معمولی معمولی چیزیں بھی آپ کے اختیار میں نہیں دی گئیں۔ لباس پہننا بھی آپ کے اختیار میں نہیں دیا گیا۔ آپ پابند ہیں کہ اسی نمونے کے مطابق پہنیں جو اللہ کے رسول کا نمونہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ کرتہ پہنو تو دایاں ہاتھ پہلے دائیں آستین میں ڈالو بایاں ہاتھ بعد میں ڈالو۔ تو سنت طریقہ یہ تھا کہ دایاں ہاتھ پہلے ڈالو اور بایاں بعد میں ڈالو۔ آج موجودہ تہذیب کے مطابق بایاں پہلے ڈالتے ہیں اور محب رسول اور عاشق رسول ہیں، عاشق تو وہ ہوتا ہے جو لباس پہنے تو دیکھے کہ میں سنت کی مطابقت کر رہا ہوں۔ یا سنت کے خلاف کر رہا ہوں۔ محبوب کے طرز عمل پر چل رہا ہوں۔ یا اپنے نفس کو محبوب بنا رکھا ہے اس کے نمونے پر چل رہا ہوں۔ تو لباس میں بھی آپ آزاد نہیں ہیں۔ فرمایا گیا جب رات کو سوتے وقت لباس اتارو تو اسے زمین پر یا فرش پر ویسے نہ ڈالو دو تین تہہ کر کے رکھو یا اوپر ٹانگو۔ فرماتے ہیں: "اِطْوُوْا ثِيَابَكُمْ تَرِدْ اِلَيْهَا اَرْوَاحُهَا" (1)

"کپڑوں کو لپیٹ کر رکھو۔ کپڑوں میں ارواح ہوتی ہیں"۔ کپڑے کی ایک روح ہے۔ اگر وہ نکل گئی تو کپڑے کی برکت جاتی رہے گی۔ پہننے کا حظ اور لذت ختم ہو جائے گی تو معلوم ہوا کہ لباس اتار کر رکھنے میں بھی آزاد نہیں۔ ایک طریقہ ہمیں بتلا دیا گیا ہے۔

نیند کا مسنون طریقہ...... اسی طرح ہم سونے میں بھی آزاد نہیں، سونے کے چار ہی طریقے ہیں یا آدمی الٹا لیٹ کر سوئے، یا چت لیٹ کر سوئے، یا دائیں کروٹ پر یا بائیں سوئے۔ الٹا لٹک کر یا کھڑے کھڑے نہیں سو سکتا۔ اس لئے یہی چار طریقے متعین ہیں۔

---

(1) المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمہ: محمد ج: ۱۲ ص: ۴۴۱ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه الطبرانی فی الاوسط وفیہ عمر بن موسی بن وجیہ وھو وضاع دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۵ ص: ۱۳۵۔

تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اوندھا لیٹ کر سونا مکروہ ہے۔ شریعت نے اسے پسند نہیں کیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں الٹے لیٹے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر سے ٹھوکر ماردی اور فرمایا:

''يَاجُنْدُبُ! يَاجُنْدُبُ! اِنَّ هٰذِهٖ ضِجْعَةُ اَهْلِ النَّارِ'' ① ''یہ اوندھا لیٹنا جہنمیوں سے مشابہت ہے''۔

اہل جہنم اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈالے جائیں گے، مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ جہنمیوں سے مشابہت پیدا کرے۔ اس لئے اوندھا لیٹنا ناپسند کیا اور مکروہ قرار دیا۔

کوئی شخص چت لیٹے تو جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں۔ اس واسطے کہ ضعیفوں کی سی ہیئت ہے۔ بیمار آدمی ہو تو چت پڑا رہتا ہے۔ ایسے ہی جو بے قابو گرتا ہے تو چت گرتا ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ فلاں پہلوان نے پچھاڑ دیا اور وہ چاروں شانوں چت گرا یوں نہیں کہتے کہ چاروں شانوں پٹ گرا۔ تو چت گرنا بے قابو ہونے کی علامت ہے ضعیفوں کی سی ہیئت بنانے کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔ چناں چہ فرمایا گیا:

اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَيْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ ② ''قوی مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے بہادر مسلمان بزدل مسلمان سے بہتر ہے''۔

بزدلی اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوتی بہادری جمع ہوتی ہے تو ضعیفوں اور بے قابو لوگوں کی سی ہیئت بنانا پسندیدہ نہیں۔ اب رہا بائیں کروٹ پر لیٹنا یہ بھی جائز ہے مگر شریعت نے کچھ نامناسب سمجھا ہے اس واسطے کہ بائیں جانب قلب ہے، جب آپ بائیں رخ پر لیٹیں گے تو قلب کو سکون ملے گا اور جتنا زیادہ سکون ملے گا نیند گہری آئے گی اور جتنی گہری نیند آئے گی۔ آپ گھوڑے بیچ کر سوئیں گے۔ پھر نہ نماز کی فکر رہے گی، نہ تہجد کی۔ نہ قیام لیل کی تو اس سے عبادت کے نظام میں خلل پڑے گا۔ عبودیت کے اندر فرق پڑے گا تو نومِ غریق (گہری نیند) کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔ چوکنا سونا شریعت نے پسند کیا ہے۔ اس واسطے یہ بھی ناپسند ہے۔

اب ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے، یعنی دائیں کروٹ پر لیٹنا۔ یہی سنت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور دائیں کروٹ پر جب آدمی لیٹے گا تو قلب بائیں جانب ہے وہ معلق رہے گا۔ جب معلق رہے گا تو گہری نیند کبھی نہیں آئے گی۔ چوکنا نیند آئے گی۔ اس وقت ارادہ کر کے سوئے گا جبھی آنکھ کھلے گی تو میں کہتا ہوں کہ ہم سونے میں بھی آزاد نہیں آپ سمجھتے تھے کہ یہ ایک عادت کی چیز ہے۔ طبعی چیز ہے طبعیات پر بھی شریعت نے آداب عائد کر دیئے ہیں ہم تو سونے میں بھی پابند ہیں چہ جائیکہ شادی اور غمی میں آزاد ہو جائیں۔ چہ جائیکہ رسوم میں آزاد ہو جائیں تو لباس اور سونے کے اندر بھی قانون شریعت لاگو ہے۔

---

① سنن ابن ماجه، كتاب الادب، باب النهي عن الاضطجاع على الوجه: ۲/ ۱۲۲۷ رقم: ۳۷۲۴. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابن ماجة ج: ۸ ص: ۲۲۴، رقم ۳۷۲۴.

② الصحيح لمسلم، كتاب القدر، باب في الامر بالقوة وترك العجز... ج: ۱۳ ص: ۱۲۲.

رسوم وخیالات اور قانون شریعت...... حتیٰ کہ ہمارے خیالات کے اوپر بھی یہ قانون لاگو ہے کہ خیالات میں بد بھی دل کے اندر نہ لاؤ۔ فکر بھی صحیح ہو عقیدہ بھی صحیح ہو قلب پاک چیز ہے پاک ظرف ہے اس کے اندر پاک چیزیں بھرو، ناپاک چیزیں مت بھرو، تو ہمارے قلب پر بھی قانون شریعت عائد ہے۔

سلاطین دنیا کا قانون بدنوں پر عائد ہوتا ہے اس لئے کہ بدن تک ہی ان کی رسائی ہے ہمارے قلب اور قلبی خیالات کو وہ نہیں جان سکتے لیکن جو ﴿عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ہو دلوں کی کھٹک سے واقف ہو اس کا قانون تو دل پر بھی عائد ہوگا۔ وہ دل کی حرکت کو بھی دیکھ رہا ہے تو دیا تنا ہم پر ضروری ہوا کہ تنہائی میں بیٹھ کر بدفکری بھی نہ کریں۔ خیالات فاسدہ بھی نہ لائیں۔ وساوس بھی سوچ سوچ کر نہ لائیں۔ غیر اختیاری طور سے آجائیں تو بلا سے آجائیں۔ تو جب قلوب کے خیالات، لباس، سونا اور جاگنا سب میں پابند ہیں۔ تو ہم دنیا اور معاشرہ کے اہم امور سے کیسے آزاد ہو جائیں گے۔ ان میں بھی ہم پابند رہیں گے۔ شادی ہوگی اس میں دیکھنا پڑے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شادیاں کس طرح سے ہوئیں۔ غمی ہوگی تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے غمی کے وقت میں کیا کیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ تم بیان کر کے روؤ۔ بلکہ فرمایا: ''اِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَآءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ''① ''تم بیان کر کر کے روتے ہو اس سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے''۔

اور وہ عذاب یہ نہیں ہوتا کہ جہنم میں ڈال دیا جائے۔ بیان کرتے ہوئے جب یوں کہاں جاتا ہے کہ ''وَاجَبَلَاه! وَاكَـذَاه'' ہائے تُو تو پہاڑ جیسا تھا۔ ہائے تو تو سونے جیسا تھا۔ تو ملائکہ چوکے لگاتے ہیں کہ کیا واقعی آپ پہاڑ ہی تھے۔ آپ واقعی ایسے عظیم تھے۔ یہ جو طعن کا طرز ہوتا ہے۔ یہ برچھے ہے، زیادہ آدمی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو یہاں ہم بیان کر کے مناقب بیان کرتے ہیں۔ وہاں عذاب دیا جا رہا ہے۔ شریعت کا منشاء یہ ہے کہ اگر بڑے سے بڑا غم پیش آجائے تو صبر کرو۔ تحمل سے کام لو۔ عمل کے نظام میں خلل نہ پڑے۔ رونا اور رونے کو لے کر بیٹھنا اور ماتم کرنا یہ بزدل عورتوں کا کام ہوتا ہے۔ مردوں کا کام نہیں ہے کہ رو رو کر گزاریں۔ بڑے سے بڑا صدمہ آئے تو مضبوط قلب ہو کر رہے۔ ماتم کے کیا معنی؟ تو رونے کا جب وقت آئے تو آپ اس وقت بھی شریعت کو دیکھیں گے کہ میرے نبی نے کیا کیا۔ آنکھوں سے رونا جائز ہے۔ بیان کر کر کے اور نوحہ کر کے رونا، یہ نا جائز ہے۔

ترکِ سنّت کا وبال...... غرض شادی ہو، غمی ہو، چلنا ہو پھرنا ہو، اٹھنا ہو بیٹھنا ہو، سونا ہو جاگنا ہو، راہنما اس میں سنّت بنے گی اگر سنّت کو ترک کر دیا جائے اور حدیث کو قطع کر دیا جائے تو زندگی بنتی نہیں۔ قرآن تو دستور اساسی ہے۔ دستور اساسی سے معاشرہ تھوڑا ہی بنا کرتا ہے جب تک اس کا بیان کر کے اس کی جزئیات سامنے نہ آئیں اور بیان شدہ چیزوں میں سے استنباط کر کے سارے پہلو نہ کھول دیئے جائیں۔ تو عمل کی ہیئت نہیں بن سکتی اصول اور کلیات سے عمل تھوڑا ہی ہو سکتا ہے۔ عمل جزئیات سے ہوتا ہے جزئیات جب نکلتی ہے جب کلیات میں سے نکالی

① الصحیح لمسلم، کتاب الجنائز، باب المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ ج:۴ ص:۵۰۰.

جائیں اور کلی کا بیان کیا جائے تو بیان رسول کو اگر قطع کر دیا۔ تو کلیات ہی کلیات رہ جائیں گی عمل ممکن نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فقط قرآن پر اکتفا کرنے والے فی الحقیقت کام چوروں کی جماعت ہے۔ اس لئے کہ نہ انہیں عمل مقصود اور نہ عمل کی محنت اٹھا سکتے ہیں۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمیں لوگ پکا مومن سمجھیں۔ تو انہوں نے کہا کہ حدیث کا رشتہ (قرآن حکیم سے) قطع کر دو۔ نہ ہوگا نہ عمل کی ضرورت پیش آئے گی۔ قرآن سے جتنا ہمارا جی چاہا کر لیا۔ جتنا جی نہ چاہا نہ کیا اس لئے میں نے عرض کیا کہ سنّت راہنما ہے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ایک روشن مینار ہے جس سے اللہ تک پہنچنے کا راستہ نظر آتا ہے، اور آپ کی سنتیں اس راستہ پر چلنے کی راہنمائی کرتی ہیں اور وہ راستہ کتاب اللہ ہے جو اللہ تک پہنچاتا ہے۔ اور چلنے والے آپ ہیں۔ اگر آپ میں طاقت ہے تو آپ چلیں گے اور طاقت نہیں ہے یا آپ پیدا بھی نہیں کرنا چاہتے تو چلنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اس کا الزام کتاب وسنت پر نہیں آئے گا۔ چلنے والوں کی کوتاہی پر آئے گا۔

نور اور کتاب ...... یہی چند چیزیں ہیں جن کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: ﴿قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ ○ يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ ① ”حق تعالیٰ نے بشارت سنائی کہ تمہارے پاس نور آ گیا۔ اللہ کی جانب سے آیا ہے۔ معاذ اللہ کوئی بنا ہوا نہیں کسی نے افترا کر کے کہہ دیا ہو کہ میں نور ہوں۔ بلکہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا نور تمہارے پاس پہنچ گیا۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ نور سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی ہے جو روشنی راہ ہے اور آگے فرماتے ہیں کہ فقط روشنی نہیں آئی کتاب مبین بھی آئی ہے جو سیدھا راستہ ہے“۔ ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ ② ”یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس پر چلو۔ یہ ایک ہی راستہ ہے۔ سبل متفرقہ پر مت چلو“۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مبتدع اور متبع سنت کی کچھ علامتیں ہیں، بدعت پسند کی علامت ہمیشہ مجادلہ اور بدکلامی ہے۔ اور متبع سنت کی علامت ہمیشہ سلامتی اور سادگی کے ساتھ مسئلہ بیان کرنا ہے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جس قوم میں بدعت کا نزغہ پیدا ہو گیا۔ جدال ومجادلہ بدگوئی وبدکلامی اور جھگڑا اس کے اندر ضرور آ جائے گا۔ اشتعال انگیزی اور فساد پھیلانا اس کا وطیرہ ہوگا اور جو سنت پر قائم ہوگا۔ وہ نبی کا طریقہ پیش کر دے گا۔ نہ اس میں جذبات کی ضرروت ہے نہ برا کہنے کی ضرورت ہے۔ بہر حال روشنی اور سیدھا راستہ نور اور کتاب مبین سے مراد ہیں۔ آگے فرماتے ہیں: ﴿يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ﴾ ”اللہ اسے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔ سلامتی کے راستے اس کے سامنے کھلتے ہیں۔ جو اس کی رضا کی پیروی کرے اور چاہتا ہو کہ اللہ راضی ہو جائے“۔

① پارہ:٦،سورة المائدة،الآية:١٥، ١٦. ② پارہ:٨،سورة:الانعام،الآية:١٥٣.

اسلام قانون نہیں، دین ہے...... ایک تو یہ ہے کہ محض رسمی طور پر اسلام کو ایک لاء اور قانون کی طرح سمجھ کر اس پر چلیں تو یاد رکھئے اسلام لاء اور قانون نہیں ہے۔ دین ہے قانون اور دین میں فرق یہ ہے قانون روکھی دفعات کا نام ہے اور دین وہ ہے جس میں محبت اور عشق بھی شامل ہو تو اسلام قانون نہیں ہے بلکہ دین ہے تو دین کے اندر طریق ثواب بھی ہوگا، طریقِ عشق بھی ہوگا محبت بھی ہوگی اور قلب کے جذبات بھی ہوں گے، اس لئے فرمایا کہ: جو رضا کا طالب ہو۔ قانون پر اس لئے بھی چلتے ہیں کہ نہیں چلیں گے تو پٹائی ہوگی نہیں چلیں گے تو جیل پہنچ جائیں گے۔ کچھ جان کا خوف اور کچھ اپنے منافع پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ لیکن دین پر محض اس لئے چلتا ہے کہ میرا اللہ راضی ہو۔ محبوب کی رضا کے لئے اطاعت اور پیروی کرتا ہے اور جو رضا نہیں چاہتے تو فرمائیں گے کہ ہم اس سے راضی ہونا نہیں چاہتے۔ ہم تو ''غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ'' ہیں محتاج تو تم ہو جب تم راضی نہیں ہونا چاہتے تو ہم کیوں راضی ہوں؟

نورِ علم و اخلاق...... مقصد اور نصب العین کیا ہے؟ ﴿یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ ''تا کہ اللہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر نور میں لے آئے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ نور سے مراد حسّی نور نہیں ہے۔ یہ تو پہلے سے بھی موجود تھا۔ سورج بھی روشن تھا۔ چاند بھی روشن تھا۔ اس میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ معنوی نور ہے اور معنوی ہی ظلمت مراد ہوگی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں۔ معنوی نور ہیں حسّی نور نہیں ہیں۔ اور معنوی نور جس سے اچھائی اور برائی میں تمیز ہو۔ وہ علم کامل اور عدل واخلاق ہیں جس سے آدمی کو سیاہ اور سفید میں تمیز ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس نور کا مجموعہ ہیں وہ نور علم اور نور اخلاق ہیں، جس پر نبوت کی بنیاد ہے۔

نبی علم وحی سے لے کر آتے ہیں اور اخلاق کا ملہ اپنی فطرت اور اللہ کے دین سے پیش کرتے ہیں تو اخلاق کا نور اور علم کا نور، یہ دونوں چیزیں پیش کرتے ہیں علم کے نور میں حدت اور شدت ہوتی ہے اور اخلاق کے نور میں رقت اور رافت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ علم اللہ کا ہے علم میں ترفع کا خاصہ ہے۔ عالم کبھی گردن جھکا کر نہیں رکھتے علم ہمیشہ اسے اونچا لے جائے گا۔ رفعت کی طرف لے جائے گا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ بعض دفعہ تکبر پیدا ہو جاتا ہے بعض دفعہ نخوت پیدا ہو جاتی ہے بعض دفعہ غرور اور گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے تو علم کے گھمنڈ کے لئے بدرقہ عبدیّت ہے اور عبدیّت نہیں آتی جب تک کسی شخصیت کے آگے آدمی پامال نہ ہو۔

پیش مرد کاملے پامال شو

تو علم رفعت دکھلاتا تھا اور شخصیتوں کے آگے جھکنا تواضع سکھلاتا تھا ان دونوں کو جب ملایا تو وقار بھی جمع ہو گیا۔ تواضع بھی پیدا ہو گئی علم سے وقار آتا ہے۔ اور شخصیتوں کے آگے جھکنے سے قلب میں تواضع پیدا ہوتی ہے اگر علم نہ ہو اور شخصیتوں کے آگے جھکے تو ذلت نفس پیدا ہوگی جس سے شرک کا دروازہ کھلتا ہے اور اگر محض علم ہو اور شخصیتیں سامنے نہ ہوں تو کبر اور نخوت کا دروازہ کھل جائے گا۔ اس لئے جو اہل علم شخصیتوں سے وابستہ نہیں وہ عموما

متکبر ہوتے ہیں اور جو علم سے وابستہ نہیں۔ مگر شخصیتوں سے وابستہ ہیں۔ ان میں ذلت نفس پیدا ہو گی۔

علم بلا شخصیت......اور دونوں کی مثالیں دو قوموں میں موجود ہیں یہود کی امت ایک علمی امت ہے تورات ان کو دی گئی۔ جس کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ① ''ہر چیز کی تفاصیل بیان کی گئیں''۔ لیکن اہل تورات نے شخصیتوں سے اجتناب کیا، انبیاء علیہم السلام سے وابستگی کو کم کیا۔ ان کی توہین کی۔ ان کو قتل کیا: ﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ ②

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بے حرمتی کی اور کہا کہ وہ بھی آدمی ہیں ہم بھی آدمی، کتاب اللہ (تورات) ہمارے لئے کافی ہے۔ جب تورات موجود ہے، ہم اس کو سمجھیں گے اور چلیں گے۔ نبی کی ضرورت کیا ہے۔ تو شخصیتوں کا دامن چھوڑ دیا تو محض کتاب کا علم ان کے لئے نخوت و ترفع اور استکبار کا ذریعہ بن گیا۔ یہ متکبر قوم ہے جو نخوت شعار ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ﴾ ③ ''ہم اپنی آیتیں پھیر دیں گے۔ اس قوم سے جو زمین کے اندر متکبر بنی ہوئی ہے۔ جس کا کام نخوت شعاری، کبر اور ترفع ہے کہ اس ترفع اور تکبر نے ان کے قلب کا ستیاناس کر دیا۔ قلب کے رخ کو غلط کر دیا ہے اور اس درجہ کجی اور زیغ پیدا کر دیا ہے کہ جب ہماری کوئی آیت سامنے آتی ہے تو ایمان نہیں لاتے جب سیدھی راہ سامنے آتی ہے تو کبھی اس راستہ پر نہیں چلتے اور جب کبھی کوئی غــی طغیانی یا کجی کا راستہ آتا ہے تو فوراً چل پڑتے ہیں سنت پیش کرو نہیں چلتے۔ بدعت پیش کرو فوراً چل پڑتے ہیں''۔ بہر حال یہود کو متکبر کہا گیا اس لئے کہ فقط کتاب کو اختیار کیا اور شخصیتوں کو ترک کر دیا۔

شخصیت بلا علم......نصاریٰ کی امت یہ عملی امت ہے اس کو علم زیادہ نہیں دیا گیا۔ انجیل میں احکام زیادہ نہیں ہیں۔ یہ فی الحقیقت تصوف کی کتاب ہے۔ اس میں تزکیۂ نفوس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے انہوں نے شخصیتوں کو اتنا پکڑا کہ کتاب کو چھوڑ کر شخصیتوں کو خدا کا قائم مقام بنا دیا۔

مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہا، بعضوں نے اللہ کہا: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ﴾ ④

انہوں نے اپنے علماء اور صوفیاء کو رب بنا دیا خدا بنا دیا تو اس درجہ شخصیتوں کا دامن پکڑا پھر جھکتے جھکتے ذلت نفس پیدا ہو گئی۔ اور شرک میں گرفتار ہو گئے تو ان سے علم چھوٹ گیا اور شرک آ گیا۔ یہود میں شرک نہیں تھا تو تکبر

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۵۔ ② پارہ: ۱ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۸۷۔

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۶۔ ④ پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۳۱۔

پیدا ہو گیا تو فقط کتاب ہوگی تو تکبر پیدا ہوگا۔ فقط شخصیت کی پیروی ہوگی تو ذلت نفس پیدا ہوگی اور کتاب و شخصیت کو ملا دو تو وقار کے ساتھ تواضع للہ پیدا ہو جائے گی نہ کبر رہے گا نہ ذلت نفس باقی رہے گی۔ تو امت مسلمہ نے یہ دونوں چیزیں سنبھال لیں ایک طرف اہل اللہ کا دامن پکڑتی ہے اور ایک طرف کتاب وسنت کا دامن پکڑتی ہے۔

دونوں چیزوں کو ملا کر چلتی ہے تو وقار بھی ہے خودداری بھی ہے اور تواضع للہ بھی ہے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ بَاعًا بِبَاعٍ ذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ دَخَلَ اَحَدًا" الخ ① "اے مسلمانو! تم لوگ پچھلی امتوں کی خوب پیروی کرو گے۔ بالشت بالشت بھر، ہاتھ ہاتھ بھر، دو دو ہاتھ بھر یعنی حقیر سے حقیر چیزوں میں اور بڑی سے بڑی چیزوں میں۔ حتی کہ اگر پچھلی امتوں میں سے کوئی گوہ کے سوارخ میں گھسا ہوگا جو فعل لغو اور عبث ہے تم میں بھی ایسے پیدا ہوں گے جو یہ فعل لغو اور عبث کریں گے"۔ عرض کیا یا رسول اللہ! وہ پچھلی امت کون سی ہے؟ فرمایا: وہی یہود و نصاریٰ۔

غرض فرمایا گیا کہ: تم یہود و نصاریٰ کی پیروی کرو گے۔ عبادات میں، اعتقادات میں، معاشرت میں، معشیت میں، گھریلو زندگی میں، اجتماعی زندگی میں ہو بہو پیروی کرو گے۔ حتی کہ صورتوں شکلوں اور معنویت میں بھی ان کے پیرو بنے ہوئے ہونگے۔ تو یہود و نصاریٰ کے دو نمونے بیان کئے۔ ایک متکبر امت ہے، جس نے کتاب کو لے کر شخصیتوں کو چھوڑ دیا۔

ایک عیسائیوں کی ضال اور گمراہ امت ہے۔ جنہوں نے شخصیتوں کو لے کر کتاب کو چھوڑ دیا تو امت میں بھی دونوں نمونے موجود ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو کتاب اللہ کو ہاتھ میں لے کر چلتا ہے۔ سلف و آئمہ اور علماء سب کو ترک کرتے ہیں۔ "نَحْنُ رِجَالٌ وَهُمْ رِجَالٌ" "ہم بھی آدمی وہ بھی آدمی"۔ ضرورت کیا ہے کسی کے سامنے جھکنے کی کتاب موجود ہے تو بلاشبہ اتنا دعوی تو صحیح کیا مگر فقط کتاب کا اثر یہ ہے کہ استکبار اور عجو دنیز رفعت و ترفع کی شان ان میں پیدا ہوگئی۔

ایک طبقہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کتاب اللہ کیا ہے، ہم نہیں جانتے کہ بخاری اور مسلم کیا ہے۔ یہ جو اہل اللہ اور اہل کمال شخصیتیں ہیں یہی ہمارے لئے کتاب ہیں۔ یہی ہمارے لئے طریقہ ہیں۔ جو یہ کہیں گے ہم وہ کریں گے۔

شریعت وطریقت کا مابہ الامتیاز...... ظاہر بات ہے کہ نبی کے بعد اہل اللہ میں سے معصوم کوئی نہیں۔ اور معصوم نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ گناہ کرتے ہیں۔ یعنی دینی اعمال میں بہت سی چیزیں غلبہ حال میں ایسی سرزد ہوتی ہیں کہ حقیقتاً صحیح ہوتی ہیں۔ مگر ظواہر شریعت کے خلاف ہوتی ہیں۔ مغلوب الحال جو ہوئے۔ اگر فقط شخصیتوں

① الصحيح للبخاري، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لتتبعن سنن من قبلكم، ج: ٦، ص: ٢٦٦٩، رقم: ٦٨٨٩.

کی پیروی رہ جائے اور کتاب وسنت کے اصول سامنے نہ ہوں تو ان کے احوال سے جو ان کی حرکتیں سرزد ہوئی ہیں ان میں بھی پیروی کریں گے تو گمراہ ہوں گے۔

منصور نے اگر وجد میں آ کر "اَنَا الْحَقُّ" کہہ دیا اور منصور کی ہر چیز شریعت بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا اَنَــا الْحَقُّ کہے کہ میں بھی خدا ہوں۔ حالانکہ وہ غلبہ حال میں ایک کلمہ سرزد ہوا تھا۔ نہ یہ کہ وہ اصول ہے۔ تو شریعت قانون کلی کا نام ہے اور طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ قانون کلی تو ہر کس و ناکس کے لئے پیغام ہوتا ہے اور شخصی احوال دوسرے کے لیے حجت نہیں ہوتے ہر ایک کی شخصی حالت الگ الگ ہے۔ اگر منصور نے "اَنَــا الْحَقُّ" کہا تو میرے لئے فرض نہیں ہے کہ میں بھی "اَنَا الْحَقُّ" کہوں۔ ہاں اگر وہ حال میرے اندر پیدا ہو جائے پھر غیر اختیاری طور پر میں کہہ دوں تو پھر کسی کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہے مگر حال نہ ہو اور ان کی وجدی حرکات کی نقالی کروں تو یہ محض رسوم کی پیروی ہے۔ بہر حال ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا ہے کہ اس نے کہا کہ اصل کتاب ناطق تو یہ اہل اللہ ہیں ہم نہیں جانتے کہ کتاب میں کیا لکھا ہے اصل یہ ہیں۔ ان کے سامنے جھکے تو شرک اور بدعت میں مبتلا ہو گئے۔ اور دوسرا طبقہ کتاب پر اس درجہ جھکا کہ شخصیتوں کو چھوڑ کر کبر اور نخوت میں مبتلا ہوا۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: " مَنْ فَسَدَ مِنْ عُلَمَاءِ نَا فَفِيهِ شِبْهٌ مِّنَ الْيَهُوْدِ وَمَنْ فَسَدَ مِنْ عُبَّادِنَا فَفِيهِ شِبْهٌ مِّنَ النَّصَارٰی" " ہمارے علماء میں سے جو بگڑتا ہے وہ یہود کے نقش قدم پر ہوتا ہے اور عبّاد اور زہاد میں سے جو بگڑتا ہے وہ نصاریٰ کے نقش قدم پر ہوتا ہے"۔ محقق کون ہے؟ جو نہ تکبر میں مبتلا ہو نہ ذلّت نفس میں بلکہ وقار کے ساتھ تواضع للہ انجام دیتا رہے۔ اور یہ جب ہوگا کہ کتاب اور شخصیت دونوں کو ملا کر ان کا دامن پکڑ کر آدمی چلے تو حقانی علم وعمل اس وقت تک نصیب نہیں ہوسکتا جب تک دونوں کو جمع نہ کیا جائے اور تادّب مع اللہ نصیب نہیں ہوسکتا جب تک دونوں کو جمع نہ کیا جائے۔

مدرسہ و خانقاہ...... واقعہ یہ ہے کہ اگر غور کیا جائے تو علم مدارس میں سکھلایا جاتا ہے اور تربیتِ اخلاق خانقاہ میں ہوتی ہے۔ مدرسی ہونے کے ساتھ جب تک آدمی خانقاہی نہ بنے تکمیل نہیں ہوتی، محض خانقاہ میں جائے گا تو آدمی وجدی بن جائے گا۔ اسے خانقاہ میں خوب وجد آئے گا اور کورا مدرس بنے گا تو نجدی بن جائے گا۔ تو اس راہ میں نہ وجدی ہونا کافی نہ نجدی ہونا کافی۔ نجد اور وجد دونوں کو آدمی جمع کرے۔ تبھی کامل بنے گا۔ ایک طرف آدمی علم لے جس کے لئے مدرسہ جانا پڑے گا اور ایک طرف تربیت بھی لے اس کے لئے خانقاہ جانا پڑے گا۔ بہر حال دونوں چیزوں کو جمع کرنا یہ محقق ہونے کی علامت ہے۔

یہ جو مولویوں اور صوفیوں کی لڑائی ہے میں کہا کرتا ہوں کہ ایک طرف کورے مولوی جن میں عشق کی کمی ہے اور ایک طرف کورے عاشق جن میں علم کی کمی ہے محقق اور کامل کبھی نہیں لڑا کرتا۔ اس کے ظرف کے اندر وسعت ہوگی تو کامل بننے کی کوشش کیجئے۔

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

''ایک ہاتھ میں جام شریعت ہونا چاہئے اور ایک ہاتھ میں جام عشق ہونا چاہئے''۔ آگ بھی ہو اور پانی بھی ہو، جلال بھی ہو اور جمال بھی۔ جب جا کے آدمی میں کمال پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ کمال کی کوئی صورت نہیں۔ اور اعتدال بھی تبھی ہوگا جب جلال و جمال جمع ہو جائیں گے۔

روح کا علاج...... تو فرمایا گیا: ﴿يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ﴾ ''اللہ تعالیٰ اس آدمی کی رہنمائی فرما دیتے ہیں۔ جو ہماری رضا کی پیروی کرے''۔

اور رضا کا مقام ہے۔ رضا اسی کو حاصل ہوگی جو قلب کو متوجہ کرے گا۔ باطن سے گویا ابتداء ہوئی۔ اہل باطن سے آدمی اپنا علاج کرائے گا۔ جبھی تو رضا پیدا ہوگی۔

جیسے بدن پر بیماری آتی رہتی ہے۔ دل اور نفس پر بھی آتی ہے۔ بدن کی بیماریوں کے لئے طبیب کے پاس جاتے ہیں۔ جو کہتا ہے وہی کرتے ہیں۔ روح کی بیماری ہوگی تو روحانی طبیب کے پاس جانا پڑے گا۔ جو وہ کہے گا کرنا پڑے گا۔ وہ بھی دواء غذا اور پرہیز بتلائے گا۔ یہ بھی دواء غذا اور پرہیز بتلائے گا۔ یہ کہے گا معصیت سے پرہیز کرو۔ روزانہ کے اعمال شریعت غذا ہیں۔ ان میں کوتاہی نہ کرنا اور دوا ذکر اللہ ہے۔ اس کی اتنی تسبیح پڑھنا۔ اتنا اللہ کا نام لینا۔ تو دوا، غذا اور پرہیز سب ہی کچھ ہے۔

بہرحال جیسے بدن پر بیماریاں آتی ہیں۔ ایسے ہی نفس پر بھی بیماریاں آتی ہیں۔ جیسے بدن کے معالج ہیں، ایسے ہی نفس و قلب کے بھی معالج اللہ نے پیدا کئے ہیں۔ تو جو ان سے معالجہ کرائے گا۔ اس کے قلب میں مقام رضا پیدا ہوگا۔ اسی طرح عشق و محبت اور تفویض کا مقام پیدا ہوگا۔ اگر یہ نہیں ہے تو کچھ پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے باطن کی بھی ضرورت ہے۔ ظاہر کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے متعلق اشارہ فرمایا کہ مشعل راہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جس سے حق و باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں راہنما ہیں اور کتاب اللہ صراط مستقیم ہے۔ مگر چلے گا وہ جس کا دل درست ہوگا۔ اور رضاء خداوندی کا اثر ہو۔

سیرتِ نبوی کے عناصر اربعہ...... اور مقصد کیا ہے؟ ﴿يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ مقصد نور میں لانا ہے۔ جیسی ظلمت تھی اس کا مد مقابل ویسا ہی نور ہوگا۔ جہالت مظالم اور معصیت کی ظلمت تھی۔ اس کے مقابل جو نور آئے گا، وہ علم، طاعت، کمال اور اخلاق ربانی کا ہوگا۔ جس کا مرکز بنا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے یہ عناصر اربعہ ہیں، تعلیم کتاب، تلاوت الفاظ، تعلیم حکمت اور تزکیہ نفس اور اس کے ساتھ یہ بھی صحیح کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشعل نور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں راہنما۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا راستہ قرآن اور اس پر چلنے والے مسلمان۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم اس راستہ پر چلیں۔ ان عناصر سے اپنے عنصر کو بنائیں۔ اپنے بدن اور روح کا علاج کریں۔ اپنے نفس کی تکمیل کریں۔ حق تعالیٰ شانہ

ہمیں توفیق دے کہ ہم مرضیات حق پر چلیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کریں اور من گھڑت راستوں کو ترک کریں۔حق تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم علم صحیح استعمال کریں، تا کہ کتاب وسنت کا مقام ہمارے قلوب کے اندر آجائے۔(آمین)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَالَاتُزِغْ قُلُوْبَنَابَعْدَاِذْهَدَيْتَنَاوَهَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ، اَللّٰهُمَّ اِنَّانَعُوْذُبِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَاظَهَرَمِنْهَاوَمَابَطَنَ رَبَّنَالَاتَجْعَلْنَافِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ تَوَفَّنَامُسْلِمِيْنَ غَيْرَخَزَايَا وَلَامَفْتُوْنِيْنَ وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِخَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

(۲۳ صفر ۱۴۰۵ھ)

اسلام عالمی مذہب ہے

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّـا بَعْـدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ ①
صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

حکیمانہ تشکر...... بزرگانِ محترم! میرے تعارف کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا۔ یہ اپنی عالی ظرفی اور بلند خیالی کا اظہار کیا گیا ہے۔ میرے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس میں ان حضرات نے اپنے طرف کی بلندی ظاہر فرمائی۔ میری بلندی اس میں ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لئے میرے ذمہ شکریہ ادا کرنا نہیں ہے۔ اس لئے کہ آپ تعریف اپنی کریں کہ ہم اتنے عالی حوصلہ یا وسیع الظرف ہیں اور شکریہ میں ادا کروں؟ آپ اپنی تعریف کریں تو مجھ پر شکریہ کب فرض ہے؟ میری آپ تعریف کرتے تو میں شکریہ ادا کرتا۔

اور تعریف کی بھی تو ایسی کہ اس کا واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ چاند اور سورج ہیں تو میں کب چاند اور سورج ہوں میں انسانی مخلوق ہوں یہ کون سی میری تعریف، ہوئی جو واقعہ کے خلاف ہے۔ کسی نے کہا کہ بہت بڑا آدمی ہوں تو میں کب بڑا ہوں؟ غرض میری تعریف کرتے تو میں شکریہ ادا کرتا آپ نے میری تعریف نہیں کی۔ اس لئے میرے ذمہ نہیں ہے کہ میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کروں؟

دارالعلوم کا ایک طالب علم...... جہاں تک تعارف کا تعلق ہے تو میں اپنا تعارف خود کرائے دیتا ہوں! میرا تعارف نہ چاند سورج سے ہوگا۔ نہ علم اور فضل سے ہوگا۔ اس لئے کہ علم اور فضل میں یہ حضرات مجھ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ آپ کے سامنے مولانا محمد حسن صاحب کھڑے ہوئے تھے وہ ہمارے دارالعلوم (دیوبند) کے استاذ

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۴۔

ہیں۔میں بھی ان کی تعظیم کرتا ہوں میں ان کے سامنے ایک طالب علم ہوں۔

مولانا انظر شاہ صاحب ہیں۔عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔مگر علم میں کہیں بڑھے ہوئے ہیں میں دل سے ان کی عظمت کرتا ہوں۔تو میرا تعارف یہ ہے کہ میں دارالعلوم دیوبند کا ایک طالب علم ہوں۔وہاں کے اساتذہ اور بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنا میرا کام ہے اس کے سوا اور کوئی کام نہیں۔غرض اس سے زیادہ سمجھا بھی نہ جائے۔

اور یہ کوئی تواضع نہیں ہے۔اس لئے کہ یہ حضرات تو دن رات تعلیم میں لگے ہوئے ہیں۔ان کا علم تازہ ہے مجھے پڑھے ہوئے ساٹھ برس ہوگئے۔ان کا علم تازہ ہے اور میرا باسی۔اور باسی ہو کر بھی چوراسی ہوگیا۔گویا قریب الختم ہے۔اس واسطے میرا تعارف اس سے زیادہ نہیں کہ دارالعلوم کا ایک طالب علم ہوں۔اور ان حضرات کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔انہوں نے جو کچھ کہا اپنی عالی ظرفی سے کہا۔میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

ادائیگی فرض...... باقی شکریہ ادا کردینا میرا فرض تھا۔کہ جب آپ نے صدر بنادیا۔تو اصل میں تو صدر بنانے والے آپ ہیں۔جو گھٹیا آدمی کو بنا سکتے ہیں تو وہ خود صدر ہیں(بلکہ صدر ساز ہیں)جن کو بنانے پر قدرت ہے وہ خود صدر ہوں گے۔بہرحال جب آپ نے صدر بنادیا اور اس کرسی پر بٹھادیا۔تو لامحالہ اس کرسی کا وقار اور اس کی لاج رکھنا میرا فرض ہے۔اس سلسلہ میں چند باتیں مجھے گزارش کرنی ہیں۔لیکن مناسب یہ ہے کہ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے جس کے بارے میں چند باتیں گزارش کرنی ہیں۔اس سے پہلے ایک مختصر سی تمہید عرض کردوں جس کے ذریعے آیت کا مفہوم سمجھنا بھی آسان ہو جائے گا اور آیت کا جو منشاء اور مقصد ہے وہ بھی انشاء اللہ واضح ہو جائے گا۔ابتداء میں تھوڑی سی تمہیدی باتیں ہیں۔

تمہید...... پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت دنیا بین الاقوامی ہوگئی ہے۔یعنی ساری دنیا سمٹ کر ایک قبیلہ بن گئی ہے پہلے اگر دوسری ولایتوں کا مہینوں میں سفر ہوتا تھا اب وہ دنوں میں ہونے لگا ہے،جو سفر دنوں میں ہوتے تھے اب وہ گھنٹوں میں طے ہونے لگے ہیں جو گھنٹوں میں ہوتے تھے وہ منٹوں میں طے ہونے لگے تو ساری دنیا سمٹ کر ایک قبیلہ بن گئی ہے۔پہلے بچپن میں ہم لوگ اگر دس بارہ میل کا سفر کرتے تھے تو بڑی تیاریاں ہوتی تھیں۔کہ سفر درپیش ہے۔آج وہ سفر سفر نہیں رہا شہروں میں دس بارہ میل کا سفر تو روزانہ ہوتا ہے۔تو وسائل ایسے مہیا ہوگئے کہ جن کی وجہ سے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں بدل گیا ہے۔ہوائی جہاز پہ آپ یورپ جائیں گے تو بارہ گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے پہلے دیوبند سے دہلی تک اڑتالیس گھنٹے لگتے تھے۔اور اب لندن بارہ گھنٹوں میں پہنچ جاتے ہیں۔تو ہزاروں میل کا سفر ایسا ہوگیا ہے جیسے چند فرلانگ کا سفر ہوتا ہے سواریاں ایسی ایجاد ہوگئیں کہ انہوں نے ساری دنیا کو لپیٹ کر رکھ دیا۔

نظریاتی یکسانیت...... اسی طرح سے علم وفضل کے وسائل اتنے بڑھ گئے ہیں کہ آج جو آپ یہاں علم رکھتے ہیں، وہی علم لندن والے بھی رکھتے ہیں۔وہی معلومات امریکہ وجرمنی میں ہیں۔کوئی خصوصیت کہیں کی باقی نہیں رہی۔حتی کہ تمدن کی خصوصیات مٹتی چلی جارہی ہیں یورپ وامریکہ اور ہندوستان کا تمدن یکساں سا ہوگیا ہے۔جو چیزیں آپ

لندن میں دیکھیں گے، وہی بمبئی اور کلکتہ میں دیکھیں گے، جو امریکہ میں ہیں وہی امریکن اسٹائل یہاں بھی نظر پڑیں گی۔ تو تمدن بھی یکساں، نظریات بھی یکساں گویا پوری دنیا بین الاقوامی بن گئی۔ مسائل ایک ملک کے ہیں اور دنیا کے سارے ملک مل کر طے کر رہے ہیں، تو کسی ملک کی سیاست اپنی اندرونی نہیں رہی بلکہ بیرونی سیاست کے تابع ہوگئے ہیں ہر ملک کا یہی معاملہ ہے کشمیر کا معاملہ آپ کے ملک کا ہے اور اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ درپیش ہے، آپ کے ملک کا مسئلہ ہے اور یورپ، امریکہ والے بیٹھ کر طے کر رہے ہیں۔ تو چھوٹے چھوٹے مسائل اقوام متحدہ میں پیش ہوتے ہیں۔ اور وہ فیصلہ کرتے ہیں۔ تو کسی ملک کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی، اس لئے نظریات بھی یکساں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جو نظریہ تمدن کے بارے میں یورپ کا ہے وہی آج آپ کا، امریکہ اور روس کا بھی ہے۔ تو مدنیت اور معاشرے کا ایک ہی ذریعہ ہوگیا ہے۔ کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ وہاں سے نظریات برآمد ہوتے ہیں۔ آپ کے ملک میں آتے ہیں۔ آپ قبول کرتے ہیں۔ تو ساری دنیا سمٹ کر ایک کنبہ بن گئی ہے۔ جس سے ہر ملک کی خصوصیات ختم ہوگئیں۔ نظریات ایک ہوگئے۔ ذہنوں کا رخ ایک بن گیا۔ پلیٹ فارم ایک بن گیا۔ اور دنیا یہ چاہتی ہے کہ سب کے اندر یکسانیت پیدا ہو جائے۔ یہ ایک نظریہ ہے جو اب چل رہا ہے۔

مذہبی یکسانیت...... تو میں عرض کرتا ہوں کہ یہ نظریات جب یکسانیت کے ساتھ قائم ہوگئے حتیٰ کہ تمدن و معاشرہ بھی ایک ہو، تو قدرتی طور پر یہ مسئلہ سامنے آئے گا کہ پھر مذہب بھی ایک ہی ہو۔ دین بھی سب کا ایک ہی ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ معاشرت تو یکساں ہو اور مذہب الگ الگ ہو۔ تمدن ایک ہو جائے اور دین ایک نہ ہو، یہ فطرت اور طبیعت کے خلاف ہے۔ نظریات میں یکسانیت پیدا ہوگئی۔ مذہب کی یکسانیت کا مسئلہ باقی رہ گیا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ آتا جا رہا ہے۔ اور مذہبیت جاندار ہو رہی ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَا يَبْقَى عَلَى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَبِذُلِّ ذَلِيْلٍ" ① "روئے زمین پر کوئی کچا اور پکا مکان باقی نہیں رہے گا۔ کپڑے کا گھرانہ ہو، جیسے خیمہ یا پتھروں کا گھرانہ ہو جیسے پہاڑوں پر مکانات ہوتے ہیں۔ یا اینٹ پتھر کا گھرانہ جسے آپ تعمیر کرتے ہیں۔ کوئی گھرانہ باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے گا" **بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَ بِذُلِّ ذَلِيْلٍ** کوئی رغبت سے قبول کرے یا مجبور ہو کر۔ مجبوری کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ مسلمان کسی کے گلے پر چھری رکھیں گے کہ یا قبول کرو، نہیں تو ذبح کر دیں گے۔ اس کی تو اسلام نے مخالفت کی ہے۔ صاف فرمایا گیا: ﴿**لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ**﴾ ②

دین کے اندر کوئی جبر نہیں ہے نیکی اور بدی، خیر اور شر خود کھل کر سامنے آگئی ہے جس کا جی چاہے اسلام قبول کرے جس کا جی چاہے نہ کرے، کوئی جبری چیز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ یہاں تک فرمایا: ﴿**اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى**

① مسند احمد، حديث المقداد بن الاسود، ج: ٦، ص: ٤، رقم: ٢٣٨٦٥. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، باب وصبره على ذلك ج: ٢ ص: ٤٣٩. ② پارہ: ٣، سورة البقرة، الآية: ٢٥٦.

یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ﴾ ''اے پیغمبر! کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ لوگ مسلمان بنیں''۔ یہ آپ کا حق نہیں ہے۔ یہ اللہ کا حق ہے جس کے جی میں چاہے ایمان ڈال دیں آپ کا کام صرف تبلیغ اور دین کا پہنچا دینا ہے ماننا نہ ماننا ہر شخص کے اختیار میں ہے جس کو دوسری جگہ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا﴾ ① ''جس کا جی چاہے ایمان قبول کرے جس کا جی چاہے نہ قبول کرے ہم نے عذاب آخرت تیار کر رکھا ہے جس کا جی چاہے بچ جائے جس کا جی چاہے اپنے کو اس کے اندر جھونک دے''۔

تو دین میں کوئی جبر نہیں۔ اس لئے فرمایا: ''بِعِزِّ عَزِیْزٍ وَبِذُلِّ ذَلِیْلٍ'' اسلام کا کلمہ ہر شخص تک پہنچ جائے گا خواہ وہ رغبت سے مانے یا مجبور ہو کر۔ تو مجبوری کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ مسلمان تلوار سے مجبور کریں گے۔ مجبور کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر شخص کو دھکے کھا کر مجبور ہو کر انہی اصول کے اندر پناہ ملے گی۔ جو اسلام نے لا کر رکھے ہیں۔ لوگ مجبور ہو کر قبول کریں گے۔ اس کے سوا چارہ کار باقی نہیں رہے گا تو یہ حاصل ہوا کہ گھر گھر اسلام کا کلمہ داخل ہو کر رہے گا۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ آج اس کی تمہید بڑھتی چلی جا رہی ہے تمدن ایک بن گیا۔ نظریات ایک بن گئے معاشرت ایک ہوتی جاری ہے۔ خود یہ سوال آئے گا کہ پھر مذہب کیوں نہ ایک ہو؟ دین کیوں نہ ایک ہو؟ ساری قومیں مل کر ایک پلیٹ فارم پر کیوں نہ جمع ہوں؟ اتحاد تو جبھی پیدا ہوگا۔ تو یہ نظریہ سامنے آنے والا ہے۔ بلکہ زبانوں پر آنے بھی لگا ہے۔ اب کھل کر آنے والا ہے چند دن کے بعد۔

عالمی دین...... تو مقصد یہ ہے کہ جب دنیا بین الاقوامی ہے تو لامحالہ ایسے دین کی طرف توجہ منعطف ہوگی جو خود بین الاقوامی ہو۔ اگر دین ایک ملک کا ہو کہ دوسرے ملک کا اس کے ساتھ تعلق نہ ہو وہ بین الاقوامی نہیں ہے، وہ تو ملک والوں کے لئے ہے۔ یا ایک خاندان کا ہو دوسرے خاندان کا نہ ہو تو دوسرا خاندان متوجہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو سارے ملکوں کا ہو سارے عالم کا ہو اس کی طرف خواہ مخواہ عالم کی توجہ ہوگی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلَی النَّاسِ کَافَّةً'' ② ''پہلے پیغمبر اپنی اپنی اقوام اور خاص خاص قوموں کی طرف۔ ان کو ہدایت کرتے تھے نصیحت کرتے تھے۔ تو اب یہ خاص کون ہیں؟''

تو بعض انبیاء علیہم السلام تو ایک خاندان کی طرف آئے ہیں جیسے بنی اسرائیل اس خاندان میں ہزاروں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے لیکن ہر نبی کا کام یہ تھا کہ اسرائیلی خاندان کی اصلاح کرے، انہیں دوسرے خاندانوں سے تعلق نہیں تھا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام رسول ہیں مگر بنی اسرائیل کے۔

خود حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے آیا ہوں کہ یہ منتشر نہ رہیں دوسری اقوام میں جو بھیڑیں ہیں ان سے مجھے تعلق نہیں۔ تو بعض انبیاء مخصوص خاندانوں کی طرف آئے۔ اسی خاندان کی

① پارہ: ۱۵، سورۃ الکہف، الآیۃ: ۲۹. ② الصحیح للبخاری، کتاب الصلاۃ، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعلت لی الارض مسجداً وطهوراً، ج: ۱، ص: ۱۶۸، رقم: ۴۲۷.

اصلاح ان کے ذمے تھی۔

بعض مخصوص ملکوں کی طرف آئے یا مخصوص قوموں کی طرف کہ جیسے حضرت یونس علیہ السلام کہ چار قوموں کی طرف مبعوث ہوئے انہی کے اصلاح کے لئے آئے تھے۔ اور قوموں سے انہیں کوئی تعلق نہیں تھا، اسی طرح سے اور انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اقوام، خاندان اور قبیلوں کی طرف بھیجے گئے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ ''ہر قوم کے لئے ہم نے ہادی بھیجا اور ڈرانے والا بھیجا''۔ ﴿وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ ''کوئی امت ہم نے نہیں چھوڑی جس میں ڈرانے والے نہ بھیجے ہوں''۔ اور فرمایا گیا۔ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ ''ہم کسی قوم کو عذاب نہیں دیتے جب تک رسولوں کو بھیج کر تمام حجت نہ کر دیں''۔

دین پیش کر دیں اور وہ نہ مانیں، حجت تام ہو تب ہم عذاب دیں گے، ورنہ ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں۔

تو قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی قوم اور ملک باقی نہیں ہے جس کے اندر انبیاء علیہم السلام نہ آئے ہوں۔ اب یہ حجت تام اتنی عام ہے تو کروڑوں کا ملک ہو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے اندر اللہ کی طرف سے ڈرانے والے نہ آئے ہوں۔

آغازِ اسلام...... اور میں کہتا ہوں کہ سب سے پہلے پیغمبر تو ہندوستان ہی میں مبعوث ہوئے حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں ہی آئے تو ہندوستان میں ان کا نزول اور اترنا ثابت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ہندوستان سے عربستان کا سفر کیا ہے۔ اور ایک سو بیس حج کئے ہیں چالیس حج پیدل کئے ہیں اور بقیہ حج بیل پر سوار ہو کر کئے ہیں۔ تو سب سے پہلا دار النبوت اور دار الخلافت اللہ کا ہندوستان ہے جس سے مذہب کا آغاز ہوا۔ مذہب کی تکمیل عربستان میں ہوئی مگر آغاز ہندوستان سے ہوا۔ تکمیل کے لئے تو فرمایا: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ ① ''حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آج کے دن میں نے دین کو مکمل کر دیا۔ اور اپنی نعمتوں کو تم پر پورا کر دیا ہے۔ اور میں آج اسلام کے سوا تم سے کسی اور دین پر راضی نہیں ہوں''۔

اسلام لے کر تو حضرت آدم علیہ السلام آئے ہیں۔ آغاز ان سے ہوا۔ تکمیل عربستان میں ہوئی۔ بیچ میں انبیاء علیہم السلام آتے رہے، ہر ملک اور قوم کی طرف آتے رہے اور تبلیغ اسلام کرتے رہے مگر اللہ کا دین ایک رہا شریعتوں میں چوں کہ تغیر و تبدیل ہوتا رہا پچھلی شریعتوں میں ایک چیز حلال تھی تو اگلی شریعتوں میں اسے حرام کر دیا۔ یا پہلی شریعت میں حرام تھی۔ اگلی شریعت میں اسے حلال کر دیا۔ شرائع کے اندر تو تغیر و تبدل رہا۔ مگر دین ایک رہا۔

تکمیل شریعت...... دین کے معنی اصول کے ہیں۔ اللہ کی توحید، نبی کی عظمت، آخرت کا یقین جنت و دوزخ کا ہونا۔ ملائکہ کا وجود، پل صراط کا ہونا۔ عرش کرسی اور لوح و قلم کا ہونا یہ غیبی چیزیں ہیں جو سب انبیاء کے زمانے میں ایک رہی ہیں۔ البتہ حلال و حرام کے احکام جس کو ہم عملی پروگرام کہیں گے اس عملی پروگرام میں کچھ تغیر و تبدیل ہوتا رہا، اخیر

---

① پارہ ٦: سورة المائدة، الآية: ٣۔

میں آ کر وہ بھی مکمل ہو گیا۔ شریعت بھی اتنی مکمل ہو گئی کہ اب اس میں کمی اور زیادتی کی گنجائش نہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے بچہ پیدا ہوا تو اس کے لئے کرتہ بنائیں تو بالشت بھر کا ہو گا۔ اور وہ بھی بلکہ بڑا ہو گا۔ بچہ اس میں چھپ جائے گا۔ لیکن اب جوں جوں بڑھتا جائے گا تو پیائش بڑھتی جائے گی۔ تو بچہ تو پیدائش سے لے کر ایک ہی ہے۔ مگر لباس اسکے بدلتے رہے۔ اسی طرح سے دین ایک ہے مگر عملی پروگرام کے لباس بدلتے رہے ہیں۔

وحدتِ دین...... انبیاء علیہم السلام آتے رہے تو تغیر وتبدل ہوتے رہے ہیں مگر دین سب کا ایک تھا۔ ”کَانَ دِیْنُ الْاَنْبِیَآءِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ“ سارے پیغمبروں کا دین توحید تھا کہ ایک کو ہی مانو۔ ایک ہی کو سب کا کرتا دھرتا سمجھو، ایک ہی کو نفع ونقصان کا مالک سمجھو، ایک ہی کو ہادی سمجھو، ایک ہی کو زندہ کرنے اور موت دینے والا سمجھو، نہ کسی کے بس میں موت ہے نہ حیات نہ کسی کے بس میں ہدایت وراہنمائی ہے، یہ صرف اللہ کا کام ہے، نجات دینا اس کا کام ہے، تو توحید سارے انبیاء کا دین رہا۔ اور جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ ① ”کوئی رسول دنیا میں ہم نے نہیں بھیجا جس نے یوں نہ کہا ہو کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور اسی کی عبادت کرو“۔

نہ انبیاء علیہم السلام کی عبادت کرو نہ اولیاء اللہ کی عبادت کرو، نہ علماء ومشائخ کی، عبادت کے لئے سزاوار صرف ایک ہی ذات ہے، اور وہ ذات اللہ کی ہے، اس لئے کہ زندہ کرنے اور مارنے والا صرف اللہ ہے اگر زندہ کرنے میں معاذ اللہ اس کا کوئی شریک ہوتا کہ کچھ ہماری اور آپ کی قوت اور کچھ اللہ تعالیٰ کی قوت، مل ملا کر زندہ کر دیا۔ اسی طرح موت دینے میں اللہ کے کچھ اور بھی شریک ہوتے تنہا اللہ کی قوت کافی نہ تھی، کچھ اور لوگوں کو ملا کر فلاں کو موت دی جائے۔ تو اگر موت وحیات میں شرکت ہوتی تو عبادت میں بھی شرکت ہوتی، تو اللہ کی بھی عبادت کرتے اور جو ان کے شریک ہوتے، ان کی بھی عبادت کرتے۔

مگر زندگی، موت، صحت ومرض، رزق دینے والے وہ تنہا ہیں اور کل معاملات ان کے ہاتھ میں ہیں پھر عبادت بھی تنہا انہی کی ہوگی، یہ کیسے ممکن ہے کہ کام تو وہ کریں اور جھکیں دوسرے کے آگے، دوسروں کے آگے پیشانی رگڑیں، جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت کی باگ ڈور ہے، اسی کی عبادت کی جائے گی تو آیت شریفہ میں یہ بتلایا گیا کہ ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا جس نے یہ تعلیم نہ دی ہو کہ دیکھو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی عبادت کرو، اسی سے ڈرو۔ اگر اس سے ڈرو گے تو سب سے ڈرنا چھوڑ دو گے۔ اگر اس سے نہیں ڈرو گے تو سب سے ڈرنا پڑے گا، اگر اس کی عبادت کرو گے تو ہر ایک کی عبادت ترک کر دو گے۔ اگر اس کی عبادت نہیں کرو گے تو در در پر جھکنا پڑے گا۔

ترکِ توحید کی پھٹکار...... آج کوئی آپ کے آگے جھک رہا ہے کوئی پتھر کے آگے جھک رہا ہے، کوئی آگ کے

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۵۔

آگے کوئی پانی کے آگے، تو میں کہتا ہوں کہ یہ شرک نہیں ہے یہ پھٹکار ہے کہ جب ایک کی عبادت نہیں کی تو ایک ایک چیز کے سامنے ناک رگڑ رگڑ کر یہاں بھی ذلیل بنو وہاں بھی ذلیل بنو، انسان کو اللہ نے معظم اور مکرم بنایا تھا کہ اللہ کے سوا کسی اور کے آگے اس کی پیشانی نہ جھکے، جب اس نے اپنے آپ کو خود عزت والے سے ہٹالیا تو ایک ایک مخلوق کے آگے اسے جھکنا پڑا، ذلیل ہونا پڑا۔ حالانکہ آگ پانی، مٹی ہوا تو ہمارے خادم ہیں۔ یہ معبود تھوڑا ہی ہیں۔ ان سے تو ہم کام لیتے ہیں، پانی سے نجاستیں اور گندگیاں دھوتے ہیں، پھر پانی کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جائے۔ آپ اسے آٹھویں منزل پائپ کے ذریعے لے گئے، جانے پر یہ مجبور ہے آپ پانی سے مجبور نہیں ہیں، پانی آپ سے مجبور ہے، کہ وہ نیچے کو جانا چاہتا ہے اور آپ اس کی طبیعت کے خلاف اس کو اوپر لے جانا چاہتے ہیں۔ آگ کی طبیعت یہ ہے کہ وہ اوپر کو جاتی ہے اس کی لپٹ جب جاتی ہے تو اوپر کی طرف، نیچے کی طرف نہیں جائے گی، لیکن مشینوں کے ذریعے سے آپ اس کی لپٹ کو نیچے لے جاتے ہیں، وہ مجبور ہے کہ مشین چل رہی ہے لپٹ نیچے جارہی ہے، تو آگ نے آپ کو مجبور نہیں کیا آپ نے آگ کو مجبور کردیا۔ زمین پر آپ کو قابو ہے، زمین کو آپ پر قابو نہیں ہے، چناں چہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ﴾ ①

زمین کو ہم نے تمہارے سامنے ذلیل بنا دیا ذلیل نہیں کہا بلکہ مبالغہ کا صیغہ ذلولا فرمایا، اس کو کھودیں، پھاڑیں، چکنا چور کریں، بیچاری چوں نہیں کرتی، اسی طرح اس میں پانی بہادیں نالی کھودیں چوں نہیں کرے گی، تو زمین آپ کے سامنے مجبور ہے آپ اس کے سامنے مجبور نہیں ہیں۔

یہی صورت ہوا کی بھی ہے کہ ہوا کو آپ نے مجبور کررکھا ہے، یہ ہوا جو فضا میں بھری ہوئی ہے، آپ کے قبضے میں جب آتی ہے تو جیسا چاہے تصرف کریں، سائیکل کے ٹیوب کے اندر آپ نے اُسے بند کررکھا ہے، نکلنا چاہتی ہے مگر جا نہیں سکتی، پانچ آنے کی گیند آتی ہے اس میں الگ بند کررکھا ہے، گیند کو نیچے ماریں گے وہ اچھل کر اُوپر جائے گی وہ ہوا ہی ہے نکلنا چاہتی ہے مگر نہیں نکل سکتی آپ نے اس کو قید کررکھا ہے، غرض ہوا آپ کے سامنے مجبور ہے۔

یہی صورت آگ کی بھی ہے، اب یہ آپ کے سامنے بجلی ہے یہ پہاڑوں کو چکنا چور کردیتی ہے۔ اب جب انسان کے ہاتھ میں آگئی تو ایک پتلے سے تار میں باندھ رکھا ہے نہ چھوڑیں تو تار میں بند ہے۔ ذرا سوئچ نیچے دبادیں فوراً خادم حاضر ہے۔ تو جو پہاڑوں کو چکنا چور کرتی ہے انسان کے ہاتھ میں آکر قید ہوئی، تو چوں نہیں کرسکتی ہے۔ گرفتار ہے، بجلی کیا ہوئی ایک خادم ہوئی۔ تو خادم کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کے آگے جھکے، انسان نے الٹا کام کردیا خود اس کے آگے جھکنا شروع کردیا کبھی آگ کے آگے کبھی پانی کے آگے، کبھی درخت کے آگے، یہ سب چیزیں تو تمہاری خادم ہیں، تمہارے استعمال کے لئے پیدا کی گئی ہیں، ان کا کام ہے کہ وہ تمہاری اطاعت کریں، نہ یہ کہ انسان جیسی

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۵.

معظم ومکرم چیز ان کے آگے جھکے اوران کی اطاعت کرے۔تو جھکنے کے لئے ایک ہی ذات سزاوار ہے جس کے ہاتھ میں سورج بھی ہے چاند بھی ہے درخت بھی ہیں پہاڑ بھی ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ ① نہ تم سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو سجدہ کرو، اس ذات کو سجدہ کرو جس نے سورج اور چاند جیسی چیزیں تمہارے سامنے بنا کر رکھ دیں، اور تمہارے لئے بنائیں۔تو صبح کو سورج نکلتا ہے روشنی پھینکتا ہے تاکہ تم اپنے کام کاج کرو۔رات کو چاند نکلتا ہے۔اگر رات کو بھی سورج رہتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔تو رات کو وہ ستارے چمکائے جس میں ٹھنڈی روشنی ہے، دن میں وہ ستارے چمکائے جس میں گرم روشنی اور چاندنا کافی ہے،تو جس نے ان کے نوروں اور روشنیوں میں فرق ڈالا وہ اللہ رب العزت ہیں تو وہ عبادت کے لائق ہیں یا یہ چاند سورج عبادت کے لائق ہیں؟ یہ تو اس قدرت کے مظاہر ہیں کہ کسی میں گرم نور اور کسی میں ٹھنڈا نور چمکا دیا، پہاڑوں کو عظمت اور رفعت دے دی۔آسمان کو بلند کر دیا مگر سب کی بلندیوں سے جو زیادہ بلند ہے وہ ذات بابرکات ہے، سب عظمتوں پر جس کی عظمت فائق ہے وہ اللہ رب العزت کی ذات ہے۔تو سارے انبیاء کا دین یہی رہا تو حید اور یہ کہ ایک کو کرتا دھرتا سمجھو اور اسی کے آگے جھکو۔

تاثیرِ توحید......اسی میں قلب کی قوت بھی ہے

یک در گیر محکم گیر

ایک در کو مضبوط تھاموجو ایک کا ہو جاتا ہے اس کے قلب میں قوت آجاتی ہے کہ میرا آقا موجود ہے، اور چند آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کر سکتا ایک طرف جھکے گا اسے خطرہ ہوگا کہ دوسرا خفا نہ ہو جائے دوسرے کے آگے جھکے گا اسے خطرہ ہوگا تیسرا خفا نہ ہو جائے۔تو چند آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کر سکتا۔غلام جب خدمت کرے گا ایک آقا کی کرے گا جو متعین ہو کہ اسی کے ہاتھ میں میرا مفاد ہے۔تو حق تعالیٰ شانہ کے ہاتھ میں نفع ونقصان، وجود وعدم اور موت وحیات ہے، اس واسطے عبادت کے لائق وہ ہی ہے سارے انبیاء علیہم السلام نے یہی تعلیم دی ہے،تو میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ دین سارے انبیاء علیہم السلام کا ایک رہا۔شریعتیں کچھ مختلف ہوتی رہی ہیں، جیسے آدمی کے لباس بدلتے رہتے ہیں مگر آدمی وہی رہتا ہے، وہی بچہ جس نے بالشت بھر کا لباس پہنا تھا وہی اب ڈیڑھ گز کا لباس پہنے گا کیوں کہ اس کی عمر اب بیس برس کی ہوگئی، لیکن جب اس کی نشوونما مکمل ہوگئی۔اب اس میں بڑھنے کی گنجائش نہیں رہی۔اب جو لباس پہنے گا اس کی پیمائش متعین ہوگی وہ نہ کم ہو سکتا نہ زیادہ، اس لئے کہ کم زیادہ تو تب ہو جب انسان کے اندر بڑھنے کی گنجائش ہو کیوں کہ اس کی نشوونما اور بڑھوتری مکمل ہو چکی ہے۔اب لباس کی پیمائش متعین ہوگی۔غرض دین تمام انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی رہا، شریعتیں بدلتی رہیں۔اس لئے عبادت صرف ایک ہی ذات کی کی جائے گی۔

① پارہ: ۲۴، سورۃ حٰم سجدۃ، الآیۃ: ۳۷.

عبادت و تعظیم کا فرق...... البتہ کسی چیز کی تعظیم کا حکم ہو تو اس کی عظمت بجالائی جائے گی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ جو صاحب کشف و کرامات بزرگ اور اولیائے کاملین میں سے تھے، دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے، مولانا پر اکثر جذب کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ایک دفعہ مولانا کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ گنگا کہاں سے نکلی ہے؟ جو ایک قوم کی قوم گنگا کی عظمت کر رہی ہے، اسی وقت اٹھ کر سفر شروع کر دیا تو دیوبند سے چالیس میل کے فاصلے پر گنگا بہتی ہے، مولانا نے چالیس میل کا سفر کیا۔ اور اس موضع مین پہنچے جہاں سے گنگا کا دہانہ پھوٹا ہے، جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں ہے، گنگوتری اس جگہ کا نام ہے، سات دن وہاں ٹھہرے اس کے بعد آ کر فرمایا کہ میں نے گنگا کے دہانے پر روزے رکھے، عبادتیں کیں ذکر اور تلاوت خوب کرتا رہا تو مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ جہاں سے دہانہ پھوٹا ہے وہاں سے مجھے انوار نبوت محسوس ہوئے، یا تو کسی نبی کی وہاں قبر ہے یا کسی نبی کی نشست گاہ ہے جہاں بیٹھ کر انہوں نے قوم کو ہدایت کی ہے، اسی برکات کے آثار اس پانی میں ہیں، اس لئے قوم کی قوم، اس کی عظمت کر رہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ایک ہے کسی چیز کی عظمت کرنا اور ایک ہے عبادت کرنا۔ عبادت جائز نہیں عظمت سب کی ضروری ہے۔

زمزم شریف جو آپ کے ہاں پانی ہے اس کی آپ عظمت کرتے ہیں اس لئے کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کیساتھ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں اور چھوٹے سے بچے ہیں، پیاس لگ رہی ہے، اور ﴿وَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ﴾ جہاں بیت اللہ ہے، اردگرد ریگستان ہے، پانی کا نشان نہیں۔ تو بچے نے پیاس کے اندر تڑپنا شروع کیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے آ کر پر مارا اور زمزم کا چشمہ جاری ہو گیا آپ اسے عظمت سے پیتے ہیں ہر پانی کے لئے بیٹھ کر پینا سنت ہے، لیکن زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا سنت ہے، یہ تعظیم کی وجہ سے ہے اور فرمایا گیا حدیث میں: ''مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ'' ① ''زمزم پی کر جو دعا مانگو گے، اللہ اسے قبول کرے گا''۔

تو زمزم پینے سے پہلے کچھ اپنی مراد مانگنی چاہئے، وعدہ خداوندی ہے کہ وہ مراد عطا کی جائے گی، عام پانیوں میں یہ بات نہیں ہے، زمزم میں یہ خصوصیت ہے، اس لئے سارے مسلمان مل کر زمزم کی تعظیم کرتے ہیں زمزمیوں میں بھر کر لاتے ہیں اس کا قطرہ زمین پر گرنے نہیں دیتے کہ معظم و مشرف پانی ہے لیکن اس کے سامنے سجدہ نہیں کرتے، سجدہ کے لئے صرف ایک ہی اللہ کی ذات ہے، عظمت و تعظیم اگرچہ کی جائیگی۔

تعظیمی سجدہ...... اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی تعظیم آپ کے اوپر فرض ہے، ذرا بے عظمتی کوئی کرے گا تو اسلام سے خارج ہو جائے گا، یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نہیں، تمام ہی انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہے تو تعظیم اتنی ضروری کہ جب تک نبی کی عظمت نہ کی جائے ایمان نہیں بنتا، مگر عبادت جائز نہیں کہ نبی کو سجدہ کرنے لگیں اس کو شریعت نے ممنوع قرار دیا۔

---

① السنن لابن ماجه، كتاب المناسك، باب الشرب من زمزم ج: ۹ ص: ۱۸۲.

حدیث میں ارشاد ہے کہ: ایک دفعہ ایک صحابی حاضر ہوئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا آپ نے فرمایا: تم نے یہ کیا حرکت کی؟ عرض کیا: یارسول اللہ! یہ قیصر وکسریٰ جو روم اور فارس کے بادشاہ ہیں۔ ان کے درباری جب آتے ہیں تو ان کو سجدہ کرتے ہیں تو اللہ کا رسول اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کو سجدہ کیا جائے، اس لئے میں نے سجدہ کیا۔

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام ہے اگر میں اجازت دیتا سجدہ کرنے کی، تو عورتوں کو اجازت دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں''۔ لیکن ان کے لئے بھی ممنوع اور ناجائز ہے، اس لئے یہ حرکت کبھی نہ کی جائے نبی ہو یا غیر نبی عبادت کسی کی جائز نہیں۔ تعظیماً بھی سجدہ نہیں کر سکتے اس لئے کہ صحابہ نے تو تعظیماً ہی سجدہ کیا تھا عبادت نہیں کی تھی اس کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع قرار دیا۔ تو غیر اللہ کے سامنے عبادت کی ہیئت بھی نہیں آنی چاہئے لیکن تعظیم ضروری ہے۔

معیارِ تعظیم...... ہم حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی بھی تعظیم کریں گے، اگر اولیاء اللہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ بھی نکلے جو بظاہر شریعت کے خلاف ہو۔ تو اس کی تاویل وتوجیہ کریں گے یہ نہیں ہے کہ گستاخی یا توہین کرنے لگیں۔ تو اولیاء کی توہین جائز نہیں چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام؟ حتیٰ کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بعض کتابوں میں تحریر فرمایا کہ: ہندوؤں کے جو بڑے اور مقتدا ہیں جیسے شری گلشن جی ہیں یا شری رام چندر جی ہیں ان کا نام لے کر کبھی ان کی شان میں گستاخی نہ کرو، ممکن ہے اپنے وقت میں یہی پیغمبر اور مردان حق ہوں، اگر ہمیں سند سے معلوم ہو جاتا کہ یہ واقعی پیغمبر تھے تو ہم ان پر اسی طرح ایمان لاتے جیسے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام پر ایمان لاتے۔ مگر سند سے ثابت نہیں اور احتمال ہے کہ یہ اپنے وقت کے پیغمبر ہوں۔ اس لئے حضرت نے تحریر فرمایا۔ کہ گستاخی کا کلمہ ان کی شان میں نہ کہا جائے۔ ممکن ہے کہ وہ مردان حق ہوں۔ اور اللہ کی طرف سے شریعتیں لے کر آئے ہوں مگر جیسے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی شریعتوں میں قوم نے تغیر کر دیا، شریعت اپنی ذات کی حد تک حق تھی جو آئی، بعد میں لوگوں نے تغیر وتبدل کیا اور تحریف کی، کتابوں کے اندر ردو بدل کیا اس کا وبال قوموں پر ہے، پیغمبر اس سے بری ہیں، وہ اپنے وقت میں حق تھیں۔ تو بدلنا قوموں کا کام ہے، لیکن جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے وہ آسمان سے نازل ہوئیں ان پر ایمان لانا ضروری ہے، جن پیغمبروں کا نام بتلایا گیا ان پر اور جن کا نام نہیں بتلایا گیا ان پر بھی بالاجمال ایمان لانا ضروری ہے۔ ﴿مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ ① ''بعض وہ ہیں جن کے واقعات بیان کر دیے نام بھی لیا اور بعض وہ ہیں جن کا نام ہم نے نہیں لیا''۔ جن کا نام لے لیا ہے، ان کا نام لے کر ان پر ایمان لاؤ، اور جن کے نام نہیں لئے ان کے بارے میں یوں کہو کہ جتنے اللہ کے پیغمبر آئے ان سب پر ایمان لاتے ہیں۔

تو تعظیم اور چیز ہے عبادت اور چیز ہے، تعظیم حضرات انبیاء اور اولیاء اللہ کی بھی ہوگی اور فرض ہے علماء ربانی اور مشائخ

① پارہ: ۲۴، سورة الغافر، الآیة: ۷۸.

حقانی کی بھی تعظیم کی جائے گی مگر عبادت کسی کی نہیں کی جائیگی، عبادت صرف ایک اللہ رب العزت کی کی جائیگی کہ وہ مالک اور مختار ہے، اسی کے ہاتھ میں وجود وعدم کی باگ ڈور ہے تو انبیاء علیہم السلام جتنے بھی آتے ہیں ان سب کا دین توحید رہا ہے کہ ایک کو کرتا دھرتا مانو، کسی دوسرے کی طرف عبادت کے راستہ سے مت جھکو، تعظیم کے راستہ سے جھکو۔

اوصافِ معبودیت...... اس لئے آگ ہو یا پانی، ہوا یا مٹی۔ ہم ان کی توقیر کریں گے کہ یہ اللہ کے تبرکات ہیں، مٹی بھی اسی کا ایک عطیہ ہے جس سے ہمارے پھل اور دوسری چیزیں پیدا ہوتی ہیں، جس سے ہم خود پیدا ہوتے ہیں تو وہ ماں کی جگہ ہے، اسی لئے ایک عام مثل پھیل گئی کہ ''مادر وطن'' یعنی وہ زمین جس پر آدمی پیدا ہوا اس کو اپنی ماں کہتا ہے اور بعض روایات میں بھی یہ لفظ آتا ہے کہ زمین مثل ماں کے ہے، تو مادر وطن کا لفظ چلا، اس لئے کہ جس سے ہمارا خمیر بنا، جس سے ہمارا غذا نکلی۔ اس کو ہم ماں کی جگہ سمجھیں گے، تو اس کی توقیر کریں گے کہ اللہ کا ایک عطیہ ہے مگر اس کی عبادت نہیں کریں گے۔ آگ کو ایک عطیہ سمجھیں گے، اس کی عبادت نہیں کریں گے سردیوں میں اس کے بغیر تاپ نہیں سکتے، اسکے بغیر کھانا نہیں پک سکتا۔

اور اگر کوئی عبادت کرے گا تو میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ کیا بے عقلی کی بات ہے، اس لئے آگ کے سامنے اگر آپ جھکیں گے تو آگ کی لپٹ آئی تو سب سے پہلے اسی کو ہی جھلسائے گی جو سجدہ میں پڑا ہوا ہے، جس آگ کو یہ بھی تمیز نہیں ہے کہ یہ میرا ماننے والا پجاری ہے اس کو تو بچادوں دوسروں کو پل بھر میں ختم کردوں، جس معبود کو اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ یہ میرا عابد ہے اور یہ میرا عابد نہیں وہ عبادت کے لائق ہوگا؟ اسے دوست دشمن کی بھی پہچان نہیں۔

اسی طرح پانی میں آپ گئے آپ نے اس کی عبادت کی۔ جب موج آئے گی تو پہلے وہی ڈوبے گا جو عبادت کررہا ہے۔ اس پانی کو یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ اسے نہ ڈبوؤں یہ تو میری عبادت کررہا ہے، دوسروں کو جاکے ڈبوؤں۔ تو جس معبود کو یہ بھی تمیز نہ ہو کہ کون میرا عابد ہے اور کون نہیں؟ کون میرا مطیع ہے اور کون نہیں؟ تو وہ عبادت کے لائق ہوگا؟ عبادت کے لائق وہ ہے جو علیم وخبیر ہو: ﴿ أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ﴾ ''وہ پیدا کرنے والا ہے جو پیدا کرنے سے پہلے بھی جانتا ہے'' کہ میں کیا چیز پیدا کررہا ہوں پیدا کرنے کے بعد بھی جانتا ہے کہ میں نے کیا چیز پیدا کی۔ اس کے انجام کو بھی جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ تو اول سے لے کر آخیر تک جس کے سامنے سارا علم حاضر ہے وہی عبادت کے لائق ہے، تو سارے انبیاء علیہم السلام نے ایک ہی چیز کی تعلیم دی اور وہ توحید ہے۔

تکمیلِ توحید...... اور توحید کے لئے البتہ نبوت کا ماننا ضروری ہے۔ اس کے بغیر توحید مکمل نہیں ہوتی۔ اس واسطے کہ توحید کے معنی ہیں کہ ایک کو کرتا دھرتا مانو، ایک ہی کی رضا حاصل کرو ایک ہی کی مرضیات پر چلو، اور اس کی نامرضی چیزوں سے بچو، جس سے وہ خوش ہے اسے قبول کرو یہی دین کا حاصل نکلے گا کہ مرضیات خداوندی کے مطابق عمل کرو اور نامرضیات سے الگ رہو، جس کا حکم دیا ہے اس کو مانو جس سے روک دیا ہے اس سے بچو تو مرضی اور نامرضی کو پالینا یہی فی الحقیقت دین کی روح ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ کسی کی مرضی اس کے بتلائے بغیر سمجھ

میں نہیں آسکتی۔ دو حقیقی بھائی ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے سینے سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں تو ایک کے دل کے بات دوسرے کے دل میں نہیں آئے گی، جب تک کہ دوسرا زبان سے ظاہر نہ کرے کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں اور فلاں چیز سے ناخوش ہوں۔ تو حقیقی دو بھائی جو ایک جنس اور ایک نوع ہیں ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے ایک کے دل کی خبر دوسرے کے دل میں نہیں آتی۔ جب تک بتلانے والا خود نہ بتلائے۔ تو اللہ رب العزت جو نور مطلق ہیں اور انسان جو ظلمت محض ہے بلا بتلائے آدمی کے اندر کیسے آجائے گا جب تک وہ خود نہ بتلائے۔ تو اللہ رب العزت جو نور مطلق ہیں اور انسان جو ظلمت محض ہے وہ وراء الورراء اور یہ سافل درسافل کوئی نسبت بندے کو خدا سے نہیں، اس کی مرضیات کا علم بلا بتلائے آدمی کے اندر کیسے آجائے گا جب تک وہ خود نہ بتلائے کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں، فلاں چیز سے ناخوش ہوں فلاں چیز کو ترک کردو، اور فلاں کو اختیار کرو، یہ میرا قانون اور آرڈر ہے۔

اب ایک تو صورت یہ ہے کہ اللہ میاں خود گھر گھر کہتے پھریں کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں فلاں چیز سے ناخوش ہوں ایک ایک گھر میں خود آئے اور اطلاع دی لیکن یہ اس کی شان اقدس کے لائق نہیں، دنیا کے معمولی بادشاہ جنہیں ہم بادشاہ بناتے ہیں خود ان کی بادشاہت ذات کی نہیں ہے، ہم نے ووٹ دیا تو بادشاہ بن گئے، ووٹ نہ دیں بادشاہ نہیں۔ لیکن بادشاہ بن جانے کے بعد بادشاہ کو بھی اس سے عار آتا ہے کہ وہ رعیت کے گھر گھر جا کر اپنے قانون کو پہنچائے کہ دیکھو میں اس سے خوش ہوں اور اس سے ناخوش ہوں وہ اپنے وزیر اعظم کو مقرر کرتا ہے، وزیر اعظم گورنروں کو مقرر کرتا ہے گورنر کمشنروں کو مقرر کرتے ہیں اور تحصیلدار ایک بھنگی کو بلا کر کہتا ہے کہ منادی کردو کہ بادشاہ کا حکم یہ ہے تو پھر رعیت کے دل میں آتا ہے، تو جب دنیا کے بادشاہ جنہیں ہم ہی بناتے ہیں انہیں غیرت آتی ہے کہ گھر گھر جائیں اور قانون کی منادی کریں تو اللہ رب العزت تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کی جناب کے لائق کہاں ہے کہ وہ گھر گھر میں آ کے خود فرمائیں، وہ اپنے وزراء کو مقرر کرتا ہے وہ وزراء انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے قلوب پر اپنی وحی اتارتا ہے، وحی کے ذریعے اطلاع دیتا ہے۔

یہ میرا قانون ہے، میں یکتا اور بے مثل ہوں، وحی سے حضرات انبیاء علیہم السلام نے جان لیا کہ ہمارا مالک ایک ہے اور یہ اس کی شان ہے۔ فرمایا گیا: ﴿ اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ﴾ ① ”موسیٰ علیہ السلام کے قلب پر وحی فرمائی کہ میں اللہ ہوں۔ میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرو“۔

اپنی شان بیان فرمائی کہ: ﴿ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ۚ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴾ ② ”میری مانند کوئی نہیں، کوئی مجھ جیسا نہیں۔ نہ میرا کوئی جسم ہے نہ میرا کوئی ضد ہے نہ کوئی ند اور شریک ہے“۔ ﴿ قُلۡ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ﴾ ③ ”کہہ دو اے پیغمبر! اللہ یکتا ہے“۔ ﴿ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ﴾ ”اللہ صمد ہے“۔

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔ ② پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۱۱۔ ③ پارہ: ۳۰، سورۃ الاخلاص: ۱۔

صمد کے معنی یہ ہیں کہ سارے اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ زندگی نہیں مل سکتی جب تک ادھر رجوع نہ کرے موت نہیں آسکتی جب تک وہی موت نہ دے۔ ہم باقی نہیں رہ سکتے جب تک وہ باقی نہ رکھے۔ ہر چیز اس کے قبضہ قدرت میں ہے تو ہم اپنی موت وحیات اور حدوث و بقاء میں محتاج ہیں لیکن اللہ کسی کا محتاج نہیں اس کا وجود اپنا ہے وہ کہیں وجود مانگنے نہیں گیا۔ اس کی قدرت اپنی ہے، اس نے دوسروں سے قدرت نہیں مانگی۔ اس کا علم اپنا ہے اس نے دوسروں سے کب کہا تھا کہ مجھے علم دے دو۔

استحقاقِ عبودیت...... علم وقدرت اس کی اپنی صفات ہیں اس کے علم کا کچھ سایہ ہم پر پڑ جائے تو ہم بھی عالم کہلانے لگ جائیں، اس کی قدرت کی پرچھائیں پڑ جایں تو ہم اور آپ بھی قادر کہلانے لگ جاتے ہیں، کہ ہمیں بھی کچھ قدرت اور بس حاصل ہے، تو اصل میں قدرت والا ایک ہے، جس پر وہ اپنی قدرت کا نور فائز کر دے اس میں قدرت آجاتی ہے، جس پر اپنا علم ڈالدے وہ عالم کہلانے لگتا ہے، جس پر اپنے اخلاق کا رنگ ڈال دے وہ درویش کہلانے لگتا ہے، عطا اور جود سب اس کی طرف سے ہے خود کسی کی ذات کے اندر کچھ نہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ انسان کی ذات کوری ہے نہ اس میں علم ہے نہ قدرت ہے نہ کوئی اور کمال ہے کمالات کو قبول کرنے کی صرف استعداد اور صلاحیت ہے، مگر پیدائشی طور پر ماں کے پیٹ سے کوئی کمال لے کر نہیں آتا چناں چہ ارشاد ہے: ﴿واللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ① ”ہم نے تمہاری ماؤں کے پیٹ سے تمہیں نکالا۔ اس حالت میں کہ ذرہ برابر تم علم نہیں رکھتے تھے، پیدا شدہ بچہ مضغہ گوشت ہوتا ہے، نہ اس کو اچھے کی خبر نہ برے کی خبر، نہ سیاہ کی تمیز نہ سفید کی، کوئی امتیاز اور علم نہیں تو ماں کے پیٹ سے لاعلم پیدا ہوتا ہے“۔ یہ انسان کی ابتداء ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ انتہا کیا ہے؟ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿مَنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ ② ”انجام کار ہم تمہیں ایسی رذیل عمر کی طرف لوٹا دیتے ہیں کہ عالم ہونے کے بعد تم پھر جاہل بن جاتے ہو“۔

نوے سو برس کی عمر ہوگئی آج آنکھوں نے جواب دے دیا تو جو دیکھ کر علم حاصل ہوتا تھا اس کے راستے بند ہوگئے کانوں نے جواب دے دیا۔ ثقل سماعت پیدا ہوئی تو سن سن کے جو علم حاصل ہوتا تھا وہ راستہ ختم ہوا۔ اب کچھ حافظے میں محفوظ تھا، کچھ پہلی معلومات جمع تھیں۔ مگر پچھلی عمر میں حافظہ بھی کمزور ہو جاتا ہے تو پچھلی معلومات بھی ختم ہوئیں۔ تو اگلی معلومات کا راستہ بند ہوگیا اور پچھلی معلومات نسیان کی نذر ہوگئیں نتیجہ آگے واضح ہوگیا تو جیسے کورے آئے تھے ویسے ہی کورے چلے گئے، تو حق تعالیٰ شانہٗ نے بتلا دیا کہ تمہاری ذات میں کوئی علم نہیں جب ہم نے چاہا ڈال دیا، اور جب چاہا نکال دیا، اگر یہ چیزیں تمہاری ذات میں ہوتیں تو پیدائشی طور پر تم عالم ہوتے اور مرتے دم تک عالم رہتے لیکن ذات میں نہیں ہے تو ہماری دین سے آتی ہیں۔ غرض ہمارا وجود، علم اور قدرت سب اسکی دی

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل: الآیۃ: ۷۰۔

ہوئی ہیں۔تو اسی کے سامنے جھکیں گے جس نے دی ہیں۔دوسروں نے دی نہیں تو دوسروں کے آگے کیسے جھکیں گے؟تعظیم وتو قیرا لگ چیز ہے مگر عبادت نہیں کریں گے ذلت اختیار نہیں کریں گے،تو حق تعالٰی نے فرمایا کہ یہ سب ہماری دین ہے۔یہ انسان کی حالت ہے کہ نہ پیدائشی طور پراس میں علم ہے نہ اخلاقی کمالات ہیں،اور جتنے ہوں آخیر میں وہ بھی چھن جاتے ہیں،مثل مشہور ہے کہ بچہ اور بڑاایک بن جاتا ہے۔یعنی جیسے بچہ معصوم اور دوسروں کے ہاتھوں میں ہے وہ بھی دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔چل نہیں سکتا جب تک کوئی چلانے والا ہو، بیٹھ نہیں سکتا جب تک اس کو حرکت نہ دیں،غرض بالکل بچہ کی طرح دوسروں کے ہاتھ پڑجاتا ہے،پھراس پر معصومیت طاری ہو جاتی ہے تو واضح ہوا کہ انسان کی ذات کوری ہے،اس میں کچھ نہیں،جب انسان کی ذات کوری ہے تو انسان عبادت کے لائق نہیں بن سکتا،جواپنی ذات سے جاہل ہو وہ معبود کیسے بن جائے،معبود کی شان یہ ہے کہ وہ عالم ہو۔

جب انسان معبود نہیں بن سکتا تو اور تو تمام انسان کے نیچے ہی نیچے ہیں تو کیا جانور معبود بنیں گے جو انسان کے نیچے ہیں،کیا آگ پانی معبود بنیں گے جن کو انسان خود عدم سے نکالتا ہے،دیا سلائی کھینچی تو آگ آگئی،پاؤں سے روند دی تو آگ ختم ہوگئی تو یہ آگ معبود بنے گی؟

جب انسان معبود نہیں تو ساری چیزیں انسان کے نیچے ہی نیچے ہیں وہ انسان کی خادم ہیں وہ کیسے معبود بن سکتی ہیں؟ایک ذات سب کی معبود ہے اورا یک یہی کرتا دھرتا ہے۔یہی انبیاء علیہم السلام بھی تعلیم دیتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام ساری دنیا اور سارے ملکوں میں آئے اور ایک ہی چیز لے کر آئے۔

اختلاف مذہب کے اسباب......اورابتداء میں سارے انسان ایک ہی دین پر تھے،لیکن جوں جوں لوگوں نے اپنی عقلیں چلائیں تو دین کے اندر فتنے پیدا ہوتے گئے اگر محض اتباع کرتے کہ جو اللہ کے رسول نے لا کر دے دیا اس پر آنکھ بند کر کے چلتے،کوئی نزاع نہ ہوتا۔نزاع جب ہوتا ہے جب اوپر سے آئی ہوئی چیزوں میں آدمی عقلیں لڑائیں اور عقلی ڈھکوسلوں سے عقیدے بنانا شروع کریں یہیں سے آدمی کے اندر خلل پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔

اس طرح کبھی انتہائی محبت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی ذات سے انتہائی محبت اور عقیدت ہے اس کو اتنی بڑائی دی کہ اس کو خدائی کے درجہ تک پہنچا دیا۔کبھی انتہائی عدوات سے عقیدہ بگڑتا ہے،کہ کسی سے عداوت ہوئی کہ فلاں پر نام لے کر لعنت بھیجنی شروع کردو،نام لے کر برا کہو۔اس کا بھی ایک غلو ہے،تو کبھی غلوعداوت میں اور کبھی غلومحبت میں عقیدے بگڑتے ہیں،جیسا کہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ:''اے علی!تمہارے بارے میں بعض لوگ محبت کی وجہ سے تباہ ہوں گے اور بعض عداوت کی وجہ سے''۔

بعض لوگوں نے انتہائی محبت کی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خدا تک کہا اور کہا کہ یہ خدا کا مظہر ہیں،اور اتنی انتہائی عقیدت کی کہ ان کے سامنے جھکے جیسے خدا کے آگے،یہ غلو محبت میں ہلاک ہوئے،اور رفض کا قصہ چلا۔اور خوارج ان کی عداوت میں ہلاک ہوئے کہ ان کو مسلمان تک بھی نہ مانا،ان کا تبرا شروع کیا معاذ اللہ ان پر لعنت

بھیجنی شروع کی، تو بعض محبت میں اور بعض عداوت میں غلو سے تباہ ہوئے۔

یا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کہ نصاریٰ ان کی محبت میں تباہ ہوئے کہ ان کو اللہ کہا، اللہ کا بیٹا کہا خدائے مجسد کہا کہ ایک نورانی خدا ہے ایک جسمانی خدا ہے، نورانی خدا اوپر ہے جسمانی خدا نیچے ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ان کے لئے علم غیب اور قدرت ثابت کی اور سارے وہ اوصاف جو اللہ کے لئے ہیں ان کے لئے ثابت کئے تو غلو محبت میں عقائد تباہ کئے۔ اور یہود عداوت میں برباد ہوئے حتیٰ کہ ان کے بارے میں کہا کہ یہ وَلَدِ غَیَّا ہیں۔ بازار والے آدمی یوسف نجار سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم علیہا السلام پر انہوں نے تہمت لگائی۔

بہر حال عقائد میں ان دو چیزوں سے خلل پڑتا ہے اور کبھی عقل لڑانے سے اس لئے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی چیز ہو اس میں عقل کی گنجائش نہیں۔ مثلاً قرآن کریم یا حدیث میں فرمایا گیا کہ عذاب قبر برحق ہے اور وہ اپنی جگہ ہوتا ہے۔ اب لوگوں نے عقل لڑائی کہ ہم نے قبر کھود کر دیکھی ہمیں تو اس میں عذاب نظر آیا نہیں، وہاں تو ایک لاش پڑی ہوئی تھی وہاں نہ کوئی آگ تھی نہ سانپ نہ بچھو۔ تو ہم اس عقیدے کو کیوں مانیں، عقل لڑائی تو عقیدہ بگڑ گیا۔

حدودِ عقل...... حالانکہ یہ عمل سے بالاتر چیز ہے، وہ دوسرے عالم کی چیز ہے، لاش پڑی ہوئی ہو اور سب کچھ گزر رہا ہو ممکن ہے کہ آپ کو نظر نہ آئے۔ آپ ایک سوتے ہوئے آدمی کو دیکھیں کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے کہ میں بادشاہ بن گیا ہوں۔ تختِ سلطنت پر بیٹھا ہوا ہوں اور میرے سامنے ہزاروں غلام خدام کھڑے ہیں، اور فوجیں سلامیاں دے رہی ہیں۔ مگر آپ یہ دیکھ رہے کہ یہ پڑا ہوا سو رہا ہے، نہ وہاں حشم و خدم ہیں نہ سپاہی اور اس پر سب کچھ گزر رہی ہے مگر آپ کو نظر نہیں آ رہا۔ اس لئے کہ وہ ایک دوسرے عالم، عالم مثال سے گزر رہا ہے، روح نیند کے وقت نکل کر اس عالم میں پہنچی تو وہاں وہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ آپ کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

جب وہ خود سویا ہوا اٹھ کر بیان کرے کہ میں نے یہ خواب دیکھا آپ اس کی تصدیق کریں گے، تو خواب میں اس نے لذت و راحت بھی اٹھائی اور عزت بھی پائی آپ کو کچھ نظر نہیں آیا، مگر آپ نے یقین کیا۔ تو جیسے ایک سونے والے پر سب کچھ گزر رہی ہے مگر آپ کو کچھ نظر نہیں آتا تو حدیث میں ہے کہ: ''اَلنَّوْمُ اُخْتُ الْمَوْتِ'' ''نیند موت کی بہن ہے''۔

تو جو چیز نیند میں گزرتی ہے وہ موت کے بعد بھی گزر سکتی ہے، فرق اتنا ہے کہ قبر میں عذاب ہو رہا ہے، آپ کو ایک لاش نظر آ رہی ہے مگر اس پر سب کچھ گزر رہی ہے اس کی دوسرے کو اطلاع نہیں، جو دوسرے پر گزر رہی ہو۔

یا ایک چار پائی پر دو آدمی سو رہے ہوں، ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ میں بادشاہ بن گیا ہوں ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ سپاہی مجھے ڈنڈے مار کر جیل خانے میں لے جا رہے ہیں، ایک خواب میں ہنس رہا ہے اور ایک رو رہا ہے مگر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں جو اس پر گذر رہی ہے اس کی دوسرے کو اطلاع نہیں، جو دوسرے پر گزر رہی ہے اس کی دوسرے کو خبر نہیں حالانکہ ملے ہوئے ایک چار پائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اگر ایک قبر میں دو مردوں کو دفن

کردیں ایک اللہ کا مطیع ہے ایک مجرم ہے۔ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ قبر میں بہترین نعمتیں میرے سامنے ہیں،اور ایک دیکھ رہا ہے کہ بدترین عذاب میرے اوپر ہے اس کی اسے خبر نہیں،اس کی اسے خبر نہیں اور آپ دیکھیں گے کہ دو لاشیں پڑی ہوئی ہیں نہ نعمت ہے نہ عذاب ہے۔

جب دنیا میں اللہ نے ایک نظیر رکھ دی ہے،اس میں جب نعمتیں اور مصیبتیں گزرتی ہیں تو مرنے کے بعد اگر قبر میں راحت،اور مصیبت گزرے،عذاب اور ثواب ہو تو اس میں کون سے تعجب کی بات ہے دنیا میں اس کی نظیر موجود ہے۔لیکن اگر عقل لڑائیں گے تو عقیدہ بگڑ جائے گا،اس لئے کہ عقل کا وہاں کام نہیں۔عقل ہوا مٹی آگ پانی کے اس دار فانی میں کام کرنے کے لئے ہے یہاں کی چیزوں میں عقل چلے گی۔ یہاں کی عقل سے وہاں کی چیزوں میں کام لینے لگیں تو وہاں یہ نہیں چلے گی۔

امور غیبیہ اور عقل...... یہ بالکل ایسا ہے جیسے ترازو جو پیتل کی چھوٹی سی ہوتی ہے،اس پر سونا اور چاندی تلتا ہے۔ایک ذرا بڑی ہوتی ہے اس میں حلوئی تلتا ہے،ایک اس سے بڑی ہے اس میں ایندھن اور سوختہ تلتا ہے اور ایک اتنی بڑی ہے کہ اس میں ہزاروں ٹن کا ریل کا ڈبہ تلتا ہے کہ اس میں اتنے ٹن وزن ہے،دس ہزار ٹن کا ایک جہاز ہے اس میں ایک مشین لگی ہوئی ہے،تو کانٹا بتلا دیتا ہے کہ اتنے ہزار ٹن کا جہاز ہے،اب اگر جہاز کو کانٹے پہ تولنے لگیں تو کیا تل جائے گا؟ ایندھن تولنے کے ترازو پر آپ ریل کے ڈبے کو رکھ دیں تو کیا وہ تل جائے گا؟ حالاں کہ یہ بھی ترازو ہے وہ بھی ترازو ہے،مگر یہ ترازو سونا تولنے کی،یہ گیہوں تولنے کی اور یہ ترازو لکڑیاں تولنے کی ہے۔اور یہ ترازو ریل کا ڈبہ تولنے کی ہے ہر ترازو میں وہی چیز تلے گی جس کے لئے وہ بنائی گئی ہے،یہ نہیں ہوسکتا کہ چھوٹی ترازوؤں میں بڑی چیز تلنے لگے۔تو عقل بھی ایک ترازو ہے مگر اس میں محسوسات تولے جاتے ہیں،وجدان اور وحی بھی ایک ترازو ہے جس میں غیبی امور تولے جاتے ہیں،باطن بھی ایک ترازو ہے جس کے اندر قبر کا عذاب اور ثواب تولا جاتا ہے،اب اگر آپ آنکھ سے قبر کا عذاب اور ثواب تولنے لگیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے سونے تولنے کے کانٹے میں ریل کے ڈبے کو تولنے لگیں،وہ نہیں تلے گا بلکہ وہ ترازو ہی ختم ہو جائے گا،تو اگر عقل پر غیبی امور کا بوجھ ڈال دیا جائے تو وہ سسک کر مر جائے گی فیصلہ ان کا کیا کرے گی؟ تو آپ دنیا کی ترازو سے آخرت کی چیزیں تولنے لگیں تو وہاں عقل کیا کام کرے گی؟ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے سونے تولنے کی ترازو میں آپ لکڑی تولنے لگیں وہ نہیں تلیں گی۔بہرحال کبھی عقائد میں عقل لڑانے سے بگاڑ آتا ہے کہ عقائد غیب کی چیزیں ہیں عقل وہاں کام نہیں کرتی گویا آپ نے عقل کے کانٹے میں عقیدے کو تولنا شروع کر دیا۔

حدودِ ادراک......دنیا کے اندر آنکھ کا کام نظر ہے کہ صورتیں دیکھے اور رنگ دیکھے،آپ یوں کہیں کہ میں آنکھ سے خوشبو سونگھوں،نہیں سونگھ سکتے،اس کے لئے ناک ہی کام دے گی۔ناک خوشبو سونگھتی ہے آپ ناک کے ذریعے کسی چیز کو دیکھنا چاہیں کبھی نہیں دیکھ سکتے،کان آوازیں سنتے ہیں،آپ یوں چاہیں کہ کان سے رنگ دیکھ لوں

کبھی نہیں دیکھ سکتے، حالانکہ ایک چہرے میں یہ ساری چیزیں جمع ہیں، آنکھ، ناک، کان، گلہ ان میں انچ انچ بھر کا فاصلہ ہے مگر ایسی سدِ سکندری حائل ہے کہ آنکھ کے دائرے میں کان اور کان کے دائرے میں ناک کام نہیں کرسکتی، اپنے اپنے دائروں میں کام کرتے ہیں۔ تو عقل کا بھی ایک دائرہ ہے اور باطن کا بھی ایک دائرہ ہے اب اگر میں، گنگا کے کنارے پر بیٹھ کر معلوم کرنا چاہوں تو مجھے کیا معلوم ہوگا کہ گنگا کے اندر کیا برکت ہے، کون سے نبی آئے تھے کن کے آثار ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پتہ چل گیا۔ اس لئے کہ باطن کی آنکھ تھی ان پر منکشف ہوگیا کہ واقعی اس پانی میں کچھ برکات کے آثار ہیں، اور پیغمبروں کی طرف نسبت ہے اس لئے قوم کی قوم اس کی عظمت پر لگی ہوئی ہے۔

تو ہر چیز سے اس کے دائرے کی چیزیں تولی جاتی ہیں۔ عقل سے عقلی امور، آنکھ سے، رنگ وصورت، ناک سے خوشبو بدبو اور کان سے آوازیں۔ پھر ہر ایک کا دائرہ الگ الگ ہے۔ تو اسی طرح سے ایک دائرہ وحی خداوندی کا ہے وحی بتلاسکتی ہے کہ قبر کیسی ہے، جنت ودوزخ کیسی ہے۔ پل صراط کیسا ہے۔ میزان عمل ''جس میں اعمال تولے جائیں گے'' وہ کیسی چیز ہے۔ آپ عقل سے جاننے لگیں گے نہ سمجھ سکیں گے یہ عقل سے بالاتر چیز ہے، جو وحی سے سمجھ میں آئے گی، بہر حال ہر چیز کا ایک دائرہ ہے۔

منبعِ عقائد...... تو عقیدہ کبھی عقل سے بگڑتا ہے کہ ہے غیر عقلی چیز اس میں عقل لڑانی شروع کی تو یا سچے عقیدہ کا انکار کریں گے یا غلط عقیدہ گھڑلیں گے، دین برباد ہو جائیگا۔ اور کبھی عقیدہ غلو محبت سے بگڑتا ہے کہ اپنے اعتقاد والے بزرگوں سے اتنی محبت بڑھ جائے کہ آدمی فانی بن جائے جو وہ کہیں اسی کو آدمی شریعت سمجھ لے، جو وہ کہیں اسی کا عقیدہ بنا کے، کیوں کہ عقیدے شریعت کے ہیں ان میں اس سے بگاڑ پیدا ہوگا اور کہا جائیگا کہ عقیدے پیغمبر سے لئے جائیں گے اولیاء سے عقیدے نہیں لئے جائیں گے، علماء عقیدے بنانے والے نہیں ہیں، مشائخ عقیدہ قائم کرنے والے نہیں ہیں، مشائخ خود پابند ہیں ان عقیدوں کے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں، علماء خود ان عقائد کے پابند ہیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ نے ارشاد فرمائے عقیدہ خدا کی خبر سے بنتا ہے، علماء کے کہنے سے عقیدہ نہیں بنتا، لیکن محبت میں ان کے ہر قول وفعل کو آدمی عقیدہ بنالے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ شریعت اور دین کے اندر خلل پیدا ہوگا۔

اور کبھی غلو عداوت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی جماعت یا کسی شخص سے عداوت پیدا ہو جائے۔ ضد یا عناد پیدا ہو جائے، اچھی سے اچھی بات بھی کہیں گے، تو یہ غلط کہے گا، اس لئے کہ بدگمانی پہلے قائم کرلی۔ وہ صحیح عقیدہ بھی بیان کریں گے تو غلط کہے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ غلط عقیدے پر قائم ہو جائے گا، اور صحیح عقیدے سے محروم رہے گا تو عقائد کو بگاڑنے والی کبھی عقل ہوتی ہے کہ غیبی امور میں دخل دے۔

ضرورتِ اعتدال...... کبھی محبت کا غلو ہوتا ہے کہ بے جا محبت پیدا کرلے اور کبھی عداوت کا غلو ہوتا ہے کہ بے جا

عداوت پیدا کرلے، اس لئے شریعت نے اعتدال بتلایا۔ عربی کا ایک شعر ہے جس کا ترجمہ ہے: ''اگر کسی سے محبت کروتو اعتدال سے کرو، افراط کے ساتھ مت کرو، ممکن ہے کہ کل کو دشمنی پیدا ہو جائے کہ آج محبت میں آ کے سارے راز کھول دیئے اور کل کو ہوگئی دشمنی تو خود اس کے ہاتھ میں آگئے، جدھر چاہے تمہیں لے جا کے پٹخ دے، اب پچھتاؤ گے کہ محبت میں سارے راز میں نے کیوں کھول دیئے''۔ اور فرمایا: کہ کسی سے عداوت کروتو اعتدال سے کرو ممکن ہے کہ کل کلاں دوست بن جائے، تو عداوت میں آ کر جو برا بھلا کہا ہے کل کو تمہاری آنکھ نیچی ہوگی کہ ہم نے بہت برا بھلا کہا تو کیوں افراط وتفریط سے چلتے ہو، محبت کروتو اعتدال سے، عداوت کروتو اعتدال سے، نفس کے جذبے سے نہ محبت ہو نہ عداوت ہو، اس لئے کہ اسلام کی یہی تعلیم ہے۔

کمالِ ایمان...... چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا: ''مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰی لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِاسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ'' ''جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے، نفس اور اپنی ذات کے جذبے سے نہیں کی، رضاء خداوندی کے لئے کی، عداوت باندھی تو اللہ کے لیے باندھی، کہ یہ اللہ کا دشمن ہے، مجھے بھی اس سے عداوت ہے۔ یہ اللہ کا دوست ہے میں بھی اس سے محبت کروں، کسی کو دیا تو اللہ کی رضا کے لئے دیا اور کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے روکا۔ تو عطاء ومنع اور محبت وعداوت سب لوجہ اللہ ہوں تو اس شخص نے ایمان کامل کرلیا''۔ تو کمال ایمان یہ ہے کہ محبت اور عداوت لوجہ اللہ ہوں، ذاتی جذبہ اور غیض کا دخل نہ ہو، دینا اور لینا لوجہ اللہ ہو، محض ذاتی جذبہ نہ ہو کہ فلاں سے محبت ہوگئی تو سب دے ڈالو اور فلاں سے عداوت ہوئی تو روک لو نہیں! بلکہ یہ دیکھو کہ اللہ کے نزدیک اسے دینا پسندیدہ ہے یا نہیں۔ پسندیدہ ہوتو دو اگرچہ نفس نہ چاہئے اور اگر اللہ کے نزدیک دینا پسندیدہ نہیں تو ہرگز نہ دو، اگرچہ نفس دینا چاہے، تو اپنے نفس کو ایک طرف ڈالو، اللہ کی رضا کو مقدم رکھو، تو حاصل ایمان کا یہ ہے کہ۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ‏ ‏ ‏ ‏ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اگر آپ زندہ کریں تو آپ کی عطا ہے زندہ ہونے کو تیار ہیں اور اگر موت دیں تو میں آپ پر فدائی ہو جاؤں گا، دل آپ سے اٹک چکا ہے جو آپ کریں، جس سے آپ راضی اس سے میں راضی ہوں، تو بندے کا کام یہ ہے کہ رضاء خداوندی میں فنا ہو جائے کہ میری رضا کچھ نہیں جو رضاء ہے وہ اللہ کی ہے، میرا لینا دینا اور محبت و عداوت سب اللہ کی رضا کے تابع ہے۔

ممنونیت اِحسان...... اور خود میرے حق میں بھی نفس کے تابع نہیں ہے۔ کسی غلام سے کسی نے کہا تھا کہ تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلا دے۔ کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے کام کیا کریگا؟ جو آقا کام لے۔ اس نے کہا کہ آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا کہ اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو میں غلام ہی کیوں بنتا، میرے غلام بننے کے معنی یہ ہیں کہ اب میری مرضی بھی غلام، میرا ارادہ اور خواہش بھی غلام جو کچھ ہوگا آقا کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ وہ کھلا دیں گے تو کھالیں گے، نہیں کھلائے گا تو نہیں کھائیں گے وہ کام لے تو کام کریں گے، معطل چھوڑ دے تو

معطل ہو جائیں گے، تو ہم اپنے آقا کے تابع ہیں۔

جب ایک انسان، ایک انسان کے ذرا سے احسان کی وجہ سے اتنا تابع ہوتا ہے تو رب العزت تو سارے محسنوں سے برتر محسن ہیں جب اس کا بندہ بنیں تو بندگی کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز اس کے تابع کر دی نہ میری اپنی مرضی نہ اپنی رضا، نہ میرا اپنا ارادہ، جو کچھ ہو وہ آپ کا ہی ہے، یہ شان جب پیدا ہوگی تو کہا جائے گا کہ آج انسان میں بندگی آگئی۔ آج اس کے اندر عبدیت آئی۔

شانِ عبدیت...... اگر اپنا ارادہ اور اپنے عزائم ہیں تو پھر وہ بندہ کیا ہے؟ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے اپنے ایک مرید کو خلافت دی اور فرمایا کہ: فلاں جگہ جاؤ اور جا کر دین پھیلاؤ، رخصت ہوتے وقت اس مرید خلیفہ نے عرض کی کہ حضرت مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔

فرمایا: دو نصیحتیں کرتا ہوں: ایک خدائی کا دعویٰ نہ کرنا اور ایک نبی ہونے کا دعویٰ نہ کرنا۔

وہ حیران ہوا کہ حضرت کیا مجھ سے آپ کو یہ توقع تھی کہ میں خدائی کا دعویٰ کر دوں، آپ کا مرید اور آپ کا نائب اور خدائی کا دعویٰ کرے۔ اور کیا آپ کو یہ توقع تھی کہ میں نبی ہونے کا دعویٰ کروں گا۔ یہ تو ادنیٰ مسلمان بھی نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ آپ کا مرید اور نائب خدائی اور نبوت کا دعویٰ کرے۔

فرمایا: پہلے اس کے معنی سمجھ لو، خدا کے معنی ہیں کہ جو کچھ وہ فرمائیں وہ ہو کر رہے وہ اٹل ہے، اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، اگر کوئی بندہ یہ کہے کہ جو میں چاہوں وہی ہوگا، وہ در پردہ خدائی کا مدعی ہے، چاہے زبان کے واسطے سے نہ کہے۔

اور نبی کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو فرما دیں، وہی صدق اور حق ہے ممکن نہیں کہ نبی کا کہا ہوا غلط ہو جو آدمی یوں کہے کہ جو میں نے کہا یہی صحیح ہے، اس کے علاوہ سب غلط ہے تو وہ فی الحقیقت نبوت کا مدعی ہے، چاہے زبان سے نہ کہے، اس لئے میں نے کہا کہ نہ خدائی کا دعوی کرنا نہ نبوت کا دعویٰ کرنا۔

انسان جب یہ دعویٰ کرے کہ جو میں کہہ رہا ہوں، اٹل ہے، وہی ہوگا، یہ در پردہ خدائی کا دعویٰ ہے، جو میں کہہ رہا ہوں وہ اٹل ہے، یہ در پردہ نبوت کا مدعی ہے، اسے یوں کہنا چاہئے کہ جو اللہ نے کہا ہے وہی حق ہے، میرا کہا ہوا کوئی چیز نہیں جو اللہ کے رسول نے کہا وہی حق ہے، میرا کہا ہوا کوئی چیز نہیں، جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا میرا چاہا ہوا پورا نہیں ہو سکتا: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾

اگر یوں کہے تو ہے بندہ۔ اور اگر یوں کہے کہ میں جو چاہوں وہی ہوگا تو در پردہ خدائی کا مدعی ہے، جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے، باقی سب غلط ہے، یہ در پردہ نبوت کا دعویٰ ہے، یہ تفویض اور عبدیت کے خلاف ہے، بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جو کہا جائے یا کیا جائے وہ اس کی رضاء کے لئے ہو حتیٰ کہ ہر نقل و حرکت اس کی رضا کے لئے ہو۔ جیسے مولانا رومی نے فرمایا: ''اے اللہ اگر آپ ہمیں علم دیں اور ہم علم کے میدان میں آئیں تو آپ کے محل اور ایوان و قصر میں

داخل ہو گئے، اور اگر آپ جہالت میں رکھیں تو آپ کے جیل خانے میں داخل ہیں، آپ کے بندے علم میں لے آئیں تو آپ کے محل میں داخل ہو گئے اور اگر جیل میں لے آئیں تو آپ کے جیل خانے میں داخل ہو گئے"۔

اگر آپ سلا دیں تو ہم بے بس ہیں اور اگر آپ بیدار رکھیں تو آپ کے ہاتھ میں ہیں نہ خواب ہمارے نہ بیداری ہماری، جو کچھ دیا ہوا ہے وہ آپ کا ہے، تو بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ ادھر کا منشاء ہو اس کی آدمی تابعداری کرے۔ جب آدمی اپنی بات چلائے، عقل چلائے، غلو محبت یا غلو عداوت چلائے تو در پردہ الوہیت و نبوت کا مدعی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اللہ کے آستانے کے آگے جھکے توحید کے معنی ہی یہ ہیں کہ دل سے بھی ایک ہی کو یکتا اور کرتا دھرتا سمجھے اور عمل سے بھی ایک ہی کی طرف جھکے۔

اقسامِ توحید...... اسی لئے شریعت اسلام نے توحید دو قسم کی بتلائی ہے، ایک توحید اعتقادی یعنی اعتقاد بھی یہ کہ ایک ہی اللہ ہے جو معبود ہے، وہی علیم و خبیر ہے اور رحمٰن و رحیم، وہی آقا وہی مالک ہے، یہ عقیدہ ہے، عملاً یوں جھکایا کہ زندگی کا کوئی موڑ نہیں ہے جس میں اللہ کی طرف نہ جھکایا ہو اگر آپ سونے کے لئے لیٹیں، حدیث میں حکم ہے کہ دعاء پڑھو: "بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی". "اے اللہ! تیرے ہی نام پر مر رہا ہوں اور تیرے ہی نام پر صبح کو زندہ ہوں گا"۔ یہ بھی ایک مجازی موت ہے، اللہ کے نام پر خاتمہ ہونا چاہئے، جب آپ جاگے تو پھر شریعت متوجہ ہوئی کہ پھر اللہ کی طرف متوجہ ہوں۔ اور کہیں: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَمَآ اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ" (1) "حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے موت کے بعد پھر مجھے زندگی بخشی، اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کے جانا ہے"۔

آفتاب طلوع ہو تو فرمایا: اللہ کی طرف توجہ کرو اور یہ دعا کرو: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَلَّلَنَا الْیَوْمَ عَافِیَةً" (2) "حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے سورج کو چمکا دیا، جس نے سورج کے ذریعے ہمارے کام آسان کئے"۔ جب غروب آفتاب ہو پھر فرمایا کہ: اللہ کی طرف متوجہ ہو اور یہ پڑھو: "اَللّٰھُمَّ ھٰذَا اِقْبَالُ لَیْلِکَ وَاِدْبَارُ نَھَارِکَ وَاَصْوَاتُ دُعَاتِکَ فَاغْفِرْلِیْ" (3) "اے اللہ! تیرے سورج کے جانے کا وقت ہے اور تیری رات کے آنے کا وقت ہے اور تیرے منادی نداء کر رہے ہیں کہ دوڑو نماز کی طرف، ایسے وقت میری مغفرت فرما"۔

غرض زندگی کا کوئی موڑ آئے شریعت نے فوراً متوجہ کیا ہے، کہ توجہ الی اللہ کرو تا کہ توحید میں خلل نہ پڑے، ایسا نہ ہو کہ تم سورج کو کرتا دھرتا سمجھ لو، ایسا نہ ہو کہ تم روشن دن کو یہ سمجھ لو کہ یہ ہمارا کام چلانے والا ہے، ایسا نہ ہو کہ رات کو تم موت دینے والی سمجھ لو کہ رات آ گئی تو مر گئے سو گئے، نہ دن زندگی دیتا ہے نہ رات، جس نے رات اور دن بنائے وہی زندگی اور موت کا مالک ہے، لہٰذا بستر پر جا کر کہو: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَکَفَانَا مکم ممن لا کافی له

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب وضع الید الیمنیٰ تحت الخد الایمن، ۵/۲۳۲۷ رقم: ۵۹۵۵.

(2) عمل الیوم و اللیلة لابن سنی، ج: ۱ ص: ۲۷۷.

(3) السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب دعاء ام سلمة، ج: ۱۲، ص: ۱۴.

ولا مـؤوی" ① ''حمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے ہمیں کھلایا جس نے ہمیں پلایا جس نے ہمیں ٹھکانا دیا'' تاکہ ادھر توجہ نہ ہو کہ یہ کھانا کھانا زندگی کا بڑا سبب ہے، کھانے نے ہمیں زندہ رکھا ہے، کھانا کیا چیز ہے؟ فاقہ مست بھی زندہ رہتے ہیں، زندگی ایک اللہ کے ہاتھ میں ہے روٹی میں زندگی نہیں ہے تو روٹی کے وقت متوجہ کیا، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ روٹی کو خدا سمجھ بیٹھیں، اس کو خدا سمجھیں جس نے روٹی عطا کی، تو کھانا شروع کرو تو کہو بِسْمِ اللّٰہِ اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں، ختم کرو تو کہو "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کثیرا بہت تعریف میرے پروردگار کے لئے ہے، جس نے کھلایا۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: اگر ''بِسْمِ اللّٰہِ'' سے کھانا شروع کرے اور ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا''. پر ختم کرے ''غُفِرَلَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ'' اس کے پچھلے چھوٹے گناہ سب بخش دیئے جاتے ہیں، اس کی فضیلت بیان فرمائی۔ تو حاصل یہ ہے کہ زندگی کا کوئی موڑ ایسا نہ ہوگا جس میں توجہ الی اللہ نہ ہو۔ استنجا کیلئے جاؤ تو دعاء بتلائی گئی: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ ② ''اے اللہ! میں ناپاک چیزوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں''۔ شیطان ہو یا کچھ اور ہو میں پناہ مانگتا ہوں۔

اور جب استنجاء کر کے نکلو پھر اللہ کو یاد کرو، اور کہو۔ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ'' ③ ''حمد ہے اس اللہ کیلئے جس نے اذیت کی چیزیں مجھ سے دور کردیں اور اب میں اس کی عبادت کے لئے تیار ہوگیا اور میرے قلب میں نشاط پیدا ہوگیا''۔

تو آدمی یوں نہ سمجھ جائے کہ استنجاء کرنا درحقیقت صحت ہے، میری صحت استنجاء کے ہاتھ میں ہے، قبض ہوگی تو بیمار ہوں، قبض نہیں ہوگی تو بیمار نہیں رہا، گویا قبض وبسط کے ہاتھ میں میری زندگی ہے، تو اس سے بچانے کیلئے کہا کہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ تو سونے جاگنے، استنجاء کرنے اور فارغ ہونے میں، سورج نکلنے اور غروب ہونے میں، دن کے آنے اور جانے میں اور اسی طرح گھر کے باہر نکلنے میں بھی کہ وہاں بھی متوجہ کیا کہ اب تم کام کاج کے لئے جارہے ہو تو اللہ کی طرف توجہ کرو اور کہو: ''بِسْمِ اللّٰہِ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ. تَوَکَّلْنَا عَلَی اللّٰہِ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ'' ④ ''میں اللہ کے نام سے نکل رہا ہوں، میں اللہ پر ایمان لاچکا ہوں میں نے اللہ پر بھروسہ کرلیا ہے کہ جو کچھ پیش آئے گا، اس کی تقدیر سے پیش آئے گا، کوئی مجھے نقصان پہنچانے والا بجز ایک اللہ کے نہیں ہے''۔

اسی طرح گھر میں داخل ہوتو فوراً دعاء کرو: "بِسْمِ اللّٰہِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللّٰہِ خَرَجْنَا وَعَلَی اللّٰہِ

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب مایقول عند النوم واخذ المضجع ج:۱۳ ص: ۲۴۱. صحیح ابن حبان، کتاب الزینة والتطییب، باب آداب النوم، ج:۲۳، ص:۱۰۴.

② الصحیح للبخاری، کتاب الوضوء، باب الدعاء عند الخلاء، ج:۵، ص:۲۳۳۰.

③ سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب ما یقول اذا خرج من الخلاء، ج:۱ ص:۱۱۰، رقم:۳۰۱.

④ السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب مایقول اذا خرج من بیته، ج:۱۳، ص:۲۹۰. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح ابی داؤد، ج:۱۱ ص:۹۵ رقم ۵۰۹۵.

رَبِّنَاتَوَ كَّلْنَا". ” اللہ ہی کے نام سے ہم گھر میں داخل ہو رہے ہیں، اور اللہ ہی کے نام سے نکلیں گے، اور ہمیں تو اللہ پر بھروسہ ہے“ کسی غیر اللہ پر ہمیں بھروسہ نہیں ہے تا کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے، کہ آرام دینے والا یہ گھرانہ ہے، گھرانے آدمی سے چھنتے رہتے ہیں، آج بڑی جائیداد اور کئی گاؤں کا مالک، لیکن کل کو غریب بن گیا، تو وہ خدا نہیں ہے وہ دینے والا نہیں ہے، وہ اسباب کے درجہ میں ہے۔

غرض ہر موقع پر اللہ کی طرف توجہ کرائی ہے۔ تو ایک توحید اعتقادی ہے کہ دل میں یہ یقین رکھے کہ اللہ کی ذات اور ساری صفات یکتا ہوں، اور ایک ہی میں ہیں دوسرا اس کا مثل نہیں۔ اور دوسری عملی توحید ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں ایک ہی کی طرف متوجہ کیا ہے، فقط نماز روزے ہی میں نہیں معاشرت میں چلنے پھرنے میں، گھر آنے جانے میں مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے میں سفر میں جانے اور آنے میں بھی ہر موقع پر اللہ کی طرف توجہ کرو، یہ توحید عملی ہے تا کہ عمل کے ایک ایک گوشہ میں تم اللہ ہی کی طرف پہنچو، کسی دوسرے تک نہ جاؤ۔

اسلام کا مزاج...... تو جس دین نے ہمیں سونے جاگنے، چلنے پھرنے میں ایک ذات کی طرف متوجہ کیا تو کیا وہ دین غیر اللہ کی طرف متوجہ کرے گا کہ ہم غیر اللہ کو سجدہ کریں اور غیر اللہ سے ہم پناہ مانگیں، غیر اللہ سے ہم مرادیں مانگیں، اس دین کا یہ مزاج ہی نہیں، یہ مزاج لوگوں کی عقلوں نے پیدا کیا ہے، لوگوں کی غلو محبت اور غلو عداوت نے پیدا کیا ہے اور عقائد انہیں اسباب سے بگڑتے ہیں۔ تو جب عقیدہ کا معاملہ آئے تو ان سب چیزوں سے ہٹ کر اللہ کی طرف اور عشق رسول طرف رجوع کرو جو ارشاد خداوندی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کریں گے، ہماری عقل اور طبعیت اس قابل نہیں، تو عقائد کا مخزن قرآن کریم یا حدیث نبوی ہے جن سے عقیدہ بنتا ہے۔

عقائد صحیحہ کی پہچان...... اور قرآن کریم میں اگر خلجان پیدا ہو تو حدیث اس کی شرح ہے، حدیث کے سمجھنے میں خلجان پیدا ہو تو صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل اس کی شرح ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو چیز قبول کی اور جو ان کا عمل جاری ہوا اس سے ہم دیکھیں گے کہ اللہ کے رسول کا یہی مطلب ہے ورنہ تو سب سے اول قرآن کریم ہے اس کے بعد حدیث نبوی ہے اس کے بعد تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم ہے حدیث اور تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم سے کٹ کر قرآن کریم میں محض عقل لڑائے تو وہ ہمارا عقلی عقیدہ ہوگا، خدا کا بھیجا ہوا عقیدہ نہیں ہوگا، خدا کا بھیجا ہوا عقیدہ وہی ہے جسے خدا خود فرمائے، اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کی شرح کرے، ان کی شرح صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل و تعامل کر دے، تو اول کتاب اللہ، پھر سنت رسول اللہ پھر تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم کا درجہ ہے۔

اور اعمالِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اگر خلجان ہو پھر عام امّت کا عمل ہے، یعنی علماء امت اور ربانیوں کا عمل ہے کہ جو دین پہنچانے والے ہیں ان کا طریق عمل کیا رہا ہے؟ محدثین فقہاء، متکلمین وغیرہ یہ حضرات کس چیز پر جمے ہوئے ہیں تو اس سے عقیدہ واضح ہو جائے گا، قرآن نے اجمالاً کہا حدیث نے اس کی شرح کی، فقہ نے تفصیل کی، تعامل صحابہ نے اسے مضبوط بنایا، اور اب امت کے علماء ربانی نے اس کو موکد کر دیا، ان چیزوں سے مل کر عقیدہ بنتا

ہے،ان میں سے ایک چیز کو بھی آپ رکھ دیں، گے تو عقیدہ صحیح نہیں بنے گا،اس واسطے ضرورت پڑے گی کہ عقیدہ درست ہواور عمل درست ہو۔ خیر بات دور نکل گئی، میں کہنا کچھ اور چاہ رہا تھا، یہ بیچ میں آ گئی۔

بین الاقوامی دین کی علامت...... میں یہ عرض کرر ہاتھا کہ انبیاء علیہم السلام ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی دین لے کر آئے ہیں،اس واسطے قرآن کریم نے ہم پر واضح کیا کہ سارے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاؤ: ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ ① ”حکم ہے کہ مسلمانوں کو کہہ دو،اعلان کر دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ،اور اللہ نے جو ہم پر (قرآن وحدیث) نازل کیا،اس پر ایمان لائے،اور ابراہیم علیہ السلام پر جو صحف نازل ہوئے ان پر بھی ایمان لائے کہ وہ اپنے زمانے میں حق تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی تمام اولاد تو اس میں نبی اسرائیل کے تمام پیغمبر آ گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو نازل ہوا،اور دیگر انبیاء علیہم السلام پر جو نازل ہوا خواہ وہ کسی بھی ملک سے آئے ہوں، ہم سب پر ایمان لاتے ہیں، ہم تفریق نہیں کرتے کہ اس نبی پر ایمان لاؤ اور اس پر نہ لاؤ سب کو ہم اللہ کا فرستادہ سمجھتے ہیں“۔

ظاہر بات ہے کہ تعصب جو پیدا ہوتا ہے وہ شخصیتوں سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ میرا متبع ہے میں اسے مانتا ہوں اور یہ تمہارا متبع ہے میں اسے نہیں مانتا یہیں سے جھگڑا شروع ہوتا ہے،اور جو سارے مقتداؤں کو مانے تو جھگڑا کہاں باقی رہا؟ اسلام نے سارے مقتداؤں کو ماننا بتلایا،تو بین الاقوامی دین اسلام ہی ہوسکتا ہے اگر اسلام یوں کہے کے عرب میں جو پیغمبر آئے ہیں انہیں تو مانو، شام حجاز اور ہندوستان وسندھ میں جو آئیں انہیں مت مانو، یہ تعصب ہوتا۔ یہ بین الاقوامی دین کی علامت نہیں ہوتی، بین الاقوامی دین کے معنی یہ ہیں کہ تعصبات کی جڑ کاٹ دی جائے ،تعصب شخصیتوں سے پیدا ہوتا ہے، جب ہم ساری شخصیتوں پر ایمان لائے ہیں،تو ہندوسندھ میں کوئی بھی پیغمبر آئے ہوں، ہمیں نام معلوم ہوں یا نہ ہوں ہم بالاجمال ایمان لاتے ہیں،تو اقوام کے اندر سے غیض اور غصہ نکل جائے گا،غصہ تو جب ہو جب ہم کسی پیغمبر کو برا کہیں، وہ ہم سے لڑے گا، ہمارے پیغمبر کو برا کہے تو ہم لڑیں گے، اگر آنے والا یوں کہے کہ میں تمہارے پیغمبر کو بھی مانتا ہوں اپنا جان کر اور تم میرے پیغمبر کو بھی اپنا جان کر مانو،لڑائی ختم ہوگئی،تو پہلا تعصب شخصیتوں کا ہے،اسلام نے اس کو مٹا دیا یہ علامت ہے کہ وہ بین الاقوامی دین ہے وہ پوری دنیا کے لئے آیا ہے پوری دنیا اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی اگر وہ برا بھلا کہتا کہ فلاں جگہ کے نبیوں کو مت ماننا اور ہندوسندھ کے پیغمبروں کو مت ماننا تو سندھ وہند کی اقوام ہم سے الگ ہوتیں، ہم ان سے الگ ہوتے ،اور جب سب کو مانا تو کسی کے دل میں غیض نہیں رہا۔تو یہ بین الاقوامی دین کی علامت ہے۔اور اگر کوئی یوں کہے کہ میرے

---

① پارہ: ۱،سورۃ البقرۃ،الآیۃ:۱۳۶.

پیغمبر کو مانو اور فلاں جگہ کے پیغمبر کو مت مانو تو یہ تعصب و تنگی اور مقامیت کی علامت ہے۔

ایک یہودی سے گفتگو...... میرا افریقہ جانا ہوا تو ہمیں پرس (یعنی بٹوے) خریدنے تھے۔ اس لئے کہ ہمیں افریقہ سے حجاز مقدس جانا تھا تو احرام میں گھڑی، مسواک کاہے میں ڈالتے، کپڑا تو نہیں پہن سکتے۔ تو ہمارے میزبانوں نے کہا کہ پرس بنانے کی ایک بہت بڑی فیکٹری ایک یہودی کی ہے، وہاں انواع واقسام کے پرس بنتے ہیں آپ وہاں چلیں، بہتر سے بہتر پرس ملے گا، چناں چہ ہم وہاں پہنچے، تو ہمارے میزبانوں نے پہلے جاکے کچھ میرا تعارف کرا دیا کہ ہندوستان سے آیا ہے اور دارالعلوم دیوبند کا ذکر وغیرہ، وہ یہودی جوارب پتی تھا، وہ استقبال کے لئے باہر نکلا، بڑی آؤ بھگت کر کے اپنی فیکٹری میں لے گیا۔ خیر اس نے کہا کہ اپنے پرس پسند کر لیں، بعد میں بیٹھ کر بات چیت کریں گے، ہم نے پرس پسند کئے مگر ہم نے کہا کہ ان پرسوں میں جو ہینڈل ہے وہ چھوٹا ہے ہمیں گلے میں ڈالنے کے لئے چاہئے، اس نے کہا میں ابھی بنوائے دیتا ہوں اس نے آرڈر دیا کہ ان کا جو فیتا ہے وہ لمبا کر دو تاکہ گلے میں ڈالنے کے قابل ہو جائے وہ دیدیئے اور کہا کہ وہ بن کر آجائیں گے اتنے میں ہم آپس میں بات چیت کریں، وہ بات چیت ہوتی رہی، اس میں اس نے کہا کہ کوئی مذہب کی بات بتایئے، میں کہا کہ میں مذہب کی کیا بات بتلاؤں آپ اپنے مذہب پر ہیں میں اپنے مذہب پر ہوں۔

﴿ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴾ ① کہنے لگے: آپ کچھ کہئے۔ میں نے کہا آپ برا تو نہیں مانیں گے؟ کہنے لگا، بالکل نہیں مانوں گا۔ میں نے کہا: پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ہمارے دشمن ہیں، ہم آپ کے دوست ہیں۔ کہنے لگا: یہ کیسے؟ میں نے کہا کہ ہم تو آپ کے دوست ہیں۔ اس لئے کہ آپ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ہم ان کو اپنا پیغمبر جانتے ہیں کہ ذرہ برابر اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں گستاخی ہوئی تو آدمی اسلام سے خارج ہو جائے گا، اس لئے جو آپ کے پیغمبر ہیں وہ ہمارے پیغمبر ہیں۔ اس لئے ہم مسلمان بن نہیں سکتے جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائیں اور آپ یہودی بن نہیں سکتے جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ جھٹلائیں اور یہ نہ کہیں کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا وہ غلط تھا تو آپ انہیں جھٹلائے بغیر یہودی نہیں بن سکتے ہم تصدیق کئے بغیر مسلمان نہیں بن سکتے، تو ہم آپ کے دوست ہیں آپ ہمارے دشمن ہیں۔ اب وہ بے چارہ چپ ہو گیا۔ چپ ہو کر کہنے لگا کچھ اور کہئے۔ میں نے کہا کہ ہم ایماندار ہیں آپ بالکل ایمان سے خارج ہیں۔ کہنے لگا کہ یہ کیسے؟ میں نے کہا ایمان ماننے کا نام ہے، نہ ماننے کا نام ایمان نہیں ہے، ہم سب کو مانتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی، حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام اور سارے پیغمبروں کو بھی، آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں تو نہ ماننے والے کا ایمان نہیں ہے ماننے کا نام ایمان ہے، اس لئے آپ ایمان سے خارج ہیں ہم ایمان میں داخل ہیں۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الکافرون: ٦.

کہنے لگا: اور کچھ کہئے۔ میں نے کہا: اب رہنے دیں۔ کہنے لگا: کچھ تو کہئے۔ میں نے کہا: آپ کے اندر عداوت بھری ہوئی ہے، ہمارے اندر محبت بھری ہوئی ہے۔ اس لئے کہ ایمان محبت کا نام ہے۔ جب ہم ایمان لائے تو سارے انبیاء سے محبت رکھتے ہیں۔ آپ کے ہاں نہ ماننے کا نام ایمان ہے اور وہ عداوت کا سرچشمہ ہے، اس واسطے آپ عداوت سے بھرپور ہیں ہم محبت سے بھرپور ہیں۔

کہنے لگا! بس کافی ہوگیا، اب زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، اب میں بات چیت کرنے کو برا مانوں گا۔ تو حقیقت یہی ہے کہ ایمان ماننے کا اور محبت کا نام ہے، مومن وہی ہے جو سارے اللہ والوں کو مانے، وہ مومن نہیں ہے جو بعض انبیاء علیہم السلام کو مانے اور بعض کو نہ مانے، مومن وہی ہے جو سارے اولیائے کرام کا نام عظمت سے لے، ان کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے، بعض اولیاء کو مانے اور بعض کو نہ مانے بعض کی تکفیر کردے اور بعض کو مومن مانے، حقیقت میں یہ شخص محبت سے خالی ہے۔

بہرحال ایمان ماننے اور محبت کا نام ہے۔ اور ایمان توکل اور بھروسہ کرنے کا نام ہے، تو اللہ پر بھروسہ اور انبیاء علیہم السلام کا ماننا اور ان کی اطاعت میں سرگرم رہنا، اور اطاعت بھی اس طرح کہ عقیدہ بھی درست ہو ایک ہی کو کرتا دھرتا مانے اور عمل بھی درست ہو کہ ہر موقع پر ایک ہی کی طرف توجہ ہو۔

بین الاقوامی دین کی دوسری علامت...... اور جو کچھ میں نے عرض کیا کہ صبح کو بھی اللہ کی طرف متوجہ۔ گھر سے نکلتے وقت نماز کے وقت بھی اللہ کی طرف متوجہ۔ یہ سارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اعمال ہیں، آپ سے ہی یہ ساری دعائیں منقول ہیں کہ جب آپ گھر میں داخل ہوتے تو یہ دعاء پڑھتے اور جب گھر سے خارج ہوتے تو یہ دعاء پڑھتے مسجد میں جاتے تو یہ دعاء پڑھتے، تو مقصود اس سے یہی ہے کہ انسان کے قلب میں صرف ایک ذات سے محبت و تعلق ہونا چاہئے ایک ہی کی طرف دھیان اور لگاؤ ہو۔

اور ایک سے تعلق رکھنا جب انفرادی طور پر آسان ہے ایسے ہی اجتماعی طور پر آسان ہے ایک ہی کی ذات کی نسبت سے دنیا کے تمام انسان ایک لڑی میں آسکتے ہیں شخصیت وطن رنگ ونسل کی نسبت سے اجتماعی وحدت پیدا ہونا ممکن نہیں اور جب تک اجتماعی وحدت نہ ہو ان امور کے لحاظ سے دین بھی مختلف ہوتا رہے تو کبھی بھی دین میں بین الاقوامیت نہیں آسکتی بین الاقوامی دین وہی ہوسکتا ہے جو رنگ ونسل اور شخصیت و وطن کے بتوں کو پاش پاش کردے اور ان سب چیزوں سے وراء الوراء کسی ایسی مقدس ذات سے انسان کو جوڑے جو سب کے لئے قابل قبول ہو اور وہ ذات اقدس اللہ رب العزت کی ذات ہی ہوسکتی ہے، اللہ رب العزت کی حقیقی پہچان اسلام دیتا ہے تو اسلام ہی بین الاقوامی دین ہوسکتا ہے کوئی اور دین نہیں ہوسکتا۔

بین الاقوامی دین کی تیسری علامت...... بہرحال اسلام نے شخصی تعصب کو بھی ختم کیا اور سب کو ماننے کا حکم دیا۔ اسی طرح وطنی تعصب کو بھی ختم کیا۔ تاکہ اس کی بین الاقوامیت ہر پہلو سے واضح ہوجائے اور اس پر کوئی حرف

نہ آسکے۔ چنانچہ اگر کوئی یوں کہے کہ میرا وطن بہت عمدہ ہے تمہارا وطن گھٹیا خواہ مخواہ جذبات کو مشتعل کرتا ہے کہ میرے وطن کو برا کہہ دیا اور اپنے وطن کو اچھا کہا میری زمین کو برا کہا، اپنی زمین کو اچھا کہا۔ تو اس سے آدمی میں وطنی تعصب پیدا ہوتا ہے کہ میری زمین ایسی اور تمہاری زمین گندی۔ اس سے بھی قوموں میں لڑائیاں پیدا ہوتی ہیں، زمین کے ٹکڑے بھی لڑائیاں کرا دیتے ہیں، اس تعصب سے بھی کبھی عقیدے اور مذہب میں خلل پڑتا ہے کہ میری زمین سے جو مذہب اگا ہے وہی مذہب ہے تمہاری زمین پر جو مذہب اگا ہے وہ ہمارا مذہب نہیں ہے۔ بھلا مذہب کو بھی گیہوں چنے کی طرح پیداوار سمجھ لیا تو اس سے ایک تعصب پیدا ہوتا ہے۔

اس لئے اسلام نے ہم وطنوں کی بھی تقدیس کی، احادیث کو آپ دیکھیں یمن، شام کی مدح فرمائی گئی، حجاز کی فضیلت بیان کی گئی ہندوستان کے مناقب الگ بیان کئے ہند اور سندھ کے بارے میں بھی تعریفی کلمات فرمائے گویا ملک کی تقدیس کی اور ہر ملک کی خوبی بیان کی تو اسلام نے وطنیت کی جڑ نکال دی یہ مذہب کی تفریق کا ذریعہ بنتی تھی، جب سارے ملک ایک ہو گئے۔

ہر ملک ملکِ ما است کہ ملکِ خدائے ما است

ہر ملک ہمارا ملک ہے کہ ہمارے خدا کا ملک ہے اور خدا سب کا ایک ہے تو ہمارے سارے وطن! تو تعصب کہاں سے پیدا ہوگا؟ لڑائی کیسے پیدا ہوگی؟ تو اسلام نے جب وطنوں کی تعریف کی، معلوم ہوا اسلام بین الاقوامی مذہب ہے اور بین الاوطانی مذہب ہے ورنہ یوں کہتا کہ صاحب! عرب کی زمین میں جو فضیلت ہے نہ وہ ہندوستان میں ہے نہ یمن میں نہ شام میں، ان ملکوں کے آدمیوں سے ہمیں کوئی تعلق نہیں۔

افضلیت کا بین الاقوامی معیار...... ہم تو عرب کے لوگوں کو جانتے ہیں۔ بلکہ یہ فرمایا دیا گیا: ''لَيْسَ لِعَرَبِيِّ عَلٰى عَجَمِيِّ فَضْلٌ اِلَّا بِالدِّيْنِ وَتَقْوٰى'' ① ''کسی بھی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے، فضیلت ہے تو تقویٰ، پارسائی اور پاکدامنی سے ہے۔'' کہیں کا رہنے والا ہو جو متقی ہوگا وہ اللہ کے ہاں معظم اور مکرم ہے جو تقویٰ نہیں اختیار کرے گا خدا سے نہیں ڈرے گا، پاکدامن پارسا نہیں بنے گا وہ اللہ کے ہاں محبوب نہیں چاہے وہ عرب ہی کا رہنے والا ہو، تو وطنیت کی جڑ نکال دی، سارے وطنوں کو اپنا وطن کہا۔ یہ دلیل ہے کہ اسلام بین الاقوامی دین ہے کوئی مقامی مذہب نہیں ہے کہ ایک زمین سے نکلا تو اس زمین والوں کے لئے ہے دوسری زمین والوں کے لئے نہیں ہے، تو شخصیت کا تعصب مٹایا، وطنیت کا تعصب بھی مٹایا۔

بین الاقوامی دین کی چوتھی علامت...... کبھی رنگ سے تعصب پیدا ہو جاتا ہے جیسے افریقہ میں ہو رہا ہے کہ وہاں کالے اور گورے کی بڑی سخت تفریق ہے کالوں کی گاڑیاں الگ اور گوروں کی الگ کالوں کی بسوں میں

① مسند الحارث زوائد الهيثمي، باب التبليغ، ج: ۱، ص: ۳۴۸، رقم: ۵۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۳ ص: ۲٦٦.

گورے اور گوروں کی بسوں میں کالے نہیں بیٹھ سکتے، گوروں کے لئے عالی شان اسٹیشن ہے اور کالوں کے لئے ایک معمولی ساویٹنگ روم بنا ہوا ہے، گورے ادھر نہیں آسکتے کالے ادھر نہیں جاسکتے ہوائی اڈے پر جو اعلیٰ ترین حصہ ہے وہ گوروں کا ہے اور ایک معمولی ہال بنا ہوا ہے اس میں کالے بیٹھتے ہیں تو اس تفریق کی وجہ سے ایک خاص تعصب وہاں پیدا ہوگیا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ کالے گوروں کے اور گورے کالوں کے دشمن بنے ہوئے ہیں، کالوں کے بس میں آجائے تو گوروں کو گولی سے اڑادیں اور گوروں کے بس میں آجائے تو کالوں کو ختم کردیں تو رنگ کی وجہ سے تعصب پیدا ہوگیا۔ مگر اسلام نے اس تعصب کو مٹادیا اور ارشاد فرمایا: ''بُعِثْتُ اِلَی الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ'' ① ''میں کالے اور گورے سب کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں''

کالے بھی میرے ہیں گورے بھی میرے ہیں، جو میرے خدا کا حکم مان لے وہ میرا ہے۔ چاہے وہ کالے رنگ کا ہو چاہے وہ گورے رنگ کا ہو۔ تو گورے اور کالے رنگ کا فرق مٹایا۔ اور شخصیتوں کا فرق الگ مٹایا، یہی تو اس دین کے بین الاقوامی ہونے کی علامت ہے۔ اگر زمین کے ساتھ مقید ہوتا تو مقامی دین ہوتا، شخصیتوں کے ساتھ مُقید ہوتا تو شخصی دین ہوتا، رنگ کے ساتھ مقید ہوتا تو رنگین دین بنتا، لیکن رنگ، وطن اور شخصیتوں سے بھی بالا تر ہے تو یہ اس کی علامت ہے کہ پورے عالم کے لئے یہ مذہب ہے اس لئے یہ فرمایا گیا کہ: ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ پہلے تو یہ کہو کہ جتنے بھی انبیاء ہیں ہم سب پر ایمان لائے، ان انبیاء پر جو کتابیں نازل ہوئیں ان سب پر ہم ایمان لائے اپنے اپنے وقت میں وہ سب حق تھیں، اگر برائی پیدا کی تو اقوام نے پیدا کی، انبیاء اور کتابیں اس سے بری ہیں، تغیر اور تبدل اقوام نے کیا ہے۔ پھر یہ انبیاء علیہم السلام سارے وطنوں میں آئے جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ ② ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ﴾ ③

تو جن رسولوں پر ہم ایمان لائے، جب وہ ہر وطن میں ہیں تو سارے وطن ہمارے نزدیک مقدس ہیں، جس وطن میں پیغمبر آئے ہم کہیں گے وہ وطن ہمارے نزدیک مقدس ہے، وہاں بھی اللہ والے ہیں، جب ہم کسی وطن کو برا نہیں کہیں گے، سارے وطنوں کی خوبیاں ہمارے ذہن میں ہیں، تو معلوم ہوا کہ اسلام سارے وطنوں کے لئے ہے کسی ایک وطن کیلئے نہیں ہے وہ سارے افرادِ بنی آدم کے لئے ہے کسی ایک شخص کے لئے نہیں ہے کسی ایک قوم کے لئے نہیں ہے وہ سارے رنگوں کو اپنا کہتا ہے تو اس میں کالے گورے کی کوئی تمیز نہیں تو جس میں یہ تفریقیں مٹ جائیں، سمجھو کہ وہ مذہب بین الاقوامی ہے جہاں یہ تفریقیں موجود ہیں سمجھو کہ وہ مقامی مذہب ہے، وطنی مذہب ہے، تو کسی دوسرے کو حق نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے وطن میں جاکے داخل ہو۔ یہ حق تو بین الاقوامی مذہب کو ہے کہ وہ ساری دنیا میں پھیلے۔

بین الاقوامی دین ہونے کا معیار...... یہ میں اس لئے عرض کررہا ہوں کہ دھڑے بندی مت کرو ایک اللہ کی

---

① مسند الرویانی، حدیث ابی موسیٰ رضی الله عنه: ۱/۳۲۱ رقم ۴۸۵. حدیث صحیح ہے دیکھئے: ارواء الغلیل، اول الکتاب ج: ۱ ص: ۳۱۶. ② پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۷. ③ پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۴۷.

طرف متوجہ ہو کر یہ کوشش کرو کہ اللہ کا پیغام سند کے ساتھ ہمیں کہاں ملے گا۔ اس لئے کہ دین نقلی ہے اور نقل کے لئے روایت کی ضرورت ہے اور روایت کے لئے سند کی ضرورت ہے تو سند تلاش کرو مقصد یہ کہ سندی اور تاریخی طور پر کون سا دین پیغمبر تک پہنچتا ہے اور بیچ میں پہنچانے والوں کو، سب کو ہم پہچانتے ہوں کہ یہ اس کا راوی ہے یہ اس کا راوی تو سند کے ساتھ جو دین پیغمبر تک پہنچ جائے وہ واجب الاعتقاد ہوگا، جس کی سند نہ ہو گویا قصے اور کہانی کے طور پر آ رہا ہے، ہوسکتا ہے اس میں غلطیاں داخل ہوگئی ہوں، ہوسکتا ہے اس میں کچھ برائیاں داخل ہوگئی ہوں۔ لیکن سند کے ساتھ جو چیز آئے گی اس میں برائی نہیں آسکتی۔ قرآن کو یا حدیث کو دیکھو ایک ایک آیت کی سند پیغمبر تک پہنچی ہوئی ہے مثلاً اگر میں یوں کہوں کہ میں نے قرآن کریم حضرت قاری عبدالوحید خاں صاحب مرحوم سے حفظ کیا، انہوں نے قاری عبدالرحمٰن صاحب مرحوم سے حفظ کیا انہوں نے قاری عبداللہ صاحب مرحوم سے، قاری عبداللہ صاحب نے قاری محمود صاحب مصری سے اور قاری محمود صاحب نے اپنے استاذ سے اور اس طرح سند میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دوں پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن جبریل علیہ السلام سے پہنچا اور جبریل امین کے قلب میں حق تعالیٰ شانہ نے القاء کیا گویا ایک حافظ کی سند حق تعالیٰ شانہ تک پہنچی ہوئی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ دنیا میں شاید کوئی مذہب اس طرح سند نہیں پیش کر سکے گا، اگر انجیل والوں سے پوچھو کہ یہ انجیل کہاں سے آئی تمہارے استاذ کون ہیں، ممکن ہے ایک دو اساتذہ تک بتلا دیں۔ آگے غائب، یہودیوں سے پوچھو کہ تورات لانے والے کون ہیں راوی کون کون ہیں؟ تاریخ ندارد ہے کیا خبر کسی نے کیا تصرف کیا۔ زیادہ کیا یا کم کیا۔ جب سندی دستاویز نہیں تو تصرفات ہوسکتے ہیں تو سب سے پہلے دیکھنے کی چیز تاریخ اور سند متصل ہے کہ اللہ تک ملی ہوئی ہو تو قرآن وحدیث کے سوا ہم انصافاً کہتے ہیں کہ کوئی سند ملی ہوئی نہیں۔ اس کی رو سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انجیل بھی حق ہے۔ اگر قرآن نہ بتلائے تو ہمیں خبر نہیں تھی کہ انجیل حق ہے یا نہیں قرآن نے کہا کہ تورات حق ہے تو سند صحیح کے ساتھ معلوم ہوا کہ واقعی حق ہے۔ تو اسلام نے سند متصل کے ساتھ پیغمبروں کا پتہ دیا۔ ہم نے مانا، ایمان لائے۔

تو اصل چیز ایمان لانے کی سند ہوتی ہے۔ اگر آج حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبری ماننے کے قابل ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری زیادہ ماننے کے قابل ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ نے معجزے نازل کئے کہ ہاتھ گریبان سے نکالا تو سورج کی طرح روشن۔ اور عصا پھینک دیا تو اژدھا بن گیا اور یہ ان کی نبوت کی دلیل ہے تو اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں معجزے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے عطا کئے۔ آپ کی انگشتان مبارک سے چشمے پھوٹ پڑے اور چودہ سو آدمیوں نے اپنے مشکیزے بھر لئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارے سے چاند شق ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے لئے عرش تک پہنچایا گیا۔ پتھروں نے آپ سے سلام کیا۔ درندوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت دی کہ: "اَشْهَدُ اَنَّکَ رَسُوْلُ اللهِ" ایسی روایات سند متصل کے ساتھ اور نقل صحیح کے ساتھ موجود ہیں، جن کی سند ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا سکتے ہیں، مسلمانوں نے

پچاس ہزار آدمیوں کی جو حدیث کی روایت کرنے والے ہیں ان کی تاریخ مرتب کردی کہ یہ ان کا کیریکٹر تھا، یہ ان کا خاندان تھا، یہ ان کی نسل تھی، یہ ان کی سچ اور جھوٹ کی کیفیت تھی، ایک ایک چیز جمع کی۔ تو آج جس سند سے ہم روایت کریں گے اس سند کے ایک ایک فرد کی تاریخ بھی بیان کرسکیں گے کہ ہمارے استاد یہ تھے تو ان کی یہ شان تھی، ان کے استاد یہ تھے تو ان کا یہ کردار تھا، اسی طرح آگے سلسلہ ہے اس طور پر پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخ مرتب ہے جن سے قرآن وحدیث ہم تک پہنچا تو سب سے پہلی چیز سند و روایت ہے، تو قرآن کی سند سے بڑھ کر کوئی سند نہیں۔ اور کتابوں کی ہم سند ہی نہیں پاتے۔ قرآن حکیم کی سند کے ہر ایک کے زمانے میں لاکھوں افراد موجود ہیں، جنہوں نے قرآن کریم حفظ کیا اگر معاذ اللہ کوئی قرآن کریم کو دریا برد بھی کردے تو منٹ بھر میں پھر لکھا جائے گا ہزاروں لاکھوں حفاظ موجود ہیں: ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِىْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ① ''اللہ نے یہ آیتیں اہل علم کے سینے میں محفوظ کردی ہیں''۔

اگر صندوقوں میں قرآن محفوظ ہوتا تو صندوقوں کو دریا میں بہایا جاسکتا تھا۔ زمین میں دفن کرتے تو زمین اس کو گلا دیتی۔ ہوا میں رکھتے تو ہوا کاغذوں کو اڑا دیتی۔ اللہ نے ایسی جگہ حفاظت کی کہ نہ وہاں آگ جاسکے نہ پانی نہ مٹی اور وہ اہل علم کے قلوب ہیں، ان میں محفوظ ہے اسی طرح وہاں شیطان اور جن بھی نہیں جاسکتے، تو قرآن کی حفاظت یہ ہے کہ ایک وقت میں لاکھوں حفاظ موجود ہیں، حدیث کی حفاظت یہ ہے کہ ایک ایک ٹکڑے کے لئے اللہ کے رسول تک سند موجود ہے۔ تو اتنا مستند کلام تو معتبر نہ ہو اور جس کی کوئی سند نہ ہو وہ معتبر ہو جائے؟ اگر وہ ماننے کے قابل ہے تو سب سے پہلے یہ ماننے کے قابل ہے۔ اگر حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانا ضروری ہے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ان سے زیادہ ضروری ہے۔ جو وہاں دلائل ہیں ان سے بڑھ کر یہاں دلائل موجود ہیں اس لئے اسی دین کو اختیار کرنا چاہئے۔

فکرِ فردا...... ایسے دین کے ہوتے ہوئے ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنی موت اور آخرت دیکھ کر آخرت کو سیدھا کرے، دین کا بڑا کام یہ ہے کہ آخرت درست کرے، اس لئے کہ مرنا مجھے بھی ہے، تمہیں بھی۔ یہ سارے قصے یہیں ختم ہو جانے والے ہیں، نہ کوئی بوڑھا باقی رہے گا، نہ کوئی جوان، بالآخر اسی پروردگار کے آگے جانا ہے جس نے پیدا کیا ہے اور جہاں سے ہم آئے ہیں: ﴿وَهُوَ الَّذِىْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ﴾ ② جس نے ہماری ابتداء کی ہے اسی کی طرف ہماری انتہا بھی ہے، وہی مبدا بھی ہے وہی معاد بھی ہے وہیں سے چلے ہیں وہیں لوٹ کر جانے والے ہیں، تو جب ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ ہمیں اللہ کے آگے کھڑا ہونا ہے، ایک ایک چیز کا حساب دینا ہے، تو آدمی غور کرے اور سمجھے کہ میں وہاں کے لئے تو کچھ سامان کروں۔ اور وہاں کا سامان روٹی کا ٹکڑا تو ہے نہیں؟ وہ دین ہی ہوسکتا ہے تو دین وہ ہو جو مستند ہو سند متصل کیساتھ پیغمبر تک پہنچا ہوا ہو، جس پر آدمی یقین کرسکے کہ یہ دین ہے۔ تو غور و

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹. ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۷.

فکر کرنا ہم سب کا فرض ہے خواہ ہندو ہو یا مسلمان ہو۔ ہر ایک کو اس کے ہاں جانا ہے اور ہر ایک کو اس سے ملنا ہے۔

اور موت کا کوئی وقت ہمیں تو معلوم نہیں۔ خدا جانے کب آجائے، یہ تو اللہ ہی کے علم میں ہے۔ یہ خیال کرنا کہ ابھی تو جوانی ہے، بڑھاپا جب آئے گا دیکھی جائے گی۔ ابھی تو ہم تندرست ہیں بیماری آئے گی تو دیکھی جائے گی، کیوں کہ موت تو بیماری سے آتی ہے۔ تو بھئی! موت کے لئے نہ بڑھاپا شرط ہے نہ بیماری شرط ہے نہ بچپن شرط ہے، بوڑھے بچے جوان سبھی مرتے ہیں تندرست بھی مرتے ہیں مریض بھی مرتے ہیں۔ بعضوں کے ہارٹ فیل ہو جاتے ہیں۔ اچھے بھلے تندرست ہوتے ہیں مگر منٹ بھر میں ختم ہو جاتے ہیں تو یہ شیطانی دھوکہ ہے کہ جب بڑھاپا آئے گا توبہ کرلیں گے اور غور کرلیں گے کیا خبر ہے بڑھاپا آئے گا بھی یا نہیں؟ کیا پتہ پہلے ہی چلتے بنیں۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں جوان زیادہ مرتے ہیں۔ بوڑھے کم مرتے ہیں، زیادہ موت جوانوں کو آتی ہے بوڑھوں کو نہیں۔ اس لئے کہ آپ مجمعوں پر نگاہ ڈالیں تو بوڑھے کم نظریں پڑیں گے جوان زیادہ نظر آئیں گے، یہ اس کی علامت ہے جوان زیادہ مرتے ہیں اس لئے اگر سارے بوڑھے ہو کر مرا کرتے تو بوڑھے مجموں میں زیادہ نظر پڑتے مگر وہاں جوان زیادہ نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے تک پہنچ ہی نہیں پاتے، پہلے ختم ہو جاتے ہیں تو نوجوانوں کو زیادہ موت آتی ہے، بوڑھوں کو کم آتی ہے، بڑھاپے تک لوگ کم پہنچتے ہیں، غرض اس دھوکہ میں آپ نہ رہیں کہ جب بڑھاپا آئے گا جب سوچ لیں گے، جب بیماری آئے گی جب سوچ لیں گے، موت کی جب علامتیں شروع ہوں گی جب سوچ لیں گے۔ وہ تو یکدم آجاتی ہے، کھڑے پیر آجاتی ہے۔

درپیش منزل ...... تین پیغمبر ہیں جن کو اچانک ہی موت واقع ہوئی ہے، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت یوسف علیہم السلام تینوں کی موت اچانک ہوئی ہے تو جب انبیاء علیہم السلام اس دنیا سے اچانک گزر سکتے ہیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ ہم کس چیز پر غرہ کریں؟ بہر حال موت کے لئے ظاہری علامت ضروری نہیں کئی آدمی بیٹھے بیٹھے گزر گئے۔ ہزاروں واقعات اس قسم کے ہیں۔ اس لئے جب سب کو یہ منزل درپیش ہے تو سب کو اس کی فکر کرنی چاہئے، اور اپنے ضمیر سے سوچنا چاہئے۔

دینِ حق کی آسان پہچان ...... آدمی کا دل بڑا مخلص ہوتا ہے۔ دل منافق نہیں ہوتا۔ دل آدمی کو صحیح مشورہ دیتا ہے ادھر ادھر کے دوست غلط مشورہ بھی دے دیں مگر دل مطمئن نہیں ہوتا، جب تک آپ صحیح بات سوچ کر سامنے نہیں رکھ دیں گے اس لئے اپنے ضمیر سے سوچیں اور غور کریں کہ دینوں کے اندر واقعی کون سا دین حق ہے، سند اور روایت کے لحاظ سے کون سا دین حق ہے، تعلیمات کے لحاظ سے دیکھو تو کس کی تعلیم زیادہ ستھری، منقّٰی اور ممتاز تعلیم ہے کہ حق و باطل اس میں نکھرا ہوا ہے۔ اور جب ذہن میں آجائے اور دل گواہی دے تو فوراً آدمی کو قبول کرنا چاہئے، پھر اس پر نہ رہے کہ قوم کیا کہے گی۔ اور میرے رشتہ دار کیا کہیں گے۔ وہاں نہ رشتہ دار کام آئے گا نہ قوم کام آئے گی۔ وہاں تو اپنا دین اور عمل کام آئے گی۔ اور اللہ کے آگے تو تنہا پہنچنا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں

فرمایا گیا:﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ﴾ ① ''حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ آ گئے تم تن تنہا ہمارے پاس جیسے ہمارے پاس سے تنہا گئے تھے، کیوں کہ تمہارے پیدا ہونے میں کوئی شریک نہیں تھا۔ ہم نے تنہا بھیجا اور تم تنہا پہنچے۔ آج اسی طرح ہمارے پاس آئے ہو جیسے ہم نے پیدا کیا تھا اور جن چیزوں پر تم نے بھروسہ کر رکھا تھا، انہیں اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ جن کو تم نے دوست سمجھ رکھا تھا، کہ یہ ہمیں بخشوالیں گے۔ (ان سب کو پیچھے چھوڑ آئے ہو؟) آج ہم تمہارا کوئی سفارشی نہیں دیکھتے۔ کوئی مددگار نہیں دیکھتے، جن کو تم یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے شریک ہیں جو اللہ کے ساتھ مل کر ہمیں نجات دلائیں گے۔ آج وہ تمہارے شفیع اور سفارشی کہاں ہیں؟ وہ سب امیدیں تمہاری قطع ہو گئیں۔ اور جو کچھ تم نے سوچ رکھا تھا وہ سب گنبد سرا ہو گیا''۔

اس لئے میری گزارش یہ ہے کہ دین کے بارے میں آدمی اپنے ضمیر سے غور کرلے، اپنے دل سے مشورے اپنی موت اور اپنی آخرت کو سامنے رکھ کر سوچے یہ سامنے رکھ کر نہ سوچے کہ میرے ساتھ سامان کتنا ہے، میرے ساتھ مشورہ دینے والے کتنے ہیں؟ میرے عزیز کتنے ہیں؟ یہ کوئی نجات دلانے والے نہیں، نہ کوئی ساتھ جانے والا ہے، ضمیر ساتھ جائے گا۔ اعتقاد اور ایمان ساتھ جائیگا۔ عمل ساتھ جائے گا اسی لئے انہیں کو اپنے ساتھ رکھو۔

حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ...... حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہیں اور خلیفہ بھی ہیں، بزرگوں سے میں ہیں۔ حضرت شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تینتیس (۳۳) برس رہے وہیں تربیت پائی اور تعلیم باطن حاصل کی۔ تینتیس برس کے بعد شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ تینتیس برس میرے پاس رہے تم نے کیا حاصل کیا؟ عرض کیا کہ میں نے آٹھ مسئلے سیکھے ہیں: فرمایا کہ کل آٹھ مسئلے؟ عرض کیا جی ہاں کل آٹھ مسئلے! فرمایا کہ میرا بھی وقت ضائع کیا اپنا بھی وقت ضائع کیا۔ بندۂ خدا تینتیس برس میں کل آٹھ مسئلے؟ فرمایا: آخر وہ آٹھ مسئلے کیا ہیں؟ عرض کیا کہ:

انتخاب محبوب...... پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں نے دنیا میں دیکھا کہ ہر ایک کو کسی نہ کسی سے محبت ہے اور وہ اپنے محبوب کی فکر میں ہے کہ وہ مجھ سے راضی ہو اور میں اس سے مل جاؤں مجھ میں اور اس میں جدائی اور فراق نہ ہو۔ لیکن مرنے کے بعد یہ سارے محبوب جدا ہو جاتے ہیں۔ نہ کوئی محبوب قبر میں ساتھ جاتا ہے، جس سے محبت کی تھی نہ وہ دستگیری کرتا ہے اس واسطے میں نے قرآن کریم میں یہ دیکھا کہ عمل آدمی کے ساتھ جاتا ہے تو میں نے اعمال صالحہ کے ساتھ محبت کی، اور سب سے محبت ترک کر دی تا کہ میرا محبوب قبر میں بھی میرے ساتھ رہے اور الگ نہ ہونے پائے۔

تو ایک مسئلہ تو میں نے یہ سیکھا ہے کہ سارے محبوب چھوڑ کر ایک عمل صالح کو محبوب بنالیا ہے، اس لئے کہ کوئی

① پارہ:۷،سورۃ الانعام،الآیۃ:۹۴.

محبوب قبر میں ساتھ نہیں جائے گا، نہ بیوی نہ دوست نہ بچہ، عمل آدمی کے ساتھ جائے گا، اس لئے اس کو محبوب بنالیا اور سارے محبوبوں کو ترک کر دیا۔

تعیینِ دشمن...... دوسرا میں نے یہ دیکھا کہ دنیا میں ہر ایک کو کسی نہ کسی سے عداوت بھی ہے اور وہ اس سے بچنے کی کوشش اور فکر میں رہتا ہے۔ اور دوسرا اس کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتا ہے تو آپس میں دشمنی ٹھن جاتی ہے، لیکن سارے دشمن ایک دن ختم ہو جاتے ہیں اور پھر یہ تن تنہا رہ جائے گا، اب کس کی دشمنی سے آدمی بچے، فوج سے بچے، سپاہی سے بچے، بچھو سے بچے، سانپ سے بچے، سارے دشمن ہی دشمن ہیں تو بچنے میں مشکل ہوگی۔ ہزاروں دشمن ہیں اور آدمی کا دل ایک ہے تو بچنے کے لئے کہاں کہاں جائے؟۔ تو میں نے قرآن کریم دیکھا۔ اس میں ہے کہ: ﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ ① ''شیطان تمہارا دشمن ہے جو اخیر تک دشمنی کرے گا''۔

تو میں نے ایک سے دشمنی بنا کے سب سے دشمنی قطع کر لی، تو میں شیطان سے لڑتا ہوں اس سے لڑوں گا تو سب دشمن ختم ہو جائیں گے، ساری دشمنی کی بنیاد، شیطان ہی ہے۔ لہٰذا میری کسی سے دشمنی نہیں، کسی سے عداوت نہیں تو دوسرا مسئلہ میں نے یہ سیکھا۔

بااعتماد ذات...... تیسرا مسئلہ یہ ہے میں نے دیکھا کہ دنیا میں ہر ایک نے کسی نہ کسی پر سہارا کر رکھا ہے، کسی نے روپے پر سہارا کر رکھا ہے کہ میرے گھر میں دولت ہے جو چاہوں گا کروں گا۔ کسی نے غلّہ پر سہارا کر رکھا ہے، کسی نے حکومت پر سہارا کر رکھا ہے، کسی نے رشتہ دار پر سہارا کر رکھا ہے میں نے قرآن کریم میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ سارے سہارے ختم ہو جائیں گے صرف ایک اللہ کا سہارا ہے جو باقی رہے گا۔ ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ ② ''جو اللہ پر بھروسہ کرے اللہ اس کے لئے کافی ہے''۔

تو میں نے ایک کو سہارا بنایا، باقی سہاروں کو ترک کر دیا۔ تو یہ میں نے تیسرا مسئلہ سیکھا۔ اسی طرح سے انہوں نے اور مسائل بیان کئے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ ایک کو اپنا سہارا بنالو، ایک کو معبود بنالو، پھر اسی کی طرف جھکو، دنیا کی عداوت بھی چھوڑو، دنیا کی محبت بھی چھوڑو اگر محبت کرو تو اللہ کے لئے عداوت باندھو، تو اللہ کیلئے، جس کا مطلب یہ ہے کہ محبوب تمہارا ایک ہی ہے اور مبغوض شیطان ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دشمن سمجھو، اس سے دشمنی ٹھان لو۔ اللہ سے دوستی کر لو اور اپنے ضمیر سے فیصلہ کر لو۔ تو مطلب یہ ہے کہ دین اور آخرت کی بات آدمی کو تنہا سوچنی ہے، اس میں کوئی سہارا نہیں خود اپنے ضمیر سے فیصلہ کر لو۔ اپنے دل سے سوچ لو اور خوب چھان بین کر لو، جب حق واضح ہو جائے۔ علی الاعلان اس کو مان لو یہ نہ دیکھو کہ کون کیا کہے گا؟ کون کیا کہے گا؟ کہنے والے کہا ہی کرتے ہیں ان کی باتوں کا قطعی دھیان نہ کیا جائے، اپنے ضمیر کی آواز کو دیکھا جائے۔

صاحب دور کا اتباع مدار نجات ہے...... تو قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ: تم اپنے ایمان کو مضبوط کرو۔ ایمان کو

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۶۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۳۔

تعصبات میں دخل نہ دو۔ نہ شخصیتوں کے تعصبات کو، نہ رنگ وبو کے تعصبات کو، نہ زمین کے ٹکڑوں کے تعصبات کو نہ وطن اور قوم کے تعصبات کو، صرف ایک اللہ پر بھروسہ کرو، ایک نبی کی بات کو مانو، کہ اس دور میں صرف انہی کے ماننے میں نجات منحصر ہے، جس کا دور اور زمانہ ہوگا اسی کے ماننے پر نجات منحصر ہے۔ یا کوئی یوں کہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہوں اور نجات ہو جائے گی، یہ غلط ہے، صاحب زمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ان کا دور ہے، ان کے ماننے میں نجات ہے، دوسروں کے ماننے میں نجات نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: ''لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّالَمَا وَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِیْ'' ''آج اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہو کر آئیں گے تو میری اتباع کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔''

ان کی نجات بھی میرے ہی دین کے ماننے میں ہے۔ اس لئے کہ میں صاحب وقت اور صاحب زمان ہوں، میری شریعت کا دور دورہ ہے آج پریزیڈنٹ وقت فخر الدین علی احمد ہیں، ہندوستان کا قانون ان کے دستخطوں سے جاری ہو رہا ہے۔ آج پچھلے لوگ صدر نہیں اگر ان سے کوئی زندہ بھی ہوا اور کوئی یوں کہے کہ میں اس قانون کو مانتا ہوں جو پچھلے صدر کے زمانے میں جاری ہوا۔ اور ان کے قانون کو نہیں مانتا تو وہ باغی سمجھا جائے گا اس کو پھانسی کی سزا ہوگی، کہا جائے گا کہ آج ان کا دور ہے انہی کے قانون میں نجات ہے۔ آج کسی اور صدر کا قانون نہیں چلے گا۔

یا کوئی سابقہ صدر یوں کہے کہ میں چوں کہ پریزیڈنٹ رہ چکا ہوں اب بھی میرا وہی مقام ہے، میں چاہے کسی کی مانوں چاہے نہ مانوں۔ میں اب بھی پریزیڈنٹ ہوں، گورنمنٹ مقدمہ کرے گی کہ آج کا پریزیڈنٹ فخر الدین علی احمد ہے آج تم نہیں ہو، تمہیں ان کا اتباع کرنا پڑے گا، جو وہ قانون دیں تمہیں ماننا پڑے گا۔ اب تمہاری صدارت کا زمانہ نہیں ہے۔ تو جو صاحب دور اور صاحب زمان ہوتا ہے اس کے ماننے میں نجات منحصر ہوتی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور مبارک جب آ گیا اور آپ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ نے شریعت اور قانون لا کے رکھا تو آج نجات اسی کے ماننے میں منحصر ہے۔ آج کوئی کہے کہ میں تورات کو مانتا ہوں یا کہے انجیل کو مانتا ہوں نجات نہیں ملے گی، ان کا دور ختم ہوا۔ آج کا دور قرآن کا ہے۔ اسی کے ماننے میں نجات منحصر ہے۔ بہر حال اس آیت سے یہ مسئلہ نکلا کہ سات سو بات میں دخل مت دو ایمان قبول کرو ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ ''ہم ان میں تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں۔ ہم سب کے مطیع اور فرمانبردار ہیں''۔ ہم سب کے بارے میں تسلیم و رضا اختیار کرتے ہیں۔

انکارِ قرآن تمام کتب کے انکار کو مستلزم ہے...... اور یہ ہمیں کس نے منوایا؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے، آپ کا ماننا سب سے پہلے ہے۔ آپ کو ماننا سب کو ماننا ہے۔ قرآن کو مانا تو انجیل اور تورات کو بھی مانا۔ زبور کو بھی مانا۔ قرآن کریم کا انکار کیا تو کسی چیز کو بھی نہ مانا۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی تو سند صحیح موجود ہے اور تورات وانجیل کی سند موجود نہیں۔ یہ تو قرآن کریم نے بتلایا کہ یہ آسمانی کتابیں ہیں اس لئے قرآن کے ذریعے ان

کو بھی مانیں گے، اس لئے قرآن کریم نے فرمایا: ﴿وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾

قرآن کریم تمام کتب سماویہ کا محافظ..... قرآن کریم تمام پچھلی کتابوں کا محافظ ہے کہ ان کے اندر جو تعلیم حق ہے وہ قرآن نے جاری کر دی، اور قوموں نے جو رلا ملا دیا تھا قرآن نے اس کو نکال کر پھینک دیا۔

اس لئے ایک مسلمان جب اسلام لائے گا تو مسلمان ہونے کے بعد سچا عیسائی بنے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح معنی میں ایمان لائے گا۔ اسی طرح جو مسلم بنا وہ صحیح معنی میں موسائی بنا۔ کہ اس نے سند متصل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صحیح طور پر سمجھا۔ وہی ابراہیمی بنا وہی آدمی بھی بنا۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو مانا۔ تو سند متصل کی دنیا میں ایک ہی کتاب ہے، اس نے دنیا کی کتابوں کا تعارف کرایا، اس کا ماننا سب کا ماننا ہے اس میں داخل ہونا ساری چیزوں کو اپنے سامنے لے آنا ہے اس واسطے ہم سب کا فرض ہے کہ دین کے بارے میں تعصبات کو چھوڑ دیں۔ دین کے بارے میں اس بات کو چھوڑ دیں کہ فلاں کیا کہتا ہے، فلاں کیا کہتا ہے، خود اپنے ضمیر پر غور کریں، اور اگر ماننے کی چیز ہے تو مانیں اور برملا اس کا اظہار کریں۔

یہ چند باتیں اس آیت کی روشنی میں مجھے عرض کرنی تھیں خدا جانے کہ میں اس میں کامیاب ہوا کہ نہیں اور آیت کے سلسلہ میں جو مقاصد ہیں وہ پیش ہو سکے یا نہیں؟ مگر بہر حال جو استطاعت تھی وہ چند جملے میں نے عرض کر دیئے، خدا کرے کہ نافع ثابت ہوں۔

اور جب آیت میں آپ غور کریں گے تو یہ باتیں منکشف ہو کر آپ کے ذہن میں گھومیں گی، جتنا آپ سوچیں گے اتنا انشاء اللہ آپ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، اور اس سے اچھے نتائج اخذ کریں گے، بہر حال یہ چند باتیں میں نے عرض کر دیں، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو حق دکھلائے اور باطل کو باطل دکھلائے۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِكَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ. اَللّٰهُمَّ لَاتَنْزِعْ مِنَّا صَالِحَ مَآ اَعْطَيْتَنَا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. (آمین)

۱۴. ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ

برسبیلِ تذکرہ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا

۷۔۸ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۱۔۲۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء دارالعلوم حقانیہ کا وہ عظیم الشان سالانہ دستار بندی اجلاس منعقد ہوا۔ جو ظاہری و معنوی امتیازات و برکات کے لحاظ سے دارالعلوم کی تاریخ میں امتیازی اور افادی حیثیت سے دور رس نتائج کا حامل رہے گا۔ اپنی روایتی آب و تاب، مسلمانوں کے بے پناہ خلوص و محبت، اکابرین و عمائدین ملک و ملت کی بزرگانہ و مخلصانہ ہمدردیوں اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ حضرت حکیم الاسلام فخر الاماثل مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم کی شمولیت بابرکت نے اجلاس کی رونق افادیت اور کامیابی کو اوج کمال تک پہنچادیا۔

اللہ تعالیٰ کے بے پناہ انعامات و اکرامات ہی کا ثمرہ ہے کہ ابتداء تاسیس دارلعلوم حقانیہ سے اکابرین دیوبند و بزرگان و مشائخ عظام کی مبارک توجہات اور نیک دعائیں اس جانب مبذول ہیں اور دارالعلوم حقانیہ نے اپنے مادر علمی، گہوارہ علم و عمل مرکز عقیدت، حصن حصین اسلام دارلعلوم دیوبند کے رشتہ محبت اور وابستگی کو سعادت و فلاح کامیابی و ترقی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھا ہے، چناں چہ اس سال جب سالانہ اجلاس دستاری بندی کے لئے حضرت المخدوم المعظم قاری صاحب مرحوم کو دعوت دی گئی تو انہوں نے شرف پذیرائی بخشتے ہوئے مذکورہ تاریخیں مقرر فرما کر ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو دارالعلوم میں قدم رنجہ فرمایا۔

۲۱ اکتوبر کو فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی فرمائی اور جامع مسجد دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا، ان تقریبات میں حضرت قاری صاحب مدظلہ کے علاوہ پاکستان کے اکثر اکابر" جیسے شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتی رحمۃ اللہ علیہ حافظ الحدیث مولانا عبداللہ درخواستی، شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی، علامہ مولانا شمس الحق صاحب افغانی، مولانا محمد مفتی نعیم لدھیانوی مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا عبدالحنان صاحب ہزاردی اور بے شمار ارباب علم و فضل موجود تھے۔

۲۱۔۲۲ اکتوبر کی درمیانی رات کو حضرت مہتمم صاحب مرحوم کی وہ بہترین سحر انگیز حکیمانہ تقریر ہوئی جس نے اہل علم و فضل و ارباب فکر و فہم اور عامۃ المسلمین کے ہزاروں کے مجمع کو گھنٹوں تک یکساں محور رکھا تھا۔ ہر ہر جملہ میں حضرت حجۃ الاسلام سیدنا الامام محمد قاسم النانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے انوار و تجلیات کی جھلک اور قاسمی علوم و معارف کا شان استدلال و عقلیت نمایاں تھا، مظہر انوار قاسمیہ حضرت مہتمم صاحب مرحوم نے اپنے اس مخصوص روایتی دلکش

خطاب میں قرآن وسنت کی روشنی میں عقل ودرایت کی پختگی کے ساتھ فلسفیانہ مگر عام فہم انداز میں کائنات عالم کے اس اشرف واعلیٰ نوع مخلوقات انسان کی حقیقت اور پھر اس کے مقاصد ومنافع تخلیق اور وجوہات افضلیت اور امتیازات خصوصیت پر سیر حاصل بحث فرمائی اوراس ذیل میں بے شمار اسرار وحکم کی طرف رہنمائی کر کے فکر ونظر کے لئے ایک شاہرہ کھول دی۔

الحاد ودہریت، سائنس اور مادیت کے اس ہیجانی وطوفانی دور میں ایسے ہی استدلال، زور بیان اور تجربہ د حقائق سے مادیت اور مغربیت زدہ پریشان اذہان وافکار کو چیلنج کیا جاسکتا ہے اور گم گشتہ راہ انسانیت کو اپنی حقیقت و مقام سے شناسا کرایا جاسکتا ہے آخر علوم الٰہیہ ربانیہ کے سواوہ کون سی خوبی ہوسکتی ہے جواس ادنی وضعیف مخلوق خاکی انسان کو خلافت ربانی کے مقام جلیل پر کھڑا کرسکتی ہے؟ معارف نبوت ورسالت کے سواوہ کون سی روشنی ہے جس کو لے کرانسان ہدایت وسعادت کی بام رفیع ''نیابت نبوت'' پر فائز ہوسکتا ہے؟

انہی حقائق ومعارف کی جانب حضرت قاری صاحب موصوف نے اپنی تقریر میں ہماری رہنمائی کی ہے، بیان کی دلکشی، تقریر کی جاذبیت، مضامین کی افادیت اور جامعیت اور خود حضرت موصوف کی جامع الکمالات پر کشش شخصیت نے مجمع میں کَاَنَّ عَلٰی رُءُ وْسِهِمُ الطَّيْرَ...... کا منظر پیش کر دیا تھا۔ اور جلسہ کے اختتام کے فوراً بعد ملک کے اطراف واکناف سے اس تقریر کی مانگ شروع ہوگئی خود دارالعلوم حقانیہ نے بھی ضروری سمجھا کہ ان ارشادات کو افادۂ عام کے لئے شائع کیا جائے دوران تقریر میں بعض حضرات خصوصا برادر عزیز مکرم ومحترم مولانا شیر علی صاحب فاضل ومدرس دارالعلوم حقانیہ نے حتی الوسع بلفظہ قلم بند کرنے کی کوشش کی۔ تاہم ضبط بیان میں قدرے اجمال وکوتاہی ہونی لازمی تھی۔ جسکی وجہ سے ضروری سمجھا گیا کہ حضرت قاری صاحب مسودہ تقریر پر نظر ثانی فرمادیں، چناں چہ اسی غرض سے تیار شدہ مسودہ حضرت موصوف کی خدمت میں دیوبند بھیج دیا گیا، حضرت قاری صاحب مرحوم نے توالئی اسفار، کثرت مشاغل کے باوجود گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر مسودہ پر نظر ثانی فرمائی۔ اور توضیح تعبیرات تفصیل مضامین کے لئے خود حضرت کے الفاظ میں ''باوجود غیر معمولی مصروفیت کے رات دن لگ کر اسے مرتب کیا اور گویا سارا مسودہ از سرنو خود ہی لکھنا پڑا''۔

اس بنا پر اب یہ بصیرت افروز تقریر ایک گرانمایہ تصنیف کی حیثیت اختیار کرچکی ہے اور اگر چہ کچھ دیر سے شائع ہورہی ہے لیکن قیمتی اضافوں اور بے شمار فوائد کی بنا پر یہ تکوینی تاخیر، خیر وحسن کا موجب بن رہی ہے، رب جلیل اس علمی وتبلیغی احسان کے بدلے حضرت قاری صاحب کو تمام اہل علم اور مسلمانوں کی جانب سے اجر جزیل عطا فرماوے شَكَرَ اللهُ مَسَاعِيَهُمْ اور قارئین کو فرمان خداوندی ﴿ وَهُدُوْا اِلَى الطَّيِّبِ ﴾ الآیۃ کے مصداق زمرہ میں شامل کردے، برادر محترم مولانا سید شیر علی شاہ صاحب شکریہ کے مستحق ہیں، جن کی شبانہ روز سعی ومحنت سے یہ گنج گرانمایہ قارئین کے ہاتھ تک پہنچ رہا ہے۔ تسہیل فہم اور ترتیب مضامین کے لئے عنوانات ضروری سمجھے گئے، جو ناچیز کے

لگائے ہوئے ہیں اس لئے تعبیر مفہوم میں نقص وکوتاہی کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ کتاب کی اہمیت وعظمت کی بناء پراسے ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ کیا جائے، تاہم ناتجربہ کاری کی بناء پر پورے طور پر کامیابی نہیں ہوسکی۔دوسرے ایڈیشن میں انشاء اللہ العزیز اس کا تدارک کیا جائے گا۔یہ مجموعہ حضرت قاری صاحب کے تجویز کردہ نام ''انسانی فضیلت کا راز'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وَالْكِتَابُ يُقْرَءُ مِنْ عُنْوَانِهٖ

دادیم تراز گنج مقصود نشان ۔۔۔ گرما نرسیدیم شاید تو برسی

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَاِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ

محمد سمیع الحق كَانَ اللّٰهُ لَهٗ

دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۳ شعبان ۱۳۷۸ھ۔۱۲ فروری ۱۹۵۹ء

تہنیت (تبریک ودعوت)

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

آج بتاریخ ۶ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ احقر حسب دعوت حضرت مولانا محمد عبدالحق صاحب بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک حاضر ہوا۔ اور دارالعلوم ہی میں قیام کیا۔

آٹھ سال کے بعد اس سرچشمہ علم میں حاضری کا یہ دوسرا موقعہ ہے سن ۱۹۵۰ء میں احقر اس وقت حاضر ہوا تھا جب کہ اس مدرسہ کے لئے نہ کوئی مستقل جگہ تھی نہ مکان۔ ایک مسجد میں غریبانہ انداز سے اساتذہ وتلامذہ نے کارِ تعلیم شروع کر دیا تھا لیکن آٹھ سال کے بعد آج دارالعلوم کو اس شان سے دیکھا کہ اس کے پاس شاندار عمارت بھی ہے۔ وسیع میدان بھی ہاتھ میں ہے۔

اس کے وسیع نظم ونسق کے لئے مختلف انتظامی شعبہ جات بھی ہیں۔ شعبہ تعمیر مستقل حیثیت میں اپنا کام بھی کر رہا ہے۔ اور تعمیرات بھی روز افزوں ترقی پر ہیں۔ طلبہ کی کثرت ہے۔ اساتذہ ماہر فنون کافی تعداد میں جمع ہیں۔ ۲۶۰ طلبہ فارغ التحصیل کی دستار بندی بھی ہوئی جن میں مختلف پاکستانی علاقوں کے علاوہ کابل وقندھار کے طلبہ بھی ہیں، ایک عظیم الشان مسجد کی بنیاد بھی رکھی جارہی ہے۔ خلق اللہ کا رجوع ہے، اعتماد ہے اور وہ پورے بھروسہ کے ساتھ پروانہ وار اس شمع علم کے ارد گرد فدائیت وعقیدت کے ساتھ ہجوم کر کے آرہے ہیں۔

حتیٰ کہ مدرسہ کے جلسہ نے ایک "عظیم الشان علمی جشن" کی صورت اختیار کر لی ہے اور بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج اسے صوبہ سرحد کی سب سے بڑی اور مرکزی درسگاہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ سات سال کی مختصر مدت میں یہ ظاہری وباطنی ترقیات بجز اس کے کہ کارکنوں کے، اخلاص وللّٰہیت کا ثمرہ کہا جائے، اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ ان مخلصین میں رئیس المخلصین حضرت مولانا عبدالحق صاحب اکوڑوی ہیں جن کے اخلاص وایثار کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب سے وہ دارالعلوم دیوبند کے ایک ماہر فن استاد کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں مقیم تھے۔ تقسیم ملک کے بعد بہ مجبوری اٹک میں مقیم ہوئے اور دارالعلوم دیوبند آج تک ان کی جدائی پر نالاں ہے۔

ان کی سادہ بے لوث اور مخلصانہ طبیعت اور خدمت ہی نے اس سات سال کی قلیل مدت میں اس مکتب کو مدرسہ اور مدرسہ سے دارالعلوم بنا دیا ہے۔ اس دارالعلوم کے احاطہ میں پہنچ کر احاطہ دارالعلوم دیوبند کا شبہ ہونے لگتا ہے اور بالآخر یہ شبہ یقین میں بدل جاتا ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ حقیقتاً اس نے اپنی صورت وسیرت میں

دارالعلوم دیوبند کی صورت وسیرت کو محو کر لیا ہے اور وہ دارالعلوم دیوبند ہی بن گیا ہے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس سرچشمۂ فیض اور اس کے بانی کو اپنے فضل وکرم کے سایہ میں تا دیر قائم رکھے اور مسلمانان پاکستان کے لئے یہ مدرسہ نور ہدایت اور مینارہ روشنی ثابت ہو!

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد

محمد طیب غفرلہ
مدیر "دارالعلوم دیوبند" وارد حال اکوڑہ خٹک

انسانی فضیلت کا راز

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ .﴿ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ o قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَاعِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ o قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْبِئْھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ فَلَمَّآ اَنْبَاَھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَاتُبْدُوْنَ وَمَاکُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ o وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ.﴾ (1) صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ.

دارالعلوم کا موضوع اور مقصد...... بزرگانِ محترم! یہ اجتماع دارالعلوم حقانیہ کی طرف سے منعقد کیا گیا ہے جس میں آپ اور ہم سب اس جگہ جمع ہوئے ہیں اور دارالعلوم کا موضوع اور مقصد سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو ظلمت جہالت سے نکال کر علم کی روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے موزوں و مناسب یہی تھا کہ میں تقریر کے لئے علم ہی کا موضوع اختیار کروں اور غالباً اسی مناسبت سے اور حضرات مقررین نے بھی اپنی تقریروں میں اب تک علم ہی کا موضوع اختیار کیا ہے اور اسی موضوع پر تقریریں ہوتی رہی ہیں تا کہ علم کی ضرورت، فضیلت اور مطلوبہ تعلیم کی نوعیت پر روشنی پڑے،اسی مناسبت سے میں نے یہ آیتیں اس وقت تلاوت کی ہیں،جن میں ان مذکورہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جن میں اللہ تعالیٰ نے علم کی مطلوبہ نوعیت واہمیت بیان فرمائی ہے اور واضح فرمایا ہے کہ علوم کی لائن میں وہ کون سا علم ہے جو مطلوب اور نافع ہے؟ اور کیا اس کے آثار ہیں؟

اس وقت ان کی مختصر الفاظ میں آپ حضرات کے سامنے شرح کرنا مقصود ہے،خدا کرے آپ سمجھ سکیں،میری

(1) پارہ: ۱،سورۃ البقرۃ،الآیۃ: ۳۱،۳۴.

زبان اردو ہے اور اوپر کی کچھ طالب علمانہ بھی ہے۔ جس میں طبعی طور پر کچھ عربی الفاظ بھی آئیں گے۔ ممکن ہے کہ اس کے سمجھنے میں صوبہ سرحد کے بھائیوں کو کچھ دقت ہو۔ تاہم میں سعی کروں گا کہ زیادہ سے زیادہ سہل الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کروں، اور بات کو دلوں میں اتارنے کی کوشش کروں۔ امید ہے کہ اگر کوئی خاص لفظ یا جملہ سمجھ میں نہ آسکے تو مجموعی طور پر مطلب ضرور سمجھ میں آجائے گا۔ ورنہ اور بھی کچھ نہیں تو ثواب تو بہر حال مل جائے گا۔ جو سمجھنے پر موقوف نہیں صرف سنتے رہنے پر موقوف ہے۔

مقدمہ وتمہید...... قبل اس کے کہ میں ان آیات کی تفسیر کے متعلق کچھ عرض کروں ایک مختصر بات جو بطور مقدمہ و تمہید ہوگی، بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، جس سے آیات کے مقصد کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات کے مالک نے یہ کائنات بنائی تو اسے پوری طرح سجایا اور آراستہ بھی کیا اور اس میں طرح طرح کی ضرورتیں بھی مہیا فرمائیں۔ زمین کا فرش بنایا اور اطلاع فرمائی کہ: ﴿جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ ① اور زمین کو فرش بنایا اور فرش پر آسمان کا خیمہ تانا اور اسے ایک محفوظ چھت بنا دیا۔ چناں چہ بتلایا کہ: ﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ ''اور ہم نے بنایا آسمان کو محفوظ چھت'' اس چھت میں روشنی کے قندیل لٹکائے تا کہ اس مکان کی فضائیں روشن رہیں اور فرمایا: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا﴾ ② ''برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج رکھے اور ان میں روشن چراغ (سورج) اور روشنی بخش چاند رکھا''۔ پھر ان ستاروں کو چھت کیلئے سامان زینت بھی کر دکھایا اور اطلاع دی کہ: ﴿اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ ٍۨالْكَوَاكِبِ﴾ ③ ہم نے آراستہ کیا آسمان دنیا کو زینت سے جو ستارے ہیں۔ پھر اس فرش خاک کو بستر بنا کر ایک وسیع ترین دسترخوان بھی بنایا جس سے ہر قسم کے غلے، ترکاریاں، پھل غذائیں اور دوائیں اگائیں۔ جس سے ہر قسم کے میٹھے کھٹے نمکین اور دوسرے ذائقوں کے پھل اور دانے نکلتے چلے آتے ہیں اور مطلع فرمایا کہ: ﴿وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ﴾ ④ ''ان سبزیوں کو نمایاں کرنے اور حیات بخشنے کے لئے پانی سے بھری ہوئی ہوائیں رکھیں اور فرمایا کہ:'' ﴿وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ﴾ پھر زمین کو فرش اور خوان نعمت بنانے کے ساتھ راہ دار بھی بنایا جس میں جگہ جگہ چلنے پھرنے کے راستے رکھے اور فرمایا کہ: ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا﴾ ⑤

مقصود تخلیق کائنات...... غرض یہ کائنات ایک عظیم ترین بلڈنگ اور رفیع الشان قصر کی حیثیت سے تیار فرمائی

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲. ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۱. ③ پارہ: ۲۳، سورۃ الصافات، الآیۃ: ۶.
④ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۹. ⑤ پارہ: ۲۹، سورۃ النوح، الآیۃ: ۱۹-۲۰.

جس میں کھانے پینے، چلنے پھرنے، رہنے سہنے، سونے جاگنے اور کام کاج کرنے کے سارے سامان فراہم فرمائے، اس کائنات کی یہ ساخت اور بناوٹ کا یہ خاص انداز پکار پکار کر زبان حال سے بتا رہا ہے کہ ضروریات زندگی سے لبریز یہ مکان کسی ضرورت مند مکین کے لئے بنایا گیا ہے، خود مقصود نہیں ہے، یعنی اس میں کسی کو بسانا مقصود ہے، محض مکان بنانا مقصود نہیں اور بلاشبہ کسی ایسے مکین کو آباد کرنا مقصود ہے جو ان سامانوں کا حاجت مند بھی ہو اور اس میں ان سامانوں کو استعمال کرنے کی صلاحیت بھی ہو، تاکہ یہ سارے سامان ٹھکانے لگیں اور اس مکین سے اس مکان کی آبادی اور زینت ہو، کیوں کہ مکان مکین کے بغیر ویرانہ، وحشت کدہ اور بے رونق ہوتا ہے، سو اس عالم میں ارادی کاروبار اور اختیاری، تصرفات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بلڈنگ میں بسنے والی ذی شعور اور حساس مخلوق جو اس کائنات کو استعمال کر سکتی ہے۔ چار ہی قسم کی ہے۔

ذی شعور اور حساس مخلوق کی چار اقسام...... ایک حیوانات ہیں جن میں سینکڑوں انواع گھوڑا، گدھا، بیل، بکری، طوطا، مینا، شیر، بھیڑیا، سانپ، بچھو، چرند، پرند، درند وغیرہ ہیں۔ دوسرے جنات ہیں جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے مگر آثار سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اور بلحاظ نسل مختلف قبائل اور خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ تیسرے ملائکہ ہیں جو نوری ہونے کے سبب لطیف اور نادیدہ ہیں۔ مگر اپنے آثار کے لحاظ سے مثل دیدہ ہیں اور نر و مادہ ہونے اور نسل کشی سے بری ہیں اور چوتھے بنی نوع انسان ہیں جو زمین کے ہر خطہ میں بسے ہوئے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں، یہی چار مخلوقات ہیں، جو اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے اندر احساس و شعور رکھتی ہیں اور اس کائناتی بلڈنگ کے باشندے اور جائز وارث ہونے کی مستحق ہیں، اس زمین آسمان میں ان کے حقوق ہیں اور وہ مالک کائنات کی طرف سے ان کے حق دار بنائے گئے ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ ان کے حقوق کو پامال کرے۔ یا انہیں منافع دنیا سے بے حق کر دے۔ غذا، مکان، تن پوشی اور رہن سہن وغیرہ میں ان سب کے حقوق قائم ہیں۔ انہیں حق ہے کہ رہنے کے لئے مکان تلاش کریں۔ غذا کے لئے مناسب حال کھانا مہیا کریں۔ اندریں صورت جو بھی ان میں سے کسی کے جائز حق میں رخنہ انداز ہوگا، وہ بلاشبہ مجرم اور مستحق سزا ہوگا۔

ہر نوع کے مستقل حقوق اور اسلام میں ان کی حفاظت...... چناں چہ شریعت اسلام نے جس طرح انسانوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ اسی طرح حیوانات کے حقوق کی بھی پوری پوری حفاظت و رعایت فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک اونٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بلبلاتا ہوا حاضر ہوا۔ اس کی آنکھوں میں پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر سر رکھ دیا اور بلبلاتا رہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاؤ اس کے مالک کو، مالک حاضر کیا گیا، فرمایا یہ اونٹ تیری شکایت کر رہا ہے کہ تو اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ اس پر لادتا ہے، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ شکایت بجا ہے واقعی میں اس جرم کا مرتکب ہوں اور میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہ کروں گا۔

دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی چند مثالیں...... بعض صحابہ رضی اللہ عنہم چڑیا کے بچے پکڑ لائے اور وہ ان کے سروں پر منڈلاتی ہوئی پریشان حال اڑ رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بچے چھڑوا دیئے کہ کیوں ان کی آزادی سلب کرتے ہو اور کیوں ان کی ماں کو ستاتے ہو۔ کیڑے، مکوڑے، زمین میں سوارخ کر کے اپنے رہنے کا ٹھکانا کرتے ہیں تو احادیث میں ممانعت آئی ہے کہ کسی سوارخ کو تاک کر اس میں پیشاب مت کرو، اس میں جہاں تمہاری یہ مصلحت ہے کہ اس سوراخ سے کوئی کیڑا مکوڑا نکل کر تمہیں تکلیف نہ پہنچا دے۔ وہیں اس جانور کی بھی یہ مصلحت ہے کہ بے وجہ اس کے گھر کو خراب کر کے اسے بے گھر مت بناؤ، اور اس کے ٹھکانے کو گندہ مت کرو کہ اس کا تمہیں حق نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن مدینہ سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک دیہاتی کے یہاں ایک ہرنی بندھی ہوئی دیکھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر چلائی کہ یا رسول اللہ! یہ دیہاتی مجھے پکڑ لایا ہے اور سامنے پہاڑی میں میرے بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تھوڑی دیر کے لئے کھول دیجئے کہ میں انہیں دودھ پلا آؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو وعدہ خلافی تو نہ کرے گی! عرض کیا یا رسول اللہ! میں سچا وعدہ کرتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھول دیا اور وعدہ کے مطابق دودھ پلا کر فوراً واپس آ گئی آپ نے اس کے گلے میں وہی رسی پھر ڈال دی۔ اور اسے بدستور باندھ دیا اور پھر اس دیہاتی کو واقعہ سنا کر سفارش فرمائی کہ اسے کھول کر آزاد کر دے۔ چنانچہ اس نے کھول دیا اور وہ اچھلتی کودتی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعائیں دیتی ہوئی پہاڑ میں اپنے بچوں سے جا ملی۔

اس واقعہ سے واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے حقوق کی رعایت فرمائی جانور کی رعایت تو اس کو کھول دینے سے فرمائی، تاکہ ہرنی کی ماما کی رعایت ہو اور بچوں کو بھوکا مرتے دیکھ کر اس کا دل نہ دکھے، بچوں کی رعایت ان کی جان بچا کر فرمائی کہ وہ ضائع نہ ہوں۔ انسانی حقوق کی رعایت یہ ہوئی کہ ہرنی کو اس کے واپس ہونے پر دوبارہ باندھ دیا تاکہ واضح ہو کہ انسان کو جنگل سے جانور پکڑ لانے اور اسے پالنے یا استعمال کرنے کا حق ہے۔ جس میں رخنہ نہیں ڈالا جا سکتا اور ساتھ اس میں وفائے عہد کی بھی تعلیم ہے کہ جب جانوروں تک وفائے عہد لازم ہے تو اس عقل مند انسان پر کیوں نہ ہوگا؟

حیوانات کے حقوق...... فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ شہر کے پالتو جانوروں اور کام کاج کے حیوانات کے لئے فناءِ مصر (شہر کے قرب و جوار) میں لازمی ہے کہ کچھ زمینیں خالی چھوڑی جائیں، جن میں کھیتی باڑی کچھ نہ ہوتا کہ جانور اس میں آزادی سے چریں اور گھاس اور پانی استعمال کر سکیں اور انہیں ان کا جائز حق ملتا رہے اور ان کی آزادی برقرار رہے۔

نیک طبیعت اور پاک نہاد انسانوں نے ہمیشہ ان جانوروں کے حقوق کی رعایت کی ہے۔ ہمارے دار العلوم دیوبند کے محدث حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب کھانا کھانے کے بعد روٹیوں کے چھوٹے ٹکڑے اور کنے تو

چھتوں پر ڈلوادیتے تھے کہ یہ پرندوں کا حق ہے اور کھانے کے ذرات اور بھورے کو چیونٹیوں کے سوراخوں پر رکھوا دیتے تھے یہ ان نہتے اور ضعیف جانوروں کا حق ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جانور کا دل دکھانا، اور اسے ستانا ہرگز جائز نہیں۔ ایک نیک شخص محض اس لئے جہنم میں جھونک دیا گیا کہ اس نے بلی کو کوٹھڑی میں بند کر کے بھوکا پیاسا مار دیا تھا اور ایک فاحشہ عورت محض اس لئے جنت میں پہنچا دی گئی کہ اس نے ایک تڑپتے ہوئے پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچالی تھی۔ جیسا کہ احادیث میں اس کا تفصیل سے واقعہ آتا ہے۔

شریعت اسلام نے جانوروں کے ذبیحہ میں اس کی رعایت کا حکم دیا ہے کہ ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح مت کرو کہ اس کا دل دکھے اور وہ اپنے بنی نوع کے فرد کو ذبح ہوتے دیکھ کر دہشت سے خشک ہونے لگے، بہرحال حیوانات کے اس دنیا میں رہنے سہنے، کھانے پینے اور امن و آزادی کے حقوق ہیں، جن کی حفاظت کا حکم اور ان کے ضائع کرنے کی ممانعت ہے۔

ہاں کوئی جانور شرّی اور موذی ہو تو اسے بے شک بند کرنے یا مار دینے کے حقوق بھی دیئے گئے ہیں، سو یہ جانور ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، شریر انسان کیلئے بھی حدود و قصاص، حبس و جیل، قید و بند اور قتل و غارت وغیرہ رکھا گیا ہے۔ چناں چہ موذی جانور مثل سانپ اور بچھو کو حرم میں بھی پناہ نہیں دی گئی اور "قَتْلُ الْمُؤْذِیْ قَبْلَ الْاِیْذَاءِ" کا معاملہ رکھا گیا ہے مگر اس سے حیوانات کے حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جنات کے حقوق...... اسی طرح جنات بھی اس جہان کے باشندے ہیں، جن کے حقوق ہیں، انہیں مکان غذا اور رہنے کا حق دیا گیا ہے جسے پامال کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ جس طرح وہ ویرانوں میں رہتے ہیں ویسے ہی انہیں حق دیا گیا کہ ہمارے گھروں میں بھی بود و باش اختیار کریں، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر گھر میں بھی جنات بسے ہوئے ہیں چوں کہ وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور ہم اپنے کام میں، اس لئے ہمیں پتا نہیں چلتا کہ کوئی جن ہمارے گھر میں آباد ہے، البتہ جو بدطینت اور شری فسادی ہوتا ہے اور ہمیں ستاتا ہے تو ہم کہنے لگتے ہیں کہ فلاں گھر میں آسیب کا اثر ہے اور عاملوں کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ عملیات سے اس جن کو بند کریں یا جلا ڈالیں۔ بہرحال جب جنات بدی پر آ جائیں تو پھر ان کا مقابلہ، بلکہ مقاتلہ کی اجازت بھی دی گئی ہے۔

جنات میں مختلف صفات و مذاہب...... ورنہ جہاں تک نیک اور مومن جنات کا تعلق ہے تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ اپنے گھروں سے انہیں نکالنے کی فکر میں رہیں۔ بلکہ ان کی طاقت اور نیکی سے خود ہمیں بھی فائدہ پہنچے گا۔ رہی بدی اور ایذا رسانی، سو وہ انسان کی بھی گوارا نہیں کی گئی چہ جائیکہ جنات کی کی جاتی۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ جنات میں ہر قسم کے افراد ہیں، نیک بھی ہیں اور بد بھی ہیں۔ مسلم بھی ہیں غیر مسلم بھی، مشرک بھی ہیں یہودی و نصرانی بھی چناں چہ قرآن کریم نے اس طرف کھلا اشارہ فرمایا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جنات آسمان کے دروازوں

تک آجاسکتے تھے اور ملائکہ کی گفتگو سے وحی خداوندی کے کچھ الفاظ اچک لاتے تھے، جس میں اپنی طرف سے جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں کو سناتے اور پھر غیب دانی کے دعوے کر کے مخلوق کو اپنے دام میں پھانستے۔ حضور کی بعثت کے وقت ان کا آسمانوں کی طرف چڑھنا بند کر دیا گیا تو انہیں پریشانی ہوئی کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا ہے، جس نے ہم پر یہ بندش عائد کر دی اور یہ کون سی نئی بات ظہور میں آئی ہے، جس کی بدولت ہم پہ یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ چنانچہ کچھ جنات اس وجہ کی تلاش میں نکلے اور مشرق ومغرب میں گھومے۔ کسی نے مغرب کی راہ لی اور کسی نے مشرق کی، کسی نے شمال کو چھانا اور کسی نے جنوب کو ان میں سے ایک جماعت کا گزر مکہ میں ہوا تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھ رہے ہیں۔ اس کا طرز وانداز نرالا اور ہادیانہ دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اس ہدایت کی زد ٹھیک ہمارے شر کے اوپر ہے۔ سمجھ گئے کہ بس یہی وہ بات ہے جس سے ہم پر اور ہمارے شری افعال پر یہ پابندی عائد کر دی گئی۔ انہوں نے جا کر اپنے بھائیوں کو اطلاع دی کہ: ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ یَّهْدِیْۤ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾ ① ''ہم نے تو عجیب قسم کا کلام پڑھا ہوا سنا ہے جو نیکی کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے، سو ہم تو اس پر ایمان لائے''۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان میں کافر بھی تھے جو بعد میں ایمان لائے تو ان میں کافر ومومن کی دونوں نوع نکلیں پھر آگے فرمایا: ﴿وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا﴾ ② ''اور ہم اب ہرگز شرک نہیں کریں گے نہ آئندہ کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں گے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان میں موحد ومشرک کی تقسیم بھی تھی کچھ مشرک تھے اور کچھ موحد، آگے فرمایا: ﴿وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا﴾ ③ ''اور یقیناً ہمارے پروردگار کی شان بہت بلند ہے، اس سے کہ اس کی کوئی بیوی اور بیٹا ہو''۔ معلوم ہوا کہ ان میں بعض عیسائی بھی تھے، جو عقیدہ زوجیت اور ابنیت کے قائل تھے، آگے فرمایا: ﴿وَّاَنَّهٗ كَانَ یَقُوْلُ سَفِیْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا﴾ ④

''اور ہم میں سے بیوقوف اللہ تعالیٰ پر حد سے زیادہ جھوٹ اور افتراء باندھتے تھے''۔ معلوم ہوا کہ ان میں ملحد بھی تھے۔ جو اپنی سفاہت اور بدعقلی سے خدا پر جھوٹ باندھ کر غیر دین کو دین باور کراتے تھے، اور وحی الٰہی کے نام سے اپنے تخیلات فاسدہ پھیلانے کے عادی تھے، بہر حال اس سے واضح ہوا کہ جنات میں مختلف فرقے اور مختلف خیالات وعقائد کے افراد پائے جاتے ہیں۔ تاہم اس سے ان کے قدرتی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بدکاروں کو سزا وسرزنش کی جائے جیسے انسان کو کی جاتی ہے، لیکن ان کے حقوق کو نہیں روکا جاسکتا۔

جنات کے ساتھ رشتہ زوجیت؟...... حتی کہ ان سے زوجیت کا رشتہ بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ فقہاء میں یہ بحث ہے کہ مسلم جن عورت سے شادی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ بعض فقہاء نے اس نکاح کو جائز کہا ہے بعض نے ناجائز، جس کی نظر اس پر ہے کہ نکاح جنس سے ہوتا ہے نہ کہ غیر جنس سے، وہ یہ نکاح جائز نہیں قرار دیتے، کیوں کہ

① پارہ: ۲۹، سورة الجن، الآیة: ۱، ۲. ② پارہ: ۲۹، سورة الجن، الآیة: ۲.
③ پارہ: ۲۹، سورة الجن، الآیة: ۳. ④ پارہ: ۲۹، سورة الجن، الآیة: ۴.

یہ نکاح ایسے ہی ہوگا، جیسے آدمی بکری یا گائے سے نکاح کرے تو جانور بوجہ غیر جنس ہونے کے محلِ نکاح ہی نہیں اس لئے نکاح نہ ہوگا، اور جن کی نظر اس پر ہے کہ جنات میں شعور ہے اور وہ شریعت کے مخاطب اور احکام کے مکلّف ہیں، نیز انسانی شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ نکاح جائز قرار دیتے ہیں۔ بہر حال جنات کے مختلف حقوق ہیں، کچھ مکان کے ہیں، کچھ غذا کے حقوق ہیں۔ کچھ پڑوسی ہونے کے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ رشتہ زوجیت کے بھی ہیں۔ ان کی رعایت لازمی ہے۔

جنات کو وعظ و تبلیغ...... حدیث شریف میں آتا ہے ① کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نصیبین کے جنات کا ایک وفد آیا اور اس نے عرض کیا! یا رسول اللہ! ہمارے بھائیوں کی ایک جماعت فلاں جگہ جمع ہوئی ہے، آپ تشریف لا کر انہیں وعظ و نصیحت فرمائیں اور ان سے متعلق مسائل بیان فرمائیں ان کے کچھ سوالات بھی ہیں، جن کا حل چاہتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اس پہاڑ کے دامن میں پہنچے، جس پر جنات کا یہ جلسہ جمع ہوا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دائرہ کھینچا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس دائرہ سے باہر نہ نکلیں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ عجیب عجیب قماش کے لوگ اس دائرہ کے باہر سے گزر رہے ہیں، لیکن دائرے کے اندر نہیں آ سکتے۔ ان کی آوازیں بھی آتی تھیں، بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مجمع میں پہنچے اور وعظ فرمایا اور مسائل بتلائے، اسی میں فرمایا کہ کوئی انسان ہڈی سے استنجانہ کرے اور وجہ یہ فرمائی کہ: "فَاِنَّهَا زَادُ اِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ" "کیوں کہ یہ تمہارے جنات بھائیوں کی خوراک ہے"۔ جس سے واضح ہوا کہ ان کی غذا کے حقوق کو تلف کرنا جائز نہیں پھر حدیث ہی میں ہے کہ جب آپ لوگ ہڈی سے گوشت کھا لیتے ہیں تو یہ ہڈیاں جنات کو 'پُر گوشت' ہو کر ملتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ پہلے انسان ہڈی سے استنجاء کرتے تھے، جس پر جنات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہڈی سے استنجاء کی ممانعت فرمائی، جس سے جنات کے غذائی حقوق کی حفاظت ثابت ہوئی اور یہ کہ ہمیں ان کے حقوق تلف کرنے کا کوئی حق نہیں، اسی طرح مکانات سے بے وجہ انہیں اجاڑنا جائز نہیں جب تک کہ وہ تکلیف پہنچانا شروع نہ کریں۔

حقوقِ ملائکہ...... یہی صورت ملائکہ کی ہے وہ بھی اس مکان کے باشندے ہیں، کچھ آسمانوں میں رہتے ہیں، کچھ زمین میں، اور ان کے بھی حقوق ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ چار انگلی جگہ آسمانوں میں خالی نہیں جہاں ملائکہ نہ ہوں اور مشغولِ عبادت نہ ہوں، عالم بالا کے ملائکہ الگ ہیں اور عالم سفلی کے الگ اور جہاں وہ مقیم ہیں وہ ان کا مسکن ہے، وہاں سے انہیں تکلیف دے کر اٹھانا جائز نہیں، مثلاً ملائکہ کو نفرت ہے بدبو سے اور رغبت ہے خوشبو سے، اس لئے

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر الجن، ج: ۱۲ ص: ۲۳۶، مسند احمد، حدیث عبد اللہ بن مسعودؓ، ج: ۱، ص: ۴۵۸ رقم: ۴۳۸۱۔

ایسے مکانات جو ملائکہ کے اجتماع کے ہیں، انہیں بدبو سے آلودہ کرنا جائز نہیں، مساجد ملائکہ کے اجتماع کی جگہ ہے تو وہاں خوشبو کا مہکانا مطلوب ہے اور بدبو سے بچانا مطلوب ہے، مساجد میں بخور اور ہر خوشبویات کا جلانا شرعاً مطلوب ہے تا کہ ملائکہ کو راحت پہنچے اور پیاز کھا کر بلا منہ صاف کئے مسجد میں جانا مکروہ ہے تا کہ انہیں اذیت نہ ہو، حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھنے والوں کے لئے ملائکہ استغفار کرتے ہیں، جب تک ان کی ریاح خارج نہ ہو اور وضو نہ ٹوٹے ایسا ہوتے ہی استغفار بند ہو جاتا ہے کہ اس سے ملائکہ کو تکلیف پہنچتی ہے، اور وہ ایسے بندوں سے رخ پھیر لیتے ہیں، گویا ہم بدبو سے انہیں ان کے مکان سے اجاڑ دیتے ہیں، جس کا ہمیں حق نہیں۔

ملائکہ کی بدبو اور جھوٹ سے نفرت...... حدیث میں ہے کہ: جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے ایک خاص قسم کی بدبو پیدا ہوتی ہے، جس کی وجہ سے فرشتہ وہاں سے دور چلا جاتا ہے گویا جھوٹ کی گندگی پھیلا کر ان سے ان کا مکان چھین لیتے ہیں۔ تو آپ کو کیا حق ہے کہ جب وہ اپنی ڈیوٹی پر بھی ہوں اور اپنی مقررہ جگہ پر متمکن ہوں تو آپ ان کو بھگا دیں اور ان کی جگہ چھین لیں، البتہ جن ناپاک افراد کو پاک مکانوں میں آنے کا حق نہیں ہے، انہیں نکالا جائے تو بات انصاف کی ہوگی، جیسے حدیث میں ہے کہ جب اذان ہوتی ہے تو شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے تو اسے بھگا ہی دینا چاہئے، بہر حال اسی طرح ملائکہ کی غذا ذکر اللہ ہے، تو اس ذکر اللہ سے روکنے کی حرکت کرنا ان سے غذا چھین لینا ہے جیسے پہلے آ چکا ہے کہ گندگی پھیلانا یا غفلت کی باتیں کرنا جس سے انہیں تشویش اور اذیت ہو، بہر حال ملائکہ کے حقوق بھی جنات اور حیوانات کی طرح ہیں، جن کا تلف کرنا جائز نہیں۔

انسان کے حقوق...... چوتھی باشعور مخلوق انسان ہے تو اللہ نے اسے بھی زمین آسمان میں حقوق دیئے ہیں، کھانے کا حق، اوڑھنے کا حق، غذا کا حق، مکان کا حق، آزادی کا حق، اسے بھی حق تعالیٰ نے اس زمین پر آباد کیا ہے، پس زمین ان چاروں مخلوقات حیوان، جن، فرشتہ اور انسان کا مکان ہے، جس پر وہ آباد ہیں، ان چاروں مخلوقات سے حق تعالیٰ کا معاملہ الگ الگ ہے، حیوان سے جو معاملہ ہے الگ ہے، حیوان سے جو معاملہ ہے وہ جنات سے نہیں ہے جنات سے جو معاملہ ہے وہ ملائکہ سے نہیں، جن وملک سے جو معاملہ ہے وہ انسان سے نہیں۔ مثلاً جانوروں سے معاملہ یہ ہے کہ انہیں قابل خطاب نہیں سمجھا گیا اور کوئی امر ونہی انہیں نہیں دیا۔ کوئی قانون ان کے لئے خطابی رنگ میں نہیں اتارا گیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو کیوں کہ انہیں فہم خطاب کا مادہ ہی نہیں، نہ عقل ہے نہ فہم، اور ہے تو بہت ہی ادنیٰ جو مثل نہ ہونے کے ہے اور وہ بھی صرف اپنے مقاصد سمجھنے کے لیے ہے کہ وہ اپنی غذا رہنے کی جگہ اور دیگر ضروریات کو سمجھ سکیں اور مہیا کریں۔

حیوانات کی پیدائش سے متعلقہ مقاصد...... مگر وہ امورِ کلیہ اور اپنی تمام بنی نوع کے مفادِ کلی کو سمجھنے کیلئے کوئی اہلیت نہیں رکھتے، صرف اپنا شخصی محدود مفاد جانتے ہیں اور بس؟ سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کو فہم وعقل مل جاتا تو کیا حرج تھا؟ جواب یہ ہے کہ جن مقاصد کے لئے جانوروں کو پیدا کیا گیا ہے۔ ان میں عقل وفہم کی ضرورت ہی نہیں بلکہ

عقل حارج ہوتی ہے اور وہ مقاصد کبھی پورے نہ ہو سکتے ان سے متعلقہ مقاصد یہ ہیں، جنہیں اس آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ﴾ ① ''ہم نے چوپایوں کو پیدا کیا کہ ان میں تمہارے گرمی کا سامان ہے اور سردی دفع کرنے کی صورت مہیا ہے''۔

چناں چہ تم ان حیوانات کے اون سے گرم کپڑے ٹوپی اور کمبل وغیرہ بناتے ہو، ان کی کھالوں میں تمہارے لئے کئی قسم کے منافع ہیں، اوڑھنے کے بچھانے کے، زینت کے خیمے بنا کر رہتے سہتے اور ﴿مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ﴾ اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو، یعنی ان کے گوشت سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ﴾ ''اور تمہارے لئے ان جانوروں میں رونق و جمال کا سامان ہے کہ تم ان سے اپنے ٹھاٹھ باٹھ اور کروفر کی شانیں قائم کرتے ہو''۔ سرکاری، قومی اور گھریلو تقریبات میں ان کا جلوس نکالتے ہو۔ گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں اور خچروں پر بیش قیمت زین، قیمتی ہودے اور زریں جھولے کس کر اپنا جاہ و حشم دکھلاتے ہو جو ایک انتہائی زینت کا مظاہرہ ہے۔ ﴿وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾ ② ''اور ان کے ذریعہ تم بوجھ لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک سامان منتقل کرتے ہو جس کو تم ان کے بغیر مشقت کثیر سے بھی مشکل ہی سے منتقل کر سکتے''۔

حیوانات کو عقل وفہم سے محروم رکھنے کی حکمت...... ان منافع اور حیوانات کے ان خلقی مقاصد پر غور کرو۔ تو ان کے لئے فہم و عقل کی ضرورت نہ تھی، بلکہ عقل ان میں حارج ہوتی کیوں کہ اگر ان میں عقل ہوتی تو جب انسان ان پر سوار ہوتا، زین رکھتا، یا بوجھ لادتا تو عقل مند جانور کہتا کہ ذرا ٹھہریئے پہلے یہ ثابت کیجئے کہ آپ کو مجھ پر سواری کرنے یا بوجھ لادنے کا حق ہے یا نہیں؟ اب آپ دلائل بیان کرتے وہ اپنی عقل کے مطابق آپ سے بحث کرتا، تو سواری اور بوجھ تو رہ جاتا بحث چھڑ جاتی، اور اگر کہیں بحث میں جانور غالب آجاتا تو آپ کھڑے منہ تکتے رہ جاتے، بلکہ ممکن ہو جاتا کہ وہی آپ پر سواری کرتا، ظاہر ہے کہ یہ بڑی مشکل بات ہوتی، ہر حیوان سے کام لیتے وقت یہی مناظرہ بازی کا بازار گرم رہتا نہ بیل کھیت جوت سکتا، نہ گھوڑے سواری لے جاسکتے نہ حلال جانوروں کا گوشت کھایا جاسکتا، سارے کام تجارت وغیرہ کے معطل ہو جاتے اور انسان کو ان حیوانوں کے مناظروں سے کبھی بھی فرصت نہ ملتی اور یہ ساری خرابی حیوانوں کو عقل و فہم ملنے سے ہوئی پھر آپ کی تعلیم گاہوں میں بھی وہ علم حاصل کرنے جمع ہوتے اور ایک ہی کلاس میں گھوڑے، گدھے کتے سب جمع رہتے، بلکہ جنگلوں سے شیر، بھیڑیئے، ریچھ، گیدڑ بھی جمع ہوتے ،تو آپ کو علم حاصل کرنا وبال جان بن جاتا، غرض علمی اور عملی کارخانے سب کے سب درہم برہم ہو جاتے اس لئے شکر کیجئے کہ اللہ نے انہیں عقل وفہم نہیں دیا۔ جن سے آپ کے کام کاج چل رہے ہیں۔

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۵-۶۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۔

بے عقلی بھی نعمت ہے......اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح عقل نعمت ہے، اسی طرح بے عقلی بھی نعمت ہے، حیوانات کی بے عقلی ہی سے انسان فائدہ اٹھارہا ہے، حتی کہ جو انسان بے عقل اور بے وقوف ہیں وہ عقلمندوں کے محکوم ہیں۔ جس سے لیڈروں کی حکمرانی چل رہی ہے بے وقوف نہ ہوتے تو لیڈروں کو غذا نہ ملتی، اگر بے فہم نہ ہوتے تو لیڈری کی دکان نہ چل سکتی۔ پس کہیں عقل نعمت ہے تو کہیں بے عقلی نعمت ہے، اس لئے جانوروں میں مادہ عقل نہ ہونا ہی نعمت ہے جس سے ان سے مختلف قسم کے کام بلا بحث ومجادلہ نکال لئے جاتے ہیں۔ ورنہ اگر ان میں عقل ہوتی تو یہ تمام منافع جو انسان ان سے لیتا ہے، پامال ہو جاتے۔ حاصل یہ نکلا کہ جانوروں کی پیدائش سے جو مقاصد متعلق ہیں۔ ان میں عقل کی ضرورت نہ تھی اس لئے ان کو ان کے فرائض کی وجہ سے بے سمجھ رکھا گیا تا کہ وہ انسان کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں اور جب عقل وفہم ان کو نہیں دیا گیا تو ان سے خطاب کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی کہ ان کے لئے کوئی شرعی قانون اتارا جاتا اور وہ مخاطب اور مکلف بنائے جاتے، پس ان کے لئے نہ امر ہے نہ نہی نہ شریعت آئی نہ کوئی تشریعی قانون صرف لاٹھی اور ڈنڈا ہے جس سے وہ کام پر لگے رہیں اور لگے رہتے ہیں، اور روز وشب مشغول ومنہمک ہیں۔

ملائکہ کو خطابِ خدا کی نوعیّت ...... ملائکہ کو خطاب تو کیا مگر خطاب تکلیفی نہیں کیا کہ فلاں کام کرو اور فلاں کام نہ کرو بلکہ خطاب تشریفی کیا جو اعزازی اور تکریمی ہے، جیسے بادشاہ کسی مقرب سے باتیں کرے تو اس سے اس کی عزت بڑھانی اور مرتبہ بلند کرنا مقصود ہوتا ہے نہ کہ پابند بنانا۔ پس ملائکہ سے اللہ تعالیٰ نے خطاب کیا، کلام بھی فرمایا گفتگو بھی کی مگر ان پر کوئی شریعت نہیں اتاری کیوں کہ احکام دو ہی قسم کے ہوتے ہیں یا کرنے کے یا بچنے کے کرنے کے کام خیر کے ہوتے ہیں، جن سے خیر کا حصول مقصود ہوتا ہے اور بچنے کے شر کے ہوتے ہیں، جس سے شر کا دفعیہ مقصود ہوتا ہے، جیسے بدکاری، دغا بازی، رشوت ستانی، زنا کاری، شراب خوری، چوری، سرزوری، بغاوت تمرد سرکشی وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شر اور برائی کا مادہ ہی نہیں رکھا گیا، تو انہیں بچنے کا حکم دینے کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ بدی نہیں کر سکتے تو ان میں بدی سے بچنے کا حکم دینا عاجز کو امر کرنا تھا، جو سراسر خلاف حکمت ہے اور حق تعالیٰ حکیم مطلق ہیں وہ خلاف حکمت بات سے بری اور منزہ ہیں، رہی خیر تو وہ ان کا طبعی تقاضا ہے جسے وہ بہ تقاضائے طبیعت کرنے پر مجبور ہیں اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں مصروف رہتے ہیں۔ عبادت بھی کرتے ہیں۔ سجدہ بھی کرتے ہیں اور اپنی طبع پاک ہی سے منشاء خداوندی کو پہچانتے ہیں۔ اس لئے ان کو شریعت کے ذریعے پہنچوانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ انہیں امر خیر کرنے کے لئے کسی قانون سے تنبیہ کی جاتی۔ پس جیسے ہمارے حق میں کھانا پینا، سونا جاگنا وغیرہ طبعی بات ہے اسی طرح تمام امور خیر عبادت نیکی، پاکدامنی صفائے باطن وظاہر اور سلامتی ملائکہ کے حق میں طبعی بات ہے ایک شریعت آئے یا نہ آئے وہ اپنے تقاضائے طبع سے ہمیشہ نیکی کریں گے، اس لئے امور خیر

کیلئے بھی کسی شرعی تکلیف اور قانونی خطاب کی ضرورت نہ تھی، بہر حال ملائکہ کو نہ امر شرعی کی ضرورت نہ نہی شرعی کی اس لئے ان سے خطاب تکلیفی نہیں کیا گیا، ملائکہ کو خطاب کیا گیا، مگر تکلیفی خطاب نہیں کیا گیا۔

جنّات کو تکلیفی خطاب کیا گیا مگر مستقل نہیں...... رہے جنات تو ان کو خطاب بھی کیا گیا اور تکلیفی خطاب کیا گیا، مگر خطاب مستقل نہیں کیا گیا یعنی خود ان پر براہ راست کوئی شریعت نہیں اتاری گئی اور نہ براہ راست ان کی نوع کو کوئی شرعی تکلیف دی گئی، بلکہ انسان کے واسطے سے انہیں بھی شریعت کا مخاطب بنایا گیا اور دین میں انسانوں کے تابع رکھا گیا چناں چہ ان میں جو یہودی ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں تورات خود ان کی نوع پر نہیں اتری، جو عیسائی ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں، انجیل خود ان کی نوع پر نہیں اتری اور جو مسلمان ہیں وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع فرمان بنائے گئے ہیں، خود قرآن براہ راست ان پر نہیں اتارا گیا پس جو شریعت انسانوں کے لئے آئی ہے وہ ان کے لئے بھی آئی مگر بواسطہ انسان کے انہیں پابند شریعت بنایا گیا۔

جنّات میں نبوّت نہ رکھنے کی وجہ...... بالفاظ دیگر ان میں نبوت نہیں رکھی گئی وجہ یہ ہے کہ جیسے ملائکہ میں خیر کا غلبہ اور شر کا لعدم ہے، جنّات میں شر کا غلبہ ہے اور خیر کا لعدم ہے اور نبوت کے لئے غلبۂ خیر ہی نہیں خیر محض کی ضرورت تھی، ورنہ بشر کے ہوتے ہوئے بدنہی یا بدعملی کی وجہ سے شرائع پر عمل اور ان کی تبلیغ دونوں غیر مامون ہوتیں اور صحیح دین مخاطبوں کو نہ پہنچ سکتا، اس لئے انہیں تابع انسان بنایا گیا تا کہ اس کی شریعت سے وہ علم اور عمل کی خطاؤں سے بچنا سیکھیں اس لئے جو انبیاء انسانوں میں مبعوث ہوئے ان ہی کی اطاعت ان پر لازم کی گئی۔ غرض اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو تو خطاب ہی نہیں کیا، ملائکہ کو خطاب کیا مگر غیر تکلیفی اور جنّات کو خطاب تکلیفی کیا مگر خطاب بالاستقلال نہیں فرمایا۔

انسان کو مستقلاً تشریعی خطاب کیا گیا...... اور انسانوں کو خطاب بھی کیا۔ تکلیف شرعی بھی دی اور مستقلاً خطاب فرمایا، یعنی اپنی وحی کے ذریعے خود ان سے کلام فرمایا، ان میں نبی اور رسول بنائے کبھی براہ راست خود خطاب فرمایا۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے طور پر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں اور کبھی بزبان ملکی خطاب فرمایا۔ پھر فرشتہ کبھی اپنی ملکیّت پر رہتا اور انبیاء بشریّت سے ملکیّت کی طرف منتقل ہو کر فرشتہ سے ملتے اور کبھی فرشتہ اپنی صورت ملکی کو چھوڑ کر صورت انسانی میں آتا اور انبیاء بشری چولہ میں اسے دیکھتے۔ جس کو قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔ ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ ① پہلی صورت فرشتہ کے قلب پر وارد ہونے کی ہے، جس میں وہ اپنی اصلیت پر رہتا ہے، لیکن پیغمبر کو بشری اصلیت سے ملکیّت کی طرف منتقل ہونا پڑتا ہے، اس لیے یہ صورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نہایت بھاری اور شدید ہوتی تھی، دوسری صورت حق تعالیٰ کے براہ راست کلام فرمانے کی ہے جو پس پردہ رہ کر

① پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۵۱.

ہوتی تھی، یعنی نگاہیں حق تعالیٰ کو نہیں دیکھتی تھیں صرف کان کلام حق سنتے تھے اور تیسری صورت فرشتہ کی انسانی صورت میں آ کر پیغامِ خداوندی سنانے کی ہے جس میں پیغمبر اپنی بشری اصلیت پر قائم رہتے تھے فرشتہ کو ملکی چولہ چھوڑ کر بشری چولہ میں آنا پڑتا تھا، یہ تینوں صورتیں وحی الٰہی کی تھیں۔

علم الٰہی کے لئے انسان کا انتخاب..... حاصل یہ ہے کہ وحی الٰہی اور نبوت و شریعت کی دولت کے لئے مخلوق میں بجز انسان کے اور کسی کا انتخاب عمل میں نہیں آیا اور ظاہر بات ہے کہ وحی علم کے اتارنے ہی کو کہتے ہیں، وحی کے ذریعہ علم ہی تو رسول کو دیا جاتا ہے، اس لئے دوسرے لفظوں میں علم الٰہی کی نعمت مستقلاً انسان ہی کو دی گئی ہے جس کو اس کی بنیادی خصوصیت اور امتیازی شان سمجھنا چاہئے کیوں کہ خصوصیت کے معنی یہی ہیں کہ اس کے سوا کسی دوسرے میں نہ پائی جائے اس لئے دوسرے لفظوں میں انسانیت کی خصوصیت علم وحی نکل آتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی خصوصیت اس میں سے نکال دی جائے تو وہ چیز، وہ چیز باقی نہیں رہ سکتی۔

انسانیت کا جوہر علم وحی ہے..... اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر انسان کو علم وحی حاصل نہ ہو تو وہ انسان، انسان نہ رہے گا کہ انسانیت کی خصوصیات اس میں نہ آئی یا نہ رہی۔ گو اس کی صورت انسانوں جیسی ہو، سو ظاہر ہے کہ انسان نام انسانی صورت کا نہیں بلکہ انسانی جوہر کا ہے اور انسانیت کا جوہر یہ علم وحی ہے، اس لئے جو انسان علم وحی کا حامل نہیں وہ دلائل بالا کی رو سے انسان نہیں صرف صورت انسان ہے اور محض صورت کی جس میں حقیقت نہ ہو، کوئی قدر و قیمت نہیں، اگر ہم گھوڑے کا مجسمہ بالکل اصلی گھوڑے جیسا بنالیں کہ دیکھنے میں اصل و نقل میں ذرا بھر فرق معلوم نہ ہو تو کیا اسے گھوڑا کہیں گے؟

اور کیا وہ گھوڑے کی طرح سواری کا کام دے سکے گا؟ اور کیا اس کی قیمت بھی ہزار، پانچ سو روپیہ اٹھ جائے گی؟ کبھی نہیں۔ کیوں کہ وہ گھوڑا نہیں گھوڑے کی محض تصویر ہے، اسی طرح اگر انسان کا اصلی مجسمہ سامنے ہو مگر اس میں انسانی جوہر اور انسانی خصوصیت (علم) نہ ہو تو وہ صورت انسان ہے، انسان نہیں۔ اور قدر و قیمت انسان کی ہوتی ہے، صورت انسان کی نہیں۔ ورنہ عمدہ سے عمدہ انسانی صورتیں پلاسٹک کی بنی ہوئی چند پیسوں میں دستیاب ہوسکتی ہیں، چاہئے کہ انسانوں سے قطع نظر کر کے ان پلاسٹک کے انسانوں سے انسانوں کے کام لینے لگیں اور اصل انسان کے پیچھے نہ پڑیں، مگر ایسا نہیں ہوسکتا جس سے واضح ہوا کہ دنیا میں قدر و قیمت انسان کی ہے، تصویر انسان کی نہیں اور آدمی حقیقت آدمیت کو کہتے ہیں محض صورت آدمیت کو نہیں ؎

گر بصورت آدمی انسان بدے | احمد صلی اللہ علیہ وسلم و بوجہل ہم یکساں بدے
اینکہ می بینی خلاف آدم اند! | نیستند آدم غلاف آدم اند!
از بروں چوں گور کافر پر حلل | اندروں قہر خدائے عزّ وجل

علم مطلق انسان کی خصوصیت نہیں..... یہاں ایک نکتہ فراموش نہ کرنا چاہئے اور وہ یہ کہ انسان کی خصوصیت

مطلق علم نہیں۔ یعنی ہر قسم کے علم کو انسانی خصوصیت نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ مطلق علم یعنی علم کی کوئی نہ کوئی نوع تو قریب قریب ہر مخلوق کو حاصل ہے، حتیٰ کہ جانور بھی علم سے خالی نہیں، اس لئے مطلق علم انسانی خصوصیت نہیں کہلائی جاسکتی اور نہ مطلق علم سے انسان کی فضیلت و شرافت اور مخلوقات میں افضلیت نمایاں ہوسکتی ہے جب تک کہ اسے کوئی ایسا علم حاصل نہ ہو جو اس کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہو۔ آج کی دنیا میں علم کی رائج شدہ جتنی بھی قسمیں ہیں، ان میں سے کوئی بھی انسان کی خصوصیت نہیں، جانوروں کو بھی ان سے حصہ ملا ہوا ہے۔ اس لئے بھی انسان اپنی افضلیت اور مخلوقات میں اپنی برتری ان غیر مخصوص علوم سے نہیں جتا سکتا۔

فنِ انجینئری انسان کے ساتھ مخصوص نہیں...... آج اگر انسان دعوی کرے کہ میں اس لئے افضل المخلوقات ہوں کہ میں انجینئری کا علم جانتا ہوں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ڈیزائنوں کی کوٹھیاں اور بلڈنگیں تیار کرسکتا ہوں تو یہ دعوی قابلِ سماع نہ ہوگا کیوں کہ انجینئری کے علم سے جانور بھی خالی نہیں ہیں، وہ بھی دعوی کرسکیں گے کہ ہم بھی انجینئر ہیں اور اپنے مناسب حال راحت دہ مکانات بناتے ہیں۔

بیا (جو ایک چھوٹی سی چڑیا ہے) اپنے لئے عجیب وغریب قسم کا گھونسلا بناتی ہے، جس میں کئی کمرے ہوتے ہیں، ماں باپ کا الگ، اور بچوں کا الگ حتی کہ اس میں بچے جھولتے ہیں، گویا مختلف رومز ہوتے ہیں۔ یہ گھونسلا گھاس سے بنایا جاتا ہے اور تین چار تاروں سے، کیکر وغیرہ کے درخت میں لگا ہوا اور لٹکا ہوا ہوتا ہے اور مضبوط اتنا کہ آندھی آئے، طوفان آئے مگر اس مکان پر کوئی زد نہیں پڑتی، آپ کا مکان گر جائے گا، مگر اس کا گھونسلہ محفوظ رہے گا کیا یہ اعلیٰ ترین صنعت نہیں ہے اور یہ چڑیا کیوں یہ دعوی نہیں کرسکتی کہ میں بھی انجینئر ہوں؟ ضرور کرسکتی ہے، تو پھر انجینئری انسان کے حق میں مخصوص کہاں رہی جو اسکی افضلیت اس چڑیا پر ثابت ہو۔ شہد کی مکھی اپنا چھتہ بناتی ہے اس کے ہشت پہلو سوارخ اس قدر مساوی ہوتے ہیں کہ آپ پرکار سے بھی اتنے صحیح خانے نہیں بنا سکتے پھر اس میں بچوں کے رہنے اور پلنے کے خانے الگ اور شہد کے الگ ہوتے ہیں جو نہ بارش سے خراب ہو، نہ طوفان میں اپنی جگہ سے ہلتا ہے، کیا یہ انجینئری اور کاریگری نہیں ہے؟ اگر ہے اور بلاشبہ ہے تو آپ کو کب یہ حق پہنچتا ہے کہ آپ انجینئری کا فن اپنی نوع کے ساتھ مخصوص بتلا کر اس مکھی پر اپنی افضلیت و برتری ثابت کرسکیں؟ سانپ اپنی ''دبلمی'' مٹی سے بناتا ہے جو اوپر سے برجی دار گنبد کی مانند ہوتی ہے اور اس کے اندر نہایت صاف ستھری نالیاں پیچ در پیچ بنی ہوئی جن میں سانپ اور ان کے بچے رینگتے رہتے ہیں، کیا اسے انجینئری اور صنعت کاری نہیں کہیں گے؟ رہا یہ کہ آپ کہیں کہ صاحب ہم عمارتیں بڑی عالیشان بناتے ہیں، جن کی خوشنمائی اور نفاست ان گھونسلوں اور بھٹوں سے کہیں زیادہ اونچی اور اعلیٰ ہوتی ہے، اس لئے ہم اور یہ جانور انجینئری میں برابر کیسے ہوسکتے ہیں، تو جواب یہ ہے کہ مکان کا عمدہ ہونا مکین کی ضرورت اور راحت کے لحاظ سے ہوتا ہے جانور اپنی ضرورت کی رعایت کرتا ہے آپ اپنی ضروریات کی، جانور آپ کی کوٹھی کو للچائی ہوتی نظروں سے دیکھتا تو آپ اپنی برتری کا دعوی کرسکتے تھے،

لیکن جیسے آپ اس کے مکان سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ آپ کے مکان سے نفرت اظہار کرتا ہے، اگر آپ سانپ یا بیا یا شہد کی مکھی کو اپنی کوٹھی میں آباد کرنا چاہیں وہ کبھی بھی آمادہ نہ ہوں گے، بلکہ اپنا ہی مکان بنا کر رہیں گے، اس سے واضح ہے کہ مکان کی صنعت میں دونوں برابر ہیں، اور اپنے اپنے رنگ کے ماہر ہیں اس لئے انجینئری کے بارے میں آپ کو دعویٰ انضلیت کا کوئی حق نہیں۔

انسان اور علمِ طب...... اس طرح مثلاً علمِ طب ایک تجرباتی علم ہے، یہ علم جس طرح انسان کو حاصل ہے، اسی طرح حیوانوں میں بھی یہ علم اپنی بساط کی بقدر پایا جاتا ہے، آپ یہ دعویٰ کریں کہ صرف ہم طبیب ہیں اور ہمیں ہی اس علم کا شرف حاصل ہے لہٰذا ہم ہی اس فن کی رو سے اشرف المخلوقات ہیں، غلط ہے، جانور بھی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم بھی علم طب میں مہارت رکھتے ہیں فرق اگر ہوگا تو صرف یہ کہ آپ پر زیادہ بیماریاں آتی ہیں، تو آپ دواؤں کی زیادہ اقسام جانتے اور استعمال کر سکتے ہیں، جانوروں کو بیماریاں کم لاحق ہوتی ہیں اس لئے وہ دوائیں بھی کم جانتے ہیں، لیکن اس کمی بیشی کے فرق سے علم طب صرف آپ کی خصوصیت قرار نہیں پاسکتا۔

مجھے ایک ہندو ریاست اندر گڑھ میں بار ہا جانے کا اتفاق ہوا، میرے بعض اعزہ وہاں اونچے عہدوں پر ممتاز تھے۔ اس ریاست میں بندروں کے مارنے کی ممانعت تھی، اس لئے بندروں کی تعداد ہزاروں کی حد تک تھی، بندروں کی جبلت میں شرارت اور چالاکی بلکہ ایذا رسانی داخل ہے، اس لئے وہ کافی نقصان کرتے تھے، کبھی برتن اٹھا کے بھاگ جاتے کبھی کپڑا اٹھالے جاتے۔ اور صرف لے جانا ہی نہ تھا، بلکہ ایسا موذی جانور ہے کہ اسے لے جانا اور منڈیر پر بیٹھ کر اسے دکھا دکھا کر چیرنا پھاڑنا جس سے ایک تو کپڑا جانے کی تکلیف ہوتی۔ اسے ضائع ہوتا دیکھ کر اور بھی زیادہ دکھ ہوتا۔ اس لئے ہمیں ایک بار غصہ آیا اور ہم نے سوچا کہ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہئے، جس سے سو پچاس بندر ایک دفعہ مر جائیں تو کچھ تو نجات مل جائے گی، اس لئے ہم نے دو روپیہ کا سنکھیا خریدا اور اسے آٹے میں ملایا اور روٹیاں پکوا کر چھت پر پھیلا دیں تا کہ وہ آتے جایں، روٹیاں کھاتے جائیں اور مرتے جائیں، اور ہم خوش ہوتے جائیں اس لئے ہم روٹیاں چھت پر ڈال کر خود ایک پناہ میں بیٹھ گئے اور دیکھتے رہے کہ ابھی بندر آ کر ان روٹیوں کو کھائیں گے، اور مریں گے اور ہمارے لئے خوشی کا سامان ہوگا۔

یعنی اگر انہوں نے ہمارے دس کپڑے پھاڑ دیئے ہیں تو دس بیس کو ہم بھی مرتا ہوا دیکھیں جس سے کچھ تو دل کو چین آئے۔ چنانچہ دو تین بندر آئے، مگر ان روٹیوں سے دور کھڑے ہو کر دیکھنے لگے کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا کہ روٹیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ بات ہے، ورنہ روٹیاں یوں نہیں بکھیری جاسکتیں، اس لئے روٹی کو غور سے دیکھا اور پھر سونگھا اور سوچا یہ نیا حادثہ کیوں پیش آیا ہے۔ پہلے تو ہم ایک روٹی بھی چھت پر پڑی ہوئی نہیں پاتے تھے۔ اب یہ روٹیوں کا ڈھیر کیوں لگا ہوا ہے؟ اس میں ضرور کوئی راز ہے؟ بالآخر انہوں نے روٹی کو ہاتھ نہیں لگایا اور چلے گئے ہم سمجھے کہ تدبیر فیل ہوگئی لیکن بندروں کا یہ چالاک قافلہ جا کر پھر اپنے ساتھ اور بندروں کو لے آیا

اور چودہ پندرہ موٹے موٹے بندر ان کے ساتھ آئے اور وہ روٹیوں کے اردگرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ گول میز کانفرنس منعقد ہوئی اور مشورہ شروع ہوا کہ روٹیاں اس مقدار میں یہاں کیوں پڑی ہوئی ہیں۔ خدا جانے انہوں نے باہم کیا کیا اشارے کئے ایک آگے بڑھا اور اس نے روٹیوں کو سونگھا پھر دوسرا آگے بڑھا، اس نے ایک روٹی توڑی اس کے ٹکڑوں کو سونگھا اور روٹیاں چھوڑ کر سب بھاگ گئے اب ہمیں یقین ہوگیا کہ یہ کچھ سمجھ گئے ہیں اور ہماری ساری تدبیر ناکام ہوگئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں تقریباً ساٹھ ستر بندروں کا ایک قافلہ آیا اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک ٹہنی تھی، جن میں ہرے ہرے پتے تھے۔ انہوں نے آکر پہلے روٹیوں کو توڑا، ان کے ٹکڑے کئے اور قریب قریب اتنے ہی ٹکڑے کئے جتنے یہ بندر تھے، تاکہ روٹیوں میں ہر ایک کو حصہ ملے، گویا پوری جماعت میں یہ اصول پیشِ نظر تھا کہ۔

نیم نانے گر خورد مرد خدا　　　　بذل درویشان کندں نیمے دگر

بندر بانٹ تو مشہور ہے۔ آخرکار انہوں نے وہ ٹکڑے باہم بانٹ لئے اور ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا کھا کر اوپر سے وہ پتے چبالئے جو ہر ایک اپنی ٹہنی کے ساتھ لایا تھا اور دندناتے ہوئے چلے گئے اور ہم دیکھتے رہے یعنی بے وقوف ہم رہے کہ دو روپیہ کا آٹا بھی گیا سنکھیے کے دام بھی بٹے کھاتے گئے، کپڑا تو پہلے ہی جا چکا تھا اور اوپر سے وقت بھی ضائع ہوا اور ہوشیار یہ بندر رہے کہ سب کچھ انہیں کا ہو کے رہا، اندازہ یہ ہوا کہ یہ پتے جو وہ ساتھ لائے تھے زہر کا تریاق تھے۔ جو ان بندروں کو معلوم تھا، اب بھی اگر آپ یہ دعویٰ کریں کہ طبیب صرف ہم ہی ہیں، جو جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں جانتے ہیں، تو یہ دعویٰ غلط ہوگا، کیوں کہ یہ بندر بھی دعویٰ کر سکتے ہیں۔ بلکہ پیش بندی کر کے بیماری کو پہلے ہی سے روک دیتے ہیں، تو فن طب میں ان کا دخل معلوم ہوا۔ پھر آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہے کہ صرف ہم ہی اطباء ہیں اور فن طب کی وجہ سے جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آپ اور بندر نفسِ فن میں برابر ہوگئے گو کچھ خصوصیات کا فرق بھی سہی۔

فنِ سیاست بھی حیوانات میں ہے...... پھر اگر آپ یہ کہیں کہ طب نہ سہی فن سیاست سہی، ہم سیاست جانتے ہیں اور اپنی ملّت کا نظم کر سکتے ہیں اور سیاسی نظام قائم کر کے قوم کی منظّم خدمت کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم اس بارہ میں جانوروں پر فضیلت رکھتے ہیں تو میرے خیال میں یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فن سیاست بھی انسانی خاصہ نہیں۔ بلکہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے، شہد کی مکھی بھی ملت کی سیاسی اور انتظامی تنظیم کر سکتی ہے۔ شہد کی مکھیاں جب شہد کا چھتہ بناتی ہیں اور بے نظیر انداز سے اس میں ہشت پہلو سوراخ اور خانے بنا کر گویا اپنا یہ قلعہ تیار کر لیتی ہیں تو اس کے نظام کی تشکیل اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے تو وہ امیر منتخب کرتی ہیں، جس کا نام عربی زبان میں یعسوب ہوتا ہے، یہ امیر اس چھتہ پر ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ ساری مکھیاں اس امیر کی اطاعت کرتی ہیں، اندرون قلعہ کی انتظامی تقسیم یہ ہوتی ہے کہ اس چھتہ کے ایک حصہ میں تو شہد بھرا جاتا ہے، ایک حصہ میں ان

کے بچے ان خانوں میں پلتے ہیں، ایک حصہ میں بڑی مکھیاں رہتی ہیں، اور امیر ان سب کی نگرانی کرتا ہے۔

حتی کہ اگر کسی مکھی سے قوم کے خلاف کوئی غداری ہو جائے تو وہ اس مکھی کی گردن قلم کر دیتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ چھتے کے نیچے ہر طرف کچھ مکھیاں سر کٹی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی پڑی رہتی ہے، کسی کا سر کٹا ہوا اور کسی کی کمر ٹوٹی ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے پتہ پر بیٹھ کر اس کا زہریلا مادہ لیکر آئی ہو جس سے بنے ہوئے شہد میں سمیت کا سرایت کر جانا یقینی ہوتا ہے تو وہ یعسوب اسے فوراً محسوس کرتا ہے کہ زہریلا مادہ لے کر آئی ہے اور اس مکھی کی گردن توڑ کر اسے فوراً مار گراتا ہے کہ وہ اس چھتہ کے اندر گھسنے نہ پائے، تاکہ اس کے زہریلے مادہ سے قوم کے دوسرے افراد کی جانیں ضائع نہ ہوں۔ گویا وہ سمجھتا ہے کہ ایک جان کی لے کر اگر پوری قوم کو بچالیا جائے تو کوئی جرم نہیں۔ یعنی اس کی سیاست اسے یہ اصول سمجھاتی ہے کہ: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ ①

شہد کی مکھیوں میں قانون قصاص اور مکافاتِ جرم...... یعنی ایک کی موت سے اگر پوری قوم کی حیات بچ جائے تو اس کی موت میں کوئی مضائقہ نہیں، اس قتل نفس پر مکھیوں کی اطاعت کا یہ عالم ہے کہ نہ کوئی ایجی ٹیشن ہوتا ہے۔ نہ امیر کے خلاف مظاہرے ہوتے ہیں۔ چپ چاپ خوشدلی سے امیر کے اس فعل قتل پر گردن جھکادی جاتی ہے، اور کسی کو خلجان نہیں گزرتا کہ یہ کیوں ہوا۔ بلکہ تمام قوم سر اطاعت جھکا کر مان لیتی ہے تو اولوالامر کا انتخاب، پھر اس کے سامنے سمع و اطاعت، پھر قوم کی انتظامی تشکیل اور نظم کے تحت مکانات کی تقسیم، پھر بے راہی پر مجرم کا قتل، اگر سیاست نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

ضلع بجنور کے ایک قصبہ نجیب آباد میں شہد بکثرت ہوتا ہے اور وہاں شہد کی مکھیوں کو پالنے کا خاص انتظام ہوتا ہے، وہاں کا ہم نے ایک محاورہ سنا کہ فلاں نے اپنی بیٹی کو تین مکھیاں جہیز میں دیں، فلاں نے چار مکھیاں جہیز میں بیٹی کو دیں۔ ہمیں تعجب ہوا کہ جہیز میں پلنگ پٹیریاں، میز کرسی، زیور، کپڑا وغیرہ تو دنیا بھر میں دیا جاتا ہے، یہ مکھیاں جہیز میں دینے کے آخر کیا معنی ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوا کہ جب وہ لوگ شہد کی مکھیاں پالتے ہیں، اور کسی خاص جگہ شہد کا چھتہ لگوانا چاہتے ہیں تو اس امیر مکھی کو یعنی یعسوب کو پکڑ کر اس جگہ بٹھلا دیتے ہیں تو ساری مکھیاں وہیں جمع ہو جاتی ہیں اور وہیں چھتہ بناتی ہیں اور وہاں شہد تیار ہو جاتا ہے۔ اس گر کو سامنے رکھ کر وہاں کے شہد کے یہ کاروباری دو، چار امیر مکھیاں پکڑ کر ڈبیہ میں بند کر کے بیٹی کو جہیز میں دے دیتے ہیں، وہ لڑکیاں ترکیب جانتی ہیں، اور مناسب مقام پر ان مکھیوں کو بٹھلا دیتی ہیں، تو وہیں شہد کے چھتے لگ جاتے ہیں۔

اور کئی کئی دھڑی شہد ہو جاتا ہے، تو چار مکھیاں جہیز میں دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چار دھڑی شہد جہیز میں

① پارہ: ۲، سورة البقرة، الآية: ۱۷۹.

دے دیا گیا۔ اس سے شہد کی مکھیوں کی اطاعت شعاری اور نظم پسندی معلوم ہوئی، جس کی نظیر انسان میں بھی نہیں، سو اس نظم پسندی اور تنظیم ملت کی اعلیٰ ترین سیاست کے ہوتے ہوئے آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہو گیا ہے کہ صرف انسان ہی سیاست دان ہیں، یہ مکھیاں بھی دعویٰ کر سکتی ہیں، کہ ہم بھی سیاست دان ہیں تو اگر آپ بھی کسی امیر کے تحت رہ کر تقسیم عمل کر لیں کہ کوئی غذا مہیا کرے کوئی تعلیم کا کام کرے، کوئی فوج میں بھرتی ہو کر ملک کی حفاظت کرے، تو کام بلاشبہ عمدہ ہے، ضروری بھی ہے، مگر محض انسان کی خصوصیت نہیں، مکھیاں بھی کر سکتی ہیں، اس لئے یہ تنظیم کوئی وجہ فضیلت نہیں کہ انسان اپنے کو حیوانات سے برتر سمجھے۔

بطخوں میں سیاست و تنظیم...... بطخوں میں بھی سیاست پائی جاتی ہے، جب بطخیں سوتی ہیں تو ان کا امیر ان کی نگہبانی اور پاسبانی کرتا ہے وہ ایک ٹانگ پر ساری رات جھیل میں کھڑا رہتا ہے، جب کوئی خطرہ پیش آتا ہے، تو وہ آواز لگاتا ہے اور ساری قوم کو خطرہ سے آگاہ کرتا ہے، ساری بطخیں بیدار ہو جاتی ہیں اور پر تول لیتی ہیں اور دوسری آواز میں اٹھ کر پرواز میں آجاتی ہیں، اور وہ بھی ایک قاعدے یعنی مثلث طریقے سے اڑتی ہیں۔ امیر آگے آگے اور بطخیں دو لائن میں پیچھے پیچھے اڑتی ہیں، جدھر امیر جاتا ہے، ادھر تمام بطخوں کا یہ قافلہ جاتا ہے، کسی کو امیر پر اعتراض نہیں ہوتا کہ وہ اس سمت میں کیوں جا رہا ہے پھر جہاں امیر بیٹھتا ہے وہیں عام بطخیں وہیں اتر پڑتی ہیں، یہ سیاست نہیں تو اور کیا ہے؟

اور اس سے بہتر سیاست اور تنظیم کیا ہو سکتی ہے؟ اپنی رعایا اور ماتحت قوم کو ہر خطرہ سے آگاہ کرنا اور بچانا خود بیدار رہنا ان کو چوکنا رکھنا کیا اعلیٰ ترین ترقی یافتہ سیاست نہیں؟

اس لئے سیاسی تدابیر اور جوڑ توڑ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں، اصول سیاست میں حیوانات بھی اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں، مکھیاں کہیں گی کہ ہم بھی سیاست دان ہیں، زیادہ سے زیادہ آپ کی سیاست شاخ در شاخ ہے تو اس کی وجہ سے یہ ہے کہ ملت میں جرائم زیادہ ہیں، اس لئے روک تھام کی تدابیر بھی زیادہ ہیں، مکھیوں اور بطخوں میں جرائم کی انواع آپ سے کم ہیں، تو تدابیر بھی کم ہیں۔ سو اس سے کچھ ان مکھیوں اور بطخوں کی افضلیت آپ پر ثابت ہوگی نہ کہ کمتری اور اصل سیاست میں برابری ثابت ہوگی تو یہ دعویٰ بھی آپ کا غلط ہے کہ ہم چوں کہ فنِ سیاست سے واقف ہیں، اس لئے افضل الحیوانات ہیں۔

مکڑی کی صنعت کاری...... اگر آپ کہیں کہ ہم کپڑا بننے کا فن جانتے ہیں۔ لہٰذا ہم سب جانداروں میں افضل ہیں تو مکڑی آکر کہے گی کہ یہ کام تو میں بھی جانتی ہوں، دیکھئے مکڑی سفید رنگ کا خیمہ تنتی ہے، جس کی طنابیں چاروں طرف کھنچی رہتی ہیں، وہ اتنا صاف باریک اور ملائم ہوتا ہے کہ مانچسٹر کی ململ بھی اتنی صارف اور باریک نہیں ہوتی اور اتنا مضبوط جس کو آندھی اور ہوا کے سخت جھونکے اور بڑی سے بڑی بارش بھی نہیں ہلا سکتی اس کی طنابیں اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں سرکتیں، آپ تو سوت سے کپڑا بنتے ہیں، وہ خدا جانے کس مادہ سے اپنا گھر بناتی ہے، آپ کا کپڑا

پھٹ جائے گا، مگراس کا بنا ہوا خیمہ، یہ کپڑا اور خیمہ نہیں پھٹے گا۔ آپ کا بنایا ہوا کپڑا میلا ہو جائیگا۔ جسے آپ پانی سے دھوئیں گے۔ صابن سے صاف کریں گے مگر مکڑی کے اس خیمہ کے کپڑے کو صاف کرنے اور دھونے کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ کہیں گے کہ ہم اپنی غذا کے لئے پرندے پھانسنے کے لئے جال بناتے ہیں، مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال بنتے ہیں۔ تو ہماری تدبیر کو کون پہنچ سکتا ہے کہ ہم غیر نوع کو قابو میں لانے کیلئے سوت کے تاگوں سے کام لیتے ہیں تو بھی مکڑی آگے بڑھ کر کہے گی کہ میں اس سے بہتر جال بن سکتی ہوں، وہ جالا تانتی ہے تو اس میں مکھیاں پھنس جاتی ہیں، ہزار بھنبھناتی ہیں چلاتی ہیں، مگر اس جال سے نہیں نکل سکتیں تو کیا یہ غیر نوع کا قابو میں لانا نہیں۔ اور اتنا باریک تار بناتی ہے کہ آپ کا سوت اتنا باریک نہیں ہوتا۔ غرض آپ فنون طبعیہ میں سے کون سے فن کو اپنی خصوصیت کہہ سکیں گے، ضروریات زندگی کا کوئی فن ایسا نہیں جو حیوانات میں نہ ہو۔ ہم جس قدر بھی ضروریات زندگی سے متعلق علم رکھتے ہیں، حیوانات بھی اپنی ضروریات زندگی سے متعلق سمجھ بوجھ اور صنعت کاری کا علم رکھتے ہیں۔

ضروریات زندگی کا ہر فن حیوانات میں موجود ہے..... حتی کہ اگر آپ سائنس کی مدد سے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر سکتے ہیں۔ تو ایک کوا اور کرگس بھی اپنی اندرونی سائنس کی قوت سے اپنے پروں سے اتنی ہی بلندی پر پرواز کرتا ہے۔ آپ پیتل تانبے اور دیگر معدنیات کے بنائے ہوئے مصنوعی پروں یعنی ہوائی جہازوں کے ذریعے اڑتے ہیں اور چیل کوّے وغیرہ پرندے اپنے بنے بنائے پروں اور خلقی طاقت سے اڑتے ہیں، آپ ان مصنوعی پروں میں معدنیات کے محتاج ہیں اور ہوائی جہاز بنانے میں خون پسینہ ایک کرتے ہیں، تب کہیں اڑتے ہیں، اور یہ پرندے خود ہوائی جہاز ہیں۔ غرض آپ اگر اڑ گئے تو پرندے بھی اڑتے ہیں۔ یعنی پرواز کا جو فعل آپ نے کیا وہی پرندوں نے بھی کیا آپ نے کپڑا بن کر تن پوشی کی اور بدن کو کپڑے سے چھپایا تو ہر چرند پرند بھی اپنی کھال اپنے پروں سے اپنے تن بدن کو چھپاتا ہے۔ آپ کا لباس مصنوعی ہے اس کا قدرتی ہے، آپ رہنے کے لئے مکان بناتے ہیں۔ جانور بھی اپنا بھٹ اور گھونسلا بناتے ہیں۔ آپ اپنا رزق تلاش کرنے جنگل میں جاتے ہیں، وہ بھی اپنی غذا تلاش کرنے کھیتوں اور جنگلوں میں گھومتے ہیں، اور شام کو پیٹ بھر کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ آپ پلاؤ زردہ کھاتے ہیں وہ گھاس دانہ کھاتے ہیں آپ گوشت پکا کر کھاتے ہیں۔ وہ اس مصیبت سے بری ہیں، کچا ہی کھا لیتے ہیں، آپ اگر ان کے گھاس دانہ سے نفرت کرتے ہیں تو وہ آپ کے زردہ پلاؤ سے نفرت کرتے ہیں۔

غرض کوئی طبعی فن ایسا نہیں۔ جس میں وہ آپ کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکیں۔ آپ سیاست کے مدعی ہوں گے تو شہد کی مکھی اور بطخ سامنے آ کر اس دعوائے خصوصیت کو باطل کر دے گی آپ کپڑا بننے اور جال بنانے کا فن کا دعویٰ کریں گے تو مکڑی سامنے آ کر بولے گی کہ یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں، آپ فن طب کی مہارت کا دعویٰ کریں گے تو بندر اچھل کر کہے گا کہ جڑی بوٹی کی خاصیتیں کچھ میں بھی جانتا ہوں۔ اور میں زہر کا تریاق جانتا ہوں۔ آپ فنِ پرواز کے مدعی ہوں تو پرندے سامنے آ کر کہیں گے ہم اس فن میں تم سے زیادہ ماہر ہیں۔ آپ انجینئری اور فن خانہ

سازی کے مدعی ہوں گے تو ہر چرند پرند اور درند آپ کے مقابلہ میں آ کر کہے گا کہ یہ کام ہم سب جانتے ہیں۔ رہنے سہنے، لباس پہننے، علاج کرنے، مکان بنانے اور تنظیم وسیاست وصنعت کاری کرنے میں شریک ہیں۔

تو ان فنون کی وجہ سے تو انسان ان جانوروں سے افضل نہیں ہو سکتا۔ افضلیت کسی خصوصیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ جو اس میں ہو، اور اوروں میں نہ ہو۔ تو حقیقت یہ ہے کہ وہ علم جو صرف انسانوں میں ہے اور اس کے سوا اور کسی میں نہیں۔ وہ علم شرائع اور علم احکامِ خداوندی ہے، جس سے اللہ کی معرفت ہوتی ہے اور انسان اس علم کے ذریعے سعادت کے درجات طے کرتا ہے اور نیابت خداوندی کا مستحق ٹھہرتا ہے یہ علم کسی بھی غیر انسان میں نہیں پایا جاتا۔ نہ ملائکہ میں یہ علم موجود ہے نہ جنات اس علم سے آراستہ ہیں۔ نہ حیوانات واقف ہیں تو جمادات ونباتات کیا واقف ہوتے؟

یہ علم خصوصیت ہے انسان کی۔ علم شرائع صرف اس کی قسمت میں ہے جس نے اسے سب مخلوقات پر فوقیت وفضیلت دی، جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علم بغیر پیغمبری کے نہیں آ سکتا۔ کیوں کہ یہ علم اللہ کی مرضیات ونامرضیات کے جاننے کا علم ہے اور کسی کی مرضی بلا اس کے بتلائے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی۔ اور اللہ ہر کس وناکس کو اپنے اندر کی بات نہیں بتلاتا سو اس کے لئے اس نے نوع انسانی کو مخصوص فرمایا اور اس میں بھی برگزیدہ تر طبقہ انبیاء علیہم السلام کا تھا تو اس نے انہیں اپنی مرضیات ونامرضیات سے آگاہ کیا اور بتلایا کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوتا ہوں۔ اسے کرو اور فلاں چیز سے ناخوش ہوتا ہوں اسے نہ کرو یعنی امر ونہی بتلایا پس امر ونہی کے قانون کو شریعت کہتے ہیں۔ اس شریعت کے علم کے لئے نبوت رکھی اور یہ نبوت نوع بشری ہی کے ساتھ مخصوص رکھی اور نبوّت کے علوم صرف انسان کو دیئے۔

انسانیت کا مدار ہی علوم الٰہیہ ہیں ..... یعنی چار ذی شعور مخلوق، ملائکہ، جنات، حیوانات انسان۔ میں سے علم صرف انسان کو بخشا باقی تین اقسام ملائکہ، جنات اور حیوانات کو یہ علم نصیب نہ ہوا یا کسی قدر ہو تو انسان کے طفیل اور اس کے واسطہ سے ہوا، سو اس میں اصل انسان ہی رہا۔ جس میں کوئی مخلوق اس کی ہمسری تو بجائے خود ہے شرکت کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔ اس سے واضح ہوا کہ علوم طبعیہ، علوم وھمیہ، علوم خیالیہ، علوم عقلیہ وغیرہ انسان کی خصوصیات نہیں یہ اور انواع کو بھی میسر ہیں، کیوں کہ یہ تمام علوم اپنے اندرونی قویٰ سے ابھرتے ہیں اور وہ قویٰ جانداروں میں کم وبیش سب میں رکھے گئے ہیں، عقل ہو یا خیال، وہم ہو یا طبعیت ہر ایک کی چیز ہے اس لئے ان کے ذریعہ جو تصور بھی جاندار کو بندھے گا، اس سے خود اس کے نفس کی مرضی اور نامرضی اور خواہش وطلب کھلے گی۔

خدا کی مرضی نامرضی اور خدا کے مطلوبہ کاموں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کیوں کہ خدا کی پسند ناپسند اس کے اندر سے آئے ہوئے علم سے سمجھ آ سکتی ہے، اور وہی وحی کا علم ہے جو نبوت ورسالت کے ذریعے آتا ہے اور یہ صرف انسان کو دیا گیا ہے۔ اس سے نمایاں ہو گیا کہ انسان کی خصوصیت علوم طبیعہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم شیطانیہ نہیں بلکہ علوم الٰہی ہیں، علوم نبوت اور علوم رسالت ہیں جو انسان کے سوا کسی کو میسر نہیں، اس لئے انسان اگر ساری مخلوقات پر برتری اور افضلیت کا دعوی کر سکتا ہے۔ تو وہ علوم شرعیہ کے ذریعے کر سکتا ہے۔ نہ کہ علوم طبیعہ وعقلیہ،

وہمیہ کے ذریعہ کہ یہ علوم انسان کے سوا اوروں کو بھی میسر ہیں۔

دوسرے لفظوں میں نہ صرف یہی کہ اس علم سے انسان کی برتری اور فضیلت ہی ثابت ہوتی ہے، بلکہ اس کی انسانیت کا مدار بھی اس علم پر ہے، کیوں کہ جب یہ علم ہی انسان کی خصوصیات ٹھہرا کہ یہ علم نہ ہوتو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ انسان اس وقت تک انسان نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ وہ اس علم سے بہرہ ور نہ ہو کیوں کہ جس چیز کی خصوصیت ختم ہو جائے۔ جس سے وہ چیز وہ چیز تھی تو پھر وہ شی وہ شی نہیں رہتی۔ اگر آپ میں خصوصات باقی نہ رہے تو آپ آپ نہ رہے، اگر خصوصیت انسان انسان میں ہوتو انسان انسان کہلائے گا ورنہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں وہ مکان بنانے، کھانے پینے علاج معالجہ کرنے میں انسان کے برابر ہیں۔

پس جب انسان کی خصوصیت یہ علم الٰہی ہے، جس سے وہ مرضیاتِ الٰہی سمجھ لیتا ہے تو یہ علم الٰہی جب انسان میں ہوگا تو اس کا نام انسان ہوگا، ورنہ ایک کھاتا پیتا حیوان رہ جائے گا، کیوں کہ کھانے پینے پہننے کو کتنا ہی خوش نما بنائے اور علمی رنگ میں نمایاں کرے تب بھی رہے گا جانور ہی، کیوں کہ جانور بھی یہ علوم اپنے اندر رکھتے ہیں جیسا کہ واضح کیا جاچکا ہے، بہر حال یہ بات صاف ہوگئی کہ نہ کھانا انسانیت ہے نہ سیاست و تنظیم اگر کوئی ماہر فن پچاس منزل کی بلڈنگ بھی بنائے تب بھی وہ اس کی وجہ سے حیوانیت سے نہیں نکل سکتا کہ یہ کام یعنی مکان سازی اس کی خصوصیت نہیں۔ حیوانیت کی خصوصیت ہے اور اگر مکان سازی پارچہ بافی نظم کاری میں عقل کو بھی لگا دیا جس سے یہ اشیاء مزین ہوگئیں تو گو بظاہر تو وہ جانوروں سے ممتاز اور افضل ہوگیا۔ مگر حقیقت میں ان سے اور زیادہ گھٹ گیا کیوں کہ عقل جیسے پاک جوہر کو اس نے اپنی طبعیت کا خادم اور غلام بنا دیا اور سب جانتے ہیں کہ طبیعت بے شعور ہوتی ہے، اور عقل سرچشمہ شعور ہے۔ تو ایک بے شعور کا حاکم بنا کر گویا جاہل کو بادشاہ اور عالم کو غلام کر دیا یہ کہاں کی عقل ہے۔ بلکہ بدعقلی ہے، جانور اس بے ہودگی سے بری ہیں اس لئے ایسا کر کے انسان اونچا تو کیا ہوتا جانوروں سے کہیں زیادہ نیچا اور کم رتبہ ہوگیا کہ جانور طبع حیوانی کو استعمال کرتے ہوئے عقل کو اس کا غلام نہیں بناتے، اب خواہ ان میں عقل بالکل نہ ہو یا ہو تو نہ ہونے کے برابر ہو۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح رہے گی کہ انہوں نے طبعیت جیسے جاہل اور بے شعور حاکم کو اس کی جاہلانہ کارروائیوں کا عالم وفاضل نہیں بنایا اور یہ انسان طبعی حرکات کرتا ہے اور عقل سے انہیں مزین بنا کر حیوانی حرکات کو انسانی بلکہ ملکی حرکات ثابت کرنا چاہتا ہے، تو جانور سے زیادہ احمق ثابت ہوا۔

طبعی تقاضوں کی مخالفت کمال ہے...... نیز یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ طبعی تقاضوں کو پورا کر لینا کوئی کمال کی بات نہیں۔ بلکہ طبعی تقاضوں کے خلاف کرنا کمال ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں، کیوں کہ میں کھانا کھایا کرتا ہوں تو لوگ کہیں گے کہ احمق یہ کون سی کمال کی بات ہے، جانور بھی کھانا کھاتے ہیں، یہ تو طبعی تقاضا ہے اس میں نہ محنت ہے نہ مشقت اور نہ ہی اس سے انسان کی کوئی جوانمردی اور جفاکشی ظاہر ہوتی ہے ورنہ سارے جانور بھی فضلاء اور باکمال ہوں گے یا اگر کوئی کہے گا کہ میں بڑا فاضل آدمی ہوں کیوں کہ میں رات کو پڑ کر سوتا ہوں تو بھی

کہا جائے گا کہ یہ تو ایک غیر اختیاری اور طبعی فعل ہے جانور بھی کر لیتے ہیں تو اس میں کمال کی بات کیا ہوئی؟

کمال نام ہے خلاف طبع کرنے کا کہ اس میں انسان کی محنت جفاکشی اور تحمل وصبر کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی کو سنایا جائے کہ وہ مہینوں کھانا نہیں کھاتا تو لوگ اسے باکمال سمجھ کر اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں کہ واقعی خلاف طبع پر قابو پالینا کمال ہے نہ کہ طبع کا غلام بن کر طبعی تقاضوں کو پورا کر لینا کمال ہے۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

حجۃ الاسلام سیدنا الامام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا بصیرت افروز واقعہ...... ابھی جس بزرگ کا نام نامی آپ کے سامنے لیا گیا تھا یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، جن کا علم وفضل اور کمال ظاہری وباطنی معروف ہے، ان کا زمانہ اور پنڈت جی دیانند سرسوتی کا زمانہ ایک ہے۔ پنڈت دیانند ہندوؤں کے فرقہ آریہ سماج کے بانی ہیں۔ انہوں نے قصبہ رڑکی میں اسلام پر اعتراضات کئے، علماء نے دندان شکن جوابات دیئے اور کہا کہ اگر جرأت ہے تو میدان میں آکر بحث کرو، اس نے کہا کہ تم لوگ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں تو صرف ''مولبی کاسم'' سے بحث کروں گا۔ چنانچہ رڑکی کے علماء نے حضرت کو خط لکھا۔ کہ ایسا واقعہ درپیش ہے آپ تشریف لاویں باوجودیکہ حضرت مولانا قاسم بیمار تھے۔ مگر مذہب اسلامی کی حفاظت و اشاعت کی خاطر اپنے چند شاگردوں کے ساتھ رُڑکی تشریف لے گئے۔

جن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب محدث دارالعلوم دیوبند، مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہی۔ مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری اور دیوبند کے مشہور ادیب منشی نہال احمد وغیرہ حضرت کے خدام خاص شریک سفر تھے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دیوبند میں کل ڈیڑھ ذہین ہیں، پورے ذہین حکیم مشتاق احمد صاحب اور آدھے ذہین منشی نہال احمد ہیں ان میں سے جب کوئی میرے وعظ میں بیٹھ جائے تو مضامین کی آمد شروع ہو جاتی ہے کہ سمجھنے والے موجود ہیں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ رُڑکی پہنچے۔ تو انہوں نے منشی نہال احمد کو پنڈت دیانند کے پاس بھیجا کہ تاکہ وہ پنڈت جی سے مباحثہ کی شرائط طے کریں، جب منشی صاحب پنڈت جی کی قیام گاہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ پنڈت جی کھانے کی میز پر بیٹھ چکے ہیں، کھانے سے فارغ ہو کر بات چیت کریں گے۔ اتنے میں پنڈت جی کے لئے ایک بڑی لمبی چوڑی (پیتل کی سینی) میں کھانا آیا۔ جس میں تقریباً چار پانچ سیر پوریاں، دو ڈھائی سیر حلوا اور اسی مقدار میں ترکاری تھی گویا دو تین دھڑی کا ملبہ سینی میں دیکھا گیا جو پنڈت جی کے لیے لایا گیا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ پرات صاف ہو کر باہر آئی جس میں ایک حبہ بھی باقی نہ تھا، منشی صاحب سمجھے کہ پنڈت جی کے ساتھ کھانے میں اور لوگ بھی شریک ہوں گے کیوں کہ ایک آدمی بھلا اتنا کہاں کھا سکتا ہے، منشی صاحب کمرہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ اکیلے پنڈت جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ شاید لوگ کسی دوسرے دروازے سے نکل گئے ہوں گے، مگر دیکھا کہ کمرہ میں کوئی دروازہ ہی نہیں۔ پھر انہوں نے خادم سے پوچھا بھی کہ اس کھانے میں کیا

اور بھی پنڈت جی کا شریک تھا؟ اس نے کہا کہ نہیں صرف پنڈت جی ہی نے کھانا کھایا ہے۔ منشی صاحب حیران رہ گئے کہ یا اللہ ایک آدمی اور اتنا کھانا، بہر حال پنڈت جی سے مباحثہ کے متعلق گفتگو ہوئی اور منشی صاحب نے واپس آ کر حضرت سے ساری گفتگو نقل کر دی، اس سلسلہ میں سنانا یہ ہے کہ منشی جی حضرت کے پاس سے الگ ہو کر جب اپنے ہم جولیوں میں بیٹھے تو منشی صاحب نے کہا کہ بھائی مجھے ایک بات کی بڑی فکر ہوگی، وہ یہ کہ اگر مسائل میں پنڈت جی سے مناظرہ ہوا تو یقین ہے، ہمارے حضرت جیت جائیں گے، کیوں کہ بحمد اللہ حق پر ہیں۔

لیکن یہ فکر ہے کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کیوں کہ پنڈت جی تو پندرہ سیر کھا کے بھی دم نہیں لیں گے، اور ہمارے حضرت آدھی چپاتی ہی کھا کر بیٹھے رہیں گے، تو یہ بات کیونکر بنے گی۔ بات ہنسی کی تھی۔ تمام احباب سن کر ہنس پڑے اور بات ختم ہوگئی۔ لیکن شدہ شدہ یہ بات حضرت تک پہنچ گئی تو منشی جی کو بلایا اور کہا کہ آپ نے کیا کہا تھا۔

منشی جی گھبرائے فرمایا کہ: میں بات سن چکا ہوں مگر پھر بھی تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے اس کا جواب دینا ہے، منشی جی نے ڈرتے ڈرتے اپنا مقولہ دہرایا۔ فرمایا کہ: اس کے دو جواب ہیں، اول الزامی جواب ہے اور وہ یہ کہ کیا ساری باتوں کے مناظرہ کے لئے میں ہی رہ گیا ہوں۔ آخر تم لوگ کس لئے ساتھ آئے ہو۔ کھانے میں بحث ہوئی تو تم مناظرہ کر لینا، دوسرا جواب تحقیقی ہے اور وہ یہ کہ (حضرت نے ذرا چیں بہ چیں ہو کر فرمایا) تم اتنے دن صحبت میں رہے، تمہارے ذہن میں یہ سوال کیونکر پیدا ہوا کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ مناظرہ علم میں ہوتا ہے یا جہالت میں؟ کھانا بھیمیت کی علامت ہے اور بھیمیت جہالت کا شعبہ ہے تو کیا تم مجھے بھمیت اور جہالت میں مناظرہ کرانے کے لیے یہاں لائے ہو؟ اگر بھیمیّت میں مناظرہ ہوا تو ہم بہائم مقابلہ کے لئے پیش کر دیں گے، ہم پنڈت جی کے مقابلہ میں بھینسے کو پیش کریں گے، اونٹ کو پیش کریں گے، اور بات بڑھی تو ہاتھی کو پیش کریں گے، کہ کھاؤ کتنا کھاتے ہو؟

پھر فرمایا کہ: مناظرہ علم کا شعبہ ہے نہ کہ کھانا، تو تمہارے ذہن میں یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کیوں کہ مناظرہ علم کے دائرہ کی چیز ہے اس کا مناظرہ ہوا تو انسان پیش کیا جائے گا، جو ذی علم ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو ہم کہیں گے کہ کھانا کھانے کے بعد ہمیں بھی اور پنڈت جی کو بھی ایک مقفل کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے اور چھ مہینہ کے بعد کھولا جائے اور جو تر و تازہ نکلے سمجھئے کہ وہ حق پر ہوگا۔

اھل اللہ کا ذریعۂ حیات ...... اس سلسلہ میں میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے وفات سے چند ماہ پیشتر فرمایا کہ اب مجھے بقاء حیات کے لئے بحمد اللہ کھانے پینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اتباع سنت کے لئے کھاتا پیتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ذکر اللہ رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ تو وہی ذریعہ حیات بن جاتا ہے، جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کی شان ہے کہ وہ اظہار عبدیت اور امت کے لئے نمونہ عمل

چھوڑنے کے لئے کھاتے پیتے ہیں اور وہ بھی انتہائی قلیل مقدار میں، اور وہ بھی بے حد سادہ کھانا، جیسے جو وغیرہ اور وہ بھی بے شمار فاقوں کے ساتھ، اس سے واضح ہوا کہ طبعی تقاضوں کی مخالفت اور ان کے ترک کا نام کمال ہے، جو جوانمردی ہے۔ طبعی تقاضے پورا کر لینے کا نام کمال نہیں۔ یہ کمال ہے تو ہر جانور میں ہے۔

ایسے ہی فنون طبعیہ میں بڑھ جانے اور ترقی کر جانے کا نام علم اور کمال علم نہیں ہے یہ طبعی علوم بقدر بساط حیوانات میں بھی ہیں۔ علمی کمال یہ ہے کہ اللہ سے باتیں کر کے علم حاصل کیا جائے جو طبیعت کے تقاضوں سے بالاتر ہے اور وہ علم وحی ہے، جو صرف پیغمبروں کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے، نہ کہ نفس میں خیالات پکا کر انہیں خوبصورت طریقوں سے نمایاں کر دینے سے ملتا ہے وہ صورت علم کہلائے گا حقیقی علم نہیں اور جب یہ علم الٰہی ہی انسانی خصوصیت ہے، تو انسان کے معنی ہی علم الٰہی کے حامل ہونے کے نکلے، اس لئے انسان نام جیسے کپڑے پہننے، گھر بنا کر رہنے اور کھانا کھانے کا نام نہیں۔ ایسے ہی دو کان، دو آنکھ ایک ناک اور مخصوص صورت زیبا کے نہیں بلکہ سیرت زیبا کے ہیں، جو علم لدنی اور علم الٰہی سے بنتی ہے۔ انسان وہ ہے جس سے علم و حکمت کا چشمہ پھوٹے یا اس چشمہ سے سیراب ہو، یا اس کا حامی ہو اس لئے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا: ''اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ مَلْعُوْنٌ مَافِيْهَا اِلَّا عَالِمٌ اَوْمُتَعَلِّمٌ'' ① ''دنیا ملعون جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون سوائے عالم کے یا متعلم کے یا ان کے حامی اور دلدادہ کے'' اور وہ علم جو عالم یا متعلم سیکھتا سکھاتا ہو کتاب و سنت کا علم ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ ''اِنَّمَا الْعِلْمُ اٰيَةٌ مُحْكَمَةٌ اَوْسُنَّةٌ قَائِمَةٌ اَوْفَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ'' ② لاشبہ علم یا محکم آیت (قرآن) ہے یا سنت قائمہ ہے یا فریضہ عادلہ جو کتاب و سنت کے مشابہ ہو یعنی قیاس مجتہد یہ علم صرف انبیاء سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ عقل و طبع یا وہم و خیال سے۔

علم نبوی محنت اور مجاہدات سے ہی حاصل ہوتا ہے..... مگر یہ علم آتا ہے محنت اور خلاف طبع مجاہدے اور ریاضت کرنے سے کیوں کہ یہ علم علوم طبعیہ و عقلیہ کی طرح طبعی نہیں اس لئے سب علوم سے افضل ہے کیوں کہ امور طبعیہ کا انسان سے سرزد ہونا عجیب نہیں۔ عجیب یہ ہے کہ اس میں ایک چیز نہ ہو اور وہ آ جائے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سوال فرمایا۔

بتاؤ کہ ایمان عجیب کن لوگوں کا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ملائکہ کا ایمان۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ملائکہ کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں۔ ہر وقت وہ تجلیات ربانی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جنت، دوزخ ان کے سامنے ہے، وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون لائے گا؟ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ انبیاء کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: انبیاء ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟ رات دن تو ان پر

---

① روایت حسن ہے۔ السنن للترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی ھوان الدنیا علی اللہ عزوجل، ج:۴، ص: ۵۶۱ رقم ۲۳۲۲.

② السنن للترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی ھوان الدنیا علی اللہ عزوجل، باب منه ج:۸ ص: ۳۰۲.

ملائکہ اترتے ہیں، اللہ کی وحی ان پر آتی ہے، جلال و جمال خداوندی ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، معجزات ان کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟

تو پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! پھر سب سے زیادہ عجیب ایمان ہمارا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں کیا ہوا جو تم ایمان نہ لاؤ۔ پیغمبر تمہارے سامنے ہے معجزات تم بچشم خود دیکھتے ہو۔ وحی تمہاری آنکھوں کے سامنے اترتی ہے۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون لائے گا؟ تو پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: ''اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ'' خدا تعالیٰ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ عجیب ایمان کن لوگوں کا ہے؟ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان عجیب ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ نہ پیغمبران کے سامنے ہوں گے نہ معجزات ان کے مشاہدہ میں آئیں گے اور اوپر سے شکوک و شبہات ڈالنے والے ہزاروں ہوں گے مگر پھر بھی وہ ایمان لائیں گے اور اس پر جمیں گے تو ان کا ایمان عجیب ہوگا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو چیز موانع کی کثرت اور رکاوٹوں کے ہجوم میں حاصل کی جاتی ہے وہی زیادہ عجیب ہوتی ہے ورنہ اگر کسی چیز کے معدات اور مویدات بکثرت ہوں اور اس کی طرف جھکانے والے اسباب بہت ہوں، رکاوٹ بالکل نہ ہو تو اس کا حاصل کر لیا جانا زیادہ عجیب نہیں ہوتا، اس بنا پر کہا گیا ہے کہ ملائکہ اگر عبادت میں مصروف ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں، کیوں کہ تجلیات الٰہیہ تو ہمہ وقت سامنے ہیں اور رکاوٹیں بالکل نہیں۔ نہ ان کے پیچھے کھانے پینے کا جھگڑا، نہ بیوی بچوں کا دھندا، نہ شہوت و غضب کا قصہ تو عبادت ان کے حق میں امر طبعی ہے، اور طبیعت کے تقاضوں کا پورا کر لینا کوئی حیرت ناک بات نہیں، بلکہ اس سے رک جانا حیرت ناک اور عجیب ہے۔

پس جیسے انسان کے حق میں کھانا پینا سونا جاگنا عجیب نہیں کیوں کہ طبعیت کا تقاضا ہے ایسے ہی عبادت کرنا فرشتوں کے حق میں طبعی بات ہے جس کو بجالانا عجیب نہیں۔ عبادت اگر عجیب ہے تو انسان کے حق میں ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی ساری نفسانی خواہشات اور طبعی تقاضوں کو پامال کر کے اور بالفاظ دیگر اپنے نفس کو قتل کر کے رکوع و سجود میں لگتا ہے۔

انسان کی عبادت فرشتوں کی عبادت سے بدرجہا افضل ہے ...... انسان کا ایک سجدہ فرشتوں کی ہزاروں برس کی عبادت سے عجیب بلکہ افضل ہے کیوں کہ وہ نفس کشی پر مبنی ہے نہ کہ نفس کے تقاضوں پر وہ صبح کے وقت گرم لحاف میں سے اٹھ کر اور خواہشات نفس کے خلاف سردی میں پانی سے وضو کر کے اور اوپر سے اپنا گھر چھوڑ کر خدا کے گھر کی طرف دوڑتا ہے اور سجدوں میں لگتا ہے۔ نفس اسے نیند کے لئے آمادہ کرتا ہے کہ یہ نرم نرم بستر سے نہ اٹھے۔ ہاتھ پیر کو وضو کے پانی سے ٹھنڈا نہ کرے۔ سرد ہواؤں میں سکڑتا ہوا مسجد کی طرف نہ جائے۔

مگر وہ ان ساری طبعی خواہشات پر لات مار کر محض اپنے مالک کی رضا کے لئے جاتا ہے اور مسجد میں پہنچ کر خداوند کریم کے حکم کی تعمیل دل و جان سے کرتا ہے تو یہ مخالفت نفس ملائکہ میں کہاں؟ اور یہ نفس کشی اور جہاد نفس ملائکہ کو کہاں میسّر؟ کہ وہاں نہ نفس امارہ ہے نہ ہوائے نفس ہے کہ اس کا مقابلہ کیا جائے اور جہاد کر کے نفس کو پچھاڑا

جائے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ملائکہ کی توہین کر رہا ہوں۔العیاذ باللہ۔وہ اللہ کے مقدس بندے ہیں۔

﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہیں، جن سے کبھی بھی گناہ ومعصیت کا صدور ممکن نہیں ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ ① ان کی توہین کفر ہے اوران پر ایمان لانا واجب ہے۔یہ صرف بیان حال ہے کہ ان کی عبادت بلا مزاحمت نفس ہے۔

انسان کی عبادت پوری مزاحمت نفس ہے......اورانسان کی عبادت پوری مزاحمتِ نفس سے ہے۔مقصد یہ ہے کہ طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرنا کمال نہیں بلکہ خلاف طبیعت کرنا کمال ہے۔ٹھیک اسی طرح انسان کی طبیعت اس کی متحمل نہیں کہ اس میں علم آئے بلکہ جہالت اس کی طبیعت کا تقاضا ہے،اس کی جبلت میں جہل ہے علم نہیں۔کوئی انسان ماں کے پیٹ سے ہنر لے کر نہیں آتا۔محنت وریاضت سے ہنر پیدا کرتا ہے طبیعت کو مار کر علم حاصل کرتا ہے جو عجیب بھی ہے۔اور کمال بھی ہے۔کمال اس لئے ہے کہ مجاہدے سے اسے حاصل کیا جس سے اس کے اندرونی قویٰ کی قوت اور کارگزاری نمایاں ہوتی ہے اور عجیب اس لئے ہے کہ وہ انسان جو ایک گندے قطرہ سے بنایا گیا ہے۔اور جماد لَايَعْقِل مادہ (نطفہ) سے تیار ہوا۔نہ نور سے بنا نہ نار سے۔بلکہ پامال خاک سے جس میں شعور کا نشان نہیں اور پھر ایسا باشعور نکلا کہ دنیا بھر پر فوقیت لے گیا۔نوری ملائکہ پر فائق ہوا اور ناری جنات پر غالب آ گیا محض علم کے کمال سے۔

انسان اور ملائکہ کے علم کا فرق !......تو علم کا ان گندے مادوں اور کثیف جسموں میں اتار لینا کمال نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور اس عجیب وغریب کمال سے اگر وہ ساری کائنات سے بازی لے جائے تو اس تامل کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔پس ملائکہ میں اگر علم آتا ہے تو یہ ان کا طبعی تقاضا ہے اوران کا علم ان کے اندرون سے ہے اور اندرون میں رہتا ہے۔اس لئے پھیل نہیں سکتا جتنا ہے اتنا ہی رہے گا،لیکن انسان مجاہدہ سے علم حاصل کرتا ہے اور جو چیز اس کے اندر نہیں ہے۔وہ باہر سے لاتا ہے اوراسے علم حاصل کرنے کیلئے مشقت ومجاہدہ کے ساتھ کتنے ہی راستے تحصیل علم کے لئے طے کرنے پڑتے ہیں۔اور کتنی ہی منزلوں سے گزر کر وہ علم کے مختلف درجات ومراتب اور علمی مقامات تک پہنچتا ہے،اس لئے اس کا علم پھیلتا ہوا ہوتا ہے،اس میں تدبر وتفکر شامل ہوتا ہے۔جس سے من بھر علم دس من ہو کر نمایاں ہوتا ہے۔پس ملائکہ کا علم عطائی قسم کا علم ہے،جس میں پھیلاؤ نہیں،اورانسان کا علم تدبر وتفقہ لئے ہوئے ہوتا ہے،جس میں پھیلاؤ ہوتا ہے،یعنی فرشتے کو اگر چار مسئلے معلوم ہیں وہ چار کے چار ہی ہیں اورانسان کو چار مسئلے معلوم ہو جائیں تو وہ تدبر واجتہاد کے ذریعے ان چار میں دس بیس مسائل اور علوم پیدا کر لیتا ہے اور نئے نئے علوم نکال لیتا ہے۔اس لئے ملائکہ نے بمقابلہ آدم صفائی سے خود اقرار کر لیا تھا۔

انسانی علم کی فضیلت......﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ اورانسان کے استنباط کو اوراجتہاد کو اس کے خدا نے سراہا کہ:﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۚ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ

① پارہ:۲۸،سورۃ التحریم،الآیۃ:۶.

وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ ① پس علمی لائن میں انسان کی برتری ملائکہ پر ایک تو کمیت علم کے لحاظ سے ہے کہ اسے تمام اسماء کی تعلیم ملی۔ جو ملائکہ کو نہیں ملی اور دوسرے کیفیت علم کے لحاظ سے ہے کہ ملائکہ اپنی معلومات میں تفقہ واجتہاد سے کوئی اضافہ نہیں کر سکتے اور انسان کرتا ہے، پس اللہ نے انسان کو سب سے زیادہ علم بھی دیا اور اس میں زیادتِ علم کی صلاحیتیں بھی رکھ دیں۔

استنباط وارتقائے علم صرف انسانی علوم کا خاصہ ہے ..... پس علم اور ارتقائے علم درحقیقت انسان ہی کی خصوصیت ثابت ہوتی ہے، جو دوسری مخلوقات میں نہیں اور ظاہر ہے کہ جامع علم شاہیت کی شان ہے کیوں کہ بادشاہ کا کام مزدوری کرنا نہیں۔ بلکہ اپنی مملکت کا علم رکھنا ہے تا کہ احکام دے سکے۔ اس لئے جب انسان کو سب سے زیادہ علم دیا گیا تو قدرتی طور پر نیابت وخلافت خداوندی بھی اسی کا کام ہوسکتا تھا جو اسے مل گیا۔ اور اس کائنات کا سارا انتظام اس کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ نائب الٰہی بن کر اس کی کائنات پر حکم چلائے، کائنات سے کام لے۔ اور اس میں حسب منشاء تصرفات کرے۔ اس لئے وہ حیوانات سے الگ کام لیتا ہے۔ جمادات سے الگ بیگار لیتا ہے، زمین سے آسمان تک اس کے تصرفات چلتے ہیں۔ وہ اس مادی کائنات کے مادوں میں علم کی طاقت سے جوڑ توڑ کر نئی نئی ایجادات کرتا ہے اور اس طرح اپنے علم کی وسعت کا ثبوت دیتا رہتا ہے، سب سے پہلے علم یہ ہے کہ شی کا نام معلوم ہو کیوں کہ علم میں سے نئی نئی باتیں نکالنا اور پھر عمل وصنعت میں نئی نئی اختراعات کرنا نہ فرشتوں سے بن پڑا نہ جن وحیوان سے۔

استعدادِ علم کی ترقی ..... بلکہ صرف انسان سے۔ تو حق تعالیٰ کی ازلی عنایت اس پر متوجہ ہوئی اور اسی کو اس نے اپنی توجہ وعنایت سے تدریجی طور پر علم سکھلایا۔ چنانچہ علم کا بالکل ابتدائی مرتبہ شی کا نام معلوم ہونا ہے۔ اگر نام ہی معلوم نہ ہو تو اسکی طرف توجہ ہی محال ہے اس لئے کہ مجہول مطلق کی طرف توجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ پس حق تعالیٰ نے اپنے سب سے پہلے شاگرد حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاء کے نام سکھلائے۔ جو علم کی ابتدائی منزل ہے۔

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾

شی کا نام معلوم ہو جانے پر طبعًا آدمی کا جی چاہتا ہے کہ میں اس کو دیکھ بھی لوں۔ جس کا نام سنتا آ رہا ہوں تو پھر حق تعالیٰ نے وہ ناموں والی کائنات پہچانوائی کہ وہ معلوم الاسماء اشیاء فلاں فلاں ہیں۔ تو زمین وآسمان اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے انہیں پیش کیا۔ پس ان کے خواص وآثار بتلائے۔ پھر ان کے نتائج وغایات پر مطلع فرمایا۔ پھر ان سے کام لینا سکھلایا اور پھر ان سے نفع حاصل کرنے کے طریقے سکھلائے۔ غرض درجہ بدرجہ عالم بشریت علمی ترقی کرتا رہا اور انبیاء علیہم السلام یکے بعد دیگرے معلم بن کر آتے رہے۔ اور علم کے مراتب کی درجہ بدرجہ تعلیم دیتے رہے۔

تکمیل علم وخلافت ..... یہاں تک کہ جب انسانی استعداد جامع علم کی متحمل ہوگئی اور قرنہا قرن گزرنے اور علمی

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۳.

مشق کرنے کے بعد وہ ہمہ گیر علم کے لئے مستعد ہوگئی تو آخری معلم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بنا کر بھیجا۔ جنہوں نے حقائق الٰہیہ کی تعلیم دی اور علم کو کامل کرتے ہوئے اس کے ہر ہر حکم کی علت اور لِم پر مطلع فرمایا۔ جس سے انسان نے حقیقت علم کا سراغ پایا اور وہ قرآن حکیم کے جامع علم سے روشن ضمیر بنا۔

پس وہ خلافت جو حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں وہ اپنے انتہائی مقام پر پہنچ گئی، کیوں کہ اس کا مبنیٰ علم تھا، علم ابتداء میں علم الاسماء کے ابتدائی دور میں تھا، تو اس پر مبنی شدہ خلافت بھی ابتدائی ادوار میں رہی اور وہی علم جب ترقی کر کے حد کمال پر پہنچ گیا کہ اس کے بعد کسی نبی ہی کے آنے کی گنجائش نہ رہی۔

جو کوئی نیا علم اور نئی شریعت لے کر آئے تو خلافت بھی حد کمال پر پہنچ گئی۔ چنانچہ خلافت ظاہری تو حقائق کائنات کی تسخیر ہے، جس کے ذریعے عناصر اربعہ کے عجائبات نمایاں ہوں۔ اور خلافت باطنی حقائق الٰہیہ کی تحصیل ہے۔ جس کے ذریعہ روحانیات کے عجائبات نمایاں ہوں۔ سو ظاہر ہے کہ دور محمدی میں یہ دونوں ہی خلافتیں حد کمال کو پہنچ گئیں۔ ایک سے ایک محیر العقول مادی ایجادات انتہا کو پہنچ رہی ہیں۔ جو عقل ونفس کے کمال کی دلیل ہے۔ اور ایک سے ایک حیرت ناک علمی وروحانی اجتہادات انتہا کو پہنچے جو تفقہ نفس کے کمال کی دلیل ہے۔ غرض تعقل اور تفقہ یا عقل نفسانی اور فقہ روحانی دونوں حد کمال کو پہنچ گئے۔ کیوں کہ علم جامع دنیا کے سامنے آ گیا۔ اس لئے خلافت صوری واسمی بھی مکمل ہوگئی اور خلافت حقیقی ومعنوی بھی تکمیل کو پہنچ گئی۔

اختصاصِ خلافت...... لیکن صورت بلا حقیقت ناپائیدار اور بے معنی ہے۔ اس لئے مادی خلافت بغیر روحانی خلافت کے بے معنی اور جسم بلا روح کی مانند ہے۔ جس کے لئے نہ بقا ہے۔ نہ پائیداری اس لئے اصل خلافت وہی علمی خلافت کہی جائے گی جس سے انسان کا کامل امتیاز ساری کائنات پر نمایاں ہوگا۔ تاہم یہ دونوں خلافتیں انسان ہی کو دی گئیں، نہ ملائکہ کو ملیں نہ جنات وحیوانات کو کیوں کہ علم کا یہ مقام اور کسی کو نہیں ملا۔ ہاں یہ علم انسان ہی میں کیوں ترقی کرسکتا تھا اور کیوں وہ بہائم یا جنات یا ملائکہ میں ترقی پذیر نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ بھی دونوں قسموں کی خلافتوں کے مستحق ہوجاتے۔

مادی ترقی عناصر کے تصادم وٹکراؤ کا نتیجہ ہے...... سو اس کی بناء یہ ہے کہ علم کی ترقی ہو یا صنعت وعمل کی۔ بغیر تصادم اور ٹکراؤ کے نہیں ہوتی۔ بلکہ ترقی نام ہی ٹکراؤ اور تصادم کا ہے کہ اس کے بغیر علم اور قدرت کے مخفی راز آشکارا نہ ہوسکتے کیوں کہ یہ ایک فطری اصول ہے کہ بسیط مادہ میں ترقی نہیں ہوتی۔ جب تک کہ اسے اس کی ضد سے ترکیب دے کر ٹکرایا نہ جائے۔ مثلاً محض آگ میں کوئی ترقی نہیں۔ جس طرح ہزاروں سال پہلے وہ جلتی اور بھڑکتی تھی، اسی انداز میں آج بھی جلتی اور بھڑکتی ہے۔ یہ نہیں کہ ہزار دس ہزار برس کے بعد اس کی لپٹ اور رنگ نے ترقی کر کے کوئی نئی صورت یا جدت پیدا کر لی ہو۔

اس کے کسی انداز میں نہ اضافہ ہے نہ ترقی۔ اس طرح محض پانی میں کوئی ترقی نہیں۔ سمندر کئی ہزار سال پہلے جس طرح ٹھاٹھیں مار کر اچھل کود کرتا تھا۔ اسی طرح آج بھی کر رہا ہے۔ نہ اس کے تموج نے کوئی جدت پیدا کی نہ جزر و مد نے وہی تموج آج بھی ہے، جو دس ہزار سال پہلے تھا۔ نیز سمندر بھی وہیں کا وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ اب بھی ہے جو پہلے تھا۔ کوئی رخ تبدیل نہیں۔ نہ اس کا رخ بدلا، نہ دھارا بدلا اسی طرح ہوا جیسے پہلے چل رہی تھی۔ اب بھی اسی انداز سے چل رہی ہے۔ زمین جیسے پہلے ایک تودۂ خاک تھی۔ اب بھی ہے، نہ اس میں کوئی جدت ہے نہ ندرت نہ ترقی ہے۔ نہ ارتقاء، لیکن اگر ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے ٹکرا دو، تو ترقی وہیں شروع ہو جائے گی۔ مثلاً پانی کو ایک برتن میں بھر کر اور بیچ میں ایک پردہ دے کر دوسری طرف آگ دھکا دیں کہ آگ پانی پر، حملہ آور ہو۔ اور پانی آگ پر وہ اسے ٹھنڈا کر دینا چاہے اور یہ اسے گرما دینا چاہے۔ تو ان دونوں کے ٹکراؤ سے ایک تیسری چیز پیدا ہو جائے گی۔ جسے بھاپ یا اسٹیم کہتے ہیں اور اس سے ملیں اور مشینیں چلنے لگیں گی۔ اور تمدنی ترقی شروع ہو جائے گی اگر آگ کو پانی سے ٹکر نہ دی جاتی تو محض آگ یا محض پانی سے کوئی انجن یا مشین نہ چل سکتی۔ تو یہ تمدّنی ترقی دو عنصروں کے تصادم اور ٹکراؤ کا نتیجہ ہے، جو تنہا ایک عنصر سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح اگر ہوا کو آگ سے ٹکرا دیا جائے اور فضا میں مثلاً آفتاب کی گرمی سے برسنے والی آگ ہوا کے جھونکوں سے متصادم ہوتی ہے تو شہاب ثاقب اور گرجنے والے رعد و برق پیدا ہوتے ہیں جن سے جو کے عجائبات نمایاں ہوتے ہیں۔

اور ساکن فضاء میں نئے نئے حوادث رونما ہوتے ہیں جو محض آگ یا محض ہوا سے نمایاں نہیں ہو سکتے اسی طرح اگر مثلاً مٹی اور پانی کو ملا دیا جائے کہ مٹی تو پانی کے سیلان اور رقت کو ختم کر دینا چاہتی ہے اور پانی مٹی کے جماؤ اور انجماد کو مٹا دینا چاہتا ہے تو ان دونوں کی ٹکر سے گارا پیدا ہو جائے گا۔ اور اس سے اینٹیں بننے لگیں گی جن سے مکانات کی تعمیر ممکن ہو گی پھر اس گارے سے برتن بننے لگیں گے، جن سے تمدّن کی ترقی ہو گی اور نئے نئے ڈیزائن کے ظروف و مکان اور سامان تیار ہو جائیں گے۔ اگر تنہا مٹی اور پانی اپنی اپنی جگہ پڑے رہیں تو یہ ترقی کبھی بھی رونما نہ ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ ترقی نام تصادم کا ہے، تصادم نہ ہو تو ترقی بھی نہ ہو ان اکوان کو چھوڑ کر اعیان میں لو، تو دو پہلوان مثلاً فن کشتی و سپہ گری کے ماہر ہوں۔

لیکن کبھی بھی زور آزمائی نہ کریں اور کبھی بھی باہم کشتی نہ لڑیں تو ان کے فن اور داؤ پیچ میں کوئی اضافہ نہ ہو گا۔ لیکن اگر ان دونوں پہلوانوں کو باہم ٹکرا دیا جائے اور وہ کشتی لڑ پڑیں۔ تو ہر ایک کوشش کرے گا کہ دوسرے کے داؤ کی کاٹ کرے تاکہ مغلوب نہ ہو، تو ہر وقت نئے سے نیا داؤ اپنے فنی قواعد کے تحت ایجاد کرے گا اور اس طرح فن کے مخفی گوشے کھل کر فن ترقی کرے گا۔ اور دنیا کے سامنے نئے نئے داؤ پیچ کھلتے رہیں گے۔

علم و جہل، و باطل کے تصادم کی حکمت ......اسی طرح ایک عالم کتنا ہی بڑا علم رکھتا ہو۔ اس کے علم میں خود بخود کوئی اضافہ نہ ہو گا۔ لیکن اگر اس عالم سے کسی جاہل کو لڑا دو جو اس پر اعتراضات اور سوالات کی بوچھاڑ کر دے تو

اس کے علم میں سے نئے نئے گوشے جوابوں کی بدولت پیدا ہو جائیں گے جن سے اس کے علم میں زیادتی ہوگی جو بغیر اس علم و جہل کی ٹکر کے کبھی نہ پیدا ہوتی۔ اسلام حق ہے اس کا علم اور قانون سچا ہے لیکن اگر اس کے مقابلہ پر کفر نہ ہوا اور وہ اس سے ٹکر نہ لیتا ہو تو اسلام کی قوتوں کے مخفی گوشے اور اس کے حقائق کے سربستہ راز جو اس میں پنہاں ہیں کبھی نہیں کھل سکتے۔ اور نہ ہی اس کی قوت نمایاں ہو سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اسلام کے مقابلہ پر کفر، اخلاص کے مقابلہ پر نفاق، سچ کے مقابلہ پر جھوٹ، علم کے مقابلہ پر جہل، دیانت کے مقابلہ خیانت، ملائکہ کے مقابلہ پر شیاطین، انبیاء کے مقابلہ پر دجال رکھ دیئے کہ یہ اضداد ان اصول سے ٹکراتی رہیں اور اس طرح ان کی پاکیزہ قوتیں اس ٹکراؤ سے نمایاں ہو کر ان کی صداقت کھولتی رہیں۔

قوموں کے باہمی تقابل میں درسِ عبرت...... اس طرح وہ قومیں کتنی ہی جاہ و جبروت کی حامل ہوں۔ لیکن اگر ایک کی دوسری قوم سے ٹکر نہ ہو تو ان کے مخفی جوہر جو مقابلہ ہی کے وقت کھل سکتے ہیں، کبھی نہ کھلیں۔ اس لئے جب دو قومیں لڑتی ہیں تو غالب و مغلوب کے ملنے سے ہمیشہ نئے نئے نظریات اور نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں تاکہ دنیا کی وہ ترقیات جو عقل انسانی اور علمِ روحانی سے وابستہ ہیں اپنے اپنے وقت پر ان تصادموں سے نمایاں ہوں۔ اور ہر قوم کے دماغی اور قلبی جوہر کھل کر اگلی نسلوں کے لئے مزید ترقیات کا درسِ عبرت بنیں۔ ورنہ ہر قوم ماء راکد (ٹھہرے ہوئے پانی) کی طرح سڑ کر اپنے جوہروں کو کھودے اور اقوام میں اس بے فکری سے سستی، کاہلی اور تن آسانی پیدا ہو جائے اور عالم میں فساد پیدا ہو جائے۔ اس لئے عوام کو ٹکرا کر ایک دوسرے کے لئے تازیانۂ عبرت بنا دیا جاتا ہے تاکہ بے فکری سے اپنے خلقی جوہروں کو ضائع نہ کرنے پائیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے اقوام کے تصادم کو خدا کے فضل و کرم سے تعبیر کیا ہے کہ اس کے بغیر نہ کائنات کے سربستہ راز ہی واشگاف ہو سکتے ہیں، نہ اقوام میں بیداری اور مستعدی پیدا ہو سکتی ہے، جو قدرت نے اس میں ودیعت رکھی تھی۔ فرمایا: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ ①

ٹھیک اسی طرح سمجھیں کہ انسان کے سوا کائنات کی تین باشعور مخلوقات ایک ایک جوہر کی حامل ہیں۔ حیوانات میں صرف بہیمیّت ہے، جنات میں صرف شیطنت ہے اور ملائکہ میں صرف ربانیت ہے۔ اسی لئے ان میں سے کسی میں بھی ترقی نہیں کوئی محض آگ کی مانند ہے جیسے جنّات۔ کوئی محض ہوا کی مانند ہے جیسے ملائکہ کوئی محض مٹی یا پانی کی مانند ہے جیسے بہائم۔ سو نہ جنات میں کوئی ارتقائی شان ہے۔ کسی جن نے آج تک نہ کوئی ایجاد کی جس سے دنیا میں سجاوٹ پیدا ہو جاتی نہ کسی فرشتہ نے آج تک کوئی اجتہاد کیا کہ نیا منہاج اور نئی شریعت پیدا ہو جاتی نہ کسی بہیمیّت نے آج تک کوئی نیا راستہ ڈالا جس سے دنیا کو کوئی رہنمائی ملتی۔

جنّات و شیاطین جس طرح ہزاروں برس پہلے حیلہ و فریب اور فساد انگیزی کرتے تھے۔ اسی نوعیّت کا آج بھی

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۱.

کرتے ہیں۔ بہائم کھانا، پینا، چرنا اور نسل بڑھانا جیسا پہلے کرتے تھے وہی آج بھی کرتے ہیں۔ نہ بیل کے گھاس کھانے کا اور نہ نرو مادہ کے ملنے کا کوئی جدید طریقہ نکلا، نہ فرشتہ کی نیکی کرنے کا کوئی نیا راستہ نکلا۔ نہ شیاطین کے مکرو زور میں کوئی جدّت پیدا ہوئی۔ بلکہ ہزار ہا ہزار برس پہلے ان انواع کے جو طبعی افعال تھے وہی کے وہی آج بھی ہیں۔ ان میں کوئی ترقی نہیں کیوں کہ یہ سب نوعیں اپنے اندر ایک ہی مادہ رکھتی ہیں اور ان کے اندرون میں تصادم کی کوئی صورت نہیں جو ترقی کی بنیاد تھی۔

تقابل صفات سے ترقی...... بخلاف انسان کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ساری قوتیں جمع فرما دیں اس میں ملکیت بھی ہے۔ بہیمیت بھی ہے اور شیطنیت بھی ہے تو لازمی تھا کہ یہ متضاد قوتیں باہم ٹکرائیں اور اس ٹکراؤ سے نئے نئے افعال کا ظہور ہو جو اکہری قوتوں سے نہیں ہوسکتا تھا مثلاً بہیمیت کا کام کھانا، پینا اور نسل بڑھانا تھا لیکن جب اس کے ساتھ ملکیت ٹکرا جاتی ہے تو تیسری قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کو عفت کہا جاتا ہے اور اس سے جائز و ناجائز کی سینکڑوں صورتیں پیدا ہوتی ہیں کہ فلاں کھانا جائز، فلاں حرام، فلاں نسل کشی حلال اور فلاں حرام فلاں چیز پینی جائز اور فلاں ناجائز غرض تدیّن کے ہزاروں گوشے عفت و پاک دامنی کی بدولت کھلتے ہیں جس سے دین و دیانت ترقی کرتے ہیں۔

اور عفت درحقیقت بہیمیت اور ملکیت کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جیسے آگ پانی کے ٹکراؤ کا نتیجہ بھاپ تھا۔ جس سے تمدن ترقی کرتا تھا۔ اسی طرح شیطنیت کا کام دھوکہ، فریب، دغابازی اور مکاری ہے اس کے ساتھ اگر ملکیت کی عقل لڑا دو تو تدبیر و تدبّر پیدا ہوگا، جس سے مکروفریب کی بجائے عقل خیز تدابیر کا ظہور ہوگا اور مخفی تدبیروں کا حسن نمایاں ہوگا اور حملہ آوری اور بچاؤ کے نئے نئے نظریات سامنے آئیں گے، درندوں میں قوت غضبیہ ہے جس کا ثمرہ تخریب اور چیر پھاڑ ہے۔

کمال کا ظہور اور مادی وروحانی ترقی...... لیکن اگر اس کے ساتھ ملائکہ کی متانت و بردباری کو ٹکرا دیا جائے تو اس سے شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ جس میں عقل و ہوش کے ساتھ جوش دکھایا جاتا ہے اور بہادری کے ساتھ دانائی کا استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال شہوت، غضب اور مکروفریب کے ساتھ اگر قوت عقلیہ کو لڑایا جائے تو اس سے پاکیزہ اخلاق پیدا ہوتے ہیں، اور علمی و اخلاقی اور دینی ترقیات کے دروازے کھل جاتے ہیں جو صرف انسان ہی سے ممکن ہیں۔ جن و ملک اور حیوان سے ممکن نہیں، کیوں کہ متضاد قوتوں کا مجموعہ انسان ہی ہے۔ اس لئے ترقی کی راہیں بھی انسان پر کھل سکتی ہیں۔ نہ کہ ان تین مخلوقات پر اس لئے اگر ایجادات سے دنیا کو سجایا تو انسان نے سجایا۔ ریل، تار، فون، بجلی اسٹیم، جہاز، کشتی سواری، مکان، ظروف، تجارت، حرفت، حکومت، انسان کے سوا کسی نے کر کے نہیں دکھلائی اور ادھر اجتہادت اور نقل و روایت کی استنادات دین، شریعت، مذہب، مشرب، ذوق وجدان حدس، تجربہ، علم، معرفت، قرب، طاعت، بصیرت بھی انسان کے سوا کسی نے حتیٰ کہ کسی پاکباز فرشتہ نے بھی کر کے نہیں

دکھلائی، یعنی انسان اس ترقی اور ان متضاد مادوں کے ٹکراؤ سے پیدا شدہ ارتقاء کی بدولت فرشتوں سے کہیں زیادہ اونچا پہنچا اور جبرئیل کی رسائی سے بھی آگے تک اس کی رسائی ہوئی جہاں ملائکہ بھی پر نہیں مار سکتے، یہ اس کی قوت عقلیہ کے قوت شہوانیہ، قوت غضبیہ، قوت سبعیہ سے ٹکراؤ اور عقل کے غلبہ کا نتیجہ ہے۔

قوائے شرّ کا عقل پر غالب ہونے کا نتیجہ...... ہاں اگر اس ٹکراؤ میں عقل مغلوب ہو جائے اور قوتیں بمقابلہ عقل کے غالب آجائیں یعنی عقل ان مادوں کی خادم بن جائے اور ان کے تقاضوں کو اپنی تدبیر سے پورا کرنے کی نوکر بن جائے تو پھر یہ بہائم سے چار ہاتھ آگے کا بھیمہ اور شیاطین سے درجوں اوپر کا شیطان بن جاتا ہے جس سے بھائم اور شیاطین بھی پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ اگر اس کی عقل بھیمیّت کا آلہ کار بن جائے تو بھائم کو وہ عیاشی اور بدکاری نہیں سوجھ سکتی جو اسے سوجھے گی۔

یہ زنا اور سیاہ کاری کی ایسی نئی نئی شکلیں ایجاد کرلے گا جو بہائم کے باپ کو بھی نہیں سوجھ سکتیں۔ اس کے ہاں عیاشی کے اڈے بن جائیں گے۔ زنا کے چکلے تیار ہو جائیں گے۔ فحاشی ایک فن اور ایک ہنر بن جائے گی اور حیوانات کے خواب میں بھی وہ حیوانیتیں نہ آئیں گی جو اس کا فحاش دماغ اور عیاش دل اختراع کرے گا اور اگر اپنی عقل کو مکروفریب کی قوتوں کا غلام بنا دیا تو پھر اسے وہ حیلے اور جعلسازیاں سوجھیں گی کہ شیطان کو صدیوں غور کر کے بھی نصیب نہ ہوں گی۔ غرض ان خلقی قوتوں کے ٹکراؤ میں اگر عقل غالب رہی تو یہ احسن تقویم کا ثبوت پیش کرے گا اور اگر عقل پر شہوت وغضب اور درندگی غالب آگئی تو پھر انسان اسفل سافلین میں کھڑا نظر آئے گا۔

لیکن غور کرو تو یہ عقل ان قوتوں پر علم کے ہتھیاروں سے غالب آسکتی ہے، بلا علم کے عقل طبعی ہے، جو بلاشبہ ان ہی طبعی قوتوں کا ساتھ دے گی اور انہیں اپنا کام کرنے کے نئے نئے راستے بتلائے گی لیکن عارف عقل جسے علم نے چمکا دیا ہو۔ ان قوتوں کو اپنی راہ پر چلائے گی، اور پھر ہر شعبہ زندگی میں انسانی کمالات کا ظہور ہوگا۔ اس لئے انسان کی فضیلت ان تینوں باشعور مخلوقات پر عقل محض سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ علم سے ثابت ہوتی ہے اور علم بھی وہ جو طبعی بھی نہ ہو اور کوراعقلی بھی نہ ہو بلکہ ربانی علم ہو جو بذریعہ وحی کے ذات حق کی طرف آتا ہے اور دلوں کو روشن کرتا ہے۔ عقلوں کو جلا دیتا ہے۔ ذہنوں کو رسا کرتا ہے۔ دماغوں کو صیقل کرتا ہے اور بالفاظ دیگر آدمی کو آدمی بناتا ہے ورنہ

آدمی کو بھی میسّر نہیں انسان ہونا

اس لئے ہمارا فطری اور عقلی فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اس شرعی اور الٰہی علم کو حاصل کریں جس سے ہماری روشنی وابستہ ہے۔

شریعت کی حکمرانی...... اور ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں اسی علم سے ہدایت حاصل کریں یعنی خلوت اور جلوت، انفراد اور اجتماع، دوستی اور دشمنی حکومت اور غلامی، خوشی اور غمی، راحت اور مصیبت، موت و حیات ہر مرحلہ پر اسی علم سے جس کا دوسرا نام شریعت ہے، رہنمائی حاصل کریں۔ اور اپنی عقل کو اس کے خادم کی

حیثیت سے ساتھ رکھیں۔ یہی قوتیں جو جہالت میں کام کرتی تھیں۔ اب علم میں کام کریں گی۔ وہی بھیمیت جو جہالت کے ساتھ عیاشی، فحاشی، بدکاری اور بے ایمانی پر لاتی تھی اب شریعت کے تابع ہو کر عفت وعصمت، پاکی، پاک دامنی اور نیکوکاری پر لے آئے گی، وہی قوت شیطنیت جو بحالت جہل مکاری، ڈپلومیسی، عیاری اور شرارتوں کی طرف لاتی تھی۔ اب تابع فرمان الٰہی ہو کر تدبیر ودانائی، دانش وبینش اور عاقبت شناسی کی طرف لے آئے گی۔ اور بالفاظ دیگر جبلتِ نفسانی سے نکال کر فطرت روحانی کی طرف نکال لائے گی۔ اس لئے خلاصہ یہ ہوا کہ طبیعت پر تو حکومت عقل کی قائم کردی جائے اور عقل پر حکمرانی شریعت اور علم الٰہی کی کردی جائے۔

اسلام کے دینِ فطرت ہونے کا معنی...... تو انسان مزکّی مصفا اور مجلّی ہو جائے گا ورنہ ایک بہیمہ یا ایک شیطان یا ایک درندہ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ شریعت انسان کے کسی خلقی مادہ کو ضائع کرنے یا پامال کرنے کے لئے نہیں آئی۔ بلکہ ٹھکانے لگانے کے لئے آئی ہے۔ تاکہ ہر قوت کو اس کا صحیح مصرف بتلا کر اس میں استعمال کرائے۔ یہی معنی ہیں اسلام کے دین فطرت ہونے کے، کہ اس نے ہر قوت کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ شہوت ہو یا غضب۔ سبعیت ہو یا شیطنیت کسی کو بھی بے کار نہیں ہونے دیا بلکہ ایک خاص پروگرام پر چلا دیا ہے، نیکی تو بجائے خود ہے، اس نے تو کسی بدی کو بھی علی الاطلاق نہیں مٹایا۔ بلکہ اپنے اشاروں پر چلایا ہے، مثلاً جھوٹ گناہ کبیرہ ہے۔ انسان کی جبلّت میں جوش کے وقت مبالغہ آمیزی اور خلاف واقعہ کلام کر جانا داخل ہے، شریعت نے اسے کلیۃً نہیں مٹایا۔ بلکہ فرمایا کہ اگر دو لڑتے ہوئے بھائیوں میں جھوٹ بول کر بھی صلح کرادو تو نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ اس پر اجر بھی ملے گا۔ اور ایسا اجر جو نماز، روزہ پر ملتا ہے۔ دو بھائی باہم لڑ رہے تھے۔ آپ نے ایک بھائی کے پاس جا کر کہہ دیا کہ میاں تم کس کا مقابلہ کر رہے ہو وہ تو تمہاری جدائی سے بے حد غمگین اور سوگوار ہے اور رات تو وہ آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور روتا تھا کہ ہائے میرا بھائی مجھ سے جدا ہو گیا۔ ادھر دوسرے بھائی کے پاس گئے اور اس سے بھی ایسی ہی باتیں کہیں، جس سے دونوں کے دل نرم ہو گئے اور مصالحت کو آمادہ ہو گئے۔ اور صبح کو دونوں نے معانقہ کر کے باہم صلح صفائی کر لی۔

شریعت نے جبلّی وطبعی قویٰ شر کو خیر کی طرف موڑا...... تو اس جھوٹ پر ثواب اس سچ کی نسبت یقیناً ملے گا جس سے فتنہ کا بیج بو دیا گیا اور دو ملے ہوئے بھائیوں کو لڑا دیا ہو۔ اس سے واضح ہے کہ جھوٹ جیسی چیز کو بھی شریعت نے مٹایا نہیں بلکہ محفوظ رکھ کر اپنے اشاروں پر چلایا ہے گویا معصیت بھی عبادت بن جاتی ہے۔ اگر شریعت کے اشاروں سے ہو اور اگر حق کو شریعت کے خلاف استعمال کیا جائے تو وہ معصیت بن جاتا ہے۔ غیبت سچ بولنے کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی کے عیب واقعی کو اس کے پس پشت بیان کرنے کا نام غیبت ہے۔ شریعت نے اس سچ کی ممانعت فرمائی ہے اور اسے حرام رکھا۔ حالانکہ غیبت سچی بات کو کہتے ہیں اور جھوٹ ہو تو وہ افتراء ہوگا غیبت نہ ہوگی تو یہ سچ بولنا حرام ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:۔ ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ﴾

یعنی غیبت کرنا ایسا گندہ فعل ہے جیسے اپنے بھائی کے مردار گوشت کو نوچ نوچ کر کھانا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ سچ عبادت ہے اور نہ جھوٹ معصیت بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے اور نہ ماننا معصیت ہے۔ یہی نماز تین اوقات میں حرام ہے۔ سورج طلوع ہوتے وقت۔ غروب ہوتے وقت اور استواء یعنی سر پر ہوتے وقت ان اوقات میں اگر نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا، معلوم ہوا کہ نہ نماز پڑھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے۔ کہنا ماننا عبادت ہے۔

عبادت کی حقیقت تسلیم و رضا ہے...... ماہ رمضان میں روزہ فرض ہے اگر بلا عذر ترک کیا جائے تو گناہ اور سزا دونوں سر پڑتے ہیں۔ لیکن یہی روزہ عید کے دن حرام ہے اگر روزہ رکھ لے گا تو گناہ گار ہو جائے گا، جس سے واضح ہے کہ نہ روزہ رکھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے، کہنا ماننا عبادت ہے کہ جب ہم کہیں، روزہ رکھو جب ترک کرائیں ترک کر دو، اپنی تجویز کو دخل مت دیں کہ یہی اطاعت درحقیقت عبادت ہے یہ نماز روزہ عبادت کی صورتیں اور مثالیں ہیں۔ حقیقتِ عبادت اطاعت اور تسلیم و رضا ہے۔

خودکشی حرام اور بہت بڑا جرم اور گناہ ہے مگر جہاد میں اپنے کو قتل کے لئے پیش کر دینا اور سر کو ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہی سب سے بڑی عبادت ہے، اس سے واضح ہے کہ نہ جان دینا عبادت ہے۔ نہ جان بچانا عبادت ہے۔ کہنا ماننا اور بروقت تعمیل حکم کرنا عبادت ہے۔ یہی قتل نفس اپنی نفس کے لئے کیا جائے تو معصیت ہے کہ خلاف اطاعت ہے اور یہی قتل نفس اگر حفاظت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر کیا جائے تو شہادت اور دین و عبادت ہے کیوں کہ یہ نفس اور بدن آپ کی ملکیت نہیں بلکہ سرکاری مشین ہے، اس کو آپ اپنی مرضی سے ضائع نہیں کر سکتے ہاں مالک کے حکم پر رکھ بھی سکتے ہیں اور کھو بھی سکتے ہیں، وہ رکھوائیں تو اس کا رکھنا اور بچانا عبادت ہے وہ خود ہی اسے تلف کرائیں تو تلف کر دینا ہی عبادت ہے۔ لوٹ مار اور غارت گری نہ معصیت ہے، نہ اس سے بچنا عبادت ہے کہنا ماننا عبادت ہے، اگر کہے کے مطابق لوٹ ماری بھی ہو تو عبادت اور کہے کے خلاف امن و امان دینا بھی معصیت ہے، زمین پر اکڑ کر سینہ تان کر اور مونڈھے ہلا کر چلنا کبر نفس ہے۔ جس کو قرآن نے حرام فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴾ "خدا کی زمین پر تکبر کی چال مت چلو۔ کیوں کہ تم اکڑ کر اور ابھرا ابھر کر زمین کو چیر نہیں دو گے۔ اور اونچے ہو کر طول میں آسمان تک نہیں پہنچ جاؤ گے"۔

پھر کیوں یہ اینٹھ کر چلنے کی مصیبت بھر رہے ہو جس سے صاف واضح ہے کہ اینٹھ مروڑ کے ساتھ چلنا معصیت اور جرم ہے، لیکن حج کے موقع پر جس طواف کے بعد سعی صفا و مروہ ہو اس میں ابتدا کے چار پھیروں میں اکڑ کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا واجب اور جزو عبادت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ اکڑ کر چلنا معصیت ہے، نہ جھک کر چلنا عبادت ہے۔ بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے، پس اصل چیز اطاعت حق نکلی، اگر اطاعت کے خلاف ہے تو نماز روزہ بھی معصیت بن جاتے ہیں، اور اگر کہے کے مطابق ہے تو جھوٹ، لوٹ مار، تکبر کی چال اور غارت گری بھی عبادت بن جاتی ہے۔ بس اس طرح تمام خلقی قوتوں کو شریعت کے موافق استعمال کیا جائے تو وہ سب اطاعت بنتی چلی جائیں

گی، اور خلاف حکم استعمال کیا جائے تو معصیت ہوتی چلی جائیں گی۔ اس سے عبادت کی دو نوعیں نکلتی ہیں ایک افعالِ خیر جن کا کیا جانا ضروری ہے، اور ایک افعالِ اثم جن سے بچنا ضروری ہے۔

بر وتقویٰ...... پہلی نوع کو شریعت کی اصطلاح میں بر کہتے ہیں جیسے فرمایا: ﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ﴾ ①

اور دوسری نوع کو تقویٰ کہتے ہیں، جس کے ذریعہ گناہ سے بچا جاتا ہے۔ عبادت کی ان دونوعوں کو پیش نظر رکھ کر غور کرو تو انسان ملائکہ سے علم ہی میں نہیں بڑھا ہوا ہے بلکہ عبادت میں بھی فائق ہے، کیوں کہ تقویٰ کی عبادت ملائکہ میں ہے ہی نہیں۔ کیونکہ تقویٰ کہتے ہیں شر سے بچنے کو اور بچنا اس چیز سے ہوتا ہے جس کا کرنا ممکن ہو۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شرّ کا مادہ ہی نہیں۔ وہ شر کے افعال کر ہی نہیں سکتے، تو ان سے بچنے کے لئے کہا بھی نہیں جاسکتا ہے اور انسان شر کر بھی سکتا ہے اور اس سے بچ بھی سکتا ہے۔ اس لیے شر سے اسے ہی روکا بھی جاسکتا ہے اور اس کا رکنا عبادت بھی قرار پاسکتا ہے کہ اور وہ ارادۂ رکتا ہے، فرشتہ میں نہ شرّ کا مادہ ہے نہ اس کے شرّ سے بالا رادہ رکنے کا سوال ہی پیدا ہوسکتا ہے، اس لئے تقویٰ کی نوع کی عبادت ہی فرشتہ کے لئے نہیں۔ یہ صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے تو انسان اس نوع عبادت میں ملائکہ سے بڑھ گیا اب جو عبادتیں کرنے کی ہیں۔ ان میں معاشرت، معاملات اور خانگی زندگی کی عبادت بھی فرشتوں کے لئے نہیں کیوں کہ ان میں نسل کا قصہ ہی نہیں کہ ان کے عزیز و اقارب پیدا ہوں اور معاملات لین دین، آشتی وصلح اور صلہ رحمی وغیرہ کی نوبت آئے اس لیے بر کا دو تہائی حصہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص نکلا، اب رہے اعتقادات، سو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے، کیوں کہ اعتقاد کی اصل ایمان ہے اور ایمان کے معنی ایمان بالغیب کے ہیں۔

فرشتہ کے حق میں کوئی چیز غیب ہی نہیں کہ اسے ایمان کا مکلف قرار دیا جائے اور ایمان لانے کی دعوت دی جائے۔ اس لئے اعتقادات کا حصہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہا۔ اب اگر رہ جاتا ہے تو دیانات کا رہ جاتا ہے۔ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، وغیرہ سو مال کی ضرورت معاشرت کے لئے ہے۔ فرشتوں میں معاشرت ہی نہیں۔ کہ نسل نہیں اس لئے مال کے لین دین کا بھی سوال نہیں ہوسکتا تو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہی رہا روزہ کے معنی اپنے ارادہ ونیت سے کھانا پینا اور لذت نساء کو ترک کرنا ہے، فرشتہ کے لئے نہ بیوی ہے نہ کھانا پینا تو وہاں اس عبادت کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اس لئے لے دے کر نماز رہ جاتی ہے تو میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ فرشتہ کی طبعی بات ہے اور طبعی تقاضوں سے کسی کام کا کرنا عجیب نہیں۔ انسان کا ایک سجدہ جو خلاف طبع کو برداشت کر کے ہوتا ہے۔ فرشتہ کی ہزار سالہ عبادت سے زیادہ وزنی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دیانات وعبادات میں بھی انسان ہی فرشتہ سے افضل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں یہ بہیمیت اور شیطنیت والی قوتیں ہیں جن کی بدولت تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ فرشتہ

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۷.

میں یہ دونوں قوتیں نہیں۔اس لئے وہ دو تہائی دین سے الگ تھلگ ہے۔اب انسان میں قوت عقلی ہے۔جو فرشتہ میں بھی ہے مگر اس عقل کے کتنے ہی مصرف جس سے عقلی قوت کی تفصیلات کھلتی ہیں۔صرف انسان میں ہیں ملائکہ میں نہیں۔اس لئے وہ اطاعت وعبادت میں بھی وہ انواع پیش نہیں کرسکتا جو انسان پیش کرسکتا ہے،غرض عبادت کے سینکڑوں دروازے ہیں جو فرشتوں پر بند ہیں اور انسان پر کھلے ہوئے ہیں۔اسلام کے معنی زندگی کے تمام شعبوں کو قانون خداوندی کے ماتحت گزارنا ہے،سو جو جامع زندگی انسان کو ملی ہے وہ کسی کو بھی نہیں ملی۔اس لئے اسلام اور تسلیم ورضا بھی اس کی جامع اور حاوی ہوسکتی ہے۔جو کسی دوسری نوع کے لئے ممکن نہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حکم ہوا۔﴿ اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ﴾ "اے ابراہیم مسلم بن جاؤ" تو یہ مطلب نہ تھا کہ معاذ اللہ کفر سے اسلام میں داخل ہو جاؤ بلکہ یہ تھا کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردو اور گردن جھکا دو تو عرض کیا۔

﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ①

میں مسلم بن گیا۔تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: اعلان کردو کہ میری زندگی اور موت۔میری نماز اور عبادت سب اللہ ہی کے لئے ہیں۔رضائے نفس کے لئے نہیں۔مجھے اسی کا حکم کیا گیا ہے اور میں اوّل مسلمین میں سے ہوں"۔

پس اسی تفویض وتسلیم کو اسلام کہتے ہیں کہ رضائے حق کے لئے جئے اور رضائے حق ہی کے لئے مرے اسی کی خوشنودی کے لئے صلح کرے،اسی کے لئے لڑے،اسی کے لئے محبت کرے،اسی کیلئے عداوت باندھے،اسی کے لئے دے اور اسی کے لئے ہاتھ روکے۔جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:"مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ" "جو اللہ ہی کے لئے محبت کرے،اسی کے لئے عداوت کرے،اسی کے لئے دے اور اسی کے لیے ہاتھ روک لے تو اس نے ایمان کامل کرلیا"۔

اور ظاہر ہے کہ یہ افعال فرشتہ کر ہی نہیں سکتا کہ اس میں شہوت ہے نہ شیطنیت ہے نہ غفلت ہے نہ نخوت۔اس لئے جو اطاعت انسان کرسکتا ہے وہ فرشتہ کر ہی نہیں سکتا کہ اس میں وہ مادے ہی نہیں۔جن کی روک تھام سے عبادت کی بے شمار شکلیں بنتی ہیں۔اس لئے فرشتہ کو ان علوم کی ضرورت بھی نہ تھی جو انسان کو تھی۔اس لئے کہ جتنی مادی رکاوٹیں انسان کے پیچھے ہیں۔اتنے ہی دفاع ومدافعت کے طریقوں کا علم اس کے لئے ضروری تھا۔

بنیادِ خلافت ......اس سے واضح ہوا کہ انسان کا علم بھی فرشتوں کی نسبت کامل اور جامع ہے اور اسکی عبادت بھی ان کی نسبت کامل اور جامع ہے اور بوجہ مدافعت جتنی عبادت انسان کی مضبوط ہے فرشتہ کی نہیں ہوسکتی۔اور ظاہر ہے کہ جب علم بھی اس کا کامل۔تو ساری کائنات میں سے صرف یہ انسان ہی مستحق تھا کہ نائب خداوندی بنے، کیوں کہ کمالات خداوندی لامحدود ہونے کے باوجود دو ہی نوعوں میں اصلاً منحصر ہیں،کمالات علم اور کمالات عمل اور انہی دو میں انسان ساری مخلوقات حتیٰ کے فرشتوں سے بھی بڑھ کر نکلا تو خدا کا نائب بھی ان کمالات میں وہی ہوسکتا

① پارہ:۸،سورۃ الانعام،الآیۃ:۱۶۲۔

تھا اور عمل چوں کہ علم کے تابع ہے اس لئے اصل بنیاد خلافت علم ہی ٹھہر جاتی ہے۔ جو انسان ہی میں حد کمال تک پہنچا ہوا ہے، اس لئے اسی کو خلیفہ الٰہی بنایا گیا۔

خلافتِ انسانی کے بارے میں ملائکہ کا سوال...... اسی لئے جب فرشتوں نے عرض کیا کہ اگر زمین میں خلیفہ بنانا ہے تو ہمیں کیوں نہ خلیفہ بنا دیا جائے کہ ہم سے زیادہ آپ کی تقدیس و تسبیح کرنے والا کون ہے؟ تو حق تعالیٰ نے اولاً حاکمانہ جواب دیا کہ اس معاملہ کو ہم جانتے ہیں۔ تم نہیں جانتے۔ جس سے ملائکہ خاموش ہو گئے اور پھر حکیمانہ جواب دیا کہ۔ آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دے کر ملائکہ کو چیلنج کیا کہ ذرا تم اشیاء کائنات کے نام تو بتا دو، وہ نہ بتا سکے تو حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا: تم بتاؤ۔ انہوں نے فرفر گنوا دیئے، تو بتا دیا گیا کہ علم کا ابتدائی مرتبہ علم اسماء ہے جب اسی میں تم انسان سے بازی نہ لے جا سکے تو اسماء کے بعد صفات اشیاء پھر خواص اشیاء پھر حقائق اشیاء وغیرہ کے علوم ہیں تم ان سے کب بازی لے جاسکو گے اس لئے مستحق خلافت انسان ہی ہے۔

بارہ گاہ الٰہی سے قولی و عملی جواب...... رہا عملی میدان تو اس میں ملائکہ نے نوع انسان کی مذمت کی تھی کہ وہ سفاک ہوگا۔ مفسد ہوگا تو قدم قدم پر حق تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے اعمال اول تو ملائکہ ہی سے لکھواتے ہیں تا کہ قیامت تک ان کے اس شبہ کا جواب عملی ہوتا رہے اور وہ انسان کی نیکی پر گواہ بنتے رہیں اور ساتھ ہی حدیث میں آیا ہے کہ جب کہیں مجلس خیر و وعظ نصیحت وغیرہ منعقد ہوتی ہے تو ہزاروں فرشتے اس مجلس پر نازل ہوتے ہیں جو اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں جیسا کہ یہ مجلس ہے جس میں آج ہم اور آپ جمع ہو کر ذکر حق سن رہے ہیں۔ اس میں بلاشبہ کروڑوں فرشتے تشریف فرما ہیں۔ جب یہ مجلس خیر ختم ہوگی۔ تو وہ فرشتے آسمانوں میں چڑھتے ہیں اور انہیں حق تعالیٰ سے قرب ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں تم کہاں گئے تھے۔ عرض کرتے ہیں آپ کے بندوں کی مجلس میں فرماتے ہیں تم نے میرے بندوں کو کس حال میں دیکھا؟ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی یاد میں، مصروف تھے، آپ کی جنت کے طالب تھے اور جہنم سے خائف تھے۔ فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے جنت، دوزخ کو دیکھا ہے؟ عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں انبیاء سے سن کر ایمان لائے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر جنت و نار کو دیکھ پائیں تو کیا کریں؟ عرض کرتے ہیں کہ اگر دیکھ پائیں تو سوائے جنت مانگنے اور دوزخ سے پناہ مانگنے کے انہیں کوئی کام ہی نہ ہوتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے ان سب کو بخش دیا۔ جو اس مجلس میں حاضر تھے۔ یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ جنت بخشنا تھا تو ان اربوں کھربوں فرشتوں کے نازل فرمانے اور انہیں آسمان پر چڑھا کر ان سے پوچھنے اور انہیں گواہ بنا کر مغفرت کرنے کی کیا ضرورت تھی، اس کے بغیر بھی مغفرت فرما سکتے تھے؟ پھر یہ کہ ایسی مجلسیں دنیا میں نہ معلوم کتنی ہو رہی ہوں گی جیسی مجلس یہاں ہو رہی ہے اور ہر جگہ ملائکہ کا ان مجلسوں پر اترنا اور چڑھنا اور پھر گواہ بننا آخر کیا ضروری تھا؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ ملائکہ کو عملی جواب دینے کے لئے ہے کہ جس کے بارے میں تم کہتے تھے کہ: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ تم نے دیکھا کہ وہ کس درجہ عمل صالح اور بر و تقویٰ میں لگا ہوا ہے اور کس درجہ

صالح بن کر دین کو پھیلانے اور اس پر خود جمے رہنے کی سعی بھی کر رہا ہے۔

انسانی اعمال پر فرشتوں کی گواہی کی حکمت ...... کیا یہ فساد ہے؟ کیا یہ سفک دماء ہے؟ پس ایک طرف تو علم کے میدان میں انسان کو فرشتوں سے فائق ثابت کرایا اور ایک طرف عبادت واطاعت میں اسے فرشتوں سے اونچا ثابت فرمایا اور خود فرشتوں ہی کو اس کی نیکی پر گواہ بنایا، تاکہ اس کی سفا کی اور افساد کا تخیل ان کے ذہن سے نکل جائے اور وہ بصدق دل اس کی خلافت کے معترف ہو جائیں، چناں چہ ہر غیر معمولی عمل وعبادت کے مواقع پر ملائکہ کو اسی طرح گواہ بنایا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب حاجی احرام باندھ کر حج وزیارت کرتے ہیں، طواف وسعی میں دوڑتے ہیں۔ منٰی وعرفات میں ٹھہرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو خطاب فرماتے ہیں کہ یہ لوگ آخر گھر بار چھوڑ کر، بیوی بچوں سے منہ موڑ کر سر سے کفن باندھ کر اپنی لذت وآرام کو مٹا کر یہاں کیوں آئے ہیں؟ یہ سب میری خوشنودی ورضا کے لئے آئے ہیں اور پروانوں کی طرح نثار ہو رہے ہیں۔ اے ملائکہ! تم گواہ رہو میں نے ان کو بخش دیا۔ حقیقت میں یہ فرشتوں کو وہی عملی جواب ہے کہ وہ انسان جس کے متعلق تم نے ﴿ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا﴾ کہا تھا۔ دیکھو کیسا اطاعت وعبادت اور ترک لذات میں اپنے رب کی خاطر مصروف ہے۔

① حدیث شریف میں آتا ہے کہ دن کے اعمال لکھنے والے ملائکہ الگ ہیں اور رات کے الگ۔ دن والے فرشتے عصر کی نماز کے وقت اوپر چڑھتے ہیں اور اعمال نامے رات والے ملائکہ کے حوالے کر دیئے ہیں اور رات والے فرشتے صبح کی نماز کے وقت دن والوں کو چارج دے کر اوپر چڑھتے ہیں غرض دونوں وقتوں کے ملائکہ کا عروج ونزول کا وقت فجر اور عصر کی نمازوں کے وقت کیا گیا۔ ان کے چڑھنے پر حق تعالیٰ جب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے بندوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا تو جواب میں عرض کرتے ہیں کہ: ”تَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ وَاَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ“ ”جب ہم نے انہیں چھوڑا جب بھی نماز میں مصروف تھے۔ اور جب ہم نے جا کر دیکھا جب بھی نماز ہی میں مشغول تھے۔ سو یہ وہی عملی جواب ہے کہ جن کے بارہ میں تم مفسد اور سفاک ہونے کے مدعی تھے، دیکھو وہ رات دن کیسے مصروف عبادت ہیں۔ یہ معاملہ روزانہ صبح اور شام ہوتا رہتا ہے۔ گویا صبح وشام ملائکہ کو عملی جواب دے کر انسان کی برتری ان پر جتائی جاتی ہے، تاکہ روزانہ ان کو عملی جواب ملتا رہے اور وہ انسان کی فضیلت اور اس کی خلافت کے معترف ہوتے رہیں۔

احوال وکیفیات میں انسان کا تفوق ...... پھر نہ صرف علم وعمل ہی انسان کا فرشتوں سے بالا وبرتر ہے بلکہ احوال وکیفیات بھی دیکھی جائیں۔ جو قرب الٰہی سے اسے حاصل ہوتی ہیں۔ سو وہ ان احوال میں بھی ملائکہ سے بالا وبرتر ہے، آخر جو احوال وکیفیات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ پر طاری ہوتی ہیں وہ فرشتوں پر نہیں آسکتیں۔ کیوں کہ نہ ملائکہ علم وعمل کے ان میدانوں سے گزرتے ہیں۔ جس سے انسان گزرتا ہے۔ نہ ان پر وہ کیفیات عشق ومحبت

---

① الصحيح للبخاری، كتاب مواقيت الصلوٰة، باب فضل صلاة العصر، ج: ٢، ص: ٣٩٠.

طاری ہوتی ہیں۔ جو انسان پر ہوتی ہیں اور جب علم، عمل، حال سب ہی میں انسان ملائکہ سے فائق ہے تو انسان ہی کا حق تھا کہ اسے نیابت کی نعمت سے نوازا جائے۔ اور خلیفہ خداوندی بنایا جائے کہ بناء خلافت یہی دو چیزیں تھیں، علم خداوندی اور اخلاقِ خداوندی وہ دونوں جب اس میں علی وجہ الاتم ثابت ہوتے ہیں۔ تو خلافت بھی علی وجہ الاتم اس میں آسکتی تھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تکمیلِ خلافت دنیا میں نہیں ہوتی بلکہ آخرت میں ہوگی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ بنائے خلافت جب کہ علمِ کامل اور عمل کامل ہے تو یہ علم و عمل جب تک کہ اسی انداز کا نہ ہوگا۔ جس انداز کا خود حق تعالیٰ کا ہے اس وقت تک اس انسان کی علمی و عملی خلافت کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

تکمیل خلافت آخرت میں ہوگی......اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے علم اور عمل وصناعی کی شان یہ ہے کہ وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا علم بھی اسباب سے بے نیاز ہے، یہ نہیں کہ حق تعالیٰ نے کوئی کتاب پڑھ کر یہ علم حاصل کرلیا۔ (معاذ اللہ)

بلکہ علم کا سرچشمہ خود اس کی ذات ہے۔ یعنی علم خود اس کی ذات بابرکات سے ابھرتا ہے، ایسے ہی اس کی صناعی بھی وسائل و آلات کی محتاج نہیں بلکہ جب کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو فرمادیتے ہیں کُـــن (ہوجا) تو وہ ہوجاتی ہے، اس لئے وہ پل بھر میں جہان بنادیتے ہیں اور ان کے ارادہ ہی سے وہ چیز خود بخود معرضِ وجود میں آجاتی ہے۔ ﴿إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ﴾ ①

اس صورتحال کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کیفیت اس میں جنت میں داخل ہوکر پیدا ہوگی۔ چناں چہ علم تو یہ ہوگا کہ تمام صنعتیں اس کی قوت متخیلہ کی تابع ہوجائیں گی۔ کسب ومحنت اور اختیار اسباب کی ضرورت نہ ہوگی۔ جس جس چیز کی خواہش ہوگی۔ ارادہ کرتے ہی وہ چیز سامنے آجائے گی۔ اسی کو یوں قرآن میں فرمایا گیا: ﴿إِذَا السَّمَآءُ انفَطَرَتْ ۝ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انتَثَرَتْ﴾ ②

یعنی ماضی و مستقبل سب کچھ انسان پر روشن ہوکر اس کے علم میں آجائے گا اگلے پچھلے تمام کئے ہوئے اعمال اس کے سامنے آجائیں گے اور یہ علوم اسے خود بخود حاصل ہوں گے، نہ کوئی استاد ہوگا۔ نہ کتاب بلکہ نفس انسان خود مُدرک بن جائے گا اور ہر عمل کی یہ کیفیت ہوگی کہ تمام صنعتیں اس کی قوت متخیلہ کی تابع ہوجائیں گی۔ کسب ومحنت اور اختیار اسباب کی ضرورت نہ ہوگی جتنی جس چیز کی خواہش ہوگی۔ ارادہ کرتے ہی وہ چیز سامنے آجائے گی اسی کو قرآن میں فرمایا گیا: ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِىٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ﴾ ③

گویا کن فیکون کی طاقت پیدا ہوجائے گی کہ جو چاہا وہی ہوگیا۔ نہ اسباب کی ضرورت نہ وسائل کی اور جب علم انسانی اسباب سے مستغنی ہوجائیگا۔ اور عمل کسب وریاضت سے مستغنی ہوکر محض قوت ارادہ کے تابع ہوجائیگا۔

① پارہ:۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ:۸۲. ② پارہ:۳۰، سورۃ الانفطار، الآیۃ:۱، ۲.
③ پارہ:۲۴، سورۃ حٰم سجدۃ، الآیۃ:۳۱.

بالفاظ دیگر حق تعالیٰ کے علم وصنعت کے مشابہ ہو جائے گا تو اس وقت انسان کی علمی وعملی خلافت مکمل ہوگی کہ وہ جس کا نائب ہے، وہ علم وعمل میں نائب ہے۔ اور اس کے علم وعمل سے مشابہ اس کا علم وعمل ہو جائے گا۔ اور جب کہ بنائے خلافت بھی علم وعمل تھا۔ جو علم وعمل خداوندی کے مشابہ بن گیا تو خلافت بھی صحیح معنی میں اس وقت مستحکم اور مضبوط ہوگی، مگر جنت میں یہ استحکام خلافت جب ہی ہوگا جب دنیا میں علم وعمل کے اسباب ووسائل اختیار کر کے اسے جزو نفس بنانے کی انسان نے سعی کی ہوگی۔ ورنہ یہاں کی محرومی سے وہاں بھی محرومی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ کامل بن جانے کے بعد حق تعالیٰ ان بندوں کو انہیں القاب وخطابات سے یاد فرمائیں گے جو القاب وخطابات خود ان کے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں کو نشاط میں لانے کے لئے ان کے نام خطوط بھیجیں گے۔ فرشتے خط رسانی کا کام کریں گے۔ ان خطوط کے لفافوں پر یہ پتہ لکھا ہوگا۔ ''مِنَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ اِلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ''

عزیز رحیم کی طرف سے یہ خط عزیز رحیم کو پہنچے یعنی القاب بھی وہی دے دیں گے۔ جو خود ان کے سرکاری خطابات ہیں۔ پس اس عالم میں انسان صورۃً خلیفہ خداوندی ہے۔ اور محض خلافت کے راستہ پر ہے، آخرت میں پہنچ کر حقیقی معنی میں خلیفہ خداوندی بن جائے گا مگر یہ منزل جب ہی آئے گی جب اس کا راستہ دنیا میں اختیار کر لیا جائے گا اگر یہاں نیابت کی یہ ظاہری صورت اختیار نہ کی جائے جو اطاعت وعبادت سے بنتی ہے۔ تو وہاں تکمیل کس چیز کی ہوگی۔ اور کیسے ہو جائے گی؟ بہر حال یہ واضح ہو گیا کہ جنات، ملائکہ اور حیوانات میں سے اس خلافت کے عہدہ کے لئے کسی کا انتخاب عمل میں نہ آیا۔ آیا تو صرف انسان کا آیا۔

قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند

سو ان میں سے حیوانات تو قابل خطاب ہی نہ تھے۔ اس لئے قابل ذکر بھی نہ تھے۔ قابل ذکر ملائکہ۔ جنات اور انسان ہی تھے۔ سو ان ہی کا اللہ نے اس آیت میں جو میں نے ابتداء میں تلاوت کی تھی ذکر فرما کر ہر ایک کی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ملائکہ کا ذکر فرما کر ان کی علمی کم مائیگی پر روشنی ڈالی گئی کہ وہ علم کے میدان مقابلہ میں انسان سے ہار گئے۔ شیطان کا ذکر فرما کر جو جنات میں سے ہے اس کے فہم وعمل کی کوتاہی پر روشنی ڈالی کہ وہ امر خداوندی کے معارضہ پر اتر آیا اور سرکشی پر آمادہ ہو گیا جو اس کی بدفہمی اور بدنیتی تھی۔ پس نہ کم علم خلیفہ الٰہی بن سکتا تھا نہ بدفہم اور بدنیت، انسان نے علم کا ثبوت دیا کہ جنت کی سکونت کا حکم دیا گیا تو وہاں جا داخل ہوا اور علم اسماء سے اس کا علم ترقی کر گیا۔ جس سے زندگی اس کی جامع ہوئی اور ان ناموں کے ذریعہ اس نے تمام اشیاء زندگی پر قابو پالیا اور کائنات اس کے لئے مسخر ہوگئی۔ ملائکہ اس کی خدمت پر لگا دیئے گئے اور شیطان کو مردود بنا کر اس کے مقابلہ پر چھوڑ دیا گیا کہ چوکنا رہے اور اس کا مقابلہ کر کے اپنی مخفی علمی اور عملی قوتوں کا ثبوت دے، اور اسی طرح اس کی خلافت روز افزوں چمکتی رہے۔ یہ علم انبیاء کو دیا اور انبیاء نے یہ علم جو مبنائے خلافت ہے بنی نوع انسان کو سکھایا پس انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کے تو شاگرد ہیں اور کائنات کے استاد اور مربی ہیں حق تعالیٰ نے ان پاکباز

استادوں کا گروہ کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد میں بھیجا۔ اور دنیا کو حکم دیا کہ ان سے علم سیکھے اور ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرے۔ پس یوں سمجھو کہ یہ پوری دنیا ایک مدرسہ ہے جس کا فرش زمین ہے چھت آسمان ہے۔ اس میں ستاروں سے چاندنا کیا۔ انسان و جنات اس مدرسہ کے طلبہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام استاذ ہیں اور ملائکہ خدام مدرسہ نگران اور منتظم ہیں، طلبہ کے لئے وظیفہ کی ضرورت تھی تو اس زمین کو دستر خوان بنا دیا تا کہ طلبہ وظیفہ پاسکیں اور ان کی ضروریات پوری ہوں اور وہ ہمہ تن علم کی تکمیل میں لگ کر استحقاق خلافت کو مکمل کریں اور اس طرح انسان کی فوقیت باقی تینوں ذی شعور انواع پر واضح ہوگئی جس کی بنا علم ہے۔

خِلافتِ نبوّت...... یہ علمی اور عملی خلافت قیامت تک باقی رہے گی۔ انبیاء علیہم السلام اوّلین خلفاء ربانی ہیں۔ ان کے بعد ان کے وارث خلیفہ ہوتے ہیں جو علمائے ربانی ہیں اور ان کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ حدیث شریف میں ہے "یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ یَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَتَاْوِیْلَ الْجَاهِلِیْنَ" پھر ہر صدی پر مجدّدِ دین کا وعدہ دیا گیا ہے جو علماء راسخین فی العلم ہوں گے یہ حضرات علماء اس علم الٰہی سے غلو کنندوں کی تحریفوں، باطل پسندوں کی دروغ بافیوں اور جاہلوں کی رکیک تاویلوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جو شکوک و شبہات اہل باطل اور اہل زیغ اس میں ڈالیں گے۔ یہ اہل علم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرتے رہیں گے۔ پس یہ امت لاوارث امت نہیں کہ جس کا جی چاہے اس کے دین وعلم کا حلیہ بگاڑ دے۔

اور کسی بھی مفسد وعیار کی دین میں پیش نہ چلے گی۔ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا: "کَیْفَ تَهْلِکُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُهَا وَالْمَهْدِیُّ وَسَطُهَا وَالْمَسِیْحُ (ابْنُ مَرْیَمَ) اٰخِرُهَا" آپ نے ارشاد فرمایا: ل "اَتَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ"

وراثتِ نبوّت...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: لَاتَزَالُ طَآئِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَایَضُرُّهُمْ مَّنْ خَاذَلَهُمْ وَلَامَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُاللّٰهِ

پس جس امت میں اتنی انواع کے اخلاف رشید کے وعدے دیئے گئے ہوں۔ وہ امت لاوارث امت نہیں ہوسکتی۔ اس کی پشت پناہی اللہ ورسول کی طرف سے برابر جاری رہے گی، جیسا کہ رہتی آرہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَثَلُ اُمَّتِیْ کَمَثَلِ الْمَطَرِ لَایُدْرٰی اَوَّلُهَا خَیْرٌ اَمْ اٰخِرُهَا؟" ①

پس انبیاء علیہم السلام کا ترکہ اس وارث امت کو ملتا رہے گا جب تک اپنا روحانی نسب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جوڑے رکھے گی اور وہ ترکہ بھی علم ہے کیوں کہ انبیاء روٹی اور کرسی وراثت میں نہیں چھوڑتے بلکہ علم ومعرفت چھوڑتے ہیں۔ اسی علم ومعرفت سے آدمی آدمی بنتا ہے اور انسانیت اسی علم پر موقوف ہے اگر دنیا میں انبیاء علیہم السلام تشریف نہ لائے تو انسان ڈھوروں، ڈنگروں کا ایک گلہ ہوتا جو بقول ملائکہ سفا کی اور مفسدہ پردازی کے سوا دوسرا کام نہ جانتا۔

① المعجم الاوسط للبطرانی، من اسمه علی، ج: ۹ ص: ۲۵۹ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه الطبرانی وفیه عبیس بن میمون وهو متروک دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰ ص: ۶۸.

انسانی ترقی ...... پس مادی تعلیم اور سائنس وغیرہ عمدہ عمدہ سامان تو پیدا کرسکتی ہے۔ مگر عمدہ انسان پیدا نہیں کرسکتی، عمدہ انسان صرف انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیم ہی سے پیدا ہوسکتے ہیں۔ سائنس سے باہر تو چاندنا ہوتا ہے مگر اندر اندھیرا ہوتا ہے نہ تقوائے ظاہر ہوتا ہے، نہ تقوائے باطن۔ ظاہراً مادیات کی ترقی ہو رہی ہے مگر اندر کے جوہر تباہ ہو رہے ہیں۔ انسان نے نئی نئی ایجادات میں اپنی تمام طاقتوں کو گم کردیا اور اس کی محتاجگی بڑھ گئی اگر وہ اڑنا چاہے تو لوہے لکڑی پیتل کا محتاج ہے اگر بعید مسافت پر خبر دینا چاہے تو لاسلکی اور وائرلیس کا محتاج۔ اگر کسی دور دراز مقام پر پہنچنا چاہے تو ریل موٹر کا محتاج خود اپنے نفس کی اندرونی طاقتوں سے یہ کام نہیں کرسکتا بلکہ ان آلات و وسائل کا دست نگر ہے۔ مرد وہ تھے جنہوں نے اپنے اندر وہ طاقت پیدا کی کہ ہزار ہا میل کی مسافت پر بلا لاسلکی کے آوازیں پہنچائیں۔ جیسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے بیت اللہ کے بن جانے کے بعد حج کرنے کی ہدایت کی آواز لگائی تو وہ سارے عالم میں گونجی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ساریہ رضی اللہ عنہ کو آواز دی تو وہ ڈھائی سو میل پر بلا ریڈیو کے پہنچی۔ انہوں نے بلند پرواز دکھلائی وہ کسی ہوائی جہاز کے محتاج نہ ہوئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام چوتھے آسمان پر پہنچے۔ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ساتوں آسمانوں سے گزر کر مستویٰ تک پہنچے۔ مگر محض اپنی اندرونی روحانی قوتوں سے، نہ کہ مادی وسائل سے اس لئے اپنے اندر جوہر پیدا کرو، لوہے، پیتل کے محتاج بن کر مت رہ جاؤ۔ اسباب کے بندے نہ بنو۔ مُسَبِّبُ الْاَسْبَابِ کے بندے بنو۔ آج کی یہ ترقی انتہائی محتاجگی کی ترقی ہے۔ حالانکہ انسانی ترقی استغناء کی ترقی ہے۔ لوہے، پیتل اور دیگر معدنیات کا غلام بن جانا ترقی نہیں۔ بلکہ ان چیزوں کو اپنی غلامی پر مجبور کردینا ترقی ہے۔ آج کا انسان صرف اس جگہ باکمال ہے جہاں مشینیں ہوں، بجلی ہو۔ پاور ہاؤس ہو، پٹرول ہو، جہاں یہ چیزیں نہ ہوں وہ عاجز، بے بس اور بے کس ہے۔ انسان کامل وہ ہے کہ اگر زمین پر ہو تو بھی باکمال ہو اور اگر زمین کے اندر ہو تو بھی باکمال۔

نورِ قلب ...... شیخ شہاب الدین سہروردی نے ایک حکایت بیان کی ہے جس کو مولانا رومی نے نقل فرمایا ہے کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ رومیوں نے کہا کہ ہم اچھے صناع اور کاریگر ہیں۔ چینیوں نے کہا ہم ہیں۔ بادشاہ کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا۔ بادشاہ نے کہا۔ تم اپنی صناعی دکھلاؤ۔ اس وقت دونوں صناعیوں کا موازنہ کر کے فیصلہ کیا جائے گا اور اس کی صورت یہ کی گئی کہ بادشاہ نے ایک مکان بنوایا اور اس کے درمیان پردہ کی ایک دیوار کھڑی کردی۔ چینیوں سے کہا نصف مکان میں تم اپنی کاریگری دکھلاؤ اور رومیوں سے کہا کہ دوسرے نصف میں تم اپنی اپنی صناعی کا نمونہ پیش کرو۔ چینیوں نے تو دیواروں پر پلاستر کر کے قسم قسم کے بیل بوٹے اور پھول پتے رنگ برنگ کے بنائے اور اپنے حصہ کے کمرہ کو مختلف نقش و نگار اور رنگا رنگ بیل بوٹوں سے گل و گلزار بنا دیا۔ ادھر رومیوں نے دیواروں پر پلاستر کر کے ایک بھی پھول پتہ نہیں بنایا اور نہ ہی کوئی ایک بھی رنگ لگایا بلکہ دیوار کے

پلاستر کو صیقل کرنا شروع کر دیا اور اتنا شفاف اور چمک دار کر دیا کہ اس میں آئینہ کی طرح صورت نظر آنے لگی۔ جب دونوں نے اپنی اپنی کاریگری اور صناعی ختم کر لی تو بادشاہ کو اطلاع دی۔ بادشاہ آئے اور حکم کیا کہ درمیان سے دیوار نکال دی جائے جونہی دیوار بیچ میں سے ہٹی، چینیوں کی وہ تمام نقاشی اور گلکاری رومیوں کی دیوار میں نظر آنے لگی اور وہ تمام بیل بوٹے رومیوں کی دیوار میں منعکس ہو گئے۔ جسے رومیوں نے صیقل کر کے آئینہ بنا دیا تھا بادشاہ سخت حیران ہوا کہ کس کے حق میں فیصلہ دے کیوں کہ ایک ہی قسم کے نقش ونگار دونوں طرف نظر آرہے تھے۔ آخر کار اس نے رومیوں کے حق میں فیصلہ دیا کہ ان کی صناعی اعلیٰ ہے کیوں کہ انہوں نے اپنی صناعی بھی دکھلائی اور ساتھ چینیوں کی کاریگری بھی چھین لی۔

مولانا روم نے اس قصہ کو نقل کر کے آخر میں بطور نصیحت کے فرمایا کہ اے عزیز! تو اپنے دل میں رومیوں کی صناعی جاری کر، یعنی اپنے قلب کو ریاضت ومجاہدہ سے مانجھ کر اتنا صاف کر لے کہ تجھے گھر بیٹھے ہی دنیا کے سارے نقش ونگار اپنے دل میں نظر آنے لگیں۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر وسرو دچمن درآ ۔۔۔۔ توز غنچہ کم نہ دمیدۂ دردل کشابہ چمن درآ

یعنی تو اپنے دل کی کھڑکیوں کو کھول دے کہ اس میں سے ہر قسم کا مادی میل کچیل نکال پھینک اور اسے علمِ الٰہی کی روشنی سے منور کر دے تو تجھے دنیا اور آخرت کے حقائق ومعارف گھر بیٹھے ہی نظر آنے لگیں گے۔

بینی اندر خود علوم انبیاء ۔۔۔۔ بے کتاب وبے معید اوستا

ایسے قلب صافی پر بے استاد وکتاب، براہ راست علومِ خداوندی کا فیضان ہوتا ہے اور وہ روشن سے روشن تر ہو جاتا ہے۔

برکتِ عمل ......مگر یہ شان مادی علوم کی نہیں۔ صرف روحانی اور شرعی علوم کی ہے جب کہ ان پر عمل کیا جائے حدیث میں ہے۔ عمل کی برکت سے حق تعالیٰ قلب میں وہ علوم ڈالتا ہے جو پہلے سے اس میں نہ تھے اس لئے انسان اگر انسانیت چاہتا ہے تو اولاً عالم بنے، پھر عامل بنے تب آخر کار علمِ لدنّی کا وارث بنتا ہے۔ پس ابتدائی علم، علمِ دراست ہے اور انتہائی علم، علمِ وراثت ہے، یہ کتابوں کے درس ومطالعہ کا علم، علمِ دراست ہے۔ "مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَالَمْ يَعْلَمْ"(1)

انسانیّت کی فیکٹریاں ...... اور اس کی عملی مشق سے پیدا شدہ بصیرت وگہرائی علم وراثت ہے مگر علم وراثت نصیب ہوتا ہے علم دراست ہی سے۔ پس یہ مدارس علم دراست سکھاتے ہیں۔ اور علم وراثت کا راستہ صاف کرتے ہیں۔ اگر یہ مدارس دینیہ نہ ہوں تو نہ علم دراست ملے نہ علم وراثت۔ پس یہ مدارس اس لئے قائم کیے جا رہے ہیں کہ جو علوم ہمیں انبیاء سے وراثت میں ملے ہیں ان کو انسانوں تک پہنچا کر انسانوں کو انسان بنایا جائے۔ اس لئے یہ

(1) الحديث اخرجه ابو نعيم في حلية وضعفه، الجزء العاشر، احمد بن ابى الحوارى ج: ۴ ص: ۲۵۰.

مدارس گویا سچے انسانوں کو ڈھالنے کی فیکٹریاں ہیں۔

پس سائنس کی فیکٹریاں اور مشینریاں سامان ڈھالتی ہیں اور یہ مدارس کی فیکٹریاں انسان ڈھالتی ہیں۔ جس کے ظاہر و باطن علوم انبیاء سے روشن ہوں۔ مادی علوم محض ظاہر کی ٹیپ ٹاپ اور نمائش سکھاتے ہیں اور یہ حقیقی علوم (علوم شرعیہ) باطن کی آراستگی سکھاتے ہیں مادی علم صورت کا جمال بخشتا ہے اور روحانی علم سیرت کا جمال عطا کرتا ہے۔

صورت اور سیرت میں فرق ...... اور محض صورت کا جمال ایک عارضی حسن و جمال ہے جو جاتا آتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک دن مٹ جائے گا اسے دو دن بخار ہی آ کر مٹا دیتا ہے۔ یہ تمام رعنائی اور زیبائی ختم ہو جاتی ہے اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو بڑھاپے سے یہ ظاہری جمال کے سارے نقش و نگار زائل ہو جاتے ہیں اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت تو کہیں گئی ہی نہیں وہ تو ساری صورتیں اور خوبصورتیاں مٹا کر رہتی ہے البتہ سیرت پر اس کا بس نہیں چلتا۔ سیرت دنیا میں جیسی بھی بنالی جائے۔ اسے موت نہیں مٹا سکتی وہ قبر میں حشر میں اور اس کے بعد برابر قائم رہتی ہے۔ حدیث میں شریف میں فرمایا گیا ہے:

"تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ وَتَمُوْتُوْنَ كَمَا تَحْيَوْنَ" حشر تمہارا اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئی ہے اور موت اس حالت میں آئے گی جس پر زندگی گزاری ہے۔ آج کل نوجوان صورت بنانے سنوارنے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ اس چیز کے بنانے سے کیا فائدہ جو بنی ہے بگڑنے کے لئے۔

میرا ایک دفعہ حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب کے ہاں لدھیانہ جانا ہوا، ان کی مسجد میں ایک کتبہ آویزاں دیکھا جس کے الفاظ یہ تھے کہ: "مرد وہ ہے جسے دیکھ کر رعب طاری ہو۔ مرد وہ نہیں ہے جسے دیکھ کر شہوت ابھرے"۔

یعنی محض صورت آرائی شہوت رانی ہے۔ اور سیرت آرائی مردانگی ہے۔ پس آپ صورت کو کہاں تک بنائیں گے جو صورت بگڑنے کے لئے ہی بنی ہے اس کو کہاں تک بنائیں گے، سنواریں گے، بنانا اس چیز کا ضروری ہے جو بن کر بگڑتی نہ ہو اور وہ سیرت اور اخلاق فاضلہ اور علوم و کمالات ہیں۔

معیارِ کمال و قبول سیرت ہے نہ صورت ...... دنیا میں صورت فتنہ کا ذریعہ بنتی ہے اور سیرت عز و جاہ کا، حضرت یوسف علیہ السلام کنعان کے کنوئیں میں ڈالے گئے، مصر کے بازار میں کھوٹے داموں بیچے گئے۔ زلیخا کے غلام بنے۔ پھر جیل خانہ میں قید ہوئے۔ یہ سارے فتنے حسنِ صورت نے پیدا کئے لیکن جب مصر کی سلطنت ملنے کا وقت آیا تو وہاں سیرت نے کام کیا۔ چناں چہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کی حکومت کا مطالبہ کرتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ: اِجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَسِيْنٌ جَمِيْلٌ بلکہ: ﴿اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾ کہا تھا یعنی علمی اور عملی سیرت پیش کی تھی جس سے حکومت ملی۔ صورت پیش نہیں کی تھی جس سے غلامی اور جیل کی قید و بند ملی تھی۔ پس حسنِ صورت فتنہ پیدا کرتا ہے اور حسنِ سیرت عز و جاہ اور کمال پیدا کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اسی سیرت کے سنوارنے کے لئے اس دنیا میں تشریف لائے ہیں، صورتوں کی آرائش کرانے کے لئے نہیں۔

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ" ① اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا اس کی نظر تمہارے دلوں اور اعمال پر ہے۔ وہاں یہ معیار نہیں کہ جو دولت مند اور خوبصورت ہو اسے قبول فرمالے اور جو غریب ومفلس ہو اسے رد کردے۔ یہی معیار حضرات انبیاء علیہم السلام کے ہاں بھی ہے کہ وہ آدمی کا رد وقبول حسنِ صورت سے نہیں بلکہ حسن سیرت سے کرتے ہیں۔ دنیا والوں کے یہاں رد وقبول کا معیار حسن صورت اور دولت ہے۔

حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ صورت کے سیاہ تھے۔ غلام حبشی تھے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو ھُوَ سَیِّدُنَا وَمَوْلَانَا فرماتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی گردنیں بلال کے آگے جھک جاتیں، حسنِ صورت کی وجہ سے نہیں کہ وہ تھا ہی نہیں۔ بلکہ حسنِ سیرت کی وجہ سے کہ وہ بحدِ کمال ان میں موجود تھا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: مَارَاَیْتُ اَفْضَلَ مِنْ عَطَاءِ ابْنِ اَبِیْ رَبَاح حالانکہ وہ صورت کے کالے تھے وہ صورت کی تعریف نہیں تھی۔ سیرت کی تھی جس نے کالوں کو گوروں کے اوپر حاکم بنایا اور سیرت دو ہی چیزوں سے بنتی ہے قوتِ علم اور قوتِ اخلاق (یعنی قوتِ عمل) ان ہی دونوں قوتوں سے آدمی باقی مخلوق پر فائق ہوتا ہے اور اسے خلافت ملتی ہے۔ قربِ حق نصیب ہوتا ہے اور صورت دو چیزوں سے بنتی ہے، دولت سے اور جہالت سے۔

مدارس دینیہ سیرت سنوارنے کے لئے ہیں...... پس یہ مدارس دینیہ انسانیت کے ان ہی دو جوہروں کے پیدا کرنے کے لئے کھڑے کئے گئے ہیں اگر یہ مدارس نہ ہوں تو انسانیت دنیا سے ختم ہو جائے کالج اور یونیورسٹیوں میں لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں مگر وہاں انسانیت نہیں سکھائی جاتی۔ صرف صورت انسانی بنائی جاتی ہے۔

زہد وقناعت...... لیکن ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں، میں جن کا نام مدرسہ اور خانقاہ ہے۔ حقیقت انسانیت دکھلائی جاتی ہے اور زہد وقناعت انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم پر چلنے، حتیٰ کہ فقر وفاقہ تک سے بھی انسانیت حاصل کر لینی سکھلائی جاتی ہے۔ زہد وقناعت اسی علم کی بدولت قائم ہے۔ یہ علماء سو، پچاس روپیہ کی تنخواہ پر بخوشی گزارہ کر لیتے ہیں۔ ورنہ آج کل سو روپیہ کیا وقعت رکھتے ہیں۔ یہ اسی سیرت کی خوبی کا کمال ہے۔ کہ یہ لوگ اس تھوڑے پر راضی اور مطمئن ہیں۔ حضرت مولانا تھانوی اس شعر کو بار بار پڑھتے اور لذت لے لے کر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

مایچ ندا ریم غم ہیچ ندا ریم　　دستار ندا ریم غم ہیچ ندا ریم

اور کبھی فرماتے ؎

لنگکے زیر و لنگکے بالا　　نے غم دزد و نے غم کالا

اور کبھی فرماتے ؎

کس نیاید بہ خانہ درویش　　کہ خراج زمین و باغ بدہ

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب،باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ، ج: ۴، ص: ۱۹۸۶ ارقم: ۲۵۶۴.

کل تک ہم زہد وقناعت کی فضیلت محض شرعی تعلیم پیش کر کے بتلاتے تھے لیکن آج زمانہ نے اس کی خوبیوں کا خود دنیا والوں کا مشاہدہ کرادیا ہے۔ ہزاروں من غلے والے غیر مطمئن ہیں۔ لاکھوں کروڑوں روپیہ والے پریشان حال اور نالاں ہیں انہیں ہر وقت مارشل لاء کے قوانین نے ڈرا رکھا ہے لیکن جن کے پاس غلہ ہی نہیں یا بقدر ضرورت ہے وہ مطمئن ہیں پس دنیا کی کثرت اور سرمایہ داری کی افراط حسن نہیں۔ ایمان اور تقویٰ حسن ہے۔

بقدر ضرورت یسارے بُود کندکار ار مردِ کارے بُود

ورنہ دنیا کی کثرت کا تو یہ حال ہے کہ جب آتی ہے جب بھی مصیبت لے کر آتی ہے۔ اور جب جاتی ہے، جب بھی مصیبت چھوڑ کر جاتی ہے۔

اِذَا اَدْبَرَتْ كَانَتْ عَلَى الْمَرْءِ حَسْرَةً وَاِنْ اَقْبَلَتْ كَانَتْ كَثِيْرًا هُمُوْمُهَا

''جب دنیا جاتی ہے تو حسرت چھوڑ جاتی ہے اور جب آتی ہے تو ہزاروں غم ساتھ لاتی ہے''۔

بہر حال اس کے بٹورنے کی مساعی کی جگہ اگر آپ اپنی سیرت کو بنانے کی فکر کریں تو دنیا ہاتھ سے نہ جائے گی اور آخرت بھی درست ہو جائے گی، اور یہ ان ہی مدارس کے ذریعہ ممکن ہے۔ ان مدارس کی اگر آپ نے امداد کی تو آپ نے ان مدارس پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کیوں کہ یہ چندہ حقیقت میں آپ نے قرضہ دیا ہے جو آپ کو مع سود کے واپس ملے گا۔ دنیا میں تو قرضہ دے کر نفع لینا سود ہے جو حرام ہے مگر وہاں آخرت میں سود جائز ہے، جو ملے گا اور ایک کے بدلے سات سو تک اور اس بھی زائد ملے گا پس آپ نے اگر ان مدارس کو چندہ دے دیا تو گویا آپ نے خدائی بینکوں میں رقم جمع کر دی۔ اگر آپ کے چندہ سے یہ مدارس قائم رہے اور ان کے ذریعہ آدمی آدمی بنتے رہے تو آپ ہی کی قوم بنے گی۔

احسانِ عظیم...... یہ مدارس صرف علم نہیں سکھلاتے، بلکہ ملک میں امن وامان کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ ان مدارس کی بدولت اگر متدین، خداترس آدمی پیدا ہوں گے تو نہ ڈکیتی ہوگی۔ نہ چوری نہ زنا کاری ہوگی۔ نہ شراب نوشی۔ تو امن کے ساتھ گورنمنٹ کے کروڑوں روپیہ کی بچت ہوگی اور پولیس اور فوج کی غیر معمولی بھرتی کی حاجت نہ رہے گی۔ ہر شخص اپنے حق میں خود پولیس مین بن جائے گا۔ پس یہ مدارس امن وامان چاہتے ہیں اور صحیح معنوں میں ملک کی خدمت کر رہے ہیں، اور پورے ملک کے یہ محسن ہیں۔ ان مدارس کی تقویّت وبقاء میں آپ کی تقویّت وبقاء ہے۔ اس لئے میں نے یہ آیتیں بیان کی ہیں۔

خاتمہ...... کہ انسان کو علم ہی کی وجہ سے افضلیّت اور نیابت ملی اور کائنات کی ساری ذی شعور مخلوقات پر بازی لے گیا۔ اس لئے اس افضلیّت کو اپنے حق میں باقی رکھیے اور جو منصب حق تعالیٰ نے بلا قیمت عطا فرما دیا ہے۔ اس کے تحفظ کی سعی کیجئے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ علم بھی حاصل کریں اور عمل سے بھی آراستہ ہوں۔ (آمین)

رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. اَللّٰهُمَّ اَعِذْنَا مِنَ الْفِتَنِ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ اَللّٰهُمَّ اَعِذْنَا مِنَ الْفَوَاحِشِ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ اٰمِيْن! محمد طیب غفرلہ

مدیر دارالعلوم، دیوبند انڈیا وارد حال اکوڑہ خٹک

۲۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء

مقصد نعمت و مصیبت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!فَأَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ .

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ O الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ O اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ.﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

دارالامتحان...... بزرگانِ محترم! یہ دنیا جس سے ہم اور آپ گزر رہے ہیں یہ پوری کی پوری امتحان گاہ ہے۔ اس میں حق تعالٰی نے ہماری جانچ اور آزمائش کے لئے ہمیں بھیجا ہے۔ یہاں کی آزمائش کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ حق تعالٰی کو علم نہیں تھا کہ یہ کیسے ہیں۔ اچھے ہیں یا برے ہیں؟ قوی ہیں یا ضعیف ہیں؟ ان کو سب معلوم ہے۔ ان کا علم ازلی اور ابدی ہے۔ جانچ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل میں اللہ نے جو جوہر پیدا کئے ہیں، ان کو کھول دے اور نمایاں کردے یعنی ہر چیز کی خاصیت کو ظاہر ہونے کا موقع دے۔ اگر ایک شخص قوی القلب ہے تو اس کو مصائب میں ڈالتے ہیں تا کہ اس کی قوتِ قلب واضح ہو جائے اور اگر ضعیف القلب ہے تو اس کا ضعف واضح ہو جائے تو حق تعالٰی کے آزمانے کا مطلب استعلام (یعنی علم حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ پہلے سے علم نہیں تھا۔) نہیں ہے۔ بلکہ جوان کا علم جس کے متعلق ہے، اسکو نمایاں کرنا چاہتے ہیں تا کہ پوری دنیا میں واضح ہو جائے کہ فلاں چیز میں یہ اثرات تھے اور فلاں میں یہ خاصیتیں تھیں۔ اس لئے دنیا میں جو بھی آیا ہے وہ درحقیقت جانچ کے لئے آیا ہے۔ کہ جو بھی جوہر اس میں رکھے گئے ہیں ان کو کھولا جائے۔

مقصدِ امتحان...... اور جانچ کے لئے اس دنیا میں اللہ تعالٰی نے دو سلسلے قائم کئے ہیں، ایک سلسلہ نعمتوں کا اور ایک سلسلہ مصیبتوں کا۔ دونوں سے مقصد انسان کی جانچ اور آزمائش ہے۔ نعمتیں دے کر اس لئے آزماتے ہیں کہ

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۵، ۱۵۷.

آیا نعمتوں میں گھر کر یہ آدمی نعمت دینے والے کو بھی یاد رکھتا ہے یا نعمتوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اگر ایک انسان اپنی نعمتوں میں، اپنی عیش میں الجھ کر رہ جائے۔ اور اسے یہ یاد نہ رہے کہ یہ نعمت کس نے دی تھی تو کہا جائے گا کہ اس بندے کے قلب میں کفرانِ نعمت کا جذبہ چھپا ہوا تھا۔ وہ کھول دیا گیا اور ظاہر ہو گیا۔ کل کو اگر اس کے لئے کوئی جزا تجویز کی جائے گی تو اس کو یہ کہنے کا موقع نہیں ہوگا کہ مجھے پہلے جانچ تو لیا ہوتا۔ آزمائش کا موقع تو دیا ہوتا۔ بلکہ خود اس پر نمایاں ہو جائے گا کہ اس جانچ میں پڑ کر میں نے اپنے بارے میں کیا ثبوت دیا۔ اس طرح سے نعمت دنیا میں خود ایک مستقل آزمائش کی چیز ہے۔ خواہ وہ دولت ہو، خواہ وہ عزت ہو۔

امتحان بطریقِ نعمت...... اس سب کا مقصد اپنا امتحانِ پیش کرنا ہے کہ تمہارا فرض کس درجہ پر ہے، تم منعم کو دیکھتے ہو یا نعمت کو دیکھتے ہو؟ نعمت دینے والے پر نظر ہے یا خود نعمت پر نظر ہے۔ اگر دینے والے پر نظر ہے تو بے اختیار انسان کی زبان سے شکر نکلے گا اور کہے گا۔ اے نعمتوں کے دینے والے تیرا فضل ہے کہ تو نے مجھے دیا، نہ میں اس کا مستحق تھا، نہ میں اس کا اہل تھا، یہ محض تیرا فضل اور انعام ہے، تو بندے نے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی نعمت دی گئی تھی۔ اس نے نعمت کا حق ادا کر دیا۔ تو نعمت کا حق فقط یہ نہیں ہے کہ آدمی نعمت کو استعمال کرے۔ بلکہ نعمت کے استعمال کے ساتھ ساتھ نعمت دینے والے کی طرف توجہ اس کی دین اور اس کے انعام کا شکر ادا کرنا یہ بھی اس کا حق ہے۔ گویا نعمت دیئے جانے کے بعد دو طرح سے آدمی آزمایا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس نعمت کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرے۔ دوسرے یہ کہ اس نعمت پر نعمت دینے والے کا شکر ادا کرے، نگاہ اس کی طرف رہے۔ کیوں کہ جس کو دینا آتا ہے اس کو چھیننا بھی آتا ہے۔ جو دے سکتا وہ واپس بھی لے سکتا ہے۔ غرض جانچتے ہیں کہ اگر دینے والے پر نگاہ ہے اور شکر کرو گے تو دینے والے کے خزانے لامحدود ہیں وہ نعمتوں کو بہاتا رہے گا۔ اگر کفرانِ نعمت اختیار کیا معلوم ہوا کہ نعمت کی قدر کرنی نہ آئی۔ وہ اپنی نعمت کو واپس لے لے گا۔ تو واضح ہو گیا کہ نعمتوں کا دینا درحقیقت آزمائش اور جانچ کے لئے ہے اور جوہروں کے کھول دینے کے لئے ہے۔

امتحان بطریقِ مصیبت...... اسی طرح سے کبھی کبھی مصیبتوں سے بھی آزمایا جاتا ہے۔ مصیبت سے آزمائش یہ ہوتی ہے کہ مصیبت میں گھر کر آیا آدمی مصیبت ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے، واویلا، جزع فزع اور پریشانی ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے یا اس کی نگاہ مصیبت کے بھیجنے والے پر بھی ہوتی ہے کہ اس نے میری کسی مصلحت کے سبب اسے بھیجا ہے۔ اگر مصیبت پر نگاہ ہے مصیبت بھیجنے والے پر نہیں تو اس کا ثمرہ یہ ہے کہ آدمی کا بے صبراپن ظاہر ہوگا۔ اللہ کی شکایت ظاہر ہوگی کہ میں ہی آزمائش کے لئے رہ گیا تھا۔ اور میں ہی مبتلا کرنے کے لئے رہ گیا تھا۔ لیکن اگر مصیبت میں گھر کا ثابت قدم رہے اور یہ نہ دیکھے کہ مصیبت تو بے شک سخت ہے مگر بھیجنے والا ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے اس لئے یہ مصیبت میرے ستانے کے لئے نہیں بھیجی گئی ہے، ایمان کی جانچ کے لئے بھیجی گئی ہے۔ پھر بندہ صبر کرے گا اور صبر کے امتحان میں کامیابی حاصل کرے گا۔ تو نعمت سے آدمی کی شکر گزاری کا امتحان ہوتا ہے اور

مصیبت سے آدمی کے صبر و تحمل کا امتحان ہوتا ہے کہ کون بندہ ثابت قدم ہے اور کون ضعیف القلب۔ جو نعمت اور مصیبت کے امتحان میں کامیاب ثابت ہوا وہی بندہ فی الحقیقت بندہ ہے۔ اور جو کامیاب نہ ہو وہ بندہ نہیں۔ یا نعمت کا بندہ ہے یا مصیبت کا بندہ ہے جو انہی دو کی طرف جھکتا ہے۔

مقامِ آدمیّت...... ہمارے آپ کے ہندوستان کے آخری بادشاہ ظفر، اس نے اس حقیقت کے ظاہر کرنے کے لئے ایک قطعہ کہا ہے، کچھ تو ظفر بادشاہ مزاج ہی صوفیانہ رکھتا تھا اور کچھ حالات نے اس کو درویش بنا دیا تھا۔ جس کی سلطنت چھنتی ہے وہی جانتا ہے کہ اس کے قلب پر کیا گزری ہے۔ تو اس نے ایک قطعہ کہا ہے اور خوب کہا ہے کہتا ہے کہ۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ۔۔۔ گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا

کتنا ہی عقلمند اور ہوشیار ہو مگر آدمی نہ سمجھنا

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ۔۔۔ گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی ۔۔۔ جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

تو دینے والے کو نہ بھولے نہ اسے عیش اللہ سے غافل کرے، نہ طیش اسے اللہ سے غافل کرے۔ ایک حالت میں خوف پیش نظر رہے اور ایک حالت میں رجاء و امید اور شکر گزاری پیش نظر رہے۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اس دنیا میں انسان کو جانچنے اور آزمائش کے دو سلسلے رکھے ہیں۔ ایک نعمتوں کا سلسلہ اور ایک مصیبتوں کا سلسلہ۔

مقدارِ امتحان...... اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی ہے کہ جتنی زیادہ نعمت دی جاتی ہے۔ اتنی ہی زیادہ جانچ کی جاتی ہے، جس پر زیادہ مصیبت آتی ہے، اس کے قلب کی اتنی ہی زیادہ جانچ کی جاتی ہے۔ چھوٹی موٹی مصیبت کو آدمی جھیل جاتا ہے۔ صبر بھی کر جاتا ہے۔ جب بڑی مصیبت آئے، اس وقت ثابت قدم رہے تو کہا جائے گا کہ ایمان بھی مضبوط قلب بھی مضبوط۔ بڑی نعمت دیدی جائے پھر ثابت قدم رہے اور نعمت دینے والے کو نہ بھولے تو کہا جائے گا کہ یہ قوی القلب ہے اور امتحان میں کامیاب ہے۔

امتحان کی عمومی روش...... پھر اس کے ساتھ مصائب میں آدمی کی زیادہ جانچ ہوتی ہے نعمتوں میں اتنی نہیں ہوتی۔ اللہ نے اس عالم میں مصیبتیں بے شمار رکھی ہیں۔ اور نعمتیں کم رکھی ہیں۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ: آدم علیہ السلام کا پتلا جب اللہ نے بنایا اور مٹی کو پانی میں بھگویا ہے تو چالیس دن اس پر پانی پڑا ہے۔ اور چالیس دن اس پر مینہ برسایا گیا۔ تو روایات میں ہے کہ اس مٹی پر انتالیس دن غم کا مینہ برسا ہے اور ایک دن خوشی کا۔ اس لئے دنیا میں خوشی کم ہے اور مصیبت زیادہ۔ زیادہ تر انسان پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ زیادہ تر عیش اور بے فکری میں کم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ﴾ (1)

ہم نے آدمی کو مصائب ہی کے اندر پیدا کیا ہے۔ تو زیادہ تر مصیبتیں انسان پر آتی ہیں، اس لیے جانچ بھی

(1) پارہ: ۳۰، سورة البلد، الآية: ۴.

زیادہ مصیبتوں میں ہوتی ہے اور اوّل سے لے کر اخیر تک مصائب کا ایک سلسلہ ہے۔ جس آن انسان پیدا ہوتا ہے تو پیدائش کی گھڑی مصیبت ہی کی ہوتی ہے۔ آدمی روتا ہوا آتا ہے۔ چلاتا ہوا آتا ہے۔ کوئی بچہ بھی دنیا کے اندر ہنستا ہوا نہیں آتا۔ تو دنیا میں پریشانی کی حالت میں آیا۔ پھر جوں جوں عمر بڑھتی چلی جاتی ہے مصائب کا سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انسان تمنائیں بہت باندھتا ہے، سو تمناؤں میں سے ایک پوری ہوتی ہے ننانوے میں ناکامیاب رہتا ہے۔ یہ ننانوے میں جو ناکامیابی ہے یہی اس کے حق میں مصیبت ہے تو اس کی تمنا اور طبیعت کے خلاف ہونا یہی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ اور یہ انسان کے لئے لازم ہے۔

مقصدِ نعمت و مُصیبت...... اس دنیا کو حق تعالیٰ نے نہ فقط عیش کی جگہ بنایا نہ فقط مصیبت کی جگہ بنایا عیش بھی ہے مصیبت بھی ہے۔ گو عیش کم ہے مصیبت زیادہ ہے۔ جہاں فقط عیش ہے۔ مصیبت کا نام نہیں، اسی عالم کو ہم جنت کہتے ہیں اور جس جہان میں مصیبت ہی مصیبت ہے عیش کا نشان نہیں اسی کو ہم جہنم کہتے ہیں جہاں عیش کا کوئی تخیل بھی نہیں باندھ سکتا تو دونوں کی عیش اور مصیبت سے ملا کر دنیا کو بنایا گیا جس میں عیش بھی ہے مصیبت بھی ہے تو کچھ جنت کی نعمتوں کے نمونے ہیں اور کچھ جہنم کی مصیبتوں کے نمونے ہیں تاکہ انسان جب عالم آخرت میں پہنچے تو جب تک دنیا میں گزارے اسے اس عالم کا تصور ہو جہاں سے عیش آئی ہے اگر اسے عیش پسند ہے تو اس عالم کے لئے سامان کر لے اور اگر مصیبت ناپسند ہے تو اس جہان کی مصیبتوں سے ڈرنے اور بچنے کا آدمی اہتمام کرے۔ تو دنیا میں عیش اور مصیبت اس لئے رکھی ہے تاکہ انجام پر نظر رہے عیش کی جگہ کی طلب میں رہے اور مصیبت کی جگہ سے بچنے کا بندوبست کرتا رہے گا اس لئے اللہ نے یہ دونوں سلسلے جاری کئے۔

موت و حیات کی کشمکش...... مصیبتوں کی انتہا موت پر ہوتی ہے اور نعمتوں کی انتہاء زندگی پر جا کر ہوتی ہے، زندگی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور موت مصیبتوں کا سرچشمہ ہے، موت کے معنی درحقیقت سلب حیات ہے۔ یعنی زندگی چھین لی جائے بس یہ موت ہے تو عیش کو چھین لیا جائے یہ عیش کی مصیبت یہ بھی موت ہے صحت کو چھین لیا جائے بیماری آجائے تو یہ صحت کی موت ہے مرض اور بیماری کی مصیبت مسلط ہوگئی تو جس طرح انسان کی ذات پر موت آتی ہے اسی طرح سے اس کے احوال پر موت آتی ہے ایک حال آتا ہے ایک جاتا ہے جو حال جاتا ہے اس کی موت واقع ہوگئی۔ جو حال آیا اس کی زندگی ہوگئی صحت گئی تو صحت کی موت آگئی عیش چلا گیا تو عیش کی موت آئی تو اس طرح ہر قدم پر انسان موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ نعمتیں آتی بھی ہیں، جاتی بھی ہیں۔

پھر ایک وقت آتا ہے کہ یہ خود ہی چلا جاتا ہے، اس کے احوال پر روزانہ موت طاری ہوتی رہتی تھی مگر خود اس کی ذات پر طاری نہیں ہوتی تھی۔ یہ جو آخری سانس ہے اس کی ذات کی موت ہے، وہ بھی بالآخر چلا جاتا ہے تو پوری دنیا موت و حیات کے درمیان کشمکش میں مبتلا ہے۔

ذرائعِ امتحان...... تو اس آیت کریمہ کے اندر اس سلسلے کو بتلایا گیا ہے کہ ہم نے انسان کا مصائب سے امتحان

لیا۔ اور اس کے صبر وتحمل کا ہم نے امتحان لیا تو فرمایا گیا: ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ ﴾

یہاں عربیت کے قاعدہ کے مطابق سب سے پہلے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ میں واو لائے، جو تاکید کے لئے ہوتا ہے، لام لائے جو تاکید کے لئے ہوتا ہے۔ پھر صیغۂ جمع کا لائے جو خود تاکید کے لیے ہوتا ہے، پھر نون ثقیلہ تاکید لائے جو خود تاکید کے لئے ہوتا ہے، پھر اس کو ضمیر خطاب یعنی کم کی طرف منسوب کیا۔ تو کئی تاکیدیں لائی گئیں۔ اس کے معنی یہ نکلے کہ ہم ضرور بالضرور تمہاری جانچ کرر ہے ہیں۔ یہ خیال مت کرنا کہ نعمتیں دیکر تمہاری جانچ اور آزمائش چھوڑ دیں گے لازمی طور پر تمہیں آزمائیں گے، تاکید کے الفاظ لائے گئے ہیں، اس لئے آدمی احتمالی بات نہ سمجھے۔ جانچ ضرور واقع ہوگی۔

پہلا ذریعہ ''خوف'' ...... کا ہے سے واقع ہوگی۔ تو فرمایا ﴿ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ﴾ کبھی تو ہم دشمنوں کا خوف مسلط کریں گے، چہار طرف سے خطرہ ہے کہ ادھر سے نہ جان چلی جائے۔ ادھر سے کوئی حملہ نہ کردے۔ ادھر سے کوئی غنیم نہ چڑھ آئے۔ کوئی دشمن نہ آجائے ہر وقت ایک فکر لگی رہتی ہے۔

خوف سے آزمانے کی غرض کیا ہوتی ہے؟ تاکہ انسان چوکنا رہے، وہ جو تدبیر کرنے کا مادہ ہے وہ معطل نہ ہونے پائے۔ اگر بے۔ خوف ہو کر آدمی بیٹھا رہے گا تو وہ جو بچاؤ کی تدبیروں کے جوہر رکھے گئے ہیں وہ سب ملیامیٹ ہو جائیں گے اور سب آدمی میں چھپے رہ جائیں گے، اس لئے خوف مسلط کرتے ہیں تاکہ بیداری اور تیقظ سے آدمی کام لے اور وہ تدابیر اختیار کرے جن سے بچا جاتا ہے تاکہ دل کے جوہر کھلیں کہ یہ کتنا مدبّر اور دانا تھا۔ اور کتنا اس نے بچاؤ کا ثبوت دیا۔

دوسرا ذریعہ ''فقر'' ...... ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ ﴾ اور کبھی ہم بھوک دے کر آزماتے ہیں، کبھی اس طرح سے آزمائش ہوتی ہے کہ فقر و فاقہ مسلط کر دیا۔ ایمان کی جانچ کرنا منظور ہے اور قلب کی قوت کی جانچ کرنا منظور ہے۔ اس کے لئے کبھی خوف دیا کہ خوف اور گھبراہٹ میں آدمی ہمارا نام لیتا ہے یا محض پامال ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر ہمارا نام لیا تو فرماتے ہیں کہ ہم مدد کے لئے تیار ہیں ہم اس کی مدد کے لئے آئیں گے۔

﴿ إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ﴾ ①

''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا''۔ اور اللہ کی مدد کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے دین کی مدد کی جائے۔ اور دین کی سب سے پہلی مدد یہ ہے کہ خود آدمی دین پر ثابت قدم رہے۔ دین کوئی تصویر یا مجسمہ تو نہیں ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔ دین کی مدد کے یہ معنی ہیں کہ دین کو اپنے میں سمو لے ہر حالت میں دین کو پیش نظر رکھے، دین کی مدد ہے۔ اور اللہ کی مدد ہے۔ ﴿ فَاذْكُرُوْنِيْٓ أَذْكُرْكُمْ ﴾ ② ''مجھے یاد کرو گے تو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔'' تم مجھے بھلا دو گے تو میں بھی تمہیں بھلا دوں گا۔

① پارہ: ۲۶، سورۃ محمد، الآیۃ: ۷۔ ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۲۔

بندۂ تسلیم و رضا...... غرض کبھی تو آدمی خوف سے آزمایا جاتا ہے۔ اور کبھی فقر و فاقے سے آزمایا جاتا ہے کہ تنگ دستی مسلط کر دی لیکن تنگدستی کے باوجود بندہ یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے، تو جس حالت میں رکھے، میں تو بندہ ہوں بندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو حال بھی آ جائے آدمی شاکر اور صابر رہے، تسلیم و رضا کے ساتھ گردن جھکا دے۔ اگر اپنی تجویز پیش کرنے لگا کہ آپ نے میرے اوپر غم بھیج دیا۔ آپ کو تو خوشی بھیجنی چاہیے تھی۔ آپ نے میرے اوپر بھلا خوف کیوں مسلط کیا۔ میرے اوپر تو اطمینان بھیجنا چاہیے تھا۔ تو یہ تجویز ہے، بندہ بندگی کے لئے آیا ہے۔ بندگی کے معنی تفویض یعنی سونپ دینے کے ہیں کہ جس حالت میں آپ رکھیں میں راضی ہوں۔ اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ آدمی تجویز چھوڑ دے خود اپنے لیے کچھ تجویز نہ کرے، جو ادھر سے آ جائے اس کے لئے راضی رہے، تو آزماتے ہیں کہ اس میں تفویض یعنی سونپ دینے کا اس کے قلب میں مضمون ہے یا اپنی تجویز اور خود رائی کا مضمون ہے۔ خود رائی اگر ہوئی تو یہ بندگی کے خلاف ہے رائے کو ترک کر دیا تو یہ بندگی ہے۔ کہ جو حق تعالیٰ چاہیں میں اسی پر راضی ہوں۔ گویا اس طرح سے آدمی بن جائے جیسا کے نہلانے والے کے ہاتھ میں میت ہوتی ہے کہ جدھر کو چاہے کروٹ دیدے جدھر کو چاہے پلٹ دے، میت یہ نہیں کہتا کہ ادھر مجھے کیوں کروٹ دی ادھر کو کیوں نہ دی؟ بس بالکل غسال کے ہاتھ میں ہے۔ یہی شان بندے کی اپنے پروردگار کے ہاتھ میں ہونی چاہیے کہ ادھر سے جو حالت آئے اسی پر لگ جائے اور کہے اے اللہ تیرا شکر ہے، میں اسی کے اندر راضی ہوں اگر خوف آئے تو راضی ہو جائے۔ مانگتا تو رہے اطمینان، مگر پیش جو کچھ آئے اس پر رضامندی کا اظہار کرے بندگی اسی کا نام ہے۔

کسی غلام سے کسی نے پوچھا تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا تھا جو آقا کھلا دے۔ کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے۔ کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام دے دے۔ تو اس نے کہا کہ آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو میں غلام ہی کیوں ہوتا۔ میرے غلام ہونے کے معنی یہ ہیں کہ میرا ارادہ بھی غلام، میری خواہش بھی غلام، میری مرضی بھی غلام، جو کچھ مرضی ہے وہ آقا کی، جو کچھ ارادہ ہے وہ آقا کا۔ وہ آقا ہے اور میں غلام ہوں۔ تو ایک انسان جب ایک انسان کا خادم اور غلام بن جاتا ہے، حالانکہ اس آقا نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ اس کی زندگی اور نعمت و مصیبت آقا کے ہاتھ میں نہیں۔ مگر بہر حال نام کا تو غلام بن گیا۔ تو آدمی اس درجہ اپنے کو جھکا دیتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ نہ میری مرضی نہ میری خواہش نہ میرا ارادہ۔ تو اللہ رب العزت کا بندہ جس کے ہاتھ میں جان بھی ہے اور جس کے ہاتھ میں اس کا ایمان بھی ہے۔ اور جس کے ہاتھ میں اس کی عزت و آبرو ہے۔ اس کے سامنے کوئی تجویز رکھے اور دعویٰ کرے کہ میں بندہ ہوں تو یہ دعویٰ غلط ہوگا۔ بندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو آپ چاہیں وہی ٹھیک ہے اسی میں میری رضا ہے۔ تو اس تسلیم و رضا کا پیدا ہو جانا اور بندۂ رضا بن جانا یہی فی الحقیقت بندگی ہے تو اس غلام نے ذکر کر کے دکھلایا کہ اس سے کہا گیا کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلا دے کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے۔

جو ہر قلب کا امتحان...... یہی حال بندے کا ہونا چاہیے کہ اگر پوچھا جائے ایک انسان سے کیا تو خدا کا بندہ

ہے؟ کیا معنی ہیں تیرے بندہ ہونے کے؟ وہ یوں کہے کہ اگر عیش میں رکھے تو میں اس کا بندہ اگر وہ مصیبت میں رکھے تو میں اس کا بندہ۔ اگر وہ اطمینان دے تب بھی میں اس کا بندہ اگر وہ فکر میں مبتلا کردے تب بھی میں اس کا بندہ تب تو ہے بندگی۔ اگر یوں کہے کہ نعمت آتی تب تو میں خدا کا بندہ اور نعمت چھین لی تو پھر میں بندہ نہیں پھر تو شکایت کروں گا۔ تو وہ خدا کا بندہ نہیں ہے وہ نعمت کا بندہ ہے۔ نعمت اس کا معبود ہے۔ اگر وہ آ گیا ہے تو یہ راضی ہے نعمت چلی گئی وہ ناراض ہوگیا۔ اس دنیا میں آدمی خدا کی بندگی کرنے آیا ہے۔ نعمت کی بندگی کرنے نہیں آیا۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ ہم آدمی کے اس جوہر کو جانچتے ہیں کہ یہ کس حد تک ہمارا بندہ ہے۔ مصیبت ہو یا نعمت ہو کس حد تک ہماری طرف جھکتا ہے اس لئے نعمت و مصیبت کا یہ سلسلہ قائم کر دیا۔

طہارت روح...... حدیث میں ہے کہ اگر ایک انسان کے گناہ زیادہ ہوں اور حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اس کو اعلیٰ مقام اور مقام کریم عطاء کریں۔ اس کے اعمال میں سکت نہیں۔ معاصی اور گناہوں کی کثرت ہے تو اس کو اس مقام کے لائق بنانے کے لئے ہم اس پر بیماری مسلط کر دیتے ہیں۔ جوں جوں بیماری بڑھتی ہے وہ صبر و تحمل کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اے اللہ! تو جس حالت میں رکھے میں راضی ہوں۔ اس بیماری کی مصیبت سے اس کے گناہ کا کفارہ ہو رہا ہے۔ اور مقامِ کریم کے قریب پہنچ رہا ہے۔

اگر اس کے گناہ نپٹ گئے اور اس مقام تک پہنچ گیا تو بہتر، اور پھر بھی اگر اس کے گناہ باقی رہ گئے تو بیماری کے ساتھ میں ناداری بھی مسلط کر دیتا ہوں۔ بیمار پہلے سے تھا، مفلس اب ہوگیا۔ ہاتھ میں پیسہ نہیں کہ غذا استعمال کرے، دوا استعمال کرے۔ تو بیماری بھی ہے مگر علاج کے لئے پیسہ نہیں۔ اور فاقہ بھی ہے مگر غذا کے لئے پیسہ نہیں لیکن اس حالت میں بھی ثابت قدم ہے۔ کہتا یہی ہے کہ اے اللہ! تو جس حالت میں رکھے میں راضی ہوں۔ فرماتے ہیں کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو رہا ہے۔ اس کے قلب میں جو گناہوں کا میل کچیل بھرا ہوا تھا وہ اب مٹ رہا ہے۔ اگر گناہ نمٹ گئے فبہا، نہ نمٹے تو فرماتے ہیں کہ اس پر موت مسلط کر دیتا ہوں کہ اس کا کوئی عزیز میں چھین لیتا ہوں۔ بیماری پہلے سے تھی، ناداری بعد میں آئی، موت اب مسلّط ہوگئی۔ عزیز قریب چلے ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ بھی اس کے لیے کفارہ سیئات ہے جتنا اس پر غم پڑے گا۔ اتنا ہی اس کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ اتنا ہی اس کو قرب خداوندی نصیب ہوگا۔ اتنا ہی اجر ملے گا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ایک انسان کو ایک کانٹا بھی چبھ جاتا ہے اور اس سے تکلیف پہنچی ہے تو اس چبھن پر ایک نیکی نامہ اعمال میں لکھ دیتے ہیں اور ایک بدی مٹا دیتے ہیں۔ اگر دس دفعہ کانٹا چبھا تو دس نیکیاں مل گئیں اور دس بدیاں مٹ گئیں۔ اور یہ ادنیٰ مصیبت پر ہے۔ اندازہ کیجئے کہ اگر بڑی مصیبت پڑے تو نیکی بھی بڑی دی جائے گی اور بڑی سے بڑی مصیبت کا کفارہ بھی کیا جائے گا۔ تو یہ مصائب کا سلسلہ کفارہ کے لئے ہے کہ مصیبتیں گھٹ جائیں اور نیکیاں بڑھ جائیں اس کے درجات بلند ہو جائیں اور اس مقام کریم کے قابل ہو جائے۔ اگر یہ بدیاں

نمٹ گئیں اور روح میل کچیل سے صاف ہوگئی تو فبہا۔ اور اگر پھر بھی صاف نہ ہوئی تو حدیث میں فرمایا گیا کہ میں نزع میں شدت کر دیتا ہوں۔ جان کنی شدید ہوتی ہے۔ یہ خود ایک مستقل مجاہدہ انسان کو ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس میں بھی بندۂ صبر و رضا بنا ہوا ہے۔ جانتا ہے کہ میں قاہر و جابر کے ہاتھ میں ہوں، مجھے راضی رہنا چاہئے وہی میرا مالک ہے۔ اس سے اگر برائیاں نمٹ گئیں اور کفارہ ہوگیا تو فبہا۔ اور اگر نہ ہوا تو پھر قبر کی اندر کچھ ہولناک حالات پیش آتے ہیں۔ قبر کا فتنہ ہے، قبر کا دبانا ہے منکر نکیر کا آنا ہے، سوال و جواب ہے۔ آزمائش اور امتحان ہے۔ یہ بھی در حقیقت کفارے کے لئے ہے۔ اگر یہاں بھی گناہ نہ نمٹے تو پھر میدان محشر کے ہولناک حالات سے گزرنا پڑے گا۔ دھوپ کی تیزی ہوگی، سرگردانی ہوگی، اللہ رب العزت کے سامنے کھڑے ہونے کا ایک دہشت ناک مقام ہوگا۔ اگر وہاں گناہ نمٹ گئے تو فبہا۔ اگر نہ نمٹے تو آگے پل صراط ہوگا، وہ ایک مصیبت ہے۔

حدیث میں ہے کہ پل صراط جو جہنم کے اوپر باندھا جائے گا۔ پندرہ ہزار سال کا اس کا راستہ ہوگا۔ پانچ ہزار برس چڑھائی کے، پانچ ہزار برس اترائی کے اور پانچ ہزار برس برابر چلنے کے۔ اس کے اوپر سے انسان کو گزارا جائے گا۔ یہ خود ایک مستقل مصیبت ہوگی۔ یہ دراصل کفارہ کے لئے ہوگا کہ جو کچھ روح کا میل کچیل ہے وہ نکل جائے۔ پھر بھی اگر نہ نکلا اور معصیتیں باقی رہ گئیں تو اس پل سے کٹ کر آدمی جہنم میں جا گرے گا۔ مومن کو جہنم میں کفارہ سیئات کے لئے ڈالا جائے گا۔ کافر کو تو ایندھن کے طور پر ڈالا جائے گا۔ مومن کو صاف کرنے کے لئے ڈالا جائے گا۔ جیسا کہ سونار بھٹی میں کوئلہ بھی ڈالتا ہے اور سونا بھی ڈالتا ہے۔ کوئلہ ڈالتا ہے تا کہ آگ روشن ہو اور سونا اس لئے ڈالتا ہے۔ کہ اس کا میل کچیل جل کر سونا کندن ہو کر نکل آئے، مومن کو اس لئے ڈالتے ہیں کہ اس کے ایمان پر جو معصیتوں کا خس و خاشاک رہ گیا تھا۔ اور اس کی روح میں میل کچیل رہ گیا تھا۔ وہ جل جلا کر روح صاف ہو جائے، اور کندن بن کر نکلے اور اس مقام کریم کے لئے لائق ہو جائے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ غرض اس مقام تک پہنچانے کے مصیبتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ پیدائش سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر بڑھاپے تک اور بڑھاپے سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر قبر تک اور قبر سے لے کر حشر تک اور حشر سے لے کر پل صراط تک ایک مصیبتوں کا سلسلہ ہے، سارا سلسلہ اس لئے ہے۔ کہ انسان جل جلا کر کندن ثابت ہو۔ اس کے اندر جو غل و غیظ کی کدورتیں بھری ہوئی ہیں۔ اعمال بد اور معصیتوں کی کدورتیں ہیں وہ سب جل جلا کر صاف ہو جائیں۔ اور وہ کسی اعلیٰ مقام کے لائق ہو۔

مصائب کفارۂ سیئات ہیں...... اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آپ نے ایک بہت عمدہ صاف ستھرا لباس پہن رکھا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس پر میل کچیل آنا شروع ہوا۔ ہفتہ بھر میں اتنا میلا ہوگیا کہ وہ برا معلوم ہونے لگا تو آپ اسے بیزاری کے ساتھ اتار کر غسل خانے میں پھینک دیتے ہیں۔ اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ ہاتھ بھی لگائیں بلکہ نفرت سے دیکھتے ہیں۔ اگر مکان میں سامنے میلے کپڑے ڈال دیئے جائیں۔ اگر چہ وہ آپ ہی کے ہوں۔ آپ

گھر والوں سے کہیں گے کیا حماقت ہے میلی کچیلی چیزیں سامنے ڈال دیں۔ ان کو کہیں ایک طرف کونے میں ڈالو۔ تو آپ کو خود نفرت ہو جاتی ہے اس لئے کہ ان پر میل آ گیا۔ کپڑا تو وہی ہے، قیمت بھی اس کی وہی ہے۔ اتنا ہی تو فرق ہوا کہ میل اس پر آ گیا بد بو اٹھنے لگی۔ آپ کو نفرت ہو گئی۔

اب دھوبی اس کپڑے کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ سب سے پہلے اسے ایک نہر یا تالاب کے کنارے ایک لکڑی کا پٹڑا بچھا کر زور زور دے کر مارنا شروع کرے گا۔ اتنی اس کپڑے کو سزا مل رہی ہے کہ بھگو بھگو کر مارا جا رہا ہے، اگر کپڑے کے زبان ہو اور وہ دھوبی سے یوں کہے کہ ظالم میں نے تیرا کیا قصور کیا تھا؟ تو مجھے پٹخ پٹخ کر مار رہا ہے۔ تجھے ذرا ترس نہیں آتا۔ تو دھوبی کہے گا کہ احمق تیرے ہی نفع کے لئے دے دے کر مار رہا ہوں۔ تیرا میل کچیل نہیں نکل سکتا۔ جب تک تجھے اس طرح دے دے کر نہ مارا جائے، تو پٹڑے پر دے دے کرا سے مارا تو پوری سزا دی۔

اسی پر بس نہیں کی، بھٹی چڑھا کر اس کے نیچے آگ جلا کر اس میں کپڑے کو ڈال دیا۔ پانی آگ کی وجہ سے ساں ساں کر رہا ہے۔ گویا زبان حال سے کپڑا چلا رہا ہے۔ کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوا کہ اب تک تو مجھے پٹخ کر مارا گیا تھا، اب مجھے بھٹی میں آگ کے اوپر رکھ دیا۔ وہ جل رہا ہے یہاں تک کہ اسے بھٹی میں نکالا گیا اور اسے نچوڑا گیا۔ اس میں سے بہت سا میل نکلا۔ پھر دھوبی اس پر قناعت نہیں کرتا۔ یہاں سے جانے کے بعد اس پر استری کرتا ہے، ایک لوہے یا پیتل میں آگ ڈال کر اسے تپا کر پھیرتا ہے۔ تاکہ اس کپڑے کے بل بھی نکل جائیں۔ جو رسل پڑے ہوئے تھے وہ بھی باقی نہ رہیں۔ پھر اس پر ابرک کوٹ کر جمایا گیا۔ جس سے اس میں چمک پیدا ہوئی۔ پھول سا بنا کر مالک کے پاس وہ کپڑے کو لایا، تو اب یہ مالک کا سلوک نہیں ہوگا کہ وہ کہے اسے پرے پھینکو۔ اب عزت کے ساتھ اگر عمامہ ہو تو سر پر جگہ دی جائی گی، چوغہ ہے تو اسے بغل میں ڈال دیا جائے گا، کرتہ ہے تو اس کو گلے میں پہنیں گے۔

اور جس مجلس میں بیٹھیں گے اس کے مناقب بیان ہوں گے کہ بڑا نفیس کپڑا ہے اس کی کتنی قیمت ہے، لوگ پوچھیں گے کہ کہاں سے منگوایا ہے تو آپ منہ بھر کر کہیں گے کہ فلاں کارخانہ کا بنا ہوا ہے، اتنا بہتر ہے اس کے اوصاف یہ ہیں، دھلنے، کے بعد ایسا ہوتا ہے، ایسا ہوتا ہے، تو مجلس میں اس کے مناقب بیان کئے جا رہے ہیں، اس کی خوبیاں بیان کی جا رہی ہیں۔ مالک کے سر پر جگہ ملی اور وہ عمامہ بن کر سر پر پہنچا! یہ کاہے کا نتیجہ تھا کہ اس میں سے میل کچیل نکل گیا میل کچیل نکالنے کے لئے مصیبتوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا، دے دے کر الگ مارا گیا۔ بھٹی میں الگ جلایا گیا۔ استری جلتی ہوئی گرم الگ اس پر پھیری گئی۔ دھوپ میں الگ تپایا گیا۔ ان مصیبتوں سے گزرنے کے بعد اب وہ مقام عزت پر پہنچا۔ اور اس کی تعریفیں کی جانے لگیں۔

اب اگر اس کپڑے کو عقل ہو تو وہ دھوبی کا شکریہ ادا کرے گا کہ میری بڑی خیر خواہی کی کہ مجھے ان مصیبتوں سے گزارا۔ اگر میں نہ گزرتا تو یہ عزت کا مقام نہ پاتا۔ بعینہ یہی صورت انسان کی بھی ہے کہ اللہ نے اس کو صاف

ستھرا کر کے دنیا میں بھیجا تھا۔ ”كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ“ ①

ہر انسان صاف، صحیح فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے۔ گناہ گار بن کر نہیں آتا لیکن جوں جوں جوانی چڑھتی ہے اور اسبابِ عیش مہیا ہوتے ہیں، معصیتوں میں اور نفسانی جذبات میں مبتلا ہوتا ہے۔ ان کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ اس کو بھول کر یہ خیال نہیں آتا کہ یہ نعمتیں کس نے مجھے دی تھیں۔ یہ انعامات کس نے کیے؟ اگر ایک غریب آدمی ایک سجدہ کرتا ہے، تو مجھ کو اللہ نے اتنی نعمتیں دی ہیں کہ مجھ کو ایک ہزار سجدے کرنے چاہئیں۔ جس کے پاس جتنی نعمت ہو اتنا ہی اس کو شکر ادا کرنا چاہیے، مگر اس کو یہ خیال نہیں آتا۔ معصیتوں اور گناہوں کا میل کچیل اس کی روح میں بھرا رہتا ہے۔

مالک الملک کی طرف سے اسے تکلیف دی جاتی ہے لیکن متنبہ نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ مصائب کے سلسلہ میں ڈالتے ہیں، جیسے دھوبی نے کپڑے کو مصیبتوں کے سلسلہ میں ڈالا تھا، لیکن دھوبی کا منشا کپڑے کو ستانا نہیں تھا، مقام بلند تک پہنچانا تھا۔ اسی طرح سے حق تعالیٰ کا منشاء ان مصیبتوں سے بندے کو بلند مقام تک پہنچانا ہے۔ اس کو مصیبتوں کی بھٹیوں میں ڈالتے ہیں۔ کبھی ناداری مسلط کر کے، کبھی دشمنوں کا خوف مسلط کر کے کبھی فقر و فاقہ مسلط کر کے کبھی غم والم مسلط کر کے، کبھی عزیزوں کو چھین کر کے اور کبھی موت کو مسلط کر کے، یہ سب چیزیں اسلیے ہیں کہ اس کے قلب میں جو میل کچیل ہے وہ نکلے اور قلب میں توجہ الی اللہ اور نورانیت پیدا ہو۔ جب یہ پیدا ہو جائے گی تو مقام کریم پر پہنچا دیا جائے گا۔

تو حاصل یہ نکلا کہ نعمتیں ہوں یا مصیبتیں۔ دونوں سلسلے جانچ کے لئے ہیں اور جانچ اس لئے نہیں کہ حق تعالیٰ کو علم نہیں تھا (معاذ اللہ) بلکہ علم تھا۔ اس علم کو ظاہر کرنے کے لئے کہ بندہ بھی محسوس کرے کہ میں نے کیا کیا تھا اور اللہ نے میرے ساتھ کیا کیا۔ مصیبتوں کو دیکھ کر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ شاید میرے ساتھ برائی کی جارہی ہے، لیکن اگر اس کے دل میں فکر ہے اور دماغ میں عقل کی خوبی ہے تو وہ کہے گا کہ میرے ساتھ برائی نہیں کی جارہی ہے۔ میرے ساتھ بھلائی کا سامان کیا جارہا ہے۔ حق تعالیٰ کو مجھے مقام عزت تک پہنچانا مقصود ہے، اسی لئے مجھے مصیبتوں کی بھٹی میں ڈالا ہے۔

عملِ جراحی ...... بالکل اس کی مثال یہی ہے جیسا کہ کسی بچے کو کوئی پھوڑا پھنسی نکل آئے تو آپ ڈاکٹر کو بلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب علاج کیجیے۔ اگر ڈاکٹر نے مرہم لگایا تو معمولی پھوڑا پھنسی اس سے درست ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر بڑا دنبل نکلا ہوا ہے۔ تو ڈاکٹر کہتا ہے آپریشن کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ آپریشن کیجیے۔ ڈاکٹر نے نشتر لگایا، بچہ روتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرے باپ کو شاید میرے ساتھ دشمنی پیدا ہوگئی۔ جیتی جاگتی کھال کٹوا دی اور باپ ہے کہ ڈاکٹر سے کہہ رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! دیکھئے ذرا گہرا نشتر لگائیے ایسا نہ ہو کہ مادۂ فاسد باقی رہ جائے، پھر کل کو ابھرے، ایسا آپریشن کیجئے کہ صاف ہو جائے۔ اس نے چبھا چبھا کر گہرا نشتر لگایا۔ اور بچہ چلا رہا ہے کہ باپ تو قصائی ہو گیا، اس کے اندر رحم و کرم باقی نہیں رہا مگر باپ بچے کی کوئی فریاد نہیں سنتا۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب ماقیل فی اولاد المشرکین، ج: ۱ ص: ۴۶۵ رقم: ۱۳۱۹.

اور جب ڈاکٹر نشتر لگا کر فارغ ہو چکتا ہے تو ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ بچہ اور ناخوش ہوتا ہے کہ ایک تو اس نے میری کھال کاٹ دی اوپر سے اس کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

لیکن جب زخم درست ہو جاتا ہے اور عقل درست ہوتی ہے تو اب وہ بچہ باپ کا شکرگزار ہوتا ہے۔ کہ اگر آپ نشتر نہ لگواتے تو زندگی خطرہ میں رہتی اگر نشتر نہ لگتا اور مادہ فاسد باقی رہ جاتا تو وہ پھیل کر تمام اعضاء کو خراب کر دیتا جڑیں بڑھ جاتیں اور موت واقع ہو جاتی اس سے بچاؤ کی یہی تدبیر تھی کہ آپریشن کیا جائے۔

ٹھیک اسی طرح۔ جب ہماری روح میں مصیبتوں اور گناہوں کے پھوڑے پھنسیاں اور بری حرکات کے دنبل نکل آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپریشن کرتے ہیں اور نشتر لگاتے ہیں۔ یہ مصیبتیں درحقیقت آپریشن ہیں۔ کہ ان سے مادہ فاسدہ نکالنا ہوتا ہے۔

مصائب کے ذریعہ اصلاحِ اخلاق...... یہی وجہ ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو آدمی کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ جب عیش وطرب کی کثرت ہوتی ہے تو آدمی میں غنا پیدا ہوتا ہے اور سرکشی بڑھ جاتی ہے، حق تعالیٰ اس کا علاج کرتے ہیں کہ کچھ نعمتیں چھین کر بتاتے ہیں۔ اگر دانشمند ہو تو فوراً متوجہ ہو کر توبہ کی طرف لگ جاتا ہے، تو نتیجہ نکل آتا ہے کہ اسے متوجہ کیا گیا تو یہ متوجہ ہو گیا تو نعمت دوبارہ واپس کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر نہیں مانتا تو پھر دوسرا آپریشن کرتے ہیں۔ یہ ساری مصیبتیں درحقیقت بندے کے حق میں آپریشن ہیں۔ اس لئے مصلحت ہیں اور خوبی کا ذریعہ ہیں اس کے انجام کی بھلائی پیش نظر ہوتی ہے، اس لئے حق تعالیٰ شانہ، ان مصائب کے نشتر کے ذریعہ سے جو مادۂ فاسدہ بھرا ہوا ہے اس کو خارج کرتے ہیں۔

میرا مقصد یہ ہے کہ اگر مصیبتیں آئیں اور مصیبتوں میں سب سے بڑی مصیبت موت کی ہے۔ اگر کسی کے گھر میں آئے تو آدمی یہ نہ سمجھے کہ یہ میرے ستانے کا سامان کیا گیا ہے۔ یہ منجانب اللہ خیر و برکت کا سامان اور عبرت دلانے کا سامان ہے۔

آپ غور کر کے دیکھیں ہر شخص کو اس کا تجربہ ہوگا کہ جس گھر میں میت ہوتی ہے، قلوب میں اس درجہ توجہ الی اللہ پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا کی بے ثباتی ہر شخص کے سامنے ہوتی ہے۔ اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہی کچھ میرے لئے بھی درپیش ہے، مجھے بھی اس راستہ سے جانا ہے وہ جو ایک بے فکری طغیانی اور سرکشی تھی وہ خود بخود گھٹ جاتی ہے، برسوں کے مجاہدے کے بعد وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو ایک جنازہ سامنے آنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ نے موت و حیات کا سلسلہ اس لئے رکھا ہے تاکہ انابت کا مضمون پیدا ہو اور قلوب کی بے فکری ہٹ جائے۔

مقصدِ موت...... اور اگر یہ شخص رونے دھونے میں لگ جائے اور رات دن میت کو یاد کر کے روئے تو اس سے نہ میت کو فائدہ ہوگا اور نہ خود اس کو۔ موت اس لئے بھیجی گئی تھی کہ اس کو دیکھ کر آدمی اپنی موت کو یاد کرے، نہ یہ کہ دوسرے کی موت میں الجھ کر رہ جائے۔ تو اصل مقصد موت کا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے عبرت حاصل کی جائے اور

اپنے اخیر وقت کو یاد کیا جائے اور ایسے سامان پیدا کئے جائیں کہ ہمارے لئے بھی نافع ہو اور میت کے لئے بھی نافع ہو۔اس لئے مثلاً تلاوت قرآن کریم بتلائی گئی کہ ایصال ثواب کریں، ایصال ثواب سے اس کو بھی راحت پہنچے گی اور آپ کے قلب کو بھی تسکین ہوگی۔

اوراس کے لئے بہترین تدبیر یہ دعاء ہے جو اس آیت کریمہ میں بتلائی گئی اور فرمایا گیا:﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ﴾ ''ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کبھی دشمنوں کا خوف مسلط کر کے، کبھی بھوک اور فقر وفاقہ مسلّط کر کے، کبھی مال گھٹا کر اور خسارہ دے کر اور کبھی جانوں کو کم کر کے، یعنی موت مسلّط کر کے، تو مختلف طریقوں سے آزمائیں گے''۔

دعاءِ تسکین......لیکن فرماتے ہیں ان مصیبتوں کے بعد جو صبر کر گیا اور تحمل سے کام لیا کہ اپنے پرورگار پر نگاہ رکھی۔تو فرماتے ہیں:﴿ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ﴾ ''بشارت دے دوصبر کرنیوالوں کو'' کہ جب ان پر مصیبت آتی ہے وہ تسکین کی یہ دعاء پڑھتے ہیں۔وہ دعاء یہ ہے:﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ ''ہم سب اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں''۔

تسکینِ عقل......اس میں تسلی کس طرح سے دی گئی دو جملے فرمائے گئے:ایک اِنَّا لِلّٰهِ. اور ایک اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ . اِنَّا لِلّٰهِ. کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب اللہ کی ملک ہیں۔جب ذہن میں یہ تصور آ گیا تو آدمی سمجھے گا کہ مالک کو اختیار ہے اپنی ملک میں جیسا چاہے تصرف کرے، مالک اگر یہ چاہے کہ میں اپنی چیز کو اوپر رکھ دوں تو حق ہے اگر یہ چاہے کہ میں اسے نیچے کے کمرے میں رکھ دوں یہ بھی اس کا حق ہے اور اگر وہ یہ چاہے کہ زمین سے نیچے رکھ دوں یہ بھی اس کو حق ہے۔

جب ہم اللہ کی ملک ہیں، زمین کے اوپر رکھنا چاہے، یہ بھی اس کو اختیار ہے، زمین کی تہہ میں قبر میں پہنچانا چاہئے۔یہ بھی اس کو اختیار ہے، قبر سے آگے کسی اور عالم میں بھیج دے یہ بھی اس کو اختیار ہے، تو اس۔کا مطلب اللہ کی مالکیت کا تصور ہے کہ وہ مالک اور ہم مملوک ہیں، وہ ہمارا آقا اور ہم اس کے خادم۔اور مالک کو اپنی ملک میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے تو عقلی طور پر انسان میں صبر آ گیا۔عقل نے سمجھا دیا کہ جب تو ملک ہے تو تجھے واویلا کرنے سے کیا مطلب؟ حق تعالیٰ مالک ہیں۔اور مالک کو اپنی ملک میں تصرف کرنے کا اختیار حاصل ہے، تو عقلی طور پر صبر آ گیا۔

تسکینِ طبع......لیکن طبعی طور پر ابھی غم مسلّط ہے، عقل بے شک سمجھا رہی ہے کہ مالک نے اپنی ملک میں تصرف کیا ہے، یہ بندہ اس کی ملکیت تھا۔اس نے اس کو اٹھالیا۔بہر حال طبعی طور پر رونے کا جذبہ موجود ہے تو دوسرے جملہ میں اس کا علاج کر دیا گیا۔

﴿وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ ہم سب لوٹ کر اس کی طرف جانے والے ہیں، اس میں یہ بتلا دیا گیا کہ جہاں یہ گیا

وہاں تم بھی پہنچو گے۔ گھبرانے کی کیا بات ہے؟ یہ تو چند دن کی جدائی ہے۔ اس کے بعد جہاں یہ ہوگا وہاں تم ہو گے۔

اگر ہمارا کوئی عزیز سفر پر چلا جائے یا ملازمت پر ایک ہزار میل کے فاصلے پر چلا جائے۔ بعض دفعہ دس دس برس ملاقات نہیں ہوتی، لیکن آدمی یوں نہیں گھبراتا کہ جب موقع ہوگا وہ چلا آئے گا۔ ملنے کا امکان ہے، تو اس امکان کی وجہ سے جدائی کا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہاں امکان نہیں بلکہ قوت یقین سے یہ چیز حاصل ہے کہ جہاں یہ گیا وہاں ہم بھی پہنچنے والے ہیں۔ امکان پر اگر صبر آجاتا تھا تو یقین سے صبر کیوں نہیں آئے گا؟ تو ''اِنَّـآ اِلَیْـہِ رٰجِعُوْنَ'' سے انسان کو طبعی طور پر بھی صبر آجاتا ہے تو ''اِنَّالِلّٰهِ'' سے عقلی طور پر اور ''وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ'' سے طبعی طور پر صدمہ گھٹ جاتا ہے۔ طبیعت اور عقل دونوں بتلا دیتی ہیں کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، جو واقعہ پیش آیا ہے وہ تمہارے لئے بھی پیش آنا ہے۔ تو اس آیت کریمہ اور دعاء میں سبق دیا گیا۔ اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ: اگر کوئی ادنیٰ بھی مصیبت آئے تو فوراً کہو ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

صرف میت ہی پر یہ دعا نہیں پڑھی جاتی بلکہ اگر یہ ایک پیسہ بھی گم ہو جائے تو بھی پڑھی جائے۔ کوئی کپڑا بھی گم ہو جائے جب بھی پڑھو۔

تاثیر دعاء تسکین...... اس دعا کی برکت سے صبر بھی حاصل ہوتا ہے۔ مالک کی طرف توجہ بھی ہوتی ہے اور بدل بھی مل جاتا ہے۔ نعم البدل ہاتھ آجاتا ہے۔ یہ اس دعا کی خاصیت ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ مصائب کے سلسلہ میں جزع فزع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ صبر ہی کرنے سے سب کچھ ملتا ہے صبر وتحمل سے اپنے کو بھی ملتا ہے دوسرے کو بھی ملتا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کا بیٹا آٹھ نو سال کا تھا بہت خوبصورت اور ہونہار تھا۔ اور ظاہر بات ہے کہ ماں باپ کی توقعات اولاد ہی سے وابستہ ہوتی ہیں، اولاد ان کی زندگی کا سہارا ہوتی ہے۔ غرض ان کو بہت زیادہ محبت تھی اور توقعات بھی تھیں اور صورت شکل سے ہونہار معلوم ہوتا تھا۔ یہ بچہ بیمار ہوا۔ اس زمانے میں جو علاج ہوتا تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ لیکن بیماری بڑھتی گئی اسی حالت میں انہیں ایک دو دن کا سفر پیش آیا اور سفر بھی کوئی ضروری تھا۔ اس لئے جانے پر مجبور ہوئے تو بیوی سے یہ فرمایا کہ بچے کی تیمارداری پوری کی جائے اور علاج معالجے میں کوئی کمی نہ کی جائے اور میں پرسوں تک آجاؤں گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روانہ ہو گئے۔ ان کی غیبت میں ان کے آنے کا دن تھا کہ بچے کا انتقال ہو گیا۔ تو بیوی بھی صحابیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ صاحب نسبت اولیاء میں سے تھیں انہوں نے بچے کی لاش کمرے میں رکھی اور چادر سے ڈھانک دی اور باہر آکر بیٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ پہنچے تو عرب کے قاعدے کے مطابق بیوی نے آگے بڑھ کر خاوند کا استقبال کیا۔ مصافحہ کر کے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ چومے۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ تو فرمایا کہ: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بِعَافِیَةٍ وَّخَیْرٍ'' خدا کا شکر ہے بڑی عافیت اور خیریت میں ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات

نہیں، وہ مطمئن ہو گئے۔ ان کو کھانا کھلایا۔

کھانا کھلاتے ہوئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے آپ سے شریعت کا ایک مسئلہ پوچھنا ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے پاس امانت رکھوائے، اور اس کی ایک میعاد مقرر کرے کہ برس دن کے بعد میں اپنی یہ چیز یا پیسہ واپس لے لوں گا۔ پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ٹھیک مقرر وقت پر ادا کر دینا چاہیے۔ تو کہا کہ ہم دیر لگائیں اور ٹال مٹول شروع کر دیں۔ فرمایا کہ: ہمیں کوئی حق نہیں۔ اگر ایسا ہوگا تو یہ خیانت ہے اور امانت داری کے خلاف ہے۔ کہا اگر ہم نے وقت پر ادا کر دیا۔ مگر دل میں گھٹن پیدا ہوئی کہ ہم نے کیوں ادا کیا رکھ ہی لیتے۔ فرمایا گھٹنے کا تمہیں کیا حق ہے، وہ چیز تمہاری کب ہے۔ اپنی چیز پر آدمی گھٹے۔ دوسرے کی چیز پر گھٹن لانے کا کیا حق ہے؟ بلکہ فرمایا کہ: شکر یہ ادا کرنا چاہیے کہ ٹھیک وقت پر امانت سے ادا ہو گئے۔ کوئی خیانت نہیں ہوئی۔ جس کی چیز تھی اسے پہنچ گئی۔ کہا کہ شریعت کا مسئلہ یہ ہے۔ فرمایا: مسئلہ تو یہی ہے اس کے بعد فرمایا کہ:

''وہ جو آپ کا بیٹا تھا وہ اللہ کی امانت تھی۔ اس نے ٹھیک آٹھ برس دو مہینے کے لئے ہمارے پاس بھیجا تھا۔ جب میعاد پوری ہو گئی تو قاصد آیا اور کہا کہ میری امانت میرے حوالے کرو۔ ہم نے حوالے کر دی۔ اب ہمیں بیٹھ کر گھٹنا چاہیے؟ ہمیں غم میں مبتلا ہونا چاہیے؟''۔

بیوی کے ہاتھ چومے، اور فرمایا کہ: خدا تجھے جزائے خیر دے تو نے میرے دل کو ایسا صبر دیا کہ بجائے غم کے مجھے خوشی ہے کہ امانت، امانت داری کے ساتھ ادا کر دی گئی۔ وقت مقررہ پر ہم سبکدوش ہو گئے۔ اور امانت مالک کو پہنچا دی۔

حقیقت حال یہی ہے کہ اللہ جب کسی نفس کو واپس لیتا ہے۔ تو طبعی طور پر صدمہ اور غم ضرور ہوتا ہے۔ مگر عقل اور طبیعت دونوں بتلاتی ہیں کہ مالک کو اپنی ملک میں تصرف کا حق تھا طبعیت کہتی ہے کہ جدائی کا غم ہے یہ تو چند روزہ جدائی ہے پھر ہم بھی وہیں جانے والے ہیں، اس سے آدمی کے اندر صبر اور سکون پیدا ہوتا ہے۔

اجرِ صبر...... اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے لئے اجر شروع ہو جاتا ہے۔ تو دنیا بھی بنتی ہے آخرت بھی بنتی ہے اس لئے میت ہو جانے کے بعد گھٹن میں رہنا یا غم والم میں رہنا یا میت کا اس لئے تذکرہ کرنا کہ غم تازہ ہو۔ یہ منشاء شریعت کے خلاف ہے۔ صورت یہ ہونی چاہیے کہ جب غم تازہ ہو تو وہ افعال انجام دینے چاہئیں جن سے ہمیں نفع ہو۔ اور میت کو بھی نفع ہو۔ تو پہلی چیز یہ ہے کہ یہ دعاء پڑھے: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ دوسری چیز پھر ایصال ثواب ہے۔ قرآن شریف کی تلاوت میں آدمی لگے تو قلب کو تسکین الگ ہوگی۔ میت کو ثواب پہنچے گا اور اس کے درجات الگ بلند ہوں گے۔

حدیث میں ہے کہ: میت عالم برزخ میں پہنچ کر ہر ہر رشتہ دار، عزیز اور پس ماندہ کی طرف متوجہ رہتا ہے کہ کون میرے لئے کیا کرتا ہے۔ اس کی مثال دی گئی کہ جیسے دریا میں کوئی ڈوبتا ہوا ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے

کہ شاید میں اس کی وجہ سے ڈوبنے سے بچ جاؤں، میت کی یہی کیفیت رہتی ہے۔تو عزیز واقارب کی طرف اس کی آس لگی رہتی ہے کہ کوئی مجھے یاد کرتا ہے یا نہیں؟ کوئی اجر پہنچاتا ہے یا نہیں؟

برزخ میں آثارِ نعمت...... حدیث میں فرمایا گیا کہ: مردوں کو اجتماع کا کچھ وقت دیا جاتا ہے تو جب وہ جمع ہوتے ہیں تو اگر کسی کے پاس زیادہ ثواب پہنچتا ہے تو وہ دوسرے مردوں کے اوپر فخر کرتا ہے کہ میرے عزیز تھے جو مجھے یاد کرتے تھے اور اگر کسی کا کوئی عزیز نہیں ہوتا تو وہ کہتا ہے کہ میرا بھی کوئی عزیز ہوتا تو مجھے یاد کرتا تو اس کو خجالت اور ندامت ہوتی ہے۔اور اس کا سرا ونچا نہیں ہوتا۔تو جو دنیا میں کیفیت تھی کہ نعمت زیادہ ہوتی ہے تو آدمی کا سرا ونچا ہوتا تھا۔مصیبت آپڑتی تھی تو سرنگوں ہو جاتے تھے۔یہی کیفیت برزخ میں بھی رہتی ہے۔

فرق اتنا ہے کہ وہاں راحت اور مصیبت کمائی نہیں جاتی۔یہاں سے بھیجی جاتی ہے، یا یہاں کا کیا ہوا اس کے ساتھ رہتا ہے۔تو اگر کوئی ثواب پہنچا دیتا ہے تو اس کا سر فخر سے اونچا ہوتا ہے اور وہ دوسروں سے کہتا ہے کہ تمہارے عزیز قریب تو کچھ نہیں بھیج رہے تو یہ ہے وہ چیز جس سے اپنے قلب کو بھی تسکین ہوتی ہے اور میّت کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔لیکن محض رونا یا غم میں مبتلا رہنا ہمارے لئے بھی تکلیف دہ ہے اور میّت کے لئے بھی تکلیف دہ ہے نہ اس کے لئے فائدہ نہ ہمارے لئے فائدہ۔

میّت اور پس ماندگان کا باہمی نفع...... تو یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ: اس گھرانے پر جو ایک سال میں دو صدمات واقع ہوئے۔ایک باوانی صاحب مرحوم کی وفات اور ایک ان کے داماد ستار بھائی صاحب کی وفات حقیقت میں یہ دو بڑے صدمات ہیں۔ایک سال کے اندر اتنے بڑے صدمات کا پڑنا کہ دو گھروں کے دو وارث اٹھ جائیں یہ کوئی کم صدمہ نہیں ہوتا۔لیکن جتنا بڑا صدمہ ہوتا ہے اس سے اگر آدمی چاہے تو اتنی ہی بڑی آخرت کمائی جاسکتی جتنا دل میں غم ہو اور صدمہ ہو، اتنا ہی بڑا صبر ہوگا اور اتنا ہی بڑا اجر ہوگا۔

وقتِ صبر...... اور صبر اپنے وقت پر ہوتا ہے مدت کے گزر جانے پر تو ہر ایک کو صبر آجاتا ہے۔وہ باعثِ اجر نہیں ہوتا۔صبر وہی باعثِ اجر ہے جو ارادہ واختیار سے مصیبت کو دبانے کے لئے کیا جائے۔

حدیث میں ہے کہ: ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مر گیا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے۔بڑھیا واویلا فریاد اور بین کر کر کے رو رہی تھی۔آپے سے باہر تھی۔آپ نے فرمایا: بڑی بی! صبر کرو۔حق تعالیٰ کو یہی منظور تھا تحمل کرو۔①

اس نے جذبے میں کہا کہ: تمہارے اوپر گزرتی، جب میں جانتی۔میرا تو جوان بیٹا مر گیا تم مجھے کہہ رہے ہو صبر کرو۔اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔غرض جواب دے دیا اور کہا کہ: مجھ سے نہیں صبر ہوتا۔فرمایا: اچھا تو جان۔تیری مرضی۔اور آپ آگے گزر گئے۔

اسے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔تو بے چاری پریشان اور نادم ہو کر نبی کریم صلی

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب زیارۃ القبور، ج: ۱، ص: ۴۳۰ رقم: ۱۲۲۳.

اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑی اور مسجد نبوی میں جا کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ صبر کی تلقین فرما رہے تھے۔ اب میں صبر کرتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُوْلٰى'' جب صدمہ پڑ رہا ہو جب صبر کیا جائے وہ صبر ہے''۔

وقت گزر جانے کے بعد مجبوری کا صبر ہوتا ہے۔ اس پر اجر وثواب مرتب نہیں ہوتا۔ جب آدمی غم میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس وقت آدمی تحمل کرے اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ کرے تو یہ صبر ہے تو اتنے بڑے صدموں کا یقیناً غم بھی زیادہ ہوگا اس غم میں جتنا صبر کیا جائے گا اتنا ہی اجر بھی زیادہ ملے گا۔

مشترکہ غم ......اور پھر اس پر غور کیا جائے کہ کوئی بڑی شخصیت گزرتی ہے تو وہ کسی ایک گھرانے کا صدمہ نہیں ہوتا۔ وہ ہزاروں کا صدمہ ہوتا ہے۔ باوانی صاحب مرحوم، ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ بہت سے لوگوں کے وارث بنے ہوئے تھے۔ بہت سوں کے باپ بنے ہوئے تھے۔ ہزاروں کو ان سے فائدہ تھا۔

ہزاروں کو ان سے نفع ہو رہا تھا۔ یہی وجہ ہے جیسا کہ سننے میں آیا جنازے میں اتنا ہجوم تھا کہ باید وشاید ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ہر شخص ان کا مرہون منت تھا۔ کوئی اخلاق کا کوئی دولت کا کوئی انعام کا کوئی اکرام کا اپنے اپنے غم میں ہر کوئی رو رہا تھا۔ تو ایسی شخصیت کا غم کسی ایک خاندان کا غم نہیں ہوتا۔ کسی ایک گھرانے کا غم نہیں ہوتا، یہ پورے ملک کا غم ہوتا ہے۔ پورے شہر کا غم ہوتا ہے۔

تو جب غم اٹھانے والے بہت سے ہوں تو دو چار گھر والوں کو ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ زیادہ غم کے اندر ڈوبیں۔ وہ تو کہیں گے ہمارا غم تو سب نے مٹا دیا۔ سب کے اندر بٹ گیا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ سب غم زدہ ہیں۔

خیر الناس...... ایسی شخصیتوں کے گزرنے سے جو خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ ہوں جن سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہو۔ وہ بہترین خلائق سمجھے گئے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ ترجمہ: بہترین انسان وہ ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچے۔ فرمایا گیا بہترین انسان وہ ہے جو مِفْتَاحٌ لِّلْخَيْرِ ہو اور مِغْلَاقٌ لِّلشَّرِّ ہو۔ یعنی اس کے ذریعے خیر کے دروازے کھلتے ہوں اور شر کے دروازے بند ہوتے ہوں۔ دنیا کے اوپر برائیوں کے دروازے بند کرتا ہو اور بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہو۔ وہ درحقیقت پوری دنیا کا وارث اور والی بن جاتا ہے۔ اس لئے اس کا غم بھی ساری دنیا کا غم ہوتا ہے۔

تو باوانی صاحب مرحوم یا ستار بھائی مرحوم درحقیقت ایسے لوگ تھے جو اپنی دولت سے بھی لوگوں کو نفع پہنچاتے تھے۔ اپنے دین سے بھی لوگوں کو نفع پہنچاتے تھے۔ ستار بھائی کو میں نے دیکھا کہ تبلیغی سلسلے میں رات دن منہمک کبھی ڈھاکہ جا رہے ہیں۔ اور کبھی ادھر ادھر گویا دین پھیلانے کا ان کے دل کے اندر ایک جذبہ موجود تھا۔ تو جس جس تک ان کی آواز پہنچی، انہوں نے اس کو دین کا فائدہ پہنچایا۔ تو کوئی دین کا نفع پہنچانے والا تھا۔ کوئی دنیا کا یہ خَيْرُ النَّاسِ میں داخل تھے۔ یقیناً ایسے لوگوں کا صدمہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ مگر ایسے صدمے میں جتنا تحمل اور

صبر کیا جائے اتنا ہی بڑا اجر بھی ہوتا ہے، کسی شاعر نے کہا ہے ۔

یاد داری وقت زادن تو ہمہ خنداں تو گریاں

شاعر انسان کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تجھے یاد ہے جب تیری پیدائش کا وقت تھا کہ تو تو روتا ہوا آیا تھا اور ساری دنیا خوشی خوشی ہنس رہی تھی۔

آنچناں زی کہ وقت مردن تو ہمہ گریاں خنداں

ایسی زندگی گزار کہ تو ہنستا ہوا جائے اور دنیا تیرے لئے رو رہی ہے تو نیک لوگ جب جاتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ تو ہنستے ہوئے جاتے ہیں اور رونے والے پیچھے سے روتے ہیں۔

رونے کی حقیقت...... لیکن یہ رونا درحقیقت ان کی موت کا رونا نہیں ہوتا۔ اپنے نفع کے گم ہو جانے پر رونا ہوتا ہے۔ ورنہ میت تو اپنے اعلیٰ مقام پر پہنچتی ہے، تو اعلیٰ مقام پر پہنچنے کی وجہ سے کسی کو غم تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کا انتقال کسی مقدس زمانے میں مثلاً رمضان میں ہو تو یہ کہہ کر تسلی دیا کرتے ہیں کہ میاں! غم کرنے کی کیا بات ہے خوش ہونا چاہئے کہ موت کا کتنا اچھا زمانہ ملا۔ اگر کسی کا انتقال کسی مقدس مقام پر مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ "زَادَهُمَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً" میں ہو جائے لوگ وارثوں کو تسلی دیتے ہیں کہ غم کرنے کی بات نہیں خوش ہو جاؤ کہ پاک مقام مل گیا۔ مدینہ طیبہ کی زمین نے اسے قبول کر لیا معلوم ہوا کہ موت غم کی چیز نہیں نہ کوئی موت پر غم کرتا ہے نہ روتا ہے۔ رونا اپنی جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے یہ شخص چھن گیا۔ خود تو وہ بہت اچھے مقام پر پہنچ گیا کہ آج باوانی صاحب مرحوم اگر نہیں ہیں کہ موت واقع ہو گئی۔

موت تو ہمیں بھی آئے گی، جتنے ہم ہیں ہم سب کو آئے گی، اس پر کیا رونا؟ بلکہ اس بارے میں تو خوش ہونا چاہئے کہ ایک اعلیٰ ترین زندگی گزار کر ایک اچھے مقام پر انشاء اللہ پہنچ گئے تو ہمارے لئے خوشی کی بات ہے۔ یہ جو غم اور رونا ہے یہ ان کی جدائی پر ہے کہ ہم سے ایک ذات چھن گئی۔ حقیقت میں آدمی اپنی غرض اور اپنے منافع کو روتا ہے نہ کہ مرنے والے کو تو مرنے والے کے انجام کو جب دیکھتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ بڑا اچھا خاتمہ ہوا۔

اچانک موت...... اب جیسے باوانی صاحب مرحوم کا میں نے سنا کہ۔ اچانک موت واقع ہوئی اور ہارٹ فیل ہوا۔ حدیث میں فرمایا گیا مَوْتُ الْفُجَآءَةِ الخ ① اچانک کی موت کافر کے لئے عذاب ہے اور مومن کے لئے رحمت ہے۔ تو اللہ کی فرمائی چیز ہے تو یہ یقینی ہے کہ ان کے لئے رحمت واقع ہوئی۔ اس لئے کہ بحمد اللہ وہ مومن تھے اور مسلم تھے اور مسلم پر جب اچانک موت آتی ہے وہ رحمت بنتی ہے۔ تو موت تو خوشی کی چیز ثابت ہوئی کہ رحمت نے انہیں قبول کر لیا۔ آگے غم اپنا ہے کہ وہ ہم سے چھین لئے گئے۔ ہم سے وہ جدا ہو گئے تو اس جدائی۔ کی تسکین یہ ہے کہ ہم ایصال ثواب کریں۔ ان کو یاد رکھیں تو وہ ہم سے قریب رہیں ہم ان کے قریب رہیں۔ کبھی کبھی ان کے

① مصنف ابن ابی شیبة، کتاب الجنائز، باب فی موت الفجاءة وماذکر فیه، ج:۳، ص:۴۸ رقم ۱۲۰۰۵.

مزار پر جا کر زیارت کرلیں۔

آدابِ زیارت..... حدیث میں ہے کہ جب قبر کی زیارت کی جاتی ہے تو آدابِ زیارت میں سے فرمایا گیا کہ آدمی قبلہ کی طرف پشت اور میّت کی طرف منہ کرے، اس لئے کہ میّت اسے دیکھتا ہے اور پہچانتا ہے، جو پہچان دنیا میں تھی وہی برزخ میں جا کر رہتی ہے، پچھلا علم سلب نہیں ہوتا۔ چھن نہیں جاتا۔ جو جذبات اور جان پہچان دنیا میں تھی وہ وہاں بھی باقی رہتی ہے تو جس سے جتنا تعلق ہوتا ہے وہاں بھی قائم رہتا ہے، جس سے جتنی جان پہچان تھی وہ قائم رہتی ہے، تو اس تعلق کو نبھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے مرنے والوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا جائے اور ایصال ثواب کے جائز طریقے اختیار کر کے ان کو نفع پہنچایا جائے۔ اس میں مرنے والوں کا بھی نفع ہے اور پس ماندگان کے لئے بھی تسکین ہے۔ انہی چند کلمات پر تقریر ختم کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، اور نافع فرمائے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْاُمُوْرِ كُلِّهَا وَاَجِرْنَامِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَةِ وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

افاداتِ بخاری نمبرا

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا."

اَمَّـا بَعْــدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ربط بین الا بواب...... یہ بخاری کی آخری حدیث ہے۔جس پر امام ہمام نے اپنی کتاب کو ختم کیا۔ پہلے تو امام کی اس صنعت پر غور کیا جائے، کہ ابتداء بھی عجیب انداز سے فرمائی اور انتہاء بھی عجیب انداز سے کی، محدثین کرام کا طریق یہ ہے کہ اگر کسی نے جامع لکھی تو ''کتاب الایمان'' سے ابتداء کرتے ہیں اور اسکے بعد دوسرے ابواب لاتے ہیں، اور اگر سنن کی کتاب ہے، تو عموماً ابتداء ''کتاب الطہارت'' سے کی جاتی ہے اور پھر نماز، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے ابواب لاتے ہیں۔تو سنن کا بھی ایک طریقہ ہے، اور جوامع کا بھی ایک طریقہ ہے

وحی سے ابتداء کی وجہ..... لیکن مصنف نے ''کتاب الْاِیْمَان'' سے ابتداء کرنے کے بجائے، بَابُ بَدْءِ الْوَحْيِ سے کی ہے کہ وحی کی ابتداء جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح ہوئی۔اسکی وجہ یہ ہے کہ جتنے دین کے ابواب ہیں، ان کا مادہ درحقیقت وحی ہے۔وحی مادہ شریعت ہے، اور اس مادہ کی بھی شاخیں ہیں۔کوئی شاخ کتاب الایمان ہے کوئی شاخ کتاب الصلوٰۃ ہے۔کوئی شاخ کتاب الزکوٰۃ ہے۔تو ان سب میں وحی جلوہ گر ہے۔ قدر مشترک وحی ہے اور اس کی شکلیں مختلف ہیں۔اور وہی وحی کبھی نماز کی صورت میں نمایاں ہوئی اور وہی وحی کبھی حج کی صورت میں نمایاں ہوئی۔اور وہی وحی کبھی دوسرے ابواب کی صورت میں ''ظہور پذیر ہوئی'' تو مادہ شریعت کا وحیِ خداوندی ہے، اس لئے مصنف نے ابتداً مادۂ شریعت کو ذکر کیا۔اس کے بعد پھر اس کی شکلوں کو ذکر کیا'' اور ظاہر بات ہے کہ مادہ کا وجود شکل پر مقدم ہوتا ہے''۔

بنیاد علم ایمان ہے..... تو سب سے پہلے کتاب الایمان کو لاتے ہیں۔اس لئے کہ تمام اعمال کی مقبولیت کا دارومدار ایمان پر ہے۔ایمان نہ ہو تو کوئی عمل مقبول نہیں ہوسکتا، گویا ایمان تمام علوم کا مدار علیہ اور موقوف علیہ تھا۔ اس لئے پہلے کتاب الایمان لائے اب آدمی کو ایمان حاصل ہوگیا اعتقاد حاصل ہوگیا۔حق تعالیٰ کی یکتائی پر، نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پر، تو سب چیزوں پر یقین ہوگیا۔

ضرورتِ علم...... لیکن یقین کے بعد علم کی ضرورت پڑتی ہے، کہ اس یقینی چیز کو ہم کس طرح انجام دیں، ظاہر ہے کہ اس کیلئے علم کی ضرورت ہے، جہالت سے کوئی چیز انجام نہیں دی جاسکتی تو کتاب الایمان کے بعد کتاب العلم لائے ہیں تاکہ علم کی عظمت اور علم کی نوعیت واضح ہوجائے۔ گویا اب آدمی میں ایمان بھی ہے اور علم بھی حاصل ہوگیا۔

مقصدِ تخلیق...... اس کے بعد پھر عبادات شروع کئے ہیں جو انسان کی پیدائش کا اصل مقصد ہے ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ ① تو مقصد اصلی یہ ہے کہ انسان عبادت کرے۔ عبادت کے معنی ہیں کہ بندے کا ربط اللہ سے اور عبد کا معبود سے رابطہ کیا ہے؟ اس رابطے اور جوڑ کو عبادت کہتے ہیں۔ کہ جس سے بندہ قربت حق حاصل کرسکے۔ اور حق تعالیٰ سے تقرب پیدا کرسکے۔

عبادات کے بعد معاملات...... جب بندے اور خدا کا رشتہ جڑ گیا۔ اس کے بعد بندوں سے بندوں کا کیا واسطہ ہے۔ تو معاملات (کے ابواب) لائے جس میں نکاح بھی ہے، جس میں بیع وشراء بھی ہے، ہبہ اور میراث بھی ہے، اوقاف بھی ہیں یہ تمام معاملات لائے ان تمام کو جب بیان کرلیا۔ اس کے بعد ان تمام چیزوں کو فتنوں سے بچانے کی کیا صورت ہے؟ ساری معلومات حاصل ہیں۔ سارے ابواب سامنے ہیں مگر فتنہ اتنا ہے کہ ان پر عمل کرنا مشکل ہے۔

ضرورتِ جہاد...... تو پھر کتاب المغازی لائے اس کے ذریعے جہاد فی سبیل اللہ ہے تاکہ دین کو فتنوں سے محفوظ رکھا جائے اور فتنہ مرتفع ہو، پھر اس کے بعد جب جہاد بھی آگیا تو ان مجاہدین کی نوعیت کیا ہونی چاہئے؟ تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال انبیاء علیہم السلام کی سیرتیں ذکر کیں کہ اصل مجاہد تو یہ حضرات تھے، ان کی پیروی میں دوسرے جہاد کریں گے۔

طریقِ عمل...... لیکن طریق عمل کیا ہوگا؟ جس سے علم پر عمل کرے، ظاہر ہے کہ وہ طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے، اس لئے اس کے بعد "بَابُ اِتِّبَاعِ السُّنَّةِ" لاتے ہیں کہ سنت کی پیروی ہوگی تب اس علم پر عمل نصیب ہوگا۔ اور علم پر عمل نصیب ہوجانا جب موثر ہوگا۔ جب پہلے ایمان ہوگا تو پہلے کتاب الایمان لائے، پھر کتاب العلم لائے اور پھر کتاب اتباع السنۃ لائے۔

فضیلتِ امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم...... ان تمام ابواب کو اس امت کی فضیلت پر لاکر ختم کیا اور آخر میں یہ حدیث لائے جس کی آپ نے تلاوت کی ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ مصنف نے دنیا سے ابتداء کی اور آخرت پر لاکر کتاب کو ختم کیا۔

ندرتِ سند...... دنیا میں انسان ایمان کا مکلف تھا، پھر اسلام کا، پھر اعمال کا، پھر معاملات کا، ساری چیزیں انجام دیں تو سوال یہ ہے کہ بھائی اس کا ثمرہ کیا نکلے گا؟ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ ہمیں کوئی اجر ملے گا؟ کوئی صلہ ملے گا؟ کوئی

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

مقبولیت پیدا ہوگی؟ تو اس حدیث پر لا کر ختم کیا کہ تسبیح وتہلیل پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور بندہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے تو دنیا سے ابتداء کی اور آخرت پر لا کر ختم کیا یہ ایک عجیب وغریب صنعت ہوگئی کہ آغاز میں اللہ کا نام اور انتہاء میں قیامت اور یوم حشر، اس کے ثمرات اور بیچ میں سارا معاملہ اسلام اور ساری زندگی کا بیان ہے۔

عظمتِ سند...... تو جیسے کتاب جلیل القدر ہے، اور جیسے مصنف جلالت والے ہیں، اسی طرح سے ان کی صنعت بھی جلالت قدر رکھتی ہے، کہ مصنف علام نے عجیب وغریب صنعت اختیار کی ہے۔ یہ تو میں نے ابتداء بخاری کے بارے میں عرض کردیا۔

اوصافِ حدیثِ متعلقہ...... اب اس کے بعد یہ حدیث آئی جو تلاوت کی گئی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے: "کَلِمَتَانِ خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ حَبِیْبَتَانِ اِلَی الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ" ① اس میں تسبیح "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ" کا ذکر ہے۔ حدیث میں اس کے تین اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں، ایک تو حسی صورت ہے جو کانوں سے محفوظ ہوتی ہے اور آدمی دیکھ سکتا ہے، ایک معنوی چیز ہے اور ایک اخروی چیز ہے تو تین صفات بیان کی گئی ہیں۔

حسی وصف اول...... پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ" یہ کلمے زبان پر بہت ہلکے ہیں۔ ان کے پڑھنے میں کوئی دشواری اور پیچیدگی نہیں کہ زبان کو اینچنا پڑے، "بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ" عربی زبان جیسی خفیف اور اخف زبان کے یہ کلمات ہیں، زبان بھی ہلکی پھلکی ہے اور یہ کلمات "خاص طور پر" اس میں اور ہلکے پھلکے ہیں، جن کے ادا کرنے میں نہ زبان کو کوئی دشواری پیش آئے اور نہ اینچنا پڑے، بہت ہی ہلکے پھلکے ہیں۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ

فضیلتِ عربی...... اور بناء اس کی یہ ہے کہ خود عربی زبان بہت ہی خفیف اور ہلکی بھی ہے، اس کے کلمات جن معانی کو ادا کرتے ہیں وہ کلمات ایسے لطیف ہیں کہ ان کے بغیر وہ حقیقت ادا نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہی کلمہ نہ پڑھا جائے، ان کلمات کو دوسری زبان میں ادا کرنا ہو تو دوسری زبانوں میں کلمات نہیں ملتے جو اس پوری حقیقت کو ادا کردیں۔ تو زبان پاکیزہ اور نہایت خفیف ہے، لسان اللہ بھی ہے، حق تعالیٰ اسی میں کلام فرماتے ہیں، اللہ نے اسی زبان کو اپنے معجزے کے اظہار کے لئے منتخب فرمایا۔ قرآن ایسا معجزہ ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا یہ کلام نہیں کرسکتا۔ تو اس شانِ اعجاز کا کوئی دوسری زبان تحمل نہیں کرسکتی، نہ انگریزی نہ ترکی زبانیں نہ پنجابی، اعجاز اور معجزے کا تحمل اگر کسی زبان نے کیا ہے تو وہ عربی زبان ہے کہ کلمات بہت تھوڑے اور حقائق اس میں بہت زیادہ بھرے ہوئے ہیں، تو زبان کے لحاظ سے خفیف بھی اور لطیف بھی ہے اور معجزے کا تحمل کرنے والی ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے کلام کیا۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ: لِسَانُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِیٌّ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی"

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ ونضع الموازین القسط، ج: ۶، ص: ۴۹ ۷رقم: ۷۱۲۴.

اہلِ برزخ کی زبان...... برزخ کی زبان تو سریانی ہے۔ جس میں میت کلام کرے گا اور ملائکہ علیہم السلام اس سے خطاب کریں گے، وہ زبان تو سریانی ہے، لیکن میدانِ محشر سے جو زبان شروع ہوگی تو وہ عربی زبان ہوگی۔ پھر جنت کی وہی زبان رہے گی۔ اور ابدالآباد تک وہی زبان رہے گی۔ تو قرآن کی زبان عربی حق تعالیٰ شانہ کا کلام عربی، اہلِ جنت کی زبان عربی تو یہ عربی زبان کی فضلیت دخفت اور اسکا ہلکا پھلکا ہونا دلیل سے واضح ہوگیا۔

سابقہ کتب کی زبان...... ابتداء میں حق تعالیٰ کی کتابیں عبرانی اور سریانی زبانوں میں نازل ہوئیں تو عبرانی ثقیل زبان ہے، جب اس کو ہلکا پھلکا کیا گیا تو اس کی شکل عربی ہوگئی، ورنہ ابتداً وہ ثقیل تھی، مثلاً توراۃ عبرانی زبان میں اتری ہے، ایک آیت ہے اس سے اندازا کیجئے کہ اس میں زبان کو کتنا اینچنا پڑتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جہاں پیشن گوئی کی تو فرمایا کہ: "**نابی بخر بحاما خوخا یا خیم نی یخو خاد جسمهم**" اس میں سوائے خا "خ" کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا جب اس کو عربی میں منتقل کیا گیا۔ معنی نہیں بلکہ لفظاً تو یوں ہوگیا نابی سے نبی تو ہوگیا۔ یعنی "**خربحنا یعنی من قربک بخربخا** کی جگہ آگیا: **من تربک ماخوخا یعنی من اخیک یا خیم لخا یعنی یقیم لک یخوخا الهک فتسمون.**"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیشن گوئی فرمائی گئی کہ نبی آئیں گے تمہارے قریب کے ہوں گے، تم بنی اسرائیل ہو وہ بنی اسماعیل ہوں گے، چچا تائے کے بھائی ہوں گے۔

"**نابی بخر بخا یعنی نبی من قوبک ما خوخاً یعنی من اخیک**" تمہارے بھائی ہوں گے "**یا خیم لخا یعنی یقیم لک**" وہ اللہ کی الوھیت کو قائم کریں گے، اور اللہ کی عظمت و بزرگی اور اس کی عبادات کو قائم کریں گے، تو اب کہاں **نابی بخو خایا خیم لخا یاخوخا** ہے۔ اور کہاں **نَبِیٌّ مِنْ قُرُبِکَ مِنْ اَخِیْکَ یُقِیْمُ لَکَ اِلٰهَکَ.**

تو لطافت کا فرق نمایاں معلوم ہوتا ہے کہ ایک میں تو زبان کو ذرا اینچنا پڑتا ہے اور ایک میں زبان ہلکی پھلکی چلتی ہے، چوں کہ زبان خود خفیف تھی اور اس میں یہ کلمات اور بھی زیادہ خفیف اور اخف ہیں تو فرمایا: **خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ** ان دو کلموں کو ادا کرو تو زبان پر بھاری نہیں ہیں، بہت ہلکے پھلکے ہیں نہ کچھ وقت لگتا ہے نہ کوئی پیچیدگی بلکہ پل بھر میں کلمات ادا ہو جاتے ہیں۔ تو ایک صفت تو یہ بیان کی گئی کہ یہ دو کلمے زبان پر ہلکے ہیں، یہ صفت حسی، یعنی جب آپ سنیں گے تو کان محسوس کریں گے کہ بڑی ہلکی پھلکی چیز ہے۔

وصفِ ثانی وزنِ اعمال اوران کی کیفیت...... دوسری صفت "**ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ**" زبان پر ہلکے اور میزانِ عمل میں وزنی اور بھاری اجرا اتنا بڑا ہوگا کہ آدمی بظاہر کتنا ہی پڑھے اتنا اجر نہیں ملے گا جتنا ان دو کلموں کے پڑھنے سے ملے گا تو میزانِ عمل میں وزنی اور ثقیل ہوں گے۔

وزنِ اعمال کی کیفیت...... وزن دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک جسمانی وزن اور ایک معنوی ہے جسمانی وزن تو

اجسام کا یہ ہے کہ سیر بھر کا وزن کم ہے دو سیر کا زیادہ اور تین سیر کا اس سے زیادہ اور دھڑی بھر کا اس سے زیادہ اور من کا اس سے زیادہ۔ تو ایک تو مادی ہے جو مادیات سے متعلق ہے جتنی مادی چیز ضخیم ہوگی اور بڑی ہوتی جائے گی وزن بڑھتا جائے گا۔ اور ایک معنوی وزن ہے تو ان دو کلمات میں معنوی وزن ہے۔ ترازو میں تو لنے لگو تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس کے معنی پر غور کرو تو نہایت باعظمت معنی ہیں جس کا بوجھ پڑتا ہے۔ بوجھ فقط مادی نہیں ہوتا بلکہ روحانی بھی ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ فلاں عالم آئے تو میرے دل پر بوجھ پڑا۔ ان کے آنے سے کیا بوجھ؟

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ سیر کا وزن رکھا گیا؟ نہیں بلکہ ان کی عظمت کا بوجھ پڑا۔ ان کے اندر جو روحانی قوت تھی اس کی ہیبت پڑی اور میرا دل بیٹھنے لگا اور انکی عظمت کو مان لیا۔ تو حق تعالیٰ کی عظمت جو دلوں میں ہے وہ معنوی عظمت ہے کہ بوجھ ہے اور وہ بوجھ معنوی ہے، حق تعالیٰ مادیات سے بری ہیں۔ اسی طرح ان کا کلام بھی مادیات سے بری ہے۔ روحانی اور لطیف ہے اس کا بوجھ قلوب کے اوپر پڑتا ہے۔ اگر کوئی جاہل کلام کہے تو آپ کے دل میں قطعی احسان نہیں ہوگا کہ بھائی یہ بھی کوئی سننے کی چیز ہے اگر کوئی عالم کلام کرے تو آپ غور کریں گے اور کہیں گے کہ بڑا وزنی کلام ہے دل میں بیٹھتا نہیں ایک دفعہ اور سنا دو ایک دفعہ اور سنا دو تا کہ دل میں پوری طرح بیٹھ جائے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جب حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف لائے، تو فرمایا کہ ان کے آنے سے میرے دل پر ان کی عظمت کا بوجھ پڑا، یہ بوجھ مادی وزن نہیں تھا روحانی وزن تھا، جو باعظمت ہوتا ہے اس کے اثر کو روح قبول کرتی ہے، دل قبول کرتے ہیں، کاغذ کے اوپر اگر آپ یہ کلمہ لکھ دیں تو کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ لیکن جب پڑھنے لگیں۔ اور عظمت خداوندی سامنے آئے تو جی لرزنے لگے گا جیسے کسی چیز کو اٹھایا نہیں جاسکتا تو یہ معنوی بوجھ ہوتا ہے، تو یہاں مراد معنوی بوجھ ہے، کہ میزان عمل میں جب اس کلمے کو تولا جائے گا تو میزان عمل اس کی عظمت کے بوجھ سے جھک جائے گی۔

وزنِ روحانی..... جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: قیامت کے دن ایک بندہ حاضر ہوگا اور اس کے ساتھ اس کی بدکاریوں کے انبار ہوں گے۔ ایک دفتر کو پھیلاؤ تو زمین و آسمان جھک جائیں۔ وہ حاضر ہوگا تو حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے۔ کہ اے بندے اپنے اعمال کو تلواؤ۔ وہ عرض کرے گا۔ کہ اللہ میں کاہے کو تلواؤں میرے پاس تو بدیاں ہی بدیاں ہیں۔ تولنے کی ضرورت تو تب ہو جب ایک طرف نیکی ہو اور دوسری طرف بدیاں ہوں۔ یہ تو بدیاں ہی بدیاں ہیں۔ فرمایا کہ نہیں تیری ایک نیکی بھی ہمارے پاس ہے۔ تو ننانوے دفتروں میں ایک پرچی نکلے گی کہ پوری عمر میں ایک مرتبہ ل "آاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کلمہ طیبہ پڑھا ہوگا تو وہ عرض کرے گا کہ اے اللہ ان ننانوے دفتروں کے مقابلہ میں اس پرچی کی کیا حیثیت ہوگی؟ میں تو جہنم کا مستحق ہوں۔ مجھے جہنم میں بھیج دیا جائے، میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ مقام کریم تک پہنچ سکوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ ﴿لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ﴾ ہمارے ہاں ظلم نہیں ہے، ذرّے ذرّے کا حساب ہوگا تم تلواؤ اور اپنی نگرانی میں تلواؤ کہیں تو

یوں نہ کہے کہ ملائکہ علیہم السلام نے کوئی زیادتی کردی ہے کم تول دیا یا زیادہ تول دیا۔ وہ ننانوے دفتر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اس کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾

اللہ کے نام سے زیادہ وزنی نام کون سا ہوسکتا ہے جس کی اندر عظمت کا بوجھ ہو تو اسی کے نام پاک کا یہ کلمہ بھی ہے ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ'' کہ اس کی عظمت سے میزان کا پلڑا جھک جائے گا اگر چہ لاکھوں بدیاں اور برائیاں ہوں مگر اس کی عظمت غالب آجائے گی اور وہ جھک جائے گا، تو مطلب یہ کہ ایک وزن مادی ہوتا ہے اور ایک وزن روحانی اور علمی ہوتا ہے۔ یہاں روحانی اور علمی وزن مراد ہے۔

درود شریف کی برکت...... نیز حدیث میں جیسے فرمایا گیا کہ اس امت کے ایک فرد کو جہنم کا حکم دے دیا جائے گا اور ملائکہ علیہم السلام اس کو جہنم کی طرف لے جا رہے ہوں گے اور وہ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوگا کہ کوئی مددگار ہے یا نہیں؟ تو حضرت آدم علیہ السلام کی نگاہ اس پر پڑے گی تو حضرت آدم علیہ السلام پکاریں گے کہ یَآ اَحْمَدُ! یَآ اَحْمَدُ! آپ عرض کریں گے: لَبَّيْكَ يَآ اَبَا الْبَشَرِ حاضر ہوں۔ تو وہ فرمائیں گے آپ کی امت کا ایک آدمی ہے۔ جسے جہنم کی طرف لے جایا جا رہا ہے تو آپ ملائکہ کا پیچھا کریں گے اور ان سے فرمائیں گے رک جاؤ، وہ کہیں گے ہمارا نام زبانیہ ہے ہم جہنم کے ملائکہ ہیں اور ہم امر خداوندی کے مامور ہیں ہم آپ کا حکم نہیں مان سکتے، امر خداوندی آچکا ہے، تو آپ بہت ہی تاسف سے اپنی ریش مبارک پر ہاتھ پھیریں گے، اور جا کر عرش کے نیچے سجدہ کریں گے اور عرض کریں گے کہ:

اے اللہ! میرا ایک امتی ہے، بے شک گنہگار ہے مگر آپ کی رحمت وسیع ہے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم آپ کو رسوا نہیں کریں اور ادھر سے آواز دی جائے گی: لَا تَعْجَلُوْا جلدی مت کرو، ملائکہ رک جائیں گے، آپ تشریف لائیں گے اور اپنی جیب میں سے ایک پرچہ نکالیں گے جیسے اس وقت کی جیب ہوگی، جیسا لباس ہوگا، خدا بہتر جانتا ہے پرچہ نکالیں گے، اور بِسْمِ اللّٰهِ کہہ کر آپ اس کو میزان عمل میں ڈالیں گے، ایک دم نیکیوں کا پلڑا جھک جائے گا اور اس کی نجات ہوجائے گی۔ وہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہچانتا نہیں ہوگا تو آ کر عرض کرے گا اے نیک نہاد! آپ کون ہیں جو اس آڑے وقت میں میری امداد کی اور مجھے جہنم سے بچایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے: اَنَا اَحْمَدُ میں تیرا نبی ہوں میرا نام احمد ہے تو وہ جھک جائے گا اور کہے گا، سبحان اللہ یہ آپ نے آکے کیا کیا۔ میرا تو پلڑا ہلکا پڑ گیا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ تو نے ایک دفعہ نہایت ہی کمال اخلاص کے ساتھ درود بھیجا تھا وہ درود کی پرچی میرے پاس جیب میں محفوظ تھی۔ وہ اتنے اخلاص سے بھرا ہوا تھا کہ جب میں نے وہ پلڑے میں ڈالی تو اس اخلاص کی برکت سے وہ ساری بدیاں ہلکی پڑ گئیں۔

ظاہر بات ہے کہ درود شریف کو اگر پرچی پر لکھ کر جیب میں ڈال لیں تو کوئی وزن محسوس نہیں ہوگا لیکن روح اس کے وزن کو محسوس کرے گی۔ اس میں جو اخلاص کا وزن ہے وہ روح محسوس کرے گی تو حق تعالیٰ شانہ قیامت

کے دن اعمال کے ڈھانچوں کونہیں دیکھیں گے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ ان کے اندر اخلاص کتنا ہے سچائی کتنی ہے محبت خداوندی کتنی ہے درحقیقت اس کا وزن ہوگا حدیث میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ یہ دو کلمے زبان پر ہلکے اور میزان عمل میں اپنی معنویت کی وجہ سے بھاری ہیں تو یہ دوسرا وصف ہوا یہ وصف حسّی نہیں ہے بلکہ وصف روحانی ہے اس کو ارواح وقلوب محسوس کریں گے۔

تیسرا وصف...... تیسرا وصف ذکر کیا کہ: ''حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ'' یہ دونوں کلمے وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہیں ظاہر بات ہے کہ جب کسی کے پاس اس کی پسندیدہ چیز ہدیے میں لے جائیں گے تو توجہ بہت ہوگی۔ فطرت کا تقاضہ ہے کہ کوئی ایسا ہدیہ لے جائیں جس سے اگلا کراہت محسوس کرے تو پسند نہیں کرے گا قبول نہیں کرے گا کوئی ایسی چیز لے جائیں جو مرغوب ہے تو شکریہ بھی ادا کرے گا اور خوش بھی ہوگا، تو یہ کلمات حق تعالیٰ شانہ کو محبوب ہیں، محبوب چیز کا جب ہدیہ پیش ہوگا تو عنایات متوجہ ہو جائیں گی۔ محبوب کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کلمات میں الوہیت کے مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔

مقامِ الوہیّت...... مقاماتِ الوہیّت چار ہیں جو خصوصیات خداوندی ہیں اور ظاہر بات ہے کہ اس میں شرک کی گنجائش نہیں ہے۔

پہلا مقام...... سب سے پہلی چیز تنزیہہ ہے، تنزیہہ کے معنی ہیں۔ اللہ کی پاکی بیان کرنا ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے پاک ہر نقص سے بری وبالا۔ کوئی ادنیٰ درجے کے نقص کا شائبہ یا عیب کا شائبہ ممکن نہیں۔ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تو سب سے پہلی چیز حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور اس کی پاکی کہ وہ تمام عیوب سے پاک ہے، اللہ ہر عیب سے ہر ذم سے یعنی برائی اور کوتاہی سے پاک ہے تو تسبیح کے معنی درحقیقت تنزیہہ کے ہیں کہ وہ ہر برائی سے منزہ ہے اور سب چیزوں سے بالا ہے جس کو قرآن حکیم میں مختلف عنوانات میں بیان فرمایا گیا ہے۔ کہیں فرمایا گیا: ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ ① نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے اس لئے کہ یہ تھکن کی علامت ہے اور تھکن ضعف کی علامت ہے اور وہ قوی ہے اس کا ضعف سے کیا کام کہیں فرمایا: ﴿لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى﴾ ②

میرا پروردگار نہ بہکتا ہے اور نہ بھولتا ہے بھول اور بہک ضعف کے سبب سے ہوتی ہے اور حافظہ قوی نہ ہو۔ اور وہ تو قوی ہے وہاں بھول چوک کا کیا کام؟ تو یہ آیتیں تنزیہہ کے لئے ہیں . ﴿لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى﴾ ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ نہ وہاں نیند ہے نہ وہاں اونگھ ہے اور نہ وہاں معاذ اللہ بہکنا ہے اور نہ وہاں نسیان ہے۔ ہر چیز سے وہ بری و بالا ہے اس کا علم قطعی اور محیط ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں تو ساری چیزیں ''سبحان'' کے نیچے آتی ہیں کہ اللہ نوم سے، اونگھنے سے، بہکنے سے اور بے راہ چلنے سے بھی پاک ہے تو سبحان کا کلمہ تنزیہہ کے لئے رکھا گیا ہے اور جگہ جگہ قرآن کریم نے اس کی طرف دعوت دی ہے، کہیں فرمایا: ﴿فَسُبْحَانَ

① پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۵. ② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۲.

اللهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ﴾ "اللہ پاک ہے تم صبح کرو یا شام کرو" یعنی صبح وشام تغیر کی علامت اور تغیر ضعف کی علامت ہے اور وہ ان سب سے بری ہے سارے تغیرات تمہارے اندر ہیں۔ ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى﴾ ① "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے مختصر حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی اور مسجد اقصیٰ سے سمٰوٰت کی طرف رجوع فرمایا"۔ کہیں فرمایا: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ ② "اپنے رب کی پاکی بیان کرو" اور کہیں فرمایا: ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَافِي الْاَرْضِ﴾ ③ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَافِي الْاَرْضِ﴾ ④

تو جگہ جگہ قرآن کریم نے تسبیح کا لفظ استعمال کیا ہے، جہاں تنزیہہ بیان کرنی مقصود ہے کہ وہ ہر کوتاہی، ہر عیب، ہر شی سے منزہ ہے تو حق تعالیٰ شانہ، کی ذات کا پہلا مقام تنزیہہ ہے کہ وہ ہر عیب سے بری و بالا ہے۔

دوسرا مقام...... اس کے بعد دوسرا مقام اس کی عظمت شان کا ہے کہ اس کی شان سب سے بڑی اور نرالی ہے اور لامحدود عظمتوں کا وہ مالک ہے اس کے لئے شریعت نے حمد کا کلمہ رکھا ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ⑤

حمد کے معنی یہ ہیں کہ ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں اور تعریف کبھی برائی پر تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ کمال پر ہوتی ہے تو جب ساری تعریفیں اسی کے لئے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سارے کمالات اسی کے لئے ہیں وہ سارے کمالات کا مصدر ہے۔ ہر خیر اور ہر برکت اس کی طرف سے ہے، ہر کمال اس کا۔ ہر علم اس کا ہے، ہر خوبی اس کی ہے وہ تمام کمالات کا سر چشمہ ہے۔ تو کمالات کا سر چشمہ ہونے سے ظاہر کیا ہے کہ ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں اور جب ساری تعریفیں اسی کے لیے ہیں تو سارے کمالات بھی اس کے لئے ہیں اس لئے کہ حمد کسی جمیل اختیاری پر ہوتی ہے کہ کوئی عمل اور کام ارادی اور اختیاری اتنا اعلیٰ ہو کہ جی چاہتا ہو کہ اس (کے صانع) کی تعریف اور حمد کریں۔ تو اس حمد کے ظاہر کرنے کے لئے شریعت اسلامیہ نے حمد کا کلمہ رکھا ہے۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ ⑥ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ﴾ ⑦ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَافِي الْاَرْضِ﴾ ⑧

تو جگہ جگہ حمد کا کلمہ استعمال کیا ہے۔ بعض سورتیں کلمہ حمد سے شروع ہوتی ہیں تو عرض تنزیہہ ہے کہ پاکی بیان کی جائے اس کے لئے سبحان کا کلمہ ہے اور تحمید ہے، یہ الوہیت کا دوسرا مقام ہے۔

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۱۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ الاعلی، الآیۃ: ۱۔
③ پارہ: ۳۰، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۱۔ ④ پارہ: ۳۰، سورۃ الصف، الآیۃ: ۱۔
⑤ سورۃ الفاتحۃ، الآیۃ: ۱۔ ⑥ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۱۔
⑦ پارہ: ۵، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۔ ⑧ پارہ: ۲۴، سورۃ السباء، الآیۃ: ۱۔

تیسرا مقام......اور ظاہر بات ہے کہ جو ذات ایسی ہو۔ ہر عیب سے پاک اور کمال کا سرچشمہ ہو تو عظمت اور بڑائی اس کے سوا کس کی ہوسکتی ہے؟ ساری برکتیں اس کی ساری عظمتیں اس کی اسی لئے فرمایا گیا: ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ ساری بڑائیاں اس کے لئے ہیں اس کو ظاہر کرنے کے لئے اسلام میں تکبیر کا حکم ہے وہ اکبر ہے یعنی ہر چیز سے بالا ﴿ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالُ ﴾

وہی بڑا، وہی عالی اور بلند ہے اس کیلئے تکبیر کا حکم ہے اَللّٰهُ اَكْبَر یعنی اللہ ہر چیز سے بڑا ہے۔ ہر بڑائی اس کے سامنے حقیر ہے ہر عظمت اس کی عظمت کے سامنے چھوٹی ہے۔ اب کوئی انڈے کے سامنے چراغ جلا دے تو چراغ کی کیا حقیقت ہوگی؟ اور سورج کے سامنے انڈا جلا دے تو انڈے کی کیا حقیقت ہوگی؟ اس کا سارا نور سورج کے نور میں گم ہو کر رہ جائے گا، سورج کے سامنے چراغ جلا دے تو چراغ کی کیا حقیقت ہوگی؟ تو انوار ربانی کے سامنے کوئی نور نہیں چلتا سب مدہم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انوار ربانی کے سامنے کوئی ہستی باقی نہیں رہتی۔ تو کبیر کے معنی یہ ہیں کہ بلندی، برتری اور بالائی سب اسی کے واسطے ہیں جس کو ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ سے تعبیر کیا کہ آسمانوں اور زمینوں میں اسی کے واسطے بڑائی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَآئِي وَالْعَظَمَةُ اِزَارِيْ فَمَنْ نَّازَعَنِيْ فِيْهِمَا قَصَمْتُهٗ.'' تکبر اور بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری لنگی ہے۔ جو اس میں کھینچا تانی کرے گا تو میں یقیناً اس کی گردن توڑ دوں گا اور اسے نیچے دکھاؤں گا۔ اس لئے جو بھی کسی مجلس میں بڑا بول بولتا ہے تو یقیناً اسی مجلس میں اس کی حقارت کرنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ ہر گناہ کے لئے کچھ نہ کچھ سہائی (معافی) ہے۔ لیکن کبر اور نخوت جب ہوگی تو ہاتھ کے ہاتھ اس کو جواب ملے گا۔ اس کی مغفرت نہیں یہ قابل برداشت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ گناہ بندے کا اپنا فعل ہے، اور اپنی صفت ہے اور کبریائی و بڑائی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جو اس کی بڑائی میں حصہ دار بننا چاہے گا وہ باقی نہیں رہ سکتا اس کو نیچا دکھایا جائے گا۔ ذلیل و رسوا کیا جائے گا تو عظمت و کبریائی تیسرا وصف ہے۔

چوتھا مقام......حق تعالیٰ کی تمجید یعنی اس کی عظمت اس کی بزرگی اور اس کی بڑائی کے لئے تکبیر کا کلمہ رکھا گیا ہے کہ: ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ'' اللہ ہر چیز سے بڑا ہے، اب ظاہر بات کہ جو ہر عیب سے پاک ہے، اور خوبی کا سرچشمہ ہو، بڑائی بھی اسی کے لیے ہو تو اس کے علاوہ یکتائی کے لائق اور کون ہوسکتا ہے۔ اس سے توحید پیدا ہوتی ہے، اس کے لئے تہلیل کا حکم رکھا گیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کے آگے جھکیں گے، اسی کے آگے فریاد کریں گے اسی سے مدد مانگیں گے اور اسی کی طرف رجوع کریں گے وہی دافع امراض ہے ہر عبادت اسی کے لئے ہوگی۔ تو یہ دعویٰ توحید چوتھا مقام ہے۔

دعویٰ توحید کی تکمیل......اس سے اتنی بات واضح ہوگئی کہ توحید کا دعویٰ کبھی مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ یہ تین مقام سامنے نہ ہوں تنزیہہ مکمل ہو کہ ہر عیب سے پاک ہو تو یہ ہو کہ ہر خوبی کا مالک ہو، تکبیر مکمل ہو کہ ہر عظمت اس

کی ہو، جب یہ تین چیزیں ثابت ہوں گی تب توحید کا وجود ہوگا۔ اگر کوئی اللہ کی تنزیہہ نہ کرے اس میں مخلوق کی صفات مان لے یا مخلوق میں خالق کی صفات مان لے تو وہ کبھی بھی توحید کا دعویٰ نہیں کر سکتا اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا دعویٰ ہوگا توحید کا پہلا قدم تنزیہہ کہ ہرعیب سے اس کی پاکی بیان کرو ۔ ﴿لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ﴾ ①

نہ وہ کسی سے جنا گیا اور نہ اس کی کوئی اصل ہے، وہ خود اصل ہے نہ وہ کسی کو جنے گا کہ اس کا کوئی بیٹا ہو یا کوئی اس کی بیوی ہو یا کوئی کفو اور برابر ہو۔ تو ان سب چیزوں سے آدمی پاکی بیان کرے گا، تب توحید کے مقام پر پہنچے گا۔ اللہ کے باپ ہونے کا قائل ہو جائے، اللہ کے لیے بیوی ہونے کا قائل ہو جائے، اس کے لئے کسی برابری کا قائل ہو جائے، اس کیلئے کسی شریک ہونے کا قائل ہو جائے۔ وہ کبھی توحید کا مدعی نہیں بن سکتا اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا ہوگا، اس لئے کہ توحید کا پہلا قدم تنزیہہ ہے۔ تو چاہے نصاریٰ توحید کا دعویٰ کریں، چاہے مشرکین کریں مگر وہ زبانی دعویٰ ہے حقیقت اس میں کچھ نہیں، کیوں کہ ان کے پاس تنزیہہ نہیں اس طرح سے تنویہ یعنی ساری عظمتیں اور بڑائیاں اس کی ذرہ برابر اس میں نقص نہیں، اگر حق تعالیٰ کی ذات میں ادنی درجے کا نقص مان لے گا تو وہ تنویہ کے خلاف ہوگا اور توحید کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔

جیسے یہود نے بندوں کی ناقص صفات اللہ میں تسلیم کیں اور کہا کہ جب طوفان نوح آیا تو حق تعالیٰ بیٹھ کر رونے لگے۔ ہائے میری مخلوق ڈوب رہی ہے تو معاذ اللہ اس کی اتنی قدرت نہیں تھی کہ بچا لے تو رونے بیٹھ گئے۔ اتنے روئے کے آنکھیں دکھنے آگئیں اور فرشتے مزاج پرسی کو پہنچ گئے کہ حضرت اب آپ کی آنکھیں کیسی ہیں؟ تو معاذ اللہ معاذ اللہ یہود نے خالق کے اندر مخلوق کی ناقص صفات مان لیں اور نصاریٰ نے خالق کی مخصوص صفات مخلوق میں مان لیں، حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں تین معبودوں میں سے ایک ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام علم غیب کلی رکھتے ہیں۔ کہ سب سے پہلا دعویٰ نصاریٰ کا ہے کہ وہ محیط الکل ہیں، مقتدر اعلیٰ پیدا کرتے ہیں، چاہے موت دے دیں یا زندگی جو الوہیّت کی خصوصیات تھیں وہ بندے میں مان لیں جو بندے میں مانی نہیں جاسکتی تھیں اور یہود نے جو بندوں کی ناقص صفات تھیں وہ خدا میں مان لیں۔ تو انہوں نے جو حدود تھیں توڑ دیں۔ خالق اور مخلوق کا فرق اٹھا دیا تو جب اللہ کی تنزیہہ باقی نہ رہے تو بھی توحید کو آدمی نہیں پا سکتا۔

خصوصیّت الوہیّت...... اس کے بعد تیسری چیز تکبیر ہے کہ ساری عظمتیں اس کی ہیں، جس میں بھی عظمت ہے تو وہ اس کی عظمت کا جلوہ اور پرتو ہے، فی ذاتہ کسی میں عظمت نہیں ہے بذاتہ عظمت صرف ذات حق میں ہے وہ کسی کو عظمت عطا کر دیں تو وہ عظمت والا بن جائے گا، عظمت چھین لیں تو وہ بے عظمت بن جائے گا، کسی کو حکومت دے دیں تو وہ حاکم کہلائے گا، حکومت چھین لیں تو حاکم باقی نہیں رہے گا۔ کسی کو ملک دے دیں تو وہ ملک کہلائے گا۔ کسی سے چھین لیں تو وہ ملک باقی نہیں رہے گا۔

① پارہ: ۳۰سورۃ الاخلاص، الآیۃ: ۳.

لیکن اللہ کا ملک ہونا ازل سے لے کر ابد تک ہے۔ اس کی کسی کی دی ہوئی حکومت نہیں وہ بالذات ملک ہے، اس کی ملکیت بالذات ہے، یہ نہیں ہے کہ اس کی ملکیت کو اس سے کوئی چھین لے، ہر ایک ملکیّت چھن سکتی ہے ہر ایک کا ملک جا سکتا ہے ہر ایک کا اقتدار جا سکتا ہے وہ عارضی ہوتا ہے آتا بھی ہے جاتا بھی ہے۔ لیکن ازل سے لے کر ابد تک جس کی قدرت محیط، جس کا اقتدار محیط، جس کا ملک محیط جس کی مِلک محیط۔ وہ صرف حق سبحانہ وتعالیٰ ہیں، اس لئے عظمتوں کی مالک صرف اللہ کی ذات ہے، اسی لئے نمازوں میں سبحان ربی العظیم پڑھتے ہیں، تاکہ عظمت نمایاں ہو، یہ چار مقام ہوئے، یہ مقام توحید کا انتہائی درجہ ہے، ابتدائی درجہ تنزیہہ کا ہے، پھر تنویہ کا پھر تکبیر کا پھر جا کر توحید کا مقام آتا ہے، ان تینوں کو پھلانگ کر کوئی توحید تک نہیں پہنچ سکتا اور اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا دعویٰ کرے گا۔

حدیثِ متعلقہ...... حدیث مذکورہ میں یہ چاروں مقام بیان فرمائے گئے ہیں، "سُبْحَانَ اللهِ" میں تنزیہہ آ گئی کہ ہر کمال کا وہ مالک ہے، ہر عظمت کا مالک وہ ہے، اس کے لیے حمد ہے، اور "سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ" کے اندر عظمت آگئی کہ ساری بڑائیاں اس کے لئے ہیں، جب ساری بڑائیاں اس کے لیے ہیں تو سارے کمالات اس کے لئے ہیں، اس لئے وہ سارے عیبوں سے بری اور بالا ہے تو التزامی طور پر یکتا وہی ہوگا۔ "لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" بھی اس سے نکل آیا۔ اور ایک حدیث میں تو ان چاروں باتوں کو عبارۃً بیان کیا گیا ہے جیسے فرمایا گیا کہ: "اَحَبُّ الْكَلِمَاتِ اِلَى اللهِ اَرْبَعٌ" سب سے زیادہ محبوب اللہ تعالیٰ کو چار کلمے ہیں: "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" ان چاروں کلموں کو محبوب کہا گیا ہے۔ تو یہاں عبارت کے اندر چاروں کلمے موجود ہیں۔

سُبْحَانَ اللهِ بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بھی، اَللّٰهُ اَكْبَرُ بھی اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بھی۔ تو اس کلمہ (یعنی حدیث مذکورہ فی الباب) میں تین عبارۃً موجود ہیں اور ایک اقتضاء ہے کہ عبارت از خود اس کا تقاضا کرتی ہے، اور وہ اس طرح کہ سبحان اللہ میں تو تسبیح آ گئی اور وبحمدہ میں حمد آ گئی۔ العظیم میں عظمت آ گئی اور ان تینوں کے مجموعے سے لازم آ گیا کہ ایک ایسی ذات جو یکتا ہے تو اس سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نکل آیا۔ تو وہاں عبارت میں چاروں مقامات موجود ہیں اور یہاں تین تو عبارت النص میں موجود ہیں اور ایک اقتضاء النص سے نکلتا ہے، یہ چاروں کلمے اللہ کو محبوب ہیں۔

محبوب کیوں ہیں؟ اس لئے کہ یہ کلمات اس کے مقام کے ترجمان ہیں، اور فطرت ہے کہ جس میں کسی کی واقعیت بیان کی جائے تو وہ اس کو پسند ہوگی، آپ کسی کی بیٹھ کی تعریف کریں تو بڑے غور سے سنے گا اور بہت خوش ہوگا اور اگر برائی کریں تو رنجیدہ ہوگا، بھلائیاں بیان کریں خوش ہوگا، کیوں خوش ہوگا؟ اس لئے کہ وہ بھلائیاں اس کے اندر موجود ہیں، تو وہ خوش ہوگا کہ اس کے سنانے والے موجود ہیں۔ اس کو بیان کرنے والے موجود ہیں۔ تو فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی کی خوبی بیان کی جائے تو وہ خوبی والا فطرۃً خوش ہوتا رہے گا، اس کے لئے دلیل کی حاجت نہیں حق تعالیٰ کی خصوصیات جب کوئی بندہ بیان کرے گا، تو فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں وہ پسند ہوں گی۔ وہ چیزیں ان کے سامنے محبوب بنیں گی یہ الوہیّت کی خصوصیات تھیں، اس لئے جب بندہ انہیں ادا کرے گا تو یہ کلمے

بھی محبوب بنیں گے اور ادا کرنے والا بھی محبوب بنے گا۔

حدیث میں مذکور اوصافِ ثلثہ اور صفتِ علم کی فوقیت......تو اس سے میں نے عرض کیا کہ تین اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں۔ ایک حسّی وصف ہے ایک معنوی وصف ہے اور ایک غیبی وصف ہے حسّی وصف تو یہ ہے کہ زبان پر ہلکے پھلکے ہیں ہر ایک محسوس کرے گا۔ معنوی وصف یہ ہے کہ میزانِ عمل میں وزنی اور ان کی عظمت کا بوجھ پڑتا ہے اور غیبی وصف یہ ہے کہ حَبِيبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صنعت قابلِ داد ہے کہ سب سے پہلے وحی کا ذکر کیا کہ وہ پسندیدہ چیز ہے چوں کہ وحی کی حقیقت علم ہے اور علم سب سے بڑی صفت ہے تمام صفات سے، اس لئے کہ جتنی بھی صفات ہیں وہ اپنی کار گزاری میں علم کی محتاج ہیں لیکن علم اپنے کام کرنے میں کسی صفت کا محتاج نہیں بلکہ غنی ہے۔ سب سے اول ارادہ ہے ارادہ آپ جب کریں گے جب مراد کا علم ہو جائے گا۔ اگر مراد ہی معلوم نہیں تو آپ کس کا ارادہ کریں گے اسی طرح قدرت ہے۔ قدرت جب آپ استعمال کریں گے جب اس مقدور کا علم تو ہو کہ مجھے قدرت کا ہے میں صرف کرنی ہے اگر اس مقدور کا علم ہی نہ ہو تو آپ قدرت کا بے جا صرف کریں گے۔ تو قدرت اپنے کام کرنے میں علم کی محتاج ہوتی ہے۔ ارادہ اپنے کام لانے میں علم کا محتاج ہے۔ اسی طرح اقتدار ہے۔ یہ اس کا محتاج ہے کہ وہ مقتدر چیزیں جن پر آپ کو اقتدار حاصل ہوگا۔ پہلے سے معلوم ہوں ایک ملک پر آپ اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس ملک کا علم تو ہو کہ وہ کہاں ہے تاکہ میں جا کر اس پر اقتدار کو قائم کرسکوں تو اقتدار نہیں آسکتا جب تک مقتدر کا علم نہ ہو تو ارادہ بھی علم کا محتاج قدرت بھی علم کی محتاج اور اقتدار بھی علم کا محتاج۔ اسی طرح آپ کسی چیز کی حفاظت کریں تو پہلے اس شَی کا علم تو ہو جس کی آپ حفاظت کر رہے ہیں اور اگر شَی معلوم نہ ہو تو آپ حفاظت کس کی کریں گے تو حفیظ کی صفت کام نہیں کرے گی جب تک کہ پہلے علیم کی صفت نہ ہو تو ہر صفت اپنے کام میں علم کی محتاج ہے لیکن علم نہ ارادے کا محتاج ہے نہ قدرت کا محتاج نہ اقتدار کا محتاج۔

آپ ریل میں جا رہے ہیں تالاب آ گیا، آپ ارادہ کریں یا نہ کریں آپ کو علم ہو جائے گا کہ یہ تالاب ہے یہ نہیں کہ آپ ارادہ کریں تو یہ معلوم ہو کہ یہ تالاب ہے اور اگر ارادہ نہ کریں تو کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ تو ارادہ کی احتیاج نہیں جب شَی سامنے آجائے گی تو آپ کو علم ہو جائے گا۔ آپ نے شہر دیکھ لیا علم ہو گیا کہ یہ شہر ہے۔ علم اس کا محتاج نہیں ہے کہ پہلے آپ شہر پر اقتدار حاصل کرلیں اور پھر معلوم ہو (کہ شہر ہے) تو آپ کو اس پر اقتدار حاصل ہو نہ ہو۔ جب شہر سامنے آئے گا تو آپ کو علم ہو جائے گا کہ یہ فلاں شہر ہے۔ تو علم نہ ارادے کا محتاج ہے نہ قدرت کا محتاج نہ اقتدار کا محتاج ورنہ ساری صفات علم کی محتاج ہیں تو علم اُم الصفات ہے سب سے اونچی صفت ہے اور ظاہر بات ہے۔ کہ جب علم سب سے زیادہ اونچی صفت ہے اور تمام صفات اس کی محتاج ہیں تو وحی بھی حقیقتِ علم ہی تو ہے۔ حق تعالیٰ اپنے پیغمبروں پر وحی فرمائیں اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہی ہے کہ اپنا علم القاء کر دیا۔ تو وحی کے دوسرے معنی

علم خداوندی کے ہیں تو وحی بھی محبوب چیز ہوئی کیوں کہ علم انسان کو محبوب ہے تو محبوب چیز سے اپنی کتاب کی ابتداء کی۔یعنی بدء الوحی سے اور محبوب ہی چیز پر کتاب کو ختم کیا ''سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ''

''اب ظاہر بات ہے کہ جو کتاب محبوبات سے شروع ہو اور محبوبات پر ختم ہو تو بیچ کی ساری باتیں محبوبات میں داخل ہو جائیں گی''۔''اول با آخر نسبت دارد'' ہر اوّل کو اپنے آخر سے نسبت ہوتی ہے اور بیچ کی چیزیں اوّل یا آخر کے تابع ہوتی ہیں۔کتاب کی ابتداء بھی محبوب چیز سے ہوئی وہ علم خداوندی ہے اور کتاب کی انتہا بھی ایک ایسے عمل سے ہوئی کہ وہ عمل محبوب خداوندی ہے یعنی ''سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ'' پڑھنا یہ عمل محبوب ہے،تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صنعت بھی واقعی نرالی اور انوکھی ہے جہاں ان کا دل اور قلب پہنچا دوسرے نہیں پہنچ سکے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت شان اور ان کا کمال وہ اسی کا مقتضی تھا کہ کتاب بھی اتنے ہی کمالات سے بھری ہوئی ہو۔

صحتِ بخاری......تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ روایت کرنے میں یکتا ہیں کہ صحیح بخاری کے اندر جو حدیثیں ہیں وہ ان کی شرائط پر منطبق ہیں وہ نہایت ہی اونچی حدیثیں ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صحیح حدیث کسی اور کتاب میں نہیں ہے مسلم میں بھی صحیح حدیثیں ہیں ترمذی میں بھی صحیح حدیثیں ہیں۔نسائی میں بھی صحیح حدیثیں ہیں۔جو صحیح حدیثیں اور کتابوں میں بھی ہیں مگر جن شرائط اور محتاط طریقے سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ قبول کرتے ہیں ان سب سے نیچے ہیں۔ان کی نہایت پکی شرطیں ہوتی ہیں۔ان میں کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں ہوتی۔تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی کڑی شرطیں راویت میں لگائی ہیں کہ وہ اور صحیحوں سے بڑھ کر روایت میں صحیح ہیں جن کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کر دیا۔اسی لئے امت کا اس پر اجماع ہے: ''اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللّٰہِ'' کہ اللہ کی کتاب کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب بخاری ہے۔کتاب اللہ کے بعد اس کا درجہ رکھا گیا۔اول تو طبعًا بھی بعد میں اس کا مرتبہ ہونا چاہئے اس لئے کہ کتاب اللہ میں تو اللہ کا علم ہے۔کتاب اللہ کہتے ہیں جس میں حق تعالیٰ کا علم ہو،اور یہ صحیح بخاری درحقیقت کتاب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ظاہر بات ہے کہ رسول کا درجہ تو اللہ کے بعد ہی ہے اس لئے رسول کی کتاب کا درجہ بھی اللہ کی کتاب کے بعد ہوا۔تو اعلیٰ ترین صحت کتاب اللہ کی ہے کہ اس عالم میں کسی آسمانی کتاب کو وہ صحت نصیب نہیں ہوئی وہ فصیحت اور سندیت نصیب نہیں ہوئی، جو کتاب مبین کو ہوئی۔بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کلام اللہ درحقیت صرف یہی ہے۔

سابقہ کتب سماوی کی حیثیت......تو راۃ حقیقی معنی میں کلام اللہ نہیں ہے انجیل بھی حقیقی معنی کے لحاظ سے کلام اللہ نہیں اس لئے کہ کلام کہتے ہیں مایتکلم بہ جس کو بولنے والا بولے وہ کلام کہلاتا ہے لکھ کر دے دے اس کو مجازاً کلام کہہ دیں گے اس کو خط تو کہیں گے لیکن کلام نہیں کہیں گے یوں مجازاً آپ کلام کہہ دیں گے۔

آپ نے کوئی مضمون اپنے دل کی حکمت سے دوسرے کے دل میں ڈال دیا تو اسے کلام نہیں کہیں گے۔اس لئے کہ آپ نے زبان سے تو وہ کلام نہیں کہا۔تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ دی گئی مگر پڑھ کر حق تعالیٰ نے نہیں

سنائی توراۃ کو الواح کے اوپر لکھ کر حوالے کر دیا تو توراۃ کتابِ خداوندی ہے کلامِ خداوندی نہیں ہے مجازی طور پر اس کو کلامِ خداوندی کہیں تو کہہ سکتے ہیں حقیقی معنی میں کلام نہیں ہے اسی طرح کتاب انجیل ہے۔

وہ حق تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر مضمون القا فرمایا۔ انہوں نے اپنے الفاظ میں اس کو ادا کیا جیسے حدیث ہے کہ یہ وحی ہے مضمون حق تعالیٰ کا ہے اور الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں، اس میں وحی متلووہ ہے جو قرآن ہے اور وحی غیر متلو یہ حدیث رسول ہے، وہاں الفاظ بھی اللہ کے ہیں اور مضمون بھی، انجیل میں مضمون تو حق تعالیٰ کا ہے لیکن اس میں الفاظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہیں۔ اس لئے انجیل کو مضمون خداوندی کہا جائے گا کلام خداوندی نہیں کہیں گے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے تکلم نہیں کیا۔ مجازاً آپ کہہ دیں کہ یہ بھی کلام خداوندی ہے۔ لیکن قرآن حکیم حقیقی معنی میں کلام خداوندی ہے، حق تعالیٰ نے پڑھ کر سنایا بھی ہے تو مَـا يَتَـكَلَّمُ بھی ہے یعنی کلام بھی اللہ نے کیا اور مضمون تو اس کا ہے ہی اور لوح محفوظ میں لکھا بھی ہے تو یہ کتاب خداوندی بھی ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سامنے پڑھا بھی ہے اس لئے یہ کلام خداوندی بھی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام پر وحی نازل ہوتی تھی تو اس کی عظمت سے تمام ملائکہ بے ہوش ہو جاتے تھے اور جب ہوش میں آتے تو پوچھتے: ﴿ مَاذَا قَالَ رَبُّنَا قَالَ الْحَقُّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴾ ہمارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام فرماتے کہ حق فرمایا ہے۔ اور وہ علی کبیر ہے۔ تو حق تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو پورا قرآن سنایا ہے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پورا قرآن لا کر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔

صرف قرآن ہی کلام خداوندی ہے...... تو قرآن کریم کتاب خداوندی بھی ہے کہ سب سے پہلے اس کو لوحِ محفوظ میں لکھا گیا اور اس کے بعد حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا کہ وہ حروف ذرا خفی تھے اور لوحِ محفوظ کے حروف جلی تھے بعض احادیث میں ہے کہ ایک ایک حرف کوہِ قاف کے برابر تھا جیسا لکھنے والا، ویسا اس کا قلم، ویسے اس کے حروف ویسے ہی اس کی لوح۔ لکھنے والا لامحدود عظمت والا ہے اس کے کلامِ کی کتابت بھی ایسی ہوگی اور حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر چھوٹے حروف میں لکھا گیا۔

یہاں سے حمائل کا ماخذ نکل آیا مسلمان بڑی تختی میں بھی قرآن کریم لکھتے اور چھوٹی حمائل شریف بھی گلے میں ڈالتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے حمائل بھی لکھ دی اور لوحِ محفوظ پر جلی حروف میں بھی لکھا۔ اس کا ماخذ بھی موجود ہے، بہر حال یہ کتابِ خداوندی بھی ہے جس کو قرآن کہتے ہیں اور کلامِ خداوندی ہے جس کا باری تعالیٰ نے اولاً تکلم کیا پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے سامنے تکلم کیا، احادیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر رمضان میں حضور علیہ السلام کے ساتھ دور کرتے تھے اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام پڑھتے، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام پڑھتے، وفات کا جو سال ہے جو آپ کا آخری رمضان تھا اس میں دو مرتبہ دور فرمایا تو تکلم واقع ہوا۔ نبی کی زبان سے بھی یہ کلام ادا ہوا اور فرشتے کی زبان سے بھی یہ تکلم ہوا اور حق تعالیٰ کی طرف سے بھی یہ تکلم

ہوا۔ تو کلامِ حقیقی صرف کلامِ خداوندی یہی قرآن ہے، دوسری چیزوں کا کلام مجازاً کہہ دیں گے حقیقتاً وہ یا کتابِ خداوندی ہے یا مضمونِ خداوندی ہے لیکن کلام اسی کو کہیں گے جس کے ساتھ تکلم واقع ہوا۔

قرآن وحدیث میں مابہ الامتیاز...... تو یوں کہنا چاہئے کہ حدیث مضمونِ خداوندی لیکن الفاظ حضور علیہ السلام کے ہیں اور قرآن کلام خداوندی ہے کہ لفظ بھی اللہ کا اس لئے اس کو وحی متلو کہتے ہیں کہ وہ تلاوت میں آتی ہیں اور اس (حدیث) کو وحی غیر متلو کہتے ہیں کہ یہ ان معنوں میں تلاوت میں نہیں آتی۔ لیکن محبت اور استفادے کا تقاضا ہے کہ اس کی بھی تلاوت کی جائے۔

چناں چہ بعض علماء کا معمول رہا ہے کہ جہاں وہ دو چار پارے قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے تو وہاں وہ بخاری کا پارہ۔ یا نصف یا ربع یا ثلث مقرر کر لیتے تھے اور اس کی بھی تلاوت کرتے تھے تو اب بھی بعض علماء ایسے ہیں کہ وہ بخاری کی تلاوت کرتے ہیں دو تین سال میں ختم کر دیتے ہیں تو تلاوت کرنے میں ایک برکت حاصل ہوگئی دوسرا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت پیدا ہوتی ہے جتنا کسی کے کلام کو پڑھا جائے اس سے نسبت پیدا ہو جائے گی یعنی دل اٹک جاتا ہے اور لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر آدمی بامعنی پڑھے تو حقائق تک پہنچتا ہے اور اگر مراقبے کے ساتھ پڑھے تو کیفیات بھی طاری ہونے لگتی ہیں۔

شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: جب تلاوت کرنے بیٹھو تو یہ تصور کرو کہ دراصل تلاوت کنندہ حق تعالیٰ کی ذات ہے، میں تلاوت نہیں کر رہا۔ حق تعالیٰ تلاوت کر رہے ہیں زبان میری ہل رہی ہے زبان میری ہے کلام ان کا ہے تکلم ہو رہا ہے: ﴿وَمَايَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى o اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى﴾

ہمارا نبی جو کلام کرتا ہے کلام ہمارا ہے زبان ان کی ہے زبان مظہر بنی ہوئی ہے۔ تو شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ تلاوت کرنے بیٹھو تو اس لحاظ سے کرو کہ کلام حق تعالیٰ کا ہے۔ وہ پڑھ رہے ہیں زبان میری حرکت کر رہی ہے۔ اس پر عبور ہو رہا ہے۔ تو کہتے ہیں کہ جب یہ مراقبہ مضبوط ہو جائے گا تو صراحۃً غیب وکشف کے اندر سے آواز آنا بھی شروع ہو جائے گی کہ حقیقتاً تم تلاوت نہیں کر رہے ہو۔ حق تعالیٰ ہی تلاوت کر رہے ہیں اور جب وہ تلاوت کریں گے تو پورے عالم کا ذرّہ ذرّہ ناطق ہوگا۔ اس کلام کے ساتھ ہر درخت کے پتہ سے آواز آئے گی کہ تلاوت ہو رہی ہے۔

بہر حال یہ کلام خداوندی کی خصوصیت ہے کہ اس کی تلاوت کرو تو بڑھتا چلا جائے گا۔ تلاوت کثرت سے کرو گے تو حق تعالیٰ سے نسبت پیدا ہوگی اور اس کو مراقبہ سے کرو تو وہ کیفیات جو ان آیات میں بھری ہوئی ہیں وہ قلب پر طاری ہونا شروع ہو جائیں گی اور قلب وروح محسوس کریں گے اور قیامت میں جا کر آنکھوں کو محسوس ہوگا۔

عظمتِ قرآن اور پیغمبر کی جلالتِ شان...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: حق تعالیٰ لوحِ محفوظ کو (قیامت میں) خطاب کریں گے کہ قرآن لاؤ۔ وہ عرض کرے گی کہ قرآن تو جبرائیل امین لے گئے تھے جبرائیل علیہ السلام کو بلایا جائے گا تو وہ اس طرح آئیں گے کہ ان کے ہاتھ پیر کانپتے ہوں گے۔ اتنا مشکل ہوگا لرزتے ہوئے ہوں

گے کہ معلوم نہیں کیا ہوگا؟ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ قرآن لوحِ محفوظ سے تم لے کر آئے ہو؟ عرض کریں گے، میں لے کر آیا، کہاں لے کر گئے، میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اتارا۔

تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طلبی ہوگی۔ حق تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائیں گے کہ ہمارا قرآن آپ تک جبرائیل نے پہنچایا۔ آپ فرمائیں گے بلاشک پہنچایا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے آپ نے کیا کیا؟ میں نے اپنی امت کے سامنے تلاوت کیا اور اس کو پڑھا اور تعلیم بھی دی اس کی کیفیات بھی میں نے بتائیں

﴿یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْهِمْ﴾

حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا اب ہمارے سامنے اور ان امتوں کے سامنے بھی تلاوت کرو۔ حدیث میں ہے کہ آپ کا منبر اس مقام پر بچھا دیا جائے گا۔ جہاں آج آپ کا منبر بچھا ہوا ہے یعنی مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں۔ اس پر بیٹھ کر آپ تلاوت فرمائیں گے پوری ترتیل کے ساتھ اوّل سے لے کر آخر تک پورقرآن پڑھیں گے اور دنیا کی ساری امتیں سنیں گی۔ تو اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہیں گے کہ یہ قرآن تو ہم نے اب تک سنا ہی نہیں جو آج سن رہے ہیں اس لئے کہ وہ کیفیات جن کا ادراک روح کرتی تھی آج آنکھوں سے نظر آئیں گی اور قرآن ایک باغ و بہار کے رنگ میں ہوگا جس میں عجیب وغریب پھول کھلے ہوئے ہوں گے، عجیب عجیب خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں تو پورے قرآن کو مجسم کر دیا جائے گا۔ اور وہ کیفیات جو روحیں محسوس کرتی تھیں، قیامت کو آنکھیں محسوس کرنے لگیں گی۔ ظاہر بات ہے کہ جب حق تعالیٰ سامنے ہوں، تمام انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کا مجمع ہو اور سیّد اولین والآخرین پڑھ رہے ہوں تو ان کیفیات کا کیا ٹھکانہ ہوگا جو قلوب پر طاری ہونگی اور وہاں سے بڑھ کر آنکھوں کے سامنے آجائیں گی۔ تو درحقیقت قرآن کریم میں پہلی چیز لفظ اور دوسری چیز معنی ہیں اور تیسری چیز اس کے حقائق ہیں، اور چوتھی حقائق کے نیچے، اس کی کیفیات ہیں جو اروح پر طاری ہوتی ہے کبھی خوف کا غلبہ، کبھی خشیت کا غلبہ، کبھی رجاء کا غلبہ، کبھی امید کا غلبہ، کبھی رحمت سامنے، کبھی قہر سامنے، یہاں روح محسوس کرتی ہے وہاں آنکھیں محسوس کرنے لگیں گی۔

اس لئے میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم میں تو کیفیات الوہیت جمع ہیں اور کلام رسول میں کیفیات نبوّت جمع ہیں۔ اگر آیت قرآن کو تلاوت کیا تو کیفیات الٰہیہ آپ کے باطن پر طاری ہوں گی اور اگر کلام نبوّت کو تلاوت کیا تو کوائف نبوّت آپ کے قلب کے اوپر طاری ہوں گے، اور پھر آپ محسوس کریں گے کہ یہ کیسا عجیب وغریب کلام ہے کہ کتنے سمندر اس میں چھپے ہوئے ہیں۔ تو بہرحال یہ داستان تو بڑی طویل ہے، میرا یہ مقصد تھا عرض کرنے کا کہ پہلی بات کتاب کی صنعت تھی اور دوسری چیز حدیث کی خصوصیات تھیں۔

احوال واقعی...... حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعوم دیوبند نے دارالعلوم حقانیہ میں اپنی تشریف آوری کے موقع پر طلباء واساتذہ، دارالعلوم کی خواہش پر بروز اتوار ۲۰ رجب ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۸ء دارالحدیث ہال میں بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث پر نہایت حکیمانہ اور عالمانہ درس دیا۔

دارالحدیث اوراس کے باہر برآمدے۔اہل علم وفضل سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، ہال پر ایک عجیب نورانی فضاء چھائی ہوئی تھی۔علوم ومعارف قاسمیہ کا یہ فیضان نمازعصر تک جاری رہا۔ یہ تقریب ایک گونہ دارالعلوم کی طرف سے استقبالیہ تقریب بھی تھی،اس لیے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی طرف سے دارالعلوم کے مدرس مولانا شیرعلی شاہ نے عربی زبان میں ایک فصیح و بلیغ سپاسنامہ بھی پیش کیا۔حضرت حکیم الاسلام مظہر انوارِ قاسمیہ مدظلہ کی تقریر کے تمہیدی کلمات اپنے اندرا کابرین دیوبند کی تواضع عجز،انکساری اور بےنفسی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔حضرت مدظلہ کا درس اس وقت ٹیپ ریکارڈ سے محفوظ کرلیا گیا۔اوراب اسے من عن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

ادارہ ''الحق'' دارالعلوم اکوڑہ خٹک

افاداتِ بخاری نمبر۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّـا بَعْـدُ!.....حَدَّثَنَاالْحُمَيْدِيُّ (إِلٰى قَوْلِهٖ)سَمِعْتُ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ :"إِنَّمَاالْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰى،فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ،وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلٰى دُنْيَايُصِيْبُهَاأَوْإِلٰى امْرَأَةٍ يُّنْكِحُهَافَهِجْرَتُهٗ إِلٰى مَاهَاجَرَ إِلَيْهِ ."①

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ:"سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ"②

بجواب سپاس نامہ..... بزرگانِ محترم! یہ مجلس کسی وعظ وتلقین کی یا کوئی اجتماعِ عام نہیں ہے۔ بلکہ مجلس درس ہے اس لئے میں نے صحیح بخاری کی دوحدیثیں تلاوت کی ہیں۔ایک بالکل ابتدائی اور ایک بالکل انتہائی۔ابتداء اور انتہاء کے بیچ میں "وسط" کا حصہ ہوتا ہے۔تو اس اعتبار سے تقریباً پوری بخاری معنیً وحکماً آپ کے سامنے میں نے تلاوت کر دی۔

سپاسنامہ میرے لئے دنیا وآخرت کی نجات کی دستاویز ہے۔اس لئے کہ پیش کرنے والے جن کا نام مبارک لیا گیا،حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ ہیں میں انہیں اپنے اساتذہ کے طبقے میں سمجھتا ہوں۔اس لئے ان کا سپاس نامہ درحقیقت شفقت نامہ ہے،سپاسنامہ تو کسی چھوٹے کی طرف سے ہوتا ہے،بڑوں کی طرف سے محض شفقت،

① الصحيح للبخاری، كتاب بدء الوحی، باب كيف كان بدء الوحی الی رسول الله ﷺ، ج: ١، ص: ٣.

② الصحيح للبخاری، كتاب التوحيد،باب قول الله تعالىٰ :ونضع الموازين القسط،ج:٦، ص: ٩ ٧٤،رقم: ٧١٢٤.

حوصلہ افزائی اور اظہار برکت کے لئے ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: أَنْتُمْ شُهَدَآءُ اللهِ فِي الْأَرْضِ ①
تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ اگر سرکاری گواہ کسی کی نسبت شہادت دے دے کہ وہ اچھا ہے تو وہ عنداللہ اچھا ہی ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان حضرات کی شہادت اگرچہ کریم النفسی یا حوصلہ افزائی ہے لیکن میں اسے یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اہل اللہ کی زبان ہے اور اہل اللہ کی زبان سے جو کچھ ادا ہو رہا ہے۔ وہ انشاء اللہ من اللہ ہے۔ اور میں کتنا بھی نالائق سہی لیکن جب ایسے پاکیزہ لوگ گواہی دیں گے تو اللہ کے ہاں کیا بڑی بات ہے کہ اللہ کسی نالائق کو لائق بنادے، کسی برے کو اچھا بنادے۔ سپاسنامہ درس کے مناسب حال نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میں یہاں دارالعلوم حقانیہ حاضر ہوا، تو میں اسے اپنا گھر سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند میں بیٹھا ہوا ہوں میں تو خود آپ کے گھر کا ایک جز ہوں۔ تو اپنے گھر میں کسی کو سپاس نامہ تھوڑا ہی دیا جاتا ہے۔ یہ تو غیر کو دیا جاتا ہے۔

برادری مختلف جگہوں پہ منتشر ہے لیکن افراد کے انتشار سے خاندان منتشر نہیں ہوتا۔ ہمارا علمی خاندان ایک ہی ہے اس کے اجزاء منتشر ہیں کچھ دیوبند میں، کچھ پاکستان میں، کچھ برما میں، اور کچھ افریقہ میں، یہ سارے افراد کنبہ ہیں جو مختلف جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اصل ہم سب کی ایک ہے جس کو دارالعلوم دیوبند کہا جاتا ہے۔ اس واسطے جیسے آپ اس کی شاخیں ہیں، میں بھی ایک شاخ ہوں تو میں اپنی برداری میں آیا، بھائیوں میں آیا۔ تو بھائیوں میں سپاس نامہ عزت افزائی تو ہے مگر ایک رسمی سی چیز ہے۔ لیکن چوں کہ اہل حق پیش کر رہے ہیں میں اس لئے اسے رسم بھی نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ حقیقت ہے۔ جو کچھ ارشاد فرمایا گیا یہ اعماقِ قلب سے ارشاد فرمایا گیا یہ زبان اور قلم نے حرکت نہیں کی۔ بلکہ دل کی حرکت ہے اور دل سے جب ایک چھوٹے اور نالائق کو اچھا کہا گیا، تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ عنداللہ اچھا بن جائے گا۔

تو میں نے اس وقت بجائے کسی تقریر کے جو جلسے کا موضوع ہوتا ہے صحیح بخاری کی دو حدیثیں تلاوت کی ہیں اور اسی سلسلے میں چند کلمات طالب علموں کے سامنے گزارش کروں گا۔ میرے مخاطب حضرات اساتذہ نہیں ہیں۔ یہ تو خود میرے استادوں کے طبقے میں ہیں۔ یہ میری بات چیت طلبہ سے ہے جو برادری کے بھائی ہیں۔

علم میں بے شک آپ مجھ سے افضل ہیں، آپ کا علم تازہ ہے۔ اور مجھے تو پڑھے ہوئے چالیس برس گزر گئے، بھول بھال بھی گیا کہ پڑھا تھا۔ انتظامی سلسلے کے جھگڑوں میں پھنس کر وہ نوعیّت بھی نہیں رہی اس واسطے ایک بھائی تو ہوں مگر ایک جاہل قسم کا بھائی ہوں آپ بحمداللہ علماء ہیں علم تازہ ہے تاہم آپ نے چوں کہ اس جگہ بٹھلا دیا۔ اس واسطے اسی کے مناسب حال یہ روایتیں میں نے تلاوت کیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی کتاب کی عظمت...... امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان اور

① سنن الترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی الثناء الحسن علی المیت، ج: ۴، ص: ۲۱۸۔ حدیث صحیح ہے۔
دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی بحوالہ صحیح ابن ماجۃ ج: ۳ ص: ۵۸ رقم ۱۰۵۸۔

جلالتِ قدر سے کون مسلمان ناواقف ہے اہل علم میں کون ہے جو ناواقف ہے۔ان کی تصنیف یا تالیف صحیح بخاری کی عظمت وجلالت پوری امت پر واضح ہے۔امت نے اجتماعی طور پر تلقی بالقبول کی ہے اور "اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللہِ" ہونے کی شہادت دی ہے اس لئے مولف بھی جلیل القدر، کتاب بھی جلیل القدر اور کتاب کا جو موضوع ہے وہ حدیث ہے، یعنی "کَلَامُ النَّبِیِّ ﷺ وَ اَفْعَالُہٗ وَاَقْوَالُہٗ وَتَقْرِیْرَاتُہٗ."

اس لئے موضوع بھی مبارک، مصنف بھی مبارک، تصنیف بھی مبارک، حق تعالیٰ ہم سب کو بھی مبارک بنا دے کہ ان کے سلسلے سے ہم سامنے آرہے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ صفت تمام محدثین کرام میں امتیازی طور پر معروف ہے نسائی رحمۃ اللہ علیہ کو کہتے ہیں کہ انہوں نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا کچھ نقش قدم اختیار کیا ہے مگر بہر حال اصل اصل اور فرع فرع ہے صنع بخاری یہ بہت اونچی چیز ہے اور تراجم بخاری یہ تو فی الحقیقت فقہ کا ایک مستقل باب ہیں: "فِقْـهُ الْبُـخَارِیُّ فِیْ تَـرَاجِمِـهٖ" تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ محدث بھی ہیں اور فقیہ بھی ہیں۔ نیز اجتہاد کے رتبے کو پہنچے ہوئے ہیں اس لئے میں نے تبرکاً پہلی حدیث بھی تلاوت کی اور آخر کی بھی تلاوت کی۔

عملی دنیا کی دو چیزیں ...... دونوں روایتوں کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں نہ وقت ہے نہ اب اتنی طاقت ہے لیکن اتنی بات بالاجمال عرض کئے دیتا ہوں کہ آدمی کے لئے عملی دنیا میں دو چیزیں ہیں، ایک مصدرِ عمل اور ایک مظہرِ عمل، وہ چیز ہے، جس سے عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔اور مظہرِ عمل، عمل کی وہ ہیئت کذائی ہے جس میں رہ کر ہم اور آپ عمل انجام دیتے ہیں تو مصدرِ عمل درحقیقت انسان کی نیت ہے جس سے عمل سرزد ہوتا ہے، اور عمل کی قبولیت نا قبولیت ،نیت پر موقوف ہے، اچھا سے اچھا عمل ہو، لیکن نیت خراب ہو وہ برا بن جاتا ہے، اور برے سے برا عمل ہو لیکن وہ نیت کی صحت سے انجام پائے تو آدمی کبھی موردِ ملامت نہیں ہوتا۔وہ عمل بھی مقبول ہو جاتا ہے، اس لئے سب سے بڑی چیز نیت ہے کہ جس سے عمل کا صدور ہو اور ایسے پاک عمل کا ثمرہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جو میزانِ عمل ہے وہ بھاری پڑ جائے۔نیک اعمال ہی سے میزان میں وزن پیدا ہوگا۔ برے اعمال کا وزن نہیں ہے۔ بلکہ بروں کو تو تولنے کی بھی ضرورت نہیں۔جب اچھے اور برے جمع ہوں گے جبھی تو تولنے کی ضرورت پڑے گی۔تاکہ توازن قائم ہو جائے۔

اس عملی دنیا میں دو ہی چیزیں ہیں۔ایک مصدرِ عمل اور ایک ثمرہ عمل۔تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدا میں "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" ① حدیث نقل کی ہے کہ گویا نیت بنیاد ہے عمل کا ظہور درحقیقت اسی نیت سے ہوتا ہے ،قبولیت بھی اسی نیت پر موقوف ہے یہ الگ چیز ہے کہ بعض اعمال بلانیت کے صحیح ہو جائیں اور شریعت ان کو معتبر مان لے، لیکن آخرت کا اجر وثواب بغیر نیت کے مرتب نہیں ہوگا۔وضو اگر آپ بلانیت بھی کریں تو مفتاح صلوٰۃ تو بن

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ج:۱،ص:۳،رقم: ۱

جائے گا۔لیکن جب تک نیت نہ ہو، اجر مرتب نہیں ہوگا۔تو عند اللہ قبولیت کا معیار درحقیقت نیت پر ہے۔صحت کا معیار فتویٰ ہے۔اس لئے کہ بعض بغیر نیّت کے صحیح بھی نہیں ہوتے بعض صحیح تو ہو جاتے ہیں گو ان پر اجر مرتب نہ ہو۔

نیت عمل کی بنیاد ہے...... بہر حال قدر مشترک کے طور پر نیّت بنیادی چیز ہے۔حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''نِيَّةُ الْمَرْءِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهٖ'' آدمی کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

بعض احادیث میں فرمایا گیا کہ یوم محشر میں بعض لوگ حاضر ہوں گے، حق تعالیٰ شانہ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ لکھ دو انہوں نے عمر بھر تہجد پڑھی ہے۔ملائکہ عرض کریں گے کہ انہوں نے ایک دن بھی تہجد نہیں پڑھی۔حق تعالیٰ فرمائیں گے، روزانہ سوتے وقت نیت کرتے تھے کہ آج ہم تہجد پڑھیں گے، مگر آنکھ نہیں کھلتی تھی، لہٰذا لکھ دو کہ انہوں نے ساری عمر تہجد پڑھی تو انسان کی نیّت عمل کی بنیاد ہے۔

ربط بین الابواب...... دوسرے لفظوں میں اس کو یوں تعبیر کرنا چاہئے کہ آدمی پہلے دل سے عمل کرتا ہے پھر ہاتھ پاؤں سے۔ وہی دل کا عمل بنیاد ہے جس سے ہاتھ پیر کا عمل ظاہر ہوتا ہے۔تو قلب سے عمل کرنے کی صورت نیّت ہے اور قالب سے عمل کرنے کی ہیئت کذائیہ ہے جو شریعت نے ارشاد فرمائی۔تو پہلے ہر عمل قلب سے ہوتا ہے پھر قالب سے انجام پاتا ہے اور وہ قالبی عمل اس باطنی عمل پر منطبق ہوتا ہے۔تو رخ دو ہیں اور عمل درحقیقت ایک ہے باطنی رخ اس کا نیت ہے اور ظاہری رخ اس کی وہ ہیئت عمل ہے۔

تو امام ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے ایسی بنیادی حدیث نقل کی کہ کوئی عمل ایسا نہیں ہے جس میں نیت کا دخل نہ ہو۔اور اس کے اجر و ثواب کا تعلق نیّت سے نہ ہو۔ترتیب یوں ہوگی کہ پہلے نیت درست کرادی۔اس کے بعد ابواب ایمان، ابواب علم، پھر ابواب زکوۃ، اور دیگر ابواب بیان کئے، ان سب کا مصدر ''نیت'' ہی بتلا دیا۔تو حکماً وہ سارے ابواب اس کے نیچے آ گئے۔

اعمال پر اجر کا ترتب...... اخیر میں جو چیز تھی وہ عند اللہ قبولیت اور اجر کا ترتب ہے۔تو آخر میں یہ حدیث نقل کی: كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ: ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ'' دو کلمے ہیں جو زبان پر نہایت ہلکے، ان کے ادا کرنے میں نہ وقت لگتا ہے نہ دشواری ہے۔ایک کلمہ ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ''

اور دوسرا کلمہ ''سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ'' ہے۔یہ ہلکے ہلکے دو کلمے جو ادائیگی میں نہایت ہلکے زبان پر نہایت لطیف، لیکن بلحاظ اجر کے ثقیل ہیں۔میزان عمل کے اندر جو ان کا وزن ہوگا۔وہ دوسرے اعمال کا نہیں ہوگا۔کیوں ہیں یہ وزنی؟

وزنِ کلمات کی وجہ......ان کے ثقیل ہونے کی بنا درحقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں مقامات الوہیت کا بیان ہے۔اور ظاہر ہے کہ وہ اتنے عظیم ہیں کہ کائنات کی کوئی چیز اس کے لگ بھگ نہیں ہوسکتی۔تو انتہائی بات یہ ہے کہ

مقامات الوہیّت کو ان دوکلموں کے ذریعے بیان فرمایا گیا گویا یوں کہنا چاہئے کہ حق تعالیٰ اجزاء سے پاک ہیں۔ وہ نہ بسیط ہے نہ مرکب، ہر چیز سے وراء الوراء ہیں۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ کی الوہیت کے مقامات، ظاہر بات ہے کہ وہ لامحدود ہیں حد کمال انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

مقام تنزیہہ...... حق تعالیٰ کے مقامات میں سب سے پہلی چیز تنزیہہ ہے، یعنی وہ ہر عیب سے بری۔ ہر نقص سے بالا اور تمام عیوب سے پاک تو حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور اس کی پاکی بیان کرنا ظاہر بات ہے کہ یہ مقامات الوہیت میں ایک مقام ہے۔ خدا کہتے ہیں اس ذات کو جو ہر برائی سے پاک ہو "اَلْخَیْرُ کُلُّهٗ مِنْکَ وَاِلَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ" ہر خیر کا سر چشمہ وہ ہے، اسی سے خیر چلتی ہے، ہر شر سے بری و بالا ہے ذات بھی شر سے پاک ہے اور باہر کی شر بھی وہاں نہیں پہنچ سکتی۔ تو وہ ہر حیثیت سے وراء الوراء ہے۔ تو الوہیّت کا پہلا مقام یہ ہے کہ وہ خدا ذات برتر ہر عیب سے پاک ہے، تو پہلی چیز مقامات الوہیت میں تنزیہہ ہے اور سبحان اللہ کہنا یہ گویا اشارہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی پاکی بیان کررہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب ایک ذات بابرکات وہ ہو جو ہر عیب سے پاک اور بری ہے (تو الوہیّت اسی کے شایان شان ہوسکتی ہے۔ تو ایک مقام تو الوہیت کا یہ ہوا)۔

اب آگے خوبیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ تو جہاں بھی جو خوبی ہے وہ اسی ذات کی ہے اگر آپ علم دیکھیں گے تو اصل علم حق تعالیٰ کا ہے اس کا پرتو پڑتا ہے تو دوسرے عالم کہلانے لگتے ہیں۔ قدرت درحقیقت اس کی ہے اس کا پرتو پڑا۔ تو ملائکہ قادر کہلانے لگے۔ کہ پل بھر میں آسمان سے زمین اور زمین سے آسمان پر۔ ان کا علم حقیقی اور ذاتی ہے اس کا پرتو پڑا تو ہم آپ بھی عالم کہلانے لگے اور اور انسان کو مظہر علم بنادیا۔ رفیع المرتبہ اور رفعت وعظمت ان کی شان ہے۔ اس کا پرتو آسمانوں پر پڑا تو وہ رفعت والے ہوگئے۔ وہ بھی اونچے بن گئے اور ان کی برتری ثابت ہوگئی۔ تو سر چشمۂ کمالات کا اللہ کی ذات بابرکات ہے اور ظاہر بات ہے کہ حمد وثناء کمال پر ہی کی جاتی ہے۔ نقص اور عیب پر کوئی کسی کی حمد وثناء نہیں کرتا تو حمد وثناء کے معنی یہ ہیں کہ جمیل اختیاری پر حمد کی جائے۔

مقام تحمید...... ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہ تمام کمالات کا سر چشمہ اور ساری برکتوں کا مصدر ہیں اس لئے تمام تعریفیں بھی انہی کے لئے ہونگی۔ حمد وثناء بھی انہی کے لئے ہوگی۔ جس کی بھی ثنا کی جائے گی وہ درحقیقت انجام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ثناء ہوگی۔ کیوں کہ اسی کا کمال تھا جو کسی دوسرے میں ظاہر ہوا۔ تو حمد وثناء کے اظہار کا طریقہ درحقیقت تحمید ہے اور اس کے لئے الحمد للہ کا کلمہ رکھا گیا تو سبحان اللہ کا کلمہ تنزیہہ بیان کرنے کے لئے ہے۔

دوسرا مقام تنویہ اور عظمت بیان کرنے کا ہے اس لئے تحمید رکھی گئی اور اس کے لئے الحمد للہ کا کلمہ رکھا گیا ہے۔ اسی واسطے قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف عنوانوں سے ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿فَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا﴾ ﴿فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ﴾ ﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ وَغَيْرَ ذٰلِكَ. تو تسبیح وتحمید اور حمد وتسبیح کرنا جگہ جگہ ذکر کیا گیا۔ تو سبحان کا کلمہ مقام تنزیہہ کو

ظاہر کرتا ہے اور الحمد للہ کا کلمہ مقام تنویہ کو ظاہر کرتا ہے۔

اب ظاہر بات ہے جو ذات اقدس ہر عیب سے بری اور ہر کمال کا سر چشمہ ہو تو عظمت اور بڑائی بھی اسی کے لئے ہوگی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ عظمتوں کا سر چشمہ تو وہ ہو اور بڑائی کسی اور کی ہو جائے۔ عظمت اور کبریائی کسی اور کے لئے ہو جائے۔ جو در حقیقت کمال کا مصدر ہے وہی حمد و عظمت کا مستحق ہے کہ اسی کی کبریائی اور عظمت بیان کی جائے، اسی لئے اسلام نے تکبیر کا عنوان رکھا اور اس کے لئے اَللّٰهُ اَكْبَرُ کا صیغہ رکھا۔ تاکہ اللہ کی عظمت بیان کی جائے کہ اَكْبَرُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وہ ہر چیز سے وہ بڑا ہے۔

اور نہ صرف اضافۃً بڑا ہے بلکہ حقیقتاً بڑا ہے کہ بڑائی ہے ہی اس کے لئے جس میں کوئی بڑائی آتی ہے اسی کے نام کے ساتھ ملنے سے آتی ہے، اس کے نام سے جو کٹ گیا، اس میں بڑائی ختم ہوگئی۔ تو بڑائی، عظمت و کبریائی در حقیقت اسی کے لئے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ وَالْعَظَمَةُ اِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ فِيْهِمَا قَصَمْتُهٗ'' تکبر میری چادر ہے، بزرگی میری لنگی ہے جو بھی اس میں کھینچا تانی کرے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ اس کو نیچا دکھلاؤں گا۔ تو یہ برداشت نہیں کہ کبریاء و عظمت میں کوئی شریک ہو۔ وہ وحدہ لاشریک لہ کے لئے ہے۔ تو ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اس کے لئے بڑائی و عظمت ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب ...... یہاں ذرا سا ایک طالب علمانہ شبہ پیدا ہوگا۔ یا ہوا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ حدیث میں حکم ہے تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ اللہ کے اخلاق سے متخلق بنو، وہ کریم ہے تو تم بھی کریم بنو۔ وہ رحیم ہے تو تم بھی رحیم القلب بنو وہ حافظ حفیظ ہے تو تم بھی اپنوں کی نگہداشت کرو وہ معطی حقیقی ہے تو تم بھی فقیروں کے ہاتھ پر رکھو اور اعطاء کی صفت اختیار کرو۔ تو اللہ تعالیٰ کے کمالات سے متکمل بھی بنو۔ اور اس کے اخلاق سے متخلق بھی بنو۔ تو شبہ یہ ہوتا ہے کہ متکبر بھی تو اس کی شان ہے، اس میں بھی تخلق ہونا چاہئے ہر شخص متکبر بنے ورنہ کریم النفس بننے سے روکا جائے۔ اس میں بھی شرک ہوگا تو پھر اگر ہم تکبر کریں تو ملامت کیوں کی جاتی ہیں تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ (بموجب حدیث) اللہ کے اخلاق سے متخلق بننا تو عین کمال ہے۔؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تکبر کرنا معاذ اللہ بری بات نہیں ہے۔ نہ کبر بری چیز ہے۔ وہ تو صفت خداوندی ہے، تکبر کرنا برا نہیں ہے۔

جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ جو اللہ کے سوا کہے گا میں بڑا ہوں جھوٹا ہوگا۔ جھوٹ بولے گا۔ تو جھوٹ بولنے سے روکا گیا ہے، اب ایک ہی ذات کے لئے تکبر سزا وار ہے تو اللہ ہی فرما سکتا ہے: ''اَنَا الْكَبِيْرُ، اَنَا الْمُتَعَالُ، لِيَ الْكِبْرِيَاءُ'' بڑائیاں میرے لئے ہیں اور عظمت میرے لئے ہے۔ اس کے سوا جو دعویٰ کرے گا کہ ''لِيَ الْكِبْرِيَاءُ، لِيَ الْعَظَمَةُ'' ۔ وہ جھوٹا ہوگا تو جھوٹ بولنا بری عادت ہے تکبر کرنا بری عادت نہیں ہے۔ مگر حق تعالیٰ شانہ کے سوا جو متکبر بنے گا، جھوٹ بولے گا۔ اس واسطے روک دیا گیا۔

(دوسرا جواب یہ ہے کہ جو حقیقی جواب ہے، کیوں کہ آدمی تکبر تو نہیں کرتا کیوں کہ ہر متکبر حق تعالیٰ شانہ کے

علاوہ جھوٹا ہوگا۔ لیکن پھر حدیث "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللهِ" کے پیش نظر "صفت کبریائی" کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے مفہوم کا تعین ضروری ہے تو فرماتے ہیں) پھر یہ کہ کبریائی وعظمت درحقیقت صفات ذات میں سے ہے۔ صفات افعال میں اگر ہم تخلق کریں تو وہ الگ بات ہے (اس کا تو حکم ہے) لیکن صفات ذات مثلاً خالقیت کی صفت میں کوئی تخلق کرنے لگے یا تکبر میں تو یہ ایسا ہے جیسے کوئی ذات کی برابری چاہتا ہو۔ اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اس واسطے روکا گیا کہ تکبر نہ کیا جائے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ تکبر کرنے والا ہمیشہ محروم ہوتا ہے کیوں کہ وہ جھوٹا ہوتا ہے، کسی کو تکبر کی اجازت نہیں ہے۔

حقیقتِ توحید...... تو جو ذات تمام عیوب سے پاک ہو، تنزیہہ اسی کے لئے ہے۔ جو ذات ساری خوبیوں کا سرچشمہ ہو، تو یہ اسی کے لئے ہے۔ جو ذات ساری خوبیوں کی مالک ہو، عظمت وکبریائی اس کے لئے ہے، اور ظاہر بات ہے کہ جب ذات وہ مان لی جو ہر عیب سے پاک اور ہر کمال سے متصف وموصوف اور ذاتی طور پر ہر برائی اور عظمت اس میں ہے، تو پھر یکتا بھی وہی ہوگا۔ جب ایسی ذات کوئی دوسری نہیں ہے تو اس ذات کو یکتا کہا جائے گا۔ جس کا کوئی شریک نہیں برابر نہیں۔ کوئی ند نہیں، کوئی ضد نہیں، کوئی اس کے لگ بھگ نہیں تن تنہا ایک ہی ذات بابرکات ہے جو ایک بھی ہے اور یکتا بھی نہ اس کی ذات جیسی ذات، نہ اس کے افعال جیسے افعال، نہ اس کی شیون جیسے شیون، تو ہر چیز کے اندر وہ یکتا ہے، اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں توحید ہے۔ توحید کے معنی محض ایک ہونے کے نہیں ایک تو اپنی اپنی ذات میں، ہم اور آپ بھی ہیں، توحید کے معنی یکتا کے ہیں کہ اس کی کوئی مثل اور نظیر نہیں ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ تو درحقیقت توحید کی بنائیں تین ہیں، ایک تنزیہہ مطلق، ایک تنویہ مطلق، ایک تعظیم مطلق، عظمت بھی اس کی، پاکی بھی اس کی مصدر کمالات ہونا بھی اسی کی ذات کے شایان شان ہے تو جو ذات پاک بھی ہے۔ جو ذات خوبیوں کا مصدر بھی ہے، جو عظمت والی بھی ہے تو معبودیت بھی اسی کی ہوگی یکتا بھی اسی کو کہا جائے گا۔ پھر عبادت بھی اسی کی ہوگی، کسی دوسرے کی نہیں ہوسکتی۔ یہی توحید کے معنی ہیں۔ کہ ذات کے لحاظ سے بھی یکتا ہو، صفات کے لحاظ سے بھی اور افعال کے لحاظ سے بھی کہ اس کا کوئی شریک نہ ہو اور شیون بھی اس کے بے مثل اور بے نظیر ہوں۔

تو مقامات الوہیّت چار نکل آئے، ایک تنزیہہ جو سُبْحَانَ اللهِ سے ادا ہوتی ہے، ایک تنویہ جو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے ادا ہوتی ہے ایک کبریائی وعظمت جو اَلْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ سے ادا ہوتی ہے اور ان تینوں کے مجموعے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ یکتا ہو تو یہ اس کے لئے توحید نکلی۔

تو اس حدیث پاک میں مقامات الوہیت بیان فرمائے گئے ہیں۔ سُبْحَانَ اللهِ سے تسبیح وَبِحَمْدِهٖ سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ میں عظمت وکبریائی بیان کی گئی ہے اور ان تینوں کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ یکتا ہو تو توحید بطور ثمرہ ان پر مرتب ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلی حدیث جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نیت کے بارے میں روایت

فرمائی‘‘۔اس میں مقامات عبدیّت ہیں،عبد کا کام یہ ہے کہ نیت سے بھی اس کی طرف رجوع کرے اور عمل سے بھی اس کی طرف رجوع کرے،قلب سے متوجہ ہوگا وہ نیت ہو جائے گی۔قالب سے متوجہ ہوگا،وہ عمل ہو جائے گا۔

تصحیح نیت اور حقیقت نیت......تو در حقیقت اس حدیث میں مقامات عبدیّت بیان کئے گئے ہیں۔بندے کا کام یہ ہے کہ نیت صحیح ہو۔نکاح کرے تو نیت صحیح ہو۔ہجرت کرے تو بھی اس کی نیّت صحیح ہو،دولت کمائے تو بھی نیّت صحیح ہو،اور نیّت صحیح کے معنی ’’حِبۃً‘‘ کے ہیں۔یعنی ہر عمل لِرِضَآءِ اللّٰہِ اور لِوَجْہِ اللّٰہِ ہو۔اور یہ کام بندے کا ہے۔حق تعالیٰ شانہ معاذ اللہ نیت کے پابند نہیں،وہاں نیّت کا کیا دخل۔؟وہ تو ہر چیز سے بری ہے۔کیوں کہ نیت تو درحقیقت عبادت ہے اور وہ عبادت سے بری ہے۔وہ تو معبود ہے(یہ کیسے ممکن ہے کہ معبود خود ہی اپنی عبادت شروع کردے)۔اس واسطے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ میں تو ’’مقامات عبدیّت‘‘ بیان کئے اور اخیر حدیث میں مقامات الوہیّت بیان فرمائے اور درمیان میں علم کے ابواب عمل کے ابوابُ،اور اعتقاد کے ابواب،تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان اعمال اور ان اعتقادات میں نیت صحیح کرو تا کہ قرب پیدا ہو۔اور جب قرب ہوگا تو ثمرات مرتب ہوں گے۔کہ تمہاری میزان عمل بھر جائے گی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صنع بھی حد کمال تک ہیں لیکن یہ اول وآخر کی صنعت اس میں بھی حد کمال ہے کہ ابتدا میں بندے کو بندگی سمجھائی اور اخیر میں الوہیت کے مقامات کی طرف اشارہ کر دیا اور بیچ کے اندر تمام ابواب آ گئے۔اس میں عبادات بھی ہیں،معاملات بھی ہیں،معاشرت بھی ہے،سیاسیات بھی ہیں،تو دین کے سارے ابواب درمیان میں آ جاتے ہیں،اور اول وآخر کو نیّت اور میزان عمل سے گھیر دیا،اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دو کنارے صحیح رہیں تو عبادت بھی قبول،معاشرت بھی قبول،سب رضائے خداوندی کا ذریعہ بن جائیں گے،اس واسطے میں نے اوّل کی حدیث بھی تلاوت کر دی اور آخر کی حدیث بھی اور ۔ع۔اول باخر نسبتے دارد۔ان دونوں میں باہم ایک نسبت ہے اور وہ نسبت یہی ہے کہ بندہ ابتداء سے چلے اور انتہا تک پہنچ جائے اور امت میں علم وعمل اور عبادت سب کو لیتا ہوا چلے اور انجام کار میزان عمل تک پہنچ جائے،یہی آپ کے اعمال ہی درحقیقت تولے جائیں گے۔

اعمال میں وزن کیسے ہوگا؟......اور اعمال میں وزن نیّت سے ہوگا۔اگر نیت صحیح ہے،اخلاص صحیح ہے تو وہ عمل وزنی ہوگا،اگر العیاذ باللہ نیّت صحیح نہیں تو کتنا ہی بڑا عمل ہوگا،نا مقبول ہوگا،تو اللہ کے ہاں صورت نہیں دیکھی جائے گی کہ ڈیل ڈول کتنا ہے؟ پھیلاؤ کتنا ہے؟ بڑا کتنا ہے،بلکہ وہاں وزن دیکھا جائے گا کہ اندر اخلاص کتنا ہے؟ کتنا حسن نیت ہے۔صدق دل کتنا ہے؟

’’اِنَّ اللّٰہَ لَایَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ‘‘ اللہ تعالیٰ شانہ،نہ تمہاری صورتیں دیکھتا ہے نہ تمہارے اعمال کی صورتیں دیکھتا ہے لیکن وہ تمہارے اندر دیکھتا ہے دلوں میں کیا ہے؟ اور عمل بھی دیکھتا ہے(کہ کتنا حسنِ نیت ہے)؟

بعض دفعہ چھوٹا سا عمل ہوتا ہے اور آدمی کمال اخلاص سے انجام دیتا ہے۔ وہی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے، اور بعض دفعہ صورت کے لحاظ سے عمل بہت بڑا ہوتا ہے مگر نیت درست نہیں تو وہی حبط اعمال کا ذریعہ بن جاتا ہے، اسی طرح ایک عمل چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ کس کمال خلوص سے ادا کیا گیا کہ وہی مغفرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اخلاص کی قوت...... امام ابوداؤد محدث جلیل، ان کی کتاب ''ابوداؤد شریف'' نصاب میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان کے تراجم میں لکھا ہے کہ وہ کسی دریا کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے اور تقریباً سو پچاس قدم کے فاصلہ پر جہاز کھڑا ہوا تھا اس زمانے میں گودیاں تو تھی نہیں کہ جہاز پلیٹ فارم سے لگ جائے، تو جہاز پرے کھڑا ہوا تھا اور امام ابوداؤد کنارے پر تھے۔

جہاز میں کسی شخص کو چھینک آئی اس نے بہت زور سے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہا۔ ان کے کان میں آواز پڑی۔ تو مسئلہ آپ بھی جانتے ہیں کہ چھینک لینے والا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہے تو اس کے جواب میں یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہنا اخلاقی فرض ہے۔ مگر اس کے لئے مجلس شرط ہے یہ نہیں کہ کوئی بازار میں چھینک مار کر ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہے تو آپ سفر کر کے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہنے کے لئے جائیں۔

امام ابوداؤد پر واجب نہیں تھا کہ وہ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہتے۔ وہ کنارے پر تھے اور جہاز آدھے فرلانگ کے فاصلے پر دور تھا۔ مگر یہ حضرات عمل کے بارے میں حریص ہوتے ہیں چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے جیسے دنیادار پیسے پیسے کے لئے حریص ہوتے ہیں کہ ہزار ہوں تو کہیں گے کہ دس ہزار ہو جائیں۔ دس ہزار ہو جائیں تو پھر کہیں گے کہ ایک لاکھ کے مالک ہو جائیں۔

اگر جنگل بھر کے بھی ان کو سونے کا دیں تو ضرور حرص کی وجہ سے دوسرا جنگل مانگیں گے ان اہل اللہ کو عملِ صالح کی حرص ہوتی ہے کہ جتنا ہو سکے کمالیں، گویا ساری جنت کو اپنے لئے سمیٹنا چاہتے ہیں۔

مگر اس کے معنی بخل کے نہیں (کہ کسی اور کو کچھ نہ ملے) بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ساری جنت پر قبضہ کر لیں اور اپنے ساتھ جو وابستہ ہیں۔ ان کو بھی ساتھ لے جائیں۔ معاذ اللہ خود غرضی لاحق نہیں کہ تنہا چلے جائیں بلکہ (بفضل خدا) اپنے سب متعلقین کو ساتھ پہنچائیں گے۔ بہر حال چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتے۔ تو کان میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' پڑا، تین روپیہ میں کرایہ پر کشتی لی، اس میں بیٹھ گئے کہ جہاز کو پہنچ جائیں، وہاں جا کر یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہا۔ تو اہل تراجم لکھتے ہیں کہ غیب سے ایک آواز کان پڑی، بولنے والا تو نظر نہیں آتا تھا کہ اے ابوداؤد آج تین درہم میں تم نے جنت خرید لی۔

اب امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ، کتنے تو انہوں نے تہجد پڑھے ہوں گے، کتنی حدیثیں روایت کی ہوں گی۔ کتنے جہاد کئے ہوں گے، کتنے اعمال صالحہ کئے ہوں گے اور جنت کی خریداری میں صرف تین درہم لگے، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمل کامل اخلاص سے کیا تھا، وہ اتنا وزنی بن گیا کہ وہی نجات کا ذریعہ بن گیا، تو اصل میں عمل کو مقبول بنا دینے

والی چیز وہ اخلاص کی قوت ہے، عمل تو بمنزلہ ڈھانچے کے ہے اور روح اس کے اندر حسنِ نیت ہے، اگر یہ روح نہ ہو تو عمل کا ڈھانچہ لاش کی مانند ہے۔ اور لاش کا انجام پھٹنا، پھولنا، سڑنا، گلنا ہے۔ اسی طرح عمل ہے۔ اس کے لئے اخلاص روح ہے۔ وہ آخرت تک پہنچے گا، اس پر ثمرات مرتب ہوں گے، تو امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے تین درہم میں جنت کمالی۔ اسی طرح جو بھی آپ حدیث پڑھ لیں اس کو کم درجے کا نہ سمجھیں ایک حدیث پڑھنے کی بھی توفیق ہوگئی تو دنیا و مافیہا ہمارے ہاتھ آ گئی۔ جنت میں تو ایک تنکے کے برابر ایک جوتے کے تسمے کے برابر بھی جگہ مل جائے تو سعادت ہے، دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

حقیقت جنت وعمل...... اور جنت یہ قرآن و حدیث ہی تو ہے بلکہ بعض روایات میں تو فرمایا گیا کہ قرآن مجید کی جتنی آیات ہیں اتنے ہی جنت میں درجات ہیں اور بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتیں خود جنت کے درجات ہیں، وہاں جا کر نعیم مقیم کی صورت میں متمثل ہونگی۔ یہاں ان کی عمل کی شکل ہے، وہاں جا کر ان کی شکل نعمت کی بن جائے گی تو چیز ایک ہی ہے، دار دنیا میں ان کا لباس عمل ہے اور دار آخرت میں ان کا لباس ثمرہ اور جزاء کا ہے۔ تو یہ اعمال بعینہ وہاں جا کر باغ و بہار کی صورت اختیار کریں گے۔

تمثل اعمال کی مثال...... ہمارے بچپن میں یورپ سے ایک کھلونا آیا کرتا تھا۔ ایک پیکٹ ہوتا۔ اس میں بارہ ٹکیاں ہوتیں۔ وہ دو آنے میں ملا کرتا تھا۔ ٹکیہ لے کر بچے بیٹھ جاتے اور کٹورے میں پانی ڈال لیتے تھے پھر ایک ٹکیہ اس میں ڈال لیتے تھے۔ منٹ بھر کے بعد ٹکیہ پھٹتی تو کسی سے پھول نکل آتا، کسی میں سے انجن۔ کسی میں ریل کا ڈبہ نکل آتا۔ بچے خوش ہوتے کہ گولی کا انجن بن گیا۔ گولی کا پھول بن گیا۔ گویا کاری گر نے اس گولی کو ایسی ساخت سے بنایا تھا کہ جب وہ کھلے تو کسی نہ کسی صورت میں نمایاں ہو جائے۔

آیات نعمت کی شکل میں ظاہر ہونے کی مثال...... آتش بازی آپ نے دیکھی ہوگی۔ آتش بازی میں ایک بانس کا چکر ہوتا ہے اس کے سر پر مصالحہ اور بارود وغیرہ لگا دیتے ہیں، لیکن جب اس کو آگ دے کر کھولتے ہیں تو کسی میں سے آگ کا بنا ہوا گھوڑا اور کسی میں سے سوار نکل آتا ہے۔

وہ فضا کے اندر دوڑ رہا ہے۔ یہ کاریگر کی صناعی ہوتی ہے کہ وہ ایسے انداز سے مصالحہ لپیٹتا ہے کہ جب وہ کھلے تو گھوڑے کی شکل بن جائے۔ تو ان گولیوں میں بھی صنعت ہے، اور یہ بندوں کی صنعت ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو کسی ایسی صورت سے ترتیب دیا ہے کہ جب وہ کھلیں گی تو باغ و بہار بن جائیں گی۔ یہاں ان کی شکل آیت کی ہے، وہاں ان کی شکل نعیم مقیم کی بن جائے گی۔ تو چیز ایک ہی ہے۔ دار بدلنے سے، وطن بدلنے سے، اس کی ہیئت بدل جاتی ہے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی انجینئر جب کوئی کوٹھی بناتا ہے۔ تو سب سے پہلے اس کے قلب میں وہ کوٹھی بنتی ہے۔ اتنی کھڑکیاں، دروازے، اور رنگ و روغن وہ سب دل میں ذہنی آئینے میں تصور میں دیکھتا ہے کہ

وہی کوٹھی بعینہ بنی بنائی تیار ہے۔ پھر وہ اس کا نقشہ کاغذ پر کھینچتا ہے۔ پنسل سے یا قلم سے، وہی کوٹھی کا نقشہ کاغذ پر آجاتا ہے۔ پھر اس کے مطابق زمین پر وہ اینٹ سے کوٹھی تیار کرتا ہے۔ تو کوٹھی درحقیقت ایک ہی ہے جو کاغذ اور زمین پر آئی ذہن کا ظرف لطیف ہے تو اس کی شکل بھی مادی نہیں تھی۔ کاغذ پر آئی تو اس کی شکل روشنائی اور لکیروں کی بن گئی۔ دنیا کے میدان میں زمین پر آئی تو اس کی شکل اینٹ پتھر کی بن گئی۔ مگر جو اصل نقشہ ہے وہ بعینہ وہی ہے جو انجینئر کے دل میں تھا، لباس بدلتے رہے لیکن وطن کے بدلتے رہنے کے باوجود شی ایک ہی رہی۔ اس طرح یہ آیات الٰہیہ اور اعمال صالحہ ہیں یہاں ان کی عمل کی شکل ہے۔ جب وطن بدل جائے گا۔ تو آخرت میں ان کی شکل نعیم مقیم کی بن جائے گی۔

تمثّل اعمال کی حقیقت...... تو یہاں یہ جو آپ عمل کر رہے ہیں۔ یہ عمل بھاری بھی ہے شاق بھی، مگر صبر و تحمل سے اطاعت کے طور پر انجام دے رہے ہیں۔ یہاں یہ عمل آپ کے سر پر سوار ہے۔ آپ پر بوجھ ہے مگر آخرت میں جائے گا تو آپ کا بوجھ اٹھائے گا۔

آخرت میں حمل ونقل کے قابل بن جائے گا۔ آپ اس پر سوار ہوں گے، بالکل اسی طرح جیسے آپ سفر کرتے ہیں تو ایک چھوٹا سا بستر باندھا اور ایک بکس لیا بکس سر پر رکھا، اور بستر کو بغل میں دابا، بکس بھی آپ کے سر پر سوار ہے اور بستر بھی آپ کے سر پر، تھکتے ہوئے، ہانپتے کانپتے ہوئے آپ جا رہے ہیں جب آپ سرائے میں پہنچے تو بستر بچھایا، اب بستر نیچے ہے اور آپ اس کے اوپر اور وہ بکس آپ کے لئے تکیہ بن گیا۔ تو اثناء سفر میں سامان آپ کے اوپر بار تھا اور منزل پر پہنچ کر وہ آپ کے لیے تکیہ بن گیا بعینہ یہ وہاں کی مثال ہے، یہاں اعمال بھاری ہیں۔ صبر و تحمل کرنا پڑتا ہے، مگر وہاں جا کر یہ عمل ہمارے لئے سواری بن جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: **"سَمِّنُوْا ضَحَايَاكُمْ فَإِنَّهَا عَلَى الصِّرَاطِ مَطَايَاكُمْ"** "تم قربانیوں کو فربہ کیا کرو کہ یہی تمہارے لئے پل صراط پر سواریاں بنیں گی"۔ ①

تو یہاں قربانی گویا ہمارے پر سوار ہے، بوجھ ہے کہ سینکڑوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد دل کڑھ رہا ہے کہ ایسے محبوب جانور ذبح کر دیا۔ اپنے ہاتھوں سے کانٹ چھانٹ دیا۔ اور وہاں جا کر ہم اس کے اوپر بار ہو جائیں گے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: **"اَلسَّخَاءُ شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ"** "یہ سخاوت جنت کے اندر ایک درخت کی صورت میں نمایاں ہوگی"۔

جیسے آپ نے سخاوت کی اور کسی غریب کی خبر گیری کی، کسی کو چار پیسے دیدیئے تو وہ آپ کی سخاوت کے زیر سایہ پل رہا ہے۔ سایہ اور راحت بھی ملی، یہی عمل وہاں جا کر درخت بنے گا۔ آپ اس کے پھلوں سے فائدہ اٹھائیں گے تو یہی سخاوت وہاں جا کر درخت کی صورت میں تمثل ہو گئی۔

---

① الحديث اخرجه الديلمي و لفظه: "استفرهوا" علامہ عجلونی فرماتے ہیں: رواه الديلمي بسند ضعيف جداً عن ابي هريرةؓ دیکھئے: كشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۲۱۔

اعمال متشکل کب ہوں گے؟......تو حق تعالیٰ قیامت کے دن ہر ایک عمل کو کوئی نہ کوئی صورت دیں گے۔ یہ اعمال متجسد اور متشکل بن جائیں گے اور یہ یوم حشر سے ہی شروع ہو جائے گا حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ عرصات حشر میں قیامت کے میدان میں ہر آدمی کے سامنے دو چیزیں ہوں گی۔ ایک جہنم جس سے ہیبت ناک آوازیں آتی ہوں گی اور ایک اس کے اعمال جو قطار باندھے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ عمل کے مناسب ان کو شکلیں دے دی جائیں گی۔ گویاں پوری دنیا مجسم کر کے سامنے کر دی جائے گی، ہر ایک آدمی بیٹھا ہوا اپنے کو دیکھے گا کہ میں فلاں برائی کر رہا ہوں۔ سات کوٹھڑیوں کے اندر، فلاں وقت، بعینہ وہی زمانہ، وہی ہیئت ہے۔ وہ زمانہ وہ مکان سب وہاں منتقل کیا جائے گا۔ اسے نظر آئے گا کہ میں اس زمانہ اور مکان میں بیٹھا ہوا اس حرکت میں مشغول ہوں۔ تو یہاں کا زمانہ، مکان ہر عمل اور اس کی ہر ہیئت کذائی بھی وہاں لوٹا دی جائے گی۔

سائنسی دنیا سے تمثیل اجساد کی تصدیق......اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ آج کی سائنس نے تو اسے بالکل آسان کر دیا ہے ہندوستان میں دلی میں ایک نمائش ہوئی، مختلف یورپین ممالک نے اپنے اپنے سٹال لگائے، اور اپنی اپنی ایجادات دکھلائیں۔ روس کی طرف سے ٹیلی ویژن آیا تھا تو اس نمائش میں ہم دیکھنے کے لئے گئے۔ تو ہم نے ان سے کہا کہ کوئی عجیب چیز اپنے روس کی دکھلاؤ۔ اس نے ایک ٹیلی ویژن دکھلایا۔ اس کے بعد اس نے کچھ مشینوں سے اور کام لیا۔ تو ہمیں یوں نظر آیا کہ چین کا ایک جنگل ہے، جس میں عورتیں دھان بو رہی ہیں۔ تو چینی عورتوں کا طریقہ یہ ہے کہ دھان بوتے بوتے کچھ گیت گاتی جاتی ہیں، تو ٹیلی ویژن کے اندر وہ کھیتوں میں دھان لگاتی جاتی ہیں، اور چینی زبان میں ان کی گانے کی آواز بھی آ رہی ہے۔ ہم نے واقعی یہ عجیب چیز دیکھی تھی۔ پھر لطف یہ کہ ہم یہ رات کے وقت دیکھ رہے تھے، اور وہاں ظہر کا وقت تھا گویا بارہ ایک بجے ہوں گے، اس میں وہی وقت نظر آتا تھا، ویسی ہی دھوپ پھیلی ہوئی ہے، وہی وقت ہے۔

تو ٹیلی ویژن والوں کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ ایک وقت کو متمثل کر کے دوسرے وقت میں دکھلا دیں۔ عشاء کے وقت میں ظہر کا وقت دکھلا دیں چین کا جنگل ہندوستان میں دکھلا دیں چینی عورتوں کا حرکت کرنا ہمیں نظر آ جائے ان کے گانے کی آواز ہم سن سکیں، ایک وقت ایک مکان میں دوسرا وقت اور دوسرا مکان نمایاں کر دیں۔ تو اللہ نے انسان کو یہ عقل و قدرت دی ہے تو اللہ کی قدرت کیا ایسا نہیں کر سکتی کہ دنیا کے سارے اعمال اور سارے زمانے اور سارے مکان آخرت میں سب کے سامنے پیش کر دے۔ جو اس کو مان سکتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ اسے نہیں مانے گا؟

جو یہاں کی ایجاد کو مانتا ہے وہ وہاں کی ایجاد کو بھی مانے گا، جبکہ یہاں کی ایجاد بھی انسان کی ذاتی نہیں۔ اللہ نے ہی تو عمل اور عقل دیا، جس سے یہ ایسی ایجاد کرتے ہیں تو جس کے دیئے سے ہم اس نہج پر پہنچ گئے، تو جو ان کمالات کا سرچشمہ ہے تو وہ اس سے کہیں زیادہ بنا دے تو تعجب کی کونسی بات ہے؟

بہر حال یہ آیتیں، یہ اعمال۔ یہاں عمل کی صورت میں ہیں۔ وہاں جا کر نعیم مقیم اور باغ و بہار کی صورت بن جائے گی۔ ایک آدمی یہاں معاذ اللہ زنا کرتا ہے وہ گویا اپنے بدن سے سانپ اور بچھو لپیٹ رہا ہے مگر یہاں شکل نمایاں نہیں قیامت کے دن شکل نمایاں ہو جائے گی کہ وہ زنا نہیں تھا بلکہ سانپ اور بچھو تھا وہ چوری نہیں تھی بلکہ عذاب تھا۔ جو عذاب الیم وہاں لپیٹا تھا۔ یہاں آ کے وہ شکل بن گئی تھوڑے عرصہ میں شکل سامنے آ جائے گی۔

سردیوں میں بعض بچوں کو گڑ کھانے کی عادت ہوتی ہے اور اگر زمینداروں کا گھر ہو تو وہاں گڑ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور بچے کھاتے رہتے ہیں۔ ماں باپ روکتے ہیں کہ بھئی گرمی کرے گا، مگر چوں کہ مٹھاس ہوتی ہے، مزہ آتا ہے تو رکتے نہیں تو وہ انہوں نے پانچ مہینے کھایا اور خوب کھاتے رہے مگر جب گرمی کا موسم آیا اب وہ پھوٹ پھوٹ کر نکلنا شروع ہوا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں اور پیپ بہنے لگی۔ اب والد علاج کراتے کراتے تنگ آ گیا کہیں مرہم لگا رہا ہے۔ کہیں مصفیات پلا رہا ہے اور کہتا ہے کہ بچے! اسی دن کے لئے تو میں روکتا تھا کہ گرمی میں پھوٹ کر نکلے گا۔ تو یہی گڑ وہاں اس کی شکل مٹھاس کی تھی اور یہاں اس کی شکل پھوڑے کی ہو گئی تھوڑا سا موسم بدل گیا تو آثار ظاہر ہو گئے۔

آج جو بدعملی یہاں کی جا رہی ہے۔ وہ یہاں عمل کی شکل ہے، لیکن تھوڑا سا وقفہ گزرنے کے بعد جب موت کو پار کر کے آدمی قیامت میں پہنچے گا۔ وہی عذاب الیم کی صورت میں پھوٹ پھوٹ کر بدن سے نکلے گی۔ جو یہاں نکلا تھا، وہ وہاں سامنے آ جائے گا۔

جتنے بھی اعمال ہیں یہ محض سطحی نہیں ہیں بلکہ انسانی نفس ان کو نگلتا ہے اور جزو بدن بناتا ہے۔ نیکی ہو یا بدی جب جزو نفس بن گئیں تو جب اس میدان میں پہنچے گا تو وہی چیزیں جو جزو بدن بنالی تھیں نفس سے وہ نکل گئیں اور اللہ تعالیٰ اندر سے نمایاں کر دیں گے عمل کو۔ اور باہر سے بھی عمل کو مجسم بنا کر حجت تمام کریں گے۔

صحیح بخاری کے اوّل و آخر کی نسبت...... بہر حال امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابتداء میں عمل کا پہلا سرا بتلا دیا کہ: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کہ نیت صحیح کروتا کہ عمل صحیح ہو گویا: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ تو ایک اصول وکلیہ ہے کہ ہر چیز نیت سے معتبر ہوگی۔ شرعی وجود اور شرعی ثواب نیت حسے ہوگا۔ اب ہم اس کلیہ سے نفع کس طرح اٹھائیں تو انتفاع کے لئے دوسرا جملہ رکھا: وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّانَوٰی آدمی جو نیت کرے گا اس کو وہی پھل ملے گا۔ محض اصول کے درجے میں بات نہیں رہ جائے گی بلکہ عمل کے میدان میں یا ضرر اٹھائے گا۔ یا نفع، تو یہ دوسرا اصول ہے، انتفاع کے لحاظ سے وہ اصول ہے عقلی اور کلی، کوئی آدمی کرے یا نہ کرے وہ اصول اپنی جگہ ہے اور جب کرے گا تو وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّانَوٰی اب اس سے منتفع ہونے کا وقت آیا۔ تو یہ اصول درحقیقت عمل ہی ہے اور پہلا اصول نظری۔

اس کے بعد تیسری مثال جزوی دی کہ: "فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْ اِلَى امْرَاَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ." تو ایک

جزوی مثال۔ایک عملی اصول، ایک نظری اصول۔یہ تینوں اس حدیث میں جمع کر دیئے گئے اور مجموعہ سے یہ بات نکلی کہ عمل بغیر نیت کے ہوتا ہی نہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔حتیٰ کہ اگر دنیا میں کوئی مجرم ہو تو بعض گورنمنٹ کا قانون بھی کہتا ہے اور وکیل بھی کہتا ہے کہ حالات کا تقاضہ ہے کہ اس کی نیت بری نہیں تھی، باقی عمل سرزد ہو گیا تو وہاں تو مدار ہی نیت پر ہے۔اللہ کی حکومت میں تو اصل باطن ہی کو دیکھا جاتا ہے تو اس حدیث میں تین چیزیں بیان فرما دیں اور عمل کا مبداء بیان کر دیا۔اور دوسری حدیث میں کلمات ارشاد فرمائے۔اخیر میں کہ وہ ثمرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر نتیجہ کیا نکلے گا؟ تو اسے ظاہر فرما دیا کہ: ''کَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ'' ''یہ دو کلمے ایسے ہیں کہ زبان پر ہلکے اور میزان عمل میں بھاری ہیں''۔

میں ہنسی میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں، کبھی آپ نے یہ پاپڑ تو کھائے ہوں گے باریک باریک بنتے ہیں، کبھی موم کے کبھی ویسے، تو میں کہا کرتا ہوں کہ: ''خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ''

زبان پر ہلکے مگر معدے میں گئے تو بھاری ہو جاتے ہیں۔گڑبڑ پیدا کرتے ہیں تو یہ مادی غذاؤں میں اس کا مصداق ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال شریعت میں یہ کلمات وہ ہیں کہ زبان پر ہلکے، ادائیگی میں کوئی دشواری نہیں اور نہ ان میں وقت لگے، اور میزان کو دیکھو تو وہ پُر ہو جاتی ہے اجر و ثواب سے۔

تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صنعت سے مبداء بھی بیان کر دیا اور منتہا بھی، مصدر بھی اور مظہر بھی۔اس واسطے میں نے یہ دو روایتیں پڑھیں کیوں کہ یہ مجلس وعظ اور تقریر کی نہ تھی درس کی تھی۔

تو ان دو احادیث کا کچھ ترجمہ پیش کر دیا اور اصل جو علوم ہیں اور کمالات ہیں، وہ تو ہمارے مولانا (حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مرحوم) ہی آپ کے سامنے بیان فرما دیں گے۔اور علماء ہی کا بیان کا حق ہے۔میں نے تو چند باتیں طالب علمانہ عرض کر دیں کہ تعمیل حکم کے بغیر چارہ نہ تھا۔

دعاء......اب امید ہے کہ آپ حضرات میرے لئے بھی دعاء فرمائیں گے۔اپنے لئے بھی اور حضرت مولانا (عبدالحق مرحوم) کے لئے بھی دعا فرما دیں گے کہ، جن کی وجہ سے یہ ساری بہار قائم ہے اور یہ باغ و بہار آپ کے سامنے ہے، اور دارالعلوم دیوبند کے لیے بھی دعا فرما دیں گے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ایک مادرِ علمی بنا دیا ہے وہاں سے یہ سب گل کھل رہے ہیں اور یہ پھل پھول نکل کر سامنے آرہے ہیں حق تعالیٰ ہم سب کا انجام بخیر فرماوے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ صاحب قدس سرہ

جلد — ۶

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

علمی معجزہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!.....فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَارُسُلَنَابِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَامَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ، وَاَنْزَلْنَاالْحَدِيْدَفِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ، إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ①

معجزہ دلیل نبوّت ہے...... بزرگان محترم! انبیاء علیہم السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف معجزات دیئے ہیں معجزہ چونکہ دلیل نبوت ہوتا ہے۔ تو وہ نبی ہی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے غیر نبی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوتا۔ اور گویا یہ فعل خداوندی ہے کہ اس کی مثل لانے سے مخلوق عاجز ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ معجزہ دیا تھا کہ وہ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ تو احیائے موتی ان کا معجزہ تھا۔ اسی طرح اندھے مادرزاد کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ ان میں بینائی آجاتی تھی۔ جذامیوں اور کوڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے تھے، ان کا بدن صاف ستھرا بن جاتا تھا۔ بلکہ اس دور کے ڈاکٹر اور اطباء عاجز آگئے تھے اور ان بیماریوں کو لاعلاج سمجھا گیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہ معجزہ ظاہر کیا تو دنیا سمجھ گئی کہ یہ اسباب کے درجے کی چیز نہیں ہے ضرور مسبب الاسباب کی طرف سے یہ کوئی کرشمہ اور خرق عادت ہے۔ یہ ان کی نبوت کی دلیل تھی۔

موسیٰ علیہ السلام آئے ان کو عصاء موسیٰ دیا گیا۔ جس کی خاصیت یہ تھی کہ اسے زمین پر ڈالتے تھے تو وہ اژدھا بن جاتا تھا، ہاتھ میں تھام لیتے تھے تو لکڑی بن جاتی تھی۔

اسی طرح ید بیضاء ان کو عطا کیا گیا۔ گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالتے تھے تو سورج کی طرح ان کا ہاتھ چمکتا تھا۔ ہر سو روشنی پھیل جاتی تھی۔ دنیا نے سمجھ لیا کہ یہ چیزیں دوسرا کوئی دکھلانے والا نہیں۔ یقیناً یہ خدا کی طرف سے

---

① پارہ:۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ:۲۵.

اس شخص کی نبوت اور رسالت پر دلیل ہے۔ جو سفیر خداوندی ہے اور اس کی سفارت لے کر آیا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اللہ نے ان کے ہاتھ پر خرق عادت ظاہر کی کہ ان کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈالا گیا اور آگ بردوسلام بن گئی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ چیز دکھلانے والا رب ابراہیم علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ان کے ہاتھ پر ایک ایسا عجیب معجزہ ظاہر ہوا جو ان کے مبعوث من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ تو نارِ خلیل ان کو دی گئی۔ دیگر انبیاء علیہم السلام کو بھی معجزات دیئے گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو ظلہ شعیب دیا گیا قوم نے جب نہ مانا تو ابر آیا اور ابر میں سے انگارے برسے۔ قوم عذاب میں مبتلا ہوئی۔ حضرت ہود علیہ السلام آئے تو ہوا کا معجزہ دیا گیا قوم نے نافرمانی کی تیز آندھی چلی اور سات دن تک چلتی رہی یہ چھوٹی موٹی آندھی نہیں تھی اتنی عظیم آندھی تھی کہ اس نے بستیوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکا ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ قوم عاد کے جانوروں کی آوازیں فضا میں سنی جاتی تھیں مکانات اوپر جاتے تھے پھر پٹخے جاتے تھے۔ یہ معجزہ تھا جس سے سمجھ لیا گیا کہ یہ شخص بے شک مبعوث من اللہ ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کو ناقہ صالحہ دی گئی۔ قوم نے مطالبہ کیا کہ کوئی دلیل لاؤ کوئی سند لاؤ کہ ہم تمہیں نبی سمجھیں۔ فرمایا۔ جو تم مانگو۔ انہوں نے کہا کہ پتھر میں سے اونٹنی نکالو۔ ظاہر ہے کہ بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ پتھر میں سے اونٹنی نکال دے۔ یہ تو اسی ذات کا کام ہے جس کی شان یہ ہے کہ: ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ ① زندہ میں سے مردہ نکال دے اور مردہ میں سے زندہ پیدا کردے۔ تو پتھر جیسی ظاہری طور پر ایک بے جان چیز میں سے جاندار کو نکالنا یہ معجزہ تھا آپ یہ معجزہ رات دن دیکھتے رہتے ہیں مگر چونکہ رات دن کا قصہ ہے اس لئے وہ عجیب معلوم نہیں ہوتا انسان کی پیدائش کیا معجزہ نہیں ہے؟ ایک جماد لا یعقل، ایک بے حقیقت قطرہ اس پانی پر نقاشی کرنا، نقش کھینچنا اور گندے قطرے میں سے ایک پاکباز انسان نکال کر تیار کرنا، بے عقل چیز میں سے عاقل انسان پیدا کر دینا۔ بے جان چیز میں سے جان دار چیز کو نکالنا، بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ پتھر کے اندر سے اونٹنی نکال دی گئی۔ مگر چونکہ رات دن یہ قصہ ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے مشکل اور عجیب نہیں معلوم ہوتا ورنہ معجزات رات دن ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ تو حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ ناقہ صالح تھی۔

یوسف علیہ السلام کو قمیص یوسف دیا گیا۔ وہ یعقوب علیہ السلام کے چہرہ مبارک پر ڈالا گیا قمیص کا ڈالنا تھا کہ بارہ برس کی بینائی جو ضائع ہوئی تھی پانچ منٹ بعد لوٹ آئی اور آنکھیں روشن ہوگئیں۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ داؤد علیہ السلام کو الانۃ (نرمی) حدید کا معجزہ دیا گیا۔ لوہے کو ہاتھوں میں پکڑتے تھے وہ موم کی طرح سے نرما جاتا تھا۔ جس طرح چاہتے اس سے سامان بنا لیتے تھے۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۱۹.

حضرت سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ریاح کا معجزہ دیا گیا۔ ہوائیں مسخر تھیں ان کے حکم سے ہوائیں تخت اڑاتی تھیں۔ سواریاں لے جاتی تھیں۔ ہوا پر وہ کام ہوتا تھا جو زمین پر سواری کو چلانے کا ہوتا ہے۔ اسی کو فرمایا گیا ﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ﴾ ① بہر حال تسخیر ریاح یہ سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

اسی طرح منطق الطیر کا معجزہ بھی دیا گیا۔ پرندوں کی بولیوں کا جاننا اور سمجھنا اور اس پر احکام مرتب کرنا یہ اعجاز سلیمانی تھا۔ تو داؤد علیہ السلام کو الانہ حدید یعنی لوہے کو نرمادینے کا معجزہ دیا گیا، سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ریاح، موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا اور عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتی کا معجزہ دیا گیا۔ یہ تمام معجزے درحقیقت ان کی نبوت کے دلائل تھے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ یہ مبعوث من اللہ ہیں۔ خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اس کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات کا تفوق...... جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس قسم کے ہزاروں معجزات عطاء کئے گئے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتی کا معجزہ دیا گیا کہ ان کے ارشاد سے مردے زندہ ہوتے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر استوانہ حنانہ کو زندگی عطاء کی گئی۔

واقعہ آپ نے سنا ہوگا احادیث میں صراحۃً موجود ہے کہ منبر بننے سے قبل مسجد نبوی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ تو کھجور کا ایک سوکھا ہوا تنا کھڑا ہوا تھا، جس کو کاٹ دیا گیا تھا اس پر ٹیک لگا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ ایک مدت دراز تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ٹیک لگا کر خطبہ پڑھا، جب منبر تیار ہو گیا اس پر خطبہ پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے تو حدیث میں موجود ہے اس ستون میں سے آہ و بکاہ کی آوازیں نکلنا شروع ہوئیں اس طرح سے اس نے بلک بلک کر رونا شروع کیا جیسے فراق زدہ انسان روتا ہے۔ اور جب چیخ و پکار بڑھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر سے اترے، اس پر ہاتھ رکھا اور اس طرح دلاسہ دیا جس طرح سسکتے ہوئے بچے کو چپ کرایا جاتا ہے اور وہ چپ ہوا۔ ②

تو عیسیٰ علیہ السلام نے اگر مردے کو زندہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے سے ایک سوکھا ہوا تنا زندہ بنا۔ یہ معجزہ اس سے کہیں زیادہ بلند تر ہے۔ اس لئے کہ انسانی لاش میں بہر حال پہلے جان موجود تھی۔ اگر دوبارہ لوٹ آئے تو اس روح کو اس بدن سے مناسبت تھی۔ اگر نکل سکتی تھی۔ تو داخل بھی ہوسکتی تھی اپنے محل اور مکان میں پہنچ گئی۔ اپنے سانچے میں آ کر ڈھل گئی۔

لیکن کھجور کا ایک تنا زندہ ہوا اور زندہ ہو کر وہ آثار ظاہر ہوں جو جاندار میں سے ظاہر ہوتے ہیں اگر فقط اتنی زندگی ہوتی کہ اس پر ہرے پتے لگ جاتے تو کہا جاتا کہ اس کے اندر روح نباتی آ گئی۔ روح نباتی اگر اس کے خشک ہونے کی وجہ سے چلی گئی تھی وہ دوبارہ لوٹ آئی، اس کا محل تھا۔ جیسے مردے میں جان آ جائے۔

① پارہ: ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۳۶۔

② السنن لابن ماجۃ، کتاب الصلوٰۃ والسنۃ فیھا، باب ماجاء فی بدء شان المنبر ج: ۴ ص: ۳۳۶۔

لیکن جان آئی تو ایسی آئی جو جانداروں کی سی جان ہے۔ یعنی روح حیوانی داخل ہوئی نہ صرف روح حیوانی بلکہ انسانی افعال ظاہر ہوئے۔ تو روح انسانی داخل ہوئی اور انسانی افعال میں سے وہ افعال سرزد ہوئے جو عشاق خداوندی سے سرزد ہوتے ہیں عاشقان الٰہی کی طرح فراق نبوی میں رونا اور چلانا شروع کیا جو ایک عاشق خداوندی کا کام ہے۔ تو ایک کھجور کے خشک تنے میں جان بھی آئی تو انسانوں جیسی بلکہ کامل انسانوں جیسی تو یہ اس سے بڑا معجزہ ہے کہ ایک لاش کے اندر انسانی جان آئے جو انسان ہی کی لاش تھی۔ لاش تو ہو درخت کی اور روح اس میں کامل انسان کی پڑے یہ کہیں زیادہ اونچی بات ہے بہ نسبت اس احیاءِ موتی کے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی احیائے موتی کا معجزہ دیا گیا۔

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا عطاء کیا گیا کہ ہاتھ روشن ہوتا تھا تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی جن کا نام غالباً حنیفہؓ ہے وہ جنگل میں جا رہے تھے۔ سخت اندھیرا تھا، راستہ ملتا نہیں تھا۔ حق تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ راستے کی کوئی صورت ہو؟ کسی طرح سے مجھے راہ ملے۔

حدیث میں ہے کہ ان کی لاٹھی اس طرح روشن کر دی گئی کہ پورے جنگل میں روشنی پھیلی اور راہ نظر آنے لگی۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے صحابہ کرامؓ میں یہ کرامتیں پائی گئیں۔ یہ معجزہ ہی کا اثر تھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ کہلائے گا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔ تو جتنے بھی انبیاء علیہم السلام کو معجزات دیئے گئے وہ سب کے سب بلکہ بدرجہا زائد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عطاء فرمائے گئے۔

سب سے بڑا معجزہ...... لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سب سے بڑا معجزہ جو انبیائے سابقین کو نہیں دیا گیا وہ معجزہ فی الحقیقت علمی معجزہ ہے۔ جس کو قرآن حکیم کہا جاتا ہے کہ ایسی کتاب اور شریعت لا کر پیش کی جو جامع ہدایات ہے۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معجزہ ہے اس کی فصاحت و بلاغت وہ ہے کہ دنیا اس کے مقابلہ کرنے سے عاجز رہ گئی، معانی اور مضامین کے لحاظ سے انتہائی جامع ہے کہ اتنا جامع کلام پیش کرنے سے دنیا عاجز آ گئی۔

عرب کے لوگ فصاحت و بلاغت میں بے مثل تھے۔ ان کو دعویٰ تھا کہ ہم عرب ہیں باقی ساری کی ساری دنیا عجم ہے۔ عجم کے معنی گونگے کے ہیں۔ وہ اپنے مقابلے میں پوری دنیا کو گونگا جانتے تھے کہ نہ انہیں بولنا آتا ہے نہ یہ شادی اور غم کی شرح کر سکتے ہیں، نہ وہ اسالیب بیان ان کے ہاتھ میں ہیں جو عربوں کے ہاتھ میں ہیں قصائد لکھتے تھے اور دنیا کو چیلنج کرتے تھے کہ کوئی ہے جو ان کا مقابلہ کرے؟ ان جیسا قصیدہ لائے؟ بیت اللہ میں قصیدے ٹانگے جاتے تھے چیلنج دیا جاتا تھا کہ کوئی ان کا مثل بنا کر لائے۔ یہ گویا اس زمانے میں عام دستور تھا۔ اور عربوں کی فصاحت و بلاغت اس حد پر پہنچ چکی تھی کہ ان کی پانچ چھ برس کی بچیاں ننانوے ننانوے اشعار کے نہایت بدیہہ قصائد برجستہ پڑھ جاتی تھیں۔ یہ سبعہ معلقہ جو درس نظامی میں پڑھائی جاتی ہے یہ وہی سات قصیدے ہیں جو بیت اللہ میں لٹکائے گئے تھے اور چیلنج کیا گیا تھا کہ کوئی ان کا مثل لائے۔

غرض اس زمانے میں عربوں کے اندر فصاحت و بلاغت کا زور تھا، اس وقت کا معجزہ جو جناب نبی صلی اللہ علیہ

وسلم نے لا کر پیش کیا وہ فصاحت وبلاغت ہی کا معجزہ تھا جس کو قرآن کریم کہا جاتا تھا کہ انہوں نے اگر قصائد لٹکا کر چیلنج کیا اللہ نے قرآن اتار کر چیلنج کیا ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ ① ”اگر جن اور انسان سب مل کر مجتمع ہو جائیں اور اس قرآن کا مثل بنانا چاہیں تو ان کو قدرت نہیں ہے کہ وہ بنا سکیں“۔ اس لئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے یہ خدا کا کلام ہے۔

حقیقتِ معجزہ...... جس سے سب عاجز آ جائیں یہ دلیل ہوتی ہے کہ یہ بشر کے قبضہ قدرت کی بات نہیں ہے۔ آج آپ پہچانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سورج اور چاند خدا کا فعل ہے اس لئے کہ سارے انسان مل کر چاہیں تو سورج کی ایک کرن نہیں بنا سکتے۔ آپ کہتے ہیں زمین خدا کی بنا ہوئی ہے۔ دلیل یہی دے دیتے ہیں کہ سارے انسان جمع ہو جائیں تو زمین کا ایک ذرہ نہیں پیدا کر سکتے۔ اس کے ذروں کو جوڑ توڑ کر اس سے کام لے لینا تو اور چیز ہے۔ لیکن ایک ذرہ بنا دیں جس میں وہی انبات وغیرہ کی تمام صلاحیتیں ہوں جو زمین میں ہیں دنیا کے سارے فلاسفر جمع ہو کر نہیں بنا سکتے۔ چاند اور سورج تو علویات وفلکیات میں سے ہیں ارضیات میں سے زمین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا جز انسان نہیں بنا سکتا۔ درخت کی ایک پتی ایسی نہیں بنا سکتا جس میں وہی خاصیتیں ہوں جو اللہ نے کسی پتے میں رکھی ہوں یہ الگ چیز ہے کہ آپ زمین کے اجزاء میں ترکیب اور تحلیل کر کے اس سے کوئی نئی چیز پیدا کر لیں۔ مگر پیدا کرنے میں آپ اسی زمین کے اور اس کے مادوں کے محتاج رہیں گے۔ خود مادے کو اپنے ہاتھ سے بنا لینا اور اس کو ایجاد کر لینا، عدم سے وجود میں لے آنا، یہ انسان اور بشر کی قدرت کی چیز نہیں ہے سارے انسان جمع ہو جائیں نہیں بنا سکتے۔ جس چیز سے سارے انسان عاجز آ جائیں اس کی نظیر نہ لا سکیں اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔

کلامی معجزے کے سامنے اہل کلام کی بے بسی...... اسی طرح کلام کے سلسلہ میں ساری دنیا کے فصحاء اور بلغاء عاجز آ گئے اور وہ عرب عاجز آ گئے جنہوں نے دنیا کو چیلنج کیا تھا کہ ہمارے مقابلہ پر کوئی فصاحت وبلاغت کا نمونہ لائے لیکن جب قرآن کی آیتیں پڑھی گئیں تو ہار مان لی اور کہا کہ: ”اِنَّ فِيْهِ لَحَلَاوَةً وَّاِنَّ فِيْهِ لَتَرَاوَةً“ ② اس کلام میں عجیب قسم کی حلاوۃ اور شیرینی ہے کہ ہم پیدا کرنا چاہیں تو اس کا عشر عشیر بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ غرض اس زمانے کے فصحاء اور بلغاء اس چیز کو مان گئے کہ ہم اس کی نظیر لانے سے عاجز ہیں۔

ورنہ آپ خود اندازہ کیجئے کہ جب چیلنج کیا گیا تو جن لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر سے بے گھر کیا، انتہائی ایذاء رسانی کی، لڑائیاں ٹھانیں، مقابلے کئے یہ ساری چیزیں تھیں۔ مگر ایک آیت کی نظیر لا کر پیش کر دی ہو، کسی نے یہ نہیں کیا۔ پورا قرآن تو بجائے خود ہے کسی ایک آیت کی نظیر نہیں دے سکے۔ اسی لئے قرآن نے پہلے تو یہ چیلنج کیا کہ: ﴿عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ ③ ”اس قرآن کا مثل لاؤ“۔

---

① پارہ:۱۵ سورۃ الاسراء، الآیۃ:۸۸. ② دلائل النبوۃ، باب اعتراف مشرکی مکۃ...... ج:۲، ص:۵۷، رقم:۵۰۵. حدیث صحیح ہے دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج:۲ ص:۳۶۰ رقم ۸۶۰. ③ پارہ:۱۵ سورۃ الاسراء، الآیۃ:۸۸.

پھر تنزل کر کے کہا ﴿قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ﴾ ① ”تم کہتے ہو کہ یہ اختراع کردہ کلام ہے تو اس قسم کی اختراع کردہ دس سورتیں تم بھی لاؤ“ پھر اور تنزل کیا اور کہا ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾ ② ”ایک ہی سورۃ اس جیسی بنالاؤ“۔

سورت میں یہ بھی قید نہیں لگائی کہ سورت بقرہ جیسی سورت ہو جو اڑھائی پارے کی ہے۔ آل عمران جیسی سورۃ ہو یہ بھی قید نہیں ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ﴾ ③ کی طرح کی چھوٹی سی سورۃ بنالاؤ۔ پھر اس سے تنزل کیا اور کہا کہ ﴿فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ﴾ ④ ”اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ایک بات ہی اس جیسی بنا لاؤ“۔ سورت تو بجائے خود ہے۔

تو اندازہ کیجئے اس قوم کے سامنے جو چیلنج دینے کی عادی تھی اتنے بڑے چیلنج دیئے جائیں وہ دوسرے سارے مقابلے کرے، جتن کرے۔ لیکن کلام کی نظیر نہ پیش کرے تو وہ سمجھتی تھی کہ یہ بشر کی طاقت سے خارج ہے اس قدر فصاحت وبلاغت سے کلام کا بھرا ہوا ہونا یہ صرف اعجازِ خداوندی ہے۔

انسانی صفات کی حدِ اعجاز...... آپ اندازہ کیجئے کہ جتنی بھی انسانی صفات ہیں اور انسانی افعال ہیں ان میں ایک حد ایسی نکلتی ہے کہ وہاں پہنچ کر انسان عاجز ہو جاتا ہے۔ ایک حد تک قادر رہتا ہے پھر ایک حد پر جا کر عاجز ہو جاتا ہے اسی حد سے سمجھا جاتا ہے کہ آگے خدائی حدود ہیں۔ مثلاً آپ دیکھتے ہیں گویا آپ میں بصر کی طاقت ہے۔ آپ فرلانگ دو فرلانگ یا میل بھر کی چیز دیکھ لیں گے۔ آسمان کے ستارے دیکھ لیں گے۔ لیکن اس کے بعد؟ اس کے بعد نگاہ عاجز ہو گی اور ایک حد نکلے گی جہاں آپ کی نگاہ عاجز ہو جائے گی، آپ تحت الثریٰ کو نہیں دیکھ سکتے، صرف سطح کو دیکھ سکتے ہیں آپ کسی چیز کے اندرونی جگر کو اپنی بصر سے نہیں دیکھ سکتے۔ بصر عاجز ہے۔ بہر حال آپ کی بصر دیکھے گی اسے دیکھنے کی قدرت ہے مگر ایک حد ایسی نکلے گی جہاں آ کر عجز کا اقرار کرنا پڑے گا کہ ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اس سے آگے خدائی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ان کو دیکھنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔ اسی کی بصر ہے جو دیکھتی ہے۔

آپ میل دو میل یا پچاس میل کی بات سنیں گے۔ آلات کے ذریعے سے آپ مشرق ومغرب کی خبریں سن لیں گے لیکن آسمان کے اندر کی خبریں اور آوازیں بھی آپ سننے لگیں؟ آپ کی سماعت یہاں آ کر عاجز ہو جائے گی اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی سمع وبصر اور تکلم بھی محدود۔ ہر چیز محدود ہے ایک حد کے اندر گھری ہوئی ہے۔ اس حد کے اوپر پہنچ کر آپ اپنے عجز کا اقرار کرتے۔ ہیں اس حد سے باہر خدائی قوتیں ہوتی ہیں۔

یہی صورت کلام کی بھی ہے کہ آپ کلام کرنے کے سلسلہ میں فصیح وبلیغ اور بہترین کلام کریں گے۔ آپ بہترین شاعر بن جائیں گے۔ آپ سے بڑھ کر کوئی اور پیدا ہوگا، وہ آپ سے اچھا کلام کرے گا۔ پھر اس سے اور

---

① پارہ: ۱۲، سورۃھود، الآیۃ: ۱۳۔ ② پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۳۸۔ ③ پارہ: ۳۰، سورۃالکوثر، الآیۃ: ۱۔

④ پارہ: ۲۷، سورۃالطور، الآیۃ: ۳۴۔

بڑھ کر پیدا ہوگا جو اور اچھا کلام کرے گا۔ مگر ایک حد ایسی نکلے گی کہ بشر وہاں عجز کا اقرار کرے گا کہ اتنے دقیق معانی کو میں چار الفاظ میں ادا کرنے پر قادر نہیں ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم "اَفْصَحُ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ" ہیں۔ احادیث میں دقیق سے دقیق مضامین سہل سے سہل تعبیر سے ادا فرمادئے گئے ہیں، دوزخ و نار کی کیفیات، جنت کی کیفیات، حشر کی کیفیات اور قبر کے احوال وغیرہ جو خالص کیفیاتی چیزیں ہیں ان کو اگر ادا کیا ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سہل الفاظ میں ادا کیا ہے، تعبیر اور عنوان نہایت سہل، اور مضامین نہایت دقیق، ایک عامی آدمی سمجھے گا تو اپنی بساط کے مطابق سمجھے گا۔ اسی کلام کو ایک حکیم پڑھے تو اس میں سے حکمت کی باتیں نکالے گا، اسی کلام کو ایک عارف باللہ پڑھے تو معرفت کی باتیں نکالے گا۔ تو کلام چھوٹا سا ہے مگر مضامین اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ احادیث کا ذخیرہ آپ کے سامنے ہے ان کی شرح میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کی حد و نہایت نہیں۔ حدیث ایک ہے۔ ہر عالم نئے سے نئی اس کی شرح کرتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے، ایک عالم ایک پہلو لیتا ہے تو اس پہلو سے بے انتہاء علوم نکلتے چلے آتے ہیں دوسرا عالم دوسرے پہلو پر غور کرتا ہے تو اس سے بے انتہاء علم نکلتا چلا آتا ہے۔ حدیث ایک ہوتی ہے اس کے اندر سے ہزاروں دقائق اور معانی نکلتے آتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم "اَفْصَحُ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ" ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے بارے میں میں بھی عاجز ہوں کہ میں ایسا کلام نہیں لاسکتا۔ یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ تو ایک حد ایسی پیدا ہوئی کہ خالق ہی اس تعبیر کے اوپر قادر ہے۔ مخلوق کو قدرت نہیں دی گئی۔ تو تمام صفات میں، سمع، بصر، قدرت اور حیات ہو ان میں جیسے ایک حد اعجاز نکلتی ہے تو کلام میں بھی ایک حد اعجاز ہے اور وہی حد اعجاز معجزہ کہلاتی ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم کا معجزہ دیا گیا ہے۔

اعجاز کلام..... قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے ثبوت میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں بڑے بڑے دلائل پیش کئے ہیں۔ موٹی سی ایک بات یہ ہے جو سمجھنے کی ہے۔ ہر شخص اسے سمجھے گا کہ ہر انسان پر مختلف کیفیات آتی ہیں جس کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے اس حالت میں جو وہ کلام کرتا ہے وہی کیفیت اس کے کلام میں ہوتی ہے۔ اگر وہ یوں چاہے کہ اس وقت میرے کلام میں دوسری کیفیت آجائے اسے قدرت نہیں ہوتی۔

مثلاً ایک شخص غمگین بیٹھا ہوا ہے خدانخواستہ کوئی میت ہوگئی، اس کا قلب غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس وقت وہ جو بھی کلام کرے گا اس میں غم کے اثرات نمایاں ہوں گے اگر وہ یہ چاہے کہ میں اس وقت خوشی کا کلام کروں اسے قدرت نہیں ہوگی۔ اگر وہ تصنع اور بناوٹ کر کے چاہے بھی کہ میں خوشی کا بھرا ہوا کلام کروں ناممکن ہے۔ اس لئے کہ اس پر اس وقت غم کی کیفیت غالب ہے۔ جس چیز کا غلبہ ہوگا، وہی چیز اس کے کلام میں آئے گی۔

اگر ایک شخص پر خوشی ہے اس کے ہاں شادی ہو رہی ہے وہ جب بھی بولے گا۔ اس کے ہر ہر لفظ سے بے

ساختہ خوشی ٹپکے گی۔ اگر وہ یوں چاہے کہ میں ایسا کلام کروں جس سے بے انتہاغم ٹپکتا ہو۔ اس کی قدرت میں نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اس وقت خوشی سے مغلوب ہے۔ تو ہر کیفیت انسان پر جب آ کر غالب ہوتی ہے اس کیفیت کے تحت جب بھی کلام کرے گا تو کلام میں اسی کیفیت کا غلبہ ہوگا۔ ایک کیفیت سامنے آئے گی۔ دوسری مغلوب ہوگی۔

لیکن قرآن کریم کو دیکھا جاتا ہے ایک وقت میں ایک آیت نازل ہوئی اس کی ابتدا میں بے انتہاء جلال خداوندی کا اظہار معلوم ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ دوسرے جملہ میں بے انتہاء جمال معلوم ہوتا ہے کہ بے انتہاء بشارتیں اس میں چھپی ہوئی ہیں۔ اگر جنت کا ذکر ہے تو اسی کے ساتھ دوزخ کا ذکر ہے اور جس وقت ہم پڑھتے ہیں تو یہ کیفیات ہمارے قلوب کے اوپر طاری ہوتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں متضاد کیفیات برابر چل رہی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان تو ابن الحال ہے، ہر حال اس پر غالب آتا ہے جیسا حال ہوگا ویسا کلام کرے گا۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ، پر کوئی چیز غالب نہیں آسکتی۔ ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ﴾ ①

نہ خوشی غالب آسکتی ہے نہ غمی، خوشی اور غمی اس کی پیدا کردہ ہے۔ اس لئے جب وہ کلام کریں گے تو اگر چاہیں کہ اس میں خوشی کی کیفیات بھری ہوئی ہوں اس میں پیدا کردیں گے۔ اگر چاہیں کہ غمی کی کیفیات ہوں تو وہ پیدا کردیں گے کیونکہ وہ ہر چیز پر ہر وقت قادر ہیں۔ تو قرآن کریم کی ایک ایک آیت کے اندر جو لمبی آیت ہو کئی کئی متضاد کیفیات پوری قوت کے ساتھ برابری سے سمجھ میں آتی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام بشر کی طاقت سے خارج ہے بشری کلام نہیں بلکہ اس ذات کا کلام ہے جو ہر چیز کے اوپر غالب ہے اس کی صفات اور اس کی شانیں اس کے اندر بھری ہوئی ہیں جب آدمی پڑھے اور سمجھ کر بصیرت کے ساتھ پڑھے تو کچھ کیفیات قلب پر مترشح ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

معرفت اوصاف متکلم...... وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر کلام میں متکلم کے اثرات چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلام کو پڑھ کر آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہ کسی عالم کا کلام ہے یا جاہل کا؟ شاعر کا ہے یا غیر شاعر کا؟ اس کے کلام کے طرز بیان اور مضامین کو دیکھ کر آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہ فلاں شخص کا کلام ہے یا ایسے شخص کا جس میں فلاں صفت غالب ہے۔ غرض کلام میں متکلم کے اثرات غالب ہوتے ہیں بلکہ کلام میں خود متکلم چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اگر متکلم کو دیکھنا ہو اس کا کلام پڑھ لو تو اس کی کیفیت عیاں ہو جائے گی۔

اورنگ زیب کی بیٹی ''زیب النساء'' یہ بڑی شاعرہ تھی۔ اس کا کلام بہترین ہوتا تھا۔ مشاعرے جب ہوتے تھے تو اس کا کلام بھی پڑھا جاتا تھا۔ تو عاقل خان جو اورنگ زیب کے زمانے کا بڑا عہدہ دار بھی تھا اور بڑا شاعر بھی تھا۔ اس کی زبان سے کہیں یہ جملہ نکلا کہ کاش میں اس شاعرہ کو کہیں دیکھتا جس کا اتنا اونچا کلام ہے، اتنی اس میں بلاغت ہے۔ یہ جملہ زیب النساء کو پہنچا۔ زیب النساء نے اس کا جواب ایک شعر میں دیا۔ اگر تو مجھے دیکھنا چاہتا ہے

---

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۱.

تو دیکھ سکتا ہے۔ میں اس کی تدبیر بتلائے دیتی ہوں۔ اس نے یہ شعر لکھ کر بھیجا کہ ۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گُل در برگ گل

میں اپنے کلام میں اس طرح سے چھپی ہوئی ہوں جس طرح سے گلاب کی پتیوں میں خوشبو چھپی ہوئی ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

جو دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے وہ میرے کلام میں مجھے دیکھ لے، میں نمایاں ہو جاؤں گی۔ غرض ہر کلام میں متکلم کے اوصاف چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ شعراء کے کلام کی فصاحت و بلاغت کے درجات آپ اسی طرح سے قائم کرتے ہیں کہ اگر بہت اونچا شعر ہے آپ کہتے ہیں کہ کسی بڑے اونچے شاعر کا ہے۔ اگر معمولی کلام ہے آپ کہتے ہیں کہ ہاں تک بندی ہے۔

ایک بات مجھے یاد آئی کہ ہماری اردو زبان میں ایک محاورہ ہے ''آنکھیں چار ہونا'' اور یہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب محبت کا اشارہ کنایہ کرنا ہوتا۔ اس محاورے کو استاذ ذوق نے نظم کیا ہے کہ

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا کہیں یہ جائے نہ اس جنگ وجدل میں مارا

ایک دوسرا شاعر ہندو اس نے بھی یہی مضمون بیان کیا۔ مگر اس مضمون کو اونچا کر دیا۔ وہ کہتا ہے ۔

دل کی نہیں تقصیر مکنڈ آنکھیں ہیں ظالم یہ جا کے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا

یہ ایک ہی بات دو شعروں میں ادا کی گئی مگر جاننے والوں نے جان لیا کہ اس مضمون کو دوسرے شعر میں جس پیرائے میں ادا کیا گیا ہے وہ بہ نسبت پہلے پیرائے کے بلند پیرایہ ہے۔ تو کلام کے اندر فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے مراتب اور تفاوت فصحاء و بلغاء سمجھتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یہ بہترین کلام ہے اس سے زیادہ بہتر دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جب انسانوں کے کلام میں ایسے درجات نکلتے ہیں کہ بعض موقعوں پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ سہل ممتنع ہے اس سے آگے اب بہتر نہیں ہو سکتا۔

متکلم حقیقی..... تو اللہ کے کلام میں یہ چیز بدرجہ اولیٰ پائی جانی چاہئے۔ جب وہ کلام کرے تو اس درجے کا بدیع ہو کہ اس سے بہتر ناممکن ہو۔ انسانی کلام کتنا ہی بدیع ہو مگر اس سے بہتر ممکن تو ہوگا اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ اس سے بہتر فصیح و بلیغ انسان پیدا ہو جائے۔ لیکن اللہ جو کلام کرے گا یا کلام فرمائے گا اس سے بہتر یوں ممکن نہیں کہ نہ خدا کا نظیر ہے نہ اس کے کلام کا نظیر ہو سکتا ہے نہ اس کے لئے کوئی مثل ہے نہ اس کے کلام کا کوئی مثل ہو سکتا ہے۔ اس لئے فرما دیا گیا کہ ﴿لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ﴾ ①۔ اس کے کلام کے مثل کوئی نہیں لا سکتا۔

اس لئے کہ اس کی ذات وصفات کا مثل کوئی موجود نہیں ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸۸.

﴿الْبَصِيرُ﴾ ① ''اس کی ذات کی کوئی مثل اور نظیر نہیں ہے، وہ سمیع اور بصیر ہے''۔

جب ذات بے چوں اور بے چگون ہے اور صفات کی کوئی نظیر نہیں ہے تو پھر افعال کی کوئی نظیر کیسے ہوگی؟ تو صفات میں سے کلام بھی ہے۔کلام کرنے کا حق تو اللہ ہی کا ہے۔ہم اور آپ متکلم تو اس کے پرتو سے بن گئے ہیں اگر کلام کا پرتو نہ پڑے تو ہمیں متکلم ہونا نصیب نہیں ہوسکتا۔سمع اور بصر اس کی صفت ہے۔اس کا پرتو پڑا تو ہم بھی سمیع اور بصیر کہلائے۔موجود حقیقی وہ ہے۔اس کے وجود کا پرتو پڑ گیا تو ہم بھی موجود کہلانے لگے۔ورنہ ہم میں کوئی اپنا ذاتی اور اصلی وجود نہیں ہے۔تو جب ہماری ہر چیز حق تعالیٰ کے پرتو سے ہے، اصل صفات اس کی، ظلی صفات ہماری ہیں، اصل وجود اس کا ظلی وجود ہمارا، اصل کلام اس کا، ظلی کلام ہمارا تو اصل فصاحت و بلاغت اس کی ہوگی ہماری فصاحت و بلاغت ظلی ہوگی۔

غرض جب اصل فصاحت و بلاغت ہمارے اندر ہے ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ ایک کا ظل دوسرے ظل کے مشابہ ہوسکتا ہے۔اصل کے مشابہ تو جب ہو جب کوئی دوسرا اصل پیدا ہو اور اصل ایک ہے تو اصل کلام ایک ہی رہے گا۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے حقیقت میں جیسے افعال کے معجزے ظاہر فرمائے زمین ایک معجزہ ہے، آسمان ایک معجزہ ہے، چاند اور سورج ایک معجزہ کہ جن کی نظیر لانے کی کسی کو قدرت نہیں، تو کلام کا معجزہ بھی ظاہر فرمایا اور وہ قرآن کریم ہے جس کا مثل ناممکن تھا نہیں لایا گیا اور آج تک نہیں لایا گیا۔

دنیا کی اقوام نے دن رات مقابلے کئے مگر اس جیسا کلام لا کر پیش کر دیں جس میں ویسی ہی معنویت ہو اتنے ہی پہلو بھرے ہوئے ہوں، اتنی ہی جامعیت ہو اور اتنی ہی فصاحت و بلاغت ہو یہ کوئی نہ کرسکا۔یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ معجزہ ہے یعنی خدا کا کلام ہے بشر کا کلام نہیں ہے۔

قرآن کریم کی اعجاز نمائی...... پھر یہ معجزہ ہی نہیں بلکہ معجزہ گر بھی ہے۔یعنی قرآن کریم نے معجزات بنائے اس واسطے کہ قرآن کریم پر عمل کرنے سے بڑے بڑے اکابر اولیاء پیدا ہوئے ان اولیاء کے ہاتھ پر کرامتیں ظاہر ہوئیں تو قرآن خود ہی معجزہ نہیں ہے بلکہ لوگوں کے ہاتھ پر معجزے نمایاں بھی کرتا ہے۔فرق اتنا ہے کہ نبی کے ہاتھ پر جو خرق عادت ظاہر ہوتی ہے اسے معجزہ کہتے ہیں۔ولی کے ہاتھ پر خرق عادت ظاہر ہو اسے کرامت کہتے ہیں۔ ابوحنیفہ، سفیان ثوری رحمہما اللہ تعالیٰ وغیرہ یہ اکابر مجتہدین گزرے ہیں یہ انبیاء نہیں تھے مگر نبیوں جیسے کام کئے ایک ایک نے کروڑوں انسانوں کے دلوں کو ایمان سے رنگا اور ایک ایک خطہ کو ایمان و اسلام سے رنگیں بنادیا۔

صوفیاء کے طبقے پر نگاہ ڈالو۔ایک حضرت شیخ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کسی مسلمان کی نہیں بلکہ ایک عیسائی کی شہادت ہے۔جس کا نام مسٹر آرنلڈ ہے، اس نے ''پریچنگ آف اسلام'' کتاب لکھی ہے وہ لکھتا ہے کہ ایک حضرت شیخ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک پر ننانوے لاکھ آدمیوں نے

① پارہ: ۲۵، سورۃ الشوری، الآیۃ: ۱۱.

ہندوستان میں اسلام قبول کیا ہے۔تو ایک فرد نے ننانوے لاکھ کو مسلم بنایا۔خود حضرت شیخ کے خلفاء کے ہاتھ پر جو لوگ اسلام لائے ان کی تعداد الگ ہے۔تو ایک شیخ معین نے وہ کام کیا جو انبیاء بنی اسرائیل کرتے تھے کہ جس خطے میں بیٹھ گئے، لاکھوں اور کروڑوں کو باایمان بنایا۔ایمان کی روشنی پیدا کر دی، تو جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزے اور اس پر عمل کی بدولت لوگ ایسے مقامات پر پہنچے' ولایت کے ان مرتبوں پر پہنچے جن کے ہاتھوں پر خرق عادت اور کرامتیں ظاہر ہوئیں، الہامات ظاہر ہوئے۔

شرائع ظلیہ...... یہ جتنے ائمہ مجتہدین ہیں اگر انبیاء علیہم السلام پر اصلی شریعتیں ظاہر ہوئیں تو ان مجتہدین کے قلوب پر ظلی شریعتیں ظاہر ہوئیں۔یعنی انہوں نے انہی شریعتوں میں سے استنباط کر کے مستقل احکام دیئے۔انہی شریعتوں میں اجتہاد کر کے احکام نکالے اور کتابوں کی کتابیں بھر دیں۔

یہ کتاب وسنت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔کتاب وسنت کی کلیات میں جو چیزیں چھپی پڑی تھیں۔مجتہد کے فہم نے ان کو اندر سے نکال کر کے نمایاں کر دیا یہ الہامی چیزیں تھیں۔حق تعالیٰ نے ان کے قلوب میں ڈالیں، انہوں نے ان کو واضح کر دیا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ...... مجھے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں کا واقعہ یاد آیا۔استاذ بھی امام ہیں اور شاگرد بھی امام ہیں۔اور دونوں صاحب مذہب اور صاحب فقہ ہیں۔امام شافعیؒ کا فقہ حجاز میں پھیلا اس لئے کہ ان کی ابتداء حجاز میں ہوئی انتہا مصر میں جا کر ہوئی۔مصر کی اکثریت شوافع کی ہے۔امام احمد بن حنبلؒ مغربی ممالک کی طرف گئے۔تو نجد اور یمن کے اندر حنبلیت پھیلی ہوئی ہے۔لاکھوں انسان فقہ حنبلی پر چل رہے ہیں۔

چونکہ امام شافعیؒ کا اخیر زمانہ مصر میں گزرا ہے اور امام احمدؒ سے ملاقات کیے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔تو امام شافعیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کے نام خط لکھا۔"بہت عرصہ ہو گیا تم سے ملے ہوئے اور ملنے کو جی چاہتا ہے۔اگر مصر آنے کی کوئی صورت بن پڑے تو کوشش کر و مصر آ جاؤ۔جی چاہتا ہے کہ اخیر عمر میں تمہیں ایک دفعہ اور دیکھ لوں"۔

امام احمد نے جواب لکھا کہ "میں حاضر ہو رہا ہوں"۔دن اور تاریخ متعین کر دی کہ میں فلاں تاریخ کو حاضر ہو رہا ہوں۔چنانچہ مقررہ وقت پر امام احمد بن حنبلؒ مصر کے لئے روانہ ہوئے اور اسی تاریخ کو مصر پہنچے جس کا وعدہ لکھا تھا۔امام شافعیؒ استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلے۔جب امام نکلے تو جتنے علماء تھے سب کے سب امام شافعیؒ کے ساتھ چلے۔علماء جب چلے تو جتنے احکام اور زعماء تھے وہ بھی ساتھ ہوئے۔حتیٰ کہ بادشاہ وقت بھی استقبال کے لئے آ گیا ایک بڑا عظیم جتھہ گویا ملک کے اجلہ اور اکابر استقبال کے لئے آئے اور پورے مصر میں خوشی تھی کہ آج امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہو رہے ہیں۔امام شافعیؒ کی بچیوں کا یہ حال تھا کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں کودتی پھرتی ہیں کہ ہمارے ہاں امام وقت مہمان ہونے والا ہے۔خدا خدا کر کے امام احمدؒ پہنچے، اور امام شافعیؒ کے ہاں قیام کیا۔

امام شافعیؒ نے کھانا لا کے رکھا۔ امام شافعیؒ کی مہمان نوازی مشہور اور تاریخی چیز ہے۔ ان کی مہمان نوازی کے عجائبات تاریخ کا حصہ ہیں۔ غرض امام شافعیؒ نے بہت شغف اور توجہ کے ساتھ مہمان نوازی کی اور کھانا لا کر رکھا۔

امام احمد بن حنبلؒ نے کھانا، کھانا شروع کیا مگر اس طرح سے کھایا جس طرح کوئی سات وقت کا بھوکا کھاتا ہے اور کافی مقدار میں خوب پیٹ بھر کے کھایا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ معلوم نہیں کتنے وقت کا کھانا نہیں ملا۔ وہ زمانہ تقویٰ اور طہارت کا ہے۔ تو امام شافعیؒ کی بچیوں نے گھر میں امام شافعیؒ پر اعتراض کیا کہ تم کہتے تھے کہ امام وقت ہے یہ کیسا امام وقت ہے جو پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے یہ عوام الناس کا کام ہے کہ پیٹ بھر کے کھائیں۔ اتقیاء کا یہ کام نہیں ہے۔ وہ تو سنت کے تابع ہوتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ اور تابعین کی سنت یہ ہے کہ بقدر ضرورت کھالیا۔ لیکن اس طرح سے گر پڑ کے کھانا کہ معلوم ہو بہت وقت کا بھوکا ہے یہ شان اتقیاء کی نہیں ہے۔ تو یہ کیسا امام وقت ہے؟

امام شافعیؒ سے جواب نہیں بن پڑا۔ فرمایا کہ: حیرت مجھے بھی ہے۔ مگر میں بول یوں نہیں سکتا کہ میں میزبان ہوں۔ اگر میری زبان سے یہ نکلا کہ بھائی کم کھاؤ۔ تو یہ موضع تہمت ہوگا کہ میں شاید اپنی روٹی بچانا چاہتا ہوں۔ اس لئے میرے بولنے کا موقع نہیں مگر حیرت مجھے بھی ہے کہ احمد بن حنبلؒ میں یہ تغیر کیسے پیدا ہوا؟ کھانے کی طرف اس طرح سے متوجہ کیسے ہوئے؟

رعایت مقام...... اتقیاء کے کھانے کی شان یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کے بارے میں فرمایا گیا کہ: جب جہاد میں جاتے تھے تو یہ نہیں تھا کہ سامان رسد کے طور پر وہاں انڈے کیک اور پیڑیاں پہنچتی تھیں۔ کچھ سوکھے ٹکڑے زنبیلوں میں بھرے ہوئے ہیں بہت بھوک لگی چبا کر کھالئے۔ کسی کے پاس وہ بھی نہیں کچھ کھجوریں پڑی ہوئی ہیں وہ کھالیں۔ یہ بھی نہ ہوا تو بعض کے پاس گٹھلیاں بھری ہوئی ہوتی تھیں گٹھلیاں منہ میں ڈال لیں گویا نفس کو بہلا دیا کہ ہم کچھ کھا رہے ہیں اور نفس سمجھ گیا کہ مجھے میری غذا مل گئی تو غذائیں یہ تھیں اور چوبیس گھنٹے جہاد میں مصروف تھے۔ یہ روحانی ومعنوی قوت ہوتی تھی۔

حضرت قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے کہ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے۔

اندازہ کیجئے ایک بادام بھی کوئی غذا ہے۔ شراح لکھتے ہیں کہ وہ خود حضرت شیخ ہیں۔ اپنے کو چھپانے کے لئے ایسے لکھا کہ میں کسی ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے اور حالت یہ تھی کہ ان کے تراجم میں موجود ہے رات کو جب ذکر اللہ کرتے تھے تو اتنی بلند آواز سے ذکر کرتے تھے کہ سرائے میں ذکر کرتے تھے، دو فرلانگ پر شہر ہے ہر گھر میں اس طرح پر آواز پہنچتی تھی جیسے ہمارے دروازے پر بیٹھے ہوئے ذکر کر رہے ہیں یہ ان کی قوت کی حالت تھی۔ یہ روحانی ومعنوی قوت تھی۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حدیث میں فرمایا کہ: دو دو مہینے ایسے گزرتے تھے کہ بیت نبوت میں دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا اسودین پر گزر ہوتا تھا ایک کھجور کھالی، ایک کٹورا پانی پی لیا، یہ غذا ہوتی تھی اور جب صوم وصال رکھنے پر آئے تو یہ بھی ختم ہو جاتی تھی۔ ①

بہر حال انبیاء علیہم السلام کی شان بھی کھانے پینے کے بارے میں انتہائی تقلیل کی ہے، صحابہ، اولیاء اور اتقیاء کی شان بھی انتہائی قلت کی ہے۔ اتقیاء کی یہ نظیریں سامنے تھیں، ان کو سامنے رکھ کر لڑکیوں نے اعتراض کیا کہ احمد بن حنبلؒ کیسا متقی شخص ہے؟ اور کیسا امام ہے جس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا؟

امام شافعیؒ سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑا اور فرمایا کہ حیرت مجھے بھی ہے مگر میں میزبان ہونے کی وجہ سے بول نہیں سکتا۔ خیر وہ بات ختم ہوگئی۔

عشاء کا وقت آیا اور امام احمد بن حنبلؒ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں تشریف لے گئے۔ تو امام شافعیؒ کی بچیوں نے امام احمد کے لئے بستر لگایا اور لوٹا بھر کر پانی کا رکھا تا کہ رات کو تہجد کے لئے اٹھیں تو تکلیف نہ ہو۔ لوٹا بھرا بھرایا مل جائے۔ رات کا یہ سب سامان کر کے بچیاں چلی گئیں۔

امام احمدؒ تشریف لائے چارپائی پر لیٹ گئے۔ صبح کی نماز کو جب اٹھ کر گئے۔ بچیاں بستر تہہ کرنے آئیں تو معلوم ہوا لوٹا اسی طرح بھرا ہوا رکھا ہے۔ اب تو ان کے غصہ کا پارہ انتہائی طور پر چڑھ گیا اور انہوں نے امام شافعیؒ کا دامن پکڑ کے کہا کہ یہ تمہارے شاگرد جن کو تم کہتے تھے کہ امام وقت ہے اور اتقیاء امت میں سے ہیں کیسا متقی ہے کہ پیٹ بھر کے یہ کھانا کھائے؟ اور رات کے اوقات میں نوافل پڑھنے کی اسے توفیق نہ ہو؟ تہجد یہ نہ پڑھے؟ یہ کیسا نئی قسم کا امام ہے۔ اب امام شافعیؒ سے بھی ضبط نہ ہو سکا آخر احمد بن حنبلؒ کے استاذ تھے۔ تو بٹھا کر کہا کہ:

اے احمد بن حنبل! یہ تغیر تم میں کب سے پیدا ہوا۔ میں کل سے دیکھ رہا ہوں اور صبر کر رہا ہوں تم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ میں اس لئے نہیں بولا کہ میں میزبان تھا۔ میرے اوپر تہمت آتی۔ بہر حال میں نے صبر کیا۔

لیکن اب جب دیکھا کہ رات کو تہجد تک کی توفیق نہیں ہوئی، تو میرے سے نہ رہا گیا۔ تو تمہارے حالات میں یہ تغیر کب سے پیدا ہوا؟ یہ تو افسوسناک حالات ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ ہنسے اور عرض کیا، حضرت! واقعہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھے ہوئے ہیں۔

شانِ عمل اور شانِ اجتہاد...... فرمایا کیا واقعہ ہے؟ کہا کہ: واقعہ یہ ہے آپ کو میرے زیادہ کھانے کے اوپر اعتراض ہوا۔ حقیقتاً میں نے زیادہ کھایا ہے اور کافی کھایا۔ عمر بھر میں کبھی اتنا نہیں کھایا تھا جتنا یہاں کھایا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ جب آپ کا دستر خوان بچھا تو اتنی حلال کی کمائی تھی اس کے اوپر آسمان سے انوار و برکات کی بارش تھی، میں نے عالم میں اتنی پاک کمائی نہیں دیکھی۔ میں نے ارادہ کیا جتنا زیادہ سے زیادہ کھا سکوں کھالوں

① دلائل النبوة للامام البيهقي بباب ذكر اخبار رؤية في زهده...... ج: ۱، ص: ۳۳۱، رقم: ۲۹۸.

ممکن ہے پھر ایسی پاک غذا مجھے نصیب نہ ہو۔ اس وجہ سے میں نے زیادہ کھایا چاہے مجھے سات دن روزے رکھنے پڑیں۔ مگر اتنا منور اور بابرکت لقمہ حلال میں نے آج تک عالم میں نہیں دیکھا۔ اور فرمایا کہ: اس کھانے کی دو برکتیں میرے اندر نمایاں ہوئیں ایک علمی اور ایک عملی۔ عملی برکت تو یہ نمایاں ہوئی کہ میں نے آج عشاء کے وضو سے تہجد پڑھی اور صبح کی نماز بھی پڑھی یہ وجہ ہوئی لوٹا استعمال نہ کرنے کی وہ بھرا ہوا رہ گیا۔ میں رات بھر عبادت میں رہا۔

اور علمی برکت یہ پیدا ہوئی کہ قرآن حکیم کی ایک آیت سے فقہ کے سو مسئلے نکالے اور علوم کے دروازے مجھ پر کھل گئے۔ یہ لقمۂ حلال کی غذا کی برکت تھی۔

شرط معرفت...... حقیقت یہ ہے کہ نورِ معرفت حلال غذا سے پیدا ہوتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ لقمہ حلال کا ہو۔ ایمانی و روحانی قوتیں لقمہ حلال کے تابع ہیں۔ انسان کا پیٹ حوض بدن ہے۔ حوض میں جو بھرا جائے گا نلوں اور نالیوں میں بھی وہی آئے گا۔ اگر پیٹ میں پاک غذا ہے تو قلب میں پاک آثار آئیں گے اور دماغ میں بھی، اقوال بھی پاک نکلیں گے اور اگر لقمہ حلال نہیں ہے تو پھر وہی ظلمت اور کدورت ملے ہوئے اقوال و افعال ہوں گے اور ایسی ہی حرکات بھی ہوں گی۔ اسی لئے اہل اللہ سب سے زیادہ لقمہ حلال کا اہتمام کرتے تھے کہ ہماری کمائی پاک ہو۔ اس کمائی سے ہی قلب میں نورِ معرفت پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ قساوت پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں دیوبند میں ایک بزرگ تھے شاہ جی عبداللہ صاحب ان کا نام تھا۔ بے پڑھے لکھے امی محض تھے۔ مگر صاحب نسبت بزرگوں میں تھے انہوں نے اپنے گزر اوقات کا ذریعہ گھاس کھودنا مقرر کر لیا تھا۔ گھاس کھود کر گٹھڑی بیچتے تھے۔ اور گٹھڑی کی قیمت چھ پیسے مقرر کی ہوئی تھی۔ نہ ایک پیسہ کم لیتے تھے نہ ایک پیسہ زیادہ لیتے تھے۔ دیوبند میں جتنے لوگ اپنے جانوروں کے لئے گھاس خریدتے تھے، منڈی میں پہنچتے تو سینکڑوں گٹھڑیاں گھاس کی ہوتی تھیں، مگر سب منتظر رہتے تھے کہ ہم شاہ جی کی گٹھڑی خریدیں گے۔ ہر ایک اس کی کوشش میں ہوتا تھا اور سمجھتا تھا کہ ہمارا جانور ان کا لایا ہوا گھاس کھائے گا تو گھر میں برکت ہوگی۔ جب شاہ جی عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نظر پڑتے تو لوگ ان کی طرف دوڑتے تھے، بس جس نے جا کر پہلے ہاتھ لگایا، شاہ جی وہیں گٹھڑی ڈال دیتے تھے اور چھ پیسے لے لیتے تھے۔

اس چھ پیسے کی تقسیم ان کے ہاں کیا تھی؟ دو پیسے تو اسی وقت صدقہ کر دیتے۔ ان دو پیسوں میں اس زمانے میں کچھ پائیاں ملتی تھیں تو وہ ایک ایک دو دو بچوں کو، یتیموں کو، بیواؤں کو غریبوں کو وہیں کھڑے کھڑے تقسیم کر دیتے۔ اور دو پیسے روز ان کے گھر کا خرچ تھا۔ کچھ تیل لے لیا، کچھ نمک، لکڑی وغیرہ سستا زمانہ تھا تو دو پیسے روز میں گھر والوں کا خرچ ہو جاتا تھا۔

اور دو پیسے جو بچتے تھے۔ انہیں جمع کیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب وہ چھ، سات روپے بن جاتے اس رقم سے ہمارے اکابر حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی دعوت کیا کرتے تھے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں۔ یہ فقط عالم ہی نہیں عارف باللہ بلکہ صاحب کشف و کرامت بزرگوں میں سے تھے۔ ان کا مقولہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ سال بھر ہمیں شاہ جی ؒ کی دعوت کا انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دن آئے کہ ان کے گھر کا کھانا کھائیں اور فرمایا جس دن کھانا کھاتے تھے۔ تو چالیس چالیس دن قلب میں نور رہتا تھا اور قلب میں جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بھی عبادت کر لیں، نوافل پڑھ لیں، تلاوت کر لیں۔ ہر وقت طاعت وعبادت کو جی چاہتا تھا۔ اس اکل حلال کی یہ برکت قلوب میں نمایاں ہوتی تھی۔

سلب توفیق..... لقمہ حلال درحقیقت ایسی چیز ہے کہ اسی سے توفیق پیدا ہوتی ہے۔ آج کی بے عملی لاعلمی کے سبب سے نہیں ہے۔ علم تو عام ہو گیا۔ ہر شخص جانتا بوجھتا ہے۔ پھر بھی بدعملی ہے؟ توفیق کے سلب ہونے کی وجہ سے۔ اور توفیق لقمہ حرام یا مشتبہ لقمہ کی وجہ سے سلب ہوتی ہے اکل حلال پورا میسر نہیں ہے۔ بقول غالب کے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس لئے کہ مشتبہ غذاؤں نے طبیعت پر بندش عائد کر رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ غرض آج کے گناہوں کا سبب لاعلمی نہیں ہے۔ بلکہ طبیعت کی قساوت یا ظلمت یا عدم توفیق یا سلب توفیق یہ چیزیں باعث بنتی ہیں۔ اس لئے کہ لقمہ صحیح نہیں رہا۔

میں دیکھا کرتا ہوں یہاں تو نہیں مگر ادھر اپنے نواح میں دیکھا۔ یہ جو آج کل شوگر مل ہر جگہ ہیں۔ ہمارے ہاں دیوبند سے لے کر دہلی تک ہر اسٹیشن پر ایک شوگر مل ہے۔ اس کی وجہ سے گنے کی کاشت بڑھ گئی۔ تو گنے ریل گاڑی اور بیل گاڑیوں میں بھر بھر کے جاتے ہیں۔ بعض مل والوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریلیں چلا رکھی ہیں تو وہ کھیتوں میں گھومتی ہیں اور وہاں سے گنا مل میں پہنچاتے ہیں تو مال گاڑی کے ڈبے ہر وقت بھرے ہوئے کھڑے رہتے ہیں۔ تو میں نے دیکھا کہ مسافر جب اترتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مال گاڑی گنوں سے بھری کھڑی ہے تو کوئی بیس گنے کھینچ لایا، کوئی چالیس کوئی پچاس اور کھا رہے ہیں۔ میں حیرت سے دیکھا کرتا ہوں کہ یہ لوگ گویا یوں سمجھ کے کھا رہے ہیں کہ ان کے باپ کا مال ہے۔ انہیں کوئی احساس نہیں کہ یہ غیر کا مال ہے۔ ہمارے لئے اس کا کھانا حلال نہیں یا حرام ہے۔ کوئی حس باقی نہیں جیسے جانور، مثلاً بیل جس کھیت میں گھسا، منہ مارتا ہوا چلا گیا، اسے اس کی کیا تمیز کہ میرے مالک کا کھیت ہے یا غیر کا۔ یہی حالت انسانوں کی ہو گئی کہ بس کھانے کی چیز سامنے آنی چاہئے۔ پھر حلال ہو یا حرام۔ بے تحاشا اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ تو میں سوچا کرتا تھا۔ یا اللہ! ان کے قلوب کی کیا کیفیت ہو گی؟ اس قسم کے مال سے سوائے قساوت، ظلمت اور تاریکی کے اور کیا پیدا ہو سکتا ہے۔ لقمہ حرام سے نیکی کا جذبہ نہیں ابھر سکتا۔ نیکی کا جذبہ ہمیشہ لقمہ حلال سے ابھرے گا۔

پچھلے زمانے میں اہل اللہ جب بیعت کرتے تھے' پہلی شرط یہ لگاتے تھے کہ لقمہ حلال بھی میسر ہے یا نہیں؟ اگر تمہاری غذا مشتبہ ہے تو سارا دن بھی ذکر اللہ کرو گے تو قلب کے اوپر آ ثار نمایاں نہیں ہوں گے۔ غرض لقمۂ حلال کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ پاک کمائی سے نور معرفت پیدا ہوتا ہے اور پاک کمائی کی طرف جذبہ؟ یہ ظاہر بات ہے کہ اتباع انبیاء علیہم السلام سے ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ لقمہ حلال کی قرآن کریم میں بھی جگہ جگہ تاکید کی گئی ہے فرمایا ﴿وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾ ① ایک دوسرے کا مال باطل کے ساتھ مت کھاؤ۔ حق کے ساتھ کھاؤ، جائز طریق پر کھاؤ، ناجائز طریق پر مت استعمال کرو۔ یہ چوری، ڈکیتی، رشوت، جو اسب اسی لئے تو ممنوع ہوئیں کہ یہ کمائیاں ناجائز ہیں۔ ان کے کھانے سے قلب پر برا اثر پڑے گا' مشتبہ کمائی سے برا اثر پڑے گا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ میں مال کے مصارف کو دیکھ کر مداخل کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ یعنی جن مواقع میں صرف ہوتا ہے۔ ان مواقع کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ مال کیسے مواقع سے آیا ہوگا۔ اگر پاک جگہ پر خرچ ہو رہا ہے۔ میں سمجھ لیتا ہوں کہ پاک طریق پر کمایا گیا ہے۔ اگر ناپاک مواقع پر صرف ہو رہا ہے، میں سمجھ لیتا ہوں کہ یقیناً ناجائز طریق پر کمایا گیا ہے، پاک مال کبھی بھی ناپاک جگہ پر خرچ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ ناپاک مال پاک جگہ پر نہیں لگ سکتا۔

مشتبہ چندے سے احتراز...... دارالعلوم دیوبند میں بمبئی کے ایک سیٹھ آئے تھے۔ لکھ پتی لوگوں میں سے تھے دارالعلوم کو دیکھا۔ بہت خوش ہوئے پسند کیا اور اعلان کیا کہ پچیس ہزار روپیہ بھیجوں گا۔ تو ہمارے بزرگوں نے اس کے اوپر کوئی زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ جیسے مثلاً یہ ہوتا کہ انہوں نے اعلان کیا تھا تو اس پر کوئی شکریہ ادا کیا جاتا یا کوئی دعائیہ کلمات کہے جاتے، جس سے ان کا دل بڑھتا۔ بس چپ ہوکر بیٹھ گئے۔ تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بے چارے نے تو کتنی جی داری کا ثبوت دیا۔

پچیس ہزار، یہ آج سے پینتالیس برس پہلے کی بات ہے پینتالیس برس پہلے پچیس ہزار کی قیمت ایسی ہی ہے جیسے آج اسی ہزار۔ پھر دینی مدارس میں پچیس ہزار کی رقم آئے تو ان کے مصارف تھوڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے بلحاظ مصارف وہ رقم بہت تھی۔ تو بجائے اس کے کہ ان کا کوئی شکریہ یا دعاء وغیرہ کے کلمات یا خوشی کا کچھ غیر معمولی اظہار ہوتا۔ سارے ہی چپ بیٹھ گئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ خیر وہ سیٹھ صاحب اعلان کر کے چلے گئے۔ ایک مہینہ گزرا، دو مہینے گزرے میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ آپ نے یاددہانی نہیں فرمائی۔ دارالعلوم کو اگر اتنی رقم مل جاتی تو دارالعلوم کے بہت سے کام چلتے۔ ایک شخص نے وعدہ کیا اعلان کیا کم سے کم وعدہ کی یاددہانی فرمادیں میری بات سن کر وہ خاموش ہوگئے۔ پھر مجھے حیرت ہوئی کہ اس شخص کو نہ شکریہ نہ دعا دی اور

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۸۔

اب بھی یاددہانی کے لئے کہہ رہا ہوں تو چپ۔ پھر میں نے کسی دوسرے وقت یاد دہانی کرائی کہ کم سے کم ایک خط تو لکھ دیں کہ بھائی یہ رقم بھیج دیں۔ اس وقت کچھ منہ بنا کر فرمایا کہ ”یہ رقم دارالعلوم میں آ نہیں سکتی“۔

میں نے کہا: آخر کیوں؟ فرمایا: ان کا سارا کام سود بٹے پر چلتا ہے۔ آبکاری کے محکمے میں ان کی ملازمت ہے اور اسی قسم کی ان کی ساری کمائی ہے۔ وہ کمائی یہاں نہیں آئے گی نہ یہاں چلے گی اور نہ انہیں بھیجنے کی توفیق ہوگی۔ ہم کیوں یاد دہانی کرائیں۔ اس وقت میرے ذہن میں آیا کہ ان حضرات کو ہمیشہ ایسی کمائی کا چندہ قبول کرنے سے انکار رہتا تھا۔ جس کو یہ مشتبہ سمجھتے تھے۔ اور وہ اس بناء پر کہ اگر چندہ صرف کیا گیا تو طلباء پر بھی وہی اثر پڑے گا، ان کے علم میں برکت نہیں رہے گی۔ ان کی معرفت ختم ہو جائے گی۔ اس واسطے گریز کرتے تھے۔

بہر حال اہل اللہ کے ہاں یہ مسئلہ ہمیشہ بہت ہی زیادہ قابلِ توجہ رہا ہے کہ کمائی مشتبہ نہ ہونی چاہئے۔ پاک ہونی چاہئے اس لئے کہ اسی پر توفیق اور اعمال کا دارومدار ہے۔ تو تقلیل تو بجائے خود ہے کہ حلال میں سے بھی کم سے کم ہو۔ یہ تو خیر بڑوں کی شان ہے۔ لیکن ہم کم سے کم اتنا تو رکھیں کہ کمائی حرام اور مشتبہ نہ ہو۔

شانِ اتقیاء...... تو میں نے عرض کیا کہ آج بے عملی لاعلمی کے سبب سے نہیں بلکہ دوسرے اسباب ہیں ہمارے اندر احتیاط باقی نہیں ہے۔ تقویٰ اور طہارت چھوڑ فتویٰ بھی باقی نہیں کہ فتویٰ کے مطابق ہماری کمائیاں صحیح ہوں۔ سب کو میں نہیں کہتا الا ماشاء اللہ ایسے آج بھی موجود ہیں جو برابر اپنی کمائی میں احتیاط کرتے ہیں اور قیامت تک موجود رہیں گے۔ یہ امت خالی نہیں ہوگی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”مَثَلُ اُمَّتِیْ کَمَثَلِ الْمَطَرِ لَا یُدْرٰی اَوَّلُهٗ خَیْرٌ اَمْ اٰخِرُهٗ“ ①

میری امت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ بارش۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ زمین کے لئے بارش کا پہلا قطرہ زیادہ نافع ہوا یا بیچ کا یا اخیر کا۔ یعنی میری امت میں خیریت مشترک ہے۔ کمی اور زیادتی کا فرق رہے گا۔ لیکن خیر سے امت کبھی خالی نہیں ہوگی۔ اس لئے متقیوں سے یہ امت کبھی خالی نہیں ہوسکتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ دیا ہے فرمایا: ”لَاتَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ مَّنْ خَالَفَهُمْ وَلَامَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ.“ ② میری امت میں ہمیشہ ایک طبقہ رہے گا جو منصور من اللہ ہوگا، موید من اللہ ہوگا، حق کہتا اور سناتا رہے گا، حق ہی پر عمل کرتا رہے گا۔ اس کے خلاف کرنے والے اس کو گزند نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہاں لفظ طائفہ فرمایا یعنی چھوٹی جماعت یہ تو ہوگا کہ وہ کم ہو جائیں گے۔ مگر موجود رہیں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ امت میں باقی نہ رہیں گے۔

اسی طرح فرمایا: ”لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ.“ ③ فرمایا: میری امت ساری کی ساری مل کر گمراہی پر جمع نہیں ہوگی اہل حق اس میں ضرور باقی رہیں گے اور اس مت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ اس لئے یہ تو

---

① المسند للامام ابی یعلیٰ، ج:۷، ص:۲۹۵، رقم:۳۳۸۱. ② السنن للامام ابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة رسول الله ﷺ، ج:۱، ص:۱۲، رقم:۱۰. ③ المعجم الکبیر للطبرانی، ج:۱۱ ص:۷۸.

نہیں کہا جا سکتا کہ خدانخواستہ سارے کے سارے (ایسے مشتبہ حرام کمائی والے) ہی ہیں مگر ہاں اکثریت ایسوں کی ہوگئی ہے۔ قلیل طبقہ ہے جو احتیاط برتتا ہے اور تقویٰ وطہارت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ تو بات اس پر یاد آئی تھی کہ لقمہ حلال سے ہی انسان میں توفیق ہوتی ہے نہ صرف عمل کی بلکہ اس سے علم اور معرفت بھی پیدا ہوتی ہے۔

کمال دانشمندی...... تو امام شافعیؒ اس وقت خوش ہوئے اور لڑکیوں سے کہا کہ دیکھا تم نے کہ امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہے؟ یہ امام کی شان ہے کہ وہ قلیل کھائے تب اس میں سے دین پیدا کر لیتا ہے۔ کثیر کھائے تب اس میں سے دین پیدا کر لیتا ہے۔ تو دیندار حقیقی معنی میں وہی ہے کہ اس کو دنیا جہاں بھی ملے وہ اس میں سے اپنے لئے دین پیدا کر لے۔ یہ بد عقلی ہے کہ آدمی دین کو بھی دنیا بنا لے اور دانش مندی یہ ہے کہ دنیا میں سے اپنے حق میں دین اور خیر نکال لے۔

غرض امام شافعیؒ اس پر بہت خوش ہوئے اور پھر فرمایا کہ: دیکھو! امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہے۔ بات اس پر یاد آئی تھی کہ اکل حلال اور قلیل کھانے میں بہر حال ایک نور اور ایک معرفت ہے اور اس سے آدمی چلتا ہے۔

عمل بالقرآن سے انبیاء بنی اسرائیل سے مماثلت...... تو قرآن کریم ایک معجزہ ہے اس پر چل کر لوگ ولی بنے، کامل بنے اور امت اولیاء سے بھر گئی اور ایسے ایسے اولیاء کاملین پیدا ہوئے جو "كَأَنْبِيَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ." تھے، وہ نبی نہیں تھے، مگر انہوں نے کام ایسے کئے جیسے نبیوں کے ہوتے ہیں۔ نبیوں پر اگر وحی آتی تھی تو ان پر الہام ہوا۔ نبیوں کے ہاتھوں پر اگر معجزے ظاہر ہوئے تو ان کے ہاتھوں پر کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ نبیوں نے اگر اصل شرائع پیش کیں تو انہوں نے شرائع وضعیہ پیش کیں جنہیں اجتہادی شرائع کہتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام سے مماثلت پیدا ہوگئی۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "كَأَنْبِيَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ." ①

یہ حدیث گو سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ مگر اس کے ہم معنی اور بھی حدیثیں ہیں۔ مضمون قدر مشترک کے طور پر ثابت ہے کہ اس امت کے اولیاء، اتقیاء اور علماء کارناموں اور کارگزاری کے سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کے مثل ہوئے ہیں۔ یہ ان کی ساری چیزیں عمل بالقرآن سے پیدا ہوئی ہیں۔

تو بات اس پر چلی تھی کہ قرآن خود ہی معجزہ نہیں ہے بلکہ معجزے بناتا بھی ہے۔ یعنی معجزے کی شبیہ چیزیں اولیاء کے ہاتھ پر نمایاں ہوتی ہیں جب وہ عمل بالقرآن کرتے ہیں۔ تو قرآن کریم معجزہ ہے جو نبوت کی دلیل ہے۔

علمی معجزے کا امتیاز...... اس سے ایک اور بات واضح ہوئی۔ وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو عملی معجزات دے دیئے گئے تھے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عملی معجزات کے ساتھ ساتھ یہ علمی معجزہ بھی دیا گیا۔ عمل کی خاصیت یہ ہے کہ عامل جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن علم کی خاصیت یہ ہے کہ عالم دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔ مگر اس

① علامہ پٹنی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قال شيخنا الزركشي لا اصل له ولا يعرف في كتاب معتبر. دیکھئے: تذكرة الموضوعات، ج: ۱ ص: ۲۰.

کا علم باقی رہتا ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ ختم ہو گئے۔ لیکن علمی معجزہ قرآن کریم ہے جو آج تک باقی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کی دلیل آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ تو جس دعوے کی دلیل آج موجود ہے۔ وہ دعویٰ آج بھی ثابت ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو آج بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی دلیل مانگے تو معجزہ پیش کر دیں گے اور وہ قرآنی معجزہ ہے۔

دوام کتاب دوام نبوت کو مستلزم ہے...... موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ آج ان کی نبوت پر ایمان لے آؤ اور دلیل مانگی جائے تو نہ عصاء موسیٰ ہے نہ ید بیضاء ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں آج نہ احیاء موتی ہے نہ ابراء اکمہ وابرص ہے، جس کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے۔ شعیب علیہ السلام کی نبوت کو پیش کیا جائے تو ان کی نبوت کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ لیکن اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو پیش کیا جائے اور دلیل کا مطالبہ ہو تو یہ دلیل موجود ہے، یہ معجزہ کلامی اور علمی ہے۔ جو عالم کے دنیا سے اٹھنے کے بعد ختم نہیں ہوا بلکہ آج بھی بدستور موجود ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت بھی ابدی ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے کہ اس کی دلیل قائم ہے۔ غرض اور انبیاء علیہم السلام کی نبوتیں حق ہیں اور اپنے اپنے زمانے میں سچی ہیں مگر آج ان کے دلائل عالم میں موجود نہیں ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل آج دنیا میں موجود ہے اس لئے نبوت قائم ہے اور اس کے بارے میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہا جائے گا کہ قرآن کی وجہ سے یہ نبوت دائمی اور ابدی ہے اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ قیامت تک باقی رکھنی تھی اس لئے دلیل نبوت وہ دی گئی جو باقی رہ سکے ختم نہ ہونے پائے۔ اور وہ ''علمی معجزہ'' ہے۔

معارضۂ قرآن کا عذاب...... معجزے کی شان یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی معجزے کے مقابل آئی ہے، جبھی فنا ہو گئی۔ صالح علیہ السلام سے معجزہ مانگا گیا کہ پتھر میں سے اونٹنی نکال کر دو۔ انہوں نے باذن اللہ اونٹنی نکال کر دکھلائی۔ قوم نے اونٹنی کا مقابلہ کیا اور اس کو ختم کیا۔ تو قوم کے اوپر عذاب آیا اور اس کا صفایا کر دیا گیا۔ غرض جب بھی دنیا میں معجزے کے مقابل کوئی قوم آئی ہے جبھی گر گئی۔ قرآن کریم ایک معجزہ ہے۔ یہ الگ چیز ہے کہ ہم اپنی سستی یا غفلت سے عمل میں کوتاہی کریں۔ لیکن خدانخواستہ اگر کوئی قوم مدمقابل آئے گی اور قرآن کے معارض پڑے گی۔ تو یقیناً خسارے میں پڑے گی یقیناً کسی نہ کسی عذاب میں پڑے گی۔ وہ عذاب چاہے کسی بھی نوعیت کا ہو اس امت پر وہ عذاب تو نہیں آئیں گے جو پچھلی امتوں پر آئے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''لَيْسَ عَذَابُ أُمَّتِي الْخَسْفُ وَالْمَسْخُ وَالرَّجْفُ اِنَّ عَذَابَهَا الْقَتْلُ وَالْفِتَنُ وَالزَّلَازِلُ.'' ① ''میری امت کا عذاب یہ نہیں ہے کہ صورتیں مسخ کر دی جائیں۔ جیسے پچھلی امتوں کی گئیں یا پوری امت زمین میں دھنسا دی جائے یہ نہیں ہو گا یا پتھر برسا کر ختم کر دی جائے یہ نہیں ہو گا یہ عذاب ختم کر دیے گئے''۔

① مسند الشهاب القضاعي، ج: ۲، ص: ۴۸۵، رقم: ۱۰۹۰.

میری امت کا عذاب کیا ہے؟ فتنے پھیلیں گے، ایک دوسرے کو مزہ چکھائیں گے، ایک دوسرے کے مدمقابل آئیں گے۔ ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾ ① فرماتے ہیں! اللہ اس پر قادر ہے کہ اس امت پر اوپر سے عذاب برسادے، نیچے سے عذاب ابھار دے۔ یا ان کے اندر عذاب ڈال دے۔ وہ کیا ہے؟ ﴿يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا﴾ ② ان میں گروہ بندی پیدا کردے۔ ایک پارٹی دوسرے کو مزہ چکھاتی رہے، چین سے نہ بیٹھے، یہ عذاب آج بھی موجود ہے۔ یہ جبھی ہوگا جب لوگ قرآن ''جو معجزہ ہے'' کے معارضے پر آئیں گے۔ قرآن کریم کو ماننے پر آئیں، اختلافات ختم ہو جاتے ہیں، معارضہ کرنے پر آئیں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ نزاعات کا برا اثر پھر امت ہی کے اوپر پڑتا ہے۔

افتراقِ امت کے عذاب سے بچنے کا راستہ...... اگر اس کو امام مان کر سارے طبقات اس پر جمع ہو جائیں اور اس کی شرح حدیث ہے، اس پر جمع ہو جائیں اور آئمہ وعلماء راسخین نے جو جو مسائل اس سے استنباط کئے ہیں اس پر جمع ہو جائیں تو فی الحقیقت قوم کو کوئی گمراہ کرنے والا اور مٹانے والا نہیں ہے۔ اس کی قوت بنی بنائی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''تَرَكْتُ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْٓ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا'' فرماتے ہیں کہ میں دو چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا، اگر تم ان دونوں چیزوں سے تمسک کرتے رہو گے۔ تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے، کبھی مغلوب نہیں ہو گے۔ ''كِتَابُ اللّٰهِ وَ سُنَّتِيْ.'' ③ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔ یعنی اسوہ اور میرا طریق عمل، جب ان دو کو اختیار کرلو گے۔ تو ان دو کو ثقلین فرمایا گیا۔ یہ وزنی چیزیں ہیں یہ ہٹنے والی نہیں ہیں۔ مٹنے والی نہیں ہیں۔

جب طوفان آتا ہے۔ اگر آدمی تنکے کا سہارا پکڑے تو تنکا بھی بہہ جائے گا اور آدمی بھی بہہ جائے گا، کوئی درخت بہتا ہوا آرہا ہے گو بڑا نظر آئے، مگر وہ بھی بہتا ہے، اسے پکڑے گا تو یہ بھی بہہ جائے گا۔ لیکن اگر آدمی کسی عظیم الشان چٹان کی پناہ لے۔ تو چٹان کو طوفان نہیں ہلا سکتا۔ تو اس شخص کو بھی نہیں ہلا سکتا۔ اس لئے کہ وہ ثقیل اور وزنی چیز ہے تو کتاب وسنت کو ثقلین کہا گیا۔ یعنی یہ دو اتنی وزنی چیزیں ہیں کہ اپنی جگہ سے ٹلنے اور ہلنے والی نہیں ہیں۔ انکو کوئی دوسرا نہیں ہلا سکتا۔ اگر ان دو چیزوں کو ہم مضبوط تھام لیں۔ تو یہ ایسی ثقیل اور وزنی چیزیں ہیں کہ پھر طوفان ہمیں بہا نہیں سکتا۔ یقیناً ہم اپنی جگہ اٹل ہو جائیں گے۔ ایک قوی حجت ہمارے ہاتھ میں آجائے گی۔

اگر ہم عقلی حجت پیش کریں تو جس سے بھی ہم کوئی معقول بات کہیں گے وہ کہے گا میں تم سے زیادہ عقلمند ہوں میں بھی ایک معقول بات پیش کرتا ہوں۔ ہم طبعی بات پیش کریں گے، وہ کہے گا میرے اندر بھی طبیعت ہے،

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۶۵۔ ② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۶۵۔

③ السنن للامام الترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب اھل بیت ... ج: ۱۲ ص: ۲۵۸ رقم: ۳۷۲۰۔

ہم اپنے مزاج کی بات منوانا چاہیں گے، وہ کہے گا میرے اندر بھی مزاج موجود ہے میری بات آپ کیوں نہ مانیں۔ لیکن جب آپ ایسی چیز پیش کریں گے جو سب مزاجوں سے بالاتر اور سب طبیعتوں سے اونچی ہوگی اور وہ کتاب اللہ اور سنت رسول ہیں۔ یہ دو ایسی وزنی اور اٹل چیزیں ہوں گی کہ ان کے آگے جھکنا پڑے گا۔ تو ایک قوی حجت اللہ نے ہمارے ہاتھ میں عطاء کی ہے۔

اور وہ قرآن وسنت ہے کہ یہ اٹل چیز ہے اپنی جگہ سے ملنے والی نہیں ہے۔ بہرحال قرآن کریم معجزہ بھی ہے اور معجزہ نما بھی ہے، اس پر چل کر آدمی خود معجزہ نما بھی بن سکتا ہے۔ ہزاروں اولیاء بنے، ہزاروں کاملین تیار ہوئے۔ اسی کتاب وسنت کے عمل نے تیار کئے یہ خود مستقل ایک حجت ہے۔

تو قرآن کریم کو علم کے درجے میں دیکھو تو اعلیٰ ترین علم اس میں ہے، عمل کے درجے میں دیکھو تو اعلیٰ ترین عمل کی کتاب ہے اس کا وظیفہ پڑھو تو وظیفے کی بہترین کتاب ہے اس میں سے حکمت نکالو تو بہترین حکمت کی کتاب ہے آج اس کے علم وحکمت سے کتب خانے بھرے ہوئے ہیں۔

علوم القرآن...... امام اوزاعیؒ نے لکھا ہے کہ کثرت تصنیف اس امت کی خاصیت ہے دنیا کی کسی امت نے تصانیف کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع نہیں کیا جتنا اس امت نے کیا ہے۔ تصانیف کے راستے ڈال دیئے ہیں، تاتار کی جنگ کے موقع پر تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کیا ہے تو بغداد میں کتنے کتب خانے تھے یہ تو آپ تاریخ میں دیکھیں، تو تعداد آپ کو معلوم ہوگی۔ صرف ایک کتب خانے کا مورخین حال لکھتے ہیں کہ بغداد کے کنارے پر جو دجلہ دریا بہتا ہے اس کا پل توڑ دیا گیا تھا تاکہ دشمن اندر نہ آسکے۔ لیکن بہرحال دشمن اندر پہنچ گئے اور بغداد کو فتح کرلیا۔ پل ٹوٹا ہوا تھا۔ تاتاریوں کو آنے جانے کی ضرورت تھی دریا گہرا تھا تو مسلمانوں کے ایک کتب خانے کو لے کر اس کی کتابوں سے دریا کو بھرنا شروع کیا پاٹتے پاٹتے اتنی چوڑی سڑک بنائی کہ چار پانچ گاڑیاں برابر برابر آجاسکتی تھیں۔ صرف ایک کتب خانے کی کتابوں کا یہ عالم تھا۔

نیز مورخین لکھتے ہیں کہ ان کتابوں کی روشنائی سے دھل دھل کر پانی جو بہا ہے تو ایک مہینے تک علماء کو روشنائی لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دریا کا پانی اتنا سیاہ ہوگیا تھا کہ اس سے بے تکلف لکھا جاسکتا تھا۔ تو اندازہ کیجئے جس شہر کے ایک کتب خانہ کا یہ حال ہو اس شہر کے دوسرے کتب خانے کتنے ہوں گے۔ اس ملک میں کتنے ہوں گے۔

اندلس ''اسپین'' کی حکومت جب تباہ ہوئی ہے تو ایک عیسائی عورت نے اس کی تاریخ لکھی ہے جس کا نام ''حَاضِرُ الْاُنْدَلَسِ وَ غَابِرُھَا'' ہے تو اس میں تعصب دکھلایا ہے کہ عیسائیوں نے تعصب میں آکر ارادہ کیا کہ مسلمانوں کا لٹریچر تباہ کیا جائے۔ اگر یہ کتابیں باقی رہ گئیں۔ تو ان کا عروج پھر ممکن ہے۔ اس لئے ایک مستقل مہم قائم کی گئی کہ ان کتب خانوں کو ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے افراد چنے گئے۔ ایک محکمہ قائم کیا گیا کہ کتب خانوں کو جلا دیا جائے یا دریا برد کیا جائے اور ضائع کیا جائے۔ اس کے لئے ایک مستقل انچارج آفیسر مقرر ہوا۔

تو وہ لکھتی ہے کہ کتب خانوں کی کتابیں لائی جاتی تھیں اور جلائی جاتی تھیں۔ پچاس برس میں جا کر پورے ملک کے کتب خانے ختم ہوئے ہیں، تو اندازہ کیجئے کتنے کتب خانے ہوں گے، ہندوستان کے کتب خانے، آپ کے پاکستان کے کتب خانے، بہت سے قدیم کتب خانے ہیں، جن کو کیڑے چاٹ رہے ہیں، پڑھنے والا کوئی نہیں، ہزاروں کتب خانے اب بھی موجود ہیں جو کیڑوں کی نذر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح حجاز کے کتب خانے، نیز مصر کے کتب خانے، مصری حکومت چھاپتے چھاپتے تنگ آ گئی ہے۔ مگر سلف کی کتابیں عشر عشیر بھی نہیں چھپی ہیں، ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں اب بھی باقی ہیں جو چھپ سکتی ہیں۔ یہ اتنا ذخیرہ اس قرآن وسنت ہی کی بدولت تو قائم ہوا۔ یہ علماء نے جو تصانیف کی ہیں۔ یہ قرآن ہی کی تو شرح ہو رہی ہیں۔

کتاب مبین کا خاصہ...... تو قرآن وحدیث کا اندازہ کیجئے کہ یہ اسلوب بیان کتنا جامع اور بلیغ ہے کہ اس کی شرح ہوتے ہوتے ہزاروں کتب خانے جمع ہو گئے۔ اب بھی عشر عشیر ہوا ہے۔ ہزاروں لاکھوں کتابیں اب بھی باقی ہیں جو شرح طلب ہیں، تو اس سے قرآن کے علم کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علم معجزے کا علم ہے کسی انسان کے علم کی تعبیر میں علم کا اتنا ذخیرہ نہیں ہوتا کہ اس کی شرح ہوتے ہوتے صدیاں گذر جائیں اور اس کی شرح ختم نہ ہو۔ یہ کتاب مبین ہی کا خاصہ ہے۔ خدائی کتاب ہے اور اسی کے علم ہی کی یہ صورت ہو سکتی تھی کہ علماء، حکماء، عرفاء، اور صوفیاء ہزاروں طبقات کھڑے ہوئے اور اس کی شرح کی اور وہ شرح ہوتی جا رہی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: "لَا تَنْقَضِیْ عَجَآئِبُهٗ." ①

قیامت آ جائے گی مگر قرآن کریم کے عجائبات ختم نہیں ہوں گے، برابر چلتے ہی رہے گے اور نکلتے ہی رہیں گے اور آج بھی علماء ہزاروں تصانیف کرتے جا رہے ہیں اور استدلال آیات سے یا احادیث ہی سے ہوتا ہے۔ تو اندازہ کیجئے ایک ایک آیت مستقل ایک سمندر معلوم ہوتا ہے۔

مسلمانوں نے نہ صرف تصانیف کی ہیں بلکہ فنون کی بنیاد ڈالی۔ بیسیوں فنون اور علوم ایجاد کئے ہر ہر فن کے اندر پھر لاکھوں کتابیں ہوئیں۔ تو یہ معجزہ نہیں تو کیا ہے؟۔ کہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے کہ اس کتاب کے اندر سے اتنا علم نکلتا چلا آ رہا ہے کہ لاکھوں کتب خانے بھر گئے، لاکھوں کتابیں بن گئیں اور آج بھی بنتی جا رہی ہیں اور جو نیا مسئلہ یا حادثہ سامنے آتا ہے اس میں سے اس کا حکم نکلتا چلا آتا ہے یہ سوائے اعجاز کی قوت کے اور کون سی قوت ہے؟

اصلاحی نصاب...... بہر حال قران کریم معجزہ ہے اور مسلمان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ معجزہ انہیں عطاء فرمایا اور اللہ کا ایک تبرک جو اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے وہ ان کے اندر موجود ہے۔ وہ آج بھی اس کی طرف توجہ کریں تو ان کا علم عمل اور تقویٰ پھر اونچے درجے تک پہنچ سکتا ہے اور اس کے آثار پھر ویسے ہی نمایاں ہو سکتے ہیں جیسا کہ کسی زمانے میں نمایاں ہوئے تھے۔

---

① السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن، ج: ۱۰، ص: ۱۴۷.

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِہٖ اَوَّلُھَا.'' ② اس امت کے اخیر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہوسکتی ہے جس چیز سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی ہے۔ تو امت کا اولین طبقہ صحابہ کرام کا ہے۔ ان کی اصلاح کا ضامن یہی قرآن ہوا ہے۔ ان کے کتب خانے میں قرآن کے سوا اور کوئی کتاب نہیں تھی یا قرآن تھا یا اللہ کے رسول کا کلام تھا جو ان کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اسی نے ان کی اصلاح کی۔ زمانہ جاہلیت کو تبدیل کیا، اس میں انقلاب پیدا کیا۔ انقلاب پیدا کرنے والی یہی کتاب مبین تھی۔ جو قوم کہ دنیا کی تمام اقوام میں ذلیل سمجھی جاتی تھی؛ حقارت کی نگاہوں سے عربوں کو دیکھا جاتا تھا۔ وہ پچاس برس کے اندر اندر اتنی اونچی بن گئی کہ قیصر وکسریٰ کے تخت الٹ دیئے حکومتوں میں انقلاب پیدا کردیئے، دنیا میں جہالت کی بجائے علم کو فروغ دیا اور پھیلا دیا۔ یہ انقلاب ان کے اندر اس کتاب مبین ہی نے پیدا کیا۔ اس کے سوا کوئی اور کتاب نہیں تھی اسی کا علم اور اسی کا عمل تھا۔ جس نے انہیں اتنا آگے بڑھایا تو جو چیز ان کی اصلاح کا ذریعہ بنی وہی آج ہماری بھی اصلاح کا ذریعہ بنے گی۔

مرکزِ علوم...... میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ دوسرے علوم اور فنون کی تعلیم چھوڑ دیں۔

تمام علوم وفنون آپ حاصل کریں۔ آپ سائنس، فلسفہ، ہندسہ، ریاضی اور علوم طبعیہ وعقلیہ بھی حاصل کریں۔ لیکن ہر علم کا کوئی معیار اور مرکز بھی تو ہونا چاہئے جس کے اردگرد وہ علوم گھومیں۔ سارے علوم کا اگر مرکز آپ دین کو بنالیں گے کہ ہم اس کی ترویج وتبلیغ اور فروغ کے لئے یہ تمام چیزیں حاصل کررہے ہیں یہ سب چیزیں آپ کے حق میں دین بنتی چلی جائیں گی، دنیا ہی کارآمد نہیں ہوگی بلکہ دنیا کے ساتھ آخرت کا اجر وثواب بھی مرتب ہونا شروع ہوجائے گا۔ اگر دین اور کتاب وسنت کو مرکز بنایا جائے اور تمام علوم وفنون اس کے اردگرد گھمائے جائیں؛ جن کا مقصد یہ ہو کہ اس علم کو آگے بڑھانا ہے اس کے ذریعے سے لوگوں کی اصلاح کرنی ہے اور اس کے ذریعے سے لوگوں کو صالح بنانا ہے تو ہر علم وفن کام دے گا اور ہر علم وفن باعث اجر اور باعث اصلاح وتقویٰ بنے گا۔

تبریک...... بہرحال اس وقت یہ چند کلمات میں نے قرآن کریم کے متعلق اس لئے عرض کئے کہ دار القرآن میں یہ جلسہ ہورہا ہے تو وہ لوگ مبارک ہیں جنہوں نے دار القرآن قائم کرکے قرآن کے فروغ کا راستہ ڈالا۔

قرآن کے الفاظ کا اور اس کے لب ولہجے کے پہنچانے کا۔ اور یہی پھر آگے قرآنی علوم کو پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ تو وہ افراد یقیناً قابل مبارکباد ہیں جنہوں قرآن کی تبلیغ اور ترویج کے لئے ادارے قائم کرنے کی کوشش کی اور قائم کئے۔ اسی میں ہمارے لئے صلاح اور فلاح ہے۔ اس وقت یہ چند جملے اس ذیل میں ذہن میں آگئے تھے جو میں نے عرض کئے حق تعالیٰ ہمیں اور آپ کو قرآن کریم پر چلنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اَللّٰھُمَّ اَعِذْنَا مِنَ الْفِتَنِ مَاظَھَرَ مِنْھَا وَمَا

① شرح بلوغ المرام، ج: ۱ ص: ۲۹۸.

بَطَنَ. اَللّٰھُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ اِمَامًا لَّنَا وَاجْعَلْہُ حُجَّۃً لَّنَاوَارْزُقْنَاعَمَلَہٗ بِفَضْلِکَ الْعَظِیْمِ یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ، اَللّٰھُمَّ تَوَفَّنَامُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَابِالصَّالِحِیْنَ غَیْرَ خَزَایَاوَّلَامَفْتُوْنِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ. ①

① ۲، ربیع الاول، ۹ ۱۴۰ھ

خلافت تجوید

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:تَبَرَّكْ بِالْقُرْاٰنِ فَإِنَّهٗ كَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ أَوْكَمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ①

جوہرِ دنیا ...... بزرگانِ محترم! یہ دنیا دو چیزوں سے آباد ہے وہی دو چیزیں اس دنیا کا جوہر اور روح ہیں۔ ایک اللہ کا کام اور ایک اللہ کا کلام ایک طرف آپ کے سامنے یہ دنیا کھڑی ہوئی ہے، زمین کا فرش بچھا ہوا ہے، آسمان کا خیمہ اوپر تنا ہوا ہے، آسمان میں سورج اور چاند کے انڈے روشن ہیں۔ جن سے اس دنیا میں روشنی اور چمگاہٹ ہے۔ مختلف قسم کی جاندار اور بے جان مخلوق اس میں آباد ہے اور بس رہی ہے۔ یہ سب چیزیں اللہ کا کام ہیں، یہ اس کی صنعت و صناعی اور کاریگری ہے جو آپ کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ یہ سب چیزیں فی الحقیقت اللہ کے انعامات اور اس کے تبرکات ہیں۔ سورج اور چاند بھی اللہ کا ایک عطیہ اور تبرک ہے' زمین اور آسمان بھی اللہ کا ایک عطیہ اور تبرک ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئی۔ اللہ کے پیدا کئے ہوئے سے پیدا ہوئی ہے، لیکن خدا کے اندر سے نکل کر نہیں آئی اس نے ایک معدوم شے کو وجود دیا، تخلیق کی، پیدا کیا اور نمایاں فرمادیا تو اس کی ایجاد سے ہی یہ ساری چیزیں آپکے سامنے موجود ہیں۔

امتیازی عطیہ ...... لیکن وہ تبرک اور عطیہ جو اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے اس کے باطن سے نکل کر ظاہر ہوا اور آپ کے سامنے آیا وہ اللہ کا کلام ہے۔ تو یہ ساری چیزیں مخلوق کہلائیں گی۔ لیکن کلام مخلوق نہیں ہوسکتا۔ جب آپ کوئی چیز بناتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے یہ چیز بنائی، میں نے عمارت بنائی، چارپائی بنائی، برتن بنایا۔ لیکن جب کلام کرتے ہیں تو یوں نہیں کہا کرتے کہ میں نے اپنے کلام کو بنایا یا میں نے اپنے کلام کو پیدا کیا۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے کلام کیا۔ تو کلام متکلم کے اندر سے سرزد ہوتا ہے، صادر ہوتا ہے۔ بنایا نہیں جاتا۔ باہر کی چیز بنائی

① کنز العمال لعلی المتقی الھندی، ج: ۱، ص: ۳۲۶، رقم: ۲۳۶۴.

جاتی ہے۔جس کو وجود دیا جاتا ہے تو یہ زمین اور آسمان اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئے، اس کے پیدا کئے سے پیدا ہو گئے اور نمایاں ہو گئے۔لیکن کلام خداوندی خود اس کی ذات میں سے نکلا ہے اور نکل کر ہمارے سامنے آیا تو سب سے بڑا تبرک اور عطیہ جو بلا واسطہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا، وہ آج مسلمانوں کے ہاتھ میں موجود ہے۔

امتیاز مسلم......تو یہ ایک مسلمانوں کا امتیاز اور خوش قسمتی ہے کہ براہ راست عطیہ خداوندی اور تبرک الٰہی ان کے ہاتھ کے اندر موجود ہے۔اللہ کے اندر سے نکلا اور ان کے اندر داخل ہو گیا۔اسی واسطے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ اَوْ کَمَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ'' ''قرآن سے برکت حاصل کرو، اس لئے کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے''۔

کلام خداوندی یوں تو رات بھی ہے، انجیل اور زبور بھی ہے۔لیکن حقیقی معنی میں کلام وہ ہوتا ہے جس سے تکلم کیا جائے اور بولا جائے۔تورات سے حق تعالیٰ بولے نہیں بلکہ الواح لکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیج دیں۔ اسی طرح انجیل بھی کلام خداوندی ہے مگر اس کا تکلم واقع نہیں ہوا۔عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر اس کا الہام کر دیا گیا۔الفاظ منزل من اللہ نہیں ہیں۔مضمون حق تعالیٰ کا ہے۔عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مبارک الفاظ میں اسے پڑھ کر سنایا۔اسی طرح سے زبور کے ساتھ بھی تکلم واقع نہیں ہوا۔

امتیازی کتاب......قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ اللہ نے اس کا تکلم کیا، اسے پڑھ کر سنایا۔اسی واسطے قرآن کریم میں قرات کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی، تلاوت کی نسبت بھی اپنی طرف کی اور تکلم کی نسبت بھی اپنی طرف کی۔فرمایا گیا:﴿ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴾ ① ''جب ہم قرآن کریم کی قرات کریں تو اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! سنتے رہو اور اس کی پیروی کرو''

کہیں فرمایا:﴿نَتْلُوْا عَلَیْکَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ ﴾ اے پیغمبر! ہم آپ کے اوپر تلاوت کرتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اور فرعون کا قصہ۔بہر حال حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو تالی اور تلاوت کنندہ بھی کہا اور قاری بھی اپنے آپ کو کہا اور حافظ بھی اپنے آپ کو کہا۔فرمایا:﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ② ''اور ہم نے ہی یہ کلام اتارا ہے اور ہم ہی اس کے حافظ اور نگہبان ہیں''۔

تو حافظ بھی وہ ہیں، قاری بھی وہ ہیں اور تلاوت کرنے والے بھی وہ ہیں تو یہ خصوصیت قرآن کریم کی ہے کہ اس کی تلاوت بھی اللہ کی طرف سے واقع ہوئی، اس کا تکلم بھی ان کی طرف سے واقع ہوا، اس کی قرات بھی ان کی طرف سے واقع ہوئی۔

صوت سرمدی......کلام کے لئے بہر حال کچھ آواز کی ضرورت پڑتی ہے۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب

① پارہ: ۲۹، سورة القیامة، الآیة: ۱۸۔

② پارہ: ۱۴، سورة الحجر، الآیة: ۹۔

پوچھا گیا کہ: ”کَیۡفَ یَاتِیۡکَ الۡوَحۡیُ یَارَسُوۡلَ اللّٰہِ؟“ ① ”یارسول اللہ! آپ پر وحی کس طرح سے آتی ہے؟ کیا کیفیت ہوتی ہے؟“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”یَاتِیۡنِیۡ مِثۡلَ صَلۡصَلَةِ الۡجَرَسِ.“ ② میرے اوپر وحی اس طرح سے آتی ہے جیسے گھنٹہ بجا کر جب چھوڑ دیا جاتا ہے، تو اس میں ایک قسم کی گونج ہوتی ہے جو کئی منٹ تک اس کی آواز آتی رہتی ہے میں ایسی ایک گونج دار آواز سنتا ہوں۔

کہیں یہ فرمایا چکنے پتھر کے اوپر اگر ایک لوہے کی زنجیر ڈال کر اسے کھینچا جائے تو ایک مسلسل جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے، میں اس قسم کی آواز سنتا ہوں جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں کسی قسم کی صوت اور آواز کا بھی دخل ہے اگر چہ اس کی کیفیت ہم نہیں بیان کر سکتے۔ مگر بہر حال تکلم کے لئے صوت ہوتی ہے تو صوت سرمدی کے ساتھ قرآن کریم سنایا گیا۔

عظمتِ کلام...... جبرئیل علیہ السلام نے اولاً کلام کو سنا۔ حدیث میں ہے کہ جب حق تعالیٰ وحی فرماتے تو اس کی ہیبت اور عظمت سے تمام ملائکہ پر غشی طاری ہو جاتی ہے خود جبرئیل علیہ السلام پر بھی اس کی ہیبت وعظمت اور جلال سے غشی طاری ہوتی تھی۔ سب سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام افاقہ پاتے تھے، اس کے بعد دوسرے ہوش میں آتے تھے تو ملائکہ پوچھتے تھے ﴿مَاذَا قَالَ رَبُّکُمۡ﴾ ③ ”کیا فرمایا تمہارے پروردگار نے؟“ ﴿قَالُوا الۡحَقَّ وَهُوَ الۡعَلِیُّ الۡکَبِیۡرُ﴾ ④ کہتے ”حق فرمایا اور وہ ”علی وکبیر“ ہے“۔

خلافتِ تجوید وقرأت...... اس سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی کلام جبریل علیہ السلام سنتے تھے اس سماع کی ہیبت سے ہی غشی طاری ہوتی تھی تو تکلم کے ساتھ صورت اور آواز واقع ہوتی ہے، جب آواز عظیم اور ہیبت ناک ہوتی ہے تو اس کی ہیبت سے ضروری ہے کہ غشی طاری ہوتی ہے۔ اگر گرج زور سے ہو جائے تو یقیناً دل دہل جاتے ہیں اور بعض دفعہ آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے آدمی تو آدمی۔ آواز جب زوردار آتی ہے تو اس سے پہاڑ تک شق ہو جاتے ہیں، عمارتیں گر جاتی ہیں مکانات گر پڑتے ہیں۔ تو قرآن کریم کی آواز جب سنائی دیتی تھی تو ملائکہ جیسی طاقت ور مخلوق بھی ہیبت زدہ ہو کر بے ہوش ہو جاتی تھی۔

بہر حال قرآن کریم کی تلاوت واقع ہوئی اور تکلم واقع ہوا اور کوئی خاص قسم کی آواز بھی تھی جس سے تکلم ہوتا تھا۔ جس کو ملائکہ سنتے تھے اور بعض اوقات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سنا۔ تو قرآن کریم میں ایک طرف الفاظ ہیں، ایک طرف اس کے معنی ہیں اور ایک طرف اس کا تکلم اور لب ولہجہ ہے۔ الفاظ کی حفاظت حفاظ نے کی ہے۔ بجنسہ آج اس کا ایک ایک لفظ، اس کا ایک ایک اعراب اور ایک ایک نقطہ محفوظ ہے اور لکھا پڑھا موجود ہے۔ بعض قرآن کریم چھاپے گئے ہیں جن میں رکوعات کی تعداد اور سورتوں کی تعداد، حروف کی اور لفظوں کی تعداد اور زیر وزبر

① ② الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، ج: ۱، ص: ۴، رقم: ۲۔ ③ پارہ: ۲۲ سورة السبا، الآیة: ۲۳۔ ④ پارہ: ۲۲ سورة السبا، الآیة: ۲۳۔

کی تعداد تک لکھی گئی ہے۔اس کو حفاظ نے محفوظ کیا۔اس کے معانی کی علماء اور فقہاء نے حفاظت کی۔اس کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ قانونی حیثیت دی تھی،اس کو علماء نے سمجھا اس کے لب ولہجہ اور طرز ادا کی قراء اور مجودین نے حفاظت کی۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے سنا جبریل علیہ السلام سے سنا تو ایک خاص لب و لہجے سے سنا، پھر اسی لب و لہجے سے آپ نے تلاوت فرمایا اور اپنے صحابہ کو آپ نے سکھلایا۔اس میں سے بہت سے قراء اور مجودین ہیں ان مجودین نے سنا اور سن کر دوسروں کو سنایا اور سکھلایا۔تو قرآن کریم کی طرز ادا کی مجودین نے حفاظت کی۔اگر الفاظ میں حفاظ خلفاء خداوندی ہیں اور معانی میں اگر خلفاء الٰہی علماء ہیں تو اصوات اور طرز قرات میں خلفاء ربانی قراء اور مجودین ہیں جنہوں نے طرز ادا کی حفاظت کی۔اس کے رسم الخط کی حفاظت کی۔وہ اسی انداز میں آج بھی لکھا جاتا ہے جس انداز میں قرن اول میں لکھا گیا۔مثلاً آپ الرحمٰن لکھیں گے تو یہ لکھنا مکروہ اور ممنوع ہے کہ میم کے ساتھ الف ملا کر ''الرحمان'' لکھا جائے میم کے ساتھ نون ملا کر لکھیں گے اور میم پر کھڑا زبر دے دیں گے۔یہ اصل رسم الخط ہے۔تو اسی طرح پورے رسم الخط کی حفاظت کی گئی۔علماء رسم الخط نے اس کے قواعد منضبط کئے اور اس کو ایک فن کی صورت دی۔تو پورے ایک طبقے نے اس کی حفاظت کی۔

اس کی حکمتوں کی حفاظت حکماء اسلام نے کی۔اسکے اندر تاریخ کے جتنے جملے موجود ہیں،ان کی تفصیلات مؤرخین نے بیان کیں۔اس میں جتنے حقائق موجود ہیں،ان کو صوفیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے منضبط کیا۔تو قرآن کریم کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لئے مستقل ایک ایک طبقہ کھڑا ہو گیا۔الفاظ کے لئے حفاظ،معانی کے لئے علماء،رسم الخط کے لئے علماء رسم الخط،آواز اور طرز ادا کے لئے قراء اور مجودین،حکم اور مصالح کے لئے حکماء،حقائق کے لئے صوفیاء،اور علل و اسرار کے لئے فقہاء۔تو ایک ایک طبقے نے ایک ایک پہلو کی حفاظت کی اسی طرح سے قرآن کریم محفوظ ہوا۔﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① ''ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔

امتیازی حفاظت......تو حقیقی حفاظت تو حق تعالیٰ شانہٗ کی ہے۔لیکن اللہ کی جتنی صفات اور کمالات ہیں،وہ اس دنیا میں بذیل اسباب نمایاں ہوتے ہیں۔خالق بلاشبہ حق تعالیٰ ہیں لیکن تخلیق مرد و عورت کے ملنے سے واقع ہوتی ہے تو سبب تخلیق مرد و عورت ہیں اور خالق حق تعالیٰ ہیں۔ماں باپ کو خالق نہیں کہا جائے گا،سبب تخلیق کہا جائے گا۔رزاق بلاشبہ حق تعالیٰ ہیں لیکن رزق رسانی کا ذریعہ زمین کو بنایا،اس سے غلہ اگتا ہے۔کاشتکار اس میں محنت کرتا ہے تو کاشتکار ظاہر میں محنت کرتا ہے۔حقیقت میں کاشتکاری حق تعالیٰ فرماتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:﴿ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ ② ''تم زراعت کرتے ہو کہ ہم زراعت کرتے ہیں؟''۔

تم نے بیج ڈال دیا،اس بیج کی منوں مٹی کے نیچے حفاظت کرنا،اس میں سے کونپل نکالنا،کونپل میں مادے اور جوہر

① پارہ: ۱۴،سورۃ الحجر،الآیۃ: ۹۔ ② پارہ: ۲۷،سورۃ الواقعۃ،الآیۃ: ۶۴۔

رکھنا، پھراس کونپل میں دانہ پیدا کرنا، یہ کاشتکار کا کام ہے یا ہمارا کام ہے؟ تو محض دانہ ڈال دینا یہ کاشت نہیں ہے۔اس میں سے بنانا، بنا کر درخت نکالنا، درخت میں سے پھل نکالنا، اصل کاشتکاری یہ ہے تو فرماتے ہیں: ﴿ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ ① ''تم زارع اور کاشتکار ہو کہ ہم کاشتکار ہیں؟ ہم کھیتی کرتے ہیں کہ تم کرتے ہو؟''۔

اور فرمایا: ﴿ءَ اَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ﴾ ② تم خالق ہو کہ ہم خالق ہیں؟ تمہارا کام اتنا ہے کہ نر و مادہ مل گئے۔ رحم مادر میں کیا ہو رہا ہے؟ کس طرح سے مخلوق بنائی جا رہی ہے؟ کس ترتیب سے اسے ابھارا جا رہا ہے؟ یہ تو کرنے والا جانتا ہے۔ وہی کرتا ہے، خود اس ماں کو خبر نہیں جس کے پیٹ میں یہ ساری مشینری چل رہی ہے اور کارخانہ چل رہا ہے۔ تو اس اندھیری کوٹھڑی میں پانی کے اوپر نقاشی کرنا یہ اسی صانع حکیم کا کام ہے جس کی قدرت لامحدود ہے۔ اسی طرح سے کلام کو تکلم کرنا، فرمایا تم تکلم کرتے ہو، ظاہر میں تم ہو مگر حقیقت میں کلام ہمارا ہوتا ہے۔ حفاظت بظاہر تم کر رہے ہو مگر حقیقت میں ہماری حفاظت ہے۔ ظاہر میں تم قاری ہو مگر حقیقت میں ہم قاری ہیں جو قرآن کریم کی قرات کر رہے ہیں۔ تو حفاظت خداوندی بذیل اسباب نمایاں ہو رہی ہے۔

آج کے دور میں جب کہ قرآن کریم کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہے یعنی سو میں سے ایک دو کی ہے۔ مجموعی طور پر قوم متوجہ نہیں ہے جیسا کہ توجہ کا حق ہے قرآن کی تعلیم پر کوئی مادی وعدہ نہیں ہے کہ آپ نے اگر قرآن پڑھ لیا تو آپ کو کوئی بڑا عہدہ مل جائے گا یا قرآن پڑھ لیا تو چند لاکھ روپے آپ کو مل جائیں گے یا کوئی جاگیر آپ کو مل جائے گی؟ کوئی اس قسم کا وعدہ نہیں۔ اس کے باوجود یہ دارالعلوم کس طرح سے قائم ہیں؟ یہ حافظ خانے کس طرح سے قائم ہیں؟ ہزاروں آدمی کیوں چلے آ رہے ہیں؟ یہ محض قرآن کا معجزہ ہے کہ کوئی وعدہ نہیں اور دلوں پر دباؤ پڑ رہا ہے کہ آؤ پڑھو اور پڑھاؤ بظاہر اس میں کوئی دنیوی مفاد نہیں ہے پھر بھی آنے پر مجبور ہیں۔ یہ وہی حفاظت خداوندی ہے کہ دلوں میں ڈالا جا رہا ہے۔ وہ آ رہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں اور قرآن کی حفاظت ہو رہی ہے۔

پھر حفاظت بھی چھوٹے بچوں سے کرائی جا رہی ہے۔ عموماً قرآن کریم پڑھنے والے چھوٹے بچے ہی ہوتے ہیں۔ بڑے آدمی اگر پڑھتے تو یہ تہمت آ سکتی تھی کہ وہ حفاظت قرآن کی غرض سے پڑھ رہے ہیں اور ان کی طرف حفاظت منسوب ہوتی کہ اگر یہ عقلاء اور بڑے بوڑھے متوجہ نہ ہوتے تو قرآن محفوظ نہ ہو سکتا۔ تو وہ اگر حفاظت کرتے تو ان کے ارادے کی طرف نسبت ہوتی کہ انہوں نے کچھ سوچ سمجھ کر حفاظت کی ہے۔ لیکن بچوں سے حفاظت کرائی جا رہی ہے۔ جنہیں یہ بھی خبر نہیں کہ اس کے پڑھنے سے فائدہ کیا ہے؟ اور حفاظت ہو رہی ہے تاکہ اس کی حفاظت کی نسبت خالص اللہ کی طرف ہو کہ وہ حفاظت کرنے والے ہیں، بچے حفاظت کرنے والے نہیں ہیں۔ تو بڑوں کے ذریعے حفاظت ہوتی تو حفاظت کی نسبت ان کی طرف ہوتی جس سے تہمت آتی۔ اس لئے عادت اللہ یوں چلی کہ چھوٹے بچے پانچ پانچ، چھ چھ اور سات سات برس کے جن سینوں کے اندر قرآن کریم محفوظ

① پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۶۴۔ ② پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۵۹۔

ہے تا کہ یہ حفاظت براہ راست اللہ کی حفاظت سمجھی جائے، بہرحال فرمایا گیا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① ''ہم نے ہی یہ قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔ تو حقیقی حفاظت حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے ہو رہی ہے۔

حفاظت بطریق حفظ...... اور اس کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لئے ایک ایک مستقل طبقہ کھڑا ہو گیا جس نے حفاظت کی۔ تو یہ قراء اور مجودین بھی فی الحقیقت قرات کے اندر خلفاء خداوندی ہیں۔ ان کی سند بھی جا کر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پہنچتی ہے۔

اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ہر چیز استناد کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم ہے، حدیث ہے، فقہ ہے اصول فقہ ہے۔ سب چیزیں سند کے ساتھ ہیں۔ حدیث کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک ٹکڑے کی سند ہم سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ ایک ذرا سا جملہ آپ روایت کریں گے اس کی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے گی۔ محدثین نے حدیث کے راویوں میں سے چار لاکھ راویوں کی تاریخ مدون کر دی۔ ان کا کیریکٹر ان کا کردار، ان کا حافظہ، ان کا ضبط ان کی عدالت اور ان کے نام و نسب محفوظ کر دیئے کہ یہ راویان حدیث ہیں۔

اسی طرح سے قرآن کریم کی حفاظت سند کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہ جتنے قراء اور مجودین ہیں، ان کو سند دی جاتی ہے۔ مثلاً میں نے خود مولانا قاری عبدالوحید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن کریم پڑھا اور تجوید کے ساتھ پڑھا تو اس کی سند میرے پاس محفوظ ہے۔ تو مجھے قاری عبدالوحید صاحب نے پڑھایا۔ ان کو قاری عبدالرحمٰن صاحب الہ آبادی نے پڑھایا۔ ان کو قاری عبداللہ صاحب مکی نے پڑھایا، ان کو قاری ابراہیم رشید مصری نے پڑھایا اور پھر آگے ان کے استاد، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچ گئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اسکو بواسطہ جبرئیل حق تعالیٰ سے حاصل کیا اور جبرئیل کہتے ہیں کہ میں نے براہ راست حق تعالیٰ سے سنا۔ تو ایک قاری کی سند اللہ تک پہنچ جاتی ہے۔ تو جس طرح سے قرآن کریم کے الفاظ کی سند محفوظ ہے اسی طرح سے اس کے لب و لہجے کی سند بھی محفوظ ہے اس کے معانی اور علوم کی سند بھی محفوظ ہے اس کے کلام کے جتنے پہلو ہیں وہ سب سند کے ساتھ محفوظ ہیں، ایک ایک نقطہ تک اس کا حفاظت کیا گیا ہے۔ تو فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ② ''ہم نے اس کو نازل کیا، اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔ تو حفاظت کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ زبان سے پڑھا جائے یا لکھا جائے تو حق تعالیٰ کی طرف سے تکلم بھی واقع ہوا اور لکھا بھی گیا۔

حفاظت بطریق کتابت...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم سب سے پہلے لوح محفوظ کے اوپر لکھا گیا ہے۔ جیسا کاتب ہے ویسی ہی اس کی کتابت ہے۔ ویسے ہی اس کے حروف ہیں۔ بعض سیر کی روایتوں میں ہے کہ لوح محفوظ میں قرآن کریم لکھا گیا اور اس کا ایک ایک حرف کوہ قاف کے برابر ہے۔ تو جیسا اس کا لکھنے والا

① ② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹.

ہے ویسے ہی اس کے حروف ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے لوحِ محفوظ کو دیکھ کر قرآن حفظ کیا۔ پھر اسی قرآن کو حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا گیا یہ گویا ان پر انعام کیا گیا۔ تو اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر اور لوحِ محفوظ میں بھی درج ہے اور جبریل علیہ السلام کے قلب میں درج کیا گیا۔ اس کے بعد میں پھر بیت العزت میں قرآن اتارا گیا۔ یہ آسمان اول کے اوپر یعنی آسمان دنیا میں ایک مقام ہے۔ پورا قرآن آسمان دنیا کے اوپر بیت العزت میں اتار دیا گیا۔ اور وہاں سے پھر تیئس برس میں رفتہ رفتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر نازل ہوا۔ ایک ایک آیت، دو دو آیت حسب موقع حسب واقعہ اترتی گئی۔ تو گویا اللہ سے چلا لوحِ محفوظ تک آیا پھر جبرئیل تک آیا، پھر بیت العزت میں آیا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔

حفاظت بطریق تواتر...... اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو پڑھایا، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے تابعین کو پڑھایا۔ تو قرآن کریم میں تواتر بھی طبقہ کا ہے۔ ایک تو ضابطے کا تواتر ہوتا ہے حدیث متواتر اس کو کہتے ہیں جس میں کم سے کم تین تین آدمی روایت کرتے چلے آرہے ہوں اور اخیر تک تین کا عدد محفوظ رہے۔ بہرحال تین ہو یا تین سے زیادہ۔ یہ اعلیٰ ترین تواتر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں تین تین کا نہیں بلکہ ہزاروں ہزار کا ہے۔ ہر قرن میں ہزاروں لاکھوں حافظ رہے۔ ہر قرن کے اندر ایک طبقے نے دوسرے طبقے سے سنا، دوسرے نے تیسرے سے سنا۔ اس طرح سے سند چلی۔

محیط بالدیانت کتاب...... تو مروی عنہ جس سے روایت کی گی وہ حق تعالیٰ شانہ ہیں، راوی اول وہ جبریل علیہ السلام ہیں۔ پھر حفاظت کے ساتھ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اس کو اتارا گیا۔ جس کو ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ○عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ﴾ ① ”یہ اللہ رب العزت کا نازل کردہ ہے۔ اس کو لے کر روح الامین نازل ہوئے اور قلب محمدی کے اوپر لے کر آئے“۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی صفت اس کے اسماء میں سے امین ہے کہ وہ امانت والا ہے۔ حضرت جبریل کی صفت روح الامین، وہ خود امانت والے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت محمد الامین۔ ہے کہ امانت والے۔ اور یہ امانت کا لفظ وہ تھا جس کو اپنوں نے ہی نہیں بلکہ غیروں نے بھی تسلیم کیا۔ نبوت سے پہلے تمام کفار مکہ آپ کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم آتے تو کہتے: ”جَآءَ مُحَمَّدُ ‌نِ الْاَمِیْنُ“ ② ”امانت والا آ گیا“۔

تو کلام امین سے چلا، امین کے قلب پر اترا۔ تو امانت کے ساتھ اوپر سے نیچے تک پہنچ گیا۔ سند میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ راوی اور مروی عنہ پوری عدالت لئے ہوئے ہوں، پورا ضبط لئے ہوئے ہوں پوری امانت داری کے ساتھ پہنچائیں۔ تو اللہ سے بڑھ کر امانت والا کون ہو سکتا ہے اور جبرئیل علیہ السلام سے بڑھ کر امین کون ہو سکتا ہے؟ اور خاتم الانبیاء سے بڑھ کر انسانوں میں امانت والا کون ہو سکتا ہے؟ تو تین امینوں کے اندر یہ کلام رہا پھر سند کا سلسلہ چلا۔

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۹۲ تا ۱۹۴۔ ② المستدرک للحاکم، کتاب المناسک، ج: ۴ ص: ۲۲۸۔

سند قرآن پر از روئے قرآن بحث......اسی واسطے ایک جگہ قرآن کریم میں اس کی سند بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ محدثین کوئی حدیث بیان کریں تو راویوں کے اوپر نقد تبصرہ کرتے ہیں کہ اس کے راوی کیسے ہیں پہنچانے والے کیسے ہیں جس درجہ کا راوی ہوگا اسی درجے کی روایت ہوگی۔ تو ایک سورۃ میں مستقل طور پر قرآن کریم کی سند پر بحث کی گئی ہے۔ فرمایا گیا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ o ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ o مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ﴾ ①

گویا راوی اول جبریل علیہ السلام ہیں۔ اس لئے ان کا وصف بیان کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا گیا ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ ② ''یہ کہا ہوا ہے ایک رسول کا جو کریم ہے''۔ تو لفظ ''رسول'' سے تعبیر کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ رسول کس کے ہیں؟ اللہ ہی کے رسول ہیں اللہ تعبیر فرما رہے ہیں۔ ہر شخص اپنا رسول اور قاصد اسے بناتا ہے جس پر پورا اطمینان ہوا۔ اگر ذرا بھی بے اعتمادی ہوا سے قاصد نہیں بنایا جا سکتا۔ معمولی معمولی باتوں پر اسے قاصد بناتے ہیں جس پر پورا اطمینان ہو، وہ دوستوں میں شمار ہوتا ہو، دشمن اور بدخواہ نہ ہو۔ سچا ہو، امانت دار ہو۔ تو اول تو لفظ رسول سے حضرت جبریل کی تعریف کی گئی کہ وہ ہمارے رسول ہیں۔ رسالت خود ایک بزرگی اور برگزیدگی کی چیز ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ رسول بھی کیسے ہیں؟ کریم ہیں۔

جن کے اخلاق میں کرم داخل ہے۔ ان کی عادت میں کرم داخل ہے۔ تو رسول بھی ہیں اور کریم بھی ہیں۔ کریم النفس ان کا جوہر ہے تو دو لفظ فرمائے گئے ایک رسول اور ایک کریم جس سے گویا جبریل علیہ السلام کی شان واضح کی گئی۔

لیکن یہ سوال ہو سکتا تھا کہ ایک شخص رسول بھی ہے، کریم بھی ہے، نیک نفس ہے۔ بلکہ نیک نیت ہے۔ مگر اتنا کمزور ہے کہ اگر کلام لے کر آئے تو کسی نے دباؤ ڈالا، تو ممکن ہے کہ دباؤ میں بات بدل ڈالے، دباؤ میں آ کر مرعوب ہو جائے۔ تو نیک نیت بھی ہے، امانت دار بھی ہے مگر دل کا کمزور ہے۔ سچی بات کہنے لگا تھا مگر دوسرے نے تلوار دکھلائی کہ یہ کیا کہتا ہے؟ دباؤ میں آ کر اس نے کچھ کا کچھ کہہ دیا۔ تو بعض دفعہ ایک شخص نیک نیت ہے، کریم النفس بھی ہے۔ مگر بے حد کمزور ہے۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید دب کر کلام میں تبدیلی کر دے۔ اس لئے ایک جملہ اور فرمایا:

﴿ذِیْ قُوَّةٍ﴾ ③ رسول بھی ہے، کریم بھی ہے، طاقت ور ہے، کمزور اور ضعیف نہیں ہے کہ کوئی اس پر دباؤ ڈال کر کچھ کا کچھ کہلوائے بہرحال تین باتیں ہوئیں کہ جبریل میں رسالت بھی ہے، کرامت بھی ہے اور قوت بھی ہے جبریل ایسے نہیں ہیں کہ کسی کے دباؤ میں آ کر کچھ کا کچھ کہہ دیں۔ سنجیدگی سے کہیں گے، امانت سے کہیں گے اور جو پیغام دیا گیا ہے وہی پہنچائیں گے۔ لیکن پھر بھی ایک احتمال ہو سکتا تھا کہ ایک شخص نیک نیت بھی ہے، کریم النفس بھی اور باقوت بھی ہے۔ لیکن اس نے دور سے کلام کو سنا اور کچھ کا کچھ سن لیا۔ جب روایت کی تو پوری طرح وہ روایت نہ کر سکا جو اصل متکلم کا کلام تھا۔ اس نے میل دو میل، فرلانگ دو فرلانگ سے سنا۔ آواز آ رہی تھی مگر دور کی

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹، ۲۱۔ ② پارہ: ۳۰ سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹۔
③ پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۰۔

آواز تو دور کی ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے۔ کہ غلط فہمی ہوجائے آواز پوری طرح کان میں نہ پڑے۔ یہ ایک احتمال ہوسکتا تھا اس واسطے ایک جملہ اور بڑھایا ﴿عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ﴾ ① جبریل عرش والے کے پاس ہی رہتے ہیں کہیں دوری اور بعد نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دور بیٹھ کر کچھ کا کچھ سن لیں۔ تو قرب بھی انتہائی ہے کہ ان کا مکان اور جگہ اور رتبہ بھی عرش والے کے پاس ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: جبریل علیہ السلام کا مقام سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ اور یہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے سدرۃ کے آگے پھر جنتوں کے علاقے شروع ہوتے ہیں۔ پھر اس کے اوپر سمندر ہے جس کے اوپر عرش عظیم واقع ہے۔ بہر حال کائنات کا دائرہ جس کو مکلف کہا جاتا ہے وہ آسمانوں کے نیچے نیچے ہے تو آسمان کے اوپر جا کر حضرت جبریل کا مقام ہے۔ اب پرواز اگر ہوتی ہوگی تو کہیں اوپر ہی ہوگی۔ نیچے بھی آتے ہیں اوپر بھی جاتے ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا کہ: ﴿عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ﴾ ② ''عرش والے ہی کے پاس مقیم ہیں''۔

لہٰذا دوری اور بعد کا کوئی سوال نہیں۔ تو ایک راوی کی یہ شان نکلی کہ اس میں رسالت بھی ہے، کرامت بھی ہے، قوت بھی ہے اور قرب خداوندی بھی ہے۔ بُعد کا کوئی احتمال نہیں ہے۔

مگر پھر بھی ایک احتمال ہوسکتا تھا کہ ایک شخص رسول ہے، کریم ہے، طاقت ور ہے، اللہ کا مقرب بھی ہے۔ لیکن اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یعنی اس کا منصب کوئی نہیں۔ منصب والا جب بولتا ہے، اس کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ ایک بڑے سے بڑا آدمی ہو طاقت ور بھی ہو مگر اس کے پاس کوئی عہدہ نہ ہو، کوئی ضابطے کی بڑائی اس کے پاس نہ ہو، تو اس کے کلام کو توجہ سے نہیں سنا جائے گا۔ اگر میں ایک جملہ بولوں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر کسی ملک کا سربراہ وہی جملہ بولے، تو سیاست کی بساط الٹتی چلی جاتی ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ملکوں میں اس سے انقلابات واقع ہوجاتے ہیں۔ اس لئے کہ ایک صاحب منصب نے کلام کیا۔ تو آدمی نیک بھی ہے، بزرگ بھی ہے، مقرب خداوندی بھی ہے، حقانی بھی ہے۔ مگر منصب دار اور عہدہ دار نہیں، کوئی منصبی رتبہ نہیں ہے، تو اس کا کلام زیادہ قابل توجہ نہیں ہوتا۔ تو جبریل علیہ السلام کے متعلق ممکن تھا کہ کوئی یہ کہتا کہ بڑے درویش ہیں، بڑے اعلیٰ درجہ کے مقرب ہیں، عرش کے قریب رہتے ہیں، نیک بھی اور بزرگ بھی ہیں، کامل امانت دار ہیں مگر عہدہ وغیرہ تو ہے نہیں۔ اس لئے ان کی ذمہ دارانہ شان نہیں ہے کہ ان کے کلام کو توجہ سے سنا جائے اس لئے حق تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھایا۔

﴿مُطَاعٍ﴾ ③ سارے ملائکہ کے سردار بھی ہیں اور واجب الاطاعت ہیں، سارے فرشتے ان کے آگے جھکے ہوئے ہیں، آسمانوں میں ان کی حکومت ہے، سید الملائکہ ہیں تو ظاہر بات ہے جب متکلم، قاصد اور بولنے والا نجی ذات سے بزرگ ہو، صاحب امانت ہو، باہر سے اس کو رسالت ملی ہوئی ہو اور اوپر سے اتنا بڑا عہدہ دار کہ ساتوں آسمانوں میں اس کی حکمرانی بھی ہو۔ اس کی ذمہ داری اور اس کا منصب بھی ہو، تو اتنی بڑی شخصیت جب

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹۔ ③ پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۱۔

پیام پہنچائے گی تو اس میں کوئی غل وفصل کا خطرہ نہیں ہوسکتا۔ کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا، اس کے بعد پھر فرمایا:

﴿ثَمَّ اَمِیۡنٍ﴾ ① ان سارے اوصاف کے اوپر یہ ہے کہ وہ امانت دار ہیں اور اس کی شہادت کون دے رہا ہے؟ اللہ میاں شہادت دے رہے ہیں۔ یہ جبریل کو کون کہہ رہا ہے کہ وہ بزرگ بھی ہیں، مطاع بھی ہیں۔ صاحب قرآن کہہ رہے ہیں۔ تو حق تعالیٰ ان کی صفت فرما رہے ہیں۔

عظیم شہادت...... اگر کسی بڑے آدمی کی بڑائی کوئی چھوٹا آدمی بیان کرنے لگے تو وہ بڑائی نہیں سمجھی جاتی یوں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تعریف خود کرنا چاہتا ہے ؎

مادحِ خورشید مداحِ خود است

اگر سورج کی کوئی تعریف کرنے لگے تو یہ کہا جائے گا کہ اسے اپنی تعریف منظور ہے، سورج محتاج تعارف نہیں ہے۔ تو کسی بڑے آدمی کا تعارف اگر چھوٹا کرائے، وہ درحقیقت اپنا تعارف کرا رہا ہے۔ بڑا تو خود ہی متعارف ہے۔ لیکن اگر بڑا تعارف کرائے یہ فی الحقیقت ایک عظیم شہادت ہے۔ تو جبریل علیہ السلام کا مثلاً میں تعارف کرانے لگوں۔ تو یہ کہا جائے گا کہ میں اپنے تعارف اور اپنی عزت کا خواہاں ہوں کہ ایک بڑے آدمی کا نام لے رہا ہوں ایک بڑی شخصیت کا نام لے رہا ہوں۔ جبریل علیہ السلام کا تعارف وہ کرائے جو خود جبریل کا خالق ہے جو جبریل کا معبود ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جبریل رسول بھی ہیں، کریم بھی ہیں۔ ذی قوت بھی ہیں، امانت دار بھی ہیں، مقرب بارگاہ بھی ہیں، عہدے دار بھی ہیں یعنی سید الملائکہ بھی ہیں۔ ان کو ہم نے قاصد اور پیغمبر بنا کر بھیجا۔ تو بھیجنے والے حق تعالیٰ جن کا علم لامحدود ہے۔ ان کے علم کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ جن کو بھیجا گیا وہ صاحب امانت ہیں اور جن کے پاس بھیجا گیا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کو نبوت کا عہدہ دیا گیا کہ عالم بشریت میں اس سے بڑا کوئی با کمال نہیں۔

عظمت سند...... اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فقط نبی ہی نہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں۔ خاتم کے معنی یہ ہیں کہ جو نبوت کے درجات کا منتہی ہو۔ یعنی نبوت کے سارے مراتب ان کے اوپر آ کر ختم ہو جائیں۔ کوئی ایسا درجہ باقی نہ رہے کہ کسی اور شخصیت کی ضرورت پڑے کہ وہ اس درجے کو لے کر سامنے آئے۔ تو خاتم النبیین کا یہ مطلب ہے کہ نبوت کے کمالات کے جتنے درجات اور جتنے مراتب ہیں وہ اس ذات میں ہیں وہ اس ذات اقدس پر ختم ہو گئے۔

نبوت کی بنیاد دو ہی چیزوں کے اوپر ہے۔ ایک کمالات علمی اور ایک کمالات اخلاق، جن سے عمل کا سلسلہ چلتا ہے۔ تو علم کے بارے میں تو فرمایا گیا: ''اُوۡتِیۡتُ عِلۡمَ الۡاَوَّلِیۡنَ وَالۡاٰخِرِیۡنَ'' ''اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم آپ کو عطاء کئے گئے''۔

اور اخلاق کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ﴾ ② ''تو اخلاق بھی خلق عظیم''۔ اور

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۱. ② پارہ: ۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ: ۴.

آپ کا علم اتنا جامع کہ اولین وآخرین کا تمام علم آپ کو دے دیا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ جو ذات بابرکات علم میں بھی ساری مخلوق سے اکمل ہو، اخلاق میں بھی ساری مخلوق سے اکمل ہو۔ تو اس کی نبوت بھی انبیاء علیہم السلام میں سے سب سے زیادہ مکمل ہوگی۔ اس لئے آپ فقط نبی ہی نہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں۔ یعنی آپ کی ذات بابرکات پر نبوت کے مراتب ختم کر دیئے گئے۔

تو ایسی ذات کے اوپر قرآن نازل ہو جو کمالات بشریہ میں سب سے زیادہ اکمل ہو۔ اور ایسی ذات قرآن کو لے کر آئے جس کی حق تعالیٰ تعریف فرمائیں کہ ایک راوی میں جتنے اوصاف ہوسکتے ہیں وہ سب ان میں موجود ہوں اور قرآن کریم کو بھیجنے والی ذات حق تعالیٰ کی ہو جو سارے کمالات کا مصدر اور سرچشمہ ہے۔ تو اوپر سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک قرآن کریم کی سند اتنی مکمل ہے کہ اس میں کسی نقد وتبصرہ کی گنجائش نہیں۔

تواتر طبقہ...... اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو قرآن پڑھایا تو صحابہؓ نے طبقے کے طور پر اس کو لیا۔ یعنی اِکے دُکے نے حفظ نہیں کیا۔ بلکہ جماعتوں کی جماعتیں اور طبقات کے طبقات حافظ قرآن ہوئے۔ انہوں نے پھر بعد والے طبقات کو حافظ بنایا اور طبقہ در طبقہ حافظ بنتے چلے گئے۔ اسی طرح آج تک تواتر طبقہ کے ساتھ یہ قرآن کریم چلا آ رہا ہے کہ ایک ایک اور دو دو یا بیس بیس اور چالیس چالیس نہیں سو سو اور پچاس پچاس نہیں بلکہ ہزاروں ہزار حفاظ ہر قرن میں موجود رہے۔ اوپر کے قرن سے لیتے رہے اور نیچے کے قرن کو دیتے رہے۔ تو جو کلام خداوندی اس حفاظت کے ساتھ آئے اور قیامت تک چلتا رہے اس میں کسی دَغل وفصل یا تحریف کی گنجائش نہیں۔ اگر کوئی تحریف کرنے والا تحریف کرے گا۔ چونکہ حفاظت کے سامان کافی ہیں اس لئے اس کی تحریف کھل جائے گی چنانچہ بہت سے محرفین پیدا ہوئے جنہوں نے معنی کے لحاظ سے بھی تحریف کرنا چاہی لیکن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا گیا۔

ہمہ گیر ابدی حفاظت...... حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر صدی پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَّنْ یُّجَدِّدُ لَھَادِیْنَھَا'' ① ہر صدی کے اوپر اللہ مجدد بھیجے گا۔ مجدد کے لئے کوئی شخص واحد ہونا ضروری نہیں۔ جماعتیں بھی مجدد بن کر آئی ہیں افراد بھی مجدد بن کر آئے ہیں۔ دین کے جس گوشے میں لوگوں نے خلط واقع کیا اور تنقیص واقع کیا۔ انہوں نے آ کر اسی کو کھول دیا۔

تو ہر صدی پر مجددوں کا وعدہ دیا ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''کَیْفَ تَھْلِکُ اُمَّۃٌ اَنَا اَوَّلُھَا وَالْمَسِیْحُ آخِرُھَا وَالْمَھْدِیُّ وَسَطُھَا۔'' ② وہ امت کیسے ہلاک ہو جائے گی جس کی ابتداء میں میں ہوں اور اخیر میں مسیح ہیں اور بیچ میں مہدی ہیں۔ تو اول وآخر کی بھی حفاظت بتلائی گئی ہر صدی کی حفاظت بتلائی گئی۔

① السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی قرن المائۃ ج: ۱۱ ص: ۳۶۲۔

② مشکاۃ المصابیح، کتاب المناقب، باب ثواب ھذہ الامۃ، ج: ۳، ص: ۱۷۱، رقم: ۶۲۷۸۔

پھر ہر صدی کے اندر اندر وعدہ دیا گیا: ''یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ یَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَتَاْوِیْلَ الْجَاهِلِیْنَ.'' ① ہر قرن اور زمانے کے اندر اس علم کو اٹھاتے رہیں گے، اسلاف میں سے اخلاف رشید، نیک خلف، نیک سلف سے لیتے رہیں گے۔ اس علم کو امانت داری کے ساتھ سلف سے خلف قبول کرتے رہیں گے غلو کرنے والے کے غلو کو توڑ دیں گے۔ غلو کرنے والے جو تحریفیں کریں گے اور معانی کے اندر جو تحریف واقع کر دیں گے اس کو مٹائیں گے اور دورغ بافیوں اور جاہلانہ تاویلات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے۔ بہر حال اس امت میں وعدہ دیا گیا کہ قیامت تک ایک طبقہ حقانی ضرور باقی رہے گا جو بجنسہٖ قرآن کو مع اس کے لفظ و بیان اور مع اس کی شرح کے دیتا رہے گا تو سلف سے خلف تک پہنچتا رہے گا۔

جہاں یہ کہا گیا کہ امت میں فرقے ہوں گے اور اختلافات رونما ہوں گے وہاں یہ بھی وعدہ دے دیا گیا کہ قیامت تک ایک فرقہ ضرور حق کے اوپر رہے گا اور اپنے ذوق، وجدان اور دلائل سے لوگ سمجھتے رہیں گے کہ یہ فرقہ حقانی ہے۔ اس کے افعال واعمال اور اس کی علامات بتلاتی رہیں گی کہ یہ حقانی ہے اور لوگ اس کی طرف رجوع کرتے رہیں گے۔ غرض ایک طبقہ ہمیشہ باقی رہے گا جو صحیح مزاج کے ساتھ دین کو باقی رکھے گا اور صحیح ذوق کے ساتھ اس کو قائم رکھے گا۔ ''لَا یَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ.'' ② نہ ان کو رسوا کرنے والا رسوا کر سکے گا نہ ذلیل کرنے والا ذلیل کر سکے گا۔ وہ ایک ہی چیز کہتے رہیں گے کہ: ''مَا اَنَا عَلَیْهِ الْیَوْمَ وَاَصْحَابِیْ'' ③ جن کے اوپر آج کے دن میں (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) اور میرے صحابہؓ ہیں۔

اسی کے مطابق لفظ اور معنی اور حقائق و کیفیات دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔ بہر حال یہ وعدہ دیا گیا اور جہاں اختلافات کی خبر دی گئی وہیں ساتھ اس فرقہ حقانی کی بھی خبر دی گئی۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ دین خاتم النبیین کا دین ہے۔ قیامت تک باقی رہے گا کیونکہ درجات نبوت آپ کی ذات بابرکات پر ختم کر دیئے گئے۔ اب کوئی درجہ باقی نہیں رہا کہ کسی شخصیت کو لا کر اسے پورا کیا جائے۔

بہر حال قرآن کریم کی حفاظت خداوندی کے سلسلہ میں مجددین کے وعدے الگ ہیں۔ ائمہ ہدایت کے وعدے الگ ہیں، خلفاء کے وعدے الگ ہیں اور خلف عدول کے وعدے الگ ہیں، صلحاء کے وعدے الگ ہیں کہ یہ برابر بھیجے جاتے رہیں گے اور دین کی حقانیت قائم رہے گی۔ تو یہ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ④ میں بتلایا گیا کہ جہاں قرآن کریم کے الفاظ محفوظ کئے گئے اور جہاں اس کا رسم الخط محفوظ کیا گیا، وہیں اس کے

---

① السنن الکبریٰ للبیهقی ج:۱۰ ص:۲۰۹، مجمع الزوائد ج:۱ ص:۱۴. ② الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب سوال المشرکین ان یریهم...... ج:۱۱، ص:۴۷۲، رقم:۳۳۶۹. ③ السنن للامام الترمذی، ابواب الایمان، باب ماجاء فی افتراق هذه الامة، ج:۹، ص:۲۳۵، رقم:۲۵۶۵. ④ پارہ:۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ:۹.

علوم اور معانی بھی محفوظ کئے گئے، وہیں اس کے احکام بھی محفوظ کئے گئے۔ تو اول سے لے کر اخیر تک اور ظاہر سے لے کر باطن تک قرآن کریم کا ایک ایک پہلو محفوظ ہے اور محفوظ چلا جائے گا۔

بہر حال یہ بات میں نے اس پر عرض کی کہ یہ دار القرآن قائم کیا گیا، بہر حال یہ بھی ایک خلافت خداوندی ہے۔ یہ الفاظ اور لب و لہجے کی خلافت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چلی ہے۔ قراء اور مجودین نے اسی لب و لہجے کے حفاظت کی کوشش کی ہے۔ نوعیت ایک رہتی ہے گو شخصی طور پر کچھ نہ کچھ فرق واقع ہوتا ہے۔

تغنی بالقرآن...... اس واسطے قرآن کریم کے بارے میں فرمایا گیا کہ: مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ فَلَیْسَ مِنَّا" ② ''جو قرآن کریم کے ساتھ تغنی نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

مگر تَغَنِّیْ کے معنی یہاں موسیقی کے نہیں ہیں۔ گانے بجانے کے طرز پر پڑھنے کے متعلق دھمکی دی گئی ہے۔ اگر کوئی قرآن کو مزامیر کی صورت سے پڑھے تو اسے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے تو قرآن کا غنا الگ ہے، گانے بجانے کا غنا الگ ہے۔ قرآن کریم کی تغنی کی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ اتنے درد آمیز لہجے کے ساتھ پڑھے کہ قرآن کی کیفیات ایک قلب سے دوسرے قلب میں پہنچنے لگیں۔ تو وہ ایک خاص درد، ایک خاص لب ولہجہ ہے، قراء اور مجودین وہی اختیار کرتے ہیں۔

چنانچہ جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی سینکڑوں قسم کی موسیقیاں ہیں۔ ہر ملک کی موسیقی الگ ہے لیکن قرآن کا غناوہ ہے کہ کسی موسیقی پہ منطبق نہیں اور کسی موسیقی میں وہ تاثیر نہیں جو اس میں تاثیر ہے اگر صحیح معنی میں کوئی پڑھنے والا موجود ہو اس سے دل کھنچتے ہیں۔ تو فرمایا گیا ''مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ فَلَیْسَ مِنَّا.''

کہیں فرمایا گیا ''زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ یَزِیْدُ الْقُرْاٰنَ حُسْنًا. '' ① قرآن کریم کو خوش آوازی کے ساتھ پڑھو۔ اس سے قرآن کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ تو خوش آوازی میں اوپر والوں کی تقلید کرنی پڑے گی کہ جس انداز کی خوش آوازی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے چلی آرہی ہے اور تابعین سے چلی آرہی ہے اور سلسلہ بسلسلہ پہنچی ہے۔ اسی کے ساتھ تغنی کرو۔ اسی کے ساتھ حسن صورت اختیار کرو۔ تو قرآن کریم کی آواز اور لب ولہجہ اور طرز ادا تک محفوظ کیا گیا۔

تبریک...... اور وہ قراء و مجودین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے یہ خلافت خداوندی سنبھالی۔ تو ایک خلافت علمی ہے، ایک خلافت اخلاقی ہے، ایک خلافت عملی ہے اور یہ خلافت صوتی ہے کہ آواز کے لحاظ سے بھی دنیا میں اللہ کے خلیفہ موجود ہیں کہ اس کے کلام کو اسی کے انداز سے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس واسطے مبارک باد کے مستحق ہیں

---

① الصحيح للبخاری، کتاب التوحید، باب قوله تعالىٰ واسروا قولكم او جهروا به، ج: ۲، ص: ۵۵، رقم: ۲۹۷۳.

② الحديث اخرجه الدارمی ولفظه: حسنوا القرآن...... كتاب فضائل القرآن، باب التغنی بالقرآن، ج: ۱۰، ص: ۴۱۰، رقم: ۳۵۶۵.

اور دارالقرآن بھی مبارکباد کا مستحق ہے جس نے قراء اور مجودین بنانے کا ایک راستہ پیدا کیا۔ اس فن شریف کو پھیلانے کا ارادہ کیا۔ بہرحال یہ اس کی برکات میں سے ایک برکت ہے کہ آپ حضرات یہاں جمع ہیں اور قرآن سننے کے لئے جمع ہوئے۔ قراء اور مجودین کی محفل منعقد ہوئی۔ کلام خداوندی پڑھا گیا۔ تو حقیقت میں یہ کلام اللہ کا ہے۔

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں جب کفار کے اوپر کنکریاں پھینکی تھیں تو آپ کے بارے میں فرمایا گیا تھا ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ ② اے نبی! جب آپ کنکریاں پھینک رہے تھے وہ آپ نہیں پھینک رہے تھے۔ وہ تو ہم پھینک رہے تھے۔ یعنی اعضاء آپ کے تھے ہمارے کمالات کا ظہور ہو رہا تھا اور مظہر آپ بنے ہوئے تھے۔ تو زبانیں ہماری ہیں، کلام خدا کا ہے اور انسان مظہر بنا ہوا ہے۔ اس واسطے یہ ادارہ مستحق مبارکباد ہے جس نے قراء اور مجودین جمع بھی کئے اور آئندہ پیدا کرنے کا سلسلہ بھی ڈالا۔ حق تعالیٰ شانہٗ کامیاب فرمائے اور اس ادارے سے بہت سے مجودین پیدا ہوں اور قرآن کریم کے پڑھنے کی اور اس فن تجوید کی اشاعت ہو اور لوگوں کے دلوں میں یہ گھر کرے اور پھر لوگ مائل ہوں اور اس کے علم و عمل کی طرف متوجہ ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَعَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَاَخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ. بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ ①

① پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۱۰. ② حررہ: ۲۴، ربیع الاول، ۹ ۱۴۰ھ

نجومِ ہدایت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ (اَوْكَمَاقَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ) ①

مقامِ صحابیت...... آفتابِ نبوت کی تاثیر وتربیت اور تعلیم وتمرین سے امت کے استفادہ اور منور ہونے کے متفاوت درجات ومراتب کھل جاتے ہیں جن کا معیار آفتاب سے قرب اور بعد ہے یعنی جو اس سے قریب تر ہے وہ اتنا ہی نورانی تر اور متاثر تر ہے اور جتنا آفتاب سے دور ہے اتنا ہی اس کے فیض سے کم مستفید ہے۔

مثلاً طلوعِ آفتاب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ اور سب سے پہلے آفتاب کے آثار سے متاثر ہوتی ہے وہ فضا ہے۔ وہ چونکہ خلقۃً اپنی ذات سے شفاف ہے اور ادھر آفتاب کے سامنے بلاواسطہ حاضر ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ وہ اس کے نور وحرارت کا اثر لیتی ہے۔ وہ اس درجہ منور ہوتی ہے کہ باوجود اس کے چمک اٹھنے کے خود اس کی چمک آنکھوں کو نظر نہیں آتی بلکہ آفتاب ہی کی دھوپ اور شعاعیں نظر پڑتی ہیں۔ اگر فضا میں نگاہ اٹھائی جائے تو فضا کا جو حصہ بھی سامنے آئے گا اس میں آفتاب ہی دکھائی دے گا۔ خود فضا کی ہستی نظر نہ پڑے گی۔ گویا وہ اس کے نور میں اس درجہ مستغرق اور فنا ہو جاتی ہے کہ اس کا اپنا تنور کسی کی آنکھ میں نہیں آتا بلکہ آفتاب اس میں سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ گویا بلاواسطہ دکھائی دے رہا ہے۔ حالانکہ فضا اپنی بے حد وسعت کے ساتھ بیچ میں حائل ہے۔

ٹھیک یہی صورت روحانی آفتاب سے استفادہ کی بھی ہے کہ اس کے عالمگیر آثار سے متاثر تو سب ہوتے ہیں مگر سب سے زیادہ متاثر وہ طبقہ ہوتا ہے جو بلاواسطہ اس سے قریب ہو کر نور لیتا ہے اور وہ طبقہ صحابہ کرامؓ کا طبقہ ہے جو فضا کی مانند ہے کہ زمین سے بالاتر ہے اور فلک شمس یعنی آسمانِ نبوت سے فروتر ہے وہ فضا کی طرح خلقی طور

---

① الابانة الكبرى للامام ابن بطة، باب التحذير من استماع كلام قوم يريدون نقص الاسلام، ج:٢، ص: ٢٢٠ رقم: ٧٠٩.

پر خود شفاف ہے جو محض اس کے نور ہی کو دکھا دینے کی نہیں بلکہ عین آفتاب کو دکھلانے کی کامل استعداد رکھتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آپ نے فرمایا کہ: سارے نبیوں کے صحابہ میں میرے صحابہ منتخب کر لئے گئے۔ یا جیسے عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے دل شفاف تھے، ان کا علم گہرا تھا، ان میں تکلفات نہ تھے، انہیں اقامت دین کے لئے پوری امت میں سے چن لیا تھا۔ ان کا نقش قدم واجب الاتباع ہے وغیرہ۔ جس سے حضرات صحابہ کرامؓ کی کمال قابلیت کھلتی ہے جو انہیں انوار نبوت کو جذب کرنے کیلئے عطاء ہوئی تھی۔ پس وہ فطری شفافی اور کمال قرب کے لحاظ سے بمنزلہ فضا کے ہوئے جو شفاف ہے اور ساری دنیا کی نسبت سے آفتاب سے قریب تر بھی ہے کہ بلا واسطہ نور آفتاب جذب کرتی ہے۔ پس انہوں نے ان شفاف سینوں سے اس درجہ آفتاب نبوت کا نور واثر قبول کیا کہ فضا کی طرح سرتاپا نور بن گئے اور جیسا کہ فضا آفتاب سے متصل اور ملحق ہو کر اس درجہ منور ہو جاتی ہے کہ وہ خود نظر نہیں آتی۔ یعنی وہ خود اپنے کو نہیں دکھلاتی بلکہ صرف آفتاب اور اس کی شعاعوں اور چمک دمک ہی کو نمایاں کرتی ہے۔ ایسے ہی صحابہؓ کرام اپنی فطری قابلیتوں کی بناء پر اس درجہ پاک قلوب، عمیق العلم، قلیل التکلف اور بے غل وغش بنا دیئے گئے تھے گویا ان میں خود ان کی کوئی ذاتی خصوصیت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مجسم نمونے بن گئے تھے۔

سنن صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم...... اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عقیدہ وعمل کو اپنے عقیدہ وعمل کے ساتھ ختم کر کے انہیں معیار حق فرمایا اور اعلان فرمایا کہ سنن نبوتؐ اور سنن صحابہؓ ایک ہی ہیں جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی دینی خصوصیات، خصوصیات نبوی تھیں۔ چنانچہ امت کے بہتر (۷۲) فرقوں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا گیا کہ ان بہتر (۷۲) میں وہ ناجی فرقہ کونسا ہے؟ تو فرمایا: ''مَا اَنَا عَلَیْهِ وَ اَصْحَابِیْ'' ① ''جس پر آج کے دن میں اور میرے صحابہؓ ہیں''

گویا اپنے عقیدہ وعمل کے ساتھ انکے عقیدہ وعمل کو اس طرح ملا کر بتلایا کہ ان کے عقیدہ وعمل اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عقیدہ وعمل کی نوعیت ایک ثابت ہوگئی اور فرقوں کے حق وباطل ہونے کا معیار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی بابرکات اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو ٹھہرایا۔

سب وشتم کا انجام...... پھر جیسے فضا تک کوئی گندگی نہیں پہنچتی اور پہنچائی بھی جائے تو وہ لوٹ کر پہنچانے والے ہی پر گرتی ہے۔ فضا اس سے گندی نہیں ہوتی۔ ایسے ہی حضرات صحابہ کرام کا طبقہ جو روحانی فضا کی مانند ہے۔ امت کی تنقیدوں سے بالاتر ہے۔ اگر ان کی شان میں کوئی طبقہ سب وشتم یا گستاخی یا سوء ادب یا جسارت وبے باکی یا ان پر اپنی تنقیدی تحقیر کی گندگی اچھالے گا تو اس کی یہ ناپاکی اسی کی طرف لوٹ آئے گی۔ اس فضاء شفاف پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ بہر حال حضرات صحابہؓ فضاء قریب کی مانند ہیں کہ انہیں شفافی میں بھی آفتاب سے مناسبت ہے وہ

① السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی افتراق ھذہ الامۃ، ج: ۹، ص: ۲۳۵، رقم: ۲۵۶۵.

آفتاب نبوت سے نزدیک تر بھی ہیں۔ بلا واسطہ اس سے ملحق بھی ہیں۔ وہ زمین کی کدورتوں سے بالاتر بھی ہیں اور وہ آفتاب کے نور میں فانی بھی ہیں کہ اس نور کی نمائش گاہ بن کر رہ گئے ہیں جن میں اپنی خصوصیت بجز انفعال اور قبول حق کے دوسری نہیں رہ گئی تھی۔

جامع اضداد زندگی...... پس صحابہ کرامؓ کی اس اعلیٰ ترین زندگی کا نور تیز بھی ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اقرب تر او اشبہ تر بھی ہے کہ اس نے نبوت کی زندگی سے متصل رہ کر اس کی شعاعوں کا نور قبول کیا ہے اس لئے یہ زندگی نہ صرف عزیمتوں کی زندگی اور اولعزمانہ زندگی ہے کہ جائزات کی آڑ لئے بغیر عمل کے اعلیٰ ترین حصہ ہی کو اپنالیا جائے اور نفس کی راحت طلبیوں کو خیر باد کہہ کر عملی مجاہدہ وریاضت ہی کو زندگی بنالیا جائے بلکہ یہ زندگی جامع اضداد بھی ہے جو کمال اعتدال لئے ہوئے ہے کہ ایک طرف نفس کشی بھی انتہائی اور ساتھ ہی ادب شریعت اور اتباع سنن نبوی بھی انتہائی اور ایک طرف طبعی جذبات بھی قائم اور دوسری طرف عقلی دواعی اور ملکیت بھی غالب اس کمال اعتدال و جامعیت کے ساتھ یہ زندگی صحابہ کرامؓ کے سوا امت کے کسی طبقہ کو طبقاتی حیثیت سے نصیب نہیں۔ آحاد و افراد اس زندگی کے حامل نظر پڑیں گے۔ جس میں شرف صحابیت کے سوا سب کچھ ہوگا، لیکن طبقہ کا طبقہ ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا ہو اور ہمہ وقت اخلاص و معرفت کی حد کمال کو طے کئے ہوئے ہو۔ طبقہ صحابہؓ کے سوا دوسرا نہیں۔ جنہوں نے گھر بار چھوڑ کر اور نفس کی خواہشات سے منہ موڑ کر صرف اور صرف رضائے حق کو اپنی زندگی بنایا۔ مرغوبات کو شرعی مطلوبات پر قربان کردیا۔ موطن طبیعت سے ہجرت کر کے موطن شریعت میں آ کر بس گئے اور شرعی مرادوں کی خاطر نفس کی حیلہ جوئیوں اور راحت طلبیوں سے کنارہ کش ہو کر عزم صادق کے ساتھ ہمہ تن مرضیات الٰہی اور سنن نبوی ؐ کی پیروی میں مستغرق ہوگئے اور اسی کو اپنی زندگی بنالیا۔ اس جامع اور جامع اضداد زندگی کا سب سے زیادہ نمایاں اور حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ وہ کلیۃً تارک دنیا بھی تھے اور رہبانیت سے الگ بھی، دنیا اور دنیا کے جاہ و جلال، دھن و دولت، حکومت و سیاست، گھر بار، زمین، جائیداد کے ہجوم میں بھی تھے اور پھر ادائے حقوق میں بے لاگ بھی یہ زن، زر، زمین ان کے تصرف میں بھی تھی اور پھر قلباً ان سب چیزوں سے بے تعلق اور کنارہ کش بھی؛ درویش کامل بھی ہیں اور قبا شاہی بھی زیب تن ہے۔ حکمران بھی ہیں اور دلق گدائی بھی کندھوں پر ہے۔ ممالک بھی فتح کر رہے ہیں اور فقیری کی خو بھی بدستور قائم ہے۔

یوں بہم کس نے کئے ساغر و سندال دونوں

کامل انسانیت کا طبقہ...... انبیاء علیہم السلام کی یہی زندگی ہے کہ بشر بھی ہیں اور ملک بھی۔ نہ طبائع کو ترک کرتے ہیں اور نہ عقل و فراست کے تقاضوں سے ایک انچ ادھر ادھر ہوتے ہیں۔ خالص طبعی جذبات کی پیروی حیوان کا کام ہے اور طبعیات سے کلیہ باہر رہ کر محض عقل کلی کی پیروی فرشتوں کا کام ہے، لیکن طبعیات کو بحالہ قائم رکھ کر انہیں عقلی شعور کے ساتھ عقل کی ماتحتی میں انجام دینا اور حدود سے تجاوز نہ کرنا یہ انسان کا کام ہے۔ مگر انسان

کامل فرما کر اس کے تقدس و برگزیدگی کو نمایاں کیا گیا۔ اس لئے جس طبقہ کے افعال اقوی، عقائد، احوال، اقوال سب میں یہ کامل اعتدال رچا ہوا ہو۔ وہی طبقہ کامل انسانیت کا طبقہ کہلائے گا۔ سو طبقاتی حیثیت سے یہ کمال بالذات تو انبیاء علیہم السلام میں ہوتا ہے اور بالغرض بحیثیت طبقہ ان کے صحابہ ؓ میں ان کے بعد طبقاتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ صرف انفرادی حیثیت باقی رہ جاتی ہے اور وہ بھی اس مقام کی نہیں جس پر یہ طبقہ فائز ہوتا ہے۔

ظل نبوت...... پس صحابہ کرامؓ درحقیقت نبوت کا ظل کامل تھے جن کے طبقہ سے نبوت اور کمالات نبوت پہچانے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی طبقہ کے طبقہ کو بحیثیت طبقہ اللہ و رسولؐ کے یہاں مرضی و پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تو وہ صرف صحابہ کرام ؓ کا طبقہ ہے جس کی شہادت قرآن اور حدیث نے دی اور ﴿رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ﴾ ① اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی یہ دستاویز رضا ان کے لئے آسمانی کتاب میں تا قیام قیامت ثبت کر دی گئی۔ کہیں ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی ۔ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ﴾ ② ''یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے تقوے کے لئے خالص کر دیا ہے ان لوگوں کے لئے مغفرت و اجر عظیم ہے۔ کے ذریعے ان کے قلوب کی پاکیزگی کی شہادت دی گئی۔

اور کہیں ﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوْنَ o فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَنِعْمَۃً﴾ ③ اور کہیں ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا﴾ ④ فرما کر ان کے اخلاق کی برتری ثابت کی گئی اور کہیں۔ ''اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ'' فرما کر ان کے ہر ہر فرد کو پوری امت کا مقتدا بتلایا گیا جس کی پیروی اور پیروی سے حصول ہدایت میں کوئی ادنیٰ کھٹکا نہ ہو۔

مکمل میزان اور متوازن ترازو...... کچھ عرصہ ہوا بعض منتسبین دارالعلوم کا ایک خط دربارہ طلب سرٹیفکیٹ احقر کے نام دفتر دارالعلوم میں موصول ہوا۔ جس میں ضمناً مودودی مکتب فکر اور خود اپنے مودودی ہونے کی نوعیت کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا تھا۔ یہ اصلاح طلب نوعیت دیکھ کر حضرت شیخ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بنظر اصلاح انہیں ایک شفقت نامہ تحریر فرمایا جس میں مودودی مکتب خیال کی بعض بنیادی دفعات پر کلام فرماتے ہوئے ان کے اصلاح خیال کی توجہ فرمائی ہے۔ حضرت شیخ مدنی کا یہ ارشاد نامہ سلسلہ عقائد و افکار کے لئے ایک مکمل میزان اور متوازن ترازو کی حیثیت رکھتا ہے جس سے موجودہ زمانے کے حدود سے گزرے ہوئے افکار و خیالات کو عموماً اور مودودی نقطۂ نظر کے مزعومات و معتقدات کو خصوصاً تول کر ان کے حق و باطل کا فیصلہ باآسانی کیا جا سکتا ہے کیونکہ حضرت ممدوحؒ کے اس والا نامہ کا موضوع مودودی لٹریچر کا کوئی فروعی یا جزوی مسئلہ نہیں ہے جسے مودودی صاحب کی شخصی رائے یا ان کے اجتہاد و قیاس کا ثمرہ کہہ کر جماعت کے سر سے بوجھ ہلکا کر لیا جائے۔ جیسا کہ اس قسم

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ البینۃ، الآیۃ: ۸. ② پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳.

③ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۷-۸. ④ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹.

کے موقع پر عموماً ایسا ہی کیا جاتا ہے بلکہ ایک اصولی مسئلہ ہے اور وہ بھی دستور جماعت کا بنیادی اصول موضوعہ جو جماعت اور امیر سب کے لئے یکساں حجت اور معیار عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پس اگر پوری جماعت دستور کو جو بنام دستور اسلامی شائع شدہ ہے، تسلیم کرتی ہے۔ (اور ضرور تسلیم کرتی ہے جب کہ جماعت کا وجود اور اس کی تشکیل ہی اس دستور سے ہوئی ہے) تو بلاشبہ دستور کی یہ دفعہ:

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ''ذہنی غلامی'' میں مبتلا نہ ہو''۔

ساری جماعت کا ایک مسلمہ عقیدہ اور بنیادی اصول ثابت ہوئی۔ اس لئے حضرت شیخ کے مکتوب گرامی میں اس بنیادی عقیدہ کا تجزیہ کر کے اس پر جو شرعی گرفتیں کی گئی ہیں وہ یقیناً پوری جماعت کے ایک ایک فرد پر حجت ہیں اور اس لئے بحیثیت مجموعی جماعت کو گروہی تعصب سے بالاتر ہو کر ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عقائد کا معاملہ دنیوی نہیں اخروی ہے جو زیادہ توجہ کا محتاج ہے۔

دفعہ مذکورہ پر حضرت شیخؒ نے کتاب وسنت سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے سامنے آنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اس دفعہ کے آنے سے پہلے تنقیح کر دوں تا کہ ان حقائق کا جو اس مکتوب کا موضوع ہے سمجھنا آسان ہو جائے۔ اس دفعہ میں مودودی صاحب نے غیر رسول کو معیار حق بنانے اور تنقید سے بالاتر سمجھنے سے روکا ہے۔ مگر یہ ممانعت جب ہی درست ہو سکتی ہے کہ شرعاً کوئی غیر رسول معیار حق و باطل نہ بن سکے اور تنقید سے بالاتر نہ ہو۔ اگر شرعی طور پر کوئی معیار ہو اور بن سکتا ہو تو اسے معیار حق مان لینا اور تنقید سے بالاتر سمجھنا جرم نہیں ہو سکتا۔ کوئی تنقید سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی اگر کسی نے از خود کسی کو معیار حق بنا لیا اور تنقید سے بالاتر سمجھا تو وہ شرعی مجرم اور ایک شرعی گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اس لئے ہمارا کلام مودودی صاحب (علیہ ما علیہ) کے اس نظریہ پر ہوگا کہ غیر رسول معیار حق نہیں بن سکتا اور تنقید سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔ اگر اس دفعہ نمبر ۶ کو اس کے ہمہ گیر عموم کے ساتھ اس کے عام الفاظ میں تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ۔

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی بھی معیار حق نہیں، کوئی بھی تنقید سے بالاتر نہیں، اور کوئی بھی اس کا مستحق نہیں کہ اس کی ذہنی غلامی کی جائے''۔

تو سوال یہ ہے کہ خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہی کسی کو معیار حق بنا دیں یا اس کے معیار حق ہونے کی شہادت دیں یا معیار حق ہونے کا ضابطہ بتا دیں کہ اس کی رو سے معیار حق ہونے کی تعیین کر لی جائے تو کیا وہ پھر بھی معیار حق نہ بن سکے گا؟ اگر بن سکے گا تو یہ اصول غلط نکلا کہ ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم'' کے سوا کوئی بھی معیار حق نہیں ہو سکتا۔ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے باوجود بھی ان کے سوا کوئی معیار حق نہ ہوا تو خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا معیار حق ہونا معاذ اللہ باطل ٹھہر جاتا ہے جب کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا قول خلاف ہو گیا۔

(العیاذ باللہ) دونوں صورتوں میں دستور جماعت کی دفعہ نمبر ۶ باطل ہو جاتی ہے۔ ایک صورت میں اس کا منفی پہلو یا باطل ٹھہرتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی معیار حق نہیں اور دوسری صورت میں اس کا مثبت پہلو باطل ہو جاتا ہے کہ صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہی معیار حق ہیں۔ اس ضابطہ سے نکلنے کی آسان صورت اس کے سوا دوسری نہیں کہ ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق معیار حق اور نا قابل تنقید تسلیم کرلیں۔ کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بذاتہ معیار حق ہیں اور غیر رسول بارشاد رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم معیار حق ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا معیار حق ہونا منصوص ہے...... سوال رہ جاتا ہے تو صرف یہ کہ آیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو معیار حق بنایا بھی ہے یا نہیں؟ اور آیا کسی کو تنقید سے بالاتر اور مستحق ذہنی غلامی فرمایا بھی ہے یا نہیں؟

سو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کا نام لے کر معیار حق و باطل قرار دیا' ان پر جرح و تنقید سے روکا اور ذہنوں کو ان کی غلامی کے لئے مستعد فرمایا وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مقدس جماعت ہے۔ ان کے معیار حق بتلانے ہی کے لئے آپ نے نہایت صاف وصریح اور غیر مبہم ہدایت جاری فرمائی۔ یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کا معیار حق ہونا قیاسی یا استنباطی نہیں بلکہ منصوص ہے۔ جس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک مستقل حدیث ارشاد فرمائی:

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: تَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلٰثٍ وَّسَبْعِیْنَ مِلَّۃً کُلُّھُمْ فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدَۃً قِیْلَ مَنْ ھُمْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ. ① ”حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میری امت تہتر (۷۳) ملتوں پر تقسیم ہو جائے گی سوائے ایک کے سب جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ پوچھا گیا کہ وہ (مستثنیٰ) کون ہیں یا رسول اللہ! تو فرمایا کہ جو لوگ میرے اور میرے اصحاب کے طریق پر ہیں“۔

فرق اسلامیہ کے حق و باطل ہونے کا معیار...... اب اس حدیث میں فرق اسلامیہ کی نجات و ہلاکت اور بالفاظ دیگر ان کے حق و باطل ہونے کا معیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ وہ میرا اور میرے صحابہ کا طریقہ ہے۔ لیکن اس طریقہ کو شخصیتوں سے الگ کر کے تنہا کو معیار نہیں بتلایا۔ بلکہ اپنی ذات بابرکات اور اپنے صحابہ ؓ کی ذوات قدسیہ کی طرف منسوب کر کے معیار بتلایا کہ وہ ان شخصیتوں کے ضمن میں پایا جائے۔ ورنہ بیان معیار میں اس نسبت اور نامزدگی کی ضرورت نہ تھی بلکہ مَنْ ھُمْ کے جواب میں مَا اَنَا عَلَیْہِ کی سیدھی تعبیر یہ تھی کہ مَا جِئْتُ بِہٖ فرما دیا جاتا۔ یعنی معیار حق وہی ہے جسے میں لے کر آیا ہوں۔ یعنی شریعت' لیکن شریعت کو شخصیتوں سے الگ کر کے ذکر کرنے کی بجائے شخصیتوں کے انتساب سے ذکر فرمانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے

① السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی افتراق ھذہ الامۃ، ج: ۹ ص: ۲۳۵.

کہ محض کاغذ کے کالے نقوش معیار نہیں بلکہ وہ ذوات معیار حق ہیں جن میں یہ نقوش وحروف اعمال واحوال بن کر رچ گئے ہیں اور اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اب کوئی بھی ان کی ذوات کو دین سے الگ کر کے اور دین کو ان کی ذوات سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتا۔

جس کا حاصل یہ نکلا کہ محض لٹریچر معیار حق نہیں بلکہ وہ ذات معیار حق ہیں جو اس لٹریچر کی حقیقی ظرف بن چکی ہیں: ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ﴾ ① ''بلکہ یہ تو قرآن کی آیتیں ہیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں جن کو ملی ہے سمجھ اور منکر نہیں ہماری باتوں سے مگر وہی جو بے انصاف ہیں''۔

پھر اس طریقہ کو شخصیت کی طرف منسوب کرنے کے سلسلہ میں بظاہر (مَا) کے بعد (اَنَا) کافی تھا اور یہ فرما دینا بس کرتا تھا کہ نجات وہلاکت کے پہچاننے کا طریقہ میری ذات ہے تاکہ معیار حق صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہوتی، لیکن آپ نے اپنے ساتھ اپنے صحابہ کو بھی شامل فرمایا جس سے واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ فرقوں اور مختلف مکاتب خیال کے حق وباطل کے پرکھنے کا معیار جیسے رسول کی ذات ہے ویسے ہی صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذوات بھی ہیں اور اس لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی یا عدم موجودگی میں کسی فرقہ اور کسی مکتب خیال کے افراد کو پرکھنے کے لئے یہ دیکھ لینا کافی ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کی راہ پر چل رہے ہیں یا مخالف سمت میں ہیں، ان کی اطاعت کر رہے ہیں یا ان سے گریزپا ہیں ان کے ساتھ حسن ظن کا برتاؤ کر رہے ہیں یا سوء ظن اور بے اعتمادی کا! کہ یہی شان کسی کے معیار ہونے کی ہوتی ہے۔ جس سے صاف طور پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ رسول کا معیار حق ہونا واضح ہو جاتا ہے اور یہ حدیث اس بارے میں نص صریح ثابت ہوتی ہے جس کا مقصد ہی یہ مدعا ثابت کرنا ہے۔

اطاعت صحابہ رضی اللہ عنہم اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے...... اس کی وجہ یہ ہے جو خود اس حدیث ہی سے نمایاں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اپنے طریق کو بعینہ اپنے صحابہ کا طریق بتایا ہے۔ جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ ان کی راہ چلنا میری راہ چلنا ہے اور ان کی پیروی میری پیروی ہے۔ یہ ایسا ہی جیسے حق تعالیٰ شانہ اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ② ''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔

اس سے ایک کی اطاعت کو بعینہ دوسرے کی اطاعت بتلانا مقصود ہے جس کے صاف معنی یہی ہوتے ہیں کہ خدا اور اس کے رسول کا طریق الگ الگ نہیں۔ جو اللہ کا راستہ ہے وہی رسول کا راستہ ہے۔ پس اللہ کی اطاعت معلوم کرنے کا معیار یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت دیکھ لی جائے۔ اگر وہ ہے تو بلاشبہ خدا

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹۔ ② پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۰۔

کی اطاعت بھی ہے ورنہ نہیں۔

وہی صورت یہاں بھی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی واطاعت کو بعینہ اپنی پیروی وطاعت قرار دیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت دیکھنی ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اطاعت دیکھ لی جائے۔ اگر صحابہ کرامؓ کی متابعت کی جاری ہے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قائم ہے ورنہ نہیں۔ اس کا حاصل وہی نکلتا ہے کہ رسول اور صحابہ رسول کے طریقے الگ الگ نہیں بلکہ جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے وہی بعینہ صحابہؓ رسول کا طریقہ ہے۔ اس لئے جیسے رسول فرقوں کے حق وباطل کا معیار ہیں۔ ایسے ہی صحابہؓ رسول بھی معیارِ حق وباطل ہیں۔ جن کو سامنے رکھ کر سب کے حق وباطل کو بآسانی پرکھا سکتا ہے۔ بہرحال اس حدیث سے حضرات صحابہؓ کی صرف منقبت اور فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی۔ نیز ان کی معیاریت اور مقبولیت ہی ثابت نہیں بلکہ امت کے حق وباطل کے لئے ان کی معیاری شان بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ خود ہی حق پر نہیں ہیں بلکہ حق وباطل کے لئے امت کی کسوٹی بھی بن چکے ہیں۔ جن سے دوسروں کا حق وباطل بھی کھل جاتا ہے پھر یہ بھی کہ ان میں یہ معیار ہونے کی شان محض ان کی غیر معمولی فضیلت سے بطور رائے وقیاس نہیں مان لی گئی بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے دوش بدوش ان کے معیارِ حق وباطل ہونے کی شہادت دی ہے۔ اس لئے ان کا معیارِ حق وباطل ہونا قیاسی نہیں بلکہ منصوص ثابت ہوا۔

معیار قابلِ تنقید نہیں ہوتا...... اور جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہؓ رسول پوری امت کے حق و باطل کے پرکھنے کا معیار ثابت ہوں تو کیا امت کو یہ حق پہنچے گا کہ وہ ان پر تنقید کرے اور گرفتیں کر کر کے ان کی خطائیں پکڑنے لگے؟ یا یہ حق خود ان کا ہوگا کہ امت کے خطاء وثواب کا فیصلہ کریں؟ کون نہیں جانتا کہ تنقید کا حق معیار کو ہوتا ہے جو پرکھنے والا ہے نہ کہ محتاج معیار کو جو پرکھوانے والا ہے، آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو اپنے خطاء وثواب کو کسی معیار پر جو جانچنے اور اپنا فیصلہ کرانے چلے ہوں اور وہ چلتے چلتے راستہ میں خود ہی معیار بن جائیں اور اپنے اوپر حکم لگوانے کی بجائے معیار پر ہی حکم لگانے کھڑے ہو جائیں؟ اس سے واضح ہے کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معیارِ حق وباطل کی وجہ سے تنقید سے بالاتر ہیں۔ ایسے ہی آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی، جب کہ آپؐ نے ان کو بھی حکم میں ساتھ ملا کر معیارِ حق وباطل قرار دیا ہے، تنقید سے بالاتر ہیں۔ ورنہ کسی کو معیارِ حق مان کر اس پر نکتہ چینی کرنا یعنی خلاف حق ہونے کا اس کی طرف ایہام کرنا یا اسے خلاف حق ہونے کا طعنہ دینا اسے معیار مان کر بھی معیار نہ ماننا ہے جو صریح اجتماع ضدین ہے اس لئے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اگر امت کے فرقوں کے حق وباطل کے فیصلے کا معیار ہیں اور حسب بالا ضرور ہیں تو وہ یقیناً ان فرقوں کی تنقید سے بالاتر بھی ضرور ہیں ورنہ ان میں معیار ہونے کی شان قائم نہیں رہے گی، جس کا قائم رہنا بنص حدیث ضروری ہے۔

حق دستیاب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے ہوگا...... صحابہ کرام کا معیارِ حق اور بالاتر از تنقید

ثابت ہو جانے کے بعد یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے معیار حق و باطل کی کسوٹی ہونے کے یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ جیسے کسوٹی کا پتھر سونے کے کھرے اور کھوٹے ہونے کو تو نمایاں کر دیتا ہے۔ مگر خود نہ کھرا ہوتا ہے نہ کھوٹا۔ ایسے ہی حضرات صحابہ بھی باایں معنی معیار حق ہوں کہ دوسروں کا حق و باطل تو ان سے کھل جائے مگر وہ خود معاذ اللہ نہ حق ہوں نہ باطل۔ کیونکہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ ملا کر امت کے لئے معیار حق بتلایا ہے اور ظاہر ہے کہ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معیار حق ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ حق و صداقت کا مجسم نمونہ اور سرتا پا صدق و امانت ہیں۔ جن میں باطل کی آمیزش کا شائبہ بھی ممکن نہیں۔ اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے معیار حق ہونے کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ وہ بھی خالص حق کے پیکر ہوں اور حق و صداقت کا مجسم نمونہ ہوں جس میں باطل کا گذر نہ ہو۔

اس صورت میں ظاہر ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معیار حق ہونے کی شان یہ نکلتی ہے کہ ان کو سامنے رکھ لینے پر حق و باطل میں امتیاز کامل بھی پیدا ہو جائے اور حق دستیاب بھی ہو جائے۔ کیونکہ جب وہ کامل نمونہ حق ٹھہرے اور وہی اس امت کے اولین نمونہ حق بھی ہوئے تو حق پہچاننا بھی انہی سے جائے گا اور دستیاب بھی انہی سے ہوگا۔ بشرطیکہ اس کی پیروی کی جائے۔ اندریں صورت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معیار حق ہونے اور امت کے مختلف الخیال فرقوں کی کسوٹی ہونے کے یہ معنی نکل آئے کہ جو فرقہ ان کی اطاعت کا التزام کرے گا وہی حق پر ہوگا اور اس کسوٹی پر پورا اترے گا اور جو ان سے منحرف ہو کر خلاف راہ چلے گا وہی باطل پر ہوگا۔

اور ظاہر ہے التزام اطاعت کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ ان پر جرح و تنقید کرنے کی بجائے ان کی تصویب کی جائے۔ ان کی خطائیں پکڑنے اور ان پر گرفتیں کرنے کی بجائے ان کی توصیف کی جائے۔ ان سے بدظنی کی بجائے حسن ظن رکھا جائے اور ان پر امور قبیحہ مثل جھوٹ وغیرہ کی تہمتیں دھرنے کی بجائے انہیں صادق و امین سمجھا جائے۔ اگر ان کے بعد امت کے طبقات کو پیروی کا یہ درجہ بھی حاصل نہ ہو اور اس انداز سے وہ صحابہ کرامؓ کے نمونوں کو سامنے نہ رکھیں تو یقیناً نہ انہیں حق حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ان کے دلوں میں حق و باطل کا امتیاز ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

ناقدین صحابہ رضی اللہ عنہم کا دین سلامت نہیں رہ سکتا..... کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کے مومنین اولین اور امت کے حق میں دین کے مبلغین اولین ہیں۔ دین کا کوئی حصہ کسی سے پہنچا ہے اور کوئی کسی سے، قرآن کریم کا کوئی ٹکڑا کسی سے ملا ہے اور کوئی کسی سے۔ جن کو جامعین قرآن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جمع فرمایا ہے تو کسی ایک صحابیؓ کی پیروی سے انحراف یا کسی ایک صحابیؓ پر جرح اور نکتہ چینی درحقیقت دین کے اس ٹکڑے سے انحراف ہوگا جو اس سے روایت ہو کر امت تک پہنچا ہے اگر راوی مجروح اور ناقابل پیروی ہے تو اس کا روایت کردہ حصہ دین بھی مجروح اور ناقابل اعتبار رہے۔ اگر معاذ اللہ یہ نکتہ چینی اور جرح اور عدم پیروی ان حضرات کے حق میں یونہی جائز کر دی جائے اور وہ سب میں دائر و سائر اور جاری رہے۔ جس کا

ہم سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھو اور نہ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو تو دین کا کوئی ایک حصہ بھی غیر مجروح اور معتبر باقی نہیں رہ سکتا اور امت کا کوئی ایک فرد بھی دین دار یا مدعی دین نہیں بن سکتا۔ اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کو جائز سمجھنے والے بلکہ اسے اپنے دین کا موضوع بنانے والے پہلے اپنے دین کی خبر لیں کہ وہ باقی رہا کہ وہ ختم ہو گیا۔ بہر حال التزام طاعت اور ''ذہنی غلامی'' کا ادنی ترین مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ قلبی حسن ظن اور ان پر جرح وتنقید سے روک تھام ہے۔ انہیں خطا کار سمجھ کر اطاعت شعار بننا ممکن نہیں کیونکہ خطا کو خطا سمجھ کر اس کی اطاعت نہیں کی جاتی۔

فرقہ ناجیہ اہلسنت والجماعت...... اس لئے امت میں صرف وہی ایک فرقہ اس حدیث کی رو سے حق پر ہو سکتا ہے جو ہر نہج سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توثیق وتصدیق اور تصویب وتنزیہ کے جذبات اپنے اندر لئے ہوئے ہو اور کوئی شبہ نہیں کہ وہ مطیع طبقہ یا ''ذہنی غلامی'' کا پیکر طبقہ صرف اہلسنت والجماعت کا جن کا مذہب ہی یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب بلا استثناء مطلقاً عدول اور پاکباز ہیں۔ ان کے ہر فعل کا منشا پاک نیتیں راست ارادے سچے تھے۔ وہ جھگڑتے بھی تھے تو ان کے جھگڑے میں شر نہ ہوتا تھا' ان کا اختلاف بھی ہماری آشتی سے خوش آیند تر تھا' ان سب کے نفوس امارہ نہیں بلکہ مطمئنہ تھے' ان کے قلوب تقویٰ اور تقدس کا محور تھے۔ جن کا امتحان اللہ تعالیٰ نے کر لیا تھا' ان کا آدھ پاؤ صدقہ بھی ہمارے پہاڑ جیسے صدقہ سے افضل تھا۔ وہ تصنع اور بناوٹ سے بری تھے۔ ان کا علم گہرا اور نکھرا ہوا تھا۔ ان کے مقامات توحید واخلاص سے پوری امت کے توحید واخلاق کو کوئی نسبت نہیں اور بقول حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ امیر معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک کے اوپر کا غبار عمر بن عبدالعزیزؒ سے ہزار درجے افضل تھا۔ کیونکہ امیر معاویہؓ صحابی تھے اور عمر بن عبدالعزیزؒ تابعی (روح المعانی وغیرہ وغیرہ)۔

ذہنی غلامی کے بغیر چارۂ کار نہیں...... ظاہر ہے کہ ان جذبات کو بطور عقیدہ ذہن میں رکھ لینے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جرح وتنقید کا تو کوئی سوال ہی ذہنوں میں نہیں آ سکتا۔ البتہ ''ذہنی غلامی'' کا سوال ضرور پیدا ہو سکتا ہے۔ سو اس منقول دین میں اولین طبقہ کا ہر آدمی کا کلیتہً محتاج ہوگا۔ روایت میں بھی اور درایت میں بھی' تاویلات میں بھی اور تعلم وتزکیہ میں بھی اجمال میں بھی اور تفسیر میں بھی آخر اس کی ''ذہنی غلامی'' نہ کرے گا تو کیا کرے گا اور جب کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کو امت کے مختلف فرقوں کے حق وباطل کا معیار بھی قرار دے دیا اور معیار ہونے کی شان یہ ہے کہ انہی سے حق وباطل ممتاز ہوتا ہے اور انہی سے ملتا بھی ہے اور اس صورت میں بجز ''ذہنی غلامی'' کے چارہ کار بھی کیا ہے ورنہ محق ہونے کے بجائے آدمی مبطل ہونا گوارہ کرے۔

روافض، خوارج، معتزلہ اور دوسرے انہی کے ہم رنگ فرقے مبطل ہی اس لئے قرار پائے کہ انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھا ان کی ''ذہنی غلامی'' پر راضی نہ ہوئے اور ان پر طعنہ زنی اور نکتہ چینی سے باز نہ آئے۔ جس سے صاف لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا تھا اور فرمایا تھا کہ میرے

صحابہ پر سب وشتم نہ کرو، میرے صحابہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ جس میں نکتہ چینی اور گرفت اور نقد وتبصرہ سب ہی کچھ زیر ممانعت آ جاتا ہے۔ وہ نجوم ہدایت ہیں تو ان سے راہ پائی جائے گی۔ انہیں راہ دکھائی نہیں جائے گی، ان کی اقتداء کی جائے گی، ان کی غلطیاں پکڑ پکڑ کران سے اقتداء کرائی نہیں جائے گی۔

اس سے واضح ہے کہ جولوگ اپنے نقد وتبصرہ کا دائرہ ان آباء صالحین تک وسیع کردینا چاہتے ہیں اور بقول شخصے ''بازی بازی باریش بابا ہم بازی'' کے ڈھنگ پران پر جرح وتنقید جائز سمجھتے ہیں۔ تو یہی ایک چیز ان کے مسلک کے باطل ہونے اور مخالف اہلسنت والجماعت ہونے پران سے اعتزال کر لینے کی کافی دلیل ہے۔ اب خواہ کوئی نیا فرقہ بن جائے یا پرانے مبطل فرقوں کی ''ذہنی غلامی'' میں مبتلا ہوکرانہی کا مقلد ہو۔ بہرحال وہ اہل حق میں سے نہ ہوگا۔

ناقدین صحابہ رضی اللہ عنہم افتراقِ امت کا سبب ہیں...... کیونکہ اس حدیث میں یہ بھی نمایاں ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیار حق وباطل ہیں تو ان کی مخالفت ہی سے نیا فرقہ بنے گا۔ موافقت سے کوئی نیا فرقہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ بلکہ وہی قدیم ناجی فرقہ برقرار رہتا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واسطے سے اپنا روحانی سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملائے ہوئے ہے، کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک ہی فرقہ تھا جو ناجی تھا اور وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت تھی جو برحق بھی تھی اور معیار حق بھی۔ بعد میں جتنے فرقے بنے وہ ان کی مخالف راہ چل کر ہی بنے۔

اور اسی لئے وہ ناحق قرار پائے کہ معیار حق سے الگ ہو گئے۔ پس جولوگ بلا استثناء سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت وعقیدت کے ساتھ پیروی کرتے ہیں اور ان پر زبان طعن وتنقید کھولنا جائز نہیں سمجھتے وہ یقیناً فرقہ نہیں بلکہ اصل جماعت ہیں۔ جن کے عقیدہ وعمل کا سرا سند کے ساتھ قرن اول کی پاکباز جماعت سے ملا ہوا ہے اور وہی اس جماعت کی سنتوں پر عقیدت وعظمت سے جمے ہوئے ہونے کے سبب صحیح معنوں میں اہلسنت والجماعت کہلانے کے مستحق ہیں۔ البتہ صحابہ کرامؓ کا خلاف کرنے والے اور ان پر جرح وتنقید سے نہ رکنے والے حتی کہ اسے اصول قرار دینے والے درحقیقت بلا جڑ کی نئی نئی شاخیں دین میں نکال کر اور نئے نئے خوشنما روپ کے عنوانوں سے دین کی تعبیریں کر کے اسے صدرخ بنا دینے والے امت میں افتراق وانتشار پھیلا رہے ہیں اور امت کو دین کے نام پر ضعیف ناتواں بناتے جا رہے ہیں تو یہی لوگ فی الحقیقت فرقہ ہیں''جماعت نہیں'' گو اپنے نام کے ساتھ جماعت کا لفظ پکار پکار کر شامل کر لیں ''فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ سَمّٰاهُمُ اللّٰهُ'' بہرحال اس حدیث مذکورہ سے ثابت ہو گیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معیار حق رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا اور وہ آپ کے منشاء کے مطابق معیار حق ثابت ہوئے۔ جن پر آج تک امت مرحومہ اپنے کھرے اور کھوٹے کو پہچانتی رہی ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے ان پر کلی اعتماد فرما کر ان کے طریقے کو اپنا طریقہ اور اپنے طریقہ کو ان کا طریقہ فرمایا اور پوری امت کے لئے انہیں حجت قرار دیا جس سے قیامت تک امت کے حق وباطل کا فیصلہ انہی کے علم وعمل کے معیار سے ہوتا رہے گا۔

خود اپنے معیارِ حق ہونے کا ادعاء...... اندریں صورت مودودی صاحب کا دستور جماعت کی بنیادی دفعہ میں عموم واطلاق کے ساتھ یہ دعویٰ کرنا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی معیارِ حق اور تنقید سے بالاتر نہیں ہے جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب سے پہلے شامل ہوتے ہیں اور پھر ان پر جرح وتنقید کا عملی پرداز بھی ڈال دینا حدیث رسول کا محض معارضہ ہی نہیں بلکہ ایک حد تک خود اپنے معیارِ حق ہونا کا ادعاء ہے۔ جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک کو پرکھنے کی جرات کر لی گئی۔ گویا جس اصول کو شد ومد سے تحریک کی بنیاد قرار دیا گیا تھا اپنے ہی بارے میں اسے ہی سب سے پہلے توڑ دیا گیا اور سلف وخلف کے لئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا خود معیارِ حق بن بیٹھنے کی کوشش کی جانے لگی۔ ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ ①

صحابہ رضی اللہ عنہم کی اجتماعی اطاعت...... اِدھر الفاظ حبیبؐ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ایک دو صحابی ہی معیارِ حق نہیں بنا دیئے گئے۔ بلکہ "اصحابی" جمع کا صیغہ لا کر اشارہ کیا گیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیارِ حق بن کر واجب الاطاعت ہیں۔ جس کے لئے احادیث میں ایک ایک، دو دو اور چار چار اس سے زیادہ اور پھر پوری جماعت کی اقتداء کے اوامر وارد ہوئے ہیں۔ کیونکہ معیار ہو کر بھی واجب الاطاعت نہ بنے تو معیار معیار نہیں رہتا اور جب کہ معیارِ حق ساری جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرمایا گیا تو سارے ہی صحابہ رضی اللہ عنہم بلا استثناء واجب الاطاعت بھی قرار دیئے گئے۔ ممکن ہے کہ کسی کو شک وشبہ گذرے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فروعی مذاہب مختلف رہے اور مسائل میں اختلاف اور تناقض تک نظر آتا ہے تو لامحالہ ایک کی اطاعت کر کے بقیہ کی اطاعت سے دست برداری ہی کرنی پڑے گی ورنہ ضدین کا اجتماع ہو جائے گا جو ناممکن العمل ہے تو پھر سب کی اطاعت وپیروی کہاں رہی اور ممکن ہی کب ہوئی؟

جواب یہ ہے کہ اگر ایک کی پیروی دوسروں کی طعن وتنقید سے بچ کر اور سب کی عظمت رکھ کر ہو تو وہ سب ہی کی پیروی کہلائے گی۔ جیسا سلسلہ ختم نبوت میں عملاً پیروی ایک رسول کی ہوتی ہے مگر معیارِ حق سب کو سمجھا جاتا ہے۔ عظمت وتنزیہ اور تقدیس سب کی یکساں کی جاتی ہے۔ تنقید وتخطیہ سب کا معصیت سمجھا جاتا ہے۔ تو یہی سارے انبیاء کی پیروی سمجھی جاتی ہے۔ ورنہ کسی ایک پر بھی زبان طعن یا لسانی نقد وتبصرہ کھول کر ہزار کی پیروی بھی پیروی نہیں ہے۔ بلکہ سب کی مخالفت اور بغاوت ہے کیونکہ خود حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم فروعات میں مختلف رہنے کے باوجود آپس میں ایک دوسرے کی عظمت وتوقیر کو واجب سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام شرائع میں مختلف رہ کر ایک دوسرے کی تصدیق کو اصل ایمان قرار دیتے تھے۔ پس ایک طعنہ زن اور نکتہ چین جب کہ ان کے اس قدر مشترک کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو وہ سب کی خلاف ورزی کا مرتکب اور سب کے حق میں باغی ہے۔ ذیل کے ارشاد نبویؐ میں اس حقیقت پر روشنی بھی ڈال دی گئی ہے کہ

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الحشر، الآیۃ: ۱۹.

"اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمُ اِهْتَدَیْتُمْ" "میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے"۔ "اَیُّهُمْ" کے لفظ سے اقتدا تو مطلق رکھی گئی ہے کہ کسی کی بھی کی جائے ہدایت مل جائے گی۔ لیکن نجوم کے لفظ سے اقتداء کو سمجھنا اور ہادی ماننا سب کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ جس کی پیروی کرو نجم ہدایت اور نور بخش صرف اسی کو سمجھو پس پیروی کا عمل تو ایک دو تک محدود ہو سکتا ہے لیکن نور افشانی کا عقیدہ ایک دو تک تو محدود نہیں رہ سکتا وہ سب کے لئے ماننا لازمی ہوگا۔

بہر حال صحابہ کرام کا طبقہ تو وہ ہے کہ اس کا نام لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے امت کے مختلف مکاتب خیال کے فرقوں کے حق و باطل کا معیار قرار دیا ہے۔ تنقید سے بالاتر بتلایا اور ان کی "ذہنی غلامی" یا اطاعت و پیروی ضروری قرار دی۔

تا قیامت معیار شخصیت رہے گا...... باقی ان حضرات کے بعد کسی طبقہ کو طبقہ کی حیثیت سے نام لے کر معیار حق نہیں فرمایا، البتہ معیار حق ہونے کا ایک کلی ضابطہ اور معیاری اوصاف کا تعین فرما دیا گیا ہے۔ جنہیں سامنے رکھ کر معیاری افراد کو ہر زمانے میں فی الجملہ متعین کیا جا سکتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ قرون مشہودہ کے بعد بشری کمزوریوں کے امکانات بھی رہے اور ایسی کمزوریوں کا گاہے بگاہے عملاً ظہور بھی ہوا، لیکن ایسی گاہے بگاہے کمزوریوں سے معیاری شخصیتوں کے معیار ہونے میں فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اول تو اتقیاء امت میں سے کسی کی زندگی کو پاکباز زندگی کہنے کیلئے یہ کافی ہے کہ غالب زندگی تقویٰ و طہارت کی ہو۔ بھول، چوک، نسیان و ذہول اور گاہے بگاہے ارادی کمزوری انسانی خمیر میں ہے۔

دوسرے بعد کے لوگ صرف بایں معنی معیار حق و باطل ہوتے ہیں کہ ان کی مجموعی زندگی کو سامنے رکھ کر اپنے لئے دینی راہ عمل کا خاکہ بنا لیا جائے اور اسے ان کے پارسایانہ عمل کے خاکہ پر منطبق کر کے اپنے حق و باطل ہونے کا فیصلہ کیا جائے، بایں معنی معیار حق ہونے کو ان کا ہر قول و فعل حجت شرعی ہو تو اس قسم کے مقدس افراد اور معیاری لوگ ہر دور میں ہوتے رہیں گے اور امت کے لئے مینارۂ روشنی ثابت ہوتے رہیں گے چنانچہ حضرت شیخ نے معیاریت کے ایسے اوصاف پر بھی کتاب و سنت سے روشنی ڈالی اور اس لئے روشنی ڈالی ہے کہ راہ رشد و ہدایت میں محض لٹریچر سے رہنمائی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ شخصیتوں کے کردار کے جامہ میں سامنے نہ آئے۔ ورنہ کتب سماویہ کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمائے جانے کی ضرورت نہ ہوتی درحالیکہ خود کتب سماوی کے معانی و مرادات کی تعیین کے لئے بھی معیار حق یہی مقدس ہستیاں ہوئی ہیں۔ وہ نہ ہوں تو کتب الٰہیہ کے معنی متعین کرنے میں ہر بوالہوس آزاد ہو جائے اور حق و باطل کا کوئی فیصلہ کبھی نہ ہو سکے۔ اس لئے قیامت تک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسی معیاری شخصیتوں کا بنام، مجدد، محدث، امام، مجتہد، راسخ فی العلم، فقیہ وغیرہ کا آتے رہنا ضروری ہے جس کے معیار سے امت کے عوام و خواص اپنے دینی عقیدہ و کردار کو جانچتے رہیں اور فی الجملہ ان پر اپنے کو

منطبق کر کے روحانی سکون وطمانیت حاصل کرتے رہیں۔

پس مودودی صاحب تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی انسان کو معیارِ حق ماننے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن کتاب وسنت کا فیصلہ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک معیاری شخصیتیں آتی رہیں گی جو درجہ بدرجہ حق وباطل کا معیار ثابت ہوتی رہیں گی اور جو بھی کتاب وسنت کے الفاظ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی سعی کرے تو ایسی شخصیتیں اپنے اپنے دور کے مناسب حال عنوانوں سے انکی تاویلات کا پردہ چاک کر کے اصل حقیقت کا چہرہ دکھاتی رہیں گی۔

جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَ تَاْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ." "اس علم (دین) کو (ہر دور میں) اعتدال پسند خلف (اپنے سلف سے) لیتے رہیں گے جو غلو پسندوں (اور حدود واعتدال سے گذر جانے والوں) کی تحریفوں، باطل پرستوں کی دروغ بیانیوں اور جہلاء کی (رکیک) تاویلوں کو رد کرتے رہیں گے"۔

اگر توفیق خداوندی شامل حال ہوئی تو ان معیاری شخصیتوں اور ان کے معیار ہونے کی شانوں کی تفصیل آئندہ کسی دوسرے مقالہ میں کی جاسکے گی۔

بہرحال حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوب گرامی میں اہم اور بنیادی نکتہ بحث بھی معیاریت غیر رسول کا مسئلہ ہے جس کو مودودی صاحب نے اصولی طور پر اپنے بنیادی دستور میں رد کر دیا ہے اور شیخ نے اسے اہل حق کی بنیاد قرار دیا ہے۔ جس سے یہ اختلاف فروعی نہیں بلکہ اصول بن گیا۔ خدا کرے کہ مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کار اس خلیج کو پاٹ دینے کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لائیں۔ کسی تحریک کو چلانے کے لئے بنیادی اختلافات پیدا کر لینا خود تحریک کو اپنے ہاتھوں ختم کر دینا ہے۔ فروعی باتیں تو اتفاق واختلاف دونوں راستوں سے چلتی رہتی ہیں، لیکن اصولی اختلاف اور صرف نظر ایک طرف میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ①

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلَاغُ

محمد طیب غفرلہٗ مہتمم دار العلوم دیوبند

۲۰ جمادی الاولی ۱۳۷۵ھ

① محمد طیب غفرلہٗ مہتمم دار العلوم دیوبند، ۲۰ رجمادی الاولی ۱۳۷۵ھ (یوم الخمیس)

ضمیمہ

ذہنی غلامی اور تقلید...... ذہنی غلامی کے لفظ سے غالباً مودودی صاحب نے ''تقلید'' کی ترجمانی فرمائی ہے لیکن اس معنی میں یہ اصطلاح غلط اور مغالطہ انگیز ہے۔ غلامی کا حاصل کسی کے آگے جھکنا ہے اور تقلید کے معنی کسی کی بات ماننا ہے۔ ایک غلام اپنے آقا کے کمالات کے آگے نہیں جھکتا بلکہ اس کی ذات کے سامنے جھکتا ہے خواہ وہ کندہ نا تراش اور احمق ہی کیوں نہ ہو، لیکن ایک مقلد اپنے امام مجتہد کے سامنے آتا ہے تو صرف اس کے منصب و مقام کی پیروی کرتا ہے جس کو وہ عقل ونقل کا پیکر کامل سمجھتا ہے۔ ذات کے آگے نہیں جھکتا۔ پس غلامی میں آقا کی ذات پیش نظر ہوتی ہے۔ اس کا کمال پیش نظر نہیں ہوتا اور تقلید میں مجتہد کا کمال سامنے ہوتا ہے، ذات سامنے نہیں ہوتی۔ غلامی میں جبر ہوتا ہے کہ نہ غلام اپنی صلاحیتوں کو آقا کے انتخاب میں صرف کرسکتا ہے ور نہ خود آقا ہی کی صلاحیتوں پر نظر رکھ سکتا ہے۔ ادھر بھی ذات اور ذاتی خوف وطمع، ادھر بھی ذات اور ذاتی جبر وقہر۔ نہ وہاں شعور واستدلال نہ یہاں۔ پس ''ذہنی غلامی'' میں نہ اپنا شعور بیچ میں ہوتا ہے نہ آقا کا کمال اور تقلید میں طوع ورغبت' عقلی شعور اور قلبی اعتقاد ہوتا ہے جس میں نہ جبر ودباؤ کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ امام مجتہد کے کمالات سے بے شعوری، غرض غلامی بے عقلی سے پیدا ہوتی ہے اور تقلید اتباع عقل وشعور سے، کیونکہ تقلید کسی کے آگے سر جھکانے کا نام نہیں، اس کی بات ماننے کا نام ہے اور بات بھی وہ جسے جذبات سے نہیں، علمی کمالات کے چشموں سے نکلی ہوئی سمجھ لی گئی ہو اور پھر کمالاتی ہی نہ ہو بلکہ اوپر سے نسبت بھی ہو کہ وہ خود اس شخص کی بات نہیں بلکہ اوپر کی بات ہے جہاں جھک جانا ہی نفسانی شرف ہے۔ پس تقلید میں شعور ہوتا ہے۔ بے شعوری نہیں، استدلال ہوتا ہے۔ (گو جزوی مسئلہ نہ ہو، اصولی اور کلی ہو۔ جس سے مجتہد مطاع کی شخصیت اتباع کے لئے متعین کی جاتی ہے) بے حجتی اور ذاتی دباؤ نہیں ہوتا، عبودیت نہیں ہوتی اطاعت ہوتی ہے۔ پس کہاں غلامی اور عبدیت اور کہاں اتباع وعقیدت، کہاں غرض مندی اور خوف وطمع اور کہاں محبت وغنائیت، کہاں شعور واستدلال اور کہاں جمود وتعطل، کہاں حسن ظن اور قلبی شفقت اور کہاں بیزاری اور اندرونی انحراف، کہاں عقل وخرد بالائے طاق اور کہاں عقلی رہنمائی پیش پیش۔

چراغ مردہ کجا، نور آفتاب کجا۔ اس لئے ذہنی غلامی کا لفظ جس کا معنی ذہن کو شعور واستدلال سے معطل کر کے کسی کی ذات کے آگے جھکا دینے کے ہیں اس تقلید کا ترجمان نہیں بن سکتا جس میں ذہنی شعور کی بیداری کے ساتھ کسی کی علمی اور کمالاتی نسبتوں کو سامنے رکھ کر حسن ظن اور استدلال کلی سے اس کی تقلید کی ترجمانی کے لئے ''ذہنی

غلامی'' کا تحقیر آمیز لفظ شاید اشتعال انگیزی اور نئی نسل کے دل و دماغ پر چوٹ لگا کر انہیں تقلید سے بیزار بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ فی زمانہ غلامی کے لفظ سے زیادہ کریہہ کوئی لفظ نہیں، آج افراد ہوں یا طبقات' اقوام ہوں یا اوطان۔ آزادی کے نام پر برسر پیکار ہیں۔

با اقتدار قوموں نے چونکہ کمزوروں کی غلام سازی کو زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے جس سے بے دست و پا اقوام تنگ آ چکی ہیں۔ اس لئے وہ آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی ہیں اور آج کی دنیا میں غلامی کے لفظ ہی کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اس لفظ کے سامنے آتے ہی لوگ چونک پڑتے ہیں اور نفرت کے ساتھ اس سے بدک جاتے ہیں۔ اس لئے تقلید سے نفرت دلانے کے لئے اس سے بہتر تدبیر نہیں سوچی جا سکتی تھی کہ اس کا ترجمہ ایک ایسے مکروہ لفظ سے کر دیا جائے تو جو خود ہی ذہنوں میں حقیر و ذلیل ہو کہ اس راستہ سے تقلید کے مفہوم سے ہی لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر دی جائے، لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ ذہنی غلامی اور تقلید کی حقیقتوں میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ اور ایک کے لئے دوسرا لفظ کسی طرح بھی ترجمان نہیں ہو سکتا بلکہ یہ لفظ ہی شرعی نہیں ہے جو کسی دینی اور شرعی اصطلاح کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہ محض اشتعال انگیزی اور پنہائی مقصد برآری کے لئے ایک حیلہ کیا گیا ہے۔

پس ہم تقلید کے ضرور قائل ہیں لیکن تقلید کے معنی ذہنی غلامی کے نہیں سمجھتے جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ تقلید میں اتباع بھی ہوتا ہے اور شعور بھی۔ گو شعور اجمالی ہو تفصیلی نہ ہو۔ ارشاد ربانی ہے۔

﴿عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ﴾ ① یہاں صحابہ کرامؓ کے لئے (جو متبعین اولین ہیں) اتباع بھی ثابت کیا گیا ہے اور بصیرت و شعور بھی جس میں سب سے پہلے اس کا شعور پیدا ہوتا ہے کہ یہ کلام کس کا ہے جس کی پیروی کی جا رہی ہے اور وہ شخصیت کون ہے جس کا اتباع کیا جا رہا ہے۔ اور ذہنی غلامی کا حاصل کلیتہً ذہنی بے شعوری اور جمود کے ہیں جو کسی بھی مومن کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اس مضمون میں ہم نے جہاں بھی یہ لفظ لیا ہے وہ مودودی صاحب کے کلام سے بطور حکایت و نقل کے لیا ہے ورنہ ہمارے نزدیک اسلامی اصطلاح کے نقطۂ نظر سے یہ لفظ مہمل اور بے معنی ہے۔ نہ یہ کسی شرعی مفہوم کا ترجمان بن سکتا ہے نہ عقل کا۔ کفار کی آبائی تقلید پر بول دیا جائے تو ممکن ہے کہ کسی حد تک چسپاں ہو جائے۔

(محمد طیب غفرلہ)

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸۔

آغازِ بخاری

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـا بَعْـدُ!...... کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَوْلِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ ذِکْرُہٗ: ﴿اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْ بَعْدِہٖ﴾حَدَّثَنَا الْحُمَیْدِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْیَانُ قَالَ حَدَّثَنَا یَحْیَی بْنُ سَعِیْدِ ، الْاَنْصَارِیُّ قَالَ اَخْبَرَنِیْ مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاھِیْمَ التَّیْمِیُّ اَنَّہٗ سَمِعَ عَلْقَمَۃَ بْنَ وَقَّاصٍ ، اللَّیْثِيِّ یَقُوْلُ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ عَلَی الْمِنْبَرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ:اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَّانَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ،وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَااَوْاِلَی امْرَاَۃٍ یَنْکِحُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَاھَاجَرَ اِلَیْہِ. صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ. ①

کلماتِ تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ ہم لوگوں کی سعادت ہے کہ بخاری شریف کے افتتاح میں شرکت کا موقع ملا۔ عموماً اصحابِ درس کا طریق یہ ہے کہ وہ کسی بھی فن کی اہم کتاب شروع کرنے کے وقت چار چیزوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ سب سے پہلے مصنف کا اجمالی تعارف کراتے ہیں۔ دوسرے خود تصنیف کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ خود کتاب کی عظمت وجلالت کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے جس سے کتاب میں بحث کی گئی ہے اور چوتھے یہ کہ اس کی غرض وغایت کیا ہے؟ کیوں اس کتاب کو پڑھتے ہیں؟

اس کو اگر علمی اصطلاح میں لایا جائے تو وہ چار چیزیں یہ ہیں۔ سب سے پہلے "علت فاعلی" کہ اس کا فاعل کون ہے جس کی طرف ہم توجہ کررہے ہیں۔ دوسرے "علت مادی" کہ وہ کیا چیزیں ہیں جن پر مصنف نے بحث کی ہے اور تیسرے "علتِ صوری" کہ اس کتاب کی اور موضوع کی تشکیل کس طرح سے ہوئی ہے؟ اور چوتھے

① الصحیح للبخاری ، کتاب بدء الوحی،باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ ، ج: ۱ ،ص: ۱ برقم: ۱ .

''علتِ غائی'' کہ اس کے پڑھنے سے کیا غرض وغایت ہے۔ تو عام طور پر اصحاب درس علتِ فاعلی، علتِ مادی، علتِ صوری اور علتِ غائی انہیں چار چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔

جلالتِ امام رحمۃ اللہ علیہ...... جہاں تک مصنفؒ کی ذات کا تعلق ہے، وہ مسلمانوں کے قلوب میں آفتاب سے زیادہ مرکوز اور روشن ہے۔ کوئی زیادہ تعارف کرانے کی ضرورت نہیں ہے، اوائل میں سے ہیں، متقدمین میں سے ہیں، امام ہیں، حافظ ہیں اور مصنف ہیں۔ تمام اوصاف کمال جو اہل علم میں ہوتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان میں جمع فرمائی ہیں۔

تقریباً ۱۹۲ھ یا ۱۹۴ھ میں پیدائش ہوئی ہے۔ باسٹھ (۶۲) سال کی عمر ہوئی ہے اور قریب قریب ۲۵۳ھ یا ۲۵۶ھ میں وفات ہوئی ہے۔؟ نے یہ تین چیزیں جمع کی ہیں اور تاریخ بتلائی کہ کونسا سن ولادت کا ہے اور کون سا سن وفات کا ہے اور عمر کتنی ہے؟ تو ان تینوں کو ایک شعر میں جمع کر دیا ہے۔

كَانَ الْبُخَارِيُّ حَافِظًا وَّمُحَدِّثًا جَمَعَ الصَّحِيْحَ مُكَمِّلَ التَّحْرِيْرَ

مِيْلَادُهٗ صِدْقٌ وَمُـــدَّةُ عُمْرِهٖ فِيْهَا حَمِيْدٌ وَانْقَضٰى فِيْ نُوْرٍ

گویا سن ولادت تو صدق کے لفظ سے نکلتا ہے اور مدتِ عمر حمید کے لفظ سے ہے اور سن وفات نور کے لفظ میں ہے۔ ①

جہاں تک امام کی عظمت اور جلالت کا تعلق ہے۔ حافظہ، عدل واتقان، زہد وتقویٰ اور دیانت وہ اس سے زیادہ مشہور ہے جتنا کہ آفتاب کو ہم دیکھتے ہیں۔ پوری امت نے امام کی تلقی بالقبول کی ہے۔

حافظہ حق تعالیٰ نے محیرّ العقول عطاء فرمایا۔ اس زمانے میں حفظ ہی پر مدار تھا اور بڑے بڑے محدثین اور حفاظ حدیث پیدا ہوئے کہ جن کے حفظ کو بس کرامت ہی کہا جاسکتا ہے۔ عام طبعی طور پر یہ حافظے نہیں ہوتے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو زیادہ پھیلانا تھا تو حیرت ناک حافظے عطاء فرمائے، جس کو ہم کرامت ہی کہہ سکتے ہیں۔

کرامتِ حفظ...... امام ترمذیؒ مکہ مکرمہ کا سفر کر رہے تھے اور شیخ بھی ساتھ ہیں، جن کے امام ترمذی شاگرد ہیں۔ متعدد تلامیذ ساتھ ہیں۔ تمام تلامیذ نے درخواست کی کہ جہاز میں ایک لمبا وقت گزرے گا تو حدیث کا املاء کرادیا جائے۔ شیخ نے فرمایا کہ: شرط یہ ہے کہ کاغذ دوات ہو اور قلم لے کر بیٹھو۔ جو حدیث میں لکھ واؤں لکھتے جاؤ۔ یہ شرط مان لی گئی۔ امام ترمذی کے پاس نہ کاغذ تھا نہ قلم اور شوق یہ تھا کہ میں بھی درس میں حاضر ہوں۔ مگر شیخؒ نے شرط لگادی تھی۔

تو یہ کیا کہ پیچھے بیٹھے تھے اور ایک گھٹنا کھڑا کر کے بایاں ہاتھ اس پر رکھتے اور دائیں ہاتھ کو اس طرح حرکت دیتے تھے گویا لکھ رہے ہیں۔ تاکہ شیخ یہ سمجھیں کہ کاغذ بھی ہے اور لکھائی بھی ہورہی ہے۔ متعدد ایام گزر گئے، ایک دن شیخ کی نظر پڑی تو دیکھا کہ نہ کاغذ ہے نہ قلم ہے فرمایا۔ میں نے شرط لگائی تھی تم بلا کاغذ اور قلم کے کیسے آئے؟

① صدق ۱۹۴ھ، حمید ۶۲، نور ۲۵۶ھ ۶۲ سال عمر مبارک ہوئی۔

انہوں نے کہا کہ: حضرت! مقصد تو یہ تھا کہ چیز محفوظ ہو جائے. تو اس ایک ہفتے میں حضرت نے جتنی حدیثیں ارشاد کیں وہ سب محفوظ ہیں اور پہلے دن اتنی حدیثیں ان اسانید کے ساتھ سنائیں۔ دوسرے دن یہ حدیثیں فلاں فلاں سند کے ساتھ سنائیں، ہفتے کی کل حدیثیں مع اسانید کے حافظے سے بتلائیں۔ شیخ بڑے خوش ہوئے۔ گلے لگایا۔ فرمایا: تمہیں بیٹھنے کی اجازت ہے۔

اب یہ حافظ کہ دس دن بعد فرمائیں کہ فلاں دن یہ حدیثیں تھیں، اور یہ یہ سند تھی، فلاں دن یہ حدیثیں تھیں یہ یہ سند تھی۔ اس کو سوائے کرامت کے اور کیا کہا جائے۔ عام حافظے میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

امتحانِ حفظ...... یہ امام بخاریؒ جب بغداد تشریف لائے۔ تو محدثین میں چرچا تھا کہ ایک نوجوان ہے جو حافظ حدیث ہے اور حفظ کا جو شہرہ تھا یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا غیر معمولی حفظ ہو، تو ارادہ کیا گیا کہ امام بخاریؒ کے حافظے کا امتحان لیا جائے۔ دس محدث جمع ہوئے اور دس دس حدیثیں چھانٹ لیں۔ سو احادیث میں امتحان کرنا تھا۔ بہت عظیم مجمع ہوا۔

پہلے محدث نے دس حدیثیں بیان کیں اور سندیں الٹ دیں۔ کسی متن کی سند کسی کے ساتھ تھوپ دی، کسی کی سند کسی کے ساتھ، تو دس حدیثیں الٹ پلٹ کر کے بیان کیں۔

امام بخاریؒ فرماتے اَعْرِفُهٗ لَآ اَعْرِفُهٗ. اس کے بعد دوسرے محدث نے اسی طرح الٹ پلٹ کر کے کسی کی سند اور کسی کا متن خلط ملط کر کے بیان کیا۔

ہر حدیث پر فرماتے رہے "لَآ اَعْرِفُهٗ لَآ اَعْرِفُهٗ"

میں نہیں پہچانتا، سو کی سو حدیثیں اس طرح سے روایت کی گئیں ہر حدیث پر امام نے کہا: "لَآ اَعْرِفُهٗ لَآ اَعْرِفُهٗ" میں نہیں پہچانتا۔ لوگوں نے کہا کہ خواہ مخواہ شہرت ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان نہ حفظ رکھتا ہے، نہ اتقان رکھتا ہے وہ ہر چیز میں "لَآ اَعْرِفُهٗ لَآ اَعْرِفُهٗ" میں نہیں پہچانتا ہی کہتا جاتا ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو گیا تو امام بخاریؒ بولے سب سے پہلے محدثؒ نے اس ترتیب سے دس حدیثیں بیان کیں اور سندیں الٹ دیں۔ پہلی حدیث کی یہ سند ہے، دوسری کی یہ سند ہے، تیسری کی یہ ہے۔ دس کی دس صحیح سندیں بیان کیں۔ اس کے بعد کہا کہ دوسرے محدثؒ نے یہ دس حدیثیں بیان کیں، ان مین یہ خرابی تھی۔ یہ خرابی تھی۔ اس کی اصل سند یہ ہے، یہ ہے۔ سو کی سو روایتوں کی صحیح سندیں بیان کر دیں۔ تمام محدثین کی گردنیں جھک گئیں اور کہا جو سنا تھا وہ حقیقتاً سچ تھا اور یہ شخص امامت کے درجے تک پہنچا ہوا ہے۔ وہاں سے پھر امام بخاریؒ کا شہرہ ہوا۔ بہر حال امام بخاریؒ کا حافظہ، ان کا اتقان اور ان کا زہد و تقویٰ یہ گویا اظہر من الشمس ہے۔ ساری دنیا اس کو جانتی ہے۔

جلالتِ کتاب...... ظاہر بات ہے "قَدْرُ الشَّهَادَةِ قَدْرَ الشُّهُوْدِ" جیسا شہود ہوتا ہے ویسی ہی شہادت ہوتی ہے۔ جب امام اس درجہ کا ہے تو اس کی تصنیف بھی اسی درجہ کی ہوگی۔ تو بخاری کی جلالت شان یہ ہے کہ پوری امت نے اجمالی طور پر تلقی بالقبول کی ہے اور "اَصَحُّ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللهِ" مانا گیا ہے۔

بعض حضرات محدثین کی رائے ہے کہ "اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللہِ" امام مالکؒ کی مؤطا ہے اور وہ حدیث میں اوّلین تصنیف بھی ہے۔لیکن مؤطا کے اندر احادیث بھی ہیں، آثارِ صحابہ بھی ہیں اور فتاویٰ بھی ہیں۔تو مخلوط ہے۔

امام بخاریؒ نے تنقیح کی بلکہ ہر چیز کو الگ الگ کر دیا ہے۔ابواب اور فصول مرتب کئے اور ایسی کڑی شرائط لگائیں کہ دوسری عبارات اور اسانید میں وہ شرطیں نہیں پائی جاتیں، بالآخر امت کا اجماع ہو گیا کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری ہے۔اولین درجہ سند میں قرآن کریم کا ہے تو وہاں تواترِ طبقہ ہے۔یہ نہیں ہے کہ تواترِ روایت ہو یا تواترِ سند ہو۔بلکہ طبقاتی تواتر ہے۔ہر قرن میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں حافظِ قرآن مجید موجود ہیں۔اس واسطے وہ تواترِ طبقہ ہے کہ جس میں کذب کا شائبہ یا خلط ملط کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔اس کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔

اسماءُ الرجال...... احادیث میں محدثینؒ نے ''حق تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے'' اور بڑے بڑے مقامات دے، امت کے لئے سامان کر دیا۔روایات حدیث کے سلسلے میں پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخ جمع کر دی جو روایانِ حدیث ہیں۔ان کے خاندان کیا ہیں، ان کا کیریکٹر کیا ہے، ان کا کردار کیا ہے، حافظے کیسے تھے، عدالت کیسی تھی یہ سب جمع کر دیا ہے۔تو پچاس ہزار انسانوں کی تاریخ ان کے خاندانوں اور احوال سمیت مرتب کر دی کہ یہ روایانِ حدیث ہیں۔

میزانِ حدیث...... پھر مصطلحات الحدیث مستقل فن ایجاد کر دیا۔حدیث کے درجات قائم کر دیئے کہ اگر حدیث مرفوع متصل ہے اور طبقہ میں کم سے کم تین تین آدمی روایت کرتے آ رہے ہیں اس کو متواتر کہا۔جو مورثِ یقین ہوتی ہے، اس کے منکر کو جاحد کہا کہ وہ کفر میں مبتلا ہے اس سے دوسرا درجہ خبرِ مشہور کا ہے کہ کم سے کم دو دو آدمی صحابی سے لے کر اب تک روایت کرتے آ رہے ہوں۔کہیں زیادہ ہو جائیں تو مضائقہ نہیں مگر دو سے کم نہ ہوں، وہ حدیث مشہور کہلاتی ہے۔یہ مورثِ ظنِ غالب ہے جو قریب قریب یقین کے ہوتا ہے۔تیسرا درجہ خبرِ واحد کا رکھا کہ ایک ایک آدمی روایت کرتا آ رہا ہو۔درمیان میں بڑھ جائے تو مضائقہ نہیں مگر ایک سے کم نہ ہو، یہ خبرِ واحد یا خبرِ وحید کہلاتی ہے۔یہ مورثِ مطلق ظن ہوتی ہے۔اس کا منکر کافر تو نہیں ہوتا مگر فسق میں ضرور مبتلا ہو جاتا ہے، تو خبر مرفوع متصل، متواتر، مشہور، خبرِ واحد۔پھر اس کے بعد اگر بیچ میں انقطاع آئے تو منقطع۔اگر صحابیؓ کی جگہ پر انقطاع آئے تو مرسل، بیچ میں انقطاع مسلسل دو راویوں کا آئے تو معضل، غرض اقسامِ حدیث بیان کی گئی ہیں کہ حدیث مشہور ہے، متواتر ہے، معضل ہے، مشکل ہے، مجمل ہے، مجہول ہے۔ہر ایک کا الگ الگ درجہ بتلایا کہ کس درجے میں اس کی حیثیت ہے۔بہر حال محدثین نے ایسے کانٹے اور میزانیں بنا کر دیں کہ کوئی بوالہوس خلط ملط نہیں کر سکتا، اس کانٹے پر ناپ کر پانی الگ اور دودھ الگ کر دیا جاتا ہے، نکھار دیا جاتا ہے۔

انتخابِ احادیث...... امام بخاریؒ اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور کتاب میں سات لاکھ احادیث میں سے سات ہزار حدیثیں منتخب کیں ہیں۔اگر مکرّرات کو ملا دیا جائے تو سات ہزار بیٹھتی ہیں، مکرّرات کو حذف کر دیا جائے تو چار ہزار سے اوپر بیٹھتی ہیں جو روایتیں اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں بہر حال مصنف بھی جلیل القدر اور کتاب بھی جلیل القدر۔

شانِ قبولیت......خود مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "جَعَلْتُهُ بَيْنِي وَبَيْنَ اللّٰهِ حُجَّةً" ① میں نے اس کتاب کو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان حجت قرار دیا ہے۔

حجت اور دستاویز سے مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی کامیاب ہوتا ہے اور مقبول ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ مقبولیت کے لئے یہ حجت ہے۔ انشاء اللہ مصنف بھی مقبول اور جو جو کتاب کو پڑھتے ہیں اور حجت جان کر پڑھتے ہیں، وہ بھی انشاء اللہ عند اللہ مقبول ہیں۔ ان کے لئے یہ دستاویز ہے۔ یہ گویا کتاب کی شان ہے۔

موضوعِ کتاب......اس کا موضوع اقوال وافعالِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ نے جو زبان مبارک سے ارشاد فرمایا یا عمل کر کے دکھلایا یا کسی کے عمل پر سکوت فرمایا۔ یہ سکوت رضا ہے یہ سب احادیث میں داخل ہیں۔

عصمتِ انبیاء علیہم السلام......اس لئے کہ نبی کا قول اور فعل ہی شریعت ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام دین کے بارے میں معصوم پیدا فرمائے گئے ہیں اور اہلسنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ قبل از نبوت بھی معصوم ہیں اور بعد از نبوت بھی معصوم ہیں معصومیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مجبور کر دیئے گئے ہیں کہ گناہ نہ کریں۔ قوتیں ساری موجود ہیں۔ مگر مخالفتِ نفس کی اتنی قوت ہے کہ کوئی ایک درجہ بھی رضائے حق کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ قوت نفس اور مقاومت نفس اتنی ہے کہ شوائب نفس باقی نہیں رہے، مغلوب ہو گئے ہیں۔

بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کا نفس اتنا مطمئن ہوتا ہے کہ جو نفس میں خواہش آتی ہے وہ بھی پاک ہی آتی ہے۔ غیر پاک یا ناپاک آتی ہی نہیں۔ اتنے پاک اور صاف انبیاء علیہم السلام کے قلوب پیدا کئے گئے ہیں، جس کو صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کی عجیب شان ہے" إِنَّ رَبَّكَ يُسَارِعُكَ فِي هَوَاكَ" ②

آپ کی ہر خواہش کے پورا کرنے میں حق تعالیٰ اتنی جلدی فرماتے ہیں کہ ادھر دل میں خواہش آئی اور ادھر پوری ہوئی۔ وہ یہ ہے کہ نبی کے قلب میں خواہش ہی پاک آتی ہے۔ جب نبی کو مخلی باالطبع چھوڑ دیں گے تو خیر ہی کی طرف طبیعت جائے گی شر کی طرف نہیں جائے گی۔ تو خیر غالب ہوتی ہے اور ہوائے نفس اس کے تحت ہوتی ہے، ہر خواہش نفس میں انبیاء علیہم السلام کو رضائے حق کا دھیان ہر وقت رہتا ہے۔ کسی وقت بری خواہش ان کے قلب میں آتی ہی نہیں۔ "إِنَّ رَبَّكَ يُسَارِعُكَ فِي هَوَائِكَ"

حفاظتِ اولیاء......اور انبیاء علیہم السلام کے طفیل سے اور ان کی جوتیوں کی برکت سے انبیاء علیہم السلام کے خدام میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں کہ ان کے نفوس بھی مطمئن ہیں اور ان کی ہر خواہش پاک ہوتی ہے۔ جیسے

---

① تهذيب الكمال للعلامة المزى، فصل فى ماروى عن الائمة فى فضيلة هذه الكتب الستة، ج: ١، ص: ١٦٧.

② الحديث اخرجه الامام البخارى فى صحيحه ولفظه: مارى ربك الأ يسارع فى هوائك، كتاب التفسير، باب قوله تعالى ترجى من تشاء ج: ١٤، ص: ٢٧٢، رقم: ٤٤١٤.

حدیث میں ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ: ''اَلْحَقُّ يَنْطِقُ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ'' ① ''عمر کی زبان پر حق بولتا ہے''۔ ''دَارَ الْحَقُّ مَعَهٗ حَيْثُ دَارَ'' ''جدھر عمر جاتے ہیں، حق بھی ادھر جاتا ہے''۔

تو بظاہر تو یہ ہوتا کہ جدھر حق جاتا ہے ادھر عمر جاتے ہیں اور فرمایا جا رہا ہے کہ جدھر عمر جاتے ہیں، حق ادھر جاتا ہے۔ یہ انتہائی مقام ہے۔ اور مبتدی کا مقام یہ ہے کہ جدھر حق چلے ادھر ہی مبتدی بھی چلے۔ لیکن جب اس مشق کے بعد منتہی ہوتا ہے، پھر وہ جدھر جاتا ہے، حق ادھر ہی جاتا ہے، اس لئے قلب پاک اور مطمئن بن جاتا ہے اس میں وہ چیز ہی آتی ہے جو حق ہوتی ہے، ناحق چیز نہیں آتی۔ انبیاء علیہم السلام کے خدام میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ جدھر جھک جائیں حق بھی ادھر جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی شان تو بہت بلند و بالا ہے۔

بہرحال نبی، کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل اور سکوت سب شریعت ہے، اس لئے کہ وہ پاک ہی پاک ہے، خیر ہی خیر ہے۔ تو اس فن کا موضوع اقوالِ نبیؐ، افعالِ نبیؐ اور رضائے نبویؐ ہے۔

غرضِ کتاب...... اس کے پڑھنے کی غرض و غایت کیا ہے؟ رضائے خداوندی حاصل کرنا، آخرت کی کامیابی اور دنیا کی فلاح ہے۔ دارین کی فلاح اگر حاصل کرنی ہو تو فن حدیث کی طرف آدمی متوجہ ہو۔ یہ بالکل ایسی ہی صورت ہے جیسے ہم اور آپ اور دنیا کا کوئی بھی انسان بغیر نبی کے توسل کے خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

وساطتِ حدیث...... اگر انبیاء علیہم السلام کا واسطہ بیچ میں نہ ہو تو کوئی بھی خدا رسیدہ نہیں ہو سکتا۔ یہ انبیاء علیہم السلام ہی کا صدقہ ہے کہ بیچ میں آ کر بندے کو خدا سے جوڑ دیتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام ادھر بھی واسطہ، ادھر بھی واسطہ۔ ادھر مخلوق میں شامل، ادھر اللہ سے واصل۔ تو بیچ میں جو بھی آ جائے گا، اسے اللہ سے واصل کر دیں گے۔ بغیر نبی کے واسطے کے کوئی بھی انسان خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

اسی طرح سے لوگوں کا علمی کلام قرآن سے نہیں جڑ سکتا۔ جب تک بیچ میں کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ نہ ہو۔ تو حدیثِ نبوی قرآن سے لیتی ہے، فقہاء کو دیتی ہے۔ اگر فقیہہ کے کلام اور قرآن کریم کے بیچ میں حدیث نہ ہو تو فقہاء کا کلام قرآنِ کریم سے نہیں جڑ سکتا، جیسے افراد اللہ سے بغیر نبی کے واسطے نہیں جڑ سکتے ایسے ہی کلام الناس بھی بغیر کلامِ رسول کے واسطے کے کلامِ خداوندی سے نہیں جڑ سکتا۔ تو حدیث بیچ میں واسطہ ہے۔ قرآن سے لیتی ہے اور فقہاء کو دیتی ہے۔

بیان القرآن...... اسی واسطے حدیث کو بیانِ قرآن کہا گیا ہے۔ ایک قرآن ہے اور ایک بیانِ قرآن ہے۔ قرآنِ کریم تو وہ کلمات اور الفاظ ہیں جو منزل من اللہ ہیں ان کے معنی بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر خود

① الحديث أخرجه الامام ابن ماجه رحمه الله تعالىٰ في سننه: عن ابي ذر رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: ان الله وضع الحق علىٰ لسان عمر. كتاب السنة، باب فضل عمر رضي الله عنه، ج: ۱، ص: ۱۱۹، رقم: ۱۰۵.

ہی اللہ تعالیٰ نے اتارے۔ تو قرآن لفظوں اور معنی کا مجموعہ ہے۔ لفظ بھی منزّل من اللہ ہیں اور معنی بھی منزّل من اللہ ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فکر اور سوچ سے قرآن کے معانی متعین کئے ہوں کہ یہ مطلب ہوسکتا ہے۔ اس مطلب کو بھی اللہ ہی نے واضح کیا ہے۔ تو لفظ بھی اللہ کے ہیں، معنی بھی اللہ کے ہیں۔

چنانچہ ابتداء میں یہ تھا کہ جب وحی نازل ہوتی تو جلدی جلدی رٹنا شروع کر دیتے کہ کہیں بھول نہ جاؤں۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: ﴿لَاتُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ① "آپ جلدی نہ کریں۔ آپ کو یہی تو ڈر ہے کہ آپ بھول نہ جائیں"۔ فرمایا: ﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ② ہمارے ذمہ ہے کہ ہم آپ کے سینے میں جمع بھی کر دیں اور آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں۔ اس کی فکر نہ کریں۔ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ③ جب ہم قرات کریں۔ از خود یا بواسطہ ملک کے۔ آپ سنتے رہیں۔ ہمہ تن گوش ہو کر اسے جذب کر لیں۔ دھیان نہ کریں، نہ عقل لڑائیں نہ حواس کو دخل دیں۔ صرف جذب کریں۔ آگے اس کا جمع کرنا، پڑھوانا اور جمع کر دینا یہ ہمارے ذمہ ہے۔ تو الفاظ سے جمع کرنے کی اور زبان سے پڑھوا دینے کی گارنٹی حق تعالیٰ نے دی۔ ﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾

اس کے بعد پھر فرماتے ہیں: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ﴾ ④ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول دینا بھی کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کی مراد کیا ہے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ میں بھی امین ہیں اور معنی میں بھی امین ہیں۔ پوری امانت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے کلمات بھی پہنچا دیئے اور حق تعالیٰ کے کلام سے جو مرادات ہیں، وہ بھی بندوں تک پہنچا دیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم امین ہی امین ہیں۔

اہمیت فنِ حدیث...... بہر حال قرآن کریم اور کلام فقہاء کے درمیان اگر اتصال کا واسطہ ہے تو وہ حدیث ہے۔ اگر حدیث بیچ میں نہ ہو تو کلام فقہاء کا حدیث سے کوئی جوڑ نہیں لگ سکتا۔ جیسا کہ بندوں اور خدا کے درمیان اگر انبیاء علیہم السلام کا واسطہ نہ ہو تو کوئی بندہ اپنے خدا سے مربوط نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے اسلام میں فن حدیث کی اہمیت ہے۔ اور یہ دنیا میں اعلیٰ ترین اور اشرف ترین فن شمار کیا گیا ہے۔ تو اس فن میں اعلیٰ ترین کتاب یہ ہے، جس کا نام بخاری ہے۔ جسے اللہ اور بندے کے درمیان امام بخاریؒ نے حجت قرار دیا ہے۔ وہ آج شروع ہو رہی ہے۔ شروع میں اس میں چند مباحث ہیں۔ جو اکثر حضرات اساتذہ بیان کرتے ہیں۔

حمد و نعت سے ابتداء نہ کرنے کی وجہ...... پہلی بات تو یہ کہ عام کتابوں کا طریقہ یہ ہے کہ کتابیں حمد و نعت سے شروع کی جاتی ہیں۔ خطبہ ماثورہ ہوتا ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِیْنُهٗ" الخ اسی میں حمد ہوتی ہے نعت بھی ہوتی ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوۃ وسلام ہوتا ہے۔ امام بخاریؒ نے یہ نہیں کیا بس بسم اللہ سے کتاب شروع کر دی۔ تو ایک عام شبہ اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ امام بخاریؒ نے عام مروجہ طریق کے خلاف کیوں

① پارہ: ۲۹، سورة القيامة، الآية: ۱۶. ② پارہ: ۲۹، سورة القيامة، الآية: ۱۷.
③ پارہ: ۲۹، سورة القيامة، الآية: ۱۸. ④ پارہ: ۲۹، سورة القيامة، الآية: ۱۹.

کیا؟ لیکن حقیقت میں یہ کوئی اعتراض نہیں۔ اس لئے کہ سب سے پہلے یہ سوال کیا جائے گا کہ اس اعتراض کا منشاء کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے کس حدیث یا نص کی خلاف ورزی کی ہے؟ بظاہر ایک رواج کی خلاف ورزی کر دی، تو رواج کوئی حجت قاطعہ تو نہیں تھا کہ امام خواہ مخواہ اس کی پابندی کرتے؟ تو اصل منشاء کیا ہے؟

تو منشاء یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ ''کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَءْ بِبِسْمِ اللّٰہِ تَعَالٰی فَھُوَ اَقْطَعُ'' جو مہتم بالشان کام خدا کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ مقطوع البرکۃ ہوتا ہے۔ یہ حجت تھی۔ لیکن چھ طریقوں سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے اس کے کلمات مختلف ہیں: ایک صیغہ ''کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَءْ بِبِسْمِ اللّٰہِ تَعَالٰی فَھُوَ اَقْطَعُ'' دوسرا صیغہ یہ ہے: ''کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَءْ بِبِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فَھُوَ اَقْطَعُ'' ① تیسرا صیغہ یہ ہے: ''کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَءْ بِذِکْرِ اللّٰہِ تَعَالٰی فَھُوَ اَقْطَعُ'' ② اسی طرح سے اور بھی ہیں جو تقریباً چھ صیغے ہیں۔ تو سب میں قدر مشترک یہ نکلتا ہے کہ ''ذِکْرُ اللّٰہِ'' سے آغاز کیا جائے۔ اس میں بِسْمِ اللّٰہ بھی آ گئی، اِسْمُ اللّٰہِ بھی آ گیا، ذِکْرُ اللّٰہ بھی آ گیا۔ ان کا قدر مشترک یہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے آغاز ہو۔ تو مصنف نے بِسْمِ اللّٰہِ سے آغاز کر دیا۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ بسم اللہ بھی تو ذکر ہے اور اعلیٰ ترین ذکر ہے۔ پھر انہوں نے شبہ کیا کہ اگر لکھ دیتے تو کیا حرج تھا؟ تو سوال یہ ہے کہ نہ لکھتے تو کیا حرج تھا؟

حدیث میں یہ ہے کہ ''کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَأْ'' الخ..... کوئی مہتم بالشان کام جس کو ذکر اللہ سے شروع نہ کیا جائے مَقْطُوْعُ الْبَرَکَۃِ ہے۔ تو اس حدیث میں لَمْ یُبْدَءْ کا لفظ ہے لَمْ یُکْتَبْ کا لفظ تو نہیں ہے کہ کوئی اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ کے شروع میں اگر بِسْمِ اللّٰہ نہ لکھی جائے وہ مَقْطُوْعُ الْبَرَکَتْ ہوتا ہے لَمْ یُبْدَءْ شروع نہ کیا جائے۔ اب خواہ زبان سے شروع کر دے، لکھ کر شروع کر دے، دل سے شروع کر دے۔ حدیث پر عمل ہو جائیگا۔ تو مصنفؒ نے اگر نہیں لکھا تو حمد ثناء زبان سے کہہ دی ہو گی۔

ہر حدیث کی ابتداء میں اذکارِ عشرہ...... اور میں تو یہ کہتا ہوں۔ کسی کتاب میں تو نہیں دیکھا مگر بہر حال قواعدِ فن کے بھی خلاف نہیں۔ کہ امام بخاریؒ کا طریق یہ ہے جو راویوں نے نقل کیا ہے کہ امام نے مکہ مکرمہ (زَادَ ھَا اللّٰہُ شَرَفًا وَّ کَرَامَۃً) میں سولہ برس گزارے ہیں اور وہیں بخاریؒ کی تکمیل فرمائی ہے۔ اس دوران میں اور بھی سفر ہوئے مگر مستقر مکہ مکرمہ رہا، یہاں بیٹھ کر بخاری کی تکمیل کی ہے اور تکمیل بھی اس طرح سے کی ہے کہ ہر حدیث لکھنے سے پہلے غسل کرتے۔ پھر دو رکعت نفل پڑھتے۔ جب انشراح تام ہو جاتا تب حدیث نقل کرتے، تو ہر حدیث کو نماز اور غسل سے شروع کیا ہے۔ اور نماز اذکارِ عشرہ کا مجموعہ ہے۔ نماز کے اندر بِسْمِ اللّٰہِ بھی ہے، اَعُوْذُ بِاللّٰہِ بھی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھی ہے، تکبیر بھی ہے، تحمید بھی ہے، تسبیح بھی ہے، تھلیل

① کنز العمال، ج: ۱، ص: ۵۵۵، رقم: ۲۴۹۰ (عبدالقادر الدھلوی فی الاربعین عن ابی ھریرۃؓ)

② مسند احمد، مسند ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ، ج: ۱۷ ص: ۳۹۷.

بھی ہے جواذ کارعشرہ کہلاتے ہیں اور دین میں معروف ہیں وہ سارے اذ کار جمع کئے، طاعت وعبادت کی ساری ہیئتیں جمع کیں۔تو میں کہتا ہوں کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ذکر سے ابتداء نہیں کی۔ میں کہتا ہوں کہ بخاری نے ایک ایک حدیث میں نماز اوراذ کارعشرہ سے ابتداء کی ہے۔اس سے زیادہ اور آپ امام بخاریؒ سے کیا چاہتے ہیں؟۔اگر کتاب میں اذ کارعشرہ نہیں لکھے۔تو ہر حدیث کی ابتداء میں اذ کارعشرہ کئے ہیں۔اس کے بغیر حدیث نہیں لکھی۔ لَمْ يُكْتَبْ کا لفظ تو ہے نہیں لَمْ يُبْدَأ کا لفظ ہے اور بدایت اس طرح سے کی کہ ایک ایک حدیث کے لکھنے سے پہلے نماز پڑھ لی۔ ہر نماز میں سارے اذ کار ادا کئے،تو آپ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ذکر سے شروع نہیں کیا، میں کہتا ہوں کہ ہر ہر حدیث کو اذ کارعشرہ سے شروع کیا ہے۔اس کی کوئی نظیر بتلائے۔یہ کیا اعتراض کی بات ہوئی۔؟ غرض اس میں مصنفؒ پر کوئی شبہ نہیں پڑتا۔

ابتداءِ کتاب میں اتباعِ سنت کا اہتمام......اب آگے اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اذ کار میں بِسْــــمِ اللهِ بھی داخل ہے اَلْحَمْدُلِلّٰهِ بھی داخل ہے تو بِسْمِ اللهِ ہی کی کیوں تخصیص کی؟ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ کیوں نہ لکھ دیا۔؟ اس قسم کے سوالات طالبعلمانہ ہوتے ہیں کہ لکھا کیوں نہیں؟ فقط بِسْمِ اللهِ ہی کیوں لکھی؟

تو میں کہتا ہوں کہ اس میں بھی امام بخاریؒ نے اتباعِ سنت کیا ہے۔اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب آپ منبر پر وعظ اور خطاب فرماتے تو پورا خطبہ ماثورہ پڑھتے "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِينُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ" الخ اور جب سلاطین کو دعوتِ اسلام کا فرمان بھیجتے تو اس میں فقط بِسْمِ اللّٰهِ ہوتی تھی اس کے بعد "مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰى فُلَانَ اِلٰى فُلَانَ".تو عادت کریمہ یہ تھی کہ خطبات اور مواعظ کے شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورا خطبہَ ماثورہ پڑھتے اور فرامین لکھتے تو فقط بسم اللہ پر اکتفاء فرماتے۔تو امامؒ نے دیکھا کہ حدیثیں فی الحقیقت فرامین ہیں جوامت کے نام بھیجے گئے ہیں۔تو بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ابتداء کی۔

ترجمۃُ الباب اور حدیث میں مناسبت......اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔وہ یہ کہ باب رکھا "كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ" وحی کا آغاز کیسے ہوا؟ اور حدیث لائے "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ." دوسری حدیث میں جس میں وحی کی کیفیت ذکر کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: وحی اس طرح سے میرے اوپر آتی ہے، "يَاْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ" جیسے گھنٹہ بجانے کے بعد جو گونج پیدا ہوتی ہے بس اس قسم کی آواز سنتا ہوں،اس میں سے پھر حروف متمیز ہوتے ہیں۔تو اگر بَدْءُ الْوَحْيِ کا باب رکھا تھا تو اگلی حدیث لانی چاہئے تھی، یہ بیچ میں "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کا کیا ذکر؟ تو ترجمۃ الباب میں اور حدیث میں کوئی مناسبت قائم نہیں ہوتی، یہ ایک سوال کیا جاتا ہے۔حالانکہ مصنف کا طریق یہ ہے کہ ترجمۃ الباب وہ رکھتے ہیں جو بعد میں حدیث لاتے ہیں۔تو حدیث میں اور ترجمۃ الباب میں کامل مناسبت ہوتی ہے۔ یہاں بظاہر کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ کہاں بَدْءُ الْوَحْيِ اور کہاں "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کہ عمل نیت سے ہوتا ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو کامل مناسبت ہے۔اس واسطے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر جب وحی آتی ہے۔تو نبی کے قلب میں پہلا جذبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جتنا جلد ہو سکے اسے امت تک پہنچاؤں۔یہی تو نیت تھی۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اس وحی کا تحمل بھی کروں اور امت کے لیے اس وحی کی ادائیگی بھی کروں۔نزول وحی کے وقت انبیاعلیہم السلام کی یہی دونیتیں ہوتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے نزول کے وقت سب سے پہلی چیز جو قلب نبوت میں آتی ہے وہ نیت ہے یا وحی کا انجذاب ہے۔تو "بَدْءُ الْوَحْيِ" کو "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" ① سے کامل مناسبت ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں وحی کے اترنے کے وقت یہ نیت تھی کہ میں اسے جذب کروں۔یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رٹنے لگتے تھے جس سے حق تعالیٰ نے روک دیا کہ ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ② آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی نہ کریں۔ہم آپ کے قلبِ مبارک میں جمع کر دیں گے"

تو قلب مبارک میں پہلی نیت تو یہ آئی کہ میں اس وحی کو اپنے اندر جذب کرلوں اور ایسا یادرکھوں کہ بھول نہ سکوں۔تو سب سے پہلی نیت نبی کے قلب میں یہ آتی ہے کہ اس کا تحمل کرلوں اور اسے جذب کرلوں، اسے جزو نفس کرلوں۔اس کے بعد دوسری نیت یہ ہوتی ہے کہ اسے مخلوق کی طرف پہنچاؤں اور اس امانت کو ادا کردوں۔تو معلوم ہوتا ہے کہ وحی کو نیت سے کامل مناسبت ہے۔نبی پر جب وحی آتی ہے تو سب سے پہلے قلب کے اندر نیت کا انضباط ہوتا ہے اس واسطے اگر بدء الوحی کے نیچے "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" لائے تو کامل مناسبت پیدا ہوگئی کہ یہی حدیث لانی چاہئے۔تو پوری مناسبت ہے۔یہ کوئی شبہ واعتراض کی بات نہیں۔

"كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ." "وحی کی ابتداء کس طرح سے ہوئی؟" کس طرح سے وحی آئی؟ یہ تو اللہ کا فعل ہے کہ کس طرح سے وحی بھیجی؟ نبی کا فعل یہ ہے کہ جب وحی آئی تو نبی نے کیا نیت کی؟ یہ کہ اس کا تحمل بھی کروں اور ادائیگی بھی کردوں۔تو نیت اور وحی میں کامل مناسبت ہے۔

مثلاً آپ کے سامنے اگر وحی قرآنی پیش کی جائے یا وحی حدیث ہی پیش کی جائے تو سب سے پہلے آپ کے دل میں نیت ہی تو آتی ہے کہ اسے مان لوں۔ماننے کے بعد یہ نیت آتی ہے کہ اس پر عمل بھی کروں، اس کے برکات اور فوائد بھی حاصل کروں۔تو وحی کو نیت سے اتنی مناسبت ہے کہ درجہء اوّل میں وحی ہے اور درجۂ دوم میں نیت ہے۔بالکل مطابقت ہے۔

امام رحمۃ اللہ علیہ کا تفقُّہ......تو امام بخاری نے "كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ" کا باب رکھ کر پھر حدیث "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کا ذکر کیا، اس سے کمالِ مناسبت ظاہر ہوتی ہے کہ وحی نمبر اوّل ہے اور نیت نمبر دوم ہے، تو ان

① الصحيح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب كيف كان بدء الوحی الى رسول الله ﷺ، ج:۱، ص:۴، رقم:۱۔

② پاره: ۲۹، سورة القيامة الآية: ۱۶۔

میں کامل تطبیق ہے۔اس واسطے بدءالوحی کے تحت میں حدیثِ مذکور کا آنا برمحل اور بہت موزوں ثابت ہوا۔

اس سے گویا امام بخاریؒ کے تفقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔تو امام بخاریؒ فقط محدث ہی نہیں تھے بلکہ فقیہ بھی تھے۔فقط روایت ہی سامنے نہیں تھی بلکہ درایت بھی سامنے تھی۔حدیث کے الفاظ ہی سامنے نہیں تھے بلکہ حدیث کے معانی اور حدیث کے حقائق اور معارف بھی ان کے قلب میں موجود تھے۔تو امام بخاریؒ روایت اور درایت دونوں کے جامع ہیں۔اسی واسطے علماء لکھتے ہیں کہ "فِقْهُ الْبُخَارِیْ فِیْ تَرَاجِمِهٖ". امام بخاریؒ کا فقہ اگر دیکھنا ہو تو ان تراجم کو دیکھو جو باب رکھتے ہیں،مثلاً یہی "بَابٌ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ بَابُ الْإِيْمَانِ، بَابُ الصَّلٰوةِ" وغیرہ۔اوران کے نیچے روایتیں لاتے ہیں۔تو امام بخاریؒ کا اگر فقہ دیکھنا ہو تو ابواب وتراجم کو دیکھ لو۔اس سے تفقہ معلوم ہوگا۔

درجۂ اجتہاد...... یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ اجتہاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ویسے معروف تو یہ ہے کہ وہ شافعی ہیں اور اکثر اعمال میں ہیں بھی شافعی۔لیکن احادیث میں جب غور کیا جاتا ہے اوران کی رائے معلوم ہوتی ہے تو بعض راؤں میں فقہ حنفی کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض میں امام شافعیؒ کی فقہ کو اور بعض میں امام مالکؒ کی فقہ کو مختلف مذاہب کی ترجیحات ذکر کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود صاحبِ اجتہاد ہیں۔خود مستقل ان کی ایک رائے ہے۔تو محض مقلد ہی نہیں بلکہ مجتہد بھی ہیں۔جس درجہ کا بھی اجتہاد ہو مگر اجتہاد ہے۔تو ان کا تفقہ تراجم وابواب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ "بَابٌ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ" یہ ترجمہ ہے اوراس کے نیچے "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کی حدیث لائے ،اس سے تفقہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ وحی اور نیت کی کیسی تطبیق ان کے قلبِ مبارک میں آئی کہ وہی حدیث ذکر کی جو بَدْءُ الْوَحْيِ کے ساتھ زیادہ مناسب تھی۔بہر حال امام بخاریؒ نے اگر بِسْمِ اللّٰهِ سے آغاز کیا تو اتباعِ سنت کیا۔ابتداء میں میں بَدْاُء الْوَحْيِ کا ذکر لائے تو مادۂ شریعت کا ذکر کیا جس کا مقام اوّلیت کا ہے پھر بَدْءُ الْوَحْيِ کے ساتھ "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کو لائے ،اس سے تفقہ معلوم ہوتا ہے کہ وحی کو نیت سے کتنی کامل مناسبت ہے۔

تشریحِ حدیث...... اس کے بعد حدیث نقل کی "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَ إِنَّمَا لِامْرِءٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَّتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ إِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ."

اصلِ کلی...... اس حدیث کے تین جز ہیں۔سب سے پہلا جز "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" ہے۔یہ ایک اصلِ کلی ہے جس میں کسی عمل کی طرف اشارہ نہیں۔حاصل اس کا یہ ہے کہ عمل نیت سے ہے۔نیت اچھی عمل اچھا۔نیت بری عمل برا۔عمل نیت کے تابع ہے۔بعض نے کہا ہے کہ: "إِنَّمَا ثَوَابُ الْأَعْمَالِ بِالنِّيَّاتِ" عمل پر جو ثواب ملتا ہے وہ نیت ہی سے ملتا ہے اور بعض نے کہا: "إِنَّمَا صِحَّةُ الْأَعْمَالِ بِالنِّيَّاتِ" جب تک نیت نہ ہو عمل صحیح نہیں ہوتا۔

ہر ایک چیز پر اعتراض پڑتا ہے اس واسطے کہ شریعت کے بعضے اعمال ایسے ہیں کہ نیت نہ ہو تب بھی شریعت معتبر

مان لیتی ہے، ایک شخص جنبی ہے، بلانیت کے دریا میں کود گیا۔ شریعت نے اس عمل کو معقول سمجھا۔ وہ پاک ہو گیا۔ نماز ادا کر سکے گا، یا ایک شخص نے وضو کیا، نیت کچھ نہیں کی۔ لیکن اس کا وضو مفتاحِ صلوٰۃ بن جائے گا۔ شریعت اس کو معتبر مانے گی۔ تو یہ کہنا کہ "اِنَّمَا صِحَّۃُ الْاَعْمَالِ بِالنِّیَّاتِ" عمل نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتا، یہ چلنے والا اصول نہیں ہے، بہت سے اعمال ایسے ہیں جو صحیح ہو جاتے ہیں اور شریعت میں معتبر ہو جاتے ہیں حالاں کہ نیت نہیں ہوتی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ عمل کا ثواب اس وقت تک نہیں ملتا جب تک کہ نیت نہ ہو۔ اگر بلانیت کے وضو ہوا تو مفتاحِ صلوۃ تو بن جائے گا مگر اجر نہیں ملے گا جب تک تقرب کی نیت نہ ہو۔ نماز اس درجہ میں صحیح ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ عام یہ ہے کہ جیسی نیت ویسا عمل، نیت اچھی تو عمل اچھا، نیت بری تو عمل برا۔ تو "وُجُوْدُ الْاَعْمَالِ یا صِحَّۃُ الْاَعْمَالِ" تو صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ ثَوَابُ الْاَعْمَالِ اس درجہ میں صحیح ہوگا، یا پھر اعتبار کا لفظ (مقدر مانا جائے) کہ "اِنَّمَا تُعْتَبَرُ الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" عمل کا اعتبار نیت سے ہے، جیسی نیت ویسا عمل۔ بہر حال سب معنی محدثین نے ذکر کئے ہیں۔ تو پہلا جملہ "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" یہ ایک اصلِ کلی ہے۔ اس میں کسی عمل کا ذکر نہیں۔ جو بھی عمل ہو وہ "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" کے نیچے آجائے گا تو ایک اصلِ کلی ذکر فرمایا۔

انتفاعِ نیّت...... اس کے بعد دوسرا جملہ "وَاِنَّمَا لِامْرِءٍ مَّانَوٰی" ہے، جیسی نیت کرے گا، وہی صلہ ملے گا۔ یہ دراصل ایک سوال کا جواب ہے۔ کیوں کہ جب آپ نے نیت کی تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اس نیت پر کوئی فائدہ بھی مرتب ہوگا یا خالی نیت ہی کرانی ہے۔ کوئی ثمرہ مرتب ہوگا یا نہیں؟ یا قلب کا ایک تخیل ہے کہ ہم نے نیت کر لی۔

تو دوسرے جملے میں اس کا جواب دیا کہ نہیں، اس کا انتفاع بھی ہوگا۔ اگر نیت اچھی ہے تو عنداللہ عمل معتبر ہے۔ اس پر اجر و ثواب مرتب ہوگا اور جیسی نیت کی وہی اس کو ملے گا۔ اگر اللہ و رسول کی قربت کی نیت کی ہے تو تقرب مل جائے گا۔ اگر دنیوی مصالح کی نیت کی ہے تو وہ مصلحت مرتب ہو جائے گی۔ مگر نیت رائیگاں نہیں جائے گی۔ ضرور اس پر ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔

ابتدا و ظہورِ عمل...... اسی واسطے شرعی طور پر فرمایا گیا کہ "نِیَّۃُ الْمَرْءِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ" ① "آدمی کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے"۔ یعنی عمل کا آغاز نیت سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے دل عمل کرتا ہے جو نیت ہے۔ اس کے بعد ہاتھ، پیر عمل کرتے ہیں۔ وہ ہیئت عمل ہے۔ تو سب سے اوّل عمل کی ابتداء قلب سے ہوتی ہے اور وہ نیت کی صورت میں ہے۔ تو جس نے عمل کی نیت کر لی گویا اس نے اپنے دل سے عمل کر لیا۔ عمل کا ظہور نہیں ہوا وہ ہاتھ پیر سے ہوگا۔ مگر اس پر بھی نفع مرتب ہوتا ہے۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ایک شخص نے نیت کی کہ فلاں نیک کام کروں۔ ابھی کیا نہیں تو فرشتہ لکھ دیتا ہے کہ ایک نیکی کر لی۔ اس پر آخرت میں ثواب مرتب ہوگا۔ تو مطلق نیت پر بھی ثواب مرتب ہوتا ہے۔ اگر بدی کی نیت کی تو قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ ایک بدی لکھ دیتے، مگر نہیں لکھی جاتی۔ اگر

① المعجم الکبیر للطبرانی، باب السین، سھل بن سعد الساعدی، ج: ٦ ص: ١٨٥.

نیت بدل گئی کہ اس بدی کو نہیں کروں گا تو اس رک جانے پر ایک نیکی لکھ دیتے ہیں کہ یہ بھی ایک حسنہ اور نیکی ہے۔ یہ قلب ہی قلب سے معاملہ چل رہا ہے۔ اور نیّت پر ثمرات مرتب ہو رہے ہیں۔ تو پہلا جملہ ثواب وعذاب سے قطع نظر محض ایک اصول تھا کہ جیسی نیت ویسا عمل، دوسرے جملے میں انتفاع کی طرف اشارہ ہے کہ یہ رائیگاں نہیں بلکہ جیسی نیت ہوگی ویسے ثمرات مرتب ہوں گے ''وَاِنَّمَا لِامْرِءٍ مانوی'' جیسی نیت کرے گا وہ آگے آجائے گی۔ دنیا کی نیت کرے گا دنیا آجائے گی۔ آخرت کی نیت کرے گا آخرت آجائے گی۔

ثمراتِ نیّت ...... جن کے واقعہ میں یہ حدیث ارشاد فرمائی گئی۔ یعنی حدیث کا شانِ نزول، وہ صحابی ہیں جنہوں نے اس نیّت سے مدینہ ہجرت کی تھی کہ فلاں عورت مالدار ہے، امّ قیس اس کا نام ہے، اس سے نکاح بھی کریں گے، دولت مند ہے کوئی مال بھی حاصل ہوگا۔ یہ نیت کی اور ہجرت کی۔ اس پر ارشاد فرمایا گیا ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِءٍ مَّانَوٰى'' ''جو نیت کی ہے وہ ملے گا۔ اگر عورت کی نیت کی ہے وہ مل جائے گی''۔

مگر خدا نہیں ملے گا۔ اگر خدا کی نیت کی ہے تو خدا ملے گا۔ جیسی نیت ویسا ثمرہ۔ تو دوسرے جملہ میں ثمرہ بتلایا گیا ہے کہ یہ نیت رائیگاں نہیں جاتی بلکہ اس سے انتفاع ہوتا ہے، دنیا اور آخرت کا اس سے آدمی نفع اٹھاتا ہے۔

واقعۂ جزئی ...... چناں چہ اس صحابی کا لقب ہی ''مُهَاجِرُ اُمِّ قَيْسٍ'' مشہور ہو گیا کہ یہ ام قیس کے مہاجر تھے جو مدینے گئے اور عورت کی نیت کی۔ بعد میں نیت درست کی ہوگی، توبہ کی ہوگی۔ غرض پہلا جملہ اصل کلی ہے، دوسرا جملہ اس اصل سے انتفاع کا بیان ہے کہ آدمی نیت سے منتفع ہوگا۔ جیسی نیت کی ہوگی ویسے ثمرات سامنے آئیں گے۔

اور تیسرا جملہ ایک جزوی مثال کا ہے۔ ''فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ اِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهُ اِلَى اللهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْ اِلَى امْرَاَةٍ يَّتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ.'' تو پہلے جملے میں اصول بیان کیا گیا دوسرے جملہ میں انتفاع بیان کیا گیا اور تیسرے جملے میں جزوی مثال بیان کی گئی۔

جامعیتِ حدیث ...... اور ظاہر بات ہے کہ یہی تین درجے ہیں کہ جن سے ایک دعویٰ منضبط اور مرتّب ہوتا ہے کہ پہلے دعویٰ کرو، پھر اس کی غرض وغایت بیان کرو۔ پھر اس کی ایک حسّی مثال بیان کرو۔ تو دعویٰ منقح اور ثابت ہو جاتا ہے۔ تو یہ حدیث جامع ترین حدیث ہے اور جوامع الکلم میں سے ہے۔ جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: چھ چیزیں مجھے عطاء کی ہیں جو پچھلے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دی گئیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے ''اُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ'' مجھے جامع جملے دیئے گئے ہیں کہ چھوٹا جملہ بولتا ہوں اور علوم کے دریا اس کے اندر چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور ہزار ہا ہزار مسائل اس سے نکل آتے ہیں۔ تو یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے کہ تین جملے ہیں اور تینوں میں تین علوم ہیں اور الگ الگ تین فوائد ہیں۔ ایک اصل کلی ایک انتفائی کلیہ اور ایک مثال جزوی۔ غرض یہ حدیث جامع ترین حدیث ہے جس کو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا تھا۔

غور کیا جائے تو اس ایک حدیث پر عمل ہو تو آدمی کامیاب ہے۔ ہر چیز میں نیت کر لیا کریں۔ تو دنیا بھی دین

بنتی چلی جائے گی لباس پہنتے ہوئے اگر یہ نیت کرلیں کہ حکم خداوندی کی تعمیل کررہا ہوں، بدن چھپانا واجب ہے، اب یہ عبادت بن گیا۔ اس پر اجر وثواب مرتب ہوگا۔ کھانا کھاتے ہوئے نیت کرلے کہ تقویٰ علی العبادت کے لئے کھا رہا ہوں کہ قوت پیدا ہو تو اللہ کو یاد کروں' پھر یہ سارا کھانا عبادت میں داخل ہو جائے گا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے یہ نیت کرے کہ اتباعِ سنت یہ ہے کہ گھر میں سلام اور اللہ کے نام سے داخل ہو تو میں اتباعِ سنت کررہا ہوں، یہ گھر میں داخل ہونا عبادت بن جائے گا۔ تو پوری دنیا کو دین بنالینا یہ نیت سے ممکن ہے۔ بری نیت ہو تو عبادت بھی بری کی اور اعلیٰ نیت ہو تو عادت بھی عبادت بن جاتی ہے۔

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے بھی ہے۔ اور دین کا نچوڑ اس میں گویا بیان کردیا ہے کہ دین کا آغاز نیت ہی سے ہوتا ہے۔ آدمی جب اسلام قبول کرتا ہے تو اس کی نیت یہی تو ہوتی ہے کہ خدا کے دین میں داخل ہو جاؤں۔ تو نیت سے دین کا آغاز ہوا۔ آگے عمل کا درجہ اب باقی ہے۔ یہ جوامع الکلم میں سے بھی ہے اور یہ حدیث دین کا اصل الاصول بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کو امام بخاریؒ ابتداءً لائے۔

ضروری تنبیہ...... دوسرے یہ بھی ایک فائدہ ہے کہ امامؒ طلباء کے لئے گویا اشارہ کررہے ہیں کہ جو بخاری پڑھنے کے لئے بیٹھے ہیں، وہ سب ابھی سے اپنی نیت درست کرلیں کہ بخاری کیوں پڑھ رہے ہو؟ اگر صحیح نیت ہے تو اخیر تک یہ دین بنتا جائے گا، اگر نیت غلط کی ہے مثلاً کوئی اس لیے بخاری پڑھ رہا ہوں کہ میں محدث کہلاؤں تو شہرت طلبی مقصود ہوئی، خدا طلبی مقصود نہ ہوئی۔ اگر کوئی اس لئے پڑھ رہا ہے کہ اس کے ذریعے سے دنیا کماؤں تو دنیا حاصل ہوگی آخرت نہیں ملے گی اس واسطے امامؒ نے گویا ابتداء اس کو روایت کرکے طالبانِ علم کے لئے تنبیہ کی ہے کہ سب سے پہلے اپنی نیت درست کرلو کہ کیوں بخاری پڑھ رہے ہو؟ تمہاری غرض وغایت کیا ہے؟ جیسی اخیر تک نیت کروگے، وہی ثمرات مرتب ہوتے چلے جائیں گے۔ تو جوامع الکلم میں سے بھی ہے، دین کی اساس بھی ہے اور ایک مختصر نصیحت جو پورے انسانوں کے دین کے لئے ہے اور جامع بھی ہے۔ اس واسطے امام بخاریؒ کا تقویٰ اور زہد اور اس کے ساتھ ذکاوت اور فطانت کی داد دینی پڑتی ہے کہ کیسے عجیب طریق پر مصنفؒ نے اپنی کتاب کا آغاز کیا۔ تو یہ چند جملے میں نے عرض کردیئے۔ طالب علموں کے سامنے تو یہ جملے دس منٹ میں ادا ہوسکتے تھے۔ مگر چوں کہ دوسرا مجمع بھی تھا، اس واسطے قدرے تفصیل بھی کی۔ ورنہ درس کا یہ طریقہ نہیں ہوتا۔ درس میں تو مختصر اور مجمل الفاظ ادا کردیئے جاتے ہیں۔ وہ دس منٹ کے بات تھی۔ مگر جیسے مخاطب ہوں گے تو تھوڑی تفصیل کرنی پڑے گی۔

بہرحال اس تفصیل میں بھی کچھ فنی چیزیں آگئیں، کچھ احادیث آگئیں۔ کچھ امامؒ کی عظمت وجلالتِ شان آگئی، کچھ کتاب کی عظمت وجلالتِ شان آگئی اور کچھ آغازِ کتاب کی برکت کا بھی ذکر آگیا۔ تو یہ سب چیزیں جمع ہوگئیں۔

دعاء...... اب آیئے سب حضرات مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس مدرسے کو تا دیر قائم رکھے۔ جس کے ذریعے سے دین پھیل رہا ہے۔ اور حجازِ مقدس میں علم کا چرچا ہے اور جو بھی طلباء داخل ہوں وہ اپنے علوم سے منتفع ہوں۔ حق

تعالیٰ انہیں باکمال بنا کر وہاں تک پہنچائے۔ جیسا کہ اب تک اس دارالعلوم ''(مدرسہ صولتیہ)'' سے بہت سے علماء اور فضلاء نکل چکے ہیں اور انہوں نے دین کے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ،اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ عِلْمًا نَّافِعًا وَّ عَمَلًا صَالِحًا وَرِزْقًا وَّاسِعًا وَّ شِفَاءً مِّنْ کُلِّ دَآءٍ ،اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً وَّھَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ، رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْاَبْرَارِ یَا عَزِیْزُ یَا غَفَّارُ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

تعلیم وتدریس

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!...... فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

احوالِ واقعی...... بزرگانِ محترم! جس مبارک جامعہ کا افتتاح آج کیا جارہا ہے اور یہ ایک برگزیدہ شخصیت کے انتساب سے کیا جارہا ہے۔ یعنی حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند (انڈیا) کے اسم گرامی کی طرف منسوب کر کے یہ جامعہ قائم کی جارہی ہے یہ ہم سب کے لئے خوش قسمتی ہے کہ تعلیم گاہ قائم ہو اور کسی برگزیدہ شخصیت کے انتساب سے قائم ہو، یہ خود ایک عظیم ترین نعمت ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ آیت میں نے تلاوت کی ہے اور اس سلسلے میں چند باتیں گذارش کرنی ہیں اور وہ مختصر وقت میں ہی ان شاء اللہ پوری ہو جائیں گی۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ تو وقت دیا گیا ہے۔ شاید یہ بھی پورا نہ ہو سکے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ ان چند باتوں کو محدود وقت کے اندر اندر عرض کر دوں۔

شرفِ انسانی کے بارے میں دعویٰ شریعت...... ایک بڑا مسئلہ علماء میں یہ زیر بحث رہا ہے کہ انسان جو ساری کائنات میں افضل ترین نوع ہے اور اس کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ شریعت نے بھی اس کا دعویٰ کیا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ عقل بھی اس کی شاہد ہے اور محسوسات بھی اس کے شاہد ہیں۔ شرع، عقل اور حس تینوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان افضل الکائنات ہے، اشرف المخلوقات ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ ② "ہم نے انسان کو مکرم اور معظم بنایا اور بر و بحر میں اس کو اٹھایا، بلند کیا اور اونچا کیا اور بہترین پاکیزہ رزق اس کے کھانے کے

---

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۷۹. ② پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۷۰.

لئے دیا اور اسے بہت بڑی فضیلت دی۔ جتنی بھی چیزیں ہم نے پیدا کیں، ان میں اسے فضیلت دی‘‘۔ تو انسان کی افضلیت اور اشرف المخلوقات ہونا اس آیت سے پوری طرح ثابت ہے اور یہ دعویٰ قرآن کریم کا ہے۔

شرفِ انسانی کے بارے میں دعویٰ عقل...... عقل بھی اس کی شاہد ہے کہ انسان ساری کائنات پر بلند اور برتر ہے۔ اس لئے کہ ساری کائنات میں یہی تصرّف کرتا ہے۔ کائنات اس کے اندر متصرّف نہیں ہے۔ زمین، آسمان، سورج، چاند ساری چیزیں اس کے استعمال میں ہیں۔ ہر چیز میں اس کے تصرّفات ہیں۔

زمین کو نہ صرف کھود سکتا اور اس کے مکانات بھی بنا سکتا ہے بلکہ اس کی خصوصیات پر بھی مطلع ہے۔ اس کے خواص و آثار سے طرح طرح کی چیزیں ایجاد کر رہا ہے۔ سورج کی روشنی اور گرمی سے صرف فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ اس کی شعاعوں اور حرارت سے مشینوں کے طرز پر یہ چیزیں بنا بنا کے استعمال کر رہا ہے۔ نہ صرف سیارات کی روشنی اور گرمی سے فائدہ اٹھا رہا ہے بلکہ سیارات کے اجسام تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہے اور آلات تیار کر رہا ہے۔ گویا سیاروں کی ذوات میں بھی تصرف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جَوّ اور فضاء میں بھی اس کے تصرّفات ہیں، زمین پر بھی تصرّفات ہیں، سمندروں میں بھی تصرّفات ہیں: ﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً﴾ ①

فرماتے ہیں کہ: کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمینوں اور آسمانوں کو کام میں لگا دیا ہے۔ جو کچھ زمین میں اور آسمانوں میں خزانے ہیں سب انسان کے کام میں آتے ہیں اور اللہ نے اپنی نعمتیں انسان کے لئے کامل اور مکمل کر دیں۔ کسی نوع کے لئے یہ دعویٰ نہیں کیا گیا جو انسان کے لئے کیا گیا۔ تو افضل بھی کہا گیا، متصرّف بھی کہا گیا، موجد بھی کہا گیا۔ تو یہ ایک دعویٰ ہے۔

حکماء کی نظر میں وجہِ اشرفیت...... سوال یہ ہوتا ہے کہ انسان کیوں افضل ہے؟ اس کی فضیلت کی خصوصیت اور بنا کیا ہے؟ بہر حال کوئی تخصیص ہوگی جو اوروں میں نہیں پائی جاتی ہوگی، جس کی وجہ سے یہ سب سے بلند و بالا بن گیا۔

حکماء اور فلاسفہ کا دعویٰ تو یہ ہے کہ انسان میں ایک جوہر ہے جو دوسری چیزوں میں نہیں ہے اور وہ عقل ہے۔ اسی لئے منطقی اس کی ’’حیوان ناطق‘‘ سے تعریف کرتے ہیں۔ یعنی ایسا جاندار جو معقولات کا بندہ اور پانے والا ہے۔ یعنی عقل سے امور دریافت کرتا ہے جو اور چیزوں میں نہیں ہے۔ اس واسطے انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا، تو بناءِ اشرفیتِ عقل ہے جو اس کے اندر ہے۔ یہ عام طور سے فلاسفہ اور حکماء کا دعویٰ ہے۔

حکماء کے نظریئے کی غلطی...... لیکن میں سمجھتا ہوں یہ دعویٰ کچھ نامکمل ہے۔ فی الجملہ صحیح بھی ہے لیکن محض عقل پر بنیاد رکھ دینا، یہ انسان کی فضیلت کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ عقل تھوڑی بہت جانوروں میں بھی موجود ہے۔ عقل سے انسان قیاس ہی تو کرتا ہے کہ ایک معلوم چیز پر قیاس کر کے نامعلوم کا حکم معلوم کرے۔ تو عقل کا

① پارہ: ۲۱، سورة لقمان، الآية: ۲۰.

سب سے بڑا کام قیاس اور استنباط ہے کہ انہونی چیز کو ایک موجود شے میں سے نکالا ہے۔ عقل یہ کام کرتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جانور بھی یہ کام کر سکتے ہیں کہ ایک شے کا جو حکم ان کے ذہن میں ہے، قیاس کر کے دوسری شے پر لگا دیں گے۔ ایک کتا ایک جگہ موجود ہو، آپ اسے لاٹھی مار دیں۔ دوسرے دن اس جگہ نہیں آئے گا۔ اس نے قیاس کیا کہ کل گیا تھا تو یہ حرکت ہوئی تھی، آج جاؤں گا تو آج بھی وہی ہوگی۔ یہ عقل نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اگلے دن کی مار پٹائی کو اس نے آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ وہ تو پہلے ہی دن پٹ چکا تھا دوسرے دن کی مار پٹائی سے جو بچ رہا ہے یہ محض فہم اور عقل کی وجہ سے ہے۔ سمجھتا ہے کہ جو واقعہ کل ہوا تھا۔ میرا قیاس یہ ہے کہ آج بھی وہی ہوگا۔ تو انسان قیاس کرتا ہے تو کتا بھی قیاس کرتا ہے۔ اس میں بھی عقل ہے اور اس میں بھی، یہ الگ بات ہے کہ انسان میں زیادہ عقل ہے، اور اس میں کم ہے، تو زیادتی اور کمی کی بات تو یہ ہے کہ خود انسانوں کی عقلیں برابر تھوڑا ہی ہیں۔ بعضے حکیم گزرے ہیں، بعضے نہایت غبی، بعضے بلید انسان ہیں، بعضے تیز فہم ہیں۔ بعضوں کی عقل بہت اعلیٰ بعضوں کی بہت ادنیٰ، جب خود آپ کی نوع میں عقلوں کا تفاوت اور کمی و بیشی کا فرق مراتب ہے اور کم عقل والے کو بھی آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی عقل مند ہے تو اس سے کم تھوڑی سی کتے میں ہوگی تو اسے کیوں نہیں کہتے کہ یہ بھی عقل مند ہے۔ تھوڑی سی عقل ہے گو آپ کے برابر نہ سہی۔ تو انسان محض یہ دعویٰ کر کے بیٹھ جائے کہ میں ہی عقل مند ہوں، دوسرے میں عقل نہیں ہے، یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے، اور لومڑی کی چالاکی و ہوشیاری تو مشہور ہے اور بندر کی عیاری سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ایسی چالاکیاں کرتا ہے کہ بعض دفعہ انسان بھی زچ ہو جاتے ہیں۔ بہر حال مطلقاً عقل و شعور ہر جاندار کو دیا گیا ہے۔ کمی و بیشی کا فرق ہے جیسے خود بنی نوع انسان میں ہے، جانوروں میں بھی کمی و بیشی کا فرق ہے، اس لئے افضلیت کی بناء محض عقل پر رکھنا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، جب کہ یہ جوہر دوسروں میں بھی موجود ہے، چاہے کم ہی درجہ کا ہو۔

علم محض بھی وجہِ شرافت نہیں...... اس لئے بعض حکماء نے دعویٰ کیا کہ عقل بناءِ افضلیّت نہیں۔ بناءِ افضلیّت علم ہے۔ جانوروں کو علم نہیں دیا گیا، انسانوں کو علم عطاء کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی بناء صحیح نہیں ہے، فی الجملہ صحیح ہے مگر اس پر ہم دارومدار نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے کہ خود قرآن کریم دعویٰ کرتا ہے کہ جانوروں کو بھی علم دیا گیا ہے اور علم بھی معمولی نہیں، شریعت کے احکام کا علم ہے، بندگی اور اطاعت کا علم ہے جیسے انسان کو دیا گیا ہے، جانوروں کو بھی دیا گیا ہے۔

انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات کو بھی علم حاصل ہے..... قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ﴾ ① ہر چیز نے اپنی نماز کو بھی اور تسبیح کو بھی جان لیا ہے''۔

تو نہ صرف آپ نماز پڑھتے ہیں بلکہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ نماز پڑھتا ہے اور جانور بھی اپنی نماز کو جاہلانہ طریق

① پارہ: ۱۸ النور، الآیۃ: ۴۱.

پڑھتے نہیں پڑھتے۔ قَدْعَلِمَ میں قَدْ کلمہ تحقیق کا ہے اور ماضی پر داخل ہو رہا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ یقیناً ہر شے نے جان لیا ہے۔ اور لفظ کُلٌّ کے اندر جمادات بھی آتے ہیں، نباتات بھی آتے ہیں، حیوانات بھی آتے ہیں۔ تو شریعت سب کے لئے علم ثابت کر رہی ہے اور علم بھی شریعت کا۔ یعنی سب اپنی اپنی تسبیح اور نماز جانتے ہیں۔

شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ نمازی ہے، نماز پڑھتا ہے مگر ہر ایک کی نماز اس کے مناسب حال ہے لکھتے ہیں کہ: درختوں کی نماز میں قیام ہے، رکوع اور سجدہ نہیں ہے۔ وہ ایک پیر پر کھڑے ہوئے اللہ کی یاد میں مصروف ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ جس طرح آپ نے ہمیں بنایا۔ ہماری اطاعت کا تقاضا ہے کہ ہم یوں ہی بنے رہیں۔ نہ ادھر جھکیں نہ، اُدھر جھکیں، نہ گریں نہ سجدہ کریں، ایک پیر پر کھڑے ہوئے قیام کی حالت میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ اطاعت وفرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔ حقیقی معنی میں مسلم ہیں۔ ﴿وَلَـهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ① یعنی ہر چیز مسلم ہے اور عبادت گذار ہے۔ تو درختوں کی نماز میں قیام ہے۔ یعنی ہیئت ایسی بنائی ہے گویا وہ قیام کئے ہوئے ہیں۔

اور لکھتے ہیں کہ چوپایوں کی نماز میں رکوع ہے۔ سجدہ اور قیام نہیں ہے، جو چار پیر سے چلنے والے جانور ہیں۔ ان کی ہیئت ایسی بنائی کہ وہ ہمہ وقت رکوع کے ساتھ عبادت میں مشغول ہیں۔ ان کی نماز میں رکوع ہے۔

جتنے حشرات الارض ہیں، سانپ، بچھو، کیڑے مکوڑے ان کی نماز میں سجدہ ہے۔ رکوع اور قیام نہیں ہے۔ وہ اوندھے پڑے ہوئے ہیں، گویا ہر وقت اللہ کے سجدہ گزار ہیں۔ اسی میں نماز ادا کر رہے ہیں۔

پہاڑوں کی نماز میں تشہد ہے یعنی گھٹنے ٹیکے ہوئے زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں جیسے نمازی آدمی اَلتَّحِیَّاتُ میں گھٹنے ٹیک کر بیٹھتا ہے۔ ان کی نماز میں تشہد ہے۔ نہ قیام ہے، نہ رکوع ہے، نہ سجدہ، اگر پہاڑ سجدہ کرنے لگیں تو ساری دنیا پس کر رہ جائیں، غنیمت ہے کہ وہ ایک جگہ تشہد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

جنت اور دوزخ کی نماز میں فقط دعا ہے۔ سوال کرنا اور مانگنا یہ جنت اور دوزخ کی نماز ہے۔۔ جنت بھی سوال کر رہا ہے کہ اے اللہ! مجھے بھر دیجئے۔ جہنم بھی سوال کر رہا ہے کہ مجھے بھر دیجئے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ قیامت کے دن تمہارا پیٹ بھر دیں گے۔

جہنمی جب سارے جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے اور جہنم پھر بھی خالی رہ جائے گا تو کہے گا ﴿هَلْ مِنْ مَّزِیْدِ. هَلْ مِنْ مَّزِیْدِ﴾ ② اور لائیے اور لائیے۔ بھرنے کا وعدہ ہے۔ میں نے عمر بھر پیٹ بھرنے کی دعائیں مانگی ہیں۔ آج میرا پیٹ بھریئے۔ پہاڑ جھونک دیئے جائیں گے۔ زمین جھونک دی جائے گی۔ پھر بھی کہے گا ﴿هَلْ مِنْ مَّزِیْدِ﴾ اور لائیے یہ تو بہت بڑا عالم ہے کروڑوں دنیائیں اس کے اندر بن جائیں جب ساری چیزیں جھونکنے کی ختم ہوں گی اور پھر بھی اس کا پیٹ نہیں بھرے گا اور بھوک سے یہی کہے گا ﴿هَلْ مِنْ مَّزِیْدِ﴾

① پارہ: ۳ ال عمران، الآیۃ: ۸۳۔ ② پارہ: ۲۶، سورۃ ق، الآیۃ: ۳۰۔

تو حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ اپنی ایڑی اس کے منہ پر رکھ دیں گے تو کہے گی قَطْ قَطْ . بس میں بھر گئی۔ اب مجھ میں تاب نہیں ہے، تو سوال پورا ہو جائے گا۔ جنت کا بھی یہی سوال ہے کہ مجھے بھر دیجئے۔ تمام اہلِ جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے اور ہزاروں محلات اور اس کے شہر خالی ہوں گے، وہ کہے گا کہ آپ کا وعدہ ہے مجھے بھر دیجئے، تو حق تعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا فرمائیں گے جس سے جنت کی آبادکاری ہوگی، اس کا سوال پورا کیا جائے گا۔ تو جنت و دوزخ کی نماز دعا مانگنا اور سوال کرنا ہے۔ ①

فرشتوں کی نماز صف بندی ہے۔ کروڑوں کی تعداد میں رکوع میں ہیں' کروڑوں سجدے میں ہیں۔ کروڑوں حالتِ قیام میں ہیں کروڑوں بیت المعمور کے طواف میں مشغول ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروفِ عبادت نہ ہو۔

تو فرشتوں کی نماز صف بندی ہے کہ ترتیب وار کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت ادا کر رہے ہیں۔ رکوع سے ہو یا سجدے اور قیام سے ہو جتنے سیارے ہیں جو چکر کھا رہے ہیں، جیسے فلاسفہ قدیم کے کہنے کے مطابق سورج گردش میں ہے اور فلاسفہ حال کے دعویٰ کے مطابق زمین گردش میں ہے۔ بہرحال زمین کو بھی وہ ایک سیارہ مانتے ہیں اور چاند و سورج کو بھی سیارہ مانتے ہیں اور ممکن ہے کہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں گردش میں ہوں۔ ان کی نماز دوران اور گردش ہے کہ جہاں سے چلے پھر پھرا کر وہیں پھر لوٹ آئے۔ پھر وہاں سے چلے پھر وہاں لوٹ آئے۔ یہ گردش اور چکر یہی ان کی نماز ہے۔

تو کائنات کا ایک ایک ذرہ اپنی ہیئت اور خلقت کے مطابق نماز اور "تَسْبِيْح وَتَهْلِيْل" میں مشغول ہے۔ احادیث میں وہ تسبیحات بتلائی گئی ہیں جو مختلف جانوروں کی ہیں کہ تیتر بولتا ہے تو اس کی یہ تسبیح ہے۔ فرمایا گیا کہ: تیتر جو اپنی زبان میں بولتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ "كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ." ② جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ بعض جانور کہتے ہیں۔ "سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ" ③ جانوروں کی مختلف تسبیحات آتی ہیں کہ مور یہ کہتا ہے، تیتر یہ کہتا ہے، طوطا یہ کہتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سیٹیاں بج رہی ہیں۔ حقیقۃً یہ تسبیح وتہلیل ہے مگر ان کی زبان میں ہے۔

اسی کو فرماتے ہیں ﴿وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ④ کوئی شے کائنات کی ایسی نہیں ہے جو تسبیح میں مشغول نہ ہو، تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ وہ اپنی زبان میں کہہ رہے ہیں۔ اور آپ اپنے ہی بھائیوں کی زبان کب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی انگریزی میں تسبیح پڑھے تو آپ کیا سمجھیں گے؟ پشتو زبان میں کوئی تسبیح پڑھے، آپ اسے کیا سمجھیں گے؟ جن لوگوں کو حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ مشرق

① الصحيح للبخاري، كتاب التفسير، باب قوله تعالى هل من مزيد، ج:١٥ ص:٨٥.

② ③ تفسير الطبري، ج:١٣ ص:١٦٥. ④ پاره:١٥، سورة الاسراء، الآية:٤٤.

ومغرب کے انسان آتے ہیں۔ پشتونی آدمی اپنی پشتو میں اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ بنگالی آدمی اپنی بنگلہ زبان میں اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ پنجابی، پنجابی زبان میں دعائیں مانگ رہا ہے۔ دوسرا اس سے نابلد ہے، وہ سمجھ رہا ہے کہ خدا جانے کیا گڑ بڑ ہو رہی ہے۔ لیکن اس گڑ بڑ میں بہت سے علوم ہیں، بہت سے اذکار ہیں، بہت سی تسبیحات ہیں جو پوری ہو رہی ہیں۔ لیکن ہم انہیں نہیں سمجھتے۔

جیسے تار برقی والے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب تار دینے جاتے ہیں اسے مضمون بتا دیا، آپ کے سامنے سوائے اس کے کہ وہ پیتل کی ایک کلّی کے اوپر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کر رہا ہے کچھ نہیں اور آپ کہیں گے کہ عجیب احمق آدمی ہے۔ میں آیا تھا کہ اس مضمون کو یہ بذریعہ تار پہنچا دے اور یہ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کر رہا ہے۔ لیکن آپ کو خبر نہیں کہ اسی کھٹا کھٹ میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں علم پہنچ رہا ہے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف معلومات منتقل ہو رہی ہیں۔ اگر آپ ان اصطلاحات سے واقف ہو جائیں جن اصطلاحات کو تار برقی والے جانتے ہیں، سارے علوم آپ کے سامنے آ جائیں کہ اس کھٹا کھٹ میں کیا پوشیدہ ہے۔ اسی طرح اگر پرندوں کی بولیوں سے آپ واقف ہو جائیں تو سمجھیں گے کہ کس طرح عظیم الشان تسبیح وتہلیل اور ذکر اللہ ہے جو ان کی زبان پر جاری ہے۔ جن کو حق تعالیٰ نے معجزانہ طریق پر سمجھا دیا وہ جانتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں. ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ ① اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھلا دی گئی ہیں۔ وہ بتلا دیتے تھے کہ یہ کوا یہ کہہ رہا ہے۔ یہ کبوتر یہ بول رہا ہے۔ اللہ نے ہمیں جانوروں کی بولیاں سکھلا دی ہیں۔ لیکن کسی کالج اور اسکول کے ذریعہ سے نہیں۔ اعجاز کے طور پر ان کی زبانوں کا دل میں الہام کر دیا تو ؎

ہر یکے را اصطلاحے دادہ ایم

ہر ایک کی ایک لغت ہے۔ انسانوں کی بھی ایک لغت ہے۔ ہندی کی اور لغت، سندھی کی اور لغت پنجابی کی اور لغت۔ اسی طرح تیتر اور طوطے کی الگ الگ لغت ہے۔ یہ سارے اپنی اپنی لغات میں تسبیح وتہلیل کرتے ہیں۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ محض علم کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ہو تو علم تو پرندوں کو بھی ہے، جانوروں کو بھی ہے اور علم بھی تسبیح وتہلیل اور شریعت ونماز تک کا علم ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ آپ کی نماز کو اللہ نے مکمل کر دیا، تو آپ کی نماز میں درختوں کا سا قیام بھی ہے، چوپایوں جیسا رکوع بھی ہے حشرات الارض جیسا سجدہ بھی ہے۔ پہاڑوں کا سا تشہد بھی ہے۔ جنت ودوزخ کی سی دعا مانگنا بھی ہے۔ فرشتوں کی سی صف بندی بھی ہے اور سیاروں کی سی گردش بھی ہے، اس لئے کہ کوئی نماز دو رکعت سے کم کی نہیں ہے۔ دو رکعت کے معنی یہ ہیں کہ جو کام پہلی رکعت میں کریں گے لوٹ کر پھر دوسری رکعت میں وہی کریں

① پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶.

گے۔تو آپ کی نماز کے اندر گردش بھی ہے۔اگر آپ کے لئے گردش نماز ہے تو آفتاب کے لئے گردش نماز کیوں نہیں ہوسکتی؟ اگر آپ کا ایک رکعت سے دوسری رکعت کی طرف جانا اور چکر کھانا عبادت ہے تو زمین اگر چکر کھانے لگے تو وہ کیوں عبادت نہیں ہوگی؟ بہرحال عبادت کے طریقے مختلف اور اس کا علم بھی مختلف ہے۔تو اشرف المخلوقات ہونے کی یہ بناءنہیں ہوسکتی کہ آپ کوعلم ہے۔

علم وعقل میں اگر انسان اور دیگر مخلوقات میں کچھ فرق ہے تو خود انسانوں میں بھی باہم فرق ہے

......اور علم محسوسات تو بہت معمولی چیز ہے،ایک گدھے میں بھی ہوتا ہے،آپ سورج کو دیکھتے ہیں،گدھا بھی سورج کو دیکھتا ہے۔آپ کو بھی حس ہے اسے بھی حس ہے۔آپ زمین دیکھ رہے ہیں وہ بھی دیکھ رہا ہے،تو احساسات میں جانور اور انسان برابر ہے۔اس میں سے چیزیں نکالنا نتیجے پیدا کرنا یہ عقل سے تعلق رکھتا ہے تو تھوڑی بہت عقل جانوروں کو بھی ہے،اس سے بھی آگے بڑھ کر اس علم کا مرتبہ ہے کہ آپ احکام خداوندی کو جان گئے۔یہ مرتبہ جانوروں کو بھی نصیب ہے۔بہت سے بہت آپ اس مرتبے میں کامل سہی۔وہ ناقص سہی تو میں یہ عرض کروں گا کہ سارے انسان عالم ہی نہیں،کیا سارے احکام شریعت کو جانتے ہیں؟اگر سارے عالم الکل ہوتے تو اس جامعہ قاسمیہ ہی کے قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟اور اس مدرسہ کے قیام کی کیا ضرورت تھی،سارے ماں کے پیٹ سے عالم ہی پیدا ہوتے۔تو سارے ایک درجے کے نہیں۔تو علم اگر آپ میں ہے تو تھوڑا بہت جانوروں میں بھی ہے۔عقل اگر آپ میں ہے تو تھوڑی بہت جانوروں میں بھی ہے۔فہم اگر آپ میں ہے تو ان میں بھی ہے۔

پھر کیا چیز ہے کہ آپ اشرف المخلوقات ہیں؟ آخر آپ کو کیوں دعویٰ ہے کہ ہم ہی سب سے افضل ہیں؟

آپ کہیں گے کہ ہم مکان بناتے ہیں تو کوا کہے گا کہ میں بھی گھونسلہ بناتا ہوں۔آپ کہیں گے کہ میں کئی منزلہ مکان بناتا ہوں تو بھیا ایک چھوٹا سا جانور ہوتا ہے،وہ کہے گا میں مکان بناتا ہوں جس میں ایسی ایسی بلڈنگ ہوتی ہے۔اس میں باتھ روم الگ ہے،سونے کا کمرہ الگ ہے اور بچوں کا کمرہ الگ اور جھولا الگ اور کیسا پرتکلف اور مضبوط مکان؟ یعنی دو تین گھاس کے تار ہوتے ہیں جس سے وہ اپنے گھر کو کیکر میں تانتا ہے۔آندھیاں چلیں، بارشیں آئیں،طوفان آئے کیکر اکھڑ کر گر جائے گا مگر کیا مجال ہے کہ گھونسلہ ٹوٹ جائے۔اتنی پکی بلڈنگ بنتی ہے اور اس میں کمرے اور خانے ہیں۔تو آپ کو خواہ مخواہ دعویٰ ہوگیا کہ ہم بڑے انجینئر ہیں،وہ کہے گا کہ میں بھی انجینئر ہوں۔میں بھی کئی منزلہ مکان بناتا ہوں۔

شہد کی مکھی کہے گی کہ میں تم سے زیادہ کاریگر ہوں۔اس لئے کہ وہ شہد کے چھتے میں ہشت پہلو سوراخ بناتی ہے۔آپ پرکار سے بھی ایسے برابر برابر سوراخ مشکل سے بنائیں گے وہ بلا پرکار کے اپنے منہ سے اپنے صحیح اندازے سے بناتی ہے۔پھر اس میں تقسیم عمل ہے کہ ایک حصہ میں شہد بھرا ہوا ہے۔جو قوم کی خوراک ہے۔ایک حصہ میں بچے ہیں اور ایک میں ماں باپ ہیں۔یہ ساری کارروائیاں جو آپ کرتے ہیں وہ بھی کرتی ہے۔اگر آپ

کے ہاں وزیر خوراک ہے، تو ان کے ہاں بھی وزیر خوراک ہے۔

آپ کہیں گے کہ صاحب ہم تنظیمِ ملّت جانتے ہیں۔ ہمارا ایک صدر اور پریزیڈنٹ ہے۔ وزیر اعظم ہے۔ جانوروں کو کہاں نصیب؟ شہد کی مکھی کہے گی کہ میرے ہاں بھی یہ سب کچھ موجود ہے۔ امارت بھی ہے۔ عربی زبان میں جو سب سے بڑی مکھی ہوتی ہے اسے یعسوب کہتے ہیں۔ اس کے اشاروں پر پوری مکھیاں حرکت کرتی ہیں۔ وہ جہاں جاکے بیٹھے گی ہزاروں مکھیاں وہیں بیٹھیں گی۔ وہیں شہد کا چھتہ بنے گا۔ مجال نہیں کہ یعسوب چلی جائے اور قوم نہ جائے۔ پھر تنظیمِ ملت کا یہ عالم ہے کہ مجرموں کو سزا دینا اور مطیعوں کو سرفراز کرنا، یہ بھی مکھیوں میں موجود ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جہاں شہد کا چھتہ ہوتا ہے اس کے نیچے کچھ مکھیاں ٹوٹی ہوئی پڑی ہوتی ہیں۔ اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے درخت پر بیٹھ کر آئی اور زہریلا عرق چوس کر آئی ہے، وہ امیر یعسوب فوراً پہچان لیتا ہے کہ یہ زہریلا مادّہ لے کر آئی ہے، اگر یہ یہاں بیٹھ گئی اور اس نے شہد میں ملا دیا تو پوری قوم تباہ ہو جائے گی، تو اس کی گردن توڑ کر اسے نیچے پھینک دیتا ہے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ امیر نے قتل کر دیا۔ لیکن قوم میں ایجی ٹیشن نہیں ہوتا کہ امیر کو برطرف کرنے کے لئے نعرے لگا کر کھڑی ہو جائے۔ ساری کہتی ہیں کہ ہماری خیر خواہی کے لئے کیا ہے۔ ہمارے اندر اتنا علم نہیں ہے جتنا اس کے اندر ہے۔ یہ قوم کے بھلے برے کو جانتا ہے۔ لہٰذا اس کے قتل پر راضی ہیں۔ یہی قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ ① ایک کو قتل کرتے ہیں تاکہ قوم زندہ ہو جائے۔ یعسوب بھی یہی کہے گا کہ ایک قتل کرتا ہوں تاکہ پوری قوم میں زندگی باقی رہے۔ اگر میں نے اسے باقی چھوڑ دیا تو پوری قوم تباہ ہو جائے گی۔ تو علمِ سیاست اور علمِ تنظیم ملت بھی ان میں ہے۔ انجینئری اور مکان سازی بھی ہے۔ آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہو گیا کہ انجینئر تو ہم ہیں۔ سیاسی ہیں تو ہم ہیں۔ تنظیم ملت کرتے ہیں تو ہم کرتے ہیں، یہ تو سارے جانور کرتے ہیں۔

بطخیں جب آتی ہیں تو ہمیشہ مثلث ہو کر آتی ہیں، دو قطاریں اور آگے آگے ان کا امیر ہوتا ہے۔ جیسے پریڈ کے میدان میں فوجیں قطار باندھ کر جاتی ہیں اور لیفٹیننٹ کی آواز پر چلتی ہیں۔ وہی شان بطخوں کے اندر ہے۔ جب جھیل پر بیٹھتی ہیں۔ اگر ذرا خطرہ ہوتا ہے تو ان کا امیر جو بطخا ہوتا ہے۔ وہ پوری رات ایک پیر پر کھڑا ہو کر گزارتا ہے تاکہ میری پوری قوم آرام سے سوئے، تکلیف میں اٹھاؤں۔ اس لئے کہ عیش کرنے کا نام امارت نہیں ہے۔ امارت قوم کے لئے تکلیف اٹھانے کا نام ہے۔ میری قوم کو راحت پہنچے۔ اس لئے پوری رات امیر تکلیف اٹھاتا ہے۔ ذرا خطرہ دیکھا تو وہ ایک آواز لگاتا ہے اس پر ساری بطخیں چوکنا ہو جاتی ہیں، دوبارہ آواز لگاتا ہے تو پر تولنے لگتی ہیں اور تیسری دفعہ جو اس نے آواز لگائی تو ایک دم راستہ چلنا شروع کر دیتی ہیں۔ جیسے فوجی کمانڈر گویا بگل بجا دیتا ہے اور اس

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ الآیۃ: ۱۷۹۔

میں اصطلاحات ہیں کہ پہلے بگل پر تیار ہوجائیں دوسرے پر وردیاں پہن لیں، تیسرے پر ہتھیار آراستہ کریں اور چوتھے پر مارچ کرنا شروع کردیں۔ وہی ان کے اندر قاعدہ ہے، تو آپ کو خواہ مخواہ یہ دعویٰ ہوگیا کہ ہم ہی جنگی لوگ ہیں، ہم ہی امیر الحرب ہیں، ہم ہی حربی علوم سے واقف ہیں۔ وہ عربی علوم سے بھی واقف ہیں۔ حربی علوم سے بھی واقف ہیں۔ ان میں بھی دونوں قسم کے علوم ہیں، تو اشرف المخلوقات ہونے کی یہ بناء نہیں ہوسکتی۔

آپ کہیں گے صاحب! ہم تو بڑے عمدہ کپڑے بناتے ہیں۔ کھانے بڑے عمدہ کھاتے ہیں۔ بھلا گدھا پلاؤ زردہ کہاں کھاتا ہے۔ ہم کھاتے ہیں، لہٰذا ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ تو آپ جب کہیں جب گدھے کو آپ کے زردہ پلاؤ پر لالچ آیا ہو۔ جس طرح آپ اس کی گھاس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ آپ کے پلاؤ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ اپنی نوع کے مطابق غذا کھاتے ہیں وہ اپنی نوع کے مطابق، تو نوعیت میں فرق ہوا۔ کھانے اور بھوک میں تو فرق نہیں آیا، آپ کا بھی جذبہ ہے۔ اس کا بھی جذبہ ہے۔ بہرحال نہ کھانا شرافت کی وجہ ہوسکتی ہے۔ نہ مکان بنانا اور نہ انجینئری وجہِ شرافت ہے۔ نہ علومِ سیاسیہ آپ کی افضلیت کی دلیل ہوسکتی ہے۔ ان میں بھی سیاسی موجود ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم بڑے بڑے طبیب ہیں، علاج کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان میں بھی بڑے بڑے اطباء موجود ہیں۔ مجھے راجپوتانہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے خسر مولوی محمود صاحب مرحوم ریاست اندر گڑھ میں وزیر تھے۔ وہاں چوں کہ ہندو راج تھا تو بندروں کے مارنے کی ممانعت تھی اور یہ بندر بڑا نقصان کرتے۔ ذرا کمرہ کھلا رہ گیا تو کوئی برتن لے گیا، کوئی کپڑے لے گیا۔ روز یہ قصہ ہوتا۔ اور یہ ایسا موذی جانور ہے کہ یہ نہیں کہ کپڑا لے گیا بلکہ منڈیر پر بیٹھ کر دکھا دکھا کے اسے پھاڑتے۔ جیسے چڑا رہا ہو۔ خواہ مخواہ بھی غصہ آتا مگر اب بس کی بات بھی نہیں تھی، مار بھی نہیں سکتے تھے۔ چھپ چھپا کر دو چار بندر مارے اور راتوں کو باہر پھینکوا دیئے۔ مگر اس سے بندروں میں کمی تھوڑا ہی آتی تھی۔ اگلے دن پھر موجود اور پھر وہی قصہ۔

ہم نے یہ ارادہ کیا کہ سو پچاس ایک دم مرجائیں۔ کچھ تو کمی ہوگی اور ہمارا دل بھی ٹھنڈا ہوگا۔ تو ہم نے چار روپے کا سنکھیا خریدا اور کئی سیر آٹے میں ملا کر اس کی روٹیاں پکوائیں اور انہیں چھت پر پھیلا دیا اور ہم دیکھنے بیٹھ گئے اور تصور یہ تھا کہ بندر آتے جائیں گے، کھاتے جائیں گے، مرتے جائیں گے اور ہم خوش ہوتے جائیں گے۔

مگر دو تین بندر آئے۔ بندر تو بڑا سیانا جانور ہے۔ اس نے دیکھا کہ روٹیاں پھیلی پڑی ہیں۔ روٹیوں کی یہ حالت ہوتی نہیں کہ وہ پھیلی پڑی ہوں، کوئی بات اس کے اندر ہے۔ اب وہ کم بخت بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہے۔ روٹی اٹھانے کے لئے آگے نہیں بڑھتا۔ دو تین آئے تھے، وہ چلے گئے۔ ہم یہ سمجھے کہ تدبیر فیل ہوگئی۔ یہ کم بخت کچھ سمجھ گئے۔ انہوں نے اپنے شہر یا بستی میں جا کر اطلاع کی ہوگی تو وہاں سے چودہ پندرہ موٹے موٹے بندر اور آئے اور انہوں نے آ کر یہ دیکھنا شروع کیا۔ گویا ان کے ذہن نے یہ سوال اٹھایا کہ عادۃً اس طرح روٹیاں پھیلی نہیں رہا کرتیں یہ جو پھیلی پڑی ہیں ان کے اندر کوئی بات ہے اور ان کی سمجھ میں آ نہیں رہی۔ وہ بھی آخر چلے گئے۔ اس کے

دس پندرہ منٹ کے بعد پچاس ساٹھ بندروں کی قطار بڑے بڑے موٹے چوہدری قسم کے لوگ آئے اور وہ روٹیوں کے اردگرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ گویا گول میز کانفرنس منعقد کی کہ اس مسئلہ پر غور کیا جائے کہ روٹیاں کیوں پھیلی پڑی ہیں۔ اس میں کیا بھید ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے، ڈر کے مارے آگے کوئی نہیں بڑھتا۔ خیر ایک بڑا بوڑھا بندر آگے بڑھا۔ اس نے روٹی کو توڑ کر سونگھا، دوسرے نے توڑا۔ اس نے بھی سونگھا، تیسرے نے توڑا، اس نے بھی سونگھا اب گویا یہ ایک نتیجے پر پہنچ گئے اور پچاس کے پچاس بھاگ گئے۔ ہم نے سمجھا کہ تدبیر فیل ہوگئی مگر وہ ہم سے زیادہ چالاک تھے۔ کوئی دس بیس منٹ گذرے ہوں گے تو کوئی سو دو سو بندروں کی ایک قطار اور ہر ایک یک ہاتھ میں ایک ایک ہری ٹہنی جس میں پتے بھی تھے۔ وہ لئے چلے آ رہے ہیں۔ ایک لشکر چلا آ رہا ہے اور ٹہنیاں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ کمبخت آئے۔ آ کر انہوں نے روٹیوں کے ٹکڑے کئے۔ اس لئے کہ بندروں کی تعداد زیادہ تھی اور روٹیوں کی تعداد کم تھی ۔

نیم نانے گر خورد مردِ خدا بذلِ درویشاں کندنیمے دگر

درویش لوگ تھے۔ انہوں نے کہا خود غرضی ٹھیک نہیں۔ بانٹ کر کھاؤ، سب کو مل جائے تو مناسب ہے تو تعداد کے مطابق ٹکڑے کئے اور اس کے بعد ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا کھایا اور اوپر سے پتے چبائے اور دندناتے ہوئے چلے گئے۔ ان میں سے بے ہوش بھی کوئی نہیں ہوا مرنا تو بعد میں ہے۔ تو وہ اچھے خاصے عقل مند ہوئے اور بے وقوف ہم ثابت ہوئے کہ چار روپے بھی گئے، سنکھیے کی خریداری ہوئی۔ آٹا بھی خراب ہوا اور وقت بھی گیا اور بات وہیں کی وہیں رہی، وہ اطمینان سے چلے گئے۔ انہیں گویا ایک ایسی جڑی بوٹی معلوم تھی جس میں تریاقیت موجود تھی۔ جو زہر کو مارنے والی تھی۔ انہوں نے وہ زہر کا لقمہ کھایا۔ اور اوپر سے وہ تریاقی پتے کھالئے۔ کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ آپ کو خواہ مخواہ دعویٰ ہے کہ طبیب ہم ہیں۔ ان میں بھی اطباء ہیں۔ وہ بھی جڑی بوٹیوں کی خاصیت جانتے ہیں۔ آپ سو کی جانتے ہیں وہ دو چار کی جانتے ہوں گے۔ اتنا فرق ہے مگر جاننے والے وہ بھی ہیں۔

بہر حال علومِ طبیبہ لیجئے، علوم شرعیہ یا علوم حسیہ لیجئے۔ سب میں جانوروں کا حصہ ہے۔ تو آپ خواہ مخواہ مدعی بن بیٹھے کہ ہم اشرف المخلوقات ہیں اس لئے کہ ہم عالم ہیں۔ ان میں بھی سارے نمونے موجود ہیں، تو یہ سوال بدستور باقی ہے کہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی بنیاد کیا ہے؟ عقل محض کافی نہیں کہ یہ بھی دوسروں میں موجود۔ علم محض کافی نہیں کہ یہ بھی دوسروں میں موجود۔ علم کی نوعیتیں کافی نہیں کہ علم کی انواع مختلفہ ان میں بھی موجود ہیں۔ پھر آخر کیا بناء ہے؟

تمام مخلوقات میں علم وفہم کے درجات...... اگر غور کیا جائے اور انصاف سے دیکھا جائے تو ایک خصوصیت ہے جو انسان میں ہے۔ غیر انسان میں نہیں ہے۔ حتّٰی کہ ملائکہ میں بھی نہیں۔ یعنی عالم تو ملائکہ بھی ہیں۔ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں ملائکہ کو رکھا اور حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کہ: ﴿اَنْبِئْهُمْ

بِاَسْمَآءِ هِمْ﴾ ① ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ آدم علیہ السلام نے تمام چیزوں کے نام اور خاصیتیں بتادیں اور ملائکہ نے کہا تھا، ﴿سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآاِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ ② بے شک آپ پاک ہیں، ہمیں علم نہیں۔ جتنی آپ نے تعلیم دے دی اتنا ہے۔ معلوم ہوا کہ ملائکہ کو علم سکھلایا گیا ہے ان کے پاس بھی علم تھا۔ اتنا نہ سہی جتنا حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا۔ نیز جب جانوروں تک کو علم ہے تو ملائکہ کو تو اور زیادہ ہونا چاہیئے۔ خلاصہ یہ کہ عقل اور علم و فہم ملائکہ میں بھی ہے۔ ان سے کم درجہ کا جنّات میں ہے۔ ان سے کم درجے کا حیوانات میں ہے۔ ان سے کم درجے کا نباتات اور جمادات کا ہے۔ تو انسان کو دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں کہ چوں کہ میں عقل رکھتا ہوں، میں بڑا ہوں، میں علم رکھتا ہوں، میں بڑا ہوں۔ علم بھی سب میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے۔

انتقالِ علوم انسانی خصوصیّت ہے...... البتہ ایک چیز ہے جو انسان کے سوا کسی دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔ وہ علم نہیں بلکہ تعلیم ہے۔ یعنی دوسروں کو سکھلانا، دوسروں کو بنانا، دوسروں کی تربیت کرنا۔ یہ نہ ملائکہ میں ہے، نہ جنّات میں ہے، نہ حیوانات میں ہے۔ حیوانوں میں جتنا علم ہے وہ طبعی رنگ میں ہے کہ اللہ نے ان کے دل میں ڈال دیا۔ کسی مکتب میں جاکے وہ تعلیم نہیں پاتے۔

آج یہاں جامعہ قاسمیہ قائم ہو رہا ہے۔ آپ نے کبھی سنا کہ آسمانِ اوّل پر کوئی جامعہ قائم ہوا اور فرشتے مدرس بن کے بیٹھے یا کسی اور آسمان میں کوئی مدرسہ ہو۔ یا جنّات نے کسی ویرانے میں کوئی مدرسہ اور مکتب کھولا ہو؟ یہ صرف انسان کا کام ہے کہ ایک سے دوسرے تک تعلیم کے ذریعے علم منتقل ہوتا ہے۔ ملائکہ کا علم جو ہے وہ طبعی رنگ میں ہے کہ اللہ نے جتنا ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔ بس۔ یہ غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ہے۔ جانوروں میں جتنا علم ہے وہ ان کے اندر سیکھنے سے نہیں آتا، من جانب اللہ تکوینی طور پر ان کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ عالم بن جاتے ہیں۔ لیکن انسان تکوینی علم کے ساتھ ساتھ کسبی علم بھی رکھتا ہے کہ سیکھتا بھی ہے، سکھاتا بھی ہے۔ جو اس کے ذہن میں ہے اسے دوسرے کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اس علم پر تربیت دیتا ہے۔ ٹرینڈ کرتا ہے، مشّاق بناتا ہے۔ یہ معلّمی کی خصوصیات وہ ہے کہ عالَم میں انسان کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے، نہ فرشتوں میں تعلیم و تربیت ہے، نہ جنات میں تعلیم و تربیت ہے، نہ حیوانات میں ہے۔ گویا انسان میں علم متعدی ہے۔ طوطے کو اگر معلوم ہے تو اس کے اندر ہے۔ دوسرے کو وہ نہیں سکھلا سکتا۔ دوسرے طوطے کو جتنا آئے گا وہ پھر خدا کی طرف سے آئے گا وہ محدود ہے۔ وہ تیسرے طوطے کو نہیں سکھلا سکتا۔

فرشتے میں جو علم آئے گا وہ اس کی ذات کے لئے ہے، وہ دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتا۔ انسان کو جو علم ہے وہ اپنے بچوں کو پڑھاتا ہے، وہ اگلوں کو پڑھاتے ہیں، تو ازل کا علم ابد تک چلتا رہتا ہے، یہ صرف انسانی خصوصیت ہے۔ تو معلّمی، تعلیم و تلقین اور تربیت یہ انسانی خاصہ ہے اور یہ وجہِ اشرفیت اور بناءِ افضلیت ہے۔ انسان

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۳۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۲۔

کہہ سکتا ہے کہ میں سب سے افضل ہوں کہ جو چیز میرے اندر ہے وہ کسی میں نہیں کہ میں اپنا علم ہزاروں تک منتقل کر سکتا ہوں۔ دوسرے اپنا علم منتقل نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ان تک بھی علم منتقل ہو کر نہیں آیا۔ ان کی طبیعت میں مرکوز ہے۔ ان کو اس کا بھی شعور نہیں کہ ہم میں علم ہے مگر ان کے اندر علم ہے۔ اور انسان کو شعور ہے کہ مجھے سو مسئلے معلوم ہیں اور میں ان سو کو دوسرے تک پہنچا سکتا ہوں۔ تو سب سے بڑی انسان کی خصوصیت تعلیم اور تربیت ہے۔ یعنی اکتسابی علم، جدو جہد سے علم حاصل کرنا اور جدو جہد کے ذریعے دوسرے تک علم پہنچانا۔ تو ایک علم لازم ہے جو سب کے اندر ہے اور ایک علم متعدی ہے وہ صرف انسان میں ہے کہ دیئے سے دیا جلتا رہتا ہے۔ جو علوم آدم علیہ السلام کو عطاء کئے گئے۔ وہ آج تک محفوظ ہیں۔ ہزارہا برس گزرنے کے بعد فطری طور پر منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اس میں نوح علیہ السلام نے جو اضافہ کیا وہ اضافہ بھی آج موجود ہے۔ جو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اضافہ کیا وہ بھی محفوظ ہے۔ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام نے جو علمی اضافے کئے وہ بھی موجود ہیں۔ پھر ان پر تکمیل کا لیبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا کہ ہر چیز اور علم کے ہر دائرے کو اتنا مکمل کر دیا کہ نوعی طور پر اس میں اب بڑھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ ایسے اصول وکلیات بتلائے کہ قیامت تک لاکھوں جزئیات ان کے نیچے سے نکلتی رہیں گی اور انسان ان علوم کے اندر تشنہ نہیں رہے گا۔ تو سارے انبیاء علیہم السلام کے علوم وکمالات تعلیم ہی کے ذریعے آگے منتقل ہوئے ہیں، تربیت ہی کے ذریعے آگے منتقل ہوئے ہیں۔ تو تعلیم وتربیت برابر چلتی رہی ہے اور بڑھتی رہی ہے۔ یہ چیز انسان کے سوا کسی میں نہیں۔ اس لئے کہا جائے گا کہ یہی افضلیت کی بناء ہے کہ یہ معلّم ہے۔

عظمتِ تعلیمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا''.① میں تو معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یعنی عالم تو آپ اتنے بڑے ہیں کہ کائنات میں کوئی اتنا بڑا عالم نہیں، اللہ کے بعد اگر علم میں رتبہ ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ تو ایک ہے آپ کا عالم ہونا اور ایک ہے کہ دوسروں کو یہ علم پہنچا کر عالم بنا دینا۔ یہ سب سے بڑا کمال ہے کہ اپنی حیات طیبہ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار (یا کم وبیش) افراد کے مقدّس نمونے تیار کر دیئے جو آپ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، آپ کے نقشِ قدم پر چلنے والے تھے۔ آپ کے پسینے پر اپنے قطرات خون چھڑکنے والے تھے۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے تیار کر دیئے۔ یہ تعلیم وتربیت ہی نے تیار کئے۔ تعلیم کے ذریعے مسائل سکھلائے۔ اور تربیت کے ذریعے قلوب کی راہ کو درست کیا، دلوں میں تصرّف کیا۔ وہ باطنی تعلیم ہے کہ دل سے دل تک علوم اور کمالات کو پہنچایا۔

بتصرّف تعلیمِ باطن...... جیسے حدیث میں ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ حضرت خبّاب بن ارت رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے۔ اور قرآنِ کریم کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ ''اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی

---

① السنن للامام ابن ماجه، كتاب السنة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ١، ص: ٢٦٥، رقم: ٢٢٥.

سَبْعَةِ اَحْرُفٍ“ ①

ابتداء میں سات لغات میں قرآن پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ تو وہ نماز میں اپنی لغت کے مطابق قرآن پڑھ رہے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو لغت قریش میں قرآن یاد تھا۔ معنی میں تو فرق نہیں پڑتا مگر لغت بدلی ہوئی ہے۔ عرب میں سات بڑے بڑے قبیلے تھے، جن کی لغت فصیح تھا۔ سب سے اعلیٰ ترین قبیلہ قریش کا تھا، پھر بنی تمیم، پھر بنی ہذیل وغیرہ، یہ سب قبائل تھے۔ اور یہ ایسا فرق تھا جیسا دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں ہے یا دہلی اور حیدرآباد کی زبان میں۔ اردو سب بولتے ہیں مگر کچھ لب ولہجے کا فرق، کچھ محاورات کا فرق اور کچھ اصطلاحات کا فرق ہے۔ تو معانی وہ بھی وہی سمجھاتے ہیں جو دہلی والے اور لکھنؤ والے۔ مگر انہی معنی کے سمجھانے کے لئے ان کے ہاں اور لغت ہے، ان کے ہاں اور لغت ہے۔ مقصود دونوں کا ایک ہے۔ لب ولہجہ الگ ہے۔ بہر حال ابتداءِ اسلام میں سات لغت میں قرآن پڑھنے کی اجازت تھی۔ حضرت خبابؓ رضی اللہ عنہ نے اپنی لغت میں قرآن پڑھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے آ کے سننے لگے تو وہ دوسری لغت تھی۔ وہ تو ”اَشَدُّهُمْ فِيْ اَمْرِ اللّٰهِ“ تھے۔ وہ تو ایک دم شدت تھی، انہوں نے اسی وقت حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی پگڑی اتار کر مشکیں کس دیں اور کہا:

منافق! قرآن غلط پڑھتا ہے؟ میں ابھی تیری گردن اڑا دوں گا۔ اور گھسیٹتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے۔ اور عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ قرآن غلط پڑھتا ہے۔

آپ نے فرمایا: چھوڑ دو۔ اور حضرت خباب سے فرمایا پڑھو۔ انہوں نے اپنی لغت پر پڑھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”هٰكَذَا اُنْزِلَتْ“ ”یوں ہی نازل ہوا“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تم پڑھو! ۔ انہوں نے لغت قریش میں پڑھا۔ فرمایا: ”هٰكَذَا اُنْزِلَتْ“ ”یوں ہی نازل ہوا“۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں ایک وسوسہ پیدا ہوا کہ یہ کیسا قرآن ہے۔ جو جس طرح پڑھ دے تو فرمادیا جاتا ہے ”هٰكَذَا اُنْزِلَتْ“ یوں ہی نازل ہوا ہے۔ ریب اور شک کی کیفیت وسوسہ کے درجے میں آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا۔ ”يَا ابْنَ الْخَطَّابِ!“ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے تمام آسمان مجھ پر منکشف ہو گئے، شرح صدر ہو گیا، حقیقت حال سمجھ میں آ گئی۔ یہ بھی تعلیم تھی مگر یہ لسانی تعلیم نہیں تھی، باطن کے اندر تصرف تھا۔

دست مبارک کا سینے پر پھیر دینا، قلب پر ہاتھ کا مارنا یہ باطنی تعلیم تھی۔ قلب نبوت کا فیضان ہاتھ کی حرکت سے ان کے قلب تک پہنچا، جیسے بجلی کا کرنٹ آپ ایک لوہے کے تار لیں اور دوسرا تار اس میں ملائیں اور پھر آدمی تک پہنچائیں ان واسطوں سے پورا کرنٹ اس کے اندر سما جائے گا۔ تو قلب کا جو علمی کرنٹ تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک کے ذریعے سے پہنچایا، یہ باطنی تصرّف تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے

① الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القران، باب انزل القران علی سبعة احرف، ج:۱۵، ص:۳۹۰.

بھی تعلیم دی۔ قلبِ مبارک کی توجہ سے بھی تعلیم دی۔ دستِ مبارک کے تصرّفات سے بھی تعلیم دی۔ یہ صرف انسان کا خاصّہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام معلّمین اوّلین ہیں جنہوں نے دنیا کو تعلیم وتربیت دینا سکھلایا۔ یہ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جس کی بناء پر یہ افضل ہے۔

نبوّت تعلیم ہی ہے...... نبوّت بھی تو تعلیم ہی کا نام ہے۔ نبی اس لئے آتے ہیں کہ انباء کریں۔ انباء خبر دینے اور علم پہنچانے کو کہتے ہیں۔ تو نبوت کا حاصل ہی تعلیم وتربیت ہے اور نبوت سے بڑا کوئی مقام نہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں۔ تو تعلیم وہ خصوصیت ہے جو انسان کے سوا کسی کو نہیں دی گئی۔ جنات وملائکہ میں کوئی پیغمبر نہیں۔ بلکہ ملائکہ اور جنّات انبیاءِ بشری کے تابع بنائے گئے ہیں۔ جیسا کہ اس عالم میں یہودی بھی ہیں' نصرانی بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں اور مسلم بھی ہیں۔ اسی طرح سے جنّات کے اندر یہودی بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں' نصرانی بھی ہیں دہریئے بھی ہیں، ملحد بھی ہیں، بددین بھی ہیں۔ سب طرح کے موجود ہیں۔ وہ بھی انہیں انبیاء علیہم السلام کے اوپر ایمان لائے تھے۔ بعضے عیسائی ہیں۔ بعضے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ بعضے ان سے پہلے پیغمبروں پر ایمان لائے۔ ان میں پیغمبری نہیں ہے۔ پیغمبری بشر کے اندر ہے اور جنّات تابع بنائے گئے ہیں۔ پیغمبری کے معنی سوائے تعلیم وتربیت کے اور کیا ہیں؟ صرف یہ کہ علم پہنچا کر ان کو روشن بنایا جائے اور علم سے منوّر بنایا جائے۔ تو یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے جس سے انسان اشرف الکائنات اور افضل المخلوقات بنا۔

بلا تعلیم انسانیّت ختم ہو جاتی ہے...... اس کا حاصل یہ نکلا کہ جب یہ انسان کی خصوصیت ہے۔ تو خصوصیت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جب تک وہ خصوصیت رہتی ہے انسان انسان رہتا ہے۔ جب وہ خصوصیت ختم ہو جائے تو انسانیّت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر تعلیم انسان کی خصوصیت ہے تو جب تک تعلیم انسانوں میں موجود ہے۔ انسان انسان رہتا ہے۔ جب تعلیم نکل جائے گی ان کی انسانیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ناقص وناتمام رہ جائے گی اور جب تعلیم نہیں رہے گی، علم نہیں رہے گا، تو علم جب نہ رہے تو آدمی جمادات ونباتات سے بھی بدتر ہو جائے گا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انسان کی برتری تعلیم وتعلّم سے اور تربیت سے ہی قائم ہے۔ یہ نہ رہے تو انسان انسان نہیں ہے۔

مدارس بقاءِ انسانیت کا ذریعہ ہیں...... آج جو مدارس ومکاتب قائم کئے جا رہے ہیں، یہ دراصل انسانی خصوصیت کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔ انسان کی افضلیت کو برقرار رکھنے کے لئے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ مدارس قائم نہ کئے جائیں، یہ جوامع قائم نہ کی جائیں اور تعلیم نہ دی جائے اور فرض کیجئے کہ تعلیم مٹ گئی تو انسانیت مٹ گئی، یہ تعلیم وتعلّم کا سارا جھگڑا انسان کی بقاء کے لئے ہے۔ کیونکہ یہ خصوصیت ہے۔

اس لحاظ سے جامعہ قاسمیہ کا قائم ہونا، یہ ایک سعادت ہے اور مبارک علامت ہے۔ یہ انسانیت کے برقرار رکھنے کا ایک سلسلہ ہے۔ جتنا مضبوط ہوگا اتنی انسانیت مضبوط ہوگی۔ جتنی نیک نیتی اور اخلاص سے تعلیم دی جائے گی، اتنا ہی فی الحقیقت آدمیت کو اونچا بنایا جائے گا۔

علم مستند......اور کوئی علم اس وقت تک اونچا نہیں ہوتا جب تک اس کا انتساب صحیح نہ ہو، علم تو ہزاروں ہیں لیکن جب آپ یہ کہیں گے کہ یہ علم مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے تو وہ علم مستند ہو جائے گا، جیسے مہر لگ گئی، پکا ہو گیا۔ اگر آپ یوں کہیں کہ میری رائے یوں ہے، دنیا کہے گی آپ اپنی رائے اپنے پاس رکھیں، ہماری رائے یہ ہے، ہر انسان کی الگ الگ رائے ہے۔ لیکن جب انسان یوں کہے گا کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں اللہ کے رسول کا کہا ہوا کہہ رہا ہوں، جوں ہی گردن جھکا دی جائے تو وہ کہے گا بے شک گردن جھکی ہوئی ہے۔

یہ کیا چیز ہے؟ برگزیدہ شخصیت کی طرف علم کی نسبت قائم ہوگئی۔ تو علم میں انتساب سے مقبولیت آتی ہے۔ اگر انتساب نہ ہو مقبولیت نہ ہوگی۔

اس کی وجہ فی الحقیقت یہ ہے کہ علم ایک وراثت ہے۔ جیسے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إِنَّ الْأَنْبِيَآءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَلٰكِنْ وَّرَّثُوا الْعِلْمَ'' ① انبیاء (علیہم السلام) اپنے ورثے میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے، روپیہ پیسہ نہیں چھوڑتے، محلات اور بلڈنگیں نہیں چھوڑتے، وہ اپنے ترکے میں علم و معرفت اور اخلاقی کمالات اور باطنی و ظاہری علوم چھوڑتے ہیں۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا ورثہ ہے۔

علمی وراثت کی شرط......اور فرماتے ہیں: ''اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَآءِ'' ① علماء اس ورثے کو پاتے ہیں۔ لیکن وراثت کب ملتی ہے؟

جب نسب صحیح ہو۔ باپ کا وارث بیٹا تب بنتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ واقعی اس باپ کا بیٹا ہے۔ اور اگر بیٹا ہی یوں کہے کہ یہ میرا باپ ہی نہیں، پھر کہاں سے وراثت مل جائے گی، یا سلسلے کے بیچ میں کوئی انقطاع پڑ جائے۔ دادا سے ایک جائداد چلتی آرہی ہے اس کے باپ تک پہنچی۔ اس نے بیچ میں ایک واسطہ قطع کر دیا۔ تو میراث سلسلے سے آرہی تھی، جب سلسلہ نہیں رہا، میراث رک جائے گی۔ تو میراث جب ملتی ہے جب مورثِ اعلیٰ تک سلسلہ یکسانی کے ساتھ قائم ہو، مثلاً علوم دین، علوم اسلام میں اور ان علوم میں جو اللہ تک پہنچانے والے ہیں۔ ہمارے مورث اعلیٰ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی اوّلین روحانی اولاد صحابہ کرامؓ ہیں۔ صحابہؓ کے بعد دوسری پشت تابعین عظام ہیں۔ تابعین کے بعد تبع تابعین ہیں۔ تبع تابعین کے بعد پھر ائمہ کرام، علمائے مجتہدین اور محدثین وفقہاء درجہ بدرجہ، طبقہ بطبقہ یہ سب وارث بنتے چلے آرہے ہیں اور ایک سلسلہ قائم ہے۔

تو آج آپ قرآن پڑھیں گے تو یوں کہیں گے کہ قرآن میرا اور میرے باپ کا بتایا ہوا نہیں، یہ اللہ کے رسول کا لایا ہوا ہے اور یہ میرا سلسلہ ہے اور میں نے یہ حدیث فلاں سے سنی، اس نے فلاں سے سنی اور اس نے فلاں سے سنی۔ سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے گا۔ ایک ایک حدیث کی سند محدثین کے یہاں موجود ہے۔

---

① السنن لابی داؤد، کتاب العلم، باب الحث علی طلب العلم ج: ۱ ص: ۴۷ رقم: ۳۱۷.

② السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة ج: ۹ ص: ۲۹۶.

پھراحادیث کی قسمیں ہیں کہ سند اگر شبہ سے بالاتر ہواور مورثِ یقین ہوتو وہ حدیث قرآن کے درجے میں آجائے گی، جیسے اس کا منکر کافر ویسے اس کا منکر بھی کافر۔اگر مورثِ یقین نہیں ہے مورث ظن ہے تو اس کا منکر کافر نہیں ہوگا مگر فاسق ہو جائے گا اور مبتدع کہلائے گا۔اگراس سے بھی کم درجہ ہے یعنی شبہات ہیں تو اس کا منکر نہ کافر ہوگا نہ فاسق،تو حدیث کے علم کا درجہ استناد پر موقوف ہے۔اسی لئے محدثین نے چار لاکھ افراد کے قریب جو راویانِ حدیث ہیں۔ان کی سوانح عمری مرتب کردی کہ ان کا کردار کیسا تھا؟ ان کا کیریکٹر کیسا تھا؟ کس طرح سے یہ حدیث منتقل ہوکر آئی،تو ایک مسلمان کو بحمد اللہ یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ اپنے رسول کے ایک جملے کو سنے گا تو رسول تک سند پہنچا دے گا۔گویا مطلب یہ ہے کہ اس سند کے ساتھ یہ علم کی وراثت مجھ تک پہنچ گئی ہے۔اس لئے میں صحیح معنی میں روحانی طور پر اولادِ رسول ہوں اور میں صحیح وارث ہوں۔تو وراثت تب ملتی ہے جب اوپر سے لے کر نیچے تک نسب ملا ہوا ہو۔اگر بیچ میں انقطاع ہو جائے وراثت ختم ہو جاتی ہے۔

تو یہی روحانی وراثت میں بھی ہے کہ علم کی وراثت تب ملے گی کہ یہاں سے لے کر تلمذ اور شاگردی کا سلسلہ قائم ہونا چاہئے کہ یہ میرا استاذ اور یہ میرے استاذ کا استاذ اور آگے تک سلسلہ پہنچ جائے۔اوروہ بھی بصیرت کے ساتھ یعنی راویوں کے احوال اور کردار کے ساتھ۔

اگر بیچ میں سے آپ خدانخواستہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو نکال دیں پھر ہم تک علم پہنچتا ہی نہیں۔تابعین کو نکال دیں،علم نہیں پہنچے گا۔اس لئے کہ زنجیر ٹوٹ گئی یا آپ کسی کو استاذ نہ بنائیں اور یوں کہیں کہ میرے اوپر یہ علم آیا ہے پھر تو سرے سے نسب ہی قائم نہ ہوا،تو وراثت وہ نہ رہی جو پیغمبر کی تھی۔کچھ آپ کے وساوس اور کچھ اوہام ہوں گے۔جن کو آپ نے علم سمجھ لیا۔علم تو وہ ہے جو سند کے ساتھ منتقل ہوکر آپ تک پہنچے۔

علومِ اسلامیہ کی خصوصیت......یہ اسلام کی خصوصیت ہے،آج دنیا میں کس قوم کے پاس خدائی کتابوں کی سند موجود ہے؟اور مسلمانوں میں پیغمبر کے کلام تک کی سند موجود ہے۔وہ روایت یہاں سے لے کر اوپر تک ملا سکتے ہیں۔

اہتمامِ استناد......اور قرآن وحدیث تو بجائے خود ہے،فقہ کی جو کتابیں ہیں،ان کی سند موجود ہے۔اگر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط لکھی ہے تو مبسوط کی روایت موجود ہے کہ یہ ہمیں فلاں سے پہنچی،انہوں نے فلاں سے سنا اور انہوں نے فلاں سے۔تصوف کی سند موجود ہے۔۔رسالہ قشیریہ جو تصوّف کی بنیادی کتاب ہے۔جتنے تصوّف کے مسائل اور اصطلاحات ہیں ان کی سند جنید وشبلی تک اس میں پہنچائی گئی ہے۔اور جنید وشبلی سے آگے جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک۔تو یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس امت نے ہر دینی فن کو سند کے ساتھ قبول کیا ہے۔بلا سند اور بلا حجت کے کوئی بات نہیں ہے۔لفظوں کی بھی روایت کی ہے تو سند موجود ہے۔مثلاً میں نے قرآن شریف حفظ کیا،اگر میں سند پڑھوں تو اللہ میاں تک سلسلہ پہنچا سکتا ہوں،مجھے تجوید کے ساتھ میرے استاذ قاری عبدالوحید خان صاحب نے حفظ کرایا،انہیں تجوید کے ساتھ قاری عبدالرحمن صاحب رحمانی نے حفظ کرایا،

انہیں قاری ابراہیم صاحب مکی نے تجوید کے ساتھ حفظ کرایا۔ اس طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تک سند پہنچ جائے گی اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفظ کرایا۔ تو جتنے مجوّدین اور قرّاء ہیں ان سب کی سند موجود ہے۔

تصوف کے سلسلہ میں یہ جو شجرے پڑھے جاتے ہیں یہ سند ہی تو ہے کہ میں نے فلاں شیخ سے بیعت کی۔ اس نے فلاں سے کی، اس نے فلاں سے کی اور سلسلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچا دیتے ہیں اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک ۔تو یہ جو شجرہ ہے یہ درحقیقت نسب نامہ ہے، یہ رواۃ کا سلسلہ ہے۔ تو فقہاء کے ہاں الگ سند، محدثین کے ہاں الگ سند، قرّاء اور مجودین کے ہاں الگ سند، صوفیاء کے ہاں الگ سند ہے۔ ہر چیز سند سے ہے جو دوسروں کے ہاں نہیں پائی جاتی۔

بقائے سلاسل تعلیم ہی کے ذریعے ممکن ہے..... تو مسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو پڑھایا، سلسلہ ہم تک پہنچ گیا۔ یہ تعلیم ہی سے پہنچا ہے۔ محض علم سے نہیں پہنچا۔ علم جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہ آپ کی ذات بابرکات کے ساتھ خاص پہنچا ہے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم نہ دیتے تو ہم کیسے عالم بنتے؟ ہم تک علم کیسے پہنچتا؟ تو تعلیم کے ذریعے ہم تک علم پہنچا۔ تو درحقیقت انسانی خصوصیت اور بشری کمال تعلیم وتعلّم میں منحصر ہے۔ یہی افضلیت کی وجہ ہے جس نے انسان کو کائنات پر بڑھایا ہے۔ ورنہ مطلقاً علم تو حیوانات میں بھی ہے۔ تھوڑے بہت کا فرق ہے۔ آپ میں زیادہ ہے ان میں کچھ کم ہے۔ لیکن ہے۔ مگر کوئی معلّم نہیں۔ انسانوں میں سب سے پہلے معلّم حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر ان کے بعد ان کے اصحابِ کرام ہیں۔ پھر ائمہ عظام، پھر علماء ربانیین۔

تردیدِ باطل تعلیم پر موقوف ہے..... "يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَ انْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَ تَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ." ① نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر قرن اور ہر دور میں اس علم کو اٹھاتے رہیں گے، سلف سے منتقل کر کے ہر زمانے میں خلف موجود ہوں گے جو علم کو لیتے رہیں گے اور صحیح مستند پیغمبر کا علم پہنچتا رہے گا۔ جو اخلافِ رشید ہوں گے وہ اسلاف سے علم لیتے رہیں گے اور آگے چلتا کرتے رہیں گے۔

اس علم کی بدولت ہر قرن میں ایسے لوگ رہیں گے جو غلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور مبطلین کی دروغ بافیوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جاہلوں کی رکیک تاویلات کو چاک کرتے رہیں گے۔ ہر زمانے میں ایسے لوگوں کے ہونے کی خبر دی گئی۔

وہ ہوں گے تو تعلیم ہی کے ذریعے سے ہوں گے، تو اصل بنیادی چیز تعلیم ہے۔ جس پر امت کا دارومدار ہے، افراد کا دارومدار ہے۔ اور اشخاص کا دارومدار ہے۔ اور تعلیم کے لئے مدارس قائم کئے جاتے ہیں۔ اس لئے

① الحديث اخرجه الامام البيهقى فى سننه الكبرىٰ ج:١٠ ص:٢٠٩. والهيثمى وضعفه، مجمع الزوائد. ج:١ ص:١٤٠.

مدارس فی الحقیقت انسانیت کی بقاء کے لئے قائم ہو رہے ہیں۔انسانیت اجاگر نہیں ہوسکتی اور خصوصیت انسانی باقی نہیں رہتی اگر مدارس ومکاتب نہ ہوں، اس لئے میں اپنے عزیز کو اور ان حضرات کو جو ان کے معاون ہیں۔ اس جامعہ قاسمیہ کے قیام پر مبارکباد دیتا ہوں۔

تعلیم وتعلّم کے لحاظ سے برگزیدہ شخصیت......اور اس سے بھی زیادہ اس پر کہ اس جامعہ قاسمیہ میں جو تعلیم دی جائے گی اس کا ایک ہستی کی طرف استناد کیا گیا ہے جو فی الحقیقت علم میں بھی اونچی ہے اور معلّمی میں بھی اونچی ہے۔ دار العلوم دیو بند کو حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے قائم کیا اور دس بارہ شاگرد ایسے پیدا اور مہیا کئے کہ اس وقت ہندوستان میں علومِ حدیث کا دارومدار انہی پر ہے۔ دار العلوم میں تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمتہ اللہ علیہ نے چالیس برس تک حدیث کا درس دیا۔ ہزاروں طلبہ وفضلاء ان سے فیضیاب ہوئے۔ شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کے فضلاء اور شاگرد کون ہیں؟

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ جو آپ کے پاکستان کے شیخ الاسلام ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ جو وہاں شیخ الاسلام کہلاتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی رحمتہ اللہ علیہ، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ مولوی عبد العلی صاحب رحمتہ اللہ علیہ مدرسہ عبد الرب کے محدث تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب امروہی رحمتہ اللہ علیہ جو مدرسہ شاہی مراد آباد کے محدث تھے۔ تو جہاں جہاں یہ بڑے بڑے مدارس ہیں۔ حضرت کے تلامذہ نے وہاں حدیث پہنچائی اور فقہ پہنچایا۔

افادیتِ مدارس......اور یہ خاص حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کی شان تھی کہ دار العلوم دیو بند قائم کر کے جہاں جہاں گئے مدارس قائم کرتے چلے گئے۔ امروہہ میں مدرسہ قائم کیا، مراد آباد میں مدرستہ الغرباء قائم کیا، انبیٹھ، شاہجہان پور اور بریلی میں مدارس قائم کئے۔ اسی طرح گلاٹھی میں قائم کیا اور اپنے شاگردوں اور مریدین کو تاکید کی کہ جہاں رہو مدرسے قائم کرو! آج ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں جہاں مدارس ہیں وہیں کچھ علم کی روشنی پائی جاتی ہے۔ جہاں مدارس نہیں جس کا جو جی چاہے کہتا ہے۔ ظلمت پھیلی ہوئی ہے، مستند علم کا نشان نہیں ہے، یا موضوع روایتیں ہیں جو لوگ پڑھ دیتے ہیں یا غیر مستند باتیں ہیں، لیکن محدثانہ اور معلمانہ طرز پر بیٹھ کر سندِ صحیح کے ساتھ علم کو پہنچانا اور پرکھ کر دینا، یہ چیز نہیں پائی جاتی۔ جہاں مدارس ہیں وہاں پائی جاتی ہے۔

درجاتِ تربیت......اس آیت میں یہی فرمایا گیا کہ ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ کس بشر کے لئے زیبا نہیں اور جائز نہیں ہے۔ کسی بشر کے لئے؟ جس کو اللہ تعالیٰ علم دے، نبوت دے وہ لوگوں سے یوں کہے کہ لوگو میرے بندے بن جاؤ اور میری عبادت کرو۔ یہ اس کے لئے جائز نہیں۔ وہ یوں کہے گا۔ ﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ﴾ ① ربانی بنو، رب والے بنو، اللہ والے بنو، میرے بندے مت بنو اور ربانی کسے کہتے ہیں؟

① پارہ: ۳، سورۃ ال عمران، الآیۃ: ۷۹.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے صحیح بخاری میں اس کی تفسیر فرمائی کہ ربانی کون ہے؟ فرماتے ہیں ''اَلَّذِیْ یُرَبِّی النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ ثُمَّ بِکِبَارِھَا'' ① ربانی وہ ہے کہ مخلوقِ خدا کو چھوٹے چھوٹے مسائل سے تربیت دے کر بڑے مسائل تک پہنچائے۔ محض بڑے ہمہ گیر اور کلیاتی مسائل کا پیش کرنا ربانی کی شان نہیں ہوتی۔ ربانی تو جزئیات پیش کرتا ہے۔ کہیں نماز کے مسائل، کہیں وضو کے مسائل، کہیں نکاح وطلاق کے مسائل، کہیں معاشرت کے۔ چھوٹی چھوٹی جزئیات پر تربیت کرتا ہے۔ اس کے بعد بڑے بڑے علوم سامنے لاتا ہے۔ اسے اس سے اپنی ہیچ مدانی محسوس نہیں ہوتی کہ میں اتنا بڑا عالم ہوں۔ میں نماز کا کیا مسئلہ بیان کروں؟ وضو کا مسئلہ کیا بیان کروں۔ یہی سب سے بڑی کائنات ہے کہ ابتداء مخلوق کو چھوٹے مسائل سے تربیت دے تاکہ عملی زندگی درست ہو۔ پھر اونچے اونچے مسائل بیان کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: ''عَلِّمْنِیْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ غَرَآئِبَ الْعِلْمِ'' یارسول اللہ! علم کے کچھ عجائبات کچھ نکتے اور کچھ لطیفے ارشاد فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''ھَلْ عَرَفْتَ رَأْسَ الْعِلْمِ؟'' یہ جو علم کے کچھ لطیفے اور نکتے سیکھنے آیا ہے کیا اصل علم بھی تیرے پاس ہے؟ بنیادی علم بھی تیرے پاس ہے، جس کے اوپر نکتوں کی تعمیر کھڑی کی جائے؟

اس نے عرض کیا کہ: ''مَاشَآءَ اللّٰہُ''. جتنا اللہ نے چاہا فرمایا: ''ھَلْ عَرَفْتَ اللّٰہَ؟ قَالَ مَاشَآءَ اللّٰہُ'' جتنی میری استعداد تھی پہچان چکا ہوں۔ فرمایا: ''ھَلْ عَرَفْتَ الْمَوْتَ؟'' تو نے اپنی موت کو پہچان لیا؟ ''قَالَ مَاشَآءَ اللّٰہُ'' فرمایا! پہلے ان دوعلموں کا حق ادا کر کے آ۔ پھر ہمارے پاس آنا۔ پھر ہم عجائبات بتلائیں گے۔ پہلے ان چیزوں پر تو عمل کرلے۔ تو ربانی وہ ہے کہ عمل کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بتلائے اور رفتہ رفتہ بڑے علوم تک پہنچائے، تو قرآنِ حکیم میں فرمایا کہ ہم جس کو علم وحکمت اور نبوّت دیتے ہیں اس کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ لوگو! میرے بندے بن جاؤ، میری عبادت کرو۔ وہ یوں کہے گا۔ ②

بلا تعلیم ربانیّت پیدا نہیں ہوتی...... ﴿وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ﴾ تم ربانی بنو، رب والے بنو اور کس طرح سے؟ آگے صورت بتلائی۔ ﴿بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ ③ کتاب کی جو تعلیم دیتے ہو اور درس وتدریس کا جو مشغلہ اختیار کرتے ہو اس کے سبب سے تمہیں ربانی بننا پڑے گا۔

حاصل یہ نکلا کہ درس وتدریس کا مشغلہ نہ ہو تو ربانیّت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ محض وعظ گوئی سے اور محض

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱، ص: ۱۱۷. ② احیاء علوم الدین، کتاب العلم، باب وبیان علامات علماء الآخرۃ ج: ۱ ص: ۷۰. علامہ عراقی فرماتے ہیں: رواہ ابن السنی وابو نعیم فی کتاب الریاضۃ لھما، وابن عبدالبر من حدیث عبداللہ بن المسور مرسلا وھو ضعیف جداً دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج: ۱ ص: ۱۵۵. ③ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۷۷.

تقریروں سے ربانی نہیں بنایا جاسکتا، تقریریں تو مذکرات ہیں جو بھولا ہوا سبق یاد دلا دیتی ہیں۔ تقریر تربیت کی چیز تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو وقتی بات ہوتی ہے۔ تو تقریر یا خطابت یہ تربیت نہیں کرسکتیں یہ تو محض مذکر ہیں۔ اور یاددہانی تو اس کی کی جائے گی جس سبق کو آدمی پہلے پڑھ چکا ہو اور جو پڑھا ہی نہ ہو تو یاد کاہے کو دلایا جائے گا؟ تو حقیقت میں مربی جو شے ہے وہ تعلیم اور تدریس ہے اور تعلیم وتدریس بھی کتاب کے ساتھ۔ ﴿تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ یعنی کتاب اللہ سامنے ہو اور اس کا درس دو۔ اس کی تعلیم دو جو علوم کا سرچشمہ ہے۔ تو اس کا حاصل یہ نکل آیا کہ ربانیت بغیر تعلیم وتربیت کے پیدا نہیں ہوتی اور تعلیم وتعلّم ہی انسان کی خصوصیت ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتی۔ تو معلوم ہوا کہ حقیقی معنی میں ربانی بنانا یہ انسان کا کام ہے دوسروں کا کام نہیں ہے، حتی کہ ملائکہ بھی اگر جدوجہد کریں تو انسانوں کو ربانی نہیں بناسکتے وہ زیادہ سے زیادہ علم لاکر پہنچادیں گے۔ چاہے انہیں معنی معلوم نہ ہوں۔ جیسے کتاب علم پہنچادیتی ہے۔ لیکن حقیقی معنی میں اس کو سمجھنے والا اور سمجھانے والا انسان ہوگا۔ اس واسطے علم ہو اور علم کے بعد تعلیم ہو، تعلیم کے بعد استناد ہو، اس کی سند اور نسبت صحیح ہو، یہ مقبول ہوجاتی ہے۔

عظمتِ استناد...... الحمدللہ جامعہ قاسمیہ کے جو مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں تینوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ علم بھی ہے، تعلیم بھی ہے اور تعلیم کے ساتھ ایک ذات کے ساتھ استناد بھی ہے اور وہ ذات مقبولانِ الٰہی میں سے ہے۔ میں تو کہتا ہوں ہمارا اصل وجود نسبت سے ہے۔ ہمارے وجود کے معنی یہ ہاتھ اور پیر، یہ جگہ گھیرنا، یہ نہیں ہے۔ ہمارا وجود نسبت سے قائم ہے۔ ایک مومن کیوں مومن ہے؟ اس کا ایمانی وجود کیا ہے؟ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے۔ وہ جب اپنا تعارف بحیثیت مومن کے کرائے گا تو وہ یہ کہے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں۔ بس یہ میرا تعارف ہے۔ یہ نسبت ہی تو ہوئی کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں اور میں کسی کا نہیں ہوں میں تو ذاتِ بابرکاتِ نبوی کا غلام ہوں۔

جیسے دھوپ سے اگر پوچھا جائے کہ تو کون ہے؟ وہ اس کے سوا اور کیا تعارف کرائے گی کہ میں آفتاب کا ایک سایہ ہوں۔ تو آفتاب کی طرف نسبت دے دینا' یہی اس کا وجود ہے۔ اگر دھوپ آفتاب سے کٹ جائے، اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ تو حاصل یہ نکلا کہ وجود حقیقت میں نسبت وانتساب کا نام ہے۔ اگر ہمارا علم کسی مقدس ذات کی طرف منسوب ہو۔ وہ علم کارآمد اور معتبر ہے، اگر کسی ذات کی طرف منسوب نہیں، محض اپنے ہی اندر سے اٹھا ہے، اسے دماغی بخار کہا جائے گا۔ اس کا نام علم نہیں رکھا جائے گا۔ اسے اوہام ووساوس کا مجموعہ کہا جائے گا۔ خواہ عقل بھی اس میں شامل ہو۔

نسبتِ علمی...... کیوں کہ عقل محض بھی علوم پیدا نہیں کرسکتی۔ اس لئے کہ عقل غلط بھی چلتی ہے' صحیح بھی چلتی ہے۔ اس کے غلط اور صحیح ہونے کا بھی تو معیار ہونا چاہئے جس پر پرکھ کر ہم کہیں یہ عقل صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ ایک فلسفی کہتا ہے کہ سورج گھومتا ہے، ایک کہتا ہے کہ زمین گھومتی ہے، ایک فلسفی عقلی دعوؤں سے کہتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ ایک

کہتا ہے کہ بالکل موجود نہیں ہے۔علّت تامّہ موجود ہے۔ایک فلسفی کہتا ہے کہ قیامت آئے گی، دوسرا کہتا ہے کہ ہر گز نہیں آئے گی، عالم قدیم ہے۔یوں ہی آرہا ہے یوں ہی چلتا رہے گا۔یہ سارے عقل مند ہی تو ہیں لیکن متضاد دعوے ہیں۔ایک کا دعویٰ سچا ہوگا ایک کا دعویٰ جھوٹا ہوگا اور دونوں عقل سے کہہ رہے ہیں، تو جب عقل غلطی بھی کر سکتی ہے اور صحیح بھی ہوسکتی ہے۔تو غلط اور صحیح ہونے کی کوئی کسوٹی تو ہوگی جس پر پرکھ کر ہم کہیں کہ یہ عقل صحیح ہے اور یہ غلط، تو عقل کی کسوٹی نقل اور وحیِ خداوندی ہے۔اس علم پر پرکھ کر ہم کہیں گے کہ یہ عقل صحیح کہہ رہی ہے اور یہ عقل غلط کہہ رہی ہے۔اس عقل کے دعوے کے ساتھ خدا کا علم شامل ہے۔اس عقل کے دعوے کے ساتھ خدا کا علم شامل نہیں ہے۔کس میں یہ قطعیت ہے اور کس میں محض وہمیّت ہے، تو عقل کی صحت وسقم کا مدار خود وحی کے اوپر ہے۔

اصل بنیاد وحی ہے اور وحی کا علم نسبت ہی تو لئے ہوئے ہے کہ اللہ کا علم، اللہ کے رسول کا علم، رسول کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا علم اور صحابہؓ کے تابعین کا علم۔اس نسبت نے علم کو معتبر بنایا، اگر یہ نسبت نہ ہو اور ایک شخص یوں کہے کہ میرا علم۔تو اس کو دیوار پر مارا جائے گا۔کہا جائے گا کہ تیرا علم ہے تو ہمارا بھی علم ہے۔ہم تیری بات کیوں مانیں؟ ہم بھی تو انسان ہیں۔لیکن جب دونوں مل کر کہیں گے کہ نہ میرا علم نہ تیرا علم، خدا کا علم۔دونوں گردن جھکا دیں گے کہ بے شک اب جھکنا پڑے گا۔تو خدا کے علم کے معنی یہ ہیں کہ وہ علم جو خدا کی طرف سے آیا۔جو اللہ کی طرف منسوب ہے۔

قبولیّتِ نسبت......تو نسبت سے علم بڑا بنتا ہے اور قابلِ قبول بنتا ہے۔تو جامعہ قاسمیہ کے لفظ میں جیسے تعلیم کی طرف اشارہ ہے ویسے ہی نسبت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ ایک ایسی ذات کی یادگار میں ہے جو معلّمِ ہند ہو کر گزری ہے، جس نے بڑے بڑے محدّث پیدا کئے، جس نے سینکڑوں ہزاروں مدارس قائم کئے۔

آج اگر آپ دیکھیں، آپ کے پاکستان میں قصبے قصبے میں مدرسے موجود ہیں۔میں افغانستان گیا تو گاؤں گاؤں میں فضلاءِ دیوبند موجود ہیں، برما میں گیا تو شہر شہر میں فضلائے دیوبند اور مدارس موجود، اخیاب میں پہنچا تو چار سو کے قریب علماء جمع ہوئے جو فضلاء دیوبند تھے، ملنے کے لئے آئے۔افریقہ میں جاؤ تو ہزاروں کی تعداد میں فضلاء موجود۔تو یہ جگہ جگہ مدارس، جگہ جگہ فضلاء اور جگہ جگہ معلّم۔یہ درحقیقت عالمِ اسباب میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا فیض ہے۔جنہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھ کر گویا علم کی ایک فیکٹری قائم کردی کہ وہاں سے علم کی مشینیں تیار ہوتی رہیں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے سات برس کی عمر میں خواب دیکھا تھا کہ میں بیت اللہ کی چھت پر کھڑا ہوا ہوں اور میرے ہاتھ اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے دودھ کی نہریں جاری ہیں جو اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں۔تو ان کے ماموں مولوی عبدالسمیع صاحب مرحوم نے تعبیر دی تھی کہ حق تعالیٰ شانہٗ تمہارے ذریعے سے علومِ نبوّت کا فیضان کریں گے۔

کسی کو وہم بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ نانوتہ ایک کوری بستی جو ضلع سہارن پور (انڈیا) میں ہے، کوئی اس کی خصوصیت

نہیں تھی کہ وہاں ایک ایسی شخصیت بھی پیدا ہوگی کہ مشرق ومغرب میں اس کے ذریعے علوم کے دریا بہیں۔ جب دارالعلوم قائم ہوا تو لوگوں نے کہا کہ یہ تعبیر ہے۔ آج دارالعلوم کے نقشِ قدم پر مدینہ منورہ میں اگر مدرسہ شرعیہ قائم ہے تو فضلاءِ دیوبند کا قائم کیا ہوا ہے۔ مکہ میں مدرسۃ الفلاح کا قیام ہوا تو مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری کے ذریعہ جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ مکہ ہو، مدینہ ہو، بخارا ہو، بلخ ہو، افغانستان ہو، افریقہ ہو ہزاروں ہزار مدرسے قائم ہیں۔ تقریباً بیس ہزار کے قریب دارالعلوم دیوبند نے ایسے علماء تیار کر دیئے۔ جن پر فتویٰ کا مدار اور حدیث سنانے کا مدار اور قرآنِ کریم کی تعلیم کا مدار ہے۔ مشائخ طریقت ان میں ہیں اور صوفیت کی تعلیم بھی ان میں ہے۔

عزتِ نسبت......تو ایک ایسی ذات جس کے فیضان سے ہزار ہا علماء تیار ہوں، ہزار ہا مدارس تیار ہو جائیں۔ اس کی طرف نسبت کر دینے سے یقیناً ہم لوگوں کی عزت ہے اور اس جامعہ کی بھی یقیناً عزت ہے کہ نسبت کی وجہ سے مقبولیت پیدا ہو جائے گی کہ قبولیت نسبت سے آتی ہے۔

آپ مکہ مکرّمہ میں جاتے ہیں اور بیت اللہ کے در و دیوار کو عزت وعظمت سے چومتے ہیں۔ کیوں؟۔ اس لئے کہ اس کی اللہ سے نسبت ہے۔ اس کا نام بیت اللہ ہے۔ یعنی اللہ کا گھر، حالانکہ اللہ میاں اس میں رہتے تھوڑا ہی ہیں، وہ تو جسم سے پاک اور بری وبالا ہیں۔ مگر ایک نسبت ہے اور اس نسبت کی وجہ سے بیت اللہ مکرّم ومعظم ہے۔ اور تجلیات کا مورد بن گیا۔

تو بیتُ اللہ قابلِ تعظیم اور واجب التعظیم نسبت کی وجہ سے بنا۔ بیت اللہ کے اوپر غلاف ڈال دیا۔ حالاں کہ آپ ہی نے تو اسے پاکستان سے سی کر بھیجا تھا۔ وہاں جب پڑ جائے گا تو آپ اسے چومیں گے۔ اگر چہ اس سے پہلے چومنا نہایت غلطی ہے۔ اس واسطے کہ ابھی اسے وہ نسبت حاصل نہیں ہوئی، ابھی تو اسے آپ کی طرف نسبت ہے۔ جب اسے بیت اللہ سے نسبت ہوگی جب اسے چومنا۔ تو جب اسے بیت اللہ پر ٹانگ دیا جائے گا اور بیت اللہ سے مس کر دے گا تو اس میں برکات کے آثار آئیں گے۔ پھر بے شک آپ اسے چومیں تو آپ کے لئے عزّت وعظمت اور مقبولیت ہے۔ تو پردوں میں مقبولیت آ گئی اس لئے کہ دیوارِ کعبہ کو لگ گیا۔ دیوارِ کعبہ میں مقبولیت آئی کہ اللہ کا نام لگ گیا۔ بیت اللہ مسجدِ حرام میں ہے تو مسجدِ حرام ساری مسجدوں سے افضل بن گئی۔ مسجد حرام جس شہر میں ہے تو اس شہر کا نام بلد امین ہو گیا۔ کیوں کہ وہ مسجدِ حرام کا شہر بن گیا۔ وہ مکہ شہر جس صوبے میں ہے وہ حجاز کا صوبہ مقدس بن گیا، اس لئے کہ اس میں مکہ واقع ہے۔ تو نسبت در نسبت سے فضیلت اور بڑائی آئی۔ اس طرح سے علم خود بڑی چیز ہے اور کسی بڑی شخصیت کی طرف انتساب ہو جائے تو اس کی اور بڑائی ہو کر نمایاں ہو جاتی ہے۔

اس واسطے اس جامعہ کا قیام اور اس کے قائم کرنے والے دونوں مستحق مبارکباد ہیں۔ یہ چند جملے تھے جو مجھے اس آیت کے تحت اس جامعہ کے متعلق عرض کرنے تھے۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالٰی اس جامعہ کو مضبوط بنائے اور اس کو فیضان کا ذریعہ بنائے اور ایسے معاون اس کے لئے پیدا ہو جائیں تاکہ جو اس کے مقاصد ہیں وہ آگے بڑھیں اور علم پھیلے اور یہ علم کا منارہ بن جائے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَافِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ. اَللّٰھُمَّ اسْتَعْمِلْنَا بِالْقُرْاٰنِ اَجْسَادَنَا.

۱۲شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ

تاثیر الاعمال

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّـــا بَعْـــدُ!......فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ. (1)

تمہید...... بزرگانِ محترم! حدیثِ قدسی میں حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ "اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ" میں بندے کے گمان کے ساتھ ہوں، جیسا گمان میرے ساتھ قائم کرے گا ویسا ہی میرا عمل اس کے ساتھ ہوگا۔ اگر آپ نے ایک ناکارہ کے بارے میں اچھا گمان کرلیا ہے تو کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ اس ناکارہ کو کارآمد بنادے۔ بہرحال اس وقت میں کچھ زیادہ کہنے کی ہمت تو نہیں ہے، نہ کچھ قوت ہی ہے اور سفر بھی بہت لمبا رہا۔ اس کی وجہ سے کچھ تھکاوٹ بھی ہے۔ اس لئے زیادہ وقت تو میں نہیں لے سکوں گا۔ البتہ جلسہ کے احترام کی وجہ سے چند جملے ضرور عرض کروں گا۔

خواصِ اعیان...... اتنی اصولی بات سمجھ لیجئے کہ دنیا کی ہر چیز میں اللہ نے ایک خاصیّت رکھی ہے۔ دوا ہو، غذا ہو ہر چیز کی ایک خاصیّت ہے اور اس کے استعمال سے وہ خاصیّت ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً گل بنفشہ ہے۔ زکام زائل کرتا ہے۔ یہ اس کی خاصیّت ہے۔ جب آپ اسے استعمال کریں گے اور زکام ہوگا تو وہ زائل ہوگا۔ ملٹھی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ کھانسی دفع کرتی ہے، جب بھی آپ استعمال کریں گے، کھانسی ہوگی، اللہ تعالیٰ اسے زائل فرمادیں گے۔ تو ہر دوا کی ایک خاصیت ہے۔ اسی طرح ہر غذا کی ایک خاصیت ہے۔ گیہوں کھائیں گے تو اور خاصیّت ہے، چنا کھائیں گے تو اور خاصیّت ہے، چاول کھائیں گے تو اس کی اور خاصیّت ہے۔ بہرحال ہر چیز کی ایک خاصیّت ہے۔

خواصِ افعال...... اور میں کہتا ہوں کہ یہ چیزیں تو اعیان میں سے ہیں، ان کی خاصیتیں تو ہیں ہی، انسان کی ہر حرکت میں ایک خاصیت ہے۔ ہر وضع میں ہر انداز میں ایک اثر ہے۔ اگر آپ کسی کے سامنے یوں اشارہ کریں،

(1) پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۳۸.

ممنونِ کرم ہو جائے گا اور اگر یوں کریں تو لڑائی بن جائے گی۔ اگر کسی کو انگوٹھا دکھلا دیں تو چڑ پیدا ہو جائے گی اور کسی کو سلام کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائیں تو محبت پیدا ہو جائے گی۔ رخ دے کر بات کریں، اس کا اثر اور ہے اور منہ پھیر کر بات کریں، اس کا اثر دوسرا ہے۔ ہر ہیئت کا اثر اور ہر شے کا ایک اثر ہے۔

اسی طرح سمجھئے کہ شرعی اعمال کی بھی کچھ خاصیتیں ہیں۔ جتنے اعمال حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہوئے ہیں، ہر عمل کی ایک خاصیت اور اس کی ایک خاص تاثیر ہے، جب اسے استعمال کیا جائے گا، اس کے اثرات ظاہر ہوں گے۔

روزے کی خصوصیت...... مثلاً روزہ ہے، اس کی ایک خصوصیّت اور خاصیّت ہے۔ اور وہ قہرِ نفس ہے۔ جب آپ نفس کا دانہ پانی بند کر دیں گے اور نفس کو مقہور و مجبور کر دیں گے تو نفس مقہور ہو کر کے گناہ کی طرف نہیں جائے گا۔ یہ تو خمارِ گندم ہے۔ جتنی زیادہ غذا کھائی جاتی ہے، طاقت بڑھتی ہے، گناہ کی سوجھتی ہے اور سات دن فاقہ کر لیں تو گناہ کی طرف طبیعت ہی مائل نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ نفس کے اندر ہی جان باقی نہیں ہوگی، تو روزہ قہرِ نفس کے لئے رکھا گیا ہے کہ اس کو مقہور کر دے، قہر کے نیچے دبا دے تا کہ وہ کھل کر کوئی عمل نہ کر سکے اور مجبور ہو جائے۔

اسی واسطے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: روزہ رکھنے میں۔ نفس تو مقہور ہوتا ہی ہے اور نفس کے آثار و خواص تو مغلوب ہوتے ہی ہیں۔ نفس کے ساتھ شیطان کا ساز باز ہے۔ رمضان میں شیاطین بھی قید کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ جو کھل کر نفس پر اثر ڈالتے ہیں وہ گھٹ جاتا ہے۔ اس لئے کتنے بھی نیچے درجے کا مسلمان ہو، اس میں کچھ نہ کچھ رمضان کا احترام ضرور ہوگا۔ اگر روزہ بھی نہیں رکھے گا تو بھی دن میں کھاتے ہوئے شرمائے گا۔ بے روزہ رہنے کو اعلانیہ ظاہر کرنے سے شرمائے گا اور عار محسوس کرے گا۔ یہ خاصیّت ہے۔

زکوٰۃ کی خصوصیت...... زکوٰۃ کی بھی ایک خاصیّت ہے۔ پہلی خاصیّت یہ ہے کہ بخل کا رذیلہ انسان کے اندر سے زائل ہوتا ہے۔ بخیلی کا جو مادّہ ہے وہ گھٹ جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ غرباء کے لئے سہولت اور آسانی پیدا ہو جائے گی۔ اس سے حسنِ معاشرت پیدا ہوتا ہے۔ جتنا آپ غرباء پر خرچ کریں گے۔ وہ آپ کے ممنونِ کرم ہوں گے اور جان نثار بن جائیں گے۔ آپ تو یوں خوش ہوئے کہ میں نے اللہ کا ایک فرض ادا کیا کہ زکوٰۃ دے دی۔ غریب یہ سمجھے گا کہ میرے اوپر کرم کیا اور احسان کیا۔ تو امیر اور غریب میں ایک ربط اور رشتہ قائم ہو جائے گا۔ اور وہی حسنِ معاشرت کی بنیاد ہے۔ تو زکوٰۃ کے اندر جہاں نفس کے اندر یہ اثر پڑتا ہے کہ بخل کا رذیلہ زائل ہو، وہاں معاشرت کی خوبی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور تمدن کی خوبی بھی سامنے آتی ہے اور امیر و غریب میں باہمی میل جول پیدا ہو جاتا ہے۔ تو یہ زکوٰۃ کی خاصیّت ہے۔

ظہورِ خواص کی شرط...... جب آپ اسے استعمال کریں گے یہ خاصیّت ظاہر ہوگی، اب کوئی استعمال ہی نہ کرے تو وہ بات جداگانہ ہے۔ جیسے کوئی دوائی استعمال نہ کرے تو بیماری کیسے زائل ہوگی۔ محض طبیب کے نسخہ لکھ دینے سے تو بیماری زائل نہیں ہوگی۔ استعمال ہی کرنے سے زائل ہوگی۔ یہی صورت شرعی اعمال کی ہے کہ ہر عمل کی

ایک خاصیت ہے۔ظاہر جب ہی ہوگی جب اسے استعمال کیا جائے۔

ماہرینِ خواص کی اطاعت..... حق تعالیٰ نے جس طرح سے اطبّاءِ جسمانی پیدا فرمائے، ڈاکٹر ہیں، طبیب ہیں، وہ ان خواص وآثار کو جانتے ہیں۔ مریض کی حالت دیکھ کر وہ نسخہ لکھتے ہیں، مریض اگر طبیب کی اطاعت کرے گا، شفا پائے گا۔ اطاعت نہیں کرے گا بیمار پڑا رہے گا۔ بیماری بڑھ جائے گی، ہلاکت کے قریب پہنچ جائے گا۔تو اطبّاء جانتے ہیں۔ ہر شخص دوا کی خاصیت کو نہیں جانتا۔اسے طبیب کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔

اگر کوئی طبیب نسخہ لکھے۔اور بیماریوں کہے کہ آپ نے اس نسخے میں گلِ بنفشہ کو چھ ماشے کیوں لکھا ہے۔ ایک تولہ کیوں نہ لکھ دیا۔اور ملٹھی آپ نے تین ماشے کیوں لکھی ہے چھ ماشے کیوں نہیں لکھی۔تو طبیب کان پکڑ کر مطب سے نکال دے گا کہ تو مجھے تعلیم دینے کے لئے آیا ہے یا شفا پانے کے لئے نسخہ لینے آیا ہے؟۔تو لامحالہ مریض کو اطاعت کرنی پڑے گی۔ جتنی مقدار وہ لکھ دے اور جو وقت وہ تجویز کرے۔ اسی وقت میں وہ دوا استعمال کی جائے گی۔اتنی ہی مقدار میں استعمال کی جائے گی جتنی مقدار طبیب لکھ دے گا۔

پھر جو پرہیز بتلائے گا وہ بھی کرنی پڑے گی اگر آپ پرہیز نہ کریں تو دوا فائدہ نہیں دے گی۔ زکام کو زائل کرنے کے لئے اس نے گلِ بنفشہ لکھا۔وہ آپ نے پی لیا۔مگر صبح سے شام تک سیر بھر دہی برف ملا کے پی لی۔اس سے تو زکام اور ترقی پر آجائے گا۔تو دوا موثر نہیں ہوتی۔ جب تک پرہیز نہ ہو۔ ہر علاج کے اندر دو جز ہوتے ہیں ایک دوا، ایک پرہیز۔ بلکہ پرہیز زیادہ نافع ہوتی ہے۔اگر جم کر پرہیز کرے تو بیماری آدھی ہو جاتی ہے۔دوا سے پھر بقایا آدھی بیماری زائل ہو سکتی ہے۔مگر ہر صورت میں طبیب کی اطاعت کرنی پڑے گی۔رائے زنی کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی کہ اس نسخے میں آپ نے پانچ دوائیں کیوں لکھی ہیں۔ چھ کیوں نہ لکھ دیں؟ مریض کو اس کا حق نہیں ہوگا، طبیب کہے گا کہ میں فن کی رُو سے جانتا ہوں کہ کتنی مقدار ہونی چاہئے۔ تجھے اگر علاج کرانا ہے تو یہ نسخہ اسی مقدار میں استعمال کر۔

یہی صورت بعینہٖ طبِ روحانی یعنی شریعت کی ہے۔ جو اللہ نے نازل فرمائی۔اس کے لئے اطبّائے روحانی بھی نازل کئے، وہ انبیاء علیہم السلام ہیں۔انبیاء کی تعلیم سے ان کے ورثاء پیدا ہوتے ہیں۔جن کو علمائے ربانی کہا جاتا ہے۔وہ انبیاء سے وراثت پاتے ہیں اور وہ طب روحانی ان کے پاس آتی ہے۔مریض سامنے آتے ہیں وہ بھی نسخے لکھتے ہیں۔ ہر مرض کے مناسبِ حال دوا تجویز کرتے ہیں۔اگر مریض یہ کہنے لگے کہ آپ نے فلاں وقت میں مجھے دو ہی رکعتیں کیوں بتلائی ہیں، میں چار کیوں نہ پڑھ لوں؟ وہ کان پکڑ کے نکال دیں گے کہ تو علاج کے لئے آیا ہے یا تعلیم دینے کے لئے آیا ہے؟ اتنی ہی مقدار لازمی ہے۔شریعت نے ایک تسبیح کی مقدار بتلائی کہ سو مرتبہ پڑھا کرو۔ مریضوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ یہ کہیں سو کے سوا سو کیوں نہ ہوئے؟ اور سو کے نوے کیوں نہ کر دیئے گئے۔جتنی مقدار اللہ تعالیٰ نے تجویز کی ہے۔ وہی نافع ہوگی۔جتنی مقدار تجویز نہیں کی وہ نافع نہیں ہو سکتی۔تو ہر عمل کی ایک خاصیّت ہے، روزے کی بھی ایک خاصیّت ہے، زکوٰۃ کی بھی ایک خاصیت ہے، حج کی بھی ایک

خاصیّت ہے اور نماز کی بھی ایک خاصیت ہے۔

نماز کی خصوصیّت......نماز کی خاصیّت کیا ہے؟ نماز پڑھنے والے میں دیدارِ خداوندی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر نماز کا تارک ہے تو وہ جو میدان محشر میں دیدار خداوندی ہوگا' اس کی استعداد نہیں پیدا ہوگی، وہ دیدارِ الٰہی سے محروم رہے گا۔ تو نماز کی خاصیّت یہ ہے کہ وہ قلب کے اندر دیدارِ خداوندی کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔

دیدارِ خداوندی کے مراتب......یہاں نماز پڑھنے میں آپ اللہ تعالیٰ کو عقیدے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: عبادت اس طرح سے کرو کہ جیسے تم اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ اس عقیدہ سے نماز پڑھے گا تو گویا عقیدے کی آنکھ سے حق تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، گو اس آنکھ سے نہیں دیکھ رہا۔ کوئی بزرگ ہے۔ وَلی کامل ہے۔ وہ کشف کی آنکھ سے تجلیاتِ خداوندی کو دیکھتا ہے۔ جب نماز پڑھتا ہے تو تجلّیات الٰہیہ اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ مگر قیامت کے بعد ایک وقت آئے گا کہ جس کے دیکھنے کی مشق آپ نے قلب سے' حواس سے اور باطنی آنکھ سے کی تھی، وہ آج ظاہری آنکھ سے سامنے آجائے گی اور دیدارِ خداوندی عیاناً ہونا شروع ہو جائے گا۔ مختلف تجلیات نمایاں ہوں گی۔ جس میں بندے حق تعالیٰ شانہ، کو دیکھیں گے۔ یہ دیکھنے کی استعداد نماز ہی پیدا کرتی ہے۔ ①

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد شریف میں تشریف رکھتے تھے اور چودھویں رات کا چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین چاند کو بھی اور چاندنی کو بھی دیکھ رہے تھے۔ ارشاد فرمایا کہ تم جو چاند کو دیکھ رہے ہو تو ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں حارج تو نہیں ہے؟ وہ اپنی جگہ دیکھ رہا ہے، وہ اپنی جگہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے دیکھنے میں وہ رکاوٹ تو نہیں بنا ہوا، اس کے دیکھنے میں وہ رکاوٹ نہیں بنا ہوا۔ دنیا کے کروڑوں اربوں انسان چاند کو ایک وقت میں دیکھتے ہیں مگر ایک کے دیکھنے میں دوسرے کا دیکھنا حارج نہیں ہوتا۔ فرمایا۔ اسی طرح قیامت میں بندے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔ اربوں کھربوں ہوں گے مگر ایک کے دیکھنے میں دوسرے کا دیکھنا حارج نہیں ہوگا۔ جس طرح سے تم چاند کو دیکھ رہے ہو۔ ②

فجر و عصر کی خصوصیّت......اور اس کے بعد فرمایا: اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو اور یہ کر سکو کہ صبح کی نماز اور شام کی نماز پابندی کے ساتھ ادا کرو تو دیدار خداوندی کا یہی ذریعہ بنیں گی۔ گویا خاصیت تو ہر نماز میں ہے مگر خصوصیّت سے یہ دو نمازیں، عصر کی اور صبح کی، یہ دو نمازیں وہ ہیں کہ یہ حق تعالیٰ کے دیدار کی زیادہ استعداد پیدا کرتی ہیں۔

اور بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں نمازوں میں عالم غیب آدمی کے قریب ہو جاتا ہے۔ یہ جو اعمال لکھنے والے ملائکہ ہیں، یہ رات کے اور ہیں اور دن کے اور ہیں۔ دن کے لکھنے والے صبح کی نماز کے وقت

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبرنیل ج: ۱ ص: ۸۷.

② الصحیح للبخاری، کتاب الصلوۃ، باب فضل صلوۃ الفجر ج: ۲ ص: ۲۱۷ رقم: ۵۳۷.

آتے ہیں اور رات کے لکھنے والے انہیں چارج دے کر واپس ہو جاتے ہیں۔ یہ دن بھر اعمال لکھتے ہیں، عصر کی نماز جب پڑھتے ہیں تو یہ رات والے ملائکہ کو چارج دے دیتے ہیں۔ رات کو وہ اعمال لکھتے ہیں۔ تو صبح کی نماز میں بھی کروڑوں، اربوں، کھربوں ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ جو اعمال لکھنے والے ہیں اور اسی طرح عصر کی نماز کے وقت بھی جمع ہوتے ہیں۔ ہر بندے کے اوپر دو۲ فرشتے ہیں جو اعمال لکھتے ہیں۔ تو اگر بندے ایک ارب ہیں تو وہ چار ارب ہوں گے۔ غرض اربوں کی تعداد میں یہ ملائکہ صبح اور شام کی نماز کے وقت آتے ہیں۔

فجر وعصر میں نزولِ ملائکہ کی حکمت ...... اور عجیب حکمت ہے حق تعالیٰ کی کہ ان دو نمازوں کے لئے ملائکہ کا تبادلہ رکھا، کیوں رکھا؟ اس لئے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت دی جا رہی تھی اور حق تعالیٰ نے فرمایا تھا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ ① میں زمین میں اپنا نائب مقرر کرنے والا ہوں جو میری طرف سے دنیا میں میرا قانون چلائے گا۔ میری طرف سے نیابت کرے گا اور جو احکام میں نے بندوں کے لئے جاری کئے ہیں، انہیں پھیلائے گا۔ میں ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں، تو ملائکہ کو خلجان گزرا۔ جس کی وجوہ تھیں کہ۔

﴿اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ﴾ ②
آپ ایسی نوع کو خلیفہ بنا رہے ہیں۔ جو دنیا میں خون ریزی الگ کرے گی، فساد الگ مچائے گی اور ہم خدام کہاں چلے گئے ہیں جو ہر وقت آپ کی تسبیح وتہلیل میں مصروف رہتے ہیں۔ گویا در پردہ اشارہ ادھر تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے، یہ انسان تو نہایت ہی مفسد اور سفاک ہوگا۔

انسان کی تاریخ خون سے بھری پڑی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے آدمی کا جو خون آدمی کے ذریعہ سے بہنا شروع ہوا ہے۔ وہ آج تک بند نہیں ہوا۔ بلکہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ تو انسان انسان کو پھاڑ کھا رہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ انسان کو درندہ کہنا یہ درندے کی توہین ہے۔ اس لئے کہ درندہ مثلاً شیر ہے، اگر پھاڑتا ہے تو بکری کو پھاڑے گا۔ شیر شیر کو تو نہیں پھاڑتا۔ انسان ایسا درندہ ہے کہ اپنے ہی بھائی بندوں کو پھاڑ کھاتا ہے۔ جتنے مہلک ہتھیار ایجاد ہو رہے ہیں اور انسان ایجاد کر رہے ہیں، وہ انسانوں ہی کی تباہی کے لئے ہو رہے ہیں۔ سانپ بچھوؤں کو ہلاک کرنے کے لئے تو یہ توپیں اور بندوقیں نہیں ہیں۔ آدمی آدمی کو ہلاک کرنے کے لئے مہلک ہتھیار تیار کر رہا ہے۔ تو انسانی تاریخ خون سے بھری ہوئی ہے۔ انسان ہی انسان کا خون بہا رہا ہے۔ انسان ہی انسانوں کے حق میں فساد برپا کر رہا ہے۔ کچھ صلاح پہ آنا چاہتے ہیں۔ یہ فساد انگیزی کر کے صلاح کے راستے سے ہٹا دیتا ہے، تو فساد بھی ہے، خون ریزی بھی ہے تو ملائکہ نے یہی عرض کیا تھا کہ اس نوع کے اندر خون بھرا ہوا ہے اور فساد بھرا ہوا ہے یہ آپ کی نیابت کرے گا؟ یہ تو نیابت کو اور فاسد بنا دے گا اور ہم خدام کہاں چلے گئے ہیں جو رات دن تسبیح اور تقدیس میں مصروف ہیں۔ ہمیں خلیفہ بنایا جائے۔

---

① پارہ: ۱، سورة البقرة، الآیة: ۳۰. ② پارہ: ۱، سورة البقرة، الآیة: ۳۰.

خلافتِ آدم پر شبہ کا حاکمانہ جواب......تو حق تعالیٰ نے اس کا ایک جواب تو حاکمانہ دیا کہ: ﴿اِنِّیۤ اَعۡلَمُ مَالَا تَعۡلَمُوۡنَ﴾ ① تم نہیں جانتے، ہم حقیقت حال کو جانتے ہیں۔ ملائکہ خاموش ہو گئے۔ لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ خاموش ہونے سے دل کا خلجان بھی نکل گیا ہو، حاکم کے حکم سے آدمی دب کر ادبا چپکا تو ہو جاتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ دل کا خلجان بھی نکل جائے۔ اس لئے دوسرا جواب حکیمانہ دیا۔

خلافتِ آدم پر شبہ کا حکیمانہ جواب......اور وہ یہ تھا۔ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا﴾ ② حضرت آدم علیہ السلام کو تمام ناموں کی تعلیم دے دی۔ دنیا کی جتنی چیزیں ہیں۔ ان سب کے نام بتلائے۔ ان سب کی خاصیتیں بتائیں۔ اللہ کے جتنے نام ہیں وہ بتلائے، ان کے خواص و آثار بتلائے۔ تو اسماء الٰہیہ اور اسماءِ کونیہ سب حضرت آدم علیہ السلام کو بتلائے۔ اس کے بعد ملائکہ سے کہا۔ ﴿اَنۡۢبِـُٔوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ﴾ ③ اگر تم اپنے دعوے میں، وہ جو تمہارے دل میں دعویٰ ہے کہ ہم خلافت کے مستحق ہیں، سچے ہو، ذرا چیزوں کے نام تو بتلاؤ۔

اس واسطے کہ خلافت علم سے چلتی ہے اور علم کا ابتدائی مقام یہ ہے کہ کسی چیز کا نام معلوم ہو۔ اگر نام معلوم نہ ہو تو شئی مجہول مطلق ہے۔ نام معلوم ہوگا تو شئی کو تلاش کرے گا اور اگر نام ہی معلوم نہیں تو کسی سے کیا پوچھے گا؟ اور کیا کہہ کر پوچھے گا؟ تو علم کا ابتدائی درجہ ناموں کا معلوم ہونا ہے۔

پھر اس کے بعد دوسرا درجہ ان ناموں کی مسمّیات کا ہے کہ وہ کیا کیا چیزیں ہیں جن کے یہ نام ہیں۔ پھر ان کے افعال کیا ہیں؟

پھر ان کے حقائق کیا ہیں؟ اور ان کے نفوس کے اندر جذبات کیا ہیں؟ یہ چوتھا درجہ ہے علم کے بعد، علم کے بعد، علم کے بعد علم۔ علم کے درجات نکلتے ہیں مگر ابتدائی درجہ علم کا ناموں کا معلوم کرنا ہے۔ تو حضرت آدم علیہ السلام کو جن پر حکمرانی کروانی تھی اور جن کا نظم بندھوانا تھا ان سب چیزوں کے نام بتلا دیئے۔

ملائکہ سے کہا کہ ان کے نام تو بتلاؤ؟ ملائکہ نہیں بتلا سکے۔ اس لئے کہ جن ملائکہ کو جس نوع پر متعین کیا ہے اس کے ناموں سے تو وہ واقف ہیں، دوسرے ناموں سے واقف نہیں ہیں جو ملائکہ بارشیں لانے پر مقرر رہیں۔ وہ بارش کے احوال کو تو جانتے ہیں لیکن بقیہ دوسرے احوال کا انہیں پتہ نہیں۔ جو اعمال لکھنے والے ہیں، اعمال کی حد تک علم رکھتے ہیں، لیکن اعمال سے جو خارج چیزیں ہیں، ان کا انہیں پتہ نہیں ہے، تو ملائکہ کو ہر نوع کی اتنی ہی چیزیں معلوم ہیں جن پر انہیں مقرر کیا گیا ہے، ساری دنیا کی ساری چیزوں کے نام انہیں نہیں بتلائے گئے۔ اس لئے کہ ساری دنیا سے ملائکہ کا کوئی تعلق نہیں۔

غرض ملائکہ جواب نہیں دے سکے۔ پھر حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا: ﴿یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۰. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ الآیۃ: ۳۱.

③ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱.

بِاَسْمَآ ئِهِمْ﴾ ① اے آدم! تم چیزوں کے نام بتلاؤ"۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرفر تقریر شروع کر دی۔ یہ آسمان ہے، یہ زمین ہے، یہ لوٹا ہے اور یہ روٹی ہے اور اس کے یہ آثار اور اس کی یہ خاصیات ہیں، تمام چیزوں کے نام اور آثار گنوانے شروع کئے۔ جو ملائکہ کے علم میں نہیں تھے۔

اب ملائکہ خاموش ہوئے۔ اور کہا۔ ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا، اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ ② بے شک آپ پاک ہیں۔ آپ نے جتنی چیزوں کے نام ہمارے حلقۂ عمل کے بارے میں بتلا دیئے ہیں۔ ہمیں اتنا تو معلوم ہے، سب معلوم نہیں۔ آدم کو تو ساری چیزوں کے نام معلوم ہیں۔ زمین و آسمان کی چیزیں، زمین کی پیداوار کی چیزیں اور آسمان کے رہنے والوں کے پتے اور ان کے آثار وخواص سیارات کا پتہ، چاند سورج کا پتہ، پھر ان چاند سورج کے جو آثار ہیں ان کا پتہ، انسانی بدن کے اندر تمام اعضاء کا پتہ، معدہ کیا کام کرتا ہے۔ جگر کیا کام کرتا ہے، قلب کا کیا کام ہے، دماغ کا کیا کام ہے۔ ہر ہر چیز حضرت آدم علیہ السلام پر روشن کر دی گئی جو ملائکہ پر نہیں تھی۔ آخر ہار مانی اور خاموش ہوئے اور کہا کہ سُبْحٰنَكَ، آپ پاک ہیں۔ وہ جو ہمارا خلجان تھا، اس سے آپ بری و بالا ہیں۔ بلاشبہ آپ کا انسان کو نائب بنانا برحق ہے اور آدم ہی اس کا مستحق تھا۔

لیکن ابھی ایک درجہ جواب کا اور باقی ہے۔ وہ یہ کہ ملائکہ نے کہا تھا کہ یہ زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ اس کا جواب ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ یہ تو ہو گیا کہ آدم سب سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ جو تمہارے اندر نہیں۔ یہ بھی جواب ہو گیا کہ آدم کے حقائق کو ہم جانتے ہیں تم نہیں۔ لیکن وہ جو کہا تھا کہ فساد ہو گا خون پھیلے گا، وہ چیز ابھی تک باقی تھی؟

حق تعالیٰ نے اس کا جواب حکیمانہ طریق پر یہ دیا کہ جہاں کوئی عمل خیر ہو اور انسان اس کے اندر جمع ہوں، ملائکہ کو حکم دیتے ہیں کہ اس مجلس کے اندر جاؤ۔ ایک جلسہ ہوا، اس میں بہت سے اللہ والے جمع ہیں، اللہ کے ناموں کا ذکر ہو رہا ہے، مسائل کا ذکر ہو رہا ہے۔

تو حدیث میں فرمایا گیا۔ "اِنَّ لِلّٰهِ مَلٰٓئِكَةً سَيَّاحِيْنَ" اللہ کے ہاں کروڑوں، اربوں کی تعداد میں ملائکہ ہیں جن کا کام یہی ہے کہ دنیا میں گھومیں پھریں اور دیکھیں کہ انسان کیا کام کر رہا ہے۔ جب دیکھتے ہیں کہ ایک مجلس خیر و برکت کی ہے۔ مسائل کا ذکر ہے، وہ دوڑ پڑتے ہیں اور پچھلوں کو آواز دیتے ہیں۔ "هَلُمُّوْآ اِلٰى مَقْصَدِكُمْ" دوڑو، تمہارا مقصد اس مجلس میں پورا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے پچھلوں کو بلاتے ہیں، یہاں تک کہ اس مجلس اور جلسے میں چہار طرف آسمان تک اربوں کھربوں ملائکہ کا چھت لگ جاتا ہے۔ "غَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ" ملائکہ اس مجلس کو ڈھانپ لیتے ہیں اور رحمت اس کو گھیر لیتی ہے۔ اب یہ مجلس ختم ہونے کو ہے، ختم ہوئی۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے ارشاد فرماتے ہیں، جب یہ ملائکہ مجلس میں آتے ہیں اور دیکھتے ہیں جو کچھ مجلس میں ہو رہا ہے، اب یہ آسمانوں کی طرف چڑھتے ہیں تو ان سے حق تعالیٰ سوال کرتے ہیں اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے

① پارہ: ۱، سورة البقرة، الآية: ۳۳. ② پارہ: ۱، سورة البقرة، الآية: ۳۲.

ہیں۔مگر حکمت کے تحت سوال ہوتا ہے کہ بندوں کو کس حالت میں پایا؟

عرض کرتے ہیں کہ آپ کے ذکر میں مصروف تھے۔کیا ذکر کرتے تھے؟ آپ کی جنّت کے طالب تھے اور جہنّم سے ڈرتے تھے۔فرماتے ہیں کہ جنت کو انہوں نے دیکھا ہے جو طلب کر رہے تھے یا جہنم کو دیکھ لیا ہے جو خوف کھا رہے تھے؟

عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں، آپ کے انبیاء کی زبان سے سنا ہے اور ایماناً مانا ہے کہ جنّت بھی حق ہے اور دوزخ بھی حق ہے۔گویا پہلا الزام تو یہ ہوتا ہے کہ تم جنت و دوزخ کو آنکھ سے دیکھ رہے ہو۔اگر رات دن تسبیح میں مصروف رہو تو تمہارا کیا کمال ہے۔کمال اس انسان کا ہے کہ دیکھی ایک چیز نہیں اور پھر تسبیح و تہلیل اور ہمارے ذکر میں مصروف ہے۔اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اے ملائکہ! میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ جتنے اس مجلس میں موجود تھے، جو مانگتے تھے، وہ میں نے دیا۔یعنی جنّت۔اور جس سے ڈرتے تھے اس میں نے انہیں بچالیا۔یعنی جہنّم۔اور میں نے ان کی مغفرت کردی۔تو ملائکہ عرض کرتے ہیں کہ یا اللہ! بہت سے تو وہ لوگ تھے جو گھروں سے قصد کر کے آئے تھے کہ اس مجلس میں شریک ہوں گے، اس جلسے میں بیٹھیں گے۔مگر بعض تماشہ بین بھی کناروں پر آ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ان کا مقصد نہیں تھا کہ اس جلسے میں آئیں۔جب قریب سے گزرے تو انہوں نے کہا کہ بھئی! کیا ہو رہا ہے، ہم بھی دیکھتے چلیں۔وہ کھڑے ہوگئے تو کیا وہ بھی اس مغفرت میں شامل ہیں؟

جواب میں فرماتے ہیں "هُمُ الْقَوْمُ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ." اس جلسے میں بیٹھنے والی ایسی قوم ہے کہ ان کے آس پاس والا بھی محروم نہیں رہ سکتا، وہ بھی مغفرت میں شامل ہے۔سب کی مغفرت ہوگئی۔ ①

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک بڑے جلسے کی مغفرت کرنی تھی۔ہزاروں آدمی اس میں جمع تھے۔ تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ ملائکہ آسمانوں پر چڑھیں اور ان سے سوال کیا جائے کہ بندے کیا کر رہے ہیں، وہ جواب دیں۔پھر انہیں گواہ بنایا جائے اور مغفرت کی جائے۔اور پھر ان جلسوں کو دیکھا جائے تو ایک ہی جلسہ تو نہیں۔ایک ہی وقت میں ہزاروں جلسے ہو رہے ہیں۔اسی پاکستان میں آج ایک جلسہ یہاں ہے۔ہر شہر میں معلوم نہیں کتنے جلسے ہو رہے ہوں گے۔

اور ہر جلسے پر یہی کہ ملائکہ آئیں اور پھر چڑھیں اور حق تعالیٰ سوال کریں اور مغفرت کی جائے۔پھر ایک پاکستان ہی نہیں، ہندوستان کے شہروں میں جلسے ہو رہے ہوں گے۔ترکی کے لوگ ہیں وہاں بھی جلسے ہوں گے۔عرب کے لوگ ہیں، وہاں بھی ہوں گے۔دنیا میں سارے جلسوں کو لو، تو لاکھوں جلسے ہوں گے۔تو ہر جلسے پر یہی کہ ملائکہ آئیں۔پھر وہ اوپر چڑھیں اور ان سے سوال ہو۔تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بخشنا تھا تو بخش دیتے۔اس کی کیا ضرورت تھی کہ ملائکہ اس طرح سے آئیں اور ان سے سوال کیا جائے اور انہیں گواہ بنایا جائے کہ تم گواہ رہو کہ ہم نے بخشش کی۔

① السنن للترمذی ،ابواب الدعوات، باب ما جاء ان للہ تعالی ملائکہ.....ج: ۱۲، ص: ۲۷ رقم ۳۵۲۴.

یہ درحقیقت ان کے خلجان کا جواب ہے کہ تم نے یہ کہا تھا کہ انسان کی تاریخ خون سے بھری ہوئی ہے، یہ انسان ہی تو ہے جو ہر وقت ہمارے ذکر میں مصروف ہے۔ تم نے بھی جا کے فائدہ اٹھایا۔ تو انسانی نوع میں یہ بھی داخل ہے کہ ذکر اللہ میں مصروف، مسائل سننے میں مصروف، کتاب وسنّت کے احکام جاننے میں مصروف۔ تو تم نے سارے انسانوں پر کیسے حکم لگایا تھا کہ سارے ہی فسادی ہوں گے، سارے ہی مفسد ہوں گے، سارے ہی سفاک ہوں گے۔ ان میں یہ بھی تو ہیں۔ ایک لاکھ فسادی ایک طرف اور ایک صالح ایک طرف۔ اس کی وجہ سے ہزاروں کی نجات ہوسکتی ہے۔ تو انسانوں کے اندر یہ بھی تو ہیں۔ یہ جواب ہے اس کا کہ جو تمہارے دلوں کے اندر خلجان گزرا تھا۔

ملائکہ پر اتمام حجّت ...... حج جب ہوتا ہے، وہی صورت وہاں بھی ہوتی ہے۔ ملائکہ اربوں کھربوں جمع ہیں۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ ''یہ بندے ننگے سر، ننگے پیر، گرد آلود، ریگستان میں پڑے ہوئے ہیں، آخر یہ کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟۔ میری ہی محبت تو انہیں کھینچ کر لائی ہے۔ اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ جتنے حج کرنے والے ہیں میں نے ان سب کی مغفرت کی۔ اور آج یہ ویسے ہو گئے جیسے ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوئے ہیں''۔

ملائکہ پر یہ حجّت تام کی جاتی ہے کہ یہی وہ انسان ہے جسے تم نے کہا تھا کہ بڑا مفسد ہوگا، بڑا سفاک ہوگا۔ یہ سفاکی کر رہے ہیں؟ یہ مفسدہ پردازی کر رہے ہیں؟ ہمارے ذکر میں مصروف، ہماری اطاعت میں مصروف۔

غرض ایسے تمام مواقع میں ملائکہ بھیجا جاتا ہے تا کہ عملی طور پر جواب ہو جائے کہ تم نے جو پوری نوع پر حکم لگایا تھا کہ یہ مفسد نوع ہے خلافت کے لائق نہیں۔ سارے ایسے نہیں ہیں۔ بے شک زیادہ ایسے ہوں گے جو سفاک ہوں گے مگر ان کے اندر کم وبیش وہ بھی ہوں گے جو اللہ کا نام لینے والے ہوں گے، خدا کی یاد کرنے والے ہوں گے اور انہیں پر دنیا قائم ہے۔ ایک بھی نہ رہے تو دنیا باقی نہیں رہ سکتی۔

ذکرِ انسانی پر نظامِ دنیا قائم ہے...... حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِى الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰه**'' قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کرنے والا دنیا میں موجود ہے۔ جب ایک بھی نہیں رہے گا جب قیامت قائم ہوگی اور یہ سارا عالم درہم برہم کر دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اللہ کے نام پر قائم ہے۔ جب نام نکل جائے گا۔ دنیا تباہ ہو جائے گی۔ اور ختم ہو جائے گی۔ تو دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ دنیا قائم ہے اللہ کے نام لینے والوں کے اوپر، جب تک اللہ کا نام لینے والے موجود ہیں، دنیا قائم ہے۔ جب وہ مٹ جائیں گے تو دنیا ختم کر دی جائے۔ جس ملک کے اندر اللہ کا نام لینے والے باقی نہ رہیں وہ تباہی کی طرف جائے گا۔ اور جس ملک میں سارے ہی اللہ کا نام لیں، وہ بقاء اور ترقی کی طرف جائے گا۔ بہر حال اللہ کے نام میں ترقی ہے۔ تو جہاں کہیں بھی اللہ کا نام لینے والے جمع ہوتے ہیں تو فرشتوں کو بھیج کر انہیں جواب دیا جاتا ہے اور انہی کو گواہ بناتے ہیں کہ تم گواہ رہو، میں نے ان کی مغفرت کی۔ انہی میں سے ایک شکل یہ بھی ہے صبح اور عصر کی نماز کے وقت لاکھوں ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ جب یہ

دن والے چڑھتے ہیں اور رات والوں کو چارج دے دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ بندوں کو کس حالت میں چھوڑا؟ عرض کرتے ہیں کہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ۔ ’’اَتَیْنَاھُمْ وَھُمْ یُصَلُّوْنَ وَتَرَکْنَا ھُمْ وَھُمْ یُصَلُّوْنَ.‘‘ جب ہم اعمال نامے لینے کے لئے گئے اور چارج لینے کے لئے گئے جب بھی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور جب صبح کی نماز میں چھوڑ کر آئے، جب بھی یہ نماز ہی پڑھ رہے تھے۔ تو ترک بھی ہم نے انہیں نماز میں ہی کیا اور جب ہم پہنچے جب بھی نماز ہی پڑھ رہے تھے۔ ①

گویا جواب دیا جاتا ہے کہ یہی ہے وہ انسان جس کے بارے میں تم نے خلجان ظاہر کیا تھا کہ بڑا مفسد ہوگا، یہ فسدے کا کام ہے؟ کہ جب تم گئے جب بھی عبادت میں مصروف تھا، جب تم چھوڑ کر آئے جب بھی عبادت میں مصرف تھا۔ یہ ملائکہ پر اس خلجان کی وجہ سے حجت تمام کی جاتی ہے۔ بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ہر عمل کی ایک خاصیّت ہے۔ تو نماز کی خاصیّت یہ ہے کہ اس سے دیدارِ خداوندی کی استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تارکِ نماز کے اندر دیدارِ خداوندی کی استعداد پیدا نہیں ہوگی۔

جلوۂ خداوندی رُوحِ عبادت ہے...... اور وجہ اس کی یہ ہے کہ نماز اکمل ترین عبادت ہے اور عبادت میں لطف جب ہی آتا ہے جب عابد و معبود کا آمنا سامنا ہو۔ اگر معبود بالکل غائب ہو تو نماز کے اندر لطف نہیں آئے گا‘ نمازی اور عبادت گزار یہ کہے گا کہ ایک خیالی چیز کی عبادت کر رہا ہوں، کوئی میرے سامنے تو ہے نہیں۔ یہ خطرہ گزر سکتا تھا۔ تو اصل میں نماز کا مقصد ہی یہ ہے کہ عابد اور معبود کا آمنا سامنا ہو۔ اسی لئے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سوال کیا۔ ’’مَا الْاِحْسَانُ یَا رَسُوْلَ اللهِ؟‘‘ احسان کیا چیز ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا: ’’اَنْ تَعْبُدَ اللهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ‘‘ ② احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم آنکھوں سے حق تعالیٰ شانہٗ کو دیکھ رہے ہو۔ یعنی یہ تصوّر اور یہ دھیان باندھو کہ اللہ کے سامنے میں حاضر ہوں اور اگر تمہارے اندر اتنی قوت نہیں ہے تو کم سے کم یہ تصوّر رکھو کہ اللہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے اس کی نگاہوں سے تم اوجھل نہیں ہو۔ غرض دیکھنا اور آمنا سامنا ہونا یہ عبادت کی روح معلوم ہوتی ہے کہ محسن اور احسان والا عبادت میں جب ہی بنے گا جب معبود کا آمنا سامنا ہو۔ تو حق تعالیٰ شانہ، کے بارے میں تصور کی آنکھ سے ہم دیکھتے ہیں کہ معبود ہمارا سامنے ہے اور ہم اس کی عبادت کر رہے ہیں۔

دنیا میں تجلّیاتِ ربّانی کا ظہور...... زیادہ عبادت کی، قلب میں روشنی پیدا ہوئی۔ تو تجلّیات اور انوارِ ربّانی سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں، تو جو آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ ذات کو تو نہیں دیکھ سکتا، ذات تو وراء الوریٰ ہے اور نفسِ ذات تو قیامت کے بعد بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ اتنی لطیف، اتنی چمک اور اتنی نورانیت میں ہے کہ آنکھ کتنی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب مواقیت الصلوۃ، باب فضل صلاۃ العصر، ج:۲، ص:۳۹۰ رقم ۵۲۲.

② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل......، ج:۱، ص:۸۷.

لطیف بن جائے۔ مگر یہ طاقت نہیں رکھتی کہ ذات بابرکات کو دیکھ سکے۔ تجلّیات ربانی کو دیکھے گی، عکوس کو دیکھے گی۔ یعنی عکسِ خداوندی مختلف صورتوں میں سامنے آئے گا، اسے دیکھ لے گی، ذات کا دیکھنا، وہ کبھی نہیں ہوگا۔ مگر بہرحال تجلّیات وانوار سامنے آتے ہیں جو اہل اللہ کے سامنے آنے لگتے ہیں۔

تجلّیِ اخروی...... البتہ قیامت کے دن اس تجلی کو دیکھیں گے جو اقرب الی الذات ہے، یعنی جو ذات کے بالکل اقرب ہے۔ گویا اس کا دیکھنا ذات کا دیکھ لینا ہے۔ مگر تجلی کو دیکھیں گے۔ اس لئے کہ سب سے بڑا مقام دیدارِ خداوندی کا جنتیں ہوں گی۔

دربارِ خداوندی کا انعقاد...... حدیث میں فرمایا گیا کہ ہر ہفتہ میں۔ وہاں ہفتے تو نہیں ہوں گے مگر ایک ہفتے کی جتنی مسافت اور مقدار ہوتی ہے۔ اس میں دربارِ خداوندی ہوگا۔ اوپر نیچے سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے، ان سو کے اوپر پھر کرسی ہے۔ اس کے اوپر سمندر ہے۔ اس کے اوپر پھر عرش خداوندی ہے۔ تو کرسی گویا جنتوں کی چھت کے اوپر ہے۔ اس میں دربار ہوگا۔

آخرت میں رؤیتِ خداوندی کا مقام...... وہ دربار کہاں ہوگا؟ تو حدیث میں اس کی شرح یہ فرمائی گئی کہ حضرت جبریل علیہ السلام ایک دفعہ حاضر ہوئے تو ایک آئینہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ آئینے کے بیچ میں ایک نکتہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ نکتہ کیسا ہے؟ عرض کیا کہ اس کا نام مزید ہے۔ فرمایا: مزید، کیا چیز ہے؟

عرض کیا یارسول اللہ! جنت میں ایک میدان ہے جس کا نام مزید ہے اور وہ اتنا بڑا ہے کہ لاکھوں برس سے میں اس میں گھوم رہا ہوں اور اب تک مجھے اس کے کناروں کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں ہیں۔ اس کی ہر چیز سفید ہے، زمین سفید ہے، کنکریاں سفید ہیں، گھاس بھی سفید۔ غرض ہر چیز سفید ہے۔ تو جب جمعہ کا دن آئے گا وقت اس دربار کے لئے تیاری کی جائے گی۔ اس تمام میدان میں بیچوں بیچ تو اللہ تعالیٰ کی کرسی بچھائی جائے گی۔ جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَؤُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا﴾ ① آسمانوں اور زمینوں سے کہیں زیادہ کرسی بڑی ہے، لیکن اس میدان میں جب کرسی بچھے گی تو وہ ایسی معلوم ہوگی جیسے ایک بڑے میدان میں ایک چھوٹا سا چھلّہ ڈال دیا جائے۔ وہ بیچوں بیچ بچھائی جائے گی۔ اس کے اردگرد انبیاء علیہم السلام کے منبر ہوں گے۔ وہ نور کے منبر ہوں گے۔ ہر منبر کے پیچھے امتوں کی کرسیاں ہوں گی۔ ہر نبی کی امت اس کے پیچھے ہوگی اور کرسیاں جو ہوں گی وہ علیٰ قدرِ مراتب ہوں گی۔ جو عمل میں انبیاء علیہم السلام سے زیادہ قریب ہیں، ان کی کرسیاں منبر کے قریب اور جو عمل میں بعید تھے، کوتاہ عمل تھے، ان سے ان کی بعید۔ درجہ بدرجہ۔ ②

دربارِ خداوندی میں اہلِ جنت کی شرکت...... جب یہ دربار کا دن آئے گا تو تمام اہل جنت دربار کی شرکت کے لئے چلیں گے۔ اب یہ لاکھوں میل کا فاصلہ ہوگا مگر سواریوں پر جائیں گے، تخت ہوا ہوں گے۔ وہاں کوئی مشین

---

① پارہ: ۳، سورۃ البقرہ، آیۃ: ۲۵۵۔ ② تفسیر ابن کثیر تحت قولہ تعالی ولدینا مزید، ج:۷، ص: ۴۰۲۔

نہیں ہے۔ جیٹ طیّارے نہیں ہوں گے کہ ان کی مرمت کی ضرورت پیش آئے۔ بلکہ قوت متخیلہ کے تابع ہوں گے۔تخت پر بیٹھ کر آپ نے ارادہ کیا کہ چلے اب وہ تخت چلنا شروع ہوا، اور لاکھوں میل کا فاصلہ وہاں کی سواریاں پل بھر میں طے کریں گی۔ کوئی براق پر سوار ہے، کوئی تختِ ہوا پر سوار ہے۔ درجہ بدرجہ مختلف سواریاں ہوں گی۔ اس میدان میں آ کر بیٹھیں گے۔ جہاں کرسیاں ہوں گی۔

پھر کرسیوں میں یہ نہیں کہ وہاں نظم کرنے والے کھڑے ہوں کہ بھئی! یہ کرسی تمہاری ہے۔ یہ سیٹ تمہاری ہے۔ وہاں نہ بیٹھ جانا یہ نہیں ہوگا۔ ہر شخص اپنی قلبی شہادت سے اپنے مقام کو پہچانے گا۔ ٹھیک اسی کرسی پر جا کر بیٹھے گا جو اس کے نام زد ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ دوسری کرسی پر بیٹھ جائے، تو تمام لوگ جمع ہو جائیں گے اور میدان بھر جائے گا۔ اس میں جو بالکل عوام ہوں گے، جن میں عملی کوتاہیاں زیادہ تھیں، تو کرسیوں کے پیچھے چبوترے ہوں گے۔ ان پر مشک و عنبر کے غالیچے ہوں گے، وہ اس پر بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ اب یہ پورا دربار بھر گیا بیچ میں حق تعالیٰ کی کرسی ہے۔ اب کرسی کے اوپر تجلّیاتِ ربانی کا ورود شروع ہوگا۔ جیسے احادیث میں فرمایا گیا ہے، یہ محسوس ہوگا کہ جب اللہ کی تجلّیات اتریں گی تو کرسی اس طرح چڑچڑائے گی جیسے اب ٹوٹ کے دی، اب ٹوٹ کے دی۔ وہاں بوجھ بدن کا نہیں ہوگا۔ حق تعالیٰ بدن سے پاک ہیں۔ وہ بدن کے خالق بھی ہیں اور روح کے خالق بھی ہیں۔ وہ عظمت کا بوجھ ہوگا۔ ان کے کمالات کا بوجھ ہوگا جس کو ارواح محسوس کریں گے۔ وہ حسّی اور جسمانی بوجھ نہیں ہوگا۔ تو کرسی گویا ایسے چڑچڑائے گی جیسے تحمل کی طاقت نہیں ہے۔

اب گویا تجلیات اتر چکی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ موجود ہیں اور انبیاء علیہم السلام ارد گرد نورانی منبروں پر ہیں اور ان کے پیچھے امتیں اربوں کھربوں اوّلین و آخرین جمع ہیں۔

دربارِ خداوندی میں شرابِ طہور کا دور...... حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ ملائکہ علیہم السلام کو فرمائیں گے کہ وہ جو ہم نے قرآن کریم میں وعدہ کیا تھا ﴿وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ ① ایک پاک قسم کا شربت ہم پلائیں گے، وہ ان بندوں کو تقسیم کرو۔ ملائکہ تقسیم شروع کریں گے۔ گویا شاہی دربار کی طرف سے ایک ضیافت ہوگی۔ اس کو پئیں گے۔ اس سے ایسا سرور پیدا ہوگا، اس کو نشہ تو نہیں کہہ سکتے۔ روحانی نشہ ضرور ہوگا۔ یعنی دنیا کی شراب میں تو یہ نشہ ہے کہ عقل جاتی رہتی ہے۔ آدمی مجنون ہو جاتا ہے خبطی بن جاتا ہے۔ اس شراب کے پینے سے عقل میں اور تیزی پیدا ہوگی اور معارفِ الٰہیہ اور علومِ ربانیہ اور زیادہ کھلنے شروع ہو جائیں گے۔ انوار و برکات بڑھ جائیں گے۔ تو یہ شرابِ طہور تقسیم ہوگی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی تلاوتِ مُناجات...... اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام جن کو آواز کا معجزہ دیا گیا تھا، اتنی پاکیزہ، پاک اور خوشنما آواز تھی کہ جب وہ حمد و ثنا کی مُناجاتیں پڑھتے تھے تو چرند و پرند سب ان کے ارد

① پارہ: ۲۹، سورۃ الدھر، الآیۃ: ۲۱.

گرد جمع ہو کر سر دھنتے تھے اور مست ہو جاتے تھے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے داؤد! ان اہلِ دربار کو وہ مُناجاتیں سناؤ جو تم دنیا میں پڑھتے تھے اور اسی اعجازی آواز سے سناؤ۔

حضرت داؤد علیہ السلام حمد و ثنا کی وہ مناجاتیں پڑھنا شروع کریں گے۔ تو آواز تو معجزہ تھی ہی۔ اور وہاں میدان میں سارے اللہ والے جمع ہیں، سارے انبیاء علیہم السلام جمع ہیں۔ اربوں کھربوں ملائکہ جمع اور خود حق تعالیٰ شانہ، موجود۔ تو اس کی تاثیر کی کیا انتہا ہوگی۔ جب وہ مناجاتیں پڑھی جائیں گی تو عجیب قسم کے اس کے آثار نمایاں ہوں گے، سب بندے اس کے اندر محو ہو جائیں گے۔

جمالِ خداوندی کے دیدار کا سوال...... اس کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے: ''سَلُوْنِیْ مَاشِئْتُمْ'' جس کا جو جی چاہے ہم سے مانگو اور ہم سے سوال کرے بندے عرض کریں گے کون سی نعمت ہے جو آپ نے ہمیں عطاء نہیں کر دی جنت ساری نعمتوں کا مجموعہ ہے۔ وہاں نقص کا نشان نہیں۔ ہر چیز میں کمال ہے، جب آپ نے ہمیں سب کچھ دے دیا تو اب ہم کیا مانگیں؟ ہمارے تو خیال سے بھی زیادہ بلند چیزیں ہمیں مل چکی ہیں۔ اب کیا مانگیں ہمارا تو تخیل بھی نہیں جا سکتا۔

ارشاد ہوگا۔ نہیں، مانگو! جب کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا تو سب مل کر علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ تم فتویٰ دو اور مشورہ دو کیا چیز مانگیں۔ ہمیں تو سب کچھ مل چکا ہے۔ ①

تو میں عرض کیا کرتا ہوں کہ لوگ دنیا میں علماء سے کنارہ کشی چاہتے ہیں کہ چھوڑ دیں، یہ وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہاں بھی فتوے کی ضرورت پڑے گی۔ وہاں بھی علماء کی حاجت پڑے گی۔ علم خداوندی کے بغیر نہ دنیا میں کام چل سکتا ہے نہ آخرت میں کام چل سکتا ہے۔

علماء فتویٰ دیں گے کہ ایک چیز نہیں ملی، وہ مانگو۔ بے شک ساری نعمتیں مل گئیں۔ مگر ایک چیز ابھی تک نہیں ملی اور وہ یہ کہ جمالِ خداوندی کا دیدار ابھی تک نہیں ہوا۔ وہ طلب کرو۔ اس وقت بندے عرض کریں گے کہ: ''اے اللہ! اپنا جمالِ مبارک دکھلا دیجئے۔ آپ نے سب نعمتیں دے دیں۔ مگر یہ نعمت ابھی تک باقی ہے''۔ یہ درخواست منظور ہو جائے گی۔

نعمتِ مزید:...... اور حق تعالیٰ فرمائیں گے: ''اَنْ کَمَا اَنْتُمْ.'' ہر چیز اپنی اپنی جگہ ٹھہری رہے۔ اگر یہ نہ فرما دیں تو: ''لَاَحْرَقَ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَابَیْنَ یَدَیْهِ'' اس کے چہرے کی پاکیزگیاں ہر چیز کو جلا کر خاک کر دیں۔ خود فرما دیں گے کہ ہر چیز تھمی رہے۔ اس کے بعد حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ اور سب حجابات اٹھ کر ایک حجاب کبریائی کا باقی رہ جائے گا۔ ②

اس وقت بندوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ ایک تو شرابِ طہور۔ روحانی نشہ چڑھا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام

---

① الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور، تحت قوله تعالیٰ وجوه یومئذ ناضرة، ج: ۱، ص: ۱۵۴.

② تفسیر ابن کثیر ج: ۷، ص: ۴۷.

کے مضمونوں سے معرفت کا نشہ بڑھا۔ حق تعالیٰ کا جمال دیکھ کر اتنے محو ہوں گے کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں رہے گی۔ اور یہ سمجھیں گے کہ کوئی نعمت ہی ہمیں اب تک جنت میں نہیں ملی تھی۔ آج ہمیں نعمت ملی ہے۔ اس نعمت کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''مزید'' ہے۔ تو حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یہ وہ میدانِ مزید ہے۔ اس میں وہ نعمت ملے گی جو سب کے اوپر مزید ہے۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ﴾ ① ہم ضابطے کا اجر تو سب کو دیں گے۔ اور کچھ مزید بھی ہے جو ہم بعد میں عطاء کریں گے۔ وہ مزید یہ نعمت ہوگی۔

یوم المزید اور اس کے آداب...... اسی لئے شریعت کی اصطلاح میں جمعہ کا نام "یَوْمُ الْمَزِیْدِ" ہے تو دنیا میں اس میدانِ مزید کی نقل جمعہ کا دن رکھی گئی ہے۔ جمعہ کا دن گویا دربارِ خداوندی کا دن ہے۔ امام اور خطیب نائب خداوندی ہو کر بیٹھتا ہے۔ اسی واسطے فرمایا فرمایا گیا ہے کہ کوشش کرو کہ امام کے قریب بیٹھو۔ جو جمعہ کے اندر امام کے قریب بیٹھنے کی عادت ڈالے گا۔ اسے وہاں بھی اللہ کے قریب اور انبیاء علیہم السلام کے قریب جگہ ملے گی اور جو یہاں سستی کرے گا، پیچھے رہے گا۔ وہاں بھی پیچھے رہ جائے گا۔

اسی واسطے فرمایا گیا: ''اِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ فَلَاصَلٰوۃَ وَلَا کَلَامَ.'' ② جب خطبہ پڑھنے کے لئے خطیب نکل آئے تو نہ سلام و کلام کرنے کی اجازت ہے، نہ نماز پڑھنے کی اجازت ہے، نہ تلاوت کرنے کی اجازت ہے۔ اس وقت سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ آدمی خطیب کو دیکھے۔ اگر سامنے نہ ہو تو کم سے کم اس کی آواز سے کان لگائے۔ آواز سنائی نہ دے تو استماع کرے۔ کان لگائے۔ یعنی خطیب ہی کی طرف متوجہ رہے۔ اس وقت یہی سب سے بڑا کام ہے۔ یہ خطبہ عام وعظوں کی طرح وعظ نہیں ہے۔ اس میں تو بات بھی کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی سکتے ہیں۔ لیکن خطبہ کے آداب یہ ہیں کہ نہ کنکر سے نہ تنکوں سے کھیلو، نہ نماز پڑھو، نہ ذکر کرو۔ بس امام کو دیکھو۔ اس وقت تمہاری سب سے بڑی یہی عبادت ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا: ''مَنْ مَسَّ الْحَصَا فَقَدْ لَغَا.'' جس نے کنکری چھوئی اس نے لغو حرکت کی۔ ③ جس نے چٹائی کا کوئی تنکا چھوا، اس نے لغو حرکت کی۔ اس کا کام یہ نہیں تھا، اس کا کام یہ تھا کہ امام کو دیکھے۔ سامنے نہ ہو تو کم سے کم یہ ہے کہ ادھر آنکھ لگائے۔ آواز نہ آئے تو ادھر کان لگائے۔ غرض ہمہ تن امام کی طرف متوجہ رہے۔ جو جتنا یہاں اس توجہ کی مشق کرے گا۔ وہی میدانِ مزید میں اللہ کی طرف متوجہ ہوگا۔ جو جتنا یہاں قریب ہوگا وہاں قریب ہوگا۔ جو جتنا زیادہ جمعہ میں متوجہ ہوگا، وہاں متوجہ ہوگا تو جمعہ درحقیقت اس دربارِ خداوندی کی ایک نقل ہے جو دنیا میں ہمیں دی گئی ہے۔ اس کا نام میدانِ مزید تھا اور دن کا نام بھی مزید، وہی نام جمعہ کے دن کا ہے۔ اسے یوم

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ ق، الآیۃ: ۳۵. ② علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں: غریب مرفوعاً قال البیھقی: رفعہ وھم فاحش انما ھو من کلام الزھری دیکھئے: نصب الرایۃ، کتاب الصلوۃ، باب صلاۃ الجمعۃ ج: ۲ ص: ۳۶۴.

③ السنن لابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوۃ والسنۃ فیھا، باب مسح الحصافی الصلوۃ ج: ۳ ص: ۳۰۹.

المزید کہا گیا ہے کیوں کہ اجر وثواب کے اندر زیادت پیدا کرتا ہے۔

تو حدیث مجھے اس پر یاد آ گئی تھی کہ عبادت میں اصل تو یہ ہے کہ معبود سامنے ہوا سے دیکھ کر عبادت کرے۔ لیکن دنیا میں یہ چیز ناممکن ہے بلکہ ذات کا دیکھنا آخرت میں بھی ناممکن ہے۔ تجلیات ہی کو دیکھے گا، عکس ہی کو دیکھے گا، رُوپوں کو دیکھے گا۔ ذات نگاہ کے احاطے میں نہیں آسکتی۔ ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ ① ذات کے اوپر آپ کی نگاہ غالب نہیں آسکتی، نہ فتح پاسکتی ہے۔

رؤیتِ باری کے بارے میں معتزلہ کا مسلک...... اسی واسطے مسلمانوں میں ایک معتزلہ کا فرقہ ہے، اس نے دیدارِ خداوندی کا انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دیدار وغیرہ کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ناممکن اور محال ہے اور اس کو عقلاً محال کہتا ہے کہ یہ نہیں ہوسکتا۔

مسلکِ اہلِ حق...... لیکن انبیاء علیہم السلام اور اہلِ حق کا مسلک یہ ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ﴾ ② بہت سے تروتازہ چہرے ہوں گے جو پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے اور کفار کو دھمکی دی گئی ہے کہ: ﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ﴾ ③ کفار کو دھمکی دی گئی ہے کہ قیامت کے دن تمہارے اور اللہ کے درمیان حجابات آجائیں گے، تم اللہ کو نہیں دیکھ سکو گے۔ نہ دیکھنے کی دھمکی دینا جبھی ممکن ہے جب دیکھنا ممکن ہو۔ بہر حال قرآن کریم اور تمام آسمانی کتابوں کا مسلک اور تمام انبیاء علیہم السلام کا مسلک یہی ہے کہ آخرت میں دیدارِ خداوندی ہوگا۔ مگر معتزلہ ایک فرقہ ہے جو اسے نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ عقلاً محال ہے۔

مناظرے میں معتزلہ کی شکست...... چنانچہ مامون کے زمانے میں یہ بڑا فتنہ پھیلا۔ معتزلہ غلبہ پاگئے اور انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ دیدارِ خداوندی محال ہے۔ عقلاً ممکن نہیں ہے، واقعتاً تو ہوگا ہی نہیں۔ عقل بھی قبول نہیں کرسکتی۔ اس کے انہوں نے دلائل بیان کئے۔ مسلمان فتنے میں گرفتار ہونا شروع ہوئے۔ علماء نے جوابات دینا شروع کئے مگر مشکل مسئلے کا اعتراض جلد سمجھ میں آجاتا ہے اور جواب دیر سے سمجھ میں آتا ہے۔ دقیق مسئلہ تھا تو اعتراض تو سب کی سمجھ میں آگیا۔ جواب سمجھ میں نہ آئے۔ فتنہ بڑھتا رہا۔ علماء عاجز آگئے۔

آخر اس زمانے کے شیخ ہیں۔ حضرت شیخ شبلیؒ۔ ان کی خدمت میں علماء کا ایک وفد حاضر ہوا کہ حضرت! جتنا ہمارے امکان میں تھا ہم جوابات دے چکے۔ مگر وہ جوابات علمی ہیں اور عوام علم کی باتیں سمجھتے نہیں۔ اس واسطے شبہات تو ان کے دلوں میں بیٹھ گئے۔ جوابات نہیں بیٹھتے۔ مگر اب ہم کیا کریں۔ اب تو اہل اللہ کچھ قلبی تصرّف و توجّہ سے کام کریں تو یہ فتنہ رفع ہو۔ محض علم سے رفع نہیں ہوگا۔

حضرت شیخ شبلیؒ نے فرمایا کہ: اچھا! اعلان کردو کہ ہم معتزلہ سے مناظرہ کریں گے۔ اعلان ہوگیا۔ اور جامعہ

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۰۳۔ ② پارہ: ۲۹، القیامۃ، الآیۃ: ۲۲۔ ③ پارہ: ۳۰، المطففین، الآیۃ: ۱۵۔

بغداد میں لاکھوں آدمی جمع ہوئے۔ اوّل تو اس لئے کہ شیخ شبلی اور وعظ کہیں۔ کبھی نہیں وعظ فرماتے تھے۔ ایک نئی چیز معلوم ہوئی کہ شیخ کبھی مجمع میں وعظ کہنے کے لئے نہیں آتے تھے۔ آج وعظ فرمائیں گے، تو لاکھوں لوگ جمع ہوئے۔

دوسرے یہ کہ نام مناظرہ کا تھا اور مناظرہ درحقیقت جھگڑا ہے۔ چاہے وہ علمی ہی سہی۔ عوام کو جھگڑوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ کوئی سکون کی بات ہو کوئی نہیں جائے گا اور جھگڑا ہو تو ہزاروں وہاں پہنچ جائیں گے۔ تو لوگوں نے کہا کہ آج مناظرہ اور بحث ہوگی۔ بڑا تماشہ ہوگا۔ غرض لاکھوں آدمی جمع ہو گئے۔

منبر بچھایا گیا۔ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ بیٹھ گئے۔ معتزلہ کے جتنے علماء تھے وہ قطار باندھ کر سامنے بیٹھ گئے۔ تو شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تمہارا دعویٰ کیا ہے؟ معتزلہ نے کہا کہ دعویٰ ہمارا یہ ہے کہ اللہ کا دیکھنا ناممکن ومحال ہے۔ کبھی نہیں ہوسکتا۔ عقل گوارا نہیں کرتی، عقلاً محال ہے''۔

تو اہل اللہ پر حقائق روشن ہوتے ہیں۔ وہ لفظوں کی گرفت سے تھوڑا ہی گرفت کرتے ہیں۔ وہ لمبی تقریریں تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ وہ چٹکی میں ضمیر کو تھام لیتے ہیں۔ شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے دومنٹ میں فیصلہ کردیا۔ سارے مناظرے ختم ہو گئے۔

''معتزلہ سے پوچھا کہ تمہارے دلائل اپنی جگہ ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہم تمہارے دل سے بات پوچھنا چاہتے ہیں کہ تمہارا دل بھی چاہتا ہے اللہ کو دیکھنے کو؟'' سب نے کہا دل تو چاہتا ہے۔

فرمایا: یہ دلیل ہے کہ دیکھا جانا ممکن ہے۔ اس لئے محال کو دیکھنے کی تمنا کبھی قلب کے اندر نہیں آسکتی۔ اسی چیز کو دیکھنے کی تمنا آئے گی جس کو دیکھا جانا ممکن ہو۔ کبھی آدمی تمنا نہیں کرے گا کہ میں کان سے دیکھ لوں۔ اس لئے کہ کان کے اندر دیکھنے کی قدرت ہی نہیں۔ آنکھ سے ہی دیکھنے کی تمنا کرے گا۔ کبھی یہ تمنا نہیں کرے گا کہ میں زبان سے آواز سن لوں زبان چکھنے کے لئے ہے۔ آواز سننے کے لئے نہیں۔ اس کے لئے کان ہیں۔ تو کان سے سننے کی اور آنکھ سے دیکھنے اور زبان سے چکھنے کی تمنا کرے گا۔ یہ نہیں کرسکتا کہ آنکھ کا کام زبان سے لینے لگے اور زبان کا کام آنکھ سے لینے گئے یہ دل میں آتا ہی نہیں۔

تو شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جب تمہارے دل میں تمنا ہے کہ ہم اللہ کو دیکھیں تو تمنا اور دل کے اندر ہونا، اس کی دلیل ہے کہ دیکھا جانا ممکن ہے۔ جس کا دیکھا جانا محال ہو کبھی اس کے دیکھنے کی تمنا دل میں نہیں آسکتی۔ تو امکان تمہارے ضمیر سے ثابت ہوگیا اور وقوع پیغمبر کی خبر سے ثابت ہے۔ اب بتلاؤ تمہارا کیا اعتراض ہے؟

اب وہ چپ چاپ بیٹھے۔ وہ تو ان کا دل پکڑا گیا۔ سارا قصہ ختم ہوگیا۔ ساری بحث ختم ہوئی اور فتنہ ایک منٹ میں ختم ہوگیا۔ بہر حال مقصد یہ تھا کہ دیدارِ خداوندی کی تمنا ہر انسان کے دل میں ہے کہ میں اپنے معبود کو دیکھوں۔ اسی تمنا میں وہ نمازیں پڑھتا ہے۔ اسی تمنا میں وہ عبادتیں کر رہا ہے۔

دیدارِ خداوندی میں درجہ بدرجہ ترقی ...... یہاں عقیدے کی آنکھ سے دیکھتا ہے، اور آگے بڑھا تو خواب کی آنکھ

سے دیکھتا ہے، اور آگے بڑھا تو کشف کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ موت کے بعد جب آگے بڑھے گا تو پھر اس آنکھ سے دیکھنا شروع کر دے گا تو درجہ بدرجہ اس کا ابھی سے دیدار شروع ہو گیا ہے۔ نماز کے اندر تصور اور عقیدے سے دیکھنا، یہ دیکھنے کی ابتداء ہے۔ ترقی کرتے کرتے بالآخر وہ چیز آنکھ کے سامنے آجائے گی۔ جو دل میں جم جاتی ہے۔

یہ ایک فطری اصول ہے کہ اگر آپ تصور سے کوئی چیز دل میں جمالیں تو چند دن کے بعد وہ آنکھوں کے سامنے کھڑی نظر آئے گی۔ ایک بزرگ سے کوئی صاحب بیعت ہوئے۔ شیخ نے انہیں بیعت کر لیا اور ذکر، شغل بتلا دیا۔ محنت بھی کی، مجاہدے بھی کئے۔ مگر یکسوئی نصیب نہیں ہوتی تھی کہ ہر چیز سے کٹ کے توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے۔ بہت علاج کئے مگر یہ نہیں ہوتی تھی۔

تو شیخ نے کہا تمہیں کسی چیز سے محبت بھی ہے؟ اس نے کہا جی! مجھے بھینس سے محبت ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ فرمایا اچھا بیٹھ کر چلہ کرو۔ چالیس دن بھینس کا تصور کرو۔ چلہ کرایا۔ وہ حجرے میں بیٹھ گئے۔ طبیعت کا میلان تو بھینس کی طرف تھا ہی۔ تصور کیا تو وہ دل میں جمنے لگی۔ چالیس دن کے بعد شیخ گئے اور فرمایا. باہر آؤ۔ دروازہ کھولا۔

اس نے کہا باہر کیسے آؤں۔ بھینس کھڑی ہوئی ہے۔ راستہ رکا ہوا ہے۔ حالانکہ نہ بھینس تھی نہ کچھ تھا۔ مگر دل میں بھینس اتنی جم گئی تھی کہ آنکھوں سے وہی نظر آنے لگی۔ معلوم ہوا کہ بھینس دروازہ روکے کھڑی ہے۔ تو یہ ایک فطری چیز ہے کہ جو چیز آدمی کے دل میں جم جاتی ہے وہ مصوّر ہو کر آنکھ کے سامنے آنے لگتی ہے۔

تو جب دل میں جمائیں گے کہ میں اپنے پروردگار کو دیکھ رہا ہوں اور عقیدے کی آنکھ سے دیکھیں گے اور پھر ترقی کر کے خواب میں دیکھنے لگیں گے۔ تو ایک وقت آئے گا کہ اس آنکھ سے بھی اللہ کا دیدار ہو جائے گا۔ جس درجہ میں بھی ہو۔ بہر حال دیدار ہو گا۔ تو اصل نماز تو وہاں ہو گی۔

روح کا عروج اور عرش کے سامنے سجدہ...... جیسے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب آدمی انتقال کرتا ہے تو اس کی روح کو آسمانوں کی طرف چڑھا دیا جاتا ہے۔ صالح آدمی ہے تو لاکھوں ملائکہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ تو اس کی روح کو عروج نصیب ہوتا ہے۔ آسمان اوّل کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ وہاں کے ملائکہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اگلا آسمان آیا تو اس کے دروازے کھلتے ہیں تو وہاں کے ملائکہ اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اس جلوس کے ساتھ وہ عرش کے نیچے پہنچتی ہے اور وہاں جا کر سجدہ کرتی ہے۔ تو وہ سجدہ جو عینِ عرش کے سامنے ہے، مرنے کے بعد نصیب ہو گا مرنے سے پہلے مشکل ہے۔

دنیوی جذبات کا برزخ میں ظہور...... جس کے دل میں نماز کی لو لگی ہوئی ہے وہ برزخ میں بھی نماز کی لو لے کر جائے گا، حشر میں بھی نماز کا جذبہ لے کر جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو دو ملائکہ آکر اس سے سوال کرتے ہیں، وہ پوری زندگی کا جائزہ لیتے ہیں اور تین سوال ہوتے ہیں۔ مَنْ

رَّبُّکَ؟ تیرا رب کون تھا؟ وَمَادِیْنُکَ ؟ تیرا دین کیا تھا؟ وَمَنْ هٰذَا الرَّجُلُ؟ اور یہ کون ہے؟ ①

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یہ سوال کرتے ہیں۔ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ: میت کو ایسا متمثل ہوتا ہے کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہے۔ دھوپ پر زردی چھا چکی ہے۔ مغرب کا وقت قریب ہے۔ حالاں کہ سورج وہاں نہیں ہوتا۔ مگر وہ وقت کی صورتِ مثالی نمایاں ہوتی ہے۔ تو ملائکہ یہ پوچھتے ہیں کہ مَنْ رَّبُّکَ؟ وہ کہتا ہے کہ دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ میاں پرے کو ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ وقت تنگ ہو رہا ہے۔ غروب ہو جائے گا تو میری عصر کی نماز قضا ہو جائے گی۔ تو ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے کہ اس سے کیا رب کا سوال کرتے ہو۔ یہ تو رب پر اتنا مٹا ہوا ہے کہ یہاں بھی نماز پڑھنے کو تیار ہے۔ دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ جواب سچا دے گا مگر ہماری تو ڈیوٹی ہے، ہمیں تو ادا کرنی ہے، سوال کرنا ہی ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ جواب حق دے گا۔

مگر دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ پرے کو ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنی ہے۔ یہ کون کہے گا؟ جسے دنیا میں نماز کی عادت ہوگی۔ اور جو دنیا میں ٹلاتا رہتا ہے اسے دَعُوْنِي اُصَلِّي کہنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس کے لئے تو دنیا میں روز وقت تنگ ہوتا تھا تو نہ نماز کا ٹھکانہ روزہ کا۔ تو دنیا میں جس چیز کی مشق کرلیں گے وہی سامنے آئے گی۔ جس چیز کی عادت ڈال لیں گے آخرت میں وہی متمثل بنے گی۔ ②

دنیوی جذبات کا آخرت میں ظہور...... حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ وَ تَمُوْتُوْنَ كَمَا تَحْيَوْنَ.'' تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت میں موت آئے گی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری ہے۔ اگر لہو لعب، کھیل کود اور مختلف عیش و آرام کی حالتوں میں زندگی گزاری ہے، موت کے وقت بھی انہی چیزوں کا دھیان رہے گا اور قبر سے اٹھے گا تب بھی انہی چیزوں کا دھیان رہے گا۔

اور اگر اللہ کے ذکر اور اس کے نام لینے میں اور اس کے فرائض کے ادا کرنے میں زندگی گزاری ہے۔ وہی جذبہ موت کے وقت رہے گا کہ کسی طرح میری نماز قضا نہ ہو۔ کسی طرح میرا اور داور وظیفہ قضا نہ ہو۔ اور جب قبر سے اٹھے گا وہی جذبہ ہوگا کہ کہیں میرا ورد قضا نہ ہو جائے، بعد میں پتہ چلے گا کہ یہ میدانِ محشر ہے۔ مگر وہ یہی سمجھے گا کہ یہ دنیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ اگر کوئی حاجی لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ کہہ رہا تھا اور اتفاق سے اونٹ سے گر پڑا اور موت واقع ہوئی تو قیامت کے دن جب اٹھے گا تو لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ اس کی زبان پر جاری ہوگا اور وہ سمجھے گا کہ میں میدان عرفات میں ہوں۔ بعد میں اس پر کھلے گا کہ یہ میدانِ محشر ہے۔ میدان عرفات نہیں ہے۔ مگر جذبہ وہی رہے گا جو دنیا میں پیدا کیا تھا۔ تو موت حقیقت میں قاطع نہیں ہوتی کہ کسی چیز کو قطع کر دے۔ متمم اور مکمل ہوتی ہے، جو دنیا کی زندگی کے جذبات ہیں ان کو حد کمال تک پہنچا کر نفس کا جوہر بنا دیتی ہے۔ تو جس حالت پر زندگی گزرے گی اسی

① السنن لابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی المسالة فی القبر، ج:۳، ص:۳۶۷، رقم :۴۱۲۷.

② السنن لابی داؤد کتاب الجنائز، باب فی المسالة فی القبر، ج:۳، ص:۳۶۷، رقم :۴۱۲۷.

حالت پر موت آئے گی اور جس حالت پر موت آئے گی اسی حالت پر حشر ہوگا۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ دنیا میں جب نماز کی عادت تھی اور وقت ٹلا کر پڑھنے کی نہیں تھی، بروقت پڑھنے کی تھی وقت ٹلنے لگا اور تنگ ہونے لگا تو پریشانی اور اضطراب ہوتا تھا کہ کہیں میری نماز قضاء نہ ہو جائے۔ وہی قبر میں کہے گا دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ پرے کو ہٹو۔ وقت تنگ ہو رہا ہے۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ جسے دنیا میں عادت نہیں تھی وہ وہاں بھی نہیں کہے گا اور آخرت میں بھی یوں ہی جذبہ رہے گا۔

سایۂ عرش میں اشتیاقِ نماز...... ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ، جو پوری جماعتِ دیو بند کے شیخ طریقت ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ اگر حق تعالیٰ نے مجھ سے قیامت کے دن پوچھا کہ امداد اللہ! مانگ کیا مانگتا ہے۔ تو میں عرض کروں گا کہ "یا اللہ! نہ مجھے جنت کی ضرورت ہے، نہ حوریں مطلوب ہیں، نہ محلات مطلوب ہیں، نہ باغات مطلوب ہیں۔ مجھے تو اپنے عرش کے نیچے ڈیڑھ گز کی جگہ دے دیجئے کہ کھڑا ہو کر نماز پڑھتا رہوں"۔ اللہ سے میں یہ مانگوں گا۔ تو اہل اللہ کو نماز میں وہ لطف میسر ہوتا ہے کہ سلطنتیں بھی چھوڑنے کے لئے تیار ہیں مگر نماز چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

لطفِ نماز...... حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "جُعِلَ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ" ① "نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے"۔ نماز پڑھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ دل میں سرور اور فرحت پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال نماز ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے دل میں سرور اور فرحت اور دیدارِ خداوندی کی صلاحیت اور دیدار کی تڑپ کہ کسی طرح میں اپنے معبود کو دیکھ لوں، پیدا ہوتی ہے۔ یہ نماز کی خاصیت ہے۔

تو ایک زکوٰۃ کی خاصیت تھی کہ حسنِ معاشرت پیدا ہو، ایک روزے کی خاصیت تھی کہ نفس کے اندر سے شہوانی جذبات گھٹ جائیں۔ ایک زکوٰۃ کی خاصیت یہ تھی کہ نفس کے اندر سے بخل کا رذیلہ مٹ جائے۔ اسی طرح ایک نماز کی خاصیت ہے کہ اس سے دیدارِ خداوندی کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے اور تڑپ بھی پیدا ہو جائے، تو عبادات میں اللہ تعالیٰ کو خاص تعلق نماز ہی سے ہے۔

حقیقی عبادت...... حقیقت میں اگر حقیقی عبادت ہے تو نماز ہے۔ دوسری عبادتیں دوسری وجوہ سے عبادت بن گئی ہیں۔ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہیں۔ نماز اپنی ذات سے عبادت ہے۔ اس لئے کہ عادت کے معنی عبادت تذلل کے ہیں۔ یعنی اللہ کے آگے انتہائی ذلت اختیار کرنا۔ کیوں کہ اللہ کی ذات وہ ہے کہ انتہائی عزت میں ہے کہ عزت کا کوئی مقام نہیں ہے کہ اس کے پاس نہ ہو۔ اس لئے اس کے سامنے اتنی ذلت پیش کرنی چاہئے کہ ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے، جو بندہ اپنے پروردگار کے سامنے پیش نہ کر دے۔

اب ظاہر بات ہے کہ زکوٰۃ ہے اس میں غایت تذلل کہاں ہے؟ زکوٰۃ میں تو آپ غریب کو عطاء کرتے

---

① السنن للنسائی، کتاب العشرۃ، باب حب النساء، ج:۱۲، ص:۲۷۷، رقم: ۳۶۷۷.

ہیں۔ تو عطاء کرنا تو اللہ کی شان ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مشابہت پیدا کررہے ہیں۔ وہ بھی معطی ہے۔ آپ بھی عطا کررہے ہیں، تو اس میں ذلت کیا ہوئی؟ یہ تو عین عزت کی چیز ہوئی۔ جب اس میں ذلت کا نشان نہیں تو عبادت کیسے بنی؟

آپ روزہ رکھتے ہیں، کھانا چھوڑ دیا پینا چھوڑ دیا، بیوی چھوڑ دی۔ یہ تو حق تعالیٰ کی شان ہے کہ کھانے سے بھی بری، پینے سے بھی بری، بیوی سے بھی بری۔ یہ اللہ کے ساتھ مشابہت ہوئی۔ اس میں ذلت کہاں ہے۔ یہ تو عین عزت کا مقام ہے۔ غرض روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں، اس میں غایت تذلل ہی نہیں۔ لیکن نماز وہ ہے کہ اول سے لے کر اخیر تک سوائے اظہارِ ذلت کے اور کوئی چیز نہیں۔

ابتداء آپ نوکر چاکروں کی طرح سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور غلاموں کی طرح گردن جھکا دیتے ہیں۔ یہ ذلت کا ابتدائی درجہ ہے جو آپ اپنے رب کے سامنے پیش کررہے ہیں۔ اس کے بعد آگے بڑھے۔ سر جھکایا، رکوع کیا۔ اس میں پہلے سے بھی ذلت کا بڑا درجہ ہے۔ اس کے بعد تیسرا درجہ ہے کہ ناک اور پیشانی زمین پر رگڑتے ہیں جو انتہاءِ ذلت کا مقام ہے، اس کے بعد پھر اور ہے کہ آپ تشہد میں بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں کہ یا اللہ مجھے یہ دے۔ بھیک مانگنا سب سے زیادہ ذلت کی چیز ہے۔ تو نماز میں جتنے افعال ہیں، قیام ہو، رکوع ہو، سجدہ ہو، تشہد ہو سب میں اپنی نیازمندی اور ذلت کا اظہار ہے۔ اس لئے حقیقی معنی میں اگر عبادت ہے تو صرف نماز ہے۔ دوسری چیزیں دوسری وجوہ سے عبادت بنی ہیں۔ زکوٰۃ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے۔ پھر کیوں عبادت بنی؟ تعمیل حکم کی وجہ سے۔ حکم خداوندی ہے کہ زکوٰۃ دو۔ تعمیل کی۔ تو تعمیل ارشاد کی وجہ سے یہ عبادت بن گئی۔

روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے، تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت بن گیا ہے۔ حکم ہے کہ روزہ رکھو۔ تعمیل کی وجہ سے عبادت بن گیا۔ لیکن نماز اپنی ذات سے عبادت ہے، اس لئے کہ جتنی ہیئتیں ہیں، سب اظہارِ ذلت کی ہیں۔

پھر نماز کے اندر جو بھی آپ پڑھیں گے تسبیح و تہلیل میں، یا تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار ہے یا اپنی فدویت کا اظہار۔ یا اللہ کی عظمت کا اظہار کریں گے کہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے، ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ ② یوم الدین کا مالک ہے، یا اپنی فدویت کا اظہار ہے کہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ③ ہم آپ ہی کی عبادت کریں گے اور ہم تو آپ ہی سے مانگتے ہیں۔ غرض یا تو اللہ کی عظمت کا اظہار یا اپنی ذلت کا اظہار۔ اس کے سوا نماز میں اذکار ہوں یا اعمال ہوں، سب کی یہی حیثیت ہے۔ تو حقیقی معنی میں اگر عبادت ہے تو وہ نماز ہے۔ دوسری عبادتیں دوسری وجوہ سے عبادتیں بنی ہیں۔ یہ اپنی ذات سے عبادت ہے۔ تو ظاہر بات ہے کہ عبادت کرنے والے عابد کا جذبہ ہوگا کہ معبود میرے سامنے ہو تاکہ میں دیکھوں میں جس کی عبادت کر رہا ہوں۔ تو یہ جذبہ لے کر کھڑا ہوا ہے۔

①②③ سورة الفاتحة الآية: ١، ٤.

جذبۂ عبادت کی تسکین......اللہ نے اس جذبے کی تسکین کا سامان کردیا کہ دنیا گندی جگہ ہے۔ دیدارِ خداوندی یہاں نہیں ہوسکتا۔ تو عقیدے کی آنکھ سے اللہ کو دیکھو، دل میں یقین کے ساتھ تصور باندھو کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد ہم مزید روشنی دیں گے کہ تمہارے اوپر کچھ انکشاف ہوگا، انوارِ ربانی کچھ نظر پڑنے لگیں گے۔ اس کے بعد میں اور انکشاف ہوگا۔ آنکھوں سے بھی تجلّیاتِ الٰہیہ دنیا میں نظر آسکتی ہیں۔ اس کے بعد مزید انکشاف ہوگا۔ مگر وہ موت کے بعد قیامت کے دن ہوگا کہ ذات کے ہم پلہ تجلّی سامنے آئے گی اور بندے آنکھوں سے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔ تو نماز کی ایک خاصیت ہے تو بات اس پر چلی تھی کہ دواؤں کی الگ الگ خاصیتیں ہیں۔ اسی طرح سے عبادات کی بھی الگ الگ خاصیتیں ہیں۔

مجموعۂ شریعت پر عمل کی تاثیر......اور جیسے دواؤں میں ایک مقدار ہے جو فن دان طبیب مقرر کرتا ہے کہ یہ دوا تین ہی ماشے ہوگی اور یہ ایک تولہ ہوگی۔ ایسے ہی تسبیحات کے عدد بھی شارع علیہ السلام نے متعین کئے ہیں کہ رکوع میں "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ" کہو تو کم سے کم تین مرتبہ ہو۔ تین سے کم نہ ہو۔ پانچ دفعہ کہہ لو۔ سات دفعہ کہہ لو۔ مگر تین سے کم سنّت کے مطابق نہیں ہوگا۔ تو مقدار تین بتلائی گئی۔ اسی طرح "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" کم سے کم تین دفعہ۔ فاتحہ پڑھو تو ایک دفعہ، اس میں تکرار نہیں تو سورت پڑھو تو ایک دفعہ، اس میں تکرار نہیں، تشہد میں درود شریف پڑھو تو ایک دفعہ، اس میں تکرار نہیں تو ہر چیز میں کہیں تکرار ہے، کہیں تکرار نہیں۔ جہاں تکرار ہے وہاں عدد معیّن ہے کہ اتنے عدد میں پڑھو۔ دو دفعہ یا تین دفعہ۔

اسی طرح نمازوں کی رکعات کے اعداد متعین کردیے، صبح کی نماز دو رکعت کی، مغرب کی نماز تین رکعت کی، بقیہ نمازیں چار چار رکعت کی۔ تو کسی کو یہ حق نہیں ہے وہ کہے کہ یہ چار رکعت والی کی پانچ رکعات کیوں نہ کردیں؟ اور تین والی کی دو دو رکعات کیوں نہ کردیں؟

جو جواب طبیب دنیا میں فن کی رو سے دے گا کہ جو مقدار فن کی رو سے ضروری ہے وہی میں لکھوں گا، مریض کو کمی زیادتی کرنے کا حق نہیں ہے۔ وہی انبیاء علیہم السلام کی طرف سے جواب ہے کہ اللہ نے یہ اذکار کی دوائیں مقرّر کی ہیں۔ اس کی مقداریں بھی خود مقرر کی ہیں۔ ہمیں اس میں کمی یا زیادتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جتنی مقدار آئے گی اتنی استعمال کریں گے۔ زیادہ کریں گے، ہلاکت واقع ہوگی۔ اگر کوئی ظہر کی نماز پڑھے اور یہ خیال کرے کہ نماز تو اچھی چیز ہے، لاؤ آج آٹھ یا بارہ رکعات پڑھ لوں۔ وہ منہ پر ماردی جائے گی اور ہلاکت کے قریب ہو جائے گا۔ حالاں کہ اس نے زیادتی ہی تو کی ہے۔ مگر زیادتی بھی ناجائز، کمی بھی ناجائز۔ یہ مقدار شارعِ حقیقی کی طرف سے معین ہے، وہی مقدار رکھنی پڑے گی۔ اس واسطے جب مجموعۂ شریعت پر عمل ہوگا پھر روحانی صحت کامل نصیب ہوجائے گی۔ جیسا کہ گل بنفشہ پیا تو زکام دفع ہوگیا۔ ملٹھی کھائی تو کھانسی رفع ہوگئی، یاقوتی کھائی تو دماغ میں طاقت پیدا ہوگئی، مفرح بارد کھایا تو قلب میں فرحت پیدا ہوگئی اور اگر ان ساری چیزوں کا مجموعہ معجون مرکب بنا

کر کھاؤ تو صحت کامل بن جاتی ہے۔ یہی صورت شریعت کی ہے کہ الگ الگ اعمال کی بھی خاصیتیں ہیں اور مجموعۂ شریعت کو استعمال کرو تو مکمل طریق پر روحانی صحت حاصل ہوگی تو آدمی چاق و چوبند ہوگا۔

تو یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ ہماری اور آپ کی نجات دنیا میں بھی آخرت میں بھی شریعت کے اتباع پر موقوف ہے۔ ہم اور آپ سب مریضانِ نفوس ہیں۔کوئی شہوتوں میں گرفتار ہے، کوئی شبہات میں گرفتار ہے، کسی میں عقائد کی خرابی ہے، کسی میں کبر کی خرابی، کسی میں عمل کی خرابی ہے، ان ساری چیزوں کو رفع کرنے والی چیز قرآن وحدیث اور شریعت ہی تو ہے، جب آپ سب کو استعمال کریں گے تو نہ عقائد کا فتنہ باقی رہے گا، نہ عمل کا فتنہ باقی رہے گا، کوئی روگ باقی نہیں رہے گا۔سلامتی پر آجائیں گے۔

علم وعمل کی بنیادیں......جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تَرَكْتُ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ. لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا. كِتَابُ اللهِ وَسُنَّتِیْ'' ① میں دو وزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ اگر ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہو تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ کسی فتنے میں مبتلا نہیں ہوگے۔ اور وہ دو وزنی چیزیں کیا ہیں؟ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔ یعنی میرا اسوۂ حسنہ۔

علم حاصل کرو قرآن سے اور عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ برکات سے حاصل کرو۔ علم وعمل جب درست ہوگا تو علمی فتنے بھی ختم ہوجائیں گے۔ جو عقائد کو برباد کرتے ہیں اور عملی فتنے بھی ختم ہوجائیں گے جو اتباعِ سنت کو برباد کرتے ہیں اور منکرات و بدعات میں لوگوں کو مبتلا کرتے ہیں۔ تو منکرات و بدعات ختم نہیں ہوسکتیں جب تک سنت طریقہ سامنے نہ رکھا جائے، علمی فتنے اور شہادت ختم نہیں ہوسکتے۔ جب تک قرآن کو سامنے نہ رکھا جائے۔ انہی دو کے مجموعے کا نام شریعت ہے، شریعت کی یہی دو بنیادیں ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ، تو ایک سے علم حاصل کرو، ایک سے عمل حاصل کرو، ایک سے فکر صحیح کرو، ایک سے اخلاق درست کرو، اخلاق و کمالات کا مجموعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔

اعمالِ صالحہ کا مجموعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے، علوم کاملہ کا مجموعہ قرآن کی ذات ہے۔ ان دونوں ذاتوں کو اگر آپ ہاتھوں میں تھام لو تو کبھی فتنے میں گرفتار نہیں ہوگے، جب مسلمان تباہ ہوئے ہیں، انہیں دو چیزوں کے ترک کرنے سے تباہ ہوئے ہیں، جب ان دو کو اختیار کرلیا۔ جب ہی نجات پاگئے اور عروج پاگئے۔

بہر حال یہ چند کلمات میں نے عرض کئے، میں تو بہت تھوڑی دیر چاہتا تھا، کچھ دماغ میں قوت نہیں تھی، اور صلاحیت بھی نہیں رہی تھی ضعف بھی بہت تھا۔ مگر خیر بات بڑھ گئی۔

صدقِ طلب......تو مقصد اصلی یہ تھا کہ اتباعِ شریعت کو اصل سمجھا جائے۔ اتباعِ سنّت کو اصل سمجھا جائے۔ اس کے لئے جن معلومات کی ضرورت ہے۔ وہ معلومات حاصل کی جائیں۔ اگر آپ خود عالم ہیں تو اپنے علم کی روشنی

① مؤطا امام مالک، کتاب الجامع، باب النهي عن القول بالقدر ج:۵ ص: ۳۷۱.

میں آپ سنّت کی پیروی کریں۔ اگر آپ عالم نہیں ہیں تو قرآن کریم نے طریقہ بتلایا کہ: ﴿فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ① تم اگر نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو۔ اوران سے سوالات کر کے، استفتاء کر کے فتویٰ لو۔

پھر اس کے اوپر چلو۔ تو یا اپنے علم پر چلو یا دوسرے کے علم پر اعتماد کر کے اس سے پوچھ پوچھ کر چلو۔ اگر دل کے اندر ٹو ہ رہے گی تو یا خود علم حاصل کر کے یا علم والوں سے پوچھ کر چلنے پر مجبور ہوں گے اور اگر دل میں طلب نہیں ہوگی تو پھر کچھ بھی نہیں۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ پانی کی تلاش زیادہ مت کرو۔ اپنے اندر پیاس پیدا کرو۔ پیاس پیدا ہو گئی تو پانی خود آپ کے پاس آ جائے گا۔ پیاس ہی نہیں، طلب ہی نہیں۔ جیسا کہ ہمارے ڈاکٹر اقبال مرحوم جو ''شکوہ جواب شکوہ'' ان کی مشہور نظم ہے، اس میں ایک موقع پر کہتے ہیں ؎

راہ دکھلائیں کسے ، رہروِ منزل ہی نہیں

ہم تو راہ دکھلانے کے لئے موجود ہیں۔ مگر کوئی چلنے والا بھی تو ہو؟

راہ دکھلائیں کسے ، رہروِ منزل ہی نہیں   جس سے تعمیر ہو آدم کی، وہ گل ہی نہیں

وہ مٹی ہی باقی نہیں رہی جس سے آدمی کی تعمیر ہوتی تھی، خدا جانے لوگوں میں مٹی کہاں کہاں سے آ گئی ہے کہ اتباعِ شریعت، اتباعِ سنت اور اتباعِ دین کا کوئی رجحان نہیں آ رہا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ مٹی ہی خراب ہو گئی ہے کہ

جس سے تعمیر ہو آدم کی، وہ گل ہی نہیں

تو خوب کہا ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں   راہ دکھلائیں کسے، رہر. منزل ہی نہیں

حدیث میں ہے کہ روزانہ حق تعالیٰ کی تجلّیات آسمانِ دنیا پر اترتی ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں، جیسا ہاتھ ان کی جنابِ اقدس کے لائق ہے اور فرماتے ہیں: ''اَنَا الرَّازِقُ! مَنْ ذَا الَّذِیْ یَسْتَرْزِقُنِیْ اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَسْتَغْفِرُنِیْ'' ② ''میں رزق دینے والا ہوں، کوئی ہے رزق مانگنے والا؟ میں مغفرت کرنے والا ہوں، کوئی ہے مغفرت کا طلب کرنے والا؟''

اخیر شب میں تہائی رات میں طلوعِ فجر تک آوازیں لگتی رہتی ہیں۔ جن کو اللہ توفیق دیتے ہیں وہ مانگتے ہیں، دعائیں کرتے ہیں۔ ورنہ ہم جیسے پڑے ہوئے سوئے رہتے ہیں۔ تو یہی کہا جائے گا کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں   راہ دکھلائیں کسے رہر و منزل ہی نہیں

اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ اتباعِ شریعت اور اتباعِ سنت آسان ہو جائے گا اپنے اندر پیاس پیدا کرلو۔ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہم متبع بن کر رہیں، مبتدع اور مخترع بن کر نہ رہیں کہ ایجاد کر کے رواج کو دین بنا دیں۔ جو رواج

① پارہ:۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ:۷۔ ② مسند احمد، مسند ابی ھریرۃؓ ج:۱۵ ص:۲۳۷۔

پڑ گیا وہی دین جو رسم پڑ گئی وہی دین بلکہ ہر معاملہ میں دیکھوں کہ اللہ کے رسول نے کیا فرمایا۔ اس کے اوپر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا کیا عمل تھا۔ جو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے تعامل سے ثابت ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت ہو، اس پر چلو، جو بے غل وغش راستہ ہے، شادی ہو، بیاہ ہو، غمی ہو، خوشی ہو، ہر ایک میں دیکھو کہ میرے پیغمبر نے اس کے اندر کیا نمونہ دکھلایا ہے، اس کے مطابق کرو۔ اس میں کوئی گھاٹا نہیں، کوئی خسارہ نہیں۔ آسان راستہ ہے، حقیقت میں دنیا طلبی مشکل ہے۔ دنیا میں جھگڑوں میں پڑ کر ہزاروں طوق وسلاسل آپ نے اپنے گلے میں ڈال لئے ہیں اور اپنے کو گویا زنجیروں میں باندھ لیا۔ شریعت ان زنجیروں کو کھولنے کے لئے آئی ہے کہ آزادی اور سہولت کے ساتھ عمل کر کے دنیا بھی کما لو اور اللہ تک بھی پہنچ جاؤ۔ اس لئے میں نے یہ چند جملے عرض کئے کہ

آب کم جو تشنگی آور بدست

پانی کی تلاش زیادہ نہ کرو۔ پیاس پیدا کرو۔ پانی خود بخود مہیا ہو جائے گا۔ اتباع حق، شریعت پر عمل کرنے اور آخرت کی نجات کی پیاس ہونی چاہئے، اپنی موت کو یاد کرو۔ اس عالم کے ختم ہونے کو یاد کرو، تو جب ایک دن ختم ہونا ہے تو ایک دن جواب وہی کا بھی آنا ہے۔ اس کے لئے کچھ نہ کچھ تو تیاری کی ضرورت ہے۔

حکیمانہ بات...... حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی حکیمانہ بات فرمائی اور انبیاء علیہم السلام سے زیادہ حکیمانہ بات کہہ کون سکتا ہے۔ فرمایا: ''اِعْمَلْ لِلدُّنْيَا بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِيْهَا وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِيْهَا'' ''دنیا کے لئے اتنا کام کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کام کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے''۔

یہاں چند دن رہنا ہے تو تھوڑا کام بھی کافی ہے، وہاں ابدالآباد تک رہنا ہے تو بہت سے کام کی ضررت ہے۔

احترامِ جلسہ...... بہر حال یہ چند جملے میں عرض کئے۔ ہمت اور طاقت تو تھی نہیں، مگر جلسے کے احترام نے مجبور کیا۔ اب جب لوگ جمع ہوں، لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا جائے اور ایک شخص کو لا کر بٹھلا دو اور تو اضعاً یہ بھی کہہ دیں کہ ہم بالکل تقریر کرنے کی درخواست نہیں کرتے، چاہے۔ آپ تقریر کریں چاہے نہ کریں۔

یہ بڑے عمدہ پیرائے میں تقریر کے لئے مجبور کرنا ہے، جب ہیئتِ جلسہ کی بن گئی، لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا گیا تو آدمی جھک مارے گا اور تقریر کرے گا۔

آپ تو بری ہو گئے کہ دیکھئے ہم نے تو فرمائش نہیں کی تھی، نہ مجبور کیا تھا۔ آپ دعا کر کے اٹھ جاتے، ہم اس پر بھی راضی تھے۔ مگر ہیئت ایسی بنا دیں کہ میں کچھ عرض کرنے پر مجبور تھا۔ ارادہ تھوڑا تھا، مگر بہر حال ہو گیا کچھ زیادہ۔ بہر حال نفع ہی کی چیزیں بیان ہوئی۔ مسائل ہی علم میں آئے۔ اب دعاء کر لیجئے کہ حق تعالیٰ شانہ، توفیق عطا فرمائیں۔ اپنی مرضیات پر چلائیں۔ اپنے رسول پاک کی سنتوں پر چلنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔ ہمارے دلوں میں دین کی محبت عطا فرمائے۔ ہمارے دلوں کے اندر موت کی یاد اور قیامت کی حاضری کا جذبہ رہے اور حق تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا جذبہ تازہ رہے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّھَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا، اَللّٰھُمَّ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْاَبْرَارِ يَا عَزِيْزُ يَا غَفَّارُ. بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

۲۱ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ جمعۃ المبارک

آدابِ دعاء

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!.....فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ، ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ

سیّدالایّام...... بزرگانِ محترم! اتنا وقت نہیں ہے کہ کوئی مستقل مضمون شروع کیا جائے۔ جمعہ سے قبل جو تھوڑا سا وقت ہے۔اس میں چند مختصر باتیں منتشر طریق پر گزارش کرنی ہیں۔جس وجہ سے ہم جمع ہیں وہ جمعہ ہے۔تو جمعہ نے موضوع متعین کر دیا۔جمعہ ہی کے متعلق چند باتیں عرض کر دی جائیں گی۔

جمعہ کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے کہ یہ سیّدالایّام ہے۔یعنی تمام دنوں کا سردار اور تمام دنوں کا بادشاہ یہ دن گنا گیا ہے۔اور اس کو"عید المومنین" بھی فرمایا گیا ہے۔

شانِ جامعیت......"جمعہ" لغتِ عرب میں اس کا مادّہ جَمْعٌ ہے۔یعنی جمعہ کے اندر جمع کرنے اور جامعیّت کی شان موجود ہے۔کہ یہ منتشر اجزاء کو جمع کر دیتا ہے۔اس لئے اس کا نام جمعہ رکھا گیا۔جب سے اللہ نے اس دن کو پیدا کیا۔اس دن سے اس کا کام برابر یہی ہے کہ یہ منتشر اجزاء کو جمع کرتا رہتا ہے۔جتنے بڑے بڑے کام اور عظام امور دنیا میں پیش آئے ہیں،جُمعہ،ہی کے دن پیش آئے اور سب میں جمعیت کی شان موجود ہے۔

اجزائے انسان کی جمعیّت......سب سے پہلے اسی دن میں انسان کے منتشر اجزاء کو جمع کیا گیا،جن سے انسان تیار کیا گیا۔حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام کو جمعہ ہی کے دن حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

زمین کی مٹی میں سے ہر ہر موقع سے اجزاء جمع کر کے ایک مٹھی بھر کر لے آؤ تا کہ میں ایک نئی مخلوق تیار

① پارہ:۲۸،سورۃ الجمعۃ،الآیۃ:۹.

کروں۔اس کا واقعہ طویل ہے وہ سنانا مقصود نہیں ہے۔جبریل علیہ السلام پہنچے اور زمین نے معذرت کی کہ میں اپنے اجزاء نہیں دینا چاہتی کہ میرے ذریعے ایسی مخلوق تیار ہو جو جہنم میں جلائی جائے۔تو خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے مصیبت میں کیوں گرفتار ہوں۔اس لئے آپ مجھے معاف کریں۔انہیں رحم آیا اور چھوڑ کر چلے آئے۔حضرت اسرافیل علیہ السلام بھیجے گئے،ان کے سامنے بھی زمین نے معذرت کی اور فریاد کی۔انہیں بھی رحم آیا،وہ بھی چھوڑ کر چلے آئے،حضرت میکائیل علیہ السلام بھیجے گئے،انہیں بھی رحم آگیا،وہ بھی چھوڑ کر چلے آئے عزرائیل علیہ السلام ملک الموت بھیجے گئے۔ان کے سامنے بھی زمین نے فریاد کی۔انہوں نے کہا تیری فریاد کے سننے کی بہ نسبت مالک کا حکم ماننا زیادہ اونچی چیز ہے۔اللہ کا مجھے یہ حکم ہے کہ میں مٹی جمع کروں،مجھے ہر صورت میں جمع کرنی ہے۔چاہے کوئی جنت میں جائے،چاہے کوئی جہنم میں جائے۔مجھے اس سے بحث نہیں،مجھے تعمیلِ حکم کرنی ہے۔انہوں نے تمام اجزاء جمع کئے اور لاکر پیش کئے۔حضرت آدم علیہ السلام بنادیئے گئے اور ان کا پتلا تیار کر دیا گیا اور ملک الموت کو فرمایا گیا کہ موت پر ہم نے تم ہی کو مقرر کیا۔اس لئے کہ موت میں ایک منٹ کی تاخیر اس سے نہیں ہوسکتی جس کا جو وقت مقرر ہے،اگر آپ بھی اس طرح فریاد سنتے تو مرنے کے وقت ہر شخص فریاد کیا کرتا کہ خدا کے لئے چند منٹ کی مہلت اور دے دو۔تو نظامِ عالم درہم برہم ہو جاتا،تو ایسا ہی فرد موت کے لئے مناسب ہے۔لہٰذا تم ہی موت کے اوپر مقرر کئے گئے۔بہرحال حضرت آدم علیہ السلام کے اجزاء جمعہ کے دن جمع کئے گئے اور پتلا تیار کردیا گیا تو جامعیت کی شان ابتداء سے چلی کہ منتشر اجزاء اس میں جمع ہوئے۔

جمعِ شرائع...... پھر جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے اتارے گئے ہیں وہ بھی جمعہ ہی کے دن اتارے گئے ہیں اور یہ وقت انسانی اعمال کے جمع کرنے کا پیش خیمہ تھا۔جن عملوں سے سعادت میسّر آتی ہے،جن اعمالِ شرعیّہ سے انسان کو ترقی دی جاتی ہے وہ دنیا ہی میں پہنچ کر ممکن تھے۔تو شریعتوں کی آمد جبھی ممکن تھی کہ انسان دنیا میں آتا، جنت میں نہ شریعت کی ضرورت تھی نہ احکام وقوانین کی ضرورت تھی،دنیا ہی میں احکامِ شرعیہ کی ضرورت تھی اور احکام ایک دو نہیں ہزاروں تھے۔دین اور شریعتیں مختلف رنگوں میں آئیں،تمام انبیاء علیہم السلام مختلف شریعتیں لے کر تشریف لائے۔ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب دنیا میں پیغمبر تشریف لائے۔دین بے شک ایک ہی رہا، اصول ایک ہی رہے۔مگر شریعتیں مختلف ہوئیں۔ان تمام شریعتوں کا اجتماع دنیا میں ہوا اور اس کا سبب حضرت آدم علیہ السلام کا نزول ہے۔تو منتشر شرائع کو جمع کرنے والا دن بھی درحقیقت جمعہ ہی کا دن ہے۔تو پہلے اس نے اجزائے آدم کو جمع کیا،پھر اجزاء احکام کو اس نے جمع کیا اور اسی دن میں حضرت آدم علیہ السلام کی حضرت حوا علیہا السلام سے ملاقات ہوئی ہے۔تو دونوں جمع ہوئے،تو وہ بھی اسی دن میں جمع ہوئے۔

اجتماعِ قیامت...... قیامت قائم ہوگی وہ بھی جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔اس دن اوّلین وآخرین کو ایک میدان میں جمع کیا جائے گا۔یہی زمین جس میں اونچ نیچ ہے،پہاڑ ہیں،دریا ہیں تو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ اس

دن زمین ایسی بنادی جائے گی جس میں نہ اونچ ہوگی نہ نیچ ہوگی پہاڑ ہوں گے نہ دریا ہوں گے، '' کـأنـهـا طبق فـضـتـه'' جیسے چاندی کی ایک پلیٹ ہوتی ہے۔ بالکل ہموار زمین۔ تمام بنی آدم قبروں سے نکال کر اس پر جمع کئے جائیں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد اوّلین وآخرین جمع ہوگی۔

''یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ'' جس دن سارے انسان جمع کر دیئے جائیں گے۔ تو وہ بھی جمعہ کا دن ہوگا۔ جس دن قیامت قائم کی جائے گی۔ غرض حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی جمعہ کے دن جمع ہوئی۔ احکامِ شرعیہ کے جمع ہونے کا سبب جمعہ کا دن بنا۔ پھر تمام انسانوں کو ایک جگہ ایک میدان میں اسی دن نے جمع کیا تو اس جمعہ کے اندر جامعیت کی شان موجود ہے کہ بکھرے ہوئے کو جمع کر دے۔

اسی واسطے اس کو ''عید المومنین'' کہا گیا ہے جس میں ایک محلّہ یا ایک شہر کے منتشر افراد جمع ہو کر ایک جگہ آجاتے ہیں۔ ان کو جمعہ کا دن جمع کر دیتا ہے۔ اس لئے اس میں جمع کرنے کی یا جامعیّت کی شان پائی جاتی ہے۔

تعیینِ جمعہ میں اقوام کا امتحان ...... یہی وہ دن ہے جس کے ذریعہ سے دنیا کی بڑی قوموں کا امتحان لیا گیا ہے اور اس میں صرف مسلمان کامیاب ہوئے۔ اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی نگاہ میں یہ دن متعین تھا کہ اس میں اس کی عبادت کی جائے۔ تمام کام چھوڑ کر دن کا زیادہ حصہ عبادتِ خداوندی میں لگایا جائے۔ لیکن ابھی حق تعالیٰ نے ظاہر نہیں فرمایا تھا۔

یہود کی امت جب دنیا میں آئی تو فرمایا کہ عبادت کے لئے ایک دن منتخب کرو! اگر تمہارا انتخاب اس دن تک پہنچ گیا جو ہمارے علم میں ہے تو تم کامیاب قوم سمجھے جاؤ گے۔ ورنہ نہیں۔ یہود نے اٹکل لڑائی تو یوم السبت یعنی شنبہ (ہفتہ) کا دن عبادت کے لئے منتخب کیا۔

اور اس کی بناء یہ قرار دی کہ یہ یوم الرّاحت ہے۔ یعنی اتوار کے دن سے عالم کی پیدائش شروع کی گئی اور جمعہ پر ختم کی گئی۔ تو شنبہ کا دن فارغ رہا۔ یہ یوم الفراغ ہے۔ لہٰذا یہ خوشی کا دن ہونا چاہئے۔ اس دن یہود نے عید منائی اور عبادت کے لئے اس دن کو منتخب کیا۔ لیکن وہ اس نکتے تک نہیں پہنچے جو حق تعالیٰ کے علم میں مرکوز اور مقدر تھا۔

نصاریٰ کی امت آئی تو ان سے کہا گیا کہ ایک دن عبادت کے لئے منتخب کرو۔ اگر ہمارے علم کے مطابق تمہارا انتخاب ہوگیا تو تم امتحان میں کامیاب سمجھے جاؤ گے۔ انہوں نے اتوار کا دن منتخب کیا اور اسے یوم العید قرار دیا۔

اور بناء یہ قرار دی کہ ''یَوْمُ الْاِفْتِتَاح'' ہے۔ یعنی دنیا کی پیدائش کا آغاز اتوار کے دن سے کیا گیا ہے اور یومِ افتتاح خوشی کا دن ہوتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اتوار کا دن متعین کر دیا اور اس کو عبادت کے لئے رکھا۔

مسلمان دنیا میں آئے تو حق تعالیٰ نے یہی سوال ان کے سامنے ڈالا کہ ہفتے میں ایک دن عبادت کے واسطے منتخب کرو! جس میں زیادہ حصّہ تم عبادت میں صرف کرو گے۔

مسلمانوں نے اپنی تخمین وانتخاب سے جمعہ کا دن متعین کیا کہ اس دن ہم عبادت کریں گے۔

اوراس کی بناء یہ قرار دی کہ یہ یوم تکمیل ہے۔ یعنی اتوار کے دن عالم کی تخلیق شروع ہوئی ہے اور جمعہ کے دن ختم ہوئی اور جمعہ کی آخری ساعت میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔

جمعہ میں قبولیّت دعا کی گھڑی...... اسی واسطے جمعہ کی آخری ساعت اللہ کے ہاں مقبول ہے کہ اس میں جو شخص بھی جس مراد کی دعا مانگنے کے لئے بیٹھے گا، وہ دعا قبول کی جائے گی اور وہ ساعت آخری ساعت ہے۔ یعنی غروب سے پہلے پہلے کا جو گھنٹہ ہوتا ہے جس میں غروب واقع ہوتا ہے۔ وہی آخری ساعت ہے۔ اس ساعت کو مقبول قرار دیا گیا کہ اس میں جو بھی دعا مانگی جائے گی، حق تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔

یہ خیال نہ کیا جائے کہ بعض دفعہ ہم دعا مانگتے ہیں اور قبولیت کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ حالاں کہ نص حدیث ہے کہ ہم قبول کریں گے۔ ہم نے تو بار ہا ایسا دیکھا کہ ایک دعا مانگی۔ لیکن وہ قبول نہیں ہوئی۔ مہینہ بھر انتظار کیا، دو مہینے انتظار کیا مگر قبولیت کے کچھ آثار ظاہر نہیں ہوئے۔

قلبی دعا قابلِ قبول ہے...... اوّل اس پر غور کرنا چاہئے کہ دعا کی کچھ شرائط ہیں اور کچھ آداب ہیں۔ ان شرائط اور آداب کو پورا کر کے آدمی دعا مانگے تو ممکن نہیں کہ قبول نہ ہو۔ ان شرائط و آداب کو اگر چھوڑ دیا جائے اور پھر قبول نہ ہو تو اس میں ساعت مقبولہ کا کوئی قصور نہیں۔ وہ قصور ہمارا ہوگا۔ مثلاً حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاہٍ'' ① لہو ولعب میں پڑے دل کی دعا ہرگز قبول نہیں کی جاتی۔ اللہ سے دعا مانگ رہا ہے اور خیالات دوسری طرف ملتفت ہیں۔ کہیں بیوی میں، کہیں بچوں میں، کہیں تجارت میں اور کہیں مکان میں۔ تو خیالات بٹے ہوئے ہیں، قلب میں وساوس آ رہے ہیں اور ہاتھ دعاء کے لئے اٹھائے ہوئے ہیں۔ تو یہ دعا قبول نہیں کی جاتی، دعا وہ قبول کی جاتی ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ﴾ ② مضطر اور بے قرار ہو کر جب آدمی مانگتا ہے۔ کبھی ممکن نہیں ہے کہ وہ دعا رائیگاں ہو اور قبول نہ کی جائے۔ لیکن جب دل کے اندر اضطرار نہیں، رسمی طور پر مانگ رہا ہے، دل کے اندر بے چینی نہیں ہے۔ خیالات منتشر اور بٹے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں وہ دعا ہم قبول نہیں کرتے، وہ الفاظ کی دعا ہے اور ہم دل کی گہرائی کی دعا قبول کرتے ہیں۔ دل کی گہرائی سے آدمی مانگے تو ممکن نہیں ہے کہ قبول نہ ہو۔ تو پہلی چیز تو یہ ہے۔

مالِ حرام قبولیتِ دُعا میں مانع ہے...... حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بعض لوگ دعائیں مانگتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتیں۔ فرمایا: ''مَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ يَقُوْلُ يَا رَبِّ يَا رَبِّ فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لَهٗ'' ③

کھانا دیکھو حرام، پینا حرام کا، لباس حرام کا اور کہہ رہا ہے یا رب یا رب دعا کہاں سے قبول ہو جائے گی، یعنی

① السنن للترمذی، ابواب الدعوات، باب ماجاء فی جامع الدعوات، ج: ۱۲، ص: ۳۷۳، رقم ۳۴۱۔

② پارہ: ۲۰، سورۃ النمل، الآیۃ: ۶۲۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب قبول الصدقۃ ج: ۵، ص: ۱۹۲۔

دعا کی قبولیت کے لئے لازمی ہے کہ پاکیزہ بن کر جائے۔ کسی بادشاہ کے دربار میں جاتے ہیں۔ تو قاعدہ ہے کہ کپڑے بدلتے ہیں، بدن کو صاف ستھرا کرتے ہیں، غسل کرتے ہیں، عطر لگاتے ہیں، معطر اور معنبر ہو کر جاتے ہیں۔ دربار کے آداب کا یہی تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص میلے کچیلے کپڑے پہن کر چلا جائے اور اوپر سے عطر کے بجائے گندگی بھی لگا لے تو کیا اس کو دربار میں بیٹھنے بھی دیا جائے گا۔ اسے کان پکڑ کر نکال دیں گے کہ اس نے دربار کے آداب کے خلاف کیا۔ بات سننا تو بعد کی چیز ہے۔ اسے بیٹھنے بھی نہیں دیا جائے گا کہ یہ بے ادب ہے۔ آداب دربار کی اسے کوئی رعایت نہیں۔ تو حرام کا کپڑا پہننا یا حرام کی غذا کھا کے جانا ایسا ہی ہے جیسا کپڑے اور بدن کے اوپر نجاست لگا کر جانا۔ بلکہ یہ تو ظاہری نجاست ہے جو پانی سے دھل جاتی ہے، گناہ کی نجاست معنوی نجاست ہے جسے پانی بھی نہیں دھو سکتا۔ وہ زیادہ گندی چیز ہے۔ حق تعالیٰ کے دربار میں آدمی جائے اور گندہ بن کر جائے۔ تو بیٹھنے بھی نہیں دیا جائے گا چہ جائیکہ اس کی دعاء قبول کی جائے۔ اسی کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ: ”مَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ يَقُوْلُ يَا رَبِّ يَارَبِّ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لَهُ“ لباس حرام کا، کھانا پینا حرام کا۔ اور یارب یارب کہتا ہے۔ کہاں سے دعا قبول کی جائے گی؟ وہ تو گندگی لگا کر گیا ہے۔

جیسا کہ یہ ادب تھا کہ دل میں لہو ولعب نہ ہو۔ خیالات بٹے ہوئے نہ ہوں۔ ویسے ہی یہ بھی دعا کے آداب میں سے ہے کہ آدمی پاک بن کر جائے۔ نیت کو صاف کر کے جائے۔ لباس حلال کمائی کا پہن کر جائے۔ انشاء اللہ قبولیت ہوگی۔

دعا بالقیود...... پھر دعا مانگنے میں بعض لوگ قیدیں لگاتے ہیں۔ یا اللہ مجھے مکان دیجیو، جو اس رنگ کا ہو، ایسے ڈیزائن اور ایسے نقشے کا ہو۔ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک دیہاتی نے دعا مانگی ”اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْئَلُكَ الْقَصْرَ الْاَبْيَضَ فِى الْجَنَّةِ“ ① یا اللہ میاں! مجھ جنت میں محل دیجیو، مگر سفید رنگ کا ہو، اتنا بڑا ہو، ایسی منزلیں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ دعا مانگنے کا کیا طریقہ ہے، تم تو مطلق دعا مانگو۔ اگر جنت میں داخلہ بھی ہو گیا تو یہ عظیم ترین نعمت ہے۔ یہی سب سے بڑا انعام ہے۔ تم نے جو قیدیں لگائیں کہ محل ایسا ہو۔ پیمائش اتنی ہو۔ رنگ ایسا ہو۔

یہ تو معاذ اللہ! اللہ کی ذات کے اوپر واجب کرنا ہے۔ کہ دیکھئے یہ یہ چیزیں دینی پڑیں گی۔ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے۔ آدمی مطلق سوال کرے اور مانگے۔ اگر کوئی سائل آپ کے دروازے پر آ کر یوں کہے مجھے آپ پلاؤ پکا کر دیں۔ چینی کی رکابی ہو اور اس کا رنگ سبز ہو اور پھول سنہرے بنے ہوئے ہوں۔ تب تو میں قبول کروں گا۔ تو مالک کہے گا چلا جا نامعقول میرے گھر سے، میں کہاں سے لاؤں۔ میرے بچوں کے پاس بھی نہیں ہے کہ میں ایسی رکابی استعمال کروں، تیرے لئے کہاں سے لاؤں؟ اور یہ مانگنے کا کون سا ڈھنگ ہے؟۔ تو وہ اس کو نکال دے گا۔

① السنن لابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب الاسراف فی الماء، ج: ۱، ص: ۱۳۴، رقم: ۷۷.

تو اس سے زیادہ گستاخی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی جناب میں مانگے اور قیدیں اور شرائط لگائے۔ جو واقعی مراد ہے جس کی وجہ سے وہ پریشان ہے، معذور اور مجبور ہے، اسے مانگ لے۔ اس میں قیدیں اور شرائط لگانا یہ ادب کے خلاف ہے، ممکن ہے کہ دعاء رد ہو جائے۔

وسعتِ رحمت کے منافی قید سے بھی دعا رد ہو جاتی ہے...... یا یہ کہ آدمی (دعا میں) کوئی ایسی قید لگائے جو اللہ کی وسیع رحمت کے خلاف اور منافی ہو۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے دعا مانگی ''اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ وَلَاتَرْحَمْ عَلٰی اَحَدٍ'' ''یا اللہ! مجھ پر رحم کر، اور کسی کے اوپر رحم نہ کیجیو''۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا'' ① بندۂ خدا! تو نے ایک لامحدود، وسیع چیز کو کم کر کے رکھ دیا۔ اللہ کی رحمت تو وہ ہے کہ سارے جہانوں پر بٹے، جب بھی شمہ برابر کمی نہیں آ سکتی اور تو کہتا ہے کہ مجھ پر تو رحم ہو اور کسی پر رحم نہ ہو۔ تو یہ اس سے بھی زیادہ گستاخی اور بے ادبی کی بات ہے۔ تو لہو ولعب میں پڑے ہوئے دل سے دعا مانگنا وہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ دعا مانگنا، اور اس میں اپنی طرف سے قیدیں اور شرطیں لگانا، وہ بھی مقبول نہیں ہوتی۔ دعا مانگنا اور رحمت کے دائرے کو تنگ کر کے مانگنا، یہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ تو دعا کے کچھ آداب اور ڈھنگ ہیں۔ آدمی اس طریق پر مانگے تو ملتا ہے۔ سائل قیدیں نہیں لگایا کرتا، وہ تو مراد پیش کرتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ مجھے عطاء کر دیجئے، آپ کے دربار سے مجھے کچھ نہ کچھ مل جائے۔

مانگنے کا ڈھنگ...... تو ہم دعا کے آداب پورے نہیں کرتے اور جب قبولیت کے اثرات ظاہر نہیں ہوتے تو حدیث پر سوال کرتے ہیں کہ گھڑی تو مقبولیت کی تھی۔ مگر ہمارے حق میں تو کچھ بھی قبول نہ ہوا۔ سوال یہ ہے کہ گھڑی تو مقبولیت کی تھی مگر تم نے مقبولیت کا ڈھنگ بھی اختیار کیا؟ تم نے قبولیت کے آداب بھی اختیار کئے یا نہیں؟۔ تو انسان کی نظر اپنی کوتاہی پر نہیں ہے۔ وہ اللہ کے احکام اور قوانین پر الزام ڈال دیتا ہے۔ یہ غلط طریقہ ہے۔ اگر قبولیت کے آثار ظاہر نہ ہوں تو اپنے اندر غور کرے کہ آیا میں نے کوئی کوتاہی تو نہیں کی؟ کوئی غلطی تو نہیں کی؟

فوری قبولیت...... اچھا! پھر یہ ہے کہ اگر آپ نے سارے آداب پورے کئے، ساری شرائط آپ نے جمع کیں اور دعا مانگی اِنشاء اللہ ضرور قبول ہوگی۔ لیکن قبولیت کے طریقے مختلف ہیں۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ منہ مانگی مراد فوراً ہاتھ کے ہاتھ مل گئی اور آدمی کہا کرتا ہے کہ بھئی! عجیب قبولیت کی گھڑی تھی کہ جو مانگا وہی مل گیا۔ کاش میں اس وقت فلاں چیز مانگ لیتا تو وہ بھی مل جاتی، تو بعض دفعہ تو منہ مانگی مراد ہاتھ کے ہاتھ مل جاتی ہے اور انسان دعا مانگ کر کامیاب اٹھتا ہے۔

ازدیادِ قبولیت...... اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ شے تو نہیں ملتی۔ مگر اس سے بڑی چیز مل جاتی ہے۔ تو بعد میں خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہو وہ چیز نہ ملی جو مانگی تھی۔ مجھے تو اس سے بھی بڑی چیز مل گئی۔ ایسی چیز ملی کہ اس کے ملنے سے

① الصحیح للبخاری، کتاب الھبة، باب قبول الھدیة ج:۷، ص:۲۶، رقم:۲۳۷.

جو چیز مانگی تھی، اس جیسی ہزاروں چیزیں خود بخود آ جاتی ہیں۔ تو انسان خوش ہوتا ہے کہ بہت اچھا ہوا کہ فلاں مراد کی قبولیت نہ ہوئی، اس سے بڑی چیز مجھے مل گئی۔

تاخیرِ قبولیت...... بعض دفعہ منہ مانگی ہی مراد ملتی ہے۔ مگر ذرا دیر سے ملتی ہے۔ مانگنے والے میں کچھ کھوٹ ہوتا ہے۔ انتظار کیا جاتا ہے کہ وہ کھوٹ رفع ہو اور اس مراد کے لینے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ تب اس کو دیتے ہیں، انسان سمجھتا ہے کہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کی مصلحت کی وجہ سے قبولیت میں تاخیر کی جاتی ہے۔

مصلحتِ تاخیر...... اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کا بچہ ہو اور بچے سے زیادہ کون محبوب ہوتا ہے، اولاد سے زیادہ کس سے محبت ہوتی ہے؟ محبوب ترین اولاد ہے اور اللہ نے آپ کو سب کچھ دیا ہے، آپ لکھ پتی ہیں۔ اگر سو روپے روز بھی جیب خرچ دیں تو آپ پر بھاری نہیں۔ آپ کا بیٹا مانگتا ہے کہ مجھے سو روپے دے دیجئے تو کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ فوراً بٹوہ جیب سے نکالا اور سو روپے کا نوٹ اس کے حوالے کیا۔ بیٹا بڑا خوش ہوا کہ باپ محبت والا بھی ہے، کریم النفس بھی، جو میں نے مانگا فوراً دے دیا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا مانگ رہا ہے کہ مجھے بیس یا دس روپے ہی روز دے دیجئے اور آپ نہیں دیتے۔ مہینے گزر گئے یہاں تک کہ چھ مہینے گزر گئے اور وہ یہ خیال کر رہا ہے کہ شاید باپ کے دل میں میری محبت باقی نہیں رہی ورنہ لکھ پتی ہے اگر دو سو بھی روز دیتا تو سوائے اس کے کہ کوئی بڑی بات نہیں تھی اور میں تو دس ہی روپے روز کے مانگتا ہوں۔ مگر نہیں دیئے۔ اب وہ کڑ رہا ہے۔ چھ مہینے کے بعد دس روپے روز کے حساب سے آپ نے کئی سینکڑوں کی تھیلی حوالے کی اور کہا کہ لو بیٹا! میں نے اس لئے نہیں دیئے تھے کہ تم مریض تھے۔ معدے کے بھی مریض تھے۔ جگر بھی خراب تھا اور تمہارا علاج ہو رہا تھا۔ اگر میں تمہیں دس روپے روزانہ دیتا تو تم کھانے پینے اور چاٹنے میں اڑا دیتے تو اس سے روپیہ بھی ضائع ہوتا، صحت بھی برباد ہوتی۔ تو میں نے انتظار کیا کہ جب تمہیں پوری تندرستی حاصل ہو جائے، تمہارا معدہ ہر چیز کے ہضم کرنے کے لائق ہو جائے، جب میں تمہیں دوں تا کہ جو بھی کھاؤ، ہضم ہو جائے۔ صحت میں قوت پیدا ہو۔ اب طبیب نے کہہ دیا ہے کہ تم اچھے ہو گئے۔ لہٰذا اب یہ روپیہ موجود ہے۔ اب بیٹا خوش ہوگا اور باپ کو دعائیں دے گا کہ بہت ہی اچھا ہوا کہ وقت پر منہ مانگی مراد پوری نہ کی۔ اگر باپ پوری کر دیتا تو میں بد پرہیزی کرتا اور ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتا۔ خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہوا بر وقت منہ مانگی مراد مجھے نہ ملی۔

تاخیرِ قبولیت پر تشکّر...... اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ برس گزر گئے اور بیٹا مانگ رہا ہے اور آپ نہیں دے رہے۔ اس کے دل میں بُرائی پیدا ہو گئی کہ باپ بے انتہا بخیل ہے اور باپ کے دل میں شفقت باقی نہیں رہی، دوسروں سے شکایتیں کرتا پھرتا ہے۔ مگر باپ کوئی خیال نہیں کرتا اور اس کی رعایت نہیں کرتا۔ بدستور جما ہوا ہے کہ بھئی! کچھ نہیں ملے گا۔

جب دس پندرہ برس گزر گئے۔ تو اس وقت اس نے بیٹے کو جو اس نے مانگا تھا، جمع کر کے ایک بیس ہزار روپیہ دیا اور کہا کہ میں نے اس لئے نہیں دیا تھا کہ اگر سو روپے روز دوں تو محض فضولیات میں اڑا دیتا۔ میں نے

تیرے لئے جمع کیا۔ آج دیتا ہوں تا کہ اس سے جائیداد خریدے اور جائیداد خریدنے کے بعد اتنی آمدنی روزانہ تجھے ہو جائے کہ جتنی تو مانگا کرتا تھا بلکہ اس سے دوگنی ہو جائے۔ تیرے کام آئے گی۔ ورنہ فضول بیس ہزار روپیہ ضائع ہو جاتا۔ اب یہ بیس ہزار تیرے ہی نہیں بلکہ تیری نسل کے بھی کام آئیں گے۔

اس وقت بیٹا دعا دیتا ہے کہ واقعی باپ نے بڑی خیر خواہی کی کہ نہ دیا۔ اور اس صورت سے مجھے دیا کہ نہ صرف میرے ہی بلکہ میری نسل کے بھی کام آئیں گے۔ تو دیکھئے تاخیر یہاں بھی ہوئی۔ لیکن اس تاخیر پر مانگنے والا اخیر میں جا کر شکریہ ادا کرتا ہے۔ جب حقیقت حال کھلتی ہے اور جب حقیقت حال سامنے نہیں تھی، شکایتیں کرتا پھرتا تھا کہ باپ کو محبت نہیں رہی۔ ٹھیک یہی صورت یہاں بھی سمجھئے کہ بندہ حق تعالیٰ سے مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے ایک جائیداد دے دیجئے۔ مجھے اتنے ہزار یا اتنے لاکھ دے دیجئے۔

کہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ منہ مانگی مراد مل گئی۔ بندہ بڑا خوش ہوا کہ اللہ نے مانگتے ہی وہ چیز دے دی۔ اگر میں اس سے چوگنا مانگتا وہ بھی مل جاتا۔ وہ تو مقبولیت کی گھڑی تھی۔ اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آپ مانگ رہے ہیں۔ مگر نہیں مل رہا۔ دو یا تین مہینے یا برس دن گزر گئے۔ برسوں کے بعد اسباب ایسے ہوئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے وہ مراد پوری کی اور دل میں آپ کے القاء کیا اور آپ کے اوپر واضح کر دیا کہ معصیت اور گناہوں کا مادّہ موجود تھا۔ اگر ایسے میں ہم جائیداد دے دیتے تو تم سینما دیکھتے، لہو ولعب میں خرچ کرتے اور زیادہ اللہ کی حجت تمام ہوتی۔ لیکن ایک دم ہم نے پیسے بند کر دیئے، اس کی وجہ سے تمہارے ہاتھ پلے کچھ نہیں رہا۔ تم میں پریشانی بڑھی۔ اس پریشانی کا اثر یہ ہوا کہ اخلاقی حالت درست ہونی شروع ہوئی، وہ جو لہو ولعب میں بالکل آزاد تھے، وہ آزادی ختم ہوئی۔ اب جب حالت درست ہوگئی، حق تعالیٰ نے مراد پوری کر دی تا کہ بے جا مصرف میں رقم صرف نہ ہو۔ گناہ انسان کے نہ بڑھیں۔ بلکہ نیکی اور تقویٰ بڑھے۔ اس وقت بندہ خوش ہوتا ہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے برس دن پہلے یہ جائیداد نہ دے دی۔ میں تو واقعی اڑا دیتا۔ برس دن کے بعد دی جب کہ میرے قلب کی رفتار صحیح ہوگئی، دل کی کلیں درست ہوگئیں۔

دعا کا اُخروی ذخیرہ...... اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بندہ مانگ رہا ہے، مانگ رہا ہے عمر گزر گئی، مرتے دم تک کچھ نہیں دیا گیا۔ اسی افلاس اور پریشانی میں مبتلا ہے اور کہتا ہے کہ معلوم نہیں کون سی مجھ سے ایسی غلطی ہوئی کہ کسی طرح میری دعا قبول نہیں ہوتی۔ عمر بھر مانگتا رہا اور نہ ملا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں موت بھی آ گئی، انتقال کر گیا۔ حدیث میں ہے کہ جب یہ بندہ میدانِ محشر میں حاضر ہوگا، دیکھے گا کہ اجر وثواب کے بے انتہا ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ عرض کرے گا یا اللہ! میں نے تو کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس کا اجر اتنا بڑا ہوتا، یہ نعمتیں کہاں سے میرے لئے جمع ہوئیں؟

حق تعالیٰ فرمائیں گے، وہ جو تو دعائیں مانگا کرتا تھا، ہم تیری دعاؤں کا ذخیرہ کرتے رہے۔ تیرے پاس عمل کا ذخیرہ نہیں تھا۔ لیکن تو ہم سے مانگتا تھا، ہم نے اسی کو تیرے لئے ذخیرہ بنایا۔ عمر بھر کی دعائیں جمع کر کے آج

اتنی بڑی نعمت جمع کی کہ اب تو ابدالآباد تک جنت میں چین اڑا اور آرام کر۔ اس وقت بندہ خوش ہوگا کہ اے اللہ! تیرا شکر اور احسان ہے کہ اس وقت تو نے دعا قبول نہ کی اور اب وہ قبولیت کا ذخیرہ مجھے عطاء کیا۔

دعا میں تفویض...... تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ دعا تو مانگے مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کرے کہ اگر میں مانگ رہا ہوں تو یوں ہونا چاہئے۔ یہ مالک کے اوپر چھوڑ دے۔ کبھی ہاتھ در ہاتھ ملے گا۔ کبھی دیر سے ملے گا۔ کبھی مرنے کے قریب ملے گا، کبھی مرنے کے بعد ملے گا مگر مضطرب ہو کر جو دعا مانگی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ رائیگاں چلی جائے۔ ضرور قبول ہوگی۔

دعا کا مقام عبادت...... اور میں کہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ دعا قبول نہ ہوئی۔ نہ دنیا میں ملا نہ آخرت میں ملا۔ کچھ نہیں ملا۔ مگر دعا مانگنا خود عبادت تو ہے تو عبادت کی توفیق ہوئی، یہ آپ کو تھوڑا نفع ہے؟ حدیث میں ہے کہ "اَلدُّعَآءُ هو الْعِبَادَةِ" (1) دعا عبادت کا خلاصہ ہے۔

اس لئے کہ عبادت کے معنی غایت تذلل کے ہیں۔ انتہائی ذلت اختیار کرنا، یہ عبادت کی حقیقت ہے۔ آدمی غایت درجہ ذلیل ہو جائے۔ اتنی ذلت آدمی اختیار کرے کہ اس ذلت کے بعد کوئی درجہ ذلت کا باقی نہ رہے۔ یہ حقیقتِ عبادت ہے۔ تو ہاتھ پھیلا کر مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلت نہیں ہے۔ یہ انتہائی طور پر ذلیل چیز ہے کہ آدمی بھیک مانگے۔ اللہ کے آگے جب بھیک مانگے گا تو بندے کا حق ہے کہ وہ انتہائی طور پر ذلیل بن جائے۔ اس لئے کہ انتہائی ذلت اس ذات کے سامنے اختیار کی جا سکتی ہے جس کی عزت انتہائی ہو جس کے بعد کوئی درجہ عزت کا باقی نہ ہو۔ تو اللہ کی ذات انتہائی عزت میں ہے۔ اس کے سامنے ذلت بھی انتہائی پیش کی جائے گی کہ جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ تو دعا مانگنے میں انتہائی ذلت ہے۔

مثلاً آپ نماز پڑھتے ہیں تو کانوں تک ہاتھ اٹھا کر ہاتھ باندھتے ہیں۔ یہ اظہارِ ذلت کا ابتدائی درجہ ہے کہ نوکروں چاکروں اور غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہیں۔ مگر یہ انتہائی ذلت نہیں بلکہ ابتدائی ذلت ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ رکوع میں سر جھکا دیتے ہیں تو رکوع میں بہ نسبت قیام اور ہاتھ باندھنے کے زیادہ ذلت ہے۔ رکوع میں گردن جھک گئی اور سر جھک گیا۔ لیکن یہ بھی انتہائی ذلت نہیں ایک درمیانی قسم کی ذلت ہے۔ جب آپ سجدے میں جاتے ہیں تو ناک اور پیشانی خاک پر رگڑتے ہیں۔ یہ انتہائی ذلت ہوگئی۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ بھی انتہائی ذلت نہیں ہے۔ انتہائی ذلت اخیر میں رکھی گئی ہے کہ سلام پھیر کر ہاتھ اٹھا کر اللہ کے سامنے دعا مانگو۔ یا سلام پھیرنے سے پیشتر وہ دعائیں پڑھو جو شریعت نے تلقین کی ہیں۔ تو دعا کا مانگنا اور بھیک مانگنا یہ انتہائی ذلت ہے۔

سوال ممانعت...... اسی واسطے سوال کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے کہ آدمی آدمی سے سوال کرے یعنی بھیک مانگے۔ سوائے اس کے کہ مضطر ہو جائے مخمصہ کی حالت ہو کہ اگر نہیں مانگوں گا تو جان جانے کا خطرہ ہے۔ اس وقت

(1) السنن لابی داؤد، کتاب الصلوة، باب الدعاء فی الصلوٰة، ج:۳، ص:۷۴، رقم:۷۴۷.

اجازت دی گئی ہے کہ مانگ لو۔ عام حالات میں بھیک مانگنے کی اجازت نہیں۔

سوالِ محبت...... ایک ہے سوالِ محبت اور سوالِ تعلق۔ وہ اس سے خارج ہے۔ جیسے بیٹا باپ سے مانگنے لگے یا دوست احباب میں باہم گہرا تعلق ہے اور وہ مانگے کہ بھئی! ہمیں چند پیسے دے دو یا کھانا کھلا دو یہ سوال نہیں۔ یہ سوالِ تعلق ہے۔ یہ سوال ذلّت کا نہیں بلکہ یہ سوال محبت کا ہے۔ اس سوال کی اجازت ہے۔

بلکہ بعض اوقات شریعت نے تلقین کی ہے کہ بعض مواقع میں جا کر خود مانگ کر کھاؤ تا کہ تعلّق میں اضافہ ہو جیسے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا: ﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ ۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ﴾ ①

تمہارے اوپر کوئی نہیں گناہ اگر تم اپنے گھر میں مانگ کر کھالو۔ اگر آدمی اپنی بیوی سے کہے کہ فلاں چیز مجھے دے۔ یہ سوال ذلّت کا تھوڑا ہی ہے۔ یہ حق کا سوال ہے اور تعلق کا سوال ہے۔ تو آدمی اپنے گھر سے بلا کسی دعوت کے کھائے، اسے یہ حق ہے بلکہ کھانا ہی چاہئے۔ اگر اپنے گھر میں بھی یہ انتظار کرے کہ مجھے دعوت دی جائے تو میں کھاؤں۔ تو بھوکا مرے گا، گھر میں بیٹھ کر روز کون اسے دعوت دے گا۔

اسی طرح فرمایا کہ: یا تمہارے باپ کا گھر ہو، بیٹے کو الگ کر دیا ہے۔ باپ کا گھر الگ ہے۔ فرماتے ہیں۔ یہاں بھی مانگ کر کھانے میں کوئی گناہ نہیں۔ یعنی اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جانا چاہئے اور مانگ کر کھانا چاہئے تا کہ تعلق میں اضافہ ہو، باپ یہ نہ سمجھے کہ بیٹا مجھ سے اجنبی ہو گیا یا مستقل اپنی بارگاہ بنا لی کہ اس میں بیٹے ہونے کی شان باقی نہیں رہی۔ کبھی کبھی باپ کے سامنے اپنے بیٹے ہونے کی اور اپنی محتاجگی کی شان ظاہر کرنی چاہئے تا کہ اس کی بڑائی واضح ہو، ہماری خوردی واضح ہو۔ اس لئے فرمایا کہ باپ کے گھر میں جا کے مانگ کر کھالو۔

یا ماں کا گھر جدا ہے۔ تو وہاں جاؤ اور مانگ کر کھالو یا پھوپھی اور خالہ، ان کے گھروں میں جاؤ اور مانگ کر کھالو۔ اس لئے کہ خالہ بھی ماں کے برابر ہے، پھوپھی بھی ماں کے برابر ہے۔ وہ باپ کی بہن ہے۔ یا فرماتے ہیں کہ: ﴿اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ﴾ ② یا تمہاری باندی کا گھر ہے یا تمہارے غلام کا گھر ہے جو تمہارا زرخرید ہے۔ وہ تمہارا مملوک ہے، تمہاری اولاد کی مثل ہے۔ اس سے اگر مانگو گے تو یہ مانگنا ذلّت کا نہیں بلکہ ازدیادِ تعلق کا ہے۔

﴿اَوْ صَدِيْقِكُمْ﴾ یا دوست احباب ہوں یا تم میں میل جول ہے۔ اپنے کسی دوست کے گھر جا کے کہے کہ بھئی! آج تو تمہارے گھر سے کھانا کھائیں گے۔ تو یہ ذلّت کی بات نہیں بلکہ اس سے تعلق بڑھتا ہے۔ اس کے

---

① پارہ ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۱۔

② پارہ ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۱۔

دل میں یہ گنجائش پیدا ہوگی کہ اس نے مجھے اپنا سمجھا تو آ کر مانگا۔ آدمی کسی اجنبی کے ہاں جا کر تھوڑا مانگ لیتا ہے۔

خود فرمائش...... حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے۔ تو بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باندی اور مملوکہ ہیں۔ بے چاری غریب تھیں۔ آپ نے جا کے خود فرمائش کی کہ بریرہ کوئی چیز کھانے کی رکھی ہے؟

انہوں نے عرض کیا: ہے تو مگر آپ کے کھانے کی نہیں۔ فرمایا: کیا ہے؟ عرض کیا: کچھ گوشت رکھا ہوا ہے مگر وہ آپ کے لئے نہیں۔

فرمایا: کیوں؟ عرض کیا: وہ صدقے کا میرے پاس آیا ہے۔ فرمایا: "لَکِ صَدَقَةٌ وَلَنَا هَدِيَّةٌ" ①
فرمایا: صدقہ تیرے لئے ہے۔ جب تو ہمیں دے گی تو ہمارے لئے ہدیہ بن جائے گا۔ آپؐ نے تناول فرمایا تو معاذ اللہ یہ ذلت کا سوال نہیں تھا، یہ محبت بڑھانے کا سوال تھا۔ تعلق بڑھانے کے لئے آپ نے مانگا تھا، تو تعلق میں اضافہ کرنا ہوتا ہے تو اس وقت آدمی مانگتا ہے۔ دوسرا سمجھتا ہے کہ ہمیں اپنا سمجھا ہے۔

ترکِ تکلّف...... میرا جب افغانستان جانا ہوا تو وہاں ترکستانیوں میں ایک رواج دیکھا جو ترکستان سے مہاجرین آئے ہوئے تھے، خود کابلی افغانیوں میں بھی ہے۔ شہر کابل میں گویا یہ ایک عام تمدن ہے کہ بیٹھے بیٹھے چند دوست احباب جمع ہوئے کہ آج فلاں دوست یا بھائی کے ہاں کھانا کھائیں گے، تو دس بیس آدمی اکٹھے پہنچ گئے۔ وہ بہت خیر مقدم کرے گا۔ دعائیں دے گا اور استقبال کرے گا کہ آیئے بیٹھیے اور کھانا پکنا شروع ہو جائے گا۔ دس بیس اور احباب جمع ہوئے۔ وہ ہمارے گھر آ گئے کہ ہم تو کھانا کھانے آئے ہیں۔ تو ہر شخص وہاں دس بیس آدمی کے کھانے کا بندوبست رکھتا ہے۔ ایک عام رواج ہے کہ بے بلائے دس دس، بیس بیس آدمی پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب دوستوں میں بھی یہ تکلّف ہو کہ آدمی دعوت کا انتظار کرے تو وہ دوستی کیا ہوئی؟ وہ بے تکلّفی کیا ہوئی؟ وہاں یہ ایک عام رواج ہے جس سے وہاں تعلقات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور تعلقات مضبوط ہیں۔

اسلامی بے تکلّفی...... کسی بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ کھانا کھا رہے تھے۔ کوئی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ تواضع کریں گے۔ انہوں نے کوئی تواضع نہیں کی کہ ان کے دل میں بڑی گرانی ہوئی کہ بزرگ آدمی ہیں، کھانا کھا رہے ہیں۔ یہ تو اخلاقی بات بھی ہے اور ایک مسلمان کا حق بھی ہے کہ یوں کہے کہ بھئی! کھانا کھالو۔ بلکہ اگر کسی کو نہیں بھی کھلانا ہوتا تو ظاہر داری کے طور پر ہی کہہ دیا کرتا ہے کہ بھائی! کھانا کھایئے اور جب دوسرا کہتا ہے کہ میں تو کھا کے آیا ہوں۔ تو دل میں شکر کرتا ہے کہ اچھا ہوا کھا آیا۔ تو ظاہر داری تو کی۔ تو اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کم از کم ظاہر داری کے طور پر ہی تواضع تو کر لیتے۔ یہ تو ایک اسلامی تعلق ہے۔ تو کچھ منقبض اور گھٹے گھٹے سے رہے۔

وہ بزرگ کھانا کھا کے فارغ ہو گئے۔ تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے شکایت کی کہ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ آپ

---

① السنن للنسائی، کتاب الطلاق، باب خیار الامة، ج: ۱۱، ص: ۱۴۷.

بزرگ ہیں اور اسلامی تعلّق کا مقتضیٰ ہے اور اسلامی بے تکلّفی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کہتے کہ کھانا کھاؤ۔ تو انہوں نے حیرت سے کہا کہ اچھا آپ مسلمان ہیں؟

کہا کہ الحمدللہ میں مسلمان ہوں جیسے کہ آپ مسلمان ہیں۔ فرمایا اسلامی بے تکلفی کے تو یہ معنی تھے کہ آپ نے اپنا گھر سمجھا تھا تو کھانا کھانے بیٹھ جاتے۔ یہ انتظار کرنا کہ کوئی تمہیں دعوت دے تو اضع کرے۔ معلوم ہوا تمہارے ذہن میں تکلّف موجود ہے۔ بے تکلّف تعلق نہیں رکھتے۔ تمہاری محبت کامل نہیں تھی۔

یہ انھوں نے جواب دیا۔ خیر یہ بات اب عام تو نہیں ہے مگر بعض جگہ واقعی یہ ہوتا ہے کہ اس کا انتظار کیا کہ ہماری تواضع کی جائے۔ تب بیٹھیں گے، یہ داخل تکلّف ہوتا ہے۔ بے تکلف آ کے بیٹھ جایئے۔ اب باپ بھائی بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے ہیں، شیخ یا استاذ کھانا کھا رہے ہیں جن سے نہایت بے تکلّفی کا اور نیاز مندانہ تعلّق ہے۔ اگر آدمی بے تکلّف آ کے بیٹھ جائے کہ صاحب! مجھے تو کھانا کھانا ہے۔ تو وہ اور شکر گزار ہوں گے کہ نہایت بے تکلّف آدمی ہے۔ تعلّق مضبوط ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ شریعت کے ہاں یہ مطلوب ہے کہ بعض جگہ تواضع اور دعوت کا انتظار مت کرو تا کہ تعلّق واضح ہو۔ اس میں اپنا گھر ہے، ماں کا گھر ہے، باپ کا گھر ہے، پھوپھی اور خالہ کا گھر ہے۔ ان میں آدمی جا کے مانگے اور بے تکلّف کھائے تا کہ تعلّق بڑھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً کھانے اور پینے کی چیز کا سوال کرنا ممنوع نہیں ہے۔

ذلّت سوال...... بلکہ سوال ذلّت ممنوع ہے جس میں بھکاری بن کے جائے اور ذلیل النفس بن کے جائے۔ اور اگر عزیز النفس بن کے جائے، محبت کے بڑھانے کے لئے سوال کرے، یہ سوال اس سے مستثنیٰ ہے۔ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ سب سے زیادہ ذلت انسان کو سوال کرنے کے وقت پیش آتی ہے اور سوال کرنے والا جب سوال کرتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے منہ کی آب جاتی رہتی ہے۔ اس کے منہ پر جو ایک رونق ہوتی ہے۔ وہ ختم ہو جاتی ہے۔ خود اپنے ذہن میں اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے کہ میں نے بہت برا کام کیا۔ تو سب سے زیادہ ذلت سوال کے وقت پیش آتی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: قیامت کے دن وہ لوگ جو دنیا میں بے وجہ، محض طمع اور لالچ سے سوال کرتے تھے اور ذلیل النفس بنتے تھے۔ ان کا حشر اس حالت میں کیا جائے گا کہ ان کے چہرے کا گوشت اڑا ہوا ہوگا۔ کچھ ادھر لٹک رہا ہے، کچھ ادھر لٹک رہا ہے۔ ہڈیاں نمایاں ہیں۔ نہایت ذلیل صورت ہوگی، یہ گویا عمل کے مطابق جزا ہے۔ اس لئے کہ جب بھیک مانگتا ہے تو چہرے کی آب و تاب جاتی رہتی ہے۔ چہرے کی رونق اڑ جاتی ہے، اس بے رونقی کو اس شان سے ظاہر کیا جائے گا کہ گوشت کچھ ادھر لٹکا ہوا اور کچھ اُدھر لٹکا ہوا ہے اور ہڈیاں نمایاں ہیں۔ یعنی ایسا چہرہ لے کر آئے گا کہ دنیا اس چہرے کو دیکھ کر نفرت کرے گی۔ وہ جو ذلت نفس اس کے اندر تھی، اس ذلت کا مظاہرہ کیا جائے گا۔ وہ ذلت اس صورت میں چمکے گی کہ چہرے پر عزت کے کوئی آثار

باقی نہیں رہیں گے اور چہرے کی رونق اڑ جائے گی۔

تو قیام میں انسان اللہ کے سامنے ذلّت اختیار کرتا ہے مگر یہ ابتدائی مرتبہ ہے، رکوع میں اس سے زیادہ ذلت ہے، سجدے میں اس سے زیادہ ذلت ہے اور مانگنے میں اس سے زیادہ ذلت ہے۔

بندہ کے سوال سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی...... یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ سوال کرنے سے جتنے خوش ہوتے ہیں اتنے کسی چیز سے خوش نہیں ہوتے۔ فرماتے ہیں اگر کوئی بندہ سوال کرتا ہے تو ہم اس سے خوش ہیں کہ اگر سوال نہیں کرے گا تو ہم اس سے ناراض اور ناخوش ہیں۔ دنیا میں اس کے برعکس قصہ ہے، اگر آپ کسی کے آگے سوال کرنے لگیں تو وہ خوش نہیں ہوگا بلکہ ناخوش ہوگا۔ محبت بھی ہوگی تو ختم ہو جائے گی اور حق تعالیٰ کے ہاں اگر نہ مانگے تب ناخوش ہوتے ہیں، مانگنے پر خوش ہوتے ہیں۔

اس کی بناء یہ ہے کہ دنیا میں آپ جس سے بھی مانگیں گے، چاہے وہ ارب پتی ہو۔ مگر اس کا خزانہ پھر بھی محدود ہے، جتنا دے گا اتنی خزانے میں کمی پڑ جائے گی۔ اللہ کے خزانے لامحدود ہیں، اگر عالم بھی بخش دیں تب بھی کمی نہیں پڑے گی۔ اس لئے ناخوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں، البتہ یہ امتحان ہے کہ کون بندگی اختیار کر کے آتا ہے۔ کون بندہ کی صورت سے آتا ہے۔ تو بندہ وہی ہے جو پوری بندگی نمایاں کرے اور بندگی کے معنی اظہارِ ذلّت کے ہیں۔ اس واسطے مانگنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنی چاہئے۔ خوب مانگا جائے۔

مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کی جائے۔ مراد مانگ لی جائے اس میں قیدیں اور شرطیں لگانا یا جس سے آپ مانگ رہے ہیں، اسے آپ کہیں کہ آپ کو یوں کرنا ہوگا تو یہ حق تعالیٰ کے ہاں بے ادبی اور خلافِ تہذیب ہے۔ تو مانگنے میں کسر نہ چھوڑے مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کرے۔ جتنا مانگے گا اتنی ہی ادھر خوشی بڑھے گی اور رضا کا تعلق بھی اتنا ہی ہوگا۔

تعلیمِ دُعا...... مجھے مکّہ معظمہ کا ایک واقعہ یاد آیا، جن لوگوں کو حج کرنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں، حجاز اور مکّہ میں غرباء بہت زیادہ ہیں۔ بے چارے مانگتے ہیں اور لیچڑ بن کر مانگتے ہیں۔ حرم شریف میں باوجود یہ کہ حکومت انتظام کرتی ہے کہ سائل نہ آئیں، مگر پھر بھی ہزاروں کی تعداد میں پہنچ جاتے ہیں اور وہ ہر ایک کے آگے ایک قرش دو قرش مانگتے پھرتے ہیں۔ اور اس طرح سے مانگتے ہیں کہ دینے والا اگر دے دے تو تھوڑی دیر میں پھر لوٹ کے آ جائیں گے۔ پھر لوٹ کے آ جائیں گے۔ نہ دے تو وہ کھڑے رہیں گے، یا وہ انکار کرے یا وہ منہ پھیرے۔ غرض لوگ مانگنے والوں سے زچ آ جاتے ہیں اور تنگ آ جاتے ہیں۔ تو بعض لوگ جھنجلائے ہوئے میرے پاس آئے کہ صاحب! یہ عجیب بے وقوف قسم کے سائل ہیں۔ انہوں نے ہماری تلاوت بھی ختم کر دی، نوافل بھی ختم کر دیئے، جہاں تلاوت کرنے بیٹھے وہ آ کے کھڑے ہو گئے۔ اب یا تو دے یا جب تک زبان سے یوں نہ کہے "اللہ کریم" آگے جاؤ، اس وقت تک ٹلتے نہیں۔ اب تلاوت کے سینکڑوں ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ چند آیتیں پڑھیں پھر کہا، اللہ کریم۔ چند آیتیں پڑھیں پھر دوسرا آ گیا، پھر اس سے کہا، اللہ کریم آگے جاؤ۔ تو ہم عاجز آ گئے اور پریشان ہیں اور

آپ یہ کہتے ہیں کہ سائل کو جھڑکو بھی نہ۔ آپ کیا کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ ① کہ سائل کو مت جھڑکو۔ اب نہ کہیں یا نہ جھڑکیں تو انہوں نے تو عاجز کر دیا، کیا کریں؟ غرض بہت ہی غصے اور خفگی میں تھے اور کئی آدمی تھے۔ میں نے کہا آپ نے غور نہیں کیا۔ یہ سوال کرنے والے آپ کے معلّم ہیں۔ آپ کو تعلیم دینے آئے ہیں۔ کہنے لگے کہاں کی تعلیم؟

میں نے کہا یہ آپ کو مانگنا سکھانے آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح لپچڑ ہو کے مانگو کہ ہم تو لے ہی کے اٹھیں گے۔ خیر وہ اس پر ٹھنڈے ہو گئے اور بہت خوش ہو کے واپس ہوئے۔ پھر انہوں نے نہ کسی سائل کو برا بھلا کہا نہ جھڑکنے کی نوبت پیش آئی۔ وہ سمجھ گئے کہ واقعی یوں ہی مانگنا چاہئے۔ مانگنے کا ڈھنگ یہی ہے۔

فرق اتنا ہے کہ انہوں نے غلطی یہ کی کہ آدمی سے اس طرح مانگنا شروع کیا حالاں کہ اس طرح اللہ میاں سے مانگنا چاہئے کہ آدمی گھٹنے ٹیک دے کہ میں لئے بغیر نہیں اٹھوں گا۔ میں رب کریم کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور محروم چلا جاؤں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو اس عزم سے آدمی مانگے تو کبھی محروم نہیں ہو سکتا۔

علامتِ قبولیت...... اور بعض علامتیں بھی ایسی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب کوئی بوڑھا آدمی جس کی داڑھی سفید ہو اور وہ اللہ کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے کہ اس سفید ریش کو خالی ہاتھ واپس کروں۔ یوں تو میں کریم ہوں ہی، لیکن میری کریمی اور بڑھ جاتی ہے جب کوئی سفید ریش، سفید بال والا مانگتا ہے کہ اس بوڑھے کو میں محروم واپس کروں۔ اس کے چہرے پر ایک ہیبت کا اثر ہے اور ایک وقار ہے تو میں اس کو ذلیل کر کے واپس کروں، تو حق تعالیٰ اس کی بات تھامتے ہیں۔ فرماتے ہیں، میں اس کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرتا اور اس کی مراد پوری کرتا ہوں۔

اہلِ قبولیت سے مشابہت کا اثر...... اور اس میں بعض بزرگوں نے تو لطیفہ کیا۔ یحیٰ ابن اکثمؒ ایک بزرگ گزرے ہیں۔ اور صاحبِ فنون ہیں۔ نحو یا صرف کے غالباً امام ہیں۔ بہر حال بڑے لوگوں میں ہیں، جس وقت ان کے انتقال کا وقت آیا۔ تو انہوں نے ایک دوست کو وصیت کی کہ جب مجھے قبر میں اتاریں تو میری داڑھی کے اوپر سفید میدہ یا چونا کوٹ کر رکھ دینا کہ میری داڑھی سفید ہو جائے۔ کس لئے رکھنا؟ تجھے اس سے بحث نہیں۔ اس نے تعمیل حکم کی، کفن دیتے ہوئے کوئی میدہ اور چونا ایسا مل دیا کہ داڑھی کے بال بالکل سفید ہو گئے اور ڈھانپ دیا اور نماز پڑھ کے دفن کر دیا۔ حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوئے اور عرض کیا کہ میری مغفرت فرما دیجئے۔

فرمایا: او بوڑھے! تو نے فلاں حرکت نہیں کی؟ فلاں حرکت نہیں کی؟ فلاں گناہ نہیں کیا؟ عرض کیا جی ہاں! سب کچھ کیا، کہ پھر تو اس قابل ہے کہ تیری مغفرت کی جائے۔ مانگنے کو تو آیا ہے؟ کیا تیری مراد پوری کی جائے؟ عرض کیا کہ یا اللہ! میری داڑھی سفید ہے۔ اسے تو دیکھ لیجئے، آپ ہی نے تو فرمایا ہے کہ ہم سفید داڑھی

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الضحیٰ، الآیۃ: ۱۰۔

رکھنے والے کو واپس نہیں کرتے۔ تو میں سفید داڑھی نہیں رکھتا تھا تو میں نے سفید داڑھی رکھنے والوں سے کم از کم مشابہت پیدا کرنے کے لئے چونا لگایا اور داڑھی کو سفید کر لیا۔ تو رنگ تو سفید ہو گیا۔ چاہے عارضی طور پر ہو چاہے اصلی طور پر ہو، اور آپ نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ سفید وہ ہو جو اصلیت سے سفید ہو۔ سفید داڑھی کے معنی سفید بالوں کے ہیں اور میں سفید بال لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ وعدہ کے مطابق بخش دیجئے۔ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا او بڈھے جا ہم نے تجھے بخشا اور معاف کر دیا۔

تو بعض بزرگ وہاں بھی جا کر مذاق کرتے ہیں، مگر اس قسم کا مذاق جو اصولِ شرعیہ سے ماخوذ ہو۔ حق تعالیٰ اس کی رعایت فرماتے ہیں۔ چناں چہ یحیٰ ابن اکثمؒ کو بخش دیا۔ جس شخص نے انہیں خواب میں دیکھا تو اس کو انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ میں نے تو اپنی سفید داڑھی سامنے کر دی تھی اور عرض کیا کہ آپ ہی کا وعدہ ہے کہ ہم سفید ریش کو واپس نہیں کرتے۔ میں تو مغفرت مانگتا ہوں۔

بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ سفید داڑھی تو وقار ہے ہی اور نیکی اور تقویٰ کی علامت ہے، اس کے ساتھ اگر مشابہت ہی پیدا کر لی جائے، وہ آدمی بھی محروم نہیں رہتا، تو کم سے کم اس لئے ہی مشابہت پیدا کر لیجئے، اگر ہماری داڑھی نہیں ہے تو ہم اس لئے رکھ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ وہ معاملہ ہو جائے جو داڑھی والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اسلامی صورت...... نیز یہ کہا گیا کہ قیامت کے دن داڑھی کو نور بنایا جائے گا۔ داڑھیاں نور کی صورت اختیار کریں گی۔ یعنی اس روشنی میں آدمی راستہ طے کرے گا۔ تو اس لئے رکھ لے کہ بھائی! میرا راستہ ہی طے ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ میرا نور بجھ جائے۔ اس اندھیرے میں کس طرح قدم اٹھاؤں گا تو کم سے کم یہ رعایت کرے۔

اور مسلمان کی صورت تو داڑھی ہی سے اچھی معلوم ہوتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ داڑھی نہ ہو۔ آپ خود غور کر لیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن میں منفعل بھی ہیں کہ کچھ سوسائٹی اور ماحول کی مجبوری سے ایسا کر لیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے مگر مجبوری تو وہ پیش نظر رکھنی چاہئے جس کا کوئی جواب نہیں ہوگا اور وہ قیامت کے دن کی مجبوری ہے، یہاں کی مجبوریاں تو سہی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر وہاں کوئی ایسی بات سامنے آئے تو کسی صورت میں وہاں تدارک ہی نہیں، وہاں تو پھر بھگتانے ہی کی صورت ہے۔ تو کم سے کم اسی نیت سے کرے۔

تشبّہ باسمِ محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ثمرہ...... اور کچھ نہیں تو یہی نیت کرے کہ میری جو محبوب ترین ذات ہے وہ میرے رسول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کی صورت پاک ایسی تھی، کم از کم میں ان سے ہی مشابہت کروں۔ تشبّہ میں بڑی برکتیں ہیں، اگر نام بھی رکھ لے اس میں برکت ہے۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: قیامت کے دن جب میدانِ محشر میں لوگ جمع ہوں گے۔ حق تعالیٰ اپنے پیغمبر کو" یَا مُحَمَّدُ" کہہ کر پکاریں گے۔ تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جتنے لوگوں کے نام محمد ہوں گے، ہر ایک یہی سمجھے گا کہ مجھے پکارا ہے تو لاکھوں آدمی کھڑے ہو جائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تو اپنے پیغمبر کو پکارا تھا۔ جنہیں ہم نے جنت میں بھیجنا

تھا۔ لیکن جب تم کھڑے ہو گئے تو تم بھی ان کے ساتھ جاؤ۔ اب ہم تمہیں بٹھانا نہیں چاہتے۔ اس نام کی برکت سے نجات اور مغفرت ہو جائے گی، تو جن کے نام پاک کے نام کی نقل اتارنے کی یہ برکت ہے، اگر ان کی صورت کی نقل اتار لی تو کتنی برکات ظاہر ہوں گی۔ اگر ان کی سنتوں کی، ہم نقل اتارنے لگیں تو کتنی برکات ظاہر ہوں گی۔ بہر حال اتباعِ سنت میں خیر ہی خیر ہے، کوئی برائی نہیں اور ترکِ سنت میں برائی ہی برائی ہے۔ چاہے وہ آج واضح نہ ہو، کل کو واضح ہو جائے گی یا قبر میں واضح ہو گی یا محشر میں واضح ہو گی۔

میں تو یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر مولویوں کی سی داڑھی نہ رکھیں تو کم سے کم اتنی رکھ لیں کہ دور سے نظر آئے کہ بھئی! داڑھی ہے مسلمان ہے۔ وہ بھی انشاء اللہ نور کا کام دے گی، انشاء اللہ ضائع نہیں جائے گی، یہ فعل بھی اکارت نہیں جائے گا۔ اتباعِ سنت کے لئے ایک قدم بڑھے گا، ایک ہی قدم کا اجر ملے گا۔ دو بڑھیں گے، دو کا اجر ملے گا، لپک کر چلیں گے، اس کا اجر ملے گا۔ جتنا بھی آپ بڑھیں گے۔ خیر کی طرف بڑھیں گے، خیرِ دنیا و آخرت دونوں اس میں ظاہر ہوں گی، انشاء اللہ برکات نمایاں ہوں گی۔

مشابہت کا تمدّنی فائدہ..... مصر میں میں نے ایک واقعہ سنا، اس سے واقعی مجھے عبرت ہوئی، وہاں عام طور سے لوگ داڑھی نہیں رکھتے بلکہ جو رکھ لیتا ہے اسے پکارتے ہیں کہ یہ تو یہودی ہو گیا۔ یہ اس کو طعن دیتے ہیں۔ مگر جن لوگوں کے داڑھی ہے، ان سے پوچھا تم نے کیا فائدہ سوچا؟۔ یعنی شرعی بات تو الگ ہے، اس سے قطع نظر کر کے تمدن کی حیثیت سے تم نے کیا بات سوچی جو تم داڑھی رکھتے ہو؟ یہ جواب تو صحیح ہے کہ اتباعِ سنت کرتے ہیں پیغمبر علیہ السلام کی صورت سے مشابہت بے شک برکت ہی برکت ہے۔ لیکن تم پر جو ملامتیں پڑتی ہیں۔ اس کے مقابلہ کے لئے تمدّنی حیثیت سے داڑھی رکھنے میں تم نے کیا مصلحت سوچی؟

انہوں نے کہا کہ ایک بڑی مصلحت یہ ہے کہ یہاں پردہ بالکل نہیں۔ نوجوان لڑکیاں پھرتی ہیں اور بہت زیادہ بالکل آزاد ہیں داڑھی والا جواُن کے سامنے آتا ہے، منہ پھیر کے چلی جاتی ہیں۔ کبھی اس کی طرف رجوع نہیں کرتیں۔ تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے لئے تقویٰ کا راستہ صاف ہو گیا۔ اگر ہم نہ بچنا چاہیں تو وہ ہم سے بچتی ہیں۔ ہم برائی میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ میں نے کہا: الحمدللہ، دنیا میں کم سے کم یہ مصلحت تو نمایاں ہوئی کہ داڑھی والے کی طرف آزاد اور اوباش قسم کی عورتیں متوجہ نہیں ہوتیں اگر متوجہ ہو گی تو اپنی ہی بیوی متوجہ ہو گی۔ یعنی حلال ہی کام اس سے سرزد ہو گا، حرام سرزد نہیں ہو گا۔ یہ کتنا بڑا فائدہ ہے۔

اور پھر یہ کہ اگر آپ نے مولویانہ صورت بنالی تو آپ کو کبھی جرات نہیں ہو گی کہ سینما میں جاکے بیٹھیں، لوگ یوں کہیں گے کہ نامعقول مولویانہ صورت سے تم یہاں آئے؟ دنیا طعن دے گی۔ تو اس داڑھی کی وجہ سے آدمی بہت سے مصائب اور برائیوں سے بچ جاتا ہے۔ تو ایسی چیز تو محبت کرنے کے قابل ہے جو بہت سی برائیوں سے بچانے کا ذریعہ بن جائے۔ تو ایک تو اتباعِ سنت ہے، وہ تو عظیم چیز ہے۔ دنیا میں بہت سے منافع بھی ہیں اور فوائد و برکات بھی ہیں۔

سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کمالِ عشق ومحبت......اور اصل یہ ہے کہ محبت کی کمی ہے۔ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تام اور پوری ہو جائے۔ پھر اس قسم کے معاذیر اور عذرات کچھ پیش نہیں چلتے۔ محبت ناقص اور عشق ناتمام میں اس قسم کی چیزیں ہوتی ہیں کہ ملامت کرنے والے یوں ملامت کریں گے تو ہم کیا کہیں گے اور فلاں عیب لگا دے گا تو ہم کیا کہیں گے۔ جب عشق قلب میں تام ہو جاتا ہے تو پھر کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ باقی نہیں رہتی۔

حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ، جب ایران فتح ہو گیا، بغداد میں تشریف رکھتے تھے اور کھانا تناول فرما رہے تھے۔ ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر گر پڑا۔ انہوں نے فوراً جھک کر زمین پر سے لقمہ اٹھایا اور خاک وغیرہ اڑا کر صاف کیا اور تناول کر لیا۔ وہ فارسی غلام جو کھڑا ہوا تھا، اس نے کہا کہ: یہ آپ نے کیا حرکت کی؟ یہاں بڑا تمدن ہے بڑے متمدنوں کا ملک ہے اور بڑے معزز لوگ ہیں زمین پر پڑی ہوئی چیز اٹھا کر کھا لینا، یہاں بڑی بد تہذیبی سمجھی جاتی ہے۔ لوگ آپ پر طعن کریں گے کہ یہ بڑے حریص ہیں کہ انہوں نے ایک گری ہوئی چیز اٹھا کر کھالی۔ تو اس کو عیب اور ذلت سمجھا جاتا ہے۔ آپ حضرات کو اپنا وقار تھامنے کے لئے ان باتوں کی رعایت رکھنی چاہئے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کیا جواب دیتے ہیں؟ فرماتے ہیں ''ءَاَتْرُکُ سُنَّۃَ حَبِیْبِیْ لِھٰٓؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ'' کیا میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ان احمقوں کی وجہ سے ترک کر دوں؟ کہ یہ ملامت کریں گے۔ ان کی ملامت مجھ پر کیا اثر کر سکتی ہے؟ سنت کے فوائد میرے سامنے ہیں اور اس ملامت کا کوئی ضرر مجھ تک دنیا و آخرت میں نہیں پہنچ سکتا۔ تو جو چیز کہ کوئی ضرر نہ پہنچا سکے، اس کی وجہ سے میں وہ فعل اختیار کر لوں جو دنیا میں بھی میرے لئے مضر ہو اور آخرت میں بھی مضر ہو۔؟ تو فرمایا کہ: میں ان ملامت گروں کی ملامت کی وجہ سے سنت حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک نہیں کر سکتا۔ اس میں گویا روٹی کا بھی ادب ہوا اور اتباعِ سنت بھی ہوا اور عظمتِ سنت بھی ہوئی اور سنت کے مقابلہ میں کسی ملامت اور لومۃ لائم کی پرواہ بھی نہ ہوئی۔ تو اس سے حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ کا کمالِ عشق اور کمالِ ایمان واضح ہو جاتا ہے۔

عطیۂ خداوندی کی قدر و منزلت......اور روٹی کی عزت کرنا یہ خود شرعاً فی نفسہ واجب ہے۔ صریح حدیث میں فرمایا گیا: ''اَکْرِمُوا الْخُبْزَ'' ''روٹی کا اکرام کرو''۔

اس لئے کہ روٹی اللہ کا تبرک ہے، اس کو عزت کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔ اس کو استعمالی سامان مت سمجھو کہ کھائی اور جو باقی بچی اٹھا کر پھینک دی۔ جیسے ہم بعض دفعہ ریلوں میں دیکھتے ہیں۔ یہاں تو الحمد للہ دیکھنے میں نہیں آیا مگر ادھر کہ روٹی کھائی اور جو بچی اس سے منہ صاف کیا اور اسے لپیٹ کر باہر پھینک دیا۔ یہ نہایت ذلیل حرکت ہے۔ میں نے تو بعض کو ملامت کی حالاں کہ وہ غیر مسلم تھے۔ میں نے کہا یہ کیا طریقہ ہے۔؟ کہنے لگے کہ: اب یہ کام کی

نہیں رہی۔ میں نے کہا کہ: یہ کرتہ پائجامہ میلا ہو گیا ہے۔ اسے بھی اتار کر ذلت سے پھینک دو۔ کام کا نہیں رہا۔ اس لئے کہ میلا ہو گیا۔ اس وقت کھانا تمہارے کام کا نہیں رہا۔ شام کو تمہارے کام آ جائے گا۔ تمہارے کام کا نہ ہو کسی غریب کے کام آ جائے گا۔ یہ تو خدا کا دیا ہوا رزق ہے، اسے ذلیل کر کے پھینکنا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روٹی سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ روٹی کا ادب سکھلایا گیا ہے۔ اس کی بے ادبی جائز نہیں رکھی گئی، اس کا احترام واجب ہے۔ اسی طرح اگر دانے زمین پر گر جائیں۔ انہیں چگ لینا چاہئے، یہ نہیں کہ انہیں جوتیوں میں روند دیا جائے۔ وہ اللہ کا عطیہ ہے اور حق تعالیٰ شانہٗ کا تبرک ہے۔

احترامِ رزق ...... ہمارے اساتذہ میں سے حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے محدّث تھے۔ ان کی وفات ہو گئی بلند پایہ بزرگوں میں سے تھے اور صاحبِ حال لوگوں میں سے تھے۔ ان کا عجیب طریقہ تھا۔ جب کوئی مہمان آتا اور کھانا باہر آیا تو جب مہمان کھانا کھا کر فارغ ہو جاتے۔ تو کچھ تو روٹیوں کے ٹکڑے بچ جاتے ہیں، کچھ چھوٹے موٹے کنے بچ جاتے ہیں اور کچھ ریزے ہوتے ہیں جو دستر خوان پر پڑے ہوتے ہیں۔ تو میاں صاحب مرحوم کا عجیب طریقہ تھا، روٹیوں کے جو بڑے ٹکڑے بچ جاتے، انہیں جمع کر کے احتیاط سے گھر میں بھیجتے کہ یہ مہمان کا تبرک ہے۔ یہ گھر والوں کو کھانا چاہئے، وہ جو کنارے اور چھوٹے چھوٹے کنے رہ جاتے، ان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے فرماتے کہ انہیں چھت پر پھیلا دو، یہ چڑیوں اور کوؤں کا حق ہے۔ ہمارے رزق میں اللہ نے ان کا بھی حصہ رکھا ہے۔ اور وہ ریزے جو چھوٹے چھوٹے بھورے ہوتے، ان کو جمع کر کے جہاں چیونٹیوں کے سوراخ ہوتے وہاں ڈال دیتے کہ چیونٹیاں انہیں لے جائیں کہ ان کا بھی ہماری غذا کے اندر حق ہے۔ تو ادب بھی ہوا اور ٹھکانے بھی لگا۔ تو روزی اور رزق اسی قسم کی چیز ہے۔ پرانے بزرگوں میں اس کا بڑا احترام کیا جاتا اور کہا جاتا کہ: ''روزی کا مارا ہوا اور روٹی کا مارا کہیں نہیں پنپتا''۔

یعنی جو روٹی کے ساتھ بے ادبی کرے، رزق کے ساتھ گستاخی کرے۔ وہ محروم الرزق بن جاتا ہے، اس لئے شریعت اسلام نے روٹی کا ادب سکھلایا کہ اس کی توقیر کرو، اس کو کوڑے میں مت ڈالو، اس کو خاک پہ مت ڈالو، اسے منہ پونچھنے کا رومال مت بناؤ، بلکہ جتنا بچ جائے، ادب کے ساتھ احتیاط سے رکھو، خود تمہارے کام آئے گا۔ تمہارے کام نہیں آئے گا کسی فقیر کے کام آئے گا، کسی غریب کے کام آئے گا۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔ انہیں کھانے کو ٹکڑا نہیں ملتا اور تم سینکڑوں ٹکڑے ضائع کر کے پھینک دیتے ہیں۔ یہ خود بے ادبی کا ثبوت دیا اور دنیا کو رزق سے محروم کیا۔ جو دنیا کو رزق سے محروم کرے کہیں اس پر یہ اثر نہ پڑے کہ اللہ اسے رزق سے محروم کر دے وہاں تو ادل بدل ہے۔ بہر حال روٹی کا اکرام بھی واجب قرار دیا گیا۔ رزق کا احترام بھی واجب قرار دیا گیا۔ ذرا ذرا سی چیزوں میں ادب سکھلایا گیا۔

احترامِ لباس ...... یہی ادب کپڑے پہننے میں ہے۔ مثلاً رات کو آدمی سوتے وقت کپڑے اتارتا ہے۔ اچکن

اتارا، کرتہ اتارا، لنگی باندھی۔ فرمایا گیا کہ ان کپڑوں کو زمین پر مت ڈالو۔ فرش پر بکھرا ہوا مت چھوڑو، یعنی بے ادبی اور بے توقیری سے پھیلا ہوا مت چھوڑو۔ اوّل تو یہ ادب کے خلاف ہے۔ جب یہ عطیۂ خداوندی ہے تو جس اللہ نے دیا ہے اس کی نعمت کا احترام کر کے تہہ کر کے سرہانے رکھ دو یا کسی کھونٹی پر ٹانگ دو۔ زمین پر پڑا ہوا مت چھوڑو، اور اس میں یہ بھی فرمایا گیا کہ اس میں دنیوی مضرت بھی ہے، فرماتے ہیں کہ ''اِطْوُوْا ثِيَابَكُمْ تَرِدْ اِلَيْهَا اَرْوَاحُهَا'' کپڑوں کو لپیٹ کر احتیاط سے رکھو۔ بکھرے ہوئے چھوڑو گے تو ممکن ہے اس کے اندر چیونٹیاں گھس جائیں اور جب پہننے لگو تو ایذا پہنچائیں۔ ممکن ہے کوئی بچھو گھس جائے اور تکلیف پہنچائے، کپڑے کو پڑا ہوا مت چھوڑو۔ بے ادبی بھی ہے اور دنیوی مضرت بھی ہے۔ بلکہ اس کو تہہ کرو یا کھونٹی پر ڈالو، ہر چیز کے اندر شریعت نے آداب سکھلائے ہیں، کھانے کا ادب بتلایا، لباس پہننے کا ادب بتلایا، لباس پہننے کا ڈھنگ بتلایا کہ ڈھنگ بھی بے ادبی کا مت اختیار کرو کہ وہ اللہ کا عطیہ ہے۔

ہیئت احترام...... کوئی بادشاہ اگر کسی کو کوئی عطیہ دے، اور آدمی نے منہ ادھر کو پھیر کر بائیں ہاتھ سے لے لیا، وہ انعام سے محروم کر دیا جائے گا کہ شاہی عطیہ کی اس نے قدر نہیں کی۔ دونوں ہاتھوں سے لیتے ہیں یا دایاں ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ ادب کے ساتھ لیتے ہیں کہ شاہی عطیہ ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ: جب کھانا کھانے بیٹھو، دائیں ہاتھ سے روٹی کھاؤ، دائیں ہاتھ سے پانی پیو۔ گویا حق تعالیٰ ایک ایک لقمہ تمہیں پہنچا رہے ہیں۔ ہر ہر منٹ پر انعام ہو رہا ہے اور تم لیتے جا رہے ہو، تو بائیں ہاتھ سے مت لو کہ یہ بے ادبی ہے۔ جھک کر کھاؤ، متکبر بن کر مت کھاؤ، چوکڑا مار کر مت کھاؤ کہ یہ متکبروں کی طرز ہے۔ سوائے اس کے کوئی معذور ہو۔ بعض دفعہ آدمی لحیم شحیم اور موٹا تازہ ہے۔ اب اس غریب سے اکڑوں نہ بیٹھا جائے۔ نہ یہ کہ ایک پاؤں کھڑا کر کے ایک بچھا کے بیٹھا جائے۔ چوکڑا ہی مار کر بیٹھ سکتا ہے۔ وہ معذور ہے۔ تو معذور کا باب الگ ہے۔ لیکن اصل حکم یہ ہے کہ تربع یعنی چوکڑا مار کر کھانا مکروہ ہے۔ لیٹ کر کھانا مکروہ ہے کہ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے اور طبی اصول کے بھی خلاف ہے۔ تو یہ سارے آداب اس لئے سکھلائے گئے کہ دنیا کی بھی منفعت حاصل ہو اور اخروی نفع بھی حاصل ہو اور رضائے خداوندی بھی حاصل ہو۔

احکام شریعت میں فوائدِ اُخروی و دنیوی...... شریعت کے ہر حکم میں جہاں آخرت کے منافع ہیں وہاں دنیا کے بھی منافع ہیں۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا: ''اَلسِّوَاکُ مِطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ وَمَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ'' ① مسواک کرنے میں منہ کی پاکیزگی اور خوشبو ہے اور آخرت کا ثواب ہے اور حق تعالیٰ کی رضا ہے۔

تو مسواک کرنے میں دو فائدے حاصل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور منہ کی صفائی، اور منہ کی صفائی کا صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ دانت صاف رہیں گے تو پائیوریا نہیں ہوگا تو معدہ نہیں بگڑے گا۔ معدہ نہیں بگڑے گا تو صحت اچھی رہے گی، گویا جسمانی صحت بھی اچھی ہوئی اور صحت روحانی بھی حاصل ہوئی کہ رضائے حق میسر آ گئی۔ تو چیز

① السنن للنسائی، کتاب الطهارة، باب الترغيب في السواک ج: ۱ ص: ۱۱.

ایک ہے، ایک حکم ہے۔ اس سے دنیا کا فائدہ بھی اور آخرت کا فائدہ بھی۔

حدیث میں واقعہ فرمایا گیا کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب زخمی ہو چکے اور مرض الوفات میں تھے تو ایک نوجوان مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا۔ مزاج پوچھا اس سے بات چیت فرمائی۔ وہ واپس ہو گیا۔ جب تھوڑی دور گیا تو غلام سے کہا کہ اس نوجوان کو بلاؤ۔ وہ آیا۔ لنگی پہنے ہوئے تھا جو ٹخنوں سے نیچے زمین پر گھسٹتی ہوئی جا رہی تھی۔ تو آپ نے نہایت ہی محبت سے فرمایا: یَا فَتیٰ! (اے نوجوان) ''اِرْفَعْ اِزَارَکَ فَاِنَّهٗ اَنْقٰی لِثَوْبِکَ وَاَتْقٰی لِرَبِّکَ.'' ① اس کپڑے کو اٹھا۔ اس میں تیرے لئے دو فائدے ہیں انقی لثوبک سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تیرا کپڑا صاف ستھرا رہے گا۔ یہ جو زمین پر گھسٹتا ہوا آ رہا ہے، تو کہیں جگہ پاک ہے کہیں ناپاک ہے۔ پاکی لگی، ناپاکی لگی۔ کپڑا بے اعتبار بن گیا نہ عبادت کے قابل رہا، نہ نماز کے قابل رہا۔ تو انقی لثوبک دنیوی فائدہ تو یہ ہے کہ کپڑا پاک رہے گا۔ واتقی لربک اور پروردگار کے لحاظ سے دیکھیں تو تیرے اندر تقویٰ پیدا کرے گا۔ خوفِ خدا پیدا کرے گا۔ اس لئے کہ کپڑا زیادہ گھسٹتا ہوا ہوتا ہے تو دل میں رعونت پیدا ہوتی ہے اور کبر کا مضمون دل میں پیدا ہوتا ہے اور اگر کپڑا اٹخنے سے اونچا ہوتا ہے تو تواضع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

آثارِ لباس...... اسی واسطے سلاطین اور بادشاہوں کا لباس آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان کے لباس تین تین گز ادھر ادھر پڑے ہوتے ہیں۔ کندھے پر قباء ہے اور دو دو گز ادھر ادھر بکھری ہوئی پڑی ہے۔ یہ انتہائی کبر و نخوت اور رعونت کی دلیل ہوتی ہے۔ شریعت نے اس کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا کہ بندے کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ بندگی کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام جو منافی بندگی ہو کرے، لباس کا زمین پر پھیلا ہوا رہنا کبر کی علامت ہے اور لباس کا اونچا رہنا یہ تواضع کی علامت ہے، اس میں تزئین کم ہوتا ہے۔ اس میں زینت زیادہ ہوتی ہے۔ جتنی زینت بڑھ جائے گی تبختر اور اتراہٹ پیدا ہوگی، کبر و نخوت پیدا ہوگی، کبر و نخوت کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

اور اگر زینت میں کمی ہے، یعنی جمال تو ہے، تزئین نہیں ہے۔ جمال کے معنی صفائی ستھرائی، موٹا کپڑا، لیکن آدمی اگر بناؤ اور سنگھار میں لگ جائے، اسی سے کبرِ نفس کی طرف طبیعت جاتی ہے۔ عورت چوں کہ محلِ زینت ہے، اس واسطے عورتوں میں تکبر زیادہ ہوتا ہے۔ مرد چوں کہ زینت کم اختیار کرتے ہیں، اس لئے عورتوں کی نسبت متکبر کم ہوتے ہیں۔ متواضع زیادہ ہوتے ہیں۔ تو عورت میں ناز و نخرہ اور کبر و نخوت زیادہ ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ محلِ زینت ہوتی ہے۔ اور مرد محلِ شجاعت اور محلِ ہمت ہے۔ اگر مرد بھی محلِ زینت بننے لگے تو مرد اور عورت میں فرق نہیں رہے گا۔ اگر مرد اسی طرح بناؤ سنگھار کرنے لگے جس طرح عورتیں کرتی ہیں، تو ان میں کبرِ نفس پیدا ہوگا، جتنا زینت کو چھوڑ کر تجمل اختیار کریں گے، اتنی تواضع پیدا ہوگی۔ تزئین بناؤ سنگھار کو کہتے ہیں اور تجمل صفائی و ستھرائی، ڈھنگ اور طریقے کو کہتے ہیں۔ تو شریعت نے تجمل کا حکم دیا ہے یعنی موٹا کپڑا پہنو مگر صاف ستھرا ہو اور جمال کی شان ہو، اور

---

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب قصة البیعة و الاتفاق علیٰ عثمان، ج: ۱۲، ص: ۵۳، رقم: ۳۴۲۴.

ایک زینت ہے یعنی بناؤ سنگھار کرنا، یہ عورتوں کے لئے مخصوص کی گئی۔ تو عورتیں متکبر زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کا علاج دوسرے ڈھنگ سے بتلایا گیا۔ عورت سے زینت ترک نہیں کرائی بلکہ زینت کا حکم دیا گیا۔ اس واسطے کہ زینت سے محبت کا تعلق ہے۔ اور یہ مطلوب ہے کہ عورت خاوند کی محبوب بنے۔ اس کو محبت اور تعلق رہے۔ اگر خاوند میں بیزاری پیدا ہوئی تو گھر اور معاشرت منزلی تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے مرد کو عورت کا محب بنانا چاہا ہے اور عورت کو مرد کا محبوب بنانا چاہا ہے۔ اس لئے عورتوں کے لئے زینت کا حکم دیا ہے۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر عورت سارے سفید کپڑے پہن لے تو یہ مکروہ ہے، کوئی نہ کوئی کپڑا رنگین ہونا چاہئے تا کہ زینت کی شان اس کے اندر پیدا ہو۔

حرفِ آخر...... بہر حال شروع میں میں نے یہ عرض کیا تھا کہ کوئی منضبط بات تو ہے نہیں، منتشر چیز ہے۔ مگر مختلف مسائل آ گئے۔ اب وقت بھی پورا ہو گیا۔ جمعہ پر بات چلی تھی کہ جمعہ یومِ جامع ہے۔ معلوم نہیں ادھر کس طرح نکل آیا۔ بس اللہ کا حکم تھا ادھر نکل آیا۔ جمعہ کے متعلق جو بیان کرنا تھا، وہ رہ گیا۔ پھر کبھی آنا ہوا تو اس کی تقریر ہو جائے گی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

الہامی ادارہ اوراس کے فضلاء کی تنظیم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!.....فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قیام دارالعلوم، اسباب ومحرکات...... بزرگانِ محترم! دارالعلوم دیو بند جس کا نام آپ کل سے بار بارسن رہے ہیں اور یہ تمام اکابر جو اس وقت یہاں (دارالعلوم حقانیہ کے سالانہ اجلاس میں) آپ حضرات کے سامنے جمع ہیں۔ اسی دارالعلوم دیو بند کے اجزاء واعضاء ہیں۔ دارالعلوم کے ارکان ہیں۔ ان ہی حضرات کے اجتماع کا نام دارالعلوم دیو بند ہے، خواہ وہ دارالعلوم دیو بند کے اندر ہوں یا باہر ہوں۔

دارالعلوم دیو بند کا قیام رسمی طور سے عمل میں نہیں آیا کہ چند آدمی شہر کے ذمہ دار حضرات جمع ہوئے اور ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ صورت نہ تھی بلکہ صورت یہ تھی کہ انگریزوں کا تسلط واقتدار ہندوستان میں آیا۔ دین کی کسمپرسی کا حال سب کے سامنے ہوا۔ خدشہ یہ ہوا کہ اسلام شاید اب باقی رہے یا نہ رہے۔ تو اس وقت جتنے اولیاء اور اکابر تھے۔ یک دم ان کے قلوب میں وارد ہوا کہ ایسا کوئی ادارہ ہونا چاہئے جس کے ذریعہ سے دین اور علم دین باقی رہے۔ دین کی حفاظت کی جاسکے۔ اگر یہ باقی رہے تو تمام چیزیں اسلام اور مسلمان کی باقی رہ سکتی ہیں اور اگر دین وعلم دین باقی نہ رہے تو خدانخواستہ مسلمان مسلمان نہ رہ سکیں گے۔

دین کی بقاء علم دین کی بقاء سے ہوسکتا ہے اور اگر یہ باقی نہ رہے اور مسلمانوں کی قوت وشوکت باقی بھی ہو تو قابلِ اعتناء نہیں۔ تو وقت کے تمام اہل اللہ کے قلوب میں وارد ہوا کہ ایسا ادارہ ضروری ہے۔ ایک مجلس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اکابر جمع ہوئے تھے۔ دین کے بارے میں فکر دامن گیر تھی۔ تو کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو۔ کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہونا چاہئے۔ غرض تمام اولیاء اللہ کا اجماع منعقد ہوا کہ ادارہ قائم ہو۔ تو ایک رسمی صورت نہ تھی۔ بلکہ غیبی اور باطنی صورت تھی، الہامی اور کشفی صورت تھی۔ چناں چہ الہام خداوندی کے تحت اس مدرسے کا قیام عمل میں آیا۔

حضرت مولانا یاسین صاحب دیوان جی حضرت قاسم العلومؒ کے خادم خاص اور معتمد علیہ تھے۔ جب حج کو گئے۔ مکہ معظمہ میں حضرت امداد اللہ صاحب قدس سرہ، کی خدمت میں جانا ہوا جو پورے مشائخ کے شیخ اور مرشدِ طریقت تھے۔ تو رخصت کے وقت عرض کیا کہ ہمارے مدرسہ کے لئے بھی دعا کریں۔ حضرت حاجی صاحب نے یہ سن کر تعجب سے جواب میں فرمایا، چہ خوب، پیشانیاں تو برسوں ہم نے رگڑیں راتوں بھر سجدے ہم نے کئے دعائیں ہم نے مانگیں، اب جب مدرسہ قائم ہوا تو مدرسہ آپ کا ہو گیا اور پھر فرمایا کہ ہمارا خیال مدرسے کا تھانہ بھون یا نانوتہ میں قائم کرنے کا تھا، ہمیں کیا خبر تھی کہ دیوبند والے یہ غنیمت لے اڑیں گے۔ تو مدرسہ دیوبند کا قیام ہنگامی حالات اور مشورہ سے نہیں ہوا۔ بلکہ اکابر کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ سجدے کئے جارہے تھے۔ راتوں کو دعائیں مانگی جارہی تھیں۔ حق تعالیٰ نے قبول فرمایا، معلوم ہوا کہ الہام غیبی سے مدرسہ قائم ہوا۔

خشتِ اوّل...... اس ادارہ کی عمارت کی سب سے پہلی اینٹ حضرت مولانا اصغر حسین صاحب دار العلوم کے جلیل القدر استاد کے نانا میاں جی منے شاہ نے رکھی، ان کا نام محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ میاں جی مرحوم کے بارے میں حضرت مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: میں آج پہلی اینٹ ایک ایسے شخص سے رکھواؤں گا کہ جسے کبھی بھی عمر بھر صغیرہ کے درجہ میں بھی گناہ کا تصور نہیں ہوا۔ استغراق اور ربودگی کی یہ کیفیت طاری تھی کہ اپنی اولاد تک کو نہ پہچانتے۔ ان کے داماد تھے، اللہ بندہ نام تھا۔ جب ان کی خدمت میں آتے تو پوچھتے کون؟ تو جواب دیتے۔ اللہ بندہ، پھر پوچھتے کون؟ تو جواب دیتے آپ کا داماد ہوں، دس منٹ بعد پھر وہی استغراق۔ یہ کیفیت استغراق کی جاری رہتی، نہایت ہی پاک طینت بزرگ تھے۔ جب انتقال ہوا اور غسل کے لئے تختے پر لٹائے گئے۔ تو چشم دید واقعہ مولانا محمد یسٰین صاحب نے سنایا، جو میرے فارسی کے استاد تھے اور آپ کے پاکستان کے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے والد ماجد تھے۔ انہوں نے خود سنایا کہ تختے پر لٹاتے ہی میاں صاحب ایک دم کھل کھلا کر ہنسنے لگے۔ شور مچ گیا تو لوگ دوڑ پڑے۔ جب مجمع زیادہ ہوا تو ہنسنا بند ہوا، تو اس قماش کے لوگ تھے۔ جنہوں نے دار العلوم کی پہلی اینٹ رکھی پھر حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوریؒ اور دوسرے اکابر نے بعد میں اینٹ رکھی۔ ظاہر ہے کہ اینٹ رکھنے والے ایسے اولیاء اللہ اور روحانیت میں ڈوبے ہوئے ایسے لوگ ہوں تو اس مدرسہ کی بنیادیں کتنی مضبوط ہوں گی۔ آج بحمد للہ اس پر سو برس کے قریب زمانہ گذر گیا ہے۔ ہزاروں مصائب آ آ کر ختم ہوئے اور وہ مدرسہ ترقی کرتا گیا۔ برابر بڑھتا جارہا ہے اور آج تک اسی آب و تاب سے قائم ہے۔ یہ ایک رسمی بات ہے کہ فلاں شخص وہاں کا مہتمم ہے، عہدیدار ہے یا مدرس ہے اور اسے ترقی دیتا ہے، یہ غلط اور محض ایک تہمت ہے۔ ترقی دینے والی غیبی طاقت ہے، سب کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ کرتا ہے۔

مرکزِ روحانیت...... میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سے سنا، فرماتے تھے کہ دار العلوم آدمیوں کو بناتا ہے۔ آدمیوں نے دار العلوم کو نہیں بنایا۔ یہ ایک کسوٹی ہے، پرکھ ہے، یہاں دار العلوم کے ہزاروں

فضلاء ہیں اور مدارس قائم کئے ہوئے ہیں، میں برما گیا تو دارالعلوم کے فیض یافتہ موجود۔ افغانستان گیا تو سینکڑوں علماء موجود اور قصبہ قصبہ آباد ہے۔ مدارس قائم کر چکے ہیں۔ یہاں کثرت سے فضلاء سرگرمی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، ان سب کا رجوع دارالعلوم کی طرف ہے۔ یہ اس ماحول کے آثار ہیں۔ وہاں کی غیبی طاقت ہے کہ سب کا تعلق اور رجوع اس مرکز کی طرف ہے۔ وہاں کے فضلاء کہتے ہیں کہ جب ہم دارالعلوم سے جدا ہوئے تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ماں کی گود سے جدا ہونے کی حالت ہے، گویا ایک جاذبیت ہے، روحانیت ہے اور دارالعلوم مرکزِ روحانیت بن گیا ہے۔

دارالعلوم کی شانِ تجدید...... حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: یہ جو حدیث شریف میں آتا ہے ''اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا.'' ①

ہر ایک صدی میں کوئی نہ کوئی مجدّد آئے گا۔ جو دین کو نکھارے گا۔ عقائد واعمال اور کلیاتِ دین میں لوگ جو فرق وخرابی ڈالیں گے مجدّد ہر صدی میں آ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دے گا، تو فرمایا کہ مجدّد کے لئے فردِ واحد ہونا شرط نہیں۔ جماعت بھی مجدّد بن سکتی ہے اور فرمایا کہ دارالعلوم کے بانی حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ ان سب کی حیثیت مجدّد کی سی ہے اور ان حضرات کا مظہرِ اتم دارالعلوم ہے۔ گویا دارالعلوم کی حیثیت مجدّد کی سی ہے۔ جس نے بدعت وسنت کو الگ الگ کیا۔ دین کو خلط ملط، غل وغش سے پاک صاف کر دیا۔ مسائل میں جو خلط لوگوں نے کیا تھا، اسے نکھار نکھار کر پاک صاف کر دیا۔ یہ ایک کیفیت ہے دارالعلوم کی۔

مرکزِ اتحاد...... مادّی چیزوں میں تغیر اور انتشار ہوتا ہے۔ روحانیت میں قدرتی طور پر اجتماع ہوتا ہے اور دارالعلوم کی بنیاد روحانیت پر ہے۔ مادّہ کا خاصہ ہی تغیر ہوتا ہے اور روحانیت میں ایسا نہیں ہوتا، ایک شیخ کے مرید، ایک استاد کے شاگرد قدرتی طور پر مجتمع رہتے ہیں۔ آپس میں جڑے رہتے ہیں۔ اسی طرح دارالعلوم کے فضلاء کے قلوب ایک مرکز سے وابستہ ہیں اور حقیقی طور سے وابستہ ہیں۔

جو اتحاد کا مرکز ہے تو قدرتی طور پر ان کا آپس میں اتحاد قائم ہے۔ میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت نانوتویؒ جب تک حیات تھے، ان کی سرپرستی دارالعلوم کو حاصل تھی۔ تو کیفیت یہ تھی اور ہماری حالت یہ تھی کہ لوگ اختلاف کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے دلوں میں افتراق کا خیال بھی نہیں آتا تھا اور جب ان کی وفات ہوئی اور حضرت گنگوہیؒ کی سرپرستی آئی تو اگر کچھ اختلافات اٹھتے بھی۔ مگر حضرت گنگوہیؒ کی روحانیت کی وجہ سے ختم ہو جاتے۔ ان کی روحانی طاقت انہیں دبا دیتی اور قوت مجتمع رہتی۔

تنظیم کی ضرورت...... پھر خلفاء کے زمانے میں مراکز الگ الگ ہوئے۔ مرکز خلفاء بن گئے۔ مگر قوت مجتمع تھی۔ مریدین آپس میں مجتمع تھے۔ اس وقت سوال پیدا ہوا کہ مراکز کے اختلافات کی وجہ سے رسمی طور سے تنظیم

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذ کر فی قرن المائة، ج: ۱۱، ص: ۳۶۲ رقم: ۳۷۴.

ہونی چاہئے تا کہ رسمی طور پر بھی ایک اتفاق پیدا ہو جائے۔ایک نظام اور تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مرکز پر سب متحد رہیں۔ورنہ مشائخ کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے صورتِ اختلاف تشتت وظاہری پراگندگی کی نمایاں ہو جاتی ہے۔گو وہ درحقیقت مذموم نہ ہو۔

اس وقت بزرگوں کے دلوں میں وارد ہوا کہ تنظیم ابنائے دارالعلوم دیو بند ہونی چاہئے۔یہ تنظیم ابنائے قدیم آج کی نہیں، ہاں زیادہ قوت اس تنظیم میں ابھی چند سال ہوئے کہ پیدا ہوئی، ورنہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے میرے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کے زمانے میں جب کہ دارالعلوم ان کے ہاتھ میں تھا۔اس کی ضرورت محسوس کی۔زیادہ قوت سے اس کی ضرورت اب محسوس کی گئی۔یہ تنظیم کوئی سیاسی تنظیم نہیں، نہ سیاسی مقاصد اس کے ساتھ متعلق ہیں۔

مقصدِ تنظیم...... بلکہ اس تنظیم کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ فضلاء دینی علمی قابلیتوں سے عظیم کام انجام دے رہے تھے۔ان کو منظم کیا جائے تا کہ زیادہ موثر ثابت ہوسکیں۔آج ہزاروں کی تعداد میں دارالعلوم کے فضلاء ہیں، فیض یافتہ ہیں جو دین کو سنبھالے ہوئے ہیں۔مختلف ممالک میں اس کے فضلاء پھیلے ہوئے ہیں۔

جہاں تک مدارس کا تعلق ہے تو کوئی قصبہ ایسا نہیں جو ان سے خالی ہو۔ان سو برس میں جتنی خدمت اس ادارے نے کی، کوئی نظیر اس کی نہیں۔جہاں تک تصانیف کا تعلق ہے۔ہزار ہا ہزار تصانیف اس جماعت کی مختلف مسائل پر موجود ہیں۔ایک حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا جائے تو ایک ہزار تصانیف اپنے ترکے میں چھوڑ گئے۔ہر زبان میں تصانیف، ہر علم میں، ہر فن میں تصنیفات موجود ہیں۔نظم میں موجود ہیں، نثر میں موجود ہیں۔اس کے علاوہ ایک ہزار کے قریب مواعظ الگ چھوڑ گئے۔کچھ چھپ گئے ہیں، کچھ باقی ہیں۔گویا ایک ایک فرد نے ایک ایک امت کے برابر کام کیا ہے۔حضرت شیخ الہند قدس سرّہ کے مرید و متوسل ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔اسی طرح حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرّہ کے ہزار ہا شاگرد، مریدین اور متوسلین ملک کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے ہیں۔حضرت تھانویؒ کے مریدین ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں الگ پھیلے ہوئے ہیں۔سب اپنے رنگ میں دین کا کام کر رہے ہیں۔حدیث، فقہ، فتویٰ، تفسیر، عمل جہاد ہر میدان میں اس جماعت کے لوگ نمایاں نظر آئیں گے غرض یہ کہ ہزاروں لاکھوں افراد کے ایمان کو سنبھالے ہوئے ہیں۔کام سب سے بڑھ کر، خدمت کے میدان میں تمام جماعتوں سے آگے اور زیادہ۔ہر دیہات میں کوئی نہ کوئی فاضل موجود ہے۔شہرت نہیں، اخباروں اور رسالوں میں نام نہیں۔مگر ہزاروں کے ایمان کو سنبھالے اور خود بھی سنبھلے ہوئے ہیں۔اب آپ کے اکوڑہ خٹک میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب سلمہٗ اللہ تبارک وتعالیٰ ایک ہی شخصیت نے دارالعلوم قائم کیا۔یہ ہزاروں لوگ علماء ومشائخ جو اس وقت یہاں (دارالعلوم حقانیہ میں) نظر آرہے ہیں۔یہ ان کی نہیں بلکہ دارالعلوم دیو بند کی خدمت ہے۔ایک شخص کے ساتھ ہزاروں لوگوں کا دین وابستہ ہے۔مگر رسمی طور پر اگر کسی

نے کہا کہ دارالعلوم دیوبند نے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے فارغین کیا کیا کام کررہے ہیں۔ تو چوں کہ انتشار ہے۔ منظم نہیں ہیں۔ تو صحیح خدمات آپ نہیں بتلاسکتے۔ اگرچہ خدمتیں بے شمار ہیں۔ آپ اجمالاً بیس ہزار کی تعداد کہہ سکیں گے۔ مگر یہ معلوم نہ ہوگا کہ ان بیس ہزار علماء وفضلاء نے کیا کام کردکھایا۔ مورخ بھی اجمالاً ذکر کردے گا۔ مگر تفصیلی طور سے اسے کچھ معلوم نہ ہوگا۔ دنیا کو اجمالاً بھی پتہ نہ چل سکے گا۔

تنظیمِ خدمات...... لہٰذا اسی مقصد کے لئے شعبۂ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی تاکہ دارالعلوم کی روحانی ذریت کے کارنامے منضبط ہوسکیں۔ مقصد خدمات کی تنظیم ہے۔ افراد کی تنظیم نہیں۔ اس کے لئے ایک فارم تیار کیا گیا جس کی سرخیاں میں نے خود لکھیں کہ ہر فاضل اس کی خانہ پری کرکے بھیج دے، اس کی مدت فراغت اور کہاں اقامت ہے۔ تصنیف وتالیف کے کیا اور کون سے کام کئے۔ جائے سکونت اور بیعت وارشاد کے بارے میں سوالات لکھے گئے۔ الحمدللہ کہ ڈھائی تین ہزار فارم پُر ہوکر آگئے اور یہ خدمات اور کارنامے اگر کتابی شکل میں شائع ہوگئے۔ تو معلوم ہوجائے گا کہ ان حضرات نے دنیا کو دین وایمان سے بھردیا ہے اور پھر ان حضرات کے وعظ وارشاد، تعلیم وتبلیغ سے اور ہزاروں متکلم، خطیب، شیخ طریقت، واعظ مبلغ تیار ہوئے۔ اب اسی مقصد کے لئے یہ ادارہ قائم کیا جارہا ہے۔ کہ ماہنامہ دارالعلوم کے چار صفحات اسی غرض کے لئے مخصوص کردیئے جائیں کہ ان میں دارالعلوم کے فضلاء کا ذکر ہو۔ سن واران کے حالات اور کارنامے بیان کردیئے جائیں۔ یہ دین اور علم دین اور علماء کی ایک عظیم الشان تاریخ ہوگی۔

وسعتِ دارالعلوم...... دارالعلوم اس چاردیواری کا نام نہیں۔ اس تمام نظام مسلک، تحریک اور خدمات کا نام ہے۔ جو ہندوبیرون ہند میں قائم ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے ذکر کیا کہ بریلی میں ایک مدرس ہیں۔ جو دارالعلوم کے نمایاں فاضل ہیں۔ انہیں دارالعلوم میں بلالیں، مولانا خاموش رہے، چپ ہوگئے۔ تین دفعہ عرض کیا گیا، پھر عرض کیا کہ آپ کیوں رکاوٹ کرتے ہیں، فرمایا ان کو بلانا غلط ہے۔ اس لئے کہ جو فاضل جہاں بیٹھا ہے وہاں دارالعلوم دیوبند قائم ہے، اسی طرح گویا ہر شہر وقصبہ میں دارالعلوم قائم ہے۔ یہ دارالعلوم دیوبند کی وسعت ہے، آپ فاضل کو بلاکر دارالعلوم کے دائرے کو سمیٹ کر محدود کررہے ہیں اور میں سمیٹنا نہیں چاہتا، یہ ساری روحانی اولاد اسی دارالعلوم کی ذرّیت ہے۔ کسی کا ایک بچہ رہ جاتا ہے کسی کے دو کسی کے تین۔ دارالعلوم کے لاکھوں بیٹے ہیں۔ لاتعداد اولاد ہے اور جائز اولاد ہے۔ ترکے اور میراث کے وارث ہیں۔ اور یہ ترکہ اخلاق ہیں، اعمال ہیں، علوم ہیں، معارف ہیں جو انبیاء علیہم السلام کا ترکہ ہوتا ہے۔ اور اس ترکہ میں ہر ایک کو بقدرِ ظرف حصّہ ملا ہے۔

معیارِ اہتمام...... حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم کے مہتمم اور امّی محض تھے، منقطع عن الخلائق، صاحبِ کشف وکرامت بزرگ تھے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے بلاکر مجبور کیا۔ دارالعلوم کے

اہتمام کے لئے ،فرمایا! میں تو محض امّی ہوں، نہ لکھنا جانتا ہوں نہ پڑھنا ،فرمایا اس کا تعلق لکھنے پڑھنے سے نہیں بلکہ قلب سے اس چیز کا تعلق ہے۔ چنانچہ مولانا اہتمام کے لئے بیٹھ جاتے اور جو کچھ لکھواتے ،لکھ دیا جاتا اور اس پر مولانا کی مہر لگائی جاتی تھی۔ بہرحال حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ ادارہ بڑا ہے، میں اس ذمہ داری کو کس طرح سنبھال سکوں گا اور اتنا تحمل کس طرح کر سکوں گا۔

معیارِ طلباء……اس واقعہ سے پہلے ان کا ایک اور واقعہ سنئے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمام کے زمانے میں دارالعلوم میں پچاس ساٹھ طالب علم تھے۔ چوبیس پچیس طلبہ مطبخ سے کھانا لیتے تھے۔ یہ کل کائنات تھی۔ حضرت مولانا دارالعلوم کے احاطہ مولسری میں کھڑے تھے۔ ایک طالب علم شوربہ کا پیالہ لایا، اور غصہ سے مولانا کے سامنے پٹخ دیا اور کہا یہ سالن ہے یا پانی ہے۔ یہ کھانا مطبخ سے کھلاتے ہو؟ بے ادبی کے الفاظ بھی استعمال کئے۔ کہا کہ یہ ہے آپ کا اہتمام؟ مولانا نے تین مرتبہ سر سے پاؤں تک اس طالب علم کو دیکھا اور فرمایا یہ مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ لوگوں نے کہا مدرسہ کا طالب علم ہے، یہاں مقیم ہے، مطبخ سے کھانا لیتا ہے، فرمایا کچھ بھی ہو مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ طلبہ چپ رہے، دو تین دن کے بعد تحقیق سے معلوم ہوا کہ واقعی مدرسہ کا طالب علم نہیں تھا۔ اس نام سے دھوکہ دے کر مدرسہ سے کھانا لینے کے لئے داخل ہوا تھا، اہل مدرسہ نے آپ سے پوچھا۔ حضرت آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ فرمایا کہ جب مدرسہ کا اہتمام میرے سپرد ہوا پریشانی ہوئی کہ کس طرح یہ کام سنبھالوں گا۔ اس عالم میں رات کو خواب دیکھا۔ صاحبِ دل اور عارف ربانی تھے اور صاحب دل کا خواب آدھا خواب اور آدھا کشف ہوتا ہے۔

تو فرمایا کہ میں نے مولسری کے کنویں کو دیکھا کہ کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی من پر بیٹھ کر دودھ تقسیم فرمارہے ہیں۔ کسی کو لوٹا بھر کر دے رہے ہیں، کسی کو دیگ میں، کسی کو بالٹی میں مل رہا ہے اور کوئی پیالہ بھر رہا ہے اور جس کے ساتھ برتن نہیں تو چلو میں ہی پی کے چلا گیا، اپنے اپنے ظرف کے مطابق لوگ دودھ بھر کے لے جارہے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد ہے، آنکھ کھل گئی تو میں نے مراقبہ کیا، تعبیر کے لئے منکشف ہوا کہ یہ کنواں صورت مثالی ہے علم کی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صورت مثالی ہیں قاسم العلم کی جو تقسیم کررہے ہیں علم کو اور یہ لے جانے والے طلبہ ہیں جو بقدرِ ظرف لیتے جارہے ہیں۔ اب اس سے زیادہ عجیب بات یہ کہ حضرت مولانا نے فرمایا کہ: جب شوال کا داخلہ ہوتا ہے تو میں فوراً طلبہ کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ طلبہ کے اس مجمع میں موجود تھا۔ اب جب یہ طالب علم آیا تو میں نے اوپر سے نیچے تک اس پر نگاہ ڈالی ،معلوم ہوا کہ یہ اس مجمع میں نہیں تھا۔

الہامی طریقے سے اس کا علم ہوا۔ معلوم ہوا کہ دارالعلوم کے طلبہ کا انتخاب بھی خدا کی طرف سے ہوتا ہے، جہاں بھی کام کرتے ہیں غالب آتے ہیں۔ غلبہ پر ایک واقعہ یاد آیا۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے زمانہ میں چودہ طالب علم دورہ حدیث میں تھے دستار بندی کی تجویز ہوئی، یہ دارالعلوم کا دوسرا جلسہ تھا، ہمیں

بھی پگڑی باندھنے کا ارادہ کیا گیا تو ان چودہ طالب علموں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جلسہ کو رکوانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کیوں کہ ہم اُمیّوں کو پگڑی بندھوائی جائے گی اور ہم اہل نہیں، جس سے مدرسہ کی بدنامی ہوگی۔ غرض ان چودہ طالب علموں نے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا کہ جا کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ سے جلسہ رکوانے کی درخواست پیش کریں، حضرت مولانا یعقوب صاحب دارالعلوم کے اول صدر مدرس تھے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جب ان کی خدمت میں پہنچے تو مولانا محمد یعقوب صاحب مطالعہ فرما رہے تھے کتابوں کا۔ حضرت تھانوی نے ہیئت بھی اس وقت کی بتلادی کہ میں جب حجرہ میں گیا تو ڈیسک پر کتاب رکھی ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور بہت گہرے طریقے سے مطالعہ کر رہے تھے کتابوں سے نگاہ اٹھائی، ان کا رعب اتنا تھا کہ ہر ایک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پوچھا خیر تو ہے کیسے آنا ہوا؟ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ میں نے درخواست پیش کی کہ دیوبند میں جلسہ، دستار بندی ہو رہا ہے، اگر یہ حکم ہو تو تعمیل سے انکار نہیں اور اگر کہنے کا موقع ہو تو ہماری درخواست ہے کہ ہم اس کے اہل نہیں، نالائق ہیں، پورا مدرسہ اور ہمارے اکابر واساتذہ بدنام ہو جائیں گے۔ جلسہ روک دیا جائے اور ہماری نالائقیوں سے پردہ نہ ہٹایا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے عیوب پر پردہ ڈالا جائے، یہ سن کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو جوش رحمت آیا، فرمایا یہ تمہاری نالائقی کا احساس تمہاری سعادت مندی کی علامت ہے۔

جب آدمی میں اپنی نالائقی کا احساس آجائے تو یہ اس کے کمال وفضیلت اور سعادت مندی کی دلیل ہے اور ہم جو یہ جلسہ کریں گے تو وہاں اعلان کریں گے کہ فیما بیننا وبین اللہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ لوگ ہمارے نزدیک اہل ہیں قابل ہیں، اور جس کی مرضی ہو ان کا کسی فن میں بھی امتحان لے لے۔ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ: ہم لوگ اور بھی ڈر گئے کہ آئے تھے جلسہ رکوانے کے لئے اور یہاں امتحان دینے کا الگ کہا گیا۔ بہرحال ہم وہاں سے چلے گئے۔ جاتے وقت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جملہ فرمایا کہ دنیا گدھوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں بھی تم جاؤ گے وہاں تم ہی تم ہو گے، تمہارا ہی غلبہ ہوگا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہم نے تجربہ کیا کہ جہاں گئے، ہم ہی ہم نظر آئے جہاں گئے غالب ہی غالب رہے کیوں کہ حق ہی کو غلبہ ہے۔ "اَلْحَقُّ يَعْلُوْا وَلَا يُعْلٰى" غالبیت کے لئے حق ہے اور مغلوبیت کے لئے باطل ہے۔ بہرحال یہ ہے فضلاءِ دیوبند کی تنظیم جو دراصل خدمات کی تنظیم ہے۔

تنظیم کے فوائد...... دوسرا فائدہ اس میں یہ ہے کہ کچھ خدمات مرکز کی ہیں، کچھ فضلاء کی۔ دونوں کے سامنے خدمات ہیں۔ اس واسطے بھی تنظیم ہونی چاہئے کہ مرکز کو فضلاء کی خدمات کا پتہ لگے اور فضلاء کے سامنے مرکز کی خدمات آتی رہیں۔ اگر فضلاء کو کسی مدد کی ضرورت وحاجت ہو تو ادھر مرکز کو پتہ لگے اور اس کے لئے سوچے اور مرکز کی ضرورتوں کا علم فضلاء کو ہو۔ غرض جانبین سے ایک رابطہ قائم رہے گا۔ ہندوستان میں دیکھا گیا کہ فتنے اٹھتے ہیں، علمی فتنے، عملی فتنے، اور ہر قسم فتنے کے اٹھتے ہیں۔ فضلاءِ دیوبند نے مقامی طور پر ان فتنوں کا مقابلہ کیا اور ان

فتنوں کومغلوب کیا۔مرکز کو پتہ نہیں کہ فضلاء نے کیا خدمات انجام دیں اور فضلاء کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ہم بڑے بڑے کام کررہے ہیں۔لیکن مرکز ہماری خبر نہیں لیتا،ہماری تحسین نہیں کرتا۔تو اس غرض سے تنظیم کا سلسلہ قائم کیا گیا کہ اگر ضرورت پڑے گی تو آپس میں اجتماعی آواز ہوگی،ان کی حمایت میں آواز اٹھے گی یا مرکز کوئی شخص ان کی امداد کے لئے بھیج سکے گا۔جماعتی آواز کا اثر اور طاقت ہوگی،دین کا فائدہ ہوگا،قوم کو فائدہ ہوگا،تو یہ تنظیم خدمات کی ہے افراد کی نہیں۔اس صورت میں خدمات زندہ جاوید رہیں گی۔منظم ہونا قوم کو ہر حیثیت سے مفید رہے گا۔باہمی تعاون جاری رہے گا۔خدمات کا انضباط کیا جاسکے گا کہ کہاں کہاں اور کیا کیا خدمات انجام دی جارہی ہیں۔اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی پیش آئی کہ مختلف چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے دعوے بہت کئے اور کام بہت تھوڑا کیا یا بالکل نہیں کیا،معمولی خدمات مگر نمائش زیادہ۔ہمارے ہاں کام ہوتا ہے۔مگر نہ اخبارات نہ اشتہارات اور دعویٰ یہ لوگ کرتے ہیں کہ ہندوستان کو ہم نے سنبھالا ہے،ہمارے اکابر کے ہاں کام ہے نام نہیں،پروپیگنڈہ نہیں،لوگ چھوٹی چھوٹی خدمات اخبارات میں دیتے ہیں،میں سوچا کرتا ہوں کہ دارالعلوم میں روزانہ جلسے ہوتے ہیں لیکن کسی کو خبر نہیں ہوتی۔جتنے لوگ اشتہارات منصوبوں اور پروگرام کے بعد کسی جلسے میں جمع ہوتے ہیں۔وہاں بلا کسی منصوبہ،آئے دن اتنے لوگ جمع ہوجاتے ہیں۔چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں مگر پروپیگنڈہ بہت ہے،کام کے درجہ میں صفر ہوتے ہیں۔کئی لوگ دارالعلوم کو جاننے والے نہیں کہ کیا خدمات انجام دیں۔اس تنظیم میں ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مرکز میں بھی انبساط ہوگا اور فضلاء کا دل الگ بڑھے گا۔خدمتیں نمایاں ہوکر سامنے آئیں گی اور بھی کئی قسم کے فوائد ہیں۔یہ صورت پیش آئی کہ تنظیم ہونی چاہئے اس کے لئے کئی قواعد وضوابط منضبط کئے گئے۔تنظیم کو صوبہ وار پھر ضلع وار رکھا گیا کہ فضلاءِ دارالعلوم علاقہ وار جمع ہوکر ایک ذمّہ دار مقرر کریں،صدر بنائیں۔سیکرٹری منتخب کریں۔یہ خیال زیادہ اس وجہ سے بھی پیدا ہوا کہ اکابر نے ارادہ کیا۔

اجلاسِ صد سالہ......ایک جلسہ دستار بندی کا بھی ہوجائے۔تقریباً پچاس برس سے جلسۂ دستار بندی نہیں ہوا۔ ۱۳۲۸ھ سے لے کر اب تک درج رجسٹر فضلاء کی تعداد چھ ہزار تک ہے۔ان چھ ہزار علماء کی دستار بندی کرائی جائے۔اس واسطے اشتہارات جاری کئے گئے۔ایک مستقل دفتر قائم کیا گیا کہ اس تنظیم کے نظم ونسق کو سوچیں۔ ترتیب دیں۔اس کے اعلانات جاری کئے گئے تو ملک میں اس کا شہرہ ہوا۔ملک میں اس کا شدید انتظار ہے۔ بیرونِ ملک کے لوگ بھی منتظر ہیں۔کیوں کہ ان میں حجازی بھی ہیں،ایشیا،ساٹرا،ملایا،چینی،ترکستانی،ایسٹ افریقہ،افغانستان کے فضلاء ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔تو ہزاروں کی تعداد میں جب جلسہ ہوگا۔تو ایسی صورت میں گورنمنٹ کے سامنے ویزوں کے لئے درخواست دینی ہوگی۔متعلقہ حکومتوں سے اجازت لینی ہوگی،اس کے ساتھ مصارف کا تخمینہ اور ساتھ ہی ساتھ آمدنی کا اندازہ وغیرہ اہم امور ہیں۔کیوں کہ حاضرین کا اندازہ ڈیڑھ دو لاکھ سے کم نہ ہوگا،پورے ملک میں انتظار ہوگا۔ہم لوگ اس پریشانی میں مبتلا ہیں کہ دیوبند کی آبادی تیس ہزار ہے،

اور اگر دو لاکھ آدمی آجائیں تو اس مختصر آبادی میں کس طرح سا سکیں گے۔ کہاں بسیں گے۔ ہر ایک فاضل کو پگڑی باندھنی ہوگی اور اگر دس روپے فی پگڑی ہو تب بھی پچاس ساٹھ ہزار روپے صرف پگڑیوں کے مصارف ہوں گے اور اگر یہ بھی آسان ہو جائے تو اس کے باندھنے کا مسئلہ ہے۔ کل یہاں (دارالعلوم حقانیہ میں) ۳۰،۳۵ طلبہ کو پگڑی بندھوانی تھی۔ تو بڈھے بزرگ تھک گئے، ہاتھ تھک گئے۔ مگر ختم نہیں ہو رہے تھے۔

تو یہ تقریباً پانچ ہزار پگڑیاں باندھنا آسان کام نہیں۔ کل دستار بندی کے وقت ہمارے مولانا عبدالحنان صاحب (ہزاروی) نے خوب جملہ چسپاں کیا کہ یہ پگڑیاں ہیں۔ یا سوٹہ بازی ہے۔ میں نے کہا کہ: پگڑیاں بھی کلف دار ہیں اور باندھنے والے بھی مکلف ہیں اور پگڑیاں بھی ذرا مکلف ہونی چاہئیں۔ کلف لگا ہوا ہو۔ یہ بھی صورت ہے کہ اس وقت پیچ وخم نہ ہو۔ بلکہ پہلے سے باندھ کر رکھ دی جائیں۔ (یہ جملے حضرت نے مزاحاً فرمائے) خیر ان حالات کی وجہ سے یہ جلسہ ذرا مؤخر کیا گیا۔ مجلس شوریٰ میں یہ بھی بحث میں آیا کہ دارالعلوم کے سو سال پورا کرنے میں ایک سال باقی ہے تو پورا ہونے پر سو سالہ جشن منایا جائے۔ بہر حال منصوبہ ہے، تجویز ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ کی توفیق اور امداد پر منحصر ہے۔

وسائل جمع کرنے کے لئے سوچ رہے ہیں کہ ہند و بیرونِ ہند کے دو ڈھائی لاکھ افراد جمع ہو سکیں اور انعقاد کیا جا سکے۔ یہ تنظیم کی غرض و غایت ہے۔ یہ چند باتیں تنظیم کے بارے میں ذکر کی گئیں، یہاں آج اس مجلس میں اس صوبہ کے فضلاء اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ ان مقاصد پر غور کیا جائے۔ میں تو دیکھ کر خوش ہونے والوں میں ہوں گا۔ اب کام کرنا ان حضرات کو ہوگا۔ کام آپ حضرات ہی کا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

تقریظ

از: حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
(صدر، مہتمم، دارالعلوم دیوبند)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

برادر محترم مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے چند ماہ پیشتر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک معرکتہ الآ راء تقریر کی تھی جسے بعد میں منضبط کر کے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا گیا اور اس کا نام ''سائنس اور اسلام'' رکھا گیا۔

چھپنے سے پہلے برادر ممدوح نے مجھے بھی اس کے مطالعہ کا موقع دیا۔ میں اس مضمون کے مطالعہ سے بے حد محظوظ و مسرور ہوا اور دل سے مولف کے حق میں دعا نکلی۔

یوں تو اس موضوع پر مختلف مذاق کے لوگ سینکڑوں مضامین لکھ چکے ہیں اور لکھتے رہیں گے ہیں گے لیکن یہ مضمون اپنی نوعیت میں نرالا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب مضمون، حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی صرف نسبی اولاد ہی نہیں' ان کے علمی وارث بھی ہیں۔ جدید تعلیم کے اس بڑے مرکز (علی گڑھ) میں صحیح اور موزوں تبلیغی خدمت کا جو گہرا اور خوشنما نقش آپ کی اس تقریر نے چھوڑا، وہ مسلمانوں کی اصلاح کی ایک خوش آئند اور درخشاں علامت ہے۔ حق تعالیٰ ہمارے نو تعلیم یافتہ بھائیوں کو بار بار اس طرح کے افادات سے استفادہ کی توفیق بخشے۔

شبیر احمد عثمانی

۳ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ

تقریظ

از: حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب

(سابق شیخ الادب والفقہ، دارالعلوم دیوبند)

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّ مُسَلِّمًا. اَمَّا بَعْدُ!

اس رسالہ کے اوراق اس مقبول عام تقریر کے حامل ہیں جو عالی جناب مولانا الحاج المولوی محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے ''اسلام اور سائنس'' کے خشک مگر ضروری عنوان پر بمقام علی گڑھ کالج اسٹریچی ہال میں فرمائی تھی۔

خالص علمی اور خشک عنوان پر تقریر اور ایسے شخص کی تقریر جس کو کتب عربیہ کے مطالعہ، عربی طلبہ کے ہجوم میں عربی الفاظ و مصطلحات کی مزاولت سے فرصت ہی نہ ملتی تھی اور وہ بھی ایسے مجمع میں جہاں اس کے برعکس انگریزی زبان اور اس کے محاورات مادری زبان کے حکم میں آ گئے ہوں۔ یقیناً اضداد کے اجتماع کے حکم میں تھی اور اگر ضب (گوہ) اور نون (ماہی) کی ضدیت اور بعد مکانی کا صحیح مشاہدہ ہوسکتا تھا تو یہاں ہونا چاہئے تھا، لیکن بیان کی سلاست، مضامین کے ارتباط اور دقائق علمیہ ظاہرانہ انداز سے روزمرہ کے محاورہ میں ادا کرنے نے ایسا سہل الحصول بنادیا ہے کہ اس کے شروع ہو جانے کے بعد ختم کلام سے پہلے سیری ہی نہیں ہوتی تھی۔

پھر یہی نہیں کہ صرف سائنس اور اسلام کے ہر ہر گوشہ پر مقرر ممدوح نے روشنی ڈال کر اس پتھریلی اور سنگلاخ زمین کو طریقۂ بیضاء بنادیا بلکہ اس کے ساتھ بہت سے دوسرے معارف و دقائق علمی و اسلامی بھی نہایت سہولت کے ساتھ اہل بصیرت اور ارباب نظر کے پیش نظر کر دیئے اور قابل تحسین یہ امر ہے کہ جس جگہ کوئی ایسا دقیقہ علمیہ سمجھانا ہو جس کو سمجھنے کے لئے علوم قدیمہ سے واقفیت، مصطلحات فنونیہ کا تداول شرط تھا یا فی الحقیقت اس میں مقرر کے لئے دلچسپی پیدا کر لینا ضروری تھا تا کہ اذہان میں نشاط پیدا ہو۔ اس کو اگر ایک جگہ معمولی معمولی مثالیں دے کر کالشمس فی نصف النہار کر دیا تو دوسری جگہ ادیبانہ تشبیہات و استعارات، لطائف و ظرائف سے مزین بنا کر ذہن نشین کر دیا۔

پس یقیناً یہ تقریر اگر ایک جانب حقائق اسلامیہ، معارف شرعیہ کا آئینہ ہے تو دوسری طرف ادبی دلچسپیوں کا ذخیرہ بھی ہے ۔

در کفے جام شریعت در کفِ سندانِ عشق ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن

پس اگر یہ امر قابلِ تعجب نہیں کہ مشک ان دماغوں کو معطر کر دیتا ہے جو ماؤف نہ ہوں تو یہ بھی شایان تعجب نہیں کہ نزدیکان بے بصر کے علاوہ تمام قلوب اس تقریر سے مستفید ہوئے اور اگر یہ لائق حیرت نہیں کہ آفتاب افق مشرق سے طلوع کرنے کے بعد اپنے مقابل زمین کے ہر ہر گوشہ کو منور کر دیتا ہے تو یہ بھی موجبِ حیرت نہیں کہ اس تقریر نے مسئلہ مبحوث عنہا کے کسی گوشہ کو روشن کئے بغیر نہ چھوڑا اور اگر یہ صحیح ہے کہ ٹھنڈا اور میٹھا غیرِ مکدّر پانی پیا سوں کی پیاس کا ازالہ اس طرح کر دیتا ہے کہ ان کے رونگٹے رونگٹے سے تشنگی کی اذیت، یبوست کی تکلیف زائل ہو جاتی ہے تو پھر یہ بھی صحیح ہے کہ اس تقریر نے عنوان بالا سے متعلق تشنگان کمال کی تشنگی اسی دلچسپی کے ساتھ زائل کر دی جو پیاسے کو پانی سے ہوتی ہے۔ قاسمی فیضان کی وجہ سے میرے نزدیک تو نہ یہ تقریر قابل تعجب ہے اور نہ مقررِ ممدوح کی دوسری تقریریں یا تالیفات، اگر کسی ناواقف کو تعجب ہو تو وہ جانے اس کا کام۔

عَجِبْتُ فِی الزَّمَانِ مَا عَجِیْبُ   اَتٰی مِنْ الِ سَیَّارِ عَجِیْبًا

محمد اعزاز علی غفرلہ

تقریظ

از: جناب ڈاکٹر محمد زکی الدین صاحب
(شیخ الطبعیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

حضرت الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا نام مسلمانان ہند کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ آپ نے سائنس اور اسلام کے اہم موضوع پر ایک نہایت عالمانہ خطبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمنِ اسلامی تاریخ وتمدن کے سامنے فرمایا، اب وہی خطبہ شائع کیا جارہا ہے تاکہ لوگ اس سے استفادہ حاصل کریں۔

سائنس اور مذہب کی بحث اور فلسفہ اور مذہب کی بحث مدت سے چلی آتی ہے، سائنس اور مادّیات کی وجہ سے مذہب کو (اسلام اور عیسائیت کو خاص طور پر) سخت نقصان پہنچا۔ ساتھ ساتھ علماء کی یہ کوشش رہی کہ ان نقصانات کی تلافی کی جائے۔

ڈریپر نے ایک کتاب سائنس اور مذہب کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کتاب میں اسلام اور سائنس کے متعلق مختلف سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے، علامہ جمال الدین افغانی رحمتہ اللہ علیہ نے پیرس جاکر مشہور ومعروف فلسفی رینان سے بحث کی اور یہ ثابت کردیا کہ اسلام سائنس کی مخالفت نہیں کرتا، اس کے بعد وہ اس موضوع پر کئی مضامین بھی شائع کرچکے ہیں۔ ان کے بعد ان کے شاگرد علامہ محمد عبدہ اور علامہ رشید رضا نے مسلسل اس موضوع پر قلم اٹھایا۔

ہندوستان میں سرسید نے اسلام اور سائنس کے متعلق بہت کچھ لکھا۔ اسلام ریویو میں خواجہ کمال الدین نے بہت سے مضامین شائع کئے۔ مولانا عبدالعلیم صدیقی اور دیگر علماء نے متعدد خطبات اور مضامین اس سلسلہ میں دیئے۔ علماء کی کوشش یہ تھی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ

1 ...... سائنس اسلام کے مخالف نہیں۔

2 ...... جب مسلمان عروج پر تھے تو انہوں نے بہت سی سائنس کی ایجادات کیں، جس سے یہ ثابت کیا گیا کہ سائنس اسلام کی مخالفت نہیں کرتا۔

مصر میں علامہ طنطاوی نے ''تفسیر جواہر'' ۲۲ جلدوں میں شائع کی ہے، اس میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن شریف کی آیتوں کا تعلق سائنس سے دکھایا جائے اور ایک حد تک اس میں علامہ موصوف کو کامیابی بھی ہوئی۔

پچھلی صدی میں یہ ایک شوق پیدا ہو گیا تھا کہ سائنس کے اصولوں اور نظریوں کو قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت ہی فاش غلطی علماء سے سرزد ہوئی، وہ یہ کہ انہوں نے سائنس کے اصولوں اور نظریوں کو ابدی سمجھ لیا اور وہ بالکل بھول گئے کہ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے، سائنس کے نظریوں اور اصولوں کی خامیاں ظاہر ہوتی جاتی ہیں اور اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان میں وقتاً فوقتاً زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں کی جائیں۔ ساتھ ساتھ ہمارا یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآن شریف خدا کا پیغام ہے جو ہمیشہ کے لئے آیا ہے، جو دو متضاد چیزیں ہیں۔

حضرت مولانا کا یہ فاضلانہ خطبہ آپ کے سامنے ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس سے پورے طور پر مستفید ہوں گے اور یہ خطبہ ہمارے ان نوجوان کے لئے جن کے دماغ میں سائنس اور الحاد مترادف ہے، مشعلِ ہدایت ہوگا۔

(زکی الدّین)

سائنس اور اسلام

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـــا بَعْـــدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :لَمَّا خَلَقَ اللّٰہُ الْاَرْضَ جَعَلَتْ تَمِیْدُ فَخَلَقَ الْجِبَالَ فَقَالَ بِھَا عَلَیْھَا فَعَجِبَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ مِنْ شِدَّۃِ الْجِبَالِ، فَقَالُوْا یَارَبِّ! ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْجِبَالِ ؟ قَالَ نَعَمْ :اَلْحَدِیْدُ فَقَالُوْا یَارَبِّ! ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْحَدِیْدِ؟ قَالَ نَعَمْ. اَلنَّارُ......ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ النَّارِقَالَ نَعَمْ! اَلْمَآءُ ......ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْمَآءِ؟قَالَ نَعَمْ: اَلرِّیْحُ فَقَالُوْایَارَبِّ ھَلْ مِنْ خَلْقِکَ شَیْءٌ اَشَدُّ مِنَ الرِّیْحِ؟قَالَ نَعَمْ:اِبْنُ الْاٰدَمَ تَصَدَّقَ صَدَقَۃً یَمِیْنُہٗ یُخْفِیْھَا مِنْ شِمَالِہٖ①

ترجمہ:''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو کانپنے اورڈولنے لگی، تب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا کیا اوران سے زمین پر جم جانے کے لئے فرمایا۔ ملائکہ نے پہاڑوں کی شدت وصلابت پر تعجب کیا اور کہنے لگے کہ اے پروردگار!۔ تیری مخلوق میں کوئی چیز پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا: ہاں لوہا ہے۔اس پر ملائکہ نے عرض کیا اے پروردگار تیری مخلوق میں لوہے سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایاہاں آگ ہے، پھرعرض کرنے لگے کہ الٰہی آپ کی مخلوق میں آگ سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایاہاں پانی ہے۔ پھرانہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں پانی سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایاہاں ہوا ہے۔تو پھر ملائکہ نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں ہوا سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایاہاں، آدم کی اولاد ہے جودائیں ہاتھ سے اس طرح چھپا کر صدقہ کرے کہ بائیں ہاتھ کوبھی خبر نہ ہو''

تمہید......صدرِمحترم بزرگانِ قوم وبرادرانِ عزیز طلبہ! مجھے اس وقت جس موضوع پر تقریر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اس کاعنوان ''سائنس اوراسلام'' ہے۔ مجھے جس طرح اس پر تعجب ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں جس میں ایک

① السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ المعوذتین ج: ۱۱، ص:۲۱۵، رقم:۳۲۱.

مرکزی جگہ پر قوم کے منتخب فضلاء مختلف علوم وفنون کے ماہر اور مخصوص ارباب کمال جمع ہیں، تقریر کے لئے مجھ جیسے بے بضاعت طالب علم اور نا کارۂ علم وعمل کا انتخاب کیا گیا، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بدرجہا زائد اس پر تعجب ہے کہ تقریروں کے اہم موضوعات میں سے اس اہم تر بلکہ مشکل ترین موضوع کو مجھ ناچیز کے سر پر عائد کیا گیا ہے۔ عنوان مذکور حقیقتاً ایک غیر معمولی عنوان ہے جس کے لیے معمولی قابلیت کافی نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ یہ عنوان ''سائنس اور اسلام'' اپنی لفظی حیثیت میں جس قدر سہل اور مختصر ہے، اسی قدر اپنی معنوی وسعت اور وقت کے لحاظ سے طویل اور صعب ترین ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ عنوان تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک سائنس، دوسرے اسلام، تیسرے ایک درمیانی عطف، اس لئے قدرتی طور پر اس کے ماتحت تین امور کی تشریح مقرّر کے ذمہ عائد ہو جاتی ہے۔ ایک سائنس کا مفہوم اور اس کی حقیقت، دوسرے اسلام کا مفہوم اور اس کی حقیقت تیسرے ان دونوں کی باہمی نسبت اور اس کا حاشیتین سے ارتباط اور پھر ایک چوتھی چیز ان تین سے خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ان تین امور کا مقتضی ہے، یعنی اگر سائنس اور اسلام اور ان کی درمیانی نسبت واضح ہو جائے تو یہ ایک واقعہ کا اثبات ہوگا۔ مگر ہر واقعہ محض ایک واقعہ کی حیثیت سے ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ جب تک کہ اس سے کوئی عمل، کوئی حکم اور کوئی طلب نہ پیدا ہو۔ اس لئے چوتھا مقصد یہ ہوگا کہ ان تین ثابت شدہ حقائق کا ہم پر تقاضا کیا ہے اور یہ واقعات ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس تقریر کے موضوع سے تین مقصد پورے ہو جاتے ہیں جن پر اس مضمون کی بنیاد ہوگی اور سائنس اور اسلام کی حقیقت سائنس اور اسلام کی درمیانی نسبت اور اسلام اور سائنس سے پیدا شدہ موعظت۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں امور جس قدر اہم ہیں اسی قدر میری نسبت سے صعب اور مشکل ہیں، کیونکہ اول تو اسلامی حقائق ومقاصد ہی پر سیر حاصل روشنی ڈالنا ایک بے مایہ طالب علم کے لئے یقیناً دشوار گزار ہے۔ تاہم اگر اس حیثیت سے کہ مجھے علماء کی ایک مرکزی جماعت (علماء دارالعلوم دیوبند) کی جوتیوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور ''هم القوم لايشقى جليسهم'' کے قاعدے کے مطابق میں کوئی ایک آدھ جملہ اسلام کے مقاصد کے متعلق کہہ بھی دوں تو بہر حال سائنس تو میرے لئے ہر صورت میں ایک نئی چیز اور اجنبی ہے، نہ میں اس کے اصول سے واقف ہوں نہ فروع سے باخبر اور نہ فنی حیثیت سے مجھے اس کے مبادی اور مقاصد سے کوئی تعارف حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ جملہ کے اطراف میں سے اگر ایک طرف بھی گوشۂ چشم سے ایک طرف رہ جائے تو طرفین کی درمیانی نسبت پر روشنی ڈالنا کس قدر مشکل ہے؟ تاہم جب کہ ایک محترم جماعت کی طرف سے مجھے مامور کیا گیا تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ من اللہ ایک طلب ہے، اس لئے غیبی امداد کی توقع پر جرات ہوتی ہے کہ عنوان زیرِ نظر پر اپنی بساط کے موافق کچھ کلام کروں اور سامعین سے اپنی اغلاط کے سلسلہ میں عفو ومسامحت کی درخواست کر کے امیدوارِ تسامح رہوں۔

حضرات! اس وقت جو حدیث میں نے تلاوت کی ہے وہ عنوانِ مذکورہ کی تینوں جہات پر انتہائی جامعیت کے ساتھ حاوی ہے اور اس میں میرے علم وفہم کے مطابق پہلے سائنس کی جوہری حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی

ہے کہ گویا اس کا مغز اور لبِ لباب کھول کر سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اسلام کی اصلیت واشگاف فرمائی گئی اور پھر ان دونوں چیزوں کی باہمی نسبت اس انداز سے آشکارا کی گئی ہے۔ جس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے مقصودیت کی شان کس کو حاصل ہے اور وسیلہ محض ہونے کی کس کو؟ اور پھر یہ کہ اس وسیلہ سے اس کے مقصود کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور پھر حصول مقصد کے بعد اس پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں جن کی توقع پر تحصیل مطلوب کی سعی کی جائے۔

ہاں مگر حدیثی حقائق کھولنے سے پیشتر مناسب ہے کہ میں سائنس کا موضوع متعین کر دوں تا کہ اس پر انضباط کے ساتھ بحث کی جا سکے مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض کیے دیتا ہوں کہ فنِ سائنس کے موضوع کی تعیین فن کی حیثیت سے میری قدرت میں اس لئے نہیں کہ میں نے اس فن کی تعلیم نہیں پائی۔ البتہ اس کے مشہور اور زبان زد آثار کو سامنے رکھ کر اپنی ذہنی سعی سے سائنس کا جو کچھ موضوع متعین کر سکتا ہوں، اسی کو عرض کروں گا، مجھے امید ہے کہ اگر میں اس میں غلطی کروں گا تو اس مرکز کے اہلِ فن اور سائنس دان استاذ مجھے اس غلطی پر قائم نہ رہنے دیں گے۔

فنِ سائنس کا موضوع..... حضرات! اس دورِ ترقی میں جب تمدنی ایجادات اور مادّیات کے نئے نئے انکشافات کا چرچا ہوتا ہے تو بطور تکملہ سائنس کا ذکر بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ دورِ حاضر نے اپنی اعجازی کروٹ سے دنیا کو دیوانہ بنا دیا۔ مثلاً وسائل خبر رسانی کے سلسلہ میں ٹیلی فون اور ٹیلی گراف سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، ریڈیو اور لاسلکی اور دوسرے ایسے ہی برقی آلات سے عالم کو مبہوت کر دیا تو ساتھ ساتھ سائنس کا ذکر بھی ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کے سنہری آثار ہیں، یا مثلاً وسائل نقل وحرکت کے سلسلہ میں جب ریل، موٹر، ہوائی جہاز اور دوسری بادپا سواریوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ساتھ ہی سائنس کا نام بھی لیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کا طفیل ہے یا مثلاً صنائع وحرفت کے سلسلہ میں لوہے لکڑی کے خوشنما اور عجیب وغریب سامان تعمیرات کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے، سیمنٹ اور اس کے ڈھلاؤ کی نئی نئی ترکیبیں اور انجینئری کی نئی سے نئی اختراعات جب سامنے آتے ہیں تو سائنس کا نظر فریب چہرہ بھی سامنے کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب اسی کے خم ابرو کی کارگزاریاں ہیں، اس طرح نباتاتی لائن میں زراعتی ترقیات، پھل اور پھول کی افزائش کے جدید طریقے اور نباتات کے نئے نئے آثار وخواص کے متعلق انکشافات کا نام جب لیا جاتا ہے تو وہیں سائنس کا نام بھی پورے احترام کے ساتھ زبانوں پر آ جاتا ہے۔

اسی طرح حیوانی نفوس میں مختلف تاثیرات پہنچانے کے ترقی یافتہ وسائل اور آپریشنوں کی عجیب وغریب پھرتیلی صورتیں، کیمیاوی طریق پر فنِ دواسازی کی حیرتناک ترقی، تحلیل وترکیب کی محیرّ العقول تدبیریں بجلی کے ذریعے معالجات کی صورتیں جب زبانوں پر آتی ہیں تو ساتھ ہی انتہائی وقعت کے ساتھ سائنس کا نام بھی زبان زد ہوتا ہے کہ یہ سب اسی کے درخشندہ آثار ہیں۔ اس سے میری ناقص عقل نے مجھے اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ موضوعِ عمل موالید ثلاثہ جمادات، نباتات اور حیوانات کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔

پھر چونکہ ان ہر سہ موالید کی ترکیب عناصر اربعہ آگ، پانی، ہوا، مٹی سے ہوتی ہے جو تقریباً ایک مسلمہ چیز ہے اور اس کے لئے اس پر کسی استدلال کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے گویا سائنس کا موضوع بلحاظِ حقیقت عناصرِ اربعہ ٹھہر جاتے ہیں۔ جن کی خاصیت اور آثار کا علماً سمجھنا اور پھیر کیمیاوی طریق پر ان کی تحلیل و ترکیب کے تجربات سے عملاً نئی نئی اشیاء کو پردہ ظہور پر لاتے رہنا، سائنس کا مخصوص دائرۂ علم وعمل ہو جاتا ہے، پس سائنس کی یہ تمام رنگ برنگ تعمیریں درحقیقت انہیں چار ستونوں (عناصر اربعہ) پر کھڑی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اگر اس تفصیلی حقیقت کا مختصر عنوان میں خلاصہ کیا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ سائنس کا موضوع ''مادّہ اور اس کے عوارضِ ذاتیہ'' سے بحث کرنا ہے اور بس، جو بھی مادّیات میں زیادہ سے زیادہ منہمک رہ کر ان کے خواص و آثار سے کام لینے والا ثابت ہوگا، وہی سب سے بڑا سائنس دان اور بہترین ماہرِ سائنس کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

موضوع متعین ہو جانے کے بعد اب سائنس کے اس چو رنگ مادہ، آگ، پانی، ہوا، مٹی پر جس کا مرتب بیان حدیثِ زیبِ عنوان میں کیا گیا ہے ایک ذرا سا غور فرمائیے تو محسوس ہوگا کہ:

عناصر کی قوتوں کا باہمی تفاوت اور اس کا اصولی معیار...... ان چاروں عنصروں کے خواص وآثار اور ذاتی عوارض یکساں نہیں بلکہ کافی حد تک متفاوت ہیں اور نہ صرف عوارض وآثار ہی میں تفاوت ہے بلکہ خود ان کی جوہری طاقتیں بھی ایک درجہ کی نہیں ہیں۔ ان میں کوئی عنصر ضعیف ہے، کوئی قوی، کوئی قوی تر اور کوئی اقوی تر ہے۔ اور پھر یہ قوت وضعف کا تفاوت بھی بے جوڑ یا اتفاقی نہیں، بلکہ معیاری ہے، وہ معیار یہ ہے کہ ان عناصر میں سے جس میں بھی لطافت بڑھتی گئی ہے، اسی قدر اس کی طاقت بھی بڑھتی ہے اور پھر طاقت ہی کے اندازہ سے اس میں غلبہ وتسلط اور اقتدار کی شان قائم ہوتی گئی ہے اور جس حد تک لطافت کم ہو کر کثافت کے لئے جگہ خالی کرتی گئی ہے، اسی قدر اس عنصر میں کمزوری آتی گئی ہے، پھر کمزوری کی قدر اس میں بے بسی، مغلوبیت اور ذلّت وپستی بھی نمایاں ہوتی گئی ہے۔

راز اس کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ لطافت ایک وصف کمال ہے جو کثافت کی ضد ہے اور ہر وجودی کمال کا مخزن حضرت واجب الوجود کی ذاتِ بابرکات ہے۔ اس لئے لطافتوں کا منبع بھی وہی ہے اور اسی قاعدہ سے بوجہ لطافت طاقتوں کا منبع بھی وہی ہے۔ چنانچہ اس کی بے انتہا لطافت کا عالم تو یہ ہے کہ آنکھوں سے اوجھل، حواس وخیال کی حدود سے بالاتر اور ادراک وانکشاف کی حد بندیوں سے وراء الوراء ہے، پھر ان کی بے انتہائی طاقت کا کرشمہ یہ ہے کہ تمام جہانوں پر اپنی اور صرف اپنی شہنشاہی کا نظام محکم کئے ہوئے ہے۔ اس لئے جس چیز میں بھی لطافت کا کوئی کرشمہ ہے وہ درحقیقت اسی کی ذات وصفات کا کوئی پَرتو ہے۔ جس کا اثر بقدر استعداد اس نے قبول کرلیا ہے اور جب کہ قبولِ اثر بغیر کسی مناسبت کے نہیں ہوتا، اس لئے یہ کہا جانا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ ہر لطیف شئی کو بقدرِ لطافت حق تعالیٰ سے مناسبت ہے اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی کسی چیز کو ذاتِ بابرکات کے ساتھ قرب وتناسب قائم ہوگا وہ اسی قدر قوی، غالب اور بااقتدار بنتی جائے گی، ادھر کثائف کو اس کی ذات سے بے انتہا بُعد اور بیگانگی

ہے کہ وہاں کثافت کا نشان نہیں۔ اس لئے جو چیز بھی بقدر کثافت اس لطیف وخبیر سے دور پڑتی جائے گی، اسی وجہ سے پست ومغلوب اور ذلیل ہوتی جائے گی اور اس میں سے غلبہ واستیلاء کی شان نکلتی جائے گی۔ بلکہ اسی طرح جس طرح پانی سے کوئی چیز قریب۔ جائے تو اس میں پانی کے آثارِ برودت ورقت وغیرہ سرایت کرتے چلے جائیں گے۔ آگ سے قریب ہو جائے تو حرارت وسخونت وغیرہ آثار راسخ ہو جائیں۔ مٹی سے قریب ہو جائے تو یبوست اور خشکی کے آثار گھر کر جائیں۔

اسی طرح جو چیز کسی وصف کے ذریعہ بھی ذاتِ بابرکاتِ حق سے قرب ومناسبت پیدا کرلے گی۔ وہ اسی حد تک بقدرِ استعداد شئونِ ربانی اور صفاتِ کمالیہ کا مرکز ومحور بنتی چلی جائے گی اور ضرور ہے کہ اس میں استیلاء واستغناء کا ظہور ہوا اور وہ قوی تر، غالب تر اور رفیع المنزلت ہوتی جائے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ حسیات میں قرب بھی حسی ہوتا ہے اور آثارِ قرب بھی محسوس طریق پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر اس کی بارگاہِ رفیع میں حس کی رسائی نہیں، اس لئے اس کا قرب بھی حسی ہونے کی بجائے دمعنی ہوتا ہے، یعنی جو چیز اخلاق واوصاف کے لحاظ سے قرب ومناسبت کا درجہ حاصل کرلے گی وہی اس کے کمالات سے بقدرِ استعداد حصہ پانے لگے گی اور اسی حد تک غلبہ وتسلط اور استغناء واستیلاء اس کے حصہ میں آجائے گا۔

عنصرِ خاک...... اس معیار کے ماتحت جب ہم عناصرِ اربعہ پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے زیادہ کثیف عنصر ''مٹی'' نظر آتا ہے، جس کا مخزن یہ زمین ہے، یہ خاک کا ڈھیر کثیف ہی نہیں بلکہ کثافت آور بھی ہے۔ ساری چیزوں میں اگر کثافت وغلاظت آتی ہے تو اس مٹی ہی کی بدولت آتی ہے، آگ نے آج تک کسی چیز کو گندہ اور غلیظ نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آگ پر پکانے کی وجہ سے کسی چیز میں غلظت آجائے۔ سو یہ غلظت آگ میں سے نہیں آتی بلکہ آگ اس شے کا جوہرِ لطیف کھینچ لیتی ہے جس سے اس کا اصل مادّہ غلیظہ باقی رہ کر نمایاں ہو جاتا ہے اور شے غلیظ معلوم ہونے لگتی ہے، سو آگ اس میں کوئی چیز ڈالتی نہیں بلکہ اس سے کچھ نکال لیتی ہے، پس یہ غلظت آگ میں سے نکل کر نہیں آتی بلکہ خود اس شے کی ذات سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے، جب کہ آگ اس کا جوہرِ لطیف کھینچ لیتی ہے، اسی طرح پانی کسی چیز کو مکدّر اور غلیظ نہیں بناتا بلکہ اس کی بدولت تو غلاظتیں اور کدورتیں صاف کی جاتی ہیں کہ اس کی اصلیت پاکی اور پاکبازی ہے۔

اسی طرح ہوا بھی کسی چیز کو مکدر اور گندہ نہیں کرتی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہوا میں غیر محسوس طریقہ پر اجزاءِ ارضیہ ملے ہوئے چلے آئیں اور کسی شے کو مکدّر بنادیں تو پھر یہ کدورت بھی زمین ہی کا فیض ہوگا نہ کہ ہوا کا۔ اس لئے انجام کار ساری کثافتوں کی جڑ یہ خاک دھول بنتی ہے۔ جس کو لطافت سے دور کی بھی کوئی مناسبت نہیں۔ اس لئے عام عناصر میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ آپ ساری ہی زمین کے اس طویل وعریض کرہ کو لے لیجئے، اس میں بجز پامالی اور ذلت ومسکنت کے اور کوئی جوہر دکھائی نہیں دے گا۔ یہ زمین رات دن روندی جاتی ہے۔ مگر ذلت و

پستی کا یہ عالم ہے کہ چوں تک نہیں کرسکتی، نہ اس میں ادراک ہے، نہ احساس، نہ غلبہ ہے، نہ اقتدار، اگر غلبہ ہے تو دوسرے تمام عناصر کا خود اسی پر ہے۔ گویا سارے ہی عناصر کا قدم اس کے سر پر ہے اور ہر ایک عنصر کا یہ کھلونا ہے، ہوا اسے اڑائے پھرتی ہے، پانی اسے بہائے پھرتا ہے، آگ اسے جھلستی رہتی ہے مگر یہ ذرا بھی زور نہیں دکھا سکتی کہ زور ہو تو دکھائے۔ طاقتیں تو اس کی کثافتِ مطلقہ نے سلب کر رکھی ہیں، زور آئے تو کہاں سے آئے؟ پھر فقدانِ لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس کا مادہ بھی کثیف اور صورت بھی کثیف، اسے کتنا ہی صیقل کرو، مگر سطح پھر بھی کِرکِری ہی رہے گی۔ نہ چکناہٹ قبول کرے گی نہ چمکاہٹ۔ پھر نہ صرف کثیف المادہ اور کثیف الصورت ہی ہے، بلکہ کثیف الطبع بھی ہے، ایک ڈھیلے کو کتنا ہی زور سے اوپر پھینکو۔ جب تک پھینکنے والے کا عارضی زور اس کے ساتھ رہے گا، وہ اونچا ہوتا جائے گا۔ لیکن جب اس کی اصلی حالت اور عرضی طبیعت عود کرے گی تو پھر نیچے ہی آپڑے گا۔ بہر حال جب کہ زمین کے مادّہ صورت اور طبیعت میں کسی جہت سے بھی لطافت نہیں، گویا اسے ذاتِ اقدس سے اس وصف میں بُعد مطلق حاصل ہے تو ضعفِ مطلق اور ذلتِ مطلقہ بھی اسی عنصر کے حصہ میں آنی چاہئے تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے زمین کو ذلیل ہی نہیں، بلکہ ذلول فرمایا ہے، جو ذلت کا مبالغہ ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا﴾ ① ہاں اس زمین کا ایک جزء پہاڑ بھی ہیں جن کی مٹی یعنی ریت نے بہ نسبت غبار کے کچھ لطافت و ستھرائی قبول کرکے کدورت و کثافت سے قدرے بُعد پیدا کرلیا، تو اس کی شان اسی حد تک مٹی سے فائق ہوگئی۔ چنانچہ خشک ریت کو اگر جھاڑ دو تو بکھر جاتی ہے۔ پانی ڈالو تو کیچڑ نہیں بنتا۔ اس کے ذرّات کو دیکھو تو چمک بھی اٹھتے ہیں۔ اس پر نظر ڈالو، خاک کی بہ نسبت نظر فریب بھی ہے۔

حتی کہ بعض اوقات اس کی صاف ستھری صورت اور اس کی آب و تاب دیکھ کر پانی اور دریا کا بھی شبہ ہو جاتا ہے، غرض جس حد تک اس میں لطافت و ستھرائی آئی تھی۔ اسی حد تک وہ بہ نسبت غبار کے عزیز الوجود بھی ہوگیا۔ اس کی قدر و قیمت بھی بڑھ گئی اور پھر اس کی ترکیب سے اگر پتھر اور پتھروں کی ترکیب سے پہاڑ بنے تو ان کی عظمت و شان اور قدر و قیمت زمین کی سطح سے کہیں دوبالا ہوگی۔ چناں چہ مٹی کی نسبت سے پتھروں کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلوں بلکہ مٹی کی پختہ سے پختہ اینٹوں کو ایک پتھر سے چکنا چور کر دیا جاسکتا ہے لیکن مٹی کے تودے پتھروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اگر پہاڑ کی کوئی چٹان زمین پر آگرے تو زمین دہل جاتی ہے اور دب جاتی ہے اور اس میں گہرا غار قائم ہو جاتا ہے، لیکن اس کے برخلاف مٹی کا منوں ڈھیر بھی اگر کسی سنگین چٹان پر آپڑے تو اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ اسے شکستہ بنائے، نہ وہ ہلتی ہے نہ اس میں غار پڑتا ہے، پھر انہیں پتھروں میں بھی جوں جوں صفائی ستھرائی اور جلا بڑھتی جاتی ہے ان کی قیمت اور معنوی طاقت بھی ترقی کرتی جاتی ہے۔ سنگِ خارا عام

① پارہ: ۲۹ سورۃ الملک الآیۃ: ۱۵.

پتھروں سے قیمتی، سنگِ مرمر اس سے زیادہ قیمتی، جو ہرات اور لعل و یاقوت اس سے زیادہ قیمتی ہیرا اس سے قیمتی، فرق ہے تو وہی لطافت و کثافت اور غلاظت وصفائی کا ہے، زمین کی سطح تو اس حد تک کثیف تھی کہ اسے کتنا ہی صیقل کرو لیکن ہاتھ پھیرنے سے کامل چکناہٹ بھی محسوس نہیں ہو سکتی۔ لیکن پتھروں میں بوجہ لطافت مادہ یہ قابلیت ضرور ہے کہ اگر انہیں صیقل کرو تو مسکہ کی طرح املس اور چکنے ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض میں چمک پیدا ہو جاتی ہے اور بعض جھٹملا سا عکس بھی دکھلانے لگتے ہیں۔ پس پتھروں نے جس حد تک صفائی قبول کی، اسی حد تک ان میں شدت وقوت پیدا ہوگئی، بہر حال پہاڑ اور ان کا مادّہ بہ نسبت زمین اور اس کے غبار کے لطیف ہے اس لئے طاقتور بھی ہے اور زمین سے کہیں زیادہ شدت وصلابت اور قوت کا مالک ہے، پس وجۂ شدت وقوت وہی لطافت وستھرائی نکل آئی ہے۔

لیکن پہاڑ اور ان کے شدید القویٰ پتھر جن کی شدت کے سامنے زمین تھرتھرا بھی نہیں سکتی تھی اور پامال محض تھی، اسی وقت تک شدید ہیں جب کہ زمین کی خاک دھول سے ان کا مقابلہ ہوتا رہے، لیکن اگر کہیں پہاڑوں کی ان شدید و مدید چٹانوں کا سامنا لوہے سے ہو جائے تو پھر ان کی یہ ساری سنگدلی ہوا ہو جاتی ہے۔ لوہے کی ایک بالشت بھر کدال بڑی بڑی چٹانوں کا منٹوں میں فیصلہ کر دیتی ہے۔ وزنی وزنی پتھروں کو چکنا چور ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ریل کی پٹریوں پر یہ دوطرفہ لاکھوں من پتھروں کے ڈھیر انہی پہاڑی پتھروں کے جگر پارے ہوتے ہیں۔ جو چھوٹی چھوٹی کدالوں کی برکت سے مٹی اور لائن دبانے کی خدمت پر لگا دیئے گئے اور اپنی بے انتہا رفعت سے گر کر اس بے انتہا پستی پر آ ئے تھے۔ ان پتھروں پر لوہے کی کدالیں اس طرح پڑتی ہیں، جیسے ایک بے دست و پا قیدی کے سر پر کوڑے اور بید پڑتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اس سے صاف واضح ہے کہ لوہا پتھروں سے زیادہ شدید اور طاقتور ہے۔ کیوں؟ راز اس کا بھی وہی لطافت ہے لوہے کے اجزا نے خلقی طور پر پتھروں کے ریت سے زیادہ صفائی اور ستھرائی قبول کی ہے اور اس میں مٹی تو کیا ریت جیسی بھی کثافت نہیں ہے۔

لوہے کا برادہ اڑتا نہیں پھرتا کہ چیزوں کو آلودہ کردے، ریت اگر پانی میں بھی پڑ جاتا ہے تو بہر حال اسے کسی نہ کسی حد تک مکدّر کر دیتا ہے کہ آخر کار خاک ہی ہے۔ مگر لوہے کے اجزاء اگر برادہ کر کے بھی پانی میں ڈال دیئے جائیں تب بھی اس کی جلا اور رقت وسیلان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر لوہے پر پالش کردی جائی تو چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے بلکہ اسے صیقل کردو تو آئینہ بن جاتا ہے جو باریک سے باریک خدوخال تک کا عکس دکھلانے لگتا ہے، لیکن پتھر میں نہ ایسی پالش قبول کرنے کی استعداد ہے اور نہ وہ اس طرح کے صیقل ہونے کی صلاحیت ہی اپنے اندر رکھتا ہے۔ پس اگر پتھر منجمد ہو کر اشیاء کی ذات کا سراپا کسی حد تک نمایاں کرسکتا تھا تو لوہا اس سراپا کی تمام باریک سے باریک خوبیاں بھی عیاں کرسکتا ہے۔ اس لئے لوہے کی لطافت پتھروں سے کہیں زیادہ نکلی۔ بس اسی لطافت کی بنا پر لوہا تو پتھروں پر گراں اور طاقتور ہے اور پتھر اپنی کثافت کی بنا پر اس کے سامنے ذلیل وخوار ہے۔ بس بڑے سے بڑا پہاڑ بھی اپنی اس نمایاں عظمت وہیبت کے باوجود ذرا سے لوہے کے سامنے اپنے عجز کو نہیں چھپا سکتا۔

عنصرِ آتش..... لیکن یہی طاقتور لوہا جس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا بڑے بڑے پہاڑوں نے لوہا مان رکھا ہے۔ جب ہی تک طاقتور ہے جب تک کہ پتھروں کے سر پر ہے، لیکن اگر اسی لوہے کو کہیں آگ چھو جائے یا لوہے کا بڑے سے بڑا ٹکڑا کسی لوہار کی بھٹی میں پہنچ جائے تو اس کا رنگ روپ متغیر اور چہرہ فق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی صورتِ نوعیہ اور ذاتی خاصیت تک کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ آگ اس کے جگر تک گھس کر اسے ہم رنگِ آتش بنا کر ڈالتی ہے، پھر اس غریب لوہے کو آگ کی بھٹی سے تھوڑی دیر اور نہ چھڑایا جائے تو آگ اسے گلا کر پانی کی طرح بہا دیتی ہے اور اس کی شدت وصلابت کی کچھ بھی پیش نہیں جاتی۔ کوئی اب اس لوہے سے کہے کہ پہاڑ کی ایک چھوٹی سے چھوٹی ٹکڑی کا ہی سر کچل دے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آگ لوہے سے بھی زیادہ شدید اور طاقتور ہے۔ غور کرو تو اس کا راز بھی وہی عقلی اور طبعی اصول ہے کہ آگ میں لوہے سے بھی زیادہ لطافت موجود ہے اور لوہا اس کے مقابلے میں کثیف ہے، لوہے میں اگر اتنی لطافت تھی کہ وہ باوجود پتھروں کی طرح کثیف المادّہ ہونے کے عوارض کے سبب رقت وسیلان قبول کر لیتا تھا تو آگ اپنی ذات سے کوئی ٹھوس جسم نہیں رکھتی، جس میں کوئی چیز گھس نہ سکے۔ ادھر تو ہر چیز آگ کے جگر میں گھس سکتی ہے اور ادھر آگ بھی ہر چیز کے جگر تک میں سرایت کر جاتی ہے، جس کی صلاحیت لوہے میں نہیں پھر لوہا اگر کسی وقت چمک کر باہر سے نورانی شعاعیں قبول کر لیتا تھا تو آگ کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس میں خود بخود شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ یعنی لوہا دوسروں کی روشنی قبول کرتا ہے اور آگ اپنی روشنی خود دوسروں پر ڈالتی ہے۔ خود بھی روشن ہے اور دوسری تاریک چیزوں کو بھی روشن کر سکتی ہے، پھر صیقل شدہ لطیف لوہا جسے آئینہ کہتے ہیں اس لطافت صورت کے باوجود پھر بھی اتنا ثقیل الجسم اور کثیف المادّہ ہے کہ اگر اس پر ہاتھ مارو تو اس کے متکاثف جسم سے ہاتھ ٹکرا کر واپس آجاتا ہے، لیکن آگ کی جسمانی لطافت کا عالم یہ ہے کہ اس کے جسم میں سے ہاتھ آر پار نکل جاتا ہے اور پھر اس کا جسم بھی نہیں ٹوٹتا، پھر صیقل شدہ لوہا تو صرف عکس ہی قبول کرتا ہے لیکن آگ اصلی جسم ہی کو قبول کر لیتی ہے اور پھر بھی اس کے جسم میں پھٹن نہیں پائی جاتی اور وہ کسی دوسرے جسم کے تداخل سے مانع نہیں ہوتی، اس لئے وہ لوہے سے زیادہ شدید اور زیادہ طاقتور ہے بلکہ اسی لطافت کی حد تک اس کا حلقۂ اثر بھی کثیف اشیاء کی نسبت وسیع ہوتا گیا ہے۔ پتھر اور لوہا جہاں رکھا ہوا ہے اتنی ہی جگہ اس سے پر ہو جاتی ہے اور اس حد سے باہر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن آگ جس مکان میں ہے اس سے باہر تک اس کے اثراتِ نورانیت وحرارت پہنچتے ہیں۔ اور اگر آگ اور اس کا مکان نگاہوں سے اوجھل بھی ہو تب بھی اس کے پھیلنے والے آثار اس کے وجود کی خبریں دور دور تک پھیلاتے رہتے ہیں۔ اس لئے آگ لوہے پر غالب ہے اور اسے فنا کے گھاٹ اتار ڈالتی ہے۔

عنصرِ آب..... لیکن یہی دہکتی ہوئی آگ اور اس کا یہ کر دفر جب ہی قائم ہے جب تک اس کے آس پاس کہیں پانی کا نشان نہ ہو۔ اگر پانی کے چند قطرات بھی اس پر آ گریں تو آگ کی چمک دمک اور یہ تعلّی وترفّع سر نیچا ہی نہیں

کرتی بلکہ سب ختم ہو جاتی ہے۔ پانی اس کے وجود ہی کو باقی نہیں چھوڑتا کہ وہ کچھ ابھر سکے۔ بلکہ جس لکڑی کو کچھ دیر آگ سے اپنی جان بچانا ہے وہ پانی کی چادر اوڑھ لے یا نمناک ہی ہو جائے۔ آگ چمک مار کر رہ جائے گی لیکن اس کا گیلی لکڑی پر کوئی بس نہ چلے گا۔

بہر حال جہاں پانی موجود ہو، آگ کے پر نہیں جم سکتے۔ خواہ پانی آگ پر چھڑک دو یا آگ پانی میں گرادو، آگ کی خیر نہیں رہتی۔ بڑے سے بڑا انگارہ پانی پر گرادو تو اس کے گرتے ہی پانی ادھر ادھر ہٹ جائے گا اور پھر اچانک چاروں طرف سے سمٹ کر اس انگارے کو دبوچے گا تو وہ غریب روسیاہ ہو کر رہ جائے گا۔

غرض یہ اس کے سامنے آئے یا وہ اس کا سامنا کرے، ہر صورت میں پانی کی طاقت کے سامنے آگ کی شعلہ زنی کچھ کارگر نہیں ہوتی۔ جس سے پانی کی شدت و طاقت آگ پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن اس غلبہ و مغلوبیت کی روح یہاں بھی وہی اصول ہے جس کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں، آگ اپنی لطافتِ جسم کے سبب کسی شے کی ذات کو اپنے اندر کھپا لیتی تھی، لیکن اس کا چہرہ اتنا صاف نہ تھا کہ اشیاء کا عکس قبول کر سکے۔ مگر پانی عکس اور اصل دونوں کو اپنے اندر کھپا لیتا ہے کہ وہ فقط لطیف المادہ ہی نہیں بلکہ لطیف الصورت بھی ہے۔

یعنی کچھ بھی اس میں ڈال دو، ہر چیز اس کے قعر اور جگر میں سما جائے گی۔ پھر اس رقّت وسیلان کے باوجود اس کا چہرہ یا سطح اس قدر صاف اور شفاف ہے کہ آئینہ کی طرح صورت بھی دکھلا سکتا ہے۔ پانی کی یہ صفت کہ ہر چیز اس کے آر پار نکل جاتی ہے، گو آگ کو بھی میسر ہے۔ لیکن پانی کا کمال لطافت یہ ہے کہ نگاہ تک بھی اس سے پار ہو جاتی ہے۔ جو آگ میں ممکن نہیں۔ پس پانی لوہے کی تصویر کشی اور آگ کے عدم تکاثف دونوں لطافتوں کا جامع ہے، اس لئے اس کی قوت بھی آگ اور لوہے کی قوت سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تو آگ اور لوہے دونوں کو ختم کر سکتا ہے، لیکن یہ دونوں اس پر غالب نہیں آسکتے اور اسی لئے پانی کا حلقۂ اثر بھی آگ سے زیادہ وسیع ہے۔ آگ کا اثر اگر اسے کسی بند اور محدود مکان میں روشن کیا جائے، اسی مکان کی چہار دیواری تک محدود ہوگا۔ لیکن پانی جس مکان میں مسدود ہے، اس سے باہر بھی دور دور تک نمی اور طوبت کے آثار پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ شہر کے ارد گرد تالاب اور نہریں ہوتی ہیں، تو آب وہوا ہی نہیں، لوگوں کے مزاج تک مرطوب ہو جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب اس کی لطافت اور سرعتِ نفوذ کے کرشمے ہیں، لوہا اور آگ مسامات میں نہیں گھستے، لیکن پانی بوجہ لطافت خاص باریک سے باریک منفذ میں گھر کر لیتا ہے اور جب کہ غلبہ و طاقت بقدرِ لطافت ہے تو پانی کی طاقت بھی بلاشبہ آگ سے کہیں بڑھ کر رہی۔

عنصر ہوا...... اب آگے چلو، یہی پانی جو آگ کو تہس نہس کر دیتا ہے، ہوا کے سامنے یہ مسکین بھی عاجز اور ناتواں ہے اور اس کی کچھ پیش بھی نہیں جاتی وہ چلتی ہوا میں اگر سکون سے رہنا چاہے تو نہیں رہ سکتا۔ ہوا کے جھکڑ جب چلتے ہیں تو تالاب اور جھیلیں ہی نہیں بڑے بڑے سمندر تہہ و بالا ہو جاتے ہیں۔ پانی کی موجیں بلکہ موجوں کی موجیں

ایک دوسرے پر گرتی پھرتی پڑتی ہیں۔ سمندر کے عظیم الشان کرہ کو بایں عظمت و ہیبت قرار نہیں ہوتا۔ ٹھہرا ہوا پانی ہو تو ہوا اسے خشک کر ڈالتی ہے اور اڑا دیتی ہے۔ اگر پانی کا کوئی مخزن ومنبع نہ ہو جو اس کی مدد کرے، تو پانی کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہوا پانی پر بھی غالب اور حکمران ہے، وجہ وہی اصول ہے کہ ہوا سب عناصر سے بڑھ کر لطیف وشفاف ہے چنانچہ اس کی جسمانی لطافت کا تو یہ عالم ہے کہ نگاہ جیسی لطیف چیز بھی اس کی لطافت کے سامنے لطیف ہے، جو اس پر جم نہیں سکتی اور ہوا کو دیکھ نہیں سکتی۔ بدن کو لگ کر گو ہوا محسوس ہو جائے جس سے اس کے جسم ہونے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اور کوئی لطیف سے لطیف حاسہ حتی کہ تارِ نگاہ بھی جو الطف ترین اجسام ہے، نہ اس میں نفوذ کر سکتا ہے، نہ اس کا ادراک ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہوا اپنی شدتِ لطافت کے سبب رنگ وروپ کو بھی قبول نہیں کرتی. کہ یہ چیزیں بہر حال نگاہ و بصر ہی سے متعلق ہیں اور وہ بصر ہی کو قبول نہیں کرتی، تو محسوساتِ بصر تک کیا نوبت پہنچ سکتی ہے۔ ہاں آواز اور خوشبو جیسی لطیف اشیاء جن کی نہ کوئی حسی شکل ہے نہ ہیئت، ہوا سے ساز کر لیتی ہے اور اپنی لطافت کی بدولت ہوا میں سما جاتی ہے۔ جنہیں ہوا قبول کر کے ادھر سے ادھر منتقل کر دیتی ہے۔

پھر اثر کا یہ عالم ہے کہ فوق وتحت کے گوشہ گوشہ اور ایک ایک منفاد میں موجود، جہاں آگ کی روشنی اور پانی کی نمی نہیں پہنچ سکتی، وہاں ہوا قائم اور دائم ہے، ذرا بھی کہیں خلا پیدا ہو جائے تو ہوا کو آتے دیر نہیں لگتی، پانی کو بھی لاؤ تو نالی بناؤ، نشیب پیدا کرو اور پھر بھی اس کی نقل وحرکت میں تدریج۔ لیکن ہوا کو نہ نشیب کی ضرورت نہ فراز کی، جگہ ہوئی اور وہ دفعتاً آئی۔ گویا پہلے سے موجود تھی۔ غرض ہوا لطیف تر تھی تو قوی تر اور غالب بھی ہوئی جو تمام عناصر پر حکمران، سب سے بالا وفوق اور پھر سب میں ساری وجاری ہے۔

جامع العناصر انسان اور اس کی طاقت ...... لیکن اگر ان سارے عناصر اور ان کے تینوں موالید، اور موالید کی بھی بے انتہا شاخوں کو ایک طرف رکھ کر تنہا انسان کو ایک طرف رکھو تو نظر آتا ہے کہ انسان ان سب ہی سے زیادہ اشد، اقویٰ اور ان پر غالب ومتصرف ہے۔ یہ سب عناصر اپنی کارگزاری میں اس کے محتاج اور اس سے مغلوب ہیں۔ لیکن وہ ان میں سے کسی کے زیرِ تصرف اور کسی سے مغلوب نہیں کیوں کہ اولاً تو عناصر کی باہمی اور نسبتی طاقت جو ایک دوسرے کے مقابل آنے سے کھلتی ہے، اپنے جزئیاتی ظہور میں انسان کی محتاج ہے۔ لوہا خود بخود پتھروں کو کچلتا نہیں پھرتا۔ آگ جگہ جگہ لوہے کو خود گرماتی اور پگھلاتی نہیں پھرتی۔ پانی خود بخود آگ بجھانے نہیں جاتا۔ ہوا کی یہ جزوی متصادم حرکات خود بخود نہیں ہو جاتیں بلکہ انسان کے لئے ذریعے ہوتی ہے۔ وہی کدالیں بناتا ہے اور پتھر توڑتا ہے، وہی بھٹیاں بناتا ہے اور لوہے کو تپاتا ہے، وہی مشکیزے اور ظروف میں پانی لاتا ہے اور چولہے ٹھنڈے کرتا ہے، وہی ہوا کو قید کرتا ہے اور سیارات کو اڑاتا ہے۔ پس عناصر کی یہ متغلبانہ کارفرمائی بہت حد تک انسانی افعال کی دستِ نگر ہے۔ اگر انسان ان میں دخل نہ دے تو عناصر اربعہ اپنے اپنے خزانوں میں پڑے ہوئے جیسے چاہیں اینٹھتے رہیں، لیکن میدانِ مقابلہ میں پہنچ کر ان جزوی افعال میں اپنا تغلب نہیں دکھلا سکتے۔ پس جس پر

کسی غالب کا غلبہ موقوف ہو اور جس پر کسی قوی کی فتح ونصرت معلق ہو، ظاہر ہے کہ وہ ان سب پر غالب ہوگا اور اس کی اشدیت کی یہی سب سے بڑی دلیل ہوگی۔

عناصر میں انسانی تصرّفات...... پھر یہی نہیں کہ انسان ان کی باہمی نسبت کھول دینے ہی کا ایک ذریعہ ہے، نہیں بلکہ ان کی یہ تمام طاقتیں بھی اس کے پنجۂ تصرف وتسخیر میں قید ہیں، زمین کا قلب وجگر چاک کر دیا، کنوئیں بنائے، راستے بنائے، تہ خانے تیار کئے، ارضی معدنیات، سرمہ، ہڑتال، سونا چاندی اور پیتل وغیرہ کے خزانے اس سے چھین لئے، پہاڑوں کو تراش کر تہ بتہ مکانات بنائے، پہاڑوں اور برفانی چوٹیوں کو جہاں درندوں کو بھی پناہ نہ ملتی تھی، اپنی بستی بنا کر ان میں راستے نکالے، انہیں بر ما کر ان میں سرنگیں بنائیں، ان میں سواریاں دوڑائیں ’’وَتَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا‘‘ زمین کے خزائن ودفائن کا راز فاش کر کے اثقالِ زمین کو عالم میں آشکار کر دیا اور زمین اور اس کے اجزاء سے برابر نوکروں چاکروں اور غلاموں کی سی خدمت لے رہا ہے۔

پانی کو لو تو زمین کی تہہ میں سے اسے کھوج نکالا، کنوئیں کھود کر ڈول رسی کے جال سے اسے پکڑا، نل لگا کر سینکڑوں فٹ نیچے سے اوپر کھینچ نکالا۔ دریاؤں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ نہروں اور نالیوں میں بہا کر کھیت سیراب کئے۔ مکانات ٹھنڈے کئے، پی کر کلیجے ٹھنڈے کئے۔ جمنا اور گنگا جگہ جگہ ماری پھرتی ہے، اسے واٹر ورکس کے ذریعہ گھر گھر رسوا کیا، وہ مائی تھی تو جگہ جگہ اس بچہ نے اس سے گومت دھلوا کر چھوڑا۔ پانی جیسا آزاد عنصر ٹنکیوں میں قید، نلوں میں بند اور نکلنے میں برابر اسکاک کی حرکت کا محتاج۔ یہ سب انسان کی تسخیر کا نتیجہ ہے، وہ غریب اپنے طبعی میلان سے نیچے کو جاتا ہے، یہ اسے بیس بیس منزلہ مکانوں میں اوپر چڑھا لے جاتا ہے اور پھر وہاں سے پٹخ دیتا ہے۔ کبھی برف بنا کے اسے جما دیا، کبھی بھاپ بنا کر اڑا دیا، کبھی آگ دکھا کر گرما دیا، غرض وہی پانی جس سے آگ جیسا قوی عنصر بھی پناہ مانگتا تھا، انسان کے سامنے ایسا بے بس اور بے یارومددگار ہے کہ اسے سنبھلنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ پانیوں کا سب سے بڑا گھر اور ابوالمیاہ سمندرِ اعظم کہ جس کی بے پناہ عظمت سے ڈر کر دنیا کا ربع مسکون گویا ایک طرف پڑا ہوا ہے اور جس کی کوہ پیکر موجوں کا لگا تار سلسلہ خشکی کے کناروں پر اس طرح حملہ آور محسوس ہوتا ہے کہ گویا ابھی کرۂ زمین کو نگل جائے گا۔ بایں ہیبت وعظمت بھی انسانی دست برد سے نہ بچ سکا۔ انسان نے سمندروں کے جگر چیر ڈالے۔ اس میں جہاز چلائے، تار دوڑائے۔ آبدوز کشتیوں سے اس کی گہرائیوں پر قبضہ کیا۔ اس کے مدفون موتیوں کے خزانے اگلوائے۔ اس کی تہہ کی چھپی ہوئی چیزیں بازاروں میں رسوا ہو رہی ہیں۔

خود سمندر کے نمکین پانی کو بھی تحلیل کر ڈالا۔ ان کا نمک الگ کر دیا، رطوبت الگ۔ گویا پانی کا خون تک پی گیا اور پھر اس کے سب نکے الگ کر لئے۔ غرض یہ قوی تر پانی زمین کی تہہ میں جا کر چھپتا ہے تو اسے پناہ نہیں پہاڑوں کے دامن میں پناہ لیتا ہے تو اس کو رستگاری نہیں۔ مجبور بھی ہے، قید بھی۔ پھر ذلیل سے ذلیل خدمتیں اسے سے لی جا رہی ہیں۔ نجاستوں کا دھونا، ظروف صاف کرنا، میلے کپڑے پاک کرنا وغیرہ اس کے سر ہیں، جس

سے اندازہ کرلیا جائے کہ انسانی طاقت نے کس درجہ اس لطیف عنصر کو اپنا غلام اور پابند قیدی بنالیا ہے۔ آگ جیسے خونخوار عنصر کو دیکھو تو وہ انسان کے سامنے ایک خاکسار غلام کی طرح مجبور ہے۔ وہ لوہے اور پتھروں میں جا کر چھپتی ہے تو انسان لوہے اور پتھر کو ٹکرا کر آگ کی مخفی چنگاریاں کھینچ لیتا ہے۔ وہ آفتاب میں جا کر چھپتی ہے، انسان نے آتشی شیشوں کے ذریعہ ان کو گرفتار کیا اور پھر جب خود اسے چھپانے اور قید کرنے پر آیا تو ایک ذرا دیا سلائی کے سرے پر تی برابر مسالہ میں قید کر دیا۔ جب چاہا دیا سلائی کا سرا رگڑا اور اس قیدی کو نکال باہر کیا۔ گویا وہ آگ جو سر نیچا ہی نہ کرتی تھی، انسان کے سامنے تنکے چننے لگی اور اس کی وہ رفعت و تعلّی خاک میں مل گئی، کہیں چولہوں میں انسان کی خدمت کر رہی ہے، کہیں انگیٹھیوں میں محبوس ہے، کہیں اس کا تزکیۂ نفس کیا تو آگ کا گیس بنا دیا جس کا دھواں اور دخان سب رخصت ہوگیا۔ غرض آگ کا عنصر بھی انسان کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے، جب چاہا اور جس طرح چاہا الٹ پلٹ کر دیا۔ جسے کسی حالت میں بھی چین نہیں۔

ہوا بہت زیادہ لطیف اور مخفی تھی، جس پر انسان کی نگاہ تک فتح نہ پاسکی تھی، مگر اس کی یہ پردہ نشینی بھی انسان کی زد سے اسے نہ بچا سکی اور اس اڑتے ہوئے پرندے کو بھی انسان کے ہاتھ میں کھلونا ہی بننا پڑا۔ ہوائی فضا میں انسانوں کے جہاز اڑ رہے ہیں اور اپنے کندھوں پر انہیں سوار کئے پھر رہی ہے، ہوا کیا ہے انسان کا ایک ہوائی گھوڑا ہے جس پر بے لگام اس نے سواری کس رکھی ہے۔

انسان کی خبر رسانی کی خدمت پر جدا مجبور ہے۔ مشرق سے مغرب تک انسان کے افسانے دوڑ رہے ہیں اور ہوا اپنی مخفی طاقتوں سے انہیں لئے پھر رہی ہے۔ گویا انسان کی ایک چٹھی رسان ہے جو بلا اجرت غلامی کر رہی ہے۔

ادھر برقی پنکھوں کو حرکت میں لانے کے لئے جدا ناچ رہی ہے تا کہ انسان کا پسینہ خشک کرنے کی خدمت انجام دے۔ غرض خدمت گزاری کے فرائض میں چاکروں کی مانند مصروف ہے اور چوں و چرا نہیں کر سکتی، پھر انسان اسے قید کرنے میں اترا تو موٹروں کے پہیوں میں وہ بند، سائیکلوں کے ٹائروں میں وہ قید، برتنوں میں وہ گرفتار اور ربڑ کی گیندوں میں وہ محبوس۔

غرض یہ نادیدہ طاقت جس نے سمندروں کو تہ و بالا کر رکھا تھا، پھنسی تو ایسی پھنسی کہ انسان کے ہاتھ میں ایک قیدی محض بن کر رہ گئی جس کا کوئی پرسان حال نہیں۔

عناصر میں انسانی ایجادات...... پھر اس ظالم انسان کو اسی پر قناعت نہیں کہ عناصر کو باقی رکھی کر ہی ان سے کام لیتا رہے، نہیں اپنی ایجاد پسندی کے جذبہ میں انہیں فنا کر کے اور انہیں باہم لڑا لڑا کر بھی ان سے نئی نئی چیزیں عالم آشکارا کرتا رہتا ہے تا کہ کائنات کے دوسرے مدفون خزانوں سے بھی اپنی غلامی کرائے۔ آگ پانی کے درمیان لوہے کا پردہ حائل کر کے آگ کو دھونکا۔ آگ تو جوش میں پانی کو اڑا دینا چاہتی ہے اور پانی کھول کھول کر آگ کو ٹھنڈا کر دینا چاہتا ہے۔ دونوں اپنی جگہ غیظ و غیظ میں ہیں اور انسان ان کے جوش و خروش سے اسٹیم کی طاقت پیدا

کر کے انجن اور مشینیں چلا رہا ہے، لاکھوں ٹن لوہا اس بھاپ کی مخفی طاقت پر ناچ کر رہا ہے۔ مل چل رہے ہیں، مشینیں گھوم رہی ہیں، انجنوں میں کوئلہ کی کانیں پھنک رہی ہیں، مشینوں میں غلہ اور زمین کی پیداوار پس رہی ہے۔ گویا ساری کائنات پچلی جارہی ہے۔ مٹ رہی ہے مگر اف نہیں کرسکتی کہ ایک انسان کا بچہ مشین کی کل دبائے کھڑا ہے جس کی انگلی کی ہر حرکت سے عناصر اربعہ اور موالید ثلاثہ پر یہ طوفان بپا ہو رہے ہیں۔

پھر پانی کو پانی سے ٹکرایا اور برق پیدا کرلی، گویا پانی میں آگ لگادی۔ پھر وہ بجلی جو سیکنڈوں میں اقلیموں کی خبر لیتی اور آسمان وزمین ایک کر ڈالتی ہے، اسے تابنے اور جست کے ایک پتلے سے تار میں اس طرح باندھ رکھا ہے کہ وہ باایں زور وطاقت اس گرفت سے باہر نہیں جاسکتی۔ ایک ذراسی پیتل کی گھنڈی جسے سوئچ کہتے ہیں، اس کا قفل ہے۔ اسے نیچے کو ہلا دو تو بجلی آموجود اور اوپر کو اٹھا دو تو غائب، گویا برقی روکی ایک عظیم الشان فوج ایک دبلے پتلے سپاہی کی قید میں گرفتار ہے، اور وہ پوری فوج اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ پھر یہ مصنوعی ہی بجلی نہیں، آسمانی بجلی کی گرفتاری کے لئے بھی انسان ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لئے تیار ہے۔ بڑی بڑی بلڈنگوں پر چپٹے تار چڑھائے ہوئے ہیں کہ اگر یہ جہاں سوز بجلی عمارت پر آپڑتی ہے تو یہی معمولی سا رتار اسے الجھا دیتا ہے۔ اور وہ عمارت کو ذرہ برابر آنکھ محض دکھا نہیں سکتی بلکہ اس تار میں غلطاں پیچاں ہو کر رہ جاتی ہے۔

پیٹرول جیسی سیال اور بہتی چیز میں آگ لگادی۔ آگ اور تیل لڑرہے ہیں جس سے گیس پیدا ہو رہا ہے اور حضرت انسان کی موٹر چل رہی ہے، ہوائی جہاز اڑ رہے ہیں۔

غرض ساری کائنات کے ناک میں دم ہے۔ ایک مشتِ استخواں سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ عاجز ہے۔ عناصر نے باہم اپنی طاقتوں کے کیا جوہر کھائے تھے جو اس مجموعہء عناصر نے کر دکھایا۔ بحر و بر اور خشکی وتری کی ساری ہی کائنات اس ظالم انسان کی بدولت ایک مصیبت میں گرفتار ہے کہ اسے کسی وقت چین نہیں، اور انسان ہے کہ رات دن ان عناصر کے الٹ پھیر میں انتھک طریق پر لگا ہوا ہے۔ جس سے ساری کائنات کا دم بند ہے اور سارے جماد و حیوان قید وغلامی میں مقیّد ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ ایک شیر نے اپنے خورد سالہ بچہ کو نصیحت کی تھی کہ انسان سے بچتے رہنا۔ یہ بڑی چیز ہے۔ وہ انسان کے شوق دید میں تھا۔ کچھ شعور پا کر انسان کی تلاش میں نکلا کہ دیکھوں آخر یہ کیا بلا ہے جس سے سلاطین صحرا بھی اپنے دارالسلطنت میں بیٹھ کر کپکپاتے ہیں، چلا تو پہلے اتفاق سے گھوڑے پر نظر پڑی۔ جس کی جسامت اور پھرتی و چالاکی کو دیکھ کر اسے شبہ ہوا کہ شاید یہ ہی انسان ہے، پوچھا تو گھوڑے نے کہا کہ مجھ بیچارے کی کیا مجال ہے کہ میں انسان کے سامنے ٹھہر سکوں، چوبیس گھنٹے گلے میں رسی، پیروں میں بیڑیاں اور اصطبل کا جیل ہے اور جب حضرت انسان کا جی چاہا تو میری پیٹھ پر سوار، منہ میں لگام اور اوپر سے تڑاتڑ کوڑوں کی مار۔ جیسی مجھ پر گزرتی ہے میں ہی جانتا ہوں۔

شیر کا بچہ سہم گیا کہ یا اللہ کیا بلا ہے انسان کہ عناصر ہی نہیں۔ مو الید بھی گرفتارِ بلا ہیں۔ آگے بڑھا تو اونٹ نظر پڑا جو گھوڑے سے دوگنا اور عجیب الخلقت تھا۔ اسے یقین آ گیا کہ ہو نہ ہو یہی انسان ہے، یہ گھوڑے سے بھی چار ہاتھ اونچا ہے، اس سے دریافت کیا تو اسے بھی انسان سے دہائی دیتے ہوئے سنا، وہ بولا کہ میرے اس قد وقامت پر نہ جاؤ۔ انسان نے باایں جسامت وقامت میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ میں کیا سینکڑوں مجھ جیسے میرے بھائی بند، صرف ایک نکیل میں گرفتار اور ایک خورد سال بچہ ہمیں جنگل در جنگل لئے پھرتا ہے۔ منوں بوجھ کمر پر ہے۔ ہم بلبلاتے ہیں مگر شنوائی نہیں۔ انسانوں کے لئے ہماری گردنیں سیڑھیاں ہیں۔ جب چاہتا ہے کمر پر دھرا جاتا ہے۔ پھر ایک نہیں دو نہیں تین تین آدمی لد جاتے ہیں اور نہ صرف خود لدتے ہیں، بلکہ بڑے بڑے پلنگ ہماری کمروں پر کس کر براجمان ہوتے ہیں۔ ہم چپ چاپ کان دبائے منزلیں قطع کرتے رہتے ہیں، راتوں چلتے ہیں اور دنوں بلبلاتے ہیں۔ مگر کوئی مخلص نہیں نکلتا۔

غرض ہماری یہ ساری مصیبت وغلامی صرف اسی انسان کی بدولت ہے۔ بھلا ہم انسان تو کیا ہوتے، ہم تو اس کا نام بھی بے خوف ہو کر نہیں لے سکتے۔

شیر کا بچہ اور بھی زیادہ ہراساں ہوا کہ خدا جانے انسان کیسے ڈیل ڈویل کی چیز ہوگی جس سے ایسے عظیم الخلقت جانور پناہ مانگ رہے ہیں۔ آگے بڑھا تو اتفاق سے ہاتھی پر نظر پڑ گئی۔ جو ایک عظیم الشان بلڈنگ کی طرح سے سامنے سے آتا ہوا نظر پڑا۔ جس کی عمارت چار بڑے بڑے ستونوں پر کھڑی ہوئی تھی، اسے یقین محکم ہو گیا کہ یہ بالضرور انسان ہے اور یہی ایسی ہستی ہے جو اونٹوں اور گھوڑوں پر غالب آ سکتی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھی سے کہا کہ غالباً آپ ہی کا نام نامی انسان ہے۔

ہاتھی نے نہایت حیرت سے بچۂ شیر کو دیکھا اور کہا کہ بیٹا تم ناسمجھ ہو۔ کس بری بلا کا نام لے رہے ہو، مجھ ایسے لمبے ڈول کی جو گت اس ظالم انسان نے بنائی ہے، خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ گھوڑے کے منہ میں لگام تو دے دیتا ہے، اونٹ کی ناک میں نکیل تو پہنا دیتا ہے، لیکن مجھ پر تو بے ڈھانٹی سوار ہوتا ہے، لگام میرے نہیں، نکیل میرے نہیں، مگر پھر بھی ایسا گرفتار اور مجبورِ محض ہوں کہ اس ظالم کے آگے چوں تک نہیں کر سکتا۔ ہر وقت میری گردن پر سوار، لوہے کا آنکس ہاتھ میں، ذرا چوں کروں تو سر پر اتنے پڑتے ہیں کہ کھایا پیا بھول جاتا ہوں۔ میری کیا مجال ہے کہ انسان کے سامنے اف بھی کر سکوں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے باپ کی وصیت پر عمل پیرا رہیں اور اپنی جنگل کی بادشاہت کی حرمت قائم رکھیں، اس انسان کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ ورنہ یہ شاہزادگی ساری کر کری ہو جائے گی اور کوئی پھر فریاد کو بھی نہ پہنچے گا۔

شیر کا بچہ حیران تھا کہ انسان آخر کس تن وتوش کا ہوگا، جس کے غلبہ وتسلط کا چار دانگ عالم میں یہ شہرہ اور شور نشور برپا ہے۔ آخر کار اس نے بے نیل ومرام واپسی کا قصد کر لیا۔ لوٹ رہا تھا کہ ایک بن میں ایک بڑھئی کے بچہ کو

دیکھا کہ وہ ایک بڑے شہتیر کو آرے سے چیر رہا ہے اور جتنا چیر چکا ہے اس میں ایک کھونٹی گاڑ رکھی ہے، بچۂ شیر کا التفات بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہی انسان ہے لیکن پتہ لینے کے لئے اس سے سوال کیا کہ جناب انسان سے واقف ہیں؟ اس نے کہا کہ آپ کو کیا کام ہے؟ کہا کہ میں اس کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا بندہ ہی انسان کہلاتا ہے۔ شیر نے حقارت وتعجب سے دیکھ کر کہا، ارے کیا تو ہی وہ انسان ہے جس سے شیر، گھوڑا، اونٹ سب لرزتے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں واقعہ تو یہی ہے، بچۂ شیر نے کہا کہ او دشمن تو ہے کیا؟ تیرا کام تو میں ابھی اپنے طمانچہ سے ختم کئے دیتا ہوں۔ بڑے ہی بیوقوف میرے آباؤ اجداد تھے جو تجھ سے کانپتے رہے اور بڑے احمق وہ تھے جنہوں نے راستے میں مجھے خوانخواہ سہا دیا۔ اس لاف زنی کے ساتھ بچۂ شیر آگے بڑھا تا کہ قوت آزمائی کرے۔ بڑھئی کے بچے نے سمجھ لیا کہ وقت آ بر ہوا۔ اب تدبیر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کہا کہ واقعی آپ بڑے بہادر ہیں، میں بے چارہ کیا چیز ہوں، آپ جو چاہیں فرمائیں، اس وقت میرا ایک کام درپیش ہے جسے میں اپنے ضعف کی وجہ سے انجام نہیں دے سکتا۔ خدا نے آپ جیسا قوی اور بہادر بھیج دیا۔ پہلے وہ کام کر دیجئے پھر میرے ساتھ جو چاہے سلوک فرمایئے اور وہ یہ ہے کہ میں اس شہتیر میں سے یہ کھونٹی سرکانا چاہتا ہوں۔ ذرا اپنا ہاتھ اس شہتیر کے شگاف میں ڈال کر اسے تھام لیجئے تا کہ میں کھونٹی سرکا دوں۔

شیر صاحب اس مدح وثناء سے مسحور ہو کر بے تکلف آگے بڑھے اور ایک نہیں دونوں ہاتھ شگاف میں ڈال دیئے۔ بڑھئی کے بچہ نے کھونٹی نکال لی۔ کھونٹی کا نکلنا تھا کہ شہتیر کے دونوں پلٹ مل گئے اور شیر صاحب کے دونوں ہاتھ اس میں پھنس کر رہ گئے، اب شیر صاحب نے چیں چیں کرنا شروع کیا اور بڑھئی کے بچہ نے ہنسنا شروع کیا کہ فرمایئے، انسان کو دیکھ لیا؟ اس وقت شیر نادم ہوا کہ واقعی تجربہ کاروں اور بڑوں کی نصیحت سے روگردانی کا انجام برا ہوتا ہے۔ مگر پھر سوچنے لگا کہ ظاہر میں تو یہ انسان بڑا ہی کمزور اور حقیر ہے۔ اس کا جثہ تو قطعاً طاقتور نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں کوئی اندرونی طاقت ہے جس سے اس نے مجھے اس وقت بے بس کر دیا اور ساری کائنات کو پچھاڑے رکھا ہے۔ یہ حکایت عبرت اور انسانی طاقت سامنے لانے کے لئے بس کرتی ہے۔ ان مشاہدات کی رُو سے ماننا پڑتا ہے کہ انسان میں ان عناصر سے کہیں زیادہ طاقت موجود ہے، جب ہی وہ ایک چھوٹے سے جُثہ میں کم سے کم ہونے کے باوجود بھی عناصر کے مخزنوں اور موالید کے جثوں پر بھاری ہو رہا ہے اور ان کے غلبہ کے ساتھ ہر قسم کے تصرفات اور حاکمانہ کارروائیاں کرنے میں کسی سے مغلوب نہیں، اور جب یہ مان لیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں لطافت بھی عناصر سے کہیں زیادہ موجود ہے۔ کیوں کہ پہلے یہ اصول ثابت ہو چکا ہے کہ طاقت درحقیقت لطافت ہی میں ہے کہ کثافت میں بجز ضعف و درماندگی کے اور کچھ نہیں۔ پس انسان میں جب ہوا سے بھی زیادہ طاقت ہے جو الطف العناصر تھا، تو ناگزیر ہے کہ اس میں لطافت بھی ہو اور اسے کہیں زیادہ ہو، تا کہ وہ اس پر اپنی یہ طاقتور حکمرانی برقرار رکھ سکے۔

انسانی طاقت وتسخیر کا راز اس کی روح میں مضمر ہے..... مگر یہ ظاہر ہے کہ انسان کے ظاہر میں تو کوئی

لطیف چیز محسوس نہیں ہوتی، نہ وہ صیقل شدہ آئینہ یا صاف پانی کی سی چمک رکھتا ہے کہ اس میں منہ نظر آنے لگے، نہ وہ خود ہی ایسا روشن ہے کہ فضا میں اس سے شعاعیں پھوٹتی ہوں اور روشنی نکلتی ہو، نہ وہ ہوا کی طرح غیر مرئی ہے۔ پھر اس میں یہ لطافتوں کو زیر کر دینے کی لطافت آخر کہاں مخفی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ طاقت اور لطافت اس کے بدن کی نہیں ہوسکتی کہ بدن تو وہی آگ، پانی، مٹی، ہوا کا مجموعہ ہے۔ اگر اس بدن میں کوئی طاقت بھی ہو تو پھر بھی وہ بے چارہ اس تھوڑے سے آگ پانی سے سارے جہان کے اس آگ پانی پر کیا غلبہ حاصل کر سکتا تھا۔ یہ بدنی آگ پانی تو خود آفاقی آگ پانی سے لیا ہوا ایک قلیل سا جزء ہے اور جزءِ قلیل اپنے کل پر کیا غالب آسکتا ہے۔ ایک قطرہ دریا کو کیا مغلوب کر سکتا ہے؟ ایک چنگاری کرۂ نار پر کیا تسلط جما سکتی ہے؟ ایک ذرّہ کرۂ ارض پر کیا حکومت کر سکتا ہے؟ بلکہ اس صورت میں تو قصہ برعکس ہونا چاہئے تھا کہ یہ مادی جہان خود اس انسان پر ہر حیثیت سے غالب رہتا اور اسے دم بخود رکھتا، چہ جائیکہ اس مشتِ خاک سے ساری کائنات، آب و گل مسخر ہو جائے اور خود اسی کا دم اس ضعیف البنیان کے سامنے بند ہو؟ پس یہ تسخیر یقیناً اس کے بدن اور بدنی آب و آتش یا ہوائی لطافتوں کا کام نہیں ہوسکتی، بلکہ انسان کی یہ غلبہ پانے والی قوت بلاشبہ ایسی ہونی چاہئے جو آگ پانی تو کیا ہوا سے بھی لطیف تر ہو کہ ہوا جیسی غیر مرئی چیز کی ٹکر تو انسان کو محسوس بھی ہوتی ہے، اس کی لطافت وہ ہو کہ باوجود انسان کے رگ و پے میں سمائے ہوئے ہونے کے کبھی اس کا دھکا تک انسان کو نہ لگا ہو۔ بلکہ کبھی اس کی لمس و مس تک کا بھی اسے احساس نہ ہوا ہو۔ وہ متصل تو اتنی ہو کہ انسان اس سے ملے بغیر اپنی ہستی کو باقی نہ رکھ سے اور منفصل ایسی ہو کہ انسان کے کسی حاسہ کی رسائی اس تک نہ ہو۔ خود اس پر کوئی سرد و گرم نہ پہنچ سکے۔ اس لئے وہ فقط اپنے بدن پر ہی نہیں بلکہ جہان کے عناصر اربعہ پر غالب آ جائے، اور ظاہر ہے کہ بدن کو چھوڑ کر انسان میں روح کے سوا اور کون سی چیز ہوسکتی ہے، جس کی یہ صفات ہوں کہ ان دو ہی سے انسان مرکب ہے۔ یعنی انسان میں یہ طاقت نہیں۔

روحِ انسانی کی لطافت اور حسّی نورانیت...... یہ کرشمے ہیں تو دوسرے ہی جزو میں ہوسکتے ہیں۔ پس حاصل یہ نکلا کہ روح عناصر اربعہ ہی نہیں۔ تمام مادی عالموں سے بھی زیادہ لطیف چیز ہے۔ پھر روح کی یہ لطافتیں نہ صرف معنوی اور غیر مرئی ہی ہیں بلکہ حسی طور پر بھی اس کی لطافتیں عالم آشکارا ہیں۔ خود عناصر میں جتنی اقسام کی لطافتیں تھیں، اگر غور کرو تو وہ بھی سب کی سب روح میں جمع ہیں۔

اگر صیقل شدہ آئینہ یا شفاف پانی صورتوں کا عکس اتار لیتا تھا تو انسان کی آنکھوں کو روح نے ایک ایسی چمک دے رکھی ہے کہ جدھر اٹھ جاتی ہے، ادھر کے تمام نقشے، فوٹو اور سینریاں اپنے اندر اتار لیتی ہے۔ آئینہ کا فوٹو تو بے اصلِ محض ہے کہ پشتِ آئینہ خالی ہے، لیکن آنکھ کا فوٹو بے اصل نہیں کہ اس کے پیچھے حس مشترک میں اس کا پورا مصوّر علم قائم ہے۔

اگر آگ سے تارِ شعاع پھیلتے ہیں تو آنکھوں سے تارِ نگاہ منتشر ہوتے ہیں جو ان شعاعوں سے کسی طرح کم

نہیں، کیونکہ یہ تارِ شعاع سے تو چیز کی صورت محض آنکھ ہی کے سامنے روشن ہو جاتی ہے اور تارِ نگاہ سے یہ سب چیزیں دل کے سامنے روشن ہو جاتی ہیں جو ان کی حقیقت پر بھی غور کر سکتا ہے۔

اگر پانی غایتِ لطافت سے اجسام میں نفوذ کر جاتا ہے اور سخت سے سخت جسم بھی اس کے سریان سے نہیں بچ سکتا، جب کہ اس سے اتصال قائم ہو جائے، تو روح بھی جسم کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہوتی ہے، حتیٰ کہ سخت سے سخت ہڈیاں بھی اس سے تازگی لئے ہوئے ہوتی ہیں، پھر پانی تو اپنے سریان سے اپنے محل کو محض ٹھنڈا ہی کئے ہوئے رہتا ہے اور روح اپنے دوران سے اپنے محل کو زندہ کئے ہوئے ہوتی ہے۔

اگر ہوا غایت لطافت سے دکھلائی نہیں دے سکتی تو روح بھی اپنی لطافتِ بے غایت سے آج تک نادیدہ ہے، اور جیسے ہوا کا رنگ و بو غیر محسوس چیز ہے یا ہے ہی نہیں۔ ایسے ہی روح بھی ان خواص سے بری ہے۔

غرض عناصر میں لطافت کے جو جو کمالات اور لطافت کے جس قدر مراتب و درجات تھے، وہ سب روح میں موجود ہیں۔ اس لئے اگر عناصر کو حق تعالیٰ سے جزوی مناسبتیں تھیں اور اس بناء پر وہ قوی تھے، تو روح کو بحیثیتِ مجموعی اس سے یہ ساری مناسبتیں قائم ہیں۔ اس سے وہ عناصر سے زیادہ قوی ہونی چاہئے اور جو کام عناصر کر سکتے ہیں وہ سب اس سے بے تکلف سرزد ہو جانے چاہئیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ عناصر کو تو ان کی طاقتوں کی بناء پر درجہ بدرجہ اشد کہا جائے اور روح کو اشد ترین نہ کہا جائے۔ اس لئے عنصری اور مادی طاقتوں پر روحانی طاقتوں کے فوقیت لے جانے کی ایک یہی وجہ کافی ہو سکتی ہے کہ عناصر جزوی لطافتیں رکھتے ہیں اور روح ان کی ساری لطافتوں کی جامع ہے اور انہیں ذاتِ بابرکات سے جزوی مناسبتیں ہیں، تو روح کو کلی مناسبت ہے۔

روحِ انسانی کی معنوی لطافت و طاقت..... لیکن اگر مزید غور کرو تو روح کو حق تعالیٰ سے محض عناصر کی سی مناسبت نہیں یا بالفاظ دیگر محض مناسبت ہی نہیں بلکہ ایک جہت سے ایسی مماثلت بھی حاصل ہے کہ وہ اس کے مخصوص اوصاف و کمالات کے بلئے بطورِ مثال پیش کی جا سکتی ہے اور عناصر اس کے لگ بھگ بھی نہیں رہ سکتے کہ وہ سرے ہی سے ان کمالات سے عاری اور کورے ہیں۔ مثلاً حق تعالیٰ اگر غیر مرئی طریق پر تمام عالم کا قیوم اور مدبر ہے تو اسی طرز پر روح کائناتِ بدن کی قیوم اور مربی ہے۔ وہ ذرا اپنی توجہ ہٹا لے تو کائناتِ بدن درہم برہم ہو جائے جیسا کہ موت کے وقت ہو جاتا ہے۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ کے انوار ساری کائنات کے ذرہ ذرہ میں جلوہ افروز ہیں اور ہر ہر خطہ اور اس کے ہر ہر جزو سے اس کے مناسب کام لے رہے ہیں اور باوجود اس ظہورِ تام کے پھر بھی آج تک کسی آنکھ نے اسے نہیں دیکھا۔ اسی طرح روح کے انوارِ بدنی کائنات میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ہر ہر عضو سے اس مناسب کام لے رہے ہیں اور باوجودیکہ بدن کی رگ رگ میں روح کا ظہور ہے، آنکھ کی چمک میں، رخسار کی سرخی میں، بالوں کی سیاہی، دانتوں کی سفیدی میں، بدن کی تازگی میں اسی کا جلوہ ہے۔ وہ نہ ہو تو یہ سارے جلوے ایک آن میں ختم

ہو جائیں۔ مگر باوجود اس ظہورِ تام کے پھر بھی آج تک ایسی نادیدہ ہے کہ خود اپنا نفس بھی اس کے دیدار سے محروم ہے۔

بے حجابی یہ کہ ہر ذرّہ سے جلوہ آشکار — اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

پس جیسے وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ ایسے ہی روح ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، پھر جس طرح اس ساری کائنات کی زندگی اور زندگی کی ہر نقل وحرکت سے ذاتِ حق اول اور اقدم ہے کہ وہی تو معطی وجود ہے اور وجود سے پہلے کوئی بھی اقدام ممکن نہیں۔ آپ عالم کا کوئی اقدام ایسا نہیں پیش کر سکتے کہ وہ ہو جائے اور ذاتِ حق تعالیٰ اس کے بعد آئے۔ اس کے بغیر تو کائنات کی زندگی ہی نہیں اور بلا زندگی اس کی کوئی نقل وحرکت ہی ممکن نہیں، تو مخلوق خالق سے پہلے کیسے ہو سکتی ہے؟ ضرور ہے کہ ہر مخلوق اور مخلوق کے ہر فعل سے خالق کی ذات مقدم ہو۔ پھر اسی طرح کائنات کی ہر نقل وحرکت کا منتہی بھی اس کی ذات ہے۔ آپ عالم کا کوئی اقدام بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے کہ وہ ذاتِ حق سے گزرتا ہوا آئے، پہنچ جائے اور ذاتِ حق کو ادھر ہی چھوڑ آئے۔ کیوں کہ جب ذاتِ حق ہی سے اس کائنات کی زندگی قائم ہے۔ تو یہ دعویٰ ایسا ہوگا کہ کائنات اپنے افعال کرتی ہوئی زندگی کی حد سے گزر جائے اور پھر بھی اس کے افعال جاری رہیں، جو عقلاً ناممکن ہے۔ پس عالم کے ہر حرکت وسکون کا منتہی بھی اس کی ذات نکلتی ہے۔ اس کے آگے اور بعد کچھ نہیں۔ وہی ہر چیز کا اوّل بھی ہے اور وہی آخر بھی۔ جیسے کہ وہی ظاہر تھا اور وہی باطن بھی۔ ٹھیک اسی طرح بدنی کائنات کی ہر نقل وحرکت بلکہ اس کی نفسِ ہستی ہی سے روح اوّل بھی ہے اور آخر بھی، کیوں کہ جب روح ہی بدن کے لئے باعثِ ہستی وحیات ہے تو کسی زندہ کا کوئی اقدام زندگی سے قبل کیسے ہو سکے گا۔ پس ہر کام بلکہ بدن کے ہر کام کے اوّل روح آتی ہے۔ اور اسی طرح جب کہ روح ہی بدن کے لئے باعث حیات ہے تو کائنات بدن کا کوئی اقدام بھی حیات سے مؤخر نہیں ہو سکتا بلکہ آخر اور منتہائے حیات بھی یہی رہے گی۔ پس روح ہی اس بدن عالم کے لئے اوّل بھی ہوئی اور آخر بھی۔ جیسا کہ وہی ظاہر تھی اور وہی باطن بھی۔ پھر جیسا کہ ذاتِ حق عالم سے متصل تو اتنی ہی ہے کہ ﴿اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ اور ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَمَا كُنْتُمْ﴾ اور پھر منفصل بھی اتنی کہ وراء الوراء ثم وراء الوراء، مخلوق ظلمتِ محض اور وہ نورِ مطلق۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

ٹھیک اسی طرح روح بھی بدن سے متصل تو اتنی ہے کہ زندہ بدن کی کسی رگ کا کروڑواں حصہ بھی اس سے الگ نہیں، ورنہ زندہ نہ رہے۔ لیکن دور بھی اتنی ہے کہ اس کی پاکیزگیاں بدن سے کوئی لگاؤ ہی نہیں رکھتیں۔ لطیف و کثیف میں کیا تناسب اور کیا رشتہ؟ کجا یہ مشتِ خاک اور کجا وہ جوہرِ پاک، چراغ مردہ کجا، نورِ آفتاب کجا؟

صفاتِ روح سے الٰہیّات پر استدلال...... ان مماثلوں کے سبب جس طرح ہم تشبیہ کے سلسلہ میں اُدھر سے اِدھر آئے اِدھر سے اُدھر بھی جا سکتے ہیں۔ یعنی اپنی ہی روحانی کائنات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی یکتائی اور بے چونی پر استدلال بھی کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح یہ ہماری بدنی کائنات بلا اس غیر مرئی

مدبر یعنی روح کے موجود اور باقی نہیں رہ سکتی اسی طرح یہ ساری کائناتِ عالم بھی بلا کسی مدبر حکیم کے موجود اور بقاء پذیر نہیں ہوسکتی۔ پس روح کی بدولت وجودِ صانع پر ہمارے ہی اندر سے دلیل نکل آئی۔

پھر جس طرح بدن میں ایک ہی روح تدبیر بدن کر سکتی ہے۔ اگر دو ہوں تو کائناتِ بدن فاسد ہو جائے کہ ایک میان میں دو تلواریں اور ایک اچکن میں دو انسان نہیں سما سکتے۔ اسی طرح کائناتِ عالم میں ایک ہی واحد وقیوم اور حکیم ومدبّر کی تدبیر کارگر ہوسکتی ہے۔

ورنہ ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَ تَا﴾ ① کا ظہور ہو جائے گا۔ پس روح کے طفیل ہمارے ہی نفوس میں سے توحیدِ صانع کی دلیل بھی پیدا ہوگئی۔ پھر جس طرح بدن کے قعر تک میں گھس جانے سے روح کا کوئی کم و کیف، کوئی لون ورنگ اور کوئی سمت و جہت نہیں دکھائی دے سکتی، اسی طرح وہ ذاتِ بابرکات بھی بے چون و بے چگون اور سمت وسمات سے مبرّا اور رنگ ولون سے منزہ ہے کہ رنگ برنگ کے جلوے تو اس سے ہیں، مگر وہ ہر رنگ سے بری و بالا ہے۔ پس روح کی بدولت اس کی شان تنزیہ وتقدیس بھی ہمارے ہی اندر سے ہویدا ہوگئی۔

پھر جس طرح روح بدن کے ذرّہ ذرّہ میں موجود اور بدن کی رگ رگ سے اس کا تعلق وابستہ ہے۔ مگر تعلقات کی شدت وضعف کا یہ تفاوت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ جو تعلق قلب سے ہے وہ دماغ سے نہیں۔ جو دماغ سے ہے وہ کبد ومعدہ سے نہیں اور جوان سے ہے وہ عام جوارح بدن سے نہیں۔ اسی لئے قلب و دماغ کی ادنیٰ ایذاء یا توہین سے روح میں غصہ وجوش پیدا ہو جاتا ہے اور ان اعضاء رئیسہ پر ادنیٰ سی ضرب بھی پڑ جانے سے روح اپنی حیات کو سمیٹ لے جاتی ہے۔ بخلاف عام اعضاء کے کہ اگر ہاتھ پیر بھی کاٹ دیئے جائیں تو کمال زندگی خواہ چھن جائے مگر نفس زندگی مسلوب نہیں ہوتی۔

اس طرح ذاتِ بابرکات کا جلوہ جہانوں کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ مگر مواضع کے تفاوت سے تعلق کی شدت وضعف میں بھی تفاوت ہے کہ جو تعلق اس کی ذات کو عرشِ عظیم سے ہے وہ اور مقامات سے نہیں کہ وہ مرکزِ استواء ہے، پھر جو تعلق بیت المعمور سے ہے اور وہ ساوی مواضع سے نہیں کہ وہ قبلۂ ملائکہ ہے، پھر جو تعلق بیت اللہ اور مسجد اقصیٰ یا حرمِ نبوی سے ہے وہ اور جگہوں سے نہیں ہے۔ اس لئے اگر ان کی کوئی توہین کا یا جارحانہ اقدام ہو تو روحِ اعظم کا غضب بھڑک اٹھتا ہے۔ عالم میں ہیجان شروع ہو جاتا ہے اور دنیا کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بیت اللہ کی اینٹیں اکھڑ جانے پر بھی اس عالم سے زندگی کھینچ لی جائے گی۔ پس روح کی بدولت ہم پر اللہ کے تعلقات کی نوعیت بھی منکشف ہوگئی۔

پھر جس طرح ہر شخص اپنی روح کی پکار اور حقانی دعوت کو دل کے کانوں سے بے تکلف سنتا ہے اور اس کی نصیحتوں کو قلب کے واسطہ سے ادراک کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے کلام میں نہ لفظ ہیں نہ آواز۔ یہی شان حق

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۲.

تعالیٰ کے کلام کی ہے کہ کلام بھی ہے، اس میں حقائق بھی ہیں، اس میں سماع بھی اور اسماع بھی ہے۔ اور مخصوص افرادِ بنی آدم (انبیاء علیہم السلام) جو بنی نوعِ انسانی میں مثلِ قلب کے ہیں، اسے سنتے بھی ہیں، پر نہ وہاں الفاظ کی حد بندیاں ہیں نہ الفاظ و تلفظ کی قیود گو ظہور کے بعد مخلوق میں پہنچتے پہنچتے یہ ساری تحدیدات نمایاں ہو جائیں۔ پس روح کی بدولت ہمیں ذات کے کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی کا بھی فی الجملہ ادراک ہوا۔

پھر اگر تم آنکھ بند کر لو تو روح کا دیکھنا بند نہیں ہوتا اور کان بند کر لو تو اس کے سننے میں فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ آنکھ کان بند کر کے تصوّر کے لامحدود عالم میں یہی روح دیکھنے کی چیزوں کو اور زیادہ بے تکلفی کے ساتھ دیکھتی ہے اور سننے کی چیزوں کو اور زیادہ بے غائلہ سنتی ہے۔ حالاں کہ نہ آواز روح سے ٹکراتی ہے اور نہ کسی صورت کا رنگ و روغن اور جسم اس کے آس پاس پھٹک سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ ذات بے چون و چگون ہر چیز کو سنتی اور دیکھتی ہے۔ مگر نہ وہاں رنگ و روپ اور مادیت کو قرب نصیب ہوتا ہے اور نہ آوازوں کے نغمے ہی اس کی سمع سے ٹکر کھاتے ہیں۔ پس اپنی ہی روح کی بدولت ہمیں اللہ کی سمع و بصر کی بے کیفی اور بیچونی کا بھی ایک گونہ اندازہ ہوا۔

اسی طرح جب ہم اس پر نظر کریں کہ بدن کی حیات تو روح کی زندگی سے قائم ہے۔ مگر روح کے لئے کسی اور روح کی حاجت نہیں۔ وہ خود اپنے ہی معدنِ حیات کی ایک موج ہے، تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ عالموں کی زندگی تو ذات بابرکات کی حیات سے قائم ہے اور خود اس کی حیات کے لئے کسی اور ذات کی حاجت نہیں بلکہ وہ اپنی ذاتی حیات سے حی ہے جس میں کوئی فرق نہیں آ سکتا اور اس طرح ہم پر اللہ کی صفتِ حیات کے ذاتی اور خانہ زاد ہونے کا اندازہ بھی اپنے ہی اندر سے ہو گیا۔

بہر حال روح کو ذاتِ بابرکات سے مناسبتیں ہی نہیں بلکہ فی الجملہ مماثلتیں حاصل ہیں، جس سے حق تعالیٰ کے لامحدود کمالات کی مثالیں ہمارے نفوس میں پہنچ گئی ہیں اور ہم اپنے اندر ہی سب کچھ عیاناً دیکھنے پر قادر ہو گئے، اس لئے روح کی اس سے زیادہ جامع تعریف اور کچھ نہیں ہو سکتی، جو قرآنِ کریم نے فرمائی کہ: ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ ①

غرض روح اس ساری تفصیل سے ایک لطیفۂ ربانی ثابت ہو جاتی ہے اور جسم محض ایک کثیفۂ ظلماتی۔ لیکن جب یہ بدنی عناصر جو عالمِ خلق کی چیزیں ہیں، اس روح سے تھوڑی سی مناسبت اور واجبی سا لگاؤ پیدا کر کے ایسے قوی ہو سکتے ہیں کہ ساری دنیا ان کی طاقت پر ناچنے لگتی ہے، تو خود روح جو عالمِ امر کی چیز ہے اور اس کی مناسبت مع اللہ بلکہ مماثلت کی گہرائیوں کی کوئی حد نہیں۔ اللہ جل ذکرہ، سے اس قوی مناسبت و مماثلت کی بدولت کیا کچھ قوی اور غالب و متسلط نہ ہو گی۔ اگر ڈھنگ سے اس کی قوتوں کو استعمال کیا جائے تو کیا پھر کائنات اس کا تحمل کر سکے گی؟

پس بچۂ شیر کے قول کے مطابق انسان اگر پانی اور مٹی سے کہیں زیادہ قوی ہے تو وہ بدن کی بدولت نہیں کہ

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸۵.

بدن تو وہی آگ پانی کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ یہ بے چارہ قلیل وحقیر بدن اپنے عظیم وکثیر مخزن پر کیا غالب آ سکتا ہے۔ بلکہ انسان کی یہ غیر معمولی قوّت اور قوّت کی یہ غیر معمولی کرشمہ آرائیاں درحقیقت اس کی روح کی بدولت نمایاں ہورہی ہیں کہ روح کی لطافتوں کی کوئی حد نہیں اور وہ مجموعۂ لطافتِ سفلی وعلوی ہے، جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ روح تمام مادیات اور تمام عناصر سے اقویٰ واشد ہے، پس جہاں ذاتِ بابرکاتِ حق نے عالم آفاق میں اپنی مثالیں رکھی تھیں تا کہ اس کے کمالاتِ ظاہر در آیاتِ بینہ کا کسی حد تک ادراک واحساس ہو سکے۔ اسی طرح بلکہ ان سے بدرجہا زائد جو مخصوص مثالیں ہمارے انفس میں رکھ دیں تا کہ ان شئونِ باطنیہ اور کمالِ بطون در بطون تک ہم بقدرِ استعداد کچھ رسائی پا سکیں۔

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ ① ”ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گردونواح میں دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے۔ کیا آپ کے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے“۔

غرض مادی سائنس کی یہ کرشمہ سازیاں جن کی طرف تمہید میں میں اشارہ کر چکا ہوں، دیکھنے میں بدن اور بدنی عناصر سے نمایاں ہو رہی ہیں۔ مگر بلحاظِ حقیقت یہ سب کچھ روح کا طفیل ہے جس کی مخفی طاقتیں اس چورنگ مادہ کو نچاتی رہتی ہیں اور مزدور کی طرح چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔

روح کی طاقتوں کا غلط استعمال...... لیکن سوال یہ ہے کہ روح نے اپنے یہ باطنی کمالات صرف کرنے میں جس قدر جدوجہد کی اور ترکیب وتحلیل کے ذریعہ آگ پانی، ہوا، مٹی کے جس قدر بھی عجائبات موالیدِ ثلاثہ میں نمایاں کئے۔ اس سے خود روح کو کیا نفع پہنچا؟ اور روح کو بحیثیتِ روح اس جدوجہد سے کیا شرف حاصل ہوا؟

ظاہر ہے کہ اوّل تو ان تمام سائنسی ایجادات کا نفع روح کو کچھ نہیں، صرف بدن ہی کو پہنچا۔ بدن کی راحت اور جسمانی عیش ہی میں اضافہ ہوا۔ سردی میں آگ کی حرارت گرمی میں پانی کی تبرید، برسات میں ہوا تفریح بدن ہی کے لئے ہے، روح نہ سردی کی محتاج نہ گرمی کی کہ حرارت وبرودت روح کے اوصاف ہی نہیں، اسی طرح ہوائی جہاز نے اگر فضا میں اڑایا تو بدن کو، ورنہ روح جیسی لطیف چیز اڑانے کے لئے اس وزنی اور کثیف طیارہ کی حاجت ہی نہ تھی۔ مرنے کے بعد وہ نامعلوم کہاں کہاں اڑتی ہے تو کون سے ہوائی جہاز اس کے لئے جاتے ہیں، پھر سوچو کہ خود ہوا کو اڑنے کے لئے کسی ہوائی جہاز کی ضرورت ہے؟ ہوا تو خود ہی جہاز کو اڑاتی ہے۔ تو جو روح ہوا سے بھی لطیف تر ہے اور جس نے خود ہوا ہی کو مسخر اور قید کر رکھا ہے بلکہ ہوا کے خلافِ طبع اسے جگہ جگہ اڑا رکھا ہے، وہ اپنے اڑنے میں اس کی کیا محتاج ہوتی؟ اور جب اس کی محتاج نہیں تو اس کے بھی محتاجوں یعنی طیاروں کی محتاج کیسے ہو سکتی ہے؟

① پارہ: ۲۵ سورۃ فصلت، الآیۃ: ۵۳.

اسی طرح ریلوں اور موٹروں سے روح کو کیا فائدہ؟ ریل اور موٹر اپنے وجود ظہور میں خود ہی روح کے محتاج ہیں تو روح کو ان کی احتیاج کیا ہوسکتی ہے۔اس لئے ان تمام مادّی کرشمہ آرائیوں اور سائنسی ایجادات کا نفع اگر ہوسکتا ہے تو صرف بدن ہی کے لئے ، نہ کہ روح کے لئے۔ ریل اور موٹر میلوں کو منتقل کر سکتے ہیں تو بدن کو، برق اور گیس اگر ضیا پاشی کر سکتے ہیں تو اجسام پر، نہ کہ ارواح پر، جن کے نور سے خود ہی وہ ظہور میں آئے۔گراموفون، ٹیلی فون، ٹیلی گراف اور لاسکی وغیرہ اگر منقطع کر سکتے ہیں تو اجسام کو، ورنہ روح اپنی حقیقی قوتوں کے لحاظ سے ان اپنے پروردوں کی کیا محتاج ہوسکتی ہے۔

پس ان تمام اسبابِ راحت کی راحت رسانی بدن تک محدود نکلی اور بدن کیا ہے؟ وہی عناصرِ اربعہ کا مجموعہ اور آگ ، پانی، ہوا، مٹی کا گھروندہ، تو یوں کہو کہ آپ نے ان آگ پانی کی ایجادات کے ذریعہ آگ پانی ہی کو نفع پہنچادیا۔ بالفاظِ دیگر آپ نے باہر کا آگ پانی لیا اور اندر کے آگ پانی تک پہنچا دیا اور اب روح کا کام یہ رہ گیا کہ وہ اپنے علم وادراک کا سرمایہ آفاقی آگ پانی پر خرچ کرتی رہے اور یہ بیرونی آگ پانی بدن کے آگ پانی کو دیتی رہے۔یعنی جسم کی خدمت گزاری میں ہمہ وقت مصروف رہے، اس کے صاف معنی یہ نکلتے ہیں کہ آپ نے روح کو جو ان عناصر سے لطیف تر اور بالاتر تھی اور جو ان پر حکمرانی کر رہی تھی، آپ نے دھوکہ دے کر اسے جسم جیسی کثیف چیز یا بعنوان دیگر عناصر کا غلام بنا دیا۔ ایک لطیف چیز کو کثیف کے تابع کر دیا اور بہ تعبیر دیگر آپ نے لطیف روح کو خود اسی کی لطافت مٹانے میں استعمال کیا جو قلب موضوع ہے، پس اب اس مسکین روح کی مثال ایسی ہوگئی، جیسے ایک عالم وفاضل بادشاہ جس سے ملک وقوم کو بڑے بڑے منافع کی توقع ہو اور جس کے حسن سیاست اور کمال تدبیر سے ملک کے دفاع و بہبود کی ہزارہا امیدیں وابستہ ہوں، باوجود اس علم وفضل کے اس کے مزاج میں کوئی چالاک اور کمینہ غلام دخیل ہو کر رسوخ پالے اور اپنی ذاتی اغراض ومنافع میں بادشاہ کو استعمال کرنے لگے اور ملک کا پیٹ کٹوا کر صرف اپنا تنورِ شکم بھرنے کی فکر میں لگا رہے، ادھر بادشاہ غلام کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اسی کا کہا کرنے لگے، وزراء لاکھ سمجھائیں، نصائح کریں اور منت وسماجت سے بادشاہ کو راہِ راست لانے کی کوشش کریں لیکن یہ کمینہ غلام کسی کی نہ چلنے دے بلکہ اور الٹا وزراء سے بدظن کر دے اور بادشاہ کے وسیلے اور ذرائع معلومات کو چہار طرف سے مسدود کر کے صرف اپنے ہی ڈھنگوں پر لگا لے یا گویا زمامِ سلطنت بظاہر تو بادشاہ کے ہاتھ میں ہو۔ لیکن حقیقتاً بادشاہ کے پردہ میں یہ کمینہ غلام حکومت کر رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں حکومت کا قضیہ برعکس ہو جاتا ہے۔ جو حاکم تھا محکوم ہو گیا اور جو محکوم تھا وہ حاکم ہو گیا۔

اور سب جانتے ہیں کہ ایسی مملکت جس میں کمینے برسرِ اقتدار آجائیں اور اشراف دھکے کھاتے پھریں، دیرپا نہیں ہوسکتی بلکہ ایسے ملک کی تباہی کے آثار جلد سامنے آنے لگیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بادشاہ معزول کر دیا جائے گا اس کی امارت وسلطنت چھن جائے گی۔ ادھر آپ خود سمجھ لیں کہ انقلابِ سلطنت کے بعد اس کمینہ ملازم کا

کیا حشر ہوگا؟ وہی اس کے وسائلِ عمل اور اعضاءِ کار جوان خود غرضیوں میں اس کے ہمنوا اور مددگار تھے، خود اسی کے خلاف گواہی دیں گے اور اپنے کو تباہ ہوتے دیکھ کر پہلے خود اسی کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے جس سے ہر صورت میں سب سے زیادہ یہی کمینہ قابلِ گردن زدنی قرار پائے گا اور اس کے لیے ملک کے کسی گوشہ میں پناہ نہ ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ روح ایک عالم فاضل ہے، جس میں محسوسات معقولات اور وجدانیات کے پاکیزہ ملکات ودیعت ہیں جو کائناتِ بدن ہی میں نہیں بلکہ اس کے واسطہ سے کائناتِ عالم پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، عقل اس کا وزیر اعظم ہے اور نقل اس کا قانون ہے، مگر ساتھ ہی اس کا ایک کمینہ اور بدذات خادم بھی ہے، جس کے واسطے سے ملک میں شاہی احکام جاری ہوتے ہیں تاکہ وزراء وعمائدان کا نفاذ کریں۔ وہ کمینہ خادم یہ بدن ہے جو عناصرِ اربعہ کا مجموعہ ہے۔ کمینہ اس لئے ہے کہ جس قدر بھی اس کے اجزاءِ ترکیبی ہیں، سب بے شعور، لایعقل، جاہل اور بے تمیز ہیں۔ جن میں اچھے برے کا کوئی امتیاز نہیں۔ کمینگی کی یہ حالت کہ جو ان سے زیادہ محنت کر کے ان کا قرب حاصل کرے اسی کے سب سے زیادہ دشمن اور قاتل بن جاتے ہیں۔

ایک انسان مٹی کی مورتوں اور پتھر کے وزنی بتوں کے سامنے کتنے ہی طویل زمانہ تک سجدے کرتا جائے، لیکن اگر وزنی مورت اوپر سے آگرے تو پہلے اپنے اس مقرب پوجاری کا سر پھوڑے گی، اسے قطعاً خیال نہ ہوگا کہ یہ میرا محب اور عبادت گزار بندہ ہے، مجھے اس کا سر نہ کچلنا چاہئے بلکہ میرا یہ معاملہ صرف ان لوگوں کے ساتھ ہونا چاہئے جو مجھ سے بعید تر ہیں، اور معبودانہ عظمت کو تسلیم نہیں کرتے۔

اسی طرح ایک شخص اگر سینکڑوں برس بھی کسی دریا کے پانی کے سامنے ڈنڈوت کرے، ناک رگڑے اور عابدانہ التجائیں کرے کیونکہ جب بھی سیلاب کی رو آئے گی تو پہلے اسی کو غرق کرے گی جو اس سے زیادہ قرب حاصل کئے ہوئے ہوگا۔ اسے قطعاً یگانے اور بیگانے کی تمیز نہ ہوگی۔ ایک مجوسی برسہابرس بھی آتش کدہ میں سربسجود رہے۔ لیکن آگ اس کی اعانت نہیں کرسکتی بلکہ اس کی پہلی لپٹ اپنے اسی مقرب کو پہلے پھونکے گی۔ ہوا پرست ہزار ہوائی باتوں میں رہیں لیکن ہوائے نفس کے جھکولے پہلے صاحبِ ہوا ہی کو غارت کریں گے، دوسروں تک نوبت کہیں بعد میں آوے گی۔ آپ تمدّن کے سلسلہ میں ہی دیکھ لیں کہ جو زیادہ سے زیادہ مادیات کے عاشق ہیں، وہی مادیات کے ہاتھوں میں زیادہ تباہ و برباد بھی ہیں۔ مشینوں کی لپیٹ میں وہی زیادہ آتے ہیں۔ جو مشینری میں رات دن مبتلاءِ عمل ہیں، ہوائی جہازوں سے زیادہ وہی تباہ ہوتے ہیں، جو ان سے زیادہ مزاولت اور مقاربت رکھتے ہیں۔

ڈریڈناٹ اور وزنی آلاتِ جنگ سے وہی لوگ زیادہ ختم ہورہے ہیں، جو ان آلات کے سامنے سربسجود ہیں، گیس اور زہریلے ٹینک رائفلیں اور ریوالور، کارتوس اور بارود سے انہیں کا خاتمہ زیادہ ہورہا ہے جو ان کے عشق میں جان باختہ ہیں اور کبھی بھی مادّیات کے ان روشن آثار کو ادھر التفات نہیں ہوتا کہ جو ہمارے موجد اور غلامِ بے درہم ہیں اور جنہوں نے اپنی جانوں ہی کو نہیں بلکہ ایمانوں کو بھی ہم پر نثار کردیا ہے، کم از کم انہیں تو اپنا نشانہ نہ

بنائیں۔ انہی کو جا کر تباہ کریں جو بے لاگ رہ کر ہم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

پس اس سے زیادہ مادیات کی کمینگی اور سفلہ پن اور کیا ہوسکتا ہے کہ انہیں نہ صرف دوست دشمن کا کوئی بھی امتیاز نہیں بلکہ جوان کا زیادہ دوست ہے، اس کے زیادہ دشمن ہیں، سفلہ پن کی اسی پر حد نہیں، بلکہ مزید برآں یہ بھی ہے کہ جوان کا دشمن ہے، الٹے اس کے قدموں میں پڑ کر دعویٰ دوستی کرتے ہیں، پس ان کی اطاعت شعاری علم وشعور سے نہیں، فاضلانہ اخلاق سے نہیں، بلکہ جوتے کے زور سے ہے اور یہ واضح رہے کہ اخلاق کے جہاں میں دباؤ کو اطاعت نہیں کہا جاتا، پس جن عناصر کے سفلہ پن کی یہ حالت، ہوان سے مرکب شدہ بدن سے کب کسی خیر کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اور ایسے بدن کے لئے اگر کمینہ کا لقب اختیار کیا جائے تو کیا حرج ہے؟

قوائے روح کے غلط استعمال کا نتیجہ حرمان وخسران ہے...... بہرحال اس نالائق اور کمینہ غلام (بدن) نے اپنے ذاتی تعیش کی خاطر روح کو اپنے ڈھب پر لگالیا، عقل دوراندیش سے برسرپیکار کردیا، قانونِ نقل کو طاق نسیان پر پھینکوا دیا حظوظِ نفس کی تحصیل اور عاجل منافع سے لاپرواہ بنا دیا اور اس غفلت زدہ روح نے اپنی تمام کمالاتی قوتوں سے وہ حظوظ حاصل کرنے شروع کردیے، جن کا نفع فقط اس چورنگ مادّہ یا کمینہ غلام ہی کو پہنچ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بدن کو تو کچھ مل گیا، مگر روح خالی ہاتھ رہ گئی بلکہ جو کچھ بھی اس نے حاصل کرنے کا عزم باندھا تھا، اس میں بھی خود اس غلام ہی کی محتاج ہوگئی۔ وہ روح جو کہ کمالاتِ ربانی کا نمونہ ہونے کے سبب استغناء کی اعلیٰ شان رکھتی تھی اور کسی کی محتاج نہ تھی، وہ اپنے اس لایعقل بدن کی محتاج ہوگئی جو ہر جہت سے خود اس کا محتاج تھا۔ وہ غنی روح جس سے ان تمام وسائلِ کار کا وجود تھا، وہ اپنے ہر عمل میں خود ان وسائل کے ہاتھوں کو دیکھنے لگی اور وہ روح جو کبھی مسجودِ ملائک بنی تھی، آج عبدالاسباب بن کر اپنے ہی باندی غلاموں کو سجدے کرنے لگی اور اس درجہ عناصر کی غلام بن گئی کہ اگر مادی وسائل اس کے ہاتھ میں نہ ہوں تو وہ بیکار اور اپاہج ہے۔ اندریں حالات اس روح نے اپنی علمی طاقتوں سے مادّی منافع کا ایک تمدن تو قائم کیا مگر اپنے ان جوہری کمالات کو کھو کر جو اس کے جزوِ نفس ہوتے اور ہر موقع پر اس کے ساتھ رہتے، وہ شہر میں ہوتی یا جنگل میں، اسباب کے ہجوم میں ہوتی یا بے وسیلہ، ہر جگہ اپنا جوہر نمایاں کرسکتی۔ لیکن یہ غلام اور غلام پسند روح محتاجگی کے اس درجہ پر آگئی کہ اگر شہر میں ہے اور شہر بھی وہ جہاں بجلی سسٹم اور اسٹیم کی طاقت مہیا ہو تو باکمال ہے۔

ریڈیو سے خبر بھی دے سکتی ہے، ٹیلیفون کرسکتی ہے، ٹیلیگراف سے آواز بھی پہنچا سکتی ہے، کیمرہ ہو تو فوٹو بھی اتار سکتی ہے، لیکن اگر وہ دیہات میں ہو، جہاں ان مادی وسائل کا وجود نہ ہو یا شہر ہی میں ہو مگر بجلی فیل ہوجائے یا دشمن بڑھ کر برقی تاروں کو کاٹ دے تو یہ پھر روح اپاہج اور نکمّی ہے۔ اس کا حاصل بجز اس کے اور کیا نکلتا ہے کہ یہ روح اپنے اصلی اور جوہری کمالات لوہے پیتل کے حوالہ کر کے خود کوری ہو بیٹھی، جو محتاجگی اور غلامی کی بدترین مثال ہے۔

حالانکہ روح تو وہ تھی جو شئونِ ربانیہ کی جامع تھی، وہ علم اور معرفت کا ایک حظِ وافر لے کر آئی تھی، وہ

لطافتوں اور طاقتوں کا خزانہ تھی، اس کا استغناء اور کمالِ غیرت تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنے کسی فعل میں بھی اپنے باندی غلاموں اور ان بے شعور اور اپاہج مادوں کی محتاج نہ ہوتی۔ وہ اگر دیہات میں بیٹھ کر جہاں نہ بجلی نہ فون ہوتا نہ گیس کا خزانہ، اگر وہ آواز نکالتی تو وہ آواز مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتی، وہ اگر ایسی جگہ نقل وحرکت پر آتی، جہاں نہ ریل ہوتی نہ موٹر اور طیارہ، تو سیکنڈوں میں ہزار ہا میل کا سفر طے کر لیتی۔ وہ اگر دیکھنے پر آتی تو ایک تنگ و تاریک کونہ میں بیٹھ کر ساری دنیا ہی کی نہیں عرش عظیم تک کی کائنات کا معائنہ کر لیتی۔ زمین اس کے لئے سمٹ جاتی ' ہوائیں اس کے لئے مسخر ہوتیں، زمانہ اس کے لئے سمٹ جاتا، وہ سیرابی وتری میں دریاؤں کے رحم وکرم کی محتاج نہ ہوتی بلکہ دریا خود ہی اپنی روانی اور طغیانی میں اس کے اشاروں کو دیکھتے۔ وہ جنگ وقتال میں لوہے اور ہتھیاروں کی محتاج نہ ہوتی بلکہ جس پر ہاتھ ڈالتی وہی اس کے لئے ہتھیار ہو جاتی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا کہ یہ مادی اور عنصری آلات جب کہ اس عنصری لطافت پر ایسی طاقتوں کے کام کر سکتے تھے۔

تو روح نہ صرف ان سب لطافتوں کی جامع ہی تھی بلکہ ان سے ہزار ہا گنا بڑھ چڑھ کر لطافتوں کا ایک عمیق خزانہ بھی اور انہی لطافتوں کے سبب اس مالک الملک کی ذات پاک سے مناسبت تامہ رکھتی تھی۔ جو اپنے کسی کام میں وسائل کی محتاج نہیں بلکہ وسائل ہی اپنے وجود میں اس کے محتاج ہیں، تو ضروری تھا کہ روح ربانی کی شان بھی ایسی ہوتی ہو کہ وہ اپنے کاروبار میں ایک لحہ کے لئے بھی ان مادی وسائل کی محتاج نہ ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بجلی تو پل بھر میں آسمانوں پر چڑھ جائے، اور جو روح بجلی کو مسخر کرنے کی طاقت رکھے، وہ زمین سے ایک انچ بھی بجلی کی مدد کے بغیر اوپر نہ اٹھ سکے۔ کیا وجہ ہے کہ ایک انجن تو اپنی آگِ پانی کی اندرونی طاقت سے مشرق ومغرب کو ایک کر ڈالے اور جو انسان خود انجنوں میں یہ طاقت مہیا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، وہ ایسی سریعانہ حرکتوں میں ایک قدم بھی نہ اٹھا سکے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تار اور ٹیلیفون کی برقی رو تو ہزار ہا میل کی خبریں منٹوں میں لے آئے اور وہ انسان جو مشینریوں میں خود بجلی کی روح کو پھونکتا ہے، ایک میل بھی از خود اپنی آواز نہ پہنچا سکے۔

بہر حال اگر مادیات سے ایسے عجائبات کا ظہور ہو سکتا ہے اور وہ بھی بہ طفیلِ روح، تو خود روح اور روحانیت سے تو ایسے ہی نہیں، بلکہ ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر عجائبات کا کارخانہ کھل جانا چاہئے تھا، تا کہ اس غیر محتاج روح کے استغناء وغیرت کا پورا پورا ظہور ہو سکتا ورنہ یہ کیسی الٹی بات ہے کہ مستعیر تو طاقت ور اور مالک کلیتہً ضعیف ولاچار غلام تو حکمران اور بادشاہ مجبور و بے بس۔

روحانی طاقتوں کے محیّر العقول کارنامے...... آپ اسے کوئی خیالی بات یا محض کوئی علمی نظریہ نہ سمجھیں، بلکہ حقیقتاً روح جب بھی اپنی اصل فطرت پر چلی ہے تو اس سے بلا واسطۂ اسباب ایسے ہی عجائبات کا ظہور ہوا ہے اور اس نے مادوں سے اپنی غلامی کرا کر انہیں اپنی روحانیت کے بل بوتہ پر خوب خوب نچایا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے منبرِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر خطبہ پڑھتے ہوئے اچانک "یَا سَارِیَةَ الْجَبَلِ" ①
کی صدا مدینہ سے نہاوند کی پہاڑیوں تک عراق میں پہنچادی حالاں کہ اس وقت تک لاسلکی کا خواب بھی کسی کو نہ آیا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مقامِ ابراہیم پر کھڑے ہو کر اعلانِ حج کی ندا دی تھی، وہ عالم کے گوشہ گوشہ میں ہی نہیں بلکہ ماؤں کے رحموں میں چھپے ہوئے بچوں کے بھی کانوں میں گونج گئی حالاں کہ وہ کسی مکبر الصوت آلہ کے ذریعہ نہیں دی گئی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کے ایک نئے دروازہ کے کھلنے کا تڑاکہ زمین پر بیٹھے بیٹھے سن لیا جو کہ یقیناً کسی برقی آلہ کے ذریعہ نہیں سنایا گیا تھا۔ آپ نے جہنم کے قعر میں ایک پتھر کے گرنے کا دھماکہ دنیا ہی میں سن لیا جو ستر برس میں اس کی تہ تک پہنچا تھا حالانکہ یہاں بھی کوئی حسی اور مادی آلۂ صوت استعمال میں نہیں لایا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث ابن ابی ضرار کے فدیہ کے اونٹ اور لونڈیاں مع تعداد، اس کے بتلانے سے پیشتر ہی بتلا دیں حالاں کہ وائرلیس کے ذریعہ بعید کی خبریں دینے کی کوئی بھی ایجاد اس وقت تک نہ ہوئی تھی۔

آپ نے وحیِ الٰہی سے پتہ دیا کہ کسی بشر کی زبان سے کوئی کلمہ نہیں نکلتا کہ وہ محفوظ نہ کرلیا جاتا ہو ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ ② حالاں کہ اس وقت ریڈیو کی برقی لہروں کے ذریعہ جو کی آوازیں جذب کرنے والوں اور ان کے نظریوں کا کوئی نشان بھی نہ تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ موتہ کے پورے نقشۂ جنگ کو مسجدِ نبویؐ کے منبر ہی سے معائنہ فرما کر حاضرین کو پتہ دے دیا حالانکہ وہاں آج کے آلاتِ خبر رسانی کی بو دو نمونہ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے حرم میں بیٹھے ہوئے مسجدِ اقصیٰ کی محرابیں اور طاق تک دیکھ کر گن دیئے حالاں کہ اس وقت تک دوربین کی کوئی ایجاد کسی کے حاشیہ خیال میں نہ تھی۔ اس سے آگے بڑھ کر صلوٰۃ خوف میں انہی عرب کی وادیوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت و نار کا مشاہدہ فرمالیا۔ عرفات کے میدان میں شیطان کو ویل و ثبور کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ یوم بدر میں ملائکہ مسوّمین کی فوجوں کے پرّے مشاہدہ فرمالئے اور ایک شبِ تار میں غیبی حقائق یعنی فتن و آلام کے نزول تک کا معائنہ فرمالیا، حالانکہ وہاں مادّی شیشوں کی کوئی دوربین درمیان میں نہ تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے تختِ سلیمانی پر فضا میں پروازیں کیں اور ہوائیں ان کے اشاروں پر چلیں حالاں کہ آج کے ہوائی جہازوں کی ساخت کی طرف اس وقت کوئی ادنیٰ التفات بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف فضاء آسمانی بلکہ سارے ہی آسمانوں کا سفر لمحوں میں طے فرمالیا۔

---

① احیاء علوم الدین، باب فی اکتساب المعرفة لامن التعلم... ج:۲ ص:۲۲۷. مرقاةالمفاتیح شرح مشکاةالمصابیح، کتاب المناقب، باب مناقب عمر رضی الله تعالىٰ عنه، ج:۱۷، ص:۳۷۳.

② پارہ:۲۶، سورۃ ق، الآیة:۱۸.

حالانکہ وہاں کسی پٹرولی طیارہ کا واسطہ اس سیر میں نہ تھا کہ طیاروں کا تخیل بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا اور طیارے ہوتے بھی تو انہیں آسمانی سیر سے کیا علاقہ ہوتا۔ اس طرح کے ہزارہا واقعات بطون تاریخ میں منضبط ہیں، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ روحانی قوتوں کے مالک مادوں کے غلام کبھی نہیں ہوتے۔ بلکہ مادیات ہی نے ان کے اشارۂ خم ابرو پر ہمیشہ کام کیا اور ان کی غلامی کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ روح کی اصل شان استغناء ہے کہ وہ اپنے منبع وجود ذات حق سے وابستہ رہ کر اور اسی کے ساتھ اپنی مناسبتوں اور مماثلتوں کو بحال رکھ کر اپنے کسی فعل میں ان مادّیات کی جو اس سے بدرجہا کمتر ہیں محتاج نہ ہو، جیسا کہ اس کی فطری لطافتوں کا تقاضا ہے اور جس کی متعدد مثالیں انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ کے کرامات وخوارق سے پیش کی گئیں، جن میں ایک لمحے کے لئے مادّیات سے کوئی مدد نہیں لی گئی بلکہ وہ محض روحانی آثار کے مظاہرے ہیں جن میں مادّیات کو روحانیت کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔

مادی تصرّف کوئی حقیقی کمال نہیں...... بہرحال روحانی اقتدار کے ان ثابت شدہ نمونوں اور خوارق کی ان سچی مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک باکمال روح کا اصل کمال درحقیقت مادیات سے مستغنی ہونے اور مادی وسائل کی گرفت سے آزاد ہو جانے میں پنہاں ہے، ورنہ کسی روح کا مادّیات میں مادی وسائل کے ذریعہ تصرّفات کر لینا خود روح کا کوئی مخصوص کمال اور ممتاز کارنامہ نہیں ہے۔ یوں تو ایک مادہ بھی مادہ میں بلاواسطۂ روح تصرّف کر لیتا ہے۔

کہیں مٹی اور غبار اڑ کر بھی چند صدیوں میں دریا کو خشکی بنا دیتا ہے۔ رواں پانی نشیب میں نئے نئے نکاس نکال کر برّ کو بحر اور بحر کو برّ کر دیتا ہے۔ کوہ آتش فشاں پھٹ کر خنک فضاء کر کرۂ نار بنا دیتا ہے۔ ہوائیں چل چل کر تالابوں اور جھیلوں کو خشک کر دیتی ہیں۔ پس مادہ میں تصرّفات کر لینا اگر کوئی کمال ہے تو یہ کمال تو خود مادی قوتیں بھی کر دکھاتی ہیں، جہاں روحانیت کا کوئی توسط نہیں ہوتا، پس اگر انسان کی انسانیت ان عناصر سے بدرجہا افضل ہے اور ضرور ہے اور اگر وہ عناصر کے تینوں موالید میں اعلیٰ واشرف ترین نوع ہے، اور بلاشبہ ہے، تو اس کا مابہ الفخر یا مابہ الامتیاز کمال وہ نہیں ہو سکتا، جو اس سے ارذل ترین اشیاء سے بھی سرزد ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ روح کے یہ تصرّفات بھی ان مادّیات ہی کے واسطہ سے ہوں، گویا روح ان کی وساطت کے بغیر اس تصرف پر بھی قادر نہ ہو، تو پھر روح کے لئے یہ بے کمالی ہی نہیں بلکہ ایک کھلا ہوا عیب ہو گا کہ اپنے سے ارذل ترین اشیاء کی محتاج بن جائے اور اپنا کمال ان سے ڈھونڈنے لگے۔ کیوں کہ کسی کامل کے لئے عیب کی جڑ استکمال بالغیر ہے۔ جب کہ وہ غیر اپنے سے ارذل اور کمتر ہو، ہاں اپنے سے برتر سے استکمال کرنا عیب کی بجائے ایک بہترین ہنر ہے۔ کیوں کہ بلا استکمال بالغیر اپنی ذات سے خود بخود باکمال ہونا صرف ایک ذات بابرکات حق ہی کی شان ہو سکتی ہے جو ہر عیب سے منزہ اور ہر کمال کا منبع ومخزن ہے۔ مخلوق کسی حال میں بھی بے عیب محض نہیں ہو سکتی اور کچھ بھی نہیں تو مخلوقیت کا عیب تو اس سے ہٹ ہی نہیں سکتا۔ جس کی حقیقت عدم اصلی نکلتا ہے اور جب کہ مخلوق ذات کے درجہ میں معدوم نکلی تو ناگریز

ہے کہ درجۂ ذات میں کمالات سے عاری بھی ہو کہ عدم ہی تمام نقائص وعیوب کا منبع ہے اور ظاہر ہے کہ پھر اس عیب دار کے باکمال بننے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ اسی منبعِ وجود ذات (یعنی حق جل مجدہٗ) کی طرف رجوع کر کے استکمال کرے، جو کمالات کا مخزن اور عیوب سے مبرّا ہے۔ نہ یہ کہ حصولِ کمال کے لئے اپنے سے ارذل ترین چیز (مادہ) کی طرف جھکنے لگے کہ محصولِ کمال کے لئے اپنے بدن یا مادّیت کی طرف جو مجموعۂ عناصر ہے، رجوع کرے گویا آگ پانی ہوا، مٹی سے کمال کا جویا ہو تو وہ استکمال نہیں بلکہ ازالۂ کمال اور استحصالِ نقص ہے کہ اپنے سے ارذل کی احتیاج وغلامی ہے اور گویا سلاطین کا غلاموں کی بندگی کرنا ہے جو خود ایک بدترین اور شرمناک عیب ہے، پس اگر سائنس کی حقیقت یہی ہے کہ انسان مادہ کے ذریعہ مادوں میں تصرّفات کرنے پر قادر ہو جائے تو اس صورت میں انسان آگ پانی کے گھروندہ سے باہر ہی نہیں نکلتا کہ اسے حقیقی انسانیت کا حامل بھی کہا جائے بلکہ ایک ناقص اور عیب دار انسان ثابت ہوتا ہے، جس کا عیب بھی حد سے گزر کر شرمناک ہو، ورنہ کم سے کم کوئی ایسا ہنر تو کسی سے بھی ثابت نہیں ہوتا جس سے انسانیت کی کوئی امتیازی شان ہویدا ہوتی ہو۔

انسان میں محتاجگی کا اصل مادہ ہے…… ہاں اگر مادہ میں کچھ بھی استغناء کی شان ہوتی، تب بھی ممکن تھا کہ اس کی غلامی سے تھوڑا بہت استغناء ہی ہاتھ لگ جاتا۔ لیکن جب کہ خود اس کی اصل اور ذاتی صفت ہی محتاجگی اور پابستگی ہے اور گویا مجبوریت ہی اس کی شانِ امتیاز ہے تو اس کی غلامی سے استغناء تو کیا حاصل ہوتا، حاصل شدہ استغناء بھی فنا ہو جائے گا اور مجبوری در مجبوری پیدا ہو جائے گی جو تمام ذلتوں کی جڑ ہے، پس روح جیسے مستغنی، جوہر کا مادہ جیسے مجبور ومحتاج عنصر کی دہلیز پر جھکنا حقیقتاً اپنی امتیازی شان کو فنا کر دیتا ہے۔

عناصرِ اربعہ کے اخلاق اور ان کی محتاجانہ خاصیتیں…… ہاں اب یہ معمہ حل طلب رہ جاتا ہے کہ اس چورنگ مادہ میں ذاتی محتاجگی کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ سو ظاہر ہے کہ ہر چیز کی خیر وشر اس کے طبعی اخلاق سے پھوٹتی ہے، اس چورنگ مادہ کے جبلی اور طبعی اخلاق ہی سراپا احتیاج وغلامی ہیں، اس لئے انسانی نفس جس حد تک بھی مادّہ اور مادّیات کا شغل قائم رکھے گا۔ اسی حد تک محتاجگی اور غلامی کا اکتساب کرتا رہے گا چونکہ انسان کے نفسِ امارہ کی نشو ونما اور امتزاج انہی عناصرِ اربعہ سے ہے۔ اس لئے وہ انسان کو پستی ودنائیت اور محتاجگی کی طرف سے لے چلتا ہے، جو در حقیقت عناصر کی طبعی اور خاموش رہنمائی ہوتی ہے۔ اگر اس انسانیت پر روحانیت کا نور فائز نہ کیا جائے یا وہ اپنی روحانیت کی پناہ میں نہ آئے تو یہ چورنگ مادہ اور اس کے جبلی اخلاق ایک لمحہ کے لئے بھی اسے محتاجگی اور بے بسی کی دلدل سے نہیں نکلنے دے سکتے کہ مادہ کی خلقت وجبلت ہی بے بسی اور محتاجی ہے۔

مٹی اور اس کے جبلّی اخلاق…… چنانچہ اولاً مٹی ہی کو لے لیجئے اور غور کیجئے کہ اس کی جبلی اور بنیادی خاصیت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی حسی خاصیت تو پستی اور تسفل ہے اور معنوی یا اخلاقی خاصیت قبض اور بخل ہے، چنانچہ جو چیز بھی زمین میں رکھ دی جائے اسے دبالے گی اور جب تک آپ اس کا جگر چاک کر کے خود ہی نہ نکالیں، نہ دے گی،

آدم کی اولاد کے نامعلوم کس قدر خزانے اور کتنے دفینے اس نے اپنے بطن حرص وآز میں چھپا رکھے ہیں اور اس کا پیٹ چاک کر کے نکال لو تو فبہا، ورنہ از خود اطلاع نہ دے گی، نہ چیز دے گی۔ آپ زمینی کشت زار کو دیکھ کر خیال نہ کریں کہ زمین تو بڑی فیاض ہے، جو ایک کے سو کر دیتی ہے اور کھیتوں کے ذریعہ اس کے جود وسخا کی داستانیں سنانے لگیں، کیوں کہ دانہ خود آپ کا ہے جس میں زمین کا دخل نہیں اور اگر وہ زمین سے حاصل شدہ بھی ہے تو وہ بھی کسی ڈالے ہوئے دانے کا طفیل ہے نہ کہ خود زمین نے دانے اور بیج کی ایجاد کی ہے، اس سے واضح ہے کہ سب سے پہلی اور ابتدائی کھیتی کا بیج یقیناً باہر سے زمین میں ڈالا گیا ہے نہ کہ زمین نے ابتداء کی ہے، پس دانہ یقیناً آپ کا ہے نہ کہ زمین کا، اس لئے داد ودہش کی ابتداء زمین سے نہیں ہوئی بلکہ انسان سے ہوئی، پھر دانہ ڈال کر اس کو محفوظ رکھنے، بڑھانے اور پھر نکالنے کے سامان بھی آپ ہی کی طرف سے ہیں، اگر پانی نہ دیا جائے تو زمین اصل بیج کو بھی سوخت کر دیتی ہے، چہ جائیکہ اسے باقی رکھ کر بڑھائے، پس پانی دینا درحقیقت بیج کو باقی رکھنا، بڑھانا اور بڑھا کر اس میں سے دوسرا دانہ کھینچ لینے کا ایک آلہ ہے، اس لیے زمین نے نہ محض از خود بیج کو بڑھا نہ دیا، بلکہ پانی کا لشکر بھیج کر آپ نے جبراً اس سے راس المال مع سود کے منگوالیا۔ اس لئے زمین کا ذاتی خاصہ قبض وبخل بحالہٖ ثابت شدہ رہا۔

اب جب کہ یہی قابض اور بخیل مادہ انسان کا جزوِ اعظم ہے اور وہ مشت خاکی کہلایا۔ تو جبلی طور پر اس کے نفس میں پہلا خلق یہی قبض اور بخل کا سرایت کرتا ہے چناں چہ پیدا شدہ بچہ کو ذرا بھی ہوش آتا ہے تو وہ قبض اور بخل یعنی لینے اور ہضم کرنے کے لئے چیختا ہے نہ کہ دینے اور ترک کرنے کے لئے، آپ جو چیز بھی بچہ کے سامنے ڈال دیں گے، اسے اٹھائے گا اور طبعی تقاضا سے منہ کی طرف لے جائے گا تا کہ اسے قبض کر کے ہضم کر جائے، اسے دیتے رہو تو خوش رہے گا، چھیننے لگو تو چلائے گا۔ پس جبلی طور پر اس کی طبعیت سخا اور ایثار کی طرف نہیں جاتی، بلکہ قبض اور بخل کی طرف کہ اس میں عنصرِ خاکی کا غالب خلق یہی قبض وبخل ہے اور ظاہر ہے کہ قبض وبخل جس کا منشاء حرص وطمع ہے، محتاجگی اور غلامی پیدا کرتے ہیں، غنا واستغناء سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ کیوں کہ بخیل اول تو خود اس شے کا محتاج ہوا جس میں بخل ظاہر ہوا، پھر اس شخص کا محتاج ہوا جس کی شے ہے، پھر اس کی عطا کا محتاج جس کی بدولت یہ شے اس کے پاس آئے گی، پھر اگر معطی اور عطا اور عطیہ نہ ہو تو بخیل اس درجہ محتاج ہے کہ اپنے بخل کا بھی پوری طرح اظہار نہیں کر سکتا، اس لیے ایک بخیل کسی چیز کے لینے سے بیشتر تو معطی کا محتاج اور لینے کے بعد اس عطیہ کا محتاج ہو جاتا ہے کہ اپنے قلب وقالب کو اس سے جدا کر لینے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس لئے بخیل کے لئے اول وآخر محتاجی اور غلامی ہی نکلتی ہے اور زمین میں چوں کہ یہی وصف ایک امتیازی وصف ہے۔ اس لئے اس کی محتاجگی وذلت بھی سارے ہی عناصر سے زائد ہے، اس لئے یہ خاکی انسان خاکی رہتے ہوئے جبلی طور پر بخل کے رذیلہ میں گرفتار رہتا ہے۔ جو سراپا احتیاج (نمایاں ہو) ذلت ہے اور قبض وبخل کے بجائے سخا وایثار پیشہ بن جائے تو اس کا ثمرہ استغناء ہے جو سراپا عزت ومحبوبیت ہے اور اس میں کسی غیر کی احتیاج وغلامی نہیں بلکہ غیر ہی سے اپنی غلامی کرانا ہے۔

آگ اور اس کے جبلّی اخلاق......اسی طرح آگ کو لو تو اس کی طبعی خاصیت اور جبلت ترفع ہے کہ سر نیچا ہی نہیں کرتی۔ کسی واجبی مصلحت سے بھی دباؤ تو نہیں دبتی۔ گویا آگ خاک کی ضد ہے کہ وہ ہمہ تن پستی ہے اور یہ سرتاپا تعلّی، ناری شیطان نے یہی کہہ کر حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا کہ: ﴿خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ ① ظاہر ہے کہ انسان میں آگ کا ایک کافی حصہ رکھا گیا ہے چنانچہ اس کی بدنی حرارت اور بعض اوقات بخار کا ہیجان اس کی کافی دلیل ہے۔ اس لئے ہوش سنبھالتے ہی اس میں جبلی طور پر وہی ترفع و تعلّی شیخی اور انانیت کا جذبہ ابھرتا ہے جو حقیقت میں ناری اثر ہے، چنانچہ تعلّی اور شیخی سے مغلوب ہو کر جب انسان میں جوش و غضب اور غصہ کی لہر دوڑ جاتی ہے، اس کی رگیں پھول جاتی ہیں اور چہرہ پر آگ کی سرخی آجاتی ہے، تو عرف میں یہی کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص آگ بگولا ہو گیا، فلاں میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں میں غصہ کا پانی بہہ گیا یا غصہ کی مٹی بکھیرنے لگا، بلکہ مٹی ہو جانا، اس کے ٹھنڈے ہو جانے کی علامت شمار ہوتی ہے کہ مٹی درحقیقت آگ کی ضد ہے، بہرحال انسان کا یہ ترفع و تعلّی اور انانیت درحقیقت وہی ناری خلق ہے، اب اس خلق پر غور کرو تو یہ بھی سراپا احتیاج و ذلت نظر آئے گا کیوں کہ تعلّی اور ترفع کا حاصل دوسرے پر بڑا بننے اور اپنے آپ کو ان کی نظروں میں بڑا دکھانے یا ان کے خیال پر نکلا، جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگر دوسرے ہی نہ ہوں یا ان کا خیال اس کی بڑائی کی طرف نہ آئے یا اگر ہٹ جائے تو اس کی بڑائی کی عمارت منہدم ہو جائے، ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ محتاجگی اور کیا ہوگی کہ عزت ہماری ہو اور قابو میں دوسرے کے ہو، رفعت ہماری ہو اور دوسرے کے خیالات کی بہنے والی رو میں بہتی جا رہی ہو کہ دوسرے کے پاس بھی اسے تمکن اور استقرار نصیب نہیں۔ اسی بنا پر تعلّی و تفاخر کے لئے مداراۃ ناس اور تملق بھی لازمی ہے تاکہ ان کا خیال بدلنے نا پائے اور یہ ترفع کا بھوکہ ان کی نظروں میں سبک نہ ہونے پائے۔

پس جو خلق ایک انسان کو ہزار ہا انسانوں کا محتاج بناتا ہو اس سے زیادہ ذلت آمیز اور احتیاج خیز خلق اور کون سا ہوگا؟ ہاں اس کے بالمقابل تواضع کا خلق ہے، جس کی حقیقت بلا مجبور و پابندی محض اپنے قصد و ارادہ سے کسی کے سامنے جھکنا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم آپ کے اس خیال کے محتاج نہیں کہ آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟ آپ جو کچھ بھی ہمیں سمجھیں وہ سمجھیں مگر ہم تو اپنی اصلیت پر ہیں، جو آپ کے سمجھنے نہ سمجھنے سے کسی حال بھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ پس تواضع کا حاصل استغناء اور ترفع کا حاصل محتاجگی اور غلامی نکل آیا۔ نیز تواضع کے سلسلہ میں بلند اور رفیع ہوتے ہوئے قصد و ارادہ سے جھکنا اعتماد علی النفس کی دلیل ہے کہ اس پر خود کو قابو ہے اور وہ اپنی ناریت سے مرتفع ہونا چاہتا تھا اور ہم اسے حاکمیت سے جھکا دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ نفس پر قدرت اور قابو مالکیت کی دلیل ہے جو محتاجگی کے منافی ہے۔ کیونکہ ہمیشہ مملوکیت میں ہوتی ہے نہ کہ مالکیت میں، ادھر شیخی میں انسان کو اپنے اوپر قدرت نہیں رہتی جو مجبوری اور

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۔

محتاجگی ہے، پس تواضع سے استغناء اور ترفع ونخوت سے احتیاج وغلامی پیدا ہونا اس جہت سے بھی تواضع ہے۔

غرض جب تک انسان اس ناریت کے جال سے رہا نہ ہو، یہ ناری خلق اسے محتاج اور ذلیل ہی بنائے رکھتا ہے کہ احتیاج کی خاصیت ہی ذلّت ومسکنت ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ آگ بھی اپنی جبلت سے محتاجگی کا ثمرہ پیدا کرتی ہے نہ کہ غناء کا۔

ہوا اور اس کے جبلّی اخلاق...... اسی طرح ہوا کو لیجئے کہ اس میں انتشار اور پھیلاؤ کی خاصیت ہے کہ وہ ہر جگہ موجود رہے، ہر جگہ گھسی رہے، ہر جگہ بھری رہے، ذرّہ ذرّہ اس سے وابستہ رہے۔ گویا اسے پھیلا رہنا ہے۔ انسان میں ہوائی جزو بھی ہے۔ جیسے ریاح اور سانس وغیرہ سے نمایاں ہے تو وہ بھی چاہتا ہے کہ میں ہر جگہ موجود رہوں، ہر جگہ گھسا رہوں، ہر زمان اور ہر مکان میں میرا وجود رہے۔ مگر چوں کہ اس کا مادی نفس اتنا پھیلاؤ نہیں رکھتا کہ وہ خود ہر جگہ رہے۔ اس لئے وہ انتشاریت، شہرت اور ہوا بندی چاہتا ہے کہ لوگ جگہ جگہ میرا چرچا کریں۔ میرا ذکر پھیلائیں اور اپنے ذکر وتذکرہ کے ذریعہ میں ہر جگہ موجود رہے۔ پس ہوائے شہرت انسان میں اسی ہوائی جزو کا اثر ہے۔ غور کرو تو اس شہرت پسندی کے خلق کا حاصل بھی وہی محتاجگی ہے۔ کیوں کہ انسان کی یہ خواہش بھی اس کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی کہ پہلے دوسرے ہوں پھر وہ اسے پہچانیں اور اس کے بعد اس کی ہوا بندی بھی کریں، اس کا پروپیگنڈہ بھی کریں اور چرچا بھی کریں اور اسے اڑاتے بھی رہیں۔ پس اس خلق کا حاصل بھی وہی غیروں کی احتیاج نکل آئی۔ اس لئے شہرت پسندی بھی کوئی عزت آفرین نہیں بلکہ ایک ذلت افزا ملکہ ہے جو اپنے مقاصد کو دوسروں پر معلّق کر دیتا ہے، برخلاف شہرت پسندی کی ضد کے، جسے اخفاء وتستر کہتے ہیں، کہ اس کی حقیقت میں خود بخود مگن رہنا اور دوسروں سے ہمہ تن مستغنی اور بے پرواہ ہو جانا ہے حالانکہ اس غناء پر جو قدرتی شہرت کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے وہ اس مصنوعی اور جعلی شہرت سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ بہر حال ہوا کے خلق کا حاصل بھی وہی محتاجگی اور جگہ جگہ مارے مارے پھرنا آیا۔

پانی اور اس کے جبلّی اخلاق...... اس طرح پانی کو لو تو اس کا طبعی فعل ہے، عدم الکف اور عدم الضبط، یعنی پانی میں اعتماد علی النفس کا نشان نہیں۔ وہ اپنے نفس کو خود نہیں روک سکتا۔ ہر طرف سے آپ روک لگائیں، رک جائے گا اور جہاں بند ٹوٹا برتن پھوٹا، وہیں پانی بکھرا، سیدھا چل رہا ہے اور جہاں ذرا نشیب آیا وہیں بہ گیا، ذرا کسی نے زمین کھود ڈالی، اور وہ اپنا مستقر چھوڑ کر وہیں آ رہا۔ انسان میں بھی چوں کہ پانی کا جزو موجود ہے، جیسا کہ تھوک، سنک، بلغم، پیشاب وغیرہ سے واضح ہے۔ اس لئے اس میں بھی ضبطِ نفس کا پیدائشی طور پر نشان نہیں ہوتا، ذرا کسی کی اچھی چیز دیکھی بکھر پڑے، کسی کی عورت پر نظر پڑ گئی تو گھورنے لگے، کوئی قبول صورت چیز نظر پڑ گئی، اس کے پیچھے ہو لئے، کوئی عمارت اچھی دیکھ لی تو وہیں للچاتی نظروں سے اسے دیکھنے لگ گئے کہ کاش یہ بلڈنگ ہماری ہوتی۔

غرض ذرا سا نشیب سامنے آنے سے بکھر پڑنے کا مادّہ انسان میں آبی جزو سے آیا ہے۔ مگر اس کا حاصل

بھی وہی احتیاج اور بے بسی ہے۔ کیوں کہ غیر کو دیکھ کر قابو میں نہ رہنا اور اپنے نفس کو سنبھال نہ سکنا، عدمِ قدرت اور عجز کی دلیل ہے اور عجز جڑ ہے محتاجگی کی۔ ہاں ضبطِ نفس اور اچھی سے اچھی چیز دیکھ کر بھی اس سے بے نیاز رہنا، خود کو قابو میں رکھنا اور گرنے سے بچالینا قدرت کی دلیل ہے، جس کا حاصل بھی وہی استغناء نکلتا ہے۔ اس لئے پانی کی طبعی خاصیت بھی وہی احتیاج اور غلامی نکل آئی۔

رذائلِ نفس کے چار اصول...... پس اس طرح ان مادی یا رذائلِ نفس کے چار اصول نکل آتے ہیں۔ قبض، بخل، تعلّی و ترفع، شہرت پسندی اور انتشاریت، عدم ضبطِ نفس یعنی حرص و ہوا جو آدمی کو سراپا احتیاج و غلام بنادیتے ہیں۔

فضائلِ نفس کے چار اصول...... ہاں پھر یہیں سے استغناء و خودداری کے اصول پر روشنی پڑ جاتی ہے کہ وہ ان اخلاقِ چارگانہ کی ضد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قبض و بخل کی ضد سخاوت و ایثار ہے، کبر و نخوت کی ضد تواضع و فروتنی ہے۔ شہرت پسندی اور نام آوری کی ضد اخفاء و تستر ہے۔ حرص و ہوا اور بکھر پڑنے کی ضد ضبطِ نفس اور قناعت ہے اور جب یہ چارگانہ اضداد مادہ کے چارگانہ اخلاق کی ضدیں ہیں تو یقیناً انہیں مادی اخلاق بھی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اس روح کے روحانی اخلاق شمار کئے جائیں گے جو مادہ کی ضد ہیں اور اس طرح اگر مادہ کے جوہر میں سے رذائلِ نفس کے چار اصول نکلے تھے تو روح کے جوہر میں سے فضائلِ نفس کے بھی چار ہی اصول نکل آئے، ایثار، تواضع، اخفاء، قناعت۔

اخلاق کا ظہور اعمال کے بغیر ممکن نہیں...... لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ اخلاق کے جبلی آثار افعال ہی کے ذریعہ ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اگر ان اخلاق کے مناسب افعال سرزد نہ ہوں تو اخلاق کے طبعی آثار ظہور پذیر ہی نہیں ہو سکتے، جیسے مثلاً خلقِ شجاعت کی تاثیرات بغیر فعلِ مقاتلہ و مقابلہ کے کبھی نہیں کھل سکتیں۔ خلقِ تواضع کی کیفیات بغیر انکساری کے اور جھکاؤ کے سامنے نہیں آسکتیں۔ یہی حال اور تمام اخلاق کا بھی ہے۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ ان مادی اخلاق کے اثراتِ محتاجگی اور روحانی اخلاق کے آثار کو ظاہر کرنے والے افعال کون سے ہیں؟

مادی اخلاق کا مظہر فعلِ امساک ہے...... سو مادی اخلاق کے آثار پر جہاں تک غور کیا، ان کا حاصل بجز خود غرضی اور خود طلبی کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ بخل ہو یا حرص، شہرت پسندی ہو یا تعلّی، سب کی بنیاد نفس کی اس خواہش پر ہے کہ مال و جاہ سب کا سب ساری دنیا سے کٹ کر تنہا اسی کے دامنِ ہوس میں سمٹ آئے۔ گویا ہر چیز کو اوروں سے روک کر اپنے لئے مختص کر لینا ان نفسانی اخلاق کا مقتضیٰ ہے۔ چناں چہ قبض اور بخل میں اپنی مقبوضہ چیز اوروں سے روکی جاتی ہے۔ حرص و ہوس میں دوسروں کی مقبوضہ چیز ان سے روک کر اپنے لئے پسند کی جاتی ہے۔ تعلّی و ترفع میں ہر درجۂ کمال کو دوسروں سے منفی کر کے اپنے سے مختص ظاہر کیا جاتا ہے۔

شہرت پسندی اور نام آوری میں اوروں کی نمود روک کر صرف اپنا نام چاہا جاتا ہے، پس ان سب اخلاق میں کسی نہ کسی جہت سے اوروں سے رکاوٹ اور اپنا اختصاص کارفرما رہتا ہے۔ اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاق کے طبعی آثار کو جو فعل بطور قدرِ مشترک کے کھولتا ہے، وہ امساک ہے، بخل و حرص میں یہ امساک مالی ہوتا ہے اور تعلّی

ونام آوری میں امساک جاہی۔ مگر حبِّ جاہ ہو یا حبِّ مال، دونوں کا مظاہرہ اس فعل امساک ہی سے ہوتا ہے۔ گویا ان اخلاق کے طبعی آثار خود غرضی ومحتاجگی، بغیر فعل امساک کے نمایاں نہیں ہوسکتے۔

روحانی اخلاق کا مظہر فعلِ انفاق ہے...... ادھر روحانی اخلاق چونکہ ہر ہیئت سے مادی اخلاق کی ضد ہیں، اس لئے ان کے طبعی اثرات اور ان اثرات کو ظاہر کرنے والے افعال بھی مذکورہ افعال کی ضد ہی ہوسکتے ہیں چنانچہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جیسے مادی اخلاق کا اثر خود غرضی تھا۔ روحانی اخلاق کا اثر بے غرضی ہے۔ چنانچہ ایثار و تواضع ہو یا اخفاء وقناعت، ان میں سے کسی ایک خلق کی بنیاد بھی نفس کی اس خود غرضانہ خواہش پر نہیں ہے کہ سب کچھ تنہا اسی کو مل جائے۔ بلکہ اس پر ہے کہ اپنا واجبی حق بھی دوسروں کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ سخاوت میں اپنی چیز دوسروں کو دی جاتی ہے۔ قناعت میں دوسروں کی چیز انہی کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے۔ تواضع میں اپنی عزت دوسروں پر نثار کی جاتی ہے اور اخفاء میں دوسروں کی عزت کے لئے پورا میدان دے دیا جاتا ہے۔

غرض ان تمام اخلاق کی بنیاد دوسروں سے روکنے یا چھیننے پر نہیں، بلکہ دوسروں کو دینے اور عطاء ونوال پر ہے، اس لئے واضح ہوتا ہے کہ جو فعل ان روحانی اخلاق کے طبعی آثار کو کھولتا ہے، وہ فعل امساک نہیں بلکہ اس کی ضد، انفاق ہوسکتا ہے، سخاوت وقناعت میں یہ انفاق مالی ہوتا ہے اور تواضع واخفاء میں انفاق جاہی، مگر استغناء مالی ہو یا استغناء جاہی بغیر فعل انفاق کے کھل نہیں سکتا اور یہ ایک مشاہدہ ہے کہ جاہ ومال سے یہ بے نیازی ایک طرف تو غیروں سے غنی بنا دیتی ہے اور دوسری طرف اپنے میں بے غرضی مستحکم کر دیتی ہے، جس سے وسعتِ صدر اور فراخ دلی کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے، اس لئے ان روحانی اخلاق کا اثر وسعتِ حوصلہ، استغناء، وقار، خودداری و بے نیازی اور بے احتیاجی نکلتا ہے، جس کے ظہور کا ذریعہ انفاق ثابت ہوتا ہے، شریعت کی اصطلاح میں اس انفاق ہی کا نام صدقہ ہے جس کے معنی جان ومال، آبرو اور قول وعمل کو مالک الملک کے لئے دینے اور خرچ کرنے کے ہیں۔ پھر صدقہ کرنے میں چونکہ محبوباتِ نفس اور لذائذِ طبع کو ترک کرنا پڑتا ہے جو نفس پر بالطبع شاق ہے، اس لئے اس کا دوسرا نام مجاہدہ بھی ہے۔ اس لئے خلاصہ یہ نکلا کہ طبعی امساک کے ذریعہ انسان میں جو محتاجگی اور تنگی قائم ہوتی ہے، اس کے مٹانے اور اس کی جگہ استغناء وخودداری کی دولت جاگزین کرنے کا ذریعہ صرف صدقہ ومجاہدہ اور انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

گویا انفاق کا جو درجہ بھی امساک کے مقابلہ پر آتا رہے گا اسی درجہ نفسِ انسانی میں محتاجگی وغلامی مٹ کر استغناء کے مراتب قائم ہوتے رہیں گے کیوں کہ صدقہ سے وہ مادی اخلاق مضمحل اور کمزور پڑتے جائیں گے، جن کی بدولت امساک کے افعال نمایاں ہوتے تھے۔

صدقہ سے غنا کس طرح حاصل ہوسکتا ہے...... چنانچہ ایک صدقہ دینے والا جب اپنے محبوب مال متاع کو اپنے سے کھو دیتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس نے قبض وبخل کی تو جڑ کاٹ دی، جو عارضی خلق تھا، ورنہ غلبہ بخل کے ہوتے ہوئے یہ متاع جدا ہی کب کی جاسکتی تھی اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی قبض وبخل کا رذیلہ سست پڑے گا جو محتاجگی کی

جڑ تھا، اسی حد تک سخاوایثار کا غلبہ راسخ ہوگا، جو ذریعہ استغناء ہے اور اس طرح استغناء کے ایک بڑے درجہ پر فتح ہو جائے گا۔ پھر جب کہ ایک صدقہ دہندہ کو عطاء و نوال میں لطف محسوس ہونے لگا تو ظاہر ہے کہ اب وہ دوسروں کی چیز پر نہ نگاہ حرص ڈال سکے گا نہ کسی چیز کو دیکھ کر بکھر سکے گا بلکہ اس کے عطاء و تصدق کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ کم سے کم پر اپنے نفس کو تھامے رکھنے کا خواہشمند ہے، جسے قناعت کہتے ہیں۔ پس اسی صدقہ و انفاق کے ذریعہ حرص کا بھی خاتمہ ہو گیا جو آبی خلق تھا اور اس طرح استغناء کا ایک دوسرا مقام طے ہو گیا۔

فرق اگر ہے تو یہ کہ پہلے مقام پر پہنچ کر اپنی چیز کی محبت قطع ہوئی تھی، جس سے بخل قائم تھا اور دوسرے مقام پر پہنچ کر غیر کی چیز سے محبت جاتی رہی جس سے حرص قائم تھی، اور اس طرح ایک انسان مالی سلسلہ میں نہ اپنا غلام رہا نہ دوسروں کا، پھر جب کہ یہ صدقہ اخفاء کے ساتھ کیا گیا، جس میں نام و نمود کی کوئی خواہش نہیں ہو سکتی، ورنہ چھپانے کی کیا ضرورت تھی تو اس سے شہرت پسندی اور نام آوری کی جڑ کٹ گئی جو ہوائی خلق تھا، اس عظیم محتاجگی کی جڑ کٹ جانے سے جس کی تفصیلات آ چکی ہیں، استغناء کا ایک اور مقام میسر آ گیا۔

پھر ظاہر ہے کہ یہ صدقہ دہندہ اپنے اس عمل کو چھپانے کی سعی جب ہی کر سکتا ہے جب کہ اسے اپنا یہ عمل دوسروں کے عمل سے کم نظر آئے اور وہ اپنے عمل کی دوسروں کے عمل کے مقابلہ میں کوئی برتری اور بڑائی اپنی نگاہوں میں محسوس نہ کرے۔ ورنہ وہ اس عمل کو مخفی رکھنے کی بجائے دوسروں کے عمل سے برتر اور فائق تر ظاہر کرنا اور جا بجا اس کا چرچا کرنا پسند کرتا، لیکن جب کہ وہ اپنے صدقہ کو دوسروں کے صدقات سے نسبت تک دینے سے رک رہا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے عمل کے تفوق و برتری کے خیال سے بھی جدا ہو چکا ہے، اور اس طرح دوسروں کی نسبت خود اپنی ذات کی برتری اور تعلّی سے بھی بیزار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اخفاءِ صدقہ سے تعلّی اور ترفع کی جڑ بھی کٹ گئی، جو آتشی خلق تھا اور اس طرح استغناء کا ایک چوتھا مقام میسر ہو گیا۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اپنی نیکی کے اخفاء میں مبالغہ اور وہ بھی اس حد تک کہ اپنے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور کس کو دیا گیا، خود اپنے نفس کو بھی خبر نہ ہو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نیکی پر خود اپنے ضمیر میں بھی اسے کوئی فخر و ناز محسوس نہ ہو، وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اس نیکی کی بمقابلہ غیر ہی نہیں بلکہ بحیثیت اپنے فعل ہونے کے بھی ذرہ برابر وقعت و عظمت نہ ہو، بلکہ وہ اسے محض ادائے فرض کہہ کر کرے، نہ کہ ادائے حق جان کر کرے، ظاہر ہے کہ صدقہ کے اس اخفاء تام سے خود پسندی اور عجب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ جس سے استغناء کا ایک بہت ہی دقیق اور اہم مقام میسر آ جاتا ہے۔ استغناء کے یہ آخری تین مقامات جاہ کے سلسلے میں محتاجگی سے بچاتے تھے۔ ان تین مقامات میں باہمی فرق و تفاوت ہے، تو یہ کہ پہلے مقام پر پہنچ کر صدقہ دہندہ دوسروں سے طالب جاہ نہیں رہتا۔ دوسرے مقام پر اپنے عمل سے کاسب جاہ نہیں رہتا اور تیسرے مقام پر خود اپنے نفس سے بھی تخیل جاہ قائم کرنے کا روادار نہیں رہتا اور اس طرح ان پانچوں مقامات کے ذریعہ مال و جاہ دونوں

کے سلسلہ میں اس محتاجگی اور پابستگی سے آزاد ہو کر جس نے اسے ذلت و پستی کے حضیض میں گرا رکھا تھا، غیر سے بھی غنی ہو جاتا ہے اور خود اپنے سے بھی مستغنی۔

مادیات سے استغناء ہی تعلق مع اللہ کی بنیاد ہے...... الحاصل اس مادہ پرست اور مادّی نفس کے دو رذیلے بخل اور حرص تو نفس صدقہ ہی سے ختم ہو گئے اور تین رذیلے، تملق، نام آوری اور خود بینی اخفاءِ صدقہ کی قید سے ختم ہو گئے اور ظاہر ہے کہ جب ایک شخص بخیل نہ رہا، سخی ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے اپنی دولت کی بھی پروانہ رہی، حریص نہ رہا بلکہ قانع ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے غیروں کی دولت کی بھی پروانہ رہی۔ شہرت پسند نہ رہا بلکہ عزلت پسند ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے لوگوں کی مدح وذم کی بھی پرواہ نہ رہی، شیخی پسند اور خود بین نہ رہا بلکہ خود گزار ہو گیا، جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے اپنے نفس کی بھی پرواہ نہ رہی۔ تو اس کا صاف نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی اخلاق کی بدولت جو اس نے صدقہ سے حاصل کئے ہیں، عالم میں کسی کا غلام نہ رہا اور اسے ہر چیز سے کامل آزادی اور حریت میسر آ گئی اور یہ سب جانتے ہیں کہ ساری کائنات سے بے پرواہ ہو کر اب اگر اس کا رشتۂ نیاز کسی سے جڑ سکتا ہے تو صرف اسی خالق کائنات سے جس کی خاطر اس نے یہ اپنا مال، اپنی آبرو اور اپنا نفس سب کچھ تج دیا تھا اور جس کے اخلاق سے اس نے یہ تخلیق کیا، اندریں حالات اسے مناسبت پیدا ہوئی تو اس غنی عن العالمین سے اور لگاؤ پیدا ہوا تو صرف اسی ذات بے نیاز سے جو اپنے کاموں میں کسی کی محتاج نہیں، بلکہ ہر چیز اپنے وجودِ ظہور میں اسی کی دستِ نگر ہے۔

تعلق مع اللہ کی قوت ہی سے روحانی عجائبات اور خوارق کا ظہور ہوتا ہے...... اور اس صورت میں ضروری ہے کہ اس مردِ متصدق اور بندہ مجاہد یا تارک ماسوی اللہ سے بھی جس نے اس غنیٔ مطلق سے نسبت قائم کر لی ہے۔ غناءِ کامل کا ظہور ہو اور وہ بھی اپنے کسی کام میں ان مخلوقاتی وسائل یعنی مادی ذرائع کا محتاج نہ رہے بلکہ خود یہ وسائل ہی اس کی چشم و آبرو کو دیکھنے لگیں، اس کے تصرف بلا وسائل زمین تک ہی نہیں آسمانوں تک بھی پہنچنے لگیں۔ وہ اوپر جائے تو طیاروں کا محتاج نہ ہو اور زمینی مسافت طے کرے تو ریلوں اور موٹروں کا پابند نہ ہو۔ وہ عالم میں اپنی صدا پہنچائے تو ہوا و برق کا دست نگر نہ ہو اور عالم کی صدائیں سننا چاہے تو ریڈیو اور ٹیلیفون کا محتاج نہ ہو۔

غرض اس کے ہاتھوں پر وہ سب کچھ ظاہر ہو، جسے دنیا کے سارے فلسفی اور سائنس دان مل کر بھی ظاہر نہ کریں۔ ورنہ کم سے کم غنا کا یہ درجہ تو اسے ضرور حاصل ہو جائے کہ علم واعتقاد کے درجہ میں تو ان وسائل کو موثر حقیقی نہ سمجھے اور عمل کے درجہ میں اسے ان اسباب و وسائل سے کوئی شغف باقی نہ رہے بلکہ عادت کے طور پر محض حیلہ کے درجہ میں اور وہ بھی امرِ خداوندی سمجھ کر انہیں استعمال میں لاتا رہے، پس پہلا درجہ توکل وغنا کا اعلیٰ مقام ہے، جس میں ترک اسباب پر پوری قدرت محسوس ہونے لگے اور دوسرا درجہ ثانوی ہے جس میں گویا قدرت نہ ہو، مگر معرفت صحیح ہو جائے اور اختیارِ اسباب میں غلو اور انہماک باقی نہ رہے۔

بہرحال اب پوری طرح کھل گیا کہ مادہ میں بجز محتاجگی اور ذلت نفس پیدا کر دینے کے کوئی جوہر نہیں کہ اس کے اخلاق کی خاصیت ہی احتیاج وغلامی ہے جس کا ظہور فعلِ امساک سے ہوتا ہے اور روح میں بجز عزتِ نفس پیدا کرنے کے دوسرا کوئی جذبہ موجود نہیں کہ اس کے فطری اخلاق کی طبیعت ہی استغناء و غناء ہے، منشاء عزت وعظمت ہے۔ جس کا ظہور فعلِ انفاق سے ہوتا ہے، جسے صدقہ کہتے ہیں۔

اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ مادی اور روحانی اخلاق، ان کی زینتوں اور ان کے خواص وآثار میں تضاد کی نسبت ہے کہ خود روح و مادہ ہی میں تضاد کی نسبت ہے۔

روح ایک لطیفۂ ربانی ہے اور جسم ایک کثیفہ ظلمانی، وہ مائل بہ علو ہے، یہ مائل بہ سفل، وہ انسان کو عرشی بناتی ہے یہ فرشی، وہ اسے سربلند کرتی ہے، یہ سرنگوں، گویا ان دونوں کی مثال ترازو کے دو پلوں کی سی ہے کہ جتنا ایک کو جھکا دیا جائے دوسرا اسی قدر اٹھ جائے گا۔ اس لئے آپ ان مادی تصرفات کے ذریعہ مادی اخلاق کو جس قدر بھی قوت اور رسوخ دیں گے، روحانی اخلاق اس قدر مضمحل ہوتے رہیں گے اور اسی حد تک استغناءِ نفس مٹ کر احتیاج وذلتِ نفس کی زنجیریں مضبوط ہوتی رہیں گی، جس کو دوسری تعبیر سے یوں سمجھ لیجئے کہ روح جیسا فاضل بادشاہ جس حد تک جسم جیسے کمینہ اور بے شعور غلام کے زیر اثر بسر کرتا رہے گا، اسی حد تک اپنی ساری فرمانروائی کی عزت وشوکت برباد کرتا رہے گا اور نتیجاً انجام کی تباہی وبربادی دونوں ہی کو گھیرتی رہے گی۔

لیکن اگر صدقہ ومجاہدہ یعنی مادیات اور مادی لذات سے بے نیازی کے ذریعہ ان روحانی اخلاق کو قوۃ و رسوخ کا موقع دیتے رہیں گے تو احتیاج وغلامی مٹ کر اسی حد تک استغناء وکمال کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی، جس سے کائنات بدن میں روح کی حکمرانی قائم ہو جائے گی اور بدن کا غلام ہر آن اس کے سامنے دست بستہ حاضر رہ کر محض بجا آوریٔ احکام کے لئے رہ جائے گا، جس سے دونوں اپنے اپنے منصبی کاموں میں بھی لگے رہیں گے۔ دونوں کی عزت بھی بقدرِ مرتبہ قائم ہوگی اور اقلیم جان کا عدل بھی استوار رہے گا۔

سائنسِ محض کبھی یہ غناء پیدا نہیں کر سکتی...... اور جب کہ یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ یہی مادی تصرفات جن سے احتیاج اور ذلتِ نفس کا ثمرہ پیدا ہوتا ہے، سائنس کا موضوع عمل ہیں اور یہ ہی روحانی تصرّفات یعنی صدقہ ومجاہدہ جن سے استغناء وعزت نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے، اسلام کا موضوع عمل ہے، تو یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ سائنس تو انجام کار انسان کو ذلتِ نفس اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے اور اسلام انجام کار اسے عزت وفلاحِ دارین کی طرف بڑھاتا ہے۔

پہلی صورت یعنی مادیات کا علو اور سائنس کا بحران روح کی پامالی اور مادہ کے غلبہ کی ہے، جس سے عزیز تو ذلیل، اور ذلیل عزیز ہو جاتا ہے، جو قلبِ موضوع اور دونوں کے لئے موجبِ ہلاکت ہے

اور دوسری صورت یعنی روحانیت کا شغل اور اسلام کا شغف روح کی سربلندی اور مادہ کی محکومی کی ہے، جس سے عزیز مسندِ عزت پر اور ذلیل اپنی حدِ ذلت ومقہوریت پر باقی رہتا ہے جو عین عدل اور دونوں کے لئے دارین

میں موجبِ فلاح و بہبود ہے، بس یہ ہے سائنس اور اسلام کی ماہیتوں کا اجمالی خاکہ جو اپنی بساطِ علم کی قدر، میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا ہے اور یہی اس تقریر کے تین مقاصد میں سے پہلا مقصد تھا جو الحمد للہ کہ اتمام کو پہنچ گیا۔
سائنس اور اسلام میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے...... اب اس پر غور کیجئے کہ یہ جو رنگ مادہ ہے اور اس سے تیار شدہ بدن ایک ڈھانچہ ہے۔ جس کی زندگی روح سے ہے اور روح اسے زندہ رکھ کر اپنے علوم و کمالات کو اسی کے ذریعہ عملاً نمایاں کرتی ہے، پس بدن کمالات روح کے ظہور کا ایک ذریعہ اور آلہ ہے۔ چنانچہ روح اپنے مقررہ عمل سے فارغ ہو کر جب اس مقام معلوم تک پہنچ جاتی ہے جو ازل سے اس کے لیے طے شدہ تھا، جب ہی اس ڈھانچہ اور وسیلہ کو روح سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ پس جسم حقیقتاً فاعل نہیں بلکہ محض قابل ہے اور اصل نہیں محض وسیلہ ہے۔

اگر اس جسم کو بالاستقلال مقصودیت کا درجہ دے دیا جائے تو یہ فی الحقیقت لاشہ کو مقصود بنا لینا ہے، جس کا انجام سڑنے، گلنے اور دماغوں کو پراگندہ کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور جب کہ سائنس کا موضع محض یہ جسمانیات اور مادی چیزیں ہی ہیں اور مادیات ڈھانچہ اور وسیلہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، تو خود بخود حل ہو گیا کہ سائنس کے تمام کرشمے بھی اصولاً وسائل سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھ سکتے اور جب کہ اسلام کا موضوع بالاصالہ روحانیت اور روحانی افعال ہیں اور روح اصل ہے، تو یہ بھی خود ہی واضح ہو گیا کہ اسلام کے تمام امور بھی مقصودیت کے درجہ سے کسی طرح نہیں گر سکتے۔ ان دونوں صورتوں کے ملانے سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ جیسے بدن روح کے لئے وسیلہ عمل ہے ایسے ہی سائنس اصولی طور پر اسلامی کارناموں کے لئے ایک وسیلہ و ذریعہ اور ایک ڈھانچہ ہوگی۔ جس کی زندگی اور روح اسلامی اخلاق و افکار اور اسلامی اقوال و افعال ہوں گے اگر یہ روح اس ڈھانچہ میں نہ ہو تو یہ پوری سائنس اور اس کی تشکیلات ایک لاشہ ہوں گی، جس کا انجام بجز پھولنے پھٹنے اور سڑ گل کر صحیح دماغوں اور سچے قلوب کو پراگندہ کرنے اور صاف فضاء کو خراب کر دینے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ ایسی سائنس جس کا حاصل تعیش محض اور عناصر اربعہ کے خزانوں کو بلا دینی روح کے استعمال میں لانا ہے اور جسے اصطلاح میں دنیوی زندگی پکارا جاتا ہے، قرآن کی زبان میں لاشۂ بے جان اور چند دن اپنی سطحی چمک دمک اور زینت دکھا کر خاک کا ڈھیر ہو جانے والا ایک لاشہ ہے۔ جس پر حقیقت سے بے بہرہ لوگ ہی ریجھ سکتے ہیں۔

ارشادِ حق ہے: ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِیْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَكُوْنُ حُطَامًا﴾ ①

”تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو و لعب اور زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال و اولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے، جیسے مینہ کہ اس کی پیداوار کاشت کاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ خشک ہو جاتی ہے، سو تو اس کو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے“۔

① پارہ: ۲۷، سورة الحدید، الآیة: ۲۰.

اس غیر ضروری تعیش یا تعیش محض اور جمعِ وسائل کا نام اسلام کی زبان میں دنیا ہے، جس کے دلدادہ کو احمق اور بے وقوف کہا جاتا ہے ارشادِ نبویؐ ہے: ”اَلدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَّادَارَ لَهُ وَلَهَا يَجْمَعُ مَنْ لَّاعَقْلَ لَهُ.“ ① ”دنیا نگھرے کا گھر ہے اور اس کی جمع پر وہی پڑے گا، جس میں عقل کا نشان نہ ہو“۔

بہر حال حسی، عقلی اور نقلی طور پر یہ واضح ہوگیا کہ جس طرح جسم اور مادہ روح کے لیے وسیلۂ عمل ہیں، خود مقصود و اصل نہیں۔ اس طرح مادی تصرفات، جن کا نام سائنس ہے، روحانی تصرفات کے لئے جن کا نام اسلام ہے، اصولاً محض وسیلہ اور ذریعہ کا درجہ پیدا کر سکتے ہیں، خود مقصودیت کی شان کبھی نہیں پیدا کر سکیں گے۔

اور ظاہر ہے کہ جب سائنس وسائل میں سے ہوئی تو پھر یہ ایک عقلی اصول ہے کہ وسیلہ مقصود میں معین ہو، یعنی بقدرِ ضرورت، ورنہ بالا دصالہ اس میں انہماک رکھنا، اس میں مقصودیت کی شان قائم کرنا ہے، جو قلبِ موضوع اور خلافِ عقل ہے، اس لئے عقلاً ہی یہ بھی واضح ہوا کہ مقصودِ اصلی یعنی دین سے جدا رہ کر سائنس محض میں انہماک پیدا کرنا کوئی عاقلانہ فعل قرار نہیں پا سکتا بلکہ اسے وسیلہ کی حد تک اور بمقدارِ ضرورت ہی اختیار کرنا دانائی ہوگی۔

اس لئے دنیائے سائنس اور محفل چار عناصر کے تصرفات کو اسی حد تک حاصل کرنے کی اجازت زبانِ نبویؐ پر دی گئی ہے، جس حد تک مذہبی مقاصد میں ان کی ضرورت ہو۔

ابوبکر طرشوشی کا قول ہے ”اِعْمَلْ لِلدُّنْيَا بِقَدرِ مقامک فِيْهَا وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بقدر بَقَآئِکَ فِيْهَا.“ ② ”دنیا کے لئے اتنا کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کرو، جتنا وہاں رہنا ہے“۔

خلاصہ...... یہ ہے کہ سائنس کا درجہ وسیلہ کی حد سے آگے نہیں بڑھتا کہ اس کا معمولِ اصلی مادہ ہے اور مادہ روح کے لئے محض وسیلہ ہے اور اسلام کا درجہ مقصودیت سے گر نہیں سکتا کہ اس کا معمولِ اصلی روح ہے اور روح مادہ کے لئے اصلِ مقصود ہے۔

اس تقریر سے الحمدللہ پوری طرح سائنس اور اسلام کی درمیانی نسبت بھی واضح ہوگئی اور کھل گیا کہ ان میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے، جو موضوعِ تقریر کا دوسرا مقصد تھا، اور جس کا حاصل یہ ہے کہ سائنس کے کارنامے جب تک مذہب کے لئے بطور وسیلہ استعمال ہوں گے، خواہ ترقی کی کسی حد پر ہی پہنچ جائیں، ان کا انجام خوش کن ہوگا اور جب اس سے جدا ہو کر خود مقصودیت کی شان لے لیں گے یعنی روحانیت ترک ہو کر مادیتِ محضہ مقصود کی جگہ لے لے گی، خواہ وہ کم سے کم بھی ہو، جب ہی انجام خطرناک اور ذلت آمیز نکلے گا۔

سائنس اور اسلام کی حقیقتوں کا ہم پر تقاضہ کیا ہے؟...... اس سے آپ یہ بھی سمجھ لیں گے کہ آپ کی ترقی کا میلان کیا ہونا چاہئے؟ جس کے شور سے آج فضاءِ دنیا گونج رہی ہے۔ اس کا فیصلہ بھی وہی عقل سلیم کر سکتی ہے جس

---

① مسند احمد، حديث السيدة عائشةؓ ج: ۴۹ ص: ۴۳۹. ② تفسير الثعالبي تحت قوله تعالى وسيرى الله عملكم، ج: ۲، ص: ۱۶۲. علامہ ثعالبی نے اسے استاد ابوبکر الطرطوشی کا قول قرار دیا ہے۔

نے ان میں سے ایک کو وسیلہ اور ایک کو مقصود باور کرایا ہے کہ آیا ترقی وسائل میں کی جاتی ہے یا مقصد میں؟ اور ترقی کی دوڑ راستہ کے لئے ہوتی ہے یا منزلِ مقصود کے لئے؟

پس اگر سائنس وسیلہ ہے اور بہ شہادتِ عقل ونقل ضرور ہے، جیسا کہ ثابت ہوگیا تو پھر عقل ہی کی شہادت سے وہ کبھی مطلقاً میدانِ ترقی بھی قرار نہیں پاسکتی کہ وہ تو راہِ محض ہے، منزلِ مقصود نہیں اور اگر اسلام مقصودِ اصلی ہے اور ضرور ہے جیسا کہ عقل ونقل سے ثابت ہو چکا ہے تو اسی کو دوڑنے اور ترقی کرنے کا میدان بھی بنایا جاسکتا ہے کہ وہ راہِ محض نہیں، شہر مطلوب ہے۔ جس میں پہنچنے کے لئے ساری جدوجہد تھی، چنانچہ قرآن کریم نے ترقی کو روکا نہیں بلکہ انسان کو دنیا میں بھیجا ہی ترقی کرنے کے لئے ہے۔ ہاں وسائل میں ترقی کرنے کو اضاعت وقت کہا ہے اور مقاصد میں جس کا عنوان خیرات ومبرّات رکھا ہے، ترقی کرنا نہ صرف روا ہی بتلایا ہے بلکہ ضروری اور واجب قرار دیا ہے۔ ایک جگہ ارشادِ ربانی ہے ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ ① ''ہر قوم کے لئے ایک قبلۂ مقصود ہے، جس کی طرف وہ رخ کرتی ہے۔ سو تم ایک دوسرے سے بھلائیوں میں سبقت کرو!''

دوسری جگہ نعیم آخرت کا ذکر فرمایا جو تمام خیرات ومبرّات کا مقصودِ اصلی ہے، ارشاد فرمایا. ﴿وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾ ② ''اور حرص کرنے والوں کو ایسی ہی چیز کی حرص کرنی چاہئے''

پس ایک جگہ سبقتِ باہمی اور ایک جگہ حرصِ باہمی کے عنوان سے مسلمانوں کو ترقی کے لئے ابھارا گیا اور مامور کیا گیا ہے، لیکن یہ ترقی اسی میدان کی ہے جس کی فطرۃً ہونی چاہئے، یعنی مقاصد کی، کیوں کہ وسائل میں ترقی ترقی نہیں بلکہ بے عقلی ہے۔ اس اصولی حقیقت کے پیش نظر اب آپ اپنا جائزہ لیجئے کہ آپ نے کس طرح اس موضوع کو الٹ دیا ہے۔ مقصود کو وسیلہ اور وسیلہ کو مقصود، بادشاہ کو غلام اور غلام کو بادشاہ بنا دیا ہے، مقصودِ اصلی کو تابع محض اور رسمی وانسی کر ڈالا ہے اور سائنس کو مقصودِ حقیقی اور مطلوبِ اصلی قرار دے لیا ہے۔ پھر ساتھ ہی اس کے انجام بد کو بھی پیش نظر رکھیئے کہ ان حالات میں یہ مادہ کا کمینہ غلام آپ کو حرمان وخسران کے کس گڑھے میں لے جاکر گرائے گا، جیسا کہ اب تک اقوام کو گراتا آیا ہے۔ اللہ کے نذیر مبین صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی خالص نمائشی کروفر اور مادیات کی اسی چمک دمک پر جس کا نام شریعت کی اصطلاح میں زینت اور زہرۃ ہے' خوف کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ ''وَاللّٰهِ مَآ اَخْشٰى عَلَيْكُمُ الْفَقْرَ وَلٰكِنْ مِمَّآ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِىْ زَهْرَةَ الدُّنْيَا تُفْتَحُ عَلَيْكُمْ فَتُهْلِكُكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ.'' ③ ''خدا کی قسم، مجھے اپنے بعد تم پر فقر وفاقہ پڑ جانے سے کوئی خوف نہیں، خوف ہے تو اس کا کہ میرے بعد تم پر دنیا کی چمک دمک کھلے گی۔ اور تمہیں اسی طرح ہلاک کر ڈالے گی جس طرح اس نے تم سے پہلوں کو ہلاک کیا ہے''۔

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۴۸ . ② پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۲۶ .

③ السنن لابن ماجه، کتاب الفتن، باب فتن المال، ج: ۱۱، ص: ۴۹۹، رقم: ۳۹۷۸ .

مادیاتِ محضہ کی مضرّتیں ...... ہاں مادیات کی یہ ہلاکت آفرینیاں پہلے علم کے میدان میں قدم جماتی ہیں جس سے اعتقادات بگڑتے ہیں اور پھر عمل کے میدان میں چھا جاتی ہیں۔ جس سے ہمتِ عمل ختم ہو جاتی ہے۔ علمی میدان میں اس طرح کہ مادیات خود بے شعور ہیں، چنانچہ آگ، پانی، ہوا، مٹی میں سے کوئی ایک مادہ بھی عقل و ہوش نہیں رکھتا ورنہ انسانوں کے ہاتھ میں اس طرح بے بس ہو کر مسخر نہ ہوتا۔ اس لئے ان جہالت کے کھلونوں سے رات دن کھیلنا، ظاہر ہے کہ جہل سے آگے نہیں بڑھا سکتا۔ نیز یہ مادیات چونکہ خود محسوسات کی انواع ہیں، اس لئے ان کا دلدادہ انسان زیادہ سے زیادہ حس ہی کی گہرایوں تک رسائی پا سکتا ہے اور جس کا تعلق حواسِ خمسہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ سے ہے۔ اس لئے ایک چشم و گوش کا بندہ مشاہدات چشم و گوش ہی میں گھرا رہتا ہے۔ علوم قلب، علومِ ارواح اور علوم حقائق تک اس کی رسائی ہونے ہی نہیں پاتی اور ظاہر ہے کہ جس علم کی راہ سے آدمی ناواقفِ محض ہو اور ناواقفی کے ساتھ ادھر کا رخ بھی نہ کرے تو اس کا مبلغ پرواز بجز اوہام و خیالات اور شکوک و شبہات کے علوم و معارف کب ہو سکتے ہیں؟

اسی لئے مادی انسانوں کو روحانی میدان میں شکوک و شبہات ہی گھیرے رہتے ہیں، جو درحقیقت مادیات میں انہماک و شغف رکھنے کا ایک معمولی ثمرہ ہے، اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ روحانیت کی طرف رجوع کر کے جو منشاء علوم و ادراکات ہیں، قلب میں علم کی شمع روشن کی جائے، جس سے اوہام و وساوس کی یہ اندھیریاں رفع ہوں۔

طلبائے یونیورسٹی کو خطابِ موعظہ ...... مجھے معاف کیا جائے، اگر میں نیاز مندانہ طریق پر یہ عرض کروں کہ آج مسلمانوں میں اور آپ برا نہ مانیں تو آپ جیسے فی ذہینت کے افراد میں اس علمی اور عرفانی روشنی کا سرے سے ہی پتہ نہیں ملتا جو شکوک و شبہات کا تریاق اور وساوس و اوہام کا بدرقہ ہے، بلکہ قلوب میں ریب و ارتیاب اور تحیّر نے جگہ پکڑ کر اصل حقیقت ہی سے بیگانہ بنا دیا ہے اور جب کہ ایمان کی وہ شفاف روشنی جو ظلماتِ جہل اور جہل سے پیدا شدہ شبہات کو دفع کرتی ہے اور مشاہدۂ حق کی وہ تجلی ریزی جو ہر سوال کا جواب بنتی ہے، قلوب میں پیوست ہی نہیں تو محض علمی تعبیرات سے آپ قلوب کو کب تک پھسلاتے رہیں گے؟

یہ علمی عجائبات جو تقریروں کے ذریعہ آپ سننا چاہتے ہیں، اس وقت کا مشغلہ ہیں، جب کہ اصل علم کا راس المال ہاتھ میں ہو یہاں ایمان ہی کی خیر نظر نہیں آتی، تا با اسلام و عمل چہ رسد؟

مادّیات کی مضرّتیں رفع کرنے کا طریقہ ...... اس لئے میری صلاح تو یہ ہے اور نہ میری صلاح بلکہ اسلام کی حقیقت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ میرے عزیز بھائی اوپر کی ٹیپ ٹاپ اور مرہم پٹی کو چھوڑ کر اس مادۂ فاسد کا تنقیہ کریں، جو مادی سائنس کے غیر ضروری انہماک اور غلو نے پیدا کر دیا ہے۔ اور فسلفیت کے علم نما جہل نے اس کی آبیاری کی ہے۔ ان حالات میں ان کا فرض ہے کہ وہ جسم کے بجائے روح کو ابھرنے کے قابل بنائیں کہ وہ ہی انسان میں علم کا منبع ہے جس کی پہلی کڑی یہ ہے کہ ہواءِ نفسانی اور مادی خواہشات کے بے شمار مقاصد سے ذرا ایک

طرف ہو کر اس منبع جود و کمال ذاتِ حق کی طرف رجوع کریں۔ جس سے علم معرفت کی روشنی چلتی اور شبہات و وساوس کی دنیا کو تنگ بنا دیتی ہے۔

استحکامِ توحید...... گویا دوسرے لفظوں میں تعددِ مطالب یا شرک کو چھوڑ کر توحید پر استقامت اختیار کی جائے جو اسلام کی روح اور اصل اصول ہے، اس کی تدبیر بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہی کہ کلمہ توحید کو بار بار اور بکرات و مرّات دہرایا جائے تا کہ قول کا اثر قلب پر پڑے اور توحید راسخ ہو۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ”جَدِّدُوْا اِیْمَانَکُمْ بِقَوْلِ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ ① پھر ”لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ میں ایک توحیدِ ذات ہی کا تصور نہ کریں بلکہ توحیدِ صفات کا دھیان بھی اسی کلمہ سے کریں۔ یعنی اللہ کے سوا ناموں یا سو صفات کی توحید بھی اسی کلمہ سے حاصل کریں۔ گویا الوہیت کا اثبات ونفی اس ترکیب سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسے ہی رحمانیت، نافعیت، ضاریت وغیرہ کا اثبات ونفی بھی اس طرح کیا جائے۔ ”لَارَحْمٰنَ اِلَّا اللّٰهُ. لَامَالِکَ اِلَّا اللّٰهُ. لَانَافِعَ اِلَّا اللّٰهُ. لَامَلِکَ اِلَّا اللّٰهُ.“ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس طور پر جب قلب میں یہ ذہن نشین ہو جائے گا کہ مالک بھی ایک وہی ہے. نافع بھی وہی اور ضار بھی وہی ہے عظمت و جبروت والا بھی وہی ہے اور ذوالجلال والاکرام بھی ایک وہی ہے تو اس کا قدرتی ثمرہ یہ ہوگا کہ قلب سے سب عظمتیں مٹ کر صرف ایک ذاتِ واحد کی عظمت رہ جائے گی اور یہی کسوٹی اور یک رخی قلب کی قوت ہے۔ ایک غلام دو آقاؤں کو بیک دم خوش نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ متفکر متردد اور مذبذب رہے گا۔ جس سے قلب میں کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ لیکن جو اس یقین پر ہے کہ میرا ایک ہی آقا ہے اور وہ بھی ایسا جو علی الاطلاق ہر چیز کا مالک اور اس پر قابض و متصرف ہے۔ تو وہ متردد رہنے کے بجائے متیقن اور مطمئن ہو جائے گا اور یقین و اطمینان ہی قوتِ قلب کی بنیاد ہے۔ جس سے اس کی قوتِ فکری سمٹ کر ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہے اور پھر اس سے عجائباتِ فکر اور غرائبِ علوم پیدا ہوتے ہیں اور انسان کی بصیرت و معرفت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی قوتِ یقین کے ماتحت حضرات صحابہؓ اور سلف کے وہ محیر العقول کارنامے ہیں جنہوں نے متمدن دنیا کو آج تک حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ ان کی ترقیات اور طوفانی کارنامے روپیہ پیسہ اور دھن دولت کے رہین منت نہ تھے بلکہ دولتیں خود ان کے کارناموں سے بنتی اور بگڑتی تھیں۔ اس لئے سب سے پہلے اپنے توحیدی اعتقاد درست کیجئے کہ یہی ہر خیر و کمال کی بنیاد ہے۔

یادِ حق اور اس کا ابتدائی آسان طریقہ...... ہاں پھر اس توحیدی فکر کو پختہ اور راسخ کرنے کے لئے طمانیت قلب کی حاجت ہے۔ ورنہ وساوس و خطرات اور تشویشاتِ فکر اس صاف حقیقت پر قائم نہیں رہنے دیں گے۔ اس لئے قرآن کریم نے طمانیتِ قلب پیدا کرنے کا موثر ذریعہ فرمایا کہ: ﴿اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ②

---

① المسند للامام احمد ،مسند ابی ہریرةؓ، ج:۷، ص: ۳۷۲ رقم:۷۳۵۳.

② پارہ:۱۳ ،سورۃالرعد،الآیۃ:۲۸.

''یاد رکھو! اللہ کی یاد ہی سے دل چین پاتے ہیں'' اس سے مقصود ذکرِ قلبی ہے۔ مگر ذکر قلب میں راسخ نہیں ہوتا، جب تک کہ زبان سے اس کا بار بار تکرار نہ کیا جائے۔ چنانچہ طالب علم اپنے سبق کو قلب میں محفوظ کرنے کے لئے زبان ہی سے اس کو بار بار دہراتا ہے اور رٹتا ہے، اس لئے اولاً زبان کو ذاکر بنانا چاہئے تاکہ قلب ذاکر بن جائے اور یہ ایمان وتوحید دل میں اپنی جڑیں چھوڑ دے اور قلب اس پر قانع اور مطمئن ہو جائے۔

اس لئے شریعت نے ذکرِ حق کی مختلف صورتیں تجویز کی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج ان کا استعمال تو بجائے خود رہا ان کا علم تک بھی مسلمانوں اور اس طبقہ کو نہیں ہے، جو تعلیم یافتہ کہلاتا ہے۔

شریعت نے سب سے پہلے فرائض رکھے جو ذکر اللہ کا اعلیٰ مظہر ہیں اور ہر چھوٹے بڑے پر لازم کئے۔ اس لئے فرائض علوم وصلوٰۃ وغیرہ کی پابندی کیجئے، پھر اوقاتِ مخصوصہ کی دعائیں یاد رکھیں تاکہ چلتے پھرتے بھی خدا کی تسبیح وتہلیل آدمی کی زبان پر جاری رہے، اس لئے اس قسم کے اذکار کو یاد کرنے کی فکر کیجئے۔ پھر مختلف مواقع کلام کے محاورے اسلامی زبان نے ایسے رکھے ہیں کہ ان میں بلا ارادہ بھی ذکر اللہ زبان پر جاری رہے: ''بِسْمِ اللّٰهِ. اَلْحَمْدُلِلّٰهِ. جَزَاکَ اللّٰهُ. اِنَّا لِلّٰهِ. مَاشَآءَ اللّٰهُ. اِنْشَآءَ اللّٰهُ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ. اِلَّا اللّٰهُ. سُبْحَانَ اللّٰهِ'' وغیرہ۔ آپ کی زبان کے رات دن کے محاورے ہیں۔ اگر آپ استعمال کریں اور اغیار کی زبانوں سے شغف پیدا نہ کریں۔ آپ کی زندگی کا کوئی ایسا کام جس سے کلام کا تعلق ہو، ایسا نہیں ہے۔ جس کے متعلقہ کلام میں اللہ کا نام داخلِ محاورہ نہ ہو۔

گویا اسلامی معاشرت میں رہ کر کلام کرنے والا بے ارادہ بھی ہر وقت اللہ کا نام لینے پر مجبور ہے۔ لیکن آج مسلمان اپنی دینی زبان سے جس کی بدولت وہ ارادہ اور بے ارادہ ہر وقت خدا کا نام لینے کی توفیق پاتے تھے، نہ صرف بے پرواہ ہی ہیں بلکہ اس کے مٹانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں حالاں کہ اسلام نے عربیت اور عربی محاورے قائم رکھنے پر اسی لئے کافی زور دیا تھا کہ زبان کا اثر تہذیب، کلچر، تمدن اور عام احوالِ زندگی پر پڑتا ہے۔ چنانچہ انگریزی اقتدار کے آغاز کے وقت علماءِ وقت اور خصوصاً اکابر دار العلوم دیوبند نے مسلمانوں کی فہمائش کی تھی کہ وہ اپنی عربیت کو تھامے ہوئے غیر زبان کی ترویج وتقویت پر اس ذوق وشوق سے زور نہ دیں کہ وہی زبان ان کی بنیاد اور قبلۂ مقصود بن جائے، مگر مسلمانوں نے ان مبصرّوں کا کہنا نہ مانا اور بالآخر آج وہ اس کے نتائج بد سے دوچار ہوئے کہ ان کی تمدنی صورت وسیرت، ہی مسلمانوں جیسی نہ رہی، چہ جائیکہ ان کا علمی دین اصلی رنگ میں محفوظ رہتا۔

مگر بہر حال رجوع کے لئے کسی وقت کی تخصیص نہیں۔ اگر آپ پوری تندہی سے آج ذکر اللہ کے پابند نہیں ہو سکتے تو کم از کم عربیت کو زبان ہی کی حیثیت سے باقی رکھنے کی سعی کیجئے اور اس کے دینی محاورات ہی کو زبان زد کرتے رہیئے تاکہ اسی بہانہ سے خدا کا نام زبانوں پر جاری رہے۔ نام حق کی یہ زبانی مشق اگر چہ بے ارادہ بھی ہو پھر بھی انشاء اللہ قلوب میں ایک حد تک ذکر اللہ کو قائم کرتی رہے گی۔

صحبتِ صلحاء اور اہل اللہ سے رابطہ..... مگر ان امور کی توفیق اس کے بغیر مشکل ہے کہ اسبابِ توفیق بھی اس

کے ساتھ جمع کئے جائیں اور ان میں موثر ترین سبب سچّوں کی صحبت و معیت ہے، اسی لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ ① ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچّوں کی معیّت اختیار کرو'' چنانچہ صحبت یافتہ جاہل بعض اوقات غیر صحبت یافتہ عالم سے بدر جہا زائد مقاصدِ دین کو سمجھتا ہے اور دینی رنگ سے رنگین اور متصبغ ہو جاتا ہے، اس لئے اہلِ علم اور اہل اللہ کے پاس آمد و رفت کو ایک مستقل مقصد کی حیثیت سے قائم رکھیئے۔ بردِ یقین اور ثلجِ صدر استدلال سے پیدا نہیں ہو سکتا۔

اکبر نے خوب کہا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ۔۔۔ ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

آگے حصولِ یقین و دین کی تدبیر کے بارہ میں کہتا ہے کہ ؎

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا ۔۔۔ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اس لئے میں نیاز مندانہ التماس کروں گا کہ میرے عزیز بھائی اہل اللہ اور اہل دین سے بیگانہ نہ رہیں، بلکہ ان سے وابستگی پیدا کرنے کی صورتیں نکالیں تا کہ ان سے دولتِ دین و یقین حاصل ہو اور شکوک و شبہات یا تردّدات کا مادۂ فاسدہ ختم ہو جائے۔ ورنہ محض تقریروں اور وہ بھی ایسے کلی مسائل کی تقریروں سے جو خالص علمی حقائق پر مشتمل ہوں، اصلاح نفوس کی راہیں استوار نہیں ہوتیں، یہ اس وقت کا مشغلہ ہے جب ذوقِ یقین سے قلوب معمور ہو چکے ہیں۔ دین کا رنگ قوتِ عمل اور صحبتِ صلحاء ہی سے قلوب پر چڑھ سکتا ہے۔ پس آپ حضرات کا فریضہ ہونا چاہئے کہ مادیت کے اس ہجوم میں روحانیت کو فراموشِ محض نہ کر ڈالیں۔

خلاصۂ بحث...... بہر حال اس تقریر سے اسلام کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت بھی واضح ہوگئی کہ وہ انسان کو روحانی میدان میں دوڑا کر اسے دائمی رفعت و عزت اور طمانیت و بشاشت کی منزل تک پہنچا دیتا ہے کہ دائمی رفعت و عزت روحانیت ہی میں ہے اور پھر ساتھ ہی سائنس کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت بھی سامنے آگئی کہ وہ انسان کو مادی میدانوں میں چھوڑ کر انجام کار اسے ذلت و خسران کی طرف دھکیل دیتی ہے کہ محض مادیات کا انجام فنا و ذلت کے سوا کچھ نہیں اور آخر کار ایک سائنس زدہ نہ اپنے مادی منافع ہی کو باقی رکھ سکتا ہے اور نہ اسے روحانی منافع ہی نصیب ہوتے ہیں، نیز ''سائنس اور اسلام'' کی باہمی نسبت بھی واضح ہوگئی کہ ان میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب تک سائنس کے کارنامے مذہب کے لئے خادم اور ذریعۂ تحصیل نہ بنیں گے، ان کا انجام خوش کن نہ ہوگا اور اسی کے ساتھ بطور ثمرہ یہ مقصد بھی حل ہو گیا کہ جب اسلام مقصود ہے اور سائنس اس کا وسیلہ، تو اسلام کی مقصودیت کا تقاضا یہ ہے کہ ترقی کا میدان اسلام کو بنایا جائے نہ کہ سائنس کو کہ ترقی ہمیشہ مقاصد میں کی جاتی ہے نہ کہ ذرائع اور وسائل میں، یعنی سائنس کے معمولات اسی حد تک اختیار کئے جائیں، جس

① پارہ: ۱۱، سورة التوبة الآية: ۱۱۹۔

حد تک اسلام کو ان کی ضرورت ہے۔

مباحثِ تقریر کا ربط حدیثِ زیبِ عنوان سے...... یہی وہ مقاصدِ سہ گانہ تھے، جن کی تشریح کا حدیث زیبِ عنوان کے دائرہ میں رہتے ہوئے میں نے ابتداءِ تقریر میں وعدہ کیا تھا کہ الحمدللہ ان مقاصد کی ایک حد تک توضیح و تشریح ہو چکی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان مقاصد کی اس طولانی بحث کو سمیٹ کر اور حدیثِ عنوان پر منطبق کر کے یہ واضح کروں کہ تقریر کی یہ تمام تفصیلات جو عرض کی گئی ہیں، اسی حدیث کے چند جامع اور بلیغ جملوں کی شرح ہیں اور صرف اسی کی تعبیرات سے مستنبط ہیں

سو بغور سنیئے کہ اس حدیث کی ابتداء میں اولاً تو ملائکہ کے سوال پر عناصرِ اربعہ کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ جو عالم کا مادہ اور اس کے موالیدِ ثلاثہ (جمادات، نباتات، حیوانات) کی اصل ہے۔ جن سے یہ دنیا پیدا کی گئی ہے۔ پھر یہ تذکرۂ عناصر ایک ایسے بلیغ پیرایہ میں فرمایا گیا کہ ان کی شدت وضعف کے باہمی مراتب پر بھی ایک سیر حاصل روشنی پڑ گئی ہے کہ ان میں سے مثلاً مٹی سب سے زیادہ ضعیف ہے۔ اس سے قوی لوہا ہے، جو اجزاءِ ارضیہ میں سے ہے۔ اس سے اشد آگ ہے، اس سے اشد پانی ہے اور اس سے اشد ہوا ہے۔ یہ بیان "قَالَ نَعَمْ اَلرِّیْحُ " تک چلا گیا ہے۔

پھر ان مادی عنصروں سے منتقل ہو کر ان کے مرکب موالید کی طرف رخ فرماتے ہوئے موالید کے اعلیٰ ترین جزو انسان کی طرف توجہ فرمائی گئی اور بتلایا گیا کہ ان سب سے زیادہ اقویٰ اور اشد انسان ہے جس کا ذکر "قَالَ نَعَمْ اِبْـــنُ اٰدَمَ" کے جملہ سے فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے انسان کے افعال دکھلا کر واضح کر دیا ہے کہ انسان ہی وہ نوع ہے جس کے اشاروں پر تمام مادیات اور سارے ہی موالید ناچ رہے ہیں۔

پھر ان مادیات سے منتقل ہو کر روحانیت کی طرف حدیث مبارک کا رخ ہوا اور بتلایا گیا کہ ابن آدم علی الاطلاق اشد اور اقویٰ نہیں بلکہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ روحانی بنے اور مادی نہ رہے، یعنی مادیات کو ترک کرتا ہو جس کا بیان تصدق صدقة میں فرمایا گیا ہے۔ کیوں کہ صدقہ ہی ترکِ ماسواء یا ترکِ مادیات کا نام ہے۔

پھر روحانیت سے منتقل ہو کر روح کے بھی اعلیٰ مقامات تجرد خالص اور غوائل نفسانیہ سے برأت اور کثافت اخلاق سے پاکی، پھر لطافتِ اخلاق سے آراستگی کی طرف حدیث کا رخ ہوا اور بتلایا گیا کہ انسان کا محض صدقہ دے دینا، مادیات سے انقطاع کر لینا بھی کوئی چیز نہیں جب تک کہ اس میں خلوص اور قطع ریاء نہ ہو اور اسی کا نام اخفاءِ صدقہ ہے۔ جس کا بیان یُخْفِیْهَا میں فرمایا گیا ہے۔ یعنی محض صدقہ دہندہ سے وہ مخلص صدقہ دہندہ قوی اور شدید ہوتا ہے جس کے صدقہ میں ریاء و نمود کا دخل نہ ہو۔ گویا یہ صدقہ یا ترک مادیات محض حِسْبَةً لِلّٰهِ ہو اور یہ متصدق بجائے مادی ہونے کے روحانی بن کر صدقہ دے رہا ہو۔

پھر فرمایا گیا کہ مخلوق سے چھپا کر صدقہ کرنا بھی قوت وشدت کے لئے کافی نہیں جب تک کہ خود اپنے نفس سے بھی اس کو مخفی نہ رکھا جائے۔ یعنی اس میں خود بینی اور اعجاب و ناز بھی شامل نہ ہو اور خود اپنے نفس میں اس کو کوئی

چیز بھی نہ سمجھ رہا ہو۔ گویا صدقہ دہندہ نفسانی ہونے کے بجائے خالص ربانی بن کر صدقہ کرے، تو وہ تمام عناصر اربعہ، تمام موالید، تمام انسانوں، تمام صدقہ دہندہ انسانوں پھر تمام مخلص اور بے ریا صدقہ دہندوں سے بھی اشدو اقویٰ ہوگا۔ اسی مقام کی طرف "یُخْفِیْهَا مِنْ شِمَالِهٖ" میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یعنی اس درجہ مخفی صدقہ ہو کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور کسے دیا؟ ①

پھر ظاہر ہے کہ استغناء اور ترک کی یہ کامل شان کہ آدمی نے دنیا ہی کو نہیں خود اپنے نفس کو بھی چھوڑ دیا ہو۔ جب کہ دنیا اور اپنے نفس کے دکھاوے کے لئے نہیں، تو ظاہر ہے کہ بجز خدا کے اور کس کے دکھلانے کے لئے ہو سکتی ہے اور جب کہ خدا کے لئے ہونے، یعنی اس کامل للہیت نے یا بالفاظ دیگر صدقہ کی نسبت خدا کی طرف ہو جانے نے اس ضعیف البنیان صدقہ دہندہ میں وہ غیر معمولی طاقت پیدا کر دی کہ اس نے ساری مادیات اور اس کے عناصر وموالید کو مسخر کر لیا۔ تو اس سے صاف واضح ہو گیا کہ حقیقتاً قوی مطلق اور شدید مطلق صرف خدا ہی کی ذات ہے اور یہ کہ اسی کی طرف دوڑنے یا اسی کی نسبت پیدا کرنے میں ساری قوتیں اور شدتیں پنہاں ہیں۔

ادھر حدیث ہی کی ترتیب بیان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قوت وطاعت بقدرِ لطافت ہوتی ہے۔ تو یہ بھی حدیث ہی کی دلالت سے نکل آیا کہ جو خدا قوت وطاقت اور شدت کا مخزن ہے وہی لامحدود لطافت کا بھی مخزن ہے۔ چنانچہ اس کی لامحدود لطافت کا یہ عالم ہے کہ اسے نگاہیں بھی نہیں پا سکتیں۔

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ ② اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے"۔ اس لئے حدیث سے گویا یہ اصول بھی مستنبط ہو گیا کہ قوی ومتین صرف اللہ کی ذات ہے۔ پھر اس سے مناسبت پیدا کرنے کا طریقہ مادیات سے ہٹ کر روحانیت کی طرف آنا ہے، جس کا طریق صدقہ ہے۔ چوں کہ مخلص متصدق جو بلا اعجابِ نفس اور بلا ریاءِ خلق صدقہ دے رہا ہے۔ اس سے کامل مناسبت پیدا کر لیتا ہے۔ اسی لئے وہی کامل لطافت کا حامل اور سب سے بڑھ کر طاقت ور ہو جاتا ہے۔

مباحثِ حدیث کے لطیف نتائج...... بہر حال حدیث کے اس مرتب بیان سے کہ ہر کثیف کو پہلے بیان کیا اور ہر لطیف کو اس کے بعد اور پھر ہر پچھلے کو پہلے سے اشد اور اقویٰ فرمایا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ معیارِ شدت وقوت یہ وصفِ لطافت ہی ہے اور اس کی ترتیبِ طبعی یہی ہو سکتی تھی کہ مٹی سے لطیف لوہا، لوہے سے لطیف آگ، آگ سے لطیف پانی، پانی سے لطیف ہوا، ہوا سے لطیف انسان، عام انسانوں سے لطیف تارکِ الدنیا اور عام تارکین دنیا سے لطیف وہ تارک مخلص اور زاہد بے ریا، انسان ہے، جس کا قلب شواغل دنیا سے پاک، مادیات کی محبت سے بالاتر، مادی کثافتوں سے نفور، اور روحانی لطافتوں کا محور ہو، گویا وہ روحانی اور ربانی انسان ہی کامل لطافت کے حامل بن

---

① السنن للترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ المعوذتین، ج: ۱۱، ص: ۲۱۵ رقم: ۳۲۷۱.

② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۰۳.

سکتے ہیں۔ جو بدنوں کے پالنے میں منہمک نہ ہوں بلکہ روحوں کی تکمیل میں لگے ہوئے ہوں اور مادی تصرفات کے بجائے روحانی اعمال ان کا شعار بن گئے ہوں۔

لطافتِ روح مذہبی بننے میں مضمر ہے...... اور یہ سب جانتے ہیں کہ ربانی بننے کے طریقے اور روحانی شعائر برپا کرنے کے ڈھنگ سکھلانا مذہب کا موضوع ہے نہ کہ سائنس کا۔ اس لئے اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ لطیف تر اور قوی تر انسان وہی ہو سکتا ہے جو مذہبی ہو اور جس کا اوڑھنا اور بچھونا مذہب ہی مذہب ہو چکا ہو۔ اس لئے حدیث سے جہاں قوت وشدت کا معیار مستفاد ہوا کہ وہ لطافت ہے، وہیں حصولِ لطافت کا طریقہ بھی مستفاد ہوا کہ وہ مذہب ہے جو روحانیت کو مستحکم کر کے لطافت پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح روح بادشاہ ٹھہر جاتی ہے۔ جو اس کا حقیقی منصب ہے۔ نفس اس مملکت کا خاکروب ٹھہرتا ہے، جو تقوٰی کے وسیلے سے سیئات کا کوڑا کرکٹ صاف کرے۔ چوریاں اور ڈکیتیاں کرتا نہ پھرے۔ عقل اس کا وزیر ٹھہر جاتی ہے جو مفید مشورے دے۔ وحیءالٰہی اس کا حتمی قانون ٹھہر جاتی ہے جس سے راہ ملے اور اس طرح روح کی منظم حکمرانی سے روحانیت کا عدل چاردانگ اقلیم بدن میں پھیل جاتا ہے۔ چور اور ڈاکو مقید ہوتے ہیں، جن سے بدامنی پھیلتی تھی، پھر ایسے مامون اور مضبوط ملک میں جس کا فرمانروا بیدار، وزیر دانشمند، قانون روشن اور عدل وانصاف کے سبب پوری اقلیم منظم ہو، نہ تو بیرونی دشمنوں کو حملہ کی ہمت ہوتی ہے کہ اس اقلیم میں گھس کر فتنہ وفساد مچائیں اور نہ اندرونی خائنوں اور چوروں کی جرات ہوتی ہے کہ بدنظمی پھیلائیں، بیرونی دشمن، یعنی شیطان کے بارہ میں تو قرآن نے فرمایا کہ:

﴿اِنَّـهٗ لَيْسَ لَـهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ ① ''یقیناً اس (شیطان) کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں''۔ اور اندرونی دشمن یعنی نفس امارہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر خود ہی قانون کے تابع ہو جاتا ہے اور اسی پر مطمئن اور راضی بن جاتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ارْجِعِىْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ ② ''اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل، اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش''۔

اسلام کی بنیادی حقیقت...... اب اس تمام مضمون کا حاصل یہ نکل آتا ہے کہ یہ سارا عالم دو حصوں میں تقسیم شدہ ہے، ''مادیت اور روحانیت، یا سائنس اور اسلام'' اسلام اور روحانیت کی بنیاد بحوائے حدیث دو اصول پر ہے۔ ایک ترک ماسوی اللہ جسے صدقہ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اخلاق جسے اخفاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے اصول کا حاصل یہ ہے کہ خدا کے سوا دنیا ہو یا اپنا نفس اور ہوائے نفس، سب کی وہ الفت قلب سے نکال پھینکنا جو الفتِ حق میں خلل انداز ہو، اور دوسرے اصول کا حاصل یہ ہے کہ اس ترک ماسوی میں خالص اسی ایک محبوب حقیقی کے راضی کرنے کا جذبہ کام کر رہا ہو جو اس ارض وسماء کی محفل کا خالق ہے۔ اس بارے میں، نہ خود بینی ہو، نہ خود نمائی، نہ خودی ہو، نہ خود ستائی۔

---

① پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآية: ۹۹. ② پارہ: ۳۰، سورة الفجر الآية: ۲۷، ۲۸.

سائنس کی جڑ بنیاد کیا ہے؟......اس کے بالمقابل سائنس کی بنیاد جو اسلام کے متقابل ہے۔خود بخود ان دو اصولوں کی ضدوں پر نکل آتی ہے۔ترک ماسوی کی ضد حب ماسویٰ ہے اور اخلاص کی ضد نفاق ہے۔

جب ماسویٰ کا حاصل یہ ہے کہ ہر غیر اللہ اور ہر باطل کی محبت ہو اور نہ ہو تو خدا اور حق کی محبت نہ ہو۔چونکہ غیر اللہ کی محبت کے سلسلہ میں اپنا نفس سب سے مقدم ہے۔اس لئے گویا سب سے پہلے اور سب سے زیادہ محبت اپنے نفس سے ہو اور نفس کو چونکہ تمام مادی لذائذ سے محبت ہے۔اس لئے بواسطۂ نفس سارے مادی لذائذ سے محبت ہو جس کا نام دنیا ہے۔گویا حبّ ماسویٰ کا حاصل یہ ہے کہ نفس جاہل بوجہ حقیقت ناشناسی کے انہی مادی لذائذ کو جن کی صورت آراستہ ہے اور انجام گندہ ہے، اپنا منتہائے مقصود ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

لیکن جب کہ فی نفسہ یہ مادی لذائذ کسی برتری اور انجام کی خوبی نہ رکھنے کے سبب اہل بصیرت کی نگاہوں میں باوقعت نہیں بنتے اور وہ ایسے دنی مانوس کو قابلِ ملامت ہی سمجھتے رہتے ہیں۔اس لئے یہ نفوس اپنے خسیس مطلوبات پر اصول اور شائستگی کا پردہ ڈال کر انہیں معقول باور کرانے کی سعی کرتے ہیں۔

اور اس قسم کے تمام نفسانی جذبات کو جن سے مذاقِ سلیم کتراتا ہے، کمالات کا لباس پہنا کر سامنے لاتے ہیں تا کہ اپنے ان خسیس مطلوبات کو عام نگاہوں میں کچھ باوقعت بنا سکیں۔مثلاً عام لہو ولعب اور بازاری رقص و سرور کو فنون لطیفہ کے عنوان سے پیش کرتے ہیں۔منظم عیاشیوں اور بدکاریوں کو قانونی رنگ میں لے کر تہذیب و تمدن کا عنوان دیتے ہیں۔استعمار اور جوع الارض کو خوشنما الفاظ میں پیش کر کے ترقی کا عنوان دیتے ہیں۔جنگی آلات کی بے پناہ خون ریزیوں اور تباہی انسانیت کو جنگِ حق وصداقت اور قیامِ امن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔وسائل عیش وطرب کی فراہمی کو سوسائٹی کی بلندی اور برتری سے تعبیر کرتے ہیں، پرستش اپنے نفس اور ہوائے نفس کی کرتے ہیں اور الفاظ کے چکر سے اسی کو حق کی پرستش دکھلاتے ہیں۔عقیدت واطاعت اپنے جذبات کی ہوتی ہے اور نام سچائی کی عقیدت کا لیتے ہیں۔

غرض یہ مادی نفوس اچھے عنوان سے فائدہ اٹھا کر اپنی ہوسنا کیوں کو چھپانے اور انہیں خوبصورت لباس میں دکھلا کر باوقعت بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ نفاق کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ اندر کچھ ہو اور دکھلایا کچھ جائے، باطن گندہ ہو اور ظاہر کو آراستہ کیا جائے اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو دھوکہ اور فریب دیا جائے۔مادی تمدن کی انہی خوشنمائیوں اور گندم نما جو فروشیوں کو قرآنِ کریم نے زینت کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کی حقیقت یہی ہے کہ اندر کچھ نہ ہو، مگر ٹیپ ٹاپ اور سطحی آرائش سے اس میں دلفریبی کافی پیدا کر دی جائے۔

ارشادِ حق ہے ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ

حُسْنُ الْمَآبِ﴾ ① ''خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کی محبت، مرغوب چیزوں کی، عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، مویشی ہوئے، ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے، نمبر لگے ہوئے گھوڑے ہوئے، مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی، یہ سب استعمال کی چیزیں ہیں دنیوی زندگی کی اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے''۔

اس میں شہوت پرستیوں، مالی ہوسنا کیوں، اسباب مفاخرت و ریاست، غرض مالی تکاثر اور جاہی تفاخر کو زینتِ دنیا فرما کر بتلایا گیا ہے کہ ان تمام چیزوں زن، زر، زمین وغیرہ میں محض سطحی، عاجل اور ناپائیدار لذت ہے۔ ورنہ ان کی اندرونی حالت تیرہ وسیاہ ہے اور ان سب کی وابستگی کا انجام کدورت اور تلخی ہے۔ اگر چہ اس پر کتنے ہی پردے خوشنما اور دلفریب عنوانات کے لباس پڑے ہوئے ہوں۔ جس کا حاصل وہی بے حقیقت دکھلاوا ہے، جسے اصطلاحی لباس میں نفاق کہتے ہیں۔

اب اگر آپ غور کریں تو سائنس کے ان دونوں اصولوں حب ماسویٰ اور نفاق کی حقیقت باطل نکلتی ہے۔ نفاق کا باطل ہونا تو اس لئے ظاہر ہے کہ باطل کے معنی ہی یہ ہیں کہ دیکھنے میں بہت کچھ ہو اور حقیقت میں کچھ بھی نہ ہو۔ اوپر سے چمک رہا ہو اور اندر سے تاریک ہو پس جب کہ نفاق کی بھی یہ ہی کیفیت ہے کہ اندر کچھ ہو اور اوپر کچھ ہو تو نفاق کا باطل ہونا واضح ہے۔

ادھر ماسوی اللہ بھی باطل ہی کا ترجمہ ہے۔ کیوں کہ ہر ماسویٰ اللہ کی ہستی ظاہر ہے کہ اللہ ہی کے وجود دینے سے قائم ہوتی ہے۔ نہ وہ از خود قائم ہے اور نہ از خود موجود ہے۔ اس لئے حقیقتاً ماسویٰ اللہ کی ذات میں کوئی وجود یا کوئی کمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعہ محض وجودِ حق اور کمالات حق کا مظاہرہ ہوتا ہے اور جب کہ ماسوی اللہ کا خواہ وہ نفس انسانی ہو یا دوسرے موالیدِ عناصر اربعہ ہوں یا دوسرے اجزائے کائنات، خود ہی کوئی وجود نہ نکلا، تو وہ بظاہر تو موجود ہیں مگر کوئی ہستی ہی نہیں رکھتے۔ اس لئے کل کا کل ماسوی اللہ بھی اپنی ذات سے باطل ہی نکلا:

اَلَا كُلُّ شَىْءٍ مَاخَلَا اللّٰهُ بَاطِلٌ

اور جب کہ سائنس کی بنیاد انہی دو باطلوں پر تھی، ایک خدا سے قطع ہو کر ماسویٰ اللہ پر جو آفاقی باطل ہے۔ ایک نفاق پر جو نفسی باطل ہے تو پوری سائنس کی حقیقت بجز باطل ہونے اور باطل پسندی کے اور کچھ نہ ہوئی، جس پر سائنس دانوں کا یہ ناز او وہ شور وشغب ہے کہ اس سے ساری زمین اور آسمانی فضا گونج رہی ہے۔

ہاں اس کے بالمقابل اگر ماسویٰ اللہ کو ترک کر کے اللہ کو اختیار کیا جائے تو وہ حق ہے اور نفاق کو ترک کر کے اخلاص کو اختیار کیا جائے تو وہ بھی حق پر ہے اور اللہ کے ساتھ اسی مخلصانہ تعلق قائم کرنے کا ہی نام اسلام ہے، تو اسلام کی بنیاد ایسے حق پر نکلتی ہے جس میں باطل کا نشان نہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سائنس تو ایک شورِ بے بنیاد اور باطل کا نام ہے، اور اسلام ایک حقیقتِ ثابتہ اور حق کا نام ہے، جس کی جڑیں مستحکم اور دائمی ہیں۔ باطل کا کلمہ

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ ۱۴۔

بے بنیاد، حق کا کلمہ اپنی بنیادوں پر راسخ ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ ۢبِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ . وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ﴾ ① ''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے، جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جارہی ہوں، وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتی ہوں اور اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ خوب سمجھیں، اور گندے کلمہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو کہ وہ زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا جائے، اس کو کچھ ثبات نہ ہو''۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ...... مگر اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ میں نفس سائنس اور اس کی ایجادات کو روک رہا ہوں یا سائنس کی تعلیم پر حرمت کا فتویٰ دے رہا ہوں یا اس میں اشتغال کلیتہً باطل ہے بلکہ مقصد وہی ہے جو مختلف عنوانوں سے تقریر کے ذیل میں آچکا ہے کہ میں اسے قبلۂ مقصود اور کعبۂ مطلوب بنانے سے منع کر رہا ہوں۔ اگر یہ ساری جدوجہد جو آج سائنس کے سلسلہ میں کی جارہی ہے، کسی حقیقی مقصود کے لئے ہو، وہ نہ صرف جائز ہی ہے بلکہ آج کے دور میں مطلوب ہے اور وہ مقصود نہ ساری دنیا ہے کہ وہ تو خود وسیلہ ہے، نہ مادی راحت و آرام ہے کہ وہ بھی وسیلہ ہے بلکہ ایک مسلمان کے لئے آخرت اور اس کی مذہبی دیانت ہی مقصود ہو سکتی ہے کہ وہی مقصودِ اصلی ہے اور اسی کے لئے انسان کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔

پس سائنس مذہب سے بے تعلق رہ کر کلمہ خبیثہ ہے جس کے لئے کوئی ثبات و قرار نہیں اور مذہب کے ساتھ بحیثیت ایک خادم اور بطورِ ذریعۂ مطلوب کے وابستہ ہو کر وہ بلاشبہ نافع اور کارآمد ہوگی اور کلمۂ طیبہ ہی کے ذیل میں آجائے گی جس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں

لیکن میں جہاں تک محسوس کرتا ہوں، آج سائنسی جدوجہد ایک حقیقی مقصود کی سی نظر آرہی ہے، لوگ اس پر اسی کی خاطر جھک پڑے ہیں اور نہ صرف یہی کہ اس کے رد و قبول کا معیار مذہب کو نہیں بنایا گیا بلکہ بیشتر مواقع میں اسے مذہب کے خلاف استعمال کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ سائنس نے مذہب کی بنیادیں ہلادی ہیں۔ اور گویا سائنس ایک ایسا مقصود ہے کہ مذہب اس کا وسیلہ تک بھی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چہ جائیکہ اس کا مقصود قرار پائے۔

بہت ممکن ہے کہ دنیا کے قدیم مذاہب کے لئے سائنس نے کوئی ایسا ہی تخریبی اقدام کیا ہو۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کے جس مذہب کے ایک ایک جزو کے ساتھ سائنس ساتھ رہ کر چل سکتی ہے، وہ نہ صرف مذہبِ فطرت یعنی مذہب اسلام ہے۔ اگر اس کی تفصیلات دیکھنی ہوں تو میں نے اس پر ایک مستقل رسالہ

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۲۴-۲۶۔

’’تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام‘‘ لکھا ہے۔ جسے ’’ندوۃ المصنفین‘‘ دہلی نے شائع کیا ہے۔ جس میں دلائل واضحہ سے دکھلایا گیا ہے کہ سائنس کی تمام ایجادت درحقیقت اسلام کی معنویتوں کا مادی رخ ہیں اور اس دور میں اسلام کے تفہیم اور اس کے اقرب الی الفہم کرنے کے لئے ہی تکوینی طور پر سائنسی ترقیات کا وجود عمل میں آیا ہے۔ پس جو شخص سائنس کو اسلام کا وسیلہ بنا کر استعمال کرے گا وہ اسلام کو قوت پہنچائے گا اور جو اسے مستقلاً مقصود بناء کر عمل میں لائے گا وہ اپنے نفس کو ضعف اور ضرر پہنچائے گا، مگر اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑ سکتا۔

طلبائے یونیورسٹی کے لئے مقامِ عبرت...... بہر حال جب کہ سائنس محض یعنی بلاتوسطِ مذہب کلمۂ خبیثہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں اور اسلام کلمۂ طیبہ ہے، جس کی جڑیں مستحکم اور ہستی پائیدار ہے تو نیک نہاد اسلام فرزندوں کے لئے اس میں سے عبرت وموعظت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوقاتِ عزیز کو سائنس محض کی معلومات میں اس طرح نہ گنوائیں کہ وہ مقصودِ اصلی قرار پائے اور اس کی فانی لذات اصل ہو جائیں کہ یہ انجام کی ندامت کا سبب ہوگا۔ نیز وہ ان اقوام کی ظاہری چمک دمک اور ٹیپ ٹاپ پر فریفتہ نہ ہوں جنہوں نے آگ، پانی، ہوا اور مٹی کے گھروندوں میں سے کچھ چمکیلی چیزیں بنا کر دنیا کے لہو ولعب میں اضافہ کر دیا ہے کہ اس کی چمک دمک کی عمر بہت قلیل اور ہمیشہ قلیل ہی رہتی ہے۔

یہ سائنسی تمدّن اور شہریّت کی کمر چاندنی ایک متاعِ قلیل اور اس تمدن میں منہمک رہنے والی اقوام کی زندگی بہت محدود اور چند روزہ ہے۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے کہ چمکیلی تہذیب اپنے ہی تمدن سے ٹکرائے اور اپنے ہی متمدنوں کو اس اندرونی تصادم اور ٹکر سے ختم کر ڈالے۔ ﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ٥ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ ① . ’’تم کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے، چند روزہ بہار ہے۔ پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور بری ہی آرام گاہ ہے‘‘۔

دیکھنے میں عناصرِ اربعہ بھی نہایت نظر فریب ہیں۔ آگ نہایت چمکیلی باکروفر اور حرارت کے دور رس اثرات کی مالک ہے۔ پانی دیکھنے میں چاندی کی طرح شفاف اور نمنا کی کے پھیلنے والے اثرات کا حامل ہے۔ ہوا بظاہر لطافت کے سبب نہایت رقیق الجسم اور ہر جگہ بذاتِ خود منتشر اور موجود ہے۔ کرۂ زمین بحیثیتِ مجموعی نگاہوں میں نہایت باعظمت اور باشکوہ اور تاحدِ نظر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اپنے جبلی اخلاق وآثار کی بدولت یہ چاروں ہی عناصر محتاج پسماندہ اور بے حد ذلیل ثابت ہوئے اور ان کی یہ ظاہری چمک دمک ان کی جوہری پستی کو نہ مٹا سکی جیسا کہ مفصل ثابت ہو چکا ہے۔

ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ جس قوم یا سوسائٹی یا فرد پر ان مادی اخلاق کا غلبہ ہو اور وہ رات دن مادیات ہی کے جوڑ توڑ میں لگی رہے تو وہ قوم یا سوسائٹی گو بظاہر آگ کی سی چمک، پانی کا سا گورا رنگ، ہوا کی سی دور رسی اور پھیلاؤ اور زمین کی سی ٹھوس عظمت کی مالک نظر آ رہی ہو۔ مگر اپنے ان مادی اخلاق کے سبب جو اس میں مادی اشغال کی

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹۶، ۱۹۷.

بدولت رہ چکے ہوں، اپنے کو انجام کی ذلت وخواری سے کسی طرح نہیں بچا سکتی جو آخرت سے پہلے دنیا میں اس کے سامنے آ کر رہے گی۔ کیوں کہ جس مادہ کی قسمت میں بدءِ فطرت ہی سے کوئی عزت نہیں لکھی گئی، اس کی بنائی ہوئی قومی عمارتیں جتنی بھی زیادہ سر بفلک ہوں گی، اتنی ہی جلدی منہدم ہو جائیں گی۔

خاتمۂ کلام اور خلاصۂ نصیحت...... پس اے عزیزانِ ملت! آج کی نام نہاد و متمدن اقوام کی ظاہری شوکت پر نہ جاؤ۔ ان کا ہلاکت آفرین انجام عنقریب ہی سامنے آنے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خدا نہ کرے ان کی نقالی و تقلید سے تم بھی اس انجام کی لپیٹ میں آ جاؤ۔ ان اقوام کی طاقت آپ کے ضعف میں مضمر ہے نہ کہ خود ان کے کسی جوہر میں۔ روحانیوں نے میدان چھوڑ دیا تو مادیوں نے اسے آ دبایا۔ ورنہ جب دورِ اسلاف میں روحانیوں کی کثرت اور روحانی قومیت قائم تھی تو دنیا جانتی ہے کہ انہوں نے مادی عظمتوں کو کسی طرح نیچا دکھایا اور مادی رفعتوں کی کیا گت بنائی ہے۔ اگر آج بھی آپ اپنی حقیقت پہچان کر حقیقت پسند بن کر جائیں تو وہ سابقہ عظمت لوٹ سکتی ہے ورنہ یہ صورتوں کی نمائشیں زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکیں گی۔ بہر حال حدیث کی ایک حد تک شرح ہو چکی ہے اور سائنس اور اسلام کے موضوع کے عوارض یعنی دونوں کی حقیقت، دونوں کی غرض وغایت، دونوں میں مقصود و وسیلہ کی تعیین، دونوں کے طبعی اخلاق وخواص، دونوں کا انجام اور پھر دونوں کا مقتضا میں نے اپنی بساط کے موافق اس حدیث سے استنباط کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیا اور جس عنوان کا بیان آپ حضرات نے مجھ پر عائد فرمایا تھا۔ الحمد للہ کہ میں اس سے ایک حد تک عہدہ برآ ہو چکا ہوں۔ اس لئے دعائے توفیق واستقامت پر اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا

احقر: محمد طیب غُفِرَلَهٗ وَلِوَالِدَيْهِ
مہتمم دار العلوم دیو بند
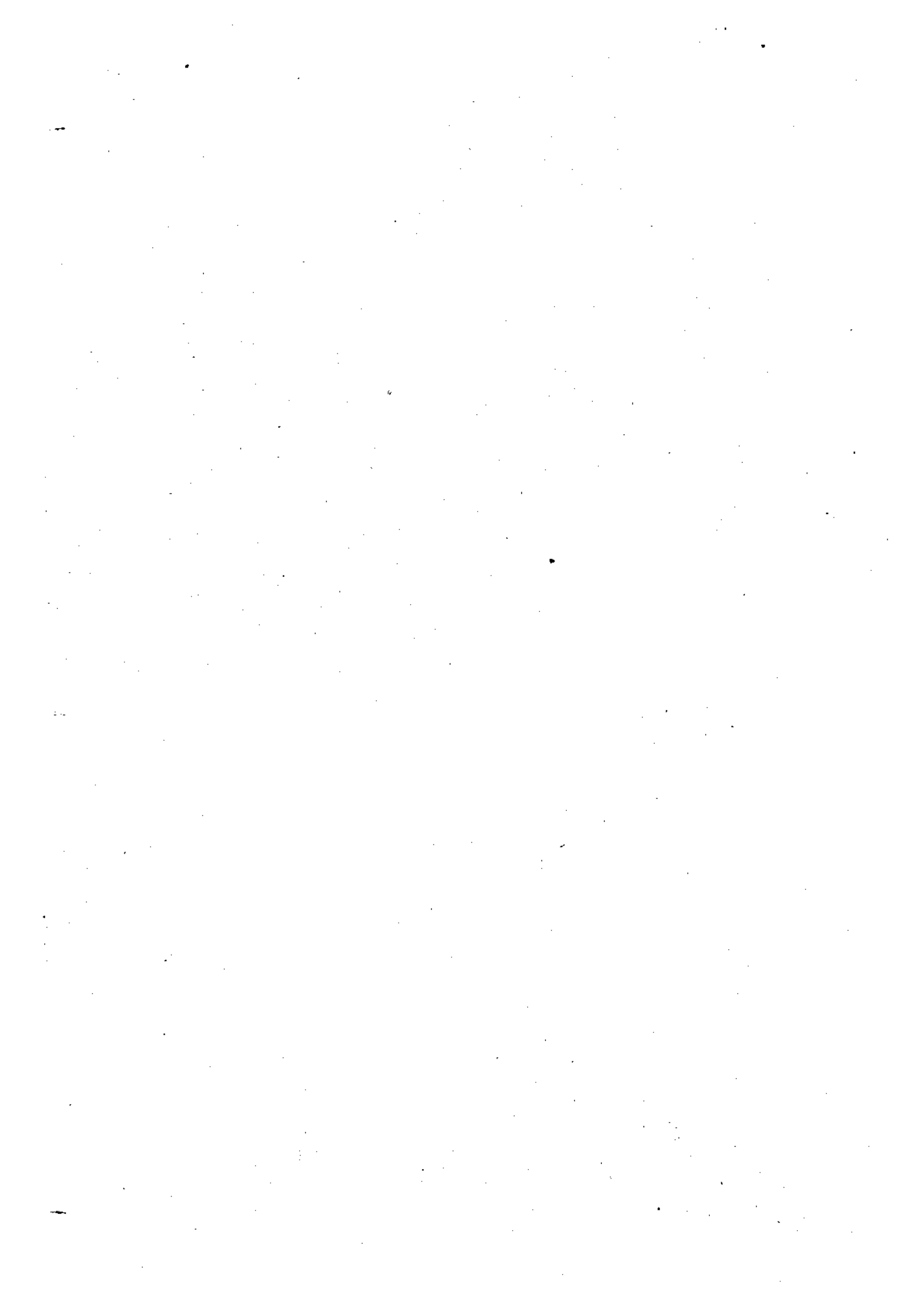
حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ

خطبات حکیم الاسلام

جلد — ۷

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشرز۔ کراچی۔ پاکستان

خطبۂ استقبالیہ اجلاس صد سالہ دار العلوم دیو بند

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَ نَـا وَسَنَدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِ یْرًا ، وَّدَ اعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا . أَمَّابَعْدُ!

صدرِ محترم! حضراتِ گرامی، علمائے کرام، مہمانانِ عظام ومعزز حاضرین! ہم اس ایمانی اور تاریخی اجتماع کے موقع پر جو برصغیر کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی بین الاقوامی تعلیم گاہ "جامعہ اسلامیہ دار العلوم دیو بند" میں بین الاوطانی انداز سے منعقد ہورہا ہے، جس میں تقریبا تمام اسلامی منطقوں کے فضلاء اور اربابِ دانش جمع ہیں، سب سے پہلے حق جل مجدہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اس چھوٹی سی بستی میں ایسی بڑی بڑی ہستیوں کو یکجا کر کے ایک دوسرے کی زیارت وملاقات، ربط باہمی اور اسلامی اخوت ومودت کو تازہ بتازہ کرنے کا موقعہ عطاء فرمایا۔ ہم اس موقع پر اس غیر معمولی مسرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آج یہ کبرائے ملت، ہم غرباءِ امت کے کندھوں سے کندھا ملائے بیٹھے ہوئے نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ دلوں سے دل ملا کر اسلامی اخوت، مساوات اور مودت باہمی کا عملی ثبوت پیش کرر ہے ہیں، جو محض فضل خداوندی اور انعام ربانی ہے۔

﴿لَوْ أَنْفَقْتَ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ أَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ أَلَّفَ بَیْنَھُمْ إِنَّہٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ﴾ ① اس پر جتنا بھی شکرادا کیا جائے کم ہے۔ ہم بصمیم قلب دعاء گو ہیں کہ اہل علم کی ہمت افزائی اور ملتِ اسلامیہ کی عزت افزائی کے لئے آپ حضرات اس سرزمین علم پر بار بار قدم رنجہ فرمائیں! آمین

شکر وسپاس...... اس کے بعد میرا سب زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ خوشگوار فریضہ یہ ہے کہ میں بحیثیت خادم جامعہ اپنی مجلس شوریٰ، اپنے ادارہ کے اساتذہ، شیوخ، طلبائے عزیز، فضلاءِ گرامی، مسلمانانِ ہند، جمیع کارکنان، ادارہ اور بالخصوص اجلاس صد سالہ کے مخلص کارکنوں کی طرف سے آنے والے مہمانان کرام کا شکریہ ادا کروں، جنہوں نے مشرق ومغرب کے دور دراز سفروں کی صعوبتیں جھیل کر محض اللہ کے لئے اس بین الملی اجتماع میں شرکت فرمائی۔

بلاشبہ یہ اسلام ہی کی جامعیت اور اجتماعیت کا کرشمہ ہے کہ ہم جیسے غرباء ان کبرائے قوم اور عظمائے ممالک

---

① پارہ: ١٠، سورۃ الانفال، الآیۃ: ٦٣.

کو اپنے درمیان دیکھ رہے ہیں اور ان کے پُر از مودّت و اخوت چہروں کی چمک دمک سے اپنی آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور بڑھا رہے ہیں، جس میں علماء و عرفاء بھی ہیں اور اصحاب حدیث و تفسیر بھی، ارباب فقہ و اصول بھی ہیں اور دانایان فلسفہ و کلام بھی، علوم شریعت کے شیوخ بھی ہیں اور علوم جدیدہ کے دانشور بھی، عمائد ملک و ملت بھی ہیں اور زعماءِ ممالک و اقوام بھی، جن میں سے ایک ایک فرد ایک مستقل یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے اور اپنی موءقر خدمات سے انسانیت کے لئے رہنما تسلیم کیا گیا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ کس زبان سے اور کن الفاظ میں ان جلیل القدر ہستیوں کا شکریہ ادا کریں۔ جب کہ الفاظ تو جذبہء امتنان و منت پزیری سے اوپر چڑھنا چاہتے ہیں، لیکن ان ہستیوں کی بلند مکانی تک صد ہزار کوششوں کے باوجود نہیں پہنچ پاتے ۔

دامان ِنگاہ تنگ گل حسن ِتو بسیار

ہم زبان و بیان بلکہ زمین و آسمان سے بھی زیادہ وسعت رکھنے والے اور ایمانی تقاضوں اور روح اسلامی سے مملو پُر خلوص جذباتِ تشکر کو دعائیہ تعبیر میں آپ حضرات کا پر تپاک خیر مقدم کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں کہ! "جَزَاكُمُ اللّٰهُ فِي الدَّارَيْنِ خَيْرًا وَّأَبْقَاكُمْ فِيْ عِزٍّ عَلَى الدَّوَامِ" (آمین!)

دیوبند ایک تاریخی اور مرکزی بستی ...... حضراتِ محترم! "یہ بستی" "دیوبند" جس میں آپ سب حضرات جمع ہیں، بہت پرانی اور قدیم الایام بستی ہے، تاریخوں سے تقریباً ڈھائی تین ہزار سال تک اس کی آبادی کا پتہ چلتا ہے، قدیم زمانے سے یہ بستی برادران وطن کی ایک زبردست تیرتھ گاہ ہونے کی وجہ سے (جو "دیوی کنڈ" کے نام سے معروف ہے۔ اور اس پر آج بھی سالانہ میلہ لگتا ہے) مرکزیّت کی حامل ہے، اس دیوی کنڈ ہی کے نام پر اس بستی کا قدیم نام "ڈیبی بن" تھا جو کثرت استعمال سے "دیوبند" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس چھوٹی سی بستی میں جس میں مسلمانوں کی تعداد بیس ہزار کے قریب ہے، سو سے اوپر مسجدیں ہیں، جن میں متعدد مساجد شاہی زمانوں کی یادگار ہیں، آدینی مسجد "یعنی قدیم جامع مسجد" پانچ سو سال اور ایک روایت کے مطابق آٹھ سو سال پرانی ہے جس کے سنگین کتبے پر بہلول شاہ ثبت ہے۔ مسجد خانقاہ عہدِ اکبری کی یادگار ہے "مسجد سرائے پیرزادگان عہدِ جہانگیری کے آثار میں سے ہے۔

یہ بستی شمالی ہند میں ۲۹ درجہ ۵۸ دقیقہ عرض البلد اور ۷۷ درجہ ۳۵ دقیقہ طول البلد دہلی سے ۹۲ میل شمالی جانب صوبہء یوپی میں واقع ہے۔ شیر شاہی شاہراہ اعظم جو پشاور سے کلکتہ تک چلی گئی ہے، اس بستی سے ہو کر گزرتی ہے، اس بستی میں قدامت کے ساتھ مرکزیّت کی شان بھی پہلے ہی سے موجود تھی، لیکن قدرت کو اس رسمی مرکزیّت سے شرعی مرکزیّت کا کام لینا تھا اور اس جگہ سے علم کا ایک ایسا ہمہ گیر چشمہ جاری کرنا تھا جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک کو بھی علوم نبوت سے سیراب کرے۔

روشن ضمیر اہلِ دل اس کی پیشین گوئیاں پہلے سے کرتے آرہے تھے "جس کی تفصیل تاریخ دارالعلوم" میں دی گئی ہے، ان پیشین گوئیوں کے مطابق یہ بستی عالموں، فاضلوں، قادرالکلام ادیبوں، آزادی کے جانبازوں اور

دینی میدان کے سرفروشوں کی بستی بننے والی تھی، یا با اسباب ظاہرہ یہاں کی قدیم مساجد کی اذانوں اور تکبیروں، ذکر د تلاوت کی محفلوں اور نمازیوں کے جمگھٹوں کی برکات کا ظہور دینی رنگ میں ہونے والا تھا۔

قیام دار العلوم کا پس منظر اور اسباب تاسیس...... وقت آیا تو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رست وخیز کے بعد اس بستی کا نیا دور شروع ہوا اور یہاں علمی وعرفانی زندگی کا ستارہ طلوع ہوا جبکہ ہندوستان کی باگ انگریز کے ہاتھ میں جا چکی تھی، اسلامی شوکت کے چراغ میں صرف دھواں اٹھتا ہوا رہ گیا تھا، جو چراغ کے بجھ جانے کا اعلان تھا۔ دہلی کا تخت مغل اقتدار سے خالی ہو چکا تھا، اسلامی شعائر رفتہ رفتہ روبزوال تھے، دینی تعلیم گاہیں اور علمی خانوادے اجڑ چکے تھے، دینی شعور رخصت ہو رہا تھا، جہالت وضلالت کی گھٹائیں افق ہند پر چھا چکی تھی، سنن انبیاء کی جگہ جاہلانہ رسوم ورواجات، مشرکانہ بدعات وخرافات اور ہوا پرستی زور پکڑتی جا رہی تھی جس سے دہریت والحاد، فطرت پرستی، آزاد فکری، بے قیدی نفس اور نوضویت کی وباء پھوٹ پڑی تھی، چمن اسلام میں خوش آواز پرندوں کے زمزموں کی جگہ زاغ وزغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی، مسلمان مضطرب وبے چین اور مایوسی کا شکار تھے، علماء کے لئے پھانسیوں کے پھندے تھے یا جلاوطنی کے مصائب، اس وقت چند نفوسِ قدسیہ نے اپنے منور قلوب میں یہ خلش اور کسک محسوس کی کہ ستم رسیدہ مسلمانوں کے ملی وجود کے تحفظ اور علومِ نبوت اور اسلامی معاشرے کو بچانے کی کیا صورت اختیار کی جائے اور ان میں دینی شعور اور ایمان دارانہ سیاسی فکر کو حیاتِ نو کس طرح بخشی جائے؟ تو یہ صلحائے امت کمرِ ہمت باندھ کر میدان میں آئے، جو رسمی قسم کے لیڈر نہ تھے بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاءِ وقت تھے، جو غیبی اشارے کے تحت کھڑے ہوئے اور آگے بڑھے، جن کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) تھے، جنہوں نے اس غیبی اشارے کو سمجھ کر اسے اس تجویز کی صورت دی کہ ایک دینی درسگاہ قائم کی جائے اور اس کی تعلیم وتربیت اور علم وعمل کے ذریعہ ڈوبتے ہوئے مسلمان کو سہارا دے کر دلوں کی مردہ زمینوں کو زندہ کیا جائے۔

چنانچہ ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ ہجری مطابق ۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء کو تعلیمی رنگ میں عالمگیر احیاءِ دین کی تحریک کا یہ پودا چھتہ کی مسجد میں (جو آپ حضرات کی نگاہ میں آ چکی ہے) ایک انار کے درخت کے نیچے صرف دو آدمیوں کے ذریعہ نصب کیا گیا، دونوں کا نام محمود تھا۔ ایک محمود معلّم تھا اور ایک محمود متعلّم۔ جو بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام سے معروفِ زمانہ ہوا۔ اس وقت نہ اس گمنام مدرسہ کے پاس اپنا کوئی مکان تھا نہ مکان بنانے کا سرمایہ، نہ پروپیگنڈہ تھا نہ اشتہار واعلان کا تخیل، صرف توکل علی اللہ کا سرمایہ تھا جس کی تلقین اور تاکید خود بانیءِ اعظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کے ہشتگانہ اساسی اصول میں بار بار شد ومد کی گئی ہے۔

دار العلوم دیوبند اور احیائے دین کی عالمگیر تحریک...... غور کرنے کی بات ہے کہ جس طرح ہندوستان سے اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا حادثہ محض مقامی یا محض ملکی قسم کا نہ تھا بلکہ عالمی رنگ کا تھا جس کے دوررس اثرات دوسرے اسلامی ملکوں پر بھی پڑے، چناں چہ تھوڑی ہی مدت کے بعد ہندوستان کی غلامی کتنے ہی ملکوں اور

ریاستوں کی غلامی پر منتج ہوئی، اس طرح ایمانی اور علمی رنگ میں احیاءِ دین کی یہ تحریک جو ''محمود دین'' سے شروع ہوئی، ابتداء محض ایک ضعیف کونپل کی صورت میں نمودار ہوئی، مگر اہل نظر کی نظر میں اس کونپل بلکہ اس کے تخم ہی میں ایک تناور شجرہ طیبہ لپٹا ہوا محسوس ہو چکا تھا، جس کے شیریں ثمرات سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک بھی بہرہ مند ہونے والے تھے اور وہ دین کی نشاۃِ ثانیہ کا مصدر و منشاء بننے والا تھا۔

اس لئے جہاں غلامی کے رنگ میں اس ملک کی تخریب عالمی تھی وہیں تعلیمی رنگ میں یہ تعمیری تحریک بھی بانیٔ اعظم کی فکر پر عالمی رنگ سے اٹھی، جو نہ صرف علم دین کے لحاظ سے ہی عالمگیر ہوتی چلی گئی بلکہ قومی اور ملکی مفادات کے لحاظ سے بھی ہمہ گیر ثابت ہوئی تا آنکہ اسی تحریک کے پروردوں نے جہاں سو برس بعد ہندوستان کو آزاد کرایا، وہیں اس کے طبعی نتیجہ کے طور پر جو ممالک اور ریاستیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، وہ بھی رفتہ رفتہ آزادی کا سانس لینے لگے، تخریب اگر عالمی انداز کی تھی تو اس کے ردِ عمل کے طور پر یہ تعمیر بھی عالمی ہی انداز سے ابھری جس کا علمی و عملی فیضان چند ہی سال میں ایشیاء سے آگے بڑھ کر افریقہ تک پھیل گیا اور آج یورپ و امریکہ تک اس کی شعاعیں پہنچ چکی ہیں، ان ساری آزادیوں کا خاموش رہنما بھی جامعہ دارالعلوم دیوبند تھا، جس کے فضلاء نے درس و تدریس کے ساتھ مختلف قومی و سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں اتر کر تحریکات کے ذریعہ اس ملک میں آزادی کی روح پھونکی اور ۱۸۵۷ء ہی سے پھونکنی شروع کر دی تھی جب کہ ملک کے دوسرے حلقے سراسیمہ اور خاموش تھے یا خوشامد میں لگے ہوئے تھے، ان بزرگوں نے غاصب انگریز کا مقابلہ ابتداءً آہنی تلوار سے کیا، پھر امن اور علم کی ناقابلِ شکست طاقت سے نبرد آزما ہوئے اور علمی رنگ سے یہ جذبات دور رس ثابت ہوئے اور آزادی کی لہریں دور دور تک پھیلیں جس سے اس جامعہ کے موسسین، فضلاء اور روشن ضمیر حلقوں کی سنہری تاریخ بھری ہوئی ہے۔

جامعہ دارالعلوم دیوبند کا بنیادی اور ہمہ گیر مقصد...... اس مرکزی جامعہ کی تعلیم کا اصل مقصد کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم و ترویج، اس کی عملی تمرین اور عمومی اشاعت و تبلیغ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تعصب آمیز منافرتوں کا استیصال کر کے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے، تاریخ اس پر شاہد ہے کہ بحیثیت مکتب فکر اس درسگاہ نے ہر اسلامی طبقہ کی طرف موانست و محبت کا ہاتھ بڑھایا اور بحیثیت جامعہ اس نے اپنا تعلیمی نصاب ایسا جامع رکھا کہ کوئی بھی اسلامی طبقہ اس سے باہر نہ رہنے پائے، نصاب میں حفظ قرآن سے لے کر تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ اصول فقہ کلام بلاغت و بیان، حقائق و اسرار اور ان منقولات کے ساتھ علوم معقولہ، منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، عروض و قافیہ، مناظرہ اور اختیاری فنون، مبادی سائنس، معلومات عامہ، علمِ طب، صنعت و حرفت اور خوشخطی وغیرہ نصابِ درس میں شامل کیں تا کہ کوئی بھی علمی، عملی، اخلاقی اور صنعتی طبقہ اس اجنبیت کو محسوس نہ کرے اور نہ صرف یہی بلکہ علم دین کے ہر بنیادی شعبے کو اس جامعہ میں ایک مستقل مدرسہ و کلیہ کی حیثیت و صورت دی گئی ہے جیسے مدرسۃ القرآن، مدرسۃ التجوید، مدرسۃ فارسی و ریاضی، کلیۃ الطب، کلیۃ الصنائع، کلیۃ اللغۃ العربیہ

اور کلیۃ الفقہ والافتاء وغیرہ، اس طرح اس درسگاہ نے ایک مذہبی یونیورسٹی اور جامعہ کی صورت اختیار کر لی اور الحمد للہ ہر ہر فن کے متخصص تا حال اس سے ۱۶ ہزار تیار ہو چکے ہیں اور جامعہ سال بسال مائل بہ ترقی ہے۔ ان ۱۶ ہزار فضلاء کی تعداد میں مدرّسین بھی ہیں اور مبلغین بھی، خطباء بھی ہیں اور مقررّین بھی، عماء بھی ہیں اور مفکرّین بھی، مصنفین بھی ہیں اور مؤرخین بھی، اطباءِ جسمانی بھی ہیں اور مصلحان روحانی بھی۔ فضلا دارالعلوم کی مذکورہ ۱۶ ہزار تعداد بلا واسطہ ہے اور بالوسائط ان فضلاء کو بھی شمار کیا جائے جو فضلائے دیوبند کے تیار کردہ ہیں تو یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے اور اس علمی گہوارہ کے لاکھوں مستفیدین نہ صرف برصغیر میں بلکہ ایشیاء، افریقہ، یورپ اور امریکہ تک میں بیش بہا دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد حضرت بانیٔ دارالعلوم اور جملہ بزرگان دیوبند کی سب سے بڑی سیاست ہی یہ تھی کہ دینی تعلیم گاہیں قائم کر کے مسلمانوں کو سنبھالا جائے، چناں چہ حضرت الامام بانیٔ دارالعلوم رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند کے علاوہ جگہ جگہ بنفس نفیس پہنچ کر دینی درسگاہیں قائم کیں اور اپنے متوسلین کو خطوط بھیج بھیج کر بڑی تعداد میں مدارس قائم کرائے۔

دارالعلوم دیوبند کے منہاج پر اور قاسمی فکر سے وابستہ معاہد و مدارس دینیہ ہی برصغیر میں درحقیقت دین کی بقاء و تحفظ کا ذریعہ ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اس طرزِ فکر کی کامیابی پر گزشتہ صدی کے ایک ایک دن اور ایک ایک رات نے مہرِ تصدیق ثبت کی ہے اور آج بحمد اللہ ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں دیوبندی مکتبِ فکر کے ہزاروں مدارس موجود ہیں۔ جن میں یہی علمائے دیوبند علمی، تبلیغی اور تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کہ تعلیم و تربیت کے بغیر تحفظِ دین اور اتباعِ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر مسلمانوں کو چلانے اور قائم رکھنے کی اور کوئی صورت نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا بنیادی مقصد تعلیم اور تربیت اخلاق ہی ظاہر فرمایا ہے۔

"اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" ① یعنی احکام کا تعلق تعلیم سے ہے۔ جو حدیث اول کا مفاد ہے اور احکام کے مطابق زندگی گزارنے کا تعلق تربیت اور تزکیۂ اخلاق سے ہے جو دوسری حدیث کا مفاد ہے۔ اس لئے علماء دارالعلوم نے انہی دونوں چیزوں کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد ٹھہرایا اور کامیابی کے ساتھ یہ منازل طے کیں! "تَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَاتَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ رَسُوْلِهٖ" ②

دارالعلوم کی تصنیفی خدمات...... اس مکتبِ فکر کا دوسرا سلسلہ تصنیف و تالیف کا ہے، تو اس سلسلے میں بھی علماء دیوبند کے قلم حقیقت رقم نے پانچ ہزار سے زائد تصانیف کا عظیم الشان ذخیرہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں جمع کیا جو برصغیر کے ہر اسلامی مکتبِ فکر سے بدرجہا زائد اور وقیع ہے۔

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ۱، ص: ۲۷۴.

② مؤطا امام مالک، کتاب الجامع، باب النهي عن القول بالقدر ج: ۵ ص: ۳۷۱.

تصنیف وتالیف کا سلسلہ آغازِ دارالعلوم ہی سے شروع ہوگیا تھا، خود حجۃ الاسلام حضرت بانی اعظم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تصانیف ۲۵ سے زائد ہیں' جن میں علم کلام، عقائد اور فقہیات وغیرہ کو عقلی اور حسی دلائل سے مبرہن کیا ہے اور ان کے بعد ان کے تلامذہ نے اس سلسلے کو نہر سے بحر بنا دیا، دارالعلوم کے مشہور مصنفین جنہوں نے علوم دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، احسان، اجتماعیات، سیاسیات، تاریخ اور سیرت وغیرہ میں تصنیفی خزانہ جمع کیا ہے، ان میں سرفہرست نام مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا آتا ہے جن کی تصانیف کا عدد ایک ہزار تک پہنچا ہوا ہے جو موصوف نے ہر علم وفن میں نثر ونظم میں، عربی، فارسی اور اردو میں مدوّن فرمائیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب محدث گوجرانوالہ پاکستان، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند ومحدّث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، حضرت علامہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ محدّث دارالعلوم دیوبند پھر ان کے تلامذہ میں ''حضرت شیخ الاسلام پاکستان علاّمہ شبیّر احمد صاحب عثمانی'' ''صاحب فتح الملہم''۔ حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ محدّث مدرسہ امینیہ دہلی وصدر جمعیت علماء ہند، حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ مدیر رسالہ ''القاسم'' و''الرشید'' دیوبند' حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ شیخ الادب والفقہ دارُالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ محدث دارالعلوم دیوبند، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدنی محدّث دارالعلوم دیوبند، پھر حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ ثم المدنی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مفتیٔ اعظم پاکستان، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدیر برہان دہلی، مولانا منظور احمد نعمانی صاحب مدیر ''الفرقان'' لکھنؤ، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، نیز حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے حقیر ترین تلامذہ میں یہ احقر راقم السطور بھی شامل ہے جس کی تصنیفات سو (۱۰۰) سے اوپر ہیں۔

اس کے بعد حضرت مولانا مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تلامذہ میں مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم اکوڑہ خٹک پاکستان، مولانا سیّد محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدّث مدرسہ امینیہ دہلی، مولانا منت اللہ صاحب رحمانی سربراہ مدرسہ رحمانیہ مونگیر، مولانا حامد الانصاری غازی صاحب وغیرہ اور ہزاروں وہ فضلاء ہیں جن کے قلم سے ہزار ہا تصانیف وجود میں آئیں اور اس طرح تصنیف کے سلسلے میں بھی یہ مکتبِ فکر برصغیر کے تمام مکاتب فکر سے آگے اور ممتاز ہے۔ جس نے دین کے ہر ہر گوشے کو اجاگر کیا اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مسائل کو علمی رنگ میں دنیا کے سامنے رکھا۔

ساتھ ہی دارالعلوم محض ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ ایک عملی تربیت گاہ بھی ہے جہاں علم کے ساتھ عمل صالح، اخلاق فاضلہ اور کثرتِ ذکر کی روح بھی طلبہ میں پھونکی اور پیوست کی جاتی ہے۔اس ادارہ میں حسن سلوک واحسان کے تحت شخصی تربیت کے علاوہ اصولی اور علمی طور پر بھی فن کے مسائل کو کتاب وسنت سے واشگاف کر کے اس مصنوعی تصوف پر کاری ضرب لگائی ہے جو فی زمانہ بنام تصوف چند بندھی جڑی رسوم وبدعات ومحدثات کا مجموعہ ہو کر رہ گیا ہے، اس لئے یہاں سے پڑھ کر نکلنے والوں میں علم کے ساتھ عزتِ نفس، وقار، استغناء اور خودداری کے ساتھ خاکساری تواضع، زہد وتقویٰ اور صلاح ورشد کی روشنی بھی راسخ ہوتی ہے جو اس کے فروعی مدارس میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔

دارالعلوم دیوبند برِصغیر کے مدارس وجامعات میں ام الجامعات ہے، اس لئے اسے ازہر الہند بھی کہا جاتا ہے جس کے فیضان سے ہزار ہا مدارس ومعاہد چل رہے ہیں اور لاکھوں کے قلوب میں ایمانوں کی حفاظت ہو رہی ہے اور بیشمار افراد طریق سنت پر لگے ہوئے ہیں۔اس طرح اس دور کی عقلیت پسندی اور خوگرئ محسوسات چونکہ نقلیاتِ دین کے ماننے میں حارج ہوتی تھی۔اس لئے انہی فضلائے دارالعلوم دیوبند نے قاسمی رنگ سے متکلمانہ انداز کی بھی سینکڑوں تصنیفیں سطح پر لا رکھیں جس سے نام نہاد عقلی شکوک وشبہات، تمدنی تاویلات اور معاشی تحریکات کا پردہ چاک ہو گیا۔ان فضلائے گرامی کو اگر چہ دستار وسند تو آج دی جا رہی ہے لیکن یہ بہت پہلے سے اپنی خدمات وتعلیمات سے خود سند دمستند ثابت ہو چکے ہیں۔

جامعہ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی امتیاز......اس دارالعلوم میں خصوصیت سے تدریس حدیث پر غیر معمولی توجہ دی جاتی ہے جو قرآن حکیم کی اوّلین تفسیر اور فقہ اسلامی کا اولین سرچشمہ ہے، اس لئے کہ فن حدیث کی تکمیل سے قرآنِ مبین اور فقہ فی الدین دونوں کے سمجھنے کی صحیح استعداد پیدا ہو جاتی ہے، اس کے نصاب کا اساسی حصہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام وبلاغت ومعانی، ادبِ عربی اور صرف ونحو ہے تفسیر فنون بطور مبادی واسباب یا بطور آثار ونتائج پڑھائے جاتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا سلسلۂ سند......اس دارالعلوم کا سلسلۂ سند اساتذہ دارالعلوم سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ تک، اور ان سے سندِ متصل کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔دارالعلوم کی جماعت خالصتاً اہلِ سُنّت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب وسنّت اور فقہ ائمہ پر قائم ہے۔اس کے ذوق پر تمام مسائل میں اولین درجہ نقل وروایت اور آثار سلف کو حاصل ہے۔اس لئے فضلائے ادارہ کتاب وسنت کی مرادات اقوال سلف سے، ان کے متوارث تعامل وذوق کی معرفت کے ساتھ اساتذہ شیوخ کی تربیت وصحبت اور معیت وملازمت سے حاصل کرتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی یہ مکتبِ فکر عقل ودرایت اور تفقہ فی الدین کو بھی فہمِ کتاب وسنّت کا ایک اہم ترین رکن قرار دیتا ہے۔

جامعہ دارالعلوم کا انتظامی طریقۂ کار......انتظامی حیثیت سے اس دارالعلوم کی تعلیمات وانتظامات کی نگران

اعلیٰ ایک مؤقر مجلس شوریٰ ہے جس میں ملک کے مقتدر علماء اور اربابِ فکر ونظر فضلاء شامل ہیں جن میں بعض بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ ادارۂ اہتمام کے تحت چوبیس انتظامی شعبے ہیں۔ ساٹھ اساتذہ اور دوسو سے اوپر شعبہ جاتی عملہ ہے جو تقسیم کار کے اصول پر کام کرتا ہے۔ ان تمام شعبوں کا حقیقی مقصد اساتذہ اور طلبہ کی ضروریات کی تکمیل اور نظام کی استواری ہے جس پر سالانہ ۳۰ لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے جس کی تکمیل کا شعبۂ محاسبی ذمہ دار ہے۔ اس کے ذریعہ ہر سال میزانیہ تیار ہوکر مجلس شوریٰ سے منظور کرایا جاتا ہے اور اسے باضابطہ آڈٹ بھی کرایا جاتا ہے۔

ملی اور اجتماعی دائروں میں جامعہ دارالعلوم کی تاریخی خدمات...... اس کے ساتھ دارالعلوم کی سرگرمیاں محض درس وتدریس تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس نے قومی، ملکی اور سیاسی معاملات میں بھی اندرون حدودِ شرعیہ بڑھ چڑھ کر قائدانہ حصہ لیا اور لے رہا ہے، اس کے اکابر کے کارنامے بھی تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ علیہما نے جہاد اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا جو نقش اپنے پاکیزہ لہو سے کھینچا تھا، وہ ہر وقت علماء دیوبند کے سامنے ہے۔

۱۸۵۷ء میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانی دارالعلوم اور حضرت قطبِ وقت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سرپرستِ اعظم دارالعلوم نے شاملی کے میدان میں تلوار اٹھائی اور انگریزوں سے جنگ کی، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مجاہدین کے قائد تھے، پھر ان کے تلمیذ رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر مدرسین دارالعلوم دیوبند اسی قیادت کو لے کر اٹھے اور آزادیٔ ہند کے لئے وہی ۱۹۱۵ء کی ریشمی خط کی انقلابی تحریک کے قائد تھے، جس کا مرکز افغانستان اور کثیر التعداد سینٹر مختلف ملکوں میں قائم تھے، مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور احمد انصاری، مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسے سرفروش مجاہدان کے دست راست تھے، اس راہ میں ہزاروں، شہید ہوئے، ہزاروں غازی بنے، خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پانچ سال تک فرنگی قید میں مالٹا رہے اور رہا ہونے کے بعد ہندوستان پہنچ کر اسی جوش جہاد سے جمعیت علماء ہند کی سرپرستی فرمائی اور آپ کے بعد یہ جماعت فضلاءِ دارالعلوم ہی کے تحت مصروفِ خدمت رہی۔

۱۹۲۰ء کی تحریکِ خلافت اور پھر ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی میں کتنے ہی علماء نے قائدانہ حصہ لیا، یہ اسی موروثی جذبہ اور عمل کا اثر تھا کہ جب ملک معظم عبدالعزیز آل سعود نے جزیرہ عرب میں اسلامی حکومت کا پر داز ڈالا تو علماء دیوبند نے سب سے پہلے اس کی حمایت کی اور دیوبند سے متعدد علماء اس کی تائید کے لئے سفر کر کے حجاز پہنچے، اسی طرح ماضی قریب میں جب بیت المقدس اور فلسطین کی آزادی کی تحریک اٹھی تو صیہونی اور برطانوی سامراج کے خلاف علمائے دیوبند ہی کا فتویٰ سب سے پہلے صادر ہوا اور ان مسائل میں دارالعلوم ہی نے تمام مسلمانوں کو اختلاف سے بالاتر ہوکر ایک محاذ پر جمع کیا اور اجتماعی احتجاج عمل میں آیا۔

اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں پر مظالم اور انہیں پسماندہ ومتفرق کرنے کے لئے جب بھی نزاعی مسائل

کھڑے کئے گئے تو ان کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے بھی فضلائے دیوبند آگے بڑھے۔ چناں چہ مسلمانوں میں تنظیمی اور طبقاتی اتحاد پیدا کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت قائم کی گئی، جس کی سربراہی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فاضل دیوبند رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم کر رہے ہیں، اس لئے اگر دارالعلوم کی یہ خواہش ہو کہ عالم اسلام کے رہنما، تعلیمی، علمی، تمدّنی اور اجتماعی میدان میں علمائے دیوبند اور مسلمانانِ ہند سے تعاون کریں، تو اس کی ہمہ جہت روشن تاریخ کی روشنی میں یہ خواہش یقیناً بجا اور برمحل ہوگی۔ حاصل یہ کہ جب بھی کوئی سیاسی فتنہ اٹھا جس سے مسلمانوں کے اجتماعی یا مذہبی معاملات مجروح ہونے کا اندیشہ ہوا، تو علماء دیوبند نے بیرونِ ملک بھی اس کے سدِ باب میں وہی پامردی دکھلائی جو اندرونِ ملک ہمیشہ ان کا طرۂ امتیاز رہی۔

جامعہ دارالعلوم اور باطل تحریکات کا مقابلہ...... انگریزی حکومت کے ایماء سے اس ملک میں بہت سی گمراہ کن سیاسی اور مذہبی تحریکیں اٹھیں، جن کے ذریعہ یہاں کے باشندوں اور خصوصیت سے مسلمانوں کو راہِ راست سے ڈگمگانے کی کوششیں کی گئیں، مگر دارالعلوم اور اس کے فضلاء نے پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور بحمداللہ ان کی کوششوں کی بدولت مسلمان انگریزی حکمت کی دسیسہ کاریوں سے بہت حد تک محفوظ رہے۔ بعض باطل پسندانہ تحریکات حضرت بانیٔ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں بڑے طمطراق کے ساتھ میدان میں آئیں اور ان کی جانب سے اسلامی احکام و مسائل پر جاہلانہ اور غلط اعتراضات کی بوچھاڑ کی گئی لیکن حضرت بانیٔ دارالعلوم اور پھر ان کے تلامذہ نے مناظروں اور تصانیف کے ذریعہ ان کے خلاف ایک مضبوط بند باندھ کر انہیں ختم کر دیا۔

انکارِ حدیث کا فتنہ ابھرا تو انہیں فضلائے دیوبند نے جیسے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور راقم الحروف (رحمۃ اللہ علیہ) نے نہایت مدلّل کتابیں تالیف کر کے اس کا سدِ باب کیا، اسی طرح قادیانیت اور دوسرے طریقوں سے مسلمانوں کو مرتد بنانے کی اسکیم تیار ہوئی تو دارالعلوم دیوبند نے پچاس سے زیادہ فضلاء اس کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتار کر ان کی مکروہ سازشوں کا قلع قمع کیا۔ فقہیاتِ اسلامی میں مداخلت کا فتنہ اٹھا تو دارالعلوم ہی نے قضاءِ شرعی قائم کرنے کی تحریک اٹھائی اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم خامس دارالعلوم نے پانچ سو علماء کے دستخطوں سے برطانوی حکومت کے سامنے محکمۂ قضاءِ شرعی کا مطالبہ پیش کر دیا جس سے یہ باطل تحریک مضمحل ہوگئی۔ ابھی ماضی قریب میں دوبارہ اس تحریک نے ترمیم فقہ کا روپ اختیار کیا اور عائلی قوانین اور فقہ میں ترمیم کرنے کی آوازیں بلند ہوئی تو دارالعلوم ہی کی تحریک پر بمبئی میں تمام مسلم فرقوں کا کنونشن بلایا گیا اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ قائم ہوا جس کی صدارت بالاتفاق مہتمم حال دارالعلوم دیوبند کے سپرد کی اور بورڈ کی متحدہ احتجاجی آواز پر حکومت نے اعلان کیا کہ وہ خود مسلم پرسنل لاء میں کوئی ترمیم نہیں کرے گی۔

غرض برِ صغیر میں جامعہ دیوبند کے ان علماءِ ربانیین رحمۃ اللہ علیہ اور فضلاءِ صالحین رحمۃ اللہ علیہ نے درس و

تدریس کے مشاغل کے ساتھ مذہبی اور دینی فضاء کو کبھی مکدّر اور زہر آلود نہیں ہونے دیا، بلکہ قلوب اور دماغوں کو جلا بخشنے کے لئے مدلّل تحریر و کتاب اور تقریر و خطاب کے ذریعہ ایک زبردست پشتہ بنا کر ان سیلابوں پر بند باندھ دیا۔ اس طرح برصغیر کے مشرکانہ ماحول میں اس نے دین توحید کو اس کی اصلی صورت میں قائم و برقرار رکھا ہے۔ اور آج یہ جامعہ اس بین الاوطانی اجتماع میں انہی خدمات پر ایک بڑی حسی دلیل کے طور پر اپنے ہزاروں فضلاء کو پیش کرنے میں شکر آمیز فخر محسوس کر رہا ہے کہ جن کی خدمات سے اطراف عالم میں دین پھیلا اور پھیل رہا ہے۔

عصری بین الاقوامیّت کے تقاضے...... یہ علمی اور عملی ثمرات اس وقت کے ہیں جب کہ دنیا پھیلی ہوئی تھی اور ہر ملک کا دائرہ عمل اپنی ہی حدود تک محدود رہتا تھا، لیکن آج وسائل نقل و حمل اور ذرائع علم و خبر کے وسیع تر ہو جانے کے سبب یہ پوری دنیا سمٹ کر ایک عائلہ اور قبیلہ بن چکی ہے اور کوئی بھی ملک محض اپنی داخلی سیاست سے اپنا کام نہیں چلا سکتا جب تک کہ اس کے روابط دوسرے تمام ممالک سے مستحکم نہ ہوں، اسی لحاظ سے آج دنیا کے سارے ممالک ملکِ واحد بن چکے ہیں اور پوری دنیا ایک نقطہ پر آ گئی ہے، اس لئے سیاسی امور ہوں یا انتظامی، سب بین الاقوامی رنگ ہی سے نمایاں ہو رہے ہیں، اس لئے ہمیں بھی مقامیّت سے آگے بڑھ کر بین لاقوامیّت کے دائرہ میں قدم رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، گو دارالعلوم کا مزاج ابتداء ہی سے بین الاقوامی ہے، اس نے قومی اور بین الاقوامی اسلامی تحریکات واجتماعات میں بھی شرکت سے کبھی گریز نہیں کیا، مئوتمر عالم اسلامی مصر، رابطہء عالم اسلامی مکہ مکرمہ، موتمر السیرت والسنۃ "دوحہ وقطر" موتمر ریاض میں اس کے نمائندگان نے شرکت کی اور اب عرب اور امارات متحدہ بھیجا، نیز رابطہ عالم اسلامی کی فرمائش پر یہاں سے تربیت الاطفال کے سلسلے میں متعدد اہلِ قلم نے مقالات ارسال کئے۔ اور آج بھی دارالعلوم کا یہی جذبہ ہے کہ اس کے ان علمی اور ثقافتی مقاصد کو اجتماعی رنگ سے عالمگیر بنایا جائے اور اسلامی تعلیمات کو اجتماعی قوت سے عالم پر آشکارا کیا جائے، نیز اسلام پر وارد کئے جانے والے شکوک وشبہات کا پردہ اجتماعی رنگ سے چاک کیا جائے۔

بلاشبہ اس کے لئے ضرورت تھی کہ بین الاوطانی اشتراک کے ساتھ اسلامی منطقوں کے رجالِ علم وفضل کو تکلیف دی جائے اور دارالعلوم کی خدمات پیش کر کے ان کی آراءِ گرامی سے استفادہ کیا جائے، ان خدمات کے پیش کرنے کا منشاء ہرگز ہرگز اس جامعہ کا کوئی تفوق جتانا یا جماعتی خودستائی کرنا نہیں حاشا وکلا، بلکہ یہ ہے کہ ماضی کا جائزہ لے کر مستقبل کے لئے آپ حضرات کے مشورہ وتعاون سے ان تبلیغی تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی مقاصد کی تعلیم کا کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس کی پشت پر سارے اسلامی منطقوں کی اجتماعی قوت کارفرما ہو، جس سے یہ دینی مقاصد اجتماعی انداز سے دنیا کے سامنے آ سکیں اور عام مسلمانوں کی زندگیوں پر کوئی عملی اثر ڈال سکیں، اور وہ ایمانی اخوت، باہمی تعاون، علمی اشتراک اور فکری یکسانی ہمت کے ساتھ اجتماعی عزائم وخدمات کو بروئے کار لا سکیں اور ان میں دینی دعوت کا وہ جذبہ ابھر آئے جو قرنِ اوّل کا نصبُ العین تھا کہ اس کے بغیر ان کی وہ پست ہمتی دور نہیں

ہوسکتی، جو آج ان پر چھائی ہوئی ہے۔

اگر اسلام کا مقصد واقعی اقوام دنیا کی اصلاح اور انہیں خدا پرستی پر لانا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کے نام لیواؤں کا یہ مقصد نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد، آج اجتماعی آواز، اجتماعی شعور، اجتماعی فکر اور اجتماعی تعاون کے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ یہ حقیقت آج کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ آج کوئی آواز بھی اس وقت تک وقیع نہیں بنتی جب تک کہ اس میں ہمہ گیری اور عالمیّت نہ ہو، اس لئے کہ آج کی سیاست ہے تو بین الاقوامی، تمدن و معاشرت ہے تو بین الاقوامی، تجارت وصنعت ہے تو بین الاقوامی، صلح وجنگ ہے تو بین الاقوامی، حتیٰ کہ کھیل کود بھی ہیں تو بین الاقوامی۔ اس لئے قدرتی طور پر طبائع میں یہ جذبہ آنا ہی چاہئے کہ دین کی دعوت اور اصلاحی آواز ہو تو وہ بھی بین الاقوامی ہی ہو، بالخصوص جبکہ اسلام خود ہی اپنی ذات سے بین الاقوامی بن کر دنیا میں آیا ہے جو ساری دنیا کی اقوام کے لئے پیغام ہے بلکہ اس نے دنیا میں بین الاقوامیت کا پر دار زڈالا ہے۔ اس لئے ہم یہ سمجھتے ہیں۔ ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ ① کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آچکا ہے اور وہ یہی وقت ہے کہ جس میں فطرت اسلام پکار رہی ہے کہ یہ بین الاقوامی دین اور اس کے انسانی فلاح کے ضامن بین الاقوامی مقاصد اور اس کی ہمہ گیر ثقافت بھی عالمی رنگ سے دنیا کے سامنے آئے۔

توحید وسنّت کی حامل جماعت تیار کرنے کے بعد حالاتِ وقت کے پیش نظر جامعہ دارالعلوم کی یہ خواہش بجا اور برمحل ہے کہ اس نئی صدی میں امتِ مسلمہ کے عالمی مقاصد کو باہمی تعاون سے آگے بڑھائے اور جو کام اب تک شخصی یا انفرادی یا تن تنہا اداری قوتوں سے ہوا ہے اسے اجتماعی بنائیں تا کہ پوری دنیا اسلام کے صحیح خدوخال سے واقف ہو۔

عالمی دعوت کے لئے تعلیمی جامعات میں ارتباط کی ضرورت...... ہمارے نزدیک قابل غور ضروری مسائل میں سب زیادہ اہم مسئلہ عالمی دعوتِ اسلام اور بگڑے ہوئے معاشرے کو درست کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس میں کن کن راستوں سے بگاڑ آرہا ہے اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہے، عموماً بے پڑھے لوگوں کا بگاڑ رسوم و رواجات اور کورانہ تقلید سے نشوونما پا رہا ہے، جس کا انسداد تبلیغی ذریعہ سے ممکن ہے۔ اور برسرِ اقتدار طبقوں کا بگاڑ جاہ پسندی اور ہواءِ نفسانی سے ابھرا ہوا ہے جس کا حل ان سے ہمدردانہ رابطہ قائم کر کے انہیں راہ پر لگانا ہے، اس لئے ان سب کے لئے نفسیات شناس ایسے مخلص فکری مصلحوں کی ضرورت ہے جو ہر ملک کے برسرِ اقتدار طبقہ کو اس کے اقتدار کی برقراری کا یقین دلا کر ان کی شخصی اصلاح کے ساتھ ان عمومی مقاصدِ دعوت کے لئے انہیں آمادہ بھی کرسکیں اور ان سے کام بھی لے سکیں۔

بہرحال تقسیمِ عمل کے اصول پر ہر طبقہ میں اسی کے مناسب حال اصلاحی افراد کی تشخیص عمل میں لانے کا مسئلہ آپ کے غور وفکر کا محتاج ہے، ساتھ ہی ان مسائل سے متعلق مالیاتی مصارف اور ایک بین الملّی مشترک فنڈ کا وجود

① پارہ: ۲۸، سورۃ الصف، الآیۃ: ۹۔

بھی بھی اپنی طبعی اہمیت کے ساتھ محتاج اعتناء ہے، اس عظیم دینی وملی مقصد وخدمت کے لئے یہ مرکزی جامعہ اپنی تمام تر عملی اور علمی خدمات پیش کرنے کے لئے تیار ہے، ہم اس کے آرزومند ہیں کہ ارباب علم وفضل ہمیں اس باب میں بھی اپنے موقر مشوروں سے نوازیں کہ اس مرکزی جامعہ کا عالم اسلام کے تعلیمی جامعات ومعاہد سے ممکن حد تک تعلیمی یکسانی کے ساتھ اس طرح قریبی رابطہ قائم ہو کہ جس سے طلبہ کے بین الجامعاتی تبادلے اور سندات کے معادلے کے مسائل سہل ہو جائیں اور عالمگیر سطح پر دینی خدمات کی راہیں ہموار ہو جائیں، غور کیا جائے تو فی زمانہ اداری قوت ایک بڑی قوت ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے تعلیمی، تہذیبی اور تبلیغی معیار سے جوڑ سکتی ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ادارے جہاں ایک دوسرے کی خدمات سے باخبر رہنے کے ذرائع مہیا کریں، وہیں معاندین اسلام کی لٹریری راہوں سے آنے والی دسیسہ کاریوں سے ایک دوسرے کو باخبر رکھنے اور بروقت اس کا سدِ باب کرنے کے لئے اپنے ذرائع ابلاغ کو مکمل طور پر استعمال کریں۔

اس ناچیز نے دارالعلوم کی ماضی کی خدمات کے اجمالی تذکرہ اور مستقبل کے منصوبوں کی پیش کش کے ساتھ چند مشورہ طلب نقاط بھی پیش کر دینے ضروری سمجھے، تا کہ اس بامقصد اجلاس کے اثرات آئندہ نسلوں کے لئے دیرپا اور خوش آئند ثابت ہوں۔ اس کے بعد میں اس سمع خراشی پر معذرت خواہی کے ساتھ صدرِ معظم اور مہمانانِ کرام اور معزز حاضرین کا تہہ دل سے مکرر شکریہ تشریف آوری پر ان افتتاحی اور خیر مقدمی کلمات کو ختم کرتا ہوں۔

وَالْحَمْدُلِلّٰهِ كَثِيْرًا اَوَّلًا وَّاٰخِرًا

دعاجو ودعاگو

محمد طیب

رئیس جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند

۲۵ ربیع الاول ۱۴۰۰ھ ۱۳ فروری ۱۹۸۰ء

اساسِ توحید

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِیْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِیَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰی کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّابَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ﴿قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا یَنْفَعُکُمْ شَیْئًا وَّلَا یَضُرُّکُمْ اُفٍّ لَّکُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ. ①

مدارِ حیاتِ انسانی...... بزرگانِ محترم! کائنات میں زمین سے لے کر جس قدر بھی مخلوقات ہیں اور جس قدر اللہ نے اشیاء پیدا فرمائی ہیں وہ سب انسان کے لئے بنائی ہیں اور انسان کے کارآمد ہیں، کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انسان کا نفع یا نقصان متعلق نہ ہو۔ انسانی زندگی کا دارومدار انہی کائناتی اشیاء کے اوپر ہے، اگر زمین نہ ہوتو انسان کس چیز کے اوپر رہے، گزربسر کرے؟ اگر آسمان اور اس میں ستارے، چانداور سورج نہ ہوتو روشنی کیسے ہو؟ سورج کی گرمی نہ ہوتو کھیتیاں کیسے پکیں، چاند کی ٹھنڈک نہ ہوتو پھلوں میں رس کیسے پیدا ہو؟ اور ہڈیوں میں گودا کیسے پیدا ہو؟ ستارے نہ ہوں تو راستوں کا تعین کیسے ہو؟ جہاز رانی کس طرح سے ہو؟ سمتیں کیسے معلوم ہوں؟ غرض زمین سے لے کر آسمان تک کوئی چیز ایسی نہیں جو انسان کے کارآمد نہ ہو۔

حیوانات ہیں تو وہ انسان کے کام آتے ہیں، کوئی انسان کو سواری دیتا ہے، کوئی انسان کے کھانے کے کام میں آتا ہے، کسی جانور کی ہڈیاں انسان کو کام دیتی ہیں، کسی جانور کا چمڑہ کام آتا ہے، چمڑوں کے اوپر کا اون اور پشمینہ انسان کے کام میں آتا ہے، غرض کوئی جانور ایسا نہیں جس سے انسان کا نفع متعلق نہ ہو۔

درختوں اور جڑی بوٹیوں میں کوئی درخت اور جڑی بوٹی ایسی نہیں ہے جو انسان کے نفع کے لئے نہ ہو۔ سب سے زیادہ وہ چیز جس کو انسان نفرت سے پھینک دیتا ہے وہ فضلات، گندگی اور نجاست ہے، وہ بھی انسان کے کارآمد ہے، اگر کھاد نہ ہو انسان کی کھیتی نہ اگے، تو وہ بھی کام دیتی ہے اور اس کی بھی دنیا میں قدروقیمت ہے۔ چناں چہ

① پارہ:۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۶۶، ۶۷.

کھاد بھی ہزاروں روپے کے حساب سے بکتی ہے اور انسان کے کام آتی ہے۔ تو پاک چیز ہو یا ناپاک چیز ہو، انسان کے لئے کارآمد ہے اور انسان کی زندگی ان چیزوں کے اوپر اٹکی ہوئی ہے۔ ان میں سے اگر ایک چیز بھی نہ ہوگی انسان کی زندگی تلخ ہو جائے گی۔ سورج نہ ہو تب زندگی ختم، چاند نہ ہو تب ختم، ہوا نہ تب ختم، زمین نہ ہو تب ختم، اس کی غذائیں نہ ہوں تب ختم، دوائیں نہ ہوں تب ختم، تو کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ انسان کی زندگی اس پر اٹکی ہوئی نہ ہو۔

کائنات کی انسان سے بے تعلقی ...... لیکن ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں کہ اس کی زندگی انسان پر اٹکی ہوئی ہو، اگر سارے انسان ختم ہو جائیں تو سورج کا کچھ نہیں بگڑتا، چاند کا کچھ نہیں بگڑے گا، ایک بھی انسان باقی نہ رہے تو زمین کا کچھ بھی نقصان نہیں، آسمان کا کوئی نقصان نہیں، پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہیں گے۔ درخت اور جڑی بوٹیاں اپنی جگہ قائم رہیں گی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ انسان کے کام کی نہ ہو اور انسان ان میں سے کسی کے کام کا نہیں، سوال یہ ہے کہ کیا انسان بیکار پیدا کیا گیا ہے۔ جب یہ نہ زمین کے کام کا، نہ چاند کے کام کا، نہ آسمان کے کام کا، آخر یہ انسان کس کام کے لئے بنایا گیا ہے، ان میں سے تو کسی کے کام کا نہیں ہے۔ کسی کی زندگی انسان پر اٹکی ہوئی نہیں ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ انسان کو بیکار پیدا کیا گیا ہے تو اس سے اللہ کی حکمت پر حرف آتا ہے حالاں کہ وہ اس سے بری ہے کہ اس کی حکمت پر کوئی عیب یا حرف آئے۔ جب کھاد جیسی گندی چیز بیکار نہیں پیدا کی گئی تو کیا انسان جیسی اشرف المخلوقات کو اللہ نے بیکار پیدا کیا ہے؟ یہ کس مرض کی دوا ہے، غرض جب کائنات میں کوئی چیز بے کار نہیں تو انسان بھی بیکار تو نہیں ہو سکتا جبکہ یہ سب سے اونچا اور افضل ہے۔

تخلیق کائنات و انسان میں باہمی ارتباط ...... اگر ان میں سے کسی چیز کے کام کا نہیں، پھر کس کے کام کا ہے۔ ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب مخلوق میں سے کسی کے کام نہیں تو پھر خالق کے کام کا ہوگا۔ اور کسی کے کام کا نہیں ہو سکتا۔ اب آگے یہ سوال رہ جاتا ہے کہ خالق کا کون سا کام انسان کے اوپر اٹکا ہوا ہے؟ اس کی مخلوق کا تو کوئی کام اٹکا ہوا نہیں، تو خالق جو غنی ہے اور ہر برائی اور محتاجگی سے بری ہے، اس کا کون سا کام اٹکا ہوا ہے۔ اس کے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے جس کو انسان سے مانگا جا رہا ہے اور طلب کیا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے خزانے میں ہر چیز ہے، اس کے خزانے بھرپور ہیں مگر ایک چیز اس کے خزانے میں نہیں ہے، اس کو انسان سے مانگا جا رہا ہے۔ اللہ کے خزانے میں علم ہے، کمال ہے، عروج ہے، رفعت اور بلندی ہے، غناء اور استغناء ہے، مگر اللہ کے یہاں محتاجگی نہیں ہے۔ ذلت نہیں ہے، جھکنا نہیں ہے، پس ماندگی نہیں ہے، انسان کو اس لئے بنایا گیا کہ یہ اس کے سامنے جھکے، اپنی ذلت اس کے سامنے پیش کرے اور اپنی محتاجگی نمایاں کرے تاکہ اس کی عزت وعظمت دنیا کے اوپر واضح ہو اور اس کی رفعت و سربلندی دنیا کے اوپر نمایاں ہو جائے، تو انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جھکے یعنی عبادت کرے، عبادت کے معنی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں۔ انسان کو اللہ نے اس لئے بنایا کہ یہ اللہ کے آگے اپنی انتہائی ذلت پیش کرے تاکہ اللہ کی انتہائی عزت سب کے سامنے نمایاں ہو جائے۔ یہ

یوں عرض کرے کہ ''اے اللہ! جیسے تیری عزت کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے، تیرے سامنے میں وہ ذلت پیش کرتا ہوں کہ اس ذلت کی بھی کوئی حد ونہایت نہیں ہے انتہائی طور پر تیرے آگے پست ہوتا ہوں''۔

انسان میں سب سے زیادہ عزت کی چیز اس کی ناک اور پیشانی ہے۔ اگر کوئی ذلیل بن جاتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ ''فلاں کی ناک کٹ گئی'' یعنی وہ ذلیل ہوگیا، فلاں کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا، یعنی اسے ذلت پہنچ گئی، تو ناک اور پیشانی سے زیادہ بلند اور باعزت چیز انسان میں اور کوئی نہیں، انہی کو اللہ کے سامنے زمین پر رگڑا جاتا ہے تا کہ انسان کی انتہائی ذلت ظاہر ہوجائے۔

غرض اللہ عزتِ مطلقہ رکھتا ہے اس کے سامنے جو مخلوق ذلتِ مطلقہ پیش کرے وہ انسان ہے، اس کے بنانے کی غرض و غایت یہ ہے کہ یہ اللہ کے آگے جھکے اور ساری کائنات اس کے آگے جھکے، ہر چیز اس کے آگے چاکر اور نوکر بن کر پیش ہو، اور یہ اللہ کا نوکر بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو۔

''اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَ اَنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ.'' ① ''ساری دنیا تمہارے لئے بنائی گئی اور تم آخرت کے لئے بنائے گئے'' تم دنیا کے لئے نہیں بنائے گئے، دنیا تو تمہارے لئے بنائی گئی ہے، تم درخت اور پتھروں کے لئے نہیں ہو، درخت اور پتھر تمہاری چاکری کے لئے بنائے گئے ہیں۔ تم چاند اور سورج کے لئے نہیں، چاند اور سورج تمہاری خدمت کے لئے بنائے گئے ﴿خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ ② ''جو کچھ زمین میں ہے وہ سب انسان کے لئے ہے اور انسان پروردگار کے لئے ہے''۔

کائنات میں انسان کا مرتبہ...... اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسا کہ ایک شخص عظیم الشان بلڈنگ تیار کرے، کیوں؟ اس لئے کہ اس نے ایک عورت سے نکاح کرنا چاہا جس سے اس کو محبت پیدا ہوئی۔ نکاح کر کے اس نے عورت کی ضرورت سے ایک بلڈنگ بنائی۔ تا کہ وہ راحت سے اس میں رہے اور گزر بسر کرے۔

بلڈنگ کے اندر اس نے ملازم رکھے، فرّاش رکھے، جھاڑو اور صفائی کرنے والے رکھے تا کہ مکان صاف ستھرا رہے، اس کی بیوی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، اس نے باورچی رکھے تا کہ بیوی بھوکی نہ مرے، اس کے لئے کھانا پکائیں، اس نے مشعلچی رکھے تا کہ رات کو مکان میں روشنی کریں، تا کہ اندھیرے میں رات کو اسے تکلیف نہ پہنچے۔ غرض جتنی بھی خدمت کی اشیاء ہیں وہ سب مہیا کیں، اور ہر خدمت کے خادم مہیا کئے۔ یہ سب بیوی کے لئے، اور بیوی کا ہے کے لئے ہے؟

بیوی ان خادموں کے لئے نہیں ہے۔ فرّاش اور باورچی کے لئے نہیں ہے، مالک نے بیوی اپنے لئے

---

① شعب الایمان للامام البیہقی، النوع التاسع والثلاثون من الایمان، ج:۲۲، ص:۲، رقم:۱۰۱۸۵. علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں: اخرجہ البیہقی فی الشعب من حدیث الحسن عن رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفیہ انقطاع دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج:۷ ص:۲۶۲. ② پارہ:۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۹.

رکھی ہے تاکہ ساری ضرورتیں اور خدمتیں بیوی کی ہوں اور بیوی میرے کام آئے۔ اگر بیوی خاوند کی خدمت سے انکار کر دے یا سرکشی دکھلانے لگے یا خاوند کو آنکھ دکھانے لگے۔ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بیوی کو طلاق دے گا بلکہ گولی مار دے گا، اس مکان کو بھی ترک کرے گا، اسے بڑھا دے گا، خادم بھی ختم کر دے گا، اس کی ضرورت سے یہ رکھے تھے، جب یہ میری وفادار نہ ہوئی تو مجھے نہ بلڈنگ کی ضرورت ہے نہ خادموں کی ضرورت ہے، نہ فرّاش کی ضرورت ہے، اس پر تین طلاق، یہ اس قابل نہیں ہے کہ یہاں رہے بلکہ گولی مار دینے کے قابل ہے۔

خالقِ کائنات کا انسان سے خصوصی معاملہ...... یہی صورت بعینہٖ انسان کی ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنی محبوب ترین مخلوق بنایا، اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا کہ کائنات کی کسی چیز کے ساتھ اس محبت کا برتاؤ نہیں کیا، عزت اسے دی، کھانے پینے کی اشیاء اسے دیں، دریا اور پہاڑ اس کے لئے بنائے، آسمان و زمین کی بلڈنگ تیار کی، اس میں سورج اور چاند کے انڈے لٹکائے تاکہ روشنی ہو، اس میں بادل بنائے تاکہ پانی برسے، ہوائیں چلائیں تاکہ مکان صاف ستھرا رہے۔ یہ سب کچھ انسان کے لئے اور انسان مالک کے لئے، اگر مالک کے کام نہیں آئے گا تو یہ انسان گولی مار دینے کے قابل ہوگا۔ اور اگر سارے انسان مل کر سرکش بن جائیں تو اس خیمے ہی کو بڑھا دیا جائے گا کہ نہ آسمان کی ضرورت ہے نہ زمین کی، جب یہ ہی قابل گردن زدنی بن گیا تو اب اس کے خدّام کی ضرورت باقی نہیں رہی، تو یہ انسان کا نقشہ ہے کہ انسان اللہ کے لئے بنایا گیا ہے، کائنات انسان کے لئے بنائی گئی۔ ''اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَ اَنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ۔ ''

اب اگر وہی جس کے لئے بلڈنگ بنائی تھی اور خادم رکھے تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ خاوند کی خدمت نہ کرے چھوڑے، تب بھی قابلِ گردن زدنی تھی۔ اور اگر اس سے بڑھ کر بیوی یہ حرکت کرے کہ کہیں اس نے کسی خادم سے آنکھ ملانی شروع کر دی، کہیں اس نے فرّاش سے آشنائی شروع کر دی، کہیں باورچیوں سے اس نے دل لگی کی باتیں شروع کر دیں تو اب زندہ رکھنے کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ خاوند اس کو گولی مار دے گا، کہ یہ تو بدکار اور فاحشہ ہے، یہ تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے زندہ چھوڑا جائے۔ جہاں تک میری خدمت ترک کر دی تھی، بری تو بنی تھی مگر خیر۔ چھوڑ دینے کے قابل تھی، اسے چھوڑا جا سکتا تھا۔ جب مجھے چھوڑ کر اس نے دوسروں سے آشنائی شروع کی۔ اور وہ بھی اپنے باندی غلاموں سے، اب تو یہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے باقی رکھا جائے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ کہ اللہ نے یہ بلڈنگ بنائی، اس میں خادم رکھے۔ کس طرح سے خادم رکھے؟

کائناتی خدّام...... فرّاش رکھے تاکہ مکان صاف ہو۔ یہ ہوا جو ہے یہ اس کائنات کی فرّاش ہی تو ہے۔ اگر ہوائیں نہ چلیں تو کوڑا کرکٹ نہیں جا سکتا، تو اس بلڈنگ کے صاف کرنے کے لئے اللہ نے ہوائیں پیدا کیں تاکہ فرّاش کا کام دیں۔ اور مکان کو صاف ستھرا رکھیں۔ یہ سورج کیا ہے۔؟ یہ آپ کا باورچی ہے جو آپ کی کھیتیاں پکاتا ہے، اس کی گرمی سے آپ کے دانے پکتے ہیں اور یوں سمجھنا چاہئے کہ سورج فی الحقیقت ایک باورچی ہے جو اللہ

نے انسان کے لئے مقرر کیا ہے۔

یہ بادل کیا ہیں؟ یہ بہشتی ہیں جو پانی بھر بھر کے لاتے ہیں اور آپ کی کائنات کو سیراب کرتے ہیں، ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے کہ اس وقت آ کے آپ کے تالابوں کو بھریں۔ آپ کی نہروں کو چلائیں۔ اور آپ کے کنوؤں کو پانی دیں۔ تاکہ سال بھر تک یہ خزانہ پانی سے بھر پور رہے اور انسان کو تکلیف نہ ہو۔ تو کوئی بہشتی ہے، کوئی باورچی ہے، کوئی فراش ہے جو کام کر رہا ہے۔ اب اگر یہ انسان مالک کو چھوڑ کر کہیں باورچی سے آنکھ ملانا شروع کرے اور سورج کے آگے ڈنڈوز کرنے لگے اور باروچی کے آگے جھکنے لگے، کہیں فراش جو ہوا ہے اس کے سامنے سجدہ کرنے لگے اور ہوا پرستی کرے، کہیں آپ کے لئے پانی برسانے کا بادل سامنے آئے، اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو اور منتیں مانگنے لگے۔ تو یہ ایسا ہی ہے جیسے بیوی بہشتی سے آشنائی کر لے۔ یا فراش سے آشنائی کر لے۔ تو گولی مار دینے کے قابل ہو گی، اس قابل نہیں ہے کہ اسے بلڈنگ میں رکھا جائے۔

مخدوم کائنات کی بے عقلی ...... بلکہ جب وہ اس درجہ پر ہے تو یہ بلڈنگ بھی منحوس ہے۔ اسے بھی بڑھا دو۔ تو انسان کا کام یہ ہے کہ ساری چیزیں اس کے لئے ہوں اور یہ اللہ کے لئے ہو۔ یہ غیر اللہ کے سامنے سجدہ نہ کرے۔ اس سے زیادہ انسان کی کم حوصلگی نہیں ہوگی کہ وہ آگ کے آگے ہاتھ جوڑنے لگے، وہ پانی کے آگے ڈنڈوز کرنے لگے وہ سورج اور چاند کے آگے جھکنے لگے، جو باندی، غلام اور خادم بنائے گئے تھے ان کے سامنے ہاتھ جوڑنا، کھڑا ہونا قلبِ موضوع ہے کہ جو مخدوم تھا وہ خادم بن گیا، جو خادم تھا اسے مخدوم بنا لیا گیا۔ گویا عقل کو انسان نے الٹ دیا کہ جس کو اپنے سامنے جھکانا چاہئے تھا۔ اس کے سامنے یہ خود جھک گیا، یہ تو وہ ہیں کہ جب اللہ والوں کو ضرورت پیش آتی ہے تو یہ خدمت کرتے ہیں، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا تو چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے، اسے پھٹتے بن پڑی، حضرت یوشع ابن نون علیہ الصلوٰۃ السلام کے لئے جنگ کے موقع پر سورج روک دیا گیا تاکہ دن دن میں فتح ہو جائے، تو دن کو ٹھہرا دیا گیا تھا، سورج خادم تھا تو اسے لئے روکا گیا۔ لیکن حضرت یوشع علیہ السلام کے کام کو نہیں روکا گیا۔ کہ وہ مقصود تھا اور سورج اس کا وسیلہ تھا۔ وسیلے پر پابندی عائد کی گئی مقصود پر پابندی عائد نہیں کی گئی۔ غرض بادل ان کے لئے آتے ہیں، سورج ان کی خدمت کے لئے آتا ہے، چاند ان کے سامنے اطاعت کرتا ہے، ذرّاتِ کائنات اطاعت کرتے ہیں۔

کائنات کا افادی پہلو اور اس کا مقصد ...... انسان کو دیکھو سمندروں میں اس کا تصرف ہے، پہاڑوں میں اس کا تصرف ہے، زمین اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہے، چاہے زمین کو کھودے، چاہے سڑکیں بنائے، فرمایا گیا ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ﴾ ①

''وہ، وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے ذلیل بنا دیا، تاکہ اس میں کھیتی کرو، دانہ ڈالو، سڑکیں بناؤ، کنویں کھودو، ذلیل

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۵۔

ہے زمین چوں نہیں کرسکتی، انسان کے سامنے اُف نہیں کرسکتی"۔ مگر انسان کس لئے ہے؟ ﴿وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ﴾ تاکہ یاد رکھے کہ اسے اپنے مالک کے آگے جانا ہے اور اس کے آگے جوابدہی کرنی ہے۔ تو انسان کا کام یہ ہے کہ حشر ونشر کو سوچے، قیامت کے دن کو سوچے، اور ان چیزوں کا کام یہ ہے کہ انسان کی چاکری میں لگی رہیں، جو خدمت یہ لے، اف نہ کریں، چپ چاپ اس کے کام میں لگی رہیں۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَالْاَنْعَامَ خَلَقَھَا لَکُمْ فِیْھَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ﴾ ① یہ چوپائے اور مویشی ﴿خَلَقَھَا لَکُمْ﴾ تمہارے لئے پیدا کئے ہیں، ﴿فِیْھَا دِفْءٌ﴾ بعضوں سے تم گرمی حاصل کرتے ہو، اونی کپڑے بنا کر ان سے گرمی حاصل کرتے ہو۔ ﴿وَمَنَافِعُ﴾ اور مختلف منافع ہیں ﴿وَمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ﴾ اور بعض جانوروں کے گوشت سے تمہارے کھانے پینے کا تعلق ہے۔ ﴿وَلَکُمْ فِیْھَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ﴾ ② بعضوں سے تم کرّ وفرّ اور حشم وخدم حاصل کرتے ہو جب ہاتھی اور گھوڑوں پر جھولیں ڈال کر جلوس نکالتے ہو اور اپنا کرّ وفرّ دکھلاتے ہو اور اپنے حشم وخدم کی نمائش کرتے ہو۔

اور فرمایا ﴿وَتَحْمِلُ اَثْقَالَکُمْ اِلٰی بَلَدٍ لَّمْ تَکُوْنُوْا بٰلِغِیْہِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾ ③ بعضے جانور وہ ہیں کہ ان پر مال کو لاد کر ایک بستی سے دوسری بستی تک لے جاتے ہو۔ غرض مختلف منافع فرمائے گئے۔ ﴿وَیَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ④ یہ وہ چیزیں ہیں کہ آج سواریاں بن گئی ہیں فرماتے ہیں، اور تمہیں کیا خبر ہے کہ آئندہ ہم نئی نئی قسم کی سواریاں پیدا کر دیں جن پر چڑھ کر انسان منزلیں طے کریں۔ چناں چہ موٹر سائیکلیں ہوائی جہاز اور دُخانی جہاز۔ غرض مختلف قسم کی سواریاں انسان کے لئے نکلیں تاکہ وہ احترام کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو۔ چوپائے اور جانور کو یہ عزت نہیں بخشی گئی، چوپایا جہاں بھی جائے گا اپنے پیروں سے چل کر جائے گا اور انسان سوار ہو کر جائے گا، کبھی چوپائے کے سر پر، کبھی جمادات کے سر پر اور کبھی نباتات کے سر پر، ہر چیز انسان کے لئے سواری بنا دی گئی۔ بہر حال حاصل یہ نکلا کہ انسان اللہ کے لئے ہے اور کائنات انسان کے لئے ہے۔

معیارِ عبادت ...... یہ اللہ کے لئے کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت نفع اور نقصان کے معیار پر کی جاتی ہے، جس کے قبضے میں انسان کا نفع اور نقصان ہے، اس کے سامنے جھکا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کے ہاتھ میں انسان کے نفع اور نقصان کی باگ ڈور ہے، نفع دے جب بھی اس کے قبضے میں ہے، نقصان پہنچائے جب بھی اس کے قبضے میں ہے۔ خواہ نعمتیں دے دے، خواہ مصیبت ڈال دے، نعمت دیکر چھین لے، یا چھینی ہوئی نعمت پھر واپس کر دے، ہر صورت میں اس کے دستِ قدرت میں ہے۔

معطیٔ حیات ...... مادی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت انسان کے لئے زندگی ہے، اس پر انسان کا کوئی بس

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۵. ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۶.
③ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷. ④ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸.

نہیں ہے، صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہے زندگی دے دے اور جب چاہے زندگی چھین لے۔ جب تک زندگی نہیں آتی، ایک انسان چاہتا ہے کہ میری اولاد ہو جائے۔ لیکن زندگی ہاتھ میں نہیں ہے تو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے کہ جب چاہے پیدا کرے۔ وہ دینا چاہے تو دے دے، نہ دینا چاہے تو انسان کو تمنائیں کرتے کرتے کرکے اور اسباب مہیا کرتے کرتے برس گزر جاتے ہیں مگر اولاد نہیں ہوتی، اس لئے کہ زندگی ہاتھ میں نہیں ہے، غرض زندگی کی نعمت اسی کے ید قدرت میں ہے۔ جب چھننے پر آتی ہے اور موت کا وقت آتا ہے تو آدمی ساری دنیا کے خزانے علاج پر صرف کردے لیکن ایک منٹ کے لئے بھی آدمی زندگی کو روک نہیں سکتا۔ جو اس کے جانے کا وقت ہے اس پر جاکر رہتی ہے، غرض نہ زندگی کو لانا قبضے میں ہے، نہ روکنا قبضے میں اور نہ واپس لے آنا قبضے میں ہے، جس کے قبضۂ قدرت میں ہے وہ سب سے بڑا نافع ہے جس کے قبضے میں نفع کی باگ ڈور ہے۔

معطیٔ صحت ...... آپ زندہ موجود ہیں۔ زندگی کے بعد سب سے بڑی نعمت تندرستی ہے۔ تندرستی آپ کے بس کی چیز نہیں ہے، جب تک مالک تندرست رکھنا چاہے آدمی تندرست رہتا ہے۔ چھیننا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ لوگ اسباب مہیا کرتے ہیں اور صحت کا تحفظ کرتے ہیں لیکن قابو نہیں ہے کہ اس کو حاصل کرلیں، آج شہر کے اندر انفلوئنزا پھیلا ہوا ہے۔ گورنمنٹ بھی سعی کر رہی ہے۔ مونسپلٹیاں بھی سعی کر رہی ہیں۔ شخصی طور پر ڈاکٹر بھی مطب کھولے ہوئے ہیں۔ پبلک بھی ایک دوسرے کی خدمت پر کھڑی ہوئی ہے۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ منٹ بھر میں یہ مادہ رفع ہو جائے۔ لیکن قبضے میں نہیں ہے۔ جب مالک کا حکم ہوگا جب ہی یہ بیماری واپس جائے گی۔ خواہ کتنا ہی جتن کیا جائے، اپنے وقت تک رہے گی۔

مبالغہ فی الاسباب کی ممانعت ...... جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب کوئی مصیبت آتی ہے، وہ اپنی ایک عمر ساتھ لے کر آتی ہے، جب اس کا وقت ختم ہوگا، جبھی ٹلے گی۔ بندے کا کام یہ ہے کہ اسباب کے درجے میں کچھ نہ کچھ اجمالی طور پر تحفظ کی فکر کی جائے۔ اسباب میں زیادہ مبالغہ نہ کرے ورنہ الجھ کر مصیبت کی عمر بڑھ جاتی ہے، فی الجملہ یہ سمجھ کر تحفظ کا سامان کرتا رہے کہ میں بندہ ہوں اور اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اسباب اختیار کروں تو ''وَاَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَ تَوَكَّلُوْا عَلَيْهِ'' ①

اجمال کے ساتھ اسباب کو طلب کرتے رہو، اللہ کے اوپر بھروسہ رکھو، اسباب پر بھروسہ مت کرو۔ اجمالی طور پر آدمی کچھ تحفظ کا سامان کرتا رہے، دوا پی لی۔ طبیب کو دکھلا دیا، لیکن طبیب کے اوپر توکل کر بیٹھے، یا دواؤں پر توکل کر بیٹھے یا ہمہ تن دل کو ڈال دے کہ یہی چیز شفا دینے والی ہے۔ یہ غلط ہے، دواؤں میں شفاء نہیں ہے، اور طبیب کے قبضے میں شفا نہیں ہے یہ تو وسائل اور اسباب ہیں۔ وسائل کے اندر تاثیر رکھنا مسبّبُ الاسباب کے ہاتھ میں ہے۔

---

① المستدرک للامام الحاکم، ج: ۴، ص: ۳۶۱، رقم: ۷۹۲۴. امام حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ذہبیؒ نے ان کی موافقت فرمائی ہے۔ دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج: ۶ ص: ۱۰۶ رقم: ۲۶۰۷.

تاثیراتِ اسباب کی حقیقت...... یہ آگ پانی، ہوا، اور مٹی بھی اسباب ہیں۔ آگ کی تاثیر یہ ہے کہ وہ جلائے، لیکن یہ اس کی ذاتی تاثیر نہیں ہے۔ اللہ نے اس میں یہ تاثیر رکھ دی ہے۔ وہ یہ تاثیر دکھلاتی رہتی ہے لیکن قبضے میں مالک کے ہے۔ اگر وہ آگ کی تاثیر کھینچ لے تو آگ جلانے کا ارادہ بھی کرے تو اس کے قبضے میں جلانا نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا گیا، جلانے کی تاثیر سلب کر لی گئی، آگ جھک مار کر بیٹھ گئی آگ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی، غرض آگ نہیں جلاتی، مشیتِ خداوندی جلاتی ہے۔ جب مشیت تقاضا کرتی ہے آگ جلانا شروع کر دیتی ہے۔

یہ پانی اصل میں ٹھنڈک بخشنے والا نہیں ہے، مشیتِ الٰہی ٹھنڈک بخشتی ہے۔ اگر پانی میں سے تبرید کا مادہ نکال لیں اور وہ خود بھی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے تو قابو نہیں پا سکتا، جب تک مالک اس کی تاثیر کو نمایاں نہ کر دے، ہر چیز کے افعال اور خاصیتیں یہ مخلوق خداوندی ہیں جب وہ نہیں چاہتے ہیں، نمایاں نہیں ہوتیں، اس لیے اصل موثر کو چھوڑ کر آدمی ان چیزوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ یہی مجھے شفا بخشنے والی ہیں۔ یہ غلط چیز ہے۔

موہمِ شرک عنوان سے احتراز کی تاکید...... اسی واسطے شریعت نے بہت سے عنوانات کی اصلاح کی ہے۔ مثلاً یہ عنوان کہ انسانوں کو چاہئے کہ اولاد پیدا کیا کریں۔ شرعی اعتبار سے یہ عنوان غلط ہے، شرعی طور پر اس عنوان کو بے ادبی کہا گیا ہے۔ پیدا کرنا خالق کا کام ہے، ماں باپ کا کام نہیں ہے کہ اولاد پیدا کریں۔ ماں باپ کا کام یہ ہے کہ وہ اسباب کے درجے میں باہم مل جائیں اور اللہ سے دعا کریں کہ اولاد پیدا کر دی جائے۔ اگر حق تعالیٰ شانہٗ پیدا نہ کرنا چاہیں تو ہزار دفعہ خاوند بیوی ملا کریں، کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ مانگنا بھی اسی سے ہے۔ بھروسہ بھی اسی پر ہے، ملنا بھی اسی سے ہے۔ جب اسباب اور وسائل میں وہ اثر ڈالتے ہیں تو اثر آ جاتا ہے۔ اور اگر آدمی مطلقاً اسباب کی طرف رجوع کرے تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

معرفتِ توحید و تصرّف...... حضرات انبیاء علیہم السلام ہی فی الحقیقت حق تعالیٰ شانہٗ کی توحید اور تصرّف کو پوری طرح سمجھتے ہیں، وہ مانگتے بھی ہیں تو اللہ ہی سے مانگتے ہیں۔ فریاد بھی کرتے ہیں تو اللہ ہی سے کرتے ہیں، کسی مصیبت کی شکایت بھی کرتے ہیں تو اللہ ہی سے کرتے ہیں۔ ہر چیز میں اللہ ہی سے رجوع کرتے ہیں۔

بارگاہِ حق میں سوال کا طریقِ کار...... حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ انہیں بیٹا مانگنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ ان کی نبوت کا مشن آگے چلے اور بڑھے۔ تو بیٹا مانگا۔ اس مانگنے کو حق تعالیٰ نے نقل فرمایا کہ: مانگنا بھی ہر کسی کا کام نہیں ہے۔ مانگنے کا ڈھنگ بھی حقیقتاً حضرات انبیاء علیہم السلام ہی کو آتا ہے۔ ان کے بتلانے ہی سے دوسروں کو آتا ہے۔ غرض حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹا مانگا؟ اس دعا کو حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں نقل کیا ہے اور واقعی اس طرح سے مانگنے کا انہیں کا حق تھا، دوسرے تو اس طرح سے سوجھ بھی نہیں سکتی۔

﴿إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَآءً خَفِيًّا﴾ ① فرماتے ہیں اس وقت کو یاد کرو جبکہ حضرت زکریا علیہ السلام نے چپکے چپکے اپنے دل میں اللہ سے مانگنا شروع کیا اور چھپی ہوئی آواز سے اولاد کی طلب کی۔ جس کو وہ سنتے تھے اور ان کا اللہ سنتا تھا، کسی دوسرے کو اس کی خبر نہیں تھی، اس طرح سے مانگنا شروع کیا۔

معلوم ہوا کہ مانگنے کا پہلا ادب تو یہ ہے کہ آدمی زیادہ چلا کر نہ مانگے۔ ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ ② ''اللہ کے سامنے دعائیں کرو چپکے چپکے اور آہستہ آہستہ''۔ غرض آہستہ آہستہ مانگنا شروع کیا۔ کس طرح سے مانگا؟ عرض کیا: ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّىْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّىْ﴾ ③ ''اے اللہ! میری ہڈیاں خشک ہوگئیں''۔ بڑھاپے کی انتہا یہ ہے کہ ہڈیاں بھی خشک ہوگئیں، ان میں گودا تک باقی نہیں رہا۔ ظاہر بات ہے کہ جب گودا تک باقی نہیں رہے گا، تری اور روغن باقی نہیں رہے گا، ہڈیاں خشک ہوگئیں تو گوشت کہاں باقی رہے گا؟ حاصل یہ نکلا کہ ہڈی سے چمڑا الگ چکا ہے، کوئی طاقت میرے اندر باقی نہیں ہے۔ اور عرض کیا۔

﴿وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا﴾ ④ ''اور سر سفید ہوگیا ہے جیسے آگ جلا کرتی ہے''۔ تو اندر بھی بڑھاپا سرایت کر گیا کہ ہڈیوں میں روغن تک باقی نہیں۔ اور اوپر بھی بڑھاپا چھا گیا کہ بالوں میں سیاہی نہیں ہے۔ غرض اوپر سے سفید ہوگیا ہوں اور اندر سے خشک ہوگیا ہوں۔ یہ میری حالت ہے۔ یعنی بیٹا مانگنا چاہتے ہیں اور حالت وہ پیش کر رہے ہیں کہ جس میں اسباب کے درجے میں بیٹا ہونا ناممکن ہے۔ جب بڑھاپے کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ اندر روغن تک باقی نہ رہے، ہڈیاں تک خشک ہو جائیں اور بڑھاپا چھا جائے تو اولاد کہاں سے ہوگی؟

مگر یہ مانگنے کا طریقہ ہے کہ وہ اسباب جن کے ذریعے سے اولاد ہوتی، وہ موجود نہیں، تو خود ہی ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ سبب بھی میرے اندر موجود نہیں، یہ سبب بھی میرے اندر موجود نہیں، تاکہ جواب یوں نہ آجائے۔ کہ اگر یوں مانگتے کہ یا اللہ! مجھے بیٹا دی دیجئے۔ تو یہ ہوسکتا تھا کہ جواب یوں آجائے کہ نہیں تم بوڑھے ہوگئے ہو، عادتِ الٰہیہ کے خلاف ہے۔ ایسے میں بیٹا نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا خاموش ہو جاؤ۔ تو پہلے ہی ان چیزوں کو پیش کر کے دفع دخلِ مقدر کر دیا، جو جواب آگے ممکن تھا میں وہ جواب خود ہی نہ دے دوں تاکہ آئندہ کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔ تو کہا کہ: اے اللہ! میری ہڈیاں تو خشک ہوگئیں اور سر کے بال سفید ہوگئے، بڑھاپا چھا گیا۔ اور بیچ میں ایک لفظ یہ بھی کہہ دیا: ﴿وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا﴾ ⑤ اے اللہ! میں کبھی بھی آپ کے سامنے سے نامراد واپس نہیں گیا، جب گیا ہوں کچھ نہ کچھ لے کے گیا ہوں یہ کبھی نہیں ہوا کہ مایوس گیا ہوں۔ یہ بھی بیچ میں کہہ دیا۔ حاصل یہ کہ اسباب کے درجے میں کچھ موجود نہیں اور آپ کے در سے کبھی مایوس گیا نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے یقین رکھنا چاہئے کہ منہ مانگی مراد ملے گی۔

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۳. ② پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۵۵.
③④⑤ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۴.

جیسے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: دعاء اس طرح سے مانگو "اَلِحُّوْا." ① الحاح کرو، اتنی زاری کرو کہ لیچڑ بن کے مانگو، کہ بے لئے ہم نہیں ٹلیں گے، کلام بھی ایسا ہی عاجزانہ ہو، جھکنا بھی ایسا ہی ہو اور بیٹھنا بھی ایسا ہی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ کریم کے دروازے پر آئیں اور خالی ہاتھ واپس جائیں۔ ہم لے کے ٹلیں گے۔ اور آگے عرض کیا ﴿وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآئِیْ﴾ ② "مجھے اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے ڈر بھی ہے۔ اور کوئی توقع نہیں کہ وہ میرے مشن کو آگے بڑھائیں گے، بلکہ میرے مقصد کو ضائع کر دیں گے"۔

اس کے بعد عرض کرتے ہیں ﴿وَ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا﴾ ③ یا اللہ میاں! میں ہی بوڑھا نہیں میری بیوی بانجھ بھی ہے اور اس کے اولاد ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ بھی ساتھ میں عرض کر دوں۔ تو میں بوڑھا ہوں، مجھ میں اولاد کی صلاحیت نہیں، بیوی بانجھ ہے اس میں اولاد ہونے کی قابلیت نہیں، رشتہ داروں سے کوئی توقع نہیں کہ وہ میرے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔ تو ہوا کیا؟

﴿فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا﴾ ④ پس اللہ میاں! ایک بیٹا مجھے عطاء کر دیجئے جو میرے ان کمالات کا وارث بنے اور ان کو آگے بڑھائے۔ تو حقیقت میں مانگنے کا ڈھنگ بھی حضرات انبیاء علیہم السلام ہی کو آتا ہے۔ وہی جانتے ہیں کہ بارگاہِ حق میں کس طرح سوال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کے آداب ارشاد فرمائے ہیں کہ دعائیں مانگو مگر اس کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

چناں چہ کسی شخص نے عرض کیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! لوگ دعائیں مانگتے ہیں، قبول نہیں ہوتیں ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتیں اور قبولیت کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔" فرمایا: مَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَ مَلْبَسُهٗ حَرَامٌ يَقُوْلُ يَارَبِّ يَارَبِّ، اَنّٰى يُسْتَجَابُ لَهٗ ⑤ کھانا دیکھو تو حرام کا، لباس دیکھو تو حرام کا، کمائی دیکھو تو وہ مشتبہ اور آدمی کہہ رہا ہے۔ "يَارَبِّ يَارَبِّ اَنّٰى يُسْتَجَابُ لَهٗ" دعا کہاں سے قبول ہو جائے گی؟ یہ تو دل لگی اور مذاق کرنا ہے۔ پاک بن کر اللہ کے آگے آئے تب دعا سنی جائے گی، ناپاک بن کر آئے تو دعا کیوں سنی جائے گی؟

بادشاہ کے دربار میں جب جاتے ہیں تو پاکیزہ کپڑے پہن کر جاتے ہیں۔ عطر لگا کر جاتے ہیں، معطر ہو کر جاتے ہیں۔ آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ دربار میں سیٹ دی جاتی ہے، اگر دربار میں عرض و معروض کریں تو اس کی شنوائی ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی میلے کپڑے پہن کر اور اوپر سے نجاست مل کر چلا گیا تو دربان دھکے دے کر نکال دیں گے کہ یہ پاس کھڑے ہونے کے قابل نہیں چہ جائیکہ اسے دربار میں سیٹ دی جائے۔ اور چہ جائیکہ اسی کی بات مانی جائے۔ تو اسے نکال دیں گے کہ یہ آدابِ دربار کے خلاف ہے۔ تو حرام کی غذا کھا کے اور حرام کا لباس پہن کر

① عمدة القاری، كتاب الفتن، باب التعوذ من الفتن، ج: ٢٢، ص: ١١.

② ③ ④ پارہ: ١٦، سورة مريم، الآية: ٥.

⑤ الصحيح لمسلم، كتاب الزكوة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب، ص: ٨٣٧، رقم: ٢٣٤٢.

جانا اور پھر یا اللہ، یا اللہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی نجاست لیپ کر دربار میں جائے اور بادشاہ کے سامنے عرض و معروض کرے، تو شنوائی ہوگی یا دھکے دیئے جائیں گے؟ تو قبولیت ہوگی یا نامقبولیت ہوگی؟

کسبِ حلال کے آثار...... غرض بتلایا گیا کہ دعاء کے آداب میں سے یہ ہے کہ آدمی پاک بن کر جائے، پہلے اپنے ضمیر کو پاک کرے کہ میں آج سے حرام کی غذا سے تائب ہوتا ہوں، اور اور مشتبہ کمائی سے تائب ہوتا ہوں کہ اگر کمائی مشتبہ ہوگی تو اس سے قلب کے اندر ظلمت پیدا ہوگی اور اس سے توفیق سلب ہو جاتی ہے، حلال کی کمائی کا اثر قلب میں نورانیت پیدا ہونا اور توفیق کا پیدا ہونا ہے۔ حرام کی کمائی کا اثر سلبِ توفیق ہے۔ قلوب کے اندر سے توفیق نکل جاتی ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا، ہمارے دیوبند میں ایک بزرگ ''شاہ جی عبداللہ'' تھے۔ اور عوام میں شمار ہوتے تھے لیکن صاحبِ نسبت بزرگ اور درویش تھے، انہوں نے کمائی کا طریقہ یہ رکھا تھا کہ گھاس کھود کے لاتے تھے اور گھاس کی گٹھڑی بیچ کر اپنا گزر اوقات کرتے تھے، صاحبِ نسبت تھے، اوقات کے پابند تھے، ان کے ہاں گٹھڑی کی قیمت چھ پیسے مقرر تھی، تو دیوبند میں جتنے گھاس خریدنے والے لوگ تھے وہ قطار باندھ کر کھڑے رہتے تھے کی شاہ جی کہ گٹھڑی ہم خریدیں گے، ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا کہ اگر میں نے خرید لی تو میرے مویشی میں بھی برکت ہوگی، میرے گھر میں بھی برکت ہوگی۔

اس لئے جہاں شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ سامنے آئے۔ لوگ دوڑتے تھے، جس نے ہاتھ پہلے لگا دیا، انہوں نے گٹھڑی وہیں ڈال دی اور چھ پیسے لے لئے۔ سردی ہو، گرمی ہو، برسات ہو۔ نہ سات پیسے نہ پانچ پیسے، چھ پیسے متعین تھے۔ جب چھ پیسے لے لیتے تو ان کے خرچ کا ان کے ہاں کیا طریقہ تھا؟ دو پیسے تو اسی وقت فقیروں میں صدقہ کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں کوڑیاں ہوتی تھیں۔ گنڈے ہوتے تھے۔ پانچ گنڈے کا ایک پیسہ ہوتا تھا۔ تو دو پیسے کے گنڈے لے کر کسی یتیم کو، کسی غریب کو، کسی بیوہ کو تقسیم کر دیتے تھے۔ اور دو پیسے روز ان کے گھر کا خرچ تھا۔ اس میں کچھ نمک لے لیا اور کچھ تیل لے لیا، کچھ ترکاری لے لی۔ سستے کا زمانہ تھا۔ جو آج دو روپے میں کام چلتا ہے۔ وہ دو پیسے میں چل جاتا تھا، تو دو پیسے ان کے گھر کا خرچ تھا۔ اور دو پیسے روز جمع کیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب دو پیسے روز کے جمع کرتے کرتے سات آٹھ روپے ہو جاتے تو ان کا کھانا پکا کر ہمارے ان سب بزرگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ جنہوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ۔ ان تمام بزرگوں کو جمع کر کے دعوت کر دی۔ تو میں نے اپنے بزرگوں میں سے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنا جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں اور بڑے صاحبِ نسبت ولیِ کامل گزرے ہیں کہ ''سال بھر تک ہمیں انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دن آئے کہ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کا کھانا کھائیں''۔

اورفرمایا کہ: ''جس دن کھانا کھاتے تھے تو چالیس چالیس دن تک قلب میں نور رہتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ نماز پڑھیں، جی چاہتا تھا کہ تلاوت کریں۔ دل میں طاعت وعبادت اور زہد وریاضت کی امنگ پیدا ہوتی تھی''۔ یہ اس حلال کی کمائی کا اثر تھا۔ تو جتنی پاک کمائی ہوتی ہے قلب میں توفیق پیدا ہوتی ہے۔

حرام کی نحوست...... جتنی ناپاک یا مشتبہ کمائی ہوتی ہے، توفیق سلب ہوتی ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ یہ کام نیکی کا ہے۔ مگر کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کے کرنے کی امنگ نہیں ہوتی جیسے غالب نے کہا کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزھد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

معلوم تو ہے کہ یہ کام اچھا ہے، یہ برا ہے۔ اور اچھے کو کرنا چاہئے مگر کرنے کو جی نہیں چاہتا، تو دل میں جب ناپاکی گھس جاتی ہے تو وہ اچھے کام کے لیے ابھرتا نہیں۔ آج جو ہم اور آپ معصیت میں مبتلا ہیں وہ لاعلمی کی وجہ سے نہیں، علم تو بڑا وسیع ہو چکا ہے، حلال وحرام کا امتیاز اچھے اور برے کی تمیز اتنی ہو چکی، ہر شخص شریعت میں رائے زنی کرنے کے لئے تیار ہے۔ جہاں کوئی تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے، بس اس نے قرآن وحدیث میں رائے زنی شروع کر دی، گویا مجتہد بن گیا۔ تو علم کی کمی کی وجہ سے گناہ میں مبتلا نہیں ہیں۔ علم موجود ہے۔ پھر بھی مبتلا ہیں توفیق کے سلب ہونے کی وجہ سے ہیں۔ اور توفیق اس لئے سلب ہوگئی کہ ہماری کمائی مشتبہ ہے، حلال کی غذا اندر نہیں پہنچتی۔ معدہ حوضِ بدن ہے جو اس میں بھر دیں گے، رگ وپے میں وہ چیز پھیلے گی۔ پاک کمائی بھریں گے، پاکی کے اثرات رگ وپے میں بھریں گے۔ ناپاک چیزیں بھریں گے، ناپاکی کے اثرات پھیل جائیں گے، تو حلال کی کمائی کا ایک اثر ہوتا ہے۔

لقمۂ حلال کی علمی وعملی برکات...... حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے۔ یہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی جلیل القدر امام ہیں۔ چار ہی بڑے امام ہیں جن کی فقہ آج کل رائج ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ علیہ، اور بھی صاحب فقہ آئمہ گزرے ہیں لیکن ان کی فقہ ختم ہوگئی۔ من جانب اللہ ان چار فقہوں کو مقبولیت حاصل ہوئی اور کروڑہا کروڑ انسان ان کی فقہ پر چل رہے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور ترکستان یہ سب حنفی المذہب ہیں اور سب میں فقہ حنفی رائج ہے۔ مصر قریب قریب کل کا کل شافعی فقہ پر چل رہا ہے۔ حجاز بھی قریب قریب شافعی فقہ کا پابند ہے۔ نجد وغیرہ ممالک یہ فقہ حنبلی کے پابند ہیں۔ مغربی ممالک جیسے الجزائر وغیرہ میں مالکی زیادہ ہیں تو دنیا کے اکثر حصوں میں یہی چار فقہ رائج ہیں۔ انہیں چار اماموں کے مسلک پر لوگ عمل کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہیں جلیل القدر امام ہیں، مگر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام مصر میں تھا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں لکھا کہ بہت عرصہ ہوگیا ملاقات کئے ہوئے۔ اگر کوئی ملاقات کا موقع ہو تو کوشش کر کے آجاؤ، مصر میں

ملاقات ہو، اور علماء آپ کے منتظر ہیں۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ میں حاضر ہو رہا ہوں اور تاریخ معیّن کر دی کہ فلاں تاریخ کو پہنچوں گا۔

مقررہ تاریخ پر حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ پہنچے۔ تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلے، بادشاہِ وقت چوں کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا معتقد تھا، وہ بھی ساتھ ہو گیا۔ جب بادشاہ آیا تو وزراء، امراء، علماء، اور زعماء غرض پورا مصر استقبال کے لئے نکل آیا۔ اور بڑے عزت و احترام سے حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو لے کر آئے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان میں عید کی سی خوشی تھی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بچیاں کودتی پھرتی تھیں کہ امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہو رہا ہے۔ ایک عجیب خوشی تھی۔ غرض ان خوشیوں کے ساتھ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے۔ علماء و زعماء اور سب اکابر ملت ملنے کے لیے آئے۔

کھانے کا وقت آیا تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے دستر خوان بچھایا۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو بٹھلایا گیا۔ اور بھی لوگ بیٹھے۔ حضرت امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جو کھانا شروع کیا تو اس طرح سے کھایا جیسے کوئی بہت حریص آدمی کھایا کرتا ہے۔ اور جیسے کوئی سات وقت کا بھوکا کھاتا ہے۔ تو بہت زیادہ کھایا اور جلدی جلدی کھایا، جیسے معلوم ہو کہ کھانے کو سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جب کھانے کے بعد گھر پہنچے تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بچیوں نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض کیا کہ آپ تو کہتے تھے کہ یہ حضرت امام وقت ہے۔ یہ کیسا امام وقت ہے جو عوام الناس کی طرح پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے۔ اتقیاء کی شان تو یہ ہے کہ وہ کم کھاتے ہیں، طاعت زیادہ کرتے ہیں۔ یہ پیٹ بھر کے کھانا اور وہ بھی ناک تک کھالینا، یہ عوام کا کام ہے خواص کا نہیں۔ خواص میں بھی جو شخص امامت کے رتبہ کو پہنچا ہوا ہو، اس کا کام یہ نہیں ہے کہ اس طرح سے اَلنسٹھ کھالے، جیسے اناڑی کی بندوق بھری جاتی ہے کہ اوپر سے لے کر نیچے تک، یہ اونچے طبقے کے لوگوں کا کام نہیں جو دیانت میں اونچا مقام رکھتے ہوں۔ تو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جواب نہیں بن پڑا اور یہ فرمایا کہ: محسوس تو میں نے بھی اس کو کیا مگر میں یوں بول نہیں سکتا تھا کہ میں میزبان ہوں۔ اگر میں یوں کہتا کہ تم زیادہ کیوں کھاتے ہو، تو تہمت آتی کہ شاید میں مہمان سے اپنا کھانا بچانا چاہتا ہوں، اس لئے میرے بولنے کا موقع نہیں تھا مگر محسوس میں بھی کر رہا تھا کہ یہ حضرت احمد بن حنبل کو ہو کیا گیا۔ اس طرح سے پیٹ بھر کے کھانا ۔

اندرون از طعام خالی دار   تا نورِ معرفت درو بینی

پیٹ کو کھانے سے خالی رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے تا کہ نورِ معرفت پیدا ہو، نہ یہ کہ آدمی اتنا بھر لے۔ بہر حال حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جواب نہیں بن پڑا، بچیوں نے اعتراض کیا تو چپ ہو گئے۔ وہ وقت گزر گیا۔ اور حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ عشاء کی نماز کے لئے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد چھوٹی چھوٹی بچیوں نے بستر بچھایا۔ اور پانی کا لوٹا بھر کے رکھا کہ امام جب تہجد کے لئے اٹھیں تو پانی لانے کی دشواری نہ ہو۔ اطمینان سے وضوء کر لیں۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ صبح کی نماز کے لئے جب اٹھ کر گئے تو بستر وغیرہ اٹھانے کے لئے بچیاں آئیں۔ دیکھا کہ لوٹا اسی طرح بھرا ہوا رکھا ہے۔ اب تو ان کے غصے کی کوئی حد نہ رہی کہ یہ کیسا امام ہے کہ پیٹ بھر کے یہ کھانا کھائے، رات کا کوئی وقت عبادت کا اسے نصیب نہ ہو۔ وضو یہ نہ کرے، تہجد یہ نہ پڑھے۔ یہ خواہ مخواہ ہی دنیا میں غلط شہرت ہو گئی کہ اپنے وقت کا بڑا امام ہے۔

جب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پہنچے تو بچیوں نے دامن پکڑ لیا کہ آپ نے ہمیں غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا کہ حضرت احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ راس الاتقیاء متقیوں کا سردار ہے۔ یہ کیسا امام ہے۔؟ ناک تک یہ کھانا کھاتا ہے اور تہجد کی توفیق اسے نہیں۔ رات بھر پڑ کر یہ سوئے۔ اب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی رہا نہ گیا اور باہر آ کر حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ ”اے احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ)! یہ تغیر تم میں کب سے پیدا ہوا۔؟ مجھے تو اس کی توقع نہیں تھی۔ یہ تمہاری حالت کب سے بدلی، پیٹ بھر کر تم کھانا کھاتے ہو۔ تہجد کی توفیق تمہیں نہ ہوئی۔ رات کو تم نہ اٹھے، وضو تم نے نہ کیا، آخر یہ تغیر تمہارے اندر کیسے پیدا ہوا“؟ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ مسکرائے۔ اور عرض کیا حضرت واقعہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں، فرمایا، واقعہ کیا ہے؟

”عرض کیا کہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے آج عشاء کے وضو سے تہجد اور صبح کی نماز کی نوبت آئی ہے۔ اور عرض کیا کہ قصہ یہ ہوا کہ جب دستر خوان پر کھانا چنا گیا تو میں نے دنیا میں اتنی حلال کی کمائی نہیں دیکھی۔ اس کھانے کے اوپر آسمانوں سے انوار و برکات کی اتنی بارش تھی کہ مکان منوّر تھا اور کھانے پر نظر ڈال کر قلب میں ذکر اللہ کی کیفیت پیدا ہوتی تھی، اتنی حلال اور پاک کمائی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی، تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جتنا کھا سکوں کھا لوں، چاہے بعد میں مجھے سات دن فاقہ کرنا پڑے، پھر یہ نورانی کھانا مجھے کہاں نصیب ہوگا، اس واسطے میں زیادہ کھایا“۔

اور عرض کیا۔: اس کھانے کی دو برکتیں نمایاں ہوئیں، ایک علمی برکت اور ایک عملی برکت۔ عملی برکت تو یہ ہوئی کہ عشاء کے وضو سے میں نے صبح کی نماز پڑھی، اور تہجد پڑھا۔ مجھے وضو کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور علمی برکت یہ ہوئی کہ چار پائی پر لیٹ کر قرآن کریم کی ایک آیت سے آج میں نے فقہ کے سو مسئلے نکالے، جواب تک مجھے سمجھ نہیں آئے تھے، علم کے دروازے میرے قلب کے اوپر کھل گئے۔ اور سو مسئلے ایک ہی آیت سے میں نے استنباط کئے، یہ علم کی برکت ہوئی۔

تب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ڈاڑھی کا بال بال خوشی سے کھل گیا۔ اور بچیوں سے کہا کہ دیکھا ہم نہیں کہتے تھے کہ یہ امام وقت ہے۔ تب بچیوں کو تسلّی ہوئی۔ تو عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ حلال کی کمائی کا اثر یہ ہے کہ معرفت بڑھتی ہے، علم الٰہی کی برکت پیدا ہوتی ہے اور عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ آج ہمارے میں عمل کی کوتاہی اس وجہ سے نہیں کہ آج ہمیں مسائل کا علم نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے۔ علم کے وسائل اتنے عام ہو گئے کہ

پہلے زمانے میں نہیں تھے، کتابیں چھپی ہوئی الگ، اخبار الگ، رسالے الگ، پیپر الگ اور ہر چیز میں شریعت پرہی مشق کی جا رہی ہے، سب مسائل ہی کو موضوعِ بحث بنا رہے ہیں۔ تو اختلافی مسائل ان کے علم میں نہ ہوں مگر اس کے باوجود کہ زبان، علم کے بارے میں کافی چلتی ہے۔ ہاتھ پیر عمل کے لئے نہیں چلتے۔

نمائشِ علم ...... علم کو بھی اگر لوگ استعمال کرر ہے ہیں تو اس انداز سے جیسے حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اخیر زمانے میں علم تجمل کے لئے رہ جائے گا۔ جس طرح سے لوگ کپڑوں سے زینت حاصل کرتے ہیں، اچھی بلڈنگ سے تجمل حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح علم سے بھی اپنی زینت اور نمائش کریں گے کہ ہم بھی پڑے لکھے ہیں، ہم بھی عالم ہیں اور ہم بھی مسائل پر عبور رکھتے ہیں۔ تو علم عمل کے لئے نہیں رہے گا، نمائش کے لئے رہے گا کہ اپنا جمال دکھلایا جائے، اپنا کمال دکھلایا جائے۔

کثرتِ علم کے باوجود قلتِ عمل ...... غرض علم کی کمی نہیں، اگر کمی ہے تو عمل کی کمی ہے۔ اگر علم کی کثرت سے عمل نصیب ہو جایا کرتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ عمل کرنے والی ہوتی، کیوں کہ علم کی کمی نہیں ہے۔ مگر جتنا علم بڑھتا جا رہا ہے عمل گھٹتا جا رہا ہے۔ اس واسطے کہ علم تجمل کے لئے ہے۔ اسبابِ علم بڑھتے جاتے ہیں، علم کی حقیقت دلوں میں ختم ہوئی جاتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ: اخیر زمانے میں علم گھٹ جائے گا، اور ایک میں خبر دی گئی کہ قربِ قیامت میں علم بڑھ جائے گا۔ علماء نے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے، وہ یہ کہ اسبابِ علم بڑھ جائیں گے اور علم کی حقیقت دلوں میں گھٹ جائے گی۔ اسباب اتنے کہ قدم قدم پر علم کے نقشے سامنے ہوں گے اور ظلمت اتنی کہ قلب کے اندر نورانیت کا نشان نہیں کہ آدمی حق و باطل کا پورا امتیاز کر سکے۔ اور اس کے اندر عمل کا جذبہ اور امنگ پیدا ہو۔

آثارِ علم ...... علم کے آثار میں سے ہے۔ ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ① اہل علم میں جو علم ہوتا ہے کہ ان میں خشیتِ الٰہی اور خوفِ خداوندی ضرور پیدا ہوتا ہے، یہ علم کی تاثیر ہے اور جو خوفِ آخرت ہوگا اور اپنے مرنے کا ڈر ہوگا اور اللہ کے سامنے جوابدہی کا اندیشہ ہوگا تو عمل کا جذبہ انسان میں پیدا ہوگا۔ لیکن جب علم سے خشیت اور خوف پیدا نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم حقیقی نہیں ہے، رسمی علم ہے، لفظی علم ہے، لفظی علم کے لئے خشیت کا دعدہ نہیں ہے۔

ابتلاءِ معصیت کے اسباب ...... غرض آج کی معصیت اور گناہ قلتِ علم کے سبب سے نہیں ہے بلکہ قلتِ اخلاق کے سبب سے ہے۔ قلتِ نورانیت کے سبب سے ہے، اور قلتِ توفیق کے سبب سے ہے اور توفیق سلب ہونے کے اسباب میں سے مشتبہ کمائی، حرام کمائی ہے کہ آدمی احتیاط سے نہ کمائے، حلال و حرام کا کوئی امتیاز نہ کرے، مشتبہ اور غیر مشتبہ کو نہ دیکھے۔ پیسہ مقصود ہو جائے۔ کہ جس طرح ہو پیسہ بٹور لو۔ ڈکیتی سے ہو، چوری سے

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸.

ہو، رشوت سے ہو، کسی بھی انداز سے ہو پیسہ آنا چاہئے، ایسے پیسے کا اثر تو یہی ہوتا ہے کہ توفیق جاتی رہتی ہے۔ بہر حال حاصل یہ نکلا کہ عبادت اور زہادت کی جب توفیق ہوتی ہے جب قلب میں نور ہو، اور نور قلب میں جب ہوتا ہے جب کمائی ٹھیک ہو حلال کی ہو، حلال کا لقمہ میسّر ہو۔

رزقِ حلال میں قلت و برکت ...... نیز حلال کی کمائی ہمیشہ تھوڑی ہوتی ہے زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ حرام کمائی تو ہوسکتا کہ زیادہ ہو لیکن عادتاً حلال کی کمائی کم ہوتی ہے۔ الا ماشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کسی کو بڑھادے، مگر عادتاً لازمی بات یہ ہے کہ ضرورت کے موافق ملتا ہے، مگر برکت اس میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی خیر زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

بناءِ عبادت ...... غرض انسان عبادت کے لئے بنایا گیا ہے اور عبادت جب ہوگی جب اس کے وسائل اور اسباب درست ہوں۔ اس لئے فرمایا گیا ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ساری چیزیں اس کے لئے بنائیں۔ اسے اپنے لئے بنایا تاکہ میری یاد میں لگے، ساری دنیا اس کے لئے مددگار بنے۔ یہ دنیا سے نفع حاصل کرے مگر کہے کے مطابق جو حدود کے اندر میں جائز طریقے سے بتلاؤں، اس طریق پر نفع حاصل کرے۔ تو نفع اور نقصان سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، عبادت کی بنیاد نفع اور نقصان ہے جو میں عرض کررہا تھا۔ اسی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ﴾ ② اپنی قوم کو خطاب کیا، کیا تم ان بتوں کو پوجتے ہو جو تمہیں ادنیٰ درجے کا نفع نہیں پہنچاسکتے، ادنیٰ درجہ میں ضرر نہیں پہنچاسکتے؟ ان مورتیوں کو جو سامنے رکھی ہوئی ہیں، جن کو تم خود ہی اپنے ہاتھ سے بناتے ہو اور خود ہی تصور کر لیتے ہو کہ یہ ہمارے معبود ہیں۔ یہ بے جان چیزیں ہیں۔ تو مصنوع تمہاری اور تم اس کے صانع، اس کے باوجود تم نے اپنے لئے مالک تجویز کرلیا۔ یہ چیزیں تمہیں نفع بھی نہیں پہنچاسکتیں اور نقصان بھی نہیں پہنچاسکتیں۔ حاصل یہ نکلا کہ عبادت کی بنا نفع اور نقصان کا مالک بنتا ہے۔

اہلِ شرک کا دھوکہ ...... اہلِ شرک کو یہیں سے دھوکہ لگا ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع نقصان پر ہے تو دنیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں جس میں انسان کا کچھ نہ کچھ نفع نہ ہو، یا کچھ نہ کچھ نقصان نہ ہو، دنیا کی کوئی چیز نہ محض نفع ہی پہنچاتی ہے نہ محض نقصان پہنچاتی ہے۔ ہر چیز سے کچھ نفع پہنچتا ہے کچھ ضرر پہنچتا ہے۔ غرض ہر چیز میں نفع ضرر موجود ہے۔ یہ روٹی جو آپ روز کھاتے ہیں، نفع بھی دیتی ہے نقصان بھی پہنچادیتی ہے، اگر ذرا حدود سے زیادہ کھالی، بیماری پیدا ہوگی، حدود کے اندر کھائیں گے نفع دے گی۔ یہی پانی اگر اعتدال کے ساتھ پئیں گے نفع دے گا، اگر بے اعتدالی کے ساتھ پانی چڑھاتے چلے جائیں گے، بارد امراض پیدا ہونا شروع ہوجائیں گے۔

یہی ہوا ہے، نفع بھی دیتی ہے نقصان بھی دیتی ہے۔ بے اعتدالی کے ساتھ ایسی چیزیں کھائیں گے جس سے فاسد ہوا پیدا ہو، نفخ کی بیماری پیدا ہوگی، اعتدال کے ساتھ کھائیں گے تو ہوا نفع دے جائے گی۔ غرض ہر چیز

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶. ② پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۶۶.

میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے، نباتات ہوں، جمادات ہوں، حیوانات ہوں، ہر ایک میں نفع ونقصان مشترک ہے، جب عبادت کی بنیاد نفع ونقصان پر رہی اور دنیا کی ہر چیز میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے، تو مشرکین نے ہر چیز کو پوجنا شروع کیا کہ جب عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے اور نفع وضرر دنیا کی ہر چیز میں ہے تو کہیں پانی کو پوجنا شروع کیا کہ اس میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے۔ اور کہیں آفتاب کو پوجنا شروع کیا کہ اس میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے تو ضرر سے بچنے کے لئے ان کو پوجتے ہیں اور نفع حاصل کرنے کے لئے ان کو پوجتے ہیں۔ اسی طرح ستاروں کو، پتھروں کو، مورتیوں کو، سونے اور چاندی کو پوجنا شروع کیا۔ تو پوجنے والا ایک ہے اور تینتیس کروڑ اس کے خدا ہیں، جتنی دنیا کے اندر انواع ہیں کہ ان میں سے ہر چیز میں کچھ نہ کچھ نفع ونقصان موجود ہے۔

آلاتِ صنعت کی پرستش...... حتیٰ کہ اگر بعض قومیں صنعت وحرفت بھی رکھتی ہیں تو جتنے ان کی صنعت وحرفت کے آلات ہیں وہ ان کو پوجتی ہیں کہ یہ ہمارے نفع کا ذریعہ ہیں اور یہی نقصان کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً کاتب ہے تو وہ قلم کے آگے بیٹھ کر ڈنڈوت کرتا ہے۔ اگر کوئی تلوار کا دھنی ہے تو وہ تلوار کو پوجتا ہے۔ کوئی بڑھئی ہے تو وہ بسولی کو پوجتا ہے کہ میرا نفع ونقصان اس سے متعلق ہے۔ غرض دنیا کی ہر چیز کو معبود بنالیا، کیوں کہ عبادت کی بنیاد نفع ونقصان ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔ مشرکین نے یہ اصول تو صحیح اختیار کیا کہ عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے لیکن یہ غلط سمجھا کہ ہر چیز میں نفع وضرر ہے۔

اسلام کا دعوئے توحید...... شریعتِ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے مگر وہ نفع وضرر جو مالک کے قبضے میں ہو، تو دنیا میں جتنے بھی اسباب ہیں نفع ونقصان ان کے قبضے میں نہیں ہے، یہ مالک کے ارادے سے نفع و نقصان پہنچتا ہے۔ خود تھوڑا نفع نہیں پہنچاتا، خود ہوا نفع نہیں پہنچاتی مشیتِ خداوندی نفع پہنچاتی ہے۔ اصل میں نفع کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو مسبب الاسباب ہے۔ اسباب کے ہاتھ میں نفع ونقصان پہنچانا نہیں۔ اس لئے عبادت اسی کی، کی جائے گی جس کے قبضے میں نفع ونقصان ہے، نہ اس کی جو نفع ونقصان کا صرف سبب ہے۔ نفع ونقصان کا موجد نہیں ہے، نفع و نقصان کا خالق نہیں ہے، محض سبب بنتا ہے۔ تو سبب بن جانے سے موجد یا خالق ہونا لازم نہیں آتا۔

استحقاقِ عبادت...... انسان اولاد کے پیدا ہونے کا سبب ہے لیکن اولاد کے حق میں اس کو خالق تھوڑا ہی کہہ دیں گے؟ کاشتکار کھیتی اُگ جانے کا سبب ہے لیکن کھیتی کو اگانے والا کاشت کار کو تھوڑا ہی کہہ دیں گے؟

اسی لئے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا: ﴿ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ ① تم کاشتکاری کرتے ہو یا ہم کاشت کاری کرتے ہیں؟ تمہارا کام اتنا ہے کہ تم کھیتی کے اُگ جانے کا سبب بن جاتے ہو، کھیتی کے اگانے والے نہیں ہو، اگانے والے ہم ہیں، منوں مٹی میں جو بیج چھپا دیا جاتا ہے۔ تو زمین کی تہہ میں سے کون کونپل نکالتا ہے، کیا تم نکالنے جاتے ہو یا ہماری قدرت نکالتی ہے؟

ماں کے پیٹ میں نطفہ پہنچتا ہے تو اس پانی کے اوپر صناعی کر کے نقشہ تم کھینچتے ہو یا ہم کھینچتے ہیں۔؟ ہم اسے

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

مُضغہ بناتے ہیں اور بڑھاتے ہیں یا تم بڑھاتے ہو؟ غرض تم سببِ خلقت ہو خالق نہیں ہو، کاشت کار زراعت کا سبب ہے خود کاشت کار زراعت پیدا نہیں کرتا، تو دنیا میں جتنی بھی اشیاء ہیں یہ نفع ونقصان کا سبب بنتی ہیں، نفع و نقصان کو پیدا کرنے والی اور ایجاد کرنے والی نہیں ہیں۔ نفع ونقصان مُسبّب الاسباب کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے زندگی دے دے جس سے چاہے زندگی چھین لے، جسے چاہے صحت دے دے اور جس کی چاہے چھین لے، جسے چاہے اولاد کی نعمت دے دے اور جب چاہے چھین لے، ہاتھ میں اسی کے ہے، اسباب میں نہیں ہے۔

اگر تم اولاد کے خالق ہوتے تو جیسے تم پیدا کرنے پر قادر تھے تو روکنے پر بھی قادر ہوتے، کوئی بھی ماں باپ اولاد کو مرنے نہ دیتے۔ لیکن بے بس ہیں۔ جب زندگی کے روکنے پر قادر نہیں ہو، تو زندگی ڈالنے پر انہیں قدرت کہاں سے آئی؟ تم زیادہ سے زیادہ سبب ہو۔ اس سے زیادہ نہیں ہو۔ موت کا بھی سبب بن جاتا ہے۔

آدمی کسی کو چھری مار دے تو وہ موت دینے والا نہیں ہے، سببِ موت ہے، موت دینے والے حق تعالیٰ ہیں۔ اگر کوئی چھری مار دے اور وہ چھری میں سے تاثیر نکال دیں اور موت نہ دیں، تو لاکھ ذبح کیا کرو، کبھی کوئی ذبح نہیں ہوگا۔ آگ سے جل کر اگر کوئی مر جائے تو مارنے والی آگ نہیں ہے، مرنے کا سبب ہے، مارنے والی اللہ کی مشیت ہے، آگ کو اس نے سبب بنا دیا۔

اس لئے اسباب میں سے جو نفع ونقصان پیدا ہوتا ہے وہ مالک کے حکم سے پیدا ہوتا ہے۔ خود یہ اسباب نفع و نقصان پر قادر نہیں ہیں، اس واسطے ان اسباب کی عبادت بھی جائز نہیں ہوگی، عبادت اسی کی کی جائے گی جس کے قبضہ قدرت میں نفع ونقصان ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ تو نفع ونقصان کا سبب ساری دنیا بن جائے وہ پوجا کے لائق نہیں ہے۔ جو نفع ونقصان کو بھیج رہا ہے۔ وہ عبادت کے لائق ہے۔ تو اس میں گویا اصول بتلا دیا کہ: ﴿اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَايَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ ① ”تم ان چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو کہ تمہیں نہ نفع پہنچا سکیں، نہ تمہیں نقصان پہنچا سکیں“۔ ﴿اُفٍّ لَّكُمْ﴾ تمہارے اوپر اُف ہے، تمہارے بنائے ہوئے ان فرضی معبودوں کے اوپر جن میں نہ نافع ہونے کی صلاحیت ہے، نہ مضر ہونے کی صلاحیت ہے۔ جیسے ایک دوسری جگہ فرمایا گیا: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۔اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ﴾ ② ”یہ اللہ کو چھوڑ کر جن چیزوں کو پکارتے ہیں، جن مورتیوں کے آگے بیٹھ کر پوجا کرتے ہیں۔ یہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔ اگر ساری مورتیاں جمع ہو کر یہ چاہیں کہ ایک مکھی کو پیدا کر دیں، ان کے بس میں نہیں ہے“۔ ﴿وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّايَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ﴾ ③ ۔ ④

① پارہ:۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۶۶، ۶۷. ② پارہ:۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۷۳. ③ ④ یہ تقریر اتنی ہی حاصل ہوسکی، جو کہ شاملِ اشاعت کی جارہی ہے، بقیہ حصہ دستیاب ہوا تو کسی دوسری اشاعت میں شاملِ کتاب کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز (از مرتب غفرلہ)

حج بین الاقوامی عبادت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّابَعْدُ!

فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

اسوۂ مساوات...... بزرگانِ محترم! مساوات اور ایک رُخی کو برنگِ عبادت عملی صورت دینے کے لئے حق تعالیٰ نے حج کی عبادت مقرر فرمائی کہ اس قبلہ پر مشرق و مغرب کی قومیں یکساں انداز سے جمع ہوں تاکہ ان میں سے اونچ نیچ کے جراثیم ختم ہوں، بلکہ اس مساویانہ اجتماع سے پیدا شدہ عملی مساوات کے نمونہ کو سامنے رکھ کر اپنی پوری زندگی اسی مساوات اور باہمی برابری کے ساتھ گزار دیں۔

اس بناء پر شریعتِ اسلام نے اس قبلہ کو اوّل تو سارے انسانوں کا قبلہ قرار دیا چناں چہ آثار و روایات حدیث سے ثابت ہے کہ کوئی نبی دنیا میں ایسے نہیں گزرے کہ انہوں نے اس قبلہ کا طواف نہ کیا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب سارے حضرات انبیاء علیہم السلام اس بیتِ خداوندی کی عظمت اور اس سے عشق و محبت کرتے آئے ہیں اور اسے اپنا قبلہ تسلیم کر چکے ہیں۔ تو قدرتی طور پر ان کے ماننے والی قوموں کا قبلہ بھی یہی بیت اللہ ثابت ہوتا ہے۔

عالمی ہدایت کا قبلہ...... پھر قرآن نے بھی یہی بتلایا کہ: قبلہ کی وضع دنیا کے سارے انسانوں کے لیے ہوتی ہے۔ ارشادِ باری ہے کہ: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ② سب سے پہلا خدا کا گھر (کعبۂ معظم) جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا وہ مکہ میں ہے۔ آیت کریمہ میں اول تو ﴿ وُضِعَ لِلنَّاسِ ﴾ کا لفظ لایا گیا، یعنی سارے انسانوں کے لئے وُضِعَ لِلْعَرَبِ یا لِلْعَجَمِ نہیں فرمایا گیا، جس سے عرب اور بقیہ ساری اقوام کا قبلہ یہی بیت کریم ثابت ہوا۔ پھر اسے ہدایت اور راہنما بتلانے کے لئے "عٰلَمِيْنَ" کا لفظ استعمال فرمایا کہ: وہ جہانوں اور عالموں کے لئے ہدایت ہے، جس سے اس قبلہ کا تمام جہانوں کے لئے عالمی

① ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۶.

ہدایت کا قبلہ ہونا ثابت ہوا، جس کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں کہ اطراف و اکنافِ عالم سے تمام اصنافِ بشر اور تمام قومیں اس عالمی رہنمائی کے تحت حج کرنے کے لئے اسی کی طرف بڑھیں اور اپنی اجتماعیتِ کبریٰ یا عالمی اجتماعیت کا ثبوت دیں۔

امام ناس (علیہ السلام) اور مرکزِ ناس...... اسی لئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو جنہیں قرآن نے امام الناس فرمایا ہے کہ: ﴿اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ ① اور فرمایا ﴿وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ﴾ ② لوگوں کے لئے حج بیت اللہ کا اعلان عام کر دیں۔

تو یہاں بھی دونوں جگہ بلا تخصیص عرب و عجم ''الناس'' کا لفظ لایا گیا۔ یعنی موذن تو امام الناس بنائے گئے جنہیں بلا تخصیص تقریباً دنیا کی تمام بڑی قومیں امام تسلیم کرتی ہیں اور اس اعلان کا مخاطب بھی ''الناس'' ہی کو بنایا گیا جس میں کسی قوم یا ملک کی تخصیص نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ سارے انسانو! حج کے لئے چلو، اس لئے امام العرب یا امام الشام یا امام العراق نہیں بلکہ امام الناس'' کہا گیا۔ جنہیں یہود و نصاریٰ بھی امام مانتے ہیں۔ اور مسلمان بھی انہیں اپنا امام تسلیم کرتے ہیں۔ مجوس اور فارس قومیں بھی زرتشت کے نام سے انہیں امام تسلیم کرتی ہیں اور براہمہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں۔ غالباً اسی لئے انہوں نے اپنا لقب براہمہ رکھا ہے۔ نیز بقیہ اقوام بھی تبعاً اسی ذیل میں آ جاتی ہیں جو ممکن ہے کہ ناموں کے تفاوت سے وہ بھی ان کی امامت کو تسلیم کرتی ہوں، غرض اعلان حج کے لئے امام الناس کو منتخب فرمایا جانا اس کی کھلی علامت ہے کہ حج کا یہ اذن عام دنیا جہاں کے سارے انسانوں کے لئے تھا اور حج کے اس اعلان عام کا خطاب ''الناس'' کو بنایا جانا بھی جس میں کسی ملک یا قوم کی تخصیص نہیں، اس کی کھلی دلیل ہے کہ حج کا خطاب دنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہے، جس سے صاف واضح ہے ہے حق تعالیٰ نے اس قبلہ مقدسہ کو مرکزِ ناس اور مرکزِ عالم بنا کر حج کے لئے اس کے اردگرد سارے ہی انسانوں کو جمع کرنے کا اذن عام دیا ہے۔ جس سے حج ایک بین الاقوامی عبادت ثابت ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اور قومیں اس سے منحرف بھی ہو جائیں اور صرف مسلمان ہی اس کی طرف رجوع کریں تب بھی وہ بین الاقوامی ہی ثابت ہوگا، کیوں کہ مسلمان دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہیں اور وہ یورپ، ایشیاء، افریقہ اور امریکہ سے چل کر نوبت بہ نوبت حج کے لئے آئیں گے تو بین الاقوامیت پھر بھی نمایاں رہے گی۔ اور اس میں پہنچ کر حج بین الاقوامی ہی عبادت ثابت ہوگا۔

عالمی مساوات...... خلاصہ یہ کہ حج بروئے قرآن اس دنیا میں ایک عالمی اجتماع ہے جس میں ساری قومیں یکسانی کے ساتھ حصہ لیتی ہیں۔ اس لئے ان میں قدرتی طور پر اخوتِ اسلامی، عالمی مساوات، اور عالمی بھائی چارہ اور عالمی خدمت کا جذبہ ابھرنا چاہئے، پھر ساتھ ہی حج میں صورتوں میں بھی مساوات رکھی گئی ہے۔ پھر اسی پر قناعت نہیں کی گئی کہ اقوام ہی یکساں رہیں، بلکہ آنے والے افراد میں بھی باہم یکسانی رونما ہو، لباس بھی سب کا ایک ہو،

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۴۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۲۷۔

وضع ایک اور افعال بھی سب کے ایک اور یکساں ہو، امیر و غریب، بادشاہ و گدا، خواص و عوام، عالم و جاہل، نیک و بد، صالح و طالح، متقی اور فاسق، ایک ہی لباس میں، ایک ہی کفن میں، ننگے سر، ننگے پاؤں یکساں فقیرانہ انداز سے اس بیتِ کریم کے ارد گرد جمع ہوں، احرام بندھا ہوا ہو۔ اور ایک وضع اور ایک رُخ ہو کر اس بیتِ کریم کے ارد گرد پروانوں کی طرح چکر کھائیں، طواف کریں، اور اس پر جاں نثاری کا ثبوت دیں۔

بندگی میں یکسانی...... عرفات کے میدان میں بھی اسی ایک وضع میں خاک بہ سر ہو کر اپنے رب کے سامنے گڑ گڑائیں، فریاد کریں، مزدلفہ میں بھی ایک ہی انداز سے گریہ وزاری میں محو اور مست ہوں، صفا و مروہ کے پہاڑوں کے درمیان بھی اسی ایک اندازِ گرویدگی اور محویت سے عاشقانہ اور والہانہ دوڑ لگائیں، ایک قافلہ، دوسرے قافلہ کو دیکھے تو بجائے کسی دنیوی یا معاشرتی نعرہ کے "لبیک لبیک" کا نعرہ بلند کرے تاکہ باہمی یکسانی کے ساتھ ان کی بندگی میں بھی یکسانی رہے اور ایک ہی متواضعانہ اور سرفروشانہ انداز سے ایک دوسرے کے سامنے آئیں، خواہ وہ حکمران ملک اور سربراہان ریاست ہوں، یا عوام الناس اور پبلک میں ہوں، ظاہر ہے کہ جب اسی طرح لاکھوں لاکھ انسانوں کی ایک ہی فقیرانہ وردی، ایک ہی سب کی نقل وحرکت، ایک ہی عمل ایک ہی مرکز اور ایک ہی رُخ ہوگا۔ کیسے ممکن ہے کہ اس مساویانہ انداز میں ہو کر ان میں اونچ نیچ کا کوئی تصوّر بھی باقی رہے، دنیا کی کوئی قوم اس عملی مساوات کا نمونہ دکھلائے تو سہی کہ ایسی بین الاقوامی مساوات کس میں ہے؟ اور ظاہر و باطن کی برابری اور ہمواری کا ایسا سچا مظاہرہ کس نے کر کے دکھلایا ہے یا دکھلا سکتی ہے۔

قلوب وقوالب کی یکسانی...... پھر اسی کے ساتھ سب کی پارسائی اور زہد وقناعت کا یہ عالم کہ گھر وبار چھوڑے زر و مال بقدرِ ضرورت ہی لئے ہوئے، نہ رسمی عزت وجاہ کا تصور، نہ کسی پر کسی کو بڑائی کا زعم، نہ کسی میں اونچ نیچ کا وہم، نہ کسی کی زبان پر کوئی فحش و بے حیائی کا کلمہ، نہ آپس میں جھگڑا اور نزاع، نہ جدال وقتال۔ بلکہ قلبی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ گرویدگی، خدمتِ باہمی کا جذبہ، ایثار وقربانی کا ہمہ وقت تصوّر اور ہر ایک میں بجائے نیچ ہونے کے غناء و توکّل کا جذبہ۔ رسمی کرّ وفرّ اور ٹھاٹھ باٹھ سے کوسوں دور۔ سادگی اور بے تکلفی سے مخمور، اسی ایک کی محبت میں چور چور اسی ایک کو پکارنا، اسی ایک سے مانگنا، اور اسی ایک کے آگے جھکنا، جو سب کا ایک ہی مرکزِ حقیقی، اصل وجود اور خالق و مالک ہے۔ اور اسی کے اس بین الاقوامی گھر کے ارد گرد گھومنا جو سب کا مرکزِ ظہور، سب کی مادی اصل اور سب کے لئے مرکزِ کشش ہے۔

دنیا کی کوئی قوم قلوب کی یہ یکسانی، قوالب کی یہ مساوات، افرادِ انسان کی یہ عالمی موانست اور اولادِ آدم کی یہ عالمی اخوت دکھلائے تو سہی کہ کہاں ہے جو اسلام اور مسلم نے اپنے رب سے جڑ کر دکھلائی اور نہ خود ہی دکھلائی بلکہ اسی نے دنیا کو یہ سبق دیا کہ اونچ نیچ کا مٹانا نعروں سے نہیں بلکہ عملاً یوں ہوتا ہے۔ اور کبر و غرور کا سر اس طرح توڑ دیا جاتا ہے۔

مساوات وعبادت کی یکسانی...... اسی توجہ الی اللہ اور ایک رُخی کا قدرتی اثر ہے کہ لاکھوں لاکھ کے مجمعے میں جس میں مرد عورت مساوات کے ساتھ ایک جگہ ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں۔ نہ کہیں فحش کا نشان ہوتا ہے۔ نہ بے حیائی کا وہم وگمان، نہ معصیت کاری کا کوئی داعیہ، نہ کسی کی حق تلفی کا کوئی جذبہ۔ نہ طبقہ وارانہ فسادات، نہ نزاع وجدال ہے، نہ قتل وقتال، نگاہوں میں پاکی اور دلوں میں حق شناسی، اور ساتھ ہی ساتھ عبادت اور اللہ سے وابستگی۔

یوں باہم کس نے کیے ساغر وسنداں دونوں

عملاً دکھایا جاتا ہے کہ معاصی اور گناہوں سے کیوں کر بچا جاسکتا ہے اور انسانی ہمدردی اور مساوات کو عبادت کے ساتھ کس طرح بروئے کار لایا جاتا ہے۔

عالمی اخوت...... پھر حج میں عالمی اخوت ومساوات محض لفظی یا اخلاقی حد تک محدود نہیں رکھی گئی بلکہ اس کے ساتھ تعاون باہمی، ضرورت مندوں کے لئے مالی اعانت وہمدردی کا سلسلہ بھی قائم فرمایا گیا ہے، تاکہ یہ اخوت و مساوات ہر نہج سے مستحکم ہوتی رہے اور اس حسن سلوک اور احسان عام سے دنیا کے ہر خطہ کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ منت پذیری اور احسان شناسی کے ساتھ مربوط ہوں، کیوں کہ خصوصیت سے اس طویل وعریض سفر میں صرف امراء ہی نہیں آتے بلکہ غرباء بھی شامل ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثریت غرباء ہی کی ہوتی ہے جو اپنے ذوق وشوق سے کسی نہ کسی ضروری حد تک ہی سامان سفر مہیا کر کے پہنچ پاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے پاس رقم کی قلت ہوجائے۔ اور وہ اپنی بعض واجبی ضروریات بھی پوری نہ کرسکیں۔ اور تکلیف میں مبتلا ہوجائیں یا ضرورت کی حد تک رقم ہومگر اچانک کوئی غیر معمولی ضرورت پیش آجائے جو ان کی برداشت سے باہر ہو جیسے بیماری اور دوادارو وغیرہ کی پریشانی۔ یا یہ بھی نہ ہو۔ مال چوری ہوجائے اور وہ غنی ہوتے ہوئے بھی اس سفرِ غربت میں فقیر بن جائیں۔ اور مستحق امداد بن جائیں یا ان میں کوئی بھی صورت پیش نہ آئے، وقتی حالات کے لئے تالیفِ قلوب ہی ضروری ہوجائے، ان تمام احوال کے پیش نظر حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر ان کی مالی اعانتوں کی ترغیب دی کہ حرم محترم میں جو بھی غریبوں پر خرچ کیا جائے گا، اس کا اجر ایک لاکھ گنا ہوگا۔ یعنی ایک روپیہ کا صدقہ ایک لاکھ روپے کے صدقے کے مساوی ہوگا۔

حج میں روحانی ترقی کے درجات...... جس کا حاصل یہ ہے کہ غیرِ حرم میں تزکیۂ نفس یا رذیلۂ بخل سے پاکی اور غنائے نفس کا ملکہ ایک لاکھ روپیہ دے کر پیدا ہوتا ہے وہ حرم محترم میں ایک روپیہ دے کر ہوجائے گا، اور روحانی ترقی کے درجات ایک سے ایک لاکھ تک پہنچ جائیں گے، سو کون ہوگا کہ اس ترغیب کے بعد اس بہتی ہوئی سبیل میں ہاتھ تر نہ کرے۔

عالمی حسن سلوک...... پھر قرآن کریم نے حج کی قربانیوں تک میں جو مناسکِ حج میں سے ہیں، غرباء اور ضرورت مندوں کی رعایت فرمائی اور اس حسن سلوک کا سلسلہ بھی عالمی بنادیا، ارشاد حق ہے: ﴿فَكُلُوا مِنْهَا

وَاَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِيۡرَ ﴾ ① سوان قربانیوں کے جانوروں میں سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو کھلاؤ۔ غرض حج میں جیسے عالمی اخوت ومساوات رکھی گئی ہے ویسے ہی مالی تعاون کو بھی بین الاقوامی بنا دیا ہے۔ کیوں کہ مصیبت زدہ فقیر میں کسی ملک یا وطن کی تخصیص نہیں فرمائی گئی کہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے، بلکہ دنیا کے کسی خطہ کے ہوں سب اسی میں داخل ہیں۔

حج میں عالمی تجارت...... سوال یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص صدقہ وخیرات کا جذبہ بھی رکھتا ہے اور غریبوں کی امداد بھی کرنا چاہتا ہے لیکن نقد رقم اس کے پاس اتنی نہ ہو کہ وہ یہ جذبہ پورا کر سکے۔ تو قرآن حکیم نے اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی مالِ تجارت ساتھ لے جا کر فروخت کر سکے جس سے اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں، تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور نہ اس عبادت میں اس سے کوئی فرق پڑے گا۔

ارشاد فرمایا گیا: ﴿لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ﴾ ② اگر حج میں کچھ اسبابِ تجارت ہمراہ لے جانا مصلحت سمجھو تو تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج) میں معاش کی تلاش کرو (جو تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (لکھا) ہے۔

دوسری جگہ ایک دوسرے عنوان سے اسی اجازت کو اس طرح دھرایا گیا ہے کہ اس میں ترغیب دینے کی شان بھی پیدا ہوگئی۔ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کا اعلان کر دینے کا امر فرمایا گیا وہیں یہ بھی ارشادِ حق ہے فرمایا: ﴿لِيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ﴾ ③ (اس اعلان سے لوگ پیدل اور دبلی پتلی اونٹنیوں پر جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی، چلے آئیں گے) تا کہ وہ اپنے فوائد کے لئے آ موجود ہوں۔

یہاں منافع کا لفظ عام ہے جس میں اوّلیت کے ساتھ حج کے اخروی منافع جیسے رضاءِ خداوندی، اجر وثواب اور آخرت کی ترقی ءدرجات بھی داخل ہیں اور ثانویت کے ساتھ دنیوی منافع جیسے قربانی کا گوشت کھانا اور کھلانا اور تجارت یا صنعت وحرفت یا علاج معالجہ وغیرہ سے مال کمانا بھی شامل ہیں۔

عالمگیر امدادِ باہمی...... پس قرآن حکیم نے جیسے مناسکِ حج کے سلسلہ میں عالمی اخوت ومساوات کے رشتے قائم فرمائے، ویسے ہی عالمی تجارت اور بین الاقوامی انداز سے صنعت وحرفت کے منافع کا راستہ بھی ہموار فرما دیا۔ تا کہ اخوت ومساوات حسنِ سلوک کی مضبوط بنیادوں پر قائم رہے اور عالمگیر طریق پر امدادِ باہمی بقائے باہم کے سلسلہ جاری رہیں تا کہ مسلمان کے روابط صرف اپنے ہی ملک کے مسلمانوں تک محدود نہ ہو جائیں بلکہ دنیا کے آخری کناروں تک پہنچیں اور بین الاقوامی بنیں۔

بہر حال حج ایک بین الاقوامی عبادت، بین الاقوامی مساوات، بین الاقوامی اخوت، اور بین الاقوامی تعاون کا ایک

---

① پارہ:۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۲۸۔ ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۹۸۔

③ پارہ:۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۲۸۔

بے مثال اور عظیم المرتبت نمونہ ہے جس میں مرکز بھی ایک، محبت بھی ایک، اور سب کی انسانیت بھی ایک ہو کر سامنے آتی ہے اور اونچ نیچ، چھوت چھات، نفرت وحقارت باہمی کا بیج تک مارا جاتا ہے۔ پس جو قومیں آج مساوات اور بھائی چارگی کی لفظی رٹ لگا رہی ہیں۔ وہ قرآن حکیم کے دیئے ہوئے اس نمونہ، مساوات کو سامنے رکھ کر عبرت پکڑیں، ورنہ وہ بھائی چارہ کے نمائشی دعوے زبان پر نہ لائیں۔ وہ صرف مساوات، اخوت اور بھائی چارہ کے الفاظ رٹے ہوئے ہیں۔

جوہرِ تخلیق میں مساوات کا تقاضا...... اور شاید وہ بھی اسلام ہی کی اس عام پکار اور دعوت کی بدولت کہ "أنتم بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ" ① "تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے"۔ تم میں نہ کوئی سورج کی اولاد ہے نہ چاند کی، نہ کوئی سونے سے بنا ہوا ہے نہ چاندی سے، نہ کوئی خدا کے منہ سے نکلا ہوا ہے نہ اس کے پیروں سے، بلکہ سب اس کی مشیت وتخلیق سے ایک ہی جوہر سے اور ایک ہی باپ کی اولاد سے پیدا شدہ ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اخوت ومحبت کے لئے بنائے گئے ہیں، وہ لوگ چاند اور سورج کی اولاد بن کر انسانوں کو اخوت ومساوات کا درس نہیں دے سکتے بلکہ آدم خاکی کی اولاد ہو کر اور آدمیوں میں مل کر ہی یہ سبق پڑھا سکتے ہیں۔ وہ بہت سے خداؤں کے بندے بن کر دنیا کو ایک مرکز پر جمع نہیں کر سکتے بلکہ ایک اور صرف ایک واحدِ قہار اور بے مثل ویکتا خدا کے بندے بن کر ہی وحدیت اور مرکزیت کے نقطہ پر لا سکتے ہیں۔

عالمی اخوت کے مرکزی نقاط...... کیوں کہ اسی خدائے واحد وبے مثال نے عالمی اخوت اور محبت کے لئے دنیا میں تین مرکز 1 کلام اللہ 2 بیت اللہ 3 اور رسول اللہ بھیجے ہیں جنہیں عالمی مرکزیت دی ہے۔ قرآن کو ﴿ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ ② بتلایا۔

بیت اللہ کو ﴿هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ فرمایا اور حضرت خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ﴿رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ③ کہا۔ قرآن سے عالمگیر ہدایت بصورتِ قانون پھیلی، بیت اللہ سے عالمگیر اخوت ومساوات بصورتِ حج ابھری اور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے عالمگیر رحمت ومحبت اور انسانیت بصورتِ عمل سامنے آئی۔

طلب صادق...... اس لئے جو قومیں صحیح ہدایت، صحیح اخوت ومساوات اور صحیح انسانیت انسانوں میں دیکھنا چاہتی ہیں انہیں ان تین مرکزوں سے چارہ ءکار نہیں ہے اور یہ پاک پونجی انہیں ان ہی تین دروازوں سے مل سکتی ہے، اگر تعصبات کو چھوڑ کر طلبِ صادق کے ساتھ ان کے سامنے آئیں گی بلاشبہ کامیاب واپس ہوں گی، حاصل یہ کہ حج جیسے بین الاقوامی اور اجتماعی رنگ کی عبادت ہے، ویسے ہی عالمی اخوت ومساوات اور عالمی امدادِ باہمی کا سرچشمہ بھی ہے۔

قرآن حکیم نے اخوت ومساوات کا ایک مستقل قانون دیا ہے جس کا ایک اہم پہلو حج کی عبادت میں بھی

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی التفاخر بالاحساب، ج: ۱۱ ص: ۱۶ ! رقم: ۵۱۱۶.
② پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۰. ③ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۱۰۷.

مضمر تھا اس لئے موضوع کی رعایت سے اسی پہلو کو مختصر خطاب اور اس قلیل وقت میں ظاہر کرنا مقصود تھا، ورنہ حج کے سلسلے میں دینی اور دنیوی فوائد اور منافع کی فہرست اس سے کہیں طویل ہے۔ اتنی نہیں کہ ان چند سطروں میں سما سکے، اس کے لئے دفتر درکار ہیں۔

وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ ①

① ماخوذ از ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک (پشاور)

اہمیت تزکیہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِ ہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا إِلَی اللّٰہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا . أَمَّابَعْدُ!

فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ﴿وَنَفْسٍ وَّمَاسَوّٰھَاo فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَاo قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَاo وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا﴾ ① صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ .

حرفِ آغاز...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن شریف کی چند آیات ہیں جو اس وقت میں نے تلاوت کی ہیں، ان میں حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے دین کا ایک بنیادی اصول ارشاد فرمایا ہے۔ جو اصل مقصد ہے اور انسان کی پیدائش کی بنیادی غرض وغایت ہے۔ قبل اس کے کہ ان آیات کی تشریح کی جائے، پہلے بطورِ تمہید کے ایک مقدمہ سمجھ لیجئے، پھر ان آیات کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

خیر وشر سے مرکب مخلوق...... اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان میں اللہ نے دو مادّے رکھے ہیں، ایک خیر کا مادّہ ہے اور ایک شر کا مادّہ ہے، خیر کے مادے سے وہ اچھے افعال انجام دیتا ہے اور شر کے مادے سے برائی، بدی اور معصیت کا ارتکاب کرتا ہے۔ کوئی انسان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے کہ دو مادّے اس کے اندر نہ ہوں۔ انسان، انسان بنا ہی اس لئے ہے کہ اس میں خیر اور شر دونوں موجود ہیں۔ اگر وہ خیرِ محض ہوتا، تو وہ انسان نہ ہوتا، اس کو فرشتہ کہتے اور اگر شرِ محض ہوتا تب بھی انسان نہ ہوتا، اس کو شیطان کہتے، تو جس میں شر کا نشان نہیں ہے وہ فرشتہ ہے، اور جس میں خیر کا نشان نہیں ہے وہ شیطان ہے۔ انسان دونوں کا مجموعہ ہے۔ کہ وہ فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی ہے۔ دونوں مادّے اس کے اندر رکھے ہوئے ہیں۔

انسان کی ترقّی کا راز...... اور اسی لئے اسی میں ترقی ہے۔ نہ فرشتہ ترقی کر سکتا ہے نہ شیطان، مادی و روحانی جتنی ترقی کی ہے وہ انسان نے کی ہے۔ اس لیے کہ اس میں دونوں مادّے موجود ہیں۔ اور دو ضدیں جب ٹکراتی

① پارہ: ۳۰،سورۃ الشمس ،الآیۃ: ۷ ، ۱۰.

ہیں تب ہی کوئی تیسری چیز پیدا ہوتی ہے، اس لئے انسان کو اللہ تعالیٰ نے ترقیات عطاء فرمائی ہیں کہ اس میں یہ دونوں مادّے موجود ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بارے میں ارشاد فرمایا کہ ہر انسان میں ایک لَمّۂ خیر کا موجود ہے اور ایک لَمّۂ شر کا موجود ہے۔ یعنی ایک جذبہ اور داعیہ بھلائی کا موجود ہے۔ ایک جذبہ اور داعیہ برائی کا موجود ہے۔ پھر ان دونوں مادّوں کو امداد دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو ہی خزانے رکھے ہیں جن سے ان دونوں مادّوں کو امداد پہنچتی ہے۔

جذباتِ خیر و شر کا محرک...... حدیث میں ہے کہ: ہر قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے جو بندے کو خیر کی طرف ابھارتا ہے، اور ہر قلب کی بائیں جانب ایک شیطان بٹھلایا گیا ہے جو بندے کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ جب یہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کی بائیں جانب بھی شیطان بٹھلایا گیا ہے؟ فرمایا بَلٰی وَلٰکِنَّہٗ اَسْلَمَ میرے قلب کی بائیں جانب بھی شیطان بٹھلایا گیا ہے مگر وہ میرے تصرّف اور میری برکت سے مسلمان ہوگیا، اب اگر وہ بھی مجھے امر کرتا ہے تو خیر کی بات کرتا ہے، سُجھاتا ہے تو خیر کی بات سُجھاتا ہے۔''

گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر و برکت نے اس کی ماہیت بدل دی کہ بجائے شر کے خود اس میں خیر پیدا ہوگئی۔ مگر بٹھلایا گیا ضرور۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں تو یہ فرمایا گیا تھا۔ قرآن کریم سے بھی واضح ہے اور حدیث میں بھی ہے کہ: ''جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ چیختا ہوا اور روتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا کہ شیطان اس کو چوکے لگاتا ہے۔ اپنے اثرات پہنچانا چاہتا ہے تو اس کی کوکھ میں اپنی چونچ مارتا ہے تاکہ اس کا اثر پہنچ جائے۔ صرف دو ہستیوں کو مستثنیٰ کیا گیا جن کو شیطان کوئی اثر نہیں پہنچا سکا۔ ایک حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ایک حضرت مریم رضی اللہ عنہا۔ ان کی پیدائش کے وقت شیطان اپنا کوئی اثر نہیں پہنچا سکا''۔

اس سے سوال پیدا ہوتا تھا کہ بظاہر اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی افضلیت ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: صرف دو ہی انسان ہیں جن تک شیطان اپنا اثر نہیں پہنچا سکا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم رضی اللہ عنہا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں بلکہ حضرت مریم علیہا السلام بھی۔

لیکن میں نے جو ابھی حدیث بیان کی اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت واضح ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک شیطان اپنا اثر نہیں پہنچا سکا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شیطان پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر غالب ہوگیا، تو وہ شیطان ہی باقی نہ رہا۔ تو قوی تاثیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نکلتی ہے نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی۔ وہاں بہت سے بہت یہ ہوا کہ شیطان نہیں آسکا۔ یہاں آ بھی نہیں سکا۔ اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اثر ڈال کر اسے بدل ڈالا، اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت واضح ہوئی۔ بہر حال یہ

واضح ہے کہ ہر انسان میں دو مادّے رکھے گئے ہیں ایک خیر کا اور ایک شر کا، اور قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے اور بائیں جانب ایک شیطان بٹھلایا گیا ہے۔ فرشتہ خیر کی طرف توجہ دلاتا ہے اور شیطان شر کی طرف۔

محرکاتِ خیر وشر کی جنگ اور ان کی مدد...... یہ تو آپ نے بعض اوقات دیکھا ہوگا کہ ایک نیک کام کرنے میں آدمی کو تردّد ہوتا ہے کہ کروں یا نہ کروں۔ یا بدی کرنے میں تردّد ہوتا ہے کہ کروں یا نہ کروں؟ یہ شیطان اور فرشتے کی جنگ کا اثر ہوتا ہے۔ فرشتہ کہتا ہے کہ خیر کر، شیطان کہتا ہے کہ شر کر، آدمی تردّد میں پڑتا ہے کہ کیا کروں، جو چیز غالب آجاتی ہے وہی کرتا ہے۔ خیر غالب آگئی تو گویا فرشتے نے غلبہ پالیا، شر غالب آگئی تو گویا شیطان نے غلبہ پالیا، بہرحال ہر انسان میں دو مادّے بھی ہیں اور ان دونوں مادّوں کو امداد بھی پہنچتی ہے، اس لئے انسان دو ہی قسم کے افعال کرتا ہے یا برائی کے یا بھلائی کے، یا نیکی کرے گا یا بدی کرے گا۔

اوامر ونواہی کی حکمت...... یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلام دو۲ حصے لے کر دنیا میں اتری، ایک حصہ اوامر کا ہے۔ حکم دیا گیا کہ یہ کام کرو، یہ تو خیر کو ابھارنے کے لئے ہے، ایک حصہ نواہی اور ممانعت کا ہے کہ ان کاموں کو مت کرو۔ یہ شر کو دبانے کا ہے تو شریعت کے دو۲ حصے ہیں، ایک مامورات کا، ایک منہیات کا، مامورات کا معنی ہے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور منہیات کا معنی ہے جن کے نہ کرنے کا حکم دیا گیا اور ان سے روکا گیا۔ ایک طرف کہا گیا کہ تم تو نماز پڑھو، تم عبادت کرو، تم روزے رکھو، تم حج کرو، تم سچ بولو۔ یہ اوامر اور احکام خداوندی ہیں، اور ایک طرف نواہی ہیں "لَا تَقْتُلُوْا. لَاتَسْرِقُوْا. لَا تَزْنُوْا" نہ چوری کرو، نہ زنا کرو، نہ قتل کرو اور نہ شراب پیو، نہ بدکاری کرو۔ یہ منہیات کا حصہ ہے، اس لئے شریعت کے دو حصے ہوگئے، ایک امر بالمعروف یعنی اچھائیوں کا حکم دینا اور ایک نہی عن المنکر، یعنی برائیوں سے روکنا۔ یہ شریعت کی دو۲ جانبیں ہیں، ان دو کے بغیر انسان کو ترقی نہیں ہوسکتی، اگر وہ ساری نیکیاں کرتا رہے مگر بدیوں سے نہ بچے، ادھر نماز پڑھتا ہے، ادھر شراب خوری بھی کرتا ہے۔ ادھر روزہ بھی رکھتا ہے، ادھر معاذ اللہ زنا کاری میں بھی مبتلا ہے، اسے کوئی ترقی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی نیکیاں اکارت جائیں گی، دونوں چیزیں جب تک جمع نہ ہوں کہ بچنے کی چیزوں سے بچتا رہے، کرنے کی چیزوں کو کرتا رہے، اس کے بغیر انسان کی ترقی نہیں ہوسکتی۔

تقدیم نواہی...... اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص بیمار ہو، طبیب یہ کہے کہ یہ دوائیں پینی پڑیں گی۔ یہ امر کا حصہ ہے۔ اور فلاں فلاں چیز سے پرہیز کرنا پڑے گا۔ یہ نہی کا حصہ ہے۔ تو علاج میں دو چیزیں نکلتی ہیں۔ ایک دوا کا پینا، ایک پرہیز کرنا۔ اگر آدمی دوا پیتا رہے مگر پرہیز نہ کرے، بیماری رفع نہیں ہوگی، اطباء ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ پرہیز کرنا دوا پینے کی نسبت زیادہ مقدم ہے۔ بعض دفعہ دوا نہ بھی پیے۔ پرہیز کرنے سے آدھی سے زیادہ بیماری خود بخود ختم ہوجاتی ہے، اس لئے پرہیز مقدم ہے، اسی طرح سے شریعت میں بچنے کی چیزوں سے بچنا، کرنے کی چیزوں سے زیادہ مقدم ہے، اگر آدمی معاصی سے، بدعملیوں سے اور برائیوں سے بچتا رہا تو اس کے دین کا بہت سا

حصہ محفوظ ہوجائے گا۔ اگر چہ کرنے کی چیزیں اس نے نہیں کیں۔ بہرحال انسان میں بہت حد تک پاکی پیدا ہوجائے گی۔ تو پرہیز دوا سے مقدم ہوتی ہے، مضرت سے بچنا، نفع حاصل کرنے سے مقدم ہوتا ہے۔

ایک تاجر کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مجھے نقصان نہ پہنچ جائے، جب نقصان سے بچ گیا تو دوسری سعی ہوتی ہے کہ نفع حاصل کرے۔ تو خسارے اور نقصان سے بچنا مقدم ہے۔ اسی طرح شریعت میں مقدم یہ ہے کہ آدمی بدعملی سے بچ جائے، اس سے کچھ نیکی کرنے کی توفیق ہوجاتی ہے۔ اور بدعملیوں میں مبتلا رہنے سے توفیق سلب ہوجاتی ہے۔ آدمی نیکی نہیں کرتا۔ یہ عقلی اصول ہے کہ دفعِ مضرت جلبِ منفعت سے مقدم ہے۔ تو شریعت کے اعمال میں منکرات سے بچنا جتنا ضروری ہے، معروفات پر عمل کرنا اس درجہ کا نہیں، پہلے ضرورت ہے کہ آدمی منکرات سے بچے۔ قتلِ ناحق ہے۔ شراب خوری ہے۔ جوا ہے۔ جھوٹ بولنا ہے۔ رشوت ستانی ہے۔ سود بٹے کا کاروبار ہے۔ ان سے بچنا مقدم ہے، اس کے بعد نماز سے بھی نفع پہنچ سکتا ہے، روزے سے بھی، حج سے بھی، زکوۃ سے بھی، اگر ایک انسان کی کمائی ناپاک ہے، وہ سود خوری بھی کرتا ہے، نفلیں بھی پڑھتا رہے نفلوں کی تاثیر نہیں ہوگی، ممکن ہے فرض ادا ہوجائے، ممکن ہے کہ مفتی فتوی دے دے کہ فریضہ ادا ہوگیا لیکن قلب پر کوئی اثر پہنچ جائے۔ نہیں پہنچے گا جب تک اس چیز سے نہ بچے۔

آدمی چوریاں کرتا پھرے، اور ساتھ ہی روزے بھی رکھتا رہے، بے شک فریضہ ساقط ہوگیا۔ لیکن روزے کی وہ تاثیر کہ نفس پاک بن جائے، نہیں ہوگی، جب تک ایک طرف سے آلائش لگی ہوئی ہے کہ چوری، بدکاری کررہا ہے، تو بدعملی سے بچنے پر ہی قلب میں نیکی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں، اس لئے شریعت کی تاکید ہے۔ اور علماء نے لکھا ہے کہ پہلے منکرات سے بچنے کی کوشش کرے، بدعملی سے بچے تاکہ نیکی تمہارے لئے کارآمد اور مفید ثابت ہو۔

وسائلِ منہیات سے احتراز...... ان منکرات میں پھر دو۲ درجے رکھے ہیں۔ ایک درجہ تو آخری ہے جو اصل مقصد ہوتا ہے اور ایک درجہ اس کے وسائل کا ہے۔ شریعت وسائل سے بھی بچاتی ہے تاکہ مفسد سے آدمی خود بخود بچ جائے۔ مثلاً شریعت نے زنا سے روکا اور فرمایا ﴿لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا﴾ ① زنا کے پاس بھی مت پھٹکو، اس لئے کہ وہ فحش اور بے حیائی کی حرکت ہے اور بدترین راستہ ہے جو انسان کو دنیا میں بھی رسوا کرتا ہے، اور آخرت میں بھی رسوا کرتا ہے، مقصود اصلی زنا سے روکنا ہے۔ لیکن زنا تک پہنچانے والے جو افعال تھے شریعت نے ان سے بھی روکا۔

حکم دیا گیا کہ عورت پر بری نگاہ بھی مت ڈالو، اجنبیہ کی طرف چل کر بھی مت جاؤ، اس کی خوشبو سونگھنے کی طرف بھی ناک کو متوجہ مت کرو، اس کی آواز پر بھی کان مت دھرو۔ حالانکہ آواز کا سن لینا کوئی گناہ نہ تھا، خوشبو کا ناک میں آجانا کوئی گناہ نہیں تھا، لیکن چوں کہ یہ ایک گناہ کا ذریعہ بنتا ہے، اس واسطے اس سے روک دیا گیا اور کہا

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۲.

گیا کہ اس سے رکو ﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۔ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۔ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾ ① ''اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! ایمان والوں سے فرما دیجئے اپنی نگاہوں کو نیچا اور پست کریں۔'' اسی طرح ﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ﴾ ② اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

نگاہ نیچی رکھنے کا حکم کیوں بیان کیا گیا۔؟ اس لئے کہ نگاہ پڑے گی، تو قلب اس سے اثر لے گا، ممکن ہے کہ دل میں فتنہ پیدا ہو جائے یا برائی کا جذبہ پیدا ہو جائے، اس لئے وہیں سے روک دیا۔ اسی طرح سے عورت کی آواز کو بھی عورت کہا گیا ہے کہ اس کی آواز سننے کی بھی کوشش مت کرو۔ بعض دفعہ آواز کی تاثیر سے بھی آدمی کے قلب میں برے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے آواز سے بچایا گیا۔

حکمتِ حجاب...... یہی وجہ ہے کہ عورتوں لئے حجاب رکھا گیا کہ باہر نکلیں تو نقاب ڈال کر نکلیں، کھلے چہرے نہ نکلیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ الْمَرْأَةَ عَوْرَةٌ مَسْتُوْرَةٌ اِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطٰنُ.'' ③ عورت، مرد کا ایک چھپا ہوا خزانہ ہے، اس کا ناموس اور اس کی آبرو ہے، جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے تاکتا ہے کہ اب کتنوں کو مبتلا کروں گا۔ کسی کو بدنگاہی میں، کسی کو بدخیالی میں مبتلا کروں گا۔ اس واسطے ارشاد فرمایا گیا کہ: جب عورت باہر نکلے تو چہرے پر نقاب ڈال کر نکلے۔

پھر یہی نہیں فقط، یہ بھی کہا گیا کہ خوشبو لگا کر نہ نکلے۔ خوشبو لگا کر نکلی تو خوشبو پھیلنے پر خیالات متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کو بھی روک دیا گیا، بلکہ یہاں تک فرمایا گیا ''مَنْ اَصَابَتْ بُخُوْرًا فَهِيَ كَذَا وَكَذَا.'' ④ جو عورت خوشبو لگا کر باہر نکلی، وہ بمنزلۂ زنا کار کے ہے۔ گویا اس نے زنا کر لیا، اور زنا کا راستہ صاف کر دیا۔ حتیٰ کہ بعض روایات میں یہاں تک بھی ہے کہ وہ گھر میں آ کر غسل کرے۔ اس نے ناپاکی کا راستہ اختیار کیا۔

ممانعتِ اختلاط...... پھر تاکید فرمائی گئی کہ جب عورت باہر نکلے اور نقاب ڈال کر نکلے تو راستے کے بیچ میں نہ چلے، کنارے پر چلے تاکہ مردوں سے اس کی مڈبھیڑ نہ ہو۔ مسلم کا حق فرمایا گیا ہے سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا۔ عورت کو ممانعت کی گئی کہ اجنبی مردوں کو نہ سلام کرے اور نہ اس کے سلام کا جواب دے۔ یہ صرف اس لئے کہ عورت مرد کا اختلاط پیدا نہ ہو۔ یہی اختلاط برائیوں اور بدعملیوں کا ذریعہ بنتا ہے۔ جس سوسائٹی میں مرد عورت کا اختلاط بڑھ جائے گا یقیناً وہ سوسائٹی بدکار بن کر رہے گی۔ کتنا ہی وہ دعوے کرے کہ وہ تقویٰ شعار ہے مگر ناممکن اور محال ہے، اس لئے شریعت نے روکا کہ اجنبی مرد عورت کا خلط ملط نہ ہو۔

---

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۳۰. ② پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۳۱.

③ الجامع للترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی کراھیۃ الدخول علی المغیبات، ج: ۴ ص: ۲۰۶.

④ الحدیث اخرجہ الامام مسلم فی صحیحہ ولفظہ: ایما امرأۃ اصابت بخوراً فلا تشھد معنا العشاء الآخرۃ، ج: ۲ ص: ۴۴۸.

اوّل تو بے ضرورت گھر سے باہر جانے کی ممانعت ہے، لیکن اگر کسی ضرورت سے جائے تو نقاب ڈال کر جائے، نقاب بھی ڈال کر جائے تو راستے کے کناروں پر چلے وسط میں نہ چلے، کناروں پر بھی چلے تو خوشبو لگا کر نہ چلے کہ وہ خود کو لوگوں کی تو جہالت کا ذریعہ بنائے۔ یہ سب چیزیں اس لئے کہ اختلاط نہ ہونے پائے۔

مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابیہ رضی اللہ عنہن کی شرکتِ جماعت کے لئے درخواست......

حدیث میں امِ حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے جو ایک انصاری عورت صحابیہ رضی اللہ عنہا ہیں اور خیر القرون ہے۔ نیکی ہی نیکی مردوں اور عورتوں میں پھیلی ہوئی ہے اور زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ غرض ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک درخواست پیش کی اور عرض کیا ''یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ میں مسجدِ نبوی میں آ کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کروں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں میری نماز ہو''۔ کتنی پاکیزہ درخواست پیش کی!

اول تو نماز افضل العبادات ہے کہ اس سے اونچی کوئی عبادت نہیں، اس کی درخواست کی۔ پھر اس عبادت کی درخواست بھی کہاں کی؟ مسجدِ نبوی میں۔ جس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہے۔ کون سے امام کے پیچھے درخواست کی؟ جو عالم میں سب سے افضل ہستی اور ذاتِ بابرکات ہے۔ اور کس جماعت میں شامل ہو کر نماز پڑھنے کی درخواست کی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت میں جن کے بارے میں مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے کہ امت میں بڑے سے بڑا قطب، غوث کسی مقام پہ پہنچ جائے۔ صحابیت کے مقام کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تمام امت سے بالا جماع افضل ہیں۔ تو کتنی پاکیزہ درخواست کی کہ افضل العبادات نماز کی درخواست تھی۔ بہترین اور اعلیٰ ترین مسجد میں نماز پڑھنے کی درخواست تھی۔ اعلیٰ ترین جماعت میں شامل ہونے کی درخواست تھی اور اعلیٰ ترین امام کے پیچھے نماز کی درخواست تھی۔

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''صَلٰوتُکِ فِیْ دَارِکِ خَیْرٌ مِّنْ صَلٰوتِکِ فِیْ مَسْجِدِیْ ھٰذَا. '' تیرا نماز گھر میں پڑھنا میری مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ پھر فرمایا: ''وَصَلٰوتُکِ فِیْ بَیْتِکِ خَیْرٌ مِّنْ صَلٰوتِکِ فِیْ دَارِکِ. '' اور گھر کے صحن میں نماز پڑھنے سے بہتر گھر کے دالان میں نماز پڑھنا ہے۔ پھر فرمایا: ''وَصَلٰوتُکِ فِیْ مِخْدَعِکِ خَیْرٌ مِنْ صَلٰوتِکِ فِیْ بَیْتِکِ. '' ''اور گھر میں بھی اندر کی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ گھر کے دالان میں نماز پڑھنے سے۔'' ①

گویا اس کا مطلب یہ نکلا کہ جس حصّے میں پردہ بڑھتا گیا، اس حصے میں افضلیّت بڑھتی گئی ہے۔ مسجد میں جانے کی بہ نسبت گھر میں عورت زیادہ پردہ نشیں ہے تو اس میں نماز افضل قرار دی گئی، پھر گھر کے صحن سے دالان میں زیادہ پردہ ہے کہ آسمان سے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس میں بہ نسبت صحن کے افضل ہے، پھر اندر کی کوٹھڑی

① مصنف ابن ابی شیبة، کتاب الصلوٰة، باب من کرہ ذالک (خروج النساء الی المسجد) ج: ۲ ص: ۲۷۷.

دالان سے زیادہ افضل ٹھہرائی گئی کہ اس میں اور بھی زیادہ پردہ ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ جتنا زیادہ پردہ ہوگا، جتنا زیادہ چھپنا ہوگا، اتنی ہی زیادہ افضلیت عورت کے لئے بڑھتی جائے گی۔

حتیٰ کہ مسجدِ حرام و مسجدِ ابراہیمی مکہ مکرمہ میں جس کے حج کے لئے عالم جاتا ہے۔ جو ہم سب کی عبادت کا مرکز ہے کہ جب تک ہماری اپنی مسجد کا رخ مسجدِ حرام کی طرف نہیں ہوگا اس وقت تک قبول نہیں ہوگی۔ گویا ہر مسجد، مسجد حرام کی طرف رخ کئے ہوئے ہے۔ اس کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے کہ: ''وہاں ایک نماز پڑھنا، ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے''۔

گویا ایک لاکھ گنا اجر ملتا ہے۔ لیکن عورت کے لئے یہ افضلیت نہیں رکھی گئی۔ عورت وہاں بھی اگر گھر میں پڑھے گی تو اس نماز سے زیادہ افضل نماز ہوگی جو کہ وہ مسجدِ حرام میں نماز پڑھتی۔ تبرکاً آدمی عورت کو اجازت دے دے کہ وہ کسی نہ کسی وقت جا کے مسجد حرام میں نماز پڑھ لے۔ لیکن وہ اتنی پابندی نہ کرے کہ دھوپ ہو، گرمی ہو، کسی نہ کسی طرح پہنچے۔ فرمایا افضل یہی ہے کہ گھر میں نماز پڑھے، اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ وہاں اجنبی مردوں کا ہجوم ہے، اختلاط زیادہ پڑھے گا، ممکن ہے کہ قلب میں کوئی فساد پیدا ہو جائے۔ ممکن ہے کوئی برائی آ جائے، ممکن ہے کوئی برائی پیدا ہو۔ تو شریعت چاہتی ہے کہ نفسِ انسانی کو پاک بنایا جائے جس میں خیالات بھی برے پیدا نہ ہوں، اس لئے ان اسباب کو قطع کیا جائے گا جن سے کوئی بدخیالی پیدا ہو سکتی ہے۔

یہ کیفیت کیوں ہے؟ دراصل اسے اُسی بری حرکت سے بچانا ہے، یہ چیزیں اس برائی کا جسے زنا کہتے ہیں، ذریعہ بن سکتی تھیں، تو یہیں سے روک دیا گیا۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں سدِ ذرائع کہتے ہیں۔ یعنی وسائل سے روک دیتے ہیں تا کہ آدمی مقاصد سے بچ سکے۔ اگر وسائل اور ذرائع میں پھنس گیا تو ایک نہ ایک دن وہ ضرور مقصد تک پہنچ جائے گا۔

طریقِ تربیت ...... حدیث میں ہے کہ: '' مَآ اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ. '' ① جس چیز کے بہت سے حصے میں نشہ ہے اس کا تھوڑا حصہ بھی ناجائز ہے۔ شراب کا جیسے ایک گھونٹ ممنوع ہے، ایک قطرہ چکھنا بھی ممنوع ہے، حالاں کہ ایک قطرہ پینے سے نشہ نہیں پیدا ہوتا، اور شراب نشے کی وجہ سے حرام کی گئی ہے، تو ایک قطرہ پی لینا جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس میں حکم کی علت نہیں پائی جاتی اور وہ نشہ ہے۔ جب ایک قطرہ چکھنے میں نشہ نہیں ہے تو جائز ہوتا، مگر اسے ناجائز قرار دیا گیا۔ کیوں۔؟ اس لئے کہ جس نے آج ایک قطرہ چکھا ہے، وہ کل ایک گھونٹ بھی پئے گا۔ اور جو کل کو ایک گھونٹ پئے گا، وہ کل کو ایک گلاس بھی پئے گا۔ اور جو پرسوں کو ایک گلاس پئے گا وہ چند دن کے بعد شرابی بن جائے گا۔ شرابی بننے سے روکنا اصل مقصود ہے۔ تو ایک قطرہ سے رکاوٹ شروع کی تا کہ وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

حدیث میں ہے کہ: ''مَنْ اَتٰى عَرَّافًا فَقَدْ كَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

① السنن لابن ماجه، كتاب الاشربة، باب ماأسكر كثيره فقليله حرام ج: ۱۰ ص: ۱۷۱ حدیث حسن صحیح ہے۔ دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابن ماجه ج: ۷ ص: ۳۹۳ رقم: ۳۳۹۳.

وَسَلَّم." ① "حدیث میں ہے کہ: جو کسی جادوگر کے پاس گیا اس نے شریعتِ محمدی کے ساتھ کفر کیا"۔ حالاں کہ کفر جب ہوتا ہے جب آدمی توحید کا انکار کردے، نبوت کا انکار کردے قیامت کا انکار کردے، تب کفر لازم ہوتا ہے۔ جادوگر کے پاس جانے سے تو بظاہر کفر نہیں آنا چاہئے۔

مگر اسے کفر کیوں قرار دیا گیا؟ نتیجے کے اعتبار سے کہ جو آج جادوگر کے پاس گیا ہے تو اوّل تو اس کے دل سے جادو کی برائی نکلے گی۔ کل کو وہ فرمائش کرے گا کہ تو کچھ جادو کر۔ پرسوں کو وہ سیکھے گا کہ مجھے بھی یہ تعویذ اور منتر سکھلا دے اور ترسوں کو اچھا خاصا جادوگر بن جائے گا۔ اس سے بچانے کے لئے جادوگر کے پاس جانے ہی سے روک دیا گیا۔ کہ جادوگر کے پاس جاتے ہی کیوں ہو؟ اور یہ نوبت آئے ہی کیوں۔؟ تو یہ سدِ ذرائع ہے کہ وسائل سے روک دیتے ہیں تا کہ آدمی مقاصد تک نہ پہنچ پائے۔

آج کی عورت کا تمدّن...... اب آج کی زندگی میں اگر دیکھا جائے تو ہم سب سے زیادہ منکرات میں گرفتار ہیں۔ یعنی کہا تو یہ گیا ہے کہ اجنبی عورت باہر نہ نکلے بے پردہ نہ نکلے، آج عورتوں کا کیا' قوم کا شعار اور تمدن یہ بن گیا ہے کہ جتنی عورت زیادہ سے زیادہ باہر جائے اسے تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ حدیث میں صاف فرمایا گیا اور خبر دی گئی کہ "رُبَّ کَاسِیَاتٍ عَارِیَاتٍ مَائِلَاتٍ مُمِیْلَاتٍ لَایَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ." ② بہت سی عورتیں جو لباس پہنی ہوئی ہیں لیکن پھر بھی ننگی ہیں۔ وہ نکلیں گی کہ لباس بھی پہنے ہوں گی، مگر پھر بھی عریاں ہوں گی، خود بھی اجنبیوں پر مائل ہوں گی، دوسروں کو بھی اپنی طرف مائل کریں گی ان کو جنت میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ جنت کا مقامِ کریم ان کا ٹھکانا نہیں ہوگا جب تک انہیں سزا دے کر پاک نہ بنایا جائے یا جو بھی اللہ چاہے، ایکا ایکی وہ اس مقامِ کریم میں داخل ہو جائیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔

فرمایا گیا کہ ایک وقت آئے گا کہ عورتوں کے سر ایسے ہوں گے جیسے اونٹ کی کوہان حرکت کرتی ہوئی ہوتی ہے۔ یعنی بال اس طرح سے بنائیں گی جیسے اوپر ایک ٹوکرا سا رکھا ہوا ہو اور معلوم ہو کہ اونٹ کی کوہان ہے۔ آج ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ وہ پیشین گوئی پوری ہو رہی ہے۔ اسی طرح سے مائلات بھی ہیں اور ممیلات بھی ہیں اور کاسیات بھی ہیں اور عاریات بھی ہیں۔

لباس کی عریانی...... لباس پہنے ہوئے ہیں اور پھر عریاں ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ لباس ہی ناقص ہو۔ جیسے آج کل ہے کہ پنڈلیاں بھی کھلی ہوئی ہیں بازو بھی کھلے ہوئے ہیں۔ سینہ بھی کھلا ہوا، پشت بھی کھلی ہوئی اور سر بھی کھلا ہوا ہے۔ حالانکہ عورت کا بدن گردن سے لے کر ٹخنوں تک ستر قرار دیا گیا ہے کہ اس کو وہ نہ چھپائے تو نماز نہیں ہو سکتی۔ سوائے خاص حالتوں کے۔ تنہائی میں بھی اس کا چھپانا ضروری ہے۔ چہ جائے کہ بھرے مجمعوں

---

① الصحیح لمسلم، کتاب السلام، باب تحریم الکهانة، ص: ۱۰۷۴، رقم: ۵۸۲۱.

② الصحیح لمسلم، کتاب اللباس و الزینة، باب النساء الکاسیات...... ص: ۱۰۵۸، رقم: ۵۵۸۲.

میں عورتیں ستر کھول کر نکلیں۔ تو ایک تو لباس کے ناقص ہونے کی وجہ سے عریانی ہو اور لباس ہی ناتمام ہو کہ گھٹنے ٹخنے سب ننگے۔ اور ایک یہ کہ لباس تو پورا ہو، گردن سے لے کر ٹخنے تک سب بدن چھپا ہوا، لیکن اتنا باریک ہو کہ چھپنے کے باوجود بدن اندر سے ڈھپک رہا ہے۔ یہ بھی کاسیات اور عاریات میں داخل ہے کہ لباس بھی ہے اور عورت پھر بھی ننگی ہے۔ اتنا باریک لباس نائیلون کا پہن لیا کہ وہ لباس نظر نہیں آتا، مگر بدن اندر سے نظر آتا ہے۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ لباس سر سے پیر تک ہو اور موٹے کپڑے کا ہو مگر بدن کے اوپر اتنا چست ہو کہ بدن کی ساری حیثیت نمایاں ہو رہی ہے۔ یہ بھی اس کا فرد ہے۔ جیسے آج کل ہم سنتے ہیں کہ ایک لباس چلا ہے جسے ٹیڈی کہتے ہیں کہ پاجامہ ہے تو وہ اتنا کسا ہوا اور چست ہے کہ اس میں ران اور پنڈلی کی پوری حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ اگر چہ وہ نظر نہ آئے۔ غرض ایک عُریانی یہ ہے کہ لباس ناتمام ہو، اور ایک یہ کہ لباس پورا ہو مگر اتنا باریک ہو کہ بدن کو چھپا نہ سکتا ہو۔ اور ایک یہ کہ لباس پورا بھی ہو اور موٹا بھی ہو مگر چست اتنا ہو کہ بدن کی حیثیت نمایاں کرتا ہو۔ یہ سب کاسیات و عاریات کہ لباس پہنے ہوئے ہو کر بھی عریانی کے افراد میں داخل ہیں۔ اس کو فرمایا گیا: ''لَایَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ.'' وہ جنت کی ہوا نہیں پائیں گی، مقام کریم تک نہیں پہنچیں گی۔ انہیں رضائے خداوندی کا مقام حاصل نہیں ہوگا۔ آج نماز، روزہ جتنا ضروری ہے ان سے زیادہ ان چیزوں سے بچنا اور بچانا ضروری ہے کہ ہم خود بھی بچیں اور اپنی نسلوں کو بھی بچائیں اور اپنی عورتوں کو بچائیں۔

اجتنابِ منکرات کی تاکید...... شریعت نے یہاں تک اس کی تاکید کی ہے کہ حقیقی بہن بھائی ہوں، ابھی جوان بھی نہیں ہوئے، دس گیارہ برس کے ہیں تو فرمایا گیا کہ: دونوں کو تنہا مکان میں مت چھوڑو، ایک چارپائی پر شریعت نے دو بہن بھائی کو لیٹنے کی اجازت نہیں دی، حالاں کہ حقیقی بہن بھائی ہیں۔ ابھی بالغ بھی نہیں ہیں۔ مراھقت کا درجہ ہے۔ دس گیارہ سال کی عمر ہے۔

مثل مشہور ہے کہ آدمی کا شیطان آدمی ہوتا ہے۔ شیطان کو آتے ہوئے کیا دیر لگتی ہے۔ شریعت رحیم و کریم ہے وہ ایسے اسباب ڈالتی ہے کہ ہر انسان مقدس اور منزہ بنے، پاک اور پارسا بنے، تو ان اسباب سے بچنا پڑے گا جو تقویٰ و طہارت اور پارسائی میں حارج ہوتے ہیں۔ ان سے بچنا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ جتنا کہ فرائض کا انجام دینا ضروری ہے، ایک طرف آپ نماز پڑھیں اور ایک طرف گھر کی معاشرت جو بدکاری کی طرف جارہی ہو اسے نہ روکیں تو وہ نماز بھی اپنا اثر نہیں دکھائے گی جب تک ان چیزوں سے بچاؤ نہ ہو، دوا اثر نہیں دکھلائے گی، جب تک پرہیز نہ کیا جائے، ایک طرف تو زکام کی حالت میں آپ نے گلِ بنفشہ پیا اور دوسری طرف آپ نے سیر بھر دہی برف ملا کر پی لیا، تو گل بنفشہ کا ایسے میں کیا اثر ظاہر ہوگا۔؟ غرض منکرات سے بچنا اس سے زیادہ ضروری ہے، جتنا کہ معروف چیزوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔

سوسائٹی کی تباہی کے عوامل...... اور منکرات میں بھی چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچنا زیادہ ضروری ہے۔

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، مجھے حضور نے فرمایا اے عائشہ! ''اِیَّاکِ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ.'' حقیر گناہوں سے زیادہ بچنے کی کوشش کرو، بڑے بڑے گناہوں سے تو آدمی کبھی وضع داری اور ظاہرداری کی وجہ سے بچ جاتا ہے۔ ایک اچھی سوسائٹی میں بیٹھنے والا کبھی کھلے بندوں شراب نہیں پیئے گا۔ اس کا جی تو چاہتا ہے مگر خیال یہ ہے کہ دنیا کیا کہے گی کہ ایسا بڑا آدمی اور شراب خانوں میں بیٹھا ہے۔ تو اس سے بچنا کبھی سوسائٹی کی وجہ سے بھی ممکن ہوتا ہے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے گناہ جن کی طرف کسی کی بھی نگاہ نہیں جاتی، انہیں آدمی کرتا رہتا ہے۔ اس کو یہ سمجھتا ہے کہ وضع داری کے خلاف مجھ پر کوئی ملامت نہیں ہوگی۔ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ان سے بچنے کی زیادہ کوشش کرو، وہی آدمی کے قلب کا ناس مارتے ہیں، آپ اجنبیہ کی طرف نگاہ ڈال دیں کوئی دیکھنے والا نہیں، کوئی بھی نہیں سمجھے گا، لیکن اس سے بچنا، اس سے زیادہ ضروری ہے جتنا زنا سے بچنا کیوں کہ آگے بڑھنے کا یہی راستہ ہے۔

تو ''اِیَّاکُمْ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ.'' ① سب سے زیادہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچو جن کو آدمی یہ بھی نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی گناہ ہوگا۔ اور کر بھی لیتا ہے۔ اور انجام کار وہ بڑی برائی کی طرف پہنچا دیتے ہیں۔ سوسائٹی جو تباہ ہوتی ہے۔ وہ منکرات سے تباہ ہوتی ہے۔ اس واسطے ان سے زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔

اخلاقی جرأت کے بغیر استیصالِ جرائم ممکن نہیں ...... اور یہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ قلب کے اندر پارسائی کا جذبہ پیدا نہ کرلیا جائے، یعنی دوسرے روکتے ہیں اور آپ رکتے ہیں۔ اسے رکنا نہیں کہتے، یہ تو مجبوری کا رکنا ہے، آپ کے قلب کے اندر خود داعیہ پیدا ہو کہ مجھے رکنا چاہئے اگر قانون آپ کو روکے اور آپ رک جائیں، یہ مجبوری کا رکنا ہے۔ ہزاروں جرائم اور ہزاروں برائیاں ہیں کہ قانون سے ان کا استیصال نہیں ہوسکتا، قانون سے وہ جرائم بند نہیں ہوسکتے جب تک خود انسان میں بچنے کی اخلاقی جرأت نہ ہو اور اپنے اندر جذبہ نہ ہو۔

ایک تھیلی میں بھرا ہوا تین لاکھ روپیہ ایک تنہا مکان میں رکھا ہوا ہے، وہاں پولیس کا بھی کوئی آدمی نہیں، سی آئی ڈی کا بھی کوئی آدمی نہیں۔ اگر آپ اٹھالیں کوئی روکنے والا نہیں۔ پھر بھی اگر آپ رکتے ہیں۔ تو کیوں رکتے ہیں؟ اللہ کا خوف آپ کو رکاوٹ ڈالتا ہے۔ تو اصل میں جرائم سے بچانے والا خدا کا خوف ہے، پولیس نہیں بچا سکتی۔

قوانین کی کثرت سے جرائم کم نہیں ہوسکتے ...... اگر پولیس سے، ہتھیاروں سے، اور فوجی قوتوں سے گناہوں سے روکا جاسکتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی۔ اس لئے کہ آج نہ فوج کی کمی، نہ پولیس کی کمی، نہ ہتھیاروں کی کمی۔ زمانے میں کبھی ایسے نئے نئے ہتھیار نہیں دیکھے گئے جتنے آج کے زمانے میں ہیں، فوج کی اتنی تعداد دنیا میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی جتنی آج ہے۔ پولیس اتنی کبھی نہیں، جتنی آج ہے۔ حتیٰ کہ راستے راستے پر پولیس ہے۔ لیکن یہ چیزیں بڑھتی جارہی ہیں جرائم بھی بڑھتے جارہے ہیں۔ بتاؤ ہی ہے کہ جرائم کا روک لینا، پولیس

---

① مسند احمد، حدیث ابی مالک سهل بن سعد الساعدیؓ ج: ۴۶ ص: ۲۹۲. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح الترغیب والترهیب للالبانی، الترغیب فی الامر ج: ۲ ص: ۳۲۴.

کا کام نہیں ہے، محض قانون کا کام نہیں، جب تک انسان کی اخلاقی حالت اندر سے صحیح نہ ہو، اور جب تک اللہ کا خوف سامنے نہ ہو آدمی جرائم سے نہیں بچ سکتا۔

تقویٰ شعار ہی جرم سے بچتا ہے...... حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ جو خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہی سنایا تھا کہ وہ سہارنپور کا سفر فرما رہے تھے۔ اور سہارنپور کے گنے مشہور ہیں، بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ تو دو تین دھڑی گنے خرید لئے۔ اتفاق سے ساتھ میں دو ایک مسلمان چیکر بھی تھے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "بھائی! کانٹے پر جا کر انہیں تلوا دو۔ تاکہ محصول ادا کر دوں"۔ وہ جو چیکر ساتھ تھے، انہوں نے کہا، حضرت! اس کی ضرورت نہیں، ہم ہی تو چیک کرتے ہیں اور ہم ساتھ چل رہے ہیں۔ آپ بے تکلف رکھیئے۔ فرمایا "بھائی! مجھے آگے جانا ہے"۔ انہوں نے کہا، آگے آپ کہاں جائیں گے؟ فرمایا "فی الحال تو میں کانپور جا رہا ہوں۔ اور آپ لوگ غازی آباد میں میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ دلی چلیں جائیں گے۔ پھر آگے کیا ہوگا؟ وہ دوسرے چیکر آئیں گے۔ اور وہ ڈبل محصول لیں گے، ممکن ہے کہ وہ جرمانہ بھی ڈالیں، تو آپ مجھے بتلا کرنا چاہتے ہیں؟"

انہوں نے کہا کہ ہم غازی آباد میں اس گاڑی کے چیکر کو کہہ دیں گے، وہ بھی آپ کو نہیں روکیں گے۔ فرمایا "جب میں کانپور کے اسٹیشن پر اتروں گا اور دروازے سے باہر جاؤں گا تو وہاں ٹکٹ لینے والا کھڑا ہوگا، وہ کہے گا۔ انہوں نے کہا۔ ہم ان چیکروں کے ذریعے اس بابو سے بھی کہلوا دیں گے، وہ بھی آپ کو نہیں چھیڑے گا۔

اس پر فرمایا "بھائی! مجھے اور آگے جانا ہے۔" انہوں نے کہا، حضرت! آگے اور کہاں جانا ہے۔ بس آپ گھر پہنچ گئے، فرمایا "اس سے بھی آگے جانا ہے"۔ "مجھے اللہ کے پاس بھی تو جانا ہے، مجھے اپنے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے اگر چیکر نے چھوڑ دیا اور گھر تک پہنچ گیا، مگر قبر اور حشر میں میرا کیا حال ہوگا۔ پھر مجھ سے گرفت ہوگی کہ تم نے کیوں یہ ناجائز حرکت کی؟ تم نے قانون کی یہ چوری کیوں کی۔؟ اس وقت میں کیا جواب دوں گا؟ اس لئے آپ مہربانی کر کے تلوا دیں، میں یہیں سے محصول دیئے دیتا ہوں تاکہ میں دنیا اور آخرت کی گرفت سے بچا رہوں"۔

یہ چیز تھی جس نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بچایا، اور ہر مسلمان کو بچانے والی چیز یہ "خوفِ خداوندی" ہے جو قلب کے اندر ہوتا ہے، یہ جرائم سے بچاتا ہے، قانون منظر عام کی برائیوں کو روک سکتا ہے، اگر آپ کھلے بندوں ڈکیتی ڈال رہے ہوں یا کھلے بندوں بدامنی کی، پولیس آ کر آپ کو پکڑ لے گی، مگر جہاں تنہائی میں چھپ کر بدامنی ہوتی ہے، جہاں پولیس کو کانوں کان خبر نہ ہو وہاں بچانے والا کون ہے، وہ تو وہی اپنا ضمیر اور اپنا قلب بچائے گا۔ تو سب سے بڑی پولیس وہ قلب کا جذبہ ہے جو انسان کے اندر موجود ہے، ایک بھی پولیس نہ ہو اور قلب کے اندر جذبہ موجود ہو آدمی خود بخود دبچے گا۔

انسدادِ جرائم میں پارلیمنٹ کی ناکامی...... دو واقعے مجھے یاد آئے۔ اور دونوں میں فرق کا آپ اندازہ کریں۔ پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کچھ عرصہ ہوا ہے کہ امریکہ میں یہ سوال اٹھا کر شراب کی بندش ہونی

چاہئے۔ چناں چہ جتنے ذمہ دارانِ حکومت تھے وہ اس پر متفق ہو گئے کہ شراب کو بند ہونا چاہئے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جو شراب بندی کا قانون بنائے۔ اس کے لئے کتنے لاکھ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا کہ برس ڈیڑھ برس میں وہ قانون تیار ہوگا تو قانون بنانے والوں کی تنخواہیں دی جائیں گی، دفتری اخراجات ہوں گے، تو لاکھوں روپے کا بجٹ منظور ہوا۔ برسوں میں وہ قانون تیار ہوا۔ جب قانون بن گیا، اسے پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا، اس کی پہلی خواندگی ہوئی۔ اس کے بعد پارلیمنٹ نے منظور کر کے یہ حکم جاری کیا کہ پبلک میں اس کا اشتہار دیا جائے اور اس قانون کو عام کیا جائے، تا کہ اس کے بارے میں رائے عامہ معلوم ہو۔ اس کی لکھائی چھپائی اور رائج کرنے کے لئے کئی لاکھ روپے کا بجٹ منظور ہوا، تا کہ اس قانون کو چھاپ کر پورے ملک میں شائع کریں۔ تا کہ جتنے اہل فکر ہیں وہ اس پر رائے زنی کریں۔

ایک عرصے تک اس کو منتشر رکھا گیا اور پھیلایا گیا، تا کہ لوگ اپنی اپنی رائے ظاہر کریں۔ جب رائیں آ گئیں پھر وہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا، پارلیمنٹ نے اس کو منظور کیا، اب اس کو چلانے کے لئے کئی کروڑ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا کہ زائد پولیس رکھی جائے جو اسے جاری کرے اور نافذ کرے، تا کہ اہلِ ملک اس پر عمل کریں، گویا کروڑوں روپے خرچ کر کے قانون بنا اور وہ جاری کر دیا گیا۔ پولیس کو ہدایت کی گئی کہ ایک برس کے بعد رپورٹ کرے کہ اس پر عملدرآمد کیسا رہا، اور اس کے کیا اثرات نمایاں ہوئے؟ برس دن کے بعد پولیس نے رپورٹ دی کہ پہلے اگر شراب پینے والے پچاس ہزار تھے تو اب ایک لاکھ بن گئے ہیں۔ یہ اس کا اثر نمایاں ہوا۔ اور وہ کیوں نمایاں ہوا؟

اس لئے کہ پہلے شراب خانے کھلے ہوئے تھے، ہزاروں آدمی پیتے تھے۔ مگر بہت سے وضعدار لوگ اس لئے نہیں پیتے تھے کہ ہماری ساکھ پر دھبہ آئے گا، لوگ ہمیں برا سمجھیں گے کہ یہ شرابیوں کی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں، وہ بچتے تھے اور اکادکا آدمی چھپ چھپا کر پی لیتا تھا۔

لیکن جب قانون کی بندش ہوگئی، اور سب کو روک دیا گیا تو سب نے بلیک کر کے اسے چوری سے پینا شروع کیا، تو جو لوگ وضعداری کی وجہ سے کھلم کھلا نہیں پی سکتے تھے، انہوں نے کہا کہ اب جب سارے چوری سے پی رہے ہیں تو ہم بھی چوری سے پینے لگیں، تو پہلے پینے والے پچاس ہزار تھے، اب ایک لاکھ بن گئے۔ یہ گویا اس قانون کا نتیجہ نکلا۔ گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے کہا کہ یہ حکومت کے وقار کے خلاف ہے کہ اس قانون کو واپس لیا جائے۔ قانون جاری رہے اور پولیس داروگیر کرتی رہے تو قانون بھی چلتا رہا۔ اور شراب خوری بھی چلتی رہی۔ دونوں چیزیں اپنی جگہ رہیں۔ انسداد نہیں ہو سکا، بالکل شراب بند نہیں ہو سکی، پینے والے پیتے رہے، چوری سے پیتے رہے گویا وہ لاکھوں کروڑوں روپیہ اکارت گیا جو صرف کیا گیا تھا۔ جو پہلے صورت تھی وہی اب ہے بلکہ بری ہوگئی کہ چھپ چھپ کر لوگ پیتے ہیں ایک تو یہ واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ اور ایک دوسرا واقعہ سامنے رکھیے۔

انسدادِ جرائم میں اسلام کا طریق کار...... اسلام سے پہلے زمانہء جاہلیت میں شراب عام تھی، تمام عرب پیتے

تھے، شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، حتی کہ بچہ پیدا ہوتا تو پہلے اس کو شراب چٹاتے تھے۔ اتنی شراب عام تھی۔ اسلام آنے کے بعد بھی شراب رائج رہی، لوگ پیتے رہے۔ مسلم بھی ہیں اور پیتے بھی رہے۔ لیکن جب وقت آیا کہ شراب کو بند کیا جائے، تو ایکا ایکی حکم نہیں دیا گیا کہ روک دو، سب سے پہلے چیز یہ تھی کہ قلوب میں ایک سوال پیدا ہوا۔ قرآنِ کریم نے اس کو نقل کیا۔ ﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ﴾ ① اے پیغمبر! لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں'' ﴿قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ② آپ فرمادیں کہ جوئے اور شراب میں کچھ نفع ہے، کچھ نقصان ہے، مگر نقصان غالب ہے، نفع مغلوب ہے۔ نقصان زیادہ ہے نفع کم ہے۔

﴿اِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا﴾ ③ شراب اور جوے کا نقصان زیادہ ہے، نفع کم ہے۔ بس اتنی آیت نازل ہوئی، شراب پینے کی ممانعت نہیں فرمائی گئی، صرف اس کی مذمت بیان کی گئی، تو حدیث میں ہے کہ: بہت سے وہ خواص صحابہ رضی اللہ عنہم جو منشاءِ نبوّت کو سمجھتے تھے، انہوں نے آج ہی سے شراب ترک کردی کہ جب اللہ تعالیٰ نے نقصان بیان کیا ہے تو شراب پسند معلوم نہیں ہوتی۔

غرض بہت سے حضرات نے تو اسی دن ترک کردی تھی۔ لیکن کچھ لوگ پیتے بھی رہے۔ چند دن کے بعد ایک دوسرا حکم نازل ہوا۔ اور ایک دوسری آیت نازل ہوئی: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی﴾ ④ اے ایمان والو! شراب پی کر نشے کی حالت میں نماز مت پڑھو'' ۔ تو نمازوں کے اوقات میں شراب ممنوع قرار دی گئی۔ نمازوں کے اوقات کے سوا لوگ پیتے رہے، نماز کی حالت میں شراب پی کر جانا حرام قرار دیا گیا، گویا پانچ اوقات میں بندش ہوئی، باقی اوقات میں جائز ہوئی۔ اس آیت کے اترنے کے بعد ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم نے شراب ترک کردی کہ رخ یہ بتلا رہا کہ یہ ممنوع کی جائے گی، اللہ کو یہ پسند نہیں ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد تیسرا حکم نازل ہوا ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ ⑤ ''اے اہلِ ایمان! یہ شراب اور جوا، اور یہ فال نکالنے کے تیر و ترکش یہ شیطانی حرکتیں ہیں ان کے پاس بھی مت پھٹکو۔ آج مکمل طور پر شراب حرام ہوئی'' ۔ حدیث میں ہے کہ: جس دن یہ آیت نازل ہوئی ہے، جس کے گھر میں دس مٹکے تھے، اس نے وہ پھوڑ دیئے، جس کے ہاں ایک مٹکا تھا، اس نے وہ توڑ دیا، اور مدینے کی گلیوں میں، نالیوں میں شراب اس طرح بہتی پھر رہی تھی جیسے برسات میں پانی برستا ہے۔ ایک قطرہ کسی کے گھر میں باقی نہیں رہا۔

تو آپ نے فرق دیکھا کہ امریکہ نے کئی کروڑ کا بجٹ منظور کیا اور ثمرہ یہ نکلا کہ پینے والے دگنے ہوگئے، اسلام کے دور میں نہ بجٹ منظور ہوا، نہ ایک کروڑ کا، نہ ایک پیسے کا۔ ممانعت کا حکم بھی پوری طرح سے نہیں آیا کہ

---

① ② ③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۱۹.

④ پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۴۳. ⑤ پارہ: ۷، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۹۰.

لوگوں نے شراب کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ اور ایک ایک گھر پاک اور صاف ہو گیا۔

قانونِ حکومت اور قانونِ الٰہی کا فرق...... فرق کیا تھا؟ وہاں قانون کا دباؤ تھا، یہاں اللہ کا خوف تھا، خوفِ خداوندی آیا تو شراب کا استیصال ہو گیا اور جڑ کٹ گئی، وہاں قانونِ محض کا دباؤ تھا۔ تو قانونِ محض سے جرائم بند نہیں ہوا کرتے جب تک اپنے قلب میں اللہ کا خوف اور ڈر موجود نہ ہو۔ تو شریعتِ اسلام برائیوں اور منکرات سے بچانا چاہتی ہے، مگر دباؤ سے نہیں۔ اس کے ذریعے بچانا چاہتی ہے کہ خود تمہارے ضمیر کے اندر دباؤ پیدا ہو۔ ضمیر خود کہے کہ یہ بری چیز ہے۔ ہم اسے چھوڑنا چاہتے ہیں۔

حقیقتِ معصیت...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ''مَا الْإِثْمُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ.'' یا رسول اللہ، گناہ کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ شراب پینا گناہ ہے، زنا کرنا گناہ ہے، چوری کرنا گناہ ہے، یہ نہیں فرمایا۔ کیا فرمایا؟ ''مَا حَاکَ فِيْ صَدْرِکَ'' ① ''تم پوچھتے ہو گناہ کیا ہے؟ جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے وہ گناہ ہے۔ اسے ترک کر دو، جس کو تم کھلے بندوں نہ کر سکو، لوگوں کے سامنے کرتے ہوئے شرماؤ، سمجھ لو، وہ برائی ہے اور گناہ ہے، بس اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ گویا گناہ سے بچنے کا تعلق قلب سے رکھا گیا۔ مَاحَاکَ فِي صدرِکَ، جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کر دے، اس سے بچو۔ یہ نہیں کہا گیا جس سے پولیس روکے اس سے بچو، جس سے حکومت اور فوج روکے اس سے بچو، اس لئے کہ وہ منظرِ عام کی چیزوں سے روکیں گی، اور دل میں تمہارے کھوٹ رہا تو آنکھ بچا کے پھر تم وہی حرکت کرو گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دل پاک ہو۔ فقط ہاتھ اور پیر کے پاک ہونے سے کام نہیں چلتا۔

گورنمنٹ جب چور کو جیل میں بند کر دیتی ہے۔ وہ یقیناً اتنے دن چوری سے بچا رہے گا جتنے دن جیل میں رہے، لیکن اس کے قلب سے چوری کا جذبہ نہیں نکلتا، وہ اس ارادے میں ہے کہ جب چھوٹوں گا پھر آ کر وہی حرکت کروں گا۔ بلکہ بعض چور تو یہ کہتے ہیں کہ گھر ویسی اچھی روٹی نہیں ملتی جتنی آزادی سے جیل میں ملتی ہے، اس لئے ایک دفعہ پھر چوری کروں تاکہ بڑے گھر میں پہنچ جاؤں، بے محنت روٹی ملے گی۔ اسلام چاہتا ہے کہ قلوب پاک کئے جائیں، قانون فقط بدن کو پاک کرے گا، قلب کو پاک نہیں کرے گا، دنیوی حکومتوں کا قانون بدن پر نافذ ہوتا ہے، لیکن اللہ کا قانون دلوں پر نافذ ہوتا ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ حکام کی حکومت فقط ظاہر پر ہوتی ہے۔ اللہ کی حکومت باطن کے اوپر بھی ہے، اس کا قانون جیسے ظاہر کو روکے گا، ویسے باطن کی برائی کو بھی روکے گا، تو شریعت تو یہی چاہے گی کہ فقط یہ نہ ہو کہ تم زنا سے بچ جاؤ، یہ ہو کہ زنا کا خیال بھی نہ لاؤ، بلکہ یہ ہو کہ تمہارے قلب میں زنا سے اس طرح نفرت ہو جائے جس طرح نجاست سے نفرت ہوتی ہے، شراب خوری سے تمہیں اس طرح نفرت ہو جیسے پیشاب پاخانے سے نفرت ہوتی

① الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة، باب تفسير البر والاثم، ص: ۱۱۲۹، رقم: ۲۵۱۶.

ہے۔ یہ جب ہوگا۔ جب قلب پاک ہوگا۔

تربیت کا مرکزی نقطہ...... تو سب سے بڑی چیز اسلام میں ''تزکیہء قلوب'' یعنی دلوں کو پاک بنا دینا ہے تاکہ جذبات صالح پیدا ہوجائیں، برے جذبات مغلوب ہوجائیں۔ مطمئن ہوکر رہیں، اس لئے فرماتے ہیں کہ ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ﴾ ① فلاح وہ پائے گا جو اپنے نفس کو پاک کرے گا۔ یہ نہیں کہا کہ فلاح وہ پائے گا جو برائی چھوڑ دے گا اور برے عمل سے بچ جائے گا، عمل چھوڑ دیا مگر دل میں کرنے کی تمنا ہے۔ جبری طور پر اس نے چھوڑ دیا، صلاح اور فلاح پانے والا وہ ہے جس کا قلب پاک ہوجائے، اس میں برائی سے نفرت بیٹھ جائے۔ اور قلب خود یوں کہے کہ اس برائی کو مت کرو۔ اسی کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گناہ شراب اور زنا نہیں بلکہ ماحاک فی صدرک، جب تمہارا دل یوں کہے کہ یہ برائی ہے تو اس برائی کو چھوڑ دو، وہی فی الحقیقت برائی ہے، تو انسان کی پاکی کا دارومدار اس کے قلب کے اوپر ہے، قلوب صحیح ہوگئے تو قالب بھی صحیح ہوگیا، قلب فاسد ہیں تو قالب بھی فاسد ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وَفِی الْجَسَدِ مُضْغَةٌ اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ.'' ② انسان کے بدن میں گاجر کی شکل کا ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، جو بائیں طرف لٹکا ہوا ہے، وہ صحیح ہے تو سارا انسان صحیح ہے۔ وہ فاسد ہے تو سارا انسان فاسد ہے۔ فرمایا: ''اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ'' آگاہ ہوجاؤ، وہ انسان کا قلب ہے، اگر آپ کا دل درست ہے تو بدن بھی درست ہے اور دل میں کھوٹ ہے تو سارے بدن میں کھوٹ ہے۔

اس لئے کہ دل ہی کے حکم سے آپ برا یا اچھا عمل کرتے ہیں۔ دل میں خیال آتا ہے، خیال سے ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ ارادے سے عمل ظاہر ہوتا ہے، اگر قلب میں فساد ہے تو خیالات بھی برے پیدا ہوں گے۔ برے خیالات سے برے ارادے پیدا ہوں گے۔ برے ارادوں سے اعمال بھی برے سرزد ہوں گے، اس لئے شریعت چاہتی ہے کہ بجائے اس کہ تم ہاتھ پیر کو مانجھو، دھوؤ اور صاف کرو، تم قلب کو کیوں نہیں دھوتے، اس کو اگر تم نے دھولیا اور پاک کرلیا، تو سارا بدن خود بخود پاک ہوجائے گا۔

تطہیر قلب...... اور قلب کی پاکی ذکر اللہ کی کثرت اور اللہ کے خوف کا مراقبہ کرنے سے ہے کہ آدمی سوچے، بہر حال ایک وقت مجھے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اپنی زندگی کا جواب دینا ہے۔ میں کیا جواب دوں گا۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے دنیا میں کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کی حجت میں نے پہلے تلاش نہ کرلی ہو، تاکہ اللہ کے سامنے کہہ سکوں کہ فلاں بات فلاں حجت سے کی۔ محض نفسانی جذبہ سے نہیں کی تھی۔ تو قلب حجت تلاش کرلے کہ جو بھی کرو، اس کی کوئی ایسی قابل قبول وجہ ہو کہ اللہ کے سامنے عرض کرسکو، کہ یہ وجہ پیش آئی۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الشمس، الآیۃ: ۹.

② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب من استبرأ لدینہ، ج: ۱، ص: ۲۸، رقم: ۵۲.

تو اللہ سے زیادہ عذر کا سننے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی سچا عذر لے کر پہنچیں گے، یقیناً آپ کی بات مانی جائے گی۔

کسی بھی گناہ کے کرنے پر یہ نہیں کیا جائے گا کہ ایک دم سزا دے دی جائے، اور جہنم میں جھونک دیا جائے۔ پوچھا جائے گا، اس کو کیوں کیا۔؟ کوئی عذر تمہارے پاس ہے۔؟ اگر کوئی معقول عذر بیان کیا، معاف کیا جائے گا، کوئی عذر آدمی بیان نہ کر سکا، اور واضح ہو گیا کہ محض شقاوتِ نفس سے کیا ہے، اس وقت سزا جاری کریں گے، اس لئے آپ جو چیز کریں پہلے اس کی حجت تلاش کریں، اور حجت جب تلاش کریں گے جب قلب میں صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ٥ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ ① اصلاح اور فلاح وہ پائے گا جس نے اپنے قلب کو پاک کر لیا"۔ بدن کی پاکی کافی نہیں ہے۔ کپڑوں کی پاکی کافی نہیں ہے۔ اصل پاکی دل کی ہے۔ وہ پاک ہے تو آپ بدن کو بھی پاک کریں گے کپڑوں کو بھی پاک کریں گے۔

درجاتِ معصیت ...... بہر حال فرمایا گیا: "اِیَّاکُمْ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ." " گناہوں سے تو بچو، مگر چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بہ نسبت بڑے گناہوں کے بہت زیادہ بچو، یہی بڑے گناہ تک پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس واسطے شریعتِ اسلام نے گناہ کے دو درجے رکھے ہیں۔ ایک صغیرہ، ایک کبیرہ، مقصود کا درجہ وہ تو کبیرہ ہے اور وسائل کا درجہ صغیرہ کا ہے۔ زنا کا فعل یہ تو کبیرہ گناہ ہے، اور عورت پر نگاہ ڈالنا، تاک جھانک کرنا، اور اس کے پیچھے چلنا یہ صغائر ہیں۔

درجاتِ توبہ ...... اگر کبیرہ سے بچ گیا، تو صغیرہ گناہ نیکیوں سے خود بخود معاف ہو جاتے ہیں: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ ② نیکیاں بدیوں کو خود مٹا دیتی ہیں۔ انسان جب نیکی کرے گا، جتنے صغیرہ گناہ ہیں، کبیرہ سے بچنے کی وجہ سے وہ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ مگر کبیرہ معاف نہیں ہو گا جب تک آدمی توبہ نہ کرے، بلا توبہ کے اس کی گرد انسان کے قلب سے نہیں دھل سکتی۔

اور اس میں بھی اگر کبیرہ گناہ کیا اور اس میں مخلوق کی حق تلفی کی، وہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہو گا۔ جب تک وہ خود صاحبِ حق معاف نہ کرے۔ اللہ کی آپ چوری کریں گے تو انسان ہے، توبہ سے معاف ہو جائے گی۔ لیکن بندوں کی چوری کریں ہزار بار آپ توبہ کریں معاف نہیں ہو گی، جب تک اس کا مال اس کو واپس نہ دے دیں جس کا مال چرایا ہے۔ اگر کسی کو گالی دی ہے ہزار توبہ کریں معاف نہیں، جب تک وہ معاف نہ کر دے جس کو آپ نے ناحق گالی دی ہے۔ تو گناہ دو ہیں صغیرہ اور کبیرہ۔ تو صغیرہ معاف ہو جاتا ہے جب آدمی کبیرہ سے بچ جائے، اور کبیرہ توبہ سے معاف ہو جاتا ہے۔ اور وہ کبیرہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا جس کا تعلق مخلوق سے ہو۔ جب تک اس کو صاحبِ حق سے معاف نہ کرائے۔

قانونی سزا ...... مثلاً زنا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس میں آدمی تین گناہ کرتا ہے اور تین کی حق تلفی کرتا ہے، چنانچہ زنا کرنے والے نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حق تلفی کی، اس نے حکم دیا تھا کہ زنا مت کرو، اس نے کیا تو

① پارہ: ۳۰، سورۃ الشمس، الآیۃ: ۹، ۱۰۔ ② پارہ: ۱۲، سورۃ هود، الآیۃ: ۱۱۴۔

خلاف ورزی کی۔ایک گناہ تو یہ ہوا کہ اس نے قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کی۔دوسرا اس نے پبلک کا گناہ کیا کہ امن اٹھادیا اور ایسا راستہ پیدا کر دیا کہ لوگ زنا کرتے پھریں۔تو یہ پبلک کا گناہ کیا۔

تیسرا گناہ اپنے نفس کا کیا کہ لازم تھا کہ نفس کو اس برائی سے پاک بناتا۔اس نے زنا کر کے اپنے قلب کو، نفس کو، بدن کو، سب کو آلودہ کیا اور ملوث کیا۔تو ایک خدا کی حق تلفی کی۔ایک عوام کی حق تلفی کی۔اور اپنے نفس کی حق تلفی کی، توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنے حق کو اگر چاہیں گے تو معاف کر دیں گے۔لیکن یہ جو نفس میں گندگی بیٹھی ہوئی ہے اور یہ جو پبلک کا نقصان کیا ہے، یہ توبہ سے ختم نہیں ہوں گے، جب تک سنگسار نہ کیا جائے اور رجم نہ کیا جائے، اس کے بعد حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر توبہ کرنی ضروری ہے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تو کہتے ہیں کہ حدِ زنا جاری کر دی گئی، سنگسار کر دیا گیا، گناہ معاف ہو گیا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ معاف نہیں ہوا۔سنگسار کر دینے سے جو پبلک کی حق تلفی کی تھی وہ ختم ہو گئی، لیکن اللہ کی جو حق تلفی کی تھی وہ ابھی باقی ہے۔وہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہو گی۔اور نفس کی جو حق تلفی کی تھی وہ اس کے بغیر معاف نہیں ہو گی، کہ آدمی آئندہ کے لئے عہد کرے کہ میں پھر اس حرکت بد سے بچوں گا۔

بہر حال حدودِ شرعیہ کی قانونی سزا بھی جاری ہو گی اور ساتھ ساتھ توبہ بھی ضروری ہے۔اس قسم کے جرائم میں ایک انسان بہت سی حق تلفیاں کرتا ہے، خدا کی حق تلفی الگ، عوام کی حق تلفی الگ، ملک کی الگ، اور اپنے نفس کی الگ۔تو توبہ سے خدا کا گناہ معاف ہو گا، حد جاری کرنے سے وہ گناہ معاف ہو گا جو پبلک کا ہے۔وہ جو اس نے بدامنی کا راستہ ڈال دیا تھا، حد جاری کرنے سے امن قائم ہو گا۔

نسخۂ تطہیر......مگر دیکھا جائے تو تینوں کا تعلق قلب ہی سے ہے۔اگر قلب میں پاکی نہیں ہے۔تو انسان نہیں بچے گا، اگر قلب میں پاکی ہے تو بے شک بچ جائے گا۔اس واسطے سب سے زیادہ ضروری قلب کو صالح بنانا ہے، اس کے لئے شریعت نے ذکر اللہ کا نسخہ تجویز کیا ہے کہ یادِ خداوندی ہمہ وقت تمہارے سامنے رہے، جتنا اللہ کی یاد سامنے ہو گی، اتنا ہی خوفِ خدا دل میں بیٹھے گا، اتنا ہی آدمی جرائم سے بچنے کی کوشش کرے گا اور ذکر کی بجائے جتنی غفلت پیدا ہو گی، اتنی ہی معاصی اور گناہوں کی کثرت ہو گی۔اس لئے بنیادی چیز یہ بتلائی گئی: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ① یادِ خداوندی اپنے اندر پیدا کرو۔"

ذکرِ معاشرت......اور ہمہ وقت یاد ہو۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی کہ: "كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ." ② ہر دم اور ہر لحہ آپ ذکر اللہ کرتے تھے۔امت کو بھی ایسا ہونا چاہئے۔لیکن آپ یہ کہیں گے کہ ہر وقت کس طرح ذکر کریں۔دکان پر بھی جانا ہے، تجارت بھی کرنی ہے، زراعت بھی کرنی ہے، بال بچوں میں بھی رہنا

① پارہ:۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ:۲۸.

② السنن لابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب فی الرجل یذکر اللہ علی غیر طھر ص:۱۲۴، رقم:۱۸.

ہے۔ ہروقت ذکر کرتے رہیں، یہ بظاہر محال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو یہ سارے کام کریں پھر بھی آپ ہروقت ذکر اللہ کر سکتے ہیں۔ ایک تو ذکر اللہ عرفاً ذکر ہے جیسے صبح وشام ایک ایک تسبیح پڑھی، یا نمازیں پڑھیں، یہ تو ذکر ہی ہے دوسرے اوقات میں، بال بچوں میں، دکان پہ جاتا ہو، اس میں ذکر کی صورت یہ ہے کہ آپ دوکان پر جائیں، یہ نیت کر کے جائیں کہ میں اس لئے جارہا ہوں کہ چار پیسے ہاتھ لگیں تاکہ بال بچوں کی پرورش کروں، یہ حکم خداوندی ہے، تو میں تعمیل حکم کے لئے جارہا ہوں، اپنے نفس کے حظ کے لئے نہیں جارہا، اطاعت خداوندی کے لئے جارہا ہوں۔ زراعت کرنے والا زراعت کرے اور یہ نیت کرے کہ چار دانے پیدا ہوں گے، بچوں کو بھی کھلاؤں گا مخلوق کی بھی خدمت کروں گا، خدا کی مخلوق کی پرورش کروں گا یہ سب ذکر اللہ میں داخل ہو جائے گا، اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ بازار اور کھیت چھوڑ کے مسجد میں آکے تسبیح لے کر بیٹھیں، اسی بازار اور کھیت میں نیت کرلیں۔ اسی طرح سے ہر معاشرت کی چیز عبادت بن جاتی ہے اور اجر وہی ملتا ہے جو عبادت پہ ملتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کھانا کھانے کے لئے بیٹھتا ہے، ابتداء میں بسم اللہ کہے اور اخیر میں الحمد اللہ کثیرا۔ فرماتے ہیں جب اس طرح سے اول وآخر میں ذکر کے ساتھ کھانا کھائے گا۔ ''غُفِرَ لَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ.'' اس کے اگلے پچھلے گناہ سب بخش دیئے جائیں گے۔

تو یہ کھانا، کھانا ایک معاشرتی فعل ہے۔ مگر مغفرت گناہوں کی ہو رہی ہے جیسے نماز پر ہوتی ہے، ذرا سی نیت اور فکر کے بدلنے سے مغفرت مرتب ہوگئی۔ حدیث میں ہے کہ: ''مَنْ قَادَ اَعْمٰی غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ.''① جس نے اندھے کو راستہ دکھا دیا، جتنے اس کے صغیرہ گناہ ہیں، بخش دیئے گئے''۔

اندھے کو راستہ دکھایا بظاہر کوئی نماز، روزہ نہیں کیا، لیکن ثمرہ وہی مرتب ہوا جو عبادت پر مرتب ہوتا تھا، اس لئے کہ نیت صحیح تھی۔ اسی طرح سے بہت سے اعمال فرمائے گئے ہیں جو معاشرتی ہیں لیکن اجر وثواب ان پر طاعت وعبادت کا ملتا ہے، چوں کہ وہ ذکر بن جاتے ہیں، اس لئے کہ نیت صحیح ہوتی ہے۔

ذکر دائمی...... آپ سے یہ نہیں کہا جارہا کہ نماز روزہ سے فارغ ہو کر آپ مسجد ہی کے اندر بقیہ سارے اوقات بیٹھے رہیں، یا ہمہ وقت ذکر کرتے رہیں۔ یہ نہیں۔ بلکہ دنیا کا جو کام ہو، نیت درست کرلو، اتباع سنت کرو، وہ سب ذکر میں شامل ہوتا جائے گا، تو آپ بھی ہمہ وقت ذکر اللہ کرنے والے بن گئے، جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ وقت ذکر فرماتے تھے، تمہیں بھی یہ مقام میسر آسکتا ہے۔

اسی طرح شریعت نے مختلف اوقات کی کچھ دعائیں بتلائی ہیں۔ انہیں یاد کرلو اور پڑھ لو تو پورے اوقات ذکر میں مشغول سمجھے جائیں گے، سورج نکلتے وقت یہ دعاء، لباس پہنتے ہوئے یہ دعا پڑھ لی، استنجاء کو گئے تو یہ دعا پڑھ

① علامہ عجلونی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواہ الخطیب عن ابن عمرؓ قال المناوی: وفیه عبدالباقی بن قانع، اوردہ الذھبی فی الضعفاء دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۷۹.

لی، بھائیوں سے مصافحہ کیا تو یہ دو جملے پڑھ لئے، یہ سب اذکار ہیں، ان کی عادت ڈالی جائے تو پوری زندگی ذکر اللہ میں گزر جائے گی۔ غرض ذکر اللہ ہمہ وقت ہونا چاہئے، اور ہمہ وقت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی سب کھانے پینے کو چھوڑ دے، سب کاروبار چھوڑ دے، اس کھانے پینے ہی کو ذرا سی نیت کی تبدیلی سے ذکر بنائے تو پورے اوقات ذکر میں صرف ہو جائیں گے، اس سے قلب میں صفائی پیدا ہوگی، قلب میں جلا پیدا ہوگی۔

تمرینِ ذکر...... اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ آپ اس کی مشق کر کے عادت ڈالیں کہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کوئی نہ کوئی اللہ کا نام زبان پر رہے، اوپر چڑھنے لگیں تو "اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہنا شروع کر دیا، نیچے اترنے لگیں تو "سُبْحَانَ اللّٰہِ سُبْحَانَ اللّٰہِ" کہنا شروع کر دیا۔ کوئی تعجب کی بات پیش آئی، آپ کہنے لگے "سُبْحَانَ اللّٰہِ" کیسی عجیب بات ہے، آپ نے کسی چیز کی قدر بڑھائی تو کہا "مَاشَاءَ اللّٰہُ." اس کی اگر آپ عادت ڈالیں تو ابتداء میں تو ذرا تکلّف ہوگا اور آپ کو تکلیف ہوگی۔ لیکن جب عادت پڑ جائے گی تو بے ارادہ بھی زبان پر ہر وقت۔ اللہ کا نام جاری ہو جائے گا، عارفین اسی کی مشق کراتے ہیں، ابتداء میں ذرا سا تکلّف ہوتا ہے۔ اخیر میں وہ چیز بے ساختہ جاری ہو جاتی ہے۔

دوامِ ذکر کا ثمرہ...... اور اس کا ثمرہ کیا نکلتا ہے۔؟ پوری زندگی میں جب ذکر کی عادت پڑ گئی اور بلا اختیار زبان پر جاری ہوا تو مرتے وقت بھی اللہ ہی کا نام زبان پر جاری ہوگا، خاتمہ صحیح ہو جائے گا، اس خاتمے کے صحیح کرنے کے لئے یہ ساری جدوجہد اور محنت ہے کہ وہ آخری دم درست ہو جائے۔ "مَنْ کَانَ اَوَّلُ کَلَامِہٖ وَ اٰخِرُ کَلَامِہٖ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ." ① تو جیسے حدیث میں ہے کہ: اوّل کلام اور آخر کلام جس کا "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" بن گیا ہے، وہ شخص جنتی ہے۔ یہ آخر کلام "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کب ہوگا؟ جب زندگی میں خدا کا نام لینے کی مشق ہوگی۔

چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا: "تُحْشَرُوْنَ کَمَا تَمُوْتُوْنَ وَ تَمُوْتُوْنَ کَمَا تَحْیَوْنَ." ② تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئے گی، اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر تم نے زندگی گزاری ہے۔

غرض زندگی جس حالت میں گزاری ہے، موت [illegible] حالت پر آئے گی، اور جس حالت پر موت آئے گی میدانِ محشر میں اسی حالت پر آپ اٹھیں گے، اگر کسی نے زندگی میں یادِ خداوندی کی مشق کی ہے، یقیناً مرتے وقت قلب میں اللہ کی یاد ہوگی، اور زبان پر اللہ کا نام جاری ہوگا۔ اور جب قبر سے اٹھے گا۔ تو وہی کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھے گا جو کلمہ پڑھتے ہوئے انتقال کر گیا تھا۔ حدیث میں ہے کہ اگر ایک حاجی لبیک لبیک کہتے ہوئے مر گیا ہے، جب قبر سے اٹھے گا تو اس کی زبان پر لبیک جاری ہوگا اور یہ سمجھتے ہوئے اٹھے گا کہ میں میدانِ عرفات میں ہوں۔ مگر زبان پر لبیک جاری ہوگا۔ اسی طرح سے جو کلمہ آدمی زبان پر جاری کرلے اور اللہ کے نام کی مشق کرتا رہے، اللہ کا وہی نام

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی التلقین، ج:۸ ص:۳۷۶. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج:۷ ص:۱۱۶ رقم: ۳۱۱۶. ② مرقاۃ، کتاب الرؤیاء، الفصل الاول ج:۱۳ ص:۳۷۷.

خاتمہ کے وقت بھی نکلے گا، اور وہی نام لیتا ہوا آدمی میدانِ محشر میں اٹھے گا۔

قبر وحشر میں ذکر کا محافظتی کردار...... یہی اذکار یہی کلمات اس کے لئے سنتری اور محافظ بنیں گے۔ حدیث میں ہے کہ: جب آدمی قبر سے اٹھے گا تو "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اس کے آگے آگے ہوگا۔ "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" سر کے اوپر ہوگا، "سُبْحَانَ اللّٰهِ" اس کے دائیں طرف ہوگا۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" اس کی بائیں جانب ہوگا "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" اس کی پشت کی جانب ہوگا، اور یہ کلمات چاروں طرف سے گھیر کر آدمی کو اپنی حفاظت میں لے کر میدانِ محشر میں لے چلیں گے، ہر طرف سے عذاب سے بچائیں گے۔

حدیث میں ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹا دیا جاتا ہے تو سر کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے، اگر سر میں قرآنی آیات محفوظ ہیں جنہیں وہ یاد کرتا رہا تھا، وہ آیتیں کھڑی ہو جاتی ہیں کہ خبردار ادھر سے مت آنا۔ دائیں جانب سے عذاب بڑھتا ہے تو حدیث میں فرمایا گیا: "اَلصَّلٰوةُ بُرْهَانٌ." ① نماز انسان کی دستاویز ہے، وہ دائیں جانب سے عذاب کو روک دیتی ہے۔ بائیں جانب سے عذاب بڑھتا ہے تو روزے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ: "اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ" ② روزہ انسان کے لئے ڈھال ہے، بائیں جانب ڈھال کر کے ہی وار کو روکتے ہیں اور اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں۔ پیروں کی جانب سے عذاب بڑھے گا تو حدیث میں ہے کہ صدقات اور زکوٰۃ عذاب کو روکنے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے، کیوں کہ یہ انسان کی چلت پھرت کی کمائی ہے، اس لئے پیروں کی طرف سے عذاب کو روکتی ہے۔ غرض قبر میں بھی اگر عذاب کو روکنے والی کوئی چیز ہوگی تو وہ ذکر اللہ ہوگا۔ میدانِ محشر میں بھی اگر آبرو کے ساتھ انسان کو کوئی چیز لے جائے گی اور بڑھائے گی، وہ بھی ذکر اللہ ہوگا اور اللہ کا نام ہوگا۔ جو خاتمہ اچھا کرے گی وہ بھی انسان کا ذکر اور یادِ خداوندی ہوگی۔ ③

مدارِ محافظت...... مگر سب کچھ جب ہی ہوگا جب زندگی میں ذکر اللہ کی مشق کی ہوگی، اگر زندگی میں غفلت رہی ہوگی، تو موت کے وقت بھی قانوناً غفلت ہی ہوگی۔ ویسے اللہ جانتا ہے کس کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔ مگر حشر میں وہ چیزیں سامنے آئیں گی جن کو جزوِ نفس بنالیا تھا۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: میت کو جب قبر میں لٹاتے ہیں اور منکر نکیر سوال و جواب کے لئے آتے ہیں اور اس میں روح ڈالی جاتی ہے اسے یوں نظر آتا ہے کہ آفتاب نکلا ہوا ہے مگر غروب ہونے کے قریب ہے۔

"يَتَمَثَّلُ لَهُ الشَّمْسُ" آفتاب کی صورتِ مثالی سامنے ہوتی ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ پر زردی چھا چکی ہے اور مغرب کا وقت بالکل قریب ہے۔ ملائکہ سوال کرتے ہیں۔

---

① ② السنن للترمذی، کتاب الجمعة، باب ماذکر فی فضل الصلوة، ج: ۳، ص: ۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی ج: ۲ ص: ۱۱۴ رقم: ۶۱۴.

③ السنن للترمذی، ابواب الجمعة، باب ما ذکر فی فضل الصلوة، ص: ۱۷۶ رقم: ۶۱۴.

''مَنْ رَّبُّکَ ''؟ تیرا رب کون ہے؟ تو میت جواب دیتی ہے۔''دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ۔ ''① میاں، پرے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو، میرا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ نماز قضاء ہو جائے گی۔۔ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے، اس سے رب کا کیا سوال کرنا ہے جو رب میں اتنا فنا ہے کہ یہاں بھی نماز پڑھنے کو تیار ہے، اس سے کیا پوچھتے ہو کہ تیرا رب کون ہے۔

دوسرا کہتا ہے کہ ہمیں تو ڈیوٹی انجام دینی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جواب سچا دے گا، مگر پوچھنا ہمارا فرض ہے۔ تو یہ جواب دینا کہ ''دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ'' پرے کو ہٹو، مجھے نماز پڑھنے دو۔ یہ کون کہے گا۔ جو دنیا میں مشق کر چکا ہوگا کہ میری نماز قضا ہونے نہ پائے وقت پہ ادا ہو۔ اور اگر دنیا میں وقت گزارتے جاتے ہیں۔ وہ ادا چھوڑ قضا چھوڑ سرے سے پڑھتا ہی نہیں، وہ وہاں ''دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ ''نہیں کہے گا، اس لئے کہ اسے نماز کی عادت ہی نہیں۔ غرض زندگی میں جو عادت ڈالی جائے گی، وہی عالم قبر اور عالم حشر میں قائم رہے گی اور وہی ذریعہ نجات بنے گی۔

ذکر اللہ کے دو اجزاء...... اس واسطے اتباع شریعت، ذکر اللہ، اور یادِ خداوندی اس زندگی میں رکھی جائے اور اس کے دو جز ہیں۔ ایک منکرات سے بچنا اور ایک معروفات پر عمل کرنا، ایک امر پر عمل کرنا، ایک نہی پر عمل کرنا، اس میں مقدّم یہ ہے کہ منکرات سے بچا جائے، جن چیزوں کو شریعت نے گناہ قرار دیا ہے اور جن چیزوں کو کبیرہ اور صغیرہ کہا ہے ان چیزوں سے بچنے کی کوشش کی جائے، تو یہ مامورات پر عمل کرنے کا ذریعہ بنیں گی، احکام شرعیہ کے اتباع کرنے کا ذریعہ بنیں گی۔ اور جو منکرات سے نہیں بچتا اسے نیکی کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ اگر توفیق ہوتی ہے تو نیکی اپنا اثر نہیں دکھلاتی، اس لئے کہ مضر چیزیں، استعمال میں آرہی ہیں۔ اس مجموعے کو کہ نیکی کو کرنے لگے اور بدی سے بچنے لگے، اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''تزکیہ'' ہے کہ اس نے اپنے نفس کو پاک بنالیا۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ ② اس انسان نے جس نے بدی چھوڑ دی، نیکی اختیار کی، اتباع شریعت اختیار کیا اور محرّمات، مکروہات اور ممنوعات کو چھوڑ دیا، تو اس نے اپنے نفس کو پاک بنالیا۔ وہ صلاح وفلاح کی منزل تک پہنچ گیا۔ ان آیات کے شروع میں فرمایا گیا ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ٥ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ ③ ''اس ذات کی قسم جس نے نفس کو صحیح صحیح بنایا، اس میں الہام کیا فجور کا بھی اور تقویٰ کا بھی''۔

نیکی کا بھی جذبہ ڈالا اور بدی کا بھی جذبہ ڈالا تا کہ دونوں کے ٹکراؤ سے انسان ترقی کرے۔ یہی چیز میں نے ابتداء میں عرض کی تھی کہ ان آیات میں بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے کہ انسان میں نیکی اور بدی دونوں کے مادّے ہیں۔ بدی بچنے کے لئے ہے، نیکی کرنے کے لئے ہے۔ دونوں کو ملا کر انسان میں ترقی کا مادّہ پیدا ہوتا ہے اور صلاح وفلاح کی منزل سامنے آجاتی ہے۔ یہ گویا آیات کا اجمالی خلاصہ ہے، تفصیلات بہت ہیں مگر اس کے لیے

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر القبر والبلى ١٢/٣٢٥ رقم: ٤٢٦٢. حدیث حسن ہے دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابن ماجه ج: ٩ ص: ٢٦٢ رقم: ٤٢٦٢. ② پاره: ٣٠، سورة الشمس، الآية: ٩، ١٠.

③ پاره: ٣٠، سورة الشمس، الآية: ٧، ٨.

وقت نہیں ہے،اس لئے اجمالی طور پراصول عرض کردیا۔اوراس اصول کی قدرے تشریح عرض کردی۔دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کے امتثال کی اور بدیوں سے بچنے کی توفیق عطاءفرمائیں۔(آمین)

دعاء......"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً. اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ' اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا بِالْخَيْرِ. وَ اخْتِمْ لَنَا بِالْخَيْرِ. اَللّٰهُمَّ نَسْئَلُكَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ وَنَعُوْذُبِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهٖ. اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَخَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ."

تنبیہ...:...ایک مسئلہ سن لیجئے۔بعض لوگوں کو عادت ہوتی کہ وہ وعظ میں بیٹھتے ہیں مگر کچھ وظیفہ بھی پڑھتے رہتے ہیں۔یہ مکروہ ہے۔آدابِ درس اور وعظ کے خلاف ہے۔وعظ سننا یہ خود مستقل طاعت وعبادت ہے۔یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی نماز بھی پڑھے اور ساتھ میں دوسروں کو پیسے بھی تقسیم کرے،تو نہ نماز ہوگی نہ پیسے ہی صحیح تقسیم ہوں گے،تو آدابِ مجلس وعظ کے یہ چیز خلاف ہے۔ہر شخص کا فرض ہے جو مجلس میں بیٹھے وہ استماع کرے اور سننے کی طرف توجہ کرے اوران چیزوں کو قلب میں اتارنے کی فکر کرے جو کہی جارہی ہیں۔اوراگر وظیفے کا ضروری وقت ہے تو دوسرے مقام پر جاکراپنا وظیفہ پڑھے،اس مجلس میں نہ بیٹھے۔"وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ."

(محررہ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ بروز جمعۃ المبارک)

جواہرِ انسانیت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّابَعْدُ! فَقَدْقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ إِلَّا الْعَالِمُوْنَ، وَالْعَالِمُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ إِلَّا الْعَامِلُوْنَ، وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ إِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ، وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰى خَطَرٍ عَظِيْمٍ أَوْكَمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت ...... بزرگانِ محترم! یہ جلسہ سیرت کے نام پر منعقد کیا گیا ہے۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ بیان کی جائے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی جائے تا کہ سیرت کے مختلف گوشوں سے لوگ آشنا ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ درحقیقت ایک ذات یا ایک شخصیّت کی سیرت نہیں ہے بلکہ یہ پورے عالم انسانیت اور پورے عالم بشریت کی مقدس سیرت ہے۔ دنیا میں بہت سی ذوات ایسی گزری ہیں جو ایک ایک جماعت کے قائم مقام ہوتی ہیں یعنی پوری جماعت مل کر جن کمالات کا سبب بنتی ہے۔ بعض دفعہ حق تعالیٰ وہ سارے کمالات کسی ایک شخصیّت میں جمع کر دیتے ہیں۔ بعض شخصیتیں وہ ہیں کہ جماعتوں کی نہیں بلکہ پوری پوری اقوام کے قائم مقام ایک شخصیّت ہوتی ہے۔ اور بعض شخصیتیں پوری ملّت اور امّت کے قائم مقام ہوتی ہیں۔ یعنی پوری ایک امت میں جو کمالاتِ علم وعمل کے جمع ہوں وہ ایک ذات میں جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿إِنَّ إِبْرٰهِيْمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا﴾ ① ابراہیم علیہ السلام پوری ایک امت ہیں۔ یعنی ایک عظیم ترین امت میں جو اخلاق وکمالات جمع ہو سکتے ہیں وہ ایک ذاتِ واحد میں اللہ نے جمع کر دیئے۔ تو آپ اندازہ کیجئے کہ جو ذاتِ بابرکات ملّتِ ابراہیمی کی تکمیل کرنے کے لئے آئے، وہ ذاتِ بابرکات کتنی عظیم ہوگی۔ وہ ایک امت نہیں بلکہ دنیا کی ساری امتوں کی جگہ وہ ایک ذاتِ واحد ہوگی اور جو ساری امتوں اور اقوام میں مل کر کمالات

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۲۰۔

جمع ہیں وہ تنہا ایک ذاتِ واحد میں ہوں گے اور وہ ذات ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

سیرتِ انسانیت...... تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت درحقیقت مکمل انسانیت کی سیرت ہے۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس سیرتِ مقدسہ کے بیان کرنے سے پہلے انسانیت کی سیرت پر گفتگو کروں کہ انسان کسے کہتے ہیں؟ اور اس کی سیرت کے اجزاءِ ترکیبی کیا ہیں؟ اگر وہ سمجھ میں آگئے تو جو ذاتِ بابرکات پورے عالم انسانیت کی عظیم اور متوازی ہے۔ اس کی سیرت خود بخود سمجھ میں آجائے گی۔ اس لئے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث تلاوت کی ہے جس میں خود اجزائے ترکیبی بیان کئے گئے ہیں کہ انسان کسے کہتے ہیں؟ انسان کے معنی کیا ہیں؟

مادّۂ انسان کے تخلیقی مراحل...... اسے آپ اس طرح سمجھیں کہ انسانیت کو یا انسان کو جو کچھ فوقیت یا عظمت یا شرف حاصل ہے۔ وہ انسانی مادّے کی وجہ سے حاصل نہیں ہے۔ انسان کی تمام کائنات پر جو کچھ بزرگی، بلندی اور برتری ہے وہ اس کے مادّے کی وجہ سے نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسانی خلقت کے مادّے جہاں بھی قرآنِ کریم نے ذکر کئے ہیں وہ نہایت ہی گندے اور نجس مادّے ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان کو کوئی فوقیت یا فضلیت حاصل ہو۔ یہ نہیں۔

کہیں انسان کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾ ① ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ اور کہیں فرماتے ہیں ﴿خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ ہم نے انسان کو گندے قطرے سے پیدا کیا، کہیں فرماتے ہیں ﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ ② کیا ہم نے تمہیں ایک ذلیل پانی سے پیدا نہیں کیا؟ اور کہیں فرماتے ہیں. ﴿خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ ③ ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا"۔

تو کہیں مٹی، کہیں نطفہ، کہیں سڑا ہوا ہو گارا اور کہیں ذلیل پانی۔ یہ انسان کی پیدائش کے ذلیل مادّے ذکر کئے ہیں، تو جن میں خود ذلت اور خود گندگی موجود ہے۔ ان مادّوں کی وجہ سے انسان کو کیا شرافت اور فضیلت حاصل ہو سکتی تھی۔ ایک موقع پر قرآنِ عظیم نے ان سب مادّوں کو یکجا طور پر جمع کر کے ذکر فرمایا ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ٥ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ٥ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ، ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ ④ "ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا، پھر اس کو نطفے کی شکل دے کر رحمِ مادر میں پہنچایا، پھر ہم نے نطفے کو خون کی شکل میں تبدیل کر دیا، پھر خون کی ہم نے ایک منجمد پھٹک بنادی۔ پھر اس کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنادیا پھر اس میں ہم نے ہڈیاں پیدا کیں اور کھال بھردی۔ اور پھر اس کی ایک اور خلقت تیار کی"۔

تخلیقِ انسان کا پہلا مرحلہ...... تو یہاں ترتیب وار چند مادّوں کا ذکر کیا گیا مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ ظاہر

① پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۲. ② پارہ: ۲۹، سورۃ المرسلات، الآیۃ: ۲۰
③ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۲۶. ④ پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۲، ۱۴.

بات ہے کہ مٹی کے اندر کون سی چمک دمک ہوتی ہے مٹی تو وہ ہے جس کو ذلول کہا گیا۔ ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا﴾ ① اس مٹی کو ہم نے تمہارے سامنے ذلیل کر دیا، پست بنا دیا۔ تو بیچاری پامال ہوتی ہے جوتیوں سے آپ اس کو روندتے ہیں لیکن یہ اف نہیں کر سکتی تو اس کے عجز اور درماندگی کا یہ عالم ہے کہ اس میں کوئی چمک اور نورانیت نہیں۔ کوئی خوبصورتی نہیں ہے۔ یہ گویا انسان کی پیدائش کا ابتدائی مادہ ہے۔

تخلیقِ انسان کا دوسرا مرحلہ...... اس کے بعد آگے ترقی کر کے فرمایا ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ﴾ ② پھر ہم نے اس کو نطفہ بنا کر رحمِ مادر میں ٹھہرایا۔ تو یہ اور زیادہ گندگی کے اندر ترقی ہوئی۔ اس لئے کہ مٹی ناپاک تو نہیں تھی۔ بہت سے بہت کوڑا کباڑ کی کثافت تھی۔ کپڑے پر لگ جاتی تھی تو دھوتے تھے، بدن پر پڑ جاتی تھی تو آدمی غسل کر کے بدن صاف کر لیتا تھا۔ تو کثافت تھی مگر نجاست نہیں تھی۔ بلکہ ایک حد تک مطہر بھی ہے۔ یعنی دوسروں کو پاک کرنے والی بھی ہے۔ اگر پانی نہ ملے تو تیمّم کی اجازت ہے، مٹی، پانی کے قائم مقام ہو جاتی تھی۔ غرض خود بھی پاک ہے اور دوسروں کو پاک بنا دیتی ہے صرف اتنی بات تھی کہ ایک کرکٹ اور کوڑا تھا جو بدن پر پڑ جائے یا کپڑوں پر تو دھونے کی صورت پیش آتی تھی۔

تخلیقِ انسان کا تیسرا مرحلہ...... لیکن جب اس کو نطفے کی شکل میں منتقل کیا تو ناپاکی پیدا ہو گئی۔ غلاظت اور کثافت کے ساتھ ساتھ نجاست بھی پیدا ہو گئی۔ اور اس درجے کی کہ اگر یہ قطرہ خارج ہو تو قرآن کریم پڑھنے کے قابل آپ نہیں رہتے۔ مسجد میں جانے کے قابل آپ نہیں رہتے۔ نماز آپ نہیں پڑھ سکتے۔ اس درجہ گویا گندگی ہے، اسی لئے ایک موقع پر فرمایا ﴿اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ﴾ ③ ''اس انسان کی جرات تو دیکھو کہ ہم نے اس کو ایک گندے قطرے سے پیدا کیا اور ہمارے ہی مقابلہ پر جھگڑالو دشمن بن کر آتا ہے''۔ گویا اب تک تو مادے میں کثافت تھی اب نجاست بھی پیدا ہو گئی۔

تخلیقِ انسان کا چوتھا مرحلہ...... اور آگے ارشاد فرمایا ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً﴾ ④ تو نطفے کے اندر کم سے کم حضرت آئمہ رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف تو تھا۔ بعض حضرت آئمہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو پاک کہتے تھے۔ کم سے کم اس کی نجاست متفق علیہ نہ تھی، مختلف فیہ تھی۔ لیکن نطفہ جب خون کی شکل میں تبدیل ہوا تو خون کی پاکی کا کوئی بھی قائل نہیں، تو متفق علیہ نجاست بن گئی۔ گویا نجاست کے اندر اور زیادہ ترقی ہوئی۔ مٹی کا خلاصہ ناپاک نہیں تھا۔ کثیف تھا۔ نطفہ کثیف بھی تھا اور ناپاک بھی تھا۔ مگر مختلف فیہ تھا۔ اور خون بنا تو متفق علیہ ناپاکی ہو گئی۔ اس کے بعد میں لوتھڑا بنا کے ہڈیاں پہنائی گئیں۔ ان تمام چیزوں کے اندر کوئی خوبی نہیں ہے۔ کوئی پاکیزگی اور کوئی چمک دمک بھی نہیں۔ معنوی چمک تو کیا ہوتی، مادی چمک بھی نہیں کہ ظاہری طور پر کوئی شعاع تو نظر آ جائے۔ یہ انسان کی

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۵۔ ② پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون الآیۃ: ۱۳۔

③ پارہ: ۲۳، سورۃ یٰسٓ، الآیۃ: ۷۷۔ ④ پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۴۔

پیدائش کے مادّے ہیں۔

تخلیق انسان کا پہلا ظلماتی مکان...... اور پھر ان مادّوں کے ساتھ انسان کو کہاں پیدا کیا گیا۔ وہ بھی گندی جگہ ہے جس میں تخلیق عمل میں آئی۔ بلکہ گندی اور ظلماتی جگہ بھی ہے۔ قرآن کریم میں ایک موقع پر ارشاد فرمایا گیا:

﴿يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ﴾ ① اللہ تعالیٰ تم کو پیدا کرتے ہیں، تمہاری پیدائش پر مختلف دور آتے ہیں۔ کہاں پیدا کرتے ہیں؟ ۔فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ۔ تین اندھیری کوٹھڑیوں اور تین ظلمتوں کے اندر پیدا کرتے ہیں۔ سب سے پہلی ظلمت ماں کا پیٹ ہے جس کے اندر کوئی چاند تا نہیں۔ جس کے اندر کوئی آفتاب کی شعاع نہیں پہنچتی۔ اور اندر سے بھی کوئی شعاع نہیں اٹھتی۔

تخلیق انسان کا دوسرا ظلماتی مکان...... اس ماں کے پیٹ میں پھر جو اندر کوٹھڑی ہے وہ رحم مادر ہے۔ جس کے اندر بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں اور زیادہ اندھیری۔ ماں کے پیٹ میں ممکن تھا کہ مسامات کے ذریعہ ہی کوئی چیز پہنچ جائے۔ مگر رحم مادر تو پیٹ کے اندر ایک اور بند کوٹھڑی ہے۔ وہاں نہ باہر سے کوئی چیز پہنچے نہ اندر سے باہر آئے۔

تخلیق انسان کا تیسرا ظلماتی مکان...... پھر اس کے اندر ایک اور تیسری کوٹھڑی ہے۔ وہ جھلی ہے جس کے اندر بچہ لپٹا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ دایا اس کو کاٹ کر بچے کو باہر نکالتی ہے۔ تو ماں کا پیٹ خود اندھیری کوٹھڑی، رحم مادر اس کے اندر ایک اور اندھیری کوٹھڑی اور اس کے اندر جھلی ایک اور اندھیری کوٹھڑی۔

فضیلت یا ندامت...... تین ظلمتیں ہیں اور تاریک گھرانے ہیں جس میں انسان کو تربیت دی جاتی ہے اور تخلیق کی جاتی ہے۔ ان تینوں اندھیری کوٹھڑیوں میں سوائے غلاظت کے اور کیا ہے؟ حیض کا خون غذا بنتا ہے۔ گندے پانی میں انسان تیرتا رہتا ہے۔ تو پیدائش کے مادّے بھی نجس، مکان بھی گندا پھر جس راستے سے اندر پہنچتا ہے وہ راستہ بھی گندا، جس راستے سے نکالا جاتا ہے وہ راستہ بھی گندا۔ تو راستے بھی گندے، مادّے بھی گندے، مکان بھی گندا اور جوہر بھی گندا۔ ان گندی چیزوں سے ان گندے مکانوں میں بن کر آپ اندازہ کیجئے کہ انسان میں کوئی فضیلت پیدا ہوسکتی ہے۔ انسان کی فضیلت تو بجائے خود ہے اگر وہ ان مادوں کی طرف دھیان کرے تو ندامت سے اس کا سر نیچا ہو جانا چاہئے۔ یہ غلاظتوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے لیے کوئی فخر اور غرور کا موقع باقی نہیں رہتا۔ کوئی موقع باقی نہیں رہتا کہ وہ شیخی کرے یا اترائے۔ کیا گندگی پر اترایا جاتا ہے؟ کیا نجاست کے اوپر انسان فخر کرے گا؟

انسان کی خود فریبی...... کوئی بزرگ چلے جا رہے تھے، ان کے سامنے ایک شخص جو بہت بڑا مالدار تھا۔ اور دنیا کی اصطلاح میں بڑا آدمی تھا۔ وہ چلا آ رہا تھا اور اپنی بڑائی کی وجہ سے اتراہٹ کی چال چل رہا تھا۔ پیر ڈالتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا، چھاتی ابھارے ہوئے، منہ ابھرا ہوا۔ غرض متکبرانہ چال سے چل رہا تھا۔ ادھر سے کوئی بیچارہ اللہ والا، سادہ زندگی والا درویش انسان آ رہا تھا۔ اس نے خیر خواہی کے طور پر اسے نصیحت کی اور کہا کہ: ”اے عزیز!

① پارہ: ۲۳، سورۃ الزمر، الآیۃ: ۶۔

خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چل۔ ﴿لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ ① اللہ کی زمین پر اینٹھ کر مت چل، اکڑ کر مت چل۔ یہ جو تو اینٹھ کر چل رہا ہے، چھاتی ابھار کر چل رہا ہے۔ ﴿إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾ ② تو اینٹھ کر زمین کو نہیں پھاڑ ڈالے گا۔ آسمان کو چیر نہیں ڈالے گا۔ اتنی ہی جگہ میں رہے گا۔ جتنی جگہ میں ہے۔ خواہ مخواہ یہ مصیبت برداشت کر رہا ہے۔ یہ انسانیت کا کام نہیں ہے''۔ اس شخص کو بہت ناگوار گزرا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو مجھے ٹوکے، میں تو سب سے بڑا آدمی ہوں۔ اس نے بہت ہی تمک کر اور بہت ہی غصّے سے کہا کہ او جاہل درویش! تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟ اور میرے سامنے ایسا گستاخانہ کلام؟ تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟ یہ درویش بھی بگڑے ہوئے دل کا آدمی تھا۔ اگر یہ اپنے مال میں مست تو وہ اپنی کھال میں مست۔

انسان کا حقیقی تعارف...... وہ بھی آگے بڑھا اور اس نے کہا جی ہاں میں جانتا ہوں آپ کون ہیں، اور اگر آپ اجازت دیں تو میں بتلاؤں آپ کون ہیں۔ یہ بھی سسک کر کھڑا ہو گیا کہ بھئی! یہ بھی عجیب درویش ہے۔ آخر آپ کیا بتلائیں گے کہ میں کون ہوں؟'' اس نے کہا میں جانتا ہوں آپ کون ہیں؟ آپ ذرا سن لیجئے''۔ ''أَوَّلُكَ نُطْفَةٌ قَذِرَةٌ وَ اٰخِرُكَ جِيفَةٌ مَّذِرَةٌ وَاَنْتَ بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ'' آپ کی ابتداء ایک گندے قطرے سے ہوتی ہے جو بدن سے نکل آئے تو غسل واجب، کپڑے کو لگ جائے تو دھونا واجب۔ آدمی نہ نماز کا رہتا ہے نہ تلاوت کا۔ یہ تو آپ کی ابتداء ہے۔ انتہاء آپ کی یہ ہے کہ قبر میں پہنچ کر یہی بدن پانی ہو کر بہے گا۔ کیڑے اس میں پڑیں گے۔ نجاست یہ بنے گا۔ یہ آپ کی انتہاء ہے۔ اور درمیان میں حالت یہ ہے کہ سیروں گندگی اور نجاست آپ کے پیٹ میں بھری ہوئی ہے، پاخانہ بھی ہے، پیشاب بھی ہے، اور خون بھی ہے یعنی دم مسفوح بھی ہے۔ تو ابتداء گندی، انتہاء گندی اور درمیانی حالت میں گند در گند۔ یہ ہے آپ کی حقیقت۔ اب فرمائیے آپ اپنی حقیقت سمجھ گئے کہ آپ کون ہیں؟ اس کی آنکھ کھلی۔ چونکہ کہنے والا اللّٰہ والا آدمی تھا۔ دل سے ایک بات کہی تھی تو ؎

از دل خیزد بر دل ریزد — دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

دل پر اثر کیا اور اس شخص نے کہا کہ ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی — مرا باجانِ جاں ہمراز کردی

خدا تجھے جزائے خیر دے، تو نے میری آنکھ کھول دی، میں نہیں جانتا تھا کہ میری یہ حقیقت ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ انسان اپنے مادّے کے لحاظ سے اتنا گندہ اور نجس واقع ہوا ہے۔ اگر وہ اپنے مادّوں پر دھیان کرے تو اس کے لئے منہ اٹھانے کی جگہ نہیں ہے۔ آنکھ اونچی کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ شرمندگی کی وجہ سے آنکھ نیچی رکھے گا۔

ستار العیوب کا احسان...... یہ تو حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اس نے ہماری گندگیوں کو چھپا دیا ہے اور

① پارہ: ۱۵، سورۃ اسرائیل، الآیۃ: ۳۷۔ ② پارہ: ۱۵، سورۃ اسرائیل، الآیۃ: ۳۷۔

نہایت خوبصورت کھال کا پردہ ڈال دیا ہے جس سے یہ چیزیں چھپادی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کھل جائیں تو انسان، انسان کو دیکھ کر نفرت کھانے لگے۔ اسی گندگی کے اگر خدانخواستہ معدے سے بخارات اٹھنے لگیں اور منہ میں بدبو پیدا ہو جائے تو انسان کو انسان سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ پاس کھڑے ہوتے ہوئے نفرت آتی ہے۔ وہ معدے کے بخارات ہوتے ہیں جو گندہ ذہنی کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔ تو جب وہ اجاگر ہوتے ہیں تو آدمی سے آدمی گھبرانے لگتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے گندگیوں کو چھپا رکھا ہے اور ان پر پردہ ڈال دیا ہے۔ انسان کو موقع نہیں ہے کہ ان چیزوں پر فخر کرے یا شیخی بگھارے یا اتراہٹ کی چال چلے۔ گویا بتلا دیا گیا کہ انسان اپنی خلقت کے لحاظ سے گندہ واقع ہوا ہے۔

یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس میں کوئی کمال ڈال دے۔ مگر انسان کی ذات کا کوئی کمال نہیں۔ ذات تو انسان کی وہ ہے جو ہم نے پیش کر دی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ان مادّوں کے ہوتے ہوئے نہ انسانی سیرت بن سکتی ہے نہ انسان کو کوئی فوقیت اور فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔ کم سے کم ان مادّوں کے لحاظ سے انسان کے اندر کوئی بھی خوبی نہیں۔

ظاہری خوشنمائی کی حقیقت ...... اب آپ یوں کہیں گے۔ یہ تو چھپی ہوئی چیزیں ہیں لیکن ان کے اوپر شکل تو خوشنما پڑی ہوئی ہے۔ کسی جاندار کو وہ خوبصورتی عنایت نہیں کی گئی جو انسان کو کی گئی ہے۔ تو انسان اپنی صورت زیبا کے اعتبار سے افضل اور اونچا ہے اور جتنا بھی وہ دعویٰ کرے کم ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ صورت درحقیقت ایک عارضی چیز ہے، جلدی سے ختم ہو جاتی ہے۔ خدا بھلا کرے بخار کا کہ تین دن آ جاتا ہے تو ساری شکل بگڑ جاتی ہے۔ سارا حلیہ خراب ہو جاتا ہے، نہ رنگ باقی رہتا ہے، نہ روغن باقی رہتا ہے۔ اگر انسان کی شرافت کے یہ معنی ہیں کہ وہ خوشنما ہے تو تین دن بخار آنے کے بعد شرافت چھن جاتی ہے، وہ رذیل بن جاتا ہے۔ تو یہ شرافت کیسی ہوئی کہ تین دن پہلے شریف اور تین دن بعد رذیل۔ پہلے اشرف المخلوقات اور اڑھائی دن گذرنے کے بعد ارذل المخلوقات۔ یہ شرافت کس کام کی ہے؟ یہ صورت کی زیبائی اور رعنائی۔ یہ ایک عارضی چیز ہے۔ بخار آ جائے تو ختم ہو جائے، انسان کو کوئی غم لگ جائے تب صورت بگڑ جاتی ہے۔ کوئی فکر پیدا ہو جائے تب صورت بگڑ جاتی ہے۔ تو جس چیز کو آنے والی کیفیت زائل کر دے۔ وہ شرافت کی بناء نہیں ہو سکتی۔ شرافت تو وہ ہے کہ جوہر میں پڑی ہوئی ہو، تو جوہر گندہ ہے تو شرافت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟

اور اگر فرض کیجئے کہ کوئی بیماری بھی نہ ہو تو بڑھاپا تو کہیں نہیں گیا؟ بڑھاپا آتا ہے تو وہی صورت جو زیبا تھی، وہ بھیانک نظر آنے لگتی ہے۔ چہرہ شوموہو جاتا ہے۔ صورت اور ہیئت بگڑ جاتی ہے اور بدل جاتی ہے اور مان لیجئے بڑھاپا بھی نہ آئے، موت تو ہر صورت میں آئے گی؟ وہ بالکل ہی صورت کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔

عقل کی گمراہی ...... یہ عقل کی گمراہی ہے کہ وہ اس صورت پر فخر کرنے لگے جو رات دن تغیر کے اندر ہے۔ ہم رات دن اس صورت کو سنوارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کنگھی اور چوٹی۔ یہ اور وہ۔ اسے آپ کہاں تک سنواریں

گے جو بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے، جس چیز کو ہر چیز بگاڑ دے آپ اسے کہاں تک سنواریں گے؟ بیماری اسے بگاڑ دے، بڑھاپا اسے بگاڑ دے، فکر اور غم اسے گھلا دے، موت اس کا حلیہ بگاڑ دے، تو آپ ناحق سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو بگڑنے کے لئے بنی ہے، اسے سنوارنا کوئی دانائی کا کام نہیں ہے۔ اگر آدمی سنوارنے کی کوشش کرے تو اپنی سیرت کو سنوارنے کی کوشش کرے نہ کہ صورت کو۔ پائیدار چیز انسان کی سیرت ہے نہ کہ صورت۔ صورت کو آپ کتنا ہی سجائیں گے، کتنا ہی زیبا بنائیں گے، کتنا ہی آپ آراستہ کریں گے، بالاخر وہ ختم ہوگی۔ اس کی زیبائش بھی ختم ہوگی۔ اگر پائیدار چیز ہے تو وہ انسان کی سیرت ہے۔

نجاست کا عشق...... کسی بزرگ کا واقعہ لوگوں نے نقل کیا ہے کہ ان کی خانقاہ میں لوگ اپنی تربیت کے لئے اللہ اللہ کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے، شیخ لوگوں کی تربیت کرتے تھے۔ اور شیخ کے ہاں طریقہ یہ تھا کہ بیس بیس اور پچاس پچاس مرید اور متوسلین جمع ہوگئے، کھانا شیخ کے گھر سے آتا تھا، ایک باندی اس کام کے لئے متعین تھی، وہ کھانا تقسیم کرجاتی تھی، ایک نئے مرید آکر بیعت ہوئے، مقصد تو یہ تھا کہ اللہ اللہ کر کے اپنی حالت کی اصلاح کریں۔ باندی جب کھانا لے کر آئی تو وہ اتفاق سے کچھ ذرا قبول صورت تھی۔ ان مرید صاحب کی اس سے آنکھ لڑ گئی، اس پر کچھ فریفتہ ہوگئے۔ اب جب وہ کھانا لے کر آتی ہے تو بیٹھ کر اسے گھورتے ہیں نہیں آتی تو منتظر رہتے کہ کب آئے گی۔ اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب وہ آئی تو اسے گھورنا شروع کیا۔ شیخ کو اس حالت کی اطلاع ہوگئی۔ تو اہل اللہ علاج کرتے ہیں، وہ زبان سے نہیں ہوتا، طریق عمل سے علاج ہوتا ہے کہ مرض کا استیصال ہوجائے۔ شیخ نے چاہا کہ ان کا یہ مرض دور ہو۔ اگر زبانی نصیحت کردیتے، فہمائش کردیتے، بے شک تھوڑا بہت اثر ہوتا مگر جب طبیعت مائل تھی تو طبیعت کا بدلنا مشکل تھا، شیخ نے ارادہ کیا کہ طبیعت ہی کو بدل دیا جائے تا کہ یہ قصہ ہی ختم ہو۔

تو ایک عجیب وغریب ترکیب استعمال کی۔ اس باندی کو جو کھانا لے کر آتی تھی۔ اسے دستوں کی دوا کھلا دی، صبح سے شام تک اسے بڑی تعداد میں دست آ گئے، ایک جگہ متعین کردی کہ اسی جگہ جانا، وہاں قدمچہ رکھ دیا۔ غرض شام تک اسے بہت دست آ گئے۔ اور شام کو حالت یہ ہوئی کہ نہ وہ رنگ باقی رہا نہ وہ روغن باقی رہا۔ ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ اس باندی کی صورت دیکھ کر ڈر معلوم ہونے لگا۔ عجیب بھیانک شکل بن گئی اس کے بعد شیخ نے فرمایا کہ: اس مرید کے پاس کھانا لے کر جا۔ اور جو کچھ وہ کہے اس کی مجھے آ کر اطلاع کرنا۔

وہ کھانا لے کر بے چاری پہنچی، ناک پکڑو تو دم نکلے، قدم اس کا لرز رہا ہے۔ ضعف کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جاتا اور صورت بھی بھیانک ہوگئی۔ یا تو مرید صاحب اس کے انتظار میں بیٹھے رہا کرتے تھے۔ اب جو آئی اور انہوں نے اس کی شکل دیکھی تو انہیں بڑی نفرت سی پیدا ہوئی اور بجائے اس کے اسے گھورتے، منہ پھیر کر کہا کہ کھانا رکھ دے اور چلی جا یہاں سے۔ وہ بے چاری کھانا رکھ کر چلی گئی۔ اور شیخ کو جا کر اطلاع کردی کہ آج اس نے مجھے بجائے گھورنے کے نفرت سے کہا کہ چلی جا یہاں سے دور ہو جا۔ میں چلی آئی۔

شیخ نے کہا۔ الحمدللہ. علاج ہوگیا۔ مگر ابھی علاج کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ ایک جز تھوڑا سا باقی تھا۔ شیخ مرید کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ ذرا میرے ساتھ چلیں۔ وہ قدمچہ جہاں باندی نے بڑی تعداد میں دستوں کا ملبہ جمع کیا تھا۔ مرید کو وہاں لے کر پہنچے اور فرمایا۔ ''یہ آپ کا معشوق ہے۔ یہ جو نجاست ہے اسے احتیاط سے لے جا کر اپنے حجرے میں صندوق میں رکھئے، اس لئے کہ جب تک یہ باندی کے اندر تھا، آپ کو محبت تھی۔ جب یہ نکل گیا۔ آپ کو نفرت پیدا ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی۔ اس گندگی سے آپ کو محبت تھی۔ اس لئے اسے اٹھا کر لے جایئے۔ یہ آپ کا محبوب ہے۔'' حقیقت میں شیخ نے بتلایا کہ صورتوں کا عشق در حقیقت گندگی کا عشق ہے۔

عشقِ سیرت...... اصل عشق، سیرت کا عشق ہے جو پائیدار عشق ہے، وہ وہی ہے جس سے محبت کرنی سکھلائی گئی ہے۔ آج ہمیں اور آپ کو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے محبت ہے، حضرت امام شافعی سے، حضرت امام احمد بن حنبل سے، حضرت امام بخاری اور حضرت امام ترمذی سے، حضرت جنید اور حضرت شبلی سے اور تمام اولیاء اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے، ان کی محبت کو جزوِ ایمان جانتے ہیں، ان سے محبت کرنے کو اپنی نجات سمجھتے ہیں۔ کیا یہ محبت ان کی صورتوں سے ہے؟ ہم نے تو آج تک ان کی صورت دیکھی بھی نہیں۔ یہ کاہے سے محبت ہے۔ ان کی سیرت اور ان کے کمالات سے محبت ہے۔ اور اتنی پائیدار محبت ہے کہ نہ آج تک ہم نے ان کی شکل دیکھی۔ مگر دل میں قائم ہے۔ اور اتنی شدید محبت کہ اگر ان بزرگوں کی شان میں کوئی ادنیٰ گستاخی کرے تو ہم اس کا منہ توڑنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ برداشت نہیں کرتے۔ یہ ان کی سیرت کی محبت ہے، ان کی صورت کی محبت نہیں ہے۔

سیرت کی سرداری...... حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت جو جلیل القدر تابعی ہیں فرماتے ہیں کہ: ''مَا رَأَيْتُ أَفْضَلَ مِنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِي رَبَاحٍ'' (1) ''میں نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے زیادہ عالم اور افضل شخصیت نہیں دیکھی''۔

یعنی حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور میں بڑی زبردست شخصیت، بڑی علم والی شخصیت ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسا شخص جس کی تعریف کرے تو اندازہ کیجئے کہ وہ کس پائے کی شخصیت ہو گی؟ تو حضرت عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ گویا اپنے زمانے میں اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کی وجہ سے سب سے زیادہ افضل ہیں۔

اور خود حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کیسے ہیں؟ ایک حبشی غلام ہیں۔ کالی صورت ہے۔ موٹے موٹے ہونٹ ہیں، کرنجی آنکھیں ہیں۔ کوئی زیبا صورت نہیں۔ لیکن حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ افضل دنیا میں نہیں دیکھا۔ یہ افضلیت صورت کے لحاظ سے نہیں تھی سیرت کے لحاظ سے تھی، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان کی صورت کو نہیں سراہ رہے تھے، ان کی سیرت کو پیش کر رہے تھے، آج

(1) السنن للترمذی، کتاب العلل الصغیر، ص: ۲۰۵۶.

اگر حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا نام آ جائے تو رضی اللہ عنہ کہہ کر آپ عقیدت اور نیاز مندی سے گردن جھکا دیتے ہیں، حالاں کہ بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی صورت کالے رنگ کی تھی موٹے موٹے ہونٹ تھے، جیسے حبشیوں کی صورت ہوتی ہے۔ مگر صورتِ حال یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ”یَا سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا“ بلال (رضی اللہ عنہ) ہمارے سردار اور ہمارے آقا ہیں۔ یہ کاہے کی آقائی اور سرداری تھی۔ یہ صورت کی سرداری نہیں تھی بلکہ سیرت کی سرداری تھی۔

صورت سببِ فتنہ اور سیرت ذریعۂ نجات ہے...... اگر غور کیا جائے تو فتنوں میں مبتلا کرنے والی چیز انسان کی صورت ہے۔ سیرت فتنے میں مبتلا نہیں کرتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی صورت اور ان کے حسن و جمال میں آپ کو کلام تو نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے ان کے حسن و جمال کی شہادت دی ہے۔ اسی طرح حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حسن و جمال کی شہادت دی۔ فرمایا گیا کہ: ”جب اللہ نے حسن پیدا کیا۔ آدھا حسن دنیا کو تقسیم کیا، آدھا حسن تنہا یوسف علیہ السلام کو عطاء کیا“۔

اتنی زبردست حسین و جمیل شخصیّت کہ قرآن و حدیث نے شہادت دی لیکن جہاں بھی فتنوں میں مبتلا ہوئے، صورت نے مبتلا کیا۔ کنعان کے کنویں میں گرائے گئے تو صورت نے مبتلا کیا۔ مصر کے بازار میں غلام بنا کر بیچے گئے تو صورت نے مبتلا کیا، اور مصر کے جیل خانے میں رہے تو صورت کی وجہ سے قید رہے، تو صورتِ زیبا نے ہر جگہ آفات میں مبتلا کیا۔ لیکن مصری کی حکومت لینے کا وقت آیا، مصر کے بادشاہ بنے اور سلطنت مانگی تو فرماتے ہیں: ﴿اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ ① مجھے یہ خزانے سپرد کر دو۔ میں ملک کا نظم کر سکتا ہوں۔ کیوں؟ دلیل میں یہ نہیں کہا کہ اِنِّیْ حَسِیْنٌ جَمِیْلٌ اس واسطے کہ میں بڑا خوبصورت ہوں، ملک کا انتظام کروں گا۔ یہ فرمایا کہ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ میرے اندر ملک کی نگہداشت کا مادہ موجود ہے، میں ملک کا نظم کر سکتا ہوں۔ جب سلطنت ملنے کا وقت آیا تو حسنِ صورت نے کام نہیں دیا، حسنِ سیرت سامنے آیا اور جب فتنے میں مبتلا ہوئے تو حسنِ صورت سامنے آیا، حسنِ سیرت سامنے نہیں آیا۔

معیارِ شرافت...... آدمی اگر مبتلا ہوتا ہے تو صورت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ سیرت کی وجہ سے کوئی مبتلا نہیں ہوتا، سیرت تو عظمت والی چیز ہوتی ہے۔ بہرحال انسان کے لئے وجہِ شرافت نہ اُس کا مادّہ بن سکتا ہے نہ اس کی صورت بن سکتی ہے۔ اور بھلا لباس تو کیا ہی بنتا؟ لباس صورت سے بھی زائد چیز ہے۔ جب انسان کے جوہر میں کوئی کمال نہیں۔ انسان کی صورت میں کوئی خاص کمال شرافت کا نہیں ہے اور ہے تو وہ زائل ہونے والی چیز ہے تو لباس تو اس سے بھی عارضی چیز ہے۔ اگر کوئی لباس پر فخر کرنے لگے اور اپنی شرافت اس سے بیان کرے تو اس سے زیادہ احمق کوئی نہیں۔ اس لئے کہ لباس تو وہ خود ہی رات کو اتار کے رکھ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح کو شریف اور رات کو رذیل۔ یہ

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۵.

شرافت کس قسم کی ہوئی کہ اسے اپنے ہاتھ سے آدمی کھودے؟ جو لوگ اپنی شرافت کو لباس سے ثابت کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت سمجھے ہی نہیں کہ شرافت کسے کہتے ہیں۔ غرض انسانی شرافت کا تعلق لباس سے نہیں ہے۔

معیارِ کمال...... سقراط کا واقعہ مشہور ہے۔ یہ ایک بہت بڑا یونانی حکیم بھی ہے، اور مجرب بھی ہے۔ فنِ طب کا موجد اور بڑا حضرت حضرت امام سمجھا جاتا ہے، اس نے بڑے بڑے تجربات کئے ہیں، رات دان جنگلوں اور پہاڑوں میں جڑی بوٹیوں کا امتحان کرتے ہوئے مارا مارا پھرتا تھا۔ اس طرح سے اس نے جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں کتابوں کے اندر مدون اور مرتب کیں۔ ایک دن جڑی بوٹیوں کے امتحان میں جنگلوں اور پہاڑوں میں تمام دن لگ گیا اور شام کے وقت شہر میں آیا، تھک کے چور ہو گیا تھا۔ ایک سڑک کے قریب کسی بنچ پر بیٹھا تو نیند نے غلبہ کیا، نیند آ گئی۔ پیر اس کے سڑک پر لٹک گئے، اتفاق سے بادشاہِ وقت کی سواری نکلی، نقیب اور چوبدار ہٹو بچو کی صدائیں لگاتے ہوئے آرہے تھے، مگر یہ سقراط بے چارہ کب کا تھکا ہوا تھا، نہ اس کے کان میں ہٹو بچو کی آواز آئی، نہ کسی نقیب کی آواز نے اس کے کانوں کو کھٹکھٹایا، پڑا ہوا سوتا رہا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی سواری قریب آ گئی۔ بادشاہ کو بڑا غصہ آیا کہ میں سواری پر سوار جارہا ہوں اور اس کی ٹانگیں سڑک کے اوپر پڑی ہوئی ہیں۔ بادشاہ نے غصے میں آ کر سواری سے اتر کر اسے لات سے ٹھوکر ماری اور کہا کہ ''او احمق! اٹھتا نہیں ہے؟

وہ بے چارہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور بادشاہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ بادشاہ نے کہا۔ ''احمق! تو جانتا نہیں ہے کہ میں کون ہوں؟'' اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا کہ جی ہاں! میں اسی پر تو غور کر رہا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اور اب تک میں اس نتیجے پر تو پہنچ چکا ہوں کہ شاید آپ جنگل کے کوئی درندے معلوم ہوتے ہیں۔

اس واسطے کہ درندوں کی عادت ہے کہ وہ زمین پر پیر مارتے ہوئے دھول اڑاتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ آپ نے چوں کہ ٹھوکر ماری تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاید جنگل کا کوئی درندہ آ گیا ہے۔ بادشاہ کو بڑا غصہ آیا اور کہا کہ ''جاہل! احمق! تو نہیں جانتا کہ میں بادشاہِ وقت ہوں، اتنے قلعے میرے قبضے میں ہیں۔ قباءِ شاہی میرے ہاتھ میں، تاجِ شاہی میرے سر پر ہے اتنے خزانوں کا میں مالک ہوں''۔ اور اس نے اپنی نعمتیں شمار کروائیں۔ سقراط نے کہا کہ: او احمق! تو نے جتنی چیزیں اپنی بڑائی اور بزرگی میں پیش کیں قلعوں کو پیش کیا، دولت کو پیش کیا، تاج کو پیش کیا، قباءِ شاہی کو پیش کیا یہ ساری چیزیں تو تجھ سے باہر باہر کی ہیں۔ تیرے اندر کون سا کمال ہے جس پر تو فخر کرے۔ یہ باہر کی چیزیں ہیں۔ تاج اگر اچھا ہے تو اپنی ذات سے اچھا ہے۔ تجھے اس سے کیا شرف ملا اور قبا اگر خوشنما لگ رہی ہے تو یہ کپڑے کی خوبی ہے۔ تیری ذات کی اس میں کیا خوبی ہے۔ تو نے اپنی ذات کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے باہر کی چیزیں پیش کیں۔ جن کا تیری ذات میں کوئی دخل نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تیری شرافت باہر باہر کی ہے۔ تیری ذات کے اندر کچھ نہیں۔''

وہ جو مثل مشہور ہے، اور نحوی لکھا کرتے ہیں کہ حضرت سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ طالب علمی میں جب

پڑھتا تھا تو اس نے بہت سی یادداشتیں مرتب کر رکھیں تھی، استاد سے سنی ہوئی تقریریں اور اپنے مطالعے کی یادداشتیں اور کچھ سوالات وغیرہ۔ غرض بہت سے کاغذات کا ایک پلندہ لکھ رکھا تھا جسے یاد کرتا تھا۔

جب کھانے کا وقت آیا تو اس نے وہ پلندہ لپیٹ کر دستر خوان میں باندھ لیا۔ اس میں ایک آدھ روٹی بھی تھی۔ اتفاق سے کتا آیا اور وہ سارا دستر خوان بندھا ہوا لے کر چلتا بنا۔ یہ حضرت سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے، ہاتھ ہی نہیں آتا تھا۔ اور کتا بھی کم بخت کچھ ایسا سرکش تھا کہ وہ آگے ہی کو چلا جا رہا ہے، پیچھے کو دیکھتا ہی نہیں۔ اور یہ اس کے پیچھے۔

لوگوں نے کہا کہ بڑا احمق ہے کہ روٹی دو روٹی ہوگی۔ کتا لے گیا تو لے جانے دے۔ اب لاٹھی لے کر پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اپنی طاقت خرچ کر رہا ہے، تو روٹی کھانے سے اتنی طاقت آئے گی نہیں جتنی پیچھے بھاگنے میں خرچ کر ڈالی۔ لوگوں نے کہا کہ بے وقوف واقع ہوا ہے۔

حضرت سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔ ''بے وقوف تو تم ہو۔ میں روٹی کی وجہ سے نہیں دوڑ رہا۔ بلکہ دستر خوان میں میرا سارا علم تھا جو کتا لے بھاگا۔ میں جاہل کا جاہل رہ گیا''۔ ''لوگوں نے کہا احمق! وہ علم ہی کیا ہوا جسے کتا ساتھ لے جائے''۔ تو حقیقت میں بادشاہ نے اپنی فضیلت تاج اور قبا میں بیان کی۔ یہ ساری چیزیں وہ تھیں کہ اگر کوئی دشمن یا غنیم آئے، تاج چھین لے، قلعے چھین لے، تو بادشاہ کی شرافت ختم ہوگئی، شرافت تو وہ ہے کہ آدمی زمین کے اوپر رہے جب بھی باکمال ہو اور اگر زمین کی تہہ میں اتار دو جب بھی باکمال ہو۔ کمال اسے کہتے ہیں۔ نہ یہ کہ ادھر جاؤ تو باکمال اور اُدھر کا رخ کر لو تو بے کمال۔ یہ کمال نہیں کہلاتا۔ کمال اپنی ذات کے اندر ہونا چاہئے۔ اپنے اندر جوہر ہونا چاہئے۔ یہ فی الحقیقت کمال ہے۔

مرکزِ محنت...... حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہٗ نے ایک تمثیلی حکایت نقل کی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ واقعہ بھی ہو۔ تمثیل نہ ہو۔ وہ یہ کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں میں باہم جھگڑا ہوا۔ دونوں آپس میں لڑے، چینیوں نے کہا ہم زیادہ باکمال ہیں، زیادہ صناع ہیں، زیادہ دستکار ہیں۔ رومیوں نے کہا کہ ہم زیادہ صناع ہیں۔ ہم زیادہ دست کار ہیں۔ ہم زیادہ کاریگر ہیں۔ دونوں میں جھگڑا ہوا، دعوے دونوں طرف سے تھے، یہاں تک قریب تھا کہ جنگ ہو جائے۔ لوگوں نے کہا کہ بھائی! باہم لڑتے کیوں ہو؟ کسی کو ثالث اور حکم بنا لو، تو مقدمہ بادشاہِ وقت کے پاس گیا کہ دو قومیں لڑ رہی ہیں۔ دعویٰ دونوں کا ایک ہے۔ ایک قوم کہتی ہے کہ ہم زیادہ باکمال ہیں۔ دوسری کہتی ہے کہ ہم زیادہ باکمال ہیں۔ چینیوں نے کہا کہ حکمت ہمارے ہاتھ پر اتری ہے۔ اور رومیوں نے کہا کہ ہمارے ہاتھ پر اتری ہے۔ بادشاہ نے کہا، دعوؤں سے کام نہیں چلتا۔ دونوں اپنی اپنی صنعت کے نمونے دکھلائیں۔ اسے دیکھ کر ہم فیصلہ کریں گے کہ کون زیادہ باکمال ہے۔ اور تجویز یہ دی کہ ایک ہال بنایا گیا اور اس میں پارٹیشن کر دیا گیا۔ تقسیم کر کے ایک پردے کی دیوار کر دی گئی اور دونوں قوموں سے کہا گیا کہ آدھے مکان میں تم اپنی صناعت دکھاؤ۔ آدھے مکان

میں تم دستکاری دکھلاؤ۔ بیچ میں سے پردہ ہٹا کر پھر ہم موازنہ کریں گے کہ کس کی صناعی اور دستکاری بڑھی ہوئی ہے۔

چناں چہ دونوں قوموں نے اپنی کاریگری کا کام شروع کیا تو چینیوں نے دیوار پر پلاستر کر کے دیوار پر نقش و نگار بنانے شروع کئے اور رنگ برنگ کے پھول اور بوٹے بنائے۔ تو دیوار کو باغ و بہار بنا دیا۔ کوئی بوٹا نہیں چھوڑا جو اس میں بنایا نہ گیا ہو۔ کوئی پھول اور پتی نہیں چھوڑی جو اس میں نہ بنائی گئی ہو۔ کوئی رنگ نہیں چھوڑا جو دیوار میں لگایا نہ ہو۔ تو پوری دیوار کو گلزار بنا دیا کہ دیکھنے والے کی نگاہ دیوار میں اثر کرنا چاہتی ہے۔ مگر آدمی کی نگاہ اس کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں ہٹ سکتی۔ یہ کاریگری تو چینیوں نے دکھلائی۔

اور رومیوں نے کیا کاریگری دکھلائی؟ انہوں نے آدھے کمرے میں پلاستر کر کے اس کو صیقل کرنا شروع کیا اور مانجھنا شروع کیا۔ مانجھتے مانجھتے اتنا چمکدار بنا دیا کہ دیواریں آئینہ بن گئیں کہ اس میں صورت نظر آنے لگی۔ بالکل چمکا کر آئینہ کر دیا۔ نہ ایک نقش بنایا، نہ ایک بوٹا بنایا، نہ ایک پھول بلکہ صیقل کر کے آئینہ کر دیا۔ جو سامنے کھڑا ہوتا۔ اس کی تصویر نظر آتی ہے۔

جب دونوں اپنی کاریگری سے فارغ ہو گئے تو بادشاہ کو اطلاع دی گئی، بادشاہ نے حکم دیا کہ پردے کی دیوار ہٹا دی جائے تا کہ موازنہ کریں۔ پردہ کی دیوار کا ہٹنا تھا کہ چینیوں نے جتنے نقش و نگار بنائے تھے، دوسری طرف نظر آنے لگے، اس لئے کہ دیواریں تو آئینہ ہو گئی تھیں۔ وہ سارے پھول ادھر نظر آ رہے ہیں۔ اب بادشاہ حیران ہے کہ جو بیل بوٹا، ادھر ہے وہی اُدھر ہے۔ جو رنگ اُدھر ہے وہی اِدھر ہے۔ جو نقش و نگار اِدھر ہیں وہی اُدھر ہیں، اب وہ حیران ہے کہ فیصلہ کس کے موافق دوں اور کس کے خلاف دوں؟

آخر رومیوں کے حق میں فیصلہ دیا کہ رومی اپنی صنعت میں بڑھ گئے، کیوں کہ انہوں نے اپنی صنعت تو دکھلائی تھی، دوسروں کی صنعت بھی چھین لی۔ یہاں بیل بوٹے ہیں اور چمک کے ساتھ ہیں۔ وہاں فقط نقش و نگار ہیں۔ چمک دمک کچھ نہیں۔ تو اپنی صنعت دکھلائی اور دوسروں کی صنعت چھین لی۔ گویا رومیوں نے ڈبل صنعت دکھلائی اس لئے رومی بڑھ گئے۔

یہ حکایت نقل کر کے حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہٗ لکھتے ہیں کہ ''اے عزیز! تو اپنے قلب میں چینیوں کی صنعت مت کر کہ دنیا بھر کے پھولوں اور بوٹوں کو دیکھتا پھرے۔ رومیوں کی صنعت کر کہ اپنے دل کو مانجھ کر آئینہ بنا لے کہ ساری دنیا کی صنعتیں تجھے گھر بیٹھے نظر آنے لگیں، تو دنیا کے اندر نقش و نگار اور پھول پتیوں کو ٹٹولتا ہوا کہاں مصیبت کے اندر پھر رہا ہے۔؟ تیرے اندر تو وہ کائنات موجود ہے کہ ساری دنیا کے پھول اور پتیاں تیرے اندر موجود ہیں۔ تو دل کو مانجھ کر رومیوں کی صنعت کی طرح دل کو صیقل بنا لے۔ دنیا تو تجھے وہیں بیٹھے ہوئے نظر آنے لگے گی۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و چمن درآ   تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ ی در دل بکشا بچمن درآ

تیرے پاس تو دل موجود ہے۔ اس میں اگر تو ایک دروازہ نیچے کا کھولے گا تو ساری دنیا اس میں سے تجھے

نظر آئے گی اور اگر اوپر کا دریچہ کھول دے تو عالمِ غیب تجھے نظر آئے گا۔ دنیا کے مشاہدات قلب میں آئیں گے اور اوپر کے علوم قلب کے اندر آئیں گے۔ تو قلب عجیب کیمیا ہے کہ اس میں دو۲ دریچے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک عالمِ غیب کی طرف اور ایک عالمِ شاہد کی طرف۔ محسوسات کی صورتیں بھی قلب میں ہیں مغیبات کے علوم بھی قلب کے اندر ہیں۔ تو جس انسان کو یہ چیز دی جائے وہ ان پھول پتیوں میں مبتلا ہو کے رہ جائے؟ اسے تو یہ چاہئے کہ ان دریچوں کھول دے تاکہ اسے ساری صورتیں نظر آئیں۔ نہ صرف یہاں کی بلکہ عالمِ غیب کی چیزیں بھی اس پر منکشف ہوں اور نظر آنے لگیں۔

مدارِ علوم...... حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی (رضی اللہ عنہ) ہیں۔ بیمار ہوئے اور کمر میں پھوڑا نکلا اور اتنا شدید کہ بتیس برس تک وہ پھوڑا رہا۔ اور کیفیت یہ تھی کہ کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ چت لیٹے ہوئے ہیں۔ کھانا بھی کھا رہے ہیں تو چت لیٹ کر اور استنجاء بھی کر رہے ہیں تو چت لیٹ کر۔ نماز بھی پڑھتے ہیں تو اشاروں سے چت لیٹ کر پڑھتے ہیں۔ نہ اٹھ سکتے ہیں نہ بیٹھ سکتے ہیں۔ نہ کروٹ بدل سکتے ہیں اور بتیس ۳۲ برس کامل اس حالت میں گزرے ہیں۔ اندازہ کیجئے کتنی عظیم تکلیف ہو گی؟ کتنی عظیم اذیّت ہو گی؟ مگر اس تکلیف کے باوجود چہرہ دیکھا جاتا تھا تو نہایت بشاش کہ تندرستوں کے چہروں پر وہ رونق نہ ہو۔ جو حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ کے چہرۂ مبارک پر تھی۔ نہایت ہشاش بشاش اور کھلا ہوا چہرہ۔

لوگوں نے عرض کیا کہ ''حضرت! بیماری تو اتنی شدید کہ اذیّت کی کوئی انتہا نہیں، بیٹھ نہیں سکتے، اٹھ نہیں سکتے۔ اور آپ کی بشاشت کی کیفیت یہ کہ کسی تندرست کا چہرہ بھی اتنا شاداب نہیں ہو سکتا جتنا آپ کا ہے؟'' فرمایا، ہاں!'' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ نے مجھے یہ تکلیف دی تو میں نے بجائے جزع فزع کرنے کے اور بجائے اللہ کا شکوہ کرنے کے صبر اور تحمل سے کام لیا اور کہا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے، جس حالت میں تو رکھے میں اس حالت پر راضی ہوں۔ تو میں نے اس تکلیف پر رضا اور تسلیم کا اظہار کیا اور اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور صبر سے کام لیا۔ نہ صرف صبر بلکہ شکر بھی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں بتیس ۳۲ برس سے روزانہ اس بستر کے اوپر ملائکہ سے مصافحے کرتا ہوں۔ عالمِ غیب میرے اوپر منکشف ہے۔ رجالِ غیب میرے سامنے آتے ہیں۔ ملائکہ کی آمد و رفت میرے سامنے ہے۔ اگر چہ میں نے ارادے سے مجاہدہ نہیں کیا، یہ تقدیری مجاہدہ ہے جو اللہ نے مجھے دیا، تو یہ ہے اضطراری مجاہدہ مگر میں نے اس مجاہدے کو قبول کر کے صبر کیا۔ اس مجاہدے کی برکت سے اللہ نے میرے قلب کے دروازے کھل دیئے، مجھ پر عالمِ غیب منکشف ہوا، اور میں ملائکہ سے مصافحے کرتا ہوں''۔

جس انسان کو یہ کائنات دی جائے، اگر وہ ارادی مجاہدے کرے۔ سبحان اللہ! اور اگر اضطراری مجاہدہ ہو تو اس پر صبر اور تسلیم اختیار کرے۔ تو اس پر غیبی چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں۔ تو جس کے اندر ایسی آنکھ دی گئی ہے کہ دنیا ہی میں بیٹھے بیٹھے وہ آخرت کی چیزیں دیکھے، اس کے لئے کیا مصیبت ہے کہ وہ پھول پتیوں میں الجھا ہوا

پھرے۔ یہ ساری پھول پتیاں اس کے اندر موجود ہیں۔

معیتِ اہلِ حق سے انکشافِ حقائق...... نیز اہل اللہ اور کاملین جب اپنے کمالات، اپنے مجاہدات اور ریاضت سے اونچے مقامات پر پہنچتے ہیں تو ان کے قلب کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ تو وہ۔ جو ان کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں ان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ وہ فائز المرام بن جاتے ہیں۔

میں نے اپنے بزرگوں سے ایک واقعہ سنا اور اس کے روایت کرنے والے حضرت مولانا منصور علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ مراد آباد کے علماء میں سے ہیں اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ جو دارالعلوم دیوبند (انڈیا) کے بانی ہیں۔ جن کا نام نامی ابھی آپ نے سنا۔ تو حضرت مولانا منصور علی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خود مجھے اپنا واقعہ سنایا۔ کوئی راوی بھی بیچ میں نہیں۔ فرمایا کہ

''جب میں دارالعلوم میں طالب علمی کے زمانے میں مقیم تھا اور دارالعلوم کی بالکل ابتداء تھی۔ ابھی قائم ہی ہوا تھا اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے میں پڑھتا تھا۔ فرماتے تھے کہ: طلباء میں ایک نوجوان لڑکا بہت ہی حسین اور خوبصورت تھا، اس سے ان کی آنکھ لڑ گئی۔ اور اس کا عشق ان کے قلب میں پیدا ہو گیا۔ مگر چوں کہ پاک دامن اور عفیف تھے۔ اس لئے برے جذبات سے تو قلب خالی رہا مگر عشق و محبت کی وجہ سے اس میں ایک سوختگی اور ایک اضطراب اور بے چینی ہر وقت ٹھہر گئی۔ ہر وقت ایک کوفت اور ایک سوزش رہنے لگی۔ اس لڑکے کا دھیان اور تصور رہتا''۔

فرماتے تھے کہ: اس کیفیت کا اتنا غلبہ ہوا کہ ایک دن میں نماز پڑھ رہا تھا کہ سجدے میں بجائے ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى'' کے اس لڑکے کا نام میری زبان سے نکلا، اس درجہ قلب پر اس کی محبت کا غلبہ ہو گیا۔ فرماتے تھے کہ میرے دل پر صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس محبت نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میری دنیا گئی تھی تو گئی تھی۔ اب تو میرا دین بھی چلا۔ جب میری نمازیں ایسی ہو گئیں کہ اللہ کے نام کے بجائے غیر اللہ کا نام نکلے تو میرا دین ہی کیا باقی رہا؟

اس کی شکایت لے کر حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ حضرت! یہ واقعہ ہے۔ حضرت کو پہلے سے معلوم تھا مگر فرماتے نہیں تھے۔ جب انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! اب تو میرا دین بھی ضائع ہونے لگا۔ اب میری دستگیری فرمائیے۔ حضرت نے ہنس کر فرمایا۔ یہ اصل میں پٹھان تھے۔ اے جی! مولوی منصور علی! تم تو پٹھان آدمی ہو۔ اتنے ہی میں تم گھبرا گئے۔ اور یہ دھاڑیں مار کر رو پڑے اور کہا حضرت! یہ مذاق کا وقت نہیں۔ میرا تو دین بھی چلا اور میری دنیا بھی گئی۔ آپ خدا کے لئے میرا علاج کریں۔

حضرت نے فرمایا۔ کل صبح کی نماز کے بعد جب میں مسجد سے نکلوں اور حجرے میں جانے لگوں تو میرے ساتھ میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ بولنا مت۔ میرے پاس آ کر بیٹھ جانا۔ چناں چہ انہوں نے ایسے ہی کیا۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ چھتے کی مسجد میں: جو دارالعلوم سے بالکل ملی ہوئی ہے اور وہیں سے دارالعلوم دیوبند کا افتتاح بھی ہوا ہے۔ اسی چھتے کی مسجد میں انار کا ایک درخت ہے۔ جو اب تک کھڑا ہوا ہے۔ اسی کے نیچے سے دارالعلوم

دیو بند شروع ہوا۔ ایک استاد اور ایک شاگرد سے دار العلوم دیو بند کی ابتداء ہوئی ہے۔ استاذ کا نام مُلّا محمود رحمۃ اللہ علیہ تھا اور شاگرد کا نام حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ تو چھتّے کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے دو محمودوں کے نام سے دار العلوم دیو بند کی ابتداء ہوئی۔ اسی چھتّے کی مسجد میں ان تمام اکابر اہل اللہ کا اجتماع رہتا تھا۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیو بند کے مہتمم اوّل ہوئے ہیں اور نقشبندیہ خاندان کے بزرگ تھے۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیو بند کے بانی ہیں۔ یہ چشتی تھے۔ اور ہماری پوری جماعت پر چشتیت ہی کا غلبہ ہے اور سلسلہ ہمارا چشتیہ ہے۔ گو ہمارے اکابر چاروں سلسلوں میں بیعت کرتے ہیں اور چاروں سلسلوں میں تربیت بھی کرتے ہیں۔ جس کو جس سلسلے سے مناسبت ہو، اسی میں بیعت وتلقین کی جاتی ہے۔ تو جامع الطرق ہیں مگر چشتیت کا غلبہ ہے۔ اور اصل سلسلہ ہم لوگوں کا چشتی ہے۔ یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ ان سے لے کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تک اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تک اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

غرض، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ چشتیہ خاندان کے اکابر میں سے ہیں۔ تو حضرت مولانا منصور علی خان رحمۃ اللہ علیہ کو فرمایا کہ کل جب میں صبح کی نماز پڑھ کر حجرے میں جانے لگوں تو میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ مگر بولنا کچھ نہیں۔ چناں چہ حضرت جب نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے، یہ ساتھ ہو لئے۔ اور حضرت مولانا منصور علی خان مجھ سے کہتے تھے، میں نے اس دن حضرت کی آنکھوں میں سرخی اور کچھ غیر معمولی ہیئت دیکھی جس سے میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ حجرے میں گئے اور میں بھی حجرے میں چلا گیا اور میں نے کواڑ بند کر دیئے، فرماتے تھے جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ جا کر بیٹھ گئے۔ اور میں سامنے مؤدب بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور میرا ہاتھ پکڑا۔ فرماتے تھے میں نے اپنا داہنا ہاتھ حضرت کے ہاتھ میں دیا تو حضرت نے میرا داہنا ہاتھ اپنے بائیں کے اوپر رکھ دیا اور اپنا داہنا ہاتھ میرے داہنے ہاتھ پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا جیسے کوئی رسی یا بان بٹا کرتا ہے۔

حضرت مولانا منصور علی خان رحمۃ اللہ علیہ مجھ سے فرماتے تھے میں تم سے حلفِ شرعی کر کے اور اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ جب تک حضرت میرے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ پورے آسمان اور زمین کی چیزیں مجھ پر روشن تھیں۔ ملائکہ کی آمد ورفت مجھے نظر آ رہی تھی۔ چڑھ رہے ہیں اور اتر رہے ہیں۔ گویا پورا عالم غیب مجھ پر منکشف تھا۔ یہ میری کیفیت تھی۔ اخیر میں زور سے ہاتھ پھیر کر مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اٹھ جاؤ یہاں سے فرماتے تھے میں باہر آیا، باہر آ کر جب مسجد سے باہر نکلا تو یہ سوچتا ہوں کہ کوئی چیز میرے قلب کے اندر تھی جو نکل گئی اور یہ یاد نہیں آتا کہ وہ چیز کیا تھی۔

یہ اس لڑکے کی محبت تھی مگر یہ بھی بھول گئے کہ وہ کیا چیز تھی اور سوچتے ہوئے جا رہے ہیں کہ کوئی چیز میرے

قلب سے نکلی ہے جو میرے قلب میں جمی ہوئی تھی اور یہ یاد نہیں آتا کہ وہ کیا چیز تھی۔ فرماتے تھے کہ: جب دار العلوم کے قریب پہنچا ہوں جو سڑک پر ہے تو وہ لڑکا نظر آیا اسے دیکھ کر یاد آیا کہ اچھا اس کی محبت تھی جو قلب میں گھسی ہوئی تھی، وہ ایسی نکلی کہ یہ بھی یاد نہیں آرہا کہ وہ قلب کے اندر تھی بھی یا نہیں۔ تو میں عرض کرتا ہوں کہ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور رسول کے صحابی رضی اللہ عنہم تو بہت اونچی شخصیتیں ہیں۔ بہت بالاتر ہیں۔ ان کے غلاموں اور خدام کو یہ کیفیت دی گئی ہے کہ اگر وہ کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیں تو اس پر غیبی چیزیں منکشف ہونے لگتی ہیں۔ اللہ نے انسان کو دل ایک ایسی کائنات عطاء کی ہے کہ اگر انسان دل کو سنوار لے تو شاہد ہی نہیں بلکہ غیوب کی چیزیں بھی اس کے سامنے آتی ہیں۔ بڑے بڑے علوم اس پر منکشف ہوتے ہیں۔

مرکزِ تجلیاتِ ربانی...... اسی واسطے فرمایا گیا ہے کہ قلب فی الحقیقت ''عَرْشُ الرَّحْمٰنِ'' ہے۔ دنیا کے اندر عرش عظیم کی کوئی تمثال موجود ہے، اور عرش کا کوئی نمونہ موجود ہے تو وہ انسان کا قلب ہے۔ جس میں تجلیاتِ ربانی اترتی ہیں۔ انسان کے ہاتھ پر تجلیات نہیں اترتیں، انسان کے دماغ پر تجلیات نہیں اترتیں۔ تجلیاتِ ربانی کا اگر مرکز ہے تو وہ قلب ہے۔ اس لئے کہ ''عرش الرحمٰن'' ہے، تو کائناتِ آفاق میں عرش عظیم وہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت مستوی ہے۔ جس کو فرمایا گیا ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ① اور کائناتِ انفس میں عرشِ عظیم انسان کا قلب ہے جس پر رحمٰن کی تجلیات آتی ہیں۔ تو جس انسان کو قلب جیسی دولت دی جائے جس کے اندر غائب وشاہد کے سارے نقش ونگار ہوں، اسے کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ دنیا کے نقش ونگار میں گھومتا پھرے کہ۔

تو طفلی و خانہ رنگین است

اس کو ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے یہ موقع نہیں ہے۔ اس کا تو کام یہ ہے کہ رومیوں کی صنعت انجام دے۔ اور اپنے دل کو صیقل کرے۔ ساری چیزیں خود بخود نظر آئیں گی۔

سیرتِ انسانی کا جوہر اوّل...... اور پھر جب اس میں چیزیں منکشف ہو جائیں گی، اور علم ومعرفت کا کمال پیدا ہو جائے گا تو کہا جائے گا کہ اب اس میں انسانیت آئی ہے۔ اب اس کے لئے شرافت کا راستہ کھلے گا۔ تو انسان نہ اپنے مادّے سے افضل بنتا ہے نہ اپنی صورت سے افضل بنتا ہے، نہ اپنے لباس سے افضل بنتا ہے۔ بنتا ہے تو اپنے دل سے افضل بنتا ہے۔ اور دل کب افضل بنتا ہے۔ اس وقت افضل بنتا ہے۔ جب عرش الرحمٰن بن جائے، اور اللہ تعالیٰ کی علمی تجلیات اس پر آنے لگیں۔ اللہ کی معرفت اس کے اندر اتر جائے۔ تب کہا جائے گا کہ اب انسان حقیقی معنی میں انسان بنا ہے۔

تو صورت سے آدمی، آدمی نہیں بنتا۔ سیرت سے بنتا ہے اور سیرت کا پہلا رکن علم ہے۔ اگر علم نہیں بلکہ قلب میں جہالت پڑی ہوئی ہے تو سیرت کا ابتدائی زینہ طے نہیں ہوا۔ غرض سیرتِ انسانی کا پہلا رکن یہ ہے کہ اس کے

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۔

اندر علم ہو۔ جہالت سے سیرت نہیں بنتی، علم سے سیرت بنتی ہے۔ بے بصیرتی سے سیرت نہیں بنتی ہے۔ بصیرت سے بنتی ہے اور بصیرت کا مرکز انسان کا قلب ہے۔ علم و معرفت کا مرکز انسان کا قلب ہے۔ تو جب آدمی رومیوں کی صنعت جاری کرتا ہے تو یہ انسان کی سیرت کا ابتدائی زینہ ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ'' سارے انسان ہلاک ہونے والے ہیں۔ سارے انسان تباہ و برباد ہیں۔ اگر بچنے والے ہیں تو اہلِ علم ہیں جو بچیں گے۔

تو انسان کے معنی کیا ہیں؟ مادّے کے لحاظ سے انسان، صورت کے لحاظ سے انسان، لباس کے لحاظ سے انسان؟ فرماتے ہیں، ان میں سے کوئی چیز نجات دینے والی نہیں ہے۔ خوبصورتی نجات نہیں دلائے گی۔ یہ گندے مادّے نجات نہیں دلائیں گے، یہ فاخرہ لباس نجات نہیں دلائیں گے، اگر نجات دلانے والی چیز ہے تو علم ہے۔ جس سے انسان حق و باطل کو پہچانے، صحیح غیر صحیح میں فرق کرے، جائز و ناجائز کا امتیاز کرے۔ اگر اس میں یہ امتیاز نہیں اور حلال و حرام کی تمیز نہیں۔ کھانا جانتا ہے مگر حلال و حرام کو نہیں جانتا، پہننا جانتا ہے مگر حرام و حلال کو نہیں جانتا، پھر بیل میں اور انسان میں کیا فرق ہے؟

بیل بھی کھانا جانتا ہے مگر جائز و ناجائز کو نہیں جانتا۔ بیل بھی تو مکان چاہتا ہے کہ جس میں رہے، مگر حلال و حرام کو نہیں جانتا۔ غیر کا مکان ہو جب بھی آ جائے گا۔ اپنے مالک کا مکان ہو جب بھی کھڑا ہو جائے گا۔ اپنے مالک کا کھیت ہو جب بھی منہ مارے گا۔ اور غیر کا کھیت ہو جب بھی منہ مارے گا۔ اسے جائز و ناجائز کی تمیز نہیں۔ آخر بیل ہی تو ٹھہرا۔ اگر انسان میں بھی جائز و ناجائز کی تمیز نہ ہو، حلال و حرام کا امتیاز نہ ہو، تو بیل اور انسان میں کوئی فرق نہیں۔ حیوانیت محضہ ہے۔ تو انسان، انسان جب بنتا ہے کہ جب اس کے اندر علم آ جائے۔

علمِ ضروری کی مقدار...... اور علم بھی وہ کہ وہ محض دانستن کا نام علم نہیں، محض جان لینے کا نام علم نہیں۔ اس لئے کہ تھوڑا بہت علم تو بیل کو بھی ہے۔ وہ بھی تو جانتا ہے کہ یہ میرا مالک ہے۔ یہ نہیں، یہ مجھے گھاس دانہ ڈالتا ہے، یہ نہیں ڈالتا ہے۔ اس کے آگے گردن جھکا دیتا ہے۔ دوسرے کے آگے نہیں۔ اتنا علم تو کتا بھی رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ میرا مالک ہے، اس کے آگے دم ہلانے لگتا ہے۔ اور غیر آ جائے اس پر حملہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ تو وہ فرق محسوس کرتا ہے کہ یہ مکان کا مالک ہے اور یہ نہیں۔ اسے مکان میں آنے کا حق ہے اور اجنبی کو نہیں۔ ہاں اگر مالک کتے کو ڈانٹ دے، تو چپکا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مالک نے اجازت دے دی تو اس کے آنے کا حق پیدا ہو گیا۔

ہمارے حاجی محمد شفیع صاحب جن کی کوٹھی پر ہم ٹھہرے ہوئے ہیں، انہوں نے بڑا زبردست قسم کا جنگلی کتا پال رکھا ہے۔ اگر اسے آزاد چھوڑ دیں تو صرف حملہ نہیں کرتا بلکہ وہ تو ایک دم گلا دبا دیتا ہے۔ کوئی بھی آئے اس نے بھونکنا شروع کیا لیکن حاجی صاحب جب ایک ڈانٹ لگاتے ہیں تو چاہے دس آدمیوں کے ساتھ آئیں، چپکا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ جانتا ہے کہ مکان ان کا نہیں، مالک کا ہے۔ مالک اجازت دے گا تو آنے کا حق

حاصل ہے۔ نہیں اجازت دے گا تو آنے کا حق حاصل نہیں۔ غرض اتنا تھوڑا بہت علم تو کتا بھی رکھتا ہے۔ اتنا علم اگر انسان میں آئے تو اتنا علم حیوانیت کے لئے بھی ہے۔ حقیقی علم وہ ہے جس سے انسان حلال وحرام کو پہچانے، حق ناحق کو پہچانے، جائز و ناجائز میں فرق کرے۔ یہ کام انسانی قلب کا ہے، ہاتھ پیر کا نہیں۔

قلب کا امتیازی ادراک...... امام رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کے اندر سارے اعضاء دنیا کے ہیں۔ صرف ایک قلب ہے جو آخرت کا عضو ہے۔ اور حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے۔ ہاتھ اگر مال لے تو جائز مال بھی ہاتھ اٹھائے گا۔ ناجائز مال کو ہاتھ ڈالیں وہ بھی ہاتھ پکڑ لے گا۔ یہ نہیں ہے کہ رشوت کا مال ہو تو ہاتھ میں کانٹے چبھنے لگیں اور جائز مال ہو تو آپ لپے چلے آئیں۔ نہیں۔ جس طرح سے خوشگواری کے ساتھ پچاس ساٹھ روپے جائز ہاتھ اٹھائے گا، اگر ساٹھ ستر رشوت کے آگئے، وہ بھی اٹھالے گا۔ چوری کے آگئے وہ بھی اٹھالے گا۔ تو جائز و ناجائز میں ہاتھ کو کوئی امتیاز اور تمیز نہیں۔ یہ بیچارہ محض مالیت دینے اور پکڑنے کا عادی ہے۔ حلال ہو یا حرام۔ اگر آدمی ناجائز مال کھائے تب بھی زبان کو وہی لذت آئے گی جو زبان کو جائز مال کھانے سے آئے گی۔ کیوں کہ زبان کو یہ تمیز نہیں ہے کہ یہ جائز اور یہ ناجائز ہے۔ یہ حلال اور یہ حرام ہے۔

اگر آپ چلیں تو جس طرح سے آپ مسجد کی طرف چلتے ہیں۔ یہی پاؤں آپ کو شراب کی بھٹی کی طرف بھی لے جاسکتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ شراب کی بھٹی کی طرف جائیں تو پاؤں میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی، اور مسجد کی طرف جانے میں قدم ذرا جلدی اٹھیں گے۔ بلکہ مسجد کی طرف جانے میں ذرا کم اٹھتے ہیں، شراب کی بھٹی کی طرف جانے میں زیادہ اٹھتے ہیں۔ مگر تمیز کی وجہ سے نہیں، عادت کی وجہ سے۔ تو پیر کو کوئی جائز و ناجائز کی تمیز نہیں لیکن قلب کے اندر احساس موجود ہے، جب چور چوری کا مال لے کر آئے گا تو ضمیر اس کو ملامت کرے گا کہ کم بخت! تو نے بری حرکت کی، اب چاہے نفس مانے یا نہ مانے مگر قلب اسے صحیح مشورہ ہی دے گا، تو انسان کا قلب آخرت کا عضو ہے۔ وہ حق اور ناحق میں تمیز چاہتا ہے۔ وہ اچھے اور برے میں امتیاز پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اگر اس قلب کو صاف کرلیا جائے تو پھر اللہ کی مرضی کیا ہے اور نامرضی کیا ہے؟ اس کو پہچاننے لگتا ہے۔ حق تعالیٰ کس چیز کو پسند کرتے ہیں اور کس چیز کو ناپسند کرتے ہیں۔ تو علم کا ابتدائی درجہ تمیز ہے کہ آدمی حق و باطل اور جائز و ناجائز میں امتیاز کرے۔

حقیقتِ علم...... علم کی حقیقت ہی درحقیقت تمیز ہے۔ یعنی دو چیزوں کو ممتاز کئے رکھنا۔ اور دو چیزیں رل مل جائیں اور مشتبہ ہو جائیں تو کہیں گے کہ اس شخص کو علم نہیں ہے۔ اگر علم ہوتا تو دونوں چیزوں کو الگ الگ دیکھتا، اور دونوں چیزوں کو الگ الگ سمجھتا، تو امتیاز پیدا کر دینا یہ علم کا مرتبہ ہے۔

علم الفرقان...... اور یہ علم جب اونچا بنتا ہے تو اور زیادہ تمیز پیدا ہوتا ہے۔ اور علم میں کمال تقویٰ سے آتا ہے۔ جتنا تقویٰ وطہارت ہوگا، علم میں کمال پیدا ہوتا جائے گا۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ

تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ ① اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرنے لگو اور متقی بن جاؤ تو اللہ تم میں فرقان پیدا کر دے گا''۔ فرقان: کے معنی اس اندرونی قوت کے ہیں جو حق و باطل میں امتیاز پیدا کر دے۔ جائز کو ناجائز سے علیحدہ کر دے۔ جب یہ تمیز پیدا ہو جائے تو کہا جائے گا تقویٰ کامل ہو گیا۔ تقویٰ کا اثر یہ ہے کہ انسان کا دل خود بھلائی اور برائی میں امتیاز کرنے لگتا ہے۔

ترتیبِ استفتاء...... اسی واسطے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَاِنْ اَفْتَاكَ الْمُفْتُوْنَ'' ② جب کوئی معاملہ پیش آئے پہلے اپنے دل سے فتویٰ لو''۔ دل خود بتلائے گا کہ یہ بات صحیح ہے، یہ بات غلط ہے، مفتیوں کے پاس تو بعد میں لے جاؤ، پہلے دل سے فتویٰ لو۔ ایک آدمی بعض اوقات چاہتا ہے کہ فتویٰ میرے مطابق ہو جائے، فتویٰ وہ ہو جس کو میرا نفس چاہتا ہے۔ تو الٹے سیدھے سوال بنا بنا کر مفتی کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اب مفتی تو جواب وہی دے گا جیسی سوال کی صورت ہوگی۔ اس نے اپنی مرضی کے مطابق جواب حاصل کر لیا اور اس پر عمل کیا۔ ظاہری طور پر آپ کہیں گے کہ بھائی! مفتی کے فتوے پر عمل کر رہا ہے۔ بے چارہ معذور ہے، مگر دیانۃً معذور نہیں ہے، اللہ جانتا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر سوال غلط بنایا تھا کہ دنیا کو دکھلانے کے لئے کہہ سکے کہ فتویٰ پر عمل کر رہا ہوں۔ یہ تو اپنے نفس کے تقاضوں پر عمل کر رہا ہے۔ اور جب انسان سب سے پہلے اپنے نفس سے فتویٰ لے۔ پھر مفتیوں سے فتویٰ لے، دل خود بتلائے گا کہ یہ بات صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا: ''اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَاِنْ اَفْتَاكَ الْمُفْتُوْنَ۔'' بہرحال انسان کے قلب کے اندر جب علم کی طاقت آتی ہے تو امتیاز پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے، تو کہا جائے گا کہ انسانی سیرت کا پہلا جوہر قلب کے اندر آ گیا، ابتدائی درجہ یہ ہے کہ انسان میں حق ناحق کا علم اور امتیاز ہو جو جانوروں کو میسّر نہیں ہے۔ اسی واسطے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ۔'' لوگ سب کے سب برباد ہیں۔ نہ ان کا مادہ ان کو بچا سکے گا، نہ ان کی صورت ان کو بچا سکے گی، نہ ان کا لباس ان کو بچا سکے گا۔ غرض لوگ ہلاکت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اہلِ علم بچنے والے ہیں۔ جن کے اندر جائز و ناجائز کا امتیاز ہے۔

سیرتِ انسانی کا دوسرا جوہر...... لیکن اگر آپ غور کریں تو علم محض بھی نجات دلانے کی چیز نہیں ہے، بلکہ جتنا علم زیادہ ہوگا زیادہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ کیوں؟ اس واسطے کہ علم سے مقصد فی الحقیقت عمل ہے۔ اگر علم پر عمل مرتّب نہ ہو تو کہا جائے گا کہ یہ علم لغو، بیکار اور فضول ہے۔ علم کی غرض و غایت اس کا استعمال میں لانا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہے۔ ''اَلشَّيْءُ اِذَا خَلَا عَنِ الْغَايَةِ لَغَا'' جب شے اپنی غرض و غایت سے خالی ہو جاتی ہے، تو وہ لغو اور بیکار ہو جاتی ہے۔ گھوڑے کی غرض و غایت یہ ہے کہ اس پر سواری ہو، جب وہ سوار ہونے نہ دے اور بدکنا

---

① پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۲۹۔ ② مسند احمد، حدیث وابصۃ بن معبد الاسدی ج: ۳۶ ص: ۴۳۸۔ السنن للامام الدارمی، کتاب البیوع، باب دع ما یریبک الی مالا یریبک، ج: ۸، ص: ۲۸، رقم: ۲۵۸۸۔ مشکاۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب الکسب وطلب الحلال، ج: ۲، ص: ۱۲۶، رقم: ۲۷۷۴۔

شروع کرے، کھانے کو سینکڑوں روپے روز کھا جائے اور جب مالک سواری کے لئے آئے تو دولتیاں مارنا شروع کردے، تو کہا جائے گا کہ گھوڑے کی غرض وغایت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ گھوڑا گولی ماردینے کے قابل ہے۔ حالاں کہ گھوڑا موجود ہے۔ اور عمدہ شکل میں ہے۔ مگر جتنی اچھی شکل ہوگی، آقا کو اور بری معلوم ہوگی۔ جب غرض پوری نہیں ہوگی۔ غرض اس سے یہ ہے کہ سواری کا کام دے، تو جب شے اپنی غرض سے خالی ہوجاتی ہے، وہ لغو بن جاتی ہے اور گولی ماردینے کے قابل ہوتی ہے۔

اگر انسان بیوی کرتا ہے، اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ وہ گھر کی مالکہ بنے، گھرستی کا کام کرے، اس کی نسل بڑھے۔ اگر وہ اتنی پھوہڑ ہو کہ گھر کو بھی تباہ کردے۔ نسل اس سے نہیں چلتی۔ تو سوائے اس کے کہ خاوند اسے طلاق دے یا اس کو ایک طرف بٹھا کے کوئی دوسرا نکاح کرے، اس کے سوا اور کیا کرے گا۔ جو اس کے نکاح کی غرض وغایت تھی، جب حاصل نہ ہوئی تو وہ لغو اور بیکار ہوگئی، کسی نے اگر بہت زیادہ دلداری کی اور ہمدردی کی تو طلاق نہیں دے گا، کچھ روزینہ مقرر کرے گا اور کہے گا چوکی پر بیٹھ کر "اَللّٰہُ اَللّٰہُ" کرتی رہ، اس کے سوا تو کسی کام کی نہیں ہے اور دوسرا نکاح کرے گا۔ غرض جب شے اپنی غرض وغایت سے خالی ہوجاتی ہے تو لغو اور بیکار بن جاتی ہے۔ اسی طرح سے علم اگر عمل کا فائدہ نہ دے تو وہ علم لغو اور بیکار ہے۔ وہ وبالِ جان بن جائے گا، اور فضول ہوجائے گا، تو جب تک علم پر عمل کی غایت مرتّب نہ ہو، علم بیکار ہے۔ اس سے معلوم ہوا علم محض انسان کو نجات نہیں دلاسکتا۔ نجات دلانے والی چیز انسان کا عمل ہے جو اس علم کے مطابق ہو۔ یہ اصل میں نجات دینے والی چیز ہے۔ اس واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ'' انسان سب کے سب تباہ وبرباد ہیں بچیں گے کون؟ صرف علم والے اور پھر فرماتے ہیں: ''وَالْعَالِمُوْنَ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَامِلُوْنَ'' علماء بھی سب کے سب وہ بچیں گے جو اپنے علم پر عمل کرنے والے ہوں گے۔ تو عمل نجات کا ذریعہ ہے۔ محض کورا علم نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔

تجمّل علم کا فتنہ..... کورا علم تو تجمّل ہے۔ اور ایک ترفّع ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: اخیر زمانے میں علم تجمّل کا ذریعہ بن جائے گا، جیسے انسان اپنے کپڑوں سے زینت حاصل کرے گا، اپنی رنگت سے زینت حاصل کرے گا، اسی طرح اپنے علم سے بھی زینت حاصل کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہوگا۔ علم کو استعمال میں لاکر انسان نجات کی طرف نہیں چلے گا۔ بلکہ فخر ومباہات کا ذریعہ بنالے گا۔ تو ایسا علم انسان کے اوپر وبالِ جان ہے۔ اس لئے فرمایا کہ علماء بھی سب کے سب تباہ وبرباد ہیں۔ اگر اپنے علم پر عمل کرنے والے نہ ہوں۔ گویا انسانیّت کی غرض وغایت علم ہے اور علم کی غرض وغایت عمل ہے، اگر علم نہیں تو انسانیت لغو ہے۔ اگر علم ہے اور عمل نہیں تو علم لغو اور بیکار ہوگیا۔ غرض علم پر عمل نجات کا ذریعہ ہے۔

سیرتِ انسانی کا تیسرا جوہر..... لیکن اگر آپ غور کریں تو عمل بھی نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔ اس واسطے کہ عمل ایک ڈھانچہ ہے، جب تک اس کے اندر روح نہ ہو، وہ محض ایک لاش ہے اور لاش کارآمد ثابت نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی ڈھانچے میں روح موجود نہ ہو تو وہ اس قابل ہے کہ اسے جلد از جلد زمین میں دفن کردیا جائے۔ اگر وہ لاش یوں ہی پڑی رہے گی

تو پھولے گی، پھٹے گی، بدبو پیدا ہوگی دماغ خراب ہوں گے، تو لاش کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اسے جلد سے جلد خاک میں ملا دیا جائے، جلد سے جلد اسے دریا برد کر دیا جائے۔ ورنہ دنیا کا دماغ صحیح سالم نہیں رہے گا۔

اسی طرح سے عمل ایک لاش اور ایک ڈھانچہ ہے۔ اگر اس کے اندر روح موجود ہے تو وہ اخلاص اللہ کی ہے کہ وہ خالص اللہ کے لئے ہو، اس میں شرک کا شائبہ بھی نہ ہو۔ اگر اس میں شرک کا شائبہ ہے وہ عمل غیر اللہ کے لئے ہے یا وہ عمل مشترک ہے کہ کچھ اللہ کے لئے ہے کچھ غیر اللہ کے لئے ہے تو درحقیقت وہ عمل بے روح کا ایک ڈھانچہ ہے۔ اور وہ عمل سوائے اس کے کہ پھولے، پھٹے، سڑے اور گلے، آخرت میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔ تو عمل کی روح اخلاص ہے کہ خالص اللہ کے لئے ہو، اس میں غیر کی رضا کی آمیزش نہ ہو۔

رضائے خلق کا طریق...... بلکہ غیر بھی جب ہی راضی ہوگا، جب اس کی رضا پیش نظر ہو۔ کیوں کہ جب اللہ کی رضا پیش نظر ہوگی، اغیار بھی راضی ہوں گے۔ اور اگر صرف غیروں کے راضی کرنے کی فکر کرو گے تو نہ وہ راضی ہوں گے نہ اللہ راضی ہوگا۔ تو کوئی بھی راضی نہ ہوا اور خدا کو راضی کرنے کی فکر کی تو غیر بھی راضی ہو جائے گا، انسان بھی راضی ہو جائے گا۔ انسان ہی نہیں بلکہ حیوان بھی راضی ہو جائے گا، نباتات بھی راضی ہوں گے۔ جمادات بھی راضی ہو جائیں گے۔ ’’مَنْ کَانَ لِلّٰهِ کَانَ اللّٰهُ لَهٗ‘‘ ① جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ جس کا اللہ ہو جائے ساری کائنات اس کی ہو جاتی ہے، اس سے سرتابی نہیں کر سکتی تو۔

تو از حکمِ داور گردن مپیچ   کہ گردن نہ پیچد ز حکمِ تو ہیچ

تیرا کام یہ ہے کہ مالک کے حکم سے گردن مت پھیر، اگر تو نہ پھرا تو ساری گردنیں تیرے آگے جھک جائیں گی۔ اور اگر تو نے مالک سے گردن پھیر لی تو ساری گردنیں تیرے سے الگ ہو جائیں گی اور اکڑ جائیں گی۔ بہر حال اللہ کو راضی کرے گا تو مخلوق خود بخود راضی ہو جائے گی، اور وہ راضی نہ ہوئے تو کوئی بھی راضی نہیں ہوگا۔ اس ’’ایک‘‘ کو آدمی پکڑ لے۔

مالک کی نگاہ کی عظمت...... ہارون الرشید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنے دربار میں ایک دفعہ جوش میں آکر اعلان کیا کہ آج جو شخص جو کچھ مجھ سے مانگے گا، میں اس کو دوں گا۔ لوگوں نے مانگنا شروع کیا۔ کسی نے کہا مجھے گورنری دے دیجئے، اس نے کہا۔ دے دی۔ کسی نے کہا مجھے فلاں قلعہ دے دیجئے۔ اس نے کہا میں نے دے دیا، کسی نے کہا مجھے دس لاکھ روپے دے دیجئے، اس نے کہا میں نے دے دیا، ہر ایک نے اپنی اپنی مراد پیش کرنی شروع کی اور بادشاہ نے پوری کرنی شروع کر دی۔

ہارون الرشید کی پشت پر ایک باندی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی تو ہارون نے کہا تو نے اب تک کچھ نہیں مانگا؟ اس نے کہا ان احمقوں کو نمٹنے دو، اس کے بعد مانگوں گی، ہارون الرشید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔ اچھا۔ یہ میری

① احیاء علوم الدین، بیان توکل المعیل ج: ۴ ص: ۲۷۴.

دولت کے امراء، وزراء سب کے سب احمق ہیں۔اس نے کہا سب پاگل اور بے وقوف ہیں۔انہیں مانگنا ہی نہیں آتا۔ ہارون سمجھا کہ ناقص العقل تو ہے ہی، کون اس کے منہ لگے، خاموش ہو گئے، لوگ مانگنے پر کھڑے ہوئے تھے، کسی نے کچھ مانگا، کسی نے کچھ مانگا، وہ دیتے رہے، جب سب نمٹ گئے تو ہارون الرشید نے کہا، اب تو مانگ کیا مانگتی ہے۔ اس نے کہا سارے بے وقوف تو نمٹ چکے ہیں۔اب میرے مانگنے کا موقع ہے، کیا آپ مجھے دیں گے۔؟ ہارون الرشید نے کہا۔ میں تو اعلان کر چکا ہوں کہ جو کوئی آج مجھ سے جو مانگے گا میں اس کو دوں گا، اس نے جا کر ہارون الرشید کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا کہ ''میں تو آپ کو مانگتی ہوں، آپ میرے ہو جایئے''۔

اس واسطے کہ جب آپ میرے ہیں تو قلعے بھی میرے ہیں، خزانے بھی میرے ہیں، رعایا بھی میری، ملک بھی میرا، اگر آپ میرے نہیں ہیں تو خزانہ آئے گا نہیں، اگر آئے گا تو پھر چھن جائے گا۔اس لئے میں تو آپ کو مانگتی ہوں۔تو اس نے کہا جتنے مانگنے والے تھے ان میں سے جس نے دس لاکھ مانگے، اسے دس لاکھ مل گئے، آگے کچھ نہیں ملا، کسی نے قلعہ مانگا آپ نے قلعہ دے دیا، آگے اس کی کوئی چیز نہ ہوئی، میں نے جو چیز مانگی، وہ مل گئی۔تو ساری چیزیں میری ہیں۔اور میں نے ان کو بے وقوف اس لئے کہا کہ اگر دس لاکھ مل گئے تو دس لاکھ ہی ہوئے، زائد تو نہ ہوئے، اور وہ دس لاکھ بھی معرض خطر میں ہیں۔اس لئے کہ اگر ہارون الرشید کی نگاہ پھر گئی اور اس نے کہہ دیا کہ ان سے یہ چھین لو، اور قلعہ دیا تھا، بعد میں نگاہ پھر گئی تو قلعہ چھین جائے گا، اگر وزارت دی تھی، بعد میں نگاہ پھر گئی تو بادشاہ کہہ دیں گے کہ اس سے عہدہ چھین لو۔تو اصل میں تو بادشاہ اور صدر کی نگاہ ہوتی ہے۔اس کو دیکھا جاتا ہے، اگر یہ قائم ہے تو یہ سب چیزیں ہیں۔اگر وہ نہیں ہے تو کسی چیز کے آپ مالک نہیں بن سکتے۔

تسخیرِ خلائق...... یہی حالت ہے اللہ والوں کی اور دنیا والوں کی کہ دنیا والے کوئی قلعہ مانگتا ہے، کوئی لاکھ مانگتا ہے، کوئی کروڑ مانگتا ہے اور اللہ والے کہتے ہیں کہ ''یا اللہ! ہمیں تو آپ درکار ہیں، اور کوئی چیز درکار نہیں، جب آپ مل گئے تو ساری دنیا ہماری، سارے قلعے ہمارے، سارے ملک ہمارے ساری مخلوق ہماری، جانور بھی ہمارے سامنے سر جھکائیں گے، اور انسان بھی''۔

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اگر جمادات کو حکم کرتے ہیں، وہ فرماں برداری کرنا اپنا فخر جانتے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو استنجاء کی ضرورت محسوس ہوئی اور ریگستان چٹیل میدان تھا، درخت اور سایہ دور دور تک میلوں پر تھا۔آپ نے دو درختوں کو اشارہ فرمایا، تو ادھر سے وہ درخت دوڑتا ہوا چلا آرہا ہے، ادھر سے وہ درخت دوڑتا ہوا چلا آرہا ہے۔ دونوں نے مل کر اپنی شاخیں ملا دیں اور اس طرح سے ملا دیں کہ ہر طرف سے بالکل پردہ سا ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضروریات سے فارغ ہوئے۔اس کے بعد اشارہ فرمایا۔وہ درخت اپنی جگہ چلا گیا۔ یہ درخت اپنی جگہ چلا گیا۔حکومت تو یہ ہے کہ ساری کائنات پر حکمرانی ہے اور کیوں ہے؟ اس لئے کہ جو کائنات کا مالک ہے اسے اپنا لیا تو ساری چیزیں اپنے قبضے میں آگئیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بڑی شان اور بڑے رتبے ہیں۔ان کے خدام وغلام اوران اولیاءِ کرام کی بھی بڑی شان ہے کہ جب وہ اپنے کوحق تعالیٰ کے سپرد کردیتے ہیں تو ساری کائنات ان کی تعمیل حکم کرنا اپنا فخر جانتی ہے،اپنے لئے سعادت جانتی ہے، جمادات بھی حاضر نباتات بھی حاضراورانسان بھی حاضر۔سب چیزیں سامنے حاضر رہتی ہیں۔یہ اخلاص للہ کی برکت ہوتی ہے کہ اپنے کوخالص اللہ کے سپرد کردے،جس میں غیر کا شائبہ نہ ہو۔

قلبِ مشرک کا تذبذب......اس لئے کہ جب غیر کا شائبہ ہوگا تو حضرت عیسٰی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: دو۲ آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کرسکتا۔جو چند آقاؤں کا غلام ہوگا تو ایک کی خدمت کی طرف جائے گا تو اسے ڈر ہوگا کہ دوسرا ناراض نہ ہوجائے۔اس کی خدمت کی طرف جائے گا تو فکر پڑے گی کہ تیسرا ناراض نہ ہو جائے،اور سب کوایک وقت میں راضی رکھنا مشکل ہے۔تو نتیجہ یہ کہ چارآقاؤں کا غلام کسی ایک آقا کی خدمت نہیں کرسکتا۔خادم وہی ہوگا جوایک کا غلام ہو۔سب سے کٹ کرایک کا ہوجائے گا کہ مرتا ہوں تواس کے لئے، جیتا ہوں تواس کے لئے،اس کے قلب میں قوت ہوگی۔اس واسطے کہ قوت کا مرکز اخلاص ہےاورقوت یقین سے پیدا ہوتی ہے،ترددا ور تذبذب سے قلب میں ضعف پیدا ہوتا ہے،تو مشرک کے دل میں کبھی جان نہیں ہوسکتی اور موحّد کبھی ضعیف القلب نہیں ہوسکتا،موحّد کے قلب میں اس کی توحید کی وجہ سے قوت ہوتی ہےاورمشرک کے دل میں جان نہیں ہوسکتی،جس کے کروڑوں خدا ہوں،وہ کسی ایک طرف جھکے گا تو دوسرے کی فکر پڑے گی،اس کے دل میں جان نہیں رہے گی،ہمیشہ ڈانواں ڈول رہے گا۔

قلبِ موحد کا یقین......اورموحّد کے قلب کے اندر قوّت ہوتی ہے۔تو موحّد اس کو ہی کہتے ہیں جوایک کا ہوکر بقیہ سے قطع نظر کرے۔

موحّد چہ برپائے ریزی زرش   کہ فولادِ ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نباشد زکس   ہمیں است بنیادِ توحید وبس

موحّد کسے کہتے ہیں؟ کہ اس کے قدموں پر لاکھوں روپیہ ڈال دو، یااس کے سر پر فولادِ ہندی کی تلوار لے کر کھڑے ہوجاؤ۔اسے نہ کسی کا ڈر ہوگا نہ کسی سے امید ہوگی وہ توایک کا ہوچکا ہے نہ طمع مائل کرسکے گی، نہ خوف مائل کرسکے گا۔

روحِ عمل......تو ''ایک کا ہوجانا'' اسی کے معنی ہیں ''اخلاص''۔اورعمل کے اندر اخلاص سے روح پیدا ہوتی ہے۔ جس عمل کے اندر شرک کا شائبہ بھی ہو،وہ عمل اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا،اس میں روح ہی نہیں ہے۔

اور شرک فقط یہی نہیں ہے کہ آدمی دو۲ خدا مانے،خدا کوایک مانے،صفات میں شرک اختیار کرے یہ بھی شرک ہے،صفات میں ایک مانے افعال میں شرک اختیار کرے۔یہ بھی شرک ہے۔افعال میں بھی ایک مانے،تو ذات بھی ایک،صفات بھی ایک،صفات میں بھی وحدانیت اورافعال میں بھی،لیکن عبادت میں شرک کرنے لگے

کہ دو کے سامنے سجدہ کرے، یہ بھی شرک ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ ظاہر میں سجدہ بھی ایک ہی کے سامنے کرے تب بھی شرک کا ایک مقام ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اللہ کی عبادت کر رہا ہے مگر دل میں یہ خیال ہے کہ لوگ مجھے سمجھیں کہ بڑا عبادت گزار ہے تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ریاء سب سے بڑا شرک ہے۔ دیکھنے میں شرک معلوم نہیں ہوتا مگر حقیقت میں شرک ہے۔ اور حدیث میں ارشاد ہے: ''اَلشِّرْکُ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ'' ① بعض شرک ایسا دقیق ہوتا ہے جیسا کہ چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی چلے تو اس کی کھسکھساہٹ اتنی دقیق ہوتی ہے کہ کان نہیں سن سکتے۔ تو جیسے اس کا ادراک نہیں ہوتا، اس شرک کا بھی ادراک نہیں ہوتا۔ وہ یہ کہ آدمی ایک اللہ کی عبادت کرے، اس کو یکتا جانے، صفات میں بھی یکتا جانے، ریا دکھلاوا بھی نہ ہو، مگر پھر بھی ایک درجہ کا شرک ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کے اندر عُجب موجود ہو۔ یعنی عبادت کرتے وقت یہ خیال موجود ہو کہ میں بہت بڑا کام کر رہا ہوں، کون ہے جو میرے برابر عبادت کر سکے۔ یہ جو عجب اور خود بینی پیدا ہوئی۔ یہ بھی اس سے زیادہ دقیق قسم کا شرک ہے، جو عمل کو ضائع کر دے گا، اس سے اندازہ ہوا کہ عمل کا ضائع ہونا شرک سے ہے اور عمل کی بقاء اخلاص سے ہے۔ تو جس چیز سے شے کی بقا ہوتی ہے اسی کو تو روح کہا جاتا ہے، بدن روح سے باقی رہتا ہے اور اگر عمل اخلاص سے باقی ہو تو اخلاص عمل کی روح ہے، جب تک اخلاص نہیں ہوگا عمل قابلِ قبول نہیں ہوگا، اسی کو فرماتے ہیں کہ: ''وَالْعَامِلُوْنَ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ''

عمل کرنے والے بھی سب کے سب ہلاک و برباد ہیں۔ اخلاص سے عمل کرنے والے بچیں گے، جن کے اندر خلوصِ نیت اور اخلاص موجود ہوگا۔ تو انسان کے لئے نجات کی کوئی صورت نہیں، نجات کا اوّلین درجہ علم ہے۔ علم بھی کارآمد اور کافی نہیں ہے۔ دوسرا درجہ عمل ہے، عمل بھی کارآمد نہیں۔ تیسرا درجہ اخلاص کا ہے۔ جب یہ تینوں چیزیں جمع ہو جائیں۔ علم بھی ہو۔ عمل بھی ہو۔ خلوص بھی ہو۔ تو کہا جائے گا کہ اب انسانیت کے جوہر اس کے اندر محقق ہو گئے، اب اس میں انسانیت اور کمالِ انسانیت آ گئی۔

سیرتِ انسانی کا چوتھا جوہر...... لیکن اگر غور کیا جائے تو اب بھی ایک چیز باقی رہ گئی، اگر وہ نہ ہو تو پھر یہ تینوں چیزیں اکارت بن جاتی ہیں۔ یہ تینوں چیزیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ نہ علم نجات دلائے گا نہ عمل، نہ اخلاص۔ للہ جب تک وہ چوتھا جوہر موجود نہ ہو۔ اور وہ کیا ہے۔ ایک آدمی علم رکھتا ہے۔ بڑا اچھا عالم ہے، عمل بھی کر رہا ہے اور مخلصانہ عمل کر رہا ہے، لیکن اس عمل کرنے کے بعد مطمئن ہو بیٹھا کہ نجات تو میرے گھر کی باندی ہے۔ تو وہ ملے گی، اللہ سے بےفکر ہو بیٹھا۔ یہ نہیں جانتا کہ جس نے اخلاص دیا ہے اگر وہ کل کو ناخوش ہو جائے اور یہ چھین لے تو میری کیا گت بنے گی۔ اجسے دینا آتا ہے اسے لینا بھی آتا ہے۔ جو علم دے سکتا ہے وہ لے بھی سکتا ہے۔ جو اخلاص کا عطیہ بخشنے والا ہے اور وہ اسے چھین بھی سکتا ہے، اس لئے مخلص کا کام یہ ہے کہ چوبیس گھنٹے مودبانہ کھڑا رہے کہ کہیں

① مسند احمد، حدیث ابی موسیٰ الاشعریؓ ج: ۴۲ ص: ۴۳۳ رقم: ۲۰۱۳۳.

مالک کی نگاہ نہ بدل جائے اور یہ ساری نعمتیں مجھ سے سلب ہو جائیں۔ تو جب تک انسان کے اندر مالک کے راضی رکھنے کی فکر نہ، ہو وہ اطمینان سے نہ بیٹھے۔ فکر میں رہے کہ معلوم نہیں کل کو کیا بات پیش آئے، اپنے علم کے اوپر غرّہ نہ کرے، اپنے عمل کے اوپر غرّہ نہ کرے، اپنے اخلاص کے اوپر غرّہ نہ کرے۔ اسے توفیق خداوندی سمجھے، اگر ذرہ غرّہ کرلیا اور یہ سمجھ لیا کہ علم میرا ہے اور یہ ہنر میرا ہے۔ یہ عمل میرا ہے اور یہ اخلاص میرا ہے۔ بس یہ اس نے عمل کو اکارت کیا، تو یہ سمجھنے کے بجائے یہ سمجھے کہ یہ توفیق خداوندی ہے۔ یہ عطیہ الٰہی ہے اور جو دینا جانتا ہے وہ چھیننا بھی جانتا ہے۔ میں چوبیس گھنٹے اس کی چوکھٹ پر حاضر ہوں۔ ایسے نہ ہو کہ اس کی نگاہ بدل جائے اور یہ ساری نعمتیں مجھ سے چھین لی جائیں۔ اس کا نام ''فکر'' ہے، جب تک یہ فکر نہ ہو اور جب تک اس میں بے اطمینانی کی کیفیت یعنی ''تفکر'' کی کیفیت نہ، ہو اس وقت تک بقائے علم، بقائے عمل اور بقائے اخلاص کی کوئی صورت نہیں۔

مقرّبین بارگاہ کی گرفت کا اندازہ ......اور بالخصوص ؎

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

جو زیادہ علم والے، زیادہ عمل والے اور زیادہ اخلاص والے ہیں وہ زیادہ ہلاکت کے مقام پر کھڑے ہوئے ہیں کہ ذرا قدم گرے تو ادھر بھی جہنم، ادھر بھی جہنم، ان کے خطرات اور ان کے وسواس پر بھی ان کی گرفت ہوتی ہے۔ حدیث میں ایک واقعہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: سابق زمانے میں بنی اسرائیل میں ایک عابد زاہد گزرا ہے۔ روایت میں جس کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بُدُوْرُ السَّافِرَةِ فِيْ عُلُوْمِ الْاٰخِـرَةِ'' میں یہ حدیث نقل کی ہے۔ آخرت کے احوال کے بارے میں ایک کتاب اس نام سے لکھی ہے۔ اس میں قبر کے حالات، برزخ کے حالات اور عالم حشر کے حالات ہیں۔ اس میں اس واقعہ کی بھی روایت نقل کی ہے۔

پچھلی امتوں میں ایک عابد زاہد گزرا ہے جو ہر وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہتا تھا۔ عبادت و زہادت کے سوا اسے دوسرا کام نہیں تھا۔ اس نے یہ دیکھا کہ میں عبادت تو کرتا ہوں مگر دنیوی اشغال میں بیوی ہے، بچے بھی ہیں، عزیز بھی ہیں نیز کمانا اور کھانا، دنیا بھر کے دھندے ہیں اور مجھے عبادت سے یہ چیزیں غافل بناتی ہیں، کوئی ایسی صورت ہو کہ یہ دھندے ختم ہو جائیں اور میں صرف عبادت کے لئے فارغ ہو جاؤں تو اس نے تمام عزیزوں، رشتہ داروں اور بیوی بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر سمندر کے بیچ میں ایک ٹیلے کو اختیار کیا اور وہاں جا کر ایک کٹیا ڈال دی کہ بس یہاں پر بیٹھ کر اللہ کی یاد میں مشغول رہوں گا۔

پچھلے ادیان میں رہبانیت جائز تھی۔ اس نے رہبانیت اور گوشہ گیری اختیار کی، عزلت اور انقطاع اختیار کیا اور جا کر بیٹھ گیا، جو چھپر یا ڈالی تھی، اس کے نیچے بیٹھ گیا۔ حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس کی غذا کا یہ سامان کیا کہ اسی ٹیلے پر ایک انار کا درخت اگا یا، اس میں بڑے بڑے انار لگے اور اس کڑوے سمندر میں اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑی پر ایک میٹھے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔

اس عابد کا کام یہ تھا کہ روزانہ چوبیس گھنٹے میں ایک انار کھالیا اور ایک کٹورا پانی پی لیا اور چوبیس گھنٹے اس طرح اللہ کی یاد میں مشغول کہ نہ سونا، نہ آرام کرنا، بس یہی اس کا کام تھا۔ پانچ سو برس اس طرح سے اس کی عمر کے گزرے، گویا خالص عبادت جس میں ریا اور دکھلاوے کا کوئی شائبہ نہیں، ظاہر ہے کہ پہاڑ کے ٹیلے پر کس کو دکھلائے گا؟ وہاں اس کو دیکھنے والا کون ہے؟ تو خالص عبادت کی جس میں علم بھی صحیح تھا، عمل بھی صحیح تھا، اور اخلاص بھی صحیح تھا۔ یہاں تک کہ اس کے انتقال کا وقت آیا تو اس نے اللہ سے دعا کی کہ ”اے اللہ! یہاں کوئی اور تو نہیں ہے جو مجھے نہلائے، کفنائے اور دفن کرے، یہاں تو میں اور تیری ذاتِ بابرکات موجود ہے۔ اس لئے ایک درخواست میری یہ ہے کہ مجھے سجدہ کی حالت میں موت دے۔ تاکہ عین خالص عبادت میں میری موت آئے“۔ اور دوسری درخواست یہ ہے کہ میری لاش کو قیامت تک سجدہ کی حالت میں محفوظ رکھا جائے۔ تاکہ میں قیامت تک تیرا صورتاً سجدہ گذار بندہ سمجھا جاؤں۔ پانچ سو برس کی عبادت تو نے مجھے عطا کی۔ اب ہزاروں برس قیامت تک بقیہ رہ گئے ہیں۔ اس میں میری لاش سجدے میں پڑی رہے۔ بگڑنے نہ پائے۔ تاکہ قیامت تک اسی طرح سجدے میں پڑا رہوں۔ اور میرا جسم سجدہ گذار رہے“۔

حق تعالیٰ نے دونوں دعائیں قبول فرمائیں۔ سجدے کی حالت میں موت آئی اور اس کا بدن بھی محفوظ ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اس کا بدن آج تک محفوظ ہے۔ حق تعالیٰ نے اس ٹیلے پر اتنے بڑے بڑے عظیم الشان درخت اگا دیئے، اتنی اندھیری ہوگئی کہ اول تو لوگوں کا وہاں پہنچنے کا موقع نہیں، اور کوئی پہنچ جائے تو ہیبت کی وجہ سے اندر نہیں جاسکتا۔ اس لئے کہ اگر لوگوں کو موقع مل جاتا تو لوگ تو مردوں کو نہیں چھوڑتے، قبروں کو نہیں چھوڑتے، اس کے آگے جا کے جانے کیا کیا کرتے۔ حق تعالیٰ نے اس کو چھپا دیا کہ نہ وہاں پہنچیں گے، نہ خرافات ہوں گی۔ اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ ”اس عابد کو اللہ تعالیٰ کے آگے پیش کیا گیا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے بندے، میں نے اپنے فضل وکرم سے تجھے بخشا اور میں نے تجھے جنت عطاء کی“۔ اس عابد کے دل میں ایک وسوسہ گزرا کہ پانچ سو برس تو میں نے عبادت کی اور خالص عبادت کی، بیوی بچوں کو چھوڑا، عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا، اتنی محنت اٹھائی، اب بھی اپنے ہی فضل وکرم سے بخشا، کم سے کم میری دلداری ہی کے لئے فرماتے کہ: تیری عبادت کے بدلے میں تجھے جنت عطاء کی۔ ذرا میرا دل تو خوش ہوجاتا کہ میں نے کچھ کیا۔ اب تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ محض اپنے فضل وکرم سے بخشا۔ یہ اس کا کوئی عقیدہ نہیں تھا۔ نہ کوئی جما ہوا خیال تھا، ایک وسوسے کے درجے میں اس کے دل میں یہ بات گزری تو۔

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

جو مقربانِ بارگاہ الٰہی ہوتے ہیں۔ ان کے افعال پر اور ان کے خیالات پر بھی گرفت ہوتی ہے، تم اپنے دل میں یہ خیال کیوں لائے؟ حق تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا۔ اس بندے کو بجائے جنت کی طرف لے جانے کے جہنم

کی طرف لے جاؤ، مگر جہنم میں ڈالنا نہیں ہے۔ بس اتنی دور لے جاؤ کہ وہاں سے جہنم پانچ سو برس کا راستہ ہو، مگر جہنم کی ہوا وہاں پہنچتی ہو۔ وہاں لے جا کر اسے کھڑا کر دو۔ تو حدیث میں ہے کہ: ملائکہ لے گئے۔ اتنی دور تک لے جا کر اسے کھڑا کیا۔ جہنم کی ایک لپٹ اور لو آئی تو سر سے پیر تک یہ عابد خشک ہو گیا، اور اس نے پیاس پیاس چلانا شروع کیا۔ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ: غیب سے ایک ہاتھ نمایاں ہوا۔ جس میں ٹھنڈے پانی کا ایک کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑا ہوا آیا کہ اے اللہ کے بندے! یہ پانی مجھے دے۔ جتنا یہ آگے بڑھا وہ ہاتھ اتنا پیچھے ہٹ گیا۔ یہ اور آگے بڑھا۔ وہ اور پیچھے ہٹ گیا۔ آواز یہ آئی کہ پانی تو مل سکتا ہے مگر مفت نہیں ملے گا، قیمت سے ملے گا۔ اور قیمت یہ ہے کہ جس شخص کے پاس پانچ سو برس کی خالص عبادت ہو اگر وہ دے تو یہ کٹورا پانی کا مل سکتا ہے۔ ورنہ نہیں مل سکتا۔

یہ عابد دوڑا اور کہا کہ یہ حاضر ہے۔ میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے۔ یہ اس نے دی اور پانی کا کٹورا لے کر پیا۔ دم میں دم آیا اور جان میں جان آئی۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ملائکہ کو ارشاد ہوا کہ اس عابد کو لوٹا کر لاؤ۔ وہ واپس لایا گیا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ اے بندے! تیری پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت سے تو ہم ادا ہو گئے۔ اور وہ تو نے ہی تجویز کی تھی۔ یعنی ایک کٹورا پانی۔ تو تُو نے اپنی پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت ایک کٹورا پانی تجویز کیا۔ وہ ہم نے تجھے دے دیا، معاملہ برابر سرابر ہو گیا، نہ ہمارے ذمے کچھ رہا۔ نہ تیرے پاس کچھ رہا۔ اب جو دنیا میں تو نے ہزاروں کٹورے ہمارے پئے اس کا حساب دے کہ ایک ایک قطرے کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کے آیا۔ اور جو اناروں کے لاکھوں دانے کھائے، ایک ایک دانے کا حساب دے۔ ایک ایک دانے کے بدلے کتنے سجدے کئے۔

اور یہ تو دانا اور پانی ہے۔ وہ جو تیری آنکھوں میں ہم نے روشنی بخشی تھی کہ ایک تارِ نگاہ سے سینکڑوں چیزیں دیکھ لیتا تھا، ایک ایک تارِ نگاہ کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کیا کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟ اور وہ جو ہم نے ٹھنڈی ہوائیں دی تھیں کہ تو سانس لیتا تھا اور تیری زندگی قائم تھی، ایک ایک سانس کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کیا عبادت لے کر آیا ہے؟ اور فرمایا کہ: یہ تو اسباب ہیں۔ ان سب کے بعد جو ہم نے تجھے عبادت کی توفیق بخشی اور طاقت دی تھی، اس توفیق کے بدلے میں بتلا تو کیا لے کر آیا ہے؟ یہ عابد تھرّا گیا۔ اور اس نے کہا کہ

مدارِ نجات فضل ہے، عمل نہیں..... ”اے اللہ! کسی کو کسی کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ تیرا فضل ہی نجات دلائے گا۔ ہر آدمی تیرے ہی فضل سے بخشا جائے گا“۔

اسی کو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”لَنْ یُّنْجِیَ اَحَدَکُمْ عَمَلُهٗ.“ تم میں سے کسی کو تمہارا عمل نجات نہیں دلائے گا، محض اللہ کا فضل نجات دلانے والا ہے۔ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ حدیث سن کر عرض کیا: ”وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ“؟ یا رسول اللہ! کیا آپ کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائے گا؟ جس عمل کی قیمت وہ ہے کہ سارے آسمان اور زمین تل جائیں۔ ایک سجدے کی قیمت نہ پڑ سکے۔ وہ عمل بھی نجات

نہیں دلائے گا؟ فرمایا: ''لَا! اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ.'' مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا، جب تک اللہ کا فضل دستگیری نہ کرے تو جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے کہ ہم اپنی کسی عبادت کے اوپر غرّہ کریں، تو اصل میں اس عابد کو یہ بتلانا تھا کہ عمل نجات دھندہ نہیں ہے، فضل خداوندی نجات دھندہ ہے۔ ①

توفیق عمل، علامت فضل ہے..... مگر بھائی! اس کا یہ مطلب مت سمجھ لجیو کہ جب عمل سے نجات نہیں ہوتی تو لاؤ پھر آج سے عمل وغیرہ سب چھوڑ دو، نہ نماز، نہ روزہ، نہ حج، نہ زکوۃ اس لئے کہ نجات تو عمل سے نہیں ہے، وہ فضل سے ہوگی۔ اور فضل کے بارے میں کیسے پتہ ہے کہ کس پر ہوگا۔ اس کے سہارے سے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ؟ جس کی نجات ہونی ہوگی فضل سے ہو جائے گی۔ نہیں ہونی ہوگی نہیں ہوگی۔ عمل تو کارآمد ہے نہیں۔ تو یہ نتیجہ مت نکال لینا۔

بے شک عمل نجات دلانے والا نہیں۔ عمل سے نجات نہیں ہوگی، فضل سے نجات ہوگی۔ مگر فضل کے پہچاننے کا طریقہ درحقیقت عمل ہے۔ اگر عمل کر رہا ہے تو یہ علامت ہے کہ اللہ کا فضل متوجہ ہے۔ اور جو عمل نہیں کر رہا تو یہ اس کی علامت ہے کہ اس کے اوپر اللہ کا فضل متوجہ نہیں ہے۔ اس واسطے عمل مت ترک کیجئے۔ یہ مت سمجھ لینا کہ جب عمل سے نجات نہیں تو عمل کو چھوڑ دو، بے شک عمل نجات دھندہ نہیں، فضل ہے، مگر فضل کی علامت عمل ہے۔ عمل ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ فضل خداوندی متوجہ ہے۔

دنیا میں فضل کی علامت یہ ہے کہ توفیق مل رہی ہے اور آخرت میں فضل کی علامت یہ ہے کہ جنت مل رہی ہے اور نعمتیں مل رہی ہیں۔ دونوں جہانوں میں دستگیری کرنے والا فضل ہے۔ عمل بھی تو فضل ہی سے کرتے ہیں۔ فضل متوجہ نہ ہو تو آپ عمل کیسے کریں۔؟ اس لئے کہ عمل توفیق سے کرتے ہیں۔ توفیق دینے والے وہ ہیں تو فضل ان کی طرف متوجہ ہو گیا، اگر توفیق نہ دیں تو آدمی عمل نہیں کرسکتا۔ تو سب سے بڑی نعمت انسان کے حق میں توفیق ہے۔

روحِ شکر..... حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے فرمایا تھا ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا﴾ ② اے داؤد ہمارا شکر ادا کرو۔ تو حضرات انبیاء علیہم السلام اللہ کے کلام کو پورا سمجھتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ بے شک میں شکر ادا کروں گا۔ میرا فرض ہے کہ میں ادا کروں۔ یوں بھی فرض تھا اور جب آپ حکم دے رہے ہیں تو بالکل ہی فرض ہو گیا۔ مگر سوچ رہا ہوں کہ شکر ادا کروں تو کس طرح سے ادا کروں؟ اس واسطے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکر کو ادا کرنے کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو وہ توفیق ایک نعمت ہوگئی، پھر اس نعمت کا مجھے شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، اس شکر کی توفیق پھر آپ دیں گے۔ تو پھر ایک نعمت بن گئی، تو اس سے پہلے اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کروں گا، وہ بھی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل، ج: ۵، ص: ۲۳۷۳، رقم: ۶۰۹۸.

② پارہ: ۲۲، سورة السبا، الآیة: ۱۳.

توفیق آپ دیں گے تو وہ نعمت ہوگئی، تو اس سے پہلے ایک اور شکر نکلا تو ہر شکر سے پہلے ایک اور شکر نکلتا ہے، میں شکر کی ابتداء کروں تو کس طرح سے کروں؟ میں تو ادائے شکر سے عاجز ہوں۔

ادھر سے جواب آیا کہ ''اے داؤد! اگر تو نے یہ سمجھ لیا کہ تو ہمارے شکر ادا کرنے سے عاجز ہے تو اپنی ہار مان لینا، یہی شکر کی ادائیگی ہے۔ تو نے شکر ادا کر دیا۔ کوئی بندہ اللہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ ہم تو فرض ادا نہیں کر سکتے حق تو کیا ادا کریں گے۔ عاجز ہیں۔ اس عجز کو سمجھ لینا کہ ہم عاجز ہیں۔ یہی شکر کی ادائیگی ہے۔ اپنی ہار مان لے کہ میں عاجز ہوں''

سندِ شکر...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو سیّد الحامدین ہیں جن سے بڑھ کر اللہ کی حمد وثنا کرنے والا عالم میں کوئی نہیں۔ اخیر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے ہیں کہ: ''اَللّٰھُمَّ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ '' (1) اے اللہ! میں تیری حمد وثناء کا ایک شمّہ بھی نہیں ادا کر سکتا میں تیری حمد وثناء کا احصاء ہی نہیں کر سکتا''۔ بس مختصر یہ ہے کہ تو ویسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنے آپ کو فرما دیا۔ میں عاجز ہوں کہ تیری حمد اور تیری ثناء وصفت کو ادا کر سکوں۔ اس لئے کہ وہ لامحدود ہے اور بندہ محدود ہے۔ اس کا کمال محدود، اس کی عقل محدود، اور اس کی طاقت محدود، تو محدود سے لامحدود کی ادائیگی کیسے ممکن ہے؟ ''اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ '' یہ وہی عجز کا ہی اعتراف ہے کہ میں تیری ثناء ادا کرنے سے عاجز ہوں۔ اسی کو سب سے بڑی سند سمجھا گیا جس نے ہار مان لی اور عجز تسلیم کر لیا وہی سب سے بڑی ثناء کرنے والا ہے۔ میرا ہی ایک شعر ہے۔ لمبی نظم تھی وہ میں بھول گیا۔ اس میں کا ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ؎

خدا کی تو ثنا کامل یہی ہے ۔۔۔ کہ ہم سے کچھ ثناء ممکن نہیں ہے

ہم سے کوئی ثناء ممکن نہیں۔ بس ثناء کا ادا کرنا ہے۔ بہر حال حق تعالیٰ شانہ جب فضل فرماتے ہیں تو توفیق بھی دی جاتی ہے۔ جب توفیق آتی ہے تبھی انسان عمل کرتا ہے۔ تو عمل اُدھر سے ہوا۔ ہماری طرف سے نہ ہوا۔

نفیِ عمل سے اثباتِ عمل...... اس واسطے اس عمل کو زیادہ قبول کرتے ہیں جس میں آدمی سمجھ لے کہ میں نے کچھ نہیں کیا، اور جو خود کہے کہ میں نے سب کچھ کیا، اسے کچھ نہیں ملے گا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ اگر کوئی بندہ عمل کر کے عزّہ اور غرور کرے اور یوں کہے کہ اے اللہ! دیکھ میں نے تیری نماز پڑھی، میں نے حج کیا، میں نے جہاد کیا، میں نے یہ کام کیا۔ تو جواب میں فرماتے ہیں کہ: ''نالائق! تو نے کیا کیا۔ بدن کے اندر طاقت تو ہم نے دی تھی، توفیق تو ہم نے دی تھی، ارادہ تو ہم نے پیدا کیا۔ تو نے کیا کیا؟ اور اگر کوئی بندہ سب کچھ کر کے کہے کہ اے اللہ! تیری ہی توفیق سے سب کچھ ہوا۔ میرے اندر کوئی طاقت نہیں۔ ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِکَ'' کوئی حول اور طاقت میرے اندر نہیں، توفیق تیری، طاقت تیری، ارادہ وقتی تیرا، میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ''نہیں۔ عمل تو تُو نے ہی کیا، حرکت تو تُو نے ہی کی، مسجد تک قدم اٹھا کر تو ہی گیا تھا۔ تو نے ہی سب کچھ کیا ہے''۔

---

(1) السنن لابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب الدعاء فی الرکوع، ص: ۱۲۸۸، رقم: ۸۷۹.

غرض جو اپنے عمل کی نفی کرتا ہے اس کا اثبات کرتے ہیں۔ اور جو خود اثبات کرنے لگے، اس کی نفی کر دیتے ہیں، جو نیچا بنے اسے اونچا اٹھاتے ہیں۔ اور جو خود اونچا بننے لگے اسے زمین کے اوپر پٹخ دیتے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا کہ ؎

پستی سے سر بلند ہوا اور سرکشی سے پست   اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

جو جتنا نیچا بنتا ہے۔ اسے اونچا بناتے ہیں اور جو خود اونچا بننے لگتا ہے اس زمین پر گرا دیتے ہیں۔ تو اونچا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی نیچا بنجائے۔ بلند و بالا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ پست بن جائے۔

طریقِ عزّت...... عزت والا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ خود اپنی ذلت پیش کر دے، عزّت آ جائے گی۔ اور جو خود ہی اپنی عزت کو سراہنے لگے، تو پھر ادھر سے پھٹکار برسے گی۔ ذلت برسے گی، اس لئے کہ کوئی عزّت کا مستحق نہیں۔ عزّت تو اللہ کی ہے۔ جو اس کے آگے جھک جائے اس کے لئے عزت آتی ہے۔

﴿فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ① تو عزت اللہ کی، اس کے رسول کی اور مومنین کی ہے۔ بہر حال طریقہ عزت کا یہ ہے کہ اپنی ذلت محسوس کرے۔ اگر کوئی مخدوم بننا چاہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ یوں کہے کہ دیکھو لوگو! میں مخدوم ہوں۔ تم سب میرے غلام ہو۔ لوگ کہیں گے۔ نامعقول! تجھے شرم نہیں آتی، ایسا کلام کر رہا ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ پست بن جائے گا۔ مخدوم بننے کا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کا خادم بن جائے، لوگ سروں پر اٹھائیں گے، وہ خود ہی مخدوم بن جائے گا۔ تو مخدوم بننے کا طریقہ خادم بننا ہے نہ کہ مخدومی کا دعویٰ اور ادّعا کرنا۔ دعویٰ کرنے والے کو پٹخ دیا جاتا ہے۔ بہر حال فضلِ خداوندی ہوتا ہے تو توفیق بھی ملتی ہے، توفیق ملتی ہے تو عمل بھی ہوتا ہے اور جس کی اس حقیقت پر نظر ہے کہ پہلے فضل آیا، پھر توفیق آئی، پھر میرے اندر ارادہ پیدا کیا گیا، پھر میرے اندر طاقت پیدا کی گئی، تب جا کے عمل ظاہر ہوا۔ جو اس سلسلے کو جانتا ہے۔ وہ کبھی دعویٰ نہیں کرے گا کہ میں نے عمل کیا، وہ تو یہ کہے گا کہ یہ سب کچھ اوپر سے ہے۔ میرے اندر تو کچھ بھی نہیں۔

سلسلۂ عمل پر نگاہ کا ثمرہ...... اب اس کی ایسی ہی مثال ہوگئی کہ دو آدمی کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں آئیں، اور یہ ان دونوں کا دعویٰ ہو کہ یہ جو کھیتی کھڑی ہوئی ہے۔ اس کا دانہ سب میرا ہے۔ وہ بھی کہے کہ میرا ہے اور یہ بھی کہے کہ میرا ہے۔ تو ایک شخص سے مجسٹریٹ پوچھتا ہے کہ یہ زمین تمہاری ملکیت ہے؟ کہ نہیں صاحب! زمین کا میں مالک نہیں ہوں۔ بیج تم نے ڈالا تھا؟ نہیں بیج بھی میں نے نہیں ڈالا۔ پانی تم نے دیا تھا؟ نہ صاحب! پانی بھی اسی نے دیا تھا۔ میں نے نہیں دیا تھا۔ چھ مہینے خون پسینہ تم نے ایک کیا تھا؟ نہیں صاحب! وہ بھی اسی نے کیا تھا۔ باقی دانہ میرا ہے۔

تو مجسٹریٹ کہے گا کہ اس پاگل کو کان سے پکڑ کر نکال دو، نہ اس کی زمین، نہ اس نے بیج ڈالا، نہ اس نے پانی دیا، نہ اس نے محنت کی۔ اور دانے کا دعوے دار ہے۔ یہ کدھر سے دعوے دار ہوگیا؟ جس کی زمین ہے، جس نے بیج

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۸۔

ڈالا ہے، جس نے محنت اٹھائی، دانہ بھی اسی کا ہوگا۔

ایک عمل کرنے والا دیکھتا ہے کہ میرے اندر طاقت نہیں ہے۔ وہ بھی خدا نے دی، عمل کرنے کا ارادہ بھی میرا اپنا نہیں تھا، وہ بھی خدا نے دیا، توفیق میں نے خود نہیں پیدا کی، وہ بھی اسی نے دی۔ باقی عمل کا مالک میں ہوں۔ تو خدا کہے گا کہ اس نامعقول کو کان سے پکڑ کر نکال دو۔ توفیق ہم نے دی، قوت ہم نے دی، ارادہ ہم نے دیا، یہ عمل کا کیسے مالک ہے؟

اور جس کی نگاہ پورے سلسلے پر ہے کہ آپ ہی فضل کرنے والے، آپ ہی توفیق دینے والے، آپ ہی قوت بخشنے والے، آپ ہی کرا دینے والے، میرا تو کچھ بھی نہیں۔ یہ سب آپ کا فضل ہے۔ تو پھر فرمائیں گے۔ نہیں، تو نے ہی عمل کیا تھا، تو نے ہی حرکت کی تھی، تو ہی چل کر گیا تھا۔ غرض جو اپنے کو خود سراہتا ہے۔ اسے مٹا دیتے ہیں۔ اور جو اپنے آپ کو مٹاتا ہے، اسے باقی کر دیتے ہیں، اسے اونچا اٹھا دیتے ہیں۔

دولتِ تفکر...... عرض کرنے کا مطلب یہ نکلا کہ نہ علم میں نجات ہے۔ نہ عمل محض میں نجات ہے، نہ اخلاص میں نجات ہے، جب تک کہ اس کے ساتھ فکر شامل نہ ہو۔ کہ نہ غرور ہو، نہ اپنے اوپر اعتماد اور بھروسہ ہو، نہ اپنی عبادت اور عمل پر کوئی غرّہ ہو۔ بلکہ ہر حالت میں اللہ پر بھروسہ ہو کہ میں نے کچھ نہیں کیا، یہ انہیں کا دیا ہوا ہے، اگر وہ چھین لیں تو میں کیا کروں گا۔ یہ فکر جس کو دامن گیر ہوگی اس کا اخلاص بھی کارآمد ہوگا۔ اس کا عمل بھی کارآمد ہوگا۔ اور اس کا علم بھی کارآمد ہوگا۔

روحانیّت کے اربعہ عناصر...... اب انسانی سیرت کے اجزائے ترکیبی چار نکل آئے۔ ایک علمِ صحیح و علم نافع، ایک عملِ صحیح و عمل صالح، ایک اخلاص کامل اور ایک فکرِ سلیم۔ یہ چار چیزیں انسان میں جمع ہوں گی تو کہا جائے گا کہ یہ انسان صحیح قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم کی بجائے جہالت ہو تو کہیں گے یہ حیوان ہے۔ علم ہو مگر عمل نہ ہو تو کہیں گے عالم بے عمل ہے۔ گردن زدنی ہے۔ عمل ہے مگر منافق ہے، مخلص نہیں ہے تو کہیں گے نامعقول ہے۔ مخلص بھی ہے مگر بے فکرا ہے تو کہیں گے نہایت غلط قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم بھی ہو، عمل بھی ہو، اخلاص بھی ہو اور آخرت کی فکرِ صحیح بھی ہو، کہا جائے گا، یہ قابلِ اعتماد انسان ہے۔ یہ ہے جس کی انسانیت کی داد دی جا سکے اور کہا جا سکے کہ ''یہ انسان ہے''۔ یہ انسانیت کے چار اجزاء نکلے۔ جیسے اس کے بدن کے چار اجزاء تھے، آگ، پانی، ہوا، مٹی، ان چار سے مل کر بدن بنتا تھا۔ اسی طرح سے انسانیت کے چار جوہر ہیں۔ علم نافع، عمل صالح، اخلاصِ کامل، اور فکرِ صحیح۔ یہ چار چیزیں اگر ہیں تو کہا جائے گا، انسان ہے، ورنہ کہا جائے گا کہ حیوان ہے، یا انسان نما حیوان ہے۔

کمالِ علمِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)......بس جب یہ چار چیزیں معلوم ہوگئیں اور یہ انسانیت کا معیار ہے۔ اس معیار کے اعتبار سے جانچا جائے تو سب سے زیادہ کامل اس معیار سے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نکلتے ہیں کہ جن کا علم فقط علم نافع نہیں بلکہ علمِ قطعی ہے۔ جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں، کتابوں سے حاصل کیا ہوا علم نہیں بلکہ ان کے علم سے کتابیں بنتی ہیں، وہ براہ راست اللہ کے سرچشمے سے علم لیتے ہیں۔ وحی کا علم ان کے اوپر آتا ہے جو لازوال

دولت ہے۔ جو قطعی دولت ہے۔ جس میں نہ شک کی آمیزش ہے، نہ جہل وتردّد کی آمیزش ہے۔ نہ شبہات وخیالات کی آمیزش ہے۔ خالص علم جو چشمۂ وحی سے ہے۔ وہ علم کامل اور علمِ قطعی ان کے قلوبِ مبارکہ پر ڈالا جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ o عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾ ① یہ قرآن کریم؟ یہ اللہ کی نازل کردہ چیز ہے۔ اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم)! یہ تمہاری بنائی ہوئی چیز نہیں ہے۔ انسانوں نے بیٹھ کر نہیں بنائی، یہ کسی پارلیمنٹ کا ریزولیشن نہیں ہے۔ یہ کسی کمیٹی کی تجویز اور مشروعات میں سے نہیں ہے۔

﴿لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② ''یہ اللہ کا نازل کردہ کلام ہے''۔ اور نازل کرنے والا اللہ۔ اور کس کے ذریعے سے؟ ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ ③ روح الامین (علیہ السلام) اس کو لے کر آئے جس میں خیانت کا کوئی ادنیٰ جذبہ نہیں۔ بلکہ کامل امانت دار فرشتہ جس کی شان ہی امین ہے۔ وہ اس کو لے کر آیا ہے ''عَلٰى قَلْبِكَ.'' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر لا کر اتارا۔ جس قلب کے اندر غیر اللہ کے لئے گنجائش ہی نہیں تھی، فقط ایک اللہ کے لئے وہ قلب مستعد تھا، تو اس قلبِ صافی کے اوپر جبریل امین لے کر آئے، اور نازل کرنے والا اللہ ہے۔ اور کیا لے کر آئے۔؟ کلامِ خداوندی اور صفتِ خداوندی لے کر آئے، اللہ کی ایک صفت لے کر آئے جو اس ''عبدِ پاک'' کے قلب پر ڈال دی گئی۔ وہ صفتِ خداوندی سے متصف ہو گیا۔ اور وہ کمالِ خداوندی سے مکمل بن گیا اور وصفِ الٰہی سے موصوف بنا، اس پاک قلب کے اوپر یہ پاک چیز نازل کی گئی کہ اس علم کے اندر نہ شبہ کی گنجائش، نہ شک کی گنجائش۔ نہ وہم کی آمیزش، نہ خیالات کی آمیزش، تو علم کے اعتبار سے دیکھا جائے تو قطعی اور اس کی کثرت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ''اُوْتِيْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ'' ④ اگلے اور پچھلے سارے علوم ایک قلبِ مبارک میں جمع کر دیئے گئے۔ تو کمیت دیکھیں تو اتنی بڑی کہ عالم کے تمام علوم کا سرچشمہ قلبِ مبارک کو بنایا گیا۔ کیفیت کو دیکھا جائے تو اتنی قطعی کہ شبہ کی آمیزش کی گنجائش نہیں۔ تو جس کا علم اتنا کامل ہو کہ نہ کیفاً اس میں نقص کی گنجائش نہ کماً اس میں نقص کی گنجائش، نہ عدد کے لحاظ سے کمی، نہ کیفیت کے لحاظ سے کمی تو اس سے بڑھ کر عالم کون ہوگا۔

اس واسطے اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ یہی ہے کہ مخلوقات کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عالم کوئی نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلم الخلائق اور اعلم البشر ہیں۔ سارے انسانوں میں، سارے ملائکہ میں سب

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۹۲ تا ۱۹۴۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء الآیۃ ۱۹۲۔

③ پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۹۳۔ ④ حدیث کی متداول کتب میں یہ حدیث نہیں ملی البتہ علامہ تقی الدین نے اپنی کتاب ''امتاع الاسماع'' میں یہ ذکر کیا ہے: واعطی صلی اللہ علیہ وسلم علم الاولین والآخرین. ولھذا اشار صلی اللہ علیہ وسلم بقولہ: علمت علم الاولین، فصل فی ذکر الفضائل التی خص اللہ تعالیٰ بھا نبیہ ج: ۳ ص: ۱۷۷، ۱۷۸۔

سے زیادہ علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا، آپ کے علم کے مقابلہ میں ساری کائنات کا علم ایسا ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرہ۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اللہ کے علم کے مقابلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ایسا ہے جیسے سمندر کے سامنے قطرہ، اس لئے کہ جو فرق خالق اور مخلوق میں ہے۔ وہی فرق خالق اور مخلوق کی صفت میں ہوسکتا ہے۔ وہی فرق خالق و مخلوق کے علم میں ہوسکتا ہے۔ لیکن مخلوق، مخلوق کو جب نسبت دی جائے تو نہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں، نہ ملائکہ میں، نہ اولیاء میں، کسی کے اندر کوئی اتنا بڑا عالم نہیں۔ سب کے علوم کو جمع کیا جائے تو ایک ذاتِ واحد امین بنی ہوئی ہے۔ تو جو اتنا بڑا عالم ہو۔ تو ظاہر بات ہے کہ "اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ"

سارے انسان تباہ و برباد ہیں اور علماء بچیں گے۔ تو علماء کے اندر اتنا بڑا عالم ہو کہ کائنات میں اس سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی نہ ہو۔ تو اس سے زیادہ درجہ نجات کا اور کسے مل سکتا ہے؟ اس سے بڑھ کر کمالات اور فوز و فلاح کا درجہ اور کس کے لئے ہوسکتا ہے؟ اور اس سے بڑھ کر کس کی سیرت اور مقدس ہوسکتی ہے، تو سیرت کا ابتدائی جز جو علم کامل تھا، وہ اتنا ہے کہ عالم میں اس کی نظیر کوئی نہیں۔ سیرت بھی ایسی ہوگی کہ عالم میں اس سیرت کی نظیر کوئی نہیں۔ سارے حضرات انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کو دیکھو تو سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کوئی نسبت نظر نہیں آئے گی، سارے حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرات اولیاء رحمہم اللہ علیہ کے اخلاق دیکھو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کے سامنے کوئی نسبت نظر نہیں آئے گی۔

کمالِ عملِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)...... سارے کاملین کے اعمالِ صالحہ کو دیکھو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملِ صالح کے مقابلے میں کوئی نسبت نہیں معلوم ہوگی۔ امت کا عقیدہ یہ ہے اور صحیح عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سجدہ ساری امت کی لاکھوں برس کی عبادات سے زیادہ ہے۔

وجہ اس کی صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی صورت کو نہیں دیکھتے عمل کی حقیقت کو دیکھتے ہیں۔ جس عمل کے اندر اخلاص کامل اور معرفت کامل ہو، وہی عمل وزن دار ہوتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اخلاص والا کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عارف باللہ کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسنِ نیت رکھنے والا کون ہے؟ کہ جن کی جوتیوں کی نسبت سے لاکھوں مخلص بن گئے، کروڑوں اخلاص والے بن گئے، جن کی جوتیوں کے طفیل سے حسنِ نیت کے پہچاننے والے پیدا ہوئے کہ نیت کہتے کسے ہیں؟ حسنِ نیت کے معنی کیا ہیں؟ تو جس ذاتِ بابرکات میں اخلاص وہ ہو جس کی نظیر نہ ہو، اس کے عمل میں جتنا وزن ہوگا، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے۔ کہ اس کے ایک سجدے میں اتنا وزن ہوگا کہ عالم کے سارے سجدوں میں اتنا وزن نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے ایک سجدہ عالم کے سجدوں سے بڑھ کر ہوگا، تو سب سے بڑا علم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات میں ہے۔ تو یہ سیرت کا ایک عنصر ہوا۔

معیارِ اعمال...... دوسرا عنصر؟ وہ عملِ صالح ہے ظاہر بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عملِ صالح سے بڑھ کر

کس کا عمل صالح ہوسکتا ہے۔ جو عمل کا معیار ہے، اور اسوہ اور کسوٹی ہے۔ عامل کے عمل کو پہچاننے کی کسوٹی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے کہ اس کے مطابق ہے تو عمل مقبول ورنہ مردود۔ غرض جس کا عمل معیار اور کسوٹی ہو، جس سے عمل کو پرکھ پرکھ کر عمل کو ناقص اور کامل کہہ سکیں، تو جس عمل کی حقیقت یہ ہے تو حقیقی معنی میں عمل وہی ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی عمل، عمل نہیں، اس لئے کہ وہ عمل دوسرے اعمال کو بنانے والا ہے۔ وہ عمل نہ ہو تو دوسروں کے عمل ہی نہ بنیں۔ تو جو عملوں کا سرچشمہ اور تخم ہو کہ جس سے اعمال سرزد ہورہے ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ اس عمل کی عظمت اور قدر و قیمت کتنی ہوگی۔ تو علم تو یہ کہ اولین و آخرین کے جامع ہوں اور عمل یہ کہ سب کے اعمال کا سرچشمہ ہوں۔ اگر اس عمل پر منطبق ہیں تو وہ عمل ہیں۔ ورنہ نہیں۔ اس لئے سیرت کا دوسرا جوہر وہ عمل پاک ہے۔ اس عمل کے بارے میں یہی کہا جائے گا اور یہی عقیدہ رکھا جائے گا اور یہ عقیدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر تھوڑا سا بھی عمل کریں تو امت کے لاکھوں برس کے عملوں سے بھی وہ عمل اونچا ہے۔

امرِ حقیقت ...... اور ''عِیَاذًا بِاللّٰہِ''!۔ یہ محض کوئی شاعریت نہیں ہے۔ یا معاذ اللہ! محض حسنِ عقیدت سے نہیں کہا جارہا ہے۔ بلکہ یہ امر حقیقت ہے۔ حدیث میں یہ واقعہ فرمایا گیا ہے کہ: بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے جانچنے کا ارادہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کیا ہے؟ تو تین آدمی آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیتِ نبوت میں موجود نہیں تھے۔ بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے انہوں نے پوچھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کیا ہے؟ ان کے ذہنوں میں یہ تھا کہ گھر میں آپ ہر وقت تسبیح و تہلیل اور نماز میں مشغول رہتے ہوں گے۔ تو پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کیا ہے؟

تو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: جواب میں یہ کہا گیا کہ جیسے گھر ہستیوں کی زندگی ہوتی ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز بھی پڑھتے ہیں۔ ذکر اللہ بھی کرتے ہیں۔ موقع اور ضرورت ہوتی ہے تو گھر میں جھاڑو بھی دے لیتے ہیں، برتنوں کو مانجھ بھی لیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا جوتا بھی گانٹھ لیتے ہیں، کپڑا اپھٹ جاتا ہے تو بیٹھ کر سی بھی لیتے ہیں۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے بیٹھ کر بات چیت بھی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مزاح بھی فرمالیتے ہیں۔ کبھی ازواج مطہرات سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ کوئی کہانی سنادو، کوئی قصہ سنادو۔ تو جیسے گھر ہستیوں کی حالت ہوتی ہے۔ ویسی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت ہے۔

تو سن کر ''کَاَنَّھُمْ تَقَالُّوْھَا......'' ان تینوں صاحبوں نے اس عمل کو کم سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل کم ہے۔ مگر اپنی طرف سے عذر یہ بیان کیا کہ حضور کی ذاتِ مبارک تو وہ ہے کہ اللہ نے آپ کی اگلی اور پچھلی زلتیں پہلے ہی معاف کردی ہیں۔ اس لئے اگر آپ بالکل ہی عمل نہ کریں تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقامات میں سب سے اونچے ہیں اور جنتوں میں سب سے اونچے ہیں۔ مگر یہ عمل کم ہے۔ یہ وہ سمجھے، گویا عذر یہ بیان کردیا، اگر آپ اتنا بھی عمل نہ کریں تب بھی آپ کے مراتب میں فرق نہیں آسکتا۔ اس کے بعد تینوں نے باہم ایک

دوسرے کے سامنے عہد کیا۔ اور کہا کہ یہ عمل تو کم ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اب ہم اپنی گھریلو زندگی کیسے بنائیں، تو ایک نے کہا کہ "اَمَّا اَنَا فَاُصَلِّی اللَّیْلَ اَبَدًا۔" میں عہد کرتا ہوں کہ اب عمر بھر کبھی نہیں سوؤں گا۔ اور پوری رات نماز کے اندر مشغول رہوں گا۔ دوسرے نے کہا "اَنَا اَصُوْمُ النَّھَارَ اَبَدًا وَلَا اُفْطِرُ" "میں عہد کرتا ہوں کہ ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا، کبھی بھی افطار نہیں کروں گا"۔ تیسرے نے کہا "اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَآءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا" "میں عہد کرتا ہوں کہ عورتوں سے دور رہوں گا اور کبھی بھی نکاح نہیں کروں گا"۔

تو یہ ان تینوں نے باہمی عہد و پیمان کیا۔ ہمیشہ قیام وصیام اس شخص کی نسبت جو رات کو سوتا بھی ہو اور قیام بھی کرتا ہو، دن کو روزہ بھی رکھتا ہو اور افطار بھی کرتا ہو، بظاہر اونچے درجے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح نکاح کے بعد جو ذمہ داریاں اور بیوی بچوں کے مشاغل بڑھ جاتے ہیں اور عبادت کے لئے موانع پیش آتے ہیں تو اس جذبے سے ترکِ نکاح کرنا کہ ہمیشہ عبادت کرتا رہوں اور بیوی بچے مخل نہ ہوں، اس شخص کی نسبت جو بیوی بچوں کے مشاغل کے ساتھ عبادت کرتا ہو۔ اونچے درجے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔ گویا مخلوق کے ساتھ تعلق کا کوئی درجہ نہیں حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ ہی تعلق محض ہے۔

تو ترکِ تعلقات اور عدد کے لحاظ سے یہ عبادات گویا اونچے درجے کی معلوم ہوتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور استفسار فرمایا: "اَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ کَذَا وَکَذَا اَمَا وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ وَاَتْقَاکُمْ لَہٗ۔" تم لوگوں نے ایسی ایسی گفتگو کی ہے۔ خدا کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ متقی ہوں، تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں، تم میں سب سے زیادہ خوف وخشیت والا ہوں۔ اور اس طرف اشارہ کیا کہ تم لوگوں نے عبادت کے معنی غلط سمجھے، رات بھر نماز پڑھو تو یہ عبادت ہے، دن بھر روزے رکھے جائیں تو یہ عبادت ہے، بیوی اور نکاح چھوڑ دیں تو یہ عبادت ہے۔ عبادت کے معنی یہ ہیں کہ پوری زندگی اللہ کے احکام کے نیچے گزرے، یہ عبادت ہے۔ دوستوں سے باتیں کرنا بھی عبادت ہے، گھر میں بیوی سے معاملہ کرنا بھی عبادت ہے۔ تہجد پڑھنا بھی عبادت ہے۔ یہ تمام چیزیں عبادت میں داخل ہیں۔ جو حق تعالیٰ شانہٗ نے زندگی بنائی ہے اس زندگی کو اللہ کے احکام کے نیچے جاری رکھنا یہ فی الحقیقت حقیقی عبادت ہے اس لئے فرمایا کہ: "فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِاَھْلِکَ عَلَیْکَ حَقًّا. وَاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا فَصُمْ وَ نَمْ وَقُمْ." ①

تم پر تمہارے بدن کا بھی حق ہے، تم پر تمہاری بیوی کا بھی حق ہے۔ تم پر تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے۔ تو تم جاگ کر اللہ کی عبادت کرو کہ اللہ کا حق ادا ہو، اور تم رات کو سو بھی جاؤ تاکہ نفس کا حق ادا ہو، تم جہاد بھی کرو، تاکہ اللہ کا حق ادا ہو۔ اور تھوڑی دیر اس سے ہٹ کر اہل وعیال میں رہو تاکہ بیوی بچوں کا بھی حق ادا ہو۔ تو تم سوؤ بھی، جاگو بھی، روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو۔ یہ سارے کام کرو تو کہا جائے گا کہ تم نے عبادت کی۔ تو عبادت کو تم نے فقط نماز

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم ص ۱۵۴، رقم: ۱۲۷۵.

اور روزے میں محدود کر دیا۔ اپنی پوری زندگی کو اللہ کی رضا کے تحت گزارنے کو عبادت کہتے ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرت سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ اس زندگی کو گزارنے والا کوئی اور نہیں۔

کمالِ اخلاصِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)...... اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ نمازیں پڑھنے والا ہوں، اس لئے میرا اجر زیادہ ہے اور میں تم سب سے زیادہ روزے رکھنے والا ہوں۔ بلکہ اگر گنا جائے اور شمار کیا جائے تو شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی تعداد سے امتیوں کی تعداد بڑھ جائے۔ وہ دن بھر رات بھر یہی کرتے رہے۔ تو ''عبادت کا عدد'' نہیں پیش کیا۔ فرمایا ''اِنِّیْ اَخْشَاکُمْ بِاللّٰہِ وَ اَتْقَاکُمْ لِلّٰہِ'' میرے اندر اللہ کا خوف تم سب سے زیادہ ہے، تقویٰ تم سب سے زیادہ ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کی روح پیش کی کہ اس کامل تقویٰ اور خوف وخشیت کے ساتھ ایک سجدہ بھی ہوگا تو وہ تم سب کی ہزاروں برس کی عبادت سے زیادہ بڑی عبادت شمار ہوگا، گویا عبادت کی اصل بنیاد وہ اخلاص للہ ہے۔ وہ خشیتِ للہ ہے۔ وہ تقویٰ باطن ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ سے ڈرے۔ اس تقویٰ باطن کے ساتھ جو عبادت ہوگی وہ اکمل ترین عبادت ہوگی۔ غرض جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم کامل اور جامع ہے کہ اولین وآخرین کے علم کا مجموعہ ہے اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کامل ہے۔ وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تقویٰ اور اخلاص بھی اتنا کامل ہے کہ ساری امتوں کا اخلاص مل کر بھی وہ اخلاص نہیں ہوسکتا جو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاص عطاء کیا ہے۔ اس لئے کہ جو قلبِ مبارک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا وہ قلب کسی اور کو عطاء نہیں کیا گیا، جو جسد مبارک اور روح پرفتوح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی وہ روح اور جسم کسی اور دوسرے کو نہیں دیا گیا، تو اس ظرف میں جو چیزیں بھریں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ظرف میں بھر سکتی تھیں۔ دوسرے ظروف میں نہیں آ سکتی تھیں۔ غرض علم وعمل بھی انتہائی کامل، اخلاص للہ بھی انتہائی کامل۔

کمالِ فکرِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)...... اور آگے رہ گئی۔ فکر۔ کہ آخرت سے ڈرنا اور مطمئن نہ ہونا۔ اس کا عالم یہ ہے کہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''نماز پڑھ کر جب میں ایک سلام پھیرتا ہوں تو مجھے یہ توقع نہیں ہوتی کہ دوسرے سلام کا مجھے موقع ملے گا یا نہیں ملے گا''۔ اس درجہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطرہ اور خوفِ آخرت محسوس فرماتے تھے اور اپنی موت کی یادگاری اور تذکر، یہ اس درجہ پر ہے کہ فرماتے ہیں۔ ایک سلام پھیر کر دوسرے کی توقع نہیں ہوتی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فکرِ آخرت کی حالت ہے۔

حدیث میں ہے کہ: ''کَانَ دَآئِمَ الْفِکْرَۃِ حَزِیْنًا'' ① آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات دائم الفکر رہتے، جیسے کوئی فکر مند بیٹھا ہو، کوئی غمگین بیٹھا ہو اور حزن وغم میں ہو، وہ فکرِ آخرت تھی، ہمہ وقت آخرت پیش نظر تھی، تو یہ انبیاء علیہم السلام ہی کو کمال دیا گیا ہے کہ ساری دنیا والوں کے حقوق ادا کریں اور فکرِ آخرت بدستور قائم

① الشمائل للترمذی، ج: ۱، ص: ۲۵۵.

رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے ہیں، بیوی بچوں سے بھی معاملہ ہے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی معاملہ ہے، حکومت کے فیصلے بھی آپ انجام دے رہے ہیں، فصل خصومات اور جہاد بھی ہو رہے ہیں، غنائم بھی تقسیم ہو رہی ہیں۔ مگر "فکرِ آخرت" ہمہ وقت بدستور ہے، بلکہ سارے اعمال کا وہی منشاء ہے، اسی سے یہ سارے اعمال انجام پا رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ متفکر کون ہے؟

روحِ ایمان...... اسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان درحقیقت "خوف اور رجاء" کے مجموعے کا نام ہے۔ یعنی نہ محض ڈرنے کا نام ایمان ہے۔ نہ محض امید باندھنے کا نام ایمان ہے۔ بلکہ یہ دونوں کیفیتیں جمع رہیں۔ امید بھی بندھی ہوئی ہو اور خطرہ بھی لگا ہوا ہو، تو فکر پیدا ہو جائے گی۔ یہی فی الحقیقت ایمان کی روح ہے۔

قرآن کریم میں دو لفظ فرمائے گئے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ﴿لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ① "اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ خدا کی رحمت سے مایوس ہونے والے کفار ہیں"۔ اس میں امید بتلائی گئی اگر کہ تم میں اللہ سے امید نہیں ہوگی۔ تو تم میں ایمان موجود نہیں۔ یہ کفار کا کام ہے کہ اللہ سے ناامید ہو جائیں، غرض اس میں رجا بتلائی گئی۔ اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا ﴿فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ② اللہ کی خفیہ تدبیر سے مطمئن بیٹھنے والے ہمیشہ گھاٹے میں رہیں گے"۔

تو مطلب یہ کہ مطمئن ہو کر مت بیٹھو، خوف اور فکر لگا رہے، تو اس میں گویا خوف بتلایا گیا۔ غرض پہلی آیت سے امید بتلائی گئی۔ دوسری آیت سے خوف بتلایا گیا اور خوف اور امید کے بیچ میں ایمان ہے۔ نہ محض امید باندھنے کا نام ایمان ہے اور نہ محض ڈرتے رہنے کا نام ایمان ہے۔

فکرِ عظیم...... عمل جب بھی کرے گا وہی کرے گا، جسے امید بھی لگی ہوئی ہو۔ خطرہ بھی لگا ہوا ہو۔ جو محض امید میں غرق ہے وہ خادم کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ محض خوف زدہ خادم ہو وہ کبھی عمل نہیں کر سکتا، جس کو ہر وقت آقا سے امید ہے کہ چاہے برا کروں چاہے بھلا کروں، چاہے ہزار دم گناہ کر لوں مگر بخشش ہی ہو جائے گی۔ آخر میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ سوچے گا کہ پھر عمل کی مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب آقا اتنا کریم ہے کہ بخش ہی دے گا، پھر میں خواہ مخواہ کیوں محنت اٹھاؤں، بخشا تو جاؤں گا۔ تو وہ عمل سے معطل ہو جائے گا، جس نے فقط امید باندھی۔

اور جسے ہر وقت خوف ہی خوف لگا ہوا ہو کہ کچھ ہی محنت کر لوں مگر جوتیاں ہی پڑیں گی، کچھ ہی محنت کر لو مگر پٹائی ہوگی، وہ کہے گا پھر عمل کی کیا مصیبت؟ جب اوّل بھی جہنم اور آخر بھی جہنم تو کیوں خواہ مخواہ محنت اٹھائی۔ وہ بھی عمل سے معطل ہو جائے گا، تو خوفِ محض میں رہنے والا بھی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ اور امیدِ محض میں غرق ہونے والا بھی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ عمل کون کرے گا؟

ایک طرف امید لگی ہوئی ہے کہ نیک کام کئے تو اجر ملے گا، اور ثواب ملے گا۔ ایک طرف خوف لگا ہوا ہے کہ

① پارہ: ۱۳، سورة يوسف، الآية: ۸۷. ② پارہ: ۹، سورة الاعراف، الآية: ۹۹.

اگر ذرا معصیت کی تو جہنم بھی تیار ہے۔تو ’’امید وبیم‘‘ کے مجموعے سے انسان کے عمل کی گاڑی چلتی ہے۔ یہ دو بازو ہیں۔ان دو بازوؤں سے عمل اڑتا ہے۔تو ایمان خوف اور رجا کے مجموعے کا نام ہے کہ اللہ سے امید بھی بندھی ہوئی ہو اور ڈر بھی لگا ہوا ہو۔اس لئے محض ڈر بھی ایمان نہیں اور محض امید باندھنا بھی ایمان نہیں۔ان دونوں کے بیچ میں رہنا یہی ’’تفکر‘‘ کہلاتا ہے۔یہی فکرِ عظیم کہلاتا ہے کہ ممکن ہے کہ میرا عمل صحیح نہ ہو، گرفت ہو جائے اور ممکن ہے کہ یہ گناہ بخشا جائے۔ میں توبہ کیوں نہ کرلوں، مالک میرا رحیم وکریم ہے، تو اللہ کی رحمت پر بھی نظر ہو اور اس کے جبر وقہر پر بھی نظر ہو۔اس پر بھی نظر ہو کہ ﴿نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ﴾ ① اور اس پر بھی نظر ہو کہ ﴿وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ﴾ ②

اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرے بندوں کو اطلاع کر دو کہ میں بہت بڑا غفور الرحیم ہوں اور یہ بھی کہہ دو کہ میرا عذاب بھی بہت بڑا سخت عذاب ہے۔ ایسا عذاب کوئی دوسرا نہیں دے سکتا جیسا میں دے سکتا ہوں۔تو دونوں شانیں بتلائی گئیں کہ رحمت کا طالب بنایا اور عذاب سے ڈرنے والا بنایا۔تو دونوں باتیں ایک حالت میں انسان میں مطلوب ہیں۔اسی کا نام ایمان رکھا گیا ہے تو فکر کامل ہوگی تو ایمان کامل ہوگا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر کو دیکھا جائے۔تو فرمایا گیا کہ: ’’کَانَ دَآئِمَ الْفِکْرَةِ حَزِیْنًا ‘‘ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوامی طور پر، ہمیشہ چوبیس گھنٹے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فکر میں غرق اور مستغرق ہیں۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سید المتفکّرین ہیں، سید المفکّرین ہیں۔عالم میں اتنی فکر کسی کو نہیں دی گئی جتنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔ اتنا بڑا اخلاص کسی میں نہیں تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا، اتنا بڑا عمل صالح کسی میں نہیں تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔اتنا بڑا علم نافع اور کامل کسی میں نہیں تھا جتنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔

جب انسانیت کی سیرت ان چار جزوں سے بنتی ہے تو جس انسان میں یہ چار جز علی وجہِ الاتم موجود ہوں گے،اس کی سیرت بھی ’’اکمل السیر‘‘ ہوگی،اس کی سیرت سب سے اونچے درجے کی سیرت ہوگی کہ کوئی سیرت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی،کوئی سیرت اس کے پاس نہیں پھٹک سکے گی۔

دستورِ زندگی...... اس سیرت کے جو لوگ مخاطب بنائے گئے ہیں۔ وہ مسلمان ہیں، وہ دنیا کے سارے انسان ہیں جن کے سامنے یہ سیرت پیش کی گئی ہے اور اس لئے پیش کی گئی کہ اس سیرت کو کسوٹی بنا کر ہم اپنی سیرتوں کو اس کے اوپر پرکھیں کہ اس سیرتِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کس حد تک ہماری عادات اور خصائل مطابقت کھاتی ہیں۔ اور کس حد تک ہم اس سے ہٹے ہوئے ہیں اور منحرف ہیں۔

غرض سیرت کا بیان اس لئے نہیں ہوتا کہ یہ کوئی کہانی ہے کہ اسے سنا دیا جائے، یہ کوئی قصہ ہے کہ اسے پڑھ کر پیش کر دیا جائے، یہ تو ایک معیار اور دستورِ زندگی ہے۔اس لئے پیش کی جاتی ہے کہ گھر جا کر ہر شخص اپنی زندگی کو اس

① پارہ: ۱۴، سورة الحجر، الآية: ۴۹، ۵۰. ② پارہ: ۱۴، سورة الحجر، الآية: ۵۱.

سیرت کے اوپر پیش کرے۔ آیا میرے اندر علم نافع ہے یا نہیں؟ جس سے میں حق و باطل میں امتیاز کر سکوں، آیا میرے اندر عملِ صالح ہے یا نہیں؟ جو میرے لئے نجات کا ذریعہ بنے۔ آیا میرے اندر اخلاص ہے؟ نفاق تو نہیں ہے کہ میرا عمل قابلِ قبول ہو سکے اور آیا میرے اندر فکر موجود ہے؟ یا میں بے فکری سے زندگی گزار رہا ہوں، میری کیفیت کیا ہے؟ انہی کیفیات کو جانچنے کے لئے سیرتِ مقدسہ صلی اللہ علیہ وسلم کسوٹی ہے جو آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

کتاب وسنّت کی چٹان

قرآن کریم آپ کے سامنے اصول پیش کرتا ہے۔ یہ تو علم ہے اور ذاتِ محمدی (عَلٰی صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفِ تَحِیَّةٍ وَّسَلَامٍ) کردار پیش کرتی ہے کہ یہ کسوٹی اور معیاری کردار ہے۔ اس پر اپنے عمل کو پرکھو تو عقائد کو قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھو کہ وہ صحیح ہیں یا غلط ہیں؟ اور عمل کو ذاتِ محمدی (عَلٰی صَاحِبِهَا اَلْفُ اَلْفِ تَحِیَّةٍ وَّسَلَامٍ) کے اسوۂ حسنہ کے اوپر پرکھو کہ کس حد تک عمل مطابقت کھاتا ہے؟ کس حد تک نہیں؟

اسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''تَرَکْتُ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا'' ① میں دو وزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ اگر تم ان سے تمسک کرتے رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے، کبھی راستے سے نہیں بھٹک سکو گے''۔ وہ دو چیزیں کیا ہیں؟ ''کِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِیْ'' ''اللہ کی کتاب اور میری سنت اور طریقۂ کار''۔ ان دو چیزوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ثَقَلَیْنِ'' وزنی چیزیں فرمایا۔ یعنی بھاری چیزیں۔ یہ اس لئے فرمایا کہ؟ جب فتنوں کے طوفان آتے ہیں اور فتنوں کا، فسق کا، کفر کا، فجور کا، اور منکرات کا دریا چڑھتا ہے، اس وقت اگر آپ نے کسی تنکے سے تمسک کیا تو طوفانوں میں تنکا بہہ جائے گا اور آپ بھی بہہ جائیں گے۔ اگر جان بچانے کے لئے کسی شہتیر کو پکڑا تو طوفان میں شہتیر نہیں ٹھہرا کرتے۔ وہ بھی بہہ جائیں گے، آپ بھی بہہ جائیں گے، اسی طرح اگر آپ نے کسی درخت سے تمسک کیا تو درخت کو طوفان جڑ سے اکھاڑ کر لے جائے گا، وہ بھی بہے گا، آپ بھی بہہ جائیں گے۔ لیکن اگر آپ کسی ایسی چٹان کو پکڑ لیں جو عظیم الشان پہاڑ کی مانند ہو کہ لاکھ طوفان آئیں مگر اس کو ہلا نہ سکیں، تو نہ چٹان ہل سکے گی نہ آپ بہیں گے، طوفان کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ تو کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''ثَقَلَیْنِ'' فرمایا۔ یعنی اتنی وزنی چیزیں ہیں کہ کتنے ہی بڑے فتنوں کے اور گمراہیوں کے جھکڑ چلیں لیکن کتاب وسنّت کی چٹان کو جس نے پکڑ رکھا ہے، وہ کبھی اپنی جگہ سے ہلنے والا نہیں ہے، اس کے علاوہ جس چیز سے بھی تمسک کرو گے، ہر چیز بہنے والی ہے۔ اتنی قوی نہیں ہے، وہ بھی بہے گی اور آپ بھی بہیں گے، تو ایک طرف قرآن کریم کو رکھا اور ایک طرف سنّت کو رکھا، جس کے معنی سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ حسنہ کے ہیں، تو حدیث اسوۂ حسنہ کو پیش کرتی ہے اور قرآنِ کریم علم کو پیش کرتا ہے۔ تو قرآن کریم پر اپنی فکر کو جانچو کہ عقائد صحیح ہیں یا نہیں۔؟ اور عمل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر جانچو، جس حد

① مؤطا امام مالک، کتاب الجامع، باب النهی عن القول بالقدر ج: ۵ ص: ۳۷۱.

تک مطابقت کھا جائے، سمجھو کہ حق ہے، جس حد تک انحراف کرے، سمجھو کہ غلط ہے، دیوار پر مارنے کے قابل ہے، ان کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

اسوۂ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اور زیادہ سہولت پیدا فرما دی۔ اور وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تو معیار اور کسوٹی ہے ہی۔ اس پر علم وعقیدہ اور عمل کو پرکھا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو بھی شامل کر لیا کہ وہ بھی معیار اور کسوٹی ہیں۔ اگر آپ اپنے علم وعمل کو ان کے اوپر پرکھو گے تو بھی حق وباطل کا پتہ چل جائے گا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی تو بہت ارفع اور اعلیٰ ہے۔ ہر کس وناکس کا پہنچنا تو بجائے خود ہے، اس کی بلندی کو نگاہ اٹھا کے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ لیکن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر ہر قسم کے نمونے موجود ہیں۔ ان میں تاجر بھی ہیں، زراعت کرنے والے بھی ہیں، فقہاء بھی ہیں، علماء بھی ہیں، حکماء بھی ہیں، گھر میں بیٹھنے والے بھی ہیں، خلوت پسند بھی ہیں، جلوت پسند بھی ہیں، مجاہد بھی ہیں، مجاہدہ پسند بھی ہیں۔ ہر نمونہ موجود ہے۔ تو فرمایا کہ میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) ستاروں کی مانند ہیں، جس کی روشنی میں چلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

"بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ" تو واضح فرما دیا کہ میری ذات تو ہے ہی معیار میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بھی تمہارے علم وعمل کے پرکھنے کا معیار اور کسوٹی ہیں۔ یعنی بالذات تو میں معیار ہوں، لیکن جسے میں معیار بتلا دوں وہ بھی معیار ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو معیار بتلایا۔

معیارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین...... حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہود ونصاریٰ میں بہتر فرقے ہوئے اور میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے۔ "كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً" سب کے سب ہلاکت میں پڑنے والے ہوں گے حقیقی معنی میں ایک نجات پائے گا۔ یعنی آخرت میں اعمال کی وجہ سے بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جن کو سزا مل جائے گی۔ گو وہ انجام کار چھٹکارا پا لیں گے، لیکن عقائد کی وجہ سے جن کو ہلاکت نصیب ہو گی وہ بہتر فرقے ہوں گے تہترواں فرقہ وہ ہے کہ عقائد کی وجہ سے اس پر کوئی وبال نہیں ہو گا، کوئی عملی خرابی یا کھوٹ ہوا تو معاف کر دیں گے؟ یا سزا دے دیں گے۔ تو فرمایا: "كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً" یہ سب کے سب ناری ہوں گے، ایک ناجی ہو گا"۔

اس پر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ ناجی فرقہ کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَا أَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَأَصْحَابِي" "آج کے دن جس چیز پر میں ہوں اور میرے صحابہؓ ہیں"۔ ①

یہی فی الحقیقت معیار ہے۔ تو اپنی ذات کو پیش کیا اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو پیش کیا۔ جس کا حاصل یہ نکلا کہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اور میرے عقیدے میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کا عقیدہ ایک ہے۔ میرے

① جامع الترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی افتراق ھذہ الامۃ ج: ۹ ص: ۲۳۵.

عمل کی نوعیت میں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کی نوعیت میں فرق نہیں، جو میرا عمل ہے۔ جو میری فکر ہے وہ ان کی فکر ہے، جو میرے مقاصد ہیں وہ ان کے مقاصد ہیں۔ اپنی نوعیت میں اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو شریک کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ تہتر فرقوں میں سے حق و باطل کو پرکھنے کے لئے ایک میں معیار ہوں اور ایک صحابہ رض اللہ عنہم معیار ہیں۔ ان پر تم اپنے آپ کو پیش کرو، جس حد تک مطابقت کھا جائے، سمجھو کہ حق پر ہے۔ جس حد تک منحرف ہو جاؤ، اس کی اصلاح کرو۔ سمجھو کہ یہ تمہارے اندر باطل ہے اور ناحق کی بات ہے۔ تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو کسوٹی بتایا۔

طبقۂ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... گویا کسی طبقے کو من حیث الطبقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجز صحابہ رضی اللہ عنہم کے، مقدس نہیں بتلایا۔ امت کے اندر۔ افراد آئیں گے جو کامل اور مکمل ہوں گے۔ مگر طبقہ کا طبقہ مقدس ہو۔ اس میں سے کوئی مستثنیٰ نہ ہو۔ یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا معیار ہے، تو جب یہ معیار قرار پا گیا تو آپ دیکھ لیجئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم معیار بن گئے۔

جس شخص کے اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت اور محبت دیکھیں سمجھو کہ حق پر ہے۔ اگر محبت نہیں، انہیں سب وشتم کرتا ہے یا انہیں گالم گلوچ کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ ناحق ہے وہ حقانی نہیں کہلائے گا۔ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ سمجھے کہ وہ سب کے سب متقی، پارسا اور پاکباز ہیں، ان کی نیتیں صادق ہیں۔ ان کے قلوب کا رخ سچا ہے تو سمجھا جائے گا کہ وہ حق پر ہے اور جو طبقہ یہ کہے گا کہ معاذ اللہ ان میں تو منافق بھی تھے۔ ان میں تو غلط کار بھی تھے۔ انہیں گالم گلوچ کرے، سمجھ لیجئے کہ وہ ناحق پر ہے۔ گویا ایک سیدھا سادہ معیار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرقوں کے حق و باطل ہونے کے بارے میں بتلا دیا۔ تو جو سب وشتم کرے، وہ بھی ناحق، جو قتلِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے درپے ہو وہ بھی ناحق، جو یوں کہے کہ ہم معیار ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم معیار نہیں ہیں۔ ہم ان پر نقد و تبصرہ کر سکتے ہیں وہ ہم پر نہیں کر سکتے۔ سمجھو کہ بطلان کی بات ہے۔ کوئی حقانیت کی بات نہیں ہے۔ غرض ایک سیدھا سا معیار فرقوں کے حق و باطل اور خطا و صواب کے پہچاننے کا بتلا دیا کہ مجھے دیکھ لو۔ اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو دیکھ لو۔

اعلانِ رضا...... بہرحال قرآن کریم نے جس طبقہ کی تقدیس کی ہے وہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے۔ فرمایا کہ: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ① وہ مہاجرین و انصار۔ اور بعد میں جو مہاجرین و انصار میں ملتے رہے، وہ سب کے سب۔ کون ہیں؟" ۔﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ "اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی"۔

مشترکہ اعلانِ رضا کیا۔ اللہ ان سے کبھی راضی نہیں ہو سکتا جن کے دل میں کوئی ادنیٰ کھوٹ اور ٹال ٹیک ہو، ان سے کبھی رضائے مطلق کا اعلان نہیں ہو سکتا۔ رضا کا اعلان ہے۔ اور قرآن کریم میں اعلان ہے۔ اور قرآن

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، ۱۰۰.

کریم قیامت تک بلکہ آگے تک چلنے والی ایک عظیم کتاب ہے۔ گویا ابد الآباد تک یہ اعلان ہوتا رہے گا۔ تو قیامت تک بھی یہ اعلان غلط نہیں ہوسکتا، اور قیامت کے بعد بھی یہ اعلان غلط نہیں ہوسکتا، تو قرآن کریم دُہراتا رہے گا کہ ﴿رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ﴾ ① اللہ ان سب مہاجرین وانصار سے راضی اور ان سے بھی جو ان میں بعد میں ملے، یعنی کل کے کل مرضیِ خداوندی میں ہیں، ایک بھی ایسا نہیں جس سے اللہ تعالیٰ ناراض یا ناخوش ہوں۔ پہلے تو مطلق جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اپنی رضا کا اعلان کیا۔ اور یہ نہیں کہ اولین مہاجرین وانصار کو لے لیا ہو، بلکہ فرمایا ﴿وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ جو احسان کے ساتھ بعد میں ان کے ساتھ ملتے رہے اور ان کی جماعت میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ سب اس اعلان رضا میں شامل ہیں۔ گویا مطلق حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس ہوئی کہ وہ سب مرضی اور پسندیدہ ہیں۔

پھر طبقاتی طور پر تقدیس کی، چناں چہ ایک جگہ اصحابِ حدیبیہ کے بارے میں فرمایا ﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ﴾ ② ”اللہ تعالیٰ ان ایمان والوں سے راضی ہے جنہوں نے کیکر کے درخت کے نیچے اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! تمہارے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔“ ان کے لئے بھی رضا کا اعلان ہے۔

اعمالِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس ...... پھر ایک آیت میں ان کے عمل کو سراہا۔ ارشاد فرمایا ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا﴾ ③ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو ان کے ساتھ ہیں، ان کی شان یہ ہے کہ ان میں کفر کے اوپر شدت ہے اور باہمی طور پر ان میں رحمت ہے۔ اور ان کا طریقہ کیا ہے؟ تم انہیں دیکھو گے، کہیں رکوع میں ہیں، کہیں سجدوں کے اندر ہیں۔ اللہ کے فضل کو جا بجا تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ہر جگہ خدا کا فضل ان کے پیش نظر ہے۔ ابتغاء وجہ اللہ اور ابتغاء مرضات اللہ، یہ ان کا شیوہ ہے۔

کمالِ معرفتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ...... اور اس درجہ ان میں ایمان بھر گیا اور اس درجہ ان کے قلبی مقامات پاک ہیں کہ بالکل اس طرح ہے کہ جب کسی چیز سے ظرف بھر جاتا ہے تو آخیر میں چھلک پڑتا ہے تو فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس درجہ ایمان سے بھرپور ہیں کہ چھلک کر ان کے ایمان کی ان کی پیشانیوں پر علامت پیدا ہوگئی ہے۔ جس کو ارشاد فرمایا ﴿سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ ④ سجدوں کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشانات پڑے ہوئے ہیں“۔ گویا اندرونی ایمان کی اوپر تک علامت آ گئی ہے اور اندرونی کمالِ معرفت کی علامت اوپر چھلک پڑی ہے۔ اور پھر یہ بھی فرمادیا کہ ﴿ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ﴾ ⑤ یہ قرآن ہی ان کے اوصاف کو نہیں سراہ رہا، یہی مثال ان کی تورات میں بھی ہے۔ یہی انجیل میں بھی ہے“۔

---

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، ۱۰۰۔ ② پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۱۷۔

③ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الایۃ: ۲۹۔ ④ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الایۃ: ۲۹۔ ⑤ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الایۃ: ۲۹۔

تو اوّلین بھی ان کی مدح کرتے آئے ہیں۔ اور آخرین بھی ان کی مدح کرتے چلے جائیں گے۔ تو اللہ کے ہاں جو ممدوح، اللہ کے نیک بندوں کے ہاں ممدوح ہے، اوّلین و آخرین شہادت دے رہے ہیں۔ اور قیامت تک دیتے رہیں گے۔ وہ طبقہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے۔ تو اس طبقہ کے اندر کوئی کھوٹ تسلیم نہیں کیا جا سکتا، ورنہ یہ ساری آیتیں بے محل ہو جائیں گی، اللہ کی ساری رضا معاذ اللہ بے محل واقع ہوگی۔

قلوبِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صاحب، تھے تو ایسے ہی۔ مگر ممکن ہے بعد میں کچھ خرابیاں پیدا ہو گئی ہوں۔ ممکن ہے بعد میں کوئی کھوٹ آ گیا ہو؟ تو اوّل تو یہ غلط ہے۔ اور اس لئے غلط ہے کہ یہ قرآن کریم کی شہادت ہے اور قرآن کریم ابد الآباد تک اعلان کر رہا ہے۔ اور اعلان کیا جاتا رہے گا لہذا یہ احتمالِ محض ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایک موقع پر ان حضرات کے قلوب پر بھی یہی حکم لگایا ہے۔ محض اعمال ہی پر نہیں۔ فرمایا ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ﴾ ① یہ وہ طبقہ ہے کہ اللہ ان کے دلوں کا امتحان کر چکا ہے۔ یہ امتحان میں پاس ہو چکے ہیں۔ ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ اور خرابی نہیں ہے۔ ان کے لئے مغفرت بھی ہے۔ اور اجرِ عظیم بھی ہے۔ تو دو چیزیں ہیں۔ مغفرت اور اجرِ عظیم۔ مغفرت آخرت میں ہوگی اور اجرِ عظیم دنیا میں دیا جائے گا۔ تو ان کی دنیا و آخرت دونوں درست ہیں۔

فرقۂ ناجیہ...... غرض جس طبقے کی نسبت ان کے قلوب پر بھی حکم لگایا، ان کے قوالب پر بھی حکم لگایا، ان کے اعمال کو بھی سراہا، ان کے طبقے کی بھی تقدیس بیان کی گئی، وہ طبقہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ پھر اس کے بارے میں کوئی ادنیٰ کھوٹ کا یقین کیا جائے یا کوئی تخیل ہی باندھے۔ جب یہ معیار ہوا وہ سارے فرقے نکل جائیں گے، جو قلوب میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت نہیں رکھتے جن کے قلوب میں عظمت ہوگی، وہی ناجی قرار پائے گا۔ اور وہ طبقہ کون ہے۔؟ جو یوں کہتا ہے کہ "اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ" ② سارے صحابہ رضی اللہ عنہم عدول، متقی، پارسا اور پاکباز ہیں۔

خطاءِ اجتہادی...... گو، ان سے خطاءِ اجتہادی ممکن ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اجتہادی طور پر ان سے کوئی خطا سرزد ہو جائے۔ مگر مجتہد کو تو خطاء پر بھی اجر ملتا ہے، اس کی خطا بھی مقبول ہوتی ہے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں اگر اجتہادی خطا ہو، وہ ہماری طاعتوں سے بہتر ہے کہ اس پر اجر دیا جا رہا ہے۔ وہ خطا اجتہادی ہے، بہرحال نیت کی ان میں کوئی خرابی نہیں ہو سکتی۔

اور اگر دنیا میں ان کی کوئی تھوڑی بہت خرابی ہو، کوئی معصیت یا برائی سرزد ہوئی ہو تو دل ان کا کسی برائی یا نیت کے کھوٹ سے قطعاً پاک ہے اور اگر کوئی غلطی عمل میں ہوئی اور وہ بھی دنیوی عمل میں تو اس کے بعد ان کی توبہ و استغفار اتنی ہے کہ یہ ہماری عمر بھر کی طاعتوں پر وہ اجر نہیں جو ان کی توبہ و استغفار پر ان کو اجر ملا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ترقی مدارج کے لئے ان سے کوئی ایسی چیز کروا دی ہو۔ غرض ایسی چیز اگر ہے تو وہ دنیا سے متعلق ہے۔

---

① پارہ: ۲۶ سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳۔ ② عمدۃ القاری، کتاب الوضوء، باب الماء الذی یغسل بہ الشعر، ج: ۳، ص: ۳۹۹۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تقدّس......لیکن جہاں تک دین کا معاملہ ہے۔ علم اور تبلیغ اور احکام وعقائد کا معاملہ ہے، اس میں سب کے سب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین مل کر متفق، عدول اور پاکباز ہیں۔ ان کے قلوب کا اللہ امتحان لے چکا ہے۔ تو جس ذاتِ بابرکات کے شاگرد ایسے ہوں ان کا استاد کیسا ہوگا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اگر پھل میٹھا ہے تو درخت قابلِ مدح ہے۔ اگر پھل کڑوا ہے قابلِ مذمت ہے۔ تو جس درخت کے یہ پھل ہیں اس درخت کا کیا حال ہوگا۔؟ جس کی شاخوں میں یہ لطف ہے ان کی اصل میں کیا لطف وکرم موجود ہوگا، تو جس ذاتِ بابرکات کی تربیّت سے صحابہ، صحابہ رضی اللہ عنہم بنے، اس ذات کی برگزیدگی اور اس کی سیرت کے تقدّس کا کیا عالم ہوگا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت کو دیکھ کر سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پہچانی جاسکتی ہے۔ جس ذاتِ بابرکات نے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے اپنے جیسے تیار کر دیئے۔ یہ مربی کی کامل تربیت کی علامت ہے کہ اپنے شاگردوں کو اپنے جیسا بنا دیا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نمونہ بنا دیا۔ اور ایک دو نہیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب افراد کا نمونہ جو مقدّسین کی ایک عظیم جماعت ہے۔ جو بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام بنی اور اس جماعت نے عالم کو علم اور دین سے بھر دیا۔ غرض جس اصل کی شاخیں ایسی، اس کی اصل کیسی؟ اور جس ذات کے پھل ایسے وہ درخت کیسا؟ اور جس استاد کے شاگرد ایسے وہ استاد کیسا؟ اور جس شیخ کے تربیّت یافتہ ایسے مقدّس، اس شیخ کے تقدّس کا کیا عالم ہوگا؟

اکمل السیَر......تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ کو اگر انسانی اصول پر پرکھا جائے تو انسان کی سیرت کے عناصرِ اربعہ میں نے ذکر کر دیئے۔ ان میں سب سے زیادہ کامل اور اکمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نکلتی ہے۔ یہ تو اصل کے اعتبار سے ہے اور فرع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو دیکھ لو، جب صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت کا تقدّس ایسا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تقدّس کا کیا عالم ہوگا؟ تو اصل کے لحاظ سے دیکھا جائے تب بھی سیرت اکمل السّیر ہے۔ اور فرع کے اعتبار سے دیکھا جائے تب بھی وہ سیرت اکمل السّیر ہے۔ جب وہ سیرت ہمارے سامنے آتی ہے، اس کا مقصد کہانی سنانا نہیں ہوتا بلکہ معیار پیش کرنا ہوتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو پرکھ پرکھ کر اس کے اوپر جانچیں، مسلمانوں میں علم کی کمی نہیں فکر کی کمی ہے۔ علم تو ہے۔ رات دن وعظ سنتے ہیں، کتابیں بھی پڑھتے ہیں، رسالے بھی ان کے سامنے ہیں لیکن تفکّر موجود نہیں ہے کہ اس نمونے کو سامنے رکھ کر غور وفکر کریں اور اپنے کو اس نمونے کے اوپر پیش کریں کہ کس حد تک مطابقت ہے اور کس حد تک مطابقت نہیں۔ یہ فکر جب تک پیدا نہیں ہوگی سیرت کا سننا نہ سننا آپ کے اوپر کوئی اثر نہیں ڈالے گا۔ تو آپ محض کانوں سے سنتے ہیں۔ حالاں کہ دل سے اور دماغ سے سننا چاہئے جس سننے میں دل بھی شامل ہو۔ یعنی اس طور پر آپ سیرت کو سنیں کہ ہم اپنا جائزہ لیں۔ نہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد وثناء کرتے رہیں۔ آپ نہ بھی مدح کریں وہ جب بھی واجب

المدح ہیں۔آپ ایک بھی ثناء نہ کریں وہ جب بھی معظّم ومکرّم ہیں۔اس سیرتِ پاک کی عظمت ورفعت آپ کے عظمت کرنے پر موقوف نہیں ہے۔آپ عظمت نہ کریں وہ جب بھی باعظمت ورفعت ہیں سوال یہ ہے کہ سیرت کوسن کرآپ نے اپنے لئے کیا کیا۔تو آپ سیرت کا بڑا مقصد یہ سمجھتے ہیں کہ سبحان اللہ کہہ کر یہ کہہ دیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کواللہ نے یہ عظمت دی،وہ تو باعظمت ہیں ہی۔آپ نہ بھی کہیں جب بھی عظمت ملی ہوئی ہے۔

لیکن یہ عظمت آپ کے سامنے کیوں لائی گئی؟ تاکہ آپ بھی باعظمت بنیں،آپ کے اندر بھی خوبیاں اور کمالات پیدا ہوں،اس لئے سیرت سامنے رکھی جاتی ہے۔یہ جذبہ ہمارے اندر مفقود ہے۔اس لئے اپنے جانچنے کی فکر نہیں۔تعریف کرنے کی فکر ہے۔تو تعریف سے زیادہ اپنا جانچئے کہ خود اپنے کو پیش کریں۔اور سیرت کے مطابق اپنے کو پرکھیں۔اس واسطے میں نے سیرتِ مقدسہ کو دو پہلوؤں سے پیش کیا ایک سیرت کی اصل کے لحاظ سے کہ انسانیتِ کاملہ اسی سیرت کے اندر ہے اور ایک سیرت کی فرع کے اعتبار سے کہ اس سیرت سے اخذ کر کے جو سیرتیں بنیں وہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعد والوں کی ہیں جو دوسروں کو مقدس بنا سکتی ہیں۔وہ سیرت اس قابل ہے کہ اسے سامنے رکھ کر مقدس بننے کی فکر کرے،تو دونوں پہلوؤں سے سیرت کامل اور اکمل ہے۔حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں اور آپ کو توفیق دیں کہ ہم اپنے کو پرکھنے کی کوشش کریں اور اپنے کو سیرت کے مطابق بنانے کی فکر کریں۔آمین۔

"اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ. اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَعَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا وَاھْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَاَخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَاظَھَرَ مِنْھَا وَ مَا بَطَنَ. اَللّٰھُمَّ وَ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِیْنَ غَیْرَ خَزَایَا وَلَامَفْتُوْنِیْنَ. وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍوَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖٓ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ."

ملّتِ اسلامیہ کا المیہ اور اس کا علاج

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّابَعْدُ.............عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَعَاذٌ رَدِیْفُہٗ عَلٰی رَحْلٍ،قَالَ یَامَعَاذُبْنُ جَبَلٍ! قَالَ لَبَّیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ،قَالَ یَامَعَاذُ!قَالَ لَبَّیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ،قَالَ یَامَعَاذُ!قَالَ لَبَّیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ ....قَالَ مَامِنْ اَحَدٍیَّشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًارَّسُوْلُ اللّٰہِ صِدْقًامِّنْ قَلْبِہٖ اِلَّاحَرَّمَہُ اللّٰہُ عَلَی النَّارِ......①

گزارشِ واقعی ...... بزرگانِ محترم! میں اس وقت زیادہ دیر تک نہیں بول سکوں گا۔ کچھ تو اپنے ضعف کی وجہ سے اور پھر کچھ یہ کہ تقریباً ایک ہفتے سے روزانہ مسلسل تقریریں کرنی پڑیں، اتنی قوت نہیں ہے کہ روز کی تقریریں نبھائی جاسکیں، بمبئی آنے کا میرا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہاں آ کر تھکاوٹ دور کروں اور آرام کروں۔ مگر یہاں پہنچ کر بہر حال جلسے کی تیاری ہوگئی، اس لئے اس تعب اور تھکان کی بناء پر زیادہ دیر نہیں بول سکوں گا، صرف جلسہ اور اس کے اعلان کا احترام قائم رکھنے کے لئے چند باتیں گزارش کرنی ہیں۔

اضطرابِ عام ......اس جلسہ کے لئے جو دعوت نامہ پہنچا تھا اس میں یہ تھا کہ اس وقت مسلمان پریشانیوں میں مبتلا ہیں، اور مختلف قسم کے فتنے اور مختلف قسم کی پریشانیاں ان پر آ رہی ہیں، کچھ اخلاقی لائنوں سے، کچھ سیاسی لائنوں سے، کچھ اعتقادی لائنوں سے، کچھ تمدنی اور معاشرتی لائنوں سے۔ غرض مختلف قسم کے فتنے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو مضطرب، بے چین اور پریشان کر رکھا ہے۔ اس میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ ان پریشانیوں کو دور کرنے کا کوئی راستہ تجویز کیا جائے اور کوئی بات کہی جائے جس سے یہ پریشانیاں دور ہوں۔ یہ ہمارے قبضے میں تو نہیں ہے کہ ہم کسی پریشانی کو دور کر دیں۔ ہم اپنی ہی پریشانی دور نہیں کر سکتے، ہم دوسروں کا کیا بنا سکتے ہیں البتہ تدبیر بیان کی جاسکتی ہے کہ یہ تدبیر اختیار کی جائے تو فتنے ختم ہوں گے، پریشانی دور ہوگی اور دلجمعی پیدا ہو جائے گی۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوماً دون قوم کراھیۃ ان لایفھموا، ج: ۱، ص: ۵۹، رقم: ۱۲۸.

تدبیر بھی ہم خود کیا تجویز کر سکتے ہیں، جو خود فتنوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو وہ تدبیر کیا کرے گا۔ تدبیر وہ بتلا سکتا ہے جو فتنوں سے بری اور بالا ہو۔ تو اس کی تدبیر حق تعالیٰ ہی سے پوچھنی چاہئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنی چاہئے وہی ہمارے فتنوں کا رد ہوگا اور وہی فتنوں کے دفعیہ کا ذریعہ ہوگا۔ اس کے بارے میں ایک حدیث سنائے دیتا ہوں، اس کا ترجمہ اور اس کی مختصری تشریح عرض کئے دیتا ہوں۔

حدیثِ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ...... حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث منقول ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرما رہے ہیں۔ اور انہوں نے روایت سے پہلے واقعہ بیان کیا کہ میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سواری پر سوار تھے۔ عرب میں عامۃً یہ دستور ہے کہ ایک اونٹ پر دو سیٹیں ہوتی ہیں، اسی طرح ایک گھوڑے پر دو سیٹیں، ایک گدھے پر دو سیٹیں۔ تو زین ہی دو سیٹ کا بنایا جاتا ہے، اس کے آگے پیچھے دو آدمی سوار ہو جاتے ہیں۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی سواری پر سوار تھے اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا قریب تھا کہ: ''لَیْسَ بَیْنِیْ وَبَیْنَهٗ اِلَّا مُؤْخِرَةُ الـرَّاحِـلِ'' میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان میں کوئی حائل نہیں تھا، صرف زین اور کجاوے کی ایک ڈنڈی بیچ میں تھی۔ گویا اگلا بیٹھنے والا تو لگام سہار کر بیٹھتا ہے اور پچھلا بیٹھنے والا اس ڈنڈی کو سہار لیتا تھا تاکہ گر نہ پڑے۔ تو وہ زین ایسے ہی بنائے جاتے تھے کہ دو سیٹیں تھیں، بیچ میں ایک ڈنڈی اس طرح سے لگاتے تھے تاکہ پیچھے بیٹھنے والا اس ڈنڈی کو تھامے رہے۔ اسے موخرۃ الراحل کہتے تھے۔ گویا کجاوے کا ایک درمیانی حصہ۔ بہر حال حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: زین کی اگلی سیٹ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور پچھلی پر میں تھا میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اسی ڈنڈی کا فاصلہ تھا۔ اس کے سوا کوئی فصل نہیں تھا۔

تعدُّ دِ نداء...... تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی کہ: ''یَا مُعَاذُ!'' اے معاذ! میں نے عرض کیا ''لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَیْکَ'' میں حاضر ہوں یا رسول اللہ! اس کے بعد کچھ سکوت فرمایا۔ اور پھر آواز دی کہ یَا مُعَاذُ! اے معاذ! میں نے عرض کیا۔ ''لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَیْکَ'' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں حاضر ہوں اور میری سعادت ہی حاضری میں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری آواز دی کہ یَا مُعَاذُ! میں نے پھر عرض کیا ''لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَیْکَ'' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں حاضر ہوں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حدیث ارشاد فرمائی جو مجھے اس وقت سنانی ہے۔

مقامِ اشتباہ...... اس میں سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو پکارنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ کسی بعید کو جو دور ہو اسے پکارا جاتا ہے اور جو اتنا قریب ہو کہ ملا ہوا بیٹھا ہو، صرف ایک کجاوے کی ڈنڈی بیچ میں ہو، اسے پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما دیتے، پکارنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ پھر پکارنا بھی ایک دفعہ نہیں تین دفعہ ہے۔ اور پھر اس کے باوجود کہ ہر پکار پر وہ عرض کرتے ہیں کہ ''لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ

اللّٰہ۔" یارسول اللہ میں حاضر ہوں۔ اگر جواب نہ آتا ممکن تھا کہ پہلی آواز کو نہ سنا ہو، اس لئے دوسری آواز دی، دوسری انہوں نے نہ سنی ہو تو تیسری مرتبہ پکارا گیا ہو۔ لیکن ہر پکار کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ پہلی پکار نہیں سنی ہو گی، تو سوال یہ ہے کہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ تین دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پکاریں۔

اشتیاقِ مقصد...... یہ حقیقت میں ایسے مواقع پر ہوتا ہے جب کوئی اہم مضمون بیان کرنا ہو اور کوئی عظیم مقصد پیش کرنا ہو۔ تو تین تین دفعہ متوجہ کرتے ہیں کہ غور سے سنو تا کہ وہ چیز دل کے اندر اتر جائے۔ بلا پکارے ہوئے اور بلا لبیک کہلوائے ہوئے کسی چیز کا کہنا بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کان سے بات کہی اور دوسرے کان سے نکل گئی۔ تین دفعہ متوجہ فرمایا کہ: شوق پیدا ہو جائے اور اس مضمون کی رغبت پیدا ہو جائے جو آگے ارشاد فرمانا ہے۔

اور یہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرات نائبانِ انبیاء علیہم السلام کا خاصہ رہا ہے کہ پہلے دل میں شوق اور تڑپ پیدا کرتے ہیں، اس کے بعد میں مقصد پیش کرتے ہیں تا کہ دل میں اتر جائے۔ بلا طلب کے اگر از خود کوئی چیز کہہ دی جائے تو عادت یہ ہے کہ دل میں اترا نہیں کرتی، آدمی توجہ نہیں کرتا، جب تک اندر سے طلبِ صادق نہ ہو، تو شوق پیدا کرنے کے لئے ایسے اسباب اختیار کرتے ہیں کہ طلب پیدا ہو جائے اور طلب کے بعد جو چیز دل میں آتی ہے وہ دل میں اترتی جاتی ہے۔ غیرِ طالب کو کچھ نہیں ملتا، اس لئے طلب گار ہونا چاہئے۔

جیسے عارف رومی نے کہا ہے کہ ؎

آب کم جو ، تشنگی آور بدست

پانی کو زیادہ مت پکارو، پیاس اپنے اندر پیدا کرو، پیاس پیدا ہو گی تو پانی ملے گا اور پھر وہ اترے گا اور رگ رگ میں تری پیدا کرے گا پیاس نہ ہو تو پانی پی لو تو بعض دفعہ بیماری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ پیٹ میں اپھارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو معدے کی خواہش کے بعد اگر کھانا کھایا جائے گا تو معدے میں اترے گا، پچے گا اور بدن کو لگے گا، اور بلا کسی بھوک کے کوئی کھاتا رہے تو بیماریوں کے پیدا ہونے کا ذریعہ بنے گا۔ اس لئے پانی اور دانے کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ بھوک اور پیاس پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معدہ خراب ہوتا ہے اور بھوک کی کمی ہوتی ہے تو طبیب کے پاس جاتے ہیں۔ تندور پر نہیں جاتے کہ بہت سی روٹیاں لے آئیں، بلکہ طبیب کے پاس جاتے ہیں کہ ان روٹیوں کی گنجائش تو پیدا ہو جائے، علاج کراتے ہیں تا کہ معدے میں طلب تو پیدا ہو جائے۔

انتظارِ رغبت...... میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ العزیز بانی دارالعلوم دیو بند ان کے مریدوں میں سے حافظ محمد احسن صاحب جو ہمارے عزیزوں میں سے تھے، حضرتؒ سے بیعت تھے۔ نوجوان تھے اور اس زمانے کے نوجوانوں کا جو لباس تھا وہ یہ تھا کہ چوڑی دار پائجامہ جو ٹانگوں پر لپٹا ہوا ہو اور سر کے اوپر دوپٹہ جس کی کناری پر کرن اور گوٹہ بھی ٹکا ہوا ہوتا تھا اور ہاتھوں پر مہندی، اور پور پور چاندی کے چھلے، یہ اس زمانے میں نوجوانوں کا تمدن تھا۔ یہی لباس ان کا بھی تھا۔ ان کے بارے میں سنا کہ یہ حضرت کی مجلس میں آتے تھے اور

حضرت کچھ نہیں فرماتے تھے۔

لوگوں کے دلوں میں یہ اعتراض پیدا ہوا کہ حضرت کے مرید اور خادم، اور لباس غیر شرعی، مردوں کے لئے کب جائز ہے کہ مہندی لگائیں یا ہاتھوں میں چاندی کے چھلّے پہنیں۔ یہ سارے ناجائز کام کر رہے ہیں۔ چوڑی دار پائجامہ جو ٹخنوں سے نیچا، جس کی شرعی ممانعت ہے۔ جس کو شرعاً اسبال کہتے ہیں۔ چناں چہ ایک حدیث میں فرمایا گیا، ٹخنوں سے نیچے پائجامہ یا لنگی ڈالنے والا جس کا نام ''مسبل متان'' ہے حق تعالیٰ اسے قیامت کے دن نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے کہ دنیا میں اسبال کرتا تھا، ٹخنوں سے نیچے ازار یا پائجامہ رکھتا تھا، تو اس پر نگاہِ رحمت نہیں فرمائیں گے، اس سے اعراض کیا جائے گا۔

تو حضرت کی مجلس میں وہ آتے ہیں اس حالت میں کہ اسبال موجود، ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی۔ ناجائز چھلّے پہنے ہوئے اور حضرت کچھ نہیں بولتے، نہی عن المنکر نہیں فرماتے، لوگوں کے دلوں میں یہ خطرہ گزرتا تھا، اور ایک دو نے ایک دوسرے سے کہا بھی مگر حضرت پر کوئی اثر نہیں۔ حافظ صاحب آ رہے ہیں اور مجلس میں بیٹھ رہے ہیں۔

حضرت کیوں کچھ نہیں فرماتے؟ دل میں شریعت کے اتباع کا شوق اور طلب پیدا کرنے کے لئے۔ کہ طلب پیدا ہو جائے۔ پھر جب یہ حکم دیا جائے گا تو دل اتر جائے گا۔ اور بلا طلب کے لاکھ تقریریں کرو، وعظ کہو، کوئی اثر نہیں ہوگا۔ جیسے آج کی دنیا میں سینکڑوں وعظ اور سینکڑوں تقریریں ہوتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں نہ ایسی تقریریں تھیں، نہ مواعظ تھے، نہ جلسے ہوتے تھے۔ اور آج جلسوں کی بھرمار ہے۔

اور جلسوں کا سیزن ہے اور ہزاروں پر انتہا نہیں ہوتی۔ لاکھوں تک اجتماعات میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ لیکن دل ٹس سے مس نہیں کسی کے اندر کوئی تغیر نہیں۔ وہی کی وہی حالت جو پہلے تھی۔ ایک واعظ وعظ کہہ کے وعظ کا ایسا پانی ڈالتا ہے جیسے گنبد پہ ڈال دیا، کہ اِدھر اُدھر بکھر جاتا ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں پہنچتا، بنا اس کی یہ ہے کہ طلبِ صادق نہیں، تفریحاً آ کے وعظوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ گویا بھانڈ کی دیکھتے ہیں کہ مقرر کیا بولتا ہے، کیسی باتیں کرتا ہے۔ یہ طلب ہو کہ اس کی کوئی بات لے کر ہم اپنی دنیا و آخرت کی نجات کی فکر کریں۔ یہ نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ ہوگی، ہزاروں لاکھوں میں کسی ایک کو۔ عام طور سے نہیں ہے۔ اس لئے مواعظ اثر بھی نہیں کرتے۔

وعظ، غلط نہیں ہوتا، مگر دل کھلا ہوا ہو جب اس کے اندر کوئی چیز اترے اور اگر دل الٹا ہو تو اس کی تلی پر جتنا پڑے گا، اِدھر اُدھر بہہ جائے گا۔ بہر حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی کچھ نہیں کہتے تھے۔ جب چھ مہینے گزر گئے اور دیکھا کہ اب ان کے اندر عقیدت پوری بیدار ہوگئی ہے اور قلب میں گرویدگی آ گئی ہے۔ اور طلبِ صادق آ گئی۔ تو تنہائی میں لے جا کر کیسے عجیب انداز سے کہا، فرمایا۔ ''بھائی! حافظ جی! تم تو ہمارے دوست ہو اور ہم تمہارے دوست ہیں اور دوستوں کے اندر محبت ہوتی ہے۔ اور محبت میں ہر ایک دوسرے کی حرص کیا کرتا ہے۔ اب ہمارا لباس تو یہ ہے کہ ایک معمولی سا کرتہ اور ایک پٹے پائنچوں کا پاجامہ، اور ایک دو پلی ٹوپی۔ تمہارا ماشاء اللہ فاخرہ لباس ہے۔ گوٹے لگا ہوا

عمامہ بھی ہے۔ پور پور چھلّے بھی اور نہایت عمدہ اچکن اور چپل بھی۔ بھائی! دوستی ہے تو یا تو ہم بھی آج سے یہ لباس اختیار کرلیں کہ ہم بھی چوڑی دار پائنچوں کا پاجامہ پہن لیں، ہم بھی ہاتھوں کو مہندی سے رنگیں، یا پھر تم اس راستے پر آ جاؤ جس پر میں ہوں۔ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ دو دوست ہوں، ایک کا رخ مشرق کو ہو اور ایک مغرب کو ہو"

طرزِ نصیحت...... چوں کہ دل میں عقیدت آ چکی تھی اور طلب صادق پیدا ہو چکی تھی، تو حافظ محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ رونے لگے اور بلا کچھ کہے وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر گئے۔ جا کر وہ چوڑی دار پاجامے تو بیوی کو دیئے کہ رنگ لگا کر اس کو تو پہن لے، اور گوٹے کی کناری کے دوپٹے اس کو دیئے کہ ان کی تو اوڑھنیاں بنالے۔ اور پندرہ دن گھر سے نہیں نکلے، جب تک مہندی کا وہ رنگ ہتھیلیوں سے زائل نہیں ہو گیا، چھلّے بھی بیوی کو دیئے کہ تو ان کا زیور بنوالے۔

پندرہ بیس دن کے بعد جب وہ مہندی کا اثر جاتا رہا تو خالص مولویانہ لباس، وہی مغلیہ قسم کا پاجامہ اور کرتہ، اور دوپلّی ٹوپی اوڑھ کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں پہنچے۔ بالکل ایسے جیسے ایک طالب علم ہوتا ہے، حضرت نے سینے سے لگایا اور فرمایا بھائی! آج دونوں دوست یکساں ہو گئے۔ اور بڑی خوشی کا اظہار فرمایا۔ یہ جو چھ مہینے تک امر بالمعروف نہیں کیا، وہ اس لئے نہیں کیا کہ اس کا انتظار تھا کہ دل میں طلب آ جائے دل میں گرویدگی اور عقیدت پیدا ہو جائے تب کہیں تو اثر پڑے گا۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا بھی یہی طریقہ ہے۔ اہل اللہ اور وارثین انبیاء علیہم السلام کا طریقہ بھی یہی ہے۔ اور وہ لوگ تو اب کہاں ہیں کہ ایک منٹ میں توجہ ڈالی اور کایا پلٹ دی، وہ لوگ گزر گئے، اب تو یہ ہے کہ اخلاق اور بھائی بندی سے کوئی اثر ڈال کر طلب پیدا کر کے کوئی نصیحت کریں تو کارگر ہوتی ہے۔ یوں نصیحت کرنے کو ہر ایک کا فرض ہے کہ نصیحت کرے، وعظ بھی کہے۔ لیکن موثر نہیں ہوتا۔

حکمتِ تربیّت...... حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرّہٗ۔ ان کے ایک پٹھان مرید جلال آباد کے تھے۔ بڑے خوبرو جوان تھے۔ اس زمانے کے نوجوانوں کا تمدن داڑھی منڈانے کا نہیں، داڑھی رکھنے اور چڑھانے کا تھا۔ نماز نہیں پڑھتے تھے، حضرت حاجی صاحب سے شکایت کی گئی کہ حضرت! آپ کے مرید ہیں اور نماز نہیں پڑھتے۔ حضرت نے بلایا۔ بڑی شفقت سے کمر کے اوپر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

''بیٹا! نماز پڑھنی چاہئے، نماز ہی تو ایک مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز اور فرق ہے، جب نماز ہی نہ ہو تو وہ مسلمان ہی کیا ہوا؟'' انہوں نے کہا حضرت! مجھے داڑھی چڑھانے کی عادت ہے اور سوا گھنٹے میں داڑھی چڑھتی ہے۔ پہلے اسے گوند لگاتا ہوں، پھر اسے سکھاتا ہوں، پھر اس میں کنگھا کرتا ہوں، سوا گھنٹہ لگتا ہے۔ آپ کہیں گے وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی، جب وضو کروں گا تو وہ سارا گوند مونڈ دھل جائے گا۔ تو ہر نماز کے بعد مجھے داڑھی چڑھانی ہے۔ تو پانچ نمازیں تو گھنٹے بھر سے کم میں ہو جائیں گی اور پانچ دفعہ داڑھی چڑھانے میں سات گھنٹے صرف ہوں گے۔ یہ مشکل ہے اور آپ کہیں گے کہ بے وضو نماز جائز نہیں۔

اب آگے ''حکمتِ تربیت'' ہے۔ تعلیم تو یہ ہے کہ حضرت فرماتے کہ ہاں بلا وضو نماز جائز نہیں، حدیث میں ہے لَاتُقْبَلُ صَلٰوۃٌ بِغَیْرِ طُھُوْرٍ ① کوئی نماز بغیر پاکی کے قبول نہیں ہوتی''۔ یہ تو تعلیم کا درجہ تھا۔ مگر تربیت کا درجہ دوسرا ہے۔ تعلیم میں ایک حکم ہوتا ہے، سب کو سنا دیا جاتا ہے، تربیت میں ہر ایک کا مزاج دیکھنا پڑتا ہے، اس کی نفسیات کے مطابق اس سے کلام کرنا پڑتا ہے۔ تو حضرت نے یہ دیکھا کہ مسئلہ تو انہیں بھی معلوم ہے اس کا کیا سنانا، وہ خود ہی کہہ رہے ہیں کہ آپ کہیں گے کہ بلا وضو کے نماز نہیں ہوتی، تو مسئلہ تو معلوم تھا۔ اب حضرت کیا فرماتے جو معلوم ہے اس کا علم کرا دیتے، مگر حکمتِ تربیت پیشِ نظر تھی۔ حضرت نے فرمایا ''بھائی میں نے تو وضو کا ذکر نہیں کیا، میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ نماز پڑھا کرو''۔ انہوں نے عرض کیا، حضرت! بے وضو پڑھ لوں؟ فرمایا ''پھر وضو کا ذکر، میں وضو کا نام کب لے رہا ہوں، میں وضو کا تذکرہ کب کر رہا ہوں میں تو نماز پڑھنے کو کہہ رہا ہوں''۔ تو خان صاحب اٹھے، انہوں بے وضو نماز ٹرخانی شروع کر دی، غرض بے وضو نماز پڑھنی شروع کر دی۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ بے وضو پڑھ رہے ہیں اور انہیں ٹوکتے نہیں۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ کی نماز نہیں ہوتی اس لئے کہ مسئلہ تو انہیں بھی معلوم ہے کہ نماز نہیں ہوتی۔ پندرہ دن گزر گئے۔ پندرہ دن کے بعد ان کے ذہن میں خود یہ جذبہ پیدا ہوا کہ تو محنت بھی کر رہا ہے۔ اور اکارت جا رہی ہے۔ رائیگاں جا رہی ہے۔ بلا وضو کے نماز نہیں ہوتی۔ مگر انہوں نے کہا کہ نماز تو اب میں چھوڑ نہیں سکتا، اس لئے کہ پیر کا حکم ہے۔ اور پٹھان کی زبان ہے جو کٹ سکتی ہے وہ ٹل نہیں سکتی، لہٰذا نماز نہیں چھوڑوں گا۔ نماز مجھے ہر صورت میں پڑھنی ہے۔ تو یہ کیا صبح کی نماز کے لئے وضو کرتے اور داڑھی چڑھاتے اور عشاء تک اس وضو کو باقی رکھتے اور پانچوں نمازیں وضو سے پڑھتے۔ لیکن یہ ایک نوجوان آدمی کے لئے بڑا مشکل ہے کہ صبح سے لے کر عشاء تک باوضو رہے، تکلیف شروع ہوئی۔ پیٹ میں نفخ اور اپھارہ شروع ہوا۔

اب انہوں نے یہ کیا کہ ایک وضو تو صبح کی نماز کے لئے کرتے اور ایک ظہر کے وقت کرتے، اسے عشاء تک باقی رکھتے۔ غرض نماز باوضو شروع کر دی۔ لیکن ایک نوجوان کے لئے بڑی مشکل سی بات ہے کہ ظہر سے لے کر عشاء تک باوضو رہے۔ اس سے بھی پیٹ میں تکلیف شروع ہوئی۔ اب انہوں نے کہا کہ نماز تو میں چھوڑ نہیں سکتا، پیر سے وعدہ کر چکا ہوں اور زبان پٹھان کی ہے جو کٹ سکتی ہے، اب بدل نہیں سکتی۔ اس واسطے انہوں نے سوچا کہ یا تو داڑھی چڑھانے کو قائم رکھو یا نماز قائم رکھو، نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے داڑھی چڑھانی چھوڑ دی اور نماز باوضو پڑھنی شروع کر دی۔

بیس پچیس دن کے بعد حضرت حاجی صاحب نے بلوایا اور بہت شاباش دی اور فرمایا ''نوجوان صالح ایسے ہی ہوتے ہیں''۔ اور بڑی دعائیں دیں۔ اس کے بعد فرمایا بھائی! بے وضو کے نماز کتنے دن تم نے پڑھی؟'' انہوں نے عرض کیا۔ حضرت! پندرہ بیس دن۔ فرمایا۔ اسے لوٹا لینا، یہ ہوئی نہیں۔ انہوں نے عرض کیا ضرور لوٹاؤں گا۔ اس کے

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الوضوء، باب لاتقبل صلوۃ بغیر طھور، ص: ۱۴، رقم: ۱۳۵.

بعد فرمایا کہ بھائی! تمہاری عمر کیا ہے؟ خان صاحب نے کہا کہ سولہواں سال شروع ہے۔ پندرہ پورے ہو چکے ہیں۔ فرمایا چودہ برس کے بعد آدمی شرعاً بالغ ہوجاتا ہے اور نماز اس پر فرض ہوجاتی ہے۔ برس دن کی نماز تو پڑھی نہیں ہوگی۔ انہوں نے عرض کیا۔ حضرت! نہیں، میں نے تو نہیں پڑھی۔ فرمایا۔ یہ قضا عمری ہے۔ اسے بھی قضا کرلو۔

اب دل میں لگن تو لگ چکی تھی۔ سرکاری ملازم تھے، انہوں نے ایک ہفتے کی رخصت لی، اور ساری نمازیں برس دن کی انہوں نے قضا کیں، اور ادا نمازوں سے سلسلہ مل گیا۔ گویا بلوغ کے وقت سے جو نمازی بنے تو پھر مرتے دن تک نماز نہیں چھوٹی اور پکّے پابندِ صوم وصلوٰۃ ہو گئے۔ یہ کیسے ہوئے؟

حضرت نے پندرہ دن کی بے وضو نمازیں پڑھوا کے عمر بھی کی نمازیں باوضو پڑھوادیں۔ اور اگر پہلے ہی کہہ دیتے ہیں کہ بلاوضو کے نماز نہیں ہوتی، وہ کبھی نہ پڑھتے، اور عمر بھر بے نماز رہتے۔ یہ حکمتِ تربیّت تھی کہ پندرہ دن بے وضو کے نمازیں پڑھوا کے عمر بھر کے لئے پابندِ نماز بنادیا۔ اگر تربیّت کی یہ صورت اختیار نہ کرتے، وہ کبھی نماز کے عادی نہ ہوتے۔ تربیت کرنے میں بعض اوقات کسی بری اور منکر چیز کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے، سکوت کرنا پڑتا ہے کہ طبیعت میں صلاحیت آجائے، پھر بات کہی جائے، پھر نصیحت کی جائے، وہ قابلِ قبول ہوگی، ورنہ نہیں ہوگی۔

تربیّت کا امتیاز......اور سنّت سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ ایک قبیلہ جو کئی ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یارسول اللہ! ہم اسلام قبول کرنے کے لئے آئے ہیں۔ فرمایا۔ ”بَارَکَ اللّٰہُ“ انہوں نے کہا، حضرت! اسلام قبول کرنے کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ ایک صبح کی نماز نہیں پڑھیں گے۔ اور ایک عشاء کی نماز نہیں پڑھیں گے، تین نمازیں پڑھواتے رہیں۔ فرمایا۔ شرط منظور ہے۔

حالاں کہ جس طرح سے تین وقت کی فرض تھیں، ویسے ہی بقیہ دو وقت کی بھی فرض تھیں۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط منظور فرمائی اور وہ تین وقت کی پڑھ رہے ہیں اور صبح وعشاء کی غائب۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہیں فرمایا کہ کیوں نہیں پڑھتے؟ یہ ناجائز ہے، ممنوع ہے، حرام ہے۔ مہینہ بھر کے بعد میں از خود ان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ جیسے تین وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ ویسے ہی صبح وعشاء کی بھی فرض ہیں۔ تو ہم آدھے دین کو قبول کریں اور آدھے دین کو ضائع کریں، یہ ہرگز مناسب نہیں، چناں چہ مہینہ بھر کے بعد انہوں نے وہ دو بھی پڑھنا شروع کردیں۔ اس کے بعد وہ حاضر ہوئے اور نماز کے پابند ہوگئے، تو دو وقت کی نماز نہ پڑھنے کی شرط مان کر عمر بھر کی پانچ وقت کی نمازوں کا پابند بنادیا، یہ تعلیم نہیں تھی بلکہ تربیّت تھی۔

تعلیم میں تو مسئلہ عام ہوتا ہے، تربیّت میں ہر مزاج کے مطابق اس کو دوا دی جاتی ہے۔ آپ کسی طبیب اور ڈاکٹر کے ہاں تعلیم پانے جائیں۔ ایک ہی مسئلہ بیان ہوگا، جو کتاب میں ہے وہی سب کے لئے ہے۔ لیکن جب طبیب مطب کرے گا، وہاں یہ نہیں کہ ایک نسخے میں سب کو پار کردے، ہر مریض کی نبض الگ ہے اور اس کا مزاج الگ ہے، اس کے مطابق نسخہ تجویز کرنا ہوگا۔ غرض تعلیم میں عموم ہوتا ہے اور تربیت میں خصوص ہوتا ہے۔ اس لئے

''مربیانِ قلوب'' بعض اوقات انتظار کرتے ہیں۔ اس کی نفسیات کو دیکھ کر اس کی برائی پر کوئی روک ٹوک نہیں لگاتے کہ پہلے اس سے تعلق پیدا ہو جائے، دل میں گرویدگی آ جائے، پھر اس وقت کہا جائے گا۔

خیر وہ بات طویل ہوگئی، میں مختصر بیان کرنا چاہتا تھا، بہر حال حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کو تین دفعہ آواز دی، حالانکہ وہ کمر مبارک سے ملے ہوئے بیٹھے تھے، تاکہ تین دفعہ آواز دے کر ان کے دل میں شوق پیدا کر دیں کہ کوئی بڑی اہم بات کہی جانے والی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے دل میں ایک طلب، تلاش اور پیاس پیدا ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرمائیں گے جو مجھے تین دفعہ متوجہ فرمایا۔

اللہ و بندے کا باہمی معاہدہ...... حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یَا مُعَاذُ! هَلْ تَدْرِیْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَی الْعِبَادِ؟...... '' اے معاذ۔! اللہ کا بندوں کے اوپر کیا حق ہے؟ انہوں نے عرض کیا ''اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ......'' اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ اللہ کے بندوں پر کیا حقوق ہیں۔ فرمایا اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے۔ ''یَعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا یُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا......'' عبادت صرف ایک اللہ کی کریں جس میں شرک نہ آنے پائے۔ جبھی اللہ کا حق ادا ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا: ''هَلْ تَدْرِیْ مَاحَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰهِ؟......'' یہ بھی جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ کے اوپر کیا حق ہے؟ عرض کیا، اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ فرمایا ''بندوں کا حق یہ ہے کہ جب وہ ایک ہی طرف جھک جائیں اور شرک سے بالکل الگ ہو جائیں۔ پوری زندگی ان کی توحید پر آ جائے اور ایک ہی کو کرتا دھرتا سمجھیں، ایک ہی کو نافع اور ضارّ سمجھیں، ایک ہی کو محی و ممیت سمجھیں، ایک ہی کو رزّاق اور فتّاح سمجھیں، ایک ہی کو مشکلات آسان کرنے والا سمجھیں، ایک ہی کو دافعِ بلیّات سمجھیں، ایک ہی کو حلالِ مشکلات سمجھیں، جب بندے کے دل میں یہ آ گیا، اس نے اللہ کا حق ادا کر دیا۔ تو اللہ نے فرمایا کہ: پھر تمہارا حق میرے اوپر یہ ہے کہ میں تمہیں رزق دوں گا، رزقِ ظاہری بھی اور رزقِ باطنی اقتدار، عزت، عظمت، عرفی حیثیت، دنیا کی اقوام پر رعب داب، یہ میں تمہیں عطاء کروں گا۔'' ①

غرض بندے سے یہ وعدہ لیا کہ تو عبادت کر جس میں شرک کا شائبہ نہ ہو۔ میں تمہیں رزق دوں گا جس کے اندر کمی کا شائبہ نہیں ہوگا۔ یہ گویا بندے اور خدا کا ایک معاہدہ ہوا کہ تم میری یاد میں لگو، میں تمہیں رزق دوں گا۔

قانونِ مکافات...... اللہ تعالیٰ کے ہاں مکافات کا قانون ہے کہ جیسا تم کرو گے، ویسا نتیجہ سامنے آئے گا۔ چناں چہ فرمایا گیا ﴿فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ﴾ ② ''فرماتے ہیں تم میری یاد کرو گے میں تمہاری یاد کروں گا''۔ ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْکُمْ﴾ ③ تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے، میں تمہاری مدد کروں گا۔ ''مَنْ اَحَبَّ

---

① الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب ارداف الرجل خلف الرجل، ج:۱۸، ص:۳۵۴.

② پارہ:۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۱۵۲. ③ پارہ:۲۶، سورۃ محمد، الآیۃ:۷.

لِقَاءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَائَہٗ۔" ① فرماتے ہیں، اگر تمہیں یہ شوق ہے کہ مجھ سے آ کر ملو اور موت قبول کرو تو مجھے بھی یہ شوق ہے کہ کب میرا بندہ آئے اور مجھ سے ملے۔ تم میں میری محبت ہے مجھ میں تمہاری محبت ہے۔ غرض ''ادل بدل'' اور مکافات کا قانون ہے اس لئے بندے اور خدا کا گویا معاہدہ یہ ہوا کہ تم تو میری عبادت میں رہو اور مجھے تنہا خالق و مالک اور موثر سمجھو، مجھے اپنا تنہا بادشاہ اور مالک حقیقی سمجھو اور پھر میں تمہیں رزق ظاہری اور باطنی بھی دوں گا، روٹی و مکان بھی، اقتدار و عزت بھی اور حکومت و سلطنت بھی۔ اور تمہیں دنیا کے اوپر غالب کروں گا۔ جس کا ایک جگہ وعدہ فرمایا: ﴿وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ﴾ ② اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح اختیار کریں گے، عقیدہ بھی پکا اور سچا اور عمل بھی سچا، ہم ضرور انہیں زمین میں خلافت عطا کریں گے، انہیں اقتدار عطا کریں گے، انہیں عزّت عطاء کریں گے، وجاہت دیں گے''۔

یہ گویا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا۔ بندے سے یہ وعدہ لیا کہ تو تنہا میری طرف جھک، کسی کو کرتا دھرتا مت سمجھنا، ڈرے تو مجھ سے ڈر عبادت کر تو میری کر، مانگ تو مجھ سے مانگ، میرا غیر تیری مشکلات کو حل نہیں کر سکتا، غیر اللہ کے ہاں تیرے لئے گنجائش نہیں۔ میرے ہی پاس ساری گنجائش ہے۔ میں ہی دوں گا۔ یہ معاہدہ ہو گیا۔

بندے کا انحرافِ عہد...... معاہدے کا قاعدہ ہے کہ اگر ایک معاہد اپنا عہد توڑ دے تو دوسرے پر ضروری نہیں رہتا کہ اپنا معاہدہ پورا کرے اور اپنا وعدہ پورا کرے۔ دو حکومتوں میں معاہدے ہوئے، ایک نے غدر کیا، دوسری کہے گی اب ہم بھی اپنے وعدے کے پابند نہیں، اب خواہ ہم جنگ کریں یا اس ملک پر ہم قبضہ کریں، جب تک معاہدہ رہتا ہے دونوں فریق ایک دوسرے کی رعایت کرتے ہیں۔

اسی طرح بندے اور خدا میں معاہدہ ہو گیا، بندے نے عہد کیا کہ میں آپ کا بنوں گا، فرمایا، ہم تیرے بنیں گے، تو ہماری عبادت کر ہم تجھے سب کچھ دیں گے، اب اگر بندہ اس عہد سے پھر جائے کہ بجائے اس ایک کی عبادت کرنے کے اس نے ہزاروں کے سامنے سر جھکانا شروع کر دیا، بجائے اس ایک کی بندگی کے کبھی وہ کسی قبر کے آگے جھک رہا ہے، کبھی کسی پتھر کے آگے جھک رہا ہے۔ کبھی سونے اور چاندی کے آگے جھک رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے عہد توڑ دیا، جب عہد توڑ دیا تو وہ جو وعدہ تھا اس کی پابندی باقی نہیں رہی۔ فرمائیں گے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ تجھے رزق دیں، کیا ضرورت ہے کہ تجھے اقتدار دیں، تُو تو ہم سے منحرف ہو جائے اور ہم تجھے اقتدار دیں تُو تو مالک و خالق روٹی گیہوں اور چنے کو اور انسانوں کو سمجھے اور ہم تجھے عزّت و اقتدار دیں؟

﴿اَنُلْزِمُکُمُوْھَا وَاَنْتُمْ لَھَا کٰرِھُوْنَ﴾ ③ کیا ہم اپنی رحمت تیری کمر سے چپکا دیں گے کہ تو بھاگتا

① الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب من احب لقاء اللہ......ص: ۵۴۲، رقم: ۶۵۰۷۔

② پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۵۵۔ ③ پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۲۸۔

جا رہا ہے۔ ہم کہیں رحمت لیتا جا تجھے لاکھ دفعہ ضرورت ہو تو ناک رگڑ، تو ہم تجھے رحمت دیں گے، جب تو وعدہ کا پکا نہیں تو ہم بھی اپنے وعدے کے پابند نہیں، جب تک وعدے کی پوری پابندی رہی، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا دور، حضرات تابعین کا دور، حضرات تبع تابعین کا دور، اقتدار بھی آیا، عزت بھی آئی اور وہ اقتدار آیا کہ آج دنیا اس کی نظیر نہیں پیش کرسکتی، آج آپ فخر کرتے ہیں کہ عرب ہمارا، عراق ہمارا، مصر ہمارا، ترکستان ہمارا، افغانستان ہمارا، شام اور اردن ہمارا، یہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ تو ہے جو آپ کو یہ کہنے کو ملا، آپ نے ان کو خود فتح کیا تھا؟ کیا آپ نے خود قوتِ بازو سے ان ممالک کو قبضے میں کیا تھا؟ یا ان بزرگوں نے جو اللہ کی چوکھٹ پر جھکے ہوئے تھے؟ آپ کو فخر کا موقع مل رہا ہے کہ ؎

چین و عرب ہمارا ، ہندوستان ہمارا مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہان ہمارا

یہ فخر کا موقع ان کی جوتیوں کے صدقے سے مل رہا ہے، آپ کی بات اگر ہوتی تو نہیں ہوسکتا تھا۔ تو جب تک قوم وعدے پر پختہ رہی وہ اقتدار بھی تھا، وہ عزت بھی تھی، وہ روزی بھی تھی۔ وہ فتنے بھی نہیں تھے، آپ داعی تھے، دوسرے مدعو، جب آپ نے دعوت چھوڑ دی تو دوسرے داعی بنے آپ کو مدعو ہونا پڑا، آپ بااقتدار تھے، دوسرے ماتحت تھے۔ جب آپ نے اقتدار کے اسباب چھوڑ دیئے، آپ ماتحت بنے، دوسرے آپ کے اوپر غالب کر دیئے گئے۔ یہ وعدہ خلافی آپ نے کی۔ تو جب فتنے آتے ہیں، پریشانیاں آتی ہیں آپ کہتے ہیں کہ تدبیر تو بتلاؤ، تدبیر تو اللہ نے بتلا دی کہ تم میرے بن جاؤ، میں تمہارا بن جاؤں گا اور کیا تدبیر ہو۔ حکومت ان کے ہاتھ میں ہے۔ رزق ان کے ہاتھ میں ہے، عزت ان کے ہاتھ میں ہے، اس کی چوکھٹ پر جھکو گے تو یہ چیزیں آئیں گی، اس کی چوکھٹ چھوڑ کر غیروں کے آگے جھکنا شروع کیا تو غیروں نے آپ کی رہی سہی عزت کو بھی قبضہ میں لے لیا رہی سہی روٹی پر قبضہ کر لیا، آپ کو فتنوں کے میدان میں چھوڑ دیا۔ اب کوئی روٹی کو رو رہا ہے، کوئی پانی کو رو رہا ہے، کوئی صحت کو رو رہا ہے۔ کیوں رو رہے ہیں؟ اس لیے کہ جب ایک کا دروازہ چھوڑا تو پچاس کے آگے جھکنا پڑا اور ان دروازوں پہ کچھ نہیں جو آپ کو دیں، نہ اُدھر کے رہے۔

عظمتِ دَر اور سَر...... مجھے ایک شعر یاد، آیا واقعی بڑا کام کا شعر ہے اور شاعر نے بڑی بلیغ بات کہی ہے، جس نے بھی کہی ہے بڑی اونچی بات ہے اور دو لفظوں میں بڑی زبردست حقیقت کہہ دی ہے، شاعر کہتا ہے ؎

سر جس پہ نہ جھک جائے اسے دَر نہیں کہتے

دروازہ وہی ہے جسے دیکھتے ہی آدمی کا جی چاہے کہ جھک جائے۔ اہل اللہ کا دروازہ، انبیاء علیہم السلام کا دروازہ۔ خواہ مخواہ ہی دل چاہتا ہے کہ سر جھکاؤ۔ انکار کی شکل ہی نہیں۔ تو شاعر کہتا ہے ؎

سر جس پہ نہ جھک جائے اسے دَر نہیں کہتے ہر در پہ جو جھک جائے اسے سَر نہیں کہتے

ذلتِ انحراف...... جو پچاس کو اپنا آقا بنا لے، وہ کسی آقا کی خدمت نہیں کرسکتا، ایک ہی آقا کی خدمت ہوسکتی

ہے۔جب آپ کے پچاس آقا ہیں کبھی اس کی چوکھٹ پہ جھکنا کبھی اس کی چوکھٹ پہ۔کبھی اس سے بھیک مانگنی کبھی اس سے بھیک مانگنی۔تو مسلم قوم دنیا میں بھک منگی بن کے تھوڑا ہی آئی تھی۔وہ دنیا سے کچھ مانگنے کے لئے نہیں آئی تھی۔دنیا کو کچھ دینے کے لیے آئی تھی،وہ محسن بن کے آئی تھی،سائل بن کر نہیں آئی تھی.جب احسان کا دروازہ بند کردیا اور ختم کردیا تو سائل اور بھکاری بننا پڑا۔اب آپ کی یہ حالت ہے کہ کسی قوم کے آگے جھک رہے ہیں کہ ہمیں تمدن کی بھیک دے دو،کسی کے آگے جھکتے ہیں کہ ہمیں سیاست کی بھیک دے دو کسی کے آگے آپ جھک رہے ہیں کہ ہمیں اخلاق کی بھیک دے دو،اور سر کے اوپر ٹوکرا رکھا ہوا ہے جس میں رزق موجود ہے۔مگر در در مانگتے پھر رہے ہو۔یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ہاتھ اٹھا کے سر کے اوپر سے لے لو،وہ ساری چیزیں اس ٹوکرے میں موجود ہیں۔قرآن وحدیث سر کے اوپر رکھا ہوا ہے اور دنیا کے در پر بھیک مانگ رہے ہیں۔حالاں کہ اس میں سب کچھ موجود ہے۔اسی نے دنیا میں بین الاقوامیت اور بین الاوطانیت پھیلائی ۔

یک سبد پُر نان ترا بر فرقِ سر   تو ہمی جوئی لبِ ناں در بدر

سر پہ روٹیوں کا ٹوکرا بھرا ہوا ہے۔اور ٹکڑوں کی مانگ کرتے پھر رہے ہیں۔اس لئے کہ جب غیر کی چوکھٹ پر سر جھکائیں گے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ آپ بھکاری بنیں گے،تو مسلمان دنیا میں اقوام کو کچھ دینے کے لئے آئے تھے،مگر سائل اور بھکاری ہو گئے۔اور بھیک ملتی نہیں۔تو ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

یہ کیوں ہوا؟اس لئے کہ وعدہ خلافی کی۔اس معاہدہ کو توڑ دیا جو اللہ سے کیا تھا۔کہا تھا کہ مجھ ہی پر بھروسہ کرو،مجھے ہی اپنا بادشاہ سمجھو مجھے ہی خالق اور مالک سمجھو۔میرے ہی قانون کی دنیا کے اندر ڈنڈی پیٹو،میرا ہی قانون سب تک پہنچاؤ۔آپ نے جو اس قانون کو چھوڑا تو دنیا کی اقوام نے آپ پر قوانین لادنے شروع کئے۔وہ قوانین جو فطرت کے بھی خلاف،عقل کے بھی خلاف اور ہوش مندی کے بھی خلاف مگر آپ کو جھک مار کر کرنا پڑ رہا ہے۔آپ کشاں کشاں جا رہے ہیں۔اور آپ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ چیز بری ہے۔مگر آپ کو جانا پڑا۔

کوئی نس بندی کا قانون پاس کرے گا،آپ کو مجبور ہو کے گردن جھکانی پڑے گی،اس لئے کہ جب اپنے قانون کو پس پشت ڈالا تو دوسرے کے قانون پر چلیں،کوئی فیملی پلاننگ لائے گا،آپ کو ماننا پڑے گا۔اس لئے کہ جو اسلام کا حکم تھا وہ پسِ پشت ڈال دیا۔پھر دنیا کی اقوام کے آگے جھکنا پڑے گا۔

اسلامی قانون کی عملی پابندی کی ضرورت......اگر آپ اس قانون پر عامل ہوتے فقط اعتقادی طور پر نہیں،عمل بھی ہو تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے اندر رخنہ اندازی کرے جب عملاً چھوڑ دیا تو ۔

خانۂ   خالی   رادیومی   گیرد

جب گھر خالی ہوتا ہے تو شیطان ہی اس میں آ کر بسیرا کرتا ہے۔اس لئے ایک ہی قرار واقعی علاج ہے۔اللہ نے جو قانون دیا ہے آنکھ بند کے اس کی عملی پابندی کرنی شروع کیجئے۔پھر دیکھئے کیسے تبدیلی آتی ہے۔آپ چاہتے

ہیں کہ نظری طور پر چیزیں آ جائیں۔ دماغ کو فرحت ہو جائے۔ عمل کا کوئی نام نشان نہیں اور کچھ نہ کرنا پڑے۔ تو دنیا میں بلا کئے کسی کو کچھ نہیں ملتا، دنیا تو دار العمل اور دار الکسب ہے، جتنا کسب و محنت کریں گے اتنا ہاتھ آئے گا، اور جتنا آپ اسباب کو چھوڑ کر غنی بن کے بیٹھ جائیں گے محتاج ترین بن جائیں گے، آپ کو کوئی چیز نہیں ملے گی، یہ جنت نہیں ہے کہ تخیل باندھنے سے نعمت سامنے آ جائے۔ یہ دنیا ہے یہاں محنت کرنے سے چیز سامنے آ جائے گی۔

اگر کاشتکار چھ مہینے خون پسینہ ایک نہ کرے، وہ چار دانے لے کر گھر میں نہیں آ سکتا، اس لئے کہ دنیا دار العمل ہے۔ اگر کاشت کار برسات کے مہینے میں یہ دیکھ کر کہ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، بڑا اچھا خنک موسم ہے۔ لہٰذا یہ چار، چھ مہینے تو سو کے گزار لو۔ تو تخم ریزی کا زمانہ نکل جائے گا، بارش کا دور ختم ہو جائے گا، جب لوگ اناج کے ڈھیر لے کر آئیں گے تو یہ بیٹھ کر قسمت کو روئے گا کہ میں نے تخم ریزی کا سارا وقت سونے میں گزار دیا، اب جب دانہ لینے کا وقت آیا تو جنہوں نے محنت کی تھی وہ لے کر آ رہے ہیں۔ میں خالی اور محروم ہوں۔ اب بیٹھ کر روئے گا مگر اب رونے سے کیا ہوتا ہے۔ ملامت کرنے والا یہی تو ملامت کرے گا کہ کمبخت تو نے ان چھ مہینوں میں جا کر کیوں نہیں محنت کی؟

جب نہیں کی تو اب بیٹھ کر اپنی قسمت کو روؤ۔ غرض دنیا کا بازار اور دنیا کا میدان کاشت کاری کے لئے ہے۔ اللہ نے تخمِ سعادت کا بیج دلوں میں بکھیر دیا ہے۔ اس کو بار آور کرنا کہ ایمان و اعتقاد مضبوط کر کے عملاً چلنا، تب جا کے آخرت اور دنیا میں اس کے ثمرات ظاہر ہوں گے۔ جب آپ نے نہ بیج کو پانی دیا، نہ بیج کی آبیاری کی تو چند دن کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیج بھی سوخت ہو جاتا ہے۔ جب زمین پر پانی ہی نہ پڑے تو بیج جل جائے گا۔ جو تخم سعادت قلوب کے اندر بکھیرا گیا تھا، اسے آپ ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کو پانی دے کر اگانے کی فکر میں نہیں ہیں۔ اور سوال یہ ہے کہ ہمیں دانہ کیوں نہیں مل رہا؟ ہمیں رزق کیوں نہیں مل رہا؟ بھائی! جب تم اگاؤ گے نہیں تو کہاں سے ملے گا۔؟ جب تخم ریزی نہیں کرو گے تو دانہ کہاں سے ملے گا؟

حصولِ عزت و اقتدار کی تدبیر...... یہ ہر شخص کے دل میں سوال ہے کہ مجھے راحت کیسے ملے؟ مجھے سکون کیسے ملے؟ مجھے عزت اور عرفی حیثیت کیسے ملے۔؟ اقتدار کیسے ملے۔؟ اور عمل کے نام سے آگے کوئی بڑھنا نہیں چاہتا۔ یہ اسی کاشتکار کی سی مثال ہوگئی کہ تخیل باندھ رکھا ہے جو تخم ریزی کے زمانے میں تو پڑ کے سو گیا، اس کے گھر میں دانہ کون لائے گا۔؟ سوائے اس کے کہ وہ دکان دکان بھیک مانگے گا کہ بھائی! میں نے تو اپنی زمین میں نہیں اگایا تم خدا کے واسطے ایک ڈھیری مجھے دے دو، خدا کے واسطے ایک ٹکڑا دے دو، وہی مثال ہماری ہوگئی کہ جو کام کرنے کا وقت ہے وہ تو ہم آرام میں ضائع کر رہے ہیں، نہ دین کی خبر، نہ احکام کی خبر، نہ خدا کے اور رسول کے اتباع کی خبر۔ نہ وہ معاہدہ یاد ہے جو اللہ سے کر کے آئے ہیں۔ اور جب کچھ نہیں کیا اور فتنے آ کے پڑے، اقتدار بھی چھنا، دولت بھی چھنی اور ملک بھی چھنا، اب بھیک مانگتے پھر رہے ہیں کہ ہمیں فلاں ریاست دے دو فلاں ملک دے دو۔ ملک و ریاست، دولت و عزت کے ملنے کے جو اسباب تھے، ان اسباب سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اب کہتے ہیں کہ کیا تدبیر کی جائے؟ تدبیر موجود

ہے، کرنے کا بھی وقت ہے۔ تدبیر بنانے کی ضرورت نہیں، وہ تو بنی بنائی اللہ نے اتار دی تھی۔

کفر کے دستِ نگر اسلامی ممالک..... غرض جب آپ نے عہد کی خلاف ورزی کی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم پر بھی ضروری نہیں کہ ہم اپنا وعدہ پورا کریں، وہ وعدہ تو اس شرط سے مشروط تھا کہ تم ہماری بندگی کرو، تم قانون خداوندی پر عمل کرو، تم اپنی زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کا دستور اپناؤ۔ ان کی حیات اور دستورِ زندگی کو مشعلِ راہ بناؤ اور تم یہ وعدہ کر کے آئے تھے، جب تم نے یہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ تو ہم پر کب وعدہ پورا کرنے کی پابندی رہی کہ تمہیں اقتدار بھی دیں، عزت بھی دیں اور رزق بھی دیں۔

اسی لئے یہ چیزیں ہاتھ سے چھنی شروع ہوئیں۔ ملک ہاتھ سے چھننا شروع ہوئے، آج یہ ملک نکل گیا۔ کل یہ نکل گیا۔ اور نہیں بھی نکلا تو اقتدار خود آپ کا نہیں، اقتدار اب غیروں کا ہے۔ آپ اپنے ملک میں رہ کر کچھ نہیں کر سکتے، جب تک ان غیروں کی منشاء نہ ہو، تو آپ ان کی منشاء کے غلام اور تابع بنے۔ کہنے کو آپ کہتے رہیں کہ صاحب! ہمارا ملک آزاد ہے اور ہمارا اقتدار ہے۔ مگر تمہارا اقتدار کیا ہے؟ پیسوں کے تم محتاج ہو، وہ اگر یوں کہیں کہ جب تک تم نس بندی نہیں کرو گے، ہم قرضہ نہیں دے گے۔ تمہیں جھک مار کے کرنی پڑ رہی ہے۔ یہ کون سا اقتدار ہے؟ یہ کون سی آزادی ہے؟

آزادی، اقتدار..... اقتدار اسی کا نام ہے کہ "اپنی قدرت سے قادر ہو۔" "قادر بقدرت الغیر" کو قادر نہیں کہتے۔ کیا آپ قادر ہیں جب تک دوسرے کی قدرت استعمال نہ کریں۔؟ یہ کون سی قدرت ہے؟ قدرت وہ ہے کہ اپنے اندر ہو اور آپ اپنی من مانی کارروائی کر سکیں۔ جی چاہی بات کر سکیں۔ یہ قدرت نہیں تو آپ قادر ہی کب رہے؟ ملک اگر آزاد بھی ہو، ہندوستان ہو، پاکستان ہو، کچھ بھی ہو۔ اور انتظام واثرات غیروں کے غالب ہوں، جب تک وہ مدد نہ کریں چل نہیں سکتے۔ اسے اقتدار تھوڑا ہی کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آپ ہر چیز میں دوسروں کے محتاج ہیں۔ روٹی، رزق اور ٹکڑے میں، عزّت اور اقتدار میں۔

پارٹی بندی کا انجام..... تو سوال یہ ہے کہ اس بے رزقی اور بے عزّتی کے بارے میں آپ کے ذہن میں کبھی یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ہم نے معاہدے کی کوئی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں؟ یہ شکایت رہتی ہے کہ اللہ نے ہمیں اقتدار کیوں نہیں دیا۔؟ ہمارے ملک کیوں چھین لئے؟ ہماری عزّت کیوں چھین لی؟ ہماری روٹی کیوں چھین لی؟ کیوں ہم بھیک مانگتے پھر رہے ہیں؟۔ اللہ کی نسبت تو خیال آتا ہے۔ اپنی نسبت خیال نہیں آتا کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم کے کہ ؎

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

جو آفت آتی ہے، وہ انہیں پر آتی ہے۔ اب روتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ یہ برق آئی کیوں۔؟ یوں کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے بھیج دی، اللہ میاں نے بھیجی۔ مگر کب بھیجی؟ جب تم اللہ میاں کے نہ رہے۔ وہ بجلی ہی گرائیں

گے، وہ تو قحط سالی ہی رکھیں گے، وہ تو رزق چھین لیں گے۔ تم نے معاہدہ توڑ دیا، انہوں نے بھی وعدہ پورا نہیں کیا، وعدہ جب ہی تک ہے جب کہ شرط ایمان وعملِ صالح کی پوری ہو۔ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ ① تو ایمان وعمل صالح اور باہمی اعتماد ومحبت کی شرط پوری ہو تو ایفائے وعدہ ہوگا'' ہمیں آپ کو تو لڑنے سے ہی فرصت نہیں۔ اتحاد کہاں رہے گا؟ اختلاف اور نزاع ہر چیز میں ہے۔ اب گویا مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر چیز میں لڑتا جھگڑتا رہے، کوئی مسئلہ آئے گا، تب کھڑے ہو کر لڑیں گے، کوئی حکمِ شرعی ہوگا، اس میں کھڑے ہو کے لڑیں گے۔ ہر چیز میں لڑائی ہر چیز میں پارٹی بندی، ہر چیز میں نکتہ چینی، اس قوم کا تو پھر یہی انجام ہونا ہے کہ وہ روتی پھرے۔

قومی غفلت...... یہ سوال ہر ایک کے دل میں ہوتا ہے کہ صاحب! ان فتنوں میں گرفتار ہیں، کیا کریں؟ مگر دل میں یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے فتنے برسادیئے۔ بس اللہ تعالیٰ کی شکایت ذہن میں آتی ہے۔ اپنے نفس کی کوئی شکایت ذہن میں نہیں آتی کہ میں نے کیا کیا۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ اس سے بری ہے کہ کوئی اس کا شکوہ کرے، اس کے ہاں تو دروازے کھلے ہوئے ہیں، لینے والا کوئی ہونا چاہئے؟ اقبال نے ایک جگہ ''جوابِ شکوہ'' میں کہا ہے۔ جو گویا اللہ کی طرف سے شکوہ کا جواب آیا ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں ‏ ‏ ‏ راہ دکھلائیں کسے، رہروِ منزل ہی نہیں

جب کوئی سوال کرنے والا ہی نہ ہو تو وہ کیسے دے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: روزانہ اخیر تہائی رات میں حق تعالیٰ کی تجلیات آسمان دنیا پر اترتی ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ: ''اَنَا الرَّزَّاقُ مَنْ ذَاالَّذِيْ يَسْتَرْزِقُنِيْ، اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَاالَّذِيْ يَسْتَغْفِرُنِيْ'' ② میں رزق دینے والا ہوں، کوئی ہے رزق مانگنے والا؟ میں مغفرتیں کرنے والا ہوں، کوئی ہے مغفرت مانگنے والا؟

جن کو اللہ نے توفیق دی، وہ مانگتے ہیں اور انہیں شخصی طور پر ملتا بھی ہے۔ لیکن قوم غافل ہے، نہ وہ مانگتی ہے، نہ اسے ملتا ہے۔ غرض ہاتھ پھیلا کر کہہ رہے ہیں کہ کوئی ہے مانگنے والا؟ تو صحیح ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں ‏ ‏ ‏ راہ دکھلائیں کسے، رہروِ منزل ہی نہیں

جس سے تعمیر ہو آدم کی، یہ وہ گِل ہی نہیں

جس مٹی سے انسان کو بنایا گیا تھا، اس مٹی میں ہی پیداوار نہ رہے۔ تو شیطانی روح حلول کر گئی تو نصب العین شیطان سے مل گیا۔ آدم سے کہاں باقی رہا؟

زندگی کا جائزہ لینے کی ضرورت...... اب ذہن میں یہ تو آتا ہے کہ اللہ میاں نے دوسری اقوام کو سب کچھ دے

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۵۵.

② مسند احمد، مسند ابی هریرۃؓ ج: ۱، ص: ۳۳۷. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، اوقات الاجابۃ ج: ۴ ص: ۴۱۳.

دیا، اور ہم سے سب کچھ چھین لیا۔ یہ نہیں آتا کہ کیوں چھینا۔؟ اور ہم نے کیا کیا۔؟ تو سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لیا جائے، ہمارا فرض ہے کہ زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر گزاریں اور یہ نہیں ہوسکتا جب تک تھوڑی بہت تعلیم نہ ہو اور تھوڑی بہت تربیت نہ ہو۔ سنتیں آسمان سے برستی تھوڑا ہی ہیں کہ وہ گھر گھر میں اتریں۔ وہ تو تعلیم کے راستے سے آتی ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان ہو گیا۔ کتنے ہیں ہم میں جو واقعی قرآن کریم کو اس نیت سے پڑھتے یا سنتے ہیں کہ ہمیں عمل نصیب ہو جائے؟

بہت سے وہ ہیں جو پڑھنا ہی نہیں جانتے، انہوں نے تعلیم ہی نہیں پائی، لفظوں کی بھی تعلیم نہیں۔ معنی کی بات تو الگ ہے اور مفہوم کی الگ ہے۔ سو میں ننانوے وہ نکلیں گے جنہیں مس بھی نہیں کہ دین کیا چیز ہے مگر مدعی ءدین بن کر کھڑے ہو جائیں گے کہ صاحب! ہم دین دار ہیں۔ شاید سو میں کوئی دو چار گنے چنے نکل آئیں گے۔ تو قوم، نیک قوم تب کہلاتی ہے جب اس کی اکثریت نیکی پر ہو۔ ہزار دو ہزار میں سے اگر دس بیس اشخاص نکل آئیں تو وہ قوم کی سربلندی نہیں ہے۔ وہ ان اشخاص کی سربلندی ہے، قوم کی سربلندی جب ہوگی جب کم سے کم اکثریت تو آئے۔ برابر سرابر تو ہو۔ اب ہماری کیفیت یہ ہے کہ ﴿مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَاَكۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ﴾ ① مومنین کم ہیں۔ فساق وفجار زیادہ ہیں اور جتنے مومن ہیں ان کے بارے میں قرآن کریم نے شکایت کی ہے کہ ﴿وَمَا يُؤۡمِنُ اَكۡثَرُهُمۡ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمۡ مُّشۡرِكُوۡنَ﴾ ② بہت سے لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ حقیقت میں مشرک ہیں۔ دلوں کے اندر وہی غیر اللہ کی عظمت جمی ہوئی ہے۔ مالک کی عظمت نہیں ہے، کوئی کہہ رہا ہے کہ پیر مجھے اولاد دے گا، کوئی کہہ رہا ہے فقیر مجھے منہ مانگی مراد دے گا۔ جو اللہ کی عظمت تھی وہ فقراء اور اشخاص کے سپرد کر دی۔ اس میں قوم کا کیسے بیڑا پار ہوگا؟ تو یہ طلب ہوتی ہے کہ فتنوں سے بچنے کی صورت بتائی جائے، یہ نہیں ہوتی کہ ہمیں بھی کچھ کرنا چاہئے۔

کم ہمتی کی انتہاء...... اور بڑے سے بڑا کام کریں گے تو یہ کہ صاحب! کہ ایک تعویذ لکھ دیں، دکان میں برکت ہو جائے۔ میں نے کہا تجھے کچھ نہ کرنا پڑے، جو کرے بس تعویذ کھڑا ہو کر کرے، تم اپنا آرام سے بیٹھے رہو۔ تو عمل کی خُو جاتی رہی، بس تعویذ سب کچھ بنا دے گا۔ یا کوئی دعا لٹکا دی، دعا بھی جبھی کارآمد ہوتی ہے جب اپنے اندر کچھ جان ہو۔ ورنہ ایسا ہے جیسے کوئی کسی کے پاس جائے کہ حضرت! دعا کرو کہ میرے اولاد ہو جائے اور نکاح کا نام نہیں۔ بیوی پاس نہیں۔ بھائی! دعا بھی جبھی کارآمد ہوتی ہے جب آدمی اسباب مہیا کرے۔ دعا نتیجے کے لئے کرائی جاتی ہے کہ اسباب پر ثمرہ مرتب ہو جائے، یہ نہیں ہوتا کہ اسباب بھی دعا ہی سے مہیا ہو جائیں گے، مجھے کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا کہ "حضرت! مجھے نماز پڑھنے کے لئے تعویذ لکھ دو!" حضرت نے فرمایا۔ "بھائی مجھے ایسا کوئی تعویذ لکھنا نہیں آتا کہ میں تعویذ لکھ کے اس میں دو سپاہی بھی بٹھا دوں کہ جہاں نماز کا وقت آیا اور وہ ڈنڈا لے کر تیرے سر پر ہو جائیں کہ چل مسجد میں۔ میرے پاس ایسا تعویذ نہیں

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۱۰. ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۶.

ہے کہ اس میں دو سپاہی بھی بیٹھے ہوئے ہوں۔ اور پھر اس کو ڈانٹا کہ ''نالائق! جو تیرے کرنے کا کام ہے۔ وہ بھی تعویذ ہی کرے۔ تجھے اپنی چار پائی سے ہلنا نہ پڑے۔ تو آرام سے پڑا رہے، بس تعویذ سب کچھ کر دے گا''۔

تو تعویذ کارآمد ہے مگر جبھی جب آپ اسباب مہیا کر لیں۔ نتیجے کے لئے تعویذ ہوتا ہے، دعا ہوتی ہے کہ اللہ ثمرہ مرتب کر دے، یہ محنت رائیگاں نہ جائے، محنت کے لئے تعویذ تھوڑا ہی بنایا جاتا ہے کہ صاحب! مجھ سے عمل کرالو۔ کان پکڑ کے مجھ سے عمل کرادو، عمل تو آپ کی ہمت کرے گی۔ دوسرے کے کان پکڑنے سے عمل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

عزم و ہمت کی ضرورت...... اصل چیز دین میں صرف ہمت ہے۔ آدمی عزم باندھ لے کہ یہ مجھے کرنا ہے، پھر مددِ خداوندی ہوتی ہے۔ اور وہ کر گزرتا ہے ڈانواں ڈول رہے۔ عزم ہی نہیں، اس کی مدد بھی نہیں ہوتی، تو آپ کے دلوں میں تمنا تو ہے کہ فتنے رفع ہوں مگر دل میں عزم نہیں ہے کہ آپ انہیں رفع کر دیں گے۔ اس لئے عزم پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ دنیوی معاملات میں بھی اگر محض تمنا ہو کہ مجھے ماہوار ہزار روپیہ آمدنی ہو، کبھی نہیں ہوگی، لیکن جب عزم کریں گے کہ مجھے ہزار روپیہ ماہوار کمانا ہے۔ چاہے تجارت کرنی پڑے، چاہے زراعت کرنی پڑے، چاہے ملازمت کرنی پڑے، مجھے ایک ہزار کی آمدنی کرنی ہے۔ اور اس کام میں آپ لگ گئے تو مددِ خداوندی ہوگی۔ ضرور ایک ہزار کی آمدنی ہو جائے گی۔ لیکن اگر نہ دکان پر جائیں، نہ دفتر میں جائیں، نہ کھیت میں جائیں اور تمنا یہ ہے کہ مجھے ہزار روپیہ ماہوار ملے تو ایک ہزار روپیہ ماہوار کی کوئی بارش تھوڑا ہی برسے گی؟ کئے کرنے سے آئے گی۔

بلا اسباب دعا موثر نہیں...... دعا بھی جبھی کام دیتی ہے جب آدمی اسباب مہیا کرا کے دعا کرائے کہ صاحب! اتنا کام تو میں نے کر دیا کہ میں وضو کر کے پانچ وقت مسجد میں جاتا ہوں۔ آپ دعا کیجئے کہ میں اس پر جما رہوں مستقیم رہوں۔ اس کی دعا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کہ میرا ارادہ تو نماز پڑھنے کا ہے نہیں۔ آپ دعا کر دیں کہ نمازی ہو جاؤں۔ ایسا بھی دنیا کا کوئی دستور اور فطرت ہے؟ اسی واسطے ایسی دعا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جس کو مشیّت کے اوپر محول کیا جائے۔ یوں کہا جائے ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ اِنْ شِئْتَ......'' ''اے اللہ! میری مغفرت فرما دے، اگر تو چاہے، اے اللہ میرے اوپر رحم فرما، اگر تو چاہے''۔

رحم و مغفرت تو وہ جبھی کریں گے، جب چاہیں گے۔ آپ کا یہ کہنا کہ ''اگر آپ چاہیں میری مغفرت کر دیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تو ضرورت ہے نہیں آپ کی مغفرت کی، آپ چاہیں تو مغفرت کر دیں، یا یہ کہ مجھے تو آپ کی رحمت کی ضرورت نہیں ہے، آپ چاہیں تو میرے اوپر رحم کر دیں، اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ دعا کو مشیت کے ساتھ مقید کر کے دعا مت مانگو کہ آپ چاہیں تو دے دیں۔ مجھے تو ضرورت نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی۔ فرمایا کہ دعا مانگو اس الحاح اور قوت کے ساتھ کہ ہم لے کر اٹھیں گے۔ کریم کے دروازے پر آئے ہیں۔ محروم ہو کر نہیں جائیں گے، تو لیچڑ بن کے دعا مانگو تو دعا ضرور قبول ہوگی اور ملے گا۔ تو سائل بن کر اور لیچڑ بن کر سوال کریں اور چوکھٹ پر سر ٹیک دیں کہ میں بغیر لئے اٹھوں گا نہیں۔ تو ایسے بندے کی دعا بے شک قبول ہوتی ہے۔

وہاں حج پر ہم نے دیکھا کہ بیت اللہ میں ایک بدوی حاضر ہوا۔ بالکل بے پڑھا لکھا۔ اور صاحب! اس نے جو دعا مانگی عجیب تھی۔ اس نے کہا "یَارَبَّ الْبَیْتِ یَا رَبَّ الْبَیْتِ جِئْتُکَ وَالْاَھْلُ فِی الْبَیْتِ اَنْ تَغْفِرَلِیْ اَنْ تَغْفِرَلِیْ......" "اے اللہ! میں تیرے گھر میں آیا ہوں اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر آیا ہوں"۔

گویا بڑا احسان کیا۔ تو بیوی بچوں کو چھوڑ کے آیا ہوں، وہ گھر میں ہیں اور میں تیرے گھر میں آ گیا۔ لہٰذا بخشنا پڑے گا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں بلا مغفرت کے جاؤں، میں تو مغفرت لے کر جاؤں گا۔ واقعی ایسے کو مغفرت ملتی ہے۔ غرض الحاح بھی ہو، زاری بھی ہو، قلب کا جھکاؤ بھی ہو، قلب کے اضطراب سے دعا ہو ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ﴾ ① "جو مضطر ہو کر الحاح تام کے ساتھ دعا مانگے گا، ہم ضرور برائی رفع کریں گے، اس کے اوپر سے فتنہ ضرور ہٹائیں گے۔ اور زمین کی قوت و خلافت بھی دیں گے اور اقتدار بھی دیں گے"۔

تو مانگنے والا ہو، قول سے بھی مانگے عمل سے بھی مانگے۔ عمل کرے تو وہ کرے جس میں شرک کا شائبہ نہ ہو، اور دعا وہ مانگے جس میں استغناء کا شائبہ نہ ہو، لیچڑ بن کر مانگے، تو ضرور ملتا ہے۔ تو اب آپ دعا سے بھی مستغنی، تعلیم سے بھی مستغنی، تربیت سے بھی مستغنی، پڑھنے لکھنے سے مستغنی، محنت بھی سے مستغنی، اور تمنا یہ ہے کہ سب کچھ ملے۔ یہ فطرتُ اللہ کے خلاف ہے۔

عزت و اقتدار کا قانونِ عام...... دنیا میں حق تعالیٰ کی کسی سے رشتہ داری تھوڑا ہی ہے کہ اس قوم کو ضرور اقتدار دیں گے، انہوں نے تو اصول و قوانین بیان کر دیئے، جو ان پر چلے گا، اسے ملے گا، جو نہیں چلے گا نہیں ملے گا، قانون عام کا اعلان کر دیا۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ ② مسلمان ہوں یا صابی ہوں یہودی ہوں یا نصرانی ہوں۔ مجوسی ہوں یا کسی اور قوم کا ہو، جو ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا، اس کے لئے اجر بھی ہے، نہ پھر خوف رہے گا، نہ غم رہے گا، نہ اسے محرومی رہے گی"

تو تدبیر تو یہ آ گئی، اب آپ کو کیا تدبیر بتائی جائے؟ اور کیا کہا جائے؟ اور کون آ کر کہے؟ کیا حضرت جبرئیل علیہ السلام کہنے کے لئے آئیں گے؟ نہیں۔ اللہ نے اپنی کتاب اتار دی، پڑھو، علم حاصل کرو اور احکام معلوم کرو، تعلیم نہیں پائی، علماء سے پوچھ پوچھ کر احکام حاصل کرو، مگر اتباع کا جذبہ رکھو کہ پابندی کریں گے۔ خواہ پڑھنے سے ہم معلومات حاصل کریں، خواہ مطالعہ سے ہم معلومات حاصل کریں، خواہ علماء سے فتوے لے لے کر ہم معلومات حاصل کریں۔ سوال کر کر کے اپنی تشفی کریں، ہمیں عمل کرنا ہے۔ اور اتنا علم ہم نے حاصل کرنا ہے جس پر ہم عمل کر سکیں۔ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ خواہ کچھ بھی ہو۔ جب آدمی کے دل میں لگن ہوتی ہے تو دس طریقے اختیار کرتا ہے۔

① پارہ: ۲۰، سورۃ النمل، الآیۃ: ۶۲۔ ② پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۶۹۔

وہ کہتے ہیں کہ کسی عورت کا شوہر ملازمت پر گیا، اور وہ سینکڑوں ہزاروں میلوں کے فاصلے پر تھا۔ عورت کو خاوند سے محبت تھی۔ پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ اگر خاوند کا خط آتا، چوں کہ خود پڑھی لکھی نہیں تھی مگر چوں کہ خاوند کی لگن اور محبت تھی تو محلے میں پھرتی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ مجھے پڑھ کے سنادے کہ میرے خاوند نے کیا لکھا ہے۔ اگر دل میں لگن نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی گھروں کو جاکے نہ جھانکتی، تو بے پڑھی لکھی تھی، مگر چوں کہ خاوند سے محبت تھی، اس کا کارڈ کا ایک پرزا آیا تو گھر گھر پھر رہی ہے کہ اللہ کے واسطے اس کا مضمون سنادو کہ میرے خاوند نے کیا لکھا ہے۔ اس لئے کہ لگن ہے۔

اللہ کا آپ کے گھر خط آیا۔ اور وہ قرآن کریم ہے جو اللہ کا فرمان ہے۔ اگر آپ کے دل میں لگن ہوتی اور علم نہ ہوتا، آپ علم کے لئے گھر گھر، مدرسے مدرسے جھانکتے پھرتے کہ اس کا مجھے مطلب سمجھادو، یہ میرے مالک کا فرمان ہے۔ میرے مالک کا خط آیا ہوا ہے۔ غرض لگن ہو تو سب کچھ ہوتا ہے اور لگن نہ ہو تو پھر آدمی مگن نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے اندر کڑھن ہوتی ہے اور پریشانی ہوتی ہے۔

خاصیتِ ذکرُ اللہ...... صاف فرمادیا گیا۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ① اگر تم دلوں کا اطمینان اور سکون چاہتے ہو تو ذکر اللہ میں لگو، ہماری یاد میں لگو، ہم سکون دیں گے۔ ذکر اللہ میں سکون مخفی ہے، دنیا کے لاکھ اسباب آپ جمع کرلیں۔ سکون قلب کبھی میسّر نہیں ہوگا۔ جو آج تمام اسباب و وسائل کو جمع کئے ہوئے ہیں۔ وہ آپ سے زیادہ پریشان خاطر ہیں، ہر وقت ڈانواں ڈول ہیں کہ یہ اسباب چھوٹ نہ جائیں، اقتدار کہیں چلا نہ جائے۔ رات دن مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اور جو اللہ کا ذکر کرکے ان پر اعتماد کئے ہوئے ہیں ان کو کوئی فکر نہیں ہے، نہایت مطمئن اور ساکن القلب ہیں۔

آپ سکون قلب غیر اللہ میں اور دنیا کے وسائل میں تلاش کریں۔ وہ کبھی میسّر نہیں ہوگا، ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ کی یاد ہو۔ اس سے دل کو سکون آتا ہے، آپ گھروں کے اندر کتنا ہی پریشان ہوں، مصیبت زدہ اور مبتلا ہوں مگر جب مسجد میں آتے ہیں اور ایک سجدہ کرتے ہیں، دل ٹھہر جاتا ہے کہ میں نے اپنے مالک کے آگے عرض و معروض کردی، تو گھر میں سکون نہیں ہوتا، مسجد میں آکے ہو جاتا ہے، تو ذکر اللہ کا خاصّہ قلب کا سکون ہے۔

ذکرُ اللہ اور اسٹالن...... یہ جو اسٹالن تھا، جو کمیونسٹوں کا حضرت حضرت امام ہے، جس نے کمیونزم ایجاد کیا، جب یہ مرنے لگا تو خدا کا تو بالکل منکر تھا۔ دین و مذہب کا انکار کرتا تھا جب مرنے لگا تو اس کی زبان سے اللہ اللہ جاری ہوا اور یہ کہنا اس نے شروع کیا۔ لوگوں نے کہا بھائی! تُو تو خدا کے وجود کا انکار کرتا تھا، اب تو کیسے کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا، میں اب بھی انکار کرتا ہوں۔ کمبخت محروم تھا۔ اس لئے کہا کہ اب بھی انکار کرتا ہوں مگر اسے کیا کروں کہ دل میں سکون اسی نام سے ہوتا ہے۔ اور سکون کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اگر میں گنّوں کا نام لوں، روپے کا نام لوں، قلعوں کا نام لوں سکون نہیں ہوتا، ساری چیزیں مجھ سے دور ہونے والی ہیں، چھننے والی ہیں، جب یہ نام لیتا ہوں،

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۲۸.

دل ٹھہر جاتا ہے۔تو میں منکر ہوں۔مگر اس کے باوجود سکونِ قلب اسی سے میسر آتا ہے۔

تو ایک دھریہ اور ملحد تو اس کا احساس کرے کہ سکون اللہ کے نام میں ہے۔اور ایک ماننے والا مسلم اقرار نہ کرے کہ سکون اللہ کے نام میں ہے۔نہ وہ فکر کرے، نہ وہ ذکر اللہ کرے، نہ دل میں یادداشت رکھے تو جب مسلمان اتنے غافل بن جائیں تو انہیں سکون کے ثمرات اور رزق کے اسباب اور اقتدار کے اسباب کہاں سے ملیں گے۔تو میرے بھائی نے یہ درخواست کی تھی کہ مسلمان مصائب میں گرفتار ہیں۔کیا علاج کریں؟ بھائی علاج یہ ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔سب کے لئے ضروری نہیں کہ سارے علماء بن جائیں اور سب کے سب امام غزالی بن جائیں۔

ادائیگیٔ فرض...... مگر اتنا ضروری ہے کہ اللہ نے جو سب کے لئے فرائض رکھے ہیں، ان کی تو پابندی شروع کرو، پانچ وقت کی نماز پڑھو، اگر صاحبِ نصاب اور صاحبِ استطاعت ہو، زکوٰۃ اور صدقات سے اپنے بھائیوں کی خدمت کرو۔روزہ رکھ کر اپنے نفس کو پاک کرو، اگر استطاعت ہو تو حج کر کے اپنے عشق کے جذبات ابھارو، حسن سلوک سے پیش آؤ، ہر ایک سے محبت سے پیش آؤ۔حسنِ ظن رکھو۔دیکھو پھر قوم جڑتی ہے یا نہیں جڑتی؟

ہر ایک کے دل میں جو بدظنی ہے کہ وہ نکما ہے اور ناکارہ ہے۔بس میں کار آمد ہوں۔وہ بھی نالائق اور مجھ میں لیاقت ہے۔جب یہ جذبات ہوں گے۔محبتِ باہمی کیسے پیدا ہوگی۔؟ اپنی برائی سامنے نہیں اور دنیا کی برائیاں سامنے ہیں اور ہم ایسے مقدس ہیں کہ ہم میں کوئی برائی نہیں۔ساری برائیاں دنیا کے انسانوں میں ہیں۔تو یہ سب سے بدظنی ہے تو بدظنی سے نہ کوئی اتحاد قائم ہوتا ہے نہ کوئی محبت ہوتی ہے، تو حسن ظن سب سے بڑی چیز ہے کہ اپنے کو کمتر سمجھے اور دوسرے کو اعلیٰ سمجھے، اس سے حسن ظن پیدا ہوگا۔

معیارِ اقتداء...... آپ کا آخری بادشاہ ظفرؔ جو مغلیہ خاندان کا آخری تاجدار تھا۔کچھ تو اپنی ذات سے بھی صوفی منش اور کچھ حالات نے بھی غریب کو صوفی بنا دیا تھا۔اس نے ایک قطعہ کہا ہے۔وہ واقعی بڑی عبرت کا ہے۔وہ کہتا ہے۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

دنیا کو آپ برا جب ہی سمجھیں گے جب اپنی برائی سامنے نہ ہو، جب اپنے عیب سامنے ہوں، ہر ایک آپ کو پاک صاف اور پاکیزہ نظر آئے گا، اب یہ کہ۔

ہر یکے ناصح برائے دیگراں

جب دیکھو دوسرے کو نصیحت کر رہا ہے، خود اپنے کو بھلائے ہوئے ہے۔اس سے کام نہیں چلتا، دنیا کے بارے میں ہمیشہ اپنے سے کمتر کے بارے میں نظر رہنی چاہئے کہ اس بے چارے کی تو سو روپے ماہوار کی آمدنی ہے اور مجھے ہزار پانچ سو روپے کی آمدنی ہے۔آدمی شکر کرے۔اور دین کے بارے میں اپنے سے برتر پر نظر ہونی چاہئے کہ یہ پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتا ہے۔افسوس، مجھے توفیق نہیں۔تو دنیا کے بارے میں اپنے سے کم

تر کو دیکھے، اور دین کے بارے میں اپنے سے برتر کو دیکھے تاکہ زیادہ رغبت پیدا ہو۔

اب لوگوں نے بالکل قصہ برعکس کر دیا کہ دین کے بارے میں تو اپنے سے کمتر کی اقتداء کرتے ہیں۔ میری نمازیں بہت ہیں۔ یہ تو نالائق آدمی ہے، اس کی نہ نماز پوری نہ کچھ، اور دنیا کے بارے میں اپنے سے برتر کے اوپر نگاہ رکھتے ہیں کہ مجھے سو روپے کی آمدنی ہے۔ مجھے دو سو کی چاہئے۔ جس سے حرص بڑھتی ہے اور حرص کا انجام برا نکلتا ہے۔ غرض لوگوں نے قصہ الٹ کر دیا۔ بہر حال دین کے بارے میں اپنے سے برتر کو دیکھا جائے، تاکہ دین کی حرص پیدا ہو اور دنیا کے بارے میں اپنے سے کمتر کو دیکھو تاکہ شکر کا جذبہ پیدا ہو کہ مجھے خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ اس لئے ظفر نے کہا کہ ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر — رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر — تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اور آگے کہتا ہے کہ ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا — گو ہو کیسا ہی صاحب فہم وذکا

کہ بڑا مدبر، لیڈر، دانشمند، ذہین ہو، اس کو آدمی نہ جانیئے گا۔ تو کہتا ہے کہ ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا — گو ہو کیسا ہی صاحب فہم وذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی — جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

وہ آدمی نہیں ہے، عیش میں آدمی اس پر نگاہ کرے کہ جو دینے والا ہے، اس کا حق ادا کروں، اس سے ڈرتا رہوں، جسے دینا آتا ہے اسے چھیننا بھی آتا ہے۔ جتنا آدمی شکر ادا کرے گا۔ اسے زیادہ ملے گا، کفران نعمت کرے گا، وہ نعمت چھین لی جائے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا وعدہ ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ ① جتنا نعمت پر شکر کرو گے، میں نعمت کو بڑھاؤں گا۔ ﴿وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾ ② اور اگر تم نے کفران نعمت کیا تو میرا عذاب بھی دردناک ہے۔ پھر وہ ساری نعمتیں چھنی جائیں گے۔

مسلم کے لئے اسبابِ اقتدار...... سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھے، اس کی اطاعت میں رہ کر تھوڑی عبادت پر بھی شکر بہت کرے، تاکہ وہ عبادت بڑھتی جائے، اپنی اطاعت پر غرّہ نہ کرے کہ میں نے کچھ کیا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب آدمی نماز پڑھ کے یا کچھ ذکر کر کے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ میں نے نماز پڑھی، میں نے تلاوت کی، میں نے ذکر کیا، گویا غرور اور اتراہٹ ہے کہ میں نے بڑا کام کیا۔ فرماتے ہیں۔ نالائق! تو نے کیا کام کیا! ارے طاقت میں نے بخشی تھی، ارادہ میں نے پیدا کیا تھا۔ اسباب میں نے مہیا کئے، تو نے کیا کیا۔ غرض جتنا کیا، اسے بھی رد کر دیتے ہیں۔

① ② پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷۔

اور اگر سب کچھ کر کے یوں کہے کہ اے اللہ! مجھ سے تو کچھ بھی نہیں بن پایا۔ فرماتے ہیں، نہیں چل کر مسجد تک تُو ہی گیا تھا، طاقت کا استعمال تو نے ہی کیا تھا۔ حج کے لئے سفر کرنے کا ارادہ تُو نے ہی کیا تھا۔ تُو نے سب کچھ کرلیا، تو سب کچھ کر کے جو یوں کہتا ہے کہ کچھ نہیں کیا، اس کا جواب دیتے ہیں کہ تُو نے ہی سب کچھ کیا ہے۔ تجھے سب کچھ ملے گا۔ اور اگر تھوڑا بہت کچھ کر کے یوں کہے کہ میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا، اسے فرماتے ہیں۔ نالائق! تو نے کیا کام کیا۔ قوت میری تھی، ارادہ میرا تھا، مشیت میری تھی، اسباب میرے تھے، تو نے کیا کیا؟

اس لئے ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے مالک کے آگے جھکیں اور جھکنے کے بعد غرّہ نہ کریں، ہر قدم پر سمجھیں کچھ نہیں ہوسکا، توبہ کریں استغفار کریں اور آگے بڑھیں، جب قوم میں یہ جذبہ ہوگا، قوم بڑھے گی۔ اگر یہ جذبہ نہیں۔ وہ لاکھ سوچتی رہے کبھی مرکزِ اقتدار پر نہیں پہنچے گی اقتدار تمناؤں سے نہیں ملا کرتا، نہ تمناؤں سے عزّت ملا کرتی ہے۔ اور نہ غیر اسباب سے عزّت ملتی ہے۔ انہی اسباب سے عزت ملتی ہے جنہیں اللہ نے مسلم قوم کے لئے متعین کر دیا ہے۔ غیر اقوام سے اور قسم کا معاملہ ہے۔ مسلم سے اور قسم کا معاملہ ہے۔ جو یہ دعویٰ کرے کہ میں آپ کا ہوں، اس کے ساتھ معاملہ اور قسم کا ہے۔

دشمن سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ...... اور جو یہ کہے کہ میں آپ کا نہیں ہوں، اس کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے، دشمن ہے تو آدمی اس کی گالیوں کو بھی سہہ جاتا ہے، کہتا ہے کہ دشمن ہے، اور اس کا کیا کام ہے، گالیاں ہی دے گا اور اپنا بیٹا ترچھی نگاہ سے دیکھ لے تو باپ دھول رسید کرے گا کہ تجھ سے توقع نہیں تھی۔ اس لئے مسلم کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز پر گرفت ہوتی ہے، تو ہمارا تھا، تیرا دعویٰ تھا کہ "اَنَا مُسْلِمٌ" "میں مطیع خداوندی ہوں اور پھر تو نے یہ حرکت کی؟

اور ایک قوم کہتی ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہی نہیں۔ اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔ انہیں سب کچھ دے دو، ایک وقت آئے گا کہ اچانک عذاب کا پنجہ ان پر گرے گا، جب انہیں پتہ چل جائے گا۔ تو دشمن کو ڈھیل دیتے ہیں اور دوست کو ڈھیل نہیں دی جاتی، جو غلطی کرتا ہے، ہاتھ کے ہاتھ سزا دی جاتی ہے۔ اور کافر کو ڈھیل دی جاتی ہے۔ وہ گالیاں بھی دے دے، دین کی تکذیب بھی کر دے، دین کا مذاق بھی اڑائے اسے ڈھیل دیتے ہیں کہ اس کے انجام کی خرابی کا وقت آ رہا ہے۔ غرض میرا مطلب یہ تھا کہ بھائی! تدبیر تو سب پوچھتے ہیں لیکن یہ جذبہ نہیں ہوتا کہ اس تدبیر کو عمل میں کون لائے گا؟۔ یہ کہتے ہیں کہ عمل کے لئے یہودی اور نصرانی ہیں۔ باقی ہمیں تو تدبیر بتلا دو، تاکہ ہمارے دماغ میں فرحت آ جائے کہ ہمیں تدبیر معلوم ہوگئی، عمل کرنا دھرنا نہیں ہے۔ یہ دوسری قوموں کا کام ہے۔ جب دوسری قومیں کریں گی تو وہی پائیں گی بھی۔ پھر آپ رشک کیوں کرتے ہیں کہ صاحب! انہیں سب کچھ مل گیا اور ہمیں کچھ نہیں ملا۔ انہوں نے کچھ کیا تھا تو انہیں کچھ ملا، آپ نے نہیں کیا، نہیں ملا۔

تدبیر عمل...... اسلام کے معنی مسلم بننے کے ہیں۔ اور مسلم کے معنی "مطیع حق" کے ہیں۔ جب آپ کہتے ہیں کہ: میں مسلم ہوں، اس کے معنی ہیں کہ میں اپنے پروردگار کا مطیع ہوں، پھر اس اطاعت کو کر کے دکھلایئے۔ تو یہ حدیث معاذ

رضی اللہ عنہ میں فرمایا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''هَلْ تَدْرِیْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَی الْعِبَادِ''؟...... اے معاذ! جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ وہ یہ ہے کہ: ''اَنْ يَّعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا......'' تو اللہ کی عبادت میں لگ جائیں، اس کے قانون پر چلیں، اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کریں اور جذبہ ولگن ان کے دل میں یہی ہو کہ ہمیں اپنے رب کی اطاعت کرنی ہے اور غیر رب کو ہم شریک نہیں کرنا چاہتے، تو یہ حق ادا کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا: ''هَلْ تَدْرِیْ مَاحَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰهِ......'' کیا یہ جانتے ہو کہ بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟

فرمایا بندوں کا حق یہ ہے کہ اس کا وعدہ ہے کہ جب تم عابد بنو گے تو میں تمہیں سب کچھ دوں گا۔ ① رزقِ معنوی بھی رزقِ باطنی بھی رزقِ حسی بھی، رزقِ ظاہری بھی۔ سبھی کچھ ملے گا، دونوں چیزیں ہاتھ آئیں گی۔ اس لئے ساری تدبیر اس ایک حدیث میں فرما دی گئی۔ اگر عمل کرنا چاہیں تو یہ ایک حدیث بھی زندگی درست کرنے کے لئے کافی ہے اور عمل نہ کرنا چاہیں تو ایک ہزار وعظ بیٹھ کر آپ سن لیں، کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا بلکہ وہ وعظ اور وبالِ جان بنیں گے۔

دنیا دار علماء...... اس واسطے کہ وعظ میں کچھ مسئلہ تو معلوم ہو گیا۔ اگر آدمی جاہل ہے اور غلطی کر جائے تو ایک عذر ہے کہ صاحب! مجھے مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ معلوم کر کے پھر نہ کرے تو یہ مصیبت اور وبال ہے، وہ متنبی ایک موقع پر کہتا ہے۔

وَاِنْ كُنْتَ لَاتَدْرِیْ فَتِلْكَ مُصِيْبَةٌ   وَاِنْ كُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِيْبَةُ اَعْظَمُ

اگر تم جانتے نہیں ہو، جاہل ہو، یہ ایک مصیبت ہے، اور اگر جانتے ہو اور پھر عمل نہیں کرتے تو یہ ڈبل مصیبت ہے۔ اس واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہل کو بد دعا دی ایک دفعہ اور عالم کو سات دفعہ فرمایا: ''وَيْلٌ لِّجَاهِلٍ مَرَّةً وَوَيْلٌ لِّعَالِمٍ سَبْعَ مَرَّاتٍ.'' ② جاہل ایک دفعہ برباد اور عالم سات دفعہ برباد، جو علم رکھتا ہے پھر عمل نہیں کرتا۔ اب اگر ایک عالم ہے، اسے حلال وحرام اور جائز و ناجائز کا علم ہے۔ وہ اللہ ہی کی رضا کی پابندی کرے گا، غیروں کی رضا کی نہیں کرے گا۔ اب اگر کوئی مولوی یہ کہے کہ صاحب! مسئلہ تو بے شک یہ ہے مگر آمدنی کا تعلق فلاں سے ہے۔ لہٰذا کیا حرج ہے۔ اس کی دلداری کے لئے اس کے مطابق مسئلہ بیان کر دو۔ وہ اللہ کا بندہ تھوڑا ہی رہا۔ وہ تو ابلیس کا بندہ بن گیا کہ جس سے چار پیسے مل گئے تو فتویٰ بھی اس کے مطابق دے دیا۔ وہ مسئلہ کیا ہوا۔ وہ تو موم کی ناک ہو گئی کہ جیسے دنیا کی غرضیں سامنے آتی جائیں ویسے ہی بدلتے جائیں۔ یہ عالم کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہل کا کام ہے۔ جس نے خواہ مخواہ علم کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ جو واقعی عالم ہے وہ تو بہت اونچی چیز ہے۔

آدمی عالم ہو اور اپنی حاجات غیروں کے آگے پیش کرے۔ اور غیروں کی رضا اتنی ہو کہ چاہے مجھے دین کا مسئلہ بھی بدلنا پڑ جائے مگر مجھے یہ چار پیسے مل جائیں۔ یہ علم اور علماء کی شان نہیں ہے۔ اور ایسے لوگ درحقیقت علماء ہیں بھی نہیں۔ وہ نام کے علماء ہیں۔ عالموں کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ ''وَاِنْ كُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِيْبَةُ اَعْظَمُ......'' جان بوجھ کر عمل

---

① الصحيح للبخاري، كتاب اللباس، باب ارداف الرجل خلف الرجل، ج: ۱۸، ص: ۳۵۴.

② مرقاة المفاتيح، كتاب الدعوات، باب جامع الدعاء، ج: ۸، ص: ۴۲۶.

نہیں کرو گے تو ڈبل مصیبت ہے۔اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہل کو ایک دفعہ بددعا دی اور عالم کو سات دفعہ۔

جدّ وجہد کا ثمرہ...... بہر حال یہ چند باتیں اس سلسلہ میں عرض کرنی تھیں کہ بے شک فتنوں کی افراط ہے، پریشانیاں ہر طرف سے ہیں۔مگر وہ ہماری لائی ہوئی تو ہیں۔اللہ تعالیٰ نے تو نہیں برسائیں، وہ تو پیدا کرنے والے ہیں۔وہ اس چیز کو پیدا کرتے ہیں جس کا بندہ کسب کرے،تو کاسب بندہ ہے۔خالق اللہ ہے۔تم کسی کام میں جدّ وجہد کرو گے، وہ پیدا کر دیں گے۔تمہارا کام یہ ہے کہ اپنی جدّ وجہد میں لگو، اور اللہ پر بھروسہ کرو۔وہ تخلیق فرمائے گا۔تو فتنے ہیں بلاشبہ ہیں۔مگر

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردہ تست

یہ تمہارے ہمارے ہی لائے ہوئے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ ① کوئی مصیبت تم تک نہیں پہنچتی جب تک تم ہی اپنی کرتوت سے اس مصیبت کو اپنے اوپر نہ ڈال دو،تمہارے کئے ہوئے کا یہ سب ثمرہ ہے۔تو ہم نے جو کیا وہ کیا دھرا سامنے آ گیا۔اور اگر نیکی کا کام کریں گے اور نیکی کی راہ پر چلیں گے تو پھر دوسرا ثمرہ آ جائے گا۔ثمرہ حق تعالیٰ دیتے ہیں۔ان کے ہاں عدل ہے۔ان کا نام ہی العدل اللطیف الخبیر ہے۔ان سے زیادہ عادل کون ہے۔تو کسی کی محنت کو وہ رائیگاں نہیں فرماتے۔﴿فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ② کسی محسن کے احسان کو اور عمل کو رَدّ نہیں فرماتے۔آدمی کر کے دیکھے،تو اللہ پر بھروسہ کیجئے اور کچھ جدو جہد بھی کیجئے، کچھ دین کی معلومات اور تعلیم بھی حاصل کیجئے۔کچھ اپنی تربیت کی طرف بھی متوجہ ہو جایئے۔کسی مربی سے تعلق پیدا کر کے اپنے اخلاق کی اصلاح کرایئے۔تو خیر انشاء اللہ ظاہر ہو گی۔اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس واسطے اب میں ختم کرتا ہوں۔اور وہ شاعر کا قطعہ ہے،وہ پڑھ لیتا ہوں۔

ما نصیحت بجائے خود کردیم   روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس   بر رسولاں بلاغ باشد وبس

شاعر کہتا ہے کہ: ہم نے اپنی جگہ بہت نصیحتیں کر لیں۔ایک بڑا زمانہ ہم نے صرف کیا، ہم نے بڑی نصیحتیں کیں، اب اس کے بعد بھی کسی کے کان میں نصیحت نہ جائے اور دل میں نہ اترے، تو نصیحت کرنے والے کا کام تبلیغ اور پہنچا دینا ہے۔منوا دینا اس کا کام نہیں ہے۔آدمی مانے گا تو اپنے اندرونی جذبے اور دیانت سے مانے گا۔اس واسطے تدبیر میں نے عرض کر دی، عمل آپ کو کرنا ہوگا۔اب یہ کہ تدبیر بھی بتلاؤں اور عمل بھی کر لوں۔اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ بھئی میرے عمل کرنے سے پوری قوم تر جائے گی تو چلو یہ بھی ہو جاتا،مگر قوم ہی کے عمل کرنے سے قوم ترے گی، کسی ایک کے عمل کرنے سے کسی دوسرے کو نجات تھوڑا ہی مل جائے گی۔﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا

① پارہ: ۲۵،سورۃ شوریٰ،الآیۃ: ۳۰. ② پارہ: ۱۲،سورۃ ھود،الآیۃ: ۱۱۵.

مَاسَعٰی﴾ ① جو سعی کرے گا وہی انسان پائے گا، سعی تو ایک کرے اور دوسرے کو مل جائے، یہ سنتُ اللہ کے خلاف ہے، جو کرے گا، اسی کو ملے گا۔ اس واسطے اب میں ختم کرتا ہوں، فتنے اور مصائب واقعی ہیں۔ ان کا علاج جو واقعی ہے وہ عرض کر دیا گیا، اس کی تفصیلات پھر آپ علماء سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس عمل کو کس طرح کریں۔ اس عمل کو کس طرح کریں۔ مثلاً ایک عمل عبادت کا ہے تو پوچھنا پڑے گا کہ کس طرح سے نماز پڑھیں، ایک عمل اجتماعیات کا ہے کہ دنیا کی قوموں کے ساتھ کیا برتاؤ کریں۔ یہ بھی قرآن کریم سے پوچھئے، اس نے بتلا دیا ہے۔ ایک عمل سیاست کا ہے کہ سیاسی تدبیریں کیا ہوتی ہیں۔ وہ بھی قرآن کریم نے بتلادی ہیں کہ: وہ یہ ہیں جن سے قوم اقتدار پاتی ہے۔ تو سب کچھ ہے، مگر یہ اسی کے لئے ہے جو کچھ کرے۔

ایمان کے سونے کی ضرورت...... اگر ہم یوں کہیں کہ آپ خالی جیب جارہے ہیں۔ تو بازار میں چاہے کروڑوں روپے کا مال بھرا پڑا ہے۔ تو یہ ٹھیک ہوگا، اس لئے کہ جیب خالی ہے، وہاں سے تو وہ سامان لے کر آئے گا جو جیب میں پیسے لے کر جائے گا۔ تو اگر آپ بازار گئے اور ہم یوں کہیں کہ اس بازار میں کچھ نہیں، کوے اڑ رہے ہیں، کوئی سامان نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ چاہے لاکھوں کا سامان ہو مگر تیرے لئے کچھ نہیں، اس لئے کہ تیری جیب میں پیسہ نہیں، پیسہ ہوگا تو تُو بھی کچھ لے کے آئے گا۔

غرض دل کی جیب میں ایمان کا سونا ہونا چاہئے۔ ایمان کا جذبہ ہونا چاہئے، پھر دنیا کے بازار میں سب کچھ ملے گا، اور اگر دل خالی کر کے جارہے ہیں جس میں ایمان باللہ نہیں، عمل صالح، پیروی سنت نہیں، پھر دنیا چاہے کروڑوں کی ہو مگر آپ کے لئے کچھ نہیں، خالی ہاتھ واپس آنا پڑے گا۔

دعاء...... اللہ تعالیٰ ہمیں نیک عمل کی، عبرت پکڑنے کی، عمل کا جذبہ اختیار کرنے کی، عمل کی ہمت باندھنے کی، ہمت کے اسباب پیدا کرنے کی صحبتِ صالحین اختیار کرنے کی، مطالعہ اختیار کرنے کی، سوال کرنے کی، ان سب چیزوں کی توفیق دے، جن سے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور عمل میں ترقی ہوتی ہے۔

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. اَللّٰهُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ."

تنبیہ...... یہ دعا بھی کر دی ہے اور یہ عزم لے کر جائیے کہ اس پر عمل کرنا ہے، اس کی ٹوہ میں لگنا ہے۔ ہمیں دینی اور اخلاقی معلومات حاصل کرنی ہیں۔ پھر انشاء اللہ مددِ خداوندی ہوگی۔ اور ایک بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ عام

① پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳۹۔

طور سے عادت یہ ہے کہ لوگ مصافحہ کیا کرتے ہیں۔ تو میں کمزور ہو رہا ہوں۔ اور ضعیف ہو رہا ہوں۔ آپ میں سے تو ہر ایک کو ایک دفعہ ہاتھ ملانا پڑے گا، مجھے پانچ سو دفعہ، میرے اندر طاقت نہیں ہے لہذا مصافحہ سے معاف رکھیں اور گزر جانے دیں۔ بس دل مل گئے، یہ کافی ہے۔ ہاتھ ملانے کی ضرورت نہیں۔

"وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّنَا وَرَسُوْلِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ."

تعلیم نسواں

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَـاوَسَنَـدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. ①

اَمَّابَعْدُ!. فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

ترقی کا پہلا زینہ...... عزیز بچیو، محترم بہنو اور استانیو! آپ کے اس مدرسہ میں آ کر بے حد مسرت اور خوشی ہوئی۔ تعلیم کا مسئلہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ دنیا کی کوئی قوم بغیر تعلیم کے ترقی نہیں کر سکتی۔ کسی قوم کی ترقی کا پہلا زینہ تعلیم ہے۔ اسلام میں بھی سب سے پہلے پڑھنے ہی کی آیت نازل ہوئی اور فرمایا ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ ② اسلام سے قبل کا زمانہ بداخلاقی، بداعمالی، اور برائیوں سے بھرپور تھا لیکن اس زمانے کا نام بداخلاقی اور بداعمالیوں کا زمانہ نہیں رکھا بلکہ اس کا نام جہالت کا زمانہ رکھا، معلوم ہوا کہ برائی کا سرچشمہ جہالت ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں اسلام کا بنیادی سرچشمہ تعلیم ہے۔ تعلیم کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنا اہتمام کیا اور کسی چیز کے بارے میں نہیں کیا، سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کے کھانے، پینے اور پہننے کا انتظام نہیں کیا بلکہ اولاً تعلیم کا بندوبست کیا جیسے ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا﴾ ③ انہیں اشیاء کے نام سکھلا کر ملائکہ سے مقابلہ کرایا اور وہ کامیاب ہوئے تو خلافت سے بہرہ ور کیا اور خلافت کا تاج سر پر رکھا۔ اس کے بعد فرمایا: ﴿اُسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ﴾ ④ تو رہنے سہنے کا انتظام بعد میں ہوا، پہلے تعلیم کا انتظام کیا۔ معلوم ہوا کہ علم اور تعلیم کا بہت درجہ ہے۔

دنیا ایک تعلیم گاہ ہے...... بغیر تعلیم کے حیوان اور انسان میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں کہ باپ کو تعلیم دیتے اور بس کرتے بلکہ اولاد کو بھی تعلیم دی۔ حدیث میں آتا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت پر دایاں ہاتھ مارا تو نیک اولاد نکلی اور بایاں ہاتھ مارا تو بری اولاد نکلی۔ اور اس کے بعد تمام کو وادیٔ ذاران میں

---

① ۵ محرم الحرام ۱۳۸۲ھ کو جامعہ خیر المدارس ملتان کے شعبہ تعلیم النساء میں خطاب فرمایا۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱.

③ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱. ④ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۵.

جمع کر کے ان (روحوں) سے خطاب کیا۔اور فرمایا: ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی﴾ ① تو اس سے بھی مقصود تمام کو تعلیم دینا تھی ربوبیّت کے بارے میں کہ میں تمہارا رب ہوں۔تو اس سے بھی تعلیم کا اہتمام معلوم ہوا۔گویا دنیا ایک مدرسہ ہے۔اور تمام انسان اس کے طالب علم ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے معلّم ہیں۔اور انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے خصوصی شاگرد ہیں۔تو دنیا کی پیدائش کا مقصد تعلیم ہے اور اس کے بعد عبادت ہے، حسنِ معاشرت ہے۔تعلیم کے سلسلے میں ضرورت پڑتی ہے کہ طالب علم کے لئے وظیفہ ہو تاکہ کھانا پینا اور رزق حاصل ہو تو اس کے لئے زمین اور دریا بنائے، مطالعہ کے لئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے تو چاند، ستارے اور سورج کو پیدا کیا۔تو جب ہم اس دنیا سے قبر میں جائیں گے۔اسی تعلیم سے متعلق سوال ہوگا۔(مَنۡ رَّبُّکَ) اور اس کا امتحان ہوگا۔یہ اوّل امتحان ہوگا۔اور بڑا امتحان میدانِ حشر میں ہوگا۔کچھ کامیاب ہوں گے اور کچھ ناکام۔کامیاب کو انعامات دیئے جائیں گے۔اور ناکام کو سزا دی جائے گی اور اس امتحان میں تمام شریک ہوں گے۔

اس میں بوڑھے، جوان اور بچے کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔اگرچہ عالمِ ارواح میں تو تمام کی روح یکساں تھیں مگر آخر عمر کے اعتبار سے کہ جو پیدائش کے بعد جلدی مرے گا تو وہ بچپن اور جو جوانی میں مرے گا وہ جوان اور جو بڑھاپے میں وہ بوڑھا، تو ان روحوں میں بھی جوان بچے اور بوڑھے اس اعتبار سے تھے، اس لئے تعلیم کا اتنا لحاظ رکھا گیا کہ جوان اور عمر رسیدہ تمام سے امتحان ہوگا۔تو تعلیم ایک بنیادی چیز ہے اور دنیا کے آباد کرنے کا مقصد یہی ہے۔

عورتوں کی تعلیمی ذمّہ داری اور اس کے نتائج و اثرات...... تعلیم کا سلسلہ عورتوں کے لئے بھی بہت ضروری ہے۔اس لئے ابتدائی تربیت یہیں سے شروع ہوتی ہے۔قوم کی تعلیم کا دارومدار ماں کی تعلیم پر ہے۔اگر وہ جاہل ہے تو قوم جاہل رہے گی۔الا ماشاء اللہ، جس کی فطرت سلیم ہوا گر وہ عالم ہوئی تو اولاد بھی عالم ہوگی۔اگر والدہ کے قلب میں تعلیم کی طرف رغبت موجود ہو تو بچے بھی اس کی رغبت سے فیض یاب ہوں گے، اگر ماں خود رغبت سے خالی ہے تو بچے بھی ایسے ہی رہیں گے۔اسی لیے سب سے پہلے جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔تو اس وقت بھی سب سے پہلے اس کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ دائیں کان میں اذان دی جاتی ہے جس میں توحید و رسالت اور عبادت کی تعلیم ہے۔تو اس اذان کے ذریعے اصول و فروع' عقائد و اعمال کی تعلیم دی جاتی ہے اور حی علی الفلاح میں اس کا انجام اور نتیجہ بھی بتا دیا جاتا ہے۔کہ فلاح اور کامیابی ہے۔جو آخرت میں تمہیں میسّر ہوگی۔تو ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے اسلام میں تعلیم کا کتنا بڑا مرتبہ اور درجہ ہے، اس لئے اس پر زور دیا گیا ہے۔

"طَلَبُ الۡعِلۡمِ فَرِیۡضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسۡلِمٍ وَّمُسۡلِمَةٍ" ② علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔تاکہ علم حاصل کرنے کے بعد ہر مسلمان مرد و عورت کو معلوم ہو جائے کہ میں کیسا مسلمان ہوں۔اور

① پارہ: ۹، سورة الاعراف، الآیة: ۱۷۲۔ ② المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمہ: مقدام، قال الطبرانی: لم یروھذا الحدیث عن ابی عروة وھو معمر بن راشد الامفضل بن فضالة، ج: ۱۹ ص: ۱۶۲۔

مسلمان کے کیسے اخلاق ہونے چاہئیں چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں سے ادب واحترام سے پیش آنا، رہنے سہنے اور حسنِ معاشرت کا طرزِ عمل معلوم ہو، اس لئے تعلیم واجب قرار دی گئی ہے تمام پر خواہ مرد ہو یا عورت، اس کے بعد دوسرے اعمال کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ: جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اس کو عبادت کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔

تو حقیقت میں یہ مقصد عورتوں سے ہی حاصل ہوتا ہے کہ جب ماں تعلیم یافتہ ہوگی، بچّہ کو بھی تعلیم سے آشنا کر دے گی۔ جس سے اس کے اخلاق سدھر جائیں گے اور اگر بالفرض ماں بچے کو تعلیم نہ بھی دے مگر وہ ماں نیکوکار اور بااخلاق ہے تو اس کو نیکوکاری اور حسنِ اخلاق کی برکت سے اولاد بھی دیندار بن جائے گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ: جو قوم میری فرماں برداری کرتی ہے تو میں اس کی سات پشتوں تک اور نسلوں تک رحمت کو بھیجا کرتا ہوں اور اگر فرماں برداری نہیں کرتی اس کی سات پشتوں تک لعنت بھیجتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ والدین کی نیکوکاری اور بدکاری کا بڑا اثر ہے جو سات پشتوں تک جاتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ والدین جیسے ہوں ویسے ہی ان کے بچے بھی اثر قبول کرتے ہیں۔ اگر والدین عالم ہیں تو بچے میں بھی علم کا اثر ہوگا کہ وہ جائز و ناجائز کے مطابق گفت وشنید کرتا ہوگا۔ اگر دوکاندار ہیں تو بچے میں بھی دکانداری کے اثرات حساب وغیرہ کچھ نہ کچھ موجود ہوں گے۔ اگر والدین کھیتی باڑی کرتے ہیں تو بچے میں بھی اس کا اثر موجود ہوگا۔ تو یہ اثر ہے، ماں کے ماحول کا بچے پر اثر ہوگا۔ اب سب سے پہلا حق انسان پر اپنے نفس کا ہے۔ دوسرا حق اولاد کو پڑھانا کہ وہ صحیح راستہ پر چلے، یعنی مخلوق کا ہے۔ اور تیسرا حق معاشرہ کا ہے۔ اور یہ تینوں علم پر موقوف ہیں۔ تو جتنا علم حاصل کریں گے خاندان علمی بنتا جائے گا۔ اور ماحول خوشگوار ہوتا جائے گا۔

ملکہ کے تقوے کا اس کی اولاد پر اثر...... امیر عبدالرحمن خان والی کابل کے دادا امیر دوست محمد کا واقعہ ہے۔ کہ اس کے ملک پر کسی نے چڑھائی کی، اس کی سرکوبی کے لئے اس نے ایک فوج اپنے ولی عہد شہزادے کے ہاتھ بھیجی، دو تین دن بعد اطلاع آئی کہ شہزادے کو شکست ہوئی اور وہ دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔ اور دشمن اس کے پیچھے ہے، اس سے بادشاہ کو بہت صدمہ ہوا اور کئی غم سوار ہوئے۔ شکست کا غم، شہزادے کی کمزوری کا اور قوم کی ملامت کا، تو وہ اس غم کے اندر محو ہو کر گھر آیا اور بیگم صاحبہ سے تمام قصہ سنایا۔ بیگم نے کہا کہ یہ سارا قصہ غلط ہے۔ امیر نے کہا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کی رپوٹ ہے، وہ کیسے غلط ہو سکتی ہے۔ مگر بیگم نہ مانی کہ شکست ہرگز نہیں ہو سکتی۔ تو بادشاہ گھر سے نکل آیا کہ یہ عورت ہے۔ یہ مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے گی۔ دوسرے دن اطلاع آئی کہ وہ خبر غلط ہے۔ شہزادہ فتح پا کر واپس آ رہا ہے۔ اس پر بیگم نے شہزادے کی سلامتی اور فتح یابی پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

بادشاہ نے پوچھا، تجھے کیسے معلوم ہوا تھا کہ وہ شکست نہیں کھا سکتا۔ کیا دلیل ہے تیرے پاس کہ میری پوری حکومت کو تو نے جھٹلایا۔؟ اس نے کہا کہ کچھ نہیں صرف اللہ تعالیٰ نے میری لاج رکھ لی۔ یہ میرا راز ہے۔ میں اس کو

فاش نہیں کرنا چاہتی۔ آخر اصرار کرنے پر بتایا، جب شہزادہ میرے پیٹ میں آیا تو میں نے اس وقت سے عہد کرلیا تھا کہ میرے پیٹ میں مشتبہ لقمہ نہیں آنا چاہئے۔ اس لئے کہ حلال غذا سے اچھی طبیعت اور اچھے اخلاق بنتے ہیں اور حرام غذا سے طبیعت فاسد ہوتی ہے اور اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ شہزادہ نو مہینے تک میرے پیٹ میں رہا۔ اور ایک لقمہ غذا کا میں نے ایسا نہیں کھایا جو مشتبہ ہو۔ اس لئے اس کے اخلاق رذیل اور برے نہیں ہوسکتے۔ شہید ہونا یہ اچھا خلق ہے۔ اور پشت پھیرنا یہ اچھا خُلق نہیں ہے۔ تو شہزادہ شہید ہوسکتا ہے اور کٹ کر مرسکتا ہے، مگر پشت پھیر کے فرار نہیں ہوسکتا۔

اور پھر اس پر بس نہیں بلکہ جب یہ شہزادہ پیدا ہوا تب بھی میں نے مشتبہ غذا استعمال نہیں کی تاکہ اس غذا سے دودھ بن کر اس کے اخلاق پر اثر انداز نہ ہو۔ اور جب دودھ پلاتی تو وضو کرکے اور دو رکعت نفل ادا کرکے پلاتی۔ اس لئے ان چیزوں سے شہزادے کے اخلاق بہت بلند ہونے چاہئیں، اس لئے میں نے تمہاری ساری فوج اور حکومت کی بات کو جھٹلایا۔ مگر اپنے قول سے باز نہیں آئی۔

جب امیر دوست محمد کی بیگم اتنی متقی بن سکتی ہے جبکہ آرام وعیش کے تمام اسباب موجود ہیں۔ تخت پر بیٹھ کر متقی بن سکتی ہے تو ہماری آج کل کی بہنیں جھونپڑیوں میں رہ کر کیوں کامل نہیں ہوسکتیں۔ جورکاوٹیں ان کو تھیں وہ تمہیں نہیں۔ بعض لوگ حیلہ جو ہوتے ہیں اور ہر کام اور ہر بات میں حیلہ تلاش کرتے ہیں، مگر حیلوں سے کچھ نہیں بنے گا۔ اور یہی حیلہ کرنے والے قیامت کے دن بھی حیلہ سازی کریں گے اور کہیں گے کہ ہمیں وقت نہیں ملا، اس لئے اطاعت نہیں کی بلکہ دولت میں مشغول رہے اور اس سے فرصت نہیں ملی تو اللہ تعالیٰ حضرت سلیمان اور حضرت یوسف علیہما السلام کو پیش کریں گے کہ باوجود اتنی دنیا اور دولت کے اللہ کے مقبول بندے اور نبی ہیں۔

حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا علمی مقام...... ایسے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے مردان باہمت تھے، ان کی عورتیں بھی ایسی تھیں اور ایسے ہی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں، میری وحی کا آدھا علم صحابہ رضی اللہ عنہم سے اور آدھا علم صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سیکھو، یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بہت بڑے بڑے درجہ کے تابعین رحمہم اللہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ شاگرد رہے ہیں۔ تو جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وحی کا آدھا علم سیکھ سکتی ہیں تو آج کل کی بہنیں ابتدائی حالات اسلام کے اور معاملات کا علم بھی حاصل نہیں کرسکتیں، حضرت امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث کی کتاب کا املاء ان کی لڑکی نے لکھا تھا، آج تمام امت پر اس کا احسان ہے۔ حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا بڑے صوفیا میں سے گزری ہیں۔

عورت اور منصب افتاء...... فقہ کی کتاب "بَدَآئِعُ الصَّنَآئِع" کی وجہ تصنیف یہ ہوئی کہ ایک بہت بڑے محدث کی لڑکی بڑی عالم اور محدث تھی اور اس کے ساتھ ساتھ حسین اور خوبصورت تھی، بہت بڑے بڑے علماء کے

پیغام نکاح کے آئے اور ایسے ہی سلاطین وغیرہ نے بھی پیغام بھیجے۔ مگر تمام سے اس لڑکی کا علم زیادہ تھا، اس لئے پیغام قبول نہیں ہوتا تھا، اس لڑکی نے یہ شرط مقرر کی کہ تمام علماء فقہ میں کتابیں تصنیف کریں۔ جس کی کتاب مجھے پسند ہوگی میں اس سے نکاح کرلوں گی، اس پر ہزاروں کتابوں کی تصنیف ہوئی تو اسے "بَدَآئِعُ الصَّنَآئِع" پسند آئی، اور اسی سے اس نے نکاح کیا۔ آج کل اگر ہماری بہنیں کمال اور مہارت حاصل نہ کرسکیں تو کم از کم حقوق کی ادائیگی کا علم تو حاصل کرلیں کہ خاوند کے یہ حقوق ہیں اور بچوں کے یہ حقوق ہیں۔

مقصدِ علم ...... اور وقائع میں لکھا ہوا ہے کہ سلجوقی کے عہد میں مدرسہ نظامیہ بنایا گیا، شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اس مدرسہ کے صدر مدرس تھے بعد عرصہ مدید کے معلوم ہوا کہ پڑھنے والوں کی نیتیں فاسد ہیں تو بادشاہِ وقت نے ارادہ کیا کہ مدرسہ کو ختم کردوں مگر خیال آیا کہ ایک دفعہ دیکھ لوں کہ واقعی سب کی نیتیں فاسد ہیں کہ نہیں۔

چناں چہ ایک رات نظام الملک خود آیا، ایک ایک طالب علم سے سوال کرتا رہا، تم کس لئے پڑھ رہے ہو؟ کوئی جواب دیتا کہ میرا والد بادشاہ کا قاضی ہے، میں اس لئے پڑھ رہا ہوں کہ میں بھی قاضی بن جاؤں۔ کوئی کہتا کہ میرا والد بہت معروف اور مشہور عالم ہے۔ اطراف میں اس کی شہرت کا ڈنکا بج چکا ہے، تو میں اس لئے پڑھ رہا ہوں کہ میری بھی شہرت ہو جائے۔ وغیر ذلک۔ نظام الملک نے تمام طلباء کو دیکھا کہ ان کی نیتیں فاسد ہیں تو تہیہ کر لیا کہ مدرسہ کو بند کر دیا جائے۔ میرے لاکھوں روپے ضائع ہو رہے ہیں۔ صحیح نیت سے کوئی نہیں پڑھتا کہ ثواب حاصل ہو جائے، اس فیصلہ پر پہنچ چکا تھا کہ اس کی نظر ایک طالب علم پر پڑی، جو مطالعہ میں مستغرق تھا۔ نظام الملک اس کے پاس گیا، مگر اس طالب علم نے کتاب سے ایک لمحہ کے لئے نگاہ نہ اٹھائی۔ پوچھا "تم بڑے مستغنی ہو"؟ کہا "میرا مقصد کتاب کا مطالعہ کرنا ہے چہروں کا مطالعہ کرنا نہیں"۔ نظام الملک نے پوچھا "تمہارا ایک دومنٹ کے لئے حرج تو ہوگا لیکن یہ بتاؤ آپ کا اس پڑھنے سے مقصد کیا ہے؟" تو اس نے کہا "میں نے ماں باپ سے سنا ہے ہمارا ایک خدا ہے جس نے ہمیں زندگی عطاء کی ہے۔ وہ ایک محسن ہے اور اس کے حقوق مجھے معلوم نہیں، تو میں محسن کے حقوق جاننے کے لئے تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔" نظام الملک نے کہا "میرا تو ارادہ اس مدرسہ کے توڑنے اور بند کرنے کا تھا لیکن جب تک تم اس مدرسہ میں پڑھتے رہو گے، تمہاری وجہ سے مدرسہ جاری رہے گا"۔ یہ طالب علم حضرت حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ چناں چہ نظام الملک نے اس مدرسہ کو باقی رکھا۔ معلوم ہوا اصلی مقصد علم سے حقوق کی ادائیگی ہے اور ہم میں سے کون ہے جس پر حقوق نہیں ہیں۔ مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا تمام پر حقوق ہیں۔ تو ان حقوق کے بتلانے کے لئے تعلیم سکھائی جاتی ہے۔

تعلیم حق فطرت وعقل ہے ...... تعلیم ایک فطری چیز ہے کہ فطرۃً محسن کا حق ادا کرنا چاہئے۔ اور عقلی بھی ہے۔ تو جو جاہل ہے وہ فطرت اور عقل دونوں کے خلاف کر رہا ہے اور احکامِ شرعیہ وعقلیہ کے خلاف کر رہا ہے۔ ہمیں اپنی بچیوں سے یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ محسن کشی کریں گی۔ اور عقل وفطرت کو آگ لگائیں گی۔

عورت کی صلاحیت...... اکثر عورتوں کو یہ خلجان اور شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترقی اور علم وفضل کا میدان مردوں کے لئے ہے۔ اور عورت تو گھر میں بیٹھنے والی ہے اس کو علم سے کیا واسطہ؟ مگر ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ تاریخ اس کو جھٹلاتی ہے بلکہ کتابوں سے عورتوں کے بڑے بڑے فضائل معلوم ہوتے ہیں۔

''صِفَةُ الصَّفْوَةِ'' ایک کتاب ہے، اس میں مستقل عورتوں کا ایک باب باندھا گیا ہے، ان کی سیاست، ان کی تعلیم اور جہاد کا بیان ہے حتیٰ کہ عورتوں کی کشتی کا بھی بیان ہے کہ انہوں نے کشتی میں بڑے بڑے بہادر مردوں کو بچھاڑ دیا۔ تو تاریخ اس کو جھٹلاتی ہے بلکہ عورتوں نے میدان جنگ میں کام کیا ہے۔

عورت کی نبوت...... دوسری بات یہ ہے کہ دین مردوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہاں بعض چیزیں ایسی ہیں جو مردوں کے ساتھ خاص ہیں۔ جیسے رسالت اور ''قَاضِیُ الْقُضَاۃِ'' کا عہدہ کہ عورت رسول اور قاضی القضاۃ نہیں بن سکتی۔ کیوں کہ اس کی قابلیت عورت میں نہیں، مگر سب سے بڑا کمال جو نبوت کا ہے، ایک بڑی جماعت اس پر ہے کہ عورت کو نبوت مل سکتی ہے۔ ابن حزم بھی یہی کہتے ہیں۔ اگر چہ جمہور کا یہ مسلک نہیں۔ جس جماعت نے اس کا قول لیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر وحی آتی رہی، تو وہ نبی ہیں فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہا نبی تھی۔ تو جب اس قول کے مطابق عورت کو نبوت جو ایک اعلیٰ درجہ کا کمال ہے، اس کا حصول ممکن ہے تو اور کیا کمال چاہئے؟ اور کون سی فضیلت ہے جس کو وہ حاصل نہیں کر سکتی، قرآن مجید میں ہے: ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ...﴾ ① اس آیت میں مرد اور عورت کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ عبادات، اخلاق اور معلامات میں یکساں ہیں۔ تو مبداءِ فیاض سے فرق نہیں، عقل اور نقل اس کو جھٹلاتی ہے، حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ اہتمام تعلیم کا ہے۔

عورتوں کی دینی ترقی...... انبیاء علیہم السلام کو بھی اس کا اہتمام ہے، امت کے بڑوں اور نامور لوگوں کو بھی اس کا اہتمام ہے، تو کیا وجہ ہے کہ ہماری بچیاں جہل کو چھوڑ کر دینی تعلیم کی طرف نہیں آسکتیں، تو مدرسہ خیر المدارس کا یہ شعبہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ عورتیں اور بچیاں بھی ترقی میں حصہ لئے رہی ہیں اور دین کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں کہ اصل ترقی یہی ہے۔

عورتوں کی عمومی تعلیم...... ایک دور میں یہ بات تھی کہ مخصوص گھرانے علم سے مختص ہو گئے اور مائیں اولاد کو تعلیم سکھاتی تھیں۔ مگر اب یہ اختصاص نہیں۔ تو خیر المدارس کا یہ شعبہ پوری قوم کے لئے خوشی کی بات ہے عورتیں اس میں تعلیم حاصل کریں تو آئندہ چل کر نسلیں نیک بنیں گی۔ عورتوں کے لئے اب یہ موقع ہے، اس سے فائدہ اٹھائیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو دن دوگنی، رات چوگنی ترقی عطاء فرمائے۔

''آمِیْن ثُمَّ آمِیْن.''

---

① پارہ: ۲۲، سورة الاحزاب، الآیة: ۳۵.

افادات علم وحکمت

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا! اَمَّا بَعْدُ

وصول الی اللہ کے اصول ......ان صلاحیتوں کا معیار ہے کہ علائق جتنے کم سے کم ہوں گے، وصول اتنا جلد سے جلد ہوگا، جتنے علائق اور تعلّقات بڑھ جائیں گے طبعیت اس میں بٹے گی، یکسوئی کم ہوگی، تو پھر دیر لگ جاتی ہے چاہے استعداد بھی ہو۔

اسی واسطے ان حضرات نے جو اصول رکھے ہیں وہ چار ہی ہیں۔ قلت طعام یعنی کھانا کم کھانا اور کم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو خوراک ہے اس سے بھی آدھا کردے، یہی دو چار لقمے کم کردے، یہ کافی ہے۔ بالخصوص اس زمانے میں۔ پہلا دور جو کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا دور ہے کہ ان کی غذائیں سوکھا ٹکڑا وغیرہ تھی۔ حتی کہ جہاد میں جارہے ہیں۔ کسی کی زنبیل میں چند ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں، کوئی سامانِ رسد نہیں تھا کہ وہاں کیک وغیرہ ملیں۔ بعض کے پاس کچھ کھجوریں پڑی ہوئی ہیں، بھوک نے ستایا، وہ کھائیں۔ بعض کو یہ بھی میسر نہیں تو چھوہاروں کی گھٹلیاں رکھی ہوئی ہیں۔ انہیں ہی منہ میں ڈال لیا اور چوس لیا، دل کو بہلالیا کہ ہم کچھ کھارہے ہیں۔ غرض غذا تو یہ تھی اور مجاہدات عظیم کہ دن بھر جہاد میں اور رات کو مجاہدہ میں ہیں اور غذا اکل یہ۔ غالبًا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ''اِنَّهُمْ يَبْعَرُوْنَ بَعْرًا وَّاَنْتُمْ تَصْلِطُوْنَ صَلْطًا'' ① وہ فراغت کو جاتے تھے بمشکل دو چار مینگنیاں سی نکل آتی تھیں۔ غذا ہی نہیں اور تم قدمچے بھر دیتے ہو۔ یہ اپنے لوگوں کو جو کہ تابعین تھے، ان کو کہا۔ تو ہر زمانے کی قلّتِ طعام الگ ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی ان کی قلّتِ طعام کی حرص کرنے لگے تو چار پائی پر پڑ جائے گا، اور اس کا انتقال بھی ہوجائے گا، برداشت نہیں کرسکتا۔ ان کے ظرف میں برداشت تھی، فیضانِ نبوّت براہِ راست متوجہ تھا۔ اس سے بڑھ کر طاقت نہیں ہوسکتی۔ اب حال کی قلّتِ طعام یہی ہے جو ہمارے حضرت مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا۔ ہم دو آدمیوں کو کسی ضرورت سے دہلی بھیجا، دو آدمیوں کی آمد و رفت میں پانچ روپے لگ جاتے مگر ہمیں پچاس روپے دیئے کہ خوب کھاؤ اور خوب کام کرو۔ غرض اس زمانے کی قلّتِ طعام یہی ہے، کھانے میں زیادہ کمی نہ کرے۔ معمول کو معتدل رکھے۔ ایک اصول یہی ہے۔ اور ایک ہے قلت منام، یعنی سونا کم۔ اس میں بھی یہی بات ہے کہ ان حضرات کا سونا تو مجبوری تھا کہ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ سوئیں بھی نہ۔ بس ذکر

---

① هذا من قول عليؓ: اخرجه البيهقي في سننه، جماع ابواب الاستطابة باب الجمع في الاستنجاء بين المسح، ج: ١، ص: ١٥.

اللہ میں ہی لگے رہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر ذکر فرماتی تھیں، ایک رسی چھت میں ٹانگ رکھی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ رسی کیسی ہے؟ عرض کیا ''جب نیند کے جھکولے زیادہ آنے لگتے ہیں تو اپنے کو اس رسی سے باندھ لیتی ہوں''۔

فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب نیند آنے لگے پڑ کے سو رہو۔ جاگ جاؤ پھر اللہ کا نام لینا شروع کرو۔ طبیعت کو گھوٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو شریعت نے طبائع کی رعایت بہت زیادہ کی ہے۔ طبیعتوں کا معمول ہر ایک کا الگ الگ ہوتا ہے، اس میں کمی ہو جائے گی تو اس کا برا اثر پڑے گا۔ اور بالخصوص اس دور میں، اس واسطے جس کا معمول سونے کا ہے اس میں کمی نہ کرے۔ اس لئے حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ''لَاتَفْرِیْطَ فِی النَّوْمِ'' ① نیند میں کمی مت کرو۔ جس کو جو عادت ہے اس کو پورا کر لے اور اپنا کام بھی کرے۔ مگر نیند میں اتنا وقت لگا دے جتنا معمول ہو۔ تو طبائع الگ الگ ہیں۔ اس لئے ہر ایک کی قلتِ طعام وقلتِ منام مختلف ہوتی ہے، پھر زمانے بھی الگ الگ ہیں، اس کے لحاظ سے ایک طبقہ پر دوسرے طبقے کو قیاس نہیں کیا جائے گا۔

تیسرا اصول ہے قلّتِ کلام۔ کم بولو۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ بلا ضرورت نہ بولو۔ ضرورت کے موقع پر کلام کرنا ضروری ہے۔ لیکن خواہ مخواہ کی فضول مجلسیں اور تفریحی باتیں، ان میں وقت ضائع ہوتا ہے اور علائق کی کثرت ہو جاتی ہے، پھر اپنے معمولات پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ اور چوتھی چیز ہے قلّتِ اختلاط مع الانام۔ ملنا جلنا کم، بالخصوص مجاہدات کے زمانے میں۔ میل جول، تفریحی مجلس، اٹھنا بیٹھنا، یہ چیزیں مضرت پہنچاتی ہیں، حدیث میں ہے کہ: ''مَنْ سَکَتَ سَلِمَ وَمَنْ سَلِمَ نَجَا'' ② جو چپ رہا وہ صحیح سالم رہا، اور جو صحیح سالم رہا اس نے نجات پالی۔ حاصل وہی ہے کہ بلا ضرورت بولنا، اسے شریعت نے پسند نہیں کیا۔ جیسے ایک روایت میں ہے کہ عجمیوں کے بکواس سے بچو۔ بے ضرورت بول رہے ہیں۔ بولے چلے جا رہے ہیں۔ یہ غلط چیز ہے۔ ضرورت کے موقع پر چپ رہنا برا ہے اور چپ رہنے کے موقع پر بولنا برا ہے۔ حسبِ ضرورت سکوت وکلام کرے، سب کا حاصل یہی نکلا کہ اختلاط اور علائق کی کمی ہو اس سے وصول جلد ہی ہو جاتا ہے، ذکر کی تاثیر قوی ہو جاتی ہے۔

مجاہداتِ باطنیہ کی مثال...... مجاہداتِ باطنیہ کی مثال ایسی ہے جیسے کہ مدارس میں طلباء تعلیم پاتے ہیں، ان کے لئے بھی کثرتِ علائق بری چیز ہے۔ اگر وہ دوستیاں کریں۔ مجلسوں میں جائیں تو مطالعہ کون کرے گا؟ استعداد کس طرح پیدا ہوگی۔؟ غرض کسی بھی مقصد کے لئے ضروری ہے کہ دل میں مقصد کی لگن ہو اور مقصد کے لئے عشق ہو اور غیر مقصد سے تنفر اور بُعد ہو۔ پھر جا کے مقصد حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وعظ فرما رہے تھے اور لوگوں کی آنکھوں میں گریہ طاری تھا۔ توجہ الی اللہ ہو رہی تھی۔ تو جوشِ عقیدت میں ایک شخص نے کہا۔

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوة، باب فی من نام عن صلوة، ص:۱۲۵۵، رقم: ۴۳۷.

② شعب الایمان للامام البیهقی، ج: ۱۱، ص:۶۸، رقم: ۴۸۶۲. (یہ حضرت اصمعیؒ کا قول ہے۔)

مقصد کی لگن...... ''اے موسیٰ! تم سے بھی بڑا کوئی دنیا میں عالم ہے؟ یعنی نہیں ہے''۔ فرمایا۔ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔ اور یہ حق تھا، اس لئے کہ اپنے دور میں پیغمبر سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ہوتا۔ انہی کے طفیل میں دوسروں کو علم پہنچتا ہے، تو اپنے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام افضل الخلائق ہیں۔ بلا کسی غرورِ نفس اور بلا کبر کے حق بات آپ نے فرمادی۔ کہ میں ہی بڑا عالم ہوں۔ اللہ نے بنادیا۔ یہ تکبر نہیں تھا۔ مگر کبر کی صورت پیدا ہوگئی دعویٰ کی صورت پیدا ہوگئی کہ ''میں ہوں'' یہ ناپسند ہوا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: تم دعویٰ کرتے ہو کہ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں۔ ''بَلٰی عِنْدَنَا عَبْدُنَا هُوَ اَعْلَمُ مِنْکَ.'' ① ہمارا ایک بندہ ہے کہ جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اس سے جا کے علم سیکھو۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام چلے اور حضرت یوشع ابن نون کو ساتھ لیا۔ حق تعالیٰ نے علامت بتلادی کہ فلاں جگہ مجمع البحرین میں جب پہنچو گے تو اس بندے سے ملاقات ہوگی۔ اور یہ فرمایا جو مجھے سنانا تھا کہ ﴿حَتّٰی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا﴾ ② میں مجمع البحرین پر پہنچ کر رہوں گا، چاہے لاکھوں برس گزر جائیں، مجھے جانا ہے اور اس بندے سے علم حاصل کرنا ہے۔ یہ مقصد کی لگن تھی کہ چاہے لاکھوں برس گزر جائیں۔

غرض ایک طالب علم کا جب انتہائی مقصد متعین ہوجائے، اس میں لگن ہونی چاہئے اور مقصد سے عشق ہونا چاہئے۔ جب اس میں منہمک ہوگا تو غیر مقصد کی طرف کبھی توجہ نہیں کرے گا۔ تو مقصد کی لگن اور دھن یہ اصل چیز ہے۔ جب علوم ظاہرہ میں اس کی ضرورت ہے تو علوم باطنہ میں اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے آدمی یہ سوچ لے کہ چاہے عمرِ نوح بھی گزر جائے مگر مجھے ہر صورت میں یہ مقصد حاصل کرنا ہے، پھر حق تعالیٰ بھی مدد فرماتے ہیں اور مقصد حاصل ہوجاتا ہے۔ غرض پہلی چیز یہ ہے کہ اپنے مقصد سے لگن ہو۔ اس کے لئے پھر ایثار ضروری ہے کہ آدمی اپنی خواہشات مقصد میں فنا کردے۔ اگر رات دن اس میں ہے کہ کھاؤں گا یہ اور پیوں گا یہ، تو وہ آرائش کی فکر میں ہے۔ اسے مقصد سے کیا تعلق؟ جب آدمی مقصد میں لگتا ہے تو ہر چیز سے نگاہ ہٹ جاتی ہے۔ پھر مددِ خداوندی آتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''ہمتِ مرداں مددِ خدا'' ہمت کروگے تو اللہ کی مدد شامل حال ہوگی، کم ہمت ہو کر گھر بیٹھ جاؤ گے، اس کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔

اختلافِ استعداد...... تو اس میں احوال بھی مختلف ہیں، استعدادیں بھی مختلف ہیں۔ عزیمتیں بھی مختلف ہیں۔ بعضوں میں عزیمت ہوتی ہے کہ انتہائی لگن ہے۔ بعض میں کچھ ہلکی سی لگن ہوتی ہے، اس کو مقصد کے حاصل کرنے میں دیر لگ جائے گی، اس کا کوئی قانون نہیں ہے۔ قانونی بات اتنی ہے کہ نصاب پورا ہوگیا تو فارغ التحصیل ہوگئے۔ اب یہ کہ تم میں کتنی علمی قوت آئی، یہ ہر شخص کی الگ الگ ہے۔ یہی یہاں بھی ہے کہ جب وہ مجاہدات و افکار صحیح طریقے سے پورے ہوگئے، شیخ کہہ دے گا کہ بھائی تم قانونی طور پر واصل ہوگئے۔ اب یہ کہ تمہارے اندر

① الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب مایستحب للعالم اذا سئل، ص: ۱۳، رقم: ۱۲۲.

② پارہ: ۱۵، سورۃ الکهف، الآیة: ۶۰.

جذبہ کتنا ہے۔ عشقِ خداوندی کتنا ہے۔ یہ ہر شخص کے حالات الگ الگ ہیں۔

اعضاء کی پیوند کاری...... یہ اصل میں اس پر موقوف ہے۔ پہلے یہ سمجھا جائے کہ اس جسم کے ہم مالک ہیں یا یہ جسم ہمیں بطورِ عاریت کے فائدہ اٹھانے کے لئے دیا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ جسم سرکاری مشین ہے جو اللہ نے بنائی ہے۔ اگر آپ مالک ہوتے یا آپ کے قبضے میں ہوتا تو آپ کبھی اس جسم کو بیمار نہ ہونے دیتے، کبھی کسی عضو کو اپنی جگہ سے ٹلنے نہ دیتے، مگر آپ مالک نہیں ہیں۔ بیماری آتی ہے تو آپ کو سر جھکا دینا پڑتا ہے۔ صحت آتی ہے جب بھی سر جھکا دیتے ہیں۔ غرض پہلا سوال یہ ہے کہ آپ اس بدن کے مالک ہیں یا بطورِ عاریت کے دیا گیا ہے؟ مالک تو ہیں نہیں بطورِ عاریت کے دیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ دیتے ہیں پھر لے لیتے ہیں۔ اگر مالک ہوتے تو کبھی بھی اپنے بدن کو دوسرے کے حوالے نہ کرتے۔ حتیٰ کہ اللہ میاں کے حوالے بھی نہ کرتے اور وہ لینا چاہتے تو کہتے کہ حضور، جب آپ نے ہماری ملک بنا دی تو غیر کی ملک میں آپ تصرّف کیوں کرتے ہیں؟ اس سے معلوم ہوا، ہماری ملک نہیں، جب ملک نہیں ہے تو مالک سے پوچھا جائے گا۔ اگر وہ اجازت دے تو ہم کسی عضو کو منتقل کر سکیں گے۔ وہ اجازت نہ دے تو نہیں کر سکیں گے، تو اس اجازت کی ذمہ داری آپ کے پاس کوئی ہے یا نہیں؟ کہ آپ کو اجازت مل گئی ہے یا نہیں؟ اگر وحی یا الہام کے ذریعہ مل گئی ہو تو ٹھیک ہے۔ اگر نہیں ملی تو پھر آپ کو کوئی حق نہیں۔ پھر اس میں ایک سوال تھوڑا ہی ہے۔ آپ نے ایک شخص کو اپنی آنکھ دے دی، قیامت کے دن اس نے کہا کہ اب چونکہ یہ میری ملک ہو گئی، لہٰذا تم اندھے رہو۔ لہٰذا یہ اندھے کا اندھا حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب تو نے اپنا ایک عضو منتقل کر دیا۔ واپس لینے کا کیا حق ہے، جب واپس لینے کا حق نہیں تو اندھا رہ، وہاں پھر آپ کیا کریں گے۔ یہ جسم جو ہے، برزخ ہو یا آخرت ہو، عذاب ثواب اسی پر واقع ہوگا تو آپ کو حق کیا ہے کہ آپ جسم کا کوئی عضو کسی دوسرے کو دے دیں۔ اوّل تو مالک نہیں۔ پھر مالک نہ ہونے کی صورت میں جو تصرفات برزخ میں یا حشر میں ہوں گے وہ اسی بدن پر ہوں گے۔ جب آپ یہ بدن دے چکے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی جلا کر بدن کو راکھ کر دے۔ اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔

دین کی بنیاد مسائل پر ہے مصالح پر نہیں...... اب رہا یہ کہ مصلحت یہ ہے تو دین کی بنیاد مصلحتوں پر نہیں ہے۔ مسائل پر ہے۔ کون سی بُری سے بُری چیز ہے جس میں کوئی نہ کوئی مصلحت نہیں۔ شراب پینے میں بھی تو مصلحت ہے۔ صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ بدن میں قوّت آ جاتی ہے۔ جوئے میں بھی مصلحت ہے ایک دم تو مال بھی بڑھ ہی جاتا ہے، ایک پیسہ خرچ کیا اور ہزار روپیہ کما لیا تو نفع ہوا۔ اور قرآن کریم بھی اس مصلحت کو مانتا ہے۔ ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ① لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں آپ فرما دیجئے ان میں کچھ نفع بھی ہے، کچھ نقصان بھی ہے۔ مگر نقصان غالب ہے نفع مغلوب

---

① پارہ: ۲ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۱۹.

ہے۔غرض قرآن کریم نے نفع کا اقرار کیا، تو کون سی چیز ایسی ہے جس میں نفع نہیں، مگر اس نفع ونقصان پر اگر احکام کا مدار ہوتا تو شراب جائز ہوتی کہ اس میں ایک نفع بھی ہے۔ جوا جائز ہوتا، اس میں ایک نفع بھی ہے۔

لیکن باوجود منفعت کے ناجائز قرار دیا گیا، غرض آپ اگر تمدّنی مصالح سے کوئی منفعت ثابت کریں تو دین کا مدار تو منافع اور مصالح پر نہیں ہے، وہ تو مسائل پر ہے۔ ورنہ آپ کل کہیں گے کہ صاحب تمدّنی طور پر شراب میں بھی تو منفعت ہے تو اس کی بھی اجازت دی جائے۔ اور جوئے میں بھی کچھ نفع ہے تو اس کی بھی تھوڑی بہت اجازت دی جائے۔ تو اس اجازت کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوسکتا۔ یہ فقط آنکھ، ناک تک نہیں رہے گا، یہ نفس کی خواہشات پر بھی آئے گا۔ طبعی تقاضوں پر بھی آئے گا کہ اس میں مصلحت یہ ہے۔ اگر میری اور آپ کی تجویز کردہ مصلحتیں جو ہم بتلاتے ہیں، اس پر مدار ہوتا تو پھر اس کی اجازت دے دی جاتی مگر اس پر تو مدار نہیں، البتہ مصلحتِ کلی پر مدار ہے کہ بنی نوع انسان کی مصلحت کیا ہے۔ زید، وعمر، بکر کی مصلحت نہیں دیکھی جاتی۔ قانون جب بنتا ہے تو مفادِ عامّہ کو سامنے رکھ کر بنتا ہے۔ زید، عمرو بکر کے لئے نہیں بنتا۔ مثلاً ریلوے کا قانون ہے کہ ایک ٹکٹ میں آپ ۲۵ سیر وزن لے جاسکتے ہیں۔ ایک آدمی یوں کہے کہ میں قوی ہوں، میں دو من وزن اٹھا سکتا ہوں۔ میرے لئے ۲۵ سیر کی کیوں قید ہے۔؟ اس کی بات کو نہیں مانا جائے گا۔ اس لئے کہ مفادِ عامّہ کی رعایت پیشِ نظر ہے۔ زید، عمرو بکر کی نہیں کہ کون قوی ہے، کون ضعیف ہے۔ تو دنیا کے قانون میں بھی جو مفاداتِ عامّہ ہیں، مصالح عامّہ ہیں جو بنی نوع سے متعلق ہیں ان کی رعایت ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کے چند افراد کی رعایت نہیں ہوتی۔

نس بندی یا کنبہ بندی؟ ...... نس بندی تو باتفاق علماء ناجائز ہے۔ اس لئے کہ اس میں تغیرِ خلق اللہ بھی ہے اور بدنِ انسانی میں اس قسم کے تصرّفات کرنا ہے جن کی فطرت اجازت نہیں دیتی۔ پھر یہ کہ نس بندی سے وہ مادّہ تقریباً ختم ہوجاتا ہے جس سے آدمی کو اولاد ہو۔ کسی کو حق نہیں کہ کسی مادّے کو ختم کردے کہ وہ اولاد بنانے کے قابل ہی نہ رہے۔ اور مرد سے نامرد ہوجائے۔ اس کا کوئی حق نہیں۔ اور کنبہ بندی جو ہے وہ اختیاری ہے۔ اس میں یہ ہے کہ خاوند بیوی میں بعض مصالح ایسے ہیں کہ وہ اگر اولاد بند نہیں کریں گے تو ان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ مثلاً بیوی بہت بیمار ہے۔ اگر اولاد ہوگی تو اس کی جان کا خطرہ ہے۔ یا خاوند بہت بیمار یا جیسے فقہاء لکھتے ہیں کہ رزق کی اتنی کمی ہے کہ کوئی صورت نہیں بن پڑتی اور اولاد روز بروز ہو رہی ہے تو تقلیلِ اولاد کے لئے خاوند بیوی مل کر باہمی معاہدہ کرلیں کہ اب ہمیں اولاد کم کرنی ہے۔ مگر یہ قانونی چیز نہیں، یہ تو اخلاقی اور خانگی چیز ہے قانونِ شریعت اس کے اوپر دباؤ نہیں ڈالے گا۔ البتہ شریعت حق دے گی کہ اگر ایسے حالات آئیں تو اس حق کو باہمی رضامندی سے استعمال کیا جائے گا۔ خاوند بیوی مل کر باہم معاہدہ کرلیں۔ غرض نس بندی میں مادّہ زائل ہوتا ہے۔ اس کا کسی کو حق نہیں۔ کنبہ بندی اختیاری ہے کہ خاص حالات میں آدمی تقلیلِ اولاد کی طرف متوجہ ہو۔ مگر وہ قانونی چیز نہیں۔ اخلاقی چیز ہے کیوں کہ ہر گھر کا الگ الگ معاملہ ہے۔

عمومی طور پر تقلیل اولاد کی صورت...... تقلیل اولاد کا جو طریق ہے وہ یہ ہے کہ ان اسباب کا انسداد کیا جائے جن سے ہر وقت شہوات ابھرتی رہتی ہیں اور خواہی نخواہی اولاد ہو، حتیٰ کہ جائز ناجائز بھی۔ جب فواحش اور منکرات عام ہوں، بے حجابی اور عریانی عام ہو، عورتوں اور مردوں کا اختلاط عام ہو، کوئی صورت تقلیل اولاد کی نہیں۔ آخر پہلے بھی تو لوگ تھے مگر اتنی اولاد نہیں ہوتی تھی، اس لئے کہ ہوسناک نہیں تھے، اب چوں کہ رات دن عورتوں کو دیکھتے ہیں۔ شب وروز اختلاط ہے تو شہوات اپنے مرکز پر قائم نہیں ہیں، وہ منتشر ہیں، اس لئے لوگ جائز ناجائز میں مبتلا ہیں۔ اور جب کوئی چیز اپنے مرکز کو چھوڑ کر حد سے نکل جاتی ہے، کوئی بھی قوت ہو وہ کسی حد پر رکتی نہیں۔ شہوات جب قبضے میں نہ رہیں تو ہر وقت آدمی شہوت رانی میں پڑا رہے گا۔ جائز ہو یا ناجائز ہو۔ تو قدرتی طور پر اولاد زیادہ ہوگی۔ اس واسطے تقلیل اولاد کی ایک تو خاص صورت ہے کہ بیوی بیمار ہے۔ بے حد کمزور ہے۔ اندیشہ ہے کہ اب اگر اولاد ہوگی تو بچے گی نہیں۔ یہ تو ایک خصوصی بات ہے۔ لیکن عمومی طور پر اگر کوئی چاہے کہ اولاد زیادہ نہ ہو اس کی صورت یہ ہے کہ ان اسباب کو ختم کیا جائے جن کی وجہ سے شہوات اپنی جگہ پر قائم نہیں ہیں۔ بے پردگی، فحاشی اور عریانی روکی جائے۔ مرد وعورت کا اختلاط روکا جائے۔ قدرتی طور پر ہر قوت اعتدال پر آ جائے گی۔

مقصود تکثیر اولاد ہے، تقلیل کا تعلق عوارض سے ہے...... تقلیل اولاد مقصود تو نہیں۔ مقصود تو تکثیر اولاد ہے۔ امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑھے گی، بہتر ہی ہے مگر تقلیل مقصود نہیں ہے۔ عوارض کی وجہ سے ہوسکتی ہے۔ جب کوئی خاص حالت پیش آ جائے جیسا کہ میں نے عرض کیا، بیوی بیمار ہے۔ یا مرد کے اندر صلاحیت باقی نہیں رہی یا اور اسباب پیش آئیں۔ غرض تقلیل مقصودِ اصلی نہیں، وہ تکثیر ہی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس پر کیا حالات گزر رہے ہیں ، وہ اپنے گھریلو حالات دیکھ لے۔ اور ایک وہ عام چیز ہے، وہ قانونی ہے۔ چاہے تقلیل ہو، تکثیر ہو کہ منکرات کو دنیا سے مٹایا جائے، عریانی، بے حجابی، بے حیائی، اس کے کارخانے بند کئے جائیں۔ یہ قوت اعتدال پر آ جائے گی۔

موجودہ تمدن جو مغرب کی طرف سے آیا ہے۔ یہ ٹھیک اسلامی تمدن کی ضد ہے۔ یہاں نگاہ بازی حرام، وہاں نگاہ بازی تمدن کا جز۔ یہاں اجنبیہ سے خلوت بالکل ممنوع، وہاں تمدن کا جز، وہاں اگر کسی شخص کی بیوی اندر ہے، اور باہر کسی غیر مرد کے جوتے پڑے ہوئے ہیں تو اسے حق نہیں ہے کہ وہ مداخلت کرے، اسے بیوی کو روکنے ٹوکنے کا حق نہیں ہے۔ اندر نہیں جاسکتا۔ ایک تمدن ہے، غرض اس بارے میں یہ اسلامی تمدن کی بالکل ضد ہے۔

تمدنی مشکلات...... اب مشکل یہ ہے کہ تمدن تو وہ پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ہم اسلامی جزئیات کا جوڑ لگائیں۔ وہ جوڑ لگے کیسے؟ وہاں تمدن کی بنیاد نفسانیت اور نفسانی خواہشات ہیں۔ یہاں تمدن کی بنیاد اخلاق اور روحانیت پر ہے کہ اخلاق اعلیٰ ہوں، کردار بلند ہو، ہر شخص خوفِ خداوندی اور تقویٰ وطہارت کی تصویر ہو۔ غرض یہاں کی بنیاد الگ اور وہاں کی بنیاد بالکل الگ۔ وہاں مقصودِ اصلی عیشِ دنیا ہے۔ یہاں مقصودِ اصلی عیشِ آخرت ہے۔ بقدرِ ضرورت شریعت نے دنیا کمانے کی بھی اجازت دے دی۔ چوں کہ یہ ایک دوسرے کے ضد ہیں، اس لئے ایک

میں دوسرے کا جوڑ کیسے لگے؟

وعظ ونصیحت سے شخصی تبدیلی آتی ہے...... اب وعظ ونصیحت آتی ہے، کوئی بے چارہ اللہ سے ڈرنے والا ہے، وہ مان لیتا ہے، لیکن محض وعظ ونصیحت سے تمدن میں انقلاب نہیں آ سکتا۔ انقلاب تو قوتِ قہری سے آتا ہے۔ بعض چیزیں طاقت سے پیدا کی جاتی ہیں، محض وعظ ونصیحت سے پیدا نہیں ہوتیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو اسلام میں خلافت نہ رکھی جاتی۔ چوں کہ جامع اور اجتماعی دین ہے۔ اس واسطے اس کے اندر خلافت ہے، حدود وتعزیرات ہیں. چوں کہ غرض بہت سی چیزوں کا انسداد قوت کرتی ہے، وعظ ونصیحت نہیں کرتی۔ وعظ ونصیحت سے بہت سے بہت کوئی عبادات کی طرف متوجہ ہوگیا، معاملات سچے کر لئے لیکن یہ کہ زمانے کے اندر تمدّنی انقلاب برپا ہوجائے، یہ محض وعظ سے نہیں ہوتا، قوّت سے ہوتا ہے۔

خلافتِ اخلاقی...... ایک خلافتِ عامہ ہے جیسے خلفاءِ راشدین کی خلافت، جو طاقت ور خلافت ہے۔ اور ایک خلافتِ اخلاقی ہے جیسے کسی شیخ نے اپنے مریدین کو خلافت دے دی۔ وہ خلافتِ باطنی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ قلوب کی اصلاح کر دلیکن زمانے کو بدل دو، یہ قبضے میں نہیں ہے۔ اور یوں کوئی روحانیت والا اللہ تعالیٰ پیدا کرے جو سارے عالم کو بدل ڈالے، تو اسے قدرت ہے جیسا کہ ظہور مہدی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا گیا کہ اتنی عظیم روحانی قوّت ہوگی کہ پوری دنیا کا تمدّن بدل جائے گا اور انقلابِ عام پیدا ہوجائے گا، سب میں خوفِ خداوندی، خدا ترسی پیدا ہوجائے گی اور سب اتقیا بن جائیں گے۔ چناں چہ فرمایا گیا کہ آدمی زکوٰۃ کا مال لے کر نکلے گا تو کوئی قبول کرنے والا نہیں ملے گا کہ میرے گھر میں خوب تموّل ہے۔ برکات اتنی ہوں گی کہ ایک انگور کے خوشے میں پورا کنبہ سیر ہوجائے گا۔ تو عدل کامل جب دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو پھر دنیا میں برکات کا ظہور ہوتا ہے۔ ظلم کے ساتھ برکات کا ظہور نہیں ہوتا۔ غرض خلافت عامہ اور چیز ہے۔ اسے خلافتِ کبریٰ کہتے ہیں۔ خلافتِ صغریٰ یہ ہے کہ ایک شخص پر آپ کو اطمینان ہوا کہ اس کا قلب صحیح ہوگیا اور یہ اپنی حد تک دوسروں کو بھی صحیح بنائے گا۔ آپ نے خلافت دی تو یہ خلافتِ باطنی ہے خلافتِ عامہ نہیں ہے۔

علامتِ ظہورِ مہدی رضی اللہ عنہ...... ظہورِ مہدی رضی اللہ عنہ کا وقت تو متعیّن نہیں کیا گیا، اس کی علامتیں بتلائی گئی ہیں، جب یہ علامتیں ظاہر ہونی شروع ہوں سمجھو کہ ظہور مہدی قریب ہے۔ پہلی علامت یہ ہے کہ ''مُلِئَتِ الدُّنْیَا ظُلْمًا وَّجَوْرًا۔ '' ① پوری دنیا ظلم وستم سے لبریز ہوگی۔ عدل اور سکونِ قلب کا کہیں نشان نہیں ہوگا۔ آثار تک نہیں ہوں گے، ظلم وزیادتی سے دنیا بھری ہوئی ہوگی اور یہ حالت عام ہوگی۔ کسی خطے کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یا جیسے فرمایا گیا کہ عرب میں سونے کا ایک پہاڑ ظاہر ہوگا۔ وہ ظہورِ مہدی کا وقت ہوگا۔ تو ایسی کچھ علامتیں بتلائی گئی ہیں۔ مدت متعیّن نہیں کی گئی، وہ اللہ کے علم میں ہے۔ وہ جانتے ہیں کب ظہور ہوگا۔ جیسے قیامت کی علامات بتلائی

① السنن لابی داؤد، کتاب المھدی، ج: ۲، ص: ۵۰۹، رقم: ۳۷۳۲.

گئیں، وقت نہیں بتلایا گیا۔

ذرائع یقین...... جس درجے میں آپ پہنچ سکتے ہیں پہنچیں، یہ جو منجّم ہیں، یہ اٹکل پچو کے تیر لڑاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جوانمردی تو یورپ والوں نے کی کہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر چاند پر پہنچ گئے۔ یا تو طاقت ہو وہاں پہنچ کر حالات معلوم کیجئے۔ باقی فنّی اصول سے جو اٹکل پچو حالات بیان کرتے ہیں، وہ ظنی چیزیں ہیں، کوئی قطعی چیز نہیں ہے۔ اس سے روک دیا گیا۔ اس لئے کہ یقین کا ذریعہ یا مشاہدہ ہوتا ہے کہ آنکھ سے دیکھ لے یا مخبرِ اسلام صادق کی خبر ہوتی ہے۔ جو آنکھ سے زیادہ یقینی ہے، تو یا تو انبیاء علیہم السلام خبر دیں یا پھر آنکھ سے دیکھ لیں۔ باقی یہ کہ فلاں فلسفی یوں کہتا ہے، فلاں یوں کہتا ہے، یہ کوئی قابلِ اعتبار چیز نہیں ہے۔ اگر وہ کچھ کہے گا تو ہم بھی اس کے مقابلے میں کہہ سکتے ہیں کہ ہماری رائے دوسری ہے۔ تو رائے پر دین کا مدار تھوڑا ہی ہے۔ یہ چیز فنِ نجوم سے تعلق رکھتی ہے اور اسے ظنّی کہا گیا ہے کہ کوئی قابلِ اعتبار چیز نہیں ہے۔ صحیح بھی ہو جاتی ہے، غلط بھی ہو جاتی ہے۔ قطعی بات وہی ہے جو اللہ و رسول فرمائیں یا پھر آپ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔ آدمی کیوں مخمصہ میں پڑے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے کا حکم...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى﴾ ① دین کی جو بات بھی اللہ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خبر دیتے ہیں، وہ وحی ہوتی ہے، اس کا ماننا فرض ہے، اس میں اس چیز کی نفی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے بھی نہیں ہوتی تھی بہت سی چیزوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی رائے بھی دی ہے جس کا تعلق وحی سے نہیں تھا۔ بہت سی تدابیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو عقلی طور پر بتلائی ہیں بہت سے مشورے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی طور پر دیئے ہیں۔ اصول تو یہ ہے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے فرمائیں وہ واجب العقیدہ ہے۔ ماننا فرض ہے اور جو رائے سے فرمائیں اس کا ماننا فرض نہیں ہے، یہ الگ چیز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور محبت کی وجہ سے آپ اسے بھی حکم ہی سمجھیں لیکن قانوناً اس کا ماننا واجب نہیں ہے۔

اس رائے پر عمل نہ کرنا یہ تو ممکن ہے لیکن یہ کہنا کہ یہ رائے معاذ اللہ غلط تھی، یہ بے ادبی ہے۔ اس سے بچنا لازمی ہے، ماننا نہ ماننا اختیاری ہے۔ لیکن تنقید، توہین یا تنقیص، وہ کسی طرح سے جائز نہیں خواہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہی ہو، وہ بھی عظمت کی وجہ سے سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہے۔

جیسے حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی باندی تھیں، ان کا نکاح حضرت مغیثؓ سے تھا۔ خاوند بیوی میں موافقت ہوتی نہیں تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں آزاد کر دیا اور مسئلہ یہ ہے کہ منکوحہ باندی آزاد ہو تو نکاح اس کے قبضے میں آ جاتا ہے چاہے نکاح باقی رکھے چاہے فسخ کر دے۔ مناسبت تھی نہیں، بریرہ رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ میں نکاح فسخ کروں اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ ان کے سو جان سے

① پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳، ۴۔

عاشق تھے، وہ جگہ جگہ روتے پھرتے کہ نکاح فسخ نہ کرے مگر حضرت بریرہ رضی اللہ عنہ نے نہیں مانا۔ اخیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

یارسول اللہ! آپ ہی نے نکاح کیا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی بریرہ کو حکم دیں کہ نکاح فسخ نہ کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ اے بریرہ! نکاح فسخ نہ کرو۔ وہ بہت ذہین تھیں، انہوں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپ کی ذاتی رائے؟ فرمایا! حکم شرعی نہیں۔ مشورہ ہے عرض کیا۔ میں تو نہیں مانتی۔ چناں چہ نکاح فسخ کر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر انبیاء علیہم السلام ذاتی رائے پیش کریں تو ماننے نہ ماننے میں آدمی مختار رہتا ہے۔ ایک ہے محبت کا تقاضا، رائے کو بھی آپ حکم کے درجے میں مانیں مگر قانوناً ماننا لازم نہیں۔ ①

تمدنی چیز کے بارے میں آپ کی رائے کا حکم ...... بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح کی باتیں ثابت ہیں۔ مشورے اور ذاتی رائے بھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ظاہر بھی فرمایا۔ حدیث میں ارشاد ہے: ''اَنسٰی کَمَا تَنسَوْنَ'' ② مجھے بھی ایسے بھول چوک ہوتی ہے۔ جیسے تمہیں ہوتی ہے، میری ذاتی رائے میں تو آپ مختار ہیں لیکن وحیء خداوندی سے جو کہوں گا. وہ قطعی ہے۔ اس میں غلطی ناممکن ہے۔ اس کا ماننا فرض ہے۔ جیسے ''تابیرِ نخل'' کے بارے میں عرب میں یہ دستور تھا کہ وہ پیوند لگاتے تھے۔ اور انہوں نے نر و مادّہ سمجھ رکھے تھے۔ اور جب پیوند لگاتے تھے تو پھل آتا تھا۔ پیوند نہ لگائیں تو پھل نہیں آتا تھا۔ آپ نے خیال فرمایا کہ یہ کوئی عقیدہ ہے جو انہوں نے جما رکھا ہے کہ یہ نر ہے یہ مادہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قلم مت لگاؤ۔ اس کے بعد پھل نہ آیا۔ عرض کیا گیا۔ یارسول اللہ! اس دفعہ تو پھل نہیں آیا؟

تب معلوم ہوا کہ معاشرے کی ایک تمدّنی چیز ہے کہ درخت کو درخت سے ملا کر جو قلم باندھتے ہیں تو پھل پیدا ہوتا ہے۔ یہ اسباب حسّیہ میں سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ......'' ③ بھائی! یہ دنیوی معاملہ ہے۔ تم اس میں زیادہ بصیرت رکھتے ہو۔ جو مناسب سمجھو کر لیا کرو۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی ٹوٹکا یا عقیدہ ہے۔ معلوم ہوا عقیدہ نہیں بلکہ یہ حسی اسباب میں سے ایک چیز ہے، اس لئے اجازت دے دی۔ غرض ایک انبیاء علیہم السلام کی رائے اور ذاتی مشورہ ہے، اس میں انسان ماننے نہ ماننے میں مختار ہے۔ اور ایک ہے حکمِ شرعی۔ جو وحی سے ہوتا ہے۔ وہ واجب الاطاعت ہے۔ تو بعض دفعہ انبیاء علیہم السلام ذاتی رائے سے بھی عمل فرماتے ہیں مگر جب وحی روک دیتی ہے، رک جاتے ہیں۔

نبوّت، مجموعۂ بشریّت وملکیّت ...... انبیاء علیہم السلام میں ایک حیثیت بشریّت کی ہے اور ایک ملکیّت کی۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الطلاق، باب شفاعة النبی فی زوج بریرة . ج: ۱۶، ص: ۳۳۲.

② الصحیح لمسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوة، باب السهو فی الصلوة ص: ۲۷۶، رقم: ۱۲۷۴.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ماقاله شرعا دون ماذکره من معایش الدنیا، ص: ۱۰۹۳، رقم: ۴۱۲۶.

بشریت میں جو عوارض بشر پر آتے ہیں، ان پر بھی آتے ہیں، کھانا، پینا، سونا، جاگنا، صحت ومرض وغیرہ۔ اور ایک ملکیت ہے کہ حق تعالیٰ وحی اتاریں، اپنا مقرب بنالیں، وہاں انبیاء علیہم السلام فرشتوں سے بھی بالاتر ہیں کہ فرشتوں کا بھی وہ مقام نہیں، ان دونوں مقاموں کو فرمایا گیا کہ:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ ① میں تمہارے جیسا بشر ہوں، ہاں میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یہ نبوت کی عظمت ہے۔ ایک بشری حیثیت ہے۔ ایک نبوت کی حیثیت ہے۔ بشری حیثیت میں سب لوازم بشریت ان پر آتے ہیں اور ملکیت کی حیثیت میں وحیءِ خداوندی آتی ہے۔ اور وہ مقربانِ الٰہی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بشریت کو تو لے لے اور یوحی الی کو نہ لے اور معاذ اللہ گستاخی کرنے لگے یہ عینِ کفر ہے۔ اور اگر کوئی شخص محض یوحی الی کو لے لے اور بشریت کی نفی کردے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر نہیں تھے۔ یہ بھی کفر ہے۔ درمیان میں بات ہے کہ بشر بھی مانے مگر عام بشروں جیسا بشر نہیں صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص بشر جس پر اللہ کی عنایات نازل ہیں، وحی ہے، معجزات ہیں۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں پیدائش کے لحاظ سے اور نبی ہیں عطائے خداوندی کے لحاظ سے، اس کی عظمت فرض ہوگی اور بشریت کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر ماننا بھی فرض ہوگا۔ دونوں چیزیں ہیں۔

حدیثِ ضیافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ..... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: ''قَالَ اَضَافَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْاَسْوَدَيْنِ التَّمْرِ وَ الْمَآءِ'' (اَوْكَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ) ② ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری ضیافت کی دو اسودین پر۔ کھجور اور پانی پر، کھجور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھا کر اُس مجھے کھلایا اور پانی پی کر مجھے پلایا اور یہ حدیث بیان فرمائی''۔ ''مَنْ اَضَافَ مُؤْمِنًا فَكَاَنَّمَا اَضَافَ اٰدَمَ.'' جس نے اخلاص کے ساتھ کسی ایک مومن کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسے کسی نے حضرت آدم علیہ السلام کی ضیافت کی، اس پر جو اجر ملتا وہ اسے اجر ملے گا۔ آگے فرماتے ہیں۔ ''وَمَنْ اَضَافَ مُؤْمِنَيْنِ فَكَاَنَّمَا اَضَافَ اٰدَمَ وَحَوَّآءَ.'' ''جس نے دو مسلمانوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جس نے آدم وحوا علیہما السلام دونوں کی ضیافت کی''۔

اس کے بعد فرمایا جس نے تین مسلمانوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسا جبریل ومیکائیل اور اسرافیل علیہم السلام کو مہمان بنایا۔ اور جس نے چار کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جس نے توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن کریم کو پڑھ لیا، یہ کتابیں پڑھنے پر اس کو جو اجر ملتا۔ اس نوعیت کا اجر اس کو ملے گا۔ جس نے پانچ آدمیوں کی مہمانی کی وہ ایسا ہے جیسے اس شخص کو اجر ملتا جو اوّلِ خلق سے برابر جماعت کے ساتھ نمازیں پڑھتا رہا۔ ہزاروں برس نماز پڑھنے پر جو اجر مرتب ہوتا، وہ اجر پانچ آدمیوں کی دعوت کرنے پر ملے گا۔

اس کے بعد فرمایا جس نے چھ آدمیوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسے اولادِ اسماعیل میں سے چھ غلام شدہ

---

① پارہ:۱۶ سورۃ الکھف، الآیۃ:۱۱۰. ② الحدیث اخرجہ علی المتقی الهندی، وضعفه، کنز العمال، ج:۹ ص:۲۶۹.

انسانوں کو آزاد کر دیا۔ جس نے سات آدمیوں کی دعوت کی تو گویا جہنم کے سات دروازے اس پر بند کر دیئے گئے ۔ گویا اس کا جہنم میں داخلہ نہیں ہوگا۔ اس پر یہ اجر مرتب ہوا۔ اور جس نے آٹھ آدمیوں کی ضیافت کی، اس کے لئے گویا جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے گئے، جس میں سے چاہے داخل ہو جائے اور جس نے نو آدمیوں کی دعوت کی وہ ایسا ہے جیسے اوّلِ خلق سے گناہ گاروں سے جتنے گناہ ہوئے ہیں، اس نے اتنے اجر کما لئے گناہوں کی قید اس لئے لگائی کہ نیکیاں کرنے والے کم ہوتے ہیں، گناہ کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ تو مبالغہ اسی میں تھا۔ اور فرمایا جس نے دس کی ضیافت کی تو حق تعالیٰ اس کے لئے ان لوگوں کا اجر لکھیں گے جنہوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، حج کیا، عمرہ کیا اور قیامت تک کرتے رہیں گے، اتنا عظیم اجر دیا جائے گا۔

گویا اس کا منشاء یہ ہے کہ: مسلمانوں میں باہمی تعاون اور باہمی امداد اور اعانت کا جذبہ پیدا ہو۔ ایک ہے خود تنہا نماز پڑھ لینا، وہ سب اپنے لئے ہے۔ گویا نماز پڑھ کر اپنی نجات کمالی، اور ایک مسلمانوں کو جوڑے رکھنے کا سامان کیا جس سے پوری امت میں قوت پڑتی ہے۔ اس کے اسباب میں سے بھی ہے کہ ضیافت و مہمانداری بھی ہو۔ تعاون اور ایک دوسرے سے ہمدردی ہو۔ جیسے کہ فرمایا گیا: ’’وَاللّٰهُ فِیْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا کَانَ الْعَبْدُ فِیْ عَوْنِ اَخِیْهِ۔ ‘‘ ① اللہ اپنے بندے کی مدد پر رہتا ہے۔ جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد پر رہتا ہے۔ تو نماز تو ذاتی فعل ہے اور دوسرے کی مدد کرنے کا تعلق امت سے ہے اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ ہے کہ امت کے اندر اجتماعیت پیدا ہو۔ تفریق کی بجائے اتحاد باہمی ہو۔ جس سے قوت پیدا ہو۔ اعداء اللہ مغلوب ہوں، دین کا کلمہ بلند ہو۔ اس واسطے اس عمل کی زیادہ قدر و قیمت بیان کی گئی۔ ورنہ بظاہر دیکھنے میں سرسری نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے حج کیا، عمرہ کیا اور ایک نے دس آدمیوں کو کھانا کھلا دیا۔ بظاہر تو بڑی بات نہ تھی لیکن اگر بنیاد پر نظر ڈالی جائے تو ہزار نمازیں بھی پڑھے گا تو اس کی ذات کے لئے ہیں۔ مہمانداری، تعاون اور ہمدردی کرے گا، اس سے امت میں اجتماعیتِ عامّہ پھیلے گی اور مقصودِ شریعت سے یہ ہے کہ امت کے اندر اجتماعیت، باہمی اخوت رہے تا کہ اعداء اللہ ضعیف ہوں اور ان کے سامنے قانونِ الٰہی پیش کیا جا سکے، اور اگر خدانخواستہ اعداء اللہ غالب آ جائیں تو وہ اپنا کلمہ آپ کے سامنے پیش کریں گے، آپ کا کلمہ تھوڑا سنیں گے قوت کی وجہ سے آدمی دوسرے کی بات سنتا ہے۔ تعاون تناصر اور باہمی قوت کا اثر پوری امۃ تک پہنچتا ہے۔ اور حج وعمرہ کا اثر ایک آدمی کی ذات تک پہنچتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی بڑا عمل ہو۔ اس واسطے اس اجر کو بڑھایا گیا، اگر ایک آدمی نے ہزار حج کئے لیکن ایک کام ایسا کیا کہ اس سے امت مل گئی، اس کا اجر ہزار حج سے زیادہ ہے۔ کیوں کہ مقصود اجتماعیت ہے۔ اس واسطے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ کھانا کھلانا کیسے بڑھ گیا؟

غرض یہ حدیثِ ضیافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل مذکور ہے کہ کھجور کھا کر باقی انہیں کھلائی اور پانی پی کر بقیہ انہیں پلایا۔ پھر حدیث بیان فرمائی۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الذکر و الدعا، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن وعلی الذکر، ص: ۱۱۴۷، رقم: ۶۸۵۳۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں، انہوں نے عرض کیا کہ آپ میری ضیافت کریں اور یہ حدیث مجھے سنائیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی ضیافت کی، کھجور کھلائی۔ پانی پلایا اور حدیث بیان کی۔ آگے شاگرد در شاگرد مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک سلسلہ پہنچ گیا۔ تو مولانا عبدالقیوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی ضیافت کی کھجور کھا کر انہیں کھلائی اور پانی پلایا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے میرے ساتھ یہی معاملہ کیا کہ کھجور کھا کے اُس کھلایا اور پانی پی کر پلایا اور یہ حدیث سنائی اور اس کی اجازت دی۔

اب یہ دو حدیثیں ہو گئیں۔ ایک مسلسل بالمصافحہ اور ایک مسلسل بالماء والتمر۔ قولی طور پر آپ نے حدیث سن لی، اب عملی حصہ رہ گیا کہ ہر شخص جس کو اجازت دی جائے اس سے مصافحہ کیا جائے اور کھجور کھا کر کھلائی جائے اور پانی پی کر پلایا جائے۔ اب یہاں اتنے آدمی ہیں کہ اتنی کھجوریں تو میں نہیں کھا سکتا کہ آدھی کھا کر انہیں کھلاؤں۔ اس واسطے ایک آدھ کھجور کھا کے میں ان کھجوروں میں شامل کر دوں گا، اس سے انشاء اللہ برکات شامل ہوں گی۔ پانی پی کر جگ میں ڈال دوں گا، اس میں سے سب حضرات پی لیں۔ ورنہ ہر گلاس میں سے ایک ایک گھونٹ پیوں تو پچاس گھونٹ میں معلوم نہیں پیٹ کہاں پہنچے گا۔

اسلام کا نظام اجتماعیت ...... حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِـالْجَمَاعَةِ'' ① اسلام نہیں ہے مگر اجتماعیت کے ساتھ۔ اسلام نام ہی اجتماعیت کا ہے۔ اسی واسطے کوئی عبادت ایسی نہیں جس میں اجتماعیت نہ ہو۔ نماز رکھی تو اس میں امام رکھا۔ اقتدار رکھی۔ اجتماع رکھا۔ تاکہ مل کر نماز ادا کریں۔ اسی طرح اگر زکوٰۃ رکھی۔ تو اس میں اصل یہ ہے کہ اسلامی حکومت ہو تو اسے بیت المال میں داخل کیا جائے۔ وہ عام غرباء میں اس کو تقسیم کرے۔ تاکہ پوری امت تک اس کا اثر پہنچے۔ اب حکومت اسلامی نہیں ہے تو علماء اور اہلِ فتویٰ کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا تاکہ ان کے فتویٰ کے مطابق تقسیم کیا جائے۔

اسی طرح حج ہے تو وہ بھی اجتماعیت کا نام ہے۔ اس میں بھی امام ہے۔ اور امام کے اشاروں پر سب حج کے افعال ادا ہوتے ہیں جہاد ہے، اس میں امام و امیر رکھا گیا، جب تک وہ حکم نہ دے نہ آپ آگے بڑھ سکتے ہیں نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ اسی طرح سے عام گھروں کے اندر فرمایا گیا کہ: ''كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِه .'' ② تم میں سے ہر شخص اپنے گھر کا بادشاہ ہے۔ اسی سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اپنی رعایا (گھر والوں) کا کس طرح سے بندوبست کیا، ان کی تربیت شرعی کی تھی یا نہیں؟ یہاں بھی اجتماعیت قائم کر دی۔

اسی طرح سفر میں جائے تو اس بات کو سنت قرار دیا کہ چند آدمی ایک امیر بنا لیں، اس کے احکام پر عمل کریں تاکہ سفر نظم کے ساتھ ہو۔ غرض اسلام نے ہر چیز میں نظم رکھا، تنظیم و اجتماعیت رکھی ہے۔ اس لئے فرمایا: '' لَا اِسْلَامَ

① هذا من قول عمرؓ: السنن للدارمي، المقدمة، باب ذهاب العلم، ج: ١، ص: ٢٨٣، رقم: ٢٥٧.

② الصحيح للبخاري، كتاب الجمعة، باب في القرى و المدن، ص: ٧٠، رقم: ٨٩٣.

اِلَّا بِـالْـجَـمَاعَةِ .'' اسلام بن نہیں سکتا جب تک جماعتی رنگ نہ غالب آ جائے۔ جتنی چیزیں اجتماعیت سے متعلق ہیں ان کے اجر کو انفرادی عبادتوں سے زیادہ بڑھا دیا گیا ہے تا کہ پوری جماعت اس کی لپیٹ میں آ جائے۔

منصب افتاء کی نزاکت...... بہت سی جزئیات ایک دوسرے کے مشابہہ ہوتی ہیں اور احکام جداگانہ ہوتے ہیں۔ اس کے الگ اور اُس کے الگ۔ مفتی پہچان سکتا ہے کہ ان جزئیات میں کون سا باریک فرق ہے جو ان دونوں کا حکم الگ الگ ہو گیا ہے، چوں کہ مفتی کے سامنے تمام جزئیات ہوتی ہیں اور فن سے واقف ہیں تو جزئیات میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

سب سے زیادہ مشکل چیز فتویٰ دینا اور عمل کے طور پر مسئلہ بتلانا ہے۔ ہر پڑھا لکھا بلکہ ہر مدرّس بھی یہ کام نہیں کر سکتا۔ یہ مفتی کا کام ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ یہ بصیرت دیتے ہیں۔ اسی لئے بزرگوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ فتویٰ دینے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے مسئلہ پوچھا تو بتلا دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مسئلہ غلط بتلا دیا گیا۔ سخت پریشان، گرمی اور بارش میں سارے شہر میں اسے ڈھونڈتے پھرے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ شخص رات کو ملا۔ تب اس سے کہا کہ بھائی! میں نے مسئلہ غلط بتلایا تھا اصل مسئلہ یہ ہے، جب جا کے انہیں تسلی ہوئی۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ کے یہاں رسالہ ''النور'' میں ایک مستقل باب ''ترجیح الراجح'' تھا۔ اگر کسی مسئلہ کے بیان میں کوئی غلطی ہوئی تو شائع کرتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، حکم یہ ہے اور یہی راجح ہے۔ لوگ اسی پر عمل کریں۔ بہر حال سب سے زیادہ مشکل چیز فتویٰ دینا ہے۔ یہ مفتی کا کام ہے۔ ہر مدرس یا ہر عالم کا کام نہیں ہے۔

منصب تدریس وتبلیغ...... اس سے زیادہ آسان درس دینا ہے۔ درس میں کتاب سامنے ہوتی ہے، کتاب کے مطابق مضمون بیان کر دیا، کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوتی، اس سے زیادہ آسان تقریر کرنا ہے۔ اس لئے کہ ایک موضوع پر جو یاد تھا، علمی طور پر کہہ دیا۔ اور اس سے زیادہ آسان ہے وہ تقریر جو علمی نہ ہو۔ محض دنیاداری کی باتیں۔ اِدھر اُدھر کے واقعات لیکچر میں کہہ دیئے، یہ سب سے زیادہ آسان ہے۔ گزرے ہوئے واقعات یوں ہوا تھا، یوں ہوا تھا۔ بیان کر دیا، اور اس سے بھی زیادہ آسان اعتراض کر دینا ہے۔ اس کے لئے کسی تکلیف کی ضرورت نہیں، جس پر چاہا اعتراض کر دیا، جس پہ چاہا شبہ وارد کر دیا۔ جاہل سے جاہل اعتراض کر سکتا ہے۔ اس میں کسی علمیت کی ضرورت نہیں۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ بعض حضرات مسائل پوچھتے ہیں۔ میں عرض کر دیتا ہوں کہ بھئی مفتی صاحب سے پوچھو۔ میں نہیں بتلا سکتا۔ مسئلہ کا علم بھی ہو تب بھی جرات نہیں ہوتی کہ مسئلہ بیان کر دوں۔ مفتی کے سامنے سب چیزیں مستحضر ہوتی ہیں۔ بعض لوگ برا مانتے ہیں کہ مسئلہ نہیں بتلایا۔ اگرچہ مسئلہ نہیں بتلایا مگر حوالہ تو دے دیا کہ مفتی سے پوچھو۔ کیا ضروری ہے کہ ہر ایک مسئلہ بتلائے ہی۔ جو بتانے والے ہیں وہ بتلائیں گے، جن کو اس کا فن اور سلیقہ ہے۔ برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ میں ہمیشہ اس سے بچتا ہوں کہ فتویٰ دوں۔ یہ کام میرا نہیں ہے۔

علم وعمل کا امتیاز...... ایک ہے کسی مسئلہ کی علمی تحقیق کر دینا، وہ الگ چیز ہے، اس سے انکار نہیں ہوتا، جو اپنے

ذہن میں ہو وہ تحقیق کردی۔ لیکن یہ کہ عمل کیا کرو؟ یہ کام مفتی کا ہے وہ فتویٰ دے گا کہ فلاں پہلو پر یوں عمل کرو، فلاں پہلو پر یوں عمل کرو۔ اس لئے اگر بعض حضرات سوال کریں اور میں مسئلہ نہ بتلاؤں، وہ برا نہ مانیں۔ ضروری نہیں کہ مجھے مسئلہ کا علم بھی ہو۔ اور اگر علم بھی ہو تو میں احتیاط کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ فقہی جزئیات پر میری زیادہ نظر نہیں ہے۔ یہ اس کی ہوسکتی ہے جو رات دن اسی میں پڑا ہوا ہو۔ یہ میں نے بطور تنبیہ اور اصول کے عرض کر دیا۔ اس میں برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کا ایک مقام ہوتا ہے۔ میں نہیں ہوں اس قابل کہ مسئلہ بتلاؤں۔ کیا ضرورت ہے زبردستی پوچھا ہی جائے، کسی اہل سے پوچھا جائے۔

حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اجماعی مسئلہ ہے...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ "حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کا لوگ انکار کیوں کرتے ہیں؟ میرے خیال میں اجمالاً اتنی بات ہے کہ "حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کا مسئلہ تو مجمع علیہ ہے۔ یعنی امّت کے اندر کوئی بھی اس کا منکر نہیں ہے۔ اس کی کیفیت میں گفتگو ہے کہ حیات ہے تو کس کیفیت اور کس نوعیت کی ہے۔ تو کیفیات میں اگر کوئی اختلاف کرے تو اس کو اصل مسئلہ میں اختلاف کنندہ نہیں کہا جا سکتا۔

جہاں تک انبیاء علیہم السلام کی حیات کا تعلق ہے تو صحیح حدیث موجود ہے۔ "**اَلْاَنْبِيَآءُ اَحْيَاءٌ فِىْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ**" ① "انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں"۔ یا فرمایا گیا: "**وَنَبِىُّ اللّٰهِ حَىٌّ يُّرْزَقُ**." ② اللہ کے نبی زندہ ہیں۔ ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس حیات سے مراد اگر وہ عمومی حیات ہے جو برزخ میں عام طور پر ہوتی ہے تو پھر اس تخصیص ذکری کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی پھر یہ کہنا کہ "**نَبِىُّ اللّٰهِ حَىٌّ**" یا "**اَلْاَنْبِيَآءُ اَحْيَآءٌ**" اس کی ضرورت نہیں۔ یوں کہا جا سکتا تھا۔ "**اَلْمُسْلِمُوْنَ اَحْيَاءٌ فِىْ قُبُوْرِهِمْ يَاالنَّاسُ اَحْيَاءٌ فِىْ قُبُوْرِهِمْ**......" اس لئے کہ حیات برزخی میں سب کے سب شریک ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کے ذکر کی تخصیص کیا جانا اور اس پر حیات کا لفظ بولا جانا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خصوصی حیات ہے جو عوام کو حاصل نہیں۔

حیاتِ کامل...... پھر یہ کہ "حیات" کے لفظ کو مقید کر کے نہیں لایا گیا، یہ نہیں کہا گیا کہ انبیاء علیہم السلام بحیثیت اس کے حیات ہیں۔ یا فلاں جہت سے حیات ہیں بلکہ مطلقاً حی کہا گیا، تو جب بھی کوئی چیز مطلق بولی جائی گی، اس کا فرد کامل مراد لیا جائے گا پھر فرد کامل کی صورت سمجھنے کی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم جسے دنیا میں زندگی کہتے ہیں وہی وہاں سمجھیں کہ وہ حی اور زندہ ہیں اور وہ اسی انداز کی زندگی ہے جیسے دنیا میں زندہ ہوتے ہیں۔ ورنہ پھر انبیاء علیہم السلام کے ذکر کی تخصیص اور حیات کے لفظ کا اطلاق۔ تو ایک تخصیص اور ایک اطلاق، تخصیص ذکری اور خصوصیت بیانی اور لفظِ حیات کا اطلاق۔ یہ دونوں مل کر یہ نتیجہ پیدا کرتے ہیں کہ کوئی خاص اور اعلیٰ قسم کی حیات ہے

---

① مسند ابی یعلی، ثابت البنانی عن انس، ج: ۷ ص: ۳۳۵. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد للهیثمی، ج: ۸، ص: ۱۴۳.

② السنن لابن ماجه، کتاب الجنائز، باب ذکر وفاته ودفنه، ص: ۲۵۷۵، رقم: ۱۶۳۷.

جو دوسروں کو حاصل نہیں۔اب یہ کہ اس کی کیفیت کیا ہے؟

قبضِ روح کا امتیاز.....تو ہم کیفیت سے واقف نہیں۔نہ ہم اس کا پتہ دے سکتے ہیں۔نہ ہمارے بس کی بات ہے۔اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی ممات بھی ہماری جیسی نہیں،ان کی حیات بھی ہماری جیسی نہیں، ان کی ممات میں تو یہ بھی ہے کہ ملک الموت آ کر ان سے اجازت لیتے ہیں اور جب تک وہ اجازت نہ دیں اور ان کے علم میں نہ لایا جائے کہ وقت آ رہا ہے اور ہم قبضِ روح کے لئے آ رہے ہیں۔اس وقت تک ممات کا آغاز نہیں کیا جاتا۔عامۃ المؤمنین سے اس قسم کی کوئی اجازت یا استیذان نہیں کیا جاتا۔

دستِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز......پھر یہ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دنیا میں جو حیات ہے تو وہ اور لوگوں کی جو دنیوی حیات ہے، اس کے مشابہ نہیں۔تو جب حیات مشابہ نہیں تو ممات بھی مشابہ نہیں ہوسکتی۔یوں تو فرمایا گیا﴿إِنَّمَآ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ ① میں تم جیسا ایک بشر ہوں۔لیکن اس مماثلت کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت اور ہماری بشریت میں کتنا فرق ہے۔یہ سیرت کے احوال دیکھنے سے واضح ہوگا۔ ہم بھی کہیں گے کہ ہمارے ہاتھ ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے بھی ہاتھ ہوتے ہیں اور جسمانی ہوتے ہیں کہ کوئی معنوی اور روحانی نہیں۔لیکن ہاتھوں کے اندر خصوصیت سے امتیازی شان موجود ہے جو عام ہاتھوں کو حاصل نہیں۔ ہم اگر کسی کے چپت ماردیں تو چوٹ لگ جائے گی۔انبیاء علیہم السلام اگر کسی کے چپت مارتے ہیں تو چوٹ لگے یا نہ لگے،لیکن اس سے معنوی حیات پیدا ہو جاتی ہے۔ہم اگر آپ کے سینے میں ہاتھ ماردیں تو آپ چوٹ کھائیں گے اور ہمیں برا بھلا کہیں گے۔حضور علیہ السلام نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے پر ہاتھ مارا تو ان کو شرحِ صدر نصیب ہو گیا اور ان کے سامنے آسمانوں تک کی چیزیں روشن ہو گئیں۔

جیسے کہ حدیث میں یہ واقعہ فرمایا گیا ہے کہ: غالباً حضرت خباب ابن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔یہ اپنے محلّے کے امام تھے،انہوں نے نماز پڑھائی۔حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی قرأت سنی،تو انہوں نے اپنے قبیلے کے لغت پر قرآت کی۔اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ لغتِ قریش کی قراءت جانتے تھے۔وہ تو ''أَشَدُّهُمْ فِيْ أَمْرِ اللّٰهِ'' ہیں۔تو خباب ابن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشکیں کس کے کھینچتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور عرض کیا۔''یارسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے اس منافق کی گردن قلم کردوں،اس لئے کہ یہ قرآن کریم غلط پڑھتا ہے''۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔پڑھو۔انہوں نے وہ آیت اپنی لغت پر سنائی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''هٰكَذَا أُنْزِلَتْ...... '' یوں ہی نازل ہوا ہے۔''أُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ. '' ② سات لغت پر قرآن کریم پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔جس

① پارہ:۱۶،سورۃ الکھف،الآیۃ:۱۱۰۔

② السنن للنسائی، کتاب الافتتاح، باب جامع ماجاء فی القرآن،ص:۲۱۴۷،رقم ۹۳۹.

میں بنی تمیم، طے قریش وغیرہ کی لغات شامل ہیں۔ یہ جو عرب میں سات فصیح لغات ہیں، ان ساتوں میں پڑھنے کی اجازت تھی۔ اس میں لفظوں میں تغیر ہوتا تھا۔ معنی اور مفہوم میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا تھا۔ تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پڑھا فرمایا: ''هٰكَذَا اُنْزِلَتْ.......'' ''یوں ہی نازل ہوا ہے''۔

اس سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سینے میں کچھ ریب اور شک کی سی کیفیت پیدا ہوئی کہ یہ کس قسم کا قرآن ہے۔ جس طرح جو پڑھے اسے کہہ دیا جاتا ہے ھکذا انزلت یوں ہی نازل ہوا ہے۔ جیسے شبہ یا وسوسہ پیش آتا ہے۔ ایسی کیفیت پیدا ہوئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''یَا ابْنَ الْخَطَّابِ!'' فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ سینے پر ہاتھ لگتے ہی اتنا عظیم شرح صدر ہوا گویا آسمان میرے اوپر روشن ہوگئے۔ اور وہ جو ریب وشک اور وساوس گزر رہے تھے وہ قطعاً ختم ہوگئے۔ تو میں اور آپ کسی کے ماردیں تو چوٹ لگے گی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ مارا تو شرحِ صدر کی دولت نصیب ہوگئی۔ ''اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ'' بھی صحیح ہے۔ لیکن یہ مماثلت نوعیت کے اندر ہے۔ مگر شخصی فرق وہ اتنا ہے کہ ہاتھوں تک میں نمایاں ہے۔ (1)

لسانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... میری اور آپ کی زبان گوشت پوست کی ہے، انبیاء علیہم السلام کی زبان بھی گوشت پوست کی ہوتی ہے۔ لیکن میں اگر کوئی غذا کھاؤں تو اس سے کھٹے اور میٹھے کا پتہ چل جائے گا۔ جو ایک مادّی ذوق ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تناول فرماتے تھے تو زبان حلال وحرام کا بھی پتہ چلا لیتی تھی۔ حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ انصار میں کہیں میت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنازے میں تشریف لے گئے۔ جب دفن سے فارغ ہوئے تو میت کے وارثوں نے عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ! ہمارے گھر جا کر کچھ تناول فرمالیں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا، تشریف لائے، گوشت لا کے رکھا گیا اور لوگ بھی کھانے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی چکھا۔ اور ارشاد فرمایا یہ غصب کا مال معلوم ہوتا ہے۔ بات یوں کھلی کہ جس نے دعوت دی تھی اس عورت نے کہا، میں نے خاوند کو بھیجا کہ فلاں جگہ سے جا کر بکری خرید لا، تا کہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کروں۔ لیکن وہاں سے بکری دستیاب نہیں ہوسکی۔ اس کے بعد میں نے ایک پڑوسی کے پاس دام بھیجے کہ تو خرید کر لا۔ اس کو بھی دستیاب نہ ہوسکی۔ تو میں نے پڑوسی کی بیوی سے کہا کہ تو کہیں سے بکری لادے۔ اس نے خاوند کی بکری جو اس کی ملک تھی، پکڑ کر بلا اجازت بھیج دی۔ میں نے ذبح کر کے پکا دی، اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک نے پہچانا کہ مال مغصوبہ ہے۔ جو بلا اجازت کے ذبح کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا ''قیدیوں کو کھلادو، ہم یہ کھانا نہیں کھائیں گے''۔

تو زبان کے اندر مماثلت بھی ہے یعنی گوشت پوست اور مادّی ہونے میں، اور عدم مماثلت بھی ہے اس چیز میں کہ ہماری زبان فقط حاسہ ذوق رکھتی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک ذوق کے ساتھ ساتھ حاسۂ

(1) الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب من لم یرباساً ان یقول...... ص: ۴۳۶، رقم: ۵۰۴۱.

معنویت بھی رکھتی ہے جس سے حلّت وحرمت، جائز ونا جائز یا افضل وغیر افضل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تو مماثلت بھی ہے مگر مماثلت کے ساتھ عدم مثلیت بھی ہے۔

صوم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ......'' میں تم جیسا ایک بشر ہوں لیکن حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ امت کو صوم وصال رکھنے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی کہ بلا افطار روزہ مت رکھو اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزہ پر روزہ رکھتے چلے جاتے، متعدد روزے رکھتے۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی اور خود آپ رکھتے ہیں'' ۔فرماتے ہیں: ''اَیُّکُمْ مِثْلِیْ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ.'' (1) تم میں مجھ جیسا کون ہیں۔ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے، تو آیت میں یہ فرمایا جا رہا ہے۔ ''اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ...... '' میں تم جیسا بشر ہوں اور حدیث بالا میں فرماتے ہیں: ''اَیُّکُمْ مِثْلِیْ '' تم میں مجھ جیسا کون اور کون میرا مثل ہے۔ میرے ساتھ پروردگار کا دوسرا معاملہ ہے تو مماثلت بھی ہے اور عدم مماثلت بھی ہے۔ مماثلت بھی ہے اور امتیازی شانیں ہر ہر عضو کے اندر بھی ہیں۔

چشم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... میری اور آپ کی آنکھ دیکھتی ہے۔ مادّی آنکھ ہے، شکلیں، صورتیں ہمیں نظر پڑتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مادّی آنکھ دی گئی۔ لیکن حدیث میں واقعہ فرمایا گیا ہے کہ نماز میں بعض لوگوں سے کچھ غلطیاں ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا۔ اور فرمایا: ''اِنِّیْ اَرٰی خَلْفِیْ کَمَا اَرٰی بَیْنَ یَدَیَّ...... '' تم یہ سمجھتے ہو میں دیکھتا نہیں۔ میں پشت کی جانب سے دیکھتا ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بینائی دو طرف کام کرتی تھی پیچھے سے بھی دیکھتی ہے اور آگے سے بھی دیکھتی ہے۔ تو آنکھ آنکھ ہونے میں تو مماثلت ہے مگر آنکھ کی خصوصیات میں کوئی مماثلت نہیں۔ پیغمبر کی آنکھ دوسری ہے، امتی کی آنکھ دوسری ہے۔

حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... اسی طرح جب ایک ایک جز اور زندگی کے ایک ایک شعبے میں مماثلت کے دعوے کے ساتھ عدم مماثلت اور امتیازی شان بھی موجود ہے۔ تو اگر ہم یوں کہیں کہ مجموعۂ حیات میں بے شک مماثلت ہے کہ ہم بھی زندہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ ہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو خصوصیات ہیں وہ ہمیں میسّر نہیں۔ تو یہ ہم کہہ سکتے ہیں کیوں کہ زندگی کی ایک ایک جزئی میں امتیازی شان موجود ہے۔

حیات بعد الوفات کا امتیاز...... اسی طرح سے ممات کے بارے میں بھی ہم کہیں گے کہ ممات اور موت کے بعد جو حیات آتی ہے اس میں بظاہر مماثلت ہے لیکن پھر امتیازات ہیں، مرنے کے بعد ہمیں وہ حیات میسر نہیں آسکتی جو انبیاء علیہم السلام کو برزخ کی حیات میسّر آتی ہے۔

علاماتِ حیات...... اور اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ حیات اور زندگی کو پہچاننے کے لئے دو چیزیں ہیں جس سے آدمی

(1) الصحیح للبخاری، کتاب المحاربین، باب کم التعزیر والادب، ص: ۵۷۱، رقم: ۶۸۵۱.

پہچانا جاتا ہے کہ آدمی زندہ ہے۔یعنی حسّی زندگی،ایک تو معنوی زندگی ہے کہ روح موجود ہے،وہ تو ہر انسان کو حاصل ہے،جس کی روح موجود ہے،بس وہ زندہ ہےاورروح کسی کی بھی مردہ نہیں۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان ازلی تو نہیں ہے مگر ابدی ہے۔یعنی ہمیشہ سے تو نہیں تھا، پیدا کیا گیا،لیکن پیدا ہونے کے بعد اب مٹے گا نہیں بلکہ وہ زندہ رہے گا،اس کی حقیقت اور روح قائم رہے گی،چولے اورجسم بدل جائیں گے مگر اصل نفس قائم رہے گا۔تو زندگی کے پہچاننے کی دو ہی علامتیں ہیں ایک کھانا پینا،کھاتا پیتا دیکھ کر ہم کھلے بندوں کہتے ہیں کہ فلاں آدمی زندہ ہے،اور جس کا کھانا پینا بالکل چھوٹ جائے تو ہم یہی کہا کرتے ہیں کہ بھائی!اس کی زندگی کیا،یہ تو عنقریب مرنے والا ہے،اس لئے کہ اس کی زندگی کے اسباب جب مفقود ہوگئے تو زندگی کیا رہے گی،آج مرجائے،تو کھانا حسی اسباب میں بقائے حیات کی علامت ہے۔

دوسری علامت زندگی کی یہ ہے کہ ہم نقل وحرکت دیکھیں۔اگر ایک شخص بے حس وحرکت پڑا ہوا ہے۔ہم اوّل وھلہ میں یہی سمجھیں گے کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔لیکن اگر وہ ھل رہا ہے،حرکت کر رہا ہے،چلتا ہے پھرتا ہے،کبھی یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتے کہ یہ میّت ہے،اس لئے نقل وحرکت زندگی کی بڑی علامتوں میں سے علامت ہے۔تو زندگی کی دو علامتیں ہوئیں۔ایک خوردونوش،کھانا اور پینا،ایک نقل وحرکت چلنا پھرنا،یعنی مختلف افعال کا سرزد ہونا جو حرکت کی علامت ہےاور یہ زندگی کی علامت ہے۔

اب دیکھئے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں فرمایا گیا: ”اَلْاَنْبِيَآءُ اَحْيَآءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ.“ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں حیات ہیں۔کیوں حیات ہیں؟اس کی علامت بتلائی گئی کہ نقل وحرکت پائی جاتی ہے کہ وہ نمازیں پڑھتے ہیں۔تو ایک نقل وحرکت مادی ہے کہ ہم ترکاری خریدنے کے لئے بازار میں جائیں یا پڑھنے کے لئے کسی مدرسے میں جائیں،یہ مادّی حرکت ہےاور نماز پڑھنے لگیں،حرکت یہ بھی ہے مگر یہ روحانی عباداتی حرکت کہی جائے گی جو بازار میں جانے کی حرکت سے یقیناً افضل حرکت ہے۔اور جو کھانے پینے کی حرکت سے یقیناً افضل ہے،کہ اللہ کے آگے جھک رہے ہیں۔تو اس حدیث نے ثابت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں، اس لئے کہ حرکت بدن حیات کے آثار میں سے ہے۔تو حرکت وہ ہے جو کامل ترین حرکت ہے،تو عباداتی حرکت ثابت ہوئی،محض کھانے پینے کی حرکت ثابت نہیں ہوئی۔اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں کہ: ”كَاَنِّيْ اَنْظُرُ مُوْسٰى يُلَبِّيْ.“ ① میں موسیٰ علیہ اسلام کو دیکھتا ہوں کہ ”لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ“ کہتے ہوئے میدان عرفات میں جارہے ہیں تو انبیاء علیہم السلام گویا حج کرتے ہیں۔حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ میں حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھتا ہوں کہ سرخ اونٹنی پر سوار ہیں اوراون اور صوف کی لگام ہاتھ میں ہےاور ”لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ“ پڑھتے ہوئے جارہے ہیں اورحج کر رہے ہیں۔

① الصحیح لمسلم،کتاب الایمان،باب الاسراء برسول. ص:۷۰۷،رقم ۴۲۱.

حدیث میں ہے کہ مطاف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص طواف کررہے ہیں: ''مَرْبُوْعُ الْخَلْقِ '' یعنی چوڑے چکلے بدن ان کا سینہ نہایت چوڑا اور اس قدر خوبصورت اور اتنا شاداب رنگ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''کَاَنَّہٗ خَرَجَ مِنْ دِیْمَاسٍ ...... '' کہ یہ شخص ابھی غسل کرکے حمام سے آیا ہے اور گویا پانی اس کے بالوں سے ٹپک پڑے گا، تو اتنی تروتازہ اور شاداب صورت، چوڑے بدن، میانہ اور ذرا پستی مائل قد اور طواف میں مشغول ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون ہے؟'' عرض کیا کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں''۔ ①

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو طواف کرتے ہوئے دیکھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ''لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ'' پڑھتے ہوئے دیکھا۔ حضرت یونس علیہ السلام کو سرخ اونٹنی پر دیکھا کہ ''لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ'' پڑھتے ہو جارہے ہیں۔ اور عام طور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَآءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ .'' انبیاء اپنی قبور میں سب زندہ ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں۔ تو نماز بھی ثابت ہوئی، حج بھی ثابت ہوا۔ تو بدن کی نقل وحرکت ثابت ہوئی اور وہ حرکت جو عباداتی حرکت ہے، محض آنے جانے کی حرکت نہیں، اس سے کہیں مکمل عباداتی حرکت ہے۔

دوسری حدیث میں ہے: وَنَبِیُّ اللّٰہِ یُرْزَقُ. اللہ کا نبی زندہ ہے اور انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ تو رزق کا دیا جانا خود دلیلِ حیات ہے کیوں کہ کھانا پینا دوسری علامت ہے، اب یہ کہ وہ رزق کیسا ہے؟ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس انداز کا تھا، اس کی کیا کیفیت تھی؟ اس میں پلاؤ زردہ؟ یہ اللہ جانے۔ لیکن رزق بتلایا گیا۔ تو رزق تناول کی چیز ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام گویا تناول بھی کرتے ہیں اور حرکاتِ بدنی بھی ہوتی ہیں۔ تو جیسے حرکات بدنی اعلیٰ قسم کی ہوتی ہیں، جو عباداتی حرکت ہیں، ممکن ہے کھانا پینا اعلیٰ ہی قسم کا ہو جو جنت کی غذا ہو۔ اس دنیا کی مادی غذا نہ ہو۔ تو جب نقل وحرکت بھی ثابت، خورد ونوش اور غذا بھی ثابت ہو تو اب حیات میں کوئی تامل باقی نہیں رہتا، کیوں کہ آثار میں سے یہی دو چیزیں ہیں جو موجود ہیں۔ یہ تو انبیاء علیہم السلام کی حرکتِ بدن اور ان کی حیات ہے۔

حیاتِ شہداء...... اسی طرح سے قرآن کریم نے شہداء کی بھی حیات ثابت کی ہے۔ ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ ② جو اللہ کے راستے میں قتل ہوئے ہیں انہیں مت کہو کہ وہ مردہ ہیں۔ یعنی مردہ تو ہیں نہیں، تمہیں کہنے کی بھی اجازت نہیں کہ یہ ان کے حق میں بے ادبی ہے، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم ان کی حیات کا شعور نہیں رکھتے۔ یعنی اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے کہ کس کیفیت کی زندگی ہے۔ تو قرآن کریم میں شہداء کی زندگی ثابت کی گئی۔

اب کسوٹی پر جانچئے جو ہم نے عرض کی تھی کہ حیات کے پہچاننے کے دو طریقے ہیں، خورد ونوش اور نقل و

① الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب واذکر فی الکتاب مریم، ص: ۲۸۱، رقم: ۳۴۳۷۔
② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۴۔

حرکت کرتے ہیں اور وہاں کی غذائیں کھاتے ہیں۔ تو رزق بھی دیا گیا اور نقل وحرکت بھی پائی گئی۔ مگر فرق کیا ہے۔؟ انبیاء علیہم السلام کی نقل وحرکت عباداتی تھی، معاشی نہیں تھی کہ کھانے پینے کے لئے جائیں، شہداء کی نقل و حرکت کھانے اور پینے کی ہے کہ جاؤ اور جنتوں میں جا کے چرو۔ انبیاء علیہم السلام کو ان کی غذا وہیں پہنچتی تھی، شہیدوں کو غذا حاصل کرنے کے لئے جنتوں کے میدان میں جانا پڑے گا۔ اور چوں کہ بطور جزاء کے جنت میں بھیجا جا رہا اس واسطے پرندوں کا خول دیا گیا، ان کا اصلی بدن نہیں دیا گیا، وہ قیامت کو دیا جائے گا جب بطورِ جزاء کے ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا، تو دونوں چیزیں شہداء کے حق میں بھی ثابت ہوئیں، نقل وحرکت بھی اور خورد و نوش بھی۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں معاشی نقل وحرکت نہیں تھی بلکہ عباداتی تھی، یہاں معاشی نقل وحرکت ہے کہ کھانے پینے کے لئے جائیں وہاں انبیاء علیہم السلام کے پاس رزق پہنچتا تھا، شہداء کے پاس رزق نہیں پہنچتا، رزق کے پاس انہیں پہنچنا پڑتا ہے، چوں کہ انہیں جانا پڑتا ہے تو یہ نمبر دو ہو گئے۔

حیاتِ صلحاء...... اب ایک عامۂ مؤمنین ہیں جن کو صلحاءِ امت کہا جائے گا، اس میں درجہ بدرجہ کچھ گناہ بھی ہیں کچھ نیکیاں بھی ہیں مگر ان پر غلبہ نیکیوں کا ہے، ان کے بارے میں کیا فرمایا گیا؟ ان کو نقل وحرکت کی اجازت نہیں ہے بلکہ وہ علیین کے مقام پر اپنی جگہ موجود ہیں، ان کو جانے آنے کی اجازت نہیں ہے اور روزق کھانے کی بھی ان کو اجازت نہیں، ثابت کیا ہوتا ہے؟ ثابت یہ ہوتا ہے کہ جب ایک میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور سوال و جواب میں وہ پورا اترتا ہے، تو پہلے جہنم کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور اسے وہ ٹھکانا نظر پڑتا ہے، اسے بتلایا جاتا ہے کہ تیرا یہ ٹھکانہ تھا لیکن تو نے چوں کہ صلاح اور نیکی اختیار کی، اللہ نے ہمیشہ کے لئے یہ تجھ پر بند کر دیا۔ پھر ملائکہ جنتوں کا دروازہ کھولتے ہیں، دور سے ان کی رُوح و ریحان اور نعمتیں نظر پڑتی ہیں اور اس کی خوشبوئیں اور لپٹیں آتی ہیں جو دماغ کو معطر کرتی ہیں اور قوت بخشتی ہیں، تو صلحاءِ مؤمنین کو کھلایا پلایا نہیں جاتا تو دور سے دکھلایا جاتا ہے، کھانے پینے کی امید بندھ جاتی ہے اور کچھ خوشبوئیں آتی ہیں جن سے دماغ میں تاثر پیدا ہوتا ہے، تو معدے کے راستے سے کوئی غذا نہیں جاتی بلکہ دماغ میں بسادی جاتی ہے تاکہ دماغ میں اس سے عطریت اور خوشبوئیں پیدا ہو جائیں، نقل وحرکت نہیں کر سکتے کہ جنتوں میں جائیں لیکن دروازے کھول دئے جاتے ہیں کہ دور سے دیکھتے رہیں تاکہ امید قائم رہے، تو یہ حیات ہے مگر یہ بہت ادنیٰ درجے کی حیات ہے۔

موتِ کفار...... اب ایک کفار ہیں، ان پر اتنی پابندی عائد ہے کہ وہ نہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتے ہیں، نہ ان کو حرکت دی جاتی ہے۔ نہ غذا۔ حتیٰ کہ ان کے خیال میں بھی حرکت نہیں، یعنی ان کی قوت خیالی بھی حرکت نہیں کر سکتی۔ قوّتِ خیالیہ اگر حرکت کرے تو کم سے کم آدمی بیٹھ کر سوچتا ہے کہ میں گرفتار ہوں، میری رہائی کی یہ صورت نکل سکتی ہے تو چاہے نہ نکلے، مگر دل میں ایک گونہ تسلی ہوتی ہے، کچھ امید کی رمق ہوتی ہے، اگر میں نے یوں کر لیا تو شاید میں چھوٹ جاؤں۔ تو جہنمیوں کو اس کی بھی اجازت نہیں ہوگی کہ قوتِ فکریہ کو بھی حرکت دے سکیں۔ ان کا خیال بھی محبوس

اور مقید ہوگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ رہائی کیا صورت ہوسکتی۔ تو نہ بدن نقل وحرکت کرے گا، نہ خیال نقل و حرکت کرے گا۔ نہ غذا ملے گی اور نہ غذا کا تصور ملے گا۔ تو حقیقی معنی میں اگر میت کہا جائے، تو کفار کو کہا جائے گا۔ کہ وہ صحیح معنی میں میت ہیں کہ نہ نقل وحرکت کی اجازت، نہ معنوی، نہ مادی، نہ حسی، اور نہ کھانے پینے کی اجازت۔

مراتبِ حیات...... باقی حیات عوام مومنین کے لئے ثابت۔ شہداء کے لئے بھی اور انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی، لیکن درجہ بدرجہ، غرض حضرات انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں۔ ان کی نقل وحرکت عباداتی ہے اور غذا ان کی خدمت میں پہنچائی جاتی ہے۔ شہداء زندہ ہیں، ان کی نقل وحرکت مادی ہے، ان کو غذا دی جاتی ہے، مگر غذا کے پاس ان کو جانا پڑتا ہے، عوام مومنین کو نقل وحرکت کی اجازت نہیں۔ وہ اپنے مقام پر رہیں۔ مگر احترام سے رکھے جاتے ہیں اور جنت کی نعمتیں دکھلا دی جاتی ہیں تاکہ ان کی قوت خیالیہ منبسط ہو جائے اور اعلیٰ درجے کی توقعات باندھیں کہ اب قریب میں وہ وقت آنے والا ہے کہ ان شاء اللہ ہم ان نعمتوں میں پہنچیں گے۔ تو نعمت سے بڑھ کرا میدِ نعمت ہوتی ہے، توقع لگی ہوئی ہے کہ اب وہ نعمت چند منٹ کے بعد ملی، اب وقت آیا کہ یہ نعمت مجھے ملی، تو مومنین کی قوتِ خیالیہ پر پابندی عائد نہیں ہے۔ ان کی قوت خیالیہ آزاد ہے، وہ اس سے لذت لیتے ہیں۔ تو یہ لذت انہیں ملتی ہے۔ یہ حیات کے تین درجے ہوگئے، اس معیار سے کہ زندگی کے پرکھنے کا معیار اور کسوٹی نقل وحرکت اور خورد ونوش ہے تو اقویٰ ترین حیات انبیاء علیہم السلام کی ثابت ہوئی۔

متوسط حیات شہداء کی ثابت ہوئی۔ ادنیٰ حیات صلحاء کی ثابت ہوئی، جس جس درجے کی یہ حیات ہے، اسی درجے کے اثرات بھی ہیں، دنیا تک اس کے اثرات پہنچے ہوئے ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات اتنی کامل ہے کہ اقویٰ ترین ہے، دنیا میں اس کا اثر یہ ہے کہ دنیا سے جا چکے ہیں لیکن ان کی بیویاں بیوہ نہیں ہوئیں، دوسرے خاوندوں سے نکاح نہیں کرسکتیں۔ دنیا سے جاچکے ہیں لیکن ان کے مالوں میں میراث تقسیم نہیں ہوسکتی، کیوں کہ زندہ کے مال میں میراث تقسیم نہیں ہوتی، تو ان کے مال بھی میراث سے مستثنیٰ اور ان کی بیویاں بھی زوجیت اور نکاح سے مستثنیٰ۔

شہداء کے اندر یہ بات نہیں ہے کہ ان کی بیویوں کا نکاح نہ ہوسکے۔ ان کے مال میں میراث تقسیم نہ ہوسکے، یہ تو سب ہوگا۔ لیکن ان کے بدنوں کو کچھ ایسی قوت دی جاتی ہے کہ دنیا کے اندر بھی ان کے کچھ ابدان محفوظ رہتے ہیں اور اگرچہ نصِ صریح سے ثابت نہیں مگر تم بات سے اتنا ثابت ہے کہ اصلحاء کے بدن بھی محفوظ رہتے ہیں ان میں تغیر بہت کم سے کم ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔

اور عوام مومنین کا دنیا کے اندر کوئی اتنا اثر نہیں ہے۔ ان کے بدن بھی مٹی ہوجاتے ہیں اور گل جاتے ہیں۔ تو جس جس درجے کی حیات برزخ میں ہے، اسی اسی درجے کے آثار دنیا کے اندر پائے جاتے ہیں، اس لئے دنیوی معیار سے دیکھا جائے تو حیات کے مراتب ہیں اور حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی حیات سب سے زیادہ قوی ہے۔

اس سے اتنا معلوم ہوا کہ عام لوگوں کی سی حیات برزخ میں نہیں ہے، جب کہ دنیا کے اندر بھی انبیاء علیہم السلام کی حیات عام لوگوں جیسی نہیں تھی۔ یہاں حیات کی نوعیت دوسری ہے۔

ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز...... عام طور سے ولادت ہوتی ہے، بچہ ماں کے پیٹ سے نکل آیا، روتا ہوا اور اوندھا نکلا۔ اور حدیث میں ہے کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اس طرح سے ہوئی کہ ماں کے پیٹ سے برآمد ہوئے، چہرۂ مبارک آسمان کی طرف تھا، شہادت کی انگلی اٹھی ہوئی تھی، گویا وحدانیت کا اعلان فرماتے ہوئے تشریف لائے۔ کوئی آلائش نہیں ہوئی۔ نو کے نو مہینے ماں کے پیٹ میں کوئی بوجھ نہیں رہا۔ ہلکا پھلکا رہا، پھر انوار و برکات ظاہر ہوئے کہ پیدائش کے وقت اتنا نور نکلا کہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں نے اس نور اور چاندنے کی روشنی میں شام کے محل دیکھ لئے، تو عام طور سے ولادت کی یہ صورت نہیں ہوتی۔ ولادت آپ کی بھی ہوئی۔ لوگوں کی بھی ہوتی ہے، مگر باوجود اس مثلیت کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت میں اور عام لوگوں کی ولادت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

طفولیت کا امتیاز...... اسی طرح سے طفولیت کی زندگی عام بچوں کی بھی ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بھی ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ہوئی۔ لیکن اس طفولیت میں بھی وہ امتیازات ہیں کہ دنیا کے اطفال کو وہ نصیب نہیں۔ کہیں شق صدر ہو رہا ہے۔ کہیں برکتوں کے آثار نمایاں ہیں کہیں حلیمہ سعدیہ کی وہ اونٹنی جس پر وہ سوار ہو کر جا رہی تھی، باوجود لاغر ہونے کے اتنی تیز دوڑنے لگی کہ بڑے بڑے گھوڑے پیچھے رہ گئے۔ قحط سالی عام تھی، دودھ پلانے کے لئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر پہنچیں تو اس سال اتنے پھل آئے کہ اس سے پہلے اتنے پھل کبھی نہیں آئے تھے۔ تو یہ برکات بھی ہیں جو عام نہیں ہیں۔

حیاتِ برزخ کا امتیاز...... اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی دیکھی جائے تو جوان اور بھی ہوتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہوئے لیکن پھر جوانی میں زمین آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے کہ اس کے آثار و برکات جداگانہ ہیں۔

حواس کو دیکھا جائے تو جیسے میں نے عرض کیا کہ ہم حاسۂ بصر سے سامنے کی چیز دیکھتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آمنا سامنا اور پیچھے دونوں کی چیزیں دیکھتے تھے۔ ہمارا حاسۂ بطش اور ہاتھ کی قوت فقط سختی اور نرمی کو پہچانتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کی قوت معنویت اور شرح صدر کی کیفیت بھی پیدا کر دیتی تھی۔ ہماری زبان مادی زبان ہے مگر چکھتی ہے تو کھٹا میٹھا محسوس ہوتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک حلال و حرام کا بھی پتہ چلا لیتی ہے۔ تو باوجود مثلیت کے بہت سی خصوصیات ہیں کہ جن پر نبی کو غیر نبی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح سے برزخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات نہایت قوی اور اکمل ہے کہ دنیا سے بھی قوی ہے۔ لیکن اس کے باوجود کیفیت ہم نہیں بیان کر سکتے۔ احادیث سے جتنے قرائن بیان کر سکتے ہیں، وہ بیان کر دیئے گئے۔ اب اس کا ادراک کرنا کہ نوعیت کیا ہے۔ یہ ہماری قدرت سے خارج ہے، یہ خلاصہ ہے۔

نوعیتِ حیات...... اب اس میں علماء کے دو مسلک ہیں۔ اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں، لیکن بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات کے بعد پھر حیات دی گئی ہے، اور وہ ایسی دی گئی جیسے دنیا کی حیات تھی لیکن وفات اور قبض روح کے بعد دی گئی۔

اور وہ یہ کہ ہر انسان کو وفات دے دی جاتی ہے اور روح قبض ہو جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وفات دی گئی۔ اور روح قبض ہوئی، اب جب قبر مبارک میں پہنچے تو وہاں جا کر عامۂ مومنین کی شان یہ ہے کہ انہیں پھر زندہ کیا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو بھی کہتے ہیں کہ قبر میں پھر زندہ کئے گئے۔ عامۂ مومنین کا یہ حال ہے کہ اس زندگی کے بعد پھر موت دے دی جاتی ہے۔ پھر قیامت کو حیات دی جائے گی۔ انبیاء علیہم السلام اس موت سے مستثنیٰ ہیں، جب قبر میں زندہ ہوئے، اب قیامت تک بلکہ ابدالاباد تک زندہ رہیں گے۔ اب موت نہیں آئے گی۔ اسی کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ نے آپ کو اس سے مکرّم بنایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر دو موتیں طاری کرے، بس وہ ایک ہی موت ہے جو آئی۔ اس کے بعد اب جو زندگی آئی ہے تو ابدی زندگی ہے، پھر موت نہیں ہے''۔

اور عوام مومنین پر دو موتیں طاری ہوتی ہیں۔ ایک یہاں جس کو ہم موت کہتے ہیں، ایک عالم برزخ میں کہ زندہ کرنے کے بعد پھر موت دے دی جاتی ہے، اور فرما دیا جاتا ہے: ''نَمْ کَنَوْمَةِ الْعُرُوْسِ'' ① اس طرح سو جاؤ جس طرح دلہن سوتی ہے۔

تو ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام حیات ہیں، ان کی بالکل دنیوی حیات ہے، مگر موت سے انقطاع واقع ہوا اور بعد میں جو حیات آئی، وہ ویسی ہی تھی جیسی دنیا میں تھی مگر وہ ابدی ہے۔ اور ایک جماعت علماء کرام کی یہ کہتی ہے کہ بیچ میں موت کا واسطہ آیا۔ لیکن اس سے سلبِ روح نہیں ہوا۔ یعنی موت واقع ہوئی۔ اس واسطے کہ موت تو قطعی ہے قرآن کریم نے شہادت دی ہے: ﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾ ②

تو موت واقع ہوئی۔ لیکن موت واقع ہونا اور ہے اور سلبِ حیات اور ہے۔ موت واقع ہوا اور حیات کلیۃً سلب نہ ہو، یہ ممکن ہے، اس واسطے کہ موت عارضی طور پر واقع ہوئی۔ اور حیات انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں ڈال دی گئی تھی، تو وہ کلیۃً سلب نہیں ہوئی گو موت بھی واقع ہوئی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسا کہ پانی۔ تو پانی کی ذات میں ٹھنڈک ہے کہ وہ آگ آئے تو اسے بجھا بھی دیتا ہے۔ لیکن پانی میں عارضی طور پر حرارت پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر آپ اسے آگ پر تپا دیں تو وہ کھول کر اتنا گرم ہو جائے گا کہ جو کام آگ کرتی ہے وہ پانی کرے گا، لیکن اس حالت میں بھی اگر اسے آگ کے اوپر ڈال دیں تو آگ کو بجھا دے گا، معلوم ہوا پانی کے اندر ذاتی برودت باوجود انتہائی گرم ہونے کے موجود ہے، اگر انتہائی گرم ہو کر پانی کی حقیقت اس کے اندر سے نکل جاتی تو آگ کو بجھا نہ سکتا،

---

① جامع الترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی عذاب القبر، ج: ۴ ص: ۲۳۷. حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی، ج: ۳، ص: ۱۷، رقم: ۱۰۷۱. ② پارہ: ۲۳، سورۃ الزمر، الآیۃ: ۳۰.

لیکن کھولتا ہوا پانی بھی آگ کو بجھاتا ہے، معلوم ہوا کہ برودت کا مادہ موجودہ ہے، جو اس کے اصل جوہر میں قائم تھا، وہ نہیں نکلا اور اوپر سے حرارت بھی موجود ہے۔

تو انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں حیات رکھی جاتی ہے۔ موت جب طاری ہوتی ہے تو کلیتہً حیات سلب نہیں ہوتی۔ تو موت بھی ہے اور حیات بھی ہے۔ دونوں جمع ہیں جیسے گرم پانی میں برودت بھی اور حرارت بھی دونوں جمع ہیں، ایک اصلی ہے اور ایک عارضی ہے۔ غرض ایک جماعت علماء کرام کی اس کی قائل ہے کہ موت واقع ہوئی مگر سلبِ حیات واقع نہیں ہوا بلکہ حیات موجود رہی۔ اس کے آثار موجود رہے کیوں کہ وہ اصلی تھی اور موت صرف عارضی طور پر طاری ہوئی۔ تو اس میں دونوں کا اتفاق ہے کہ برزخ کے اندر حیات ہے اور ویسی ہے جیسے دنیا کی لیکن ایک کہتے ہیں کہ وہ مستمر حیات ہے اور ایک کہتے ہیں کہ وہ منقطع ہو کر پھر پیدا ہوئی ہے، نتیجہ دونوں ایک رائے رکھتے ہیں کہ حیات وہی ہے جو دنیوی حیات ہے۔

سلامتی کا راستہ...... یہ علماءِ کرام کا اختلاف ہے، اس میں ہمیں نہیں پڑنا چاہئے۔ ہمارے لئے اتنا کافی ہے کہ ہم یوں کہیں کہ برزخ میں انبیاء علیہم السلام اسی طرح حیات ہیں، جس طرح ہم دنیا میں حیات ہیں۔ اب یہ کہ وہ حیات از سرِ نو آئی یا وہ پہلی ہی چل رہی ہے، یہ علماء پر موقوف ہے، ان کی آراء ہیں، ان کی وجوہ ہیں۔ ان کے قرائن اور دلائل ہیں، نہ ہم انہیں توڑ سکتے ہیں نہ ان کا خلاف کر سکتے ہیں، ہم گردن جھکائیں گے۔ بس اس قدرِ مشترک کے قائل ہو جائیں گے کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں، کیفیت ہم نہیں جانتے کہ کس طرح سے زندہ ہیں۔

جو علماء یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ہی موت طاری ہوئی اور اس کے بعد جو حیات آئی وہ مستمر اور دائمی ہے جیسا کہ وہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے مقولے سے استناد کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت ہے، عوام مومنین کی یہ صورت نہیں ہے، ان پر دو موتیں طاری ہوتی ہیں۔ پہلی موت تو وہ جس کہ ہم احتضار کہتے ہیں کہ ایک آدمی انتقال کر جائے۔ دوسری موت وہ جو قبر میں سوال و جواب کے بعد کہ دیا جاتا ہے۔ ”نَمْ كَنَوْمَةِ الْعُرُوْسِ “ اور قرآن کریم میں جو فرمایا گیا: ﴿ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ﴾ ① یہاں موت کے معنی سلبِ حیات کے نہیں ہیں، یہاں موت کے معنی عدمِ ایجاد کے ہیں، یعنی تمہیں وجود نہیں ملا تھا۔ عرفِ عام میں تو موت اسی کو کہتے ہیں کہ حیات چھین لی جائے یا اس میں کمی کر دی جائے، تو ظاہر ہے جو ابتدائی موت ہے وہ عدم ہے، اس کو آپ موت کہہ رہے ہیں اور قرآن کریم نے جو موت کہا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ حیات چھینی گئی بلکہ یہ ہیں کہ اس وقت تک حیات دی نہیں گئی تھی، البتہ۔ ﴿رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ﴾ ② ”دو موتیں مراد ہیں، ایک دنیوی موت اور ایک وہ جو قبر کے اندر حیات کے بعد واقع ہوگی“

انکشافِ برزخ...... شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ”اَنْفَاسُ الْعَارِفِيْنَ“ میں اپنے والد بزرگوار شاہ

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۸۔ ② پارہ: ۲۴، سورۃ الغافر، الآیۃ: ۱۱۔

عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں سے ایک خادم جن کا نام عاشق ہے، کے بارے میں لکھا۔ یہ وہی عاشق ہیں جو ''حُجَّۃُ اللّٰہِ الْبَالِغَۃ'' کے لکھنے کے محرّک بنے ہیں۔تو''اَنْفَاسُ الْعَارِفِیْن '' میں ایک واقعہ لکھا ہے جو شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ نے تحریر فرمایا ہے کہ میں جنگل میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ چند سوار گھوڑوں پر اچھا فاخرہ لباس پہنے ہوئے اور بڑے اچھے شاندار گھوڑے اور چلے آرہے ہیں مگر ہر سوار کی کچھ ایسی شکل ہے جیسے کوئی متجسّس ہوتا ہے اور ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ میں قریب سے گزرا تو ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ کیا تم نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر تشریف لائے ہیں؟ میں نے عرض کیا۔کیا آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں۔آپ کون ہیں؟ اس نے کہا۔میرا نام ابو ہریرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے اور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں عاشق کا قرآن کریم سننے کے لئے جارہا ہوں۔ان کی تلاش میں ہم نکلے ہیں۔

یہ کہہ کر وہ سوار غائب ہوگئے۔تو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ اپنے والدِ بزرگوار کی طرف منسوب کیا۔ ہوسکتا ہے کہ واقعہ عالم برزخ میں پیش آیا ہو۔لیکن بعض دفعہ عالم برزخ منکشف ہو جاتا ہے اور اس کی صورتیں ہمیں اس جہان میں بیٹھ کے نظر آتی ہیں۔تو یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ برزخ سے نکل کر یہاں پہنچتے ہیں۔ بلکہ ہماری نگاہ برزخ تک پہنچ جاتی ہے۔اور وہاں کے احوال منکشف ہو جاتے ہیں۔

انکشافِ سجّین ...... جیسا کہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بہت محدّ ثانہ روایات سے اس قسم کے واقعات ''کتاب الروح ''میں نقل کئے ہیں۔ایک جگہ مثلاً لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک اونٹنی پر سوار ہو کر سفر کر رہے تھے، جس وقت بدر کے اس مقام کے قریب پہنچے جس میں کفار کی لاشیں ڈالی گئی تھیں تو مغرب کا سا وقت ہو گیا تھا۔تو دیکھا کہ بدر کے کنویں میں سے ایک نہایت ہی سیاہ فام اور بدہیئت شخص نکلا اور اس شان سے نکلا کہ بے حد ہی کریہۃ المنظر اور ڈراونی صورت۔اور وہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف دوڑا اور کہا۔ ''یَا عَبْدَ اللّٰہِ اِسْقِنِیْ ......'' یہ کہہ رہا تھا کہ کنویں کے اندر سے ایک زنجیر پیدا ہوئی اور اس کے پیروں میں جکڑی گئی اور اسے نیچے کی طرف جذب کرلیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس واقعہ کو دیکھ کر بے ہوش ہوگئے ،اور اونٹنی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بالکل حمائل ہوگئے۔اونٹنی وہاں سے بھاگی اور انہیں مدنیہ لے کر پہنچی۔ جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہوش میں لائے گئے تو واقعہ سنایا۔تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے آرڈر جاری کیا کہ کوئی شخص رات کے وقت بالکل تنہا سفر نہ کرے۔بالخصوص جب کوئی رفیق سفر ساتھ نہ ہو۔اس قسم کے واقعات پیش آجاتے ہیں۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ سجّین سے نکل کر دنیا میں آگیا،لیکن سجّین منکشف ہو گیا۔اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے وہ سارا واقعہ دیکھا جو سجّین میں پیش آرہا تھا۔غرض اس قسم کے واقعات حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بکثرت نقل کئے ہیں۔اور

محدّثانہ انداز سے بھی نقل کئے ہیں۔

عالمِ منام...... نیز بہت سے منامات بھی نقل کئے ہیں۔ جیسے ابن ابی الدنیا جو مشہور محدّث ہیں، ان کا واقعہ نقل کیا ہے، کسی عارف نے ایک شخص کو خواب میں دیکھا۔ اور وہ شخص بھی عارفین سے میں تھا۔ ان سے پوچھا کہ تم پر کیا گزری؟ اور تم پر کیا گزری ہے تو انہوں نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ دنیا والوں کو جزائے خیر دے کہ اجر وثواب کے ڈھیر کے ڈھیر ہمارے پاس بھیجتے ہیں۔ جو ہمارے پاس پہاڑوں کی طرح لگ جاتے ہیں''۔ اور اس کے بعد انہوں نے کہا۔ ہمارا معمول یہ ہے کہ ہم ہفتے میں ایک بار ابن ابی الدینا کی مجلس میں حاضر ہوتے ہیں اور وہاں پہنچ کر یہ تحائف ہم کو ملتے ہیں جو دنیا والے ہمارے پاس بھیجتے ہیں۔ غرض کچھ خوابیں اور منامات اور کچھ محدّثانہ روایتیں، ان سے اس قسم کے واقعات کا پتہ چلتا ہے۔

مقامِ میّت کا انکشاف...... ایک واقعہ میں نے اپنے فارسی کے استاذ مولانا محمد یٰسین صاحب مرحوم سے خود سنا، جو آپ کے پاکستان کے مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب (مرحوم) ان کے والد ماجد تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند میں فارسی کے استاذ تھے اور فارسی کے بڑے ماہر تھے۔ تو وہ ہمارے بھی استاذ بھی تھے۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔ اس واقعہ کا حاصل یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا سید احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مدرس تھے اور عالم جید تھے کہا جاتا تھا کہ وہ فنون معقولہ کے امام تھے اور بہت ہی ذکی تھے۔ آپ چھ مہینے تک دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرّس بھی رہے۔ ان کے صاحبزادے تھے جن کا نام مولوی مصطفیٰ تھا۔ اور ہمارے ہی استاذ حضرت مولانا یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم جماعت تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ مولوی مصطفیٰ صاحب نے ان سے اپنا واقعہ بیان کیا اور مولانا محمد یٰسین صاحب مرحوم نے مجھ سے بیان کیا۔ بس راوی بیچ میں ہمارے اور صاحبِ واقعہ کے مولانا محمد یٰسین صاحب ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ: ''مولوی مصطفیٰ جب دہلی وطن پہنچے تو یہ وہ زمانہ تھا جب جمنا میں بہت بڑا سیلاب آیا۔ اور جمنا کے کنارے کچھ قبرستان تھے تو ان میں سے بہت سی قبریں بہہ گئیں، ایک قبر جو ٹوٹی تو اس کی مٹی بہہ گئی اور اس کی لاش نمایاں ہوگئی۔ پانی تو ہٹ گیا لیکن وہ لاش رکھی ہوئی ہے۔ مولوی مصطفیٰ صاحب کا بیان یہ ہے کہ اس لاش کے دیکھنے کے لئے آس پاس کے بہت سے دھوبی جو کپڑے دھو رہے تھے، وہاں آ کر جمع ہوگئے۔ اور شہرت جو ہوئی تو شہر سے بھی لوگ آئے''۔ ''اس کی کیفیت انہوں نے یہ دیکھی کہ اس لاش کی پیشانی پر ایک چھوٹا سا کیڑا بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ تھوڑی دیر کے بعد ڈنک مارتا ہے، جب ڈنک مارتا ہے تو لاش ایک دم لرز جاتی ہے اور ایک رنگ آتا اور ایک جاتا ہے۔ اور کئی منٹ بعد لاش اصلی حالت پر آتی ہے۔ جب اصلی حالت پر آئی، پھر اس نے ڈنک مارا، پھر اسی طرح لرز گئی۔ یہ انہوں نے تماشا دیکھا۔ اس میں کسی دھوبی نے اس لاش پر رحم کھا کر ایک کنکری زور سے کیڑے کے ماری۔ وہ کنکری کیڑے کے تو نہیں لگی۔ لیکن کیڑے کے پاس جا کر لگی۔ تو ایک دم اچٹ کر کیڑا اٹھا اور اس دھوبی کی پیشانی پر آ بیٹھا اور اسے ڈنک مارا۔ اور اسے ڈنک ما کر پھر اس لاش کے اوپر جا بیٹھا''۔

مولوی مصطفی صاحب کا بیان یہ ہے کہ وہ دھوبی چلایا اور اس نے کہا: کچھ عجیب قسم کی آگ میرے اندر ہے کہ نہ میں یہ کہہ سکوں کہ سانپ نے کاٹا۔ نہ یہ کہہ سکوں کہ بچھونے کاٹا۔ نہ یہ کہہ سکوں کہ آگ میں جلا، کہہ کچھ نہیں سکتا کہ وہ کس قسم کی گرمی ہے، مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر رگ میں ہزاروں بچھو پڑے ہوئے ہیں جو ڈنک مار رہے ہیں'' ۔خیر اس کے ہاتھ وغیرہ باندھے گئے ،اب مجمع بدستور ہے۔تو مولوی مصطفی صاحب کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے یہ سمجھا کہ کیڑا کوئی عالم مادّی کی چیز نہیں ہے، یہ کوئی عذاب خداوندی ہے جو اس میت پر ہے ،تو بجائے اس کے کہ اسے کنکر مارتا۔ میں نے اس میت کے قریب بیٹھ کر سورہ یسین پڑھنی شروع کی ۔اس کے علاوہ کچھ قرآن شریف کی آیتیں اور سورتیں جو مجھے یاد آئیں، جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں۔ وہ کیڑا مضمحل ہوتا جاتا ہے۔تقریباً آدھ گھنٹہ میں نے تلاوت کی۔ وہ کیڑا بالکل مضمحل ہو کر ایسا رہ گیا جیسے راکھ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہم نے اس میت کو دفن کر دیا۔ اور وہ دھوبی دو تین دن زندہ رہا اور یہ کہتا تھا کہ میں اپنے کرب و بے چینی کا بیان نہیں کر سکتا۔

تو یہ اسی قسم کے واقعات ہیں کہ یہ معاملات تو برزخی ہیں لیکن برزخ دنیا میں نہیں آتا۔ نہ میّت اپنے مقام پر چھوڑ کر آتی ہے۔ وہ اپنے مقام پر رہے لیکن کبھی کبھی حق تعالیٰ عالم برزخ کی چیزیں منکشف فرما دیتے ہیں اور انسان واقعات دیکھنے لگتا ہے۔تو وہ برزخ کی چیزیں اسی طور پر دیکھ رہا ہے جیسا کہ خواب میں ہم دوسرے عالم کی چیزیں دیکھتے ہیں۔ جیسے عالمِ مثال خواب میں دنیا میں نہیں آتا۔لیکن دنیا والے بعض اوقات سو کر عالمِ مثال کے اندر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں کے واقعات دیکھتے ہیں۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا اَلنَّوْمُ اَخُ الْمَوْتِ ① نیند جو ہے یہ موت کی بہن ہے، یعنی جو کیفیات موت میں آتی ہیں، وہی نیند میں طاری ہوتی ہیں قوّت وضعف اور دوام وعدمِ دوام کا فرق ہے۔تو سونے والا جب خواب دیکھتا ہے اور یہ دیکھے کہ میں کسی شدید عذاب میں مبتلا ہوں اور لوگ مجھے مار رہے ہیں اور ڈنڈوں سے خبر لے رہے ہیں۔ بعض مرتبہ وہ خواب میں چلاتا ہے اور چلاتے ہوئے بعض اوقات اس کی آواز جاگنے والے سن لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں! کیا ہوا؟ وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈراؤنا خواب دیکھا۔تو ہم نے نہیں جانا وہ کہاں گیا تھا حالاں کہ وہ اس عالم میں گیا اور وہاں تکلیف اٹھائی مگر اس عالم میں اتنا چلایا کہ اس عالم کے اندر اس کی آواز منتقل ہوگئی۔اور اس عالم والوں نے اس کی آواز کو سن لیا، اس لئے بعض برزخ کی آوازیں شروع وہاں سے ہوتی ہیں مگر ہمارے کانوں تک آ کر منتہی ہو جاتی ہیں۔تو جب بیداری میں یہ صورت ممکن ہے کہ عبرت کے طور پر خواب والا ایک دوسرے عالم میں ہو اور وہاں کی چیزیں ہم یہاں دیکھ لیں یا سن لیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ میّت اپنے مقام پر ہو اور اس کا عذاب یا ثواب بعض دفعہ دیکھنے والے دیکھ لیں۔ خواہ خواب میں دیکھیں یا کشفی نگاہ سے

① البعث والنشور للامام البیهقی ،باب قول الله تعالی: لا یذوقون فیها الموت، ج: ۱، ص: ۴۵۲، رقم: ۴۲۴.

دیکھیں۔ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ تو اس کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عالم برزخ سے کسی کی روح منتقل ہو کر دنیا میں آ گئی۔ یا کوئی یہاں چلا آیا۔ یہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مقام پر ہے، البتہ اس کا مقام یہاں منکشف ہو گیا۔

تعددِ ارض وسماء...... ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ ① اللہ تعالیٰ نے سات آسمان پیدا کئے اور اس کے مثل سات زمینیں پیدا کیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر میں یہ بات بھی ہے کہ ہر زمین میں آبادی ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام بھی آتے ہیں۔ یہ روایت ہے، اب یہ کہ وہاں یہی چاند سورج کام دیتا ہے یا وہاں کا چاند سورج الگ ہے۔ یہ تو اللہ ہی جانے۔ جب کہ دنیا کے بہت سے خطوں کے بارے میں بھی آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہاں اسی سورج کی روشنی پہنچتی ہے یا نہیں۔ اگر آپ قطبین کے قریب آبادیاں دیکھیں، وہاں چھ چھ اور نو نو مہینے کی رات ہوتی ہے۔ سورج نکلتا ہی نہیں۔ وہاں لوگ اندھیرے میں بسر کرتے ہیں۔ اب رہا یہ کہ وہ چراغ جلاتے ہیں یا کیا کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی کرتے ہوں بہرحال اس زمین پر بھی ایسے مواقع ہیں کہ وہاں اس سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ یا پہنچتی ہے تو کئی مہینوں میں جا کر۔ جو سورج اس زمین پر پورا کام نہ دے سکے، اس کے بارے میں آپ یہ کہیں کہ ساتوں زمین میں وہی کام دے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ کام دے۔ اللہ کے علم میں ہے کہ وہاں شاید کوئی اور سورج ہو۔

میّت کا علم وادراک...... مسند ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خود روایت ہے۔ جہاں قبور کے آداب زیارت لکھے ہیں کہ میت کی زیارت اس طرح کی جائے کہ قبلہ کو پشت کی جائے اور میت کی طرف رخ کیا جائے۔ اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے۔ اور درجہ بدرجہ تعارف بھی ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں وہ شخصی طور پر پہچانتا تھا تو وہاں بھی شخصی طور پر پہچانے گا۔ کوئی عمومی طور پر پہچانتا ہے تو وہاں بھی عمومی طور پر پہچانے گا۔ جہاں مواجہہ ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے۔

ملائکہ علیہم السلام کے ذریعے روح کو متوجہ کرا دیا جاتا ہوگا۔ جیسا کہ آپ مثلاً جاگ رہے ہیں۔ آنکھ کھلی ہوئی ہے مگر خیال دوسری طرف ہے تو باوجود یہ کہ آنکھ کھلی ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے۔ بعض دفعہ ہم بازار جاتے ہیں، آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور ایک بڑا تماشا گزر رہا ہے۔ جب گھر آتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ کیسا تماشا گزرا؟ آپ کہتے ہیں کہ کیسا تماشا؟ کہ وہی جو بازار میں تھا۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے تو نہیں دیکھا۔

لوگ کہتے ہیں۔ میاں تم آنکھیں کھولے ہوئے تو جا رہے تھے۔ آپ کہتے ہیں۔ واللہ، مجھے تو خبر نہیں۔ اس وقت آپ کہتے ہیں کہ اوہ! میرا دھیان دوسری طرف تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیکھنے والی آنکھ نہیں ہے بلکہ دھیان دیکھتا ہے۔ اگر دھیان دوسری طرف ہو آنکھ کھلی رہے گی۔ آپ کبھی نہیں دیکھ سکیں گے، متوجہ ہو جائیں، وہی آنکھ دیکھنے لگے گی۔ اگر آپ غیر متوجہ ہیں۔ کان کھلے ہوئے ہیں۔ آپ کو آواز نہیں آئے گی۔ توجہ کر لیں تو کانوں میں

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۱۲۔

آواز آنی شروع ہو جائے گی، بعض اوقات آپ آذان کی آواز نہیں سن پاتے، خیال دوسری طرف متوجہ ہے، آپ اسی میں مستغرق ہیں، تو قوتِ خیالیہ کو اگر ان حواس کی طرف متوجہ کر لیا جائے تو وہ ادراک کرنا شروع کرتی ہے۔ اگر متوجہ نہ کیا جائے تو وہ ادراک نہیں کرتی تو ہوسکتا کہ ملائکہ کے ذریعے سے میت کو توجہ دلا دی جاتی ہو جب متوجہ ہوا تو اس کی قوت خیالی اور حسّی کام کرنے لگتی ہے، نہ متوجہ ہوا، نہیں کرتی اور یہ جب ہوتا ہوگا جب کوئی جا کر سلام کرے۔ مطلقاً نہیں کہ جو قبرستان سے گزرے میت متوجہ ہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلام کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔

علیّین وسجّین کا مقام...... علیّین کا آپ اپنے ذہن میں یہ جغرافیہ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ ساتویں آسمان میں ہے۔ علیّین اور سجّین یہیں کھپا ہوا ہے، جیسا کہ ہماری روح بدن میں کھپی ہوئی ہے۔ اگر بدن کو الگ کر دیا جائے اور روح دیکھنے کا کوئی آلہ ہو تو روح کے واقعات آپ کو یہیں نظر آئیں گے۔ اسی طرح علیّین اور سجّین کے مقامات اسی عالمِ عنصری میں عالمِ روح کی طرح کھپے ہوئے ہیں۔ حجابات پڑے ہوئے ہیں۔ اگر حجابات اٹھا دیئے جائیں۔ وہ سارا ثواب وعذاب آپ کو یہیں نظر پڑے گا۔ اوپر نہیں جانا ہوگا۔ غرض یہ تو ایک نگاہ کی چیز ہے کہ نگاہ جغرافیہ بنا لیتی ہے کہ جب علیّین اور سجّین ہیں۔ تو وہ ساتویں آسمان کے اوپر ہوں گے، یہ ضروری نہیں، وہ یہیں کھپے ہوئے ہیں، مادّی حجابات میں غرق ہیں۔ اگر وہ اٹھا دیئے جائیں آپ دیکھنے لگیں گے۔

حجیتِ کشف...... بعض اہل اللہ پر عذابِ قبر منکشف بھی ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جب شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو اتنی مقبولیت تھی کہ مجھے منکشف ہوا کہ اس روز دہلی کی ساری قبروں میں سے عذابِ قبر اٹھا دیا گیا تھا۔ اتنی تکریم ہوئی۔ اب یہ انکشاف کی بات ہے، کوئی حجتِ شرعی تو نہیں تھی۔ آخر انکشاف ہے۔ کشف بھی کوئی رد کرنے کی چیز تو ہے نہیں۔ زیادہ سے زیادہ حجتِ شرعی نہیں۔ نفس وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور صوفیاء تو یہ بھی کہتے ہیں کہ کشف دوسرے کے لئے حجت نہیں مگر اپنے نفس کے لئے حجت ہے، جب آدمی قطعی طور پر دیکھ رہا ہے۔

نیز یہ کہتے ہیں کہ اس حجت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اگر اس کے مقتضٰی پر عمل نہ کیا تو آخرت کا کوئی نقصان نہیں۔ اس لئے کہ آخرت کے نفع ونقصان کا تعلق نصوص سے ہے، کشوف سے نہیں، لیکن دنیا میں کوئی نقصان ضرور پہنچ جائے گا۔ ایک چیز واقعی تھی، اس کو دکھلائی گئی۔ اس کے تقاضوں پر عمل نہ کیا تو اس کا نقصان پہنچے گا مگر دنیوی۔ اخروی کوئی ادنیٰ نقصان نہیں ہوگا۔ یہ علیّین اور سجّین کی بارے میں جغرافیہ کی بحث ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعتِ اسلام کا تو یہ موضوع نہیں البتہ اربابِ کشوف اس کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں، وہ اگرچہ حجت تو نہیں۔ لیکن اگر خلاف میں کوئی دلیل قائم نہ ہو تو قابلِ رد بھی نہیں مانی جاسکتی ہے۔

جنت وجہنم کا جغرافیائی مقام...... حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں اتنا لکھا ہے کہ یہ آسمان سے لے کر زمین تک اور نچلی زمین تک، یہ سارا علاقہ جہنم کا ہے اور قیامت کے دن آگ سے یہی

علاقہ تپے گا۔ اور اسی میں وہ سانپ اور بچھو اور وہ سارے عذابات ہوں گے۔ اور آسمانوں سے اوپر جنتیں رکھی جائیں گی۔ اور آسمان اور زمین کے درمیان جو پانچ سو میل کی مسافت ہے، یہ اعراف ہے۔ تو قیامت کے دن اوپر جنت، نیچے نار ہوگی، اب تو جنت ساتویں آسمان میں ہے۔

اس لئے کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث موجود ہے کہ "سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى" پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو، وہ ساتویں آسمان پر تھی جو مقامِ جبریل علیہ السّلام ہے۔ تو سدرۃ المنتہٰی کا ساتویں آسمان پر ہونا حدیث سے ثابت ہوا۔ اور قرآن کریم کہتا ہے۔ ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى﴾ ① ② "سدرہ المنتہٰی کے پاس "جَنَّةُ الْمَاْوٰى" ہے"۔

تو اس آیت اور روایت کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ جنتوں کی ابتداء ساتویں آسمان سے ہے۔ اور اوپر نیچے جنتوں کے سو درجے ہیں۔ گویا جنتوں کا علاقہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے اور جہنم کا علاقہ ساتویں زمین کے نیچے تحت الثرٰی میں ہے۔ قیامت کے دن جہنم کو کھینچ کر اوپر لایا جائے گا۔ جیسے حدیث میں ہے کہ ستر ہزار ملائکہ ایک ایک باگ کو پکڑے ہوئے ہوں گے اور ستر ہزار ہی اس کی باگیں ہوں گی۔ اس کو کھینچ کر اوپر لائیں گے۔ اور جنت کو کچھ نیچے اتار اجائے گا۔ اور اگر نہیں اتارا جائے گا تو آسمان توڑ پھوڑ دیئے جائیں گے۔ تاکہ جنت کے وہ پورے مقامات نظر پڑ سکیں جو اب تک حجابات میں ہیں۔ تو وہ بالاتر رہے گی۔ مگر نظر پڑے گی۔ اور جہنم اس زمین کے اوپر لائی جائے گی۔

اسی واسطے حدیث میں ہے کہ میدان محشر میں ہر انسان کے آگے دو چیزیں ہوں گی ایک جہنم کی ہولناک آوازیں جو آرہی ہوں گی اور ایک اپنے اپنے اعمال جو مجسم کر دیئے جائیں گے۔ قطار باندھے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ یہ دو چیزیں ہر انسان کے سامنے ہوں گی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہنم کو قریب لایا جائے گا۔ اور اس کی آوازیں ہیبت کے لئے سنوائی جائیں گی۔ غرض قیامت کے دن کچھ تغیر کیا جائے گا کہ جہنم کو اوپر لائیں گے اور جنت کو کچھ نیچے لائیں گے یا اوپر ہی رہے گی، مگر بیچ میں سے آسمان توڑ دیئے جائیں گے تاکہ وہ حجابات ختم ہوں۔ ادھر جہنم نظر آئے۔ ادھر جنت نظر آئے۔ اور ہر ایک کو اپنا ٹھکانہ محسوس ہونے لگے کہ، یہ فلاں کا ہے یہ فلاں کا ہے۔ تو اس وقت یہ زمین و آسمان حائل نہیں رہیں گے۔ فی الحال زمین و آسمان حائل ہیں۔ اس لئے کچھ نظر نہیں آرہا۔ اور اگر فی الحال ہی نظر آجاتا تو عقیدہ باندھنے اور ایمان لانے کی کیا ضرورت تھی۔ عقیدہ تو اسی کو کہتے ہیں کہ آدمی غیب کو سمجھے اور اسی پر ایمان لائے۔

مقامِ ارواح...... جنت اور دوزخ میں داخلے سے پہلے پہلے ارواح اپنے اپنے مقامات پر رہیں گی اور وہ علیّین اور سجّین ہیں، اور اب یہ کہ شہدا کو جنت میں لے جائیں اور سبز پرندوں کے خول پہنائیں۔ یہ تو لے جانا ہوا۔ باقی

① پارہ: ۲۷، سورۃالنجم،الآیۃ: ۱۴، ۱۵۔

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب فی ذکر سدرۃ المنتھی، ص: ۷۰۸، رقم: ۴۳۱.

داخلہ تو جنت میں قیامت کے دن ہوگا۔ اب تو قبر سے اس کو ٹھکانہ دکھلا دیا جائے گا۔ اور روح وریحان اور نعیم کی خوشبو اور تعطّر وہاں سے آنے لگیں۔

جنّیہ سے نکاح کا حکم...... حضرت حافظ ابن تیمیہ حرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب "اٰکَامُ الْمَرْجَانِ فِیْ اَحْکَامِ الْجَآنِّ" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں جنّات کے واقعات بیان کئے ہیں۔ اس میں انہوں نے ایک روایت نقل کی ہے کہ دنیا کے ہر مکان میں جنات بستے ہیں، کوئی مکان خالی نہیں ہے، فرق اتنا ہے کہ جو شرّی ہے، اس کے شر کی وجہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جن ہے اور آسیب کا اثر ہے، جو بے چارے صالحین ہیں، وہ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں محسوس نہیں کرتے۔ مگر ہر جگہ موجود ہیں۔ اور ان میں زیادہ شرّی ہوتے ہیں۔ نیک بہت کم ہوتے ہیں۔ ان میں شر کا مادّہ ہی غالب ہے جبکہ انسانوں میں شر کا غلبہ نہیں بلکہ مادّے برابر رکھے گئے ہیں۔ ان میں اکثریت شرّ والوں کی ہے۔ خیر والے اقلیت میں ہیں۔

فقہاء نے اس میں بحث کی ہے کہ جنّیہ سے نکاح جائز ہے یا نہیں۔ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جائز نہیں۔ اس لئے کہ غیرِ جنس ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بکری یا گائے سے نکاح کر لے۔ وہ منعقد نہیں ہوگا۔ اور بعض کی رائے یہ ہے کہ جب وہ صورتِ انسانی میں ہوں تو جنسیت کے اقرب ہو گئے، لہٰذا نکاح جائز ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ سے ایک جن کی ملاقات...... ایک جن سے تو خود ہماری ملاقات قندھاریہ میں ہوئی، وہاں کسی شخص کے اوپر جن کا اثر تھا اور اس کی نسبت مشہور یہ تھا کہ جب اس پر اثر ہوتا ہے تو باوجود یکہ بے پڑھا لکھا تھا۔ اس کے باوجود قرآن شریف کے متعدد رکوع پڑھتا۔ مسائل اور علوم بہت بیان کرنے لگتا تھا اور جب وہ اثر نہیں رہتا تھا تو جاہل مطلق ہوتا تھا۔ اسے کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ کوئی کلام اس کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔

میرا وہاں جانا ہوا۔ صبح کی نماز کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا تو بعض لوگوں نے کہا کہ وہ جن ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ جن کو میرے سے کیا کام ہے؟ میرے اوپر کوئی اثر ڈالے گا؟ خیر میں نے کہا اگر ملاقات کرنا چاہتا ہے تو اسے بلا لو۔ تو وہ شخص آیا۔ اس کی حرکات کچھ ایسی تھیں باہوش انسان کی نہیں ہوتیں۔ جیسے مدہوش سا ہو۔ اور پھر جب بیٹھا تو اس کی آنکھیں اتنی چڑھیں کہ پتلیاں بالکل غائب ہو گئیں۔ اتنی اوپر چڑھ گئیں کہ سفیدی سفیدی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر اس کا سانس کچھ چلا اور ابھرا اور وہ وہیں بے ہوش ہو کر گرا، اس کے بعد اٹھا تو اس کا سانس ٹھکانے پر نہیں تھا اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھی۔ لیکن اب اس نے کچھ بولنا شروع کیا اور اس کی آواز میں بھی ایک قسم کا کچھ ڈراؤنا پن سا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا میں نے "وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ" کہہ کر جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے معانقہ کرنا چاہا۔ میں نے کہا "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ......" میں جن سے کیا معانقہ کروں؟ لیکن "طَوْعًا وَّکَرْھًا" میں نے معانقہ بھی کیا۔ کوئی اثر وغیرہ تو ہوا نہیں، اس کے بعد وہ بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ آپ کا کیا نام ہے؟ اس نے شاید عباس یا ایسا کچھ نام بتایا۔ میں نے کہا آپ رہتے کہاں ہیں؟ اس نے کہا بمبئی

کے قریب ایک جزیرہ ہے، اس میں رہتے ہیں، میں نے کہا، آپ اس شخص کو کیوں ستاتے ہیں؟ اس نے کہا نہیں۔ میں تو نہیں ستاتا۔ مجھے اس سے تعلق ہے۔ اس کو بھی میرے ساتھ تعلق ہے، جب میں نہیں آتا تو یہ خود مجھے ڈھونڈتا ہے۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ آپ ہمیں کیا نفع پہنچا سکتے ہیں۔؟ اس لئے کہ ہم نے آپ کو بہت نفع پہنچایا۔

اس نے کہا وہ کیا؟ میں نے کہا کہ آپ لوگ ہمارے شاگرد ہیں۔ دارالعلوم میں ہمارے بزرگوں کے سامنے بہت سے جنات نے پڑھا ہے۔ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں کچھ ظاہر بھی ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ آپ لوگ ہمارے استاذ بھی ہیں اور شاگرد بھی ہیں۔ شاگرد تو یوں کہ دارالعلوم میں پڑھا۔ اور استاذ یوں کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ نے "حَـدِيْـثُ الْـجِنِّ" نقل کی ہے، وہ قاضی جن سے سنی ہے۔ میں نے کہا آپ لوگ استاد بھی ہیں اور شاگرد کثرت سے ہیں۔ تو میں نے کہا آپ دارالعلوم کو کیا نفع پہنچا سکتے ہیں؟ وہ چپکا ہو گیا کہ میں تو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے کہا۔ پھر آپ جن ہی کیوں بنے؟ پھر وہ چپکا ہو کر بیٹھ گیا، کچھ بولا نہیں۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد اس نے اجازت چاہی، میں نے کہا جائیے۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تو تو بہت بولتا تھا، بولا کیوں نہیں؟ کہنے لگا بس کچھ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب واللہ اعلم وہ واقعی جن ہی تھا یا کیا تھا۔ مگر بہر حال قرائن تو ایسے تھے کہ وہ انسانی حرکتیں نہیں تھیں، اس لئے کہ جب اس کا اثر ختم ہوتا تھا، وہ آدمی بالکل اچھا خاصا ہوش وحواس قائم۔ اور جہاں وہ اثر شروع ہوا، کہیں قرآن پڑھتا ہے۔ حالاں کہ حافظ نہیں ہے۔ اسی طرح مسائل بیان کرتا ہے۔

اقسام محبت...... علماءِ کرام محبت کی تین قسمیں لکھتے ہیں۔ ایک محبت طبعی ہے۔ ایک محبتِ عقلی ہے اور محبت عشقی ہے۔ محبتِ طبعی تو مادّی محبت ہے جیسے باپ کو اولاد سے ہوتی ہے یا اولاد کو ماں باپ سے ہوتی ہے یا عزیزوں رشتہ داروں میں ہوتی ہے۔ اور ایک محبت عقلی ہے۔ اسی کا نام فی الحقیقت ایمان ہے، حدیث میں ہے کہ "لَا يُـؤْمِـنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ." ① تم میں کوئی بھی مومن نہیں بن سکتا جب تک میرے ساتھ اتنی محبت ہو، کہ نہ اتنی محبت اپنے ماں باپ سے ہو، نہ اولاد سے ہو"۔

ظاہر بات ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے۔ وہ محبت عقلی ہوتی ہے۔ طبعی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ دلائل پر مبنی ہے۔ ایمان خود استدلالی چیز ہے اور ایمان کی حقیقت محبت ہے۔ تو وہ محبت عقلی ہے۔ اس محبت کی آدمی جب عملاً مشق کرے اور بڑھائے اور عشق کے درجے میں آجائے تو وہ محبت عشقی کہلاتی ہے۔ جیسے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ ② تو اشدِ حب ہی وہی عشق ہے۔ محبتِ طبعی تو غیر اختیاری ہوتی ہے۔

① الصحيح للبخاری، كتاب الايمان، باب حب الرسول، ص:۳، رقم:۱۴.

② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۶۵.

جیسے اولاد سے محبت ہے اس میں ارادے اور اختیار کا دخل نہیں۔ خواہ مخواہ آدمی محبت کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن عقلی محبت وہ اختیاری ہے بایں معنی کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں۔ جب اس کے اسباب اختیار کرے گا، وہ محبت پیدا ہو جائے گی اور اس محبت کو جب تمرین میں لائے گا، اس کی مشق کرے گا اور اس کے متعلقہ اعمال انجام دے گا، وہ محبت بڑھ کر عشق کے درجے میں پہنچ جائے گی جیسا کہ مجاہدہ اور ریاضت کرنے والے کی کیفیت ہوتی ہے۔ اصل ایمان وہ تو محبت عقلی ہے۔ جب مجاہدات اور ریاضتیں کرتے ہیں تو محبت حال کے درجے میں پہنچ جاتی ہے، وہ عشق کہلاتی ہے۔ یہ جو آپ نے سوال کیا کہ قیامت میں آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ محبت کرے۔ یہ درحقیقت محبتِ عقلی کی طرف اشارہ ہے، یعنی ایمان کی وجہ سے جس کے ساتھ محبت ہوگی۔ آدمی اس کے ساتھ ہوگا۔

مثلاً حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو محبت ہے، یہ طبعی محبت نہیں بلکہ عقلی محبت ہے۔ ان کے علوم اور کمالات کو دیکھ کر ہے۔ چوں کہ آپ کو کمالات سے محبت تھی تو صاحبِ کمال سے بھی محبت ہے۔ سارے انبیاء علیہم السلام اور سارے اولیاء نیز اھل اللہ سے محبت۔ یہ محبتِ عقلی ہے۔ آخرت کا تعلق زیادہ تر اسی محبت سے ہے جو امر اختیاری ہے۔ اور غیر اختیاری امور پر تکوینی آثار مرتب ہوں گے، وہ دوسرا درجہ ہے۔ اختیاری محبت پر تشریعی آثار مرتب ہوں گے۔ اسی کے بارے میں ہے۔ ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ۔'' ① اور اسی کو فرمایا گیا: ''مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ وَأَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ۔'' ② ''جس نے محبت کی تو اللہ کی خاطر، عداوت باندھی تو اللہ کے لئے، کسی کو دیا تو اللہ کے لئے، کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے، اس نے ایمان کو کامل کر دیا۔ حبِ فی اللہ اور بغضِ فی للہ کے کمال پر ایمان کا کمال بتلایا گیا۔ یہ وہی اختیاری محبت ہے جو اعمال سے بڑھتی ہے۔ ترکِ عمل سے گھٹ جاتی ہے''۔

قیامِ میلاد اور عُرس کی تحقیق...... ایسا موقع تو میرے علم میں نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ ان مسائل میں ابتداء حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے جواز کی تھی۔ قیامِ میلاد یا عرس ان چیزوں میں توسّع تھا۔ بعد میں جب تحقیق بدلی ہے، پھر شدت پیدا ہوگئی۔ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ جو گویا پوری اس جماعتِ دیوبند کے شیخ طائفہ ہیں۔ ان کے سلسلہء بیعت میں داخل ہیں۔ ان کے ہاں خود ان چیزوں میں توسّع ہے۔ لیکن جماعت دیوبند کا عمل حضرات فقہاء کرام کے اقوال اور نصوص پر اور کتاب وسنّت پر ہے۔

قیامِ میلاد کی جو اصل بنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو قیام ہے ایک حرکتِ وجدی ہے اور حرکتِ وجدی صرف اسی صورت میں معتبر ہے کہ کسی حال کے تابع ہو۔ اگر رسم یا نقالی کے تابع ہو، اسے حرکتِ وجدی نہیں کہتے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ

① الصحيح للبخاري، كتاب الادب، باب علامة حب الله عزوجل، ص: ٥٢٠، رقم: ٦١٦٨.

② السنن لابي داؤد، كتاب السنة، باب الدليل على زيادة الايمان ونقصانه، ص: ١٥٦٧، رقم: ٤٦٧١. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابي داؤد ج: ١٠ ص: ١٨١ رقم: ٤٦٨١.

اگر کسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت متمثل ہوا اور وہ تعظیماً کھڑا ہو جائے، پھر آگے یہ طریقت کا مسئلہ ہے کہ جتنے بھی اربابِ طریقت موجود ہوں، انہیں بھی کھڑا ہو جانا چاہئے۔ ورنہ اس پر قبض طاری ہو جاتا ہے۔

اب حقیقت میں یہ شرعی مسئلہ نہیں بلکہ ذوقی اور وجدانی مسئلہ ہے اور طریق کا ایک معالجہ ہے، اس کو جائز وناجائز کے نیچے لانا یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک حرکتِ وجدی ہے۔ اب جو ناجائز کہتے ہیں وہ ان لوگوں کے قیام کو کہتے ہیں جو کہ وجدی نہیں ہے اور کسی کے تابع نہیں۔ محض نقالی ہے، رسوم کی اتباع ہے، کوئی صاحبِ حال نہیں ہے۔ تو جب رسم کی اتباع ہوگی تو رسم پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام اولیٰ ہے۔ اگر کسی پر حال طاری ہوگا، اور وہ مغلوب الحال ہے تو وہ عنداللہ معذور ہے۔ نہ آپ اسے کچھ کہہ سکیں گے نہ ہم کہہ سکیں گے۔ لیکن جو اپنے ہوش وحواس میں ہے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں اور آپ کے لائے ہوئے قانون کی اتباع کرنی پڑے گی۔ بحالتِ صحتِ حواس اگر رسوم کی اتباع کرنے لگے، وہ نقالی سمجھی جائے گی۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کا تمثل ہوا اور مثالی صورت سامنے آئے۔ خواب میں بھی آپ دیکھ لیتے ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مَنْ رَّانِیْ فِی المنام فَقَدْ رَانِیْ .“ ① ’جس نے مجھے دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا‘۔

اسی طرح سے منام جو ہے وہ ایک ابتدائی درجے کا کشف ہے جو ہر انسان کو میسر آ سکتا ہے۔ لیکن مجاہدہ اور ریاضت کرنے والوں کا کشف، اس کا اور درجہ ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کسی مغلوب الحال کے سامنے آئے اور متمثل ہوا اور وہ تعظیماً کھڑا ہو جائے۔ اس پر نہ آپ دار وگیر کریں گے نہ ہم کریں گے کیوں کہ وہ اپنے حال میں نہیں، اپنے آپ میں نہیں ہے۔

ملتِ اسلامیہ کا ناسور...... جامعہ ازہر میں شیعوں کے بارے میں مسئلہ تو چل رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ جو شیعہ سنی کے درمیان منافرت سی ہے، اس کو ختم کیا جائے۔ اور جامعہ ازہر میں شیعوں کو بھی داخلے کا حق دیا جائے۔ یہ مسئلہ وہاں چل رہا ہے۔ وہاں کے شیوخ میں شیخ عبدالواحد واصلی ہیں۔ ایک دعوت میں ہمارا ساتھ ہوا تو اس مسئلہ پر کچھ گفتگو آئی۔ اس پر انہوں نے یہی کہا کہ ایک شیعہ تو وہ ہیں جو بالکل اصول اسلامیہ سے منحرف اور بالکل مختلف ہیں جیسے کوئی تحریف قرآن کا قائل ہے یا بعض حلولِ خداوندی کے قائل ہیں۔ ان سے تو بحث نہیں۔ وہ اسلام سے خارج ہیں۔ لیکن جو لوگ محض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفضیل کے قائل ہیں، ان سے اگر منافرت باقی نہ رہے تو کیا حرج ہے۔ خواہ مخواہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت الگ ہے۔

میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر فقط اتنا ہی مسئلہ ہو، اہم تو یہ بھی ہے، اس واسطے کہ اب فضیلتِ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر اور ان کی خلافت پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اجماع کا خرق اور اس کا توڑ ڈالنا یہ بھی تو کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کو برداشت کیا جائے کہ ایک چیز پر اجماع ہو چکا ہے مگر اس کی جو جانب مخالف ہے وہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب مایقال فی الرکوع، ص: ۲۵۴، رقم: ۱۰۹۰.

کوئی حرام یا ممنوع نہیں ہے۔اگر فقط ایک مسئلہ ہوتو کچھ صبر کرلیا جائے۔

لیکن ان کے ہاں سارے فرقوں کا قدرِ مشترک وہ "مسئلہ امامت" ہے اور وہ امامت کو نبوّت سے افضل جانتے ہیں۔اور امام کو معصوم سمجھتے ہیں کہ امام کوئی غلطی کر ہی نہیں سکتا۔تو یہ مسئلہ سامنے آئے گا۔کیا آپ اس کو برداشت کریں گے؟

ظاہر بات ہے کہ جب بنیاد کے اندر ہی اختلاف ہوگیا کہ ہم تمام مسلمان اس کے قائل ہیں کہ نبوّت سے اونچا کوئی مرتبہ نہیں۔امامت توابعِ نبوّت میں سے ہے۔جب نبوّت ختم ہوگئی تو وعدہ دیا گیا۔"اَلْاَئِـمَّةُ مِـنْ قُـرَيْـشٍ." ① یا یہ کہ بارہ امام گزریں گے۔یا آئمہ مجتہدین کے بارے میں کچھ پیشین گوئیاں آئیں۔تو اس کا مطلب یہ کہ نبوّت ختم ہوجانے کے بعد نبوّت کی خلافت باقی رہے گی۔وہ خلافت خواہ امامت کی صورت میں ظاہر ہو،خواہ علم کی صورت میں،خواہ کسی بھی کمال کی صورت میں ہو۔بہر حال وہ فروعات نبوّت میں سے ہے۔

یہ امت کا ایک اجماعی مسئلہ ہے،اس کے اندر اگر ایک فرقہ آ کر یہ دعویٰ کرے کہ نبوّت افضل نہیں بلکہ امامت افضل ہے۔تو پہلے تو اجماع کا خرق ہوا۔پھر یہ کہ ان کے نزدیک امام کے لئے عصمت لازم ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عصمت لازم ہے۔تو نبوت کے محاذ اور متوازی ایک دوسرا مقام لا کے کھڑا کر دیا۔تو ہم اس کو شرک فی النبوّت سے تعبیر کریں گے۔جیسا کہ شرک فی الالوھیّت ممنوع ہے،اسی طرح شرک فی النبوّت بھی ممنوع ہے۔ اور بالخصوص حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں۔اس لئے کہ انبیاءِ سابقین میں چوں کہ نبوّت ختم نہیں ہوئی تھی تو حضرات انبیاء علیہم السلام کے آنے کا سلسلہ جاری تھا۔اس میں اگر کوئی دعویٰ نبوت یا دعویٰ عصمت کرے تو کچھ مناسب بھی تھا۔

ختمِ نبوّت کے بعد جو بھی عصمت کا دعویٰ ہوگا یا نبوّت سے افضلیّت کا دعویٰ ہوگا۔تو وہ ختمِ نبوّت کے ٹھیک منافی پڑے گا۔ایک ادھر دعویٰ خرقِ اجماع اور ادھر ایک اسلام کا جو اجماعی مسئلہ ختمِ نبوّت کا ہے،اس کے بھی یہ منافی ہے،کیا آپ اسے برداشت کریں گے؟

تاریخی تخریبی فرقہ...... پھر میں نے عرض کیا کہ دوسری بات یہ ہے کہ ان ساری چیزوں کو چھوڑ دیجئے،یہ دیکھئے کہ ہر فرقے کا ایک مزاج ہوتا ہے۔اس فرقے کا مزاج تخریبی ہے۔اور تاریخ اس پر شہادت دے گی کہ مسلمانوں کو جتنے بھی صدمات اٹھانے پڑے ہیں،سیاست کو یا خلافت کو جہاں جہاں تباہی ہوئی،نیچے سے یہی فرقہ نکلتا ہے،تو تاریخ کی روشنی میں یہ ایک تخریبی فرقہ ہے۔جب اس کا مزاج یہ ہے تو ہوسکتا ہے کہ آج وہ آپ کی چاپلوسی کرکے آپ میں شامل ہوجائے۔لیکن کل کو نوک۔نیچے نکال کر آپ کو ہی بیخ دے۔آپ کے اوپر غالب آجائے اور آپ دیکھتے رہ جائیں۔جیسا کہ تاریخ اس پر شاہد ہے،پھر آپ کیا کریں گے؟

① الصحيح للبخاري، كتاب العلم،باب اثم من كذب على النبي،ص: ۱۲،رقم: ۱۱۰.

ذوقِ دین کی کمی...... آپ نے محض ایک عقیدہ سامنے رکھ لیا یعنی تفضیلِ علی رضی اللہ عنہ یہ کوئی زیادہ اہم نہیں۔ اگر صرف اس مسئلہ تک بات ہوتی تو مضائقہ نہیں تھا مگر مسائل دوسرے بھی ہیں۔ پھر فرقوں اور طبقات کا مزاج ہوتا ہے۔اس سے قطع نظر کر لینا تو ٹھیک نہیں ہے۔اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ اخیر میں انہوں نے یہ کہا. میں تو انہیں چیزوں کا قائل ہوں، میں تو نمائندگی کر رہا تھا کہ یہ خیالات ہیں۔ میں نے کہا الحمد للہ اب آپ اس کی نمائندگی کیجئے گا کہ یہ خیال ہونا چاہیے، تو اس سے یہ اندازہ ہوا کہ مسئلہ تو اٹھ رہا ہے اور کچھ طبیعتیں ادھر چل رہی ہیں۔ اور جب اس ذوق میں کمی آتی ہے جو خالص دین کا ذوق ہے، تو افکار میں اس قسم کی آزادی پیدا ہوتی ہے۔

بشاشتِ ایمان (ایمانی کیفیت)...... دراصل اس کا کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں ہے کہ اس پر ہم پرکھیں۔ بلکہ صحیح بخاری کی جو روایت ہے، اس میں ایک لفظ یہ ہے۔ جب ہرقل نے ابوسفیان سے مختلف سوالات کئے ہیں تو ان میں ایک یہ بھی تھا۔ ''هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ سُخْطَةً لِدِيْنِه. '' ''کیا ان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ایمان لا کر ان کے دین کو برا سمجھ کر کوئی مرتد بھی ہو جاتا ہے؟''۔ انہوں نے کہا۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی مرتد ہو گیا ہو۔

ہرقل یہ کہتا ہے کہ ''وَكَذٰلِكَ الْاِيْمَانُ اِذَا خَالَطَ بَشَاشَةَ الْقُلُوْبِ''. ① یہ صورت اس وقت ہوتی ہے جب ایمان کی بشاشت قلب کے اندر رچ جائے۔ پھر ارتداد کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔ تو حدیث میں اس کو انشراحِ تام اور بشاشتِ ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مختلف الفاظ جو احادیث میں آتے ہیں۔ کہیں ''حلاوۃِ ایمان'' فرمایا گیا۔ جیسے حدیث میں ہے۔ ''مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّجِدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ فَلْيَلْبَسِ الصُّوْفَ تَذَلُّلًا لِرَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ. '' ② جس کو یہ پسند ہو کہ میں ایمان کی مٹھاس چکھوں اسے چاہئے کہ اللہ کے سامنے ذلتِ نفس اختیار کرنے کے لئے اون کا کپڑا پہنے یعنی دکھلاوے کے لئے نہ ہو۔ تو اس کو ایمان کی حلاوت اور مٹھاس آجائے گی۔

اب یہ ایک کیفیت ہے کیفیت کو ہم الفاظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ کہیں اس کو ''شرحِ صدر'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ ③ ''جب اللہ سینے کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور شرحِ صدر نصیب ہو جاتا ہے تو اس کو ایک خاص نور عطاء کر دیا جاتا ہے''۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے کہ اب قلب کے اندر ظلمت نہیں آسکتی۔ جب شرحِ صدر ہو گیا۔ تو کہیں حلاوۃِ ایمان سے، کہیں بشاشتِ ایمان سے، کہیں شرحِ صدر سے، اس کی مختلف تعبیرات ہیں۔ لیکن ان کا مفہوم ایک ہی ہے اور یہ کہ دین کے لئے سینہ کھل جائے اور اس پر طمانیت میسّر آجائے اور رضائے کامل حاصل ہو جائے۔ پھر اندیشہ نہیں رہتا۔

---

① الصحيح للبخاری، كتاب تفسير القرآن، باب قل يا اهل الكتاب تعالوا، ج:۱۴، ص:۲۲. ② كنزالعمال، ج:۱۵ ص:۳۰۲ (الديلمي عن ابی هريرةؓ) علامہ پٹنیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قلت: الحديث حسن له شواهد فعندالبيهقي بوجه آخر نحو "من لبس الصوف وحلب الشاة وركب الاتان فليس في جوفه شيء من الكبر وغيره ذالک دیکھئے: تذکرة الموضوعات، ج:۱ ص:۱۵۷. ③ پارہ:۲۳، سورة الزمر، الآية:۲۲.

کیفیّتِ مقام...... لیکن یہ کہ اس کا قاعدہ کیا ہے۔ یہ قواعد سے متعلق چیز نہیں۔ یہ تو ایک مقام ہے، جب آدمی اس مقام پر پہنچ جائے گا تو یہ ایک قلبی کیفیت ہے، وہ خود محسوس کرے گا کہ میں کس مقام پر ہوں۔ لفظوں میں کیفیات ادا نہیں کی جا سکتیں۔ یہ تو ایمانی اور روحانی کیفیات ہیں۔ مادّی کیفیات کو آدمی الفاظ سے نہیں سمجھ سکتا، کتنی بلیغ تعبیر کیوں نہ ہو؟

میں آپ سے کہوں آپ ذرا مجھے سیب کا مزہ سمجھا دیجئے، تو آپ کتنی ہی فصیح و بلیغ تقریر کریں، آپ نہیں سمجھا سکتے۔ اس لئے کہ کیفیت الفاظ کی گرفت میں نہیں آ سکتی، آپ یوں کہیں گے کہ صاحب! دو پیسے خرچ کرو، کھا کے دیکھ لو، مزہ معلوم ہو جائے گا، یہ مادّی کیفیت ہے، یا مثلاً نفسانی کیفیت ہے۔ جیسے انسان کی عمر کے تین درجے ہیں، طفولیّت، شباب اور کہولت ہے۔ بچہ اگر آپ سے یہ پوچھے کہ جوانی کی کیا کیفیات ہیں، مجھے سمجھا دیجئے۔ کیا آپ اس پر قادر ہیں کہ سمجھا دیں؟ کبھی نہیں سمجھا سکیں گے۔ یہ کہیں گے کہ بیٹا! ایک آٹھ دس برس کا انتظار کرو، جب جوان ہو جاؤ گے، خود محسوس ہو جائے گا کہ کیا کیفیت ہے۔ یا ایک جوان آدمی یوں کہے کہ مجھے بڑھاپے کے کیفیت سمجھا دو۔ ممکن نہیں کہ آپ سمجھا دیں۔ جب تک وہ کیفیت اس پر گزرے نہیں۔ اور وہ خود صاحبِ مقام نہیں بن جاتا۔ یا بوڑھا آدمی یوں کہے کہ مجھے مختصر کی کیفیت سمجھا دو کہ نزع کی حالت کیسی ہوتی ہے تو سوائے اس کے کوئی جواب نہیں کہ بھائی! جب یہ کیفیت آئے گی تو خود سمجھ لو گے، یہ لفظوں میں میں ادا نہیں کر سکتے۔ جب مادّی کیفیّت کو لفظوں میں نہیں لا سکتے، نفسانی کیفیّت کو نہیں لا سکتے، تو روحانی کیفیّات جو مقاماتِ قلب سے تعلق رکھتی ہیں، وہ اتنی لطیف ہیں کہ ناممکن ہے کہ وہ لفظوں میں آ سکتی ہوں اور جتنی آ سکتی ہیں ان کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ بہتر کوئی نہیں بیان کر سکتا۔ اس کی علامتیں بتلا دی گئی ہیں کہ جب اس درجہ پر پہنچ جاؤ گے تو سمجھ لو کہ صاحبِ مقام ہو گئے۔

کیفیّتِ برزخ...... کسی بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے، انہوں نے کہا کہ ہزاروں آدمی مرتے ہیں لیکن کسی نے آج تک یہ نہیں بتلایا کہ مجھ پر گزرا کیا۔ انہوں نے کہا میرا جب انتقال ہو تو تم میری قبر میں کاغذ اور قلم دوات رکھ دینا۔ میں تمہیں ساری کیفیات لکھ کر دوں گا۔ بس تم تیسرے دن آ کر اس کاغذ کو اٹھا لینا۔ اور کہا میں نے تیسرے دن کی قید اس لئے لگائی ہے کہ تین دن میں مجھے اپنا اندازہ ہو جائے گا کہ مجھ پر کیا گزرے گی۔ میں مقبول ہوں یا نامقبول ہوں۔ جب اپنی طرف سے اطمینان ہو تب میں دوسرے کو اطلاع دوں گا کہ یہ کیفیّت میرے اوپر گزری۔ چناں چہ ان کے انتقال کے بعد تیسرے دن لوگ پہنچے تو وہ جو کاغذ اندر رکھا تھا، واقعی اوپر موجود تھا۔ اور اس کے اوپر لکھا ہوا بھی ہے۔ اور لکھا ہوا کچھ ایسے حروف میں ہے کہ وہ روشنائی بھی نہیں ہے۔ بس کچھ حروف سمجھ آتے ہیں۔

غرض لوگ شوق سے دوڑے کہ شیخ نے برزخ کے احوال سے مطلع کیا ہو گا۔ وہ وعدہ کر کے گئے تھے۔ اس میں انہوں نے ایک سطر میں سارا حال لکھ دیا۔ وہ یہ تھا کہ۔ ''یہاں کی حالت دیدنی ہے، شنیدنی نہیں ہے''۔ دیکھنے اور گزرنے سے تعلّق رکھتی ہے، سننے سے متعلّق نہیں ہے۔ وہ الفاظ کی گرفت میں نہیں آ سکتی۔ اور جتنی بیان میں آ سکتی ہے وہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ تو حدیث میں عالم برزخ کے جتنے واقعات بیان کر

دیئے گئے ہیں اس سے زیادہ کوئی بیان کر سکتا۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی قوت بیانیہ ہے کہ ان کی کیفیات کو پھر بھی لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ ان سے زیادہ کسی کو قدرت نہیں ہے، تو یہ جواب دیا کہ یہاں کہ حالت دیدنی ہے، شنیدنی نہیں۔ سننے کے لائق نہیں۔ بس دیکھنے کے لائق ہے۔ غرض ہر کیفیاتی مقام کا یہی حال ہے کہ آپ اس کو الفاظ کی گرفت میں نہیں لاسکتے۔ خواہ نفسانی مقام ہو، خواہ مادّی کیفیت ہو۔ صاحبِ کیفیت اور صاحبِ مقام بن جائیں۔ اس سے خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔

تعبیرِ کیفیت ناممکن ہے...... اور بظاہر اس کی بناء یہ ہے کہ جس قدر بھی کیفیات ہیں وہ امور کلیہ نہیں۔ وہ شخصی چیزیں ہیں، اگر امور کلیہ ہوں تو ان کو تو آپ تقریر و بیان سے بیان کر سکتے ہیں جن کا تعلق سارے انسانوں سے ہے۔ وہ امورِ شخصیہ ہیں، کسی کی کوئی کیفیت کسی کی کوئی کیفیت ہے کوئی کسی حال میں ہے۔ کوئی کسی مقام پر ہے۔ اور ایک کا مقام دوسرے کے لئے حجت نہیں۔ اپنے آپ کو آدمی خود ہی سمجھتا ہے اور خود ہی محسوس کر سکتا ہے اگر کلیاتی چیزیں ہوں تب تو ان کی تعبیر ہو لیکن جب وہ امورِ جزئیہ ہیں اور ان کا تعلق بھی کیفیات سے ہے تو ان کے لئے تعبیر رکھی نہیں گئی اور جتنی ہو سکتی ہے بس وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دی ہے۔ آگے نہ کسی کی جرات ہے نہ قوت ہے ۔

درنیابد حالِ پختہ ہیچ خام بس سخن کوتاہ باید والسلام

خام کبھی پختہ کار کی کیفیات کو محسوس نہیں کر سکتا۔ جواب یہی ہوگا کہ تم پہلے پختہ کار بن جاؤ، پھر خود سمجھ لوگے ۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست

کسی نے سوال کیا تھا کہ عاشقی کسے کہتے ہیں؟ عاشقی کیا ہوتی ہے ۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست گفتم کہ چوں ما شوی بدانی

مجھ جیسے عاشق بن جاؤ، تمہیں پتہ چل جائے گا کہ عاشقی کیا ہے۔ لفظوں میں کیسے بتلا سکتا ہوں

انسان کی قوتِ بیانیہ کا عجز...... اچھا یہ تو کیفیات ہیں جو باطنی چیزیں ہیں۔ انسان کے چہرے مہرے کی ایک آن اور شان ہوتی ہے۔ وہ لفظوں میں نہیں آسکتی یعنی آپ چہرے کی تصویر کھینچ دیں گے لیکن چہرے کی جو آن بان ہے، اس کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ وہ تو جب سامنے ہوگا۔ اس کی ادائیں سامنے آئیں گی۔ آپ سمجھیں گے یہ محبوب ہے۔ لیکن لفظوں میں یہ آئیں یہ ممکن نہیں۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے کہ ۔

گر مصوّر صورتِ آن دلستاں خواھد کشید

آدمی صورت کھینچ سکتا ہے ۔

گر مصوّر صورتِ آن دلستاں خواھد کشید لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواھد کشید

صورت آدمی کھینچ سکتا ہے لیکن اس کے ناز و ادا کو کیسے کھینچے گا، الفاظ میں کیسے [illegible] گا۔ کاغذ سے اس کا

کوئی تعلق نہیں۔اس کا تعلق احساسات اور ادراکات سے ہے اور وہ ادراکِ باطنی ہے۔تو بہت سی ادائیں جو آنکھوں سے نظر آتی ہیں، بیان نہیں کی جاسکتیں۔ اور کیفیاتِ روحانی ونفسانی، یہ تو آنکھوں سے بھی نظر نہیں آتیں۔ان کو آدمی کیسے بیان کرے گا۔؟ یہ تو آنکھوں دیکھی چیز ہے جب اسے بیان نہیں کرسکتا۔غرض انسان کو بیان کی قوّت نہایت محدود دی گئی ہے، ہاں جو چیز جسمانی ہو لفظوں میں بھی آسکتی ہو، آواز کی گرفت میں بھی آسکتی ہو، اسے ہم بیان کرسکیں گے، جو نہ آواز کی گرفت میں آئے، نہ لفظوں کی گرفت میں آئے، اسے کیسے بیان کریں؟ سوائے اس کے کہ سکوت کرکے صاحبِ مقام پر محوّل کردیں کہ جو کچھ کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے۔

عدمِ احصاءِ ثناءِ باری کی وجہ...... اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ شانہٗ کی مدح وثناء اتنی انتہاء کو پہنچائی کہ عالم میں اتنی مدح وثناء کرنے والا کوئی نہیں۔ جتنی حمد وثناء حق تعالیٰ شانہٗ کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے اور تعریف، وتوصیف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی ہے، کسی نے نہیں کی۔لیکن اخیر میں فرماتے ہیں۔ ’’اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ.‘‘ ① ’’اے اللہ! میں تیری ثناء وصفت کا احاطہ کر ہی نہیں کرسکتا۔بس مختصر یہ کہ تو ایسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنے کو فرمایا ہے‘‘۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ ثناء وصفت مقاماتِ کمال کی ہوتی ہے۔اور کمالاتِ الوہیت انبیاء علیہم السلام جتنے دیکھ سکتے ہیں۔اتنی ثناء کرسکتے ہیں۔باقی کمالاتِ الوہیت لفظوں کی گرفت میں تھوڑا ہی آسکتے ہیں۔جب بندوں کے مقامات بندوں کے قبضے میں نہیں آتے تو الوہیت کے مقامات کس طرح سے بندوں کے قبضے میں آجائیں گے،تو سوائے اس کے کہ سپر ڈال دی جائے اور عجز کا اقرار کیا جائے، کچھ نہیں ہوسکتا ؎

نہ ہر جا مرکب تواں تاختن ۔۔۔ کہ جاہا سپر باید انداختن

ہر جگہ گھوڑا نہیں دوڑایا جاسکتا۔بہت سی جگہیں آتی ہیں کہ لگام روک لینا پڑتا ہے اور آدمی سپر ڈال دیتا ہے کہ اس خاردار جنگل میں میں نہیں گھس سکتا، گھوڑا وہیں دوڑے گا کہ زمین سیدھی ہو، گھاس بچھی ہوئی ہو۔اور جہاں اونچ نیچ ہو، پہاڑ ہوں، گھاٹیاں ہوں اور نشیب وفراز ہوں وہاں گھوڑا بیچارہ کیا دوڑے گا، وہاں تو خیال بھی نہیں دوڑسکتا چہ جائیکہ گھوڑا دوڑے۔میری ایک لمبی چوڑی نظم تھی، وہ تو یاد نہیں ہے۔اس میں، ایک شعر یاد ہے، وہ حق تعالیٰ کی ثناء وصفت کے بارے میں ہے۔

خدا کی ثناءِ کامل یہی ہے ۔۔۔ کہ ہم سے کچھ ثنا ممکن نہیں

جو یوں کہہ دے کہ میں آپ کی تعریف کر ہی نہیں کرسکتا۔اس نے تعریف کی۔جو تعریف کرنے کا مدعی بن کے بیٹھے، ممکن نہیں کہ کرسکے۔ترکِ دعویٰ کردینا ہی تعریف ہے۔

تسلیمِ عجز ادائیگیٔ شکر ہے...... اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا کہ

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلاۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود، ص:۷۵۴، رقم: ۱۰۹ .

﴿اِعْمَلُوْآ اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ ① ”اے داؤد! ہمارا شکر ادا کرو“۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کا وصف اور خلق شکر انبیاء علیہم السلام سے ممتاز ہے۔ گویا حضرت داؤد علیہ السلام پر شکر کا غلبہ ہے۔ تو امر کیا گیا کہ شکر ادا کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے امر اور حکم کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی بھی سمجھ نہیں سکتا، وہی سمجھتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے اور کیا مقصد ہے۔ تو عرض کیا کہ اے اللہ! یہ تو میرا فرض ہے کہ میں شکر ادا کروں اور جب حکم ہے تب تو میں شکر ادا کروں گا ہی۔ مگر حیران یوں ہوں کہ کس طرح شکر ادا کروں، اس لئے کہ نعمتوں کے اوپر جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، جب آپ توفیق دیں گے جبھی تو ادا کروں گا۔ اور توفیق دینا یہ خود ایک نعمت ہوگی، تو اس نعمت کا مجھے شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کروں گا تو اس کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے۔ یہ ایک اور نعمت بن گئی۔ تو پہلے اس نعمت کا شکر ادا کروں گا بعد میں اس کا۔ اور جب اس کا ادا کرنے بیٹھوں گا، اس کی توفیق بھی آپ دیں گے۔ تو پھر یہ ایک نعمت ہوگئی تو پہلے اس کا۔ اس طرح ہر شکر سے پہلے ایک شکر۔ تو شکر کی ابتداء ہی نہیں کرسکتا تو کس طرح سے شکر ادا کروں، بس میں تو ادائے شکر سے عاجز ہوں۔ میرے قبضہ قدرت میں آپ کا شکر ادا کرنا ہے ہی نہیں، حق تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا گیا ”اے داؤد! اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ تم ادائے شکر سے عاجز ہو، تو یہ اقرار کرلینا ہی شکر کی ادائیگی ہے۔ تو شکر کا ادا کرنا یہی ہے کہ عجز تسلیم کرلے“۔

اس لئے کہ کوئی بھی بندہ کمالاتِ الٰہیہ کا حق ادا نہیں کرسکتا، یہی کہے گا کہ اے اللہ! عاجز ہوں۔ تو عجز مان لینا یہی ادائے حق ہے۔ ورنہ اگر واقعی شکر کی ادائیگی لازم ہو تو حقوق تو لامتناہی ہیں اور بندہ متناہی اور محدود ہے، یہ کیسے کرے گا؟ لامتناہی کا حق متناہی نہیں ادا کرسکتا۔ تو حق تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ لامحدود شکر کی ادائیگی یہ ہے کہ اپنا عجز مان لے کہ ہم عاجز ہیں۔ بس ہم سمجھ لیں گے کہ اس نے شکر ادا کردیا۔ یہی ثناء وصفت کا حال ہے۔ ”لَآ اُحْصِيْ ثَنَآءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَآ اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ .“

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حمد وثناء کرنے والا عالم میں کوئی نہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عارف باللہ کوئی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معرفت کے اس مقام پر پہنچے ہوئے ہیں کہ انبیاء اور ملائکہ بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اخیر میں آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ فرماتے ہیں کہ: ”لَآ اُحْصِيْ ثَنَآءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَآ اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ .“

یاجوج ماجوج میزانِ تحقیق پر...... یہ امرِ حق ہے کہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا، یاجوج ماجوج ایک قوم ہے جو قربِ قیامت میں نکلے گی۔ اور ان کے اوصاف بیان کئے کہ وہ پورے عالم پر چھا جائیں گے اور دریاؤں کا پانی پینے پر آئیں گے تو دریاؤں کو خشک کردیں گے، لوگوں کے اموال پر اس درجے غاصب بنیں گے، ساری اشیاء ان کے قبضے میں آجائیں گی، اس طرح کی علامتیں یاجوج موجوج کی بیان فرمائی گئی ہیں۔

① پارہ: ۲۲، سورة السبأ، الآية: ۱۳.

لیکن زیادہ تفصیل نہیں فرمائی گئی کہ کون ہوں گے؟ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانوں میں سے ہی ہوں گے، کوئی جنات میں سے نہیں ہیں۔صحیح روایات اور قرآن کریم میں ان کے بارے میں جو آیا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ وہ ایک قوم ہے جو قوی ہوگی، پورے عالم پر چھا جائے گی۔ پورے عالم کے خزائن اور دفائن پر قبضہ کر لے گی۔ اور انسانوں کو عام طور سے قابو میں لے لے گی۔ چاہے ختم کردے، چاہے باقی رکھے۔ پورے عالم میں اس کا اقتدار پھیل جائے گا اور ساری زمین کے خزائین اور دفائن ان کے قبضے میں آجائیں گے۔ جسے چاہیں دیں۔ جسے چاہیں نہ دیں تو روایات میں اس قسم کے احوال اور ان کی صفات آتی ہیں۔اب آگے یہ کہ وہ بالشت بھر کے ہوں گے۔ یہ سب اسرائیلی روایات ہیں، مستند روایات نہیں ہیں۔

اقوامِ یورپ کو یاجوج ماجوج قرار دیا جاسکتا ہے؟......اب اس میں علماء کی بحثیں ہیں۔بعض محقق علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ یورپ کی اقوام کو ''یاجوج ماجوج'' قرار دیتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ جتنی علامتیں فرمائی گئی ہیں یہ سب ان کے اوپر منطبق ہوتی ہیں۔ پورے عالم اسلام پر ان کا تسلّط بھی ہے، پورے عالم کے خزائن اور دفائن بھی ان کے ہاتھ میں آگئے۔ دنیا کی ہر قوم گویا ان کے قابو میں ہے، جسے چاہیں نچا کے ختم کردیں۔ چاہیں آگے بڑھا دیں۔تو پورے عالم پر اس طرح سے ان کا اقتدار چھایا ہوا ہے۔

سدِّ سکندری......اب آگے جو چیزیں آتی ہیں کہ وہ سدِّ سکندری کے پیچھے ہیں اس کو وہ چاٹتے ہوں گے اور چاٹ چاٹ کر خستہ کردیتے ہیں اور قربِ قیامت میں وہ انشاء اللہ کہہ کے بڑھیں گے تو وہ ختم ہوجائے گی اور وہ باہر نکل پڑیں گے۔اس میں پھر تاویلیں کی گئی ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ من جانب اللہ، ان کے اوپر ایک روک ڈالی گئی ہے۔وہ قربِ قیامت میں اٹھادی جائے گی، یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دیوار مادّی ہو۔اور پہاڑوں کے اندر بنائی گئی ہو۔بہرحال بعض حقیقت کے قائل ہیں کہ واقعی دیوار ہے اور قوم اس کے پیچھے ہے اور وہ اسے چاٹتی ہے۔چاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے توڑنے پھوڑنے کی فکر میں ہے۔مگر قابو نہیں ملتا۔جب ان کے خروج کا وقت آئے گا تو من جانب اللہ قدرت دے دی جائے گی۔توڑ کر نکل پڑیں گے۔اور جو اس کے قائل ہیں کہ یہ موجودہ یورپ کی اقوام ہیں۔یہی ''یاجوج یا ماجوج'' ہیں۔وہ اس کو مجازات پر محمول کرتے ہیں۔حقیقت پر محمول نہیں کرتے۔

آیتِ قدرت......لیکن قرآن کریم اور احادیث کے الفاظ سے جہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک حقیقت بن سکے، مجاز لینا یہ اصول کے خلاف ہے۔اس میں کوئی عقلی اشکال نہیں ہے کہ کوئی قوم ہو اور وہ پہاڑوں کے آگے پیچھے بند ہو اور واقعی میں سد سکندری ہو جس تک ابھی ہماری نگاہیں نہیں پہنچیں۔اور وہ اس کو توڑنے پھوڑنے میں لگے ہوئے ہوں اور اخیر زمانہ ایسا آئے کہ وہ نکل پڑیں، اس لئے کہ قران وحدیث سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی غیر معمولی قوم ہے۔عام طور پر جیسے انسان ہوتے ہیں، اس انداز کے نہیں ہیں۔چاہے وہ بشر ہی ہوں مگر غیر معمولی ہیں۔اور ان کے اسباب ووسائل بھی کچھ غیر معمولی ہوں گے۔اس کا ایک ثمرہ یہ نکلتا ہے کہ ان اقوام کو نہ مانا جائے

بلکہ وہ ایک مستقل قوم ہے۔ اور حق تعالیٰ نے اس کو محبوس رکھا ہے، وہ اس کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے۔ جیسے دجال کا ظاہر ہونا اس کی قدرت کی ایک نشانی ہے۔ قربِ قیامت میں آگ کا ظاہر ہونا قدرت کی نشانی ہے۔ اسی طرح سے اس قوم کا ظاہر ہونا یہ بھی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ مگر غیر معمولی چیز ہے۔ لیکن صحیح کیفیت کی تفاصیل زیادہ موجود نہیں ہیں، بس قیامت کی علامات میں سے ہے، جہاں اور غیر معمولی سینکڑوں چیزیں ظاہر ہوں گی، ان میں ایک یہ بھی ہے۔ ﴿حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ ① اِدھر سے اُدھر ہر گھاٹی میں سے نکلتے ہوئے نظر آرہے ہوں گے۔ یورپ والوں کی یہ صورت نہیں ہے، ان کا تو ایک مستقل ملک ہے، وہ آتے ہیں، جاتے ہیں مگر تجارت کی لائین سے دنیا پر قبضہ کر رکھا ہے۔

لیکن یہ کہ وہ ایک غیر معمولی انداز سے اس طرح خروج کریں کہ عالم میں ہر گھاٹی سے نکل کر ایک نئی قوم آرہی ہو، یہ صورت نہیں ہے۔ بہر حال الفاظ سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدرت کی غیر معمولی نشانی ہے جو قربِ قیامت میں ظاہر ہوگی۔ اب اس غیر معمولی کو غیر معمولی سمجھ کر ایسے اوصاف بیان کرنا کہ وہ بالشت بھر کے ہوں گے یا ان کے کان لمبے ہوں گے۔ یہ سب اسرائیلیات ہیں۔

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ...... ہمارے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی کچھ اس طرف مائل تھی کہ شاید یہ قومیں مراد ہوں۔ قطعی طور پر تو نہیں فرماتے تھے مگر خیال ظاہر فرماتے تھے کہ شاید یہی مراد ہوں۔ کیوں کہ بہت سی علامتیں ان میں پائی جاتی ہیں۔

اقوامِ یورپ کے مورثِ اعلیٰ کا نام ...... اور کل ہی یہ ذکر ہو رہا تھا کہ انگلینڈ میں جو اسمبلی ہال ہے، جو بہت پرانا اور قدیمی ہے، اس کے دروازے پر پتھر سے کندہ ہے۔ یا گوگ ماگوگ۔ اس کو اگر معرّب کیا جائے تو یاجوج ماجوج بنتا ہے۔ گویا وہ خود اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ۔ ہاشمی صاحب بیان کر رہے تھے کہ روس والے کہتے ہیں کہ ہمارا مورثِ اعلیٰ، جس کی ہم اولاد ہیں، اس کا نام "ماگوگ" تھا۔ اس قسم کی علامتیں دیکھ کر بعض علماء کا رجحان اس طرف ہو گیا کہ شاید یہی یاجوج ماجوج ہوں۔

ظہورِ خاتم الدجّالین کے آثار ...... آفتاب کے نمایاں ہونے سے پہلے اس کے آثار نمایاں شروع ہونے لگتے ہیں۔ پھر پو پھٹتی ہے۔ اسی طرح آفتابِ نبوّت کے طلوع سے پہلے قلوب کے اندر آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ تو جس طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار نمایاں ہوئے تاکہ صلاحیت اور استعداد ان کے دین کے قبول کرنے کی پیدا ہو۔ یہی صورت بعینہٖ دجّال کی ہے کہ اس کے ظہور سے پہلے قلوب میں دجل وفساد، ڈپلومیسی، مکاری وعیاری اور دغابازی، اس کے آثار اور صلاحیتیں پیدا ہونی شروع ہوں گی۔ اس درجہ کو ہر انسان اپنی اپنی بساط کے مطابق محسوس کرے گا کہ قلب کے اندر کچھ ظلمت اور کدورت اور کچھ فریب ہے اور دنیا کے تمدن

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، آیت: ۹۶.

کی بنیاد بھی فریب اور دکھلاوے پر نمایاں ہونا شروع ہوگی۔ تو اس قسم کی چیزیں نمایاں ہوں گی۔ یہاں تک کہ جب وہ ظہور کرے گا، اس وقت ہزاروں قلوب اس کو ماننے کے لئے مستعد ہوں گے۔ سوائے ان کے جن کے قلوب کے اندر ایمانوں کی صلاحیت بہت اقویٰ ہے۔ وہ نہ جھکیں گے لیکن عام طور سے اثر پیدا ہوگا۔ تو جس طرح سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے قبل صلاح کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے تھے تو ضروری ہے کہ خاتم الدجّالین سے پہلے قلوب دجل وفساد اور مکروفریب کو قبول کریں، گویا دنیا سے اخلاص مضمحل ہونے لگے اور مکروفریب دنیا پر غالب آنے لگے، یہاں تک کہ وہ ظاہر ہوجائے۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے دجّال کا تقابل...... چوں کہ خاتم الانبیاءِ کمالات سے بھرپور ہیں اور ختم کرنے والے یعنی سارے کمالات کے منتہٰی ہیں۔ تو دجّال سارے فسادات کا منتہٰی ہوگا۔ اور اس درجہ کو کہ جیسے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں مونڈھے کے قریب مہرِ نبوت تھی، جس پر یہ لکھا ہوا تھا جیسے کہ بعض روایات میں ہے۔ ''سِرْ حَيْثُ شِئْتَ فَإِنَّكَ مَنْصُوْرٌ.'' (1) ''تم جہاں بھی جاؤ، نصرتِ خداوندی تمہارے ساتھ ہوگی''۔

بعض روایات میں ہے کہ لفظ خاتم الانبیاء ''يَا مُحَمَّدُ'' کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ ایسا کچھ مترشح ہوتا ہے، اس کی بیّنت احادیث میں آتی ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ اس درجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کمالاتِ نبوّت سے بھرپور ہیں کہ وہ چھلک کے اوپر آگئے اور نمایاں ہوگئے، اسی طرح سے خاتم الدجّالین دجل وفریب میں اتنا بھرپور ہوگا اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا، ک۔ف۔ر۔ یعنی کفرِ مجسم۔ تو علامت اوپر آجائے گی، غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹھیک تقابل ہے۔

تقابلِ اضداد کی حکمت...... اس امت میں جس درجہ کمالات ظاہر ہوئے، اسی درجہ فسادات کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ اوّل تو کمال سے فساد کا تقابل ہوتا ہے۔ ہر کمال کی خوبی تب کھلتی ہے جب اس کے مقابلے میں نقص آتا ہے۔ ایمان کی قوت تب کھلتی ہے۔ جب اس کے مقابلے میں کفر آجائے۔ ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ (2) ہم باطل کو ٹکرا دیتے ہیں حق سے اور جب وہ حق سے ٹکر کھا کر پاش پاش ہوتا ہے تو حق کی قوتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ اگر باطل نہ رکھا جائے تو حق کی قوت نمایاں نہ ہو۔ تو اضداد رکھی گئیں

اس لئے حضرات انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں دجّال رکھے گئے، جس درجے کا نبی اسی درجے کا دجّال۔ بہر حال میری غرض یہ تھی کہ جیسے شیاطین کا مقابلہ ملائکہ سے ہے، دجّالوں کا مقابلہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے ہے۔ انبیاء کے متبعین میں جو مقبل لوگ ہیں انہیں آئمہ ہدایت کہتے ہیں۔ ادھر کفر کے سلسلہ میں آئمہ الکفر ہیں۔ تو آئمہء ہدایت کا آئمہء ضلالت سے مقابلہ ہے۔ اسی طرح اتقیاء کا مقابلہ فجّار سے ہے۔ اوپر سے لے

(1) الحديث اخرجه الشيخ الصالحي الشامي في "سبل الهدى والارشاد" وقال، قال ابن دحية: وهذا غريب واستكروه ج: ۲ ص: ۵۲. عمدة القارى، كتاب الوضو، باب استعمال فضل وضوء الناس، ص: ۲ ارقم ۱۳۱. (2) پاره: ۱۷، سورة الانبياء الآية: ۱۸.

کر نیچے تک تقابل چل رہا ہے۔ بہر حال حضرات انبیاء علیہم السلام سے دجالین کا مقابلہ ہے۔ اسی لئے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے خاتم الدجالین کا مقابلہ ہے۔

استدراجِ دجال...... ظاہر بات ہے کہ جس پر دجل کے سارے مراتب ختم ہوں گے، معمولی قسم کی روحانیت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بڑے بڑے اولیاء کاملین بھی اس کے مقابلے سے عاجز ہوں گے۔ اسی لئے حدیث میں حکم فرمایا گیا کہ: دجال ظاہر ہو تو سیر وتماشے کے طور پر بھی اسے دیکھنے کے لئے مت نکلو۔ وہ ایمانوں کو اس طرح سلب کرے گا جیسے مقناطیس لوہے کو اپنی طرف جذب کر لیتا ہے۔ تو تماشا دیکھنے کے لئے بھی مت جاؤ۔ بلکہ مقفل اور محبوس ہو جاؤ۔ اس کے سامنے مت جاؤ، گویا یہ اس کی علامت ہے کہ کوئی کتنا بڑا صالح ہوگا، روحانیت والا ہوگا لیکن اس کا دجل اور فریب اور جو اس کے ہاتھ پر کرشمے استدراج کے طور پر ظاہر ہوں گے، وہ اتنے بڑے ہوں گے کہ ولایت کام نہیں دے گی، کوئی کتنا ہی بڑا ولی ء کامل ہو کر اس کا مقابلہ کرے۔ جب تک نبوّت کی قوت مقابلہ پر نہ آئے۔ کیوں کہ اصل دجال کا مقابلہ ہی نبوّت سے ہے۔

قتل دجال کی صورت...... اب ایک صورت یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست دینی چاہیئے۔ تب تو وہ قتل ہو۔ عام ولایت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ غرض ایک صورت تو یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دجال کو ظاہر کر دیا جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قتل کر دیتے۔ وہ قتل تو ہو جاتا۔ لیکن اگر وہ اس زمانے میں ظاہر ہو کر قتل ہو جاتا تو اس کے دجل وفریب کے جو مراتب اور مقامات ہیں، وہ نہ کھلتے کہ ان سے تقابل ہو کر ایمان کی قوتیں ظاہر ہوتیں۔ بلکہ وہ یکدم سامنے آتا اور ختم ہو گیا ہوتا۔ اور مقصد یہ تھا کہ دجال ظاہر ہو اور اس کے سبب باطل کی استعدادیں پیدا ہوں۔ اس باطل سے پھر حق کی قوتیں ٹکرائیں۔ اور حق کی قوت نمایاں اور واضح ہو، اگر اس وقت ظاہر ہوتا تو یہ تقابل ختم ہو جاتا بس وہ ہاتھ کے ہاتھ قتل ہو جاتا۔ اس لئے اس کا ظہور آخر دور میں رکھا گیا تا کہ اس کے قلب کے اثرات سے امت میں باطل بھی ظاہر ہوتا رہے۔ اور اسلام اس کا مقابلہ بھی کرتا رہے۔

اب دوسری صورت قتل کی یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک باقی رکھا جاتا کہ وہ ظاہر ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قتل کر دیں۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے فروتر بات ہے کہ محض قتل دجال کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم میں باقی رکھا جاتا۔ نیز یہ کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی رکھا جاتا تو دجل وفساد کے مراتب سامنے نہیں آسکتے تھے۔ نبوّت کی قوتیں اتنی پھیلی ہوئی ہوتیں کہ دجل کچھ نہ کر سکے، تو اسے بھی موقع دینا تھا کہ وہ نمایاں ہو اور پھر شکست کھائے تا کہ دجل کا ضعف حق کے مقابلے میں واضح ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کو قاتل دجال بنانے کی حکمت...... اب کئی چیزیں پیدا ہو گئیں۔ دجال کا قتل بغیر نبوّت کی طاقت کے نہیں ہو سکتا۔ اور نبوّت بھی معمولی نبوت نہیں بلکہ ختم نبوّت کی قوت ہو جب وہ ختم ہو۔ ولایت کام نہیں دے سکے گی۔ اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا باقی رکھا جانا بھی مصلحت کے خلاف تھا کہ محض اس کے قتل کے

لئے باقی رہیں۔اب اس کے جمع کی صورت حق تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ: حضرت مسیح علیہ السلام کو دجال کا قاتل قرار دیا۔ان میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں متعدد مناسبتیں اور مشابہتیں ہیں جو اور انبیاء علیہم السلام میں نہیں ہیں۔

وصفِ خاتمیّت میں مماثلت...... مثلاً پہلی بات یہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور خاتمیّت کا مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔تو ایک گونہ خاتمیّت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بھی ہے کہ وہ خاتم انبیاءِ بنی اسرائیل گویا ہیں جو سب سے بڑا دورِ نبوت کا ہے، وہ اسرائیلی نبوّت کا ہے۔ہزار ہا انبیاء اس کے اندر پیدا ہوئے اور فرمایا گیا ﴿وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① ہم نے اس خاندان کو جہانوں پر برگزیدہ کیا۔اور اس خاندان میں ہم نے نبوت بھی دی اور بادشاہت بھی دی۔﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② نبوت کی دولت دی، ملوکیت کی دولت دی اور وہ نعمتیں دیں جو عالم میں ان سے پہلے کسی قوم کو نہیں دی گئیں، ایک عظیم انسانی خاندان جس میں ہزار ہا انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے۔اس کے خاتم حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ان پر آکر اسرائیلی نبوّت منتہی ہوگئی۔تو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق نبوّت کے خاتم ہیں۔حضرت مسیح علیہ السلام خاتم انبیاءِ بنی اسرائیل ہیں۔تو خاتمیّت کے مقام میں ایک گونہ گویا مناسبت ہوئی۔

وصفِ رحمت میں مماثلت...... پھر جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمتِ مجسم فرمائی گئی ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ③ یہی رحمتِ مجسّم حضرت مسیح علیہ السلام کی شان بتلائی گئی ہے۔ جہاں ان کی پیدائش کا ذکر ہے اس میں فرمایا گیا ہے۔

﴿وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا﴾ ④ جب حضرت مریم رضی اللہ عنہا نے کہا کہ: ﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا﴾ ⑤ ”میرے بیٹے کہاں سے ہوسکتا ہے۔بشر نے مجھے چھوا نہیں، زانیہ و باغیہ میں نہیں ہوں“۔﴿قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا﴾ ⑥ یوں ہی ہوگا۔اللہ کا حکم ہو چکا ہے۔اور یہ اس لئے ہو چکا ہے کہ مسیح علیہ السلام کو ہم نے اپنی قدرت کی نشانی بنانا ہے، بطورِ نشانِ قدرت کے ہم نمایاں کریں گے کہ بلا باپ کے بھی پیدا کر سکتے ہیں۔اور یہ امر طے شدہ ہے۔ایسے ہی ہوگا۔جو رحمت مجسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا۔وہی رحمت مجسّم ہونے کی شان حضرت مسیح علیہ السلام کی فرمائی گئی۔

تربیّتِ اِتباع میں مماثلت...... جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان فرمائی گئی ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ⑦ خود ان صحابہ میں رحمت کا غلبہ ہے۔وہی شان متبعین عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں

① پارہ: ۲۵، سورۃ الجاثیۃ، الآیۃ: ۱۶. ② پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ الآیۃ: ۲۰. ③ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء الآیۃ: ۱۰۷.
④ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۲۱. ⑤ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۲۰. ⑥ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۲۱.
⑦ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، آیت: ۲۹.

فرمائی گئی۔فرمایا گیا﴿ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً﴾ ① ''ان کے اتباع کرنے والوں کے قلوب میں ہم نے رافت اور رحمت بھردی۔'' اتباعِ عیسوی میں غضب کا غلبہ نہیں تھا بلکہ رحمت کا غلبہ تھا۔تو جو غلبہ اصحابِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں فرمایا گیا وہی غلبہ اصحابِ عیسوی کے اندر فرمایا گیا۔اس کا حاصل یہ نکلا کہ تربیّت کے اندر مشابہت ہے۔جو شانِ تربیّت حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے وہی شانِ تربیّت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں ہے جو شانِ رحمت آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔اسی کے قریب شانِ رحمت حضرت مسیح علیہ السلام میں ہے،غرض یہ مناسبات ہیں۔

زہد و شوکت کی زندگی میں مماثلت...... اس کے ساتھ ساتھ ایک اور قوی مناسبت یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو زندگیاں عطاء کی گئیں۔ایک مکّی زندگی کہلاتی ہے۔ایک مدنی زندگی کہلاتی ہے،مکہ کہ زندگی تیرہ سالہ اور مدینہ کی زندگی دس سالہ ہے۔اس طرح نبوّت کے تئیس برس ہوتے ہیں۔تو مکّہ کی تیرہ سالہ زندگی انتہائی زہد اور قناعت کی ہے جس میں تشدد کی اجازت نہیں مار کھاؤ،سہو اور جواب نہ دو۔﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ﴾ ② اے نبی درگزر اختیار کرو۔کہیں فرمایا﴿اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ﴾ ③ اگر یہ بک بک بھی کریں تو تم اعراض کرو۔درگذر کرو۔جاہلوں کی باتوں کی طرف دھیان مت کرو۔اگر یہ تمسخر بھی کرتے ہیں تو انہیں ہم پر چھوڑ دو۔انہیں ہم نپٹ لیں گے۔آپ انہیں جواب نہ دیں۔کہیں فرمایا﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا. اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰهُ قَرِيْبًا﴾ ④ اگر یہ ایذائیں پہنچائیں تو آپ تحمل کریں اور صبرِ جمیل اختیار کریں۔کیا یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کا انجام کچھ دور ہے۔حالاں کہ وہ بہت قریب آ گیا ہے۔عنقریب ان کو پتہ چل جائے گا کہ ان کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے۔

غرض جگہ جگہ حکم ہے کہ نہ تلوار اٹھاؤ۔نہ زبان کھولو، نہ ہاتھ ہلاؤ، ماریں تو مار کھاؤ، گالیاں دیں تو چپ ہو جاؤ۔ہاں کیا کرو﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ ⑤ ان کے ساتھ جہادِ کبیر کرتے رہو۔اس کے راستے میں مار کھانی پڑے تو مار کھالو، پٹنا پڑے پٹ لو۔گویا تلوار کے جہاد کو جہادِ صغیر کہا گیا۔اور زبان سے اعلائے کلمۃ اللہ کو کہا گیا کہ وہ جہادِ کبیر ہے،وہ جہاد کرتے رہو،لیکن مار کھانے کے لئے تیار رہو،مقابلہ میں اف نہ کرو۔تیرہ سال اس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی گذری ہے۔

جب مظالم کی انتہاء ہوگئی کہ گالیاں بھی دی گئیں،ساحر بھی کہا گیا۔کذاب و مجنون بھی کہا گیا اور اشرّ بھی کہا گیا اونٹ کا بوجھ بھی ڈال دیا گیا،کانٹے راستے میں بچھائے گئے۔کتے بھی پیچھے لگائے گئے۔پتھر بھی مارے گئے

① پارہ:۲۷،سورۃ الحدید،الآیۃ:۲۷. ② پارہ:۱۴،سورۃ الحجر،الآیۃ:۸۵.
③ پارہ:۱۴،سورۃ الحجر،الآیۃ:۹۴،۹۵. ④ پارہ:۲۹،سورۃ المعارج،الآیۃ:۵ تا ۷.
⑤ پارہ:۱۹،سورۃ الفرقان،الآیۃ:۵۲.

اور اخیر میں وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ تو وطن سے بے وطن بھی کیا۔ جب ظلم کی انتہا ہوگئی تب یہ آیت نزل ہوئی:
﴿أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ﴾ ① اب ان لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے جن کی مظلومیت کی حد آ گئی ہے، کہ اب وہ مقابلہ کریں اور جواب دیں۔ بہر حال دس سالہ زندگی شوکت کی زندگی ہے۔ اور تیرہ سالہ زندگی درویشی اور انتہائی فقر وقناعت کی زندگی ہے، تیرہ سالہ زندگی میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ مدینے کی زندگی میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے۔ لیکن اس شوکت کا پیش خیمہ یہی تیرہ سالہ زندگی بنی اس لیے اس تیرہ سالہ زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین کی تربیت کی زہد وقناعت، صبر وحیا، شجاعت وسخاوت بھر دی تا کہ تیرہ برس کے بعد جب یہ مجاہد قوم نکلے تو حظِ نفس کی وجہ سے جہاد نہ کرے، نفسانیت کی وجہ سے نہ کرے بلکہ خالص للّٰہیت کے جذبہ سے میدان میں آئے۔

تو تیرہ برس تربیت کی تا کہ مخلص مجاہد پیدا ہو جائیں۔ اخیر میں جا کے انہوں نے تلوار اٹھائی اور قتال کیا۔ پھر فتح مکہ ہوئی، شوکت کا آغاز ہوا اور یہ سارے کام ہوئے۔ غرض یہ دو زندگیاں۔ اور یہ دونوں باتیں حضرت عیسیٰ السلام میں پائی جاتی ہیں، ایک عیسیٰ علیہ السلام کی چالیس سالہ زندگی ہے یعنی پیغمبری کی ابتداء۔ ان کی تاریخ یہ ہے کہ اگر تمہارے بائیں گال پر کوئی تھپڑ مارے۔ داہنا سامنے کر دو، اف نہ کرو، جواب نہ دو، حضرت مسیح علیہ السلام کی شریعت میں انتقام لینا جائز نہیں ہے بلکہ عفو اور درگزر واجب ہے، غرض تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی مارے تو اور گردن جھکا دو کہ بھئی! ایک اور مارتا جا، خدا تیرا بھلا کرے، یہ گویا مکہ کی زندگی کے مشابہ ہے کہ جس کے اندر نہ ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے، نہ زبان کھولنے کی اجازت۔ لیکن جب مظلومیت کی انتہاء ہوئی۔ یہود نے یہاں تک کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی پر لٹکا دو۔ تب حق تعالیٰ شانہ نے دوسرا بندوبست کیا کہ جو پھانسی پر چڑھانے کے لئے اندر گھسا۔ اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شباہت ڈال دی اور وہ پھانسی پا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انتہائی عزت کے ساتھ اوپر اٹھا لیا گیا۔ دنیا چاہتی تھی کہ انتہائی طور پر ذلیل کریں کہ اس دنیا کے اندر ان کا وجود نہ رہے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اتنی عزت دیں گے کہ آسمانوں پر قیام کرائیں گے اور زندہ رہیں گے، یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہارے ہاتھ سے مارے جائیں گے۔

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ ② نفی کی گئی ہے کہ نہ انہیں پھانسی دی گئی ہے نہ انہیں قتل کیا گیا، جو قتل یا پھانسی کے مدعی ہیں وہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اس شخص کے اوپر شبیہ ڈالی گئی ہے جو لینے کے لئے اور پکڑنے کے لئے گیا تھا، اس کو قتل کیا گیا۔ انہیں علم نہیں ہے۔ اور اخیر میں پھر مؤکد طریق سے کہا کہ انہیں قتل نہیں کیا گیا۔ تو جب قتل نہیں کیا اور پھر موت کے سامان نہیں ہوئے تو رفع کا مطلب یہی ہے کہ

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۳۹. ② پارہ: ۶، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۵۷، ۱۵۸.

جسم کے ساتھ انہیں اٹھایا گیا۔ اگر قتل کر دیئے جاتے اور پھانسی دے دیئے جاتے۔ پھر روح محض کا رفع ہوتا۔ لیکن قتل اور پھانسی کی نفی کر کے فرمایا گیا کہ اللہ نے انہیں اٹھالیا تو وہ اٹھانا زندگی کے ساتھ ہوسکتا ہے اور جسم کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ اس کا حاصل یہ کہ جیسے مظلومیت کی انتہاء پر حکم دیا گیا کہ زمین سے آسمان کی طرف ہجرت کرو، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم چاہتی تھی کہ یہ اس ملّہ شہر میں نہ رہیں۔ تو ملک میں ہجرات کرائی گئی۔ یہود چاہتے تھے کہ اس دنیا میں نہ رہیں۔ اس واسطے آسمانوں کی طرف ہجرت کرائی گئی تو ایک جگہ ہجرت یثرب کی واقع ہوئی ہے اور ایک جگہ آسمان کی واقع ہوئی۔

جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد لوٹایا گیا اور دس سالہ شوکت کی زندگی ہے کہ اس میں تلوار ہاتھ میں ہے اور فاسقین ومنافقین اور فاجرین کے مقابلے پر تلوار بھی ہے، حدود بھی ہیں اور قصاص بھی ہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ لائیں گے، تاکہ اس زہد کی زندگی کے مقابلے میں اب ان کے ہاتھ میں تلوار بھی ہوگی دجال کا مقابلہ بھی ہوگا، دجال کے متبعین کے مقابلے میں تلوار لئے ہوئے ہوں گے۔ قتل وقتال بھی ہوگا، جہاد میں بھی کھڑے ہوں گے۔ اور استیصال کریں گے، جیسا کہ مشرکین مکّہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جزیہ قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کے لئے اسلام تھا یا قتل تھا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے۔ اس وقت دنیا کی قوموں کے لئے یا اسلام ہوگا۔ یا قتل ہوگا۔ جزیہ کا واسطہ بیچ میں نہیں ہوگا۔ یہ جزیہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ تو ٹھیک مشابہت اور مناسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہے، شانِ رحمت میں بھی، وصفِ خاتمیّت میں بھی، اتباع اور متبعین کی شانِ رحمت کے اندر بھی، ہجرت کے اندر بھی، دونوں زندگیوں کے اندر بھی ابتدائی زندگی عدم تشدد کی۔ انتہائی زندگی تشدد کی، ان سب چیزوں میں مشابہت تامہ آپ کو حاصل ہے۔

ولادتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں شبیہِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا دخل...... اور اس میں لطیفے کے طور پر ایک چیز اور بھی ہے، وہ یہ کہ شیخ عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض تابعین رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اثر نقل کیا ہے۔ وہ اس درجے میں تو نہیں ہے کہ اسے بہت بڑی حجت شریعہ سمجھا جائے، ایک تو اثر ہے، اور وہ بھی تابعین رحمۃ اللہ علیہ، کا، مگر لطیفے کے درجے میں اور مویّدات کے درجے میں اسے پیش کیا جاسکتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہوئیں جس کا واقعہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ: حضرت جبریل علیہ السلام ظاہر ہوئے: ﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾ ① ایک بشر تام الخلقت و کامل الخلقت نوجوان جس کے کسی جوڑ و بند میں فرق نہیں تھا، نہایت حسین وجمیل صورت کا انسان نمایاں ہوا۔ جس کو

① پارہ: ۱۶ سورۃ مریم، الآیۃ: ۱۷.

دیکھ کر حضرت مریم رضی اللہ عنہا گھبرا گئیں۔اور فرمایا: ﴿اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْکَ اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا﴾ ① ''اللہ کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو متقی آدمی ہے''۔ تو کہاں ایک نوجوان عورت کے پاس تخلیہ میں آیا؟ ﴿قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَهَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا﴾ ② ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں تیرے پروردگار کا رسول اور قاصد بن کے آیا ہوں تا کہ تجھے ایک بیٹا عطا کر دوں''۔ ﴿قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَکُ بَغِیًّا﴾ ③ میرے بیٹا کدھر سے ہو جائے گا، بشر نے آج تک مجھے چھوا ہی نہیں، بقول شخصے کسی مرد کی آج تک صورت تک میں نے نہیں دیکھی۔ اور ویسے بھی اپنی ذات سے میں کوئی بغیا اور زانیہ نہیں ہوں۔ عفیفہ اور پاکدامن ہوں۔ کبھی کوئی چیز عفت کے خلاف مجھ سے سرزد نہیں ہوئی۔ غرض اپنی ذات سے پاک دامن۔ اور مرد نے مجھے چھوا تک نہیں۔ زنا کا احتمال تک نہیں، پھر کیسے بیٹے آ جائے گا؟ گویا عادتِ عامہ کے اعتبار سے حضرت مریم رضی اللہ عنہا نے ظاہر کیا۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو آنے والے تھے، وہ خرقِ عادت کے طور پر تھے۔ عادت کے طور پر نہیں تھے۔ تو جبریل علیہ السلام نے کہا: ﴿قَالَ کَذٰلِکِ. قَالَ رَبُّکِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ﴾ ④ ''یوں ہی ہوگا اور تیرے رب پر آسان ہے''۔

جو نر اور مادّہ کو ملا کر اولاد دے سکتا ہے، وہ فقط مادّہ سے بھی دے سکتا ہے، وہ فقط نر سے بھی پیدا کر سکتا ہے، دونوں نہ ہوں، ہوا سے پیدا کر دے۔ اب میں کہتا ہوں کہ یہ ہزاروں جاندار بھنڈے اور مچھر پسو ہیں، وہاں نر اور مادّہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، ہوا سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو پروردگار بلا نر و مادّہ کے جاندار پیدا کر سکتا ہے۔ جو حضرت آدم علیہ السلام کو بلا ماں باپ کے پیدا کر سکتا ہے۔ جو حضرت حوا علیہا السلام کو بلا واسطہ عورت پیدا کر سکتا ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بلا باپ کے کیوں پیدا نہیں کر سکتا؟۔ چوں کہ خرقِ عادت کے طور پر پیدا کرنا تھا۔ مگر حضرت مریم علیہا السلام کو عادت کے طور پر اشکال تھا، اس کو دفع کر دیا کہ ﴿قَالَ کَذٰلِکِ. قَالَ رَبُّکِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ﴾ ⑤ ''تیرے رب پر یہ آسان ہے۔ اس میں اشکال کی کوئی بات نہیں۔ غرض انہوں نے پھونک مار دی اور وہ حاملہ ہو گئیں''۔

اس پر شیخ عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام جو بشر سوی یعنی کامل الخلقت بشر کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں تو اس کے بارے میں بعض تابعین کا اثر نقل کیا کہ وہ شبیہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، یعنی صورتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم بن کر نمایاں ہوئے۔ تو حقیقت جبرئیلی تھی اور صورت محمدی تھی۔ نفخہ تو جبریلی ہوا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ہوا۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت میں شبیہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ دخل ہے اور کچھ مناسبت ضرور حاصل ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے اوصاف میں

① پارہ:١٦، سورۃ مریم، الآیۃ:١٨. ② پارہ:١٦، سورۃ مریم، الآیۃ:١٩.

③ پارہ:١٦، سورۃ مریم، الآیۃ:٢٠. ④ پارہ:١٦، سورۃ مریم، الآیۃ:٢١. ⑤ پارہ:١٦، سورۃ مریم، الآیۃ:٢١.

مناسبت ہے، وصفِ خاتمیت میں بھی، وصفِ رحمت میں بھی، اِتباع کی شانِ تربیت میں بھی، اور زندگیوں کے ادوار میں بھی، یہ اس شبیہِ مبارک کا اثر ہے کہ ساری مناسبتیں نمایاں ہوتی چلی گئیں۔

زوجیّتِ حضرت مریم علیہا السلام......اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جیسے حدیث میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن حضرت مریم علیہا السلام بطورِ زوجہ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی جائیں گی۔ یہ روایات میں موجود ہے۔ اس سے گویا مناسبت نکلتی ہے کہ شبیہِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت مریم علیہ السّلام مثل زوجہ کی تھیں۔ اب اس شبیہ کے ساتھ میں وہ حقیقت اور ذات بھی پیش کردی گئی کہ اب وہ اس کے لئے زوجہ بنے۔ بہرحال یہ چیزیں لطیفے کے طور پر عرض کررہا ہوں۔ یہ تو حجت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زوجہ بنا کردی جائیں گی۔ لیکن یہ جو اثر میں نے نقل کیا ہے، یہ اتنی قوی حجت نہیں ہے۔ مگر لطائف اور مویدات کے درجے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال اتنی مناسبتیں ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقامِ تجدید...... جب اتنی مناسبتیں ہیں اور وصفِ خاتمیت میں بھی مناسبت ہے تو قتلِ دجّال کے لے زیادہ مستحق حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے جب کہ وہ بمنزلہ بیٹے کے بھی ہوئے۔ تو باپ کے دین اور مشن پر جب آفت آئے تو بیٹا ہی زیادہ حق دار ہوتا ہے کہ باپ کی طرف سے مدافعت کرے اور باپ کی طرف سے حمایت کرے۔ یہ دجّال گویا دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر آفت لائے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام زیادہ مستحق تھے کہ دین کی حمایت کے لئے بطورِ مجدّد کے بڑھیں اور قتل کریں اور دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے اندر برپا کریں۔ چناں چہ اسے قتل کریں گے۔

غلبۂ اسلام...... اور حدیث میں ہے کہ: دجّال کے ساتھ کثرت سے یہود ہوں گے۔ جن کے اندر تھوڑی بہت سعادت ہوگی وہ حضرت مہدی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایمان قبول کریں گے۔ اس لئے کہ مہدی رضی اللہ عنہ وہ تبرکات نکالیں گے جو "تابوتِ سکینہ" میں ہیں۔ اور تابوتِ سکینہ کی روایات میں ذکر آتا ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پگڑی ہوگی۔ اور "الواحِ توراۃ" ہوں گی۔ یہ تابوت جو دفن کیا تھا، اس کا پتہ نہیں ہے۔

لیکن حضرت مہدی رضی اللہ عنہ پر منکشف ہوگا، اس میں سے وہ چیزیں دکھلائیں گے۔ تو جس جس یہودی کے اندر ذرا بھی سعادت ہوگی وہ ایمان قبول کرے گا۔ اور جس نصرانی میں سعادت ہوگی وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان قبول کرے گا۔

تو دنیا میں تین ہی قومیں بڑی ہیں۔ ایک مسلمان، ایک یہود، اور ایک نصاریٰ۔ یہی عظیم قومیں ہیں جو مستند ہیں۔ یہود کا وجود اس طرح ختم ہوجائے گا، جن میں سعادت ہے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوں گے۔ جن میں نہیں ہے وہ دجّال کے ساتھ ہوجائیں گے اور مقتول ہوجائیں گے۔ ایک قوم ختم ہوگئی۔ نصاریٰ کے بارے میں یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اوپر ایمان لے آئیں گے۔ یہ قوم یوں ختم ہوئی۔ اب ایک ہی قوم مسلم رہ جاتی ہے۔

وَيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ. ① تو پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔ پورے عالم میں ایک ہی دین اور ایک ہی مذہب اور ایک ہی پلیٹ فارم ہوگا۔ اور پوری دنیا کے انسانوں کا ایک نقطۂ نظر ہو جائے گا۔

غرض جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دس سالہ شوکت قائم ہوئی اور حجاز کے بارے میں فرمایا گیا ﴿يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ ② ''فوج درفوج اسلام میں داخل ہو جائیں گے''۔ تو حضرت مسیح علیہ السلام کے سامنے پوری دنیا کے انسانوں کا بھی، یہی نقشہ ہوگا۔ کہ ﴿يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ ③

مراتبِ تکمیلِ دین کی صورتیں..... فرق کیا ہوگا؟ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ ④ دین کو کامل کر دیا گیا۔ تو تکمیلِ دین کی دو صورتیں ہیں ایک کیفی طور پر ایک اور کمی طور پر۔ ایک تو کیفیت کے لحاظ سے اتنا مکمل ہو کہ ہر فرد دین کا ایسا مجسمہ بن جائے کہ گویا اسلام مجسّم ہے۔ تو یہ کیفیت کے لحاظ سے ہے۔ اور کمیّت وتعداد کے لحاظ سے اسلام کی تکمیل کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ دنیا میں کوئی غیر مسلم باقی نہ رہے۔ ساری تعداد مسلمانوں ہی کی ہو۔ تو کہا جائے گا کہ عدد کے لحاظ سے اب مکمل ہوا اور کیفیت کے لحاظ سے یوں تکمیل ہے کہ چاہے تھوڑے ہوں مگر ہر ایک اسلام مجسّم ہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اسلام کی کیفی تکمیل کی۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب قریب ایسے صحابہ رضی اللہ عنہم پیدا کئے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے نمونے تھے۔ اور ایک ایک فرد اسلام مجسّم تھا۔ اس لئے امّت کا اجماع ہے کہ نیت، عدل، کمالات واخلاق اور علم ومعرفت کے لحاظ سے۔ ''اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ. ''⑤ ''ان سے زیادہ متقی اور پارسا دنیا میں نہیں ہے''۔

امت میں بڑے بڑے غوث پیدا ہو جائیں۔ صحابیت رضی اللہ عنہن کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے، اس لئے کہ براہ راست آفتاب نبوت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تربیّت کی ہے۔ اور بلا واسطہ آفتاب نبوّت کا نور ان کے قلب پر پڑا ہے۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علہ وسلم نے ایمان کی تکمیل کیفیت کے لحاظ سے کی۔ تعداد تو تھوڑی تھی کہ دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب نفوس قدسیہ نمایاں ہوئے۔ مگر ایک ایک فرد ایک ایک امّت کے برابر تھا۔ لیکن کمّی تکمیل باقی تھی کہ عددی طور پر اسلام اتنا پھیلے کہ دنیا میں غیر مسلم کا وجود باقی نہ رہے۔ یہ تکمیل آخری مجدّد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہوگی۔ وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ. ہر قوم ختم ہو کر ایک قوم رہ جائے گی، اور وہ اسلامی قوم ہوگی۔ تو پورے عالم میں دینِ واحد پھیل جائے گی۔

اسلام کا غلبۂ تام..... اس لئے دعویٰ فرمایا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ⑥ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجا اور ہدایت بھیجی تا کہ تمام ادیان پر اس دین کو غالب

① پارۃ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۳۹. ② ③ پارہ: ۳۰، سورۃ النصر، الآیۃ: ۲.
④ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۳. ⑤ عمدۃ القاری، کتاب الوضو، باب الماء الذی یغسل بہ شعر، ج: ۳، ص: ۳۹۹. ⑥ پارہ: ۲۸، سورۃ الصف، الآیۃ: ۹.

کردے۔ اور غلبۂ تام کا حاصل یہ ہوتا ہے۔ کہ مغلوب چیز کالعدم اور صفر کے درجے میں ہو جائے، غالب ہی کا وجود رہ جائے۔ تو ایک ہی دین غالب آجائے گا جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہوگا، اس سے اندازہ ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گونا گوں مشابہتیں اور مناسبتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہیں۔ اوصاف میں بھی، افعال میں بھی، وجود میں بھی، ذات میں بھی۔

اور سب سے زیادہ زمانے کے لحاظ سے اقرب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان میں کوئی نبوّت نہیں آئی، تو عہد کے لحاظ سے اشبہ ترین بھی وہی ہیں۔ تو وہ زیادہ احق تھے کہ دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اور مدافعت کریں اور اس دجّالِ اعظم کو قتل کریں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے قتل نہیں کرایا گیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شبیہ کے ہاتھ سے قتل کرایا گیا۔ جس میں وہی طاقت رکھی گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کی حکمتیں...... اور اس کے ساتھ میں ایک فائدہ اور مصلحت یہ بھی حاصل ہوئی کہ یہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَمَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ ① اگر آج کے دور میں موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو میرا اتباع کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میرے ہی دین میں داخل ہو کر رہنا پڑتا۔ تو حق تعالیٰ نے اس کو عملی طور پر نمایاں کر دیا کہ جس قوم کی ابتداء حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی ہے اس کا نچوڑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کو امتی بنا کر لایا گیا تا کہ کل اسرائیلی پیغمبر امتی شمار کئے جائیں۔ خاتم سے جو چیز سرزد ہوتی ہے وہ پورے دائرے کی شمار کی جاتی ہے۔ تو یہ بھی اس سے نمایاں ہوگیا۔ غرض خاتم الدجالین کا ظہور خاتم الانبیاء ہی کے دور میں ہونا چاہیئے تھا۔ دیگر انبیاء علیہم السلام کے دور میں نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اس کا حقیقی تقابل آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، ولایت کی روحانیت اس کے مقابلے کے لئے کافی نہیں ہے نبوّت کی روحانیت ضروری تھی اور اس میں بھی ختم نبوّت کی کچھ نہ کچھ شان موجود ہوتا کہ وہ خاتم الانبیاء کی طرف سے قاتل بنے۔ اس واسطے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع کیا گیا۔

اور اس لئے بھی رفع کیا گیا کہ یہود نے انتہائی تذلیل کا ارادہ کیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انتہائی اعزاز دیا۔ تم ان کو زمین میں بھی رکھنا نہیں چاہتے ہو۔ ہم زندگی کے ساتھ آسمانوں میں باقی رکھیں گے۔

اب آگے روایتی مسئلہ ہے تو احادیث ان مضامین سے بھری پڑی ہیں، یہ چیزیں لطائف اور اسرار کے درجے میں ہیں کہ اگر کوئی یوں پوچھے کہ مصلحت آخر کیا تھی؟ تو یہ مصالح تھیں۔ لیکن معاملے کی بنا مصالح کے اوپر نہیں ہے۔ بنا تو روایت کے اوپر ہے۔ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ اگر ایک بھی مصلحت ہمیں معلوم نہ ہو، حکم اپنی جگہ حق ہے۔

اسلام کی شانِ خاتمیّت...... لیکن یہ اسلام کی ایک خاتمیّت کی شان ہے کہ جو حکم آیا اس میں حکمت ضرور ہے،

① مسند احمد، مسند جابر بن عبدالله رضي الله عنه، ج: ۲۹، ص: ۱۵۳.

جو کوئی امر آیا اس میں کوئی نہ کوئی علّت ضرور ہے۔ جو ہدایت دی گئی اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ ﴿عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ. وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ وَمَآ اَنَامِنَ الْمُشْرِکِیْنَ﴾ ① جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اور میرے صحابہؓ معاذ اللہ صُمًّا وَّعُمْیَانًا اندھے بہروں کی طرح سے نہیں گرتے بلکہ حجت کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ دین میں بصیرت ہے، دین اسلام رسوم کا مجموعہ نہیں ہے کہ چند رواج جمع ہو گئے جن کی نہ مصلحت معلوم ہو نہ کچھ اور۔ باپ دادا سے سنتے آئے بس عمل کر لیا۔

جیسا کہ دوسرے مذاہب میں رسوم غالب ہیں۔ ان رسوم کی مصلحت پوچھی جائے تو جواب یہ ہوتا ہے کہ: ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ﴾ ② باپ دادا کو اسی طرح سے کرتے ہوئے دیکھتے چلے آئے ہیں۔ کوئی علت یا کوئی حکمت جو منجاب اللہ نازل کی گئی ہو نہیں ہے۔ تو اسلام ایسی چیز نہیں ہے۔ اس میں جو حکم بھی ہے اس میں حکمت ہوگی۔ جو امر ہے اسمیں کوئی نہ کوئی علت ہوگی۔ جو ہدایت ہے اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ تو مصالح اس طرح سے عارفین نے بیان کی ہیں۔ حکم کی بناء مصالح پر نہیں ہے۔ اگر ایک بھی مصلحت ہمیں معلوم نہ ہو ہم اس پر ایمان لائیں گے۔ جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اس سے ایک طمانیت حاصل ہو جاتی ہے جب مصلحت حاصل ہو جاتی ہے۔ کہ چلو مصلحت بھی سامنے آ گئی۔ لیکن نفس ایمان مصالح کے اوپر موقوف نہیں۔

تعوّذ دجّال کی دعاء کی حکمت ...... اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دجال پیدا ہو جاتا تو اس کا فتنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر معاذ اللہ کارگر تھوڑا ہی ہو سکتا تھا۔ اس دعاء میں دجال کے پیدا ہونے یا نہ ہونے کا ذکر نہیں۔ جس میں دجال سے پناہ مانگی گئی ہے۔ ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ'' ③ ''اے اللہ! میں فتنۂ دجال سے پناہ مانگتا ہوں''۔ اس میں امت کی تعلیم مقصود ہے۔ یعنی جن لوگوں کو دجال سے سابقہ پڑے گا ان کا فرض ہے کہ وہ یہ دعاء مانگیں۔ یا جیسے فرمایا گیا جو شخص سورہ کہف کثرت سے تلاوت کرے گا بالخصوص جمعہ کے دن تو فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔

دوسرے یہ کہ ایک دجّال ذات ہے اور ایک دجّالیت ہے اور اس کے اوصاف اور اس کا فتنہ۔ اوصاف اور فتنہ اس کے ظہور پر موقوف نہیں' اس کی آمد کے قرب میں دجل وفساد کے آثار شروع ہو جائیں گے۔ وہ اس کے ظہور کا اثر ہوگا۔ جیسے آفتاب کا اثر دو گھنٹے پہلے کچھ نہ کچھ سفیدی اور کچھ چاندنا شروع ہو جاتا ہے۔ یا جیسے حدیث میں فرمایا گیا: اِذَآ اَرَادَ اللّٰہُ شَیْئًا ھَیَّأَ لَہٗٓ اَسْبَابَہٗ ...... جب اللہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسباب کا ایک سلسلہ بچھاتا ہے کہ تدریجاً رفتہ رفتہ ایک مدت میں جا کے وہ چیز ظہور کرتی ہے مگر پہلے سے اسباب بچھنا شروع ہو جاتے ہیں، تو دجّال کے ظہور سے پہلے اسباب مہیا ہوں گے۔ قلوب میں اس کی باتیں قبول کرنے کی استعدادیں پیدا

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸. ② پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۲۲.

③ الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب الدعاء قبل السلام، ص: ۶۶، رقم: ۸۳۲.

ہوں گی تو دجّال اور فسادات اس کے آثار میں سے ہیں۔ باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دعاء مانگنا تاسی کے لیے ہے تا کہ امت کو اسوہ معلوم ہو جائے کہ یہ دعاء کرنی چاہیئے۔

عبدیّتِ عیسوی (علیہ السلام)...... احادیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسجدِ اقصیٰ کی چھت کے اوپر ملائکہ کے کندھوں کے اوپر ہاتھ ٹیک کر آئیں گے۔ اور لباس یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اوپر دو چادریں ہوں گی۔ ایک زرد اور ایک گیرو رنگ کی۔ گویا جو زہد وقناعت کا مظاہرہ ہے اسی رنگ کا لباس ہوگا۔ اور آ کر فرمائیں گے کہ سیڑھی لگاؤ' گویا جو اور فضا میں تو بواسطہ ملائکہ آئے۔ یعنی باطنی اسباب کے تحت، اور جب چھت کے اوپر آ کر ٹک گئے۔ اب مادّی دنیا کا معاملہ شروع ہو گیا۔ تو اب مادی اسباب کی طلب ہوئی کہ سیڑھی لگاؤ کہ میں اتروں۔ ورنہ ملائکہ کے واسطہ ہی سے نیچے اتر سکتے تھے، لیکن ملائکہ نے جو اور فضا تک پہنچایا جہاں اسباب نہیں پہنچتے۔ اور جہاں سے اسباب شروع ہوئے وہاں سے اسباب اختیار کئے۔ کیونکہ عبدیت کا ظہور اسی میں ہوتا ہے کہ اسباب کو قطع نہ کیا جائے، بلکہ اختیار کیا جائے۔ جب آئیں گے تو نماز کا وقت ہوگا اور حضرت مہدی رضی اللہ عنہ تواضع کریں گے کہ آپ نماز پڑھائیں۔ فرمائیں گے نہیں۔ یہ امت اللہ کے ہاں بڑی معظم ہے: وَاِمَامُکُمْ مِنْکُمْ. ① تمہارے حضرت امام تمہارے ہی اندر سے ہوں گے، آپ ہی احق ہیں کہ نماز پڑھائیں چنانچہ مہدی رضی اللہ عنہ نماز پڑھائیں گے۔ بہرحال یہ سارے واقعات تفصیل سے آتے ہیں۔

مدفنِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی قبرِ مبارک کے درمیان میں جگہ خالی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہاں دفن ہوں گے۔ اولاد بھی ہوگی۔ اس واسطے کہ جب آسمان پر گئے ہیں جب تک تو نکاح نہیں ہوا تھا۔ آئیں گے تو نکاح بھی ہوگا۔ اولاد بھی ہوگی، پھر وفات ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب دفن ہوں گے۔

یہ تمثیلی طور پر ایسا ہے جیسے کسی کی اولاد کوئی عظیم کارنامہ کر کے باپ کے اوپر سے آفت کو ٹلائے اور فاتح بن کے آئے کہ میں نے آپ کے مشن کو بالکل محفوظ کر دیا تو باپ شاباش کے طور پر بغل میں لے لے کہ میرے قریب آ جا۔ دجال کو قتل کیا، عالم میں دین پھیلایا۔ فرمایا گیا کہ اب میرے پہلو میں آ جاؤ جو تمہارا حق ہے۔

علاماتِ ظہورِ مہدیؓ...... جیسی تفصیل حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ہے ویسی ہے ظہورِ مہدیؓ کے بارے میں بھی ہے، حضرت امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس میں وہ ساری حدیثیں جن میں بعض صحیح ہیں، بعض حسن ہیں اور بعض ضعیف ہیں۔ مگر ساری قابلِ احتجاج ہیں۔ وہ سب نقل کر دی ہیں، اس میں تمام علامات ذکر ہیں۔ حضرت مہدیؓ کا نسب نامہ، ان کا حلیہ اور ان کے ظہور کی نوعیت، پھر علاماتِ قریبہ اور علاماتِ بعیدہ بھی بیان کی ہیں۔ بعض وہ علامات ہوں گی جو بالکل ظہور کے قریب میں آئیں گی۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسی بن مریم، ص: ۲۸۲، رقم: ۳۴۴۹.

قریب ترین علامت مثلاً یہ فرمائی گئی کہ حجاز کے اندر سونے کا پہاڑ ظاہر ہوگا۔ تو سونے کی کان تو حجاز میں نمایاں ہو چکی ہے۔ یہ بھی فرمایا گیا زمین اپنے خزائن اور دفائن اگلنا شروع کر دے گی، تو آج کوئی حجاز کو جا کر دیکھے تو وہاں پانی بھی ہے، سبزی بھی اگ رہی ہے، اسی طرح معدنیات کے بھی آثار ہیں، وہ بھی نکل رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سرزمین حجاز نے سونا اگلنا شروع کر دیا ہے۔ دنیا کے ملکوں کے پاس آج اتنی دولت نہیں جتنی عربوں کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ چھپر پھاڑ کر دے رہے ہیں۔ یہ علامتیں ہیں۔

منیٰ میں جنگِ عظیم...... مگر قریبی علامت یہ فرمائی گئی کہ: جس سال ظہور ہوگا، وہ مکہ میں ہوگا، اس سال منیٰ میں حجاج میں باہم جنگِ عظیم ہوگی اور اتنا قتل وقتال ہوگا کہ جمرۂ عقبہ خون سے بھر جائے گا اور ہزاروں انسان آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے۔ بلکہ یہ عدد بھی مذکور ہے کہ ۳۱۳ آدمی باقی بچیں گے۔ باقی سب قتل ہو جائیں گے، اب انہیں فکر پڑے گی کہ کوئی تو ہمارا سرگروہ ہو ورنہ ہماری زندگی بھی ختم ہو جائے گی اب ہم کہاں جائیں؟۔ پھر وہ مکہ مکرمہ میں آئیں گے۔ اور وہ اس علامت کو پہچانتے ہوں گے کہ منیٰ میں قتل ہونا اور جمرہ عقبہ کا خون سے بھرنا یہی ظہورِ مہدیؓ کی علامت ہے، تو انہیں یقین ہوگا کہ حضرت مہدیؓ ظاہر ہوں گے اور وہ مکّے میں ہوں گے، تو حدیث میں ہے کہ وہ حضرت مہدیؓ کی طرف رجوع کریں گے تو حضرت مہدیؓ ان سے چھپ کر مدینے کا راستہ لیں گے، یہ لوگ وھاں پہنچیں گے، وہ پھر چھپ کر مکے میں آئیں گے۔ پھر مطاف کے اندر یہ انہیں پکڑیں گے۔ وہ فرمائیں گے کہ میں ایسی قوم کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا جو اس درجہ آپس میں خونریزی کرے۔ تم لوگوں کا کیا اعتبار ہے۔ یہ انہیں بھی دھمکی دینا شروع کر دیں گے۔ پھر ان کے ہاتھ پر بیعت ہوگی۔ اسی کے بارے میں وہ روایت ہے جو صحیح بخاری میں ہے کہ ایک آواز بھی غیب سے ظاہر ہوگی کہ: ''هٰذَا خَلِيْفَةُ اللهِ الْمَهْدِيُّ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِيْعُوْهُ.'' ① ''یہ خلیفۃ اللہ حضرت مہدیؓ ہیں ان کی سمع وطاعت کرو۔''

شام کی جنگِ عظیم...... جب وہ ان سے بیعت لے لیں گے، پھر یہ آواز پھیلے گی اور شہرہ ہوگا تو پھر نجائب عراق، ابدالِ شام اور اقطابِ ہند تمام اطراف سے جو مسلمان منتشر ہوں گے اور انتہائی کمزوری کی حالت میں ہوں گے، وہ سب سیاہ جھنڈوں کے نیچے خراسان کی طرف سے شام کی طرف بڑھیں گے تاکہ حضرت مہدیؓ کے لشکر میں داخل ہوں۔ اور حضرت مہدیؓ شام کو اپنا مرکز بنائیں گے اور شام ہی میں وہ ملحمۂ کبریٰ اور جنگِ عظیم نمایاں ہوگی جس کے بارے میں احادیث میں فرمایا گیا کہ اتنا لمبا چوڑا محاذ ہوگا کہ کوّا جو سب سے زیادہ اڑتا ہے یہ دن بھر اڑے گا اور لاشیں ہی لاشیں اس کے نیچے ہوں گی۔ یہ دیکھتا ہوا چلا جائے گا۔ اتنا لمبا محاذ ہوگا۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جنگ محض تیر وتفنگ کی جنگ نہ ہوگی۔ ہزاروں میل کا لمبا محاذِ جنگ جبھی ہوسکتا ہے جب مشین ہو ورنہ اگر ایک میدان میں جنگ ہو جائے، چاہے دو لاکھ آدمیوں کی ہو۔ وہ میل دو میل یا دس

① الحديث اخرجه ابن ماجه ولفظه: فاذا رأيتموه فبايعوه ولو حبواً على الثلج فانه خليفة الله المهدى، ج: ١٢ ص ١٠٢.

میل میں ہوگی، لیکن ہزاروں میل مقتولین کی تعداد ہو جائے اور پھیلے ہوئے پڑے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی عظیم الشان اور لمبا چوڑا محاذ ہوگا۔

مغرب کی طاقتوں کی شکست...... وہ ملحمۂ کبریٰ جس کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ مغرب کی طاقتیں ان کے ہاتھ پر ٹوٹیں گی۔ اور پھر مسلمانوں کا عروج شروع ہوگا اور دین واحد ہو جائے گا۔ اس وقت سب سے زیادہ طاقت نصاریٰ کی ہوگی۔ پورے عالم پر انہیں کا غلبہ ہوگا۔ یہ طاقت حضرت مہدیؓ کے ہاتھ پر ٹوٹے گی۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا دوامی مقابلہ اگر کسی قوم سے ہے تو وہ عیسائی قوم ہے

مشرکین سے اسلام کا مقابلہ...... اس لئے کہ سب سے پہلے اسلام کو مشرکین عرب سے مقابلہ پڑا، لیکن وہ ختم ہوگیا اس واسطے کہ جب فتح مکہ ہوئی تو یا وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے یا قتل یا ہوئے جلاوطن ہو گئے۔ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ آج شیطان مایوس ہوگیا ہے کہ جزیرۂ عرب میں اب اس کی پوجا کی جائے۔ یعنی اب دوسرا دین نہیں آئے، گا مگر مسلمانوں میں آپس میں تفریق اور گروہ بندیاں ہوگی۔ مگر کوئی دوسرا دین اسلام کے مدمقابل آ جائے یہ نہیں ہوگا۔ گویا مشرکین سے حجاز میں دوامی طور مقابلہ ختم ہوگیا۔

مجوس سے اسلام کا مقابلہ...... دوسرا مقابلہ مجوس سے پڑا، ان کی بڑی عظیم شوکت تھی، کسریٰ کی سلطنت تھی اور پورا ایران اور خراسان گویا ان کے ہاتھ میں تھا، تو حدیث میں ہے کہ آپؐ نے کسریٰ کے نام فرمان لکھ کر بھیجا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی تھی۔ اس نے آپؐ کے نامہ مبارک کو ٹکڑے کر کے چاک کر کے پھینک دیا۔ جب آپؐ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا ''جس طرح میرا فرمان ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔ خدا اس کا ملک ٹکڑے ٹکڑے کرے''۔

یہ پیشن گوئی حضرت عمرؓ کے زمانے میں پوری ہوئی۔ اور وہ یہ ہوا کہ کسریٰ پرویز جو ایران کا بادشاہ تھا، وہ اپنے دوائی خانے میں قوت باہ کی دوا کھانے لئے گھسا۔ مگر غلطی سے وہ معجون کھا گیا جو سمی تھا اور وہ وہیں ختم ہوگیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے حکومت کا دعویٰ کیا، سرداروں نے الگ حکومت کا دعویٰ کیا' بھائی بھتیجوں نے الگ دعویٰ کیا۔ پورے ملک میں طوائف الملو کی پھیل گئی اور ملک ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ یہ پیشن گوئی فرمائی گئی تھی اور اس کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانے میں پورا ایران اور خراسان فتح ہوگیا۔ اس طرح مجوس سے مقابلہ دوامی نہ رہا اور ختم ہوگیا۔

یہود سے اسلام کا مقابلہ...... تیسرا مقابلہ حجاز میں یہود سے مدینے اور خیبر وغیرہ میں ہوا۔ یہاں یہ لوگ آباد تھے اور دو ان کے بڑے عظیم قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر تھے۔ جب انہوں نے پے در پے غدر کیا اور معاہدہ شکنی کی۔ تو آخر میں یہ ہوا کہ بنو قریظہ قتل ہو گئے اور بنو نضیر جلاوطن کر دیئے گئے جو مختلف بلاد میں جا کر آباد ہوئے۔ تو حجاز میں یہود سے بھی مقابلہ ابدی طور پر ختم ہوگیا۔

عیسائیوں سے دوامی مقابلہ اور اس کا انجام...... اب رہ گئے نصاریٰ۔ ان کی روم وغیرہ کی طرف مستقل قوت تھی اور قیصر حکمران تھا۔ ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ ہمارا مقابلہ ان سے ختم ہو

جائے گا بلکہ یہ فرمایا۔ ’’اَلرُّوْمُ ذَوَاتُ الْقُرُوْنِ اِذَا هَلَكَ قَرْنٌ خَلَفَهٗ قَرْنٌ اَلْحَرْبُ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سِجَالٌ يَّنَالُوْنَ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُمْ‘‘ روم جو ہیں ان کے درجات وقرون اور طبقات ہوں گے، ان کے اور ہمارے درمیان لڑائی ایسی رہے گی جیسے ڈول رسی کہ کبھی ڈول نیچے جائے گا۔ کبھی اوپر آئے گا کبھی ہم غالب، کبھی وہ غالب۔ کبھی وہ مغلوب کبھی ہم مغلوب۔

ہزار برس تک مسلمان غالب رہے، اس کے بعد ان کا غلبہ شروع ہوا۔ تین چار سو برس سے ان کا غلبہ ہے مسلمان مغلوب ہیں، ظہورِ مہدیؓ کی جو خبر دی گئی ہے اس وقت مسلمان پھر غالب ہوں گے اور یہ مغلوب ہوں گے۔ اور مغلوب بھی ایسے کہ مدغم ہو جائیں گے اور اس پر دورِ دنیا ختم ہے۔

غرض ان کے بارے میں دوامی مقابلہ فرمایا گیا۔ ورنہ اور کسی قوم سے دوامی مقابلہ نہیں۔ وقتی مقابلے ہوں گے لیکن یہ رہے گا کہ کبھی وہ غالب اور کبھی ہم غالب۔ ایک مجموعی طور پر اور ایک جزوی طور پر کہ کسی علاقے میں وہ غالب آ گئے۔ ہم مغلوب ہو گئے، کسی علاقے میں وہ مغلوب ہو گئے، ہم غالب آ گئے بلقان کی ریاست میں کبھی وہ مغلوب ہم غالب، کبھی ہم مغلوب وہ غالب۔ کاغان میں کبھی ہم مغلوب وہ غالب، کبھی وہ مغلوب کبھی ہم غالب۔ ٹرکی کے علاقوں میں یہی ہوتا رہا، ہندوستان میں یہی رہا، عراق میں یہی رہا، یہ غلبہ ومغلوبیت چلتی آ رہی ہے۔ آخری طور پر اس کے ختم کا نتیجہ ظہورِ مہدیؓ کے وقت نکلے گا، اس وقت اس قوم سے بھی مقابلہ ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ اور اقوام سے ختم ہوا۔

مقامِ تجدید...... جو بھی مجدّد ہوتا ہے ضروری نہیں کہ اس کے علم میں ہو کہ میں مجدّد ہوں مگر جذبۂ تجدید تو اس میں ہوتا ہے اور عمل بھی وہ وہی کرتا ہے جو ایک مجدد کرتا ہے اور بعد میں اس کے اعمال سے کھل جاتا ہے، کہ یہ مجدّد تھا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ مجدّد کو اپنے بارے میں معلوم ہو۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ مجدّد دعویٰ کرے کہ میں مجدد ہوں بلکہ اس کا عمل تجدید ہوتا ہے، خود بخود دل میں آ جاتا ہے کہ یہ دین کی تجدید کر رہا ہے، سوائے اس کے کہ جو لوگ مامور من اللہ ہوں اور ان کو اجازت دی جائے کہ تم دعویٰ بھی کرو، وہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔ لیکن نفسِ مقامِ تجدید کے لئے ضروری نہیں ہے کہ مجدّد کو یہ معلوم ہو کہ میں مجدّد ہوں مگر کام اس سے وہی نمایاں ہوں گے جو ایک مجدّد کرتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کمالِ عدل...... حضرت مہدیؓ عظیم الشان جنگ کریں گے۔ اس جنگ کی تفصیل آتی ہے۔ تین جنگیں ہوں گی۔ عظیم ترین جنگ ’’ملحمۂ کبریٰ‘‘ اس میں اتنے مقتولین ہوں گے کہ مسلمان فاتح تو ہو جائیں گے مگر ان کے لئے کوئی خوشی اور مسرّت باقی نہیں رہے گی۔ اس کے بعد پھر مسلمانوں کا عروج شروع ہوگا اور حدیث میں ہے کہ ساٹھ برس حضرت عیسیٰ علیہ السلام حکمرانی کریں گے اور ان کے دور میں اس درجہ گویا امن و امان ان کے کمالِ عدل کی وجہ سے ہوگا۔ جیسا کے روایت میں فرمایا گیا کہ سانپ اور انسانوں کے بچے ایک جگہ کھلیں گے، نہ سانپ کے دل میں یہ خطرہ ہوگا کہ یہ مجھے ماردیں گے، نہ انسانوں کے دل میں یہ خطرہ ہوگا کہ یہ

کاٹ لیں گے۔ نیز یہ کہ بھیڑ اور بھیڑیا ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے۔ اتنا امن ہوگا کہ بکری اپنے اندر امن کو محسوس کرے گی، عدل کی اتنی برکات ہوں گی کہ فرمایا گیا کہ انگور کا خوشہ اتنا پھیلے گا کہ پورا گھرانہ اور قبیلہ اس سے سیراب ہو جائے گا۔ ایک بکری اتنا دودھ دے گی کہ پورا قبیلہ اس کے دودھ سے سیراب ہو جائے گا۔ برکات اتنی ہوں گی کہ ایک مالدار زکوٰۃ صدقات دینے کے لئے نکلے گا تو جس کو دے گا وہ کہے گا کہ میرے گھر میں ڈھیر لگے ہوئے ہیں، تو ہی آ کر لے لے۔ جسے دے گا کوئی قبول کرنے والا نہیں ہوگا کہ میرے گھر میں خود بہت موجود ہے، اس درجہ گویا فراوانی اور برکات ان کے کمال عدل کی وجہ سے ہوں گی۔

اس لئے کہ عدل کا اثر اطمانیت ہے، اور جب قلوب میں اطمینان سا ہوتا ہے تو ہر چیز میں آدمی کو برکت محسوس ہوتی ہے۔ اسی واسطے جو بادشاہ اور حکومت عادل ہوتی ہے۔ اس کی علامت ہے کہ قلوب کے اندر اطمینان سا ہوتا ہے ورنہ بے چینی رہتی ہے، ظلم میں کبھی امن واطمینان نہیں ہوتا عدل میں اطمینان ہوتا ہے، تو جب کسی حکومت میں آدمی محسوس کرے کہ قلب میں تسلی کی کیفیات ہیں تو سمجھ لے کہ حکمران نیک نیت ہے اور عدل کر رہا ہے۔

عدل کی حسّی برکات......اور حسّی طور پر بھی اس کی برکات ظاہر ہوتی ہیں، چناں چہ ہارون الرشیدؒ کے واقعات میں لکھا ہے کہ یہ شکار کھیلتے ہوئے کسی جنگل میں دور تک چلے گئے اور فوج ولشکر سے بھی الگ ہو گئے پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اور پیاس کا غلبہ ہوا۔ تو ایک باغ نظر آیا۔ اس میں گھس گئے۔ باغ کا مالک بوڑھا تھا۔ اس سے انہوں نے جا کر کہا کہ بھئی! پانی ہو تو دو۔ وہ لباس سے اور چہرے مہرے سے سمجھ گیا کہ یہ کوئی بڑی شخصیت معلوم ہوتی ہے کوئی امیر ہے۔

اس نے بہت تہذیب سے بیٹھنے کو جگہ دی اور بٹھلایا۔ اور ایک انار توڑا اور اس کو دبایا تو اس کے عرق سے پورا گلاس بھر گیا۔ وہ ہارون الرشیدؒ کو پلایا وہ نہایت شیریں تھا۔ ہارون الرشیدؒ کے دل میں خیال یہ پیدا ہوا کہ اتنا عظیم باغ میرے پاس بھی نہیں۔ یہ کون امیر ہے جس کا یہ باغ ہے۔ اب جو میں جاؤں گا تو اس باغ پر قبضہ کروں گا۔ یہ باغ بادشاہ کے لئے مناسب ہے، غیر بادشاہ کے لئے موزوں نہیں ہے۔ خواہ مجھے قیمت دینی پڑے یا دباؤ سے لینا پڑے مگر باغ میرے پاس آنا چاہئے۔

پھر کچھ ستائے اور آرام کیا۔ اس کے بعد جب اٹھنے لگے تو مالی سے کہا کہ بھئی! پانی اور پلاؤ۔ اس نے پھر ایک انار توڑا اب وہ اس کو خوب دباتا ہے مگر آدھے سے زیادہ گلاس بھرتا ہی نہیں۔ ہارون الرشید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔ درخت بھی وہی ہے۔ انار بھی وہی ہے۔ یہ کیا بات ہے گلاس بھرتا کیوں نہیں۔؟ اس بوڑھے مالی نے کہا کہ۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہِ وقت کی نیت میں فرق آیا ہے''۔

ہارون الرشیدؒ سمجھ گیا۔ بادشاہ تو وہ خود ہی تھا۔ فوراً اپنے دل میں توبہ کی اور استغفار کیا۔ اور کہا کہ اے اللہ! میں مجرم ہوں۔ میں ہرگز قبضہ نہیں کروں جس کا باغ ہے اسی کو مبارک رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جو بقیہ عرق تھا وہ بھی نکل آیا اور گلاس بھر گیا، تو بوڑھا کہتا ہے، معلوم ہوتا ہے بادشاہِ وقت کی نیت درست ہوگئی۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے زمانے میں اس قدر بشاشت وطمانیت اور اس قدر برکات کا ظہور ہوگا کہ جو فطری طور پر ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ان میں بھی دشمنی کا احساس باقی نہیں رہے گا۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے خلفاءِ سبعہ...... یہ جو کلی خیر وبرکت کا زمانہ ہے، یہ چالیس برس رہے گا۔اور اس چالیس برس میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے سات خلفاء حکمرانی کریں گے۔لیکن پھر رفتہ رفتہ فساد کی طرف زمانہ بڑھتا جائے گا۔ جب ساتویں خلیفہ نمایاں ہو کر ختم ہوں گے، اب گویا فساد کا غلبہ شروع ہوگا اور پھر اتنا غلبہ ہوگا کہ لوگ اس درجہ پر آ جائیں گے کہ ''شرِ محض'' رہ جائیں گے اور ایمان والے گنے چنے ہوں گے جو اپنے ایمان کو بچانے کے لئے پہاڑوں کی کھوہ میں جا کر پناہ لیں گے۔شہروں میں ان کے لئے گنجائش نہیں ہوگی۔ یہ گویا بالکل قربِ قیامت کا وقت ہوگا۔اور یہ علامت ہوگی کہ اب اس کائنات کے خیمہ کو ختم کرنا اور فنا کرنا ہوگا۔

دَآبَّةُ الْأَرْضِ...... اسی وقت دَآبَّةُ الْاَرْضِ ظاہر ہوگا یا ''نارِ حجاز'' ظاہر ہوگی جو منتشر جگہ سے ہنکار کر مومنوں کو ایک سمت میں لے آئے گی، دابۃ الارض کا جو خروج ہوگا تو یہ عجیب شکل وشباہت کا جانور ہوگا کہ چہرہ انسانوں جیسا اور ہر جانوروں کی شباہت اس میں ہوگی۔ یہ نشان بناتا جائے گا۔مومن کے چہرے پر مومن کا اور کافر کے چہرے پر کافر کا۔پھر ایک وباء بھیجی جائے گی جس سے دو تین دن کے اندر اندر جتنے ایمان والے ہوں گے سب ختم ہو جائیں گے اور انتقال کر جائیں گے۔

جن پر قیامت قائم ہوگی......اب شرار الخلق باقی رہ جائیں گے۔ جو شرِ محض ہوں گے، ان کی شان فرمائی گئی کہ نہ ان کا کوئی دین ومذہب ہوگا۔ ''لَايَعْرِفُوْنَ مَعْرُوْفًا وَّلَا يُنْكِرُوْنَ مُنْكَرًا''...... نہ اچھے برے کی تمیز باقی رہے گی۔ گدھے، کتے کی طرح سے سڑکوں پر بدکاریاں کرتے پھریں گے۔کوئی انسانیت کی حس نہیں ہوگی، محض شہوانی جذبات ہوں گے، ان پر قیامت قائم ہوگی، یوں عالم کا خاتمہ ہو جائے گا۔

عالم کی بنیاد......اس سے علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ عالم ذکر اللہ سے تھما ہوا ہے۔ایک بھی جب تک اللہ اللہ کہنے والا رہے گا، عالم مٹنے والا نہیں ہے۔غرض عالم کی روح ذکر اللہ ہے۔ جب روح نکل جائے گی تب لاش بن کے پھولے گا، پھٹے گا اور سڑے گا۔اس سے پہلے نہیں حدیث میں ہے ''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ'' ① قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا عالم میں موجود ہے۔جب ایک بھی نہیں رہے گا، اب شرِ محض رہ جائے گا۔اس وقت قیامت قائم کردی جائے گی۔

قبولیتِ بعدد......بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جہاں چالیس آدمی جمع ہوں وہاں ایک نہ ایک ان میں مقبول ضرور ہوتا ہے خواہ کسی درجے کی بھی قبولیت ہو۔تو جہاں لاکھوں اور کروڑوں مسلمان ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں کوئی بھی مقبول نہ ہو۔ ہزاروں کی تعداد میں مقبولین ہوں گے۔

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب ذهاب الايمان في آخر الزمان، ص: ٢٠٢. رقم: ٣٧٥.

کیا اہلِ دنیا آسمان سے آگے جاسکتے ہیں؟...... دیکھئے آسمان میں جانے کی تو کوئی صورت ہے نہیں۔ نہ شرعی اصول اس کی اجازت دیتے ہیں نہ یہ واقعہ ہوگا۔ آسمان سے نیچے فضا ہے۔ یہ اس دنیا کا دائرہ ہے۔ تو دنیا والے اپنے دائرے میں رہ سکتے ہیں۔ اپنے دائرے سے نکل کر باہر نہیں جاسکتے۔ آسمان کا دائرہ وہ انسانوں کا دائرہ نہیں ہے۔ وہ ملائکہ کا دائرہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروفِ عبادت نہ ہو۔ پھر شریعت نے آسمانوں کے دروازے بتلائے ہیں ان پر بڑے مستعد دربان ہیں۔ جن میں مقبولین کو بھی بغیر اجازت کے جانے کی صورت نہیں بنتی۔

جنابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج میں تشریف لے گئے تو دروازے بند تھے، حضرت جبریل علیہ السلام نے گویا دروازہ کھٹکھٹایا تو بواب کی طرف سے اندر سے یہ جواب آیا۔ مَــنْ اَنْــتَ. ...... ''تم کون ہو؟''۔ حالاں کہ حضرت جبریل علیہ السلام سَیِّدُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ملائکہ ان کی آواز بھی بھول گئے۔ ان کا تو ہر وقت کا آنا جانا ہے۔ پوچھنا اس کی دلیل ہے کہ ڈیوٹی پر اتنے مستعد ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا بھی آئے گا تو وہ قانون کے مطابق ڈیوٹی ادا کریں گے۔ اس لئے پوچھا گیا۔ مَنْ اَنْتَ. ...... ''تم کون ہو؟''۔ فرمایا حضرت جبریلؑ۔ پھر پوچھتے ہیں وَمَنْ مَّعَکَ؟...... اور ساتھ کون ہیں؟''۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ ان کے علم میں ہے کہ کوئی ساتھ آرہا ہے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن ادائے فرض میں اتنی مستعدی کہ یہ پوچھا کہ ساتھ کون ہیں؟۔ جبریل علیہ السلام نے کہا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

پھر یہی نہیں کہ دروازہ کھول دیں۔ تیسرا سوال اور کیا گیا۔ بلائے ہوئے آرہے ہیں یا ویسے ہی خود بخود آگئے ہیں؟ تو حضرت جبریل نے جواب دیا۔ وَقَـدْ اُرْسِلَ اِلَیْـهِ...... ان کی طرف بھیجا گیا تھا۔ بلائے ہوئے آرہے ہیں۔ تب دروازے کھولے گئے اور کہا گیا مَرْحَبًا بِکُمْ نِعْمَ الْمَجِیْئُ جَآءَ. ① ''بہترین آنا ہے جو آپ آئے۔ خوش آمدید''۔ جب مقبولین کے لئے آسمان میں جانے میں اتنی پابندیاں ہیں تو مردودین وہاں کیسے جائیں گے؟ وہ خود بخود ہی پہنچ جائیں گے؟

سیارات کا تعلق اہلِ دنیا سے ہے...... اس کی بنا یہ ہے کہ جو اس دنیا میں بسنے والے انسان ہیں وہ اپنی دنیا کے دائرے میں رہتے ہیں لیکن دنیا کے دائرے سے نکل کر ایک دوسرا عالم شروع ہو جاتا ہے، اس عالم میں یہ دخل نہیں دے سکتے۔ رہے ستارے تو وہ اس دنیا ہی کے عالم میں ہیں اس لئے کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿اِنَّــا زَیَّنَّــا السَّـمَـآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ الْکَوَاکِبِ﴾ ② آسمان دنیا کو ہم نے ستاروں سے آراستہ کر رکھا ہے۔ یہ ستارے اس آسمان کی زینت ہیں۔ اور زینت ہمارے لئے بنائی گئی۔ یہ زینت جبھی ہو سکتی ہے جب یہ ستارے آسمان کی نچلی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب المعراج، ص: ۳۱۵، رقم: ۳۸۸۷.

② پارہ: ۲۳، سورۃ الصافات، الآیۃ: ۶.

سطح سے نیچے ہوں۔ اگر اوپر کی سطح پر ہوتے تو ہمارے لئے زینت نہ بنتے۔

معلوم ہوا یہ ستارے زمین ہی سے متعلق ہیں۔ سورج اور چاند جو گردش کرتے ہیں یا یہ رات اور دن، یہ دنیا ہی کے لئے ہیں۔ آسمانوں اور جنتوں کے لئے تو رات اور دن نہیں ہیں۔ یہ رات دن کی گردش اس دائرہ دنیا کے اندر ہے اور اس کا تعلق ان سیارات سے ہے۔ یا مثلاً جڑی بوٹیاں ہیں۔ تو ہر جڑی بوٹی میں کسی نہ کسی ستارے کی تاثیر ہے جس سے وہ دفعیہء امراض میں موثر ہوتے ہیں، گل بنفشہ میں فلاں خاصیتیں ہیں۔ وہ جب جڑی بوٹیوں پر روشنی ڈالتے ہیں تو ویسی خاصیتیں پیدا ہوتی ہیں اور ویسے ہی امراض کا دفعیہ ہوتا ہے۔ تو یہ سارے ستارے گویا ہمارے لئے بنائے گئے ہیں۔ دنیا سے ان کا تعلق ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ ① ''ستاروں سے ہی لوگ راستہ پاتے ہیں''۔ یہ جہاز رانی کا فن ستاروں ہی کے ذریعے سے ہے۔ سمندروں میں سڑکیں تو نہیں ہوتیں۔ ستاروں سے سمتیں متعین کر کے جہازوں کو چلاتے ہیں۔ معلوم ہوا ستارے ہمارے لئے بنائے گئے ہیں، دائرہ دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ آسمان سے تعلق نہیں ہے۔ آسمان کی چھت میں جس طرح سے بھی لٹکا دیئے گئے ہیں۔ غرض جب یہ دنیا سے متعلق ہیں تو دنیا والوں کا ان تک پہنچنا ممکن ہے لیکن اپنی دنیا کے دائرے سے نکل کر کسی اور عالم میں پہنچ جائیں۔ انسان میں یہ طاقت نہیں ہے۔ دعوے کوئی کتنے ہی کرے، اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے چاند، سورج اور مشتری میں چلے جائیں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کرے جلدی چلے جائیں تا کہ زمین میں کچھ فساد کم ہو۔ ہمارا اس میں کیا نقصان ہے؟

توبہ کا دروازہ بند ہونے کا وقت...... حدیث میں آتا ہے کہ آفتاب جب مغرب سے طلوع کرے گا اور نصف النہار تک آئے گا اور پھر لوٹ جائے گا اور معمول کے مطابق طلوع کرے گا، جب یہ آیتِ کبریٰ ظاہر ہو جائے گی تب توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اس واسطے کہ ایمان لانے سے مقصود قلوب کی آزمائش ہے۔ اور جب اتنی نمایاں خرق عادت ظاہر ہو جائے گی۔ اب اس کے بعد آزمائش کا موقع نہیں رہے گا، اب تو وہ چیزیں سامنے آ گئیں جن کی خبریں دی جا رہی تھیں، جن کو محض پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار پر ماننا چاہئے تھا۔ مشاہدے سے مانا تو اس کا نام ایمان نہیں ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد پر ماننا چاہئے۔ عقل میں آئے یا نہ آئے۔ آنکھ میں آئے یا نہ آئے۔ یہ ماننا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم غلط نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایمان ہے۔ تو اپنی عقل سے کسی چیز کو سمجھ لینا یہ ایمان نہیں۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ میں ایمان لے آیا کہ دو کا دُگنا چار ہوتا ہے۔ اسے ایمان نہیں کہتے۔ یہ تو قضیہ عقلیہ ہے۔

التفاتِ حقائق اسلام کا موضوع ہے...... اسلام کا موضوع یہ ہے کہ صورتوں کی طرف التفات مت کرو، حقائق کی طرف التفات کرو جو دوامی اور ابدی ہیں۔ اسی واسطے تصویر کی ممانعت فرمائی گئی، ہو سکتا تھا کہ اس زمانے میں بھی مصوّر رہوں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ مبارک رکھتے ہوں۔ مگر ممانعت فرما دی گئی کہ صورتوں میں الجھ

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۶۔

جائیں گے اور حقیقت رہ جائے گی، اس لئے مسلمانوں کو صورتوں سے ہی الگ رکھا ہے۔ آج کل سب کچھ مظاہروں اور نعروں میں آ گیا ہے، حقیقت گم ہوگئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے اتحاد کا مذہبی فائدہ...... (ہندوستان میں) سارے مسلمان اکٹھے ہو گئے اور یہ طے پایا کہ مشترک معاملات میں مل کر متفقہ طور پر گورنمنٹ سے مطالبہ کیا جائے۔ جو اپنی خصوصیات ہیں وہ آپ اپنے گھروں میں انجام دیں۔ اس میں کوئی دوسرا دخل نہیں دے گا۔ لیکن جب گورنمنٹ کے سامنے آئیں تو مل کر آئیں اور وہ یہ نعرہ ہو کہ پرسنل لاء اور عائلی قوانین میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں۔ نہ گورنمنٹ کو نہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کو۔ اس پر سب کا اتفاق ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرا گاندھی کو اعلان کرنا پڑا کہ ''ہم کوئی دخل دینا نہیں چاہتے۔ مسلمان چاہیں کہ دخل دو، تب ہم دخل دیں گے''۔

ہم نے کہا وہ مسلمان کون ہے جو چاہے گا۔ سب تو یہاں آ گئے، سب کے نمائندے یہاں جمع ہیں۔ شیعہ و سنی بھی، اہلحدیث بھی۔ اب وہ کون سے مسلمان ہیں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب دب دبا گئے اور وہ جو نعرے لگا رہے تھے کہ ترمیمات ہوں گی سب چپکے ہو کے بیٹھ گئے۔

دیوبندی و بریلوی حضرات کے باہمی قرب کا فائدہ...... اس موقع پر ہم نے بریلوی حضرات سے بھی خواہش کا اظہار کیا کہ آپ بھی آئیں عام طور پر وہ مذہبی معاملات میں ہمارے ساتھ شریک ہوتے نہیں۔ مگر اس موقع پر شریک ہوئے۔ اس لئے کہ سارے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔ انہیں خطرہ یہ تھا کہ اگر ہم نہ گئے تو سب نکھٹو کہیں گے اور ہماری بات گر جائے گی تو اپنا ایک نمائندہ بھیجا۔ سب سے بڑے مفتی، مفتی برہان الدین صاحب جو جبل پور کے رہنے والے ہیں، وہ آئے۔ مجھے اس موقع پر صدر بنا دیا تھا۔ میں نے انتہائی ان کی آؤ بھگت کی، جب وہ تشریف لائیں تو بیس قدم آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرنا، ہر پانچ منٹ کے بعد پان پیش کرنا۔ ہر پانچ منٹ کے بعد چائے پیش کرنا۔ اور ان کی باتیں بھی بڑی عقیدت کی نگاہ سے سنیں کہ جو بچی بات کہی، اسے ماننا چاہئے۔ وہ بہت متاثر ہوئے۔ جب جلسہ ختم ہوا تو انہوں نے کہا۔ میں نے سنا ہے آپ حج کے لئے جانے والے ہیں؟ میں نے کہا ارادہ تو ہے۔ انہوں نے کہا ''روضہ اقدس پر میرا اسلام عرض کر دینا''۔ میں نے کہا انشاء اللہ ضرور عرض کروں گا۔ خیر میں نے کہا تکفیر تو ختم ہوئی۔ کسی کافر کے ذریعے روضہ اقدس پر کوئی تھوڑا ہی سلام پہنچاتا ہے، غرض ملنے سے بھی سینکڑوں شبہات رفع ہوتے ہیں۔ بہت سے منافع ان کے ہاں ہیں جن سے ہم محروم ہیں۔ اور بہت سے منافع ہمارے ہاں ہیں جن سے وہ محروم ہیں، رلے ملیں گے تو ایک دوسرے سے فائدہ تو اٹھائے گا۔

باہمی نفرت اسلام کا ذوق نہیں...... یہ باہمی نفرتیں پیدا کرنا یہ اسلام کا ذوق نہیں ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ ① ''یہ کفار جن چیزوں کی

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۰۸۔

پرستش کرتے ہیں ان کو بھی برا مت کہو کہ وہ چڑ میں آ کر تمہارے بڑوں کو برا کہیں۔ اس لئے انہیں بھی گالی مت دو''۔ اب یہاں گالم گلوچ بھی ہے اور یہ کہ فلاں کافر، فلاں کافر۔ وہ ایسا وہ ویسا۔ تو اسلام کا یہ ذوق ہی نہیں۔ یہ ایک مصیبت ہے۔ بس جہل عام ہے۔ آدمی دین کچھ پڑھے لکھے تو ذوق پیدا ہو اور پتہ چلے، بس بھیڑ چال ہے، جس نے جو رسم ڈال دی اور دو تین برس کی بعد وہی دین کا جز بن گیا۔

رسوم کا غلبہ...... چناں چہ میرا امریکہ جانا ہوا تو قوم کے کچھ لیڈر ملنے کے لئے بیچارے نیک طینت اور نو مسلم آئے۔ میں نے حسب معمول پان کھایا۔ وہ یوں سمجھے کہ کوئی دینی چیز ہے۔ کہنے لگے اب ہم سب پان کھایا کریں گے اور ڈبہ بٹوہ رکھیں گے۔ میں نے کہا! یہ کوئی دینی بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک عادت کی بات ہے۔ ایسا مت کرنا۔ اتنے سیدھے سادھے لوگ ہیں، اب اگر وہ پان کا ڈبہ رکھتے اور اسے دین سمجھ کر رائج کرتے تو ان میں یہ رائج ہوتا کہ پان کھانا دین اسلام کا رکن ہے اور جو نہیں رکھے گا وہ کافر ہو جائے گا، اس لئے وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ یہ ہے سارا قصہ۔

اختلافی مسائل کا آسان حل...... ورنہ اگر مسائل میں نگاہ ہو تو قرآنِ کریم کا صاف حکم ہے: ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ ① اگر تم میں تنازع ہو تو اللہ و رسول کو حکم بنا کے رجوع کرو، صحابہؓ کا عمل موجود ہے، رجوع کرو۔ جب وہ عمل پیش کیا جائے تو کہتے ہیں، صاحب! یہ تو سر آنکھوں پر ہے۔ مگر رواج یہی ہے۔ تو رواج پر چلیں گے۔ نہ صحابہؓ کے تعامل پر، نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل پر، اس کا کوئی علاج نہیں۔ بس جہالت ہے اور اسلامی ذوق نہیں ہے۔

بریلوی عالم کی توہین بھی درست نہیں...... اب مولانا احمد رضا خان صاحب ہیں۔ ایک دن حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کی مجلس میں۔ غالبًا خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ نے یا کسی اور نے یہ لفظ کہا کہ ''احمد رضا یوں کہتا ہے''۔ بس حضرت بگڑ گئے۔ فرمایا عالم تو ہیں۔ ہمیں توہین کرنے کیا حق ہے؟ کیوں نہیں تم نے مولانا کا لفظ کہا؟

غرض بہت ڈانٹا ڈپٹا۔ بہر حال ہم تو اس طریق پر ہیں کہ قطعًا ان کی بے حرمتی جائز نہیں سمجھتے، کافر، فاسق کہنا تو بڑی چیز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو خلافِ سنت امور ہیں۔ انہیں ظاہر کرتے ہیں کہ بدعات ہیں۔ خلافِ سنت ہیں، انہیں ترک کرو، لیکن کرنے والے کی توہین کریں، یہ نہیں ہے۔

مولانا احمد رضا خان صاحبؒ دیوبند کے فیض یافتہ ہیں...... مولانا احمد رضا خان دیوبند کے بالواسطہ شاگرد ہیں۔ وہ اس طرح کہ مولانا محمد یسٰین صاحب رحمہ اللہ علیہ جنھوں نے بریلی میں مدرسہ اشاعتِ العلوم قائم کیا، یہ ان کے شاگرد ہیں۔ اور وہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں مگر اسے ظاہر نہیں کرتے۔ اور ابتداء ابتداء میں مولانا محمد یسٰین صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو مولانا احمد رضا خانؒ جو خط لکھتے تو نہایت تعظیم سے لکھتے، ایسے جیسے کوئی اپنے شیخ کو لکھ رہا ہے۔ بعد میں ان کے خیالات بدلے۔ کیا بات پیش آئی، وہ اللہ ہی جانے۔ پھر تو کافر سے

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹.

ورے کوئی چیز ہی نہیں تھی۔

اپنے کام سے کام...... ہم تو یہ کہتے ہیں کہ نہ ہم مولانا احمد رضا خان صاحب کو برا بھلا کہنا جائز سمجھتے ہیں نہ کبھی کہا۔ دارالعلوم میں آپ آ کے دیکھیں، کوئی ذکر یا چرچا ہے ہی نہیں۔ کون بریلوی اور کون وہ۔ سب اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اور ادھر دیکھو تو ابجد کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ وہ کافر، وہ کافر، وہ فاسق۔ وہاں کفر و اسلام کا یہ قصہ نہیں۔ سب تعلیم میں لگے ہوئے ہیں۔ برسہا برس نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ اپنا مشغلہ ہی بہت ہے، کہاں اس جھگڑے میں پڑیں کہ فلاں کافر، فلاں کافر۔ ہوگا وہ، ہمیں اس سے کیا؟ وہ کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

لَعُمْرِیْ اِنَّ فِیْ ذَنْبِیْ لَشُغْلًا بِنَفْسِیْ عَنْ ذُنُوْبِ بَنِیْ اُمَیَّةَ

میرے اتنے گناہ ہیں کہ مجھے شمار کرنے کی فرصت نہیں۔ بنی امیہ کے گناہوں کو کہاں شمار کروں۔؟ برسوں نام بھی نہیں سنیں گے۔ کون ہے بریلوی اور کون ہے رافضی؟

مسجد دھلوانے کا قصہ...... بمبئی میں یہ کیفیت تھی کہ کوئی دیوبند والا مسجد میں چلا جائے تو مسجد دھلوائی جاتی تھی، حالاں کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کفار آتے تھے لیکن دھلوائی کبھی نہیں گئی، جب کہ وہ صحیح کافر تھے۔ اس لئے کہ نجاست اعتقادی ہے، بدن کی نجاست نہیں ہے جو مسجد آلودہ ہو۔ پھر بمبئی میں جانا آنا ہوا۔ اب قصہ برعکس ہو گیا، ایک بڑی جماعت پیدا ہوگئی جو معتدل ہے اور ان خرافات کو سمجھ گئی۔

حضراتِ دیوبند اور پیر مہر علی شاہ صاحب مرحوم...... پیر مہر علی شاہ صاحب نے دیوبند سے کوئی استفادہ نہیں کیا، مگر دیوبند کے لوگ ان کے معتقد تھے۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ ان سے بڑی عقیدت سے اور بڑی نیاز مندی سے ملتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ ایک تو کچھ رسوم ہیں۔ ان بزرگوں میں اگر کوئی رسم بھی ہے تو وہ صرف اس لئے کہ ہمارے بزرگوں نے کیا ہم بھی کریں گے۔ لیکن دوسروں کی تکفیر نہیں کرتے اور برا بھلا نہیں کہتے۔ چوں کہ ان میں اخلاص تھا اس لئے دیوبند کے حضرات بھی ان سے عقیدت سے ملتے تھے۔

ایک بریلوی بزرگ سے ملاقات کے اثرات...... ملتان میں انقلاب سے پہلے ایک دفعہ میرا جانا ہوا۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ نے خیر المدارس کا جلسہ کیا تھا۔ میں نے جا کے پوچھا، یہاں کوئی بزرگ، کوئی عالم اور بھی ہے جس سے ملیں۔ انہوں نے کہا۔ مولانا محمد بخش صاحب ہیں اور بریلوی فرقے کے ہیں۔ میں نے کہا ہم انہیں فرقہ نہیں سمجھتے۔ نہ ہم فرقہ نہ وہ فرقہ۔ مولانا عبدالخالق صاحبؒ نے بہت روکا کہ ان کے خلاف تو جلسہ کر رہے ہیں اور تم جا کے ملو گے۔ میں نے کہا خلاف کا وقت آئے گا، خلاف بھی کریں گے۔ اور وہ مسئلہ کی بات ہوگی لیکن ملنے میں کیا حرج ہے۔

ان سے چھپ چھپا کر، میرے ساتھ حافظ شریف احمد تھے، مغرب کے وقت ان کی مسجد میں پہنچ گئے۔ وہ مصلے

پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک لوٹے میں برف کا پانی بھی رکھا ہوا تھا۔ کسی نے میرے آنے کی انہیں اطلاع کر دی۔ بڑی شفقت سے پیش آئے اور اس پانی کے لوٹے کو منہ سے لگا کر پہلے خود پیا اور مجھے کہا تم بھی پیو، میں نے پانی پیا۔

اس کے بعد کہنے لگے، دیوبند کے بزرگوں کے کچھ احوال تو سناؤ، میں نے وہاں کے بزرگوں کے حالات سنائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے سال انہوں نے اپنے دونوں لڑکوں کو دارالعلوم میں تعلیم کے لئے بھیجا، مگر ایک کو تو وہاں کی آب وہوا موافق نہیں آئی۔ واپس چلا آیا اور ایک البتہ سال رہا۔ مگر امتحان سے پہلے وہ بھی چلا آیا۔ خدا جانے کیا مجبوری پیش آئی۔ بہرحال ان کے گھرانے سے تکفیر نکل گئی۔ اس لئے میں ہمیشہ اس کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ بھئی منافرت مت پیدا کرو، اپنی رائے ہے، اگر آپ دیانۃً صحیح سمجھتے ہیں تو اس پر عمل کریں، لیکن نفرتیں پیدا کرنا، یہ صحیح نہیں۔

سنت وبدعت کا تاثیری امتیاز...... مگر مشکل یہ ہے کہ حدیث شریف میں بدعت کا خاصہ یہ بیان کیا گیا ''مَاضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوْا عَلَيْهِ اِلَّا اُوْتُوا الْجَدَلَ'' ① جس قوم میں بدعت آئے گی اس میں دنگا فساد اور جھگڑا ضرور آئے گا۔ یہ بدعت کا خاصہ ہے۔ سنت میں کوئی جھگڑا نہیں۔ سنت تو ایک ہی ہے، جس کا جی چاہے عمل کرے اور بدعات ہر جگہ کی الگ الگ ہیں۔ تو بدعت کا خاصہ یہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے اصل دین ختم ہو جائے گا۔ نزاع وجدال اور گروہ بندی و پارٹی بازی، یہ شروع ہو جائے گی۔

تقسیم ہند کے بارے میں علمائے دیوبند کا اختلاف..... حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ تو کانگریس کے حامی تھے، کانگریسی تھے اور کانگریس کے کٹر قسم کے حامی تھے۔ انہوں نے مخالفت کی اور کہا کہ اس میں خون خرابے مچیں گے۔ اور مسلمان اِدھر سے اُدھر ہو جائیں گے۔ تو جانیں تلف ہوں گی۔ اور اسی طرح کے دیگر مصالح ان کے پیش نظر تھے۔ لیکن یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ جب پاکستان بن گیا تو فرمایا اب اختلاف کرنے کی ضرورت نہیں، اب ہماری آبرو اسی میں ہے کہ وہ قوی ہو اور مضبوط رہے یہ تو ان کا حال ہے، جو مخالف تھے۔

اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ دیوبندی نہیں تھے؟ حضرت تھانویؒ دیوبندی نہیں تھے؟ مولانا ظفر احمد صاحبؒ اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ دیوبندی نہیں تھے؟ یہ سارے پاکستان کے حامی تھے۔ تو یہ کہہ دینا کہ دیوبند مخالف تھا۔ رائیں ہوتی ہیں، کسی کی کچھ کسی کی کچھ، مگر بن جانے کے بعد مخالفین کی رائیں بدل گئیں کہ اب ہم کسی قسم کا نزاع یا اختلاف نہیں کرنا چاہتے۔ اب تو ہماری عزت اس میں ہے کہ پاکستان قوی اور مضبوط ہو۔ دیوبند کے اندر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اشخاص کے اندر اختلاف تھا، دیوبند تو ایک ادارہ ہے، وہ نہ لیگی، نہ کانگریسی، ہمیشہ غیر جانبدار رہا۔ تو دیوبند اور چیز ہے۔ افراد اور چیز ہیں۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حامی تھے اور حامی ہونے کی بناء یہ تھی کہ یہ نعرہ لگایا جا رہا تھا کہ ہمیں ایک اسٹیٹ چاہئے جس میں اسلامی قوانین جاری کر سکیں، سارے مسلمان

① جامع الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الزخرف، ج: ۱۱ ص: ۵۱.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دشمن ہوں۔ میرا ان کا اختلاف مسئلہ کا اور حجت کا اختلاف ہے۔ ذاتی اختلاف نہیں ہے، اگر تو نے یہاں آ کے قدم رکھا تو میں حضرت علیؓ کا ادنیٰ سپاہی ہو کر تجھ سے جنگ کروں گا''۔ اور اس کی ساری امیدیں ختم کر دیں۔ اور اگر وہ معاذ اللہ دب جاتے، وہ قیصر ہی غالب آتا۔ اسی کی حکومت ہو جاتی۔

غیر قوموں کا طریقِ واردات...... غرض ان قوموں کا خاصہ یہی ہے کہ پہلے ملک میں اور قوم میں تفریق ڈالوتی ہیں اور سینکڑوں معاملات میں اختلاف پیدا کرتی ہیں۔ اسلام نے اخوتِ اسلامی سکھلائی تھی کہ مشرق و مغرب کے مسلمان ایک ہوں۔

انہوں نے کیا کیا۔ وطنیت کا رشتہ الگ ڈالا۔ اب جغرافیائی خطوط پہ لڑائی کرائی، نسلیت کا رشتہ الگ ڈالا کہ گورے الگ اور کالے الگ، غرض اس قسم کے سینکڑوں اختلاف پیدا کر دیئے۔ اور لوگوں کو لڑا رہے ہیں، جغرافیائی خطوط پر کہیں لڑ رہے ہیں، کہیں رنگ و نسل کے مسئلہ پر لڑ رہے ہیں، کہیں زبان کے مسئلے پر لڑ رہے ہیں۔ لیکن وہ جو اصل وحدت کی بنیاد تھی، اس کو سب چھوڑے ہوئے ہیں جس میں سارے مسلمان ایک ہوتے ہیں۔

ایک تو اختلاف آرا ہوتا ہے اور حجت کا اختلاف ہوتا ہے، وہ علماء و عقلاء میں آ رہا ہے، وہ مضر نہیں ہے، اس اختلاف کو نزاع و جدال اور جھگڑے پیدا کرنے کا ذریعہ بنانا، یہ مضر چیز ہے۔ یہ جذبات کا کام ہے۔ مسئلہ کا کام نہیں ہے ، مسئلہ لڑائی نہیں سکھلاتا۔ ہم مسئلہ کو آڑ بناتے ہیں اور جذبات اپنے نکالتے ہیں، پھر لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔

اجلاس صد سالہ...... اجلاس صدِ سالہ کو ''جشن'' کہنے سے ہم ہر جگہ احتیاط کرتے ہیں۔ لہٰذا اسے جشن کا نام نہ دیا جائے۔ یہ ایک دستار بندی کا اجلاس ہے جبکہ جشن ایک رسم ہے۔ دار العلوم کے اجلاس صدِ سالہ میں شرکت کے لئے یہاں کے لوگوں کا کام ہے کہ وہ صدرِ پاکستان سے ملیں اور اس کی اہمیت ان پر واضح کریں۔ پھر جو وہ فرمائیں اس کی تعمیل کی جائے، معلوم ہوا ہے کہ ایک وفد ان سے ملا ہے تو انہوں نے پانچ سو آدمی کی اجازت دے دی ہے۔ ان پانچ سو کا انتخاب کرنا بھی یہاں کے لوگوں کا کام ہے۔

گروہی خصوصیّت کی دعوت کا نقصان...... دعوتیں مختلف ہو گئیں۔ اپنی اپنی خصوصیات کی لوگ دعوتیں دیتے ہیں اور اسے اسلام پکارتے ہیں۔ حالاں کہ اسلام سب سے زیادہ بلند چیز ہے، جماعتی خصوصیات کا نام اسلام تھوڑا ہی ہے۔ ہر شخص اپنی گروہی خصوصیات کو اسلام کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اسلام کو مسلمانوں سے خطرہ ہے اور کسی سے نہیں ہے۔

اسبابِ اتحاد...... دوسرے میں نے ہر جگہ کہا ہے کہ پاکستان کے لوگوں کو اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے۔ سب مل کر باہم متحد ہو کر اپنے ملک کو مضبوط بنائیں۔ اور یاد رکھئے! اتحاد جو قائم ہوتا ہے کبھی تو وہ قوتِ عقیدت سے قائم ہوتا ہے، کوئی ایک بزرگ شخص ہے، لوگ اس پر جمع ہو گئے۔ ان میں باہمی اتحاد قائم ہو جاتا ہے۔ کوئی عالم ربانی یا شیخ طریقت ہے۔ اس کے متوسل جمع ہو جاتے ہیں۔ مرکز ایک ہو گیا۔ مگر وہ اتحاد محدود ہوتا ہے۔

ایک قوت قہری یعنی حکومت کی قوت ہے، وہ بھی ایک مرکز پر جمع کرتی ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ سب

اس کے حامی تھے کہ اس سے بہتر کیا بات ہے۔ تو جس نے رائے دی یہ سمجھ کر دی کہ وہاں اسلام رائج ہوگا۔
دوسرے حضرات کی رائے یہ تھی کہ یہ ہوگا نہیں اس لئے کہ جو لوگ بناء رہے ہیں انہیں خود دین سے مناسبت نہیں ہے، وہ نیک نیتی سے بھی چاہیں کہ اسلام رائج ہو، تب بھی نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ ان کے اندر اسلامی ذوق ہی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جب ملک تقسیم ہوگا تو یہ بھی ہوگا کہ کچھ لوگ اِدھر آئیں کچھ لوگ اُدھر جائیں، اس میں خون خرابے بھی مچیں گے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو خون کے دریا نظر آتے ہیں۔ اور یہ ہوا۔ لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ لاکھوں مسلمان عورتوں کی آبروئیں بھی گئیں اور مالی نقصان بھی ہوا۔ تو یہ چیزیں ان کے پیش نظر تھیں جس کی بناء پر ان حضرات کی رائے تھی کہ نہ بننا چاہیے۔
اور جن کی رائے تھی کہ بنے تو وہ اس پر تھے کہ جب ایک اسٹیٹ بنے گی، اس میں اسلامی قانون جاری ہو گا۔ تو زیادہ نہ سہی پورے ہندوستان میں ایک جگہ تو اسلامی اسٹیٹ ہو جائے۔ ان کی نگاہ اس پر تھی۔ اور ہم رات دن دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ ملک مضبوط ہو اور ہم وہاں بیٹھ کر دعاء ہی کر سکتے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔؟ اور اس کے متمنی ہیں کہ اس ملک کو سب متفق و متحد ہو کر سنبھالیں، اللہ نے جب ایک ملک دے دیا ہے، باہمی لڑائی سے اسے ختم نہ کریں اور ان لوگوں سے عبرت پکڑیں جن میں نزاع ہوا۔ اور تیسرا آ کر غالب ہوا۔ افغانستان میں یہی ہوا کہ بیس پارٹیاں خلاف میں کھڑی ہو گئیں، باہمی نزاع ہوا۔ تو روس نے آ کر غلبہ پایا، اسی طرح سے اور جگہوں پر بھی ہوا کہ جب باہمی نزاع ہوا تیسرا غالب۔
مسلمانوں کا باہمی اختلاف غیروں کو غلبہ دلاتا ہے...... ملک ابن سعود کا ایک مقولہ ہے، جب ان سے کہا گیا کہ یہود بڑی قوت پکڑتے جا رہے ہیں اور ممالک اسلامیہ کے لئے خطرہ بڑھ رہا ہے۔ ملک نے جواب دیا: ”ساری دنیا کے یہود ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں، مجھے ذرّہ برابر فکر نہیں۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔ تم ہی آپس میں لڑو گے اور غیروں کو موقع دو گے کہ وہ آ کر غالب ہوں اور دخل دیں“۔ غرض یہ واقعہ ہے کہ جب بھی اسلامی حکومت تباہ ہوئی ہے باہمی نزاع اور باہمی رقابتوں سے تیسرے کو موقع ملا۔ اور دوسری قومیں ہمیشہ اس کی ساعی رہی ہیں کہ ایک کا ساتھ دے کر دوسرے کو مغلوب کرو اور جب وہ مغلوب ہو جائے تو پھر غالب آ جاؤ۔
حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کلبِ روم کو جواب...... حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں جب جنگ ہوئی تو قیصر روم کا پیغام حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پہنچا کہ ”میں نے سنا ہے کہ علی تمہارے مقابلے پر ہیں اور میں ہر قسم کی مدد کے لئے تیار ہوں۔ فوجی مدد، مالی مدد“۔
اس کا مقصد یہ کہ حضرت امیر معاویہؓ کا ساتھ دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مغلوب کرو اور جب وہ مغلوب ہو کر ختم ہو جائیں تو انہیں بھی مغلوب کر دینا آسان ہوگا۔ یہ گویا اس کی ذہنی کیفیت تھی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اس کا جواب لکھا، اس میں لقب لکھا الی کلب الروم رومی کتے کی طرف یہ خط پہنچے اور لکھا کہ: ”تو یہ سمجھتا ہے کہ میں

لوگ جمع ہو جائیں اور اتفاق کریں اور حکومت کو مضبوط بنائیں۔ اور بیرونی خطرات پہ نگاہ رکھیں۔ اس لئے کہ آپ کے اختلاف سے غیروں کو دخل اندازی کا موقع ملے گا۔ اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ سارے مسلمان متحد ہو کر ملک کو اور حکومت کو مضبوط کریں۔

عشرۂ فنڈ...... میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں مدینہ طیبہ (زادھا اللہ شرفاً وکرامۃً) میں حاضر ہوں۔ اور حضرت ام المومنین صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا آدمی میرے پاس پہنچا، اور اس نے دس روپے دیئے کہ یہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ارسال فرمائے ہیں کہ یہ دارالعلوم میں داخل کر دیئے جائیں۔ میں نے اس آدمی سے عرض کیا کہ یہ زکوٰۃ ہے یا عطیہ؟ اس نے کہا یہ عطیہ ہے۔ خواب ہی میں یہ بات دل میں جم گئی کہ میں اس مبارک رقم کو اجلاس صد سالہ کے سلسلہ میں داخل کروں گا۔

چناں چہ صبح کو میں نے یہ مفصّل خواب لکھ کر اور دس روپے کا نوٹ نتھی کر کے دفتر اجلاس میں بھیجوا دیا۔ وہاں شہر کے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو خواب سنا تو بہت سے لوگوں نے کسی نے ماں کی طرف سے، کسی نے بیوی کی طرف سے، کسی نے بہن کی طرف سے دس دس روپے دیئے، جس سے دو ڈیڑھ سو روپے جمع ہو گئے، اس کے بعد گھر میں تذکرہ ہوا تو میں نے بیان کیا کہ میں نے یہ خواب دیکھا۔ تو میاں سالم، اسلم اور اعظم تینوں نے ایک ایک بچے اور ایک ایک عورت کی طرف سے دس دس روپے دے کر دو سو سے کچھ زائد انہوں نے جمع کر دیئے۔ پھر طلباء میں چرچا ہوا تو کچھ طلباء میرے پاس آئے کہ اس قسم کے خواب کا چرچا ہے۔ اس کی کیا اصلیت ہے؟ طلباء چاہتے ہیں کہ ان کے سامنے بھی بیان کر دیا جائے۔ چناں چہ طلباء کا اجتماع ہوا، ڈیڑھ دو ہزار طلباء جمع ہوئے۔ اور میں نے خواب بیان کیا۔ پھر جو پیسوں کی بارش ہونا شروع ہوئی حالاں کہ بے چارے غریب اور غریب الدیار طلباء مگر چودہ سو روپے انہوں نے اسی مجلس میں جمع کر دیئے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں تھا تو ہاتھ کی گھڑی اتار کر مجھے دے دی۔ اب شہر میں یہ چیز پھیلی، جو آ رہا ہے دس روپے کا نوٹ لئے آ رہا ہے، صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نام کی برکت ہے کہ نام آتا ہے تو لوگ اُمڈ پڑتے ہیں۔ اور عشرہ فنڈ میں خوب پیسہ جمع کراتے ہیں۔

اس پر میں نے دفتر اجلاس کو لکھا کہ جتنی بھی رقم آئے وہ حضرت ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف سے داخل کی جائے اور دینے والے کا نام معرفت میں لکھ دیا جائے کہ معرفت فلاں کی اور من جانب حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ اس طرح بہت سا روپیہ جمع ہو گیا۔ اس کے بعد میرا مدراس جانا ہوا۔ وہاں لوگوں نے کہا کہ یہاں بھی خواب کا چرچا ہے۔ وہاں بیان کیا تو کوئی چھ سات ہزار روپیہ لوگوں نے دس دس روپے دیکر جمع کر دیا۔ تو میں نے کہا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لاکھوں روپیہ دے سکتی تھیں مگر دس روپے اس لئے دیئے کہ ہر ایک کو دس دینے آسان ہیں۔ اور سو، ہزار دینے مشکل ہیں۔ اس لئے دس روپے عنایت فرمائے۔ تو اس کا نام ہم نے ''عشرہ فنڈ'' رکھ دیا اس کا یہاں پاکستان میں لاہور میں ذکر ہوا تو یہاں لوگوں نے دینا شروع کیا۔ اب تک ''عشرہ

فنڈ'' میں پندرہ، سولہ ہزار روپیہ جمع ہو چکا ہے، یہ اس خواب کی حقیقت ہے۔

عطیۂ رحمت...... اسی طرح دو روپے کے بارے میں یہ ہے کہ الٰہ آباد کے ڈاکٹر صلاح الدین صاحب، انہوں نے خواب دیکھا اور مجھے خط لکھا۔ ''مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دو روپے عنایت فرمائے اور میرا نام لیا کہ اس کے پاس بھیج دو کہ ایک دارالعلوم میں داخل کرے، ایک صد سالہ اجلاس کے فنڈ میں داخل کرے چناں چہ وہ خود لے کر پہنچے''۔ میں نے اس پر کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں، تو ایک دو روپیہ اس لئے رکھا کہ ہر شخص کو دینا آسان ہے۔

انفاقِ محبوب کا التزام...... اگر خرچ کرو تو محبوب ترین چیز خرچ کرو، محبوب چیز ہو، یہ نہ ہو کہ جسے اپنے نزدیک ردّی سمجھ رکھا ہے اسے اللہ کے نام پر دے دی، اچھی چیزیں خود رکھو، غرض جو دو محبوب چیز ہو، یہ نہیں فرمایا جو محبوب چیز ہو وہی دو۔ اس سے لزوم ہے کہ جو دو وہ محبوب ہو۔ جو محبوب ہو وہ سب کچھ دے دو یہ نہیں ہے۔ کسی کے پاس اگر دس چیزیں ہیں اور وہ محبوب ہیں، ایک چیز دے دے، وہ بھی کافی ہے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ دس کی دس دے دے ترغیب پر عمل کرے گا، درجات ملیں گے۔ امر نہیں ہے کہ اگر نہیں دے گا تو گنہگار ہوگا۔

نعمائے جنت...... جنت میں جو نعمتیں ہیں وہ، وہ ہیں کہ لَا عَيْنٌ رَأَتْ...... نہ کسی آنکھ نے دیکھی۔ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ...... نہ کسی کان نے سنی۔ وَلَا عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ خَطَرَ. ① نہ کسی قلب پر ان کا خطرہ گزرا۔ اس لئے کہ آدمی نے دیکھا تو ہے نہیں جو کچھ سمجھے گا عقل سے سمجھے گا۔ تو یہ سمجھے گا کہ جیسی دنیا میں نعمتیں ہیں ایسی ہی جنت میں ہوں گی۔ حالاں کہ وہ اس سے بالاتر ہیں۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو عقل محض سے سوچتے ہیں۔ لیکن جو ''وحیٔ خداوندی'' سے سوچتے ہیں، وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت کا معائنہ کرایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری نعمتیں دیکھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں رہے، جنت کی ساری نعمتیں دیکھیں، تو ایک ہیں انبیاء علیہم السلام اور مقرّبین، وہ محض عقل سے نہیں سوچتے وہ تو وحیٔ خداوندی اور مشاہدے کے ذریعے سے دیکھتے ہیں۔ یہ حکم عوام کے لئے کہ عقل سے جتنا سوچو گے اس کی چیزیں عقل سے بالاتر ہیں، اس لئے انبیاء علیہم السلام اس میں داخل نہیں ہیں۔

انسان ہر طرف سے عدم میں گھرا ہوا ہے...... انسانی صفات بہت محدود ہیں۔ ہر طرف سے انسان کو عدم نے گھیر رکھا ہے۔ چناں چہ صفتِ علم کی بات ہے۔ ایک انسان کو چار سو، پانچ سو مسائل کا علم ہوگا، ہزار کا ہوگا، اس کے بعد وہی عدم العلم ہے۔ تو جہل نے گھیر رکھا ہے، بیچ میں تھوڑا سا علم ہے۔

یا مثلاً ہماری قدرت ہے۔ ہم آپ سے کہیں گے کہ اگالدان اٹھالاؤ۔ آپ اٹھالائیں گے، قدرت ہے۔ یا آپ سے کہیں گے چارپائی اٹھالاؤ، مشقت سے سہی، آپ اٹھالائیں گے، ہم کہیں گے مکان اٹھالاؤ۔ آپ کہیں

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة الجنة...... ص: ۲۶۳، رقم: ۳۲۴۴.

گے مجھ میں تو قدرت نہیں۔ تو بیچ میں قدرت ہے چاروں طرف عدم القدرت ہے۔ زیادہ تر چیزیں وہ ہیں جو قدرت سے خارج ہیں۔

اسی طرح سے دیگر صفات میں بھی۔ مثلاً آپ محافظ ہیں، اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ایک بچے کی کریں گے دو بچوں کی کریں گے۔ گھر والوں کو ساتھ ملا کر دس کی حفاظت کریں گے۔ ہم کہیں گے سارے شہر کی حفاظت کرو، آپ کہیں گے مجھ میں تو قدرت نہیں، امیر اور پریزیڈنٹ جو ہے، وہ کر سکتا ہے۔ ہم اس سے کہیں گے ساری دنیا کی حفاظت کرو، سمندروں میں جو مچھلیاں ہیں ان کی بھی حفاظت کرو، وہ کہے گا میرے اندر تو قدرت نہیں، تو پھر عدم القدرت آ گئی۔ تو بیچ میں تھوڑی سی حفاظت اور قدرت ہے۔ غرض ہر انسان کی ہر صفت کمال کو عدم الصفات نے گھیر رکھا ہے، عدم چاروں طرف سے محیط ہے۔ بیچ میں تھوڑا سا وجود دیا گیا ہے۔ خود ہماری ذات جو ہے، پہلے نہیں تھے۔ بعد میں نہیں ہوں گے۔ بیچ میں تھوڑے سے ہیں۔ تو دو طرف سے عدم میں گھرے ہوئے ہیں۔ بیچ میں تھوڑا سا وجود ہے، جب وجود ہمارا تھوڑا سا ہے تو صفاتِ وجود بھی تھوڑی سی ہیں۔ کمالات بھی تھوڑے سے ہیں۔ لامحدود کمالات نہیں ہو سکتے۔

وجودِ حقیقی...... لامحدود کمالات اسی کے ہو سکتے ہیں جس کا وجود لامحدود ہے۔ جو ازل سے ابد تک رہے گا۔ اور وہ اللہ کی ذاتِ برکات ہے۔ یہ ایک بدیہی سی بات ہے کہ حق تعالیٰ کا علم محیط، اس کی قدرت محیط، اسی لئے فرمایا ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ ① ''ہر چیز اس کے علم کے احاطے میں ہے''۔ اور قدرت کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ② ''وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔ کہیں فرمایا: ﴿عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ ③ ''اس کا اقتدار ہے، کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے''۔ کہیں فرمایا: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ ④ ''مالک الملک وہی ہے، جسے چاہے ملک دے دے، جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے بادشاہ بنا دے۔ جسے چاہے گدی سے اتار دے''۔ غرض سب کی بادشاہتیں تو حد رکھتی ہیں کہ ہوئیں اور ختم ہو گئیں لیکن جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اس کی بادشاہت بھی ازلی اور ابدی ہے۔ تو وہ سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

اسلام میں انتخابِ امیر کا ایک طریق...... حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شہادت کے وقت چھ نام منتخب کئے اور فرمایا کہ ان میں سے کسی کو امیر بنا لو، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ فرمایا ان سے زیادہ کوئی مستحق خلافت نہیں ہے، ان میں سے کسی کو منتخب کر لیا جائے۔ مگر انتخاب میں تین دن سے زیادہ دیر نہ کی جائے۔

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۱۲. ② پارہ: سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۰.
③ پارہ: ۲۷، سورۃ القمر، الآیۃ: ۵۵. ④ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۲۶.

چناں چہ یہ حضرات جمع ہوئے تو حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ نے فرمایا۔ چھ میں سے تین کو سب اختیار دے دیئے جائیں، تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اور حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنا اختیار حضرت عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔

پھر حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وحضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنھما میں سے جو خلافت نہ چاہتا ہو انتخاب کا اختیار اسی کو دے دیا جائے اس پر دونوں حضرات خاموش رہے۔ تو حضرت عبدالرحمنؓ نے فرمایا۔ میں اپنے لئے خلافت نہیں چاہتا لہٰذا معاملہ میرے سپرد کر دیا جائے۔ چناں چہ انہیں یہ اختیار ان دونوں حضرات کی طرف سے سونپ دیا گیا۔ اور انہیں تین دن مہلت دی گئی۔ پھر آراء کی کثرت حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہوئی تو ان کو امیر منتخب کیا گیا۔ اور اہلِ حل وعقد نے تسلیم کر لیا۔ گویا اسلام میں دونوں طریقے ہیں۔ نامزدگی بھی ہے اور انتخاب بھی ہے۔

انتخاب کا مغربی طریقہ...... مگر انتخاب کا ایک تو موجودہ طریقہ ہے کہ جتنے بالغ ہوں سب سے رائے لی جائے، وہ امیر کے بارے میں کیا رائے دیں گے اس میں غیر عالم بھی ہیں، جہلاء بھی ہیں، جنہیں یہ ہی پتہ نہیں کہ امارت کے معنی کیا ہیں۔ یہ مسئلہ اہل حل وعقد کے اوپر رکھا گیا کہ جو قوم کے اندر علم اور دیانت کے لحاظ سے نمایاں طریق پر بڑے ہیں اور ان کی تقویٰ وطہارت پر لوگوں کو اعتماد ہے، وہ مل کر جسے منتخب کر لیں، قوم اس کو مان لیتی ہے۔ اس لئے طریقہ تو سہل ہے اور ایک معقول طریقہ ہے۔ لیکن اس میں نقصان اس سے ہوتا ہے کہ ہر لیڈر اس فکر میں رہتا ہے کہ میں بنوں اور وہ اپنے مناقب وفضائل خود بیان کرتا ہے کہ میرے یہ کارنامے ہیں۔ لہٰذا مجھے منتخب کرو، ووٹ حاصل کئے جاتے ہیں تو ووٹ حاصل کرنے والا ہی تو اپنے مناقب بیان کرتا ہے کہ میری کارگزاریاں یہ ہیں اور فلاں نے مجھے یوں کہا۔ اس کے بارے میں صراحۃً اسلام نے فرمایا: انا لا نولی هذا من سألہ و لا من حرص علیه ① جو خود کسی عہدے کا متلاشی اور خواہاں ہو، ہم اس کو عہدے دار نہیں بنائیں گے اس کی بھی جڑ کٹ گئی، یہیں سے نزاع شروع ہوتا ہے، اب اہل حل وعقد جو سیاسی امور سے بھی واقف ہوں اور ان میں دیانت بھی ہو۔ ایک تو ہے کوری سیاست یعنی جوڑ توڑ۔ اور ایک یہ کہ ضمیر کی سچائی اور دیانت وتقویٰ اور قلب کی طہارت اور ضمیر کی صداقت۔ اس سے جو وہ رائے دیں گے وہ خیر و برکت کی ہوگی، قوم بھی قبول کرے گی۔

امیر تغلّب...... بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کوئی تغلب کے ساتھ امیر بن گیا، زور اور قوّت کے ساتھ اس نے قبضہ کر لیا۔ پھر اس میں لکھتے ہیں کہ وہ بھی امیر بن جاتا ہے، اس لئے کہ اس کے ہٹانے میں فتنہ ہے اور فتنے سے بچانا ضروری ہے، اس لئے کہ ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ ② اگر خود بھی بن گیا ہو اور اس میں صلاحیت بھی موجود

① الصحیح للبخاری، کتاب الاحکام، باب مایکره من الحرص علی الامارة، ص: ٥٩٥، رقم: ٧١٤٩.

② پارہ: ٢، سورة البقرة، الآیة: ١٩١.

ہو۔قوم کا فرض ہے کہ اسے مان لے، جھگڑے نہ ڈالے۔

اقتدار میں رسہ کشی کا سبب......جھگڑے جو پڑتے ہیں وہ اس لئے نہیں پڑتے کہ اس میں خرابی ہے۔خرابی سے تو کوئی بھی شخص خالی نہیں۔ ہرایک میں کمزوری ہوتی ہے بلکہ اس لئے پڑتے ہیں کہ ہرایک خواہاں ہوتا ہے کہ میں اس عہدے پر آ جاؤں۔ یہ اقتدار پسندی جھگڑے کی بنیاد ہے۔تو اس کے لئے پہلے ہی فرما دیا کہ جو طالب ہوگا ہم اسے عہدہ نہیں دیں گے۔اس لئے کہ وہ خودغرض ہے،اس کے اندر اغراض پوشیدہ ہیں۔اب اہلِ حل وعقد جو ہوں،جن کے ہاتھوں میں قوم کی باگ ہو،یا قوم کو ان کی دیانت وتقویٰ پر اعتماد ہو۔اور یہ کہ وہ خودغرض نہیں ہیں۔ ان کو جمع کر کے کسی کا انتخاب کر دیا جائے۔اس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ساری قوم سے کہا جائے۔ جو اوپر کے لوگ ہیں ساری قوم کا وہی تو خلاصہ ہیں۔وہ حقیقت میں قوم ہی کی نمائندگی ہوتی ہے۔

رائے عامّہ کی ہمواری......اس میں البتہ یہ ہوتا ہے کہ جن کے دلوں میں خلاف ہو،اسے رفع کیا جاتا ہے کہ میاں، یہ واقعہ یوں نہیں، یوں ہے۔قوم سنبھل جاتی ہے۔اب جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا گیا تو اسی چھ آدمیوں کی مجلس میں طے تو ہو گیا تھا،لیکن حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گھر گھر جا کر پوچھا کہ کس کو چاہتے ہو۔؟ چوں کہ بنی امیہ کی تعداد زیادہ تھی اور ان میں اقتدار بھی بڑھا ہوا تھا،اس لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بجائے لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پسند کیا اور اکثریت کی رائے ادھر ہی آئی اور ان کو امیر بنا دیا گیا۔لیکن حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے رائے لی۔حتیٰ کہ لوگوں کے گھر جا کر رائے لی۔اس کا حاصل یہ ہے کہ رائے عامّہ کو ایک حد تک ہموار کرنا ضروری ہے اور وہ یہی ہے کہ جو امیر ہے اس کے واقعی فضائل بیان کئے جائیں کہ اس میں اہلیت ہے۔اس کے خلاف کوئی جذبہ ہو اس کو دفع کیا جائے۔

امیر کی غلطی کا حکم......اب ایسا کوئی آدمی جو بالکل مزکّی اور مقدّس ہو، جس میں غلطی کا نشان نہ ہو، عالم بشریّت میں کوئی نہیں ملے گا۔ ہرایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی غلطی اور خطاء ہوتی ہے اور اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔اس کے بارے میں تو یہ فرما دیا گیا کہ اگر امیر کوئی غلطی بھی کر جائے تو حتیٰ الامکان نصیحت کرو، کچھ نہ ہو تو اس کا اتباع کرو، فتنہ نہ پیدا کرو،اگرچہ وہ رائے غلط بھی ہے۔بنیاد سب کی یہ نکلتی ہے کہ خودغرض نہ ہو۔دیانت اور تقویٰ قلب میں موجود ہو۔پھر سب آسان ہے ورنہ جھگڑے پیدا ہوتے رہیں گے۔

یہی دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص میں ملک کے سنبھالنے اور چلانے کی اگر فی الجملہ صلاحیت ہے تو اس کے خلاف نہ کیا جائے اور اسے کام کرنے کا موقع دیا جائے اور اگر وہ غلطی بھی کرے تو اس غلطی کو اچھالا نہ جائے۔الا یہ کہ وہ اسلام کی تخریب کے لئے کام کرے، پھر بے شک اس کو بدل ڈالو۔

افراط وتفریط فرقہ واریّت کی بنیاد ہے......مولانا احمد رضا خانؒ اور بریلویت کے بارے میں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو آج تک کہیں ان کی تکفیر نہیں کی گئی۔ بہر حال وہ مسلمان ہیں۔ایک ہے کسی چیز میں غلو اور

مبالغہ کرنا اور تشدّد کرنا، اس کو دنیا میں بھی پسند نہیں کیا گیا، اور دین میں بھی پسند نہیں کیا گیا۔ دین کے بارے میں فرمادیا گیا لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ. ① دین کے اندر غلومت کرو۔ سادہ سادہ طریق پر چلتے رہو۔ جس قوم نے غلو کیا ہے، وہ افراط وتفریط سے ہوتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہود نے تو یہ افراط کی کہ انہیں ولدِ غیا کہا کہ معاذ اللہ ولد الزنا ہیں۔ انتہائی گستاخی کی۔ نصاریٰ نے کہا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ تفریط کی۔ تو ایک اِدھر بڑھ گیا اور ایک اُدھر بڑھ گیا۔ جو اصلیت تھی کہ اللہ کے پاک بندے ہیں اور اس کے پاک رسولؑ ہیں۔ اس کی طرف کوئی نہیں آیا۔ یا خدا بنایا یا معاذ اللہ ایک بدکار انسان ثابت کیا۔ یہ ہے وہ افراط وتفریط جس سے فرقے بنتے ہیں۔

یا جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اِنَّ فِیْکَ مَثَلُ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ. تم میں عیسیٰ ابن مریم کی مثال پائی جاتی ہے، بعض فرقے تمہاری محبت میں پڑ کر تباہ ہوں گے اور بعض تمہاری عداوت میں پڑ کر تباہ ہوں گے۔ تو خوارج نے تو عداوت کا راستہ اختیار کیا۔ اور یہ منصوبہ بنایا کہ آپ کو قتل کردیں اور روافض کے بعض فرقے ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ان میں خدا حلول کئے ہوئے ہے اور حضرت حضرت امام تسلیم کیا اور حضرت حضرت امام کے معنی معصوم کے لئے۔ اور کہا حضرت حضرت امام شریعت میں تصرّف کرسکتا ہے۔ اگر وہ یوں کہے کہ پانچ نمازوں کو تین کرو، تو اسے کردینے کا حق ہے۔ حالاں کہ اس کا رسول کو بھی حق نہیں، قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿قُلْ مَایَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِیْ﴾ ② ”مجھے اس کا حق نہیں ہے کہ میں قرآن کریم میں اپنے نفس کی رائے سے کچھ تبدیلی کردوں۔ یہ تو اللہ کا کلام ہے اور میں امین ہوں“۔

غرض نبی کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ شریعت میں تصرّف کرے اور وہاں حضرت حضرت امام کو حق دے دیا گیا۔ یہ اِدھر غلو ہے اور وہ اُدھر غلو ہے۔ یہیں سے فرقہ بندی شروع ہوگئی۔ یہی صورت یہاں بھی ہورہی ہے کہ بعض مسائل مختلف فیہ ہیں یعنی اختلافی مسائل میں اگر غلو نہ کیا جائے اور اعتدال سے چلا جائے تو میں سمجھتا ہوں کچھ بھی اختلاف نہیں۔ اب اس اختلاف کو لڑنے جھگڑنے کا ذریعہ ہی بنایا جائے، یہ جذبات کی بات ہوئی مسائل کی بات تو نہ ہوئی۔

عرس کا مسئلہ...... اس میں دیوبند کے حضرات معتدل ہیں۔ مان لیجئے عرس کا مسئلہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عرس اپنی ذات سے کوئی بری چیز نہیں۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ اہل اللہ میں سے کسی شیخ طریقت کا انتقال ہوتا تو جو متوسل ہوتے، وہ جمع ہوجاتے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ جو لوگ ضعیف النسبت ہوتے انہیں قوی النسبت لوگوں سے قوت پہنچتی تھی اور تقویّت حاصل ہوتی تھی، ان کی نسبت مضبوط ہوتی تھی۔

دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ان کو مختلف ولایات میں بھیجا جاتا تھا کہ تم وہاں جا کے اصلاح کرو، تم وہاں جا کے

---

① الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قوله تعالی یا اهل الکتاب لا تغلوا فی دینکم، ج:۳، ص:۲۹۶۔

② پارہ:۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ:۱۵۔

اصلاح کرو۔ اورتم وہاں جاکے اسلام پھیلاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام حضراتِ صوفیاء کی بدولت پھیلا ہے۔ ان کے ہاں عرس کا موضوع ہی یہ تھا کہ سال میں ایک دفعہ جمع ہوکر ہدایت اور تبلیغ حق کے لئے وجود بھیجے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ہر قصبے اور ہر ضلع میں تقریباً شاہِ ولایت کی قبر ہے، سہارن پور میں بھی شاہِ ولایت کی قبر۔ دیوبند میں بھی شاہِ ولایت کی قبر۔ اسی طرح اور بھی کئی جگہوں میں سنا گیا۔ وہ اصل میں یہ تھا کہ جس وفد کو بھیجا جاتا اس کا ایک امیر بنادیا جاتا۔ اس کا نام شاہِ ولایت ہوتا تھا۔ وہ جہاں انتقال کرگیا، وہاں دفن ہوا۔ تو شاہِ ولایت کے طور پر دفن ہوگیا۔ وہ شاہِ ولایت ہوگیا۔

غرض وہاں ولائتیں تقسیم ہوتی تھیں کہ تبلیغ دین کرو، مسلمانوں کی اصلاح کرو، حضرت خواجہ اجمیری رحمتہ اللہ علیہ، ان کے بارے میں عیسائیوں کی شہادت ہے۔ مسٹر آرنلڈ نے پریچنگ آف اسلام کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ یعنی اسلام کی دعوت کس طرح سے پھیلی۔ اس میں لکھا ہے کہ ''ہندوستان میں حضرت خواجہ اجمیری رحمتہ اللہ علیہ اسلام کے پھیلنے کا ذریعہ بنے اور ننانوے لاکھ آدمی بلاواسطہ ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ اور جو ان کے خلفاء کے ہاتھ پر ہوئے ہیں، ان کی تعداد الگ ہے''۔

حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے نو سو خلیفہ دکن میں پہنچے، وہاں جاکے اسلام پھیلایا، ہزاروں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ وہاں جاکر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں میں ایسی تنگ جگہ کہ آدمی کا جانا مشکل، مگر کوئی نہ کوئی مسجد موجود ہے یا مزار موجود ہے۔ وہاں تک یہ حضرت پہنچے ہیں، نو سو خلفاء بھیجے جنہوں نے دین پھیلایا۔

تو اصل میں عرسوں کا یہ مقصد تھا لیکن وہ ہوتے ہوتے مثل مشہور ہے۔ الولایہ سردہ آمد رفتہ رفتہ کچرہ شد، آیا تھا سردہ بن کر، ہوگیا کچرہ، اب عرسوں کے معنی میلے کے ہوگئے، عورتیں اس میں، ناچ گانا اس میں، دکانیں اس میں، ہر طرح کی خرافات۔ اس کو کوئی روکتا ہے تو کہتے ہیں عرسوں کو روکتے ہیں۔ وہ عرسوں کا روکنا نہیں ہے۔ وہ خرافات کا روکنا ہے جو خلافِ سنّت ہی نہیں بلکہ بدعات ہیں۔ جو رسمیں پڑی ہوئی ہیں اور جہلاء کی ایجاد کردہ ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر عرس ان چیزوں سے پاک ہوجائے، وہاں سے تبلیغ کے لئے وفد بھیجے جائیں۔ مواعظ ہوں، تقریریں ہوں اور تلاوت ہو، کوئی بھی نہیں روکتا۔

ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے بڑے مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ، یہ نقشبندیہ خاندان کے بزرگ تھے، ہر سال سرہند شریف عرس میں جاتے تھے اور دیوبند والا کوئی انہیں نہیں روکتا تھا، اس لئے کہ وہاں یہ خرافات ہی نہیں تھیں۔ یا تلاوت ہے یا تبلیغ ہے یا مواعظ ہیں۔ غرض اصل میں عرس کو نہیں روکا جاتا بلکہ ان خرافات کو روکا جاتا ہے۔ عوام ان خرافات کے خوگر ہیں، وہ اس پر عار دلاتے ہیں کہ دیکھئے صاحب! عرس کو روک دیا۔ حالاں کہ بزرگوں نے یہ رسم ڈالی ہوئی ہے۔ کیا بزرگوں نے ناچ گانے کی رسم ڈالی تھی؟ اس کا

منشاء تبلیغ وموعظت اور دینِ حق پھیلانا تھا۔ وہ تو رہا نہیں، ناچ گانا رہ گیا۔ بہر حال بہت سی چیزیں جہالت سے پیدا ہوئی ہیں جب شریعت کا علم ہی نہ ہو تو خرافات ہی ہوں گی۔

اسلام کے نام پر رائج رسوم......اور اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہوئی کہ ان بزرگوں کی دیانت وتقویٰ اور پاکیزہ اعمال کو دیکھ کر قومیں متوجہ ہوئیں۔ اور لاکھوں کی تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں لیکن تعلیم کا بندوبست نہیں ہوا۔ تو جن لوگوں کے گھروں میں ہندوانہ رسمیں تھیں۔ انہیں صورت بدل کر اسلامی رسوم قرار دے دیا۔ وہ گوگال کا جھنڈا نکالتے تھے۔ انہوں نے شیخ سدّو کا جھنڈا نکال دیا، وہ ستیوں پر پرشاد چڑھاتے تھے، انہوں نے قبروں پر چڑھانا شروع کر دیا۔ ساری ہی اس میں ہندوانہ رسمیں ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں مگر وہ اسلام کے نام سے رائج ہیں۔ یہ عرسوں پہ ہونے والی چیزیں درحقیقت کچھ ہنود سے آئی ہوئی چیزیں ہیں۔ کچھ اِدھر کی کچھ اُدھر کی۔ وہ پھیل گئیں۔ اب انہیں کوئی روکتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ بزرگوں کی تعظیم نہیں کرتے۔ بزرگوں نے یہ چیزیں تھوڑا ہی پھیلائی تھیں۔ وہ تو مقدّس لوگ تھے۔

ذکرِ میلاد یا جشنِ میلاد......اسی طرح مثلاً میلاد شریف ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ولادت تو طاعت وعبادت ہے، اس سے کون روک سکتا ہے۔ لیکن ذکرِ میلاد کے معنی جشنِ میلاد کے ہو گئے ہیں۔ اب دیکھیں گے جگہ جگہ سبز مینار سے بنے ہوئے ہیں، روشنیاں پھیل رہی ہیں۔ یہ سیرت پھیل رہی ہے۔ سیرت تو ان تکلفات کو مٹانے کے لئے آئی تھی۔ نہ ان کو رواج دینے اور مظاہرے کرنے کے لئے آئی تھی، دل میں تو سیرت کا نشان نہیں، مگر بازاروں میں جھنڈوں کے اوپر، میناروں اور برجوں کے اوپر گھوم رہی ہے، سیرت آدمیوں کے لئے آئی تھی، یا جھنڈوں اور قمقموں کے لئے آئی تھی۔؟ اس میں لگے ہوئے ہیں اور مظاہروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب اس سے روکو تو کہتے ہیں کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی نہیں اور محبت کے معنی یہ ہیں کہ یہ خرافات کرد تب تو محبت ہے۔ نہ کرو تو محبت نہیں ہے۔ اب انہیں کس طرح سمجھایا جائے۔ حدود قائم نہیں رہیں۔

اب اس میں علمائے کرام اگر ان خرافات سے ٹوکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ نیا اسلام کہاں سے لا رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تو ان کے گھروں سے جو اسلام آیا ہے۔ وہ یہ رسوم ہیں۔ اور جو لوگ رسوم سے روکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ نئے لوگ کہاں سے رسوم کو روکنے کے لئے آ گئے ہیں۔ حالاں کہ ان رسوم کو روکتے ہیں جو جاہلانہ طریق پر مروّج ہیں۔ اصل شئے کو نہیں روکتے۔ اس کو کوئی نہیں سمجھتا۔

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تجربہ لکھا ہے کہ جو لوگ قبروں پر طواف اور سجدے کرنے جاتے ہیں انہیں حج کی توفیق کم ہوتی ہے اس لئے کہ جو جذبہ اُدھر خرچ کرنا تھا وہ اِدھر خرچ ہو گیا۔

جو لوگ گانے بجانے میں رہتے ہیں، انہیں تلاوتِ قرآن کریم کی کم توفیق ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ جذبہ ادھر لگ گیا۔ اور اسلام اس لئے آیا تھا کہ یہ جذبات دین کے بارے میں صرف ہوں۔ قرآن وحدیث کے بارے

میں صرف ہوں، تو نہ تو تعلیم ہے کہ مسائل معلوم کریں جس سے سیرت کی حقیقت معلوم ہو، اس پر عملدرآمد کریں۔ نہ تمرین وٹریننگ ہے۔ بس جو رسمیں چل پڑیں، جس نے بھی ایجاد کردیں بس سبحان اللہ بہت عمدہ چیز ہے۔ چند دن کے بعد وہی دین بن گیا۔ تو ان چیزوں کو روکتے ہیں نہ کہ اصل دین سے روکتے ہیں۔

دیوبندی بریلوی کوئی فرقہ نہیں...... اس لئے میری سمجھ میں اب تک بھی نہیں آیا کہ وہ اختلاف ونزاع ہے کیا چیز جس کو بریلویّت اور دیوبندیّت کے نام سے کھولا جارہا ہے۔ دیوبندیّت کوئی فرقہ تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو اہلسنت و الجماعت ہیں۔ دیوبندیّت کی جو نسبت ہے وہ تعلیمی نسبت ہے کہ دیوبند میں تعلیم پائی، دیوبندی مشہور ہوگئے، جنہوں نے علی گڑھ میں تعلیم وہ علیگ کے نام سے مشہور ہوگئے۔ ندوہ میں تعلیم پائی وہ ندوی کے نام سے مشہور ہوگئے، باقیات صالحات مدارس میں تعلیم پائی تو وہ باقوی کے نام سے مشہور ہوگئے۔ اب یہ فرقہ تھوڑا ہی ہیں کہ ندوی ایک فرقہ، باقوی ایک فرقہ اور دیوبندی ایک فرقہ یہ تو تعلیمی نسبت ہے مگر فرقہ بنادیا۔

انگریز کا انتقام...... بنیاد اصل میں ساری یہ ہے کہ دیوبندی جماعت انگریزوں کے مقابلہ میں کھڑی ہوئی تھی۔ تلوار لے کر جہاد کیا۔ تو انگریزوں کے دل میں اس جماعت سے عداوت تھی مگر یہ قوم بہت دانش مند ہے۔ کھلے بندوں مقابلہ نہیں کرتی۔ تدبیر ایسی کرتی ہے کہ وہ آپس میں الجھ جائیں اور باہمی نفرتیں پیدا ہوجائیں۔ اس نے لوگوں کو ہموار کیا کہ ان کو بدنام کرو، چناں چہ جو لوگ ردِّ بدعات کرتے تھے تو ان کے مقابلہ میں جو بدعات میں مبتلا تھے۔ ان کو موقع ملا کہ تم ڈنڈا لے کر کھڑے ہوجاؤ، وہ کھڑے ہوگئے۔ اب یہ بدعات کا رد کرتے ہیں۔ وہ لوگ مقابلہ پر آگئے بس پھر فرقہ بندی کی ٹھن گئی۔ یہ نہیں دیکھتے کہ بدعات ردّ کرنے کی ہی چیز ہے۔

رد بدعات اور اتباعِ سنّت...... مسلمان تو اتباعِ سنّت کے لئے آیا ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اس نمونے پر میں عمل کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ صلوا نماز پڑھ لیا کرو، یہ فرمایا صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي ① ''نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو''۔ اس طریق پر نماز ہوگی مقبول ہے، نہیں ہوگی نامقبول ہے۔ حج کرو جس طرح مجھے کرتے ہوئے دیکھو۔ خود ساختہ طریق پر کرو گے، وہ حج نہیں ہوگا، غرض ہم تو پیروی سنّت کے لئے آئے ہیں۔ قرآن سے علم لیا، حدیث سے عمل لیا، فقہ سے اس کی تشریح لی۔ بس اس پر عمل کرو۔ اس کے جو خلاف ہے ظاہر بات ہے کہ وہ عمل کے قابل نہیں۔ جو ان کے خلاف کہے گا وہ اسے بدنام کریں گے، اس لئے کہ وہ ان کی رسوم کے خلاف پڑتا ہے۔ اور لوگ رسموں کے عادی ہوگئے۔ دین کی حقیقت قلوب میں نہیں۔ یہ ساری بنیاد ہے۔ ورنہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نزاع کیا ہے۔ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے تم بھی۔ بیعت وارشاد کا سلسلہ تمہارے ہاں بھی، طریقت تمہارے ہاں بھی۔ یہ ساری چیزیں مشترک ہیں۔ آخر نزاع کیا ہے۔؟۔ عرس ومیلا، یہ نزاعی مسئلے ہیں؟ فروعی چیزیں ہیں۔ ان میں جو خرافات آئی

① الصحيح للبخاري، كتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا كانو جماعة، ج: ١، ص: ٢٢٦.

ہیں وہ جاہلوں کے راستے سے آئی ہیں۔ جو واقعی چیزیں ہیں اس کے ہم بھی قائل ہیں کہ کرو۔

اتباعِ آباء...... اب مثلاً جنازے کی نماز ہے۔ تو اس میں سنت طریق یہ ہے کہ نماز پڑھ لی۔ اور میت کو لے جا کر دفن کرو۔ اب اس کے بعد مستقل ایک دعاء مانگی جاتی ہے حالاں کہ وہ نماز بھی تو دعاء ہے، اس نماز میں یہ تو نہیں ہے کہ اس میں رکوع وسجدہ ہو، وہ تو شفاعت وسفارش اور دعاء ہے۔ اب اس کے بعد پھر دعاء اور بعض نے قبروں پر اذانیں دینی شروع کر دیں۔ سنّت سے کہیں اس کا ثبوت نہیں۔ اب اگر کہو تو کہتے ہیں کہ یہ دین تو ہم نے اپنے باپ دادا سے پایا ہے۔ تو کفارِ مکہ جو کہا کرتے تھے ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا﴾ ① باپ دادا کو یوں ہی کرتے پایا ہے۔ تو قرآن کریم نے جواب دیا۔ ﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآءُ هُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾ ② ''کہ تمہارے باپ دادا چاہے نہ علم رکھتے ہوں اور نہ راستے پر ہوں پھر بھی تم ان کی پیروی کرو گے۔ یہ تو تعصب ہے''۔ حق پسندی تو یہ ہے کہ حکم رسول آ جائے تو اسے مانو۔ اور اتباعِ سنّت کو غالب رکھو۔

غلبۂ آدابِ شریعت...... ہم نے ان دیوبندی بزرگوں میں یہ دیکھا جو صاحبِ حال بھی تھے، دلوں میں سوز بھی تھا، مگر شریعت کا ادب غالب ہے۔ اس سے باہر نہیں نکلتے تھے کہ کوئی سنت ترک ہو جائے۔ خواہ جان پہ بن جائے۔ مگر سنّت ترک نہ ہو۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو انگریز کے خلاف ہونے والے جہاد میں امیر جہاد تھے۔ گورنمنٹ عدل وانصاف کی تھی نہیں۔ ذرا ذرا سے حیلوں پر علماء کو پھانسیاں دی جا رہی تھیں۔ اور حضرت کھلے بندوں پھرتے، چھتے کی مسجد میں گئے، مخبر نے خبر دی کہ اس وقت چھتے کی مسجد میں موجود ہیں تو پولیس نے آ کر مسجد کو گھیر لیا۔ ایک سارجنٹ اندر آیا۔ آ کر حضرتؒ سے پوچھتا ہے کہ مولوی محمد قاسم کہاں ہوں گے؟

دو قدم پیچھے ہٹ کر حضرت نے فرمایا ''ابھی تو یہیں تھے۔ دیکھ لیجئے یہیں ہوں گے''۔ وہ دیکھتے رہے اور آپ شاہ رکن الدین کی مسجد میں پہنچ گئے۔ وہاں پولیس نے گھیرا ڈالا تو وہاں سے نکل کر شاہ ولایت کی مسجد میں پہنچ گئے۔ بس یوں ہی چکر دیتے رہے۔ ان کے سالے شیخ نہال احمد صاحب مرحوم جو گاؤں گیاؤں کے مالک تھے۔ دیوبند سے کوئی آٹھ دس میل پہ جو چکوالی گاؤں ہے، وہ ان کا تھا۔ انہوں نے منت خوشامد کی۔ کہ ٹھیک ہے تم یہاں تو رکتے نہیں۔ میں تمہیں لے جا کے گاؤں میں رکھوں گا، ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔

چناں چہ مخبر نے پھر خبر دی کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ چکوالی میں ہیں۔ تو پولیس نے آ کر سارے گاؤں کا گھیرا ڈال لیا۔ اب وہ یورپین افسر تھا۔ وہ اندر آیا، حضرت نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ فرمایا۔ آیئے، تشریف لایئے۔ فرمایا، چائے بنواؤ۔ چناں چہ ان کے لئے چائے بنی اس نے کہا آپ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے واقف ہیں حضرت نے فرمایا۔ جی ہاں خوب واقف ہوں۔ اس نے کہا کیسے آدمی ہیں؟ فرمایا نیک آدمی ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ اس نے کہا میں تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ فرمایا شوق سے لیجئے۔ تو جس کی تلاش تھی وہی تو تلاشی

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۲۲. ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۰.

دلا رہے تھے۔ایک ایک کمرہ دیکھا، پتہ نہیں چلا۔خیر وہ شکریہ ادا کر کے واپس ہوا۔باہر جا کے اس نے کارڈ نکال کر حلیہ دیکھا تو اس نے کہا کہیں یہی تو نہیں تھے؟ واپس ہوا تو حضرتؒ نانوتہ جا چکے تھے، وہ نانوتہ گیا۔تو حضرت دیوبند آ چکے تھے، آخر کار عزیزوں نے مل کر مجبور کیا کہ چندون روپوش ہو کر گھر میں رہیں۔تو حضرتؒ کی سسرال دیوبند میں تھی دیوان کا محلہ ہے۔بہت بڑا محل ہے۔وہ بڑے رئیس لوگ تھے، انہوں نے مجبور کر کے ٹھہرایا۔

تین دن بعد پھر گھر سے نکل آئے۔لوگوں نے کہا کہ حالات مخدوش ہیں۔فرمایا تین دن سے زیادہ چھپنا خلاف سنت ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو ہجرت کے لئے تشریف لے گئے ہیں تو تین دن غارِ ثور میں چھپے ہیں۔خدا کا شکر ہے کہ اس کا اتباع بھی نصیب ہو گیا، تو انہیں جان کی پرواہ نہیں تھی، اتباع سنت غالب تھا۔میں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ سبق پڑھا رہے تھے، جتنی دیر طالب علم عبارت پڑھ رہا ہے، اتنی دیر ذکر کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی ہے۔یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون ذکر کر رہا ہے۔وہ خود حضرتؒ ذکر کرتے تھے۔جب وہ عبارت پڑھ چکا۔تقریر کی، مطلب بیان کیا، اس نے اگلا صفحہ پڑھا، پھر ذکر میں مشغول ہو گئے۔

اور اس میں کیفیت یہ تھی کہ رقتِ قلب سے آنسو آئے تو اس کو اس طرح پیتے تھے کہ دوسروں پر نہ کھلے کہ آنسو آئے ہیں۔بالکل ضبط کرتے تھے۔آدابِ شریعت اتنا غالب تھا کہ وہ اپنے حال وقال کو آگے نہیں رکھتے تھے۔بلکہ شریعت کو حضرت حضرت امام رکھتے تھے۔یہی طریقہ ہم لوگوں کا ہے کہ حال بھی پیدا کرو، سوز وگداز بھی پیدا کرو۔ذکر اللہ بھی پیدا کرو، قلب میں رقّت بھی ہو، مگر ادب شریعت کا غالب رہے۔اب کوئی اگر بالکل ہی مغلوب الحال ہو جائے تو مستثنیٰ ہے۔وہ معذور ہے، اس پر کوئی گرفت نہیں۔لیکن جہاں تک ارادے اور حواس کا تعلق ہے تو حال کو مغلوب کرو، اور شریعت کو اس پر غالب کرو۔

اَبُو الْحَالِ اور اِبْنُ الْحَالِ...... اس لئے ان حضرات کے ہاں دو لقب ہیں۔ایک ابو الحال اور ایک ابن الحال، ابو الحال تو وہ ہے جو حالات پر غالب آئے اور سنّت کو غالب کر کے رکھے، یہی ان کا طریقہ تھا، اور ابن الحال وہ ہے جو حالات سے مغلوب ہو جائے، غرض ان کے ہاں بیعت وارشاد بھی تھی، حَالَ وَقَالَ بھی تھے ساری چیزیں تھیں مگر اِتباعِ سنّت کا غلبہ تھا۔دین کی عظمت، دین کا ادب یہ ہر چیز سے مقدّم تھا۔

اور ہم تو مختصر لفظوں میں یہ کہا کرتے ہیں۔کہ ایک ہے قانونِ عام جو سب کے لئے عام ہے، وہ قانونِ شریعت ہے، ہر کس وناکس کے لئے پیغام ہے۔اور ایک طریقت ہے، وہ شخصی احوال کا نام ہے۔اور ایک شخص کا حال دوسرے پر حجت نہیں ہوتا، اس واسطے وہ نظیر میں نہیں پیش کیا جائے گا کہ فلاں ایسے ہے، تم بھی ایسے کرو، ہر ایک کا حال الگ الگ ہے، جو سب کے لئے یکساں ہے وہ قانونِ شرعی ہے۔تو طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔کوئی بہت بلند پہنچ گیا، کوئی نیچے رہ گیا، نیچے والا یہ چاہے کہ میں کود پھلانگ کر اس تک پہنچ جاؤں، فطرت کے خلاف ہے۔کوشش کرنی چاہئے۔اللہ پہنچا دے، پہنچ جائے۔

بس یہ فرق ہے، ورنہ ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ یہ کیا اختلاف ہے؟ ایک طوفان برپا ہے اور تکفیر جاری ہے، فلاں کافر، فلاں کافر، لوگوں نے اپنی خصوصیات کا نام اسلام رکھ لیا ہے۔ حالاں کہ اسلام بہت بلند و بالا چیز ہے۔